تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

جلد ۷

خلیفہ مجاز

شیخ المحدثین حکیم العصر
حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی رحمہ اللہ
شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا
سابق امیر مرکزیہ
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء
شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب رحمہ اللہ
سابق امیر مرکزیہ
عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)
بیسمنٹ مکہ سنٹر ○ اردو بازار ○ لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تِبیانُ الفُرقان فی تفسیرِ القُرآن

شیخ المحدثین حکیم العصر

حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی زید مجدہم

شیخ الحدیث والتفسیر جامعہ اسلامیہ باب العلوم کہروڑ پکا

سابق امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

خلیفہ مجاز

قطب الاقطاب سلطان الاولیاء

شیخ المشائخ سید نفیس الحسینی شاہ صاحب زید مجدہم

سابق نائب امیر مرکزیہ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت

نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ)

۵۔ لوئر مال ○ بیسمنٹ مکہ سنٹر ○ اردو بازار ○ لاہور

فون: 0321-320-9464017, 042-37361460

بسم اللہ الرحمن الرحیم

جملہ حقوق بحق ناشر نفیس قرآن کمپنی محفوظ ہیں۔

نام کتاب ---------- تبیان الفرقان فی تفسیر القرآن

---------- شیخ المحدثین حکیم العصر حضرت مولانا عبد المجید لدھیانوی نور اللہ مرقدہ

باہتمام ---------- شیخ الحدیث حضرت مولانا منیر احمد صاحب دامت برکاتہم

سنِ اشاعت ---------- ۱۴۴۲ھ۔۲۰۲۰ء

تعداد ---------- ۱۱۰۰

ناشر ---------- نفیس قرآن کمپنی (رجسٹرڈ) ۵۔لوئر مال ۰ بیسمنٹ مکہ سنٹر ۰ اردو بازار ۰ لاہور

علماء دیوبند کے علوم کا پاسبان
دینی وعلمی کتابوں کا عظیم مرکز ٹیلیگرام چینل
حنفی کتب خانہ محمد معاذ خان
درس نظامی کیلئے ایک مفید ترین
ٹیلیگرام چینل

ملنے کے پتے

جامعہ اسلامیہ باب العلوم
کہروڑپکا۔ضلع لودھراں فون نمبر: 0608-342983

مکتبہ عثمانِ غنی
جامعہ دارالقرآن مسلم ٹاؤن فیصل آباد
فون نمبر: 0300-7203324

جامعہ حسینیہ باب العلوم
جڑانوالہ روڈ۔فیصل آباد
فون نمبر: 0321-6670225

مکتبہ رحمانیہ اُردو بازار۔لاہور

اسلامی کتب خانہ
بالمقابل جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن کراچی

مکتبہ لدھیانوی
سلام کتب مارکیٹ بنوری ٹاؤن۔کراچی
021-34130020
021-24125590

بیت الکتب
بالمقابل اشرف المدارس گلشن اقبال، کراچی

دارالاشاعت اُردو بازار۔کراچی

ادارہ تالیفات اشرفیہ۔ملتان

فہرستِ مضامین

مضمون	صفحہ
سُوْرَةُ الصّٰفّٰت	۲۵
تفسیر	۲۸
مکی سورتوں کے مضامین	۲۸
ملائکہ اور جنوں کی اُلوہیت کا رَدّ	۲۸
فرشتوں کی قسم اور جوابِ قسم میں مناسبت	۲۹
''مشرق، مشارق اور مشرقین'' میں فرق	۳۰
''ستارے'' آسمان کی زینت کیسے ہیں؟	۳۱
جن وشیاطین کی ذِلت کا تذکرہ اور اس کا مقصد	۳۱
اِثباتِ معاد	۳۲
حضور ﷺ کا تعجب اور مشرکین کا اِستہزا اور اِنکارِ معاد	۳۲
قیامت کے دن مشرکین کی بدحالی	۳۳
تفسیر	۳۷
کفار اور ان کے معبود جمع کیے جائیں گے	۳۷
جہنمیوں کو ٹھہرا کر سوال کیا جائے گا	۳۷
جہنم میں مشرکین کا آپس میں جھگڑا	۳۸
عذاب میں تمام مشرکین اکٹھے کیوں ہوں گے؟	۳۹
اہلِ جنت کے لئے ''رزقِ معلوم''، اور ''رزقِ معلوم'' کا مفہوم	۴۰
ظاہری رزق کے ساتھ ساتھ رُوحانی لذت	۴۰
جنت میں پیار بھرا ماحول	۴۱
جنتی شراب	۴۲
جنتی بیویاں	۴۲
جنتی کا اپنے جہنمی دوست کی طرف جھانکنے کا واقعہ	۴۳
مذکورہ واقعہ ذکر کرنے سے مقصود	۴۳
خلاصۂ آیات	۴۴
اصل کامیابی کیا ہے؟	۴۵
جہنمیوں کی غذا، شجرۂ زقوم کا تعارف، اور اس کے فتنہ ہونے کا مطلب	۴۵
جہنمیوں کی گمراہی کی اصل وجہ	۴۷
تفسیر	۵۰
حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ	۵۰
کیا موجود اِنسانی آبادی صرف نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہے؟	۵۱
حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ	۵۲
قومِ ابراہیم کے اصل معبود کون تھے؟	۵۳
''مشرک'' اللہ تعالیٰ کے متعلق بدگمان ہوتا ہے	۵۴
خلاصۂ آیات	۵۴
واقعہ ''فَنَظَرَ نَظْرَةً'' کی پہلی تعبیر	۵۵
بتوں کے خلاف آپریشن	۵۷

مضمون	صفحہ
''فَنَظَرَ نَظْرَةً'' کا ایک اور مفہوم	۵۷
قومِ ابراہیم کے اصل معبود یہی پتھر کی مورتیاں ہی تھیں	۵۹
قوم کی طرف سے انتقام کی کوشش اور ناکامی	۶۰
سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کا سفرِ ہجرت	۶۰
ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے اولاد کی دُعا اور اس کی قبولیت	۶۱
ذبیح کون؟ اسماعیل علیہ السلام یا اسحاق علیہ السلام؟	۶۱
خلاصۂ آیات	۶۱
سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کو ذبح کرنے کا واقعہ	۶۳
مینڈھے کے سینگ کب جل گئے تھے؟	۶۳
قربانی سُنتِ ابراہیمی ہے	۶۴
واعظوں کے اضافے	۶۴
سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے پر دلیل	۶۵
سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں برکات	۶۵
تفسیر	۶۷
موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا تذکرہ	۶۷
حضرت اِلیاس علیہ السلام کا تذکرہ	۶۸
حضرت لُوط علیہ السلام کا تذکرہ	۶۹
تفسیر	۷۲
حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ	۷۲
انبیاء علیہم السلام کی معمولی لغزشوں پر تعبیر سخت کیوں ہوتی ہے؟	۷۲
حضرت یونس علیہ السلام نے تبلیغ میں کوتاہی نہیں کی تھی	۷۵
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۷۵
فرشتوں اور جنوں کے متعلق مشرکین کا عقیدہ اور اس کا رَدّ	۷۷
خلاصۂ آیات	۷۹
فرشتوں کا مقام، فرشتوں کی زبانی!	۸۰
مشرکینِ مکہ اپنی بات سے پھر گئے	۸۰
غلبہ ہمیشہ رسولوں کو ہی ملتا ہے، اس پر ایک اِشکال اور جواب	۸۰
حضور ﷺ کو تسلی	۸۱
کفارۂ مجلس کے لیے دُعا، اور آخری تین آیات کی فضیلت	۸۱
سُورۃ ص	۸۳
خلاصۂ آیات مع تحقیق بعض الالفاظ	۸۶
تفسیر	۹۰
اِبتدائی آیات کا شانِ نزول	۹۰
''إِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ يُرَادُ'' کے دو مفہوم	۹۲
حق کے اِنکار کے لئے مشرکین کے شبہات اور ان کا جواب	۹۲
تفسیر	۹۵
کُفّار کو تنبیہ، اور لفظ ''فَوَاق'' کی تحقیق	۹۵
مشرکین اپنے منہ آپ موت مانگتے تھے	۹۶
داؤد علیہ السلام کے تذکرے سے حضور ﷺ کو تسلی اور مشرکین کو تنبیہ	۹۶
داؤد علیہ السلام کا معجزہ	۹۷
''فصل الخطاب'' کے دو مفہوم	۹۸
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۱۰۰
تفسیر	۱۰۱
داؤد علیہ السلام کے پاس جھگڑا لانے والوں کا واقعہ	۱۰۱

مضمون	صفحہ
واقعۂ داؤد علیہ السلام کے متعلق اسرائیلی خرافات اور ان کا رَدّ	۱۰۳
واقعۂ داؤد علیہ السلام کی پہلی صحیح توجیہ	۱۰۵
حضرت داؤد علیہ السلام کو نصیحتِ الٰہی	۱۰۷
ماقبل سے ربط اور خلاصۂ آیات	۱۰۹
یومِ حساب کے لئے ایک عقلی دلیل	۱۰۹
سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ اور اس کا مقصد	۱۱۱
خلاصۂ آیات	۱۱۱
سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کا واقعہ اور اس کی پہلی تفسیر	۱۱۲
دُوسری تفسیر	۱۱۳
واقعۂ داؤد علیہ السلام کی ایک اور توجیہ	۱۱۵
خلاصۂ آیات	۱۱۶
تفسیر	۱۱۷
سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا واقعہ، اور محققین کا مسلک	۱۱۷
اِسرائیلی خرافات اور بعض مفسرین کی بے احتیاطی	۱۱۸
"وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ" کی دُوسری تفسیر صحیح حدیث سے	۱۱۹
مودودی صاحب نے اپنی عادت کے مطابق صحیح حدیث کا مذاق اُڑایا	۱۲۰
مذکورہ حدیث روایۃً اور درایۃً دُرست ہے	۱۲۰
واقعۂ معراج سے تائید	۱۲۱
اولیاء اللہ کے حیرت انگیز اَحوال	۱۲۱
گمراہی کی بُنیاد	۱۲۲
"لَاَطُوْفَنَّ اللَّیْلَةَ" کا ایک اور مفہوم	۱۲۳
"وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَیْمٰنَ" کی تیسری تفسیر	۱۲۳
سلیمان علیہ السلام کی عظیم سلطنت	۱۲۴

مضمون	صفحہ
تفسیر	۱۲۷
خلاصۂ آیات	۱۲۷
حضرت ایوب علیہ السلام پر آزمائش	۱۲۸
ایوب علیہ السلام کی قسم کیا تھی؟	۱۲۹
ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام قوتِ عملیہ اور علمیہ والے تھے	۱۳۱
انبیاء علیہم السلام اور آخرت کی یاد	۱۳۱
انبیاء علیہم السلام کے ذکر سے مقصود	۱۳۲
متقین کا انجام	۱۳۳
سرکشوں کا انجام	۱۳۴
اہلِ جنت کا اتفاق اور اہلِ جہنم کا آپس میں جھگڑا	۱۳۵
جہنمی کن لوگوں کو یاد کریں گے	۱۳۶
تفسیر	۱۳۹
اِثباتِ رسالت اور صفاتِ باری	۱۳۹
دلیلِ نبوت اور مشرکین کو تنبیہ	۱۳۹
آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم	۱۴۰
اِبلیس اَڑ گیا	۱۴۱
تخلیقِ آدم کی نسبت اللہ کے ہاتھوں کی طرف، اور اللہ کی صفاتِ متشابہات کا حکم	۱۴۲
"بشر" کی فضیلت نوع کے اعتبار سے ہے نہ کہ افراد کے اعتبار سے	۱۴۳
اصل شرف کمالاتِ رُوحانی کی وجہ سے ہوتا ہے	۱۴۴
نسب ونسل پر فخر کرنا اِبلیسی سُنت ہے	۱۴۴
اِبلیس پر پھٹکار، اور مشرکین کو واقعہ سنانے کا مقصد	۱۴۵

مضمون	صفحہ
قرآنِ کریم کی عظمت اور ڈرنے والوں پر اس کے اثرات	۱۸۰
ہدایت کس کو ملتی ہے؟ اور گمراہ کون ہوتا ہے؟	۱۸۲
جہنم میں عذاب کا تھپیڑا براہِ راست چہرے پر لگے گا	۱۸۲
کافروں کے لئے دُنیا و آخرت میں رُسوائی ہے	۱۸۳
قرآن کی زبان، اُسلوب اور مقصد	۱۸۴
''موحد'' اور ''مشرک'' کی مثال	۱۸۴
حضور ﷺ کو تسلی	۱۸۵
عقیدۂ ''حیات النبی ﷺ''	۱۸۵
منکرینِ حیات کا موقف اور اس کا رَدّ قرآن کی روشنی میں	۱۸۶
عقیدۂ ''حیات النبی'' اَحادیث کی روشنی میں	۱۸۷
''برزخ'' کی کیفیات کس طرح معلوم ہوسکتی ہیں؟	۱۸۸
''عالمِ برزخ'' کو ''عالمِ دُنیا'' پر قیاس نہیں کیا جاسکتا	۱۸۹
قرآن سے وقوعِ موت پر اِستدلال تحریف ہے	۱۸۹
بدن کی حیات کے لئے رُوح کا بدن میں ہونا ضروری نہیں	۱۹۱
تفسیر	۱۹۳
سب سے بڑا ظالم کون؟ اور اس کا انجام	۱۹۳
حق کی تصدیق کرنے والوں کا انجام	۱۹۴
شانِ نزول	۱۹۴
موحد کی شان	۱۹۵
شرک کی حقیقت	۱۹۵
نفع نقصان کا مالک صرف اللہ ہے	۱۹۶
عذاب دو قسم کے ہوتے ہیں	۱۹۸
حق واضح ہوگیا، جو چاہے اس کو اِختیار کرلے	۱۹۹
تفسیر	۲۰۱
قبضِ رُوح نیند اور موت میں	۲۰۱
اِحیائے موتی کے واقعات آیتِ بالا کے خلاف نہیں	۲۰۱
''نیند'' موت کی نظیر ہے	۲۰۲
نبی اور غیرنبی کی نیند میں فرق	۲۰۳
نبی اور غیرنبی کی موت اور حیات بعد الموت میں فرق	۲۰۴
مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی تردید اور صحیح عقیدۂ شفاعت کا اِثبات	۲۰۴
توحید کے تذکرے کے وقت مشرک کی کیفیت	۲۰۵
ضدی لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کردیجئے	۲۰۶
قیامت کے دن کفار کی بے بسی، اور اِیمان کی قدر و قیمت کا احساس	۲۰۶
مشرک کی بے صبری اور ناشکری کا شکوہ	۲۰۸
موحد و مشرک کی نظر میں فرق	۲۰۸
پہلے لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل کرو	۲۰۹
رزق کی تقسیم صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے	۲۱۰
مشرکین کی عقل کا فتور	۲۱۰
تفسیر	۲۱۲
شانِ نزول اور توبہ کی ترغیب	۲۱۲
ابھی توبہ کرلو، ورنہ بعد میں پچھتاوا ہوگا	۲۱۳
اہلِ ایمان کی کامیابی	۲۱۵
صفاتِ الٰہیہ کا بیان	۲۱۵
تفسیر	۲۱۷
غیراللہ کی عبادت جہالت کیسے ہے؟	۲۱۷

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
''شرک'' سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں	۲۱۷	دلائلِ قدرت	۲۳۸
کافروں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی	۲۱۸	اللہ جس کو چاہتے ہیں اپنا نمائندہ بناتے ہیں	۲۳۸
قدرتِ الٰہی کا بیان اور صفاتِ متشابہات کے متعلق وضاحت	۲۱۸	قیامت کے مناظر	۲۳۹
دو نفخوں کے وقت کیفیت	۲۱۹	اللہ تعالیٰ کا علم بھی کامل ہے اور قدرت بھی کامل ہے	۲۴۰
حساب و کتاب کے وقت کی کیفیت	۲۱۹	تفسیر	۲۴۲
کافروں کا انجام	۲۲۱	موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ	۲۴۳
مؤمنین کا انجام	۲۲۲	فرعونیوں کے منصوبے ناکام رہے	۲۴۴
اختتام اللہ کی حمد پر ہوگا	۲۲۲	فرعون نے قوم کا ذہن پھیرنے کی کوشش کی	۲۴۴
لفظ ''سوق'' کے دو مفہوم	۲۲۳	تفسیر	۲۴۷
سُوْرَۃُ الْمُؤْمِن	۲۲۵	''مؤمنِ آلِ فرعون'' کی فرعونیوں کو نصیحتیں	۲۴۷
تفسیر	۲۲۸	فرعون کی سیاسی چال	۲۴۹
سورت کا تعارف اور اس کی فضیلت	۲۲۸	تفسیر	۲۵۲
صفاتِ الٰہی کے ذریعے ترغیب و ترہیب	۲۳۰	دُنیا کی فنائیت کے تصوّر کا فائدہ	۲۵۲
کافروں کی خوش حالی دھوکے کا باعث نہ بن جائے	۲۳۰	عذابِ برزخ کی واضح دلیل	۲۵۳
مشرکینِ مکہ اور گزشتہ مکذبین میں مماثلت	۲۳۱	جہنمیوں کا آپس میں جھگڑا	۲۵۳
مؤمنین کی مقبولیت عند اللہ و عند الملائکہ	۲۳۲	تخفیفِ عذاب کی درخواست مردُود ہو جائے گی	۲۵۴
ایمان کے بغیر نجات ممکن نہیں	۲۳۳	تفسیر	۲۵۵
قیامت کے دن جو سختیوں سے بچ گیا وہی کامیاب ہے	۲۳۴	اللہ کی مدد دُنیا و آخرت میں انبیاء علیہم السلام اور اہلِ ایمان کے ساتھ ہے	۲۵۵
تفسیر	۲۳۶	ایک اِشکال اور اس کا جواب	۲۵۶
کافروں کو جہنم میں بدنی عذاب کے ساتھ رُوحانی عذاب بھی ہوگا	۲۳۶	ظالموں کا بُرا انجام	۲۵۷
دو موتوں اور دو زندگیوں کا اقرار اور ناکام تمنا	۲۳۷	کتاب اللہ سے فائدہ عقل والے ہی اُٹھاتے ہیں	۲۵۷
		صبر، اِستغفار اور ذِکر کی تاکید	۲۵۷
		عقیدۂ ''عصمتِ انبیاء علیہم السلام''	۲۵۸

مضمون	صفحہ
لفظِ "ذنب" کی انبیاء علیہم السلام کی طرف نسبت کیوں؟	۲۵۹
کثرتِ ذِکر کی تاکید	۲۶۰
منکرین تکبر کی وجہ سے اَڑے ہوئے تھے	۲۶۰
اِمکانِ قیامت کی دلیل	۲۶۱
وقوعِ قیامت کی مصلحت	۲۶۱
اپنی حاجات میں غیر اللہ کو پکارنا شرک کیوں ہے؟	۲۶۲
ہر دُعا قبول ہوتی ہے، لیکن قبولیت کی مختلف صورتیں ہیں	۲۶۳
کثرتِ دُعا کی تاکید اور آدابِ دُعا	۲۶۵
تفسیر	۲۶۸
آیاتِ قدرت	۲۶۸
ہر اِنسان کی اِبتدا مٹی سے کیسے ہے؟	۲۷۰
اِثباتِ معاد کے لئے تخلیقِ اوّل کا ذِکر	۲۷۰
تفسیر	۲۷۲
حق کے بارے میں جھگڑنے والوں کا انجام	۲۷۲
قیامت کے دِن معبودانِ باطلہ کا "لاشئ محض" ہونا نمایاں ہوجائے گا	۲۷۲
"فرح" اور "مرح" کا مفہوم	۲۷۳
حضور ﷺ کو تسلی اور مشرکین کو وعید	۲۷۳
انبیاء علیہم السلام کی تعداد قطعی طور پر معلوم نہیں	۲۷۴
اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی نبی معجزہ نہیں دِکھا سکتا	۲۷۴
تفسیر	۲۷۶
دلائلِ قدرت اور اِنعاماتِ الٰہی	۲۷۶
واقعات بھی انسان کے لئے بہت بڑا واعظ ہیں	۲۷۷
دُنیوی علوم کی وجہ سے اِنسان اور حیوان میں اِمتیاز نہیں ہوسکتا	۲۷۸
پُرانی بیماری آج بھی موجود ہے	۲۷۸
اِیمان لانا کب نافع نہیں؟	۲۷۹
سورۃ حٰم السجدۃ	۲۸۱
تفسیر	۲۸۴
سورت کا تعارف اور مضامین	۲۸۴
عظمتِ قرآن	۲۸۴
لفظِ "رحمٰن ورحیم" کے ذِکر کا مقصد	۲۸۴
قرآنِ کریم کے اوّلین مخاطب عربی ہیں	۲۸۵
قرآنِ کریم بشیر ونذیر ہے	۲۸۵
سماع کی نفی کرنے سے مقصود قبولیت کی نفی ہے	۲۸۶
مشرکین کی ضد اور اس کا نتیجہ	۲۸۶
مشرکین کی ضد کا جواب	۲۸۷
تفسیر	۲۹۰
توحید کی دعوت	۲۹۰
"سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ" کے دو مفہوم	۲۹۰
ہر چیز شعور رکھتی ہے	۲۹۲
تکوینی اور تشریعی اَحکام	۲۹۲
تکوینی اَحکام میں اِنسانوں کی دو قسمیں	۲۹۳
آسمان وزمین کی تخلیق اور آیات میں تطبیق	۲۹۴
پہلی قوموں کے انجام سے عبرت پکڑو	۲۹۵
قومِ عاد کا تکبر اور اس کا انجام	۲۹۶

مضمون	صفحہ
قوم ثمود کا انجام	۲۹۶
تفسیر	۲۹۸
قیامت کے دن اللہ کے دشمنوں کی حالت	۲۹۸
اعضا گواہی دیں گے	۲۹۸
جدید ایجادات نے شرعی حقائق کا سمجھنا آسان کر دیا ہے	۲۹۹
ارتکاب معصیت کی ایک وجہ علم الٰہی کا استحضار نہ ہونا ہے	۲۹۹
کفار کو نہ صبر کام آئے گا نہ توبہ قبول ہوگی	۳۰۰
کافروں کے خسارے کا فیصلہ ہو چکا ہے	۳۰۱
تفسیر	۳۰۲
قرآن کی آواز کو دبانے کے لئے مشرکین کی ایک اوچھی تدبیر	۳۰۲
قرآن کریم کو سننے کے متعلق شرعی احکام	۳۰۳
اللہ کے دشمنوں کے ٹھکانا	۳۰۳
کفر جحود کیا ہے؟	۳۰۴
کفار کا اپنے پیشواؤں پر اظہار غصہ!	۳۰۴
عقیدۂ ربوبیت کی اہمیت	۳۰۵
استقامت علی الدین والوں کے لئے انعامات	۳۰۷
ہر خواہش صرف جنت میں پوری ہوگی	۳۰۷
تفسیر	۳۱۰
داعی خود عامل ہو تبھی اثر مرتب ہوتا ہے	۳۱۰
داعی اپنے کام پر فخر بھی محسوس کرتا ہو	۳۱۱
داعی کو چاہیے کہ برائی کا بدلہ اچھائی سے دے	۳۱۲
مذکورہ اصول بچھو صفت انسانوں کے لئے نہیں ہے!	۳۱۳

مضمون	صفحہ
"صبر و تحمل" اعلیٰ ترین صفات	۳۱۴
داعی کو اللہ کی پناہ میں آنے کی تلقین	۳۱۴
مخلوق کو سجدہ جائز نہیں	۳۱۵
"سجدۂ تعظیمی" اور "سجدۂ عبادت" میں فرق	۳۱۵
سرور کائنات ﷺ نے اپنے لئے بھی سجدے کو منع کیا ہے	۳۱۶
"تقویۃ الایمان" پر غلط بیانی کی نشان دہی	۳۱۷
اب مخلوق کو سجدہ کسی بھی تاویل سے جائز نہیں	۳۱۸
اثبات معاد کے لئے احیائے ارض کا ذکر	۳۱۸
"الحاد" کا مفہوم اور "ملحدین" کے لئے وعید	۳۱۸
قرآن کی عظمت اور منکرین کا انجام	۳۱۹
تسلی رسول	۳۲۰
"خوئے بدرا بہانہ بسیار"	۳۲۰
قرآن مومنین کے لئے شفا اور کفار کے لئے باعث گمراہی ہے	۳۲۱
کافروں کی مثال	۳۲۲
تفسیر	۳۲۲
حضور ﷺ کو تسلی اور مخالفین کو تنبیہ	۳۲۲
تفسیر	۳۲۵
قیامت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے	۳۲۵
قیامت کے دن مشرکین کا حال	۳۲۶
دنیا کے اندر مشرک کا حال	۳۲۷
"کامیابی" کو اپنا کمال سمجھنا ایک دھوکا ہے	۳۲۷
خوشی اور غم کی حالت میں کافر کی دعا میں فرق	۳۲۸

مضمون	صفحہ
قرآن کے متعلق دونوں پہلو سامنے رکھ کر کفار کو دعوتِ فکر	۳۲۹
قرآن کی صداقت نمایاں ہو کر رہے گی	۳۳۰
تسلیِ رسول	۳۳۱
سُوْرَةُ الشُّوْرٰی	۳۳۳
تفسیر	۳۳۶
سورت کے مضامین اور ماقبل سے ربط	۳۳۶
وحی کی حقیقت	۳۳۶
اللہ کی صفات	۳۳۷
قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں	۳۳۷
''تسبیح'' اور ''حمد'' کا مفہوم	۳۳۷
فرشتوں کا استغفار کن کے لئے ہوتا ہے؟	۳۳۸
تسلیِ رسول	۳۳۸
''مکہ مکرمہ'' مرکزی حیثیت رکھتا ہے	۳۳۸
اللہ نے انسان کو اختیار کیوں دیا ہے؟	۳۳۹
قدرتِ الٰہی	۳۳۹
تفسیر	۳۴۲
بیوی کا ہم جنس ہونا ایک نعمت	۳۴۲
چوپایوں کے لئے بھی اللہ نے جوڑے بنائے	۳۴۲
اللہ کی صفات کو سمجھنے کے لئے ایک اہم اُصول	۳۴۲
''رزق'' کے مفہوم میں وسعت	۳۴۴
نعمت کی قدر کا احساس کس کو ہوتا ہے؟	۳۴۵
حضرت حکیم العصرؒ کے اُستاذ کا اپنے نابینا ہونے پر اللہ کا شکر	۳۴۶

مضمون	صفحہ
صبر و شکر کب نصیب ہوتا ہے؟	۳۴۶
تمام انبیاء علیہم السلام کا دین ایک ہی ہے	۳۴۷
دینِ حق سے اختلاف کی وجہ ضد ہے	۳۴۸
استقامت سب سے بڑی کرامت ہے	۳۴۸
صاف لفظوں میں اعلانِ حق کا حکم	۳۴۹
''میزان'' کا مصداق	۳۵۰
اثباتِ قیامت	۳۵۱
رزق کی وسعت کوئی کمال نہیں	۳۵۱
وسعتِ رزق کے لئے ایک بہترین وظیفہ	۳۵۲
رزق مقدر ہے	۳۵۲
اسبابِ رزق کاسۂ گدائی ہیں	۳۵۳
حصولِ رزق کے رُوحانی اسباب اور وظائف	۳۵۳
تفسیر	۳۵۵
آخرت بہترین کھیتی	۳۵۵
اللہ کی زمین پر اللہ کا ہی قانون چل سکتا ہے	۳۵۷
مکمل سزا قیامت میں ہوگی	۳۵۷
اہلِ ایمان کی خوش حالی	۳۵۸
انبیاء علیہم السلام کی تبلیغ سے مقصود دُنیا نہیں ہوتا	۳۵۸
''مودّۃ فی القربیٰ'' کا مطالبہ	۳۵۸
اللہ قدردان ہے	۳۶۰
دلیلِ نبوّت	۳۶۰
توبہ کی حقیقت اور شرائط	۳۶۱
رزق کی وسعت ہر ایک کے لئے کیوں نہیں؟	۳۶۳
دلائلِ قدرت کے ذریعے اثباتِ معاد	۳۶۴

مضمون	صفحہ	مضمون	صفحہ
تفسیر	۳۶۷	"کلام اللہ" دلوں کی حیات کا باعث ہے	۳۸۶
مصیبت کا سبب اکثر و بیشتر انسان کا اپنا بُرا عمل ہوتا ہے	۳۶۷	آپ ﷺ پہلے کتاب اور ایمان نہیں جانتے تھے	۳۸۶
ایک اِشکال	۳۶۷	قرآن نُور ہدایت	۳۸۶
پہلا جواب: "مخاطب مجرم ہیں"	۳۶۷	سُورَةُ الزُّخْرُف	۳۸۷
دُوسرا جواب: "نیک لوگوں پر حقیقتاً مصیبت نہیں آتی"	۳۶۸		
اللہ کی طرف سے درگزر زیادہ، اور گرفت کم ہوتی ہے	۳۷۱	تفسیر	۳۹۰
ایک عجیب واقعہ	۳۷۱	ماقبل سے ربط اور سورت کے مضامین	۳۹۰
کشتیوں میں دلائلِ قدرت	۳۷۲	قرآن اپنی حقانیت کے لئے خود دلیل ہے	۳۹۰
ضدی لوگوں کو تنبیہ	۳۷۳	اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ اس کی طرف سے نصیحت	
نہ دُنیا کو دوام ہے، نہ سامانِ دُنیا کو!	۳۷۳	اُترتی رہے	۳۹۱
آخرت کی لازوال نعمتیں اور اُن کے مستحق	۳۷۴	سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی اور مشرکین کے لئے وعید	۳۹۱
اہلِ جنت کی صفات	۳۷۵	اِثباتِ توحید و معاد کے لئے دلائلِ قدرت کا تذکرہ	۳۹۲
مشورے کی اہمیت و فوائد	۳۷۶	جانوروں اور کشتیوں کی تخلیق اور فوائد	۳۹۳
مشورہ کن باتوں میں ہے؟	۳۷۷	سواری کی دُعا	۳۹۴
حقیقتِ جمہوریت	۳۷۸	تفسیر	۳۹۶
بدلہ لینے کی اجازت اور اس کی حدود	۳۷۹	رَدِّ شرک	۳۹۶
معاف کرنے کی فضیلت	۳۸۰	مشرکینِ مکہ کا احمقانہ عقیدہ	۳۹۶
تفسیر	۳۸۳	نوع کے اعتبار سے عورت مرد کے مقابلے میں ناقص ہے	۳۹۷
قیامت کے دن ظالموں کی بدحالی	۳۸۳	"بیٹی" کو عار سمجھنا جاہلانہ نظریہ	۳۹۸
قیامت آنے سے قبل اپنے رَبّ کا حکم مان لو	۳۸۳	ہر وقت زیب و زینت میں مشغول ہونا ضعفِ عقل کی	
حضور ﷺ کو تسلی	۳۸۴	دلیل ہے	۳۹۹
اِنسان کی لاتعلقی کا شکوہ	۳۸۴	فرشتوں کو لڑکیاں کہنا کس دلیل پر مبنی ہے؟	۳۹۹
بیٹے یا بیٹیاں دینے والا صرف اللہ	۳۸۴	شرک کے جواز پر ایک احمقانہ شبہ اور اس کا جواب	۴۰۰
وحی کی صورتیں	۳۸۵	مشرکین کے پاس نہ عقلی دلیل ہے نہ نقلی!	۴۰۰

مضمون	صفحہ
مشرکین کا تقلیدِ آباء کا سہارا، اور ان کو پچھلی تاریخ کی یاددہانی	۴۰۱
خلاصۂ آیات	۴۰۳
تفسیر	۴۰۴
ماقبل سے ربط، تذکرۂ ابراہیم علیہ السلام اور اس کا مقصد	۴۰۴
خلاصۂ آیات	۴۰۵
مشرکین قرآن کی ناقدری کرنے والے ہیں	۴۰۶
مشرکین کا اِعتراض کہ نبوّت کسی مال دار کو کیوں نہیں ملی؟	۴۰۶
پہلا جواب: "منصبِ نبوّت محض خدائی عطیہ ہے"	۴۰۷
رزق کی تقسیم بھی اِنسان کے اختیار میں نہیں	۴۰۸
حصولِ رزق کے وسائل اور صلاحیتیں بھی غیر اختیاری ہیں	۴۰۹
دولت میں مساوات کا نظریہ فطرت سے ٹکر ہے!	۴۰۹
درجات کے تفاوت میں حکمت	۴۱۰
دُوسرا جواب: "رجل عظیم" کا معیار دولت نہیں!	۴۱۱
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۱۳
تفسیر	۴۱۴
ذکرِ رحمٰن سے اِعراض کا نتیجہ	۴۱۴
بُرے دوست آخرت میں حسرت وافسوس کا باعث	۴۱۵
جہنم کے عذاب کی تکلیف "جشن" نہیں بنے گا	۴۱۶
تسلّی رسول	۴۱۶
"وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ" کے دو مفہوم	۴۱۸
توحید کی دعوت تمام انبیاء علیہم السلام نے دی ہے	۴۱۸
تفسیر	۴۲۰
موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ اور یہاں اس کو ذکر کرنے کا مقصد	۴۲۰
مال ودولت اور عہدے کو عزّت کا معیار سمجھنا فرعونی نظریہ ہے	۴۲۱
"ہم مزاج" کی بات جلدی سمجھ میں آتی ہے	۴۲۳
تفسیر	۴۲۴
شانِ نزول	۴۲۴
ایک مناظرانہ اُصول	۴۲۴
عیسیٰ علیہ السلام کا صحیح مقام	۴۲۵
تفسیر	۴۲۹
نیک لوگوں کے لئے اِنعامات	۴۲۹
مجرمین کی بے بسی	۴۳۰
"رحمٰن" اولاد سے پاک ہے	۴۳۰
کون سفارش کرے گا؟ اور کس کی؟	۴۳۱
سُورَةُ الدُّخَان	۴۳۳
سورۂ دُخان کی فضیلت	۴۳۶
خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ	۴۳۷
تفسیر	۴۳۸
قرآن اپنی حقّانیت کی خود دلیل ہے	۴۳۸
"لیلۂ مبارکہ" کا مصداق	۴۳۹
"شبِ براءت" والی روایات اور ان کا درجہ	۴۴۰
آیات اور روایات میں تطبیق	۴۴۰
اثباتِ توحید کے لئے رُبوبیت کا تذکرہ	۴۴۲

مضمون	صفحہ
مشرکین غافل ہیں اور دُھویں کے منتظر ہیں	۴۴۲
"دُخانِ مبین" کے متعلق سیدنا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے	۴۴۲
"مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ" کی وضاحت	۴۴۳
"دخانِ مبین" کے متعلق جمہور مفسرین کی رائے	۴۴۴
دو قولوں میں تطبیق	۴۴۵
دُھویں کی کیفیت کیا ہوگی؟ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمہ اللہ کی رائے	۴۴۵
بنی اسرائیل اور قومِ فرعون کا واقعہ	۴۴۶
"زمین و آسمان کے رونے" کے دو مفہوم	۴۴۸
تفسیر	۴۵۰
بنی اسرائیل پر اِنعاماتِ خداوندی	۴۵۰
عقیدۂ آخرت کی اہمیت و حکمت اور اِثبات	۴۵۱
خلاصۂ آیات	۴۵۲
تفسیر	۴۵۴
اہلِ جہنم کا حال	۴۵۴
متقین کے لئے اِنعامات	۴۵۴
سُوْرَةُ الْجَاثِيَة	۴۵۷
تفسیر	۴۶۰
سورت کا تعارف اور اس کے مضامین	۴۶۰
عظمتِ قرآن	۴۶۰
آیاتِ توحید	۴۶۱
کفار کی ضد اور اس کا انجام	۴۶۲
تفسیر	۴۶۵
آیاتِ توحید بصورتِ اِنعام	۴۶۵
ایمان والوں کو کفار کے متعلق درگزر کرنے کی ہدایت	۴۶۶
تائید کے طور پر بنی اسرائیل کا حوالہ	۴۶۶
اب اِتباع صرف شریعتِ محمدی کی ہے	۴۶۷
اہلِ ہویٰ کی اِتباع کا کچھ فائدہ نہیں	۴۶۹
عظمتِ قرآن	۴۶۹
معاد پر عقلی دلیل	۴۶۹
عقیدۂ آخرت سے اعمال میں توازن پیدا ہوتا ہے	۴۷۱
تفسیر	۴۷۲
اتباعِ خواہشات کی مذمت اور اس کا نتیجہ	۴۷۲
زمانے کی طرف نسبت کرنے میں اللہ کے قائل اور منکر کا فرق	۴۷۴
تفسیر	۴۷۷
قیامت کے دِن مجرمین کا انجام بد اور اس کی وجہ	۴۷۷
سُوْرَةُ الْاَحْقَاف	۴۸۱
تفسیر	۴۸۴
اِثباتِ توحید	۴۸۵
"اثباتِ شرک" پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے، نہ نقلی!	۴۸۵
معبودانِ باطلہ کی بے بسی	۴۸۶
مذکورہ آیت کا "عدمِ سماعِ موتیٰ" سے کوئی تعلق نہیں!	۴۸۷
مشرکین کا "عقیدۂ سماع" کیا تھا؟	۴۸۷
اہلِ سُنت کا عقیدۂ سماع	۴۸۹
اِثباتِ رسالت	۴۹۱

مضمون	صفحہ
اللہ کے بتائے بغیر رسول کو بھی علم نہیں ہوسکتا	۴۹۲
تفسیر	۴۹۶
منکرین کی ہٹ دھرمی، اور قرآن کی عظمت	۴۹۶
اہلِ استقامت کے لئے اِنعام	۴۹۶
والدین کے حقوق ادا کرنے کی تاکید	۴۹۷
فرماں بردار اولاد کا طرزِ عمل	۴۹۸
نافرمان اولاد کا طرزِ عمل	۴۹۹
''دُنیا'' کافر کے لئے جنت اور مؤمن کے لئے جیل ہے	۵۰۰
عیش و عشرت دیکھ کر صحابہ کی گھبراہٹ	۵۰۱
تفسیر	۵۰۲
قومِ عاد کا واقعہ	۵۰۲
حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغ اور قومِ عاد کی بدسلوکی	۵۰۳
قومِ عاد کی ہلاکت	۵۰۳
کافروں نے اپنی صلاحیتیں دُنیا پر لگادیں	۵۰۴
تفسیر	۵۰۶
گزشتہ قوموں پر عذاب کے وقت ان کے آلہہ کام نہ آئے	۵۰۶
جنات کے قبولِ اسلام کا واقعہ اور اس کو ذکر کرنے سے مقصود	۵۰۷
جنات کا وجود قطعی ہے	۵۰۸
تلاوتِ قرآن کے وقت جنات خاموش ہوگئے	۵۰۸
قرآن کی حقانیت جنات کی زبانی	۵۰۸
جنات نے اِنجیل کا ذکر کیوں نہیں کیا؟	۵۰۹
جنات کا اپنی قوم کو دعوت دینا	۵۱۰
اِثباتِ معاد	۵۱۱
آخرت میں کفار کی حالت	۵۱۱
تسلیٔ رسول	۵۱۲
کافروں کو اپنی گزری ہوئی زندگی ایک گھڑی محسوس ہوگی	۵۱۲
سورۃ محمد	۵۱۳
تفسیر	۵۱۶
سورت کا مضمون اور ماقبل سے ربط	۵۱۶
کافر کے نیک اعمال اللہ کے ہاں کیوں معتبر نہیں؟	۵۱۶
''حجیتِ حدیث'' پر دلیل	۵۱۸
کافر کی نیکیاں برباد، اور مؤمن کے گناہ معاف کیوں؟	۵۱۹
کافروں کو قتل اور قید کرنے کا حکم	۵۱۹
''کافر قیدیوں'' کے بارے میں اَحکام	۵۲۰
''جہاد'' کب تک جاری رکھا جائے؟	۵۲۰
''جہاد'' کی حکمت	۵۲۱
''مجاہد'' ہر حال میں کامیاب ہے	۵۲۱
جنتی لوگ اپنا مقام خود پہچان لیں گے	۵۲۲
دِین کی مدد پر اللہ کے وعدے	۵۲۲
دِین کے اَحکام کو خوشی سے قبول نہ کرنا ایمان کے منافی ہے!	۵۲۳
گزشتہ قوموں کے اَنجام سے عبرت حاصل کرو	۵۲۳
مؤمنین کا اللہ مولیٰ ہے، کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں!	۵۲۳
تفسیر	۵۲۵
''کافر'' جانوروں کی طرح ہیں!	۵۲۵

مضمون	صفحہ
اہلِ مکہ سے زیادہ طاقتور قومیں ہلاک ہوگئیں	۵۲۶
دلیل پر چلنے والا اور خواہش پر چلنے والا، برابر نہیں ہوسکتے	۵۲۶
جنّت کے مشروبات وماکولات	۵۲۸
جہنمیوں کا مشروب	۵۲۹
''مجلسِ نبوی'' سے منافق فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے؟	
مؤمن فائدہ کیوں اُٹھاتے ہیں؟	۵۲۹
دورِ نبوی سے ہی علاماتِ قیامت کا ظہور شروع ہوگیا تھا	۵۳۰
انبیاء علیہم السلام کی لغزش پر لفظ ''ذنب'' کا اِطلاق	۵۳۱
تفسیر	۵۳۲
''محکم'' کے دو مفہوم	۵۳۲
جہاد کا حکم آنے پر منافقین اور مؤمنین کی حالت میں فرق	۵۳۳
منافقین کو حکمِ جہاد پر عمل کی ترغیب	۵۳۴
''فَهَلْ عَسَيْتُمْ إِنْ تَوَلَّيْتُمْ...الخ'' کے دو مفہوم	۵۳۵
اللہ کی لعنت کے مستحق لوگ	۵۳۶
''صلہ رحمی'' کا مفہوم اور اس کی اہمیت	۵۳۷
منافقین قرآن میں غور وخوض کیوں نہیں کرتے؟	۵۳۷
مرتدین کے لئے شیطان کی تسویل	۵۳۷
منافقین کو یہود کی صحبت برباد کرگئی	۵۳۸
موت کے وقت منافقین کی بدحالی	۵۳۹
تفسیر	۵۴۰
منافقین کا نفاق اللہ نے کھول دیا	۵۴۰
منافقین اپنے انداز سے پہچان لیے جائیں گے	۵۴۱
اللہ مجاہدین کو غیر مجاہدین سے جدا کردے گا	۵۴۲

مضمون	صفحہ
اِسلام کی حفاظت کا خدائی وعدہ	۵۴۲
مؤمنین کو اطاعت کی ترغیب اور اِبطالِ عمل کے تین مفہوم	۵۴۲
خاتمہ کفر پر ہوا تو بخشش نہیں ہوگی	۵۴۳
کفار کے ساتھ صلح کی صورتیں اور ان کا حکم	۵۴۴
''دُنیا'' کی مذمت	۵۴۵
''بخل'' کی مذمت	۵۴۵
علمائے فارس کے متعلق حدیث میں پیش گوئی	۵۴۷
''اِمام ابوحنیفہ'' پیش گوئی کا اوّلین مصداق	۵۴۷
سُورَةُ الْفَتْح	۵۴۹
تفسیر	۵۵۲
سورۂ فتح کا پس منظر، واقعۂ حدیبیہ	۵۵۲
مکہ کی طرف روانگی	۵۵۳
اُونٹنی بیٹھ گئی	۵۵۳
''حدیبیہ'' میں قیام اور معجزات کا ظہور	۵۵۳
عثمانِ غنی پیغامبر بنے	۵۵۴
سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے ''بیعت علی الموت'' اور ''بیعت'' کا مفہوم واقسام	۵۵۵
بیعت کے نتیجے میں مشرکین صلح کی طرف مائل ہوگئے	۵۵۵
بوقتِ صلح مشرکین کی ضد اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تحمل	۵۵۶
شرائطِ صلح	۵۵۷
دورانِ صلح سیدنا ابوجندل رضی اللہ عنہ کی آمد	۵۵۷
یک طرفہ شرائط سے مسلمانوں کی بے چینی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مدبرانہ جواب	۵۵۸

مضمون	صفحہ
صحابہ رضی اللہ عنہم کا کمالِ فہم اور حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا حکیمانہ مشورہ	۵۵۹
"صلح حدیبیہ" کو "فتحِ مبین" کیوں کہا گیا؟	۵۵۹
"صلح حدیبیہ" کے بعد یہود پر چڑھائی	۵۶۰
غزوۂ خیبر میں صرف شرکائے حدیبیہ داخل ہوں گے	۵۶۱
مشرکینِ مکہ کی عہد شکنی اور فتحِ مکہ کی تیاری اور اَسباب	۵۶۱
سیّدنا ابوبصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ	۵۶۲
دورانِ صلح اِسلام لانے والی ایک عورت کا واقعہ	۵۶۳
"فتحِ مکہ" کی ایک جھلک!	۵۶۴
حدیبیہ کا صلح نامہ "فتحِ مکہ" کی بنیاد بنا	۵۶۴
مسلمانوں پر سکون واطمینان کا نزول	۵۶۵
اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام	۵۶۵
سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل	۵۶۶
صلح کے نتیجے میں چار چیزوں کا خصوصیت سے ذکر	۵۶۶
"صلح حدیبیہ" اہلِ ایمان کے لئے باعثِ عزّت اور اہلِ کفر کے لئے باعثِ ذِلت	۵۶۸
حضور ﷺ کی صفاتِ عالیہ کا تذکرہ	۵۶۹
"بیعت" کی عظمت	۵۷۰
تفسیر	۵۷۲
دیہاتیوں کی بدگمانی اور حیلہ بازی	۵۷۲
بدیوں کی حیلہ بازیوں پر سزا	۵۷۲
"اَعراب" کو تنبیہ	۵۷۳
"مغفرت وتعذیب" کے موقع پر "مشیت" کو ذکر کرنے کا مقصد	۵۷۳
"شرکائے حدیبیہ" کے لئے ایک خاص اِنعامِ خداوندی	۵۷۴
"حجیتِ حدیث" پر دلیل	۵۷۵
اِنعام کے حق دار جانباز ہوا کرتے ہیں	۵۷۵
پیچھے رہ جانے والے آئندہ امتحان میں شرکت کے اہل ہیں	۵۷۵
"خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم" کے برحق ہونے پر قرآنی دلیل	۵۷۶
"معذورین" کا اِستثناء	۵۷۷
تفسیر	۵۷۹
"بیعتِ رضوان" والوں کے لئے اللہ کی رضا کا اعلان اور مغانم کثیرہ کا وعدہ	۵۷۹
حدیبیہ میں لڑائی ہوتی، تو بھی فتح مسلمانوں کی ہوتی	۵۸۰
کافروں نے مؤمنین کو مسجدِ حرام سے روکا	۵۸۱
حدیبیہ میں عدمِ قتال کی ایک مصلحت	۵۸۱
مشرکینِ مکہ کی جاہلانہ ضد اور اہلِ اسلام کا تحمل	۵۸۳
"کلمۂ تقویٰ" اور اس کے حق دار	۵۸۳
تفسیر	۵۸۵
اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا	۵۸۵
اِسلام کے غلبے کی بہترین تشریح	۵۸۶
کفار کا "ظاہری تسلط" ان کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں!	۵۸۶
انجامِ کار فتح اہلِ اسلام کے لئے ہی ہوتی ہے!	۵۸۷
"محمد رسول اللہ" قرآن میں صرف ایک جگہ ہے، اور وہ کیوں؟	۵۸۷

مضمون	صفحہ
صحابہ رضی اللہ عنہم کے اِمتیازی اوصاف: ''کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دِل''	۵۸۸
''نماز اور اِخلاص''	۵۸۸
''چہروں میں عبادت کا نُور''	۵۸۹
صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح توراۃ و انجیل میں	۵۸۹
صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت حُبِ رسول کی علامت ہے!	۵۹۰
''ذٰلِكَ'' کے مشار الیہ میں مزید دو اِحتمال	۵۹۱
عظمتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور عقیدۂ اہلِ سُنّت	۵۹۲
سُورۃ الحجرات	۵۹۳
سورت کا تعارف اور ماقبل سے ربط	۵۹۶
تفسیر	۵۹۷
اِبتدائی آیات کا شانِ نزول	۵۹۷
اسلام کے مضبوط جماعتی نظم کے لئے اہم اُصول	۵۹۸
مجلسِ نبوی میں بُلند آواز سے بولنے کی ممانعت	۵۹۸
اِیذائے نبی حبطِ اَعمال کا ذریعہ ہے!	۵۹۹
''نبی ﷺ'' کی طرح نبی کے اَحکام کی تعظیم بھی ضروری ہے!	۶۰۰
مجلسِ نبوی میں صحابہ کی کیفیت	۶۰۱
سیّدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا واقعہ	۶۰۱
حضور ﷺ سے ملاقات کا ادب	۶۰۲
جماعتی شیرازہ بندی کے لئے اہم اُصول	۶۰۳
''فاسق کی خبر'' کا حکم	۶۰۳
دِینی و دُنیوی اُمور میں حضور ﷺ کی اطاعت کی تاکید اور اس کی مختلف صورتیں	۶۰۴
صحابہ کی منقبت	۶۰۵
مؤمنین کی آپس کی لڑائی کے متعلق ہدایات	۶۰۶
تفسیر	۶۰۸
ایک دُوسرے کا مذاق اُڑانے کی ممانعت	۶۰۸
طعنہ دینے اور بُرے القاب کے ساتھ پکارنے کی ممانعت	۶۰۹
بدگمانی اور جاسوسی کی ممانعت	۶۱۰
غیبت کی ممانعت	۶۱۰
خاندانی عصبیت کی ممانعت	۶۱۲
اپنے اِیمان کا اِحسان نہ جتلاؤ بلکہ اللہ کا اِحسان سمجھو	۶۱۳
اِیمان اور اِسلام میں فرق	۶۱۴
مثال سے وضاحت	۶۱۵
سُورۃ ق	۶۱۷
سورت کا تعارف اور مضامین	۶۲۰
تفسیر	۶۲۰
کافروں کا شبہ	۶۲۱
جواب کی وضاحت	۶۲۱
مخالفینِ حق اِضطراب میں ہیں	۶۲۲
اللہ تعالیٰ کے اِنعامات اور دلائلِ قدرت	۶۲۲
اِثباتِ معاد کے لئے احیائے اَرض کا ذکر	۶۲۳

مضمون	صفحہ
مکذبین کے اَنجامِ بد پر تاریخ کی گواہی	۶۲۳
خلقِ اوّل سے معاد پر اِستدلال	۶۲۴
تفسیر	۶۲۵
اللہ کا علم محیط ہے	۶۲۵
''کراماً کاتبین'' اِنسان کے ساتھ مامور ہیں	۶۲۶
کفارۂ مجلس اور اس کی دُعا	۶۲۶
''کراماً کاتبین'' کے ''قَعِيْدٌ'' ہونے کا مفہوم	۶۲۷
موت کے وقت کی سختی کا تذکرہ	۶۲۸
موت کو بھلانا غفلت کا سبب	۶۲۸
کچھ مناظرِ قیامت	۶۲۸
جہنم کے مستحق لوگ	۶۲۹
ضال اور مضل دونوں جہنم کا ایندھن	۶۲۹
تفسیر	۶۳۱
جنت اور جہنم کی وسعت کا بیان	۶۳۱
جنت اور جہنم کو کس طرح بھرا جائے گا؟	۶۳۲
ریاضت کا مزہ تکلیف کے بعد ہوتا ہے	۶۳۲
جنت کے مستحق لوگ	۶۳۲
اِنسانی خواہشات پوری ہونے کی جگہ جنت ہے نہ کہ دُنیا	۶۳۳
عبرت کے لئے گزشتہ قوموں کی ہلاکت کا ذکر	۶۳۴
خاص اوقات میں تسبیح اور تحمید کا حکم	۶۳۵
قیامت کا تذکرہ	۶۳۵
حضور ﷺ کو تسلی اور کفار کو تنبیہ	۶۳۶

مضمون	صفحہ
سُوْرَةُ الذّٰرِیٰت	۶۳۷
تفسیر	۶۴۰
''قسم'' اور ''جوابِ قسم'' کی وضاحت	۶۴۰
''قسم'' اور ''جوابِ قسم'' میں مناسبت	۶۴۱
لفظ ''حُبُك'' کی تحقیق	۶۴۲
''منکرینِ قیامت'' کی دُنیا میں حالت	۶۴۲
''منکرینِ قیامت'' کا اُخروی اَنجام	۶۴۳
''متقین'' کا انجام اور ان کی صفات	۶۴۳
''وقتِ سحر'' کی فضیلت واہمیت	۶۴۴
زمین اور اِنسانی نفوس میں قدرت کی نشانیاں	۶۴۶
وقت کا معلوم نہ ہونا، قیامت کے نہ ہونے کی دلیل نہیں!	۶۴۶
تفسیر	۶۴۸
ابراہیم علیہ السلام کے لئے بیٹے کی خوشخبری	۶۴۸
ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کا تعجب	۶۴۹
قومِ لُوط پر عذاب	۶۵۰
فرعون، عاد اور ثمود کی سرکشی اور ہلاکت	۶۵۰
''عقیدۂ آخرت'' کو اہمیت نہ دینا نظامِ عالم کی بربادی کا سبب ہے!	۶۵۱
تفسیر	۶۵۳
دلائلِ قدرت اور اِثباتِ توحید	۶۵۳
تسلی رَسول	۶۵۳
مخالفینِ انبیاء ''صفتِ طغیان'' میں مشترک ہیں!	۶۵۳
جن وانس کی تخلیق کا مقصد	۶۵۴

مضمون	صفحہ
"عبادت" کامفہوم	۶۵۵
"اِلٰہِ حقیقی" اور "آلہۂ باطلہ" میں فرق!	۶۵۵
لفظ "ذنوب" کی وضاحت	۶۵۵
سُورَۃُ الطُّور	۶۵۷
تفسیر	۶۶۰
"کتابِ مسطور" کا مصداق کیا ہے؟	۶۶۱
"بیتِ معمور" کا تعارف	۶۶۲
قسموں میں آسمان اور سمندر کے ذِکر کا مقصد	۶۶۲
قیامت کا منظر	۶۶۲
تکذیب کرنے والوں کا انجام	۶۶۳
آخرت کے عذاب سے کُفّار کا چھٹکارا ناممکن!	۶۶۴
"متقین" پر آخرت میں اللہ کے اِنعامات	۶۶۴
"وَالَّذِیْنَ" کے دو ترکیبی اِحتمالات	۶۶۴
اہلِ جنّت کا کھانا	۶۶۵
اہلِ جنّت کی بیویاں	۶۶۵
نسبی تعلق کی وجہ سے جنّت میں درجات کی ترقّی	۶۶۵
نسب اور نسبت آخرت میں کب مفید ہوں گے اور کب نہیں؟	۶۶۶
جنّت کے میوے اور گوشت	۶۶۷
جنّت کی شراب اور اہلِ جنّت کی بے تکلفی	۶۶۸
اہلِ جنّت کے خدّام	۶۶۸
جنتیوں کا دُنیا کی مشقتوں کو یاد کرنا اور اللہ کا شکر ادا کرنا	۶۶۹
تفسیر	۶۷۱
کُفّار کی سخن سازیاں	۶۷۱
کُفّار کی سخن سازیوں کا جواب	۶۷۲
قرآن کے متعلق کافروں کا اعتراض اور اس کا جواب	۶۷۳
دلائلِ توحید	۶۷۳
خزائنِ رحمت کا مالک صرف اللہ	۶۷۴
شرکیہ عقائد کا رَدّ	۶۷۴
کُفّار کی چال بازیوں کا وبال خود اُنہی پر	۶۷۵
"ضد" لاعلاج مرض!	۶۷۵
قیامت کے دِن کُفّار کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوگا	۶۷۶
دُنیا کی تکالیف کافر کے لئے عذابِ محض اور مؤمن کے لئے تجارت ہیں	۶۷۶
دُنیوی تکالیف کے لئے تیر بہدف نسخہ	۶۷۷
سُورَۃُ النَّجْم	۶۷۹
تفسیر	۶۸۲
خلاصۂ آیات	۶۸۲
اِبتدائی آیات کا مقصد	۶۸۳
"قسم" اور "جوابِ قسم" میں مناسبت	۶۸۳
"ضلالت" اور "غوایت" میں فرق	۶۸۴
"نبی" کی ہر بات "وحی" ہونے کا مفہوم!	۶۸۵
کلامِ اِلٰہی کو لانے والے واسطوں کی توثیق	۶۸۷
جبریل علیہ السلام کی قوت اور ثقاہت	۶۸۸
جبریل علیہ السلام سے اصلی صورت میں پہلی ملاقات	۶۸۸
جبریل علیہ السلام نے پوری توجہ کے ساتھ وحی پہنچائی	۶۸۹

مضمون	صفحہ
حضور ﷺ اور جبریل علیہ السلام کا قُرب و اتصال	۶۹۰
حضور ﷺ کے مشاہدے کی توثیق	۶۹۰
دیکھنے والے پر اعتماد کرنا دُنیا کا مسلمہ اُصول ہے	۶۹۱
جبریل علیہ السلام سے دُوسری ملاقات اور "سدرۃ المنتہیٰ" کا تعارف	۶۹۱
جنت اور جہنم کا مقام	۶۹۲
"سدرۃ المنتہیٰ" کی رونق اور حُسن	۶۹۳
اللہ کی طرف سے نگاہِ پیغمبر کی ضمانت	۶۹۴
لیلۃ المعراج میں رُؤیتِ باری تعالیٰ پر بحث	۶۹۴
جنت میں رُؤیتِ باری کے ثبوت پر قرآنی دلائل	۶۹۵
دُنیا میں رُؤیتِ باری عقلاً ممکن اور شرعاً ممتنع ہے	۶۹۶
لیلۃ المعراج میں رُؤیتِ باری کی تفصیل	۶۹۶
حضرت کشمیری رحمہ اللہ کا فیصلہ	۶۹۷
خواب میں رُؤیتِ باری	۶۹۸
جنت میں رُؤیتِ باری کا ثبوت اَحادیث سے	۶۹۹
لات و عزّیٰ اور منات کی اُلوہیت پر رَدّ!	۶۹۹
لات، منات اور عزّیٰ کی وجہِ تسمیہ	۷۰۰
لات و عزّیٰ اور منات کی مُراد میں تحقیقِ لطیف	۷۰۰
اللہ اولاد سے پاک ہے	۷۰۱
"اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ" کی ماقبل کے ساتھ مناسبت	۷۰۲
معبودانِ باطلہ کا بھرپور رَدّ!	۷۰۳
تفسیر	۷۰۴
شفاعتِ حقہ اور باطلہ میں فرق	۷۰۴
کافر محض توہمات کی پیروی کرتے ہیں	۷۰۵

مضمون	صفحہ
مشرکین کا مبلغِ علم صرف دُنیا ہے	۷۰۵
آج کے مسلمان کی قابلِ افسوس حالت	۷۰۶
دُنیوی علوم کا غلبہ قیامت کی علامت	۷۰۶
اچھے اور بُرے لوگوں کا اَنجام	۷۰۷
"محسنین" کا مصداق	۷۰۸
"صغیرہ" اور "کبیرہ" گناہ کی پہچان	۷۰۹
گناہ پر مایوسی اور نیکی پر اِترانا دونوں ہی غلط	۷۱۰
تفسیر	۷۱۲
شانِ نزول	۷۱۳
اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرنے والوں کے خیالات	۷۱۳
موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں مذکور مضامین	۷۱۴
"اَلَّا تَزِرُ وَازِرَۃٌ" پر ایک اِشکال اور اس کا جواب	۷۱۴
"اِلَّا مَا سَعٰی" میں "سعیِ ایمانی" مُراد ہے	۷۱۵
دو اہم مسئلے!	۷۱۵
پہلا مسئلہ: کمیونسٹوں کا "اِلَّا مَا سَعٰی" سے اِستدلال اور اس کا جواب	۷۱۶
کیا قرآن کو سمجھنے کے لئے "کارل مارکس" جیسے یہودیوں کی ضرورت ہے؟	۷۱۷
مسئلہ ایصالِ ثواب کی تفصیل	۷۱۸
آیتِ بالا ایصالِ ثواب کے منافی نہیں: پہلی توجیہ	۷۱۸
دُوسری توجیہ	۷۱۹
اِبراہیمی اور موسوی صحیفوں کے مضامین اور قدرتِ الٰہی کا بیان	۷۲۰
ہلاک شدہ قوموں کا تذکرہ اور اس کا مقصد	۷۲۱

مضمون	صفحہ
کفارِ مکہ کو تنبیہ	۷۲۱
سورۂ نجم کا سجدہ اور اس پر عجیب واقعہ	۷۲۲
سُورَةُ الْقَمَر	۷۲۳
تعارفِ سورت اور ماقبل سے ربط	۷۲۶
تفسیر	۷۲۶
واقعۂ شقِ قمر	۷۲۷
غلط فہمی کا اِزالہ	۷۲۷
"شقِ قمر" کا مشاہدہ ایک ہندو راجہ نے بھی کیا	۷۲۸
جدید سائنس اور "شق القمر" کی تصدیق	۷۲۸
"شقِ قمر" قُربِ قیامت کی دلیل کیسے ہے؟	۷۲۹
معجزات کے انکار کے لئے مشرکین کے بہانے	۷۲۹
"كُلُّ أَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ" کے دو مفہوم	۷۲۹
گزشتہ واقعات تنبیہ کے لئے کافی وافی ہیں	۷۳۰
ضدی کافر کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوتے	۷۳۰
قیامت کے مختلف مناظر	۷۳۰
آنے والے واقعات کا ماقبل سے ربط	۷۳۱
قومِ نُوح کا نُوح علیہ السلام کے ساتھ سلوک	۷۳۱
نُوح علیہ السلام کی دُعا	۷۳۱
قومِ نُوح کا انجام	۷۳۲
لفظ "مُدَّكِر" کی صرفی تحقیق	۷۳۳
قرآنِ کریم نصیحت اور حفظ کے لئے آسان ہے!	۷۳۳
قومِ عاد کا انجام	۷۳۴

مضمون	صفحہ
تفسیر	۷۳۶
قومِ ثمود کا واقعہ	۷۳۶
اِقتدار کا نشہ قبولِ حق سے رُکاوٹ	۷۳۶
قومِ ثمود پر آزمائش	۷۳۷
اس کنویں کا تعارف جہاں سے ناقہ پانی پیا کرتی تھی	۷۳۸
ناقہ پر حملہ اور قومِ ثمود کا انجام	۷۳۸
قومِ لُوط کا واقعہ	۷۳۹
"يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ" کا صحیح مفہوم	۷۴۰
تفسیر	۷۴۲
آلِ فرعون کا انجام	۷۴۲
کفارِ مکہ کو تنبیہ	۷۴۲
قیامت کی سختی اور مجرمین کی حالت	۷۴۳
عذاب جلدی مانگنے والوں کو تنبیہ	۷۴۳
متقین کا انجام	۷۴۴
سُورَةُ الرَّحْمٰن	۷۴۵
سورۂ رحمٰن کی فضیلت	۷۴۸
ایک ہی آیت کو مکرر لانے میں حکمت	۷۴۹
ایک اِشکال اور جواب	۷۴۹
تفسیر	۷۵۰
"رحمٰن" ایک عظیم اسمِ باری	۷۵۰
تعلیمِ قرآن اللہ کی رحمت کا مظہرِ عظیم ہے	۷۵۰
"بیان" بھی نعمت، لیکن تعلیمِ قرآن سب سے بڑی نعمت!	۷۵۱

مضمون	صفحہ
"سورج اور چاند" میں انعام اور قدرت کے پہلو	۷۵۱
"نجم و شجر" بھی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں	۷۵۱
آسمان کی رفعت کا اور میزان کا ذکر	۷۵۲
زمین اور اس سے حاصل ہونے والی نعمتوں کا ذکر	۷۵۲
اِنسان اور جن کی تخلیق کا ذکر	۷۵۳
تمام جہات کا مالک اللہ ہے	۷۵۳
میٹھے اور کھاری دریا اور ان کے فوائد	۷۵۴
کشتیوں میں اِنعام کے پہلو	۷۵۴
تفسیر	۷۵۶
اسمائے حسنیٰ میں سے چند اسم اعظم	۷۵۶
حاجت روا صرف اللہ!	۷۵۶
جن و انس کے حساب کا ذکر	۷۵۷
حکومتِ الٰہیہ کی وسعت	۷۵۷
کفار اِنس و جن پر اللہ کا عذاب، اور "نحاس" کا مصداق	۷۵۸
قیامت کے دن کے کچھ حالات اور مجرمین کا انجام	۷۵۹
تفسیر	۷۶۲
متقین کے لئے دو جنتیں اور ان کے خوبصورت مناظر	۷۶۲
متقین کی جنتی بیویاں	۷۶۳
"اصحاب الیمین" کی جنت کے مناظر	۷۶۳
"اَصحاب الیمین" کی بیویاں اور عورت کی اصل حیثیت	۷۶۴
"عورت گھر کی ملکہ!" ...... اور اس کو "آزادی" کے نام پر دھوکا!	۷۶۴
جنتیوں کی محفل	۷۶۶

مضمون	صفحہ
سورۃ الواقعۃ	۷۶۷
سورۃ کا تعارف اور فضیلت	۷۷۰
تفسیر	۷۷۱
قیامت یقینی ہے	۷۷۱
قیامت کے دن پستی و بلندی کا معیار!	۷۷۱
اَحوالِ قیامت	۷۷۲
قیامت کے دن لوگوں کی تین قسمیں	۷۷۲
اوّلین اور آخرین کے مصداق میں تین اقوال	۷۷۳
سابقین اور اَوّلین کے لئے جنت کی نعمتیں	۷۷۴
اہلِ جنت کی مجلس کا نقشہ	۷۷۴
جنت مرد و عورت دونوں کی فطرت کی تکمیل کا مقام ہے!	۷۷۶
عورت کی دُرست فطرت!	۷۷۶
عورت کے لئے جنت کی نعمتوں کا الگ ذکر کیوں نہیں؟	۷۷۶
جنتی عورت کا حسن و جمال	۷۷۷
جنت میں کسی قسم کی خرافات نہیں ہوں گی	۷۷۷
"اَصحابِ یمین" کے لیے جنت کی نعمتیں	۷۷۸
تفسیر	۷۸۲
"اَصحابِ شمال" کی بدحالی	۷۸۲
"اَصحابِ شمال" عذاب میں کیوں ہوں گے؟	۷۸۲
جہنم میں جہنمیوں کی غذا	۷۸۳
اِثباتِ توحید و معاد کے لئے تخلیقِ اِنسانی کا ذکر	۷۸۴
موت اور فنا میں قدرت کے نمونے	۷۸۴
کھیتی کے نظام میں قدرت کے نمونے	۷۸۵

مضمون	صفحہ
پانی کے نظام میں قدرت کے نمونے	۷۸۵
آگ میں قدرت کے نمونے	۷۸۶
تسبیح کا حکم	۷۸۷
مذکورہ آیت کی تلاوت کے وقت مستحب عمل	۷۸۷
تفسیر	۷۸۸
قرآنِ کریم کی حقانیت	۷۸۸
مسِ مصحف کے لئے طہارت کا حکم	۷۸۹
منکرینِ قرآن کا معاندانہ رویّہ	۷۹۰
اثباتِ معاد کے لئے بوقتِ موت انسان کی بے بسی کا ذکر	۷۹۱
تین گروہوں کا دوبارہ تذکرہ	۷۹۱
سُورَۃُ الحَدِید	۷۹۳
تفسیر	۷۹۶
سورت کا تعارف	۷۹۶
ہر چیز ہر وقت اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے	۷۹۷
تسبیح اور تحمید کا مفہوم	۷۹۷
صفاتِ باری تعالیٰ کا تذکرہ اور اس سے مقصود	۷۹۷
ایمانِ کامل اور اِنفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب	۷۹۸
رؤف ورحیم میں فرق، اور ان کو ذکر کرنے کا مقصد	۸۰۰
فتح مکہ سے پہلے اسلام قبول کرنے والے صحابہ کی فضیلت	۸۰۰
صحابہ رضی اللہ عنہم کی ساری جماعت مغفور ہے	۸۰۱
تفسیر	۸۰۳
قرضِ حسن کا مفہوم	۸۰۳
''ایمان، انفاق اور جہاد'' آخرت میں نُور کا ذریعہ	۸۰۴
منافقوں کا نُور سے محروم رہنا اور دیوارِ اَعراف کا ذکر	۸۰۴
منافقین کی محرومی کی وجوہات	۸۰۵
منافق وکافر انجامِ کار یکساں	۸۰۶
منافقین کو اِخلاص کی ترغیب	۸۰۶
قرآن مُردہ دِلوں کے لئے رُوحانی بارش	۸۰۷
تفسیر	۸۰۹
دُنیوی زندگی محض ایک کھیل تماشا	۸۰۹
اِنسانی زندگی کے تین اَدوار اور تین ترجیحات	۸۱۰
مغفرت اور جنّت حاصل کرنے کی ترغیب	۸۱۱
اِنسان کی غفلت کے دو بنیادی سبب اور ان کا علاج	۸۱۱
عقیدۂ تقدیر کی اہمیت اور اس کا مفہوم	۸۱۲
''متکبر'' اللہ کا مبغوض!	۸۱۳
امانت داری کا تقاضا...... اِنفاق فی سبیل اللہ	۸۱۳
دولت متحرک چیز ہے	۸۱۴
کتاب، میزان، اور لوہے کو اُتارنے کا مقصد	۸۱۴
تفسیر	۸۱۶
بعض انبیاء اور اُن کی اولاد کا اجمالی تذکرہ	۸۱۶
عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت اور اُمتِ محمدیہ میں ایک فرق	۸۱۷
''رَہبانیت'' کا مفہوم اور اس کی اِبتدا	۸۱۷
اِسلام میں ''رَہبانیت'' نہیں ہے!	۸۱۸
اہلِ کتاب کو ایمان پر دُگنے اَجر کا وعدہ	۸۱۹

***

سُورَةُ الصَّٰٓفَّٰتِ

آیاتھا ۱۸۲ ۳۷ سُوْرَۃُ الصّٰفّٰتِ مَکِّیَّۃٌ ۵۶ رکوعاتھا ۵

سورۂ صافات مکہ میں نازل ہوئی، اس میں ایک سو بیاسی آیتیں ہیں، پانچ رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا ۙ﴿۱﴾ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا ۙ﴿۲﴾

قسم ہے ان فرشتوں کی جو کہ خوب اچھی طرح سے قطار باندھنے والے ہیں ① پھر ان فرشتوں کی جو کہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے والے ہیں ②

فَالتّٰلِیٰتِ ذِکْرًا ۙ﴿۳﴾ اِنَّ اِلٰـہَکُمْ لَوَاحِدٌ ؕ﴿۴﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

پھر ان فرشتوں کی جو تلاوت کرنے والے ہیں ذکر کی ③ تمہارا اِلٰہ ایک ہی ہے ④ وہ رَبّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو

بَیْنَہُمَا وَرَبُّ الْمَشَارِقِ ؕ﴿۵﴾ اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِۣ الْکَوَاکِبِ ۙ﴿۶﴾ وَ

ان دونوں کے درمیان میں ہیں، اور مشرقوں کا رَبّ ہے ⑤ مزین کیا ہم نے قریب والے آسمان کو زینت کے ساتھ یعنی ستاروں کے ساتھ ⑥ اور

حِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ ۚ﴿۷﴾ لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی وَیُقْذَفُوْنَ

ہم نے اس آسمان کی خوب اچھی طرح سے حفاظت کی ہر سرکش شیطان سے ⑦ کان نہیں لگا سکتے یہ شیاطین ملأ اعلیٰ کی طرف اور مارے جاتے ہیں یہ

مِنْ کُلِّ جَانِبٍ ﴿۸﴾ۖ دُحُوْرًا وَّلَہُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ ۙ﴿۹﴾ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَۃَ

ہر جانب سے ⑧ دفع کرنے کے لئے، ان کے لئے دائم رہنے والا عذاب ہے ⑨ مگر جو کوئی شیطان اُچک لے کوئی بات

فَاَتْبَعَہٗ شِہَابٌ ثَاقِبٌ ﴿۱۰﴾ فَاسْتَفْتِہِمْ اَہُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا ؕ

پھر پیچھے لگ جاتا ہے اس کے چمکتا ہوا ایک شعلہ ⑩ ان سے پوچھئے کیا یہ زیادہ سخت ہیں از روئے پیدا کرنے کے یا وہ مخلوق جن کو ہم نے پیدا کیا؟

اِنَّا خَلَقْنٰہُمْ مِّنْ طِیْنٍ لَّازِبٍ ﴿۱۱﴾ بَلْ عَجِبْتَ وَیَسْخَرُوْنَ ﴿۱۲﴾۪ وَاِذَا ذُکِّرُوْا

بے شک ہم نے پیدا کیا اُن کو چپکتی مٹی سے ⑪ بلکہ تو تعجب کرتا ہے، اور وہ مذاق اُڑاتے ہیں ⑫ اور جب نصیحت کیے جاتے ہیں تو

لَا یَذْکُرُوْنَ ﴿۱۳﴾۪ وَاِذَا رَاَوْا اٰیَۃً یَّسْتَسْخِرُوْنَ ﴿۱۴﴾۪ وَقَالُوْٓا اِنْ ہٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ﴿۱۵﴾ۚۖ

وہ نصیحت نہیں حاصل کرتے ⑬ اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو مذاق اُڑاتے ہیں ⑭ اور کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو ⑮

ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ ۝١٦ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ۝١٧

کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے اور ہڈیاں ہوجائیں گے، تو کیا ہم البتہ اُٹھائے جائیں گے؟ ⑯ کیا ہمارے پہلے آباء بھی؟ ⑰

قُلْ نَعَمْ وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ ۝١٨ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝١٩ وَ

آپ کہہ دیجئے ہاں! اور تم ذلیل ہونے والے ہوگے ⑱ پس وہ ایک ہی ڈانٹ ہے پس اچانک وہ جھانکنے لگ جائیں گے ⑲ اور

قَالُوْا يٰوَيْلَنَا هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ ۝٢٠ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ ۝٢١

پکاریں گے ہائے ہماری خرابی! یہ جزا کا دن ہے ⑳ یہی ہے فیصلے کا دن جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے ㉑

تفسیر

مکی سورتوں کے مضامین

اس سورت کے ''مکی'' ہونے کی وجہ سے مضامین میں تو کوئی خاص فرق نہیں، جس طرح سے ''مکی'' سورتوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دین کی اُصولی باتیں بیان فرمائی ہیں، اسی طرح سے اس سورت میں بھی اُصولی باتوں کا ہی ذکر ہے۔ اُصولی باتوں میں سرفہرست توحید کا مسئلہ ہوتا ہے، اور اسی طرح سے سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا ذکر، اور پھر معاد کا ذکر یعنی مرنے کے بعد جی اُٹھنے کا۔ توحید کی مناسبت سے ساتھ ساتھ رَدِّ شرک، اور رسالت کے بارے میں جس قسم کے ان کے شبہات ہوتے ہیں اُن کا اِزالہ، معاد کے بارے میں جو اُن کے اِشکالات ہیں ان کے جوابات، اور پھر اِن اُصولوں کی تائید کے لئے انبیاء علیہم السلام کے واقعات، جو انہی باتوں پر مشتمل ہوا کرتے ہیں، اور ترغیب اور ترہیب کے سلسلے میں دُنیوی اور اُخروی عذابوں کا ذکر۔ یہ ہیں بنیادی اور اُصولی باتیں، جو عام طور پر اللہ تبارک وتعالیٰ ''مکی'' سورتوں میں بیان کرتے ہیں۔

ملائکہ اور جنوں کی اُلوہیت کا رَدّ

اور یہ بات آپ نے بارہا پڑھ لی اور سُن لی کہ مشرکینِ مکہ جن کو اللہ کے ساتھ شریک ٹھہراتے تھے اُن میں فرشتے سرِفہرست ہیں، ملائکہ کو وہ اللہ کی بنات قرار دیتے تھے کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اور اللہ کے چہیتے ہیں، جس کی بنا پر اُن کی پُوجا کرتے تھے، ان کی دہائی دیتے، ان کو اپنی مشکلات میں پکارتے، ان کے نام پر نذر ونیاز دیتے، اور اُن کی مناسبت سے بعضے بت تراش کر کے اُن کے ساتھ عبادت والا معاملہ کرتے تھے، تو ملائکہ اُن کے آلہہ کے اندر سرفہرست ہیں۔ اور اسی طرح سے جنوں کی بھی وہ عبادت کرتے تھے خوف کے مارے، کہ اگر ہم ان کے نام پہ چڑھاوے نہیں چڑھائیں گے، یا ان کا وظیفہ نہیں پڑھیں گے، نذر ونیاز نہیں دیں گے، تو یہ پھر ہمیں نقصان پہنچائیں گے۔ چنانچہ اپنی اولاد میں سے بھی بعض کو انہی جنوں کے نام پہ قربان کر دیا

کرتے تھے، تاکہ باقی اولاد بچی رہے۔ اس سورت میں خصوصیت کے ساتھ ملائکہ کی اُلوہیت کو رَدّ کیا گیا ہے، شرک کا یہ پہلو جو مشرکین کے اندر زیادہ موجود تھا اس سورت میں اس کی تردید کی گئی ہے، یہ ظاہر کیا گیا ہے کہ فرشتے اللہ کے بندے ہیں، اور وہ اللہ کی تسبیح پڑھنے والے ہیں، اللہ کے سامنے ہر وقت دست بستہ، صف بستہ کھڑے رہتے ہیں اللہ کا حکم سننے کے لیے، ہر وقت اللہ کے ذکر میں مشغول رہتے ہیں، تو وہ آلہہ نہیں، نہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ اُلوہیت میں شریک ہیں، کسی قسم کی اُلوہیت ان کے لیے ثابت نہیں، نہ وہ اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ اللہ کی مخلوق ہیں، عباد مکرمون ہیں۔ پھر جس قسم کے عقیدے تم نے تراش رکھے ہیں وہ باتیں نہیں ہیں، نہ وہ اللہ تعالیٰ کے چہیتے ہیں نہ اللہ سے کوئی بات منوا سکتے ہیں، اور نہ اللہ کی مرضی معلوم کیے بغیر کوئی زبان ہی ہلا سکتے ہیں ...... اور اسی طرح سے جنوں کو بھی وہ عالم الغیب سمجھتے تھے، کہ یہ ملأ اعلیٰ پر جاتے ہیں، اور جا کے وہاں سے کوئی باتیں معلوم کرلاتے ہیں، یہ کہانت کا سلسلہ ان میں تھا، غیب کی باتیں معلوم کرنے کا جنوں سے رابطہ قائم کر کے۔ اس وجہ سے بھی وہ ان کی قدر کرتے تھے کہ ان کے ذریعے سے غیب کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ نے ابتدائی آیات میں اس کو بھی رَدّ کیا ہے کہ جن ملأ اعلیٰ کی طرف نہیں جاسکتے، وہاں سے باتیں سُن کے نہیں لا سکتے، اگر کوئی جانے کی کوشش کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے انہی ستاروں میں سے یہ انتظام کیا ہوا ہے، کہ ان سے کوئی آتشیں گولہ "شہابِ ثاقب" جسے کہتے ہیں، وہ نکلتا ہے، اور ان جنوں کے اُوپر برستا ہے، جس سے ان جنوں کو ہلاک کر دیا جاتا ہے، اس لیے یہ تمہارا خیال بھی غلط ہے، کہ یہ غیب کی باتیں اُوپر جا کے معلوم کرلاتے ہیں۔ یہ دو پہلو اس میں زیادہ تر زیرِ بحث ہیں۔

فرشتوں کی قسم اور جوابِ قسم میں مناسبت

وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا: صافات، یہ لفظ صف سے لیا گیا ہے، قطار بنانا۔ اور الصّٰفّٰتِ: صفت کا صیغہ ہے، اس کا موصوف ملائکہ ہیں۔ واؤ قسمیہ ہے، اور قرآنِ کریم میں جو قسمیں آیا کرتی ہیں زیادہ تر ان کے اندر شہادت والا پہلو ہوتا ہے، کہ جس چیز کی قسم کھائی جائے وہ مابعد والے مضمون کے لئے ایک قسم کی شہادت ہوتی ہے، گواہی ہوتی ہے۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ بعض چیزوں کی عظمت کو ظاہر کرنے کے لئے بھی اُن کو قسم کے مقام میں ذکر کرتے ہیں۔ بعض کے فوائدِ کثیرہ کی طرف اشارہ کرنے کے لئے ان کو قسم کے مقام میں ذکر کرتے ہیں۔ اور بعض جگہ قسم کا مضمون مابعد والے مضمون کے لیے ایک گواہی اور شہادت کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے۔ تو یہاں یہ مابعد والے مضمون کے لئے بطورِ شہادت کے ہے۔ اور جوابِ قسم آئے گا: اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ: تمہارا معبود ایک ہی ہے۔ اور اس معبود کے ایک ہونے پر فرشتوں کے حالات بھی دلالت کرتے ہیں، وہ فرشتے جن کو تم اپنی جگہ الٰہ سمجھے بیٹھے ہو۔ یہ مفہوم ہو جائے گا قسموں کا، اور جوابِ قسم کا۔

وَالصّٰفّٰتِ صَفًّا: قسم ہے ان فرشتوں کی جو کہ قطار باندھنے والے ہیں۔ صَفًّا یہ مفعول مطلق آ گیا بطور تاکید کے، خوب اچھی طرح سے قطار باندھنے والے ہیں۔ فَالزّٰجِرٰتِ زَجْرًا: پھر ان فرشتوں کی جو کہ ڈانٹ ڈپٹ کرنے والے ہیں، یعنی شیاطین کو۔ فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا: پھر اُن فرشتوں کی قسم جو کہ تلاوت کرنے والے ہیں ذکر کی، یادِ خدا کو ہر وقت پڑھتے ہیں، ان آیات کو پڑھتے ہیں جو

یادِ الٰہی پر دلالت کرتی ہیں۔ اور اگر ''ذِکر'' سے نصیحت مراد لے لی جائے تو پھر بھی ٹھیک ہے کہ اللہ کی طرف سے جو آیات بطور نصیحت کے اُترتی ہیں ان کو پڑھتے ہیں، اللہ کی طرف سے لے کے آتے ہیں، انبیاء علیہم السلام کے سامنے تلاوت کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر وقت وہ ذِکر اذکار میں لگے رہتے ہیں، انہی باتوں کا ذِکر آگے آیات میں بھی آئے گا، مثلاً صافات کے اندر جو فرشتوں کی صف کا ذِکر کیا گیا تو آگے (آخر سورت میں) جبریل علیہ السلام کی کلام میں لفظ آئے گا: وَمَا مِنَّاۤ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ۝ وَّ اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ: ہم میں سے ہر ایک کا ایک مرتبہ متعین ہے، اور ہم سب قطاریں باندھنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے صف بستہ رہتے ہیں۔ تو صافون کا ذِکر بھی آ گیا۔ اور اسی طرح سے آگے مسبحون کا ذِکر بھی ہے، وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ کہ ہم اس کی تسبیح بیان کرنے والے ہیں، تو وہ بھی فَالتّٰلِيٰتِ ذِكْرًا یعنی تلاوتِ ذِکر ہے، اور شیطانوں کو رجم کرنے کا ذِکر تو متصل آیات میں آ رہا ہے۔ تو فرشتے جن کی یہ کیفیت ہے کہ ہر وقت اللہ کے سامنے صف بستہ ہیں، دست بستہ ہیں، ہر وقت اس کے حکم کے منتظر ہیں کہ کیا حکم اللہ کی طرف سے آتا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے مخالفین یعنی شیاطین، جن، اُن کو فرشتے ہر وقت ڈانٹ ڈپٹ کرنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کی یاد کو ہر وقت پڑھنے والے ہیں، ذِکر کی تلاوت کرنے والے ہیں، تو ان فرشتوں کے حالات اس بات کے اوپر گواہ ہیں کہ یہ فرشتے آلہہ نہیں، اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ: تمہارا الٰہ ایک ہی ہے۔ تو فرشتے کے حالات بھی اس بات کے اوپر دلالت کرتے ہیں، یعنی جن کے ایک ایک حال سے نمایاں ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، بدبختو! تم نے انہی کو ہی اللہ کا شریک بنا لیا؟ اس مضمون کی غایت یہ نکلے گی۔

''مشرق، مشارق اور مشرقین'' میں فرق

رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا: وہ ربّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو کہ ان دونوں کے درمیان میں ہیں۔ وَرَبُّ الْمَشَارِقِ: یہاں صرف ''مشارق'' کا ذِکر آیا۔ قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ''مشارق'' اور ''مغارب'' دونوں کا ذِکر آیا ہے۔[1] اور کئی جگہ اس کو تثنیہ کے طور پر ذِکر کیا ہوا ہے، رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ (سورۂ رحمٰن: ۱۷)۔ مشارق، مشرق کی جمع ہے، طلوع کرنے کی جگہ۔ اگر مشارق سے سورج کے ہی مشارق مراد لیے جائیں، تو بھی ٹھیک ہے۔ کیونکہ سورج ہر روز نئی جگہ سے طلوع کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دن بدلتے ہیں بڑے چھوٹے ہوتے ہیں، فصلوں میں فرق پڑتا ہے، تو مشارق، اور مقابلۃً لفظ مغارب آ جائے گا، جو مشرقوں اور مغربوں کا ربّ ہے۔ اور مشرقین اور مغربین جو تثنیہ آیا ہے تو وہاں سے سردی اور گرمی کے دو مشرق مراد ہو جائیں گے، کیونکہ سردی اور گرمی میں دونوں مشرق ممتاز ہوتے ہیں، یعنی اگرچہ ہر روز مشرق بدلتا ہے، لیکن ہر روز بدلتا ہوا مشرق عام آدمی محسوس نہیں کر سکتا، لیکن ان دو موسموں میں سورج کے طلوع اور غروب کی جگہ کا فرق بہت نمایاں ہوتا ہے، اس لیے تثنیہ کے ساتھ بھی ذِکر کر دیا...... ورنہ مشارق سے عام ستاروں کے مشارق بھی مراد لئے جا سکتے ہیں، ستاروں کے طلوع ہونے کی جگہ (مظہری، آلوسی)، مقابلۃً مغارب خود معلوم ہو جائے گا۔ آسمانوں کا زمین کا اور ان چیزوں کا ربّ ہے جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، اور مشرقوں اور مغربوں کا ربّ ہے۔ جس کی رُبوبیت اتنی عام ہے، رُبوبیت تامہ اور عامہ، وہی تمہارا الٰہ ہے۔

(۱) فَلَاۤ اُقْسِمُ بِرَبِّ الْمَشٰرِقِ وَالْمَغٰرِبِ (سورۂ معارج۔ پ ۲۹)

"ستارے" آسمان کی زینت کیسے ہیں؟

اِنَّا زَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِزِیْنَۃِ الْکَوَاکِبِ: اَلْکَوَاکِبِ یہ زینۃ سے بدل ہے۔ دُنیا کا لفظ دنا یدنو سے ہے، قریب ہونا، اور یہ ادنی کا مؤنث ہے، سماء کا لفظ مؤنث ہے تو اس کی صفت بھی مؤنث آگئی، قریب والا آسمان، جس کو "آسمانِ دُنیا" کہا جاتا ہے، یہ قریب والا آسمان ہے۔ چونکہ "سبع سماوات" کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے اور احادیث میں تفصیل بیان کی گئی کہ سات آسمان اوپر نیچے ہیں تو سب سے نیچے والا آسمان زمین والوں کے قریب ہے، اس لیے اس کو "سمائے دُنیا" سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ "مزین کیا ہم نے، سجایا ہم نے، آراستہ کیا ہم نے قریب والے آسمان کو زینت کے ساتھ یعنی ستاروں کے ساتھ" الکواکب یہ زینۃ سے بدل ہے۔ یعنی یہ ستارے اگرچہ آسمان میں گڑے ہوئے نہیں، جیسے ایک دن آپ کی خدمت میں یہ تفصیل عرض کی تھی کہ ستارے نیچے فضا میں ہیں، لیکن جب آپ نیچے سے اُوپر کو دیکھتے ہیں، تو یہ آسمان کی طرف ہی زینت معلوم ہوتی ہے، اس لیے آسمان کو مزین قرار دے دیا گیا ان ستاروں کے ساتھ۔ جیسے چھت کے اندر کوئی چیزیں پیوست کردی جائیں تو بھی وہ چھت کی زینت ہیں، اور نیچے لٹکی ہوئی ہوں، درمیان کے اندر زینت کا سامان لٹکا ہوا ہو، ہمارے سر کے اُوپر ہو، تو جب یوں اوپر دیکھیں گے تو چھت ہی مزین نظر آئے گی، اور یہی حال ہے آسمانِ دُنیا کا ستاروں کے ذریعے سے مزین کرنے کا، کہ اگرچہ وہ ستارے فضا میں ہیں لیکن جب ہم اُوپر کو دیکھتے ہیں تو آسمان مزین نظر آتا ہے۔

جن و شیاطین کی ذِلّت کا تذکرہ اور اس کا مقصد

وَحِفْظًا مِّنْ کُلِّ شَیْطٰنٍ مَّارِدٍ: حفظا یہ مفعول مطلق ہے فعل محذوف کا حَفِظْنٰهَا حِفْظًا، ہم نے اس آسمان کی خوب اچھی طرح سے حفاظت کی ہر سرکش شیطان سے، مارد: سرکش کو کہتے ہیں، ہر سرکش شیطان سے ہم نے اس آسمان کی حفاظت کی، کوئی شیطان اُوپر آسمان پہ نہیں جاسکتا۔ لَا یَسَّمَّعُوْنَ اِلَی الْمَلَاِ الْاَعْلٰی: کان نہیں لگاسکتے یہ شیاطین ملأ اعلیٰ کی طرف، سننے کی کوشش نہیں کرسکتے، نہیں سُن سکتے، کان نہیں لگاسکتے ملأ اعلیٰ کی طرف۔ وَیُقْذَفُوْنَ مِنْ کُلِّ جَانِبٍ ۝ دُحُوْرًا: دُحُوْرًا مفعول لہٗ ہے یُقْذَفُوْنَ کا۔ مارے جاتے ہیں یہ ہر جانب سے دفع کرنے کے لئے، تو مفعول لہٗ بنائیں گے تو ترجمہ یوں ہوگا "دفع کرنے کے لیے ان کو ہر طرف سے مارا جاتا ہے دھکے دیے جاتے ہیں۔" اور اگر اس کو مدحورین کے معنی میں کرکے یُقْذَفُوْنَ کی ضمیر سے حال واقع کرلیا جائے تو بھی مفہوم صاف ہے "مارے جاتے ہیں یہ ہر جانب سے اس حال میں کہ یہ دھتکارے ہوئے ہوتے ہیں، پھٹکارے ہوئے ہوتے ہیں"۔ یہ تو دُنیا میں ذِلّت ہے جو ان شیاطین کو ملتی ہے، جن کی یہ مشرکین پوجا کرتے ہیں، وہ اس قسم کے ذلیل ہیں کہ اُوپر کو جانے کی کوشش کرتے ہیں تو فرشتوں کی طرف سے دھکے پڑتے ہیں۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ وَّاصِبٌ: واصب: دائم۔ جیسے قرآنِ کریم میں دوسری جگہ ہے وَلَهُ الدِّیْنُ وَاصِبًا (سورۂ نحل: ۵۲) تو وَاصِبًا: دائمًا کے معنی میں ہے۔ عَذَابٌ وَّاصِبٌ: دائمی عذاب۔ ان کے لیے دائم رہنے والا عذاب ہے، یعنی آخرت میں بھی یہ معذب ہوں گے۔ کہاں یہ تمہارے آلہہ، اور تم ان کو شرکاء سمجھتے ہو، اور کہاں دُنیا اور آخرت میں ان کے حصے میں یہ ذِلّت آئی ہے۔ اِلَّا مَنْ خَطِفَ الْخَطْفَۃَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ ثَاقِبٌ: مگر جو کوئی شیطان اُچک لے کوئی بات (خطفۃ بات کو کہیں گے جو

اُچک لی جائے، جس طرح کوئی چوری چھپے کوئی بات چرا لیتا ہے)، پھر پیچھے لگ جاتا ہے اس کے ایک چمکتا ہوا شعلہ۔ شہاب: شعلہ۔ ثاقب: چمکتا ہوا۔ چمکتا ہوا شعلہ اس کے پیچھے لگ جاتا ہے جو اس کو جلا دیتا ہے، بدحواس کر دیتا ہے...... بہر حال جس طرح سے مشرکین کا عقیدہ تھا کہ اُوپر جاتے ہیں، فرشتوں کی باتیں سُن کے آتے ہیں، اور یہ غیب کی باتیں ان کے ذریعے سے ہمیں معلوم ہوتی ہیں، جیسے کاہن لوگ تھے، پھر وہ ان جنوں کو خوش رکھنے کے لیے اِن کی پُوجا کرتے، ان کے نام پہ نذر و نیاز دیتے، ان کے ناموں کے وظیفے پڑھتے۔ یہ کہانت کو باطل کیا جا رہا ہے کہ جنوں کی اس قسم کی کوئی رسائی نہیں کہ اُوپر جائیں، فرشتوں سے باتیں سُن کے آ کے تمہیں غیب کی باتیں بتا دیں، ان کو وہاں جانے کون دیتا ہے؟ سننے کی کوشش بھی کرتے ہیں تو ان کو دھکے پڑتے ہیں ان کو پھٹکارا جاتا ہے، اور اگر چوری چھپے کسی کی کوئی بات سُن بھی لیتا ہے تو پھر اُس کے پیچھے آگ کا شعلہ لگ جاتا ہے، جو اُس کو جلا کے خاکستر کر دیتا ہے...... یہاں تک تو یہ بنیاد بنا دی کہ فرشتوں کا یہ مقام ہے اللہ کے سامنے، اور جنوں کا یہ درجہ ہے، جو جِنّ، شیاطین کی قسم کے ہیں۔

اِثباتِ معاد

فَاسْتَفْتِهِمْ اَهُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمْ مَّنْ خَلَقْنَا یہاں سے اب معاد کی طرف مضمون منتقل ہو گیا۔ ان سے پوچھیے! یہ زیادہ سخت ہیں از روئے پیدا کرنے کے یا وہ مخلوق جن کو ہم نے پیدا کیا؟ یہ زیادہ سخت ہیں پیدا کرنے کی رو سے یا باقی مخلوق؟ باقی مخلوق کے اندر آسمان، زمین، فرشتے، جنّات سارے ہی آ گئے، یعنی یہ جو کہتے ہیں کہ ہم دوبارہ پیدا نہیں کیے جا سکتے، کیا بات ہے؟ ان کا پیدا کرنا کوئی زیادہ مشکل ہے؟ سورۂ نازعات میں آئے گا: ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ؕ بَنٰهَا: تم زیادہ سخت ہو از روئے پیدا کرنے کے یا آسمان جس کو اللہ نے بنایا۔ اور ایک جگہ یوں الفاظ بھی ہیں: لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ (سورۂ مؤمن: ۵۷) آسمان و زمین کا پیدا کرنا زیادہ بڑا ہے انسانوں کے پیدا کرنے سے۔ اِنَّا خَلَقْنٰهُمْ مِّنْ طِيْنٍ لَّازِبٍ: بے شک ہم نے ان کو بنایا ان کو پیدا کیا چکنی مٹی سے۔ لازب: چمٹنے والی چکنی مٹی، چپکتی مٹی۔ ہم نے ان کو چپکتی مٹی سے بنایا۔ تو جب ابتداءً ہم نے ان کو مٹی سے بنایا ہے تو مٹی کہیں چلی تو نہیں گئی، دوبارہ اگر یہ مٹی ہو جائیں گے، جس طرح سے کہتے ہیں ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا، تو زیادہ سے زیادہ مرنے کے بعد یہ مٹی ہو جائیں گے، تو پہلے بھی ہم نے ان کو مٹی سے بنایا ہے، تو دوبارہ مٹی سے ان کا بنانا کیا مشکل ہو جائے گا؟ ''بے شک ہم نے پیدا کیا ان کو چپکتی مٹی سے۔''

حضور ﷺ کا تعجب اور مشرکین کا اِستہزا اور اِنکارِ معاد

بَلْ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ ۞ وَاِذَا ذُكِّرُوْا لَا يَذْكُرُوْنَ ۞: بلکہ تو تعجب کرتا ہے اور وہ مذاق اُڑاتے ہیں، اور جب نصیحت کیے جاتے ہیں تو وہ نصیحت نہیں حاصل کرتے، جب اُن کو کوئی بات یاد دلائی جاتی ہے تو وہ یاد ہی نہیں کرتے۔ عَجِبْتَ وَيَسْخَرُوْنَ کا

مطلب یہ ہے کہ آپ کے سامنے تو یہ حقیقت بالکل ہی بداہت کے درجے میں ہے کہ مرنے کے بعد جی اُٹھنا ہے، اور جو پہلی دفعہ پیدا کرسکتا ہے دوبارہ پیدا کرنے پر قادر ہے، جو زمین و آسمان کو بنانے والا ہے انسان کا دوبارہ بنانا اس کے لئے کوئی مشکل نہیں، آپ کے نزدیک تو یہ حقیقت بداہت کے درجے میں ہے، بالکل بدیہی ہے، بلکہ اجلیٰ بدیہیات میں سے ہے، اس لیے آپ کو ان کے انکار کرنے پہ تعجب ہو رہا ہے کہ یہ ایسی کھلی ہوئی حقیقت کا انکار کیوں کرتے ہیں؟......اور ان کے فہم میں اور آپ کے فہم میں اتنا فرق ہے کہ وہ مذاق اُڑاتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ بھلا! ایسی خلافِ عقل بات بھی کوئی شخص کہہ سکتا ہے؟ یعنی وہ آپ کی باتوں کو سمجھتے ہیں کہ یہ بات تو کسی عقل مند کی زبان پہ آہی نہیں سکتی، کہ مرنے کے بعد دوبارہ بھی اُٹھنا ہے۔ تو اتنا فرق ہے دونوں کے فہم میں، ایک کے نزدیک ایک حقیقت بالکل بدیہی ہے اور اس میں شک کی گنجائش ہی نہیں، اور دوسرے کے نزدیک وہ ایک مذاق ہے، وہ کہتا ہے کہ کیسے ہوسکتا ہے، کوئی سمجھ دار آدمی زبان پر اس بات کو لا ہی نہیں سکتا، تو دونوں کے فہم میں کتنا فرق ہے۔ آپ تعجب کرتے ہیں، یعنی ان کے انکار کرنے پر۔ اور وہ آپ کی بات کا مذاق اُڑاتے ہیں۔ تو جس وقت دونوں کے دماغوں میں طرزِ فکر میں اتنا فرق ہوا، تو پھر وہ نصیحت کو بھی کیا مان سکتے ہیں؟ جب اُن کو کوئی بات یاد دلائی جاتی ہے، کسی بات کی طرف اُن کو متوجہ کیا جاتا ہے، تو وہ یاد ہی نہیں کرتے سمجھتے ہی نہیں، جب ان کو نصیحت کی جاتی ہے تو نصیحت حاصل ہی نہیں کرتے، یاد دلائی جاتی ہے تو یاد ہی نہیں کرتے۔ وَاِذَا رَاَوْا اٰیَةً یَّسْتَسْخِرُوْنَ: اور جب کوئی نشانی دیکھتے ہیں تو اُس کا بھی مذاق اُڑاتے ہیں، یعنی نبوت کی دلیل کے لیے کوئی نشانی آجائے، معجزہ آجائے تو اس کا بھی مذاق اُڑاتے ہیں۔ وَقَالُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ: اور کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ مگر صریح جادو۔ معجزے کو بھی اس طرح سے جادو وغیرہ قرار دے کے وہ بے حیثیت بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ نقشہ ہے اس وقت کے لوگوں کا جو حضور ﷺ کے مقابلے میں تھے، مشرکینِ مکہ۔ یعنی فہم ان کا اس قسم کا تھا کہ ان کو خلافِ عقل سمجھتے ہیں، اور نبوت کا دعویٰ بھی اُن کے نزدیک ایک مذاق ہے، اور اس کے اِثبات کے لیے اگر کوئی معجزہ آتا ہے تو اُس کو بھی وہ جادو قرار دے دیتے ہیں۔ اِذَا رَاَوْا اٰیَةً اس سے مراد حضور ﷺ کا ایسا معجزہ ہے جو آپ ان کے سامنے نمایاں کرتے تھے، جیسے بیسیوں نہیں، سینکڑوں معجزات کا ذکر حدیث شریف میں آتا ہے۔ تو وہ کہتے تھے کہ یہ صریح جادو ہے۔ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ: یہ وہی ان کے تحریہ کا بیان ہے جو وہ مذاق کرتے تھے، یوں کہتے ہیں کہ کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے اور ہڈیاں ہوجائیں گے تو کیا ہم البتہ اُٹھائے جائیں گے؟ یہ بھلا کیسے ہوسکتا ہے؟ کہ جب مرجائیں گے، مٹی ہوجائیں گے، ہڈیاں ہوجائیں گے، پھر اُٹھائے جائیں۔ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ: کیا ہمارے آباء جو پہلے گزر گئے ہیں وہ بھی اُٹھائے جائیں گے؟ جو ہم سے سینکڑوں سال پہلے کے مرے ہوئے ہیں۔

قیامت کے دِن مشرکین کی بدحالی

قُلْ نَعَمْ: آپ کہہ دیجئے، ہاں! اُٹھائے جاؤ گے، وَاَنْتُمْ دَاخِرُوْنَ: صرف یہی نہیں کہ اُٹھائے جاؤ گے بلکہ تم ذلیل ہونے

والے ہو گے، ذلّت کی حالت میں تم کو اُٹھایا جائے گا اور تمہارے ان کُفریات کے نتیجے میں تمہارے سامنے آخرت میں ذلت ہی ذلت آئے گی۔ اُٹھو گے بھی اور ذلیل ہو کے اُٹھو گے۔ فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ: اللہ کو اُٹھانے کے لیے نیا کوئی اہتمام نہیں کرنا پڑتا، اللہ تعالیٰ ایک ہی جھڑک دے گا، یہی نفخہ، جو صور میں پھونک ماری جائے گی، پس وہ اُٹھانا، وہ قیامت، وہ ساعت (هِيَ ضمیر کا مرجع یہی ہے) پس وہ ایک ہی ڈانٹ ہے، فَاِذَا هُمْ يَنْظُرُوْنَ: پس اچانک وہ جھانکنے لگ جائیں گے، یعنی کھڑے حیران ہو کر دیکھ رہے ہوں گے کہ یہ کیا ہو گیا۔ ایک ہی ڈانٹ کے نتیجے میں سارے اُٹھ جائیں گے۔ دُوسری جگہ لفظ آیا ہے فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ (سورۂ زمر: ۶۸) کہ سب اُٹھ کے کھڑے ہو جائیں گے اور جھانکنے لگ جائیں گے۔ وَقَالُوْا يٰوَيْلَنَا: اور پھر اس وقت اپنی بربادی کو پکاریں گے، کہ ہائے ہماری خرابی! ہائے ہماری بربادی! هٰذَا يَوْمُ الدِّيْنِ: یہ جزا کا دِن ہے، خود کہیں گے۔ هٰذَا يَوْمُ الْفَصْلِ الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ: یہ فرشتوں کی طرف سے ان کو تنبیہ کی جائے گی۔ یہی ہے فیصلے کا دِن جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

اُحْشُرُوا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ

جمع کرو اُن لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا اور اُن کے جوڑوں کو اور ان چیزوں کو جن کو یہ پُوجتے تھے ﴿۲۲﴾ اللہ کے علاوہ

فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ ﴿۲۳﴾ وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ ﴿۲۴﴾ مَا لَكُمْ

پھر جہنم کے راستے کی طرف ان کو چلتا کر دو ﴿۲۳﴾ اور ان کو ٹھہراؤ، ان سے سوال کیا جائے گا ﴿۲۴﴾ تمہیں کیا ہو گیا کہ

لَا تَنَاصَرُوْنَ ﴿۲۵﴾ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ ﴿۲۶﴾ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ

تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے ﴿۲۵﴾ بلکہ وہ آج کے دِن سرافگندہ ہوں گے ﴿۲۶﴾ متوجہ ہو گا ان کا بعض بعض پر

يَّتَسَآءَلُوْنَ ﴿۲۷﴾ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ ﴿۲۸﴾

اس حال میں کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے ﴿۲۷﴾ تابع لوگ کہیں گے کہ بے شک تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس دائیں بائیں طرف سے ﴿۲۸﴾

قَالُوْا بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۹﴾ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ ۚ بَلْ كُنْتُمْ

رُؤساء کہیں گے بلکہ تم خود ایمان لانے والے نہیں تھے ﴿۲۹﴾ ہمارے لئے تم پر کوئی زور نہیں تھا بلکہ تم ہی

قَوْمًا طٰغِيْنَ ﴿۳۰﴾ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ ۖ اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَاَغْوَيْنٰكُمْ اِنَّا

سرکش لوگ تھے ﴿۳۰﴾ پس ہم پر ہمارے رَبّ کی بات ثابت ہو گئی، بے شک ہم البتہ مزہ چکھنے والے ہیں ﴿۳۱﴾ ہم نے تم کو گمراہ کیا، ہم خود

كُنَّا غٰوِيْنَ ۝۳۲ فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝۳۳ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ

گمراہ تھے ۝۳۲ یہ سب اس دن عذاب میں شریک ہونے والے ہوں گے ۝۳۳ ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی

بِالْمُجْرِمِيْنَ ۝۳۴ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ ۙ يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۳۵ وَ

کریں گے ۝۳۴ بے شک یہ لوگ تھے کہ جب انہیں کہا جاتا تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں تو اکڑ جاتے تھے ۝۳۵ اور

يَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ ۝۳۶ بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ وَصَدَّقَ

کہتے تھے، کیا ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں ایک شاعر دیوانے کی وجہ سے ۝۳۶ بلکہ یہ تو حق بات لایا ہے اور پہلے رسولوں کی بھی

الْمُرْسَلِيْنَ ۝۳۷ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ ۝۳۸ وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ

تصدیق کرتا ہے ۝۳۷ بے شک تم البتہ دردناک عذاب چکھنے والے ہو ۝۳۸ اور تم بدلہ نہیں دیے جاؤ گے مگر انہی کاموں کا جو تم

تَعْمَلُوْنَ ۝۳۹ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ۝۴۰ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ ۝۴۱

کرتے تھے ۝۳۹ مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے ۝۴۰ ان کے لئے رزق معلوم ہوگا ۝۴۱

فَوَاكِهُ ۚ وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ ۝۴۲ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝۴۳ عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ۝۴۴

میوہ جات، اور وہ عزت دیے ہوئے ہوں گے ۝۴۲ خوش حالی کے باغات میں ۝۴۳ تختوں پر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھنے والے ہوں گے ۝۴۴

يُطَافُ عَلَيْهِمْ بِكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ ۝۴۵ بَيْضَآءَ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِيْنَ ۝۴۶ لَا فِيْهَا غَوْلٌ وَّلَا

گھمایا جائے گا ان پر پیالہ صاف ستھری شراب کا پیالہ ۝۴۵ سفید رنگ کی ہوگی، پینے والوں کے لئے لذیذ ہوگی ۝۴۶ نہ اس سے سر درد ہوگا اور نہ

هُمْ عَنْهَا يُنْزَفُوْنَ ۝۴۷ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِيْنٌ ۝۴۸ كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ

وہ اس شراب کی وجہ سے بدحواس کیے جائیں گے ۝۴۷ ان کے پاس نظر کو نیچا رکھنے والی موٹی موٹی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی ۝۴۸ گویا کہ وہ چھپا کے

مَّكْنُوْنٌ ۝۴۹ فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝۵۰ قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ اِنِّيْ

رکھے ہوئے انڈے ہیں ۝۴۹ متوجہ ہوگا ان کا بعض بعض پر اس حال میں کہ آپس میں پوچھتے ہوں گے ۝۵۰ ان میں سے ایک بولے گا

كَانَ لِيْ قَرِيْنٌ ۝۵۱ يَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِيْنَ ۝۵۲ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّ

میرا ایک ساتھی تھا ۝۵۱ کہا کرتا تھا کیا بے شک تو البتہ تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ ۝۵۲ کیا جس وقت ہم مر جائیں گے اور مٹی اور

عِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِيْنُوْنَ ﴿۵۳﴾ قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَاطَّلَعَ فَرَاٰهُ فِيْ سَوَآءِ

ہڈیاں ہوجائیں گے کیا بے شک ہم البتہ بدلہ دیئے جائیں گے؟﴿۵۳﴾ وہ جنتی کہے گا کیا تم جھانکنے والے ہو؟﴿۵۴﴾ پھر وہ جھانکے گا پھر دیکھے گا اس کو

الْجَحِيْمِ ﴿۵۵﴾ قَالَ تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِيْنِ ﴿۵۶﴾ وَلَوْلَا نِعْمَةُ رَبِّيْ لَكُنْتُ مِنَ

جہنم کے وسط میں پڑا ہوا﴿۵۵﴾ وہ جنتی کہے گا، اللہ کی قسم قریب تھا کہ تو مجھے بھی ہلاک کردے﴿۵۶﴾ اگر میرے پر میرے رَبّ کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی

الْمُحْضَرِيْنَ ﴿۵۷﴾ اَفَمَا نَحْنُ بِمَيِّتِيْنَ ﴿۵۸﴾ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى وَمَا نَحْنُ

حاضر کیے ہوؤں میں سے ہوتا﴿۵۷﴾ کیا پھر ہم مرنے والے نہیں ہیں؟﴿۵۸﴾ سوائے ہماری اس موت کے جو پہلے آ گئی اور ہمیں

بِمُعَذَّبِيْنَ ﴿۵۹﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۶۰﴾ لِمِثْلِ هٰذَا فَلْيَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ ﴿۶۱﴾

عذاب بھی نہیں ہوگا؟﴿۵۹﴾ بے شک یہ بہت بڑی کامیابی ہے﴿۶۰﴾ اس جیسی کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے چاہیے کہ عمل کریں عمل کرنے والے﴿۶۱﴾

اَذٰلِكَ خَيْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَةُ الزَّقُّوْمِ ﴿۶۲﴾ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ ﴿۶۳﴾ اِنَّهَا

کیا یہ چیزیں بہتر ہیں از روئے مہمانی کے یا زقوم کا درخت؟﴿۶۲﴾ بے شک ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لئے آزمائش بنایا ہے﴿۶۳﴾ بے شک یہ

شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ ﴿۶۴﴾ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ ﴿۶۵﴾ فَاِنَّهُمْ

ایسا درخت ہے جو جہنم کی جڑ سے نکلے گا﴿۶۴﴾ اور اس کا پھل ایسا ہوگا جیسے کہ شیاطین کے سر ہیں﴿۶۵﴾ بے شک وہ جہنمی

لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ ﴿۶۶﴾ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا

اس درخت کو کھانے والے ہوں گے، پھر اسی کے ساتھ اپنے پیٹوں کو بھرنے والے ہوں گے﴿۶۶﴾ پھر ان کے لئے اس درخت کے اُوپر البتہ ایک مرکب ہوگا

مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿۶۷﴾ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ ﴿۶۸﴾ اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ ﴿۶۹﴾

گرم پانی سے﴿۶۷﴾ پھر ان کا لوٹنا آگ کی طرف ہی ہے﴿۶۸﴾ بے شک پایا انہوں نے اپنے آباء کو گمراہ﴿۶۹﴾

فَهُمْ عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۷۱﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا

پس وہ انہی کے نقش قدم پر بھگائے جاتے تھے﴿۷۰﴾ البتہ تحقیق ان سے پہلے بھی بہت لوگ گمراہ ہو چکے ہیں﴿۷۱﴾ ہم نے ان کے اندر

فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۷۴﴾

ڈرانے والے بھیجے﴿۷۲﴾ پھر دیکھ تو، ان ڈرائے ہوئے لوگوں کا انجام کیسا ہوا؟﴿۷۳﴾ مگر اللہ کے وہ بندے جو چُن لیے گئے﴿۷۴﴾

تفسیر

کفار اور ان کے معبود جمع کیے جائیں گے

اُحْشُرُوا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا وَاَزْوَاجَهُمْ: اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرشتوں کو حکم ہوگا، جمع کرو ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا، یعنی مشرکین کو۔ یہاں سے رُؤسائے مشرکین مراد ہیں۔ اور اَزْوَاجَهُمْ: اُن کے ہم مسلک، ان کے جوڑے۔ مشرکوں کو جمع کرو اور ان کے ازواج کو۔ دونوں طرح سے یہاں مراد ظاہر کی گئی ہے، الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا سے مرد مراد ہو جائیں اور اَزْوَاجَهُمْ سے اُن کی بیویاں، جمع کرو ان ظالموں کو اور ان کی بیویوں کو، ان کافروں مشرکوں کو اور ان کی بیویوں کو جو ان کے ساتھ وہ بھی کافرہ اور مشرکہ تھیں۔ یا الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا سے رُؤساء مراد لے لیں، اور اَزْوَاجَهُمْ سے مراد لے لیں اُن کے پچھلگ، ان کے ہم مسلک، ہم مشرب، جو اسی قسم کے لوگ تھے۔ ''جمع کرو ظالموں کو اور ان کے جوڑوں کو'' ان کے ہم مسلک، ہم مشرب لوگوں کو۔ وَمَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ ﴿۲۲﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: اور ان چیزوں کو جن کو یہ پوجتے تھے اللہ کے علاوہ۔ فَاهْدُوْهُمْ اِلٰى صِرَاطِ الْجَحِيْمِ: ان سب کو اکٹھا کر کے راہنمائی کرو ان کی جہنم کے راستے کی طرف، جہنم کے راستے کی طرف ان کو چلتا کردو، مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ: جن کو یہ پوجتے تھے، اب بظاہر وہ پوجتے فرشتوں کو بھی تھے، لیکن یہاں مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ کا مصداق فرشتے نہیں، یعنی حقیقت میں جن کی یہ پوجا کرتے تھے، نام چاہے فرشتوں کا لیں، انبیاء کا لیں، اولیاء کا لیں، لیکن حقیقت میں عبادت شیاطین کی تھی، تو یہاں وہی شیاطین مراد ہیں، چاہے ان کو نبی کہہ کے پوجیں چاہے ولی کہہ کے پوجیں، جو ان کی عبادت پہ خوش ہے یا جو ان کو اپنی عبادت کی ترغیب دیتا ہے وہی مراد ہو سکتے ہیں، ورنہ ایک اللہ کا نیک بندہ جو اپنی زندگی کے اندر اپنی عبادت سے منع کرتا رہا، اللہ کی توحید کا درس دیتا رہا، تو بعد میں لوگ اگر اس کو پوجنے لگ جائیں تو اس میں اُس کا کوئی قصور نہیں، اور نہ حقیقت میں اس کو پوج رہے ہیں، بلکہ شیطان کو پُوج رہے ہیں جو ان کو بہکا رہا ہے۔ تو یہاں مَا كَانُوْا يَعْبُدُوْنَ میں وہی شیاطین مراد ہیں ان کو بہکانے والے۔ پھر ان کی راہنمائی کرو جہنم کے راستے کی طرف۔

جہنمیوں کو ٹھہرا کر سوال کیا جائے گا

وَقِفُوْهُمْ اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ: جب ان کو اکٹھا کیا جائے گا، اکٹھا کر کے جہنم کی طرف چلایا جائے گا، تو پھر اللہ کی طرف سے حکم آئے گا کہ ذرا ان کو ٹھہراؤ، جہنم کے قریب لے جا کر کنارے پر ان کو کھڑا کر لیا جائے گا۔ قِفُوْا: اَمر کا صیغہ ہے، وَقَفَ يَقِفُ وُقُوْفًا: ٹھہرنا۔ ٹھہرالو ان کو، اِنَّهُمْ مَّسْئُوْلُوْنَ: ان سے سوال کیا جائے گا، ذرا ان سے ایک بات پوچھ لیں، وہ بات یہ پوچھی جائے گی کہ مَا لَكُمْ لَا تَنَاصَرُوْنَ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے؟ دُنیا کے اندر تو ایک دوسرے کے پیچھے جھنڈے اُٹھاتے تھے، ایک آدمی آگے لگ جاتا، دوسرے پیچھے نعرے لگانے والے ہوتے تھے، سب ایک دوسرے کی مدد کو نکلتے تھے، کیا ہو گیا کہ آج تم ایک دوسرے کی مدد نہیں کرتے۔ بَلْ هُمُ الْيَوْمَ مُسْتَسْلِمُوْنَ: اِسْتَسْلَمَ کا معنی ہوتا ہے فرماں بردار ہو جانا، کسی کے سامنے سرافگندہ ہو جانا، مدد تو انہوں نے کیا کرنی تھی وہ تو سارے کے سارے ہی سرافگندہ ہوں گے، سب نیازمند بنے ہوئے ہوں گے،

ایسے معلوم ہوگا جیسے انہوں نے تو کبھی نافرمانی کی ہی نہیں، یوں نیازمند ہوں گے۔ بلکہ وہ آج کے دن سرافگندہ ہوں گے، مطیع ہوں گے، فرماں بردار ہوں گے، اپنے آپ کو پکڑوانے والے ہوں گے، گردنیں جھکائے ہوئے ہوں گے، جس طرح سے چاہیں اس کا مفہوم ادا کرلیں۔

جہنم میں مشرکین کا آپس میں جھگڑا

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ: اب یہ جہنمیوں کی آپس میں تُوتکار کا ذِکر آ گیا۔ متوجہ ہوگا ان کا بعض بعض پر اس حال میں کہ وہ ایک دوسرے سے پوچھتے ہوں گے، سوال کرنے کے لیے پوچھنے کے لیے ایک دوسرے پہ متوجہ ہوں گے۔ قَالُوْٓا اِنَّكُمْ كُنْتُمْ تَاْتُوْنَنَا عَنِ الْيَمِيْنِ: کہیں گے، یہ کہنے والے ہیں پچھلگ لوگ، تابعین، مساکین، یا مستضعفین، جن کو اقتدار حاصل نہیں تھا، یا جو مال ودولت میں کم سمجھے جاتے تھے، اور بڑے لوگوں کے پیچھے لگنے والے تھے، تابع لوگ۔ اور اِنَّكُمْ کا خطاب ان بڑے لوگوں کو ہے، کہیں گے وہ کہ بے شک تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس، عَنِ الْيَمِيْنِ یمین دائیں طرف کو کہتے ہیں، دائیں ہاتھ کو۔ اصل میں وہ کہنا یوں چاہتے ہیں کہ تم دائیں بائیں ہماری طرف آتے تھے، اور آکے ہمیں بہکاتے تھے، نبی کی مخالفت کرنے کے لئے کہتے تھے کہ اس بات کو تسلیم نہ کرنا، دائیں طرف سے آتے تھے، بائیں طرف سے آتے تھے، تو یہاں یمین کے مقابلے میں شمال کا لفظ محذوف ہوگا، بے شک تم ہمارے پاس دائیں اور بائیں سے آیا کرتے تھے، کبھی اِدھر سے آ گئے، کبھی اُدھر سے آ گئے، لیکن یہ چونکہ تُوتکار کا اور آپس میں جھگڑنے کا موقع ہے، تو آپ اپنی مجلس کا نقشہ دیکھیے! جس وقت کسی بات پر دو آدمیوں کے درمیان میں جھگڑا ہوتا ہے، تو ایک آدمی ایک بات کررہا ہے تو دُوسرا آدمی اس کی بات کو پورا نہیں ہونے دیتا، پہلے ہی درمیان میں ٹوک کے اپنی بات شروع کردیتا ہے۔ جہاں ایک بات پوری کی جائے اور اس کو توجہ سے سُنا جائے، پھر دُوسرا آدمی جواب دے تو یہ تو ایک بڑی مہذّب مجلس ہوتی ہے، کہ آپ اپنی بات پوری کرلیں پھر دوسرا جواب دینا شروع کرے، پھر وہ اپنی بات پوری کرلے پھر دوسرا بولے۔ اور جہاں آپس میں بدتمیزی کی لڑائی ہوا کرتی ہے وہاں کوئی دُوسرے کی بات پوری نہیں سُنا کرتا، ایک آدمی نے بات شروع کی، پوری نہیں ہونے دی، درمیان میں پکڑلی اور دُوسرے نے اس کے اُوپر گرفت کرکے بات کرنی شروع کردی، تو یہاں بھی اسی طرح سے ہے، تو چونکہ اب تو لعنت اور پھٹکار کررہے ہیں ایک دوسرے پر، کون دوسرے کی پوری بات سنے، تو ابھی وہ یہاں تک ہی بات کہنے پائیں گے کہ تم ہمارے پاس آیا کرتے تھے دائیں بائیں، ''بائیں'' نکلنے بھی نہیں دیں گے زبان سے، کہ درمیان سے دُوسرے بول پڑیں گے، یہ اُن کی مجلس کا نقشہ ہے، جس طرح سے آپس میں لوگ اُلجھا کرتے ہیں اور اُلجھتے وقت بات پوری نہیں ہونے دیا کرتے، تو یہاں یہی نمونہ دکھایا گیا ہے، تو یمین کے مقابلے میں یہاں شمال آئے گا'' بے شک تم آیا کرتے تھے ہمارے پاس دائیں بائیں طرف سے۔'' جبکہ عام مفسرین نے شمال کا لفظ محذوف نہیں مانا، پھر بعض کے مطابق یمین قوت کے معنی میں ہے یعنی تم ہم پر خوب زور ڈال کر ہمیں گمراہ کیا کرتے تھے، یا ''قسم'' کے معنی میں ہے یعنی قسم کھا کھا کر گمراہ کرتے تھے۔ اور وہ جو رُؤساء ہیں وہ کہیں گے: بَلْ لَّمْ تَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ: ہم نے تمہیں نہیں بھٹکایا، یا ہم تمہیں گمراہی میں لے جانے والے نہیں، بلکہ تم ایمان

لانے والے نہیں تھے، یعنی تم خود ایمان لانے والے نہیں تھے، خود ایمان نہیں لائے اور الزام ہم پہ دیتے ہو؟ وَمَا كَانَ لَنَا عَلَيْكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ: ہمارے لئے تم پر کوئی زور نہیں تھا، بَلْ كُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِيْنَ: بلکہ تم ہی سرکش لوگ تھے، طغیانی والے تھے، سرکش تھے، مانے تم خود نہیں، الزام ہمیں دیتے ہو؟ یاد ہوگا آپ کو، سورۂ ابراہیم میں وَقَالَ الشَّيْطٰنُ لَمَّا قُضِيَ الْاَمْرُ (سورۂ ابراہیم: ۲۲) جہاں شیطان کا خطبہ ذکر کیا گیا ہے کہ قیامت کے دن جہنم میں جا کے جہنمیوں کو اکٹھا کر کے اس نے تقریر کرنی ہے، تو وہاں وہ بھی یہی کہے گا کہ میں نے صرف بلایا تھا، میرے بلانے پہ تم آ گئے، ورنہ میرا تم پہ کوئی زور تو نہیں تھا کہ میں تمہیں زبردستی گمراہی کی طرف لے گیا۔ تو ابلیس نے بھی وہاں اپنے ماننے والوں کو یہی کہنا ہے، اور یہاں یہ بڑے بڑے لیڈر جو ہیں وہ بھی اپنے پچھلوں کو یہی کہیں گے، کہ ہمارے لیے تم پر کوئی زور تو نہیں تھا، بلکہ تم ہی سرکش لوگ تھے۔ فَحَقَّ عَلَيْنَا قَوْلُ رَبِّنَآ: وہاں (سورۂ ابراہیم میں) بھی شیطان نے یہی کہا تھا کہ اب تم بھی پھنس گئے، میں بھی پھنس گیا، تم میری فریادرسی نہیں کر سکتے، میں تمہاری فریادرسی نہیں کر سکتا، مجھے کیوں ملامت کرتے ہو، اپنے آپ کو ملامت کرو، اس قسم کا مضمون ابلیس کی طرف سے بھی تھا، تو یہاں یہ بھی وہی کہہ رہے ہیں کہ ''ہم پر ہمارے رَبّ کی بات پوری ہوگئی'' کہ اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ''میں جہنم کو بھر دوں گا شیطان کے متبعین سے'' وہ بات ہم پر پوری ہوگئی، ثابت ہوگئی، اِنَّا لَذَآئِقُوْنَ: بے شک ہم البتہ مزہ چکھنے والے ہیں، ہم سب ہی مل کے مزہ چکھنے والے ہیں۔ فَاَغْوَيْنٰكُمْ: ہم نے تم کو گمراہ کیا، بہکایا، اغوا کیا۔ اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ: ہم خود گمراہ تھے، یعنی اگر ہم نے تمہیں مشورہ دیا تھا کہ تم یوں کرو، تو ہم بھی گمراہ تھے۔ تم ہم پر تو الزام تب قائم کرو کہ ہم نے کوئی اچھا طریقہ اختیار کر لیا، اور تمہیں بُرا بتا دیا۔ جیسے ہم تھے، ویسے تم ہو گئے۔ ہم نے بہکایا تمہیں، ہم نے گمراہ کیا تمہیں یعنی باتوں کے ساتھ، زور کے ساتھ نہیں، جیسے مشورہ دیا جاتا ہے، اِنَّا كُنَّا غٰوِيْنَ: ہم بھی گمراہ ہونے والے تھے۔

عذاب میں تمام مشرکین اکٹھے کیوں ہوں گے؟

فَاِنَّهُمْ يَوْمَئِذٍ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ: یہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ سارے کے سارے اس دن عذاب میں شریک ہونے والے ہوں گے، سب عذاب میں اکٹھے ہوں گے۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَفْعَلُ بِالْمُجْرِمِيْنَ: ہم مجرموں کے ساتھ ایسا ہی کرتے ہیں، یا ایسا ہی کریں گے۔ اِنَّهُمْ كَانُوْٓا اِذَا قِيْلَ لَهُمْ: ان کا جرم کیا تھا؟ وہ جرم مشترکہ ان کا یہ تھا۔ بے شک یہ لوگ تھے کہ جب انہیں کہا جاتا لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ، تو يَسْتَكْبِرُوْنَ یہ مقابلے میں اکڑ جاتے تھے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے، یہی ہے ان کا بنیادی جرم جس میں یہ سارے کے سارے شریک ہیں، اس لیے عذاب میں بھی سارے اکٹھے ہوں گے، جب ان کو کہا جاتا تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، تو آگے سے اکڑتے تھے، وَيَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَتَارِكُوْٓا اٰلِهَتِنَا لِشَاعِرٍ مَّجْنُوْنٍ: اور کہتے تھے کیا ہم اپنے معبودوں کو چھوڑنے والے ہیں ایک شاعر دیوانے کی وجہ سے، یعنی نبی کو شاعر کہتے، دیوانہ کہتے، کہتے کہ اس دیوانے کی وجہ سے اس شاعر کی وجہ سے ہم اپنے آلہہ کو چھوڑ دیں؟ اللہ تعالیٰ فوراً جواب دیتے ہیں کہ یہ نبی شاعر یا دیوانہ نہیں، بَلْ جَآءَ بِالْحَقِّ: بلکہ یہ تو حق بات لایا ہے، وَصَدَّقَ الْمُرْسَلِيْنَ: اور پہلے رسولوں کی بھی تصدیق کرتا ہے، یعنی اس کی باتیں ایسی ہیں جو پہلے رسولوں کے مطابق ہیں، پھر یہ دیوانہ کیسے ہوا؟ نہ یہ کوئی شاعر ہے، شاعر حقیقت نہیں بیان کیا کرتے، اُن کے ہاں مبالغہ آمیزی ہوتی ہے، بات کچھ ہوتی ہے بنا کے

ظاہر کچھ کر دیتے ہیں، لیکن یہ تو حق ہی حق ہے جو کچھ لے کے آیا ہے، حقیقت ہی حقیقت ہے، اور پہلے رسولوں کی بھی اس نے تصدیق کی، اس کی باتیں ساری کی ساری وہی ہیں جو پہلے رسول بھی کرتے تھے۔ اِنَّكُمْ لَذَآئِقُوا الْعَذَابِ الْاَلِيْمِ: بے شک تم البتہ دردناک عذاب چکھنے والے ہو، وَمَا تُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: اور تم بدلہ نہیں دیے جاؤ گے مگر انہی کاموں کا جو تم کرتے تھے۔

اہلِ جنت کے لئے ''رِزقِ معلوم''، اور ''رِزقِ معلوم'' کا مفہوم

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ: مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے، یہ اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوں گے جو اس قسم کے بُرے حال سے محفوظ رہیں گے۔ یہ مستثنیٰ منقطع ہے (عام تفاسیر)۔ مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے، ان کا حال ایسا نہیں ہوگا۔ مُخْلَص: اللہ کے چنے ہوئے، جن پر اللہ کی خصوصی رحمت ہوئی۔ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ رِزْقٌ مَّعْلُوْمٌ: اُن کے لیے رزقِ معلوم ہوگا۔ معلوم کا معنی جانا پہچانا ہوا، جو کچھ ان کو ملے گا ان کو پتا ہوگا کہ یہ یہ چیز ہے، یا اُس کے اوقات معلوم ہوں گے۔ رزقِ معلوم: جانا ہوا رزق۔ اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ جنتیوں کو پتا ہوگا کہ اس وقت کیا ملے گا؟ کیسی چیز ملے گی؟ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں آیا تھا كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ (آیت:۲۵) یہ تو وہی چیز ہے جو ہمیں پہلے بھی دی گئی تھی، جانی پہچانی چیز ہوگی، اس لیے اس کے ساتھ اُنس ہوگا، وہ کسی چیز کو دیکھ کے گھبرائیں گے نہیں، کہ معلوم نہیں یہ کیا سامنے آ گیا۔ اوقات اس کے معلوم ہوں گے، پروگرام کے مطابق چیز ملے گی، کوئی وحشت کوئی دہشت نہیں ہوگی۔ بخلاف جہنمیوں کے کہ جہنمیوں کے سامنے ہر وقت ہیبت ناک واقعات آئیں گے، جن کی ان کو توقع بھی نہیں ہوگی، جب بھی کوئی نئی چیز سامنے آئے گی تو اُن کے اُوپر وحشت طاری ہوگی۔ جنتیوں کے ساتھ معاملہ ایسا نہیں ہوگا، ان کے سامنے جو کچھ ہوگا سب معلوم ہے سب جانا پہچانا ہوا ہے۔ ''ان کے لیے رزقِ معلوم ہے'' اور ''معلوم'' کا یہ معنی بھی ذکر کیا گیا ہے کہ جس کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں دے دیا کہ یہ یہ چیز ملے گی، وہی چیزیں ان کو وہاں دی جائیں گی جو اب معلوم کروا دی گئی ہیں، جن کا علم اللہ تعالیٰ نے قرآنِ کریم کے اندر ظاہر کر دیا، تو جو چیز بتا دی گئی وہی ان کو وہاں ملے گی، رزقِ معلوم کا یہ مفہوم بھی ہے (دیکھئے: ''بیان القرآن'')۔ آگے اس کی کچھ تفصیل ہے، فَوَاكِهُ: میوہ جات جو تلذذ کے لئے کھائے جاتے ہیں۔

ظاہری رزق کے ساتھ رُوحانی لذّت

وَهُمْ مُّكْرَمُوْنَ: یہ رُوحانی لذت ہے، کہ اُن کی عزت کی جائے گی، مُکرَم ہوں گے، عزت دیے ہوئے ہوں گے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص کسی کے ہاں مہمان چلا جائے، اور وہ میزبان کھانے کے لیے تو اس کو بہترین سے بہترین چیزیں دے، لیکن ساتھ ساتھ برتاؤ ایسا کرے جس میں اس کی بے عزتی ہو، اس کی خودداری کو ٹھیس پہنچے، تو پھر سمجھ دار آدمی کھانے میں کوئی لذت نہیں محسوس کیا کرتا، جہاں ساتھ ساتھ ذلت بھی ہو، پھر وہاں انسان کہتا ہے کہ اس ذلت کے ساتھ اچھے کھانے سے تو عزت کے ساتھ سوکھی روٹی بہتر ہے۔ تو عزت ایک رُوحانی لذت ہے، تو اللہ تعالیٰ اگر ان کو میوہ جات دیں گے، ان کو اچھا اچھا رزق دیں گے، تو ساتھ ساتھ ان کی عزت بھی نمایاں ہوگی، وہ مکرمون ہوں گے۔ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ: اَيْ خَالِدِيْنَ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ، خوش حالی کے باغات میں ہمیشہ رہیں

گے، یہ ان کے مستقر کا دوام آ گیا، کیونکہ اگر دُنیا میں انسان کو اعلیٰ سے اعلیٰ لذت مل جائے، اعلیٰ سے اعلیٰ خوراک مل جائے، اچھی سے اچھی عزت مل جائے لیکن اگر انسان کو یہ دھیان ہو کہ یہ چند روزہ ہے، تو پھر اُس میں وہ لطف نہیں ہوتا، اور جب اس میں دوام کا تصور ہوگا کہ وہ ہمیشہ رہے گی، تو اس کا لطف اور دوبالا ہو جائے گا۔ دنیا کے اندر انسان اگر کسی اچھی سے اچھی عیش کو حاصل کر بھی لے لیکن ساتھ یہ تصور جو ہے...... اور نہ ہو تو مرنے کا تصور...... ورنہ آپ جانتے ہیں کہ جو نعمت بھی دنیا میں حاصل ہے ہر وقت یہ خطرہ ہوتا ہے کہ پتا نہیں کب چھن جائے، ہر نعمت کے متعلق یہی تصور ہوتا ہے، جس کی بنا پر اس میں خوشی کمال کو نہیں پہنچتی، اور نہ ہو تو کم از کم موت کے ساتھ تو چھن جانا یقینی ہے۔ تو یہ جب یہ بات آ جائے گی کہ یہ دائمی باغات ہیں جن میں کبھی زوال نہیں، خوش حالی کے باغات، تو پھر انسان کی لذت انتہا کو پہنچ گی۔

جنت میں پیار بھرا ماحول

عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ: سُرُرٍ، سریر کی جمع ہے، سریر تخت کو کہتے ہیں، مزین تخت جس پر گدّے وغیرہ ڈال کر مزین کیا ہوا ہوگا۔ مُتَقٰبِلِیْنَ: ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھنے والے ہوں گے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ جنتیوں کو آپس میں محبت ہوگی، ایک دوسرے سے نفرت نہیں کریں گے۔ دنیا کے اندر آپ جانتے ہیں کہ اگر انسان کو خوش حالی حاصل ہو بھی جائے، لیکن ساتھ ساتھ معاشرے کے اندر عداوت، ایک دوسرے سے نفرت، ایک دوسرے کی مخالفت موجود ہو، تو اس سے بھی زندگی خراب ہو جاتی ہے۔ گھر کے افراد ہی اگر آپس میں سیدھے منہ سے نہ بولیں، تو گھر کے اندر کتنا ہی ساز و سامان ہو، کتنا ہی راحت و آرام ہو، لیکن اگر افراد کا آپس میں دل نہیں ملتا، اور آپس میں کشاکشی ہے، ایک دوسرے سے اعراض ہے، تو اس سے بھی وہ عیش مکدر ہو جاتی ہے۔ تو جنت کے اندر جس قسم کی عیش ہوگی، اس میں کوئی پہلو ایسا نہیں ہوگا جس میں کوئی تکلیف ہو، جنتیوں کی آپس میں محبت ہوگی، ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، کوئی ایک دوسرے سے اعراض نہیں کرے گا۔ جنت میں جو لوگ جائیں گے وہ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کی دُنیا میں آپس میں کچھ کھٹ کھٹ رہتی تھی، طبیعت آپس میں نہیں ملتی تھی، ایسے بھی تو ہوتا ہے، جیسے ایک مدرسے میں آپ پڑھتے ہیں، یا ایک کمرے میں چند ایک ساتھی رہتے ہیں تو دو کا مزاج آپس میں نہیں ملتا، چاہے ہم دونوں میں سے کسی کو بھی برا نہ کہہ سکیں، لیکن ایک دوسرے کے پاس بیٹھتے ہیں تو ایک کا منہ ادھر کو ہوتا ہے، ایک کا منہ اُدھر کو ہوتا ہے، کوئی بھی سیدھے منہ سے بات کرنے کے لئے تیار نہیں، تو ایسے لوگ اگر جنت میں چلے بھی جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ ان کے دل صاف کر کے بھیجے گا، وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ (سورۂ حجر: ۴۷) بھائیوں کی طرح ہوں گے، تختوں پر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، دل کے اندر جو کچھ کینہ بغض کسی کے متعلق ہوگا سب کھینچ دیا جائے گا، سب نکال دیا جائے گا، یہ چیز باقی نہیں رہے گی۔ تو عَلٰی سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ میں یہ بات بتا دی گئی کہ جنت کا لطف تبھی آئے گا جب ساتھیوں کی آپس میں محبت بھی ہوگی، اور اگر ایک دوسرے سے اعراض ہو تو پھر بھی انسان کو تکلیف ہوتی ہے۔

جنّتی شراب

یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِکَاْسٍ مِّنْ مَّعِیْنٍ: گھمایا جائے گا ان کے اوپر، گردش میں لایا جائے گا ان کے اوپر پیالہ۔ کأس کہتے ہیں شراب کے پیالے کو، معین سے جاری شراب مراد ہے، صاف ستھری جاری، جس طرح سے جاری پانی لطیف ہوتا ہے صاف ستھرا ہوتا ہے، وہ شراب بھی اسی طرح سے ہوگی، نہر بہتی ہوگی، صاف ستھری شراب، اس کے پیالے بھر بھر کے ان کے اوپر لائیں جائیں گے، گردش میں لائے جائیں گے، لانے والے کون ہوں گے، جیسے دوسری جگہ آیا: یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ (سورۂ دہر:۱۹) کہ اس قسم کے نوعمر بچے جو ہمیشہ ویسے ہی رہیں گے، اور ایسے صاف ستھرے ہوں گے: اِذَا رَاَیْتَهُمْ حَسِبْتَهُمْ لُؤْلُؤًا مَّنْثُوْرًا (حوالہ مذکورہ) کہ جب تو ان دیکھے گا تو تو ایسے سمجھے گا جیسے موتی بکھرے ہوئے ہیں۔ تو وہ خادم ہوں گے اور اس طرح سے جاری شراب کے پیالے بھر بھر کے لائیں گے...... تو شراب نوشی یہ ایک لذت پیدا کرنے والی چیز ہے، لیکن دنیا کی شراب میں بعض خرابیاں بھی ہیں، بدذائقہ اور کڑوی ہوتی ہے، اور اس کے پینے کے بعد عقلیں ماؤف ہوجاتی ہیں، جس کے ساتھ بیسیوں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، اور جب اس کا نشہ اُترتا ہے تو پھر خمار چڑھتا ہے، اعضاشکنی، بدن میں درد، سر میں درد، اس قسم کی چیزیں پیدا ہوتی ہیں، تو یہ اس میں نقصان کے پہلو ہیں۔ قوت کا حاصل ہوجانا، وقتی طور پر سُرور کا حاصل ہوجانا، یہ اس میں نفع کا پہلو بھی ہے۔ تو یہاں شراب کا ذکر جو آیا، تو اللہ تعالیٰ ساتھ ہی فرماتے ہیں کہ اس میں خوبیاں ہی خوبیاں ہوں گی، دُنیا کی شرابوں والی اس میں کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی، کوئی خرابی نہیں ہوگی، نہ وہ بدذائقہ ہوں گی، اور نہ ان کے پینے کے بعد عقل ماؤف ہوگی، اور نہ پیٹ میں درد نہ سر میں درد ہوگا، نہ اعضاشکنی ہوگی، یہ نقصان کے پہلو کوئی نہیں ہوں گے۔ بَیْضَآءَ: سفید رنگ کی ہوگی، ایسی نہیں ہوگی کہ جس کو دیکھ کے کراہت آئے نفرت آئے۔ لَذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ: پینے والوں کے لیے لذیذ ہوگی۔ لَذَّةٌ مصدر ہے، مبالغۃً لذیذ کے معنی میں، یعنی بدمزہ نہیں ہوگی۔ لَا فِیْهَا غَوْلٌ: غول پیٹ درد کو بھی کہتے ہیں، سَر درد کو بھی کہتے ہیں، خفیہ ضرر کو بھی کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس شراب کی وجہ سے سَر درد، پیٹ درد نہیں ہوگا، نہ کوئی اور نقصان پہنچے گا۔ وَّلَا هُمْ عَنْهَا یُنْزَفُوْنَ: اور نہ وہ جنّتی اس شراب کی وجہ سے بدحواس کیے جائیں گے، ان کی عقلیں بھی ماؤف نہیں ہوں گی۔ تو شراب کے اندر یہی نقصان کے پہلو ہیں کہ اس کا رنگ اچھا نہ ہو، ذائقہ اچھا نہ ہو، پینے کے بعد عقلیں ماؤف ہوجائیں، یا پھر خمار، اعضاشکنی، بدن میں درد، سر میں درد، یا پیٹ میں گڑبڑ، یہ نقصان کے پہلو ہیں جن کی یہاں نفی کردی گئی کہ جنّت کی شرابوں ایسی کوئی بات نہیں ہوگی۔

جنّتی بیویاں

وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ عِیْنٌ: اور یہ بات بھی آپ جانتے ہیں کہ انسان کے لیے لذت کی تکمیل، اور عیش وعشرت کی تکمیل تب ہوتی ہے، جب اس کے ساتھ اس کی زوجہ اور بیوی بھی ہو۔ ورنہ اگر اکیلا آدمی ہے، چاہے اس کو کتنا ہی ساز وسامان حاصل کیوں نہ ہو، یہ اُس کی عیش کی تکمیل نہیں۔ اب اللہ تعالیٰ عیش کے اس پہلو کو ذکر فرماتے ہیں، کہ ان کے نزدیک ایسی عورتیں ہوں گی جو نظر کو نیچا رکھنے والی ہیں۔ اس میں ان کی عفت اور پاک دامنی کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، کیونکہ عورت اصل میں انسان کے

لیے شرافت اور فطرت کو دیکھتے ہوئے مرغوب فیہ وہی ہے جو پاک دامن ہو، نظر نیچی رکھنے والے ہوں گی، خاوند کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نظر نہیں اٹھائیں گی۔ عِيْنٌ: یہ عَيْنَاءُ کی جمع ہے، موٹی موٹی آنکھوں والی۔ جس طرح سے حُوْرٌ کا لفظ آتا ہے حوراء کی جمع، گورے رنگ والی۔ یہ ان کے حُسنِ ظاہری کو بیان کیا، جس طرح سے قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ کے اندر اُن کے باطنی حُسن کو بیان کیا کہ پاک دامن ہوں گی، اپنے خاوند کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نظر اُٹھانے والی نہیں ہوں گی، موٹی موٹی آنکھوں والی ہوں گی، كَاَنَّهُنَّ بَيْضٌ مَّكْنُوْنٌ: گویا کہ وہ چھپا کے رکھے ہوئے انڈے ہیں، یعنی صاف ستھرے، جو انڈا چھپا کے رکھا ہوا ہو، جس کے اُوپر گرد وغبار نہ ہو، اور پھر کہتے ہیں کہ انڈوں سے بھی شتر مرغ کے انڈے مراد ہیں جو سنہری رنگ کے ہوتے ہیں، اور یہی رنگ عورتوں کے اندر زیادہ پسند کیا جاتا ہے، اس میں ہلکا ہلکا پیلا پن ہوتا ہے۔ ''گویا کہ وہ بیضے ہیں چھپا کے رکھے ہوئے۔''

جنّتی کا اپنے جہنّمی دوست کی طرف جھانکنے کا واقعہ

فَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ: جس طرح سے جہنّمی ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوئے تھے آپس میں لڑنے بھڑنے کے لئے، یہاں جنّتی ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہوں گے، متوجہ ہوگا ان کا بعض بعض پر اس حال میں کہ آپس میں پوچھتے ہوں گے، گفتگو ہوگی، اور ان کی گفتگو آپس میں خوش طبعی کی ہوگی، اس کا ذکر کئی جگہ قرآنِ کریم میں آیا ہے۔ یہاں عبرت کے لیے خصوصیت سے ایک واقعہ ذکر کیا جارہا ہے، کہ جب یہ جنّتی بیٹھیں گے، آپس میں ایک دوسرے پہ سوال کریں گے، تو ان جنتیوں میں سے ایک کو اپنا ایک دوست یاد آجائے گا، کہ دُنیا کے اندر میرا ایک دوست تھا، اور وہ آخرت کا منکر تھا۔ جب کوئی بات آتی، میں آخرت کی بات کرتا کہ آخرت ہوگی، تو آگے سے مجھے کہتا، یہ بھی بھلا کوئی بات ہے؟ تو ایسی بات کو مانتے بیٹھا ہے جو عقل کے بھی خلاف ہے، کہ مرنے کے بعد دوبارہ بھی اُٹھنا ہے۔ تو اس قسم کی باتیں کیا کرتا تھا، تو یہ جنّتی اپنی محفل والوں کو متوجہ کرے گا، کہ آؤ! ذرا دیکھیں تو صحیح، وہ کس حال میں ہے؟ تو اللہ تعالیٰ چونکہ جنتیوں کی ہر خواہش کو پورا کرے گا، تو جب ان کا دل چاہے گا اپنے ساتھی کو دیکھنے کے لئے، تو ایسے اسباب ظاہر ہوجائیں گے کہ وہ جہنّم کی طرف جھانکیں گے، جہنّم کے وسط میں پڑا ہوا وہ دوست نظر آئے گا، پھر یہ جنّتی اُس کو دیکھ کے کہے گا کہ کم بخت! تُو تو مجھے بھی برباد کرنے لگا تھا، اللہ کا فضل میرے پر نہ ہوتا، تو میں بھی تیری طرح آج جہنّم کے اندر حاضر کیا ہوا ہوتا۔ تو اس جہنّمی کو جنّتی اس طرح سے تنبیہ کرے گا۔

مذکورہ واقعہ ذِکر کرنے سے مقصود

اس واقعے کو ذِکر کر کے اللہ تعالیٰ متوجہ کرنا چاہتے ہیں کہ دوست اختیار کرتے ہو تو ذرا خیال کرلیا کرو، بعضے بعضے دوست بُرے نظریات کے ہوتے ہیں، بُرے کردار کے ہوتے ہیں، اور اگر ان دوستوں کے ساتھ مل کر تم بھی اس طرح بُرے ہوگئے، تو جیسے وہ جہنّم میں جائیں گے تم بھی جہنّم میں جاؤ گے۔ ایک دوسرے کے اثرات قبول کرنے کے لیے دوستی ایک بہت اہم چیز ہے، جس کسی کے ساتھ محبت لگ جائے عموماً انسان اُس کے خیالات اور اُس کے حالات کو اپنالیتا ہے، اس لئے شریعت میں بار بار اس بارے میں تاکید کی گئی ہے، کہ دوستی ہمیشہ اچھے آدمی کے ساتھ لگاؤ، بُرے آدمی کے ساتھ نہ لگاؤ، جن کے ساتھ ملنے کی بنا پر تم بھی کسی

بُرائی میں شریک ہو جاؤ۔ یہ تو آپ کے سامنے آتا ہی رہتا ہے کہ دوست دوستوں کو ترغیب دے کے اچھائی کی طرف بھی لے جاتے ہیں، بُرائی کی طرف بھی لے جاتے ہیں۔ تو خوش قسمت ہے جس کو ایسا دوست مل جائے جو ترغیب دے کے اچھائی کی طرف لے جانے والا ہو، اور بدبخت ہے جس کی دوستی کسی ایسے کے ساتھ لگ جائے جو اس کو ترغیب دے کے بُرائی کی طرف لے جانے والا ہو۔ تو یہاں جنّتی اور دوزخی کا قصہ اسی لیے سُنایا جارہا ہے۔

خلاصہ آیات

قَالَ قَآئِلٌ مِّنْهُمْ: ان میں سے ایک بولا یعنی بولے گا، اللہ تعالیٰ کے سامنے ماضی حال مستقبل سب ایک ہی چیز ہے، تو آخرت کا واقعہ جو نقل کیا جارہا ہے، تو ایسا ہوگا، لیکن تعبیر اس کو ماضی کے صیغے سے کیا جارہا ہے۔ ان میں سے ایک بولا، اِنِّیْ کَانَ لِیْ قَرِیْنٌ: میرا ایک ساتھی تھا، میرے ساتھ رہنے والا، یَّقُوْلُ اَئِنَّكَ لَمِنَ الْمُصَدِّقِیْنَ: کہا کرتا تھا کیا بےشک تو البتہ تصدیق کرنے والوں میں سے ہے؟ تو آخرت کی تصدیق کرتا ہے؟ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا لَمَدِیْنُوْنَ: کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہو جائیں گے، کیا بےشک ہم البتہ بدلہ دیئے جائیں گے؟، پھر ہم زندہ ہوں گے اور ہمیں کوئی بدلہ ملے گا؟، قَالَ هَلْ اَنْتُمْ مُّطَّلِعُوْنَ: وہ جنّتی کہے گا کیا تم جھانکنے والے ہو؟ یعنی یہ ترغیب دینے کی بات ہے، کیا تم دیکھنا چاہتے ہو؟ آؤ! آج اُس کا حال دیکھیں جو یہ باتیں کیا کرتا تھا۔ اور یہی بات تھی جو ابتداءً مشرکوں کی طرف سے نقل کی گئی تھی کہ اللہ کا رسول جب بھی اُن کے سامنے معاد کا ذکر کرتا، ان کو ترغیب دیتا تو وہ یہی کہتے کہ بھلا! مرنے کے بعد مٹی ہو جائیں گے، ہڈیاں ہو جائیں گے، کہاں دوبارہ اُٹھنا ہے؟ یہ میرا دوست بھی ایسی باتیں کیا کرتا تھا، تو کیا تم دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا تم جھانکنے والے ہو؟ فَاطَّلَعَ پھر وہ جنّتی جھانکے گا، فَرَاٰهُ فِیْ سَوَآءِ الْجَحِیْمِ: پھر دیکھے گا اس کو جہنم کے وسط میں پڑا ہوا۔ قَالَ: تو یہ جنّتی اُسے کہے گا: تَاللّٰهِ اِنْ كِدْتَّ لَتُرْدِیْنِ: اللہ کی قسم! قریب تھا کہ تُو مجھے بھی ہلاک کر دے۔ اِنْ مخففہ من المثقلہ ہے، یعنی یہ بات بالکل پکّی ہے کہ قریب تھا کہ تُو مجھے بھی ہلاک کر دے۔ وَلَوْ لَا نِعْمَةُ رَبِّیْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُحْضَرِیْنَ: اگر میرے پر میرے رَبّ کا احسان نہ ہوتا تو میں بھی حاضر کیے ہوؤں میں سے ہوتا، یعنی جس طرح سے تو جہنم میں حاضر کیا ہوا ہے میں بھی حاضر کیے ہوؤں میں سے ہوتا۔

یہ بات تو اس سے ہوگئی۔ پھر آپس میں خوشی سے تذکرہ کریں گے، جب انسان کو کوئی اچھی حالت حاصل ہوتی ہے، خوشی انتہا پر پہنچی ہوتی ہے، تو پھر اس قسم کی باتیں کرتے ہیں گویا کہ اُن کو اپنے حال کا یقین ہی نہیں آرہا۔ جیسے آپ قدرتی طور پر کچھ اسباب پیدا ہونے کے بعد مکہ معظمہ پہنچ جائیں، مدینہ منورہ پہنچ جائیں، تو خوشی کے ساتھ آپس میں تذکرہ کرتے ہیں، ''کیا ہم مکہ میں آگئے؟ یہ مکہ معظمہ ہے؟'' حالانکہ پہنچے ہوئے ہیں، لیکن خوشی کی وجہ سے ایسی باتیں ہوا کرتی ہیں گویا کہ یقین ہی نہیں آتا کہ ہمیں یہ نعمت کہاں سے حاصل ہوگئی؟ اس طرح سے وہ جنّتی آپس میں خوشی سے باتیں کریں گے۔ اَفَمَا نَحْنُ بِمَیِّتِیْنَ: کیا پھر ہم مرنے والے نہیں ہیں؟ اِلَّا مَوْتَتَنَا الْاُوْلٰى: سوائے ہماری اسی موت کے جو کہ پہلے آگئی، وَمَا نَحْنُ بِمُعَذَّبِیْنَ: اور ہمیں عذاب بھی نہیں ہوگا،

ہمیں تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ یہ خوشی کی باتیں ہیں، کہ کیا ہمیں اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت دے دی کہ اب ہمیں موت نہیں آئے گی، سوائے اس موت کے جو پہلے آچکی، اور ہمیں کوئی کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی جائے گی؟

اصل کامیابی کیا ہے؟

اِنَّ ھٰذَا لَھُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ: بے شک یہ بہت بڑی کامیابی ہے، لِمِثْلِ ھٰذَا فَلْیَعْمَلِ الْعٰمِلُوْنَ: یہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کا قول ہے کہ جو کچھ تم نے جنتیوں کا حال سُنا، یہ مرتبہ اور درجہ حاصل کرلینا بہت بڑی کامیابی ہے، اس کامیابی کے حاصل کرنے کے لئے کام کرنے والوں کو کام کرنے چاہئیں، چاہیے کہ عمل کریں عمل کرنے والے اس جیسی کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے۔ کیا مطلب؟ کہ دنیا میں ہر شخص محنت کرتا ہے کسی نہ کسی چیز کو حاصل کرنے کے لئے، کوئی ڈگری حاصل کرنے کے لیے محنت کرتا ہے، کوئی جائیداد بنانے کے لیے محنت کرتا ہے، کوئی دولت جمع کرنے کے لئے محنت کرتا ہے، کوئی محلات اور کوٹھیاں بنانے کے لیے محنت کرتا ہے، جس شخص کو بھی دیکھو گے، کسی نہ کسی کام کے لیے وہ محنت کر رہا ہے، محنت کرنے کے بعد جس چیز کے لیے محنت کی جارہی ہے وہ حاصل بھی ہوجائے، اوّل تو وہ یقینی نہیں، اور اگر وہ حاصل ہو بھی گئی تو کتنے دِن کے لئے؟ اگر دنیا میں کسی حادثے کا شکار نہ ہوئے تو موت کے حادثے سے تو بچ سکتے نہیں، اگر آپ نے محنت کر کے جائیداد بنالی تو وہ بھی ایک دِن چھوٹ جائے گی، کوئی ڈگری حاصل کرلی تو وہ بھی کسی کام کی نہیں رہے گی، مال دولت بنالیا، کوٹھیاں بنالیں، کارخانے لگالیے، جب مریں گے تو ضرور چھوٹ جائیں گے، ورنہ دُنیا میں بھی ایسا حادثہ ہوجاتا ہے کہ دُنیا میں بھی چھوٹ جاتے ہیں۔ یہ مقاصد ایسے ہیں کہ جن پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، لیکن جنت کو حاصل کرنے والا مقصد یہ بہت عظیم مقصد ہے، جس کو یہ حاصل ہوگیا یہ بہت بڑی کامیابی ہے، تو محنت کرنے والوں کو اس کے حاصل کرنے کے لیے محنت کرنی چاہیے۔ تو جس نے محنت کر کے عمل کر کے یہ کامیابی حاصل کرلی، یہ حقیقی بڑی اور دائمی کامیابی ہے، کہ جس کے اندر زوال کا کوئی اندیشہ نہیں، تو کام کرنے والوں کو چاہیے کہ اس کامیابی کو حاصل کرنے کے لئے کام کریں۔

جہنمیوں کی غذا، شجرۂ زقوم کا تعارف، اور اس کے فتنہ ہونے کا مطلب

اَذٰلِكَ خَیْرٌ نُّزُلًا اَمْ شَجَرَۃُ الزَّقُّوْمِ: اب مقابلۃً دوسری بات آگئی۔ اللہ تعالیٰ پوچھتے ہیں کہ یہ جو کچھ ذکر کیا گیا کہ جنتیوں کو دیا جائے گا۔ نُزل کہتے ہیں اُس چیز کو جو مہمان کے سامنے تیار کر کے رکھی جاتی ہے، مہمانی۔ کیا یہ چیزیں بہتر ہیں ازروئے مہمانی کے یاشَجَرَۃُ الزَّقُّوْمِ؟ شجرۃ: درخت۔ زقوم: یہ جس طرح سے ہمارے ہاں تھوہڑ ہوتا ہے، یہ ایک کانٹے دار بدبودار بوٹی ہے، ویران علاقوں میں ہوتی ہے، کسی کام کی نہیں، انتہائی درجے کی بدبودار اور نقصان دِہ ہوتی ہے، یہ جہنمیوں کو کھانے کے لیے ملے گا۔ تو یہ نعمتیں جاتے ہی مہمانی کے طور پر ملیں یہ بہتر ہیں، یاشَجَرَۃُ الزَّقُّوْمِ بہتر ہے جو کہ کافروں کو مشرکوں کو ملے گا۔ اب ان دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر سوچو! کہ ان دونوں میں سے بہتر کونسی ہے؟ جو بہتر ہے اس کو حاصل کرو۔ اور یہ بات تو یقینی ہے کہ یہی نعمتیں بہتر ہیں

جن کو اوپر ذکر کیا گیا، شجرۃ الزقوم کو لے کے کیا کریں گے۔ اِنَّا جَعَلْنٰهَا فِتْنَةً لِّلظّٰلِمِيْنَ بے شک ہم نے اس درخت کو ظالموں کے لیے آزمائش بنایا ہے، فتنہ عذاب کو بھی کہتے ہیں، آزمائش کو بھی۔ آخرت میں یہ درخت ظالموں کے لیے عذاب ہے، دنیا کے اندر آزمائش ہے، جب اللہ اور اللہ کے رسول کی بات پر اعتماد نہیں، تو جب کافروں کے سامنے ذکر کیا گیا کہ جہنّم کے اندر ایک درخت ہے زقوم، اور وہ کھانے کے لیے ملے گا (اور زقوم عرب میں بھی پایا جاتا تھا، کانٹے دار جھاڑیاں تھیں) تو وہ آگے سے مذاق اُڑاتے، کہتے کہ اچھا! ادھر تو کہتے ہو اس میں آگ ہے، اور ادھر کہتے ہو کہ اس میں درخت بھی ہیں، اور ادھر کہتے ہو کہ اس میں پانی بھی ہے، یہ ساری چیزیں کس طرح سے اکٹھی ہو جائیں گی؟ تو یہ ان کے لئے ایک آزمائش بن گئی کہ اس کو مانتے ہیں یا نہیں مانتے؟ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وہ درخت ایسا ہے جو جہنّم کی جڑ سے پھوٹے گا، جہنّم کے نچلے درجے سے نکلے گا، تو اس درخت کا مزاج ہی ناری ہوگا، جب اس کا مزاج ناری ہے تو آگ میں پیدا بھی ہوگا اور آگ میں باقی بھی رہے گا۔ جس طرح سے کتابوں میں لکھتے ہیں کہ ایک کیڑا ہے جس کو سمندر کہتے ہیں، وہ آگ میں پیدا ہوتا ہے، اور آگ میں زندہ رہتا ہے، اس کا مزاج ہی ناری ہے، ناری الاصل ہے، اس لیے اس کا پیدا ہونا اور باقی رہنا آگ میں ہی ہوتا ہے، بظاہر دیکھنے میں وہ حیوان ہے، کیڑوں کی طرح حرکت کرتا ہے، ہوتا ہے آگ میں، سمندر اس کا نام لکھا ہے (بیان القرآن)۔ اسی طرح سے یہ درخت بھی ایسا ہے جو ناری الاصل ہوگا، جہنّم میں پیدا ہوگا، جہنّم میں باقی بھی رہے گا، تو اس میں کون سی مشکل بات ہے؟ اللہ کو قدرت ہے، جیسے مٹّی سے درخت اُگا دیتا ہے، آگ سے بھی اُگا دے گا۔ ''بے شک وہ درخت ہے جو کہ نکلے گا اصلِ جحیم سے'' یعنی جہنّم کے نچلے حصے سے۔ اور یہاں حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ ''سہارنپور کے کمپنی باغ میں بعض درختوں کی تربیت آگ کے ذریعے سے ہوتی ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ اس دُنیا کے اندر بھی نباتات کی ایک قسم ایسی ہے کہ جو آگ کے ساتھ ہی پرورش پاتی ہے، تو اگر وہاں یہ درخت ایسا ہو کہ آگ میں ہی پیدا ہو، اور آگ میں ہی بڑھے اور پھلے پھولے، تو اس میں کون سی اشکال کی بات ہے؟ مختلف مزاج ہو سکتے ہیں، جیسے بعض پودے ایسے ہیں کہ پانی میں اگر ڈوب جائیں، تو خشک ہو جائیں گے، گل سڑ جائیں گے، نہیں اُگ سکتے۔ اور بعض پودے ایسے ہیں کہ بالکل دریاؤں کے تہوں میں پیدا ہوتے ہیں، سمندروں کی تہوں میں پیدا ہوتے ہیں، وہیں پھلتے ہیں، تو ان کا مزاج ہی ایسا ہوتا ہے کہ پانی میں اُگیں گے، پانی میں باقی رہیں گے۔ اِنَّهَا شَجَرَةٌ تَخْرُجُ فِيْٓ اَصْلِ الْجَحِيْمِ یہ جہنّم کی جڑ سے جہنّم کی تہہ سے نکلے گا۔ طَلْعُهَا كَاَنَّهٗ رُءُوْسُ الشَّيٰطِيْنِ: اور اُس کا پھل ایسا ہوگا جیسے کہ شیاطین کے سر ہیں، شیاطین کے سروں جیسے اس کے خوشے اور اس کے پھل ہوں گے۔ طلع پھل کو کہتے ہیں، شیاطین سے بعض حضرات نے تو سانپ مراد لیے ہیں، یعنی اُن کے پھل اس قسم کے ڈراؤنے ہوں گے جس طرح سے سانپ کا سر ہوتا ہے، سانپ نے جس طرح سے پھن پھیلایا ہوا ہو، تو جیسے ڈراؤنی صورت پیدا ہو جاتی ہے، تو اُن کے پھل دیکھنے میں بھی اچھے نہیں لگیں گے، ایسے ڈراؤنے ہوں گے۔ تو رُءوس شیاطین سے سانپوں کے پھن مراد ہو جائیں گے۔ یا پھر یہ تشبیہ تخییل کے طور پر ہے کہ ہم اگرچہ دیکھتے نہیں بھوت کو اور چڑیل کو، لیکن معاشرے کے اندر ہمیشہ

ڈراؤنی چیز کو بھوت اور چڑیل کے ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے، ایک آدمی بکھرے ہوئے بالوں کے ساتھ بڑھے ہوئے ناخنوں کے ساتھ میلا کچیلا آتا ہے، تو ہم کہتے ہیں کہ ایسے لگتا ہے جیسے بھوت ہے، حالانکہ بھوت ہم نے دیکھا نہیں ہوتا، لیکن بھوت کی ایک ڈراؤنی شکل ہمارے ذہن میں موجود ہے، تصور کے طور پر، تخیل کے طور پر۔ تو جب کسی چیز کی بُرائی بیان کرنی ہو کہ وہ ڈراؤنی شکل والا ہے تو ہم کہتے ہیں کہ ایسے ہے جیسے بھوت ہوتا ہے۔ اسی طرح سے یہاں ہو جائے گا کہ شیاطین کے سروں جیسے ان کے پھل ہوں گے، تو شیاطین کے سر، یہ انسان کے لئے کوئی مرغوب فیہ نہیں ہیں، بلکہ ایک ڈراؤنی صورت ہے، تو اس درخت کے پھل بھی ایسے ہوں گے کہ جن کو دیکھ کر ڈر لگے گا۔ پھر یہ تشبیہ اس اعتبار سے بھی ہو سکتی ہے۔ فَاِنَّهُمْ لَاٰكِلُوْنَ مِنْهَا: بے شک وہ جہنمی اس درخت کو کھانے والے ہوں گے، فَمَالِـُٔوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ: پھر اسی کے ساتھ اپنے پیٹوں کو بھرنے والے ہوں گے۔ مالئون: بھرنے والے۔ بطون بطن کی جمع ہے۔ ثُمَّ اِنَّ لَهُمْ عَلَيْهَا لَشَوْبًا مِّنْ حَمِيْمٍ: حمیم کہتے ہیں گرم پانی کو۔ شوب مصدر ہے، شَابَ شَوْبًا: ملاوٹ کرنا۔ اور شوب سے مَشُوب مراد ہے، مرکب، ملایا ہوا۔ جس کا ایک جزء یہاں مذکور ہے گرم پانی، اور دوسرا جزء اس میں کون سا ہوگا، قرآنِ کریم میں کہیں صدید کا ذکر ہے، کہیں غساق کا ذکر ہے، پیپ، لہو، زخموں کا دھوون، جہنمیوں کے زخموں سے جو چیز ٹپکے گی پیپ اور لہو کی شکل میں، اور ان کا پسینہ، یہ ساری کی ساری چیزیں گرم پانی کے ساتھ ملا کر ان کو اُوپر سے پینے کے لئے دی جائیں گی، قرآنِ کریم کی دوسری آیات میں تفصیل موجود ہے۔ "پھر ان کے لئے اس درخت کے اُوپر سے البتہ ایک مرکب ہوگا پینے کے لئے گرم پانی سے" یعنی گرم پانی کے ساتھ دوسری چیزیں ملائی ہوئی ہوں گی، اور وہ ان کو پینے کے لئے دی جائیں گی۔ اور وہ دوسری چیز خون، لہو، پیپ، گند جو جہنمیوں کے جلنے سے ان کے بدنوں سے گرے گا بہے گا، وہ پانی میں ملا کر ان کو پینے کے لئے دیا جائے گا۔ ثُمَّ اِنَّ مَرْجِعَهُمْ لَاِلَى الْجَحِيْمِ: پھر ان کا لوٹنا جحیم کی طرف ہی ہے، آگ کی طرف ہی ہے۔ کیا مطلب؟ کہ یہ سزا پانے کے بعد بھی آگ سے نکلیں گے نہیں، پھر لوٹ پوٹ کے رہنا یہیں ہے۔ ثُمَّ کا یہاں یہ معنی ہے کہ یہ سزائیں پانے کے بعد بھی نکلنا نصیب نہیں ہوگا، پھر لوٹنا ان کا وہیں جہنم کی طرف ہی ہے، جحیم سے مراد پوری جہنم ہے، جس طرح سے ایک جیل ہوتی ہے، اس کے اندر مختلف بلاک ہوتے ہیں، اور مختلف شعبے ہوتے ہیں، تو جہنم میں ایک شعبہ ہوگا مثال کے طور پر گرم پانی کا، ایک شعبہ ہوگا زقوم کا، کوئی شعبہ کسی قسم کا، کوئی کسی قسم کا، تو کبھی ادھر لے جائیں گے، کبھی ادھر لے جائیں گے، لوٹ پوٹ کے رہیں گے جہنم میں، نکلنا نصیب نہیں ہوگا۔ تو ایک تو جحیم عام نام ہو گیا اس جہنم کا، جس طرح سے ایک جیل ہوتی ہے، اور اسی طرح سے اس کے اندر مختلف قطعات ہو جائیں گے۔

جہنمیوں کی گمراہی کی اصل وجہ

اِنَّهُمْ اَلْفَوْا اٰبَآءَهُمْ ضَآلِّيْنَ یہ ان کی گمراہی کی اصل وجہ ذکر کی، کہ انہوں نے اپنی عقل و ہوش کے ساتھ حق کو سمجھنے کی کوشش

نہیں کی، آنکھیں بند کر کے اپنے آباء کے پیچھے لگے رہے۔ ''بے شک پایا انہوں نے اپنے آباء کو گمراہ''، فَهُمْ عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ يُهْرَعُوْنَ:
پس وہ انہی کے نقش قدم پر بھگائے جاتے تھے، ان کے باپ گمراہ تھے ان کے پاس کوئی علم کی روشنی نہیں تھی، ہدایت نہیں تھی، اور یہ
انہی کے نقش قدم پر چلتے رہے، اور ان کے پیچھے بھاگتے رہے۔ وَلَقَدْ ضَلَّ قَبْلَهُمْ اَكْثَرُ الْاَوَّلِيْنَ: البتہ تحقیق ان سے پہلے بھی بہت
لوگ گمراہ ہو چکے ہیں۔ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا فِيْهِمْ مُّنْذِرِيْنَ: ہم نے ان کے اندر ڈرانے والے بھیجے، فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ: پھر
دیکھ تو، ان ڈرائے ہوئے لوگوں کا انجام کیسا ہوا؟ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ: مگر اللہ کے وہ بندے جو چن لیے گئے، یعنی اللہ کے مخلص
بندے اس برے انجام سے بچے، باقی جن کے پاس رسول ڈرانے کے لیے آیا اور انہوں نے رسول کی بات نہیں مانی ان سب کا
انجام برا ہوا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ ﴿۷۵﴾ وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ
البتہ تحقیق پکارا ہمیں نوح نے، اور ہم بہت اچھے جواب دینے والے ہیں ﴿۷۵﴾ اور نجات دی ہم نے نوح کو اور ان کے متعلقین کو بڑی
الْعَظِيْمِ ﴿۷۶﴾ وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهٗ هُمُ الْبٰقِيْنَ ﴿۷۷﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۷۸﴾ سَلٰمٌ
بے چینی سے ﴿۷۶﴾ اور ہم نے نوح کی اولاد کو ہی باقی رہنے والا بنایا ﴿۷۷﴾ ہم نے پچھلے لوگوں میں نوح پر یہ بات چھوڑ دی ﴿۷۸﴾ کہ سلام ہے
عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ﴿۷۹﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۸۰﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا
نوح پر جہانوں میں ﴿۷۹﴾ ہم اسی طرح سے محسنین کو بدلہ دیا کرتے ہیں ﴿۸۰﴾ بے شک یہ نوح ہمارے مؤمن
الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۸۱﴾ ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿۸۲﴾ وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ ﴿۸۳﴾ اِذْ
بندوں میں سے تھے ﴿۸۱﴾ پھر ہم نے دوسروں کو غرق کر دیا ﴿۸۲﴾ بے شک نوح کی جماعت میں سے البتہ ابراہیم ہیں ﴿۸۳﴾ جبکہ آئے وہ
جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ ﴿۸۴﴾ اِذْ قَالَ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۸۵﴾ اَئِفْكًا
اپنے رب کے پاس صاف ستھرا دل لے کر ﴿۸۴﴾ جب کہا انہوں نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو: تم کس چیز کی پوجا کرتے ہو؟ ﴿۸۵﴾ کیا جھوٹ بولنے کے لئے
اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ ﴿۸۶﴾ فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۷﴾ فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي
تم اللہ کے علاوہ آلہہ کا ارادہ کرتے ہو؟ ﴿۸۶﴾ کیا گمان ہے تمہارا رب العالمین کے متعلق ﴿۸۷﴾ پھر دیکھا ابراہیم نے ایک مرتبہ دیکھنا

النُّجُوْمِ ۸۸ فَقَالَ اِنِّیْ سَقِیْمٌ ۸۹ فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِیْنَ ۹۰ فَرَاغَ اِلٰۤى اٰلِهَتِهِمْ

ستاروں میں ۸۸ پھر فرمایا کہ بے شک میں بیمار ہوں ۸۹ پھر وہ لوگ اس سے پیٹھ پھیر کر چلے گئے ۹۰ پس جا گھسے ابراہیم ان کے معبودوں کی طرف

فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ۹۱ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ ۹۲ فَرَاغَ عَلَیْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْیَمِیْنِ ۹۳

پھر کہنے لگے ان کو، تم کھاتے کیوں نہیں؟ ۹۱ تمہیں کیا ہوگیا کہ تم بولتے نہیں؟ ۹۲ پھر قوت کے ساتھ مارتے ہوئے ان پر جا گھسے ۹۳

فَاَقْبَلُوْۤا اِلَیْهِ یَزِفُّوْنَ ۹۴ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ ۹۵ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ

پھر وہ لوگ متوجہ ہوئے ابراہیم کی طرف بھاگتے ہوئے ۹۴ ابراہیم نے کہا کیا تم پُوجا کرتے ہو ان چیزوں کی جن کو خود تراشتے ہو ۹۵ اللہ نے پیدا کیا تمہیں

وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۹۶ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْیَانًا فَاَلْقُوْهُ فِی الْجَحِیْمِ ۹۷ فَاَرَادُوْا بِهٖ

اور ان چیزوں کو جو تم بناتے ہو ۹۶ انہوں نے کہا کہ بناؤ اس کے لئے کوئی عمارت پھر ڈال دو اس کو بھڑکتی ہوئی آگ میں ۹۷ ارادہ کیا انہوں نے ابراہیم کے متعلق

كَیْدًا فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِیْنَ ۹۸ وَقَالَ اِنِّیْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّیْ سَیَهْدِیْنِ ۹۹

ایک تدبیر کا، ہم نے انہی کو اسفل کر دیا ۹۸ اور ابراہیم کہنے لگے کہ بے شک میں جانے والا ہوں اپنے رَبّ کی طرف، وہ ضرور میری راہنمائی کرے گا ۹۹

رَبِّ هَبْ لِیْ مِنَ الصّٰلِحِیْنَ ۱۰۰ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِیْمٍ ۱۰۱ فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ

اے میرے رَبّ! مجھے صالحین میں سے کچھ لوگ عطا فرما ۱۰۰ بشارت دی ہم نے ان کو ایک بچے کی جو کہ بُردبار ہے ۱۰۱ پھر جب وہ بچہ ابراہیم کے ساتھ

السَّعْیَ قَالَ یٰبُنَیَّ اِنِّیْۤ اَرٰى فِی الْمَنَامِ اَنِّیْۤ اَذْبَحُكَ فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰى

دوڑنے کو پہنچ گیا تو ابراہیم نے کہا: اے میرے پیارے بیٹے! بے شک میں دیکھتا ہوں نیند میں کہ میں تجھے ذبح کر رہا ہوں پس تُو غور کر، تیری کیا رائے ہے؟

قَالَ یٰۤاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ٘ سَتَجِدُنِیْۤ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ ۱۰۲ فَلَمَّاۤ

اسماعیل نے کہا: اے اَبا! کر گزر تُو جس چیز کا تو حکم دیا جاتا ہے، ضرور پائے گا تُو مجھے اِن شاء اللہ! صبر کرنے والوں میں سے ۱۰۲ پس جب

اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ۱۰۳ وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰۤاِبْرٰهِیْمُ ۱۰۴ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا

دونوں فرماں بردار ہو گئے، تو ڈال لیا ابراہیم نے اسماعیل کو پہلو کے بَل ۱۰۳ ہم نے آواز دی اس کو کہ اے ابراہیم! ۱۰۴ تُو نے خواب کو سچا کر دکھایا،

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ ۱۰۵ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ ۱۰۶ وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ

ہم محسنین کو ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ۱۰۵ بے شک یہ البتہ کھلی آزمائش ہے ۱۰۶ اور ہم نے فدیہ دیا اسماعیل کا ایک بڑے

عَظِيْمٍ ۝۱۰۷ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ۝۱۰۸ۖ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ ۝۱۰۹ كَذٰلِكَ نَجْزِي

ذبح کے ساتھ ۝۱۰۷ اور ہم نے چھوڑی ابراہیم پر پچھلوں میں یہ بات ۝۱۰۸ کہ سلام ہے ابراہیم پر ۝۱۰۹ اسی طرح سے ہم بدلہ دیا کرتے ہیں

الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۱۰ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ۝۱۱۱ وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِيًّا مِّنَ

محسنین کو ۝۱۱۰ بے شک وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھے ۝۱۱۱ ہم نے بشارت دی ابراہیم کو اسحاق کی، اس حال میں کہ وہ نبی ہے

الصّٰلِحِيْنَ ۝۱۱۲ وَبٰرَكْنَا عَلَيْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ ۭ وَمِنْ ذُرِّيَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ ۝۱۱۳ۧ

صالحین میں سے ہے ۝۱۱۲ اس پر بھی اور اسحاق پر بھی ہم نے برکت دی، اور ان دونوں کی اولاد میں اچھے بھی تھے اور صریح طور پر اپنے آپ پر ظلم کرنے والے بھی تھے ۝۱۱۳

تفسیر

حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ

وَلَقَدْ نَادٰىنَا نُوْحٌ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ: نَادٰى يُنَادِيْ نِدَاءً: پکارنا۔ البتہ تحقیق پکارا ہمیں نوح علیہ السلام نے، آواز دی ہمیں نوح علیہ السلام نے۔ فَلَنِعْمَ الْمُجِيْبُوْنَ: اَلْمُجِيْبُوْنَ یہ نِعْمَ کا فاعل ہے، اور مخصوص بالمدح نحن محذوف ہے۔ اور ہم بہت اچھے جواب دینے والے ہیں، اچھے جواب دینے والے ہیں ہم، یعنی اگر ہمیں کوئی پکارے تو ہم بہت اچھی طرح سے سنتے ہیں اور اس کو قبول کرتے ہیں......
یہاں سے انبیاء علیہم السلام کے واقعات کا سلسلہ شروع ہو رہا ہے، جیسا کہ ابتدا میں آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا تھا کہ اُصول ذکر کرنے کے بعد پھر واقعات کے ساتھ اُن کی وضاحت ہوتی ہے......تو حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ آ رہا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام کا تذکرہ، موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا ذِکر، اور حضرت لُوط علیہ السلام اور یونس علیہ السلام کا ذِکر، اس سورت میں ان پیغمبروں کا تذکرہ آئے گا...... ''نوح علیہ السلام نے پکارا'' اُن کی یہ پکار سورۂ نوح میں ذِکر کی گئی ہے، رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا: اے میرے ربّ! زمین پر کافروں میں سے کوئی چلنے پھرنے والا نہ چھوڑ۔ اور سورۂ قمر میں ان کے الفاظ نقل کئے گئے ہیں: اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ: اے میرے پروردگار! اے میرے ربّ! میں ان کے مقابلے میں مغلوب ہو گیا ہوں، تُو ہی انتقام لے۔ یہ دُعائیں جس وقت حضرت نوح علیہ السلام نے کیں اپنی قوم کے خلاف، تو اللہ تعالیٰ نے وہ دُعائیں قبول کیں۔ اور ان کی قبولیت کا ذکر بھی سورۂ نوح میں ہے، مِمَّا خَطِيْٓـٰٔتِهِمْ اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا: اُن کے جرموں کے سبب سے اُن کو پانی میں ڈبو دیا گیا، اور پانی میں ڈبو کے اُن کو جہنم میں پہنچا دیا گیا...... ہمیں نوح علیہ السلام نے پکارا، ہم بہت اچھے جواب دینے والے ہیں، وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ: اور ہم نے نجات دی نوح علیہ السلام کو، اور اُن کے متعلقین کو، یہاں ''اھل'' سے متعلقین مراد ہیں جو بھی اُن کے اُوپر ایمان لانے والے تھے۔ جیسا کہ دوسری جگہ صراحت ہے کہ ایمان لانے والے بھی کشتی میں سوار ہو کر نجات پا گئے

تھے۔ ”نجات دی ہم نے نوح علیہ السلام کو اور اُن کے متعلقین کو بڑی بے چینی سے“ کرب: بے چینی، گھبراہٹ۔ بہت بڑی گھبراہٹ سے ہم نے انہیں نجات دی، گھبراہٹ وہی تھی جو قوم کی طرف سے مخالفت کی بنا پر ان کی ایذاؤں سے پہنچ رہی تھی۔

کیا موجودہ انسانی آبادی صرف نوح علیہ السلام کی اولاد سے ہے؟

وَجَعَلْنَا ذُرِّيَّتَهُ هُمُ الْبٰقِيْنَ: اور ہم نے نوح علیہ السلام کی اولاد کو ہی باقی رہنے والا بنایا، یعنی طوفانِ عام آیا لوگ غرق ہو گئے، آگے نوح علیہ السلام کی نسل ہی چلی...... اگر نوح علیہ السلام کے ساتھ سوار ہونے والے صرف اُن کے بیٹے اور ان کی بیویاں ہی تھیں، تو پھر آگے اولاد انہی کی چلی۔ اور اگر ان کے علاوہ کچھ اور مؤمنین بھی سوار ہوئے تھے، یعنی ان بیٹوں اور ان کی بیویوں کے علاوہ دوسرے بھی کچھ لوگ ایمان لائے تھے اور وہ ان کے ساتھ سوار ہوئے تھے تو ان کی آگے اولاد نہیں چلی...... راجح قول یہی ہے کہ جس طرح سے سارے کے سارے انسان آدم علیہ السلام کی اولاد ہیں، تو پھر بعد میں سلسلہ سمٹ کر رہ گیا حضرت نوح علیہ السلام پر، اس وقت دُنیا میں جتنے لوگ ہیں وہ حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں، اس لیے نوح علیہ السلام کو آدمِ ثانی کہا جاتا ہے۔ راجح قول یہی ہے، اگرچہ دوسرا قول بھی موجود ہے کہ یہ طوفان عام نہیں تھا، بلکہ صرف سرزمینِ عرب میں آیا جہاں حضرت نوح علیہ السلام رہتے تھے، یہ عراق کا علاقہ ہے، اور جودی عراق کا پہاڑ ہے جس کے اُوپر جا کے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی ٹھہری تھی، اس علاقے میں سوائے ان کے متعلقین کے اور کوئی باقی نہیں رہا، باقی دنیا سے بحث نہیں ہے کہ آدم علیہ السلام کی اولاد کچھ پھیلی ہوئی ہو اور باقی علاقوں کے اندر آباد ہو، وہ اس طوفان کے اندر غرق نہیں کیے گئے، ان کی اولاد بھی چلتی رہی، تو پھر اس قول کے مطابق اس وقت دُنیا کی جتنی آبادی ہے وہ نوح علیہ السلام کی اولاد نہیں، بلکہ اور سلسلوں سے بھی آدم علیہ السلام تک نسب پہنچتا ہے۔ یہ دوسرا قول ہے۔ عام طور پر مفسرین نے پہلے قول کو اختیار کیا ہے۔ یعنی یہ مسئلہ بایں عنوان مختلف فیہ ہو گیا کہ طوفانِ نوح عام تھا یا صرف اس علاقے میں تھا جس علاقے میں حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائے تھے، اس پر بنا ہے اس اختلاف کی کہ یہ باقی رہنے والی اولاد صرف نوح علیہ السلام کی ہے یا نوح علیہ السلام کے علاوہ اوروں کی اولاد بھی باقی ہے۔ راجح قول مفسرین کے نزدیک یہی ہے کہ اب دنیا میں جتنے انسان ہیں سب نوح علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں (دیکھئے: آلوسی)۔

وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ: چھوڑا ہم نے نوح پر پچھلے لوگوں میں۔ کون سی چیز چھوڑی؟ تَرَكْنَا کا مفعول کیا ہے؟ ترکیب یہاں دو طرح سے کی گئی ہے۔ ”جلالین“ نے تو اختیار کیا تَرَكْنَا عَلَيْهِ ثَنَاءً حَسَنًا فِي الْاٰخِرِيْنَ ہم نے پچھلے لوگوں میں نوح علیہ السلام پر اچھی تعریف چھوڑی، پچھلے آنے والے نوح علیہ السلام کی اچھی تعریف کرتے ہیں، یعنی ان کے مخالفین جو تھے وہ نیست و نابود ہو گئے، اُن کا نام لینے والا کوئی باقی نہیں رہا، اور پیچھے آنے والے نوح علیہ السلام کا اچھا تذکرہ کرتے ہیں، اور سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ یہ اللہ کی طرف سے مستقل قول ہو گیا سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ ہماری طرف سے سلام ہے نوح پر جہانوں میں، یعنی ہم نے سلامتی کی دُعا ان کے اوپر باقی رکھی جہانوں میں، انسانوں میں، فرشتوں میں، جنوں میں ان کے اوپر سلامتی کی دعا باقی ہے کہ لوگ جب بھی نوح علیہ السلام کا ذکر کرتے ہیں تو علیہ السلام کہتے ہیں، اسی طرح فرشتے بھی ان کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کرتے ہیں، ان کے لیے صلوٰۃ و سلام بھیجتے ہیں...... یا سَلٰمٌ عَلٰى نُوْحٍ فِي الْعٰلَمِيْنَ یہی جملہ تَرَكْنَا کا مفعول ہے (نسفی)، ہم نے پچھلے لوگوں میں نوح کے اُوپر یہ بات چھوڑی سَلٰمٌ

عَلٰی نُوْحٍ فِی الْعٰلَمِیْنَ یعنی پچھلے لوگوں میں یہ سلام باقی ہے جونوح علیہ السلام کے اوپر بھیجا جارہا ہے، اور یہ سلام سارے جہانوں میں ہے جنوں میں انسانوں میں۔ عالمین میں نوح کے اوپر ہم نے سلام چھوڑا، یعنی یہ دُعا باقی چھوڑی کہ سارے لوگ ان کے لیے دُعا کرتے ہیں، انسان بھی کرتے ہیں، فرشتے بھی کرتے ہیں، اور مؤمنین جن بھی کرتے ہیں...... دونوں طرح سے ترکیب صحیح ہے۔

اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ: ہم اسی طرح سے محسنین کو بدلہ دیا کرتے ہیں، کہ ان کے مخالفین ملیا میٹ ہوجاتے ہیں، ان کا نام ونشان باقی نہیں رہتا، چاہے وہ اپنے وقت میں کتنے زورآور کتنے سرمایہ دار کتنے اقتدار والے ہوں۔ لیکن محسنین باقی رہتے ہیں، ان کا اچھا تذکرہ باقی رہتا ہے، اللہ تعالیٰ دُنیا میں ان کو یہ عزت دیتا ہے، اور آخرت تو پھر انہی کے لئے ہی ہے۔ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِیْنَ: بے شک یہ نوح علیہ السلام ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا، ثُمَّ اَغْرَقْنَا الْاٰخَرِیْنَ: پھر ہم نے دوسروں کو غرق کردیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا واقعہ

وَاِنَّ مِنْ شِیْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِیْمَ: اور نوح علیہ السلام کی جماعت میں سے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ شیعہ کا لفظ آپ کے سامنے پہلے آیا تھا، کہ شیعان لوگوں کو کہا جاتا ہے جو کسی ایک نظریے پر اکٹھے ہوگئے ہوں، تو جن اُصولوں پر نوح علیہ السلام تھے انہی اُصولوں پر ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے، اور انبیاء علیہم السلام سب ایک ہی جماعت ہیں، ایک ہی دِین کی تبلیغ کرتے ہیں، اُصول سب کے ایک ہی ہیں، تو نوح علیہ السلام جو اُصول لے کے آئے تھے انہی اُصولوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کاربند تھے۔ ''بے شک نُوح کی جماعت میں سے البتہ ابراہیم ہیں'' اِذْ جَآءَ رَبَّهٗ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ: جبکہ آئے ابراہیم علیہ السلام اپنے ربّ کے پاس صاف ستھرا دل لے کر۔ قلب سلیم: صحیح سالم دِل، جس کے اندر کوئی کُفر شرک نفاق حسد بغض کینہ، حب دنیا، اور اللہ کے علاوہ باقی چیزوں کی محبت ان کے دل میں نہیں تھی، صاف ستھرا دل لے کے اللہ کے سامنے آئے یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہوئے، تو قلب سلیم سے صاف ستھرا دِل مراد ہے، اور یہاں حضرت شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ کیا ہے ''اپنے ربّ کے پاس لے کر دِل نروگا'' یہ پُرانی اُردو ہے ''نروگا''، ''روگ'' کہتے ہیں بیماری کو۔ ''نروگا'' کا معنی بے مرض، جس میں کوئی کسی قسم کی بیماری نہیں تھی، بے روگ دِل لے کے آئے۔ کُفر، شرک، نفاق، یہ عقیدے کی بیماریاں ہیں، اسی طرح حب دنیا، دنیا کی محبت، اللہ کے علاوہ دوسروں کے ساتھ تعلق یہ اخلاقی بیماریاں ہیں، تو کوئی اس قسم کی بیماری حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قلب میں نہیں تھی، عقائد صحیح، صاف ستھرا دِل لے کے اللہ کے سامنے آئے، یعنی اللہ کی طرف متوجہ ہوئے۔

آگے ان کی تبلیغ جو قوم کے سامنے ہوئی تھی، قوم کے خلاف جو انہوں نے جہاد کیا کُفر وشرک کے مٹانے کے لیے، اس کا تذکرہ ہے، اور یہ واقعات تفصیلاً آپ کے سامنے مختلف سورتوں میں گزر چکے ہیں، اِذْ قَالَ لِاَبِیْهِ وَقَوْمِهٖ مَاذَا تَعْبُدُوْنَ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ سے، اور اپنی قوم سے کہا۔ باپ کا ذِکر صراحتاً آگیا، پہلے اس کو خاص کرکے ذِکر کردیا، پھر آگے عام قوم آگئی۔ اپنے باپ کو بھی خطاب انہوں نے اسی طرح سے کیا، اور قوم کو بھی۔ کیونکہ ان کے باپ بھی اُسی طرح قوم کے ساتھ مل کے بُت پرستی کرتے تھے۔

قومِ ابراہیم کے اصل معبود کون تھے؟

معلوم یوں ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم ستاروں کو بھی پوجتی تھی، اور دُنیا کے واقعات میں ستاروں کو مؤثر سمجھتے تھے کہ ان کی وجہ سے دُنیا میں حادثات نمایاں ہوتے ہیں، واقعات نمایاں ہوتے ہیں، اچھائی بُرائی جو بھی ہے یہ ستاروں کے اثرات سے پیدا ہوتی ہے، اور ممکن ہے کہ اسی طرح سے غیبی مخلوق فرشتے اور جنوں کو بھی پوجتے ہوں، پھر اُن کے ناموں پر انہوں نے بت تراش رکھے تھے، اور وہ بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہوتے تھے۔ اب نام چاہے وہ فرشتوں کا لیں، جنوں کا لیں، ستاروں کا لیں، یعنی کوئی بت سورج کے نام پہ تراش لیا، کوئی چاند کے نام پہ تراش لیا، کوئی مختلف ستاروں کے نام پہ تراش لیا، اب عملاً ان کا جھکنا اور سجدہ کرنا انہی پتھر کے بتوں کے سامنے تھا، چاہے وہ بت انہوں نے کسی کے نام پہ تراشے ہوں، لیکن اسم کی بجائے ان کے سامنے صرف مسمّٰی رہ گیا تھا، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تردید کرتے وقت جو کچھ زور دکھایا ہے وہ انہی تراشے ہوئے بتوں پہ دکھایا، نام کسی کا لیتے ہوں لیکن اس وقت ان کے سامنے یہی تصویریں تھیں جن کو وہ پوج رہے تھے۔ اب ایک بزرگ کی کوئی تصویر بنا کے کھڑی کرلے اور اس کو سجدہ کرنے لگ جائے، چاہے وہ زبان سے یہ کہے کہ میں فلاں بزرگ کو پوجتا ہوں، لیکن عملاً پوجا اسی کی ہے جس کو سامنے رکھا ہوا ہے، اس بزرگ کو تو چاہے پتا بھی نہ ہو خبر بھی نہ ہو، تو جب ان کے سامنے بیٹھ کر دُعائیں کریں گے، فریادیں کریں گے، تو بالکل یقینی بات ہے کہ بزرگ جہاں مدفون ہے، زندہ یا مردہ ہے، وہ نہیں سنتا۔ یہی صورت مشرکین کے اندر اکثر پائی جاتی تھی کہ جس کا نام بھی لیتے تھے، اس کے نام پر کوئی تصویر تراش لیتے، اور اُس کو سامنے رکھ کے عملاً ان کا جتنا بھی عبادت کا کام ہوتا تھا وہ اسی تصویر کے ساتھ ہوتا تھا، جس کو وہ سامنے رکھتے تھے، چاہے لکڑی کی بنالیں، چاہے پتھر کی بنالیں، چاہے پیتل کی بنالیں۔ تو انہوں نے بھی ایسے بت تراش رکھے تھے۔ تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ستاروں کے متعلق بھی تردید کی، اور ان کا بے بس ہونا بھی ظاہر کیا، جس طرح سے سورۂ انعام میں تفصیل آئی تھی۔ اور اس طرح سے ان بتوں کو توڑ کر ان کی بے بسی بھی نمایاں کی، جس طرح سے سورۂ انبیاء میں تفصیل گزری ہے۔

وَاِنَّ مِنْ شِيْعَتِهٖ لَاِبْرٰهِيْمَ: بے شک نوح علیہ السلام کی جماعت سے البتہ ابراہیم علیہ السلام ہیں، یعنی نوح علیہ السلام جن اُصولوں پر تھے انہی اُصولوں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے۔ شیعہ اس جماعت کو کہتے ہیں جو ایک نظریے پر متحد ہوگئی ہو۔ ”جب حضرت ابراہیم علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے سامنے قلبِ سلیم لے کے آئے“ صاف ستھرا دل جس میں کوئی کسی قسم کی بیماری نہیں تھی، کوئی روگ نہیں تھا۔ ”جب کہا انہوں نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو مَاذَا تَعْبُدُوْنَ تم کس چیز کی پوجا کرتے ہو؟“ یہ اِستفہام تحقیر کے لیے ہے۔ اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ: اَتُرِيْدُوْنَ اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ اِفْكًا: یوں ترکیب ہے اس جملے کی۔ کیا تم ارادہ کرتے ہو اللہ کے علاوہ آلِہہ کا، جھوٹ بولنے کے طور پر؟ بہتان باندھتے ہوئے؟ اِفْكًا اٰفِكِيْنَ کے معنی میں ہو کر تُرِيْدُوْنَ کی ضمیر سے حال واقع ہوجائے گا (مظہری وغیرہ)، کیا تم ارادہ کرتے ہو اللہ کے علاوہ آلِہہ کا، تم نے اللہ کے علاوہ آلِہہ کا ارادہ کر رکھا ہے، محض جھوٹ تراشتے ہوئے؟ غلط بات بناتے ہوئے؟ یا مفعول لہٗ ہے یعنی جھوٹ بولنے کے لیے؟ (عام تفاسیر)، تمہارا یہ آلِہہ تراشنا محض اِفک ہے بہتان ہے، اس میں یہ ظاہر کر دیا کہ اللہ

کے علاوہ اور آلِہہ اختیار کرنا محض جھوٹ ہی جھوٹ ہے، اور جو کوئی شخص اس قسم کا ارادہ کرتا ہے تو جھوٹ تراش کرتا ہوا کرتا ہے، اس میں واقعہ اور حقیقت کچھ نہیں ہے۔ اور ''آلہہ'' کا لفظ بتاتا ہے کہ ان چیزوں کو اِلٰہ قرار دیتے تھے، اور ان کے لئے اِلٰہ والی صفات ثابت کرتے تھے۔

''مشرک'' اللہ تعالیٰ کے متعلق بدگمان ہوتا ہے

فَمَا ظَنُّكُمْ بِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: کیا گمان ہے تمہارا ربّ العالمین کے متعلق، تم نے ربّ العالمین کو کیا سمجھ رکھا ہے۔ یہ شرک کی بنیاد پر چوٹ لگائی ہے کہ جس وقت تک کوئی شخص ربّ العالمین کے متعلق کوئی غلط نظریہ نہ رکھے اس وقت تک شرک نہیں شروع ہوتا۔ تم نے ربّ العالمین کو کیا سمجھ لیا، کہ وہ کائنات کو پیدا کر کے خود فارغ ہو کے بیٹھ گیا؟ اور اس نے اپنے اختیارات ان پر بانٹ دیے؟ تم نے ربّ العالمین کو یہ سمجھ رکھا ہے؟ یا تم نے ربّ العالمین کو اپنے دنیوی بادشاہوں کی طرح سمجھ رکھا ہے؟ کہ اُس کو اپنی کائنات کی کوئی خبر نہیں کہ کہاں کیا ہوتا ہے؟ علم میں کمی ہے؟ قدرت میں کمی ہے؟ تم کس بدگمانی میں مبتلا ہو گئے ربّ العالمین کے متعلق؟ جو تم نے اور تراش لیے۔ تم نے مخلوق کی طرح سمجھ لیا ہے؟ کہ وہ کائنات پہ اکیلا کنٹرول نہیں کر سکتا، اس لیے اس کو معاون اور مددگار چاہئیں؟ یا وہ اس طرح سے کسی کا عاشق اور محب ہو گیا ہے؟ کہ محبوب اور معشوق جو کہے وہ مان لیتا ہے، جس طرح سے عاشق کی ایک کمزوری ہوتی ہے کہ معشوق کی ہر بات مانتا ہے، تو تم نے ربّ العالمین کو یوں سمجھ لیا ہے؟ کہ اس کو اپنی کائنات میں بعض افراد کوئی اس قسم کا تعلق ہے کہ جو وہ کہیں، وہ تسلیم کرتا ہے۔ یہ سب نظریات غلط ہیں۔ اسی قسم کی بدگمانیاں ہوتی ہیں مشرکین کے قلوب میں جن کی بنا پر وہ دوسرے سہارے تلاش کرتے ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ ہماری رسائی نہیں، ہماری وہاں کون سنتا ہے، یہ بھی ایک بدگمانی ہے ربّ العالمین پر، یا وہ سمجھتے ہیں کہ جیسے دنیا کے بادشاہ دُور دُور کے علاقوں کے خود انتظام نہیں کر سکتے، ان کو نائبین کی ضرورت ہوتی ہے، گویا کہ عاجز ہے، علم میں کمی ہے، یہ بدگمانی ہو گئی، تبھی وہ اس کے لیے اور معاون تلاش کرتے ہیں، تو تم نے ربّ العالمین کو سمجھ رکھا ہے؟ کیا گمان ہے تمہارا ربّ العالمین کے متعلق؟

خلاصۂ آیات

فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ: پھر دیکھا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ایک مرتبہ دیکھنا ستاروں میں، فَقَالَ اِنِّيْ سَقِيْمٌ: پھر فرمایا کہ بے شک میں بیمار ہوں، فَتَوَلَّوْا عَنْهُ مُدْبِرِيْنَ: پھر وہ لوگ اس سے پیٹھ پھیر کر چلے گئے۔ مُدْبِرِيْنَ یہ تولوا کا حالِ مؤکدہ ہے۔ فَرَاغَ اِلٰٓى اٰلِهَتِهِمْ: رَاغَ رَوَغًا: کسی کو مغالطہ دے کے کوئی کام کر لینا، غالباً آپ کی زبان میں اس کو کہتے ہیں ''فلانا گتی مار گیا''، اور اس کو ہماری زبان میں چغانی دینا کہتے ہیں، اور اُردو کے اندر اس کے لیے لفظ بولا جاتا ہے ''کا وادے کر کوئی کام کر لینا'' یعنی ظاہری طور پر دکھایا کچھ اور کر کچھ لیا۔ اس کی مراد ظاہر کرنے کے لئے ایسے ہی لفظ بولے جاتے ہیں، اور یہاں مطلب یہ ہوگا کہ ان لوگوں سے

بچ بچا کر، جا گھسے، ان لوگوں کو پتا نہ لگنے دیا، اس لیے ترجمہ ہم یہاں یوں کریں گے ''پس جا گھسے حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کے معبودوں کی طرف'' یعنی ان لوگوں سے بچ بچا کے، آنکھ بچا کے۔ فَقَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ: جا کے ان آلہہ کو کہنے لگے، اَلَا تَاْكُلُوْنَ تم کھاتے کیوں نہیں ہو؟ مَا لَكُمْ لَا تَنْطِقُوْنَ: تمہیں کیا ہو گیا؟ تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ فَرَاغَ عَلَيْهِمْ ضَرْبًۢا بِالْيَمِيْنِ: اَیْ یَضْرِبُ ضَرْبًا بِالْيَمِيْنِ پھر جا گھسے ان پر دائیں ہاتھ کے ساتھ مارتے ہوئے پٹائی کرتے ہوئے، جا پڑے ان پر دائیں ہاتھ کے ساتھ مارتے ہوئے۔ دائیں ہاتھ میں چونکہ قوت اور زور ہوتا ہے بائیں کے مقابلے میں، اس لئے اس کا ترجمہ یوں بھی کیا گیا ہے ''زور کے ساتھ مارتے ہوئے، قوت کے ساتھ مارتے ہوئے ان پر جا گھسے۔'' فَاَقْبَلُوْٓا اِلَيْهِ يَزِفُّوْنَ: پھر وہ لوگ متوجہ ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف بھاگتے ہوئے۔ قَالَ اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ: ابراہیم علیہ السلام نے کہا: کیا تم پُوجا کرتے ہو اُن چیزوں کی جن کو خود تراشتے ہو؟ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ نے پیدا کیا تمہیں اور ان چیزوں کو جو تم بناتے ہو۔ قَالُوا ابْنُوْا لَهٗ بُنْيَانًا: انہوں نے کہا کہ بناؤ اس کے لئے کوئی عمارت فَاَلْقُوْهُ فِي الْجَحِيْمِ: پھر ڈال دو اس کو بھڑکتی ہوئی آگ میں۔ فَاَرَادُوْا بِهٖ كَيْدًا: ارادہ کیا ان لوگوں نے ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ایک مکر کا، تدبیر کا۔ فَجَعَلْنٰهُمُ الْاَسْفَلِيْنَ: ہم نے انہی کو اسفل کر دیا، وہ اس معاملہ میں شکست کھا گئے، وہی مغلوب ہو گئے، زیر ہو گئے، وہ اپنی اس تدبیر کے اندر کامیاب نہ ہو سکے۔

واقعہ ''فَنَظَرَ نَظْرَةً'' کی پہلی تعبیر

ان آیات میں واقعہ ذکر کیا گیا حضرت ابراہیم علیہ السلام کا، جو شرک کی تردید میں ایک نمایاں واقعہ ہے، سورۂ انبیاء کے اندر اس کی تفصیل آئی تھی، حاصل اس کا یہ ہے، معلوم یوں ہوتا ہے (جس میں فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُوْمِ کا مفہوم بھی سامنے آجائے گا، کہ ستاروں کی طرف ایک دفعہ دیکھا اور کہا کہ میں بیمار ہوں) یہ واقعہ کیسے ہوا؟...... دو طرح سے اس کی تعبیر کی گئی ہے...... عام طور پر مفسرین نے اس واقعے کو یوں نمایاں کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم کے ساتھ کشاکشی تو ظاہر ہو ہی گئی تھی، قوم ان کو اپنے راستے پر لانا چاہتی تھی، باپ بھی دھمکاتا تھا دوسرے بھی سمجھاتے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن کے شرک کی تردید کرتے تھے۔ اسی کشاکشی کے دور میں کوئی جشن اور میلے کا وقت آ گیا اس قوم کا۔ جس طرح سے ہر قوم کوئی نہ کوئی دن ایسا رکھا کرتی ہے، جس میں اکٹھے ہوتے ہیں، جشن مناتے ہیں، میلہ لگاتے ہیں، یہ میلوں کا ذوق بہت پُرانا ہے، تو سب نے باہر جانا تھا، کسی میدان کے اندر اکٹھے ہونا تھا، جیسا کہ میلے میں ہوا کرتا ہے، جیسے کہروڑ پکا والے ''پیر جیون'' میں اکٹھے ہو جاتے ہیں، ان دنوں میں یہاں کوئی آدمی نظر ہی نہیں آتا، سب نکل جاتے ہیں، اور آپ کے علاقوں میں بھی میلے ہوتے ہوں گے، کہیں قبروں پر، کہیں دوسری جگہ لگتے رہتے ہیں۔ تو یہ بھی کسی جشن کے موقع پر اکٹھا ہونا چاہتے تھے، تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بھی ترغیب دی کہ آپ بھی چلیں، اور ان کو ساتھ لے جانے کا مقصد یہ ہو گا کہ باہر جائیں گے ہمارا مجمع دیکھیں گے، ہماری آن بان شان و شوکت ان کے سامنے آئے گی، تو ہو سکتا ہے کہ یہ کچھ متاثر ہو جائیں، اس خیال سے وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام انکار

کررہے تھے کہ میں ساتھ نہیں جاتا، جب انہوں نے زیادہ اِصرار کیا (اور معلوم ہوتا ہے کہ وقت بھی رات کا تھا) جب زیادہ اصرار کیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نظریں آسمان کی طرف اُٹھائی ایک دفعہ، ستاروں کی طرف دیکھا، ستاروں کی طرف دیکھ کے کہنے لگے: اِنِّیْ سَقِیْمٌ: میں تو بیمار ہوں۔ وہ قوم چونکہ ستارہ پرست تھی، اور ستاروں کے اثرات کی قائل تھی، اوراُن کے اندر علم نجوم مروّج تھا، تو اپنے خیال کے مطابق انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس عمل کی توجیہ یہ کرلی کہ شاید ابراہیم علیہ السلام نے بھی ستاروں کی طرف رُجوع کرکے ستاروں کی طرف دیکھ کے کوئی اثرات معلوم کرلیے ہوں گے کہ اُن کو کوئی تکلیف آنے والی ہے۔ اس لیے وہ سمجھ گئے کہ ابراہیم جو کہتے ہیں اِنِّیْ سَقِیْمٌ تو ان کو چھوڑ دینا چاہیے، ساتھ نہ لے کے جائیں، یعنی ستاروں کی طرف دیکھنے کی بنا پر انہوں نے یہ سمجھ لیا کہ شاید انہوں نے ستاروں سے کوئی چیز معلوم کرلی کہ عنقریب یہ بیمار ہونے والے ہیں، اوران کے اوپر بیماری کا اثر ہے یا ہوجائے گا، جس کی بنا پر انہوں نے اِصرار چھوڑ دیا اور چھوڑ کر چلے گئے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی ''توریہ'' کیا، وہ پیچھے رہنا چاہتے تھے کسی نہ کسی بہانے سے، مقصد اُن کا یہ تھا کہ جب یہ چلے جائیں گے، آگے پیچھے تو بت خانے میں گھسنے کا موقع نہیں ملتا، تو آج جس وقت اکیلا ہوں گا، قوم ساری کی ساری چلی جائے گی، تو جو انہوں نے دھمکی دی تھی، لَاَكِيْدَنَّ اَصْنَامَكُمْ (سورۂ انبیاء: ۵۷) میں تمہارے بتوں کے خلاف کوئی چال چلوں گا، میں ان کی مرمت کروں گا، ان کی گت بناؤں گا (جس طرح سے ترجمہ وہاں کیا گیا تھا) تو اپنی اس تدبیر کو وہ کامیاب یوں کرنا چاہتے تھے، کہ قوم ساری کی ساری چلی جائے تو پیچھے اُن کی مرمت کروں گا۔ تو ظاہر انہوں نے یوں کیا گویا کہ میں بیمار ہوں...... اب وہ بیماری حقیقت میں تھی یا نہیں تھی؟ اس پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں، کیونکہ یہ ذہنی اُلجھن، ہر وقت کی پریشانی، یہ کوئی بیماری سے کم نہیں ہے۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات حقیقت کے اعتبار سے تو غلط نہیں تھی، لیکن جس انداز میں قوم سمجھی اس انداز میں یہ بات خلاف واقع تھی، جس کی بنا پر حدیث شریف میں اس جملے کو بھی اُن جملوں کے ساتھ ملا کے ذِکر کیا گیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے ظاہری طور پر اگر خلاف واقع باتیں نکلی ہیں، تو تین ہی نکلی ہیں۔ وہ اس مطلب کے تحت ہے جو مطلب اس کا قوم نے سمجھا تھا، ورنہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ''توریہ'' کیا تھا۔ ''توریہ'' کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کلام ذوجہتین ہوتی ہے، سمجھنے والا کچھ سمجھ جاتا ہے، متکلم کی مراد کچھ اور ہوتی ہے، متکلم اپنی مراد کے تحت سچ کہہ رہا ہے، لیکن جو مطلب دوسرے مخاطب نے سمجھا، وہ اُس کی اپنی ذمہ داری ہے، اُس کے اعتبار سے وہ بات خلاف واقع ہوتی ہے...... جیسے سفرِ ہجرت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم جارہے تھے، تو اگر کوئی ابوبکر رضی اللہ عنہ سے پوچھ لیتا کہ یہ کون ہے؟ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ ظاہر نہیں کرنا چاہتے تھے کہ یہ اللہ کے رسول ہیں، اللہ کے نبی ہیں، تو وہ جواب دیتے: ''رَجُلٌ يَهْدِيْنِي الطَّرِيْقَ''(1) یہ ایک آدمی ہے جو مجھے راستہ دِکھاتا ہے۔ اب سننے والا سمجھتا کہ جس طرح سے سفر پر جاتے ہوئے لوگ راہنما ساتھ لے لیا کرتے ہیں جو راستے کے ماہر ہوتے ہیں، تو یہ بھی کوئی اسی قسم کا راہنما ہی ہوگا، اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی مراد تھی کہ یہ ہادیٔ طریق ہے، طریق سے مراد معنوی طریق۔ تو بولنے والا کسی اور لحاظ سے بولے، اور سمجھنے والا کچھ اور سمجھ لے، تو ذمہ داری سمجھنے والے پہ ہوتی

(1) تاریخ الاسلام للذھبی ج ۲ ص ۴ ،بعنوان السنۃ الاولی من الھجرۃ۔ نیز بخاری ۱/ ۵۵۶، باب ھجرۃ النبی، ولفظہ: هٰذَا الرَّجُلُ يَهْدِيْنِي السَّبِيْلَ۔

ہے، لیکن دوسرے وقت میں جب مطلب ظاہر ہوتا ہے تو سمجھنے والا سمجھتا ہے کہ دیکھو! مجھے مغالطہ دے دیا، یعنی اس سمجھ کے اعتبار سے اس جملے کو خلافِ واقع قرار دیا گیا، ورنہ حقیقت کے لحاظ سے اس میں کوئی جھوٹ یا جھوٹ کا شائبہ نہیں ہے۔

بتوں کے خلاف آپریشن

تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یوں تدبیر کی ان سے پیچھے رہنے کے لئے، تاکہ یہ لوگ مجبور کر کے مجھے لے نہ جائیں، جب وہ سارے کے سارے چلے گئے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام اُن سے آنکھ بچا کے بُت خانے میں جا گھسے۔ اگر وہ لوگ موجود ہوتے تو شاید اس انداز سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو نہ جانے دیتے، اور اگر ابراہیم علیہ السلام چلے ہی جاتے تو آگے وہ اپنی موجودگی میں کارروائی کرنے نہ دیتے۔ تو یہ موقع تاڑا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے، اس تدبیر سے رہ گئے، جا کے پہلے تو اُن بتوں کا مذاق اُڑایا۔ معلوم یہ ہوتا ہے کہ جیسے ہتھوڑا یا کلہاڑا ہاتھ میں تھا، وہ ایک طرف سے جو گھسے، تو جیسے انسان یوں دائیں ہاتھ کے ساتھ مارتا بھی جاتا ہے، اور کہتا ہے کیا بات ہے؟ یہ سامنے رکھے ہوئے کھانے کھاتے کیوں نہیں ہو؟ او! تم بولتے کیوں نہیں ہو؟ میں تم سے باتیں کر رہا ہوں۔ یہ بھی ایک قسم کا غصہ ظاہر کرنے اور ان کا مذاق اُڑانے والی بات ہے، پتا تو ہے یہ نہ کھا سکتے ہیں نہ بول سکتے ہیں، چڑھاوے جوان کے سامنے رکھے ہوئے تھے تو صورت تو ایسی تھی جیسے شکل انسانوں کی بنائی ہوئی ہے، کھانے کی چیزیں سامنے رکھی ہوئی ہیں، تو پھر یہ کھاتے کیوں نہیں؟ اور بات کیوں نہیں کرتے؟ اس طرح سے ان کو طعن تشنیع بھی کرتے چلے گئے، زبان سے بھی غصے کا اظہار کرتے چلے گئے، اور مار مار کے سب کا ستیاناس کر دیا، البتہ جو بڑا تھا اپنی تدبیر کے تحت جو انہوں نے ذہن میں ایک سکیم بنائی تھی، جس آلے کے ساتھ اُن کو توڑا تھا، وہ آلہ اس کے کندھے پر رکھ کے آ گئے۔ ظاہر یہی کرنا چاہتے تھے کہ جب اس کے ہاتھ میں ہتھوڑا ہوگا، لوگ آئیں گے، یکدم اُن کی طبیعت اِدھر متوجہ ہوگی، کہ شاید بڑا ناراض ہو گیا، تو اس نے چھوٹوں کو مار دیا، لیکن پھر جب یہ سوچیں گے کہ یہ تو اپنی جگہ سے حرکت ہی نہیں کر سکتا، یہ کیسے مار سکتا ہے؟ یہ تو کسی دوسرے نے مارا ہوگا، اس کا عجز بھی نمایاں ہو جائے گا، اور باقیوں کا عجز بھی نمایاں ہو جائے گا، تو مجھے بات بنانے کا موقع ملے گا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ذہن میں یہ سکیم تھی، اس طرح سے پیچھے رہ کے وہ یوں بُت خانے کے اندر جا گھسے، جا کے انہوں نے بُت ریزہ ریزہ کر دیے۔ عام طور پر مفسرین نے اس واقعے کی تعبیر اس طرح سے کی ہے۔

”فَنَظَرَ نَظْرَةً“ کا ایک اور مفہوم

اور بعض جدید مفسرین کہتے ہیں کہ معلوم یوں ہوتا ہے کہ ان کا میلہ بُت خانے میں ہی تھا، اور وقت تھا رات کا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام وہاں ان کے میلے میں تشریف لے گئے ہیں، اور وہاں جا کے اُن کے ساتھ اُلجھتے رہے، اُن کو سمجھاتے رہے، جس طرح سے سرورِ کائنات ﷺ بھی میلوں کے مواقع پر جاتے تھے، حدیث شریف میں آتا ہے، سوقِ عکاظ اور جہاں جہاں ان کے میلے ہوتے وہاں حضور ﷺ تشریف لے جاتے تھے، مجمع عام دیکھ کے اُن کو تبلیغ کرتے تھے، اور اُن کی غلطیاں نمایاں کرتے۔ تو جب یہ سارے کے سارے بُت خانے میں اکٹھے ہوئے ہوئے تھے رات کے وقت اپنا جشن منانے کے لیے، بتوں پہ

چڑھاوے چڑھائے تھے اور اپنی مشرکانہ رُسوم ادا کر رہے تھے تو وہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی موجود تھے، اور وہ اُن کے ساتھ اُلجھ رہے تھے ان کے ساتھ باتیں کر رہے تھے ان کو سمجھا رہے تھے جس طرح سے ایک تبلیغی مشن ہوتا ہے، اور یہی قصہ کرتے کراتے، وہ اپنے شغل میں لگے رہے اور یہ اپنے طور پر اس مجمع میں تبلیغ کرتے رہے، تو آخر میلا منتشر ہوا، وقت ختم ہوا تو آخر مجمع جانا ہی تھا، تو جب جانے لگے تو انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کہا ہوگا کہ آپ بھی چلیں، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن مفسرین کی تعبیر کے مطابق کہ جس طرح سے آج جس وقت کوئی ضرورت پیش آتی ہے، تو ہر شخص کی نظر اپنی کلائی کی گھڑی پر جاتی ہے کہ کتنا وقت ہو گیا، پھر دیکھ کے کہتے ہیں کہ اوہو! یہ تو بہت دیر ہوگئی، یوں وقت دیکھ کے اندازہ کرتے ہیں، اور جب یہ گھڑیاں نہیں تھیں اس وقت (بدویانہ زندگی میں آج بھی ایسے ہی ہے، کہ وقت کا اندازہ کرنے کے لئے دِن کو لوگ سورج کو دیکھتے ہیں کہ سورج کہاں چلا گیا۔ اور رات کا وقت ہو تو ستاروں پر نظر ڈالتے ہیں کہ ستارے کہاں کہاں چلے گئے، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وقت کتنا گزر گیا) تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح سے ستاروں کی طرف دیکھا وقت کا اندازہ لگانے کے لئے، تو وقت کا اندازہ لگا کے کہا کہ رات بہت گزر گئی، میں تو تھکا ہوا ہوں، درماندہ ہوں، عاجز ہوں، میں تو اس وقت جا نہیں سکتا، میں تو یہیں رہوں گا۔ تو سقیم صرف بیمار کو ہی نہیں کہتے بلکہ جو کام کرتا ہوا تھک گیا ہو، جس میں کوئی کمزوری آگئی ہو، ناتوانی آگئی ہو، اُس کو بھی سقیم کہتے ہیں۔ تو انہوں نے ستاروں کی طرف دیکھ کے یہ ظاہر کیا کہ وقت بہت گزر گیا، رات زیادہ گزر گئی، اس لیے میں تو نہیں جاتا، میں تو یہیں رہوں گا، تو جب قوم نے دیکھا کہ یہ یہیں رہنا چاہتے ہیں، تو کوئی ایسا خیال نہ کیا کہ یہ اگر تھک گئے ہیں، تو چلو! رات یہیں گزار لیں گے، تو وہ پیٹھ پھیر کے چلے گئے۔ جب چلے گئے، اور یہ جو مجاور تھے، محافظ تھے، یہ بھی سو گئے تو پھر ایسے موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام آنکھ بچا کر بُت خانے میں جا گھسے، اور وہاں جا کے انہوں نے اس طرح سے کارروائی کی۔ تو فَنَظَرَ نَظْرَةً فِي النُّجُومِ کی تعبیر انہوں نے اس طرح سے کی ہے...... لیکن عامۂ مفسرین کی تعبیر وہی ہے جو میں نے آپ کی خدمت میں پہلے پیش کی کہ وہ لے جانا چاہتے تھے لیکن حضرت ابراہیم نے ستاروں کی طرف دیکھ کے عذر کیا کہ میں نہیں جاتا، میں بیمار ہونے والا ہوں یا میں بیمار ہوں...... اور اس دوسری تعبیر کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کی میلے میں شرکت ویسی تھی جیسے احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی میلوں کے مواقع پہ چلے جاتے تھے، اس خیال سے کہ وہاں مجمع عام ہوگا، وہاں ان کو سمجھانے کی وعظ کرنے کی اور تبلیغ کرنے کی سہولت ہے، اس خیال سے چلے جایا کرتے تھے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ان کو سمجھانے کے لیے ان کی تردید کرنے کے لیے چلے گئے ہوں، جب مجمع منتشر ہونے لگا تو انہوں نے اپنے آپ کو کچھ بیمار یا کمزور ظاہر کر کے وہیں ٹھہرنے کی ٹھان لی، کہ یہ جب یہ چلے جائیں گے تو ان کے بعد پھر ان بتوں کی مرمت کروں گا، ان کے دِل میں یہ تھا۔ تو وہ اندر گھسے اور جا کے ان کو توڑ پھوڑ دیا، اور زبان کے ساتھ بھی طعن تشنیع کی، اور جب اس سے فارغ ہو گئے، گھر چلے گئے ہوں گے، پھر لوگوں کو جب پتا چلا کہ بُت خانے میں یہ حادثہ ہو گیا، پھر سارے بھاگے بھاگے آئے، اور پھر یہی تذکرہ ہوا کہ وہی ان کی بُرائی بیان کر رہے تھے، یہ حرکت اگر ہو سکتی ہے تو انہی کی ہو سکتی ہے، سَمِعْنَا فَتًى يَذْكُرُهُمْ يُقَالُ لَهُ إِبْرَاهِيمُ (سورۂ انبیاء: ۶۰) ہم نے ایک جوان کو سُنا تھا جو ان کا بُرائی سے تذکرہ کر رہا تھا، اس کو ابراہیم

کہتے ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ شرارت اسی کی ہے۔ یوں انہوں نے آپس میں تذکرہ کیا، پھر وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس گئے اور ان کو لوگوں کے سامنے لے آئے، اور اسی بات کو حضرت ابراہیم علیہ السلام چاہتے تھے کہ کسی طرح سے آئیں اور میں اُن کے اُوپر یوں اتمامِ حجت کروں۔ تو جب آپس میں گفتگو ہوئی، تفصیل آپ کے سامنے سورۂ انبیاء میں آئی تھی، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس فعل کی نسبت پہلے بڑے کی طرف کی، جب انہوں نے کہا کہ یہ تو بولتا ہی نہیں، تب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اُن کو ڈانٹا تھا اور ملامت کی تھی کہ ایسی بے حس چیزیں بے حرکت چیزیں، ان کو تم پوجتے ہو؟

قومِ ابراہیم کے اصل معبود یہی پتھر کی مورتیاں ہی تھیں

یہاں اسی کا خلاصہ سا نقل کر دیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا اَتَعْبُدُوْنَ مَا تَنْحِتُوْنَ: کیا تم عبادت کرتے ہو ان چیزوں کی جن کو خود تراشتے ہو؟ معلوم ہو گیا کہ اُن کے ہاتھوں کے تراشے ہوئے وہی ان کے معبود کے درجے میں تھے، پوجا انہی کی کرتے تھے، تبھی تو اُن کا توڑنا اور خراب کر دینا ان کے لئے شرک کی تردید کا ذریعہ بنا، اور اُن کا عجز نمایاں ہوا۔ ایک شخص کسی دوسرے آدمی کے متعلق دعویٰ رکھتا ہے کہ "اس کو بہت اختیارات ہیں، وہ جو چاہے کر سکتا ہے، اور اس کو اس قسم کی قوت اور طاقت حاصل ہے" ایک آدمی کسی دوسرے کے متعلق یہ عقیدہ رکھتا ہے، اور آپ کے ہاتھ میں اس کا فوٹو ہو جس کے متعلق وہ قادر ہونے کا عقیدہ رکھتا ہے، آپ اس کے سامنے کھڑے ہو کے اس کا فوٹو پھاڑ دیں اور کہیں کہ لو! کہاں قادر ہے، یہ تو بے بس ہے، دیکھو! میں نے اس کو پھاڑ دیا، تو کیا یہ دلیل اس دعوے کی تردید کر سکتی ہے؟ کسی کی تصویر پھاڑ دینے سے خود اس کا عجز ظاہر ہو جایا کرتا ہے؟ کیونکہ تصویر ایک علیحدہ چیز ہے اور جس کے لیے قوت کا قول کیا جا رہا وہ علیحدہ چیز ہے...... جن دنوں میں یہاں بھٹو کی شاہی تھی تو ان دنوں میں ہر روز بھٹو کی تصویر اخبار میں آتی تھی، لوگ ان کو پاؤں کے نیچے کچلتے تھے، نالیوں کے اندر پھینک دیتے تھے، پھاڑ کے پھینک دیتے تھے۔ تو کیا کوئی شخص اس سے استدلال کر سکتا ہے؟ کہ بھٹو کو اس ملک میں کوئی اختیار حاصل نہیں، دیکھو! اس کی تصویریں تو گلیوں میں دھکے کھاتی پھرتی ہیں...... تو اگر ان کے معبود ہوتے کوئی اور، اور ان بتوں کے ساتھ ان کا تعلق معبود ہونے کا نہ ہوتا، اور وہ اختیارات اور قدرت کو ان پتھر کی تصویروں کی طرف منسوب نہ کرتے، تو یہ پتھر کی تصویریں توڑنے کے ساتھ اُن کے معبودوں کا عجز کیسے ظاہر ہو جاتا؟، یہ نکتہ قابلِ غور ہے..... اس لیے حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بات بالکل صحیح ہے کہ شرک کی ابتدا چاہے کسی نہج سے ہوئی ہو، بعد میں ایسا خلطِ عظیم واقع ہوا، ایسی جہالت آئی کہ لوگوں کے سامنے صرف یہ تصویریں ہی رہ گئیں، اور جن شخصیات کی وہ تصویریں بناتے تھے، وہ بھی اُوجھل ہو گئیں۔ اس لیے اپنے ہاتھوں سے تراشے ہوؤں کو معبود قرار دیا ہے، اور انہی کو توڑ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان معبودوں کے عجز کو ظاہر کیا ہے، اگر یہ تصویر کسی اور چیز کی ہوتی، حقیقت کے اعتبار سے وہ معبود اوروں کو کہتے، تو کہہ سکتے تھے کہ ابراہیم! تم یہ کیا کر رہے ہو؟ یہ تو ہم نے یاد دہانی کے لیے سامنے رکھے ہوئے ہیں، معبود تو ہمارے فرشتے ہیں، یا معبود تو ہمارا افلاس ہے، تو تیرے اس تصویر کو توڑ دینے کے ساتھ کس طرح سے ثابت ہو گیا کہ ان میں کوئی طاقت نہیں ہے؟ یہ بات آگے سے نہیں کہی گئی، بلکہ وہ سرنگوں ہو گئے اور کہنے لگے تجھے پتا ہے یہ تو کچھ کر نہیں سکتے یہ تو بولتے نہیں۔ تب حضرت

ابراہیم علیہ السلام نے کہا تھا اُفٍّ لَّكُمْ وَلِمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ انبیاء:۶۷) تف ہے تم پر اور ان چیزوں پر جن کو تم اللہ کے علاوہ پوجتے ہو، جن میں اتنی طاقت ہی نہیں کہ اپنے آپ کو بچالیں اور اپنا دفاع ہی کرلیں۔ تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ جو بُت تراش کے سامنے رکھا کرتے تھے، تو آخرکار اپنی جہالت کی وجہ سے عبادت کا تعلق اُن کا انہی بتوں کے ساتھ ہی ہوگیا تھا، اس لیے ان بتوں کے عجز کو ظاہر کرکے بتایا جارہا ہے کہ جن کو تم آلہہ کہتے ہو، ان میں تو کوئی کسی قسم کی قوت ہے ہی نہیں۔ اس لیے انہی کے سامنے وہ فریادیں کرتے تھے، انہی کے سامنے دُعائیں کرتے تھے، انہی کو سجدہ کرتے تھے، انہی کے سامنے چڑھاوے چڑھاتے تھے، تو مَا تَنْحِتُوْنَ یعنی جو اُن کے ہاتھوں کی تراشی ہوئی چیزیں تھیں اُنہی کے ساتھ اُن کا عبادت کا تعلق تھا، اس لیے اُن کو توڑ کے اُن کا عجز ظاہر کیا گیا۔ وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ اللہ نے تمہیں بھی پیدا کیا اور اُن چیزوں کو بھی جو تم بناتے ہو، لکڑی، پتھر، اینٹ جو کچھ بھی ہے جس کا تم بُت بناتے ہو یہ بھی اللہ کی مخلوق ہے، اور تم بھی اللہ کی مخلوق ہو، تو یہ اللہ کے شریک کس طرح سے ہوگئے؟

قوم کی طرف سے اِنتقام کی کوشش اور ناکامی

جب اس بات کا وہ کوئی جواب نہ دے سکے، تو آخر پھر وہی جاہلوں والی بات کہ جب دلیل کا جواب دلیل سے نہ ہو تو پھر مکا نکال لیتے ہیں۔ پھر انہوں نے یہی کہا کہ دیکھو! انہوں نے ہمارا دِل جلایا، اب اِس کی سزا یہی ہے کہ اس کو اسی طرح سے زندہ آگ میں جلاؤ، حکومت بھی خلاف تھی، نمرود کے ساتھ بھی ٹکر لگ چکی تھی، اس لیے حکومت اور عوام سب کے تعاون کے ساتھ یہ چیز انہوں نے طے کرلی، آگ بھڑکائی گئی، اور اس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو واقعۃً ڈالا گیا، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم آگیا کہ يٰنَارُ كُوْنِيْ بَرْدًا وَّسَلٰمًا عَلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ (سورۂ انبیاء:۶۹) اے آگ! ٹھنڈی ہوجا، سلامتی والی ہوجا۔ اسی کو یہاں صرف خلاصے کے طور پر ذکر کردیا، کہ ان لوگوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق ایک چال چلی تھی، لیکن شکست یہی کھا گئے، اس چال میں یہ کامیاب نہ ہوئے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی نقصان نہ پہنچا سکے، ہم نے انہی کو اسفل کردیا۔

سیدنا ابراہیم علیہ السلام کا سفرِ ہجرت

وَقَالَ اِنِّيْ ذَاهِبٌ اِلٰى رَبِّيْ سَيَهْدِيْنِ: یہاں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سفرِ ہجرت کا تذکرہ ہے، کہ جب خاندان بھی نہ مانا، قوم بھی نہ مانی، حکومت بھی خلاف ہوگئی، حضرت ابراہیم علیہ السلام ان سے مایوس ہوگئے کہ یہ کسی طرح سے سیدھے ہونے والے نہیں، تو اب ارادہ کرلیا کہ میں اس علاقے کو چھوڑ کر کسی اور علاقے کی طرف جاتا ہوں، تو عراق سے شام کی طرف ہجرت کی۔ آپ کی بیوی سارہ ساتھ تھیں، اور آپ کے بھتیجے لُوط علیہ السلام بھی ساتھ تھے۔ ''کہنے لگے کہ بے شک میں جانے والا ہوں اپنے رَبّ کی طرف، عنقریب وہ میری راہنمائی کرے گا''۔ ''سین'' تاکید کے لئے ہے، وہ ضرور میری راہنمائی کرے گا، یعنی اگرچہ میرے سامنے کچھ نہیں ہے کہ کس علاقے میں جاؤں اور وہاں والے لوگ میرے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے، مجھے راحت پہنچے گی یا تکلیف پہنچے گی، میں اللہ کے توکل پر اپنے علاقے کو چھوڑتا ہوں۔ ''رَبّ کی طرف جانے والا ہوں'' یعنی ایسی جگہ جانے والا ہوں جہاں میرے رَبّ کی مرضی ہوگی، ہجرت الی اللہ کا یہی معنی ہوتا ہے کہ ایسی جگہ کی طرف ہجرت کرجاؤ جو اللہ کی پسندیدہ ہے۔

ابراہیم علیہ السلام کی طرف سے اولاد کی دُعا اور اس کی قبولیت

تو جب ساری قوم کو چھوڑ کے حضرت ابراہیم علیہ السلام علیحدہ ہو گئے پھر اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائے کہ قوم تو چھوٹ گئی، اب یا اللہ! مجھے اور صالحین نصیب فرما۔ تو صالحین کا مصداق اچھے دوست بھی ہوتے ہیں، اور صالحین کا مصداق اولاد بھی ہے، یہاں اوّلین مصداق اولاد ہے، کہ جب خاندان نے ساتھ نہیں دیا، سب جدا ہو گئے، تو اب اپنے لئے انسان اچھے رُفقاء تلاش کرتا ہے، کہ اچھے رُفقاء مجھے دے جن کے ساتھ میرا وقت اچھا گزرے اور جو تیرے دِین کا کام بھی کریں، جن میں اولاد سرفہرست ہے، تو اس میں اولاد کی دُعا بھی ہوگئی۔ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ: اے اللہ! مجھے اچھوں میں سے دے۔ مِن تبعیضیہ ہے۔ اے اللہ! مجھے صالحین میں سے کچھ لوگ عطا فرما۔ فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ: جب انہوں نے صالحین مانگے تھے، تو ہم نے ان کو ایک بچے کی بشارت دی جو بہت بُردبار اور حلم والا ''بشارت دی ہم نے ان کو ایک بچے کی، جو کہ حلیم ہے، بُردبار ہے۔''

ذبیح کون؟ اسماعیل علیہ السلام یا اسحاق علیہ السلام؟

فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ: اب آگے اس قربانی کا ذِکر آ گیا جو مشہور واقعہ ہے، آپ وعظوں میں پڑھتے سنتے رہتے ہیں...... اس ''غلامِ حلیم'' سے حضرت اسماعیل علیہ السلام مراد ہیں، کیونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پہلے بچے جو پیدا ہوئے ہیں حضرت ہاجرہ سلام اللہ علیہا کے بطن سے، تاریخی روایات اور احادیث سب اس پر متفق ہیں کہ وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں۔ اور پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی والدہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام مکہ معظمہ والی جگہ میں آ کے آباد کر گئے تھے، جبکہ وہاں کوئی آبادی نہیں تھی، اور بیت اللہ بھی ابھی تک نہیں بنایا تھا وہ بھی بعد میں بنایا۔ اور ان کی ولادت سے تقریباً تیرہ چودہ سال بعد حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کا تہیہ کیا، اور اس امتحان میں کامیابی حاصل کی، تو انعام کے طور پر اللہ تعالیٰ نے دُوسرا بیٹا دیا، اور وہ شام میں ہی آباد ہوئے۔ جب حضرت اسحاق علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے تو اُس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر تقریباً سو سال کی تھی، اور جب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی ولادت ہوئی ہے، تو اس وقت توراۃ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر چھیاسی سال کی آتی ہے، تو دونوں بچوں میں تقریباً چودہ سال کا فرق ہے، چودہ سال تک حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اکلوتے بیٹے رہے، بعد میں حضرت اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے۔ تو جن روایات کے اندر قربانی کا ذِکر حضرت اسحاق علیہ السلام کے متعلق کیا گیا ہے کہ حضرت اسحاق علیہ السلام کو قربان کیا گیا تھا، ہمارے مفسرین کہتے ہیں کہ وہ اکثر اسرائیلی روایات ہیں جو قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ قربانی کا تعلق حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ساتھ ہے، یہی آپ کے اکلوتے بیٹے تھے۔

خلاصۂ آیات

فَبَشَّرْنٰهُ بِغُلٰمٍ حَلِيْمٍ: بشارت دی ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک ایسے بچے کی جو حلم اور بُردباری والا ہے، فَلَمَّا بَلَغَ مَعَهُ السَّعْيَ: پھر جس وقت وہ بچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھاگنے دوڑنے کو پہنچ گیا، یعنی اتنی عمر کو پہنچ گیا جب بچہ اپنے باپ کے ساتھ آگے

پیچھے بھاگتا ہے، دوڑتا ہے، سات آٹھ سال کا بچہ جس طرح ہوا کرتا ہے، اُنگلی پکڑی ساتھ چل دیا، چھوٹے موٹے کاموں کے لیے ساتھ بھاگ دوڑ کرلی۔ جب وہ اس عمر کو پہنچ گیا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ بھاگ دوڑ کرنے لگ گیا، قَالَ یٰبُنَیَّ: ابراہیم علیہ السلام نے کہا: اے میرے پیارے بیٹے! اِنِّیْٓ اَرٰی فِی الْمَنَامِ: بے شک میں دیکھتا ہوں نیند میں اَنِّیْٓ اَذْبَحُكَ: کہ میں تجھے ذبح کررہا ہوں، فَانْظُرْ مَاذَا تَرٰی: پس تُو غور کر، تُو کیا سمجھتا ہے؟ تیری کیا رائے ہے؟ قَالَ یٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ: اسماعیل علیہ السلام نے کہا کہ اے اَبّا! کر گزر تُو جس چیز کا تُو حکم دیا جاتا ہے، سَتَجِدُنِیْٓ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِیْنَ: ضرور پائے گا تُو مجھے اِن شاء اللہ! صبر کرنے والوں میں سے...... فَلَمَّآ اَسْلَمَا: پس جب دونوں فرماں بردار ہوگئے، وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ: جبین سامنے والی پیشانی کو بھی کہتے ہیں، اور پیشانی کے دو کناروں کو بھی کہتے ہیں، اِدھر والا کنارہ بھی جبین کہلاتا ہے، اُدھر والا کنارہ بھی جبین کہلاتا ہے۔ ڈال لیا ابراہیم علیہ السلام نے اسماعیل علیہ السلام کو جبین کے بَل۔ یا تو یہ ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کو پیشانی کے بَل زمین پہ گرالیا، جس طرح سے سجدے میں ہوتے ہیں، بیٹے سے کہا ہوگا کہ سجدے کی شکل میں ہوجا تا کہ تجھے ذبح کروں، تو انہوں نے اپنی پیشانی زمین پہ رکھ دی۔ یا پھر جبین سے مراد یہ ایک پہلو ہے، اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ترجمہ یہی کیا ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کو پہلو کے بَل لٹالیا، کیونکہ جب پہلو کے بَل کوئی شخص لیٹا ہوا ہو، تو پیشانی کی ایک جانب زمین کے ساتھ لگ جایا کرتی ہے، تو پہلو کے بَل لٹالیا ہو، پہلو کے بَل لٹا کے ذبح کیا ہو، تو ایسا بھی ہوسکتا ہے۔ اگر پیشانی کے بَل لٹایا ہو تو سجدے کی کیفیت ہے، بیٹے سے کہہ دیا ہوگا کہ تو اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوجا تو میں پھر تیرے اُوپر چھری چلاتا ہوں۔ یا پھر جس طرح ذبح کرنے کا طریقہ ہے کہ یوں پہلو کے بَل لٹایا، اور پہلو کے بَل لٹانے سے کنپٹی والا حصہ زمین کے ساتھ لگے گا تو پیشانی کا کنارہ بھی لگ جاتا ہے۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کروٹ کے بَل لٹانے کے ساتھ کیا ہے، اور باقی مترجمین نے پیشانی کے بَل ڈالنے کا ہی کیا ہے، تو پیشانی کے بَل ڈالنے کا وہی معنی کہ پیشانی زمین کے ساتھ لگ گئی، جیسے کہ سجدے کی کیفیت ہوا کرتی ہے۔ ''لٹالیا اس کو پیشانی کے بَل'' ...... لمّا کا جواب یہاں محذوف ہے، جب دونوں فرماں بردار ہوگئے، اور ابراہیم علیہ السلام نے بچے کو پیشانی کے بَل ڈال لیا، کان ما کان، پھر ہوا جو کچھ ہوا، یا اس وقت عجیب واقعہ پیش آیا، عجیب حال تھا، تو یوں لمّا کا جواب محذوف نکال لیا جائے گا...... اپنی طرف سے کوشش کی (جیسے روایات میں ہے) لیکن ذبح نہ کرسکے، تو اللہ کی طرف سے آواز آئی، وَنَادَیْنٰهُ اَنْ یّٰٓاِبْرٰهِیْمُ: ہم نے آواز دی اس کو کہ اے ابراہیم! قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْیَا: تُو نے خواب کو سچا کر دِکھایا، اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِی الْمُحْسِنِیْنَ: ہم محسنین کو ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، کہ امتحان میں ڈالتے ہیں، تو اس میں کامیابی کی توفیق بھی دیتے ہیں، اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِیْنُ: بے شک یہ البتہ کھلی آزمائش ہے، وَفَدَیْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِیْمٍ: اور ہم نے فدیہ دیا اسماعیل علیہ السلام کا ایک بڑے ذبح کے ساتھ، ذبحٌ سے وہ جانور مراد ہے جو ذبح کیا جاتا ہے۔ وَتَرَكْنَا عَلَیْهِ فِی الْاٰخِرِیْنَ: اور ہم نے چھوڑا ابراہیم علیہ السلام پر پچھلوں میں، وہی دو ترجمے جن کا ذکر پہلے ہوچکا ہے، ہم نے ابراہیم پر پچھلوں میں اچھی تعریف چھوڑی اَیْ ثناءً حسنًا، اور ہماری طرف سے سلام ہے ابراہیم پر۔ یا ہم نے پچھلوں پر یہ بات چھوڑی سَلٰمٌ عَلٰٓی اِبْرٰهِیْمَ، پھر یہ جملہ تَرَكْنَا کا مفعول ہے۔ اب پیچھے انسان، جن، فرشتے یہ سب جب ان کا تذکرہ کرتے ہیں تو ''علیہ السلام'' کے ساتھ کرتے ہیں، انہیں سلامتی کی دُعا

دیتے ہیں، كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ: اسی طرح سے ہم بدلہ دیا کرتے ہیں محسنین کو، اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ: بے شک وہ ہمارے مؤمن بندوں میں سے تھا۔

سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کو ذِبح کرنے کا واقعہ

یہ واقعہ ہے قربانی کا، چونکہ معروف ہے، سنتے رہتے ہیں، اس میں زیادہ تشریح کی ضرورت نہیں۔ اور یہ واقعہ مکہ معظمہ میں پیش آیا، اور یہی واقعہ ہے جس کی یادگار اسلام میں منائی جاتی ہے قربانی کی صورت میں، کہ اللہ کے نام پر قربانی دی جاتی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھا تھا، بیٹے نے کہا: افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ تُو وہ کام کر جس کا تُو حکم دیا جاتا ہے۔ تو گویا کہ اسماعیل علیہ السلام بھی اپنی فطرتِ سلیمہ کے طور پر سمجھ گئے کہ ان کا خواب اللہ کی طرف سے حکم کا درجہ ہی رکھتا ہے، تو نبی کا خواب بھی چونکہ سچا ہوتا ہے، اس میں کوئی شیطانی یا نفسانی خیالات کی آمیزش نہیں ہوتی، اس لئے جو انہوں نے دیکھا تھا کہ میں ذبح کر رہا ہوں، آگے یہ نہیں دیکھا کہ ذبح ہو بھی گیا، یہ نہیں تھا کہ آپ کہیں کہ خواب پورا نہ ہوا۔ ذبح کرتے ہوئے اپنے آپ کو دیکھا، آگے یہ کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ذبح ہو بھی گئے ہوں، ان کی گردن کٹ بھی گئی ہو، یہ خواب میں مذکور نہیں۔ اشارہ اللہ نے دیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اسی طرح سے کر دیا، چھری چلائی، باقی! آگے اللہ کے اختیار میں تھا کہ اس نے چھری نہیں چلنے دی، اور ان کے ذبح ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا کہ بس ہم تو آزمائش ہی کرنا چاہتے تھے، کہ تم میرے نام پر اولاد کو بھی قربان کر سکتے ہو یا نہیں؟ آپ اپنے امتحان میں کامیاب اُترے، اور آپ نیکوکار ہیں، اور نیکوکاروں کو ہم ایسے ہی بدلہ دیا کرتے ہیں، کہ امتحان میں ڈالتے ہیں، کامیابی کی توفیق دیتے ہیں، پھر دُنیا اور آخرت میں ان کو نوازتے ہیں۔ قربانی لینی تھی، وہ قربانی آپ نے پیش کر دی، خواب آپ کا سچا ہو گیا...... تو اس میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کا مرتبہ بھی ظاہر ہو گیا، کہ اللہ کی طرف سے اشارہ پاتے ہی انہوں نے کس طرح سے اس اشارے کو حکم سمجھا اور اپنی جان پیش کر دی، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی آزمائش بہت بڑی ہوئی کہ بڑھاپے میں اللہ سے مانگ کے بچہ لیا تھا، اور جب اِس عمر میں بچہ پہنچ جاتا ہے کہ آگے پیچھے بھاگتا پھرتا ہو تو پھر والدین کی نظر میں بہت محبوب ہوتا ہے، اور ان کے علاوہ کوئی اور اولاد بھی نہیں تھی، نسل کے باقی رہنے کا بھی سوال تھا، تو ایسے موقع پر حضرت ابراہیم علیہ السلام سے یہ امتحان لیا گیا، ان سے قربانی کا مطالبہ کیا گیا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ کے نام پر اس قسم کے چہیتے اور اکلوتے بیٹے کو بھی قربان کرنے میں کسی قسم کا باک محسوس نہیں کیا۔ یہ تھی کامیابی، اور اللہ کی نوازش یہ ہوئی کہ ہمیشہ سُنّتِ دائمہ کے طور پر یہ قربانی جاری ہو گئی۔ اور یہ ''ذِبحِ عظیم'' کے متعلق کہتے ہیں کہ اللہ کی طرف سے کوئی مینڈھا آیا، حکم دیا گیا کہ اس کے بدلے میں اسی کو ذبح کر دو۔

مینڈھے کے سینگ کب جل گئے تھے؟

اب وہ مینڈھا جو ذبح کیا گیا، تو اس کے سینگ بیت اللہ میں بطور یادگار کے چلے آرہے تھے، یہ بعض روایات میں آتا ہے۔ عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ اور حجاج کی لڑائی جو مکہ معظمہ میں ہوئی ہے، حجاج بن یوسف نے مکہ معظمہ پر حملہ کیا تھا، اور مکہ معظمہ میں حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہ نے خلافت کا اعلان کیا ہوا تھا، اس لڑائی کے اندر جب پتھر برسائے گئے ہیں، جیسے منجنیق کے ذریعے

سے برسائے جاتے ہیں، تو پتھر پتھر سے ٹکراتا ہے تو آگ نکلتی ہے، تو بیت اللہ کے ساتھ جب پتھر ٹکرائے ہیں، آگ نکلی، تو غلاف کو آگ لگ گئی، اس طرح سے بیت اللہ کی عمارت جل گئی تھی، تو اس کے اندر جس قسم کی چیزیں پڑی تھیں وہ بھی ساری کی ساری جل گئی تھیں، اور اسی آگ کے اندر وہ سینگ بھی جل گئے جو کہ اس مینڈھے کے چلے آرہے تھے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ذبح کیا تھا حضرت اسماعیل علیہ السلام کے فدیے کے طور پر (نسفی وغیرہ)۔ تو اُمت کے ابتدائی لوگوں نے وہ سینگ دیکھے ہیں، اور تبرک کے طور پر وہ اسی طرح سے بیت اللہ کے اندر رکھے ہوئے تھے، وہ اسی حادثے کے اندر ختم ہوگئے۔

تو حضرت اسماعیل علیہ السلام کا جذبہ بھی نمایاں ہوگیا، اور یہ گویا کہ ان کی فطری صلاحیت کی طرف اشارہ ہے کہ پیدا ہوتے ہی ان میں بھی اللہ کے نام پہ قربان ہونے کا جذبہ کس طرح سے تھا، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا امتحان تو بہت ہی کھلا ہے۔

قربانی سُنّتِ ابراہیمی ہے

اور یہ قربانی جو دی جاتی ہے، ہم عید کے موقع پر دیتے ہیں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا تھا: ''یارسولَ اللهِ مَا هٰذِهِ الْأَضَاحِيْ؟'' یارسول اللہ! ان قربانیوں کی کیا حقیقت ہے؟ ہم یہ جانور قربان کیوں کرتے ہیں؟ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''سُنَّةُ أَبِيْكُمْ ابراهيمَ!'' یہ تمہارے باپ ابراہیم علیہ السلام کی سُنّت ہے۔[1] تو اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کو دوام بخشا، اور آپ کے نام کو روشن کیا، دُنیا اور آخرت میں آپ کے لئے صلوٰۃ وسلام باقی رکھا، تو جو بھی اللہ کے نام پر اس طرح سے قربانی دیا کرتے ہیں، پھر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یونہی نوازش ہوا کرتی ہے۔

(کسی کے سوال پر فرمایا) یہ روایات ہیں، یہاں قصے کی تکمیل ساری تو ذِکر نہیں کی جاتی، نہ وہ ہمارے مقصد سے خاص تعلق رکھتی ہیں، لوگ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ان کو بار بار شیطان نے بہکایا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کو کنکریاں ماریں، اور حج کے موقع پر یہ جو ''رَمِیِ جمار'' ہوتا ہے، یہ جو کنکریاں ماری جاتی ہیں، یہ بھی اسی یادگار کو باقی رکھا گیا ہے، بعض روایات میں آتا ہے (مظہری)۔ (ایک اور سوال پر فرمایا) اس کی بھی قرآنِ کریم میں یا حدیث میں تو صراحت نہیں، لیکن اِنِّیْ اَرٰی میں مضارع کے طور پر جو تعبیر کیا ہے، تو اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ یہ خواب کئی دِن تک دیکھا، بار بار یہ خواب آیا، جس کی بنا پر حضرت ابراہیم علیہ السلام یہ سمجھے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مجھ سے اولاد کی قربانی مانگی جارہی ہے، باقی! کسی صحیح روایت میں یہ تعیین نہیں کہ کتنے دِن تک آیا۔

واعظوں کے اضافے

اور واعظ لوگ قصے کہانیاں طویل وعریض بنا ہی لیا کرتے ہیں، کیونکہ جس وقت تک حقیقت کے ساتھ کچھ آمیزش نہ ہو، لوگوں کو لطف نہیں آتا۔ اور ''بدعت'' کا مزاج بھی اسی طرح سے ہے کہ سُنّت پر لوگ قناعت نہیں کرتے، کہتے ہیں یہ تو سادی سیدھی سی بات ہے، جس وقت تک آپ کو اس کو مزین نہ کریں اور اس کا حاشیہ نہ چڑھائیں اس کے ساتھ کچھ اور پیوند نہ لگائیں، لوگوں کو اطمینان نہیں آتا۔ تو واقعات میں بھی اسی طرح سے ہے کہ ان میں لوگ آمیزش کرتے ہیں، رنگینی پیدا کرتے ہیں، اپنی طرف سے

(۱) ابن ماجہ ص ۲۲۶، کتاب الاضاحی، باب ثواب الأضحية۔ مشکوۃ ۱۲۹/۱ باب فی الأضحية کا آخر۔

اس کو خوشنما کرنے کے لئے، پھر جذباتی رنگ میں اس کو بیان کرتے ہیں۔ حقیقت اتنی ہے جتنی قرآنِ کریم نے نقل کر دی، یا جتنا ذکر صحیح روایات میں آتا ہے۔

سیّدنا اسماعیل علیہ السلام کے ذبیح ہونے پر دلیل

بہر حال اس میں یہ بات نمایاں ہوگئی، کہ تبادر یہی ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس بچے کی قربانی دی تھی وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام ہی ہیں، کیونکہ ان کا ذکر کرنے کے بعد پھر حضرت اسحاق علیہ السلام کی بشارت کا ذکر آیا ہے۔ دوسرے یہ کہ سورۂ ہود میں جہاں حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذکر آیا ہے، تو وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی جو بشارت دی گئی تھی، فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ (سورۂ ہود: ۷۱) ہم نے ان کو اسحاق علیہ السلام کی بشارت دی اور یہ بھی کہا کہ اسحاق علیہ السلام کے پیچھے یعقوب بھی پیدا ہوگا، تو گویا کہ یہ بچہ طویل عمر کا ہوگا کہ اس کی اولاد بھی پیدا ہوگی۔ تو جس بچے کے متعلق اللہ کی طرف پہلے ہی یہ پیش گوئی کر دی گئی ہو کہ یہ بچہ بڑی عمر کا ہوگا اور صاحبِ اولاد بھی ہوگا، تو اس کے متعلق پھر ذبح کا حکم اگر آئے گا بھی، تو باپ فوراً سمجھ سکتا ہے کہ یہ تو محض ایک امتحان ہے، ورنہ ذبح نہیں ہوگا، کیونکہ اللہ نے تو پہلے ہی بتا دیا ہے کہ یہ بڑی عمر کا ہوگا اور اس کی اولاد بھی ہوگی۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے متعلق اس قسم کی کوئی بات نہیں آتی، جس سے ظاہر یہی ہے کہ یہ جو ابراہیم علیہ السلام کا امتحان لیا گیا تو اسماعیل علیہ السلام کے متعلق ہی لیا گیا۔ اور ان کے تذکرے کے بعد پھر حضرت اسحاق علیہ السلام کا ذکر آ رہا ہے۔

سیّدنا ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں برکات

وَبَشَّرْنٰهُ بِاِسْحٰقَ نَبِیًّا مِّنَ الصّٰلِحِیْنَ: ہم نے بشارت دی حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحاق کی، اِس حال میں کہ وہ نبی ہے صالحین میں سے ہے۔ نبی کے لفظ میں خود اُن کے طویل العمر ہونے کی طرف اشارہ ہے، کہ بڑی عمر کے ہوں گے تبھی تو جا کے نبی بنیں گے، وَبٰرَكْنَا عَلَیْهِ وَعَلٰٓى اِسْحٰقَ: عَلَیْهِ کی ضمیر ظاہر یہ ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرف لوٹائی جائے۔ پہلا جو غلام حلیم آیا تھا، اس پر بھی اور اسحاق پر بھی ہم نے برکت دی، وَمِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا مُحْسِنٌ وَّظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِیْنٌ: اور ان دونوں کی اولاد سے (اسحاق کی اولاد میں بنی اسرائیل ہوئے، کیونکہ حضرت اسحاق علیہ السلام کے جو بیٹے تھے یعقوب علیہ السلام، انہی کا نام اسرائیل ہے، تو یہ بہت عظیم اُمت پھیلی اسرائیل کی اولاد سے۔ اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے یہ سارا عرب ہے، یہ بنو اسماعیل ہیں، قریشی اور دوسرے جتنے بڑے بڑے قبائل تھے سب حضرت اسماعیل علیہ السلام کی میں سے تھے) تو دونوں پہ ہم نے برکت دی، جن کی بہت کثرت کے ساتھ اولاد پھیلی۔ اور آگے ان کی اولاد میں دونوں قسم کے لوگ تھے، بعضے اچھے بھی تھے، بعضے صریح طور پر اپنے آپ پہ ظلم کرنے والے بھی تھے، اسرائیلیوں میں بھی اچھے بُرے ہوئے، اسماعیلیوں میں بھی اچھے بُرے ہوئے۔ وَمِنْ ذُرِّیَّتِهِمَا: ظاہر یہی ہے کہ اس سے اسماعیل علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کی اولاد مراد ہے (تفسیر عثمانی)، کیونکہ اگر "ھما" کی ضمیر حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسحاق علیہ السلام کی طرف لوٹائی جائے، تو پھر دو کی اولاد کہنے کی ضرورت نہیں، بلکہ وہ تو صرف حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد ہوئی، پھر دو کا کوئی مطلب نہیں ہے،

حضرت اسحاق علیہ السلام بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، اس لیے یوں کہنا چاہیے کہ ابراہیم علیہ السلام کی اولاد پر ہم نے برکت دی، اوران میں ظالم اوراچھے لوگ بھی پیدا ہوئے۔ تو جس وقت دو بیٹے آگئے علیحدہ علیحدہ، توان دو کی طرف اولاد کی نسبت ٹھیک ہے کہ اسماعیل علیہ السلام کی اولاد پر بھی ہم نے برکت دی، اسحاق علیہ السلام کی اولاد پر بھی برکت دی، یعنی بہت کثرت کے ساتھ خاندان ان کی اولادوں میں پیدا ہوئے، اور آگے ان میں اچھے بُرے دونوں قسم کے لوگ تھے، ان کی اولاد میں اچھے بھی تھے اور صریح طور پر اپنے آپ پر ظلم کرنے والے بھی تھے، ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ مُبِيْنٌ: ای ظالم مبین لنفسہ، بہت کھلے طور پر اپنے نفس پہ ظلم کرنے والے تھے، کُفر وشرک میں مبتلا ہونے والے، فسق وفجور میں مبتلا ہونے والے، جس طرح سے ظلم کے درجات ہوا کرتے ہیں۔ اور محسن کے اندر نیک آگئے۔ تو بنی اسماعیل میں بھی نیک اور بد پیدا ہوئے اور بنی اسماعیل میں بھی دونوں قسم کے لوگ آئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا مِنَ الْكَرْبِ

یہ پکی بات ہے کہ ہم نے احسان کیا موسیٰ اور ہارون پر ﴿۱۱۴﴾ ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم کو نجات دی بہت بڑی

الْعَظِيْمِ ﴿۱۱۵﴾ وَنَصَرْنٰهُمْ فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ ﴿۱۱۷﴾

گھبراہٹ سے ﴿۱۱۵﴾ ہم نے ان کی مدد کی، پس پھر وہی لوگ غالب آنے والے تھے ﴿۱۱۶﴾ اور ہم نے ان دونوں کو واضح کتاب دی ﴿۱۱۷﴾

وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۱۸﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿۱۱۹﴾ سَلٰمٌ عَلٰى

اور ہم نے ان کو سیدھے راستے پر چلایا ﴿۱۱۸﴾ اور ہم نے چھوڑی ان دونوں پر پچھلے لوگوں میں ﴿۱۱۹﴾ یہ بات کہ سلام ہے

مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ﴿۱۲۰﴾ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۲۱﴾ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا

موسیٰ اور ہارون پر ﴿۱۲۰﴾ ہم اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں محسنین کو ﴿۱۲۱﴾ بے شک وہ دونوں ہمارے ایمان والے بندوں

الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۲۳﴾ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا

میں سے تھے ﴿۱۲۲﴾ اور بے شک الیاس رسولوں میں سے تھے ﴿۱۲۳﴾ جب کہا انہوں نے اپنی قوم کو کہ کیا

تَتَّقُوْنَ ﴿۱۲۴﴾ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ ﴿۱۲۵﴾ اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ

تم ڈرتے نہیں ہو؟ ﴿۱۲۴﴾ کیا تم پکارتے ہو بعل کو؟ اور چھوڑتے ہو احسن الخالقین کو؟ ﴿۱۲۵﴾ جو کہ اللہ ہے وہ تمہارا بھی رب ہے اور

اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿١٢٦﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿١٢٧﴾ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ
تمہارے آباءِ اولین کا بھی رَب ہے ﴿١٢٦﴾ ان لوگوں نے الیاس کی تکذیب کی، پس بے شک وہ لوگ البتہ حاضر کئے ہوئے ہیں ﴿١٢٧﴾ لیکن اللہ کے
الْمُخْلَصِيْنَ ﴿١٢٨﴾ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ ﴿١٢٩﴾ سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ﴿١٣٠﴾ اِنَّا
مخلص بندے ﴿١٢٨﴾ اور ہم نے چھوڑی الیاس پر پچھلے لوگوں میں ﴿١٢٩﴾ یہ بات کہ الیاسین پر سلام ہے ﴿١٣٠﴾ بے شک ہم
كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ﴿١٣١﴾ اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٢﴾ وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ
اسی طرح سے بدلہ دیتے ہیں محسنین کو ﴿١٣١﴾ بے شک وہ الیاس ہمارے ایمان والے بندوں میں سے تھا ﴿١٣٢﴾ اور بے شک لُوط بھی البتہ
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٣٣﴾ اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٣٤﴾ اِلَّا عَجُوْزًا فِي الْغٰبِرِيْنَ ﴿١٣٥﴾ ثُمَّ
رسولوں میں سے تھے ﴿١٣٣﴾ جس وقت کہ ہم نے اس کو اور اس کے گھر والوں کو سب کو نجات دی ﴿١٣٤﴾ مگر ایک بڑھیا وہ پیچھے رہنے والوں میں
دَمَّرْنَا الْاٰخَرِيْنَ ﴿١٣٦﴾ وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَيْهِمْ مُّصْبِحِيْنَ ﴿١٣٧﴾ وَبِالَّيْلِ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿١٣٨﴾
سے تھی ﴿١٣٥﴾ پھر ہم نے توڑ پھوڑ دیا پچھلوں کو ﴿١٣٦﴾ اور تم ان پر گزرتے ہو صبح کے وقت ﴿١٣٧﴾ اور رات کو، تو کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ ﴿١٣٨﴾

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا تذکرہ

وَلَقَدْ مَنَنَّا عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ: لَقَدْ تاکید کے لئے ہے۔ یہ پکی بات ہے کہ ہم نے احسان کیا موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر۔ مَنَّ یَمُنُّ: احسان کرنا۔ حضرت نوح علیہ السلام، ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام، اور اسحاق علیہ السلام کے واقعے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ بالاجمال ذکر کیا جارہا ہے، اور اس میں کوئی نئی بات نہیں ہے۔ وَنَجَّيْنٰهُمَا وَقَوْمَهُمَا: اس میں وہ ساری تفصیل آگئی جو آپ کے سامنے مختلف سورتوں کے اندر گزری ہے۔ ''ہم نے ان دونوں کو نجات دی اور اُن دونوں کی قوم کو نجات دی'' وَقَوْمَهُمَا کا عطف ''هما'' ضمیر پر ہے۔ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ: ہم نے ان دونوں کو اور ان کی قوم کو نجات دی بہت بڑی گھبراہٹ سے۔ اور یہ کربِ عظیم وہی فرعونیوں کا عذاب تھا، فرعونیوں سے نجات دی، بڑی گھبراہٹ سے نجات دی۔ وَنَصَرْنٰهُمْ: هم یہاں جمع کی ضمیر آگئی، جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام، ہارون علیہ السلام اور اُن کی قوم سب ہی اس کا مرجع ہیں۔ ہم نے اُن کی مدد کی، فَكَانُوْا هُمُ الْغٰلِبِيْنَ: پس پھر وہی لوگ غالب آنے والے تھے، اور ان کا غلبہ یہ تھا کہ فرعونی غرق ہوگئے، اللہ نے انہیں نجات دی، اور پھر حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں فلسطین وغیرہ فتح ہوا، وہاں ان کی حکومت قائم ہوئی، بہرحال یہ قوم کی قوم آئندہ ترقی پاگئی، اور جو ان کے دشمن تھے ان کو عذاب میں مبتلا کرنے والے، وہ سارے بے نام ونشان ہوگئے۔ وَاٰتَيْنٰهُمَا الْكِتٰبَ الْمُسْتَبِيْنَ: اور ہم نے ان دونوں کو یعنی موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام

کو واضح کتاب دی۔ بالاصل اگرچہ کتاب موسیٰ علیہ السلام کو ملی تھی، لیکن حضرت ہارون علیہ السلام چونکہ اُن کے وزیر تھے، اس لیے کتاب کی نسبت ان دونوں کی طرف ہوگئی۔ اور یہ دونوں مبلغ تھے، کتاب مستبین سے مراد تورات ہے، وَهَدَيْنٰهُمَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ: اور ہم نے ان کو سیدھے راستے پر چلایا۔ معلوم ہوگیا کہ موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام کا راستہ یہی صراط مستقیم تھا، جن لوگوں نے وہ راستہ اختیار کیا وہ صراط مستقیم پہ سمجھے گئے، وَتَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ: اور ہم نے چھوڑا ان دونوں پر پچھلے لوگوں میں، سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ: یہ جملہ تَرَكْنَا کا مفعول ہے ایک ترکیب کے لحاظ سے۔ ہم نے پچھلوں میں ان پر یہ بات چھوڑی سَلٰمٌ عَلٰى مُوْسٰى وَهٰرُوْنَ۔ چنانچہ پیچھے آنے والے لوگ بنی اسرائیل بھی، اور سرور کائنات ﷺ کی اُمت بھی جس وقت بھی ان دونوں کا تذکرہ کرتے ہیں، تو ''علیہ السلام'' کا لفظ بولتے ہیں، تو یہ وہی چیز ہے جو اللہ تعالیٰ نے پچھلے لوگوں کے اندر ان دونوں کے متعلق چھوڑی۔ یا آپ کے سامنے ایک اور ترکیب ذِکر کی تھی کہ ''ترکنا'' کا مفعول محذوف ہے، ''جلالین'' نے یہی توجیہ اختیار کی ہے، تَرَكْنَا عَلَيْهِمَا فِي الْاٰخِرِيْنَ ثَنَاءً حَسَنًا، ہم نے پچھلوں میں ان کی اچھی تعریف چھوڑی، اور آگے اللہ تعالیٰ کی طرف مستقل بات ہے کہ۔ سلامٌ منا علی موسٰی وھارون، ہماری طرف سے موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام پر سلام ہے۔ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ: ہم اسی طرح سے بدلہ دیا کرتے ہیں محسنین کو۔ محسنین یہ لفظ اِحسان سے ہے، اچھی طرح سے کام کرنے والے، جس میں اعلیٰ مصداق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسے طور پر کریں گویا کہ اللہ کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، کیونکہ اگر اللہ کو انسان آنکھ سے نہیں دیکھتا، تو یہ بات تو یقیناً ہے کہ اللہ انسان کو دیکھتا ہے، بہرحال آمنے سامنے ہونے کے جذبے کے تحت جو اللہ کی عبادت کی جائے یہ احسان ہے۔ تو محسنین کا معنی ہوگا کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھتے ہوئے ہر کام کو اچھی طرح سے کرتے ہیں۔ اِنَّهُمَا مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ: بے شک وہ دونوں ہمارے ایمان والے بندوں میں سے تھے۔ تو یہاں جتنا واقعہ بالاجمال ذِکر کیا گیا، اس میں کوئی نئی بات نہیں آئی۔

حضرت اِلیاس علیہ السلام کا تذکرہ

وَاِنَّ اِلْيَاسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اور بے شک الیاس علیہ السلام رسولوں میں سے ہیں۔ ان کے کوئی تفصیلی حالات روایات میں نہیں آتے، اور ان کے متعلق بھی بعض روایات میں ذِکر کیا گیا ہے خضر علیہ السلام کی طرح کہ یہ بھی زندہ ہیں، جس طرح سے خضر علیہ السلام کے متعلق مشہور ہے کہ وہ زندہ ہیں، اُن پہ موت نہیں آئی، اسی طرح سے الیاس علیہ السلام کے متعلق بھی ذِکر کیا جاتا ہے، لیکن وہ روایات کوئی قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔ اور یاد ہوگا! کہ حضرت خضر علیہ السلام کا ذِکر کرتے ہوئے میں نے ان کا بھی ساتھ ہی ذِکر کیا تھا، اور مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کا جو کشف پڑھ کے سنایا تھا ''تفسیر مظہری'' سے، تو اس میں ان کا ذِکر بھی تھا، کہ حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ متوجہ ہوئے اللہ تعالیٰ کی طرف مراقبے میں، تو یہ خضر علیہ السلام، اور الیاس علیہ السلام دونوں ہی حضرت مجدد رحمۃ اللہ علیہ کے پاس مکاشفہ میں تشریف لے آئے، تو انہوں نے خود ان سے پوچھا کہ تم زندہ ہو یا وفات پاگئے ہو؟ تو انہوں نے کہا تھا کہ ''لَسْنَا مِنَ الْاَحْيَاءِ'' ہم زندوں میں سے نہیں ہیں، بلکہ ہم پر موت طاری ہوئی، لیکن اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے ہماری ارواح کو اس قسم کی قوت دی ہے کہ ہم کبھی متجسد ہو جاتے ہیں، جس کی بنا پر گاہے لوگ ہمیں دیکھ بھی لیتے ہیں۔ اور وہ روایات جو لوگ ذِکر کرتے ہیں کہ خضر علیہ السلام دیکھے گئے، ان کی توجیہ بھی وہاں سے نکل آتی

ہے۔تو صاحب "تفسیر مظہری" نے اس مکاشفہ پر اعتماد کر کے اس مسئلے کو حل کیا تھا کہ دلائل تو دونوں طرف بڑے قوی ہیں، جو کہتے ہیں کہ وفات ہوگئی اُن کے دلائل بھی اپنی جگہ وزنی ہیں، اور جو کہتے ہیں کہ زندہ ہیں تو ان کے پاس بھی وزنی قسم کی باتیں ہیں، تو دلائل کے ساتھ تو فیصلہ کرنا مشکل ہے، اسی پیچیدگی کو حل کرنے کے لئے حضرت مجدد الف ثانی ؒ نے براہِ راست اللہ تعالیٰ سے علم حاصل کرنا چاہا، تو یہ ایک مکاشفے کی بات ہے، اگر اس پر اعتماد کرلیا جائے تو یہ اِشکال حل ہوجاتا ہے۔سورۂ کہف میں قاضی ثناء اللہ صاحب ؒ پانی پتی نے اس مسئلے کی وضاحت کی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے واقعے کے آخر میں۔

بے شک الیاس البتہ رسولوں میں سے تھے، اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَلَا تَتَّقُوْنَ: جب کہا انہوں نے اپنی قوم کو کہ کیا تم ڈرتے نہیں ہو؟ یعنی کفر و شرک جو اختیار کر رہے ہو تو تمہیں اللہ تعالیٰ سے ڈر نہیں لگتا؟ اَتَدْعُوْنَ بَعْلًا وَّتَذَرُوْنَ اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ: بعل اس قوم کے بت کا نام ہے۔کیا تم بعل کو پکارتے ہو اور احسن الخالقین کو چھوڑے ہوئے ہو، اس کے ساتھ کوئی تعلق ہی نہیں رکھتے، اپنا فریادرس اور اپنا مشکل کشا تم نے بعل کو ہی سمجھ لیا ہے، بعل ایک بت ہے، کیا تم پکارتے ہو بعل کو اور چھوڑتے ہو احسن الخالقین کو، اور اَحْسَنَ الْخَالِقِيْنَ سے بدل ہے اللّٰهَ رَبَّكُمْ وَرَبَّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ، یعنی احسن الخالقین جو کہ اللہ ہے، وہ تمہارا بھی ربّ ہے، اور تمہارے آبائے اوّلین کا بھی ربّ ہے۔ فَكَذَّبُوْهُ فَاِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ: ان لوگوں نے الیاس علیہ السلام کی تکذیب کی، پس بے شک وہ لوگ البتہ حاضر کیے جائیں گے، حاضر کیے ہوئے ہیں یعنی اللہ کی عدالت میں، ایک وقت آئے گا کہ مجرم کی طرح سب کے سب موجود کئے جائیں گے۔ اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ لیکن اللہ کے مخلص بندے، وہ اس طرح سے مجرموں کی طرح حاضر نہیں کئے جائیں گے، یہ مستثنیٰ ہیں، جیسے یہ فقرہ بار بار دوہرایا جارہا ہے۔وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ فِي الْاٰخِرِيْنَ: ہم نے چھوڑی الیاس پر آخرین میں یہ بات، سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ۔اِلْ يَاسِيْنَ یہ بھی الیاس میں دوسری لغت ہے۔جس طرح سے طورِ سیناء میں طور سینین پڑھ لیا جاتا ہے، اسی طرح سے یہاں الیاس میں اِلْ يَاسِيْنَ پڑھ لیا گیا۔ یہاں بھی ترکیب کے حوالے سے وہی بات ہے کہ وَتَرَكْنَا عَلَيْهِ ثَنَاءً حَسَنًا فِي الْاٰخِرِيْنَ۔ سَلٰمٌ مِّنَّا عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ ہم نے پچھلے لوگوں میں ان کے لئے اچھی تعریف چھوڑی، اور ہماری طرف سے اِلْ يَاسِيْنَ پر سلام ہو۔ یا سَلٰمٌ عَلٰٓى اِلْ يَاسِيْنَ یہ تَرَكْنَا کا ہی مفعول ہے۔اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ: بے شک ہم اسی طرح سے بدلہ دیتے ہیں محسنین کو۔اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُؤْمِنِيْنَ: بے شک وہ الیاس ہمارے ایمان والے بندوں میں سے تھا..... یہ واقعہ جتنا ذکر کیا گیا ہے، بس اسی قدر ہی معلوم ہے کہ حضرت الیاس علیہ السلام کسی قوم کی طرف بھیجے گئے تھے، وہ مشرک تھی، اور ان کا جو مشہور بت تھا جس کو وہ پوجتے تھے اس کا نام "بعل" ہے، تو حضرت الیاس علیہ السلام نے اس شرک کی تردید کی، اور اُن کو اللہ کی طرف متوجہ کیا، لیکن قوم نے عام طور پر تسلیم نہیں کیا، تو آگے پھر انجام نہیں معلوم کہ اس قوم کا کیا ہوا، اور کیا نہیں ہوا؟ روایات میں حضرت الیاس علیہ السلام کے واقعے کی کوئی خاص تفصیل مذکور نہیں ہے۔

حضرت لُوط علیہ السلام کا تذکرہ

وَاِنَّ لُوْطًا لَّمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اور بے شک لُوط علیہ السلام بھی رسولوں میں سے تھے۔اِذْ نَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اَجْمَعِيْنَ: قابلِ ذکر ہے وہ

وقت جس وقت کہ ہم نے اس کو نجات دی، اور اُس کے گھر والوں کو نجات دی سب کو، اِلَّا عَجُوْزًا فِی الْغٰبِرِیْنَ: مگر ایک بڑھیا، وہ پیچھے باقی رہنے والوں میں سے تھی، غابرین غابر کی جمع، پیچھے رہنے والا، یعنی ان کے اہل وعیال میں سے ایک بڑھیا جو لُوط علیہ السلام کی بیوی تھی، اُس کو نجات نہیں دی گئی، ان کے باقی گھر والے نجات پا گئے۔ ثُمَّ دَمَّرْنَا الْاٰخَرِیْنَ: دَمَّرَ تَدْمِیْرًا: توڑ پھوڑ دینا، برباد کر دینا۔ پھر ہم نے توڑ پھوڑ دیا پچھلوں کو، نیست ونابود کر دیا پچھلوں کو، وَاِنَّكُمْ لَتَمُرُّوْنَ عَلَیْهِمْ مُّصْبِحِیْنَ: اور یہ لُوط علیہ السلام کی بستیاں چونکہ اس شاہراہ پر تھیں جو مکہ معظمہ سے شام کی طرف جاتی ہے، اور یہ لوگ تجارت کی غرض سے وہاں سے گزرتے رہتے تھے، سورۂ حجر میں اسی شاہراہ کو امامِ مبین کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔ تو یہاں بھی وہی یاددہانی کروائی گئی کہ تم ان لوگوں پر گزرتے ہو یعنی ان کے نشانات پر مُصْبِحِیْنَ صبح کے وقت، وَبِالَّیْلِ: اور رات کو، یعنی سفر کرتے ہوئے کبھی صبح کے وقت وہاں سے گزرتے ہو اُن کے مکانات کے پاس سے جہاں ان کے نشانات نمایاں ہیں، اور کبھی رات کو گزرتے ہو۔ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ: تو کیا تم سوچتے نہیں ہو؟ کہ یہ جتنی قومیں ہوئیں جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی بات نہیں مانی اور اُن کی دعوت کو قبول نہیں کیا، اللہ تعالیٰ نے ان کو کس طرح سے برباد کر دیا، تو یہ نشانات دیکھ کے تمہیں عقل نہیں آتی؟ تم سوچتے نہیں ہو؟

وَاِنَّ یُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِیْنَ ﴿۱۳۹﴾ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ ﴿۱۴۰﴾ فَسَاهَمَ
اور بے شک یونس البتہ رسولوں میں سے تھے ﴿۱۳۹﴾ جبکہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے بھری ہوئی کشتی کی طرف ﴿۱۴۰﴾ پھر وہ قرعہ اندازی میں شریک ہوئے
فَكَانَ مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ ﴿۱۴۱﴾ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ وَهُوَ مُلِیْمٌ ﴿۱۴۲﴾ فَلَوْلَاۤ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ
تو وہی شکست خوردہ لوگوں میں سے تھے ﴿۱۴۱﴾ پس لقمہ بنالیا ان کو مچھلی نے اور وہ اپنے آپ کو ملامت کرنے والے تھے ﴿۱۴۲﴾ اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ
الْمُسَبِّحِیْنَ ﴿۱۴۳﴾ لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ ﴿۱۴۴﴾ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ
تسبیح پڑھنے والوں میں سے تھے ﴿۱۴۳﴾ تو البتہ ٹھہرے رہتے مچھلی کے پیٹ میں اس دن تک جس میں لوگ اٹھائے جائیں گے ﴿۱۴۴﴾ پھر ہم نے پھینک دیا اس
وَهُوَ سَقِیْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ ﴿۱۴۶﴾ وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ
کو خالی میدان میں اس حال میں کہ وہ بیمار تھے ﴿۱۴۵﴾ اور اُگایا ہم نے ان کے اُوپر بیل دار درخت ﴿۱۴۶﴾ بھیجا ہم نے یونس کو ایک لاکھ کی طرف یا
یَزِیْدُوْنَ ﴿۱۴۷﴾ فَاٰمَنُوْا فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۱۴۸﴾ فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ
وہ زیادہ تھے ﴿۱۴۷﴾ پھر وہ لوگ ایمان لے آئے پھر ہم نے اُن کو فائدہ پہنچایا ایک وقت تک ﴿۱۴۸﴾ ان سے آپ پوچھئے کیا تیرے رب کے لئے بیٹیاں ہیں

وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ ﴿۱۴۹﴾ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾ اَلَآ اِنَّهُمْ مِّنْ

اور ان کے لئے بیٹے ہیں؟ ﴿۱۴۹﴾ کیا پیدا کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں اور یہ مشاہدہ کر رہے تھے؟ ﴿۱۵۰﴾ خبردار! بے شک یہ اپنے

اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۵۱﴾ وَلَدَ اللّٰهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۵۲﴾ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى

جھوٹ بولنے کی وجہ سے البتہ کہتے ہیں ﴿۱۵۱﴾ کہ اللہ نے اولاد جنی، اور بے شک وہ البتہ جھوٹے ہیں ﴿۱۵۲﴾ کیا چنیں بیٹیاں اللہ نے

الْبَنِيْنَ ﴿۱۵۳﴾ مَا لَكُمْ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۱۵۴﴾ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۱۵۵﴾ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ

بیٹوں پر؟ ﴿۱۵۳﴾ تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ ﴿۱۵۴﴾ کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؟ ﴿۱۵۵﴾ کیا تمہارے پاس کوئی واضح

مُّبِيْنٌ ﴿۱۵۶﴾ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۵۷﴾ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ

دلیل ہے؟ ﴿۱۵۶﴾ لے آؤ تم اپنی کوئی کتاب اگر تم سچے ہو ﴿۱۵۷﴾ اور کیا انہوں نے اللہ کے درمیان اور جنوں کے درمیان

نَسَبًا وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿۱۵۹﴾

نسب، البتہ تحقیق جان لیا جنوں نے کہ بے شک وہ بھی حاضر کیے ہوئے ہیں ﴿۱۵۸﴾ اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں ﴿۱۵۹﴾

اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۰﴾ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ ﴿۱۶۱﴾ مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ

مگر اللہ کے چنے ہوئے بندے ﴿۱۶۰﴾ بے شک تم اور وہ چیزیں جن کی تم عبادت کرتے ہو ﴿۱۶۱﴾ تم اللہ کے خلاف کسی کو

بِفٰتِنِيْنَ ﴿۱۶۲﴾ اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ ﴿۱۶۳﴾ وَمَا مِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ ﴿۱۶۴﴾ وَّ

گمراہی میں ڈالنے والے نہیں ﴿۱۶۲﴾ مگر اسی کو جو کہ جہنم میں داخل ہونے والا ہے ﴿۱۶۳﴾ نہیں ہے ہم میں سے کوئی بھی مگر اس کا مرتبہ متعین ہے ﴿۱۶۴﴾ اور

اِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ ﴿۱۶۵﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ ﴿۱۶۶﴾ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ ﴿۱۶۷﴾

بے شک ہم البتہ صفیں باندھنے والے ہیں ﴿۱۶۵﴾ اور بے شک ہم البتہ تسبیح بیان کرنے والے ہیں ﴿۱۶۶﴾ بے شک بات یہ ہے کہ یہ لوگ البتہ کہا کرتے تھے ﴿۱۶۷﴾

لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۶۸﴾ لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ ﴿۱۶۹﴾ فَكَفَرُوْا

اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت کی بات ہوتی پہلے لوگوں کی طرف سے ﴿۱۶۸﴾ تو ہم البتہ اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے ﴿۱۶۹﴾ پھر انہوں نے انکار کر دیا

بِهٖ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۷۰﴾ وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۱۷۱﴾ اِنَّهُمْ لَهُمُ

اس کا، پس ان کو عنقریب پتا چل جائے گا ﴿۱۷۰﴾ البتہ تحقیق سبقت لے گئی ہماری بات ہمارے مرسل بندوں کے لئے ﴿۱۷۱﴾ بے شک وہ البتہ

الْمَنْصُوْرُوْنَ ﴿١٧٢﴾ وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ ﴿١٧٣﴾ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿١٧٤﴾
مدد کئے ہوئے ہیں ﴿۱۷۲﴾ اور بے شک ہمارا لشکر ہی البتہ غلبہ پانے والا ہے ﴿۱۷۳﴾ آپ ان سے اعراض کر جایئے ایک وقت تک ﴿۱۷۴﴾
وَّاَبْصِرْهُمْ فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧٥﴾ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿١٧٦﴾ فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ
آپ ان کو دیکھتے رہیے، عنقریب وہ بھی دیکھ لیں گے ﴿۱۷۵﴾ کیا یہ ہمارے عذاب کو جلدی طلب کرتے ہیں ﴿۱۷۶﴾ جس وقت وہ عذاب ان کے صحن میں اتر پڑے گا
فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿١٧٧﴾ وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ ﴿١٧٨﴾ وَّاَبْصِرْ فَسَوْفَ
تو ان ڈرائے ہوئے لوگوں کی صبح بہت خراب ہوگی ﴿۱۷۷﴾ آپ ان سے اعراض کر جایئے ایک وقت تک ﴿۱۷۸﴾ اور دیکھتے رہیے،
يُبْصِرُوْنَ ﴿١٧٩﴾ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ﴿١٨٠﴾ وَسَلٰمٌ عَلَى
یہ بھی دیکھ لیں گے ﴿۱۷۹﴾ پاک ہے آپ کا رب جو غلبے والا ہے (پاک ہے) ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں ﴿۱۸۰﴾ سلام ہے
الْمُرْسَلِيْنَ ﴿١٨١﴾ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٨٢﴾
رسولوں پر ﴿۱۸۱﴾ اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو ربّ العالمین ہے ﴿۱۸۲﴾

تفسیر

حضرت یونس علیہ السلام کا واقعہ

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اور بے شک یونس علیہ السلام بھی البتہ رسولوں میں سے تھے۔ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ: ان کا واقعہ سورۂ یونس کے اندر تفصیلی طور پر ذکر کر دیا گیا تھا، کہ یہ نینویٰ شہر ہے جس کی طرف یہ بھیجے گئے تھے، آبادی اس کی لاکھ یا لاکھ سے زیادہ تھی، جیسا کہ آگے لفظ آرہے ہیں، یعنی اگر کسر کا اعتبار کر لیا جائے تو لاکھ سے زیادہ بھی کہہ سکتے ہیں، اور جس طرح سے عرب میں رواج تھا کہ کسر کو چھوڑ دیتے ہیں، تو کسر کو چھوڑ دیا جائے تو ایک لاکھ ہے، جیسے اگر سوا لاکھ مقدار ہو یعنی ایک لاکھ پچیس ہزار، تو سوا لاکھ کو لاکھ کے ساتھ بھی تعبیر کیا جاسکتا ہے، سوا لاکھ کے ساتھ بھی تعبیر کی جاسکتی ہے، یا جیسے سو سے اوپر کچھ بڑھ جائیں، تو اس کو ایک سو بھی کہہ سکتے ہیں، اور بڑھ جانے کی وجہ سے زیادہ بھی ذکر کر سکتے ہیں، تو اَوْ يَزِيْدُوْنَ کا جو لفظ آگے آئے گا تو اس کا یہی مطلب ہے کہ کچھ اوپر کسر تھی، اس کو چھوڑ دیا جائے تو لاکھ بھی کہہ سکتے ہیں، اس کا اعتبار کر لیا جائے تو وہ لاکھ سے زیادہ تھے۔

انبیاء علیہم السلام کی معمولی لغزشوں پر تعبیر سخت کیوں ہوتی ہے؟

حضرت یونس علیہ السلام نے انہیں سمجھایا لیکن وہ نہ سمجھے، تو آپ نے اُن کو عذاب کی دھمکی دی، اور دھمکی دے کر ناراض ہو کر

بغض فی اللہ کے طور پر اس بستی سے نکل پڑے، یعنی قوم کے شرک اور تکذیب کی وجہ سے ان کے دل میں جو قوم کے خلاف بغض آیا، تو اس کی وجہ سے قوم کو چھوڑ کے کہ ان کے ساتھ اب رہنے کی ضرورت نہیں ہے، نکل پڑے۔ اور حضرت یونس علیہ السلام سے یہ اِقدام جو ہوا، اپنے طور پر اچھے جذبات کے تحت ہوا، کہ جو لوگ سمجھائے سمجھتے نہیں، اللہ تعالیٰ کے نافرمان ہیں، تو اُن کے ساتھ رہنے کا کیا فائدہ؟ جس طرح رُوٹھ کے، ناراض ہو کے چلے جاتے ہیں، جذبہ یہ اچھا ہے، اچھے جذبے کے تحت یہ قدم اُٹھایا گیا، اور انبیاء علیہم السلام کی لغزشیں جتنی بھی ہوتی ہیں، سب کا حاصل یہی ہوتا ہے، کہ اپنے طور پر وہ کوئی کام اچھے جذبے سے کرتے ہیں، لیکن چونکہ انسان اور بشر ہوتے ہیں، تو سہو، نسیان یہ ساتھ لازم ہے، تو کوئی دوسرا پہلو ذہن سے نکل جاتا ہے، جس کی بنا پر ان کا اقدام لغزش قرار پاتا ہے، اور پھر اللہ تعالیٰ متوجہ کرتے ہیں تو پھر وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور اِستغفار کرتے ہیں۔ چونکہ انبیاء علیہم السلام کا مقام اللہ کے ہاں بہت اُونچا ہے، اس لیے اُن کی معمولی معمولی لغزشوں کو بھی اللہ تعالیٰ بہت زوردار الفاظ میں ذکر کرتے ہیں، اس سے ان کا منصب نمایاں ہے، اس قسم کے سخت الفاظ سے اُن کی کسی قسم کی اہانت نمایاں نہیں ہے، جتنا کوئی مقرب زیادہ ہوتا ہے اس پر غصہ زیادہ آیا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عادت یہی ہے۔ نافرمان کافر کچھ کرتے پھریں، کچھ بولتے پھریں، اُن کی رَسّی ڈھیلی چھوڑ دی جاتی ہے، لیکن جو مقرب ہوتے ہیں وہ ذرا سی لغزش کرتے ہیں، تو اُن کے اُوپر گرفت بھی زیادہ ہوتی ہے، اور غصہ بھی زیادہ آتا ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام چونکہ سب سے زیادہ مقرب ہوتے ہیں، تو اُن کی معمولی سی لغزش کو اللہ تعالیٰ اس طرح سے بیان کرتے ہیں، جیسے انہوں نے کوئی بہت بڑا جرم کر دیا۔ حقیقت کے اعتبار سے یہ اُن کے قرب کی بنا پر اور اللہ کی نزدیکی کی بنا پر یہ انداز اختیار کیا جاتا ہے، اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ واقعی انہوں نے کوئی اس قسم کا قصور کیا جو ہماری اصطلاح کے اعتبار سے کوئی بہت بڑا قصور ہو، ایسی بات نہیں ہے۔ اب یہ جذبہ کہ ایک شخص اللہ کی نافرمانی کرتا ہے، بار بار اُسے سمجھایا جاتا ہے لیکن وہ نہیں سمجھتا، تو اس کے بعد جس کے دل میں بغض فی اللہ ہوگا، اللہ کی وجہ سے جو دوسروں کے ساتھ بغض رکھتا ہے، وہ یقیناً اُس کو چھوڑ دے گا کہ مجھے اس کے ساتھ رہنے کی کیا ضرورت ہے، لیکن انبیاء علیہم السلام کو چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے صراحتاً اجازت آئے بغیر کسی قوم سے ہجرت نہ کریں۔ جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں ٹھہرے رہے، اور مشرکین کی سختیاں برداشت کرتے رہے، جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف سے اجازت نہیں آئی اس وقت تک آپ مکہ معظمہ سے نہیں نکلے، انہی مشرکوں میں گھرے رہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعونیوں میں گھرے رہے جب اللہ تعالیٰ کی طرف حکم آیا فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا (سورۂ دخان: ۲۳) تب اپنی قوم کو لے کے وہاں سے نکلے اور ہجرت کی۔ لیکن حضرت یونس علیہ السلام بغض فی اللہ کے جذبے سے قوم کو تنبیہ کر کے وہاں سے نکل پڑے کہ ان کے ساتھ اب رہنے کی ضرورت نہیں جو اتنا سمجھانے کے باوجود بھی نہیں سمجھتے۔ تو شہر سے جب نکلے، تو یہی ان کا اقدام اللہ تعالیٰ کے ہاں لغزش ہے کہ انہوں نے صراحتاً اجازت کا انتظار نہیں کیا، اور اپنے طور پر سفرِ ہجرت شروع کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کو بہت سخت انداز سے بیان فرمایا، کہ ایک غلام جس طرح سے نافرمان ہو کر بھاگ پڑتا ہے، اس طرح سے نکل گئے، انہوں نے سمجھا کہ ہم اس کو کچھ کہیں گے نہیں، ہم اس پہ قابو نہیں پا سکتے، اور پھر آگے دریا میں کشتی تیار کھڑی تھی بھری ہوئی، کسی سفر پر چلنے کے لئے، یہ دریائے فرات کا کنارہ ہے جس پر یہ شہر

آباد تھا، اور اب بھی اس کے کھنڈرات موجود ہیں شہر موصل کے بالمقابل۔ کشتی میں سوار ہو گئے، لیکن وہ کشتی آگے جا کے ہچکولے کھانے لگ گئی، اندیشہ ہو گیا کہ یہ ڈوب جائے گی جس طرح سے تفسیر مفسرین نے ذکر کی، تو کشتی والوں نے خیال کیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کشتی کے اندر کوئی غلام بھاگ کے آ گیا ہے، اپنے آقا کا نافرمان، جب تک اس کو کشتی سے اُتارا نہیں جائے گا، دریا میں نہیں پھینکا جائے گا، اس وقت تک کشتی بچے گی نہیں، سارے غرق ہو جائیں گے۔ تو اس کی تعیین کرنے کے لئے قرعہ اندازی تجویز ہوئی، حضرت یونس علیہ السلام قرعہ اندازی میں شریک ہوئے، تو قرعہ حضرت یونس علیہ السلام کے نام ہی نکل آیا، اور یہ فوراً سمجھ گئے کہ یہ اللہ کی طرف سے تنبیہ ہے، میں ہی ہوں اپنے آقا کا غلام جو صراحتاً اجازت کے بغیر آ گیا ہوں، تو میری وجہ سے کشتی والوں پر یہ مصیبت آ رہی ہے، تو حضرت یونس علیہ السلام نے اپنے آپ کو دریا میں پھینک دیا۔ جب یہ دریا میں اُترے تو اللہ کی طرف سے مچھلی کو حکم ہوا، مچھلی نے ان کو نگل لیا، اور اس مچھلی کا پیٹ ان کے لئے ایک قسم کا جیل خانہ بنا دیا گیا، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک تنبیہ مقصود تھی، مچھلی نے اُن کو ہضم نہیں کیا، کھایا نہیں، جس طرح سے جیل کے اندر کسی کو بند کر دیا جاتا ہے، اسی طرح سے مچھلی کا پیٹ اُن کے لئے جیل ثابت ہوا۔ حضرت یونس علیہ السلام سمجھ گئے اللہ تعالیٰ کی اس تنبیہ کو، تو مچھلی کے پیٹ میں چونکہ عقل ہوش حواس سب قائم تھے، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور اِستغفار کی اور اپنے قصور کا اعتراف کیا، یہی تسبیح اُن کی نقل کی گئی: ''لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ سُبْحٰنَكَ ۚ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ'' (سورۂ انبیاء: ۸۷) تو اللہ تعالیٰ نے اس تسبیح کی برکت سے، اِستغفار کی برکت سے اُن کو نجات دی، اور مچھلی اُن کو کنارے پر آ کے پھینک گئی۔ تو چونکہ کئی دِن تک وہ مچھلی کے پیٹ میں رہے، اور اندھیروں اور تاریکیوں میں رہے، جس طرح سے آپ کے سامنے سورۂ انبیاء میں لفظ آیا تھا: فَنَادٰی فِی الظُّلُمٰتِ: تاریکیوں میں، دریا کی تہہ کی تاریکی، مچھلی کے پیٹ کی، پھر مچھلی کے پیٹ کے اندر بھی کوئی جھلی جس کے اندر وہ ہوں گے۔ تو ظلمات میں تاریکیوں میں اللہ تعالیٰ کو پکارا، تو اللہ نے رحم فرمایا، باہر پھینک دیے گئے، تو اُس وقت ان کی طبیعت اچھی نہیں تھی، مچھلی کے پیٹ میں کئی دِن رہنے کی وجہ سے کمزور ہو گئے، نحیف ہو گئے، تو اللہ تعالیٰ نے کارسازی کی، وہاں کوئی بیل اُگا دی، یقطین کہتے ہیں بیل کو جو زمین پر پھیلتی ہے، اور شجرۃ مطلق نباتات کے لیے بول دیا جاتا ہے، تو شَجَرَةً مِّنْ يَّقْطِيْنٍ کا معنی ہوگا بیل دار درخت اللہ نے اُگا دیا، لفظی معنی یوں کریں گے، تو تھی اصل میں بیل ہی، جس طرح سے بعض روایات میں معلوم ہوتا ہے کہ کدو کی بیل تھی۔ اس لیے کدو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بہت پسند فرماتے تھے،[1] چونکہ حضرت یونس علیہ السلام کے ساتھ بھی اس کی نسبت ہے، تو آپ بڑے شوق کے ساتھ کھایا کرتے تھے۔ بقول حضرت تھانوی رحمہ اللہ کے ممکن ہے کہ وہاں کوئی جھاڑی یا کوئی چھوٹا درخت ہوگا، بیل اس کے اُوپر چڑھ گئی، جس کی بنا پر سایہ اچھا ہو گیا، تو اس سائے میں کچھ تھوڑی سی طبیعت سنبھلی، تو دوبارہ وہ پھر اپنی قوم کی طرف آئے، قوم عذاب کے آثار دیکھ کے سمجھ چکی تھی، توبہ اِستغفار میں لگ گئی تھی، جس کی بنا پر ان سے وہ عذاب ٹل گیا، اور پھر وہ ساری کی ساری قوم ایمان لے آئی۔ یہ ہے حضرت یونس علیہ السلام کے واقعے کی تفصیل جو آپ کے سامنے سورۂ یونس میں بھی گزری تھی ہے۔

---

(۱) مسلم ۲/۱۸۰- ولفظه: يَأْكُلُ مِنْ ذَالِكَ الدُّبَّاءِ وَيُعْجِبُهُ- نیز بخاری ۱/۲۸۱، باب ذِکر الخیاط- مشکوۃ ۲/۳۶۴، کتاب الأطعمة-

حضرت یونس علیہ السلام نے تبلیغ میں کوتاہی نہیں کی تھی

اس ساری تفصیل سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام نے نہ تو تبلیغ میں کوئی کوتاہی کی تھی، نہ اپنے فرضِ منصبی کے ادا کرنے میں۔ نبی کبھی بھی کوتاہی نہیں کرسکتا، اللہ تعالیٰ نبی بناتا ہی اس کو ہے جس کے متعلق اللہ کو پتا ہوتا ہے کہ یہ اپنے کام میں کوتاہی نہیں کرے گا۔ ہاں! البتہ انسان ہیں، ایک طرف دھیان نہیں جاتا، سہو اور نسیان انسان کے ساتھ ہے، تو اس غصے میں کہ میں ان کو سمجھا رہا ہوں اور یہ سمجھتے نہیں، تو عذاب کی دھمکی دے کے وہاں سے علیحدہ ہوگئے، اللہ کی طرف سے ہجرت کی اجازت آئے بغیر، اتنی سی بات ہے جس کی بنا پر حضرت یونس علیہ السلام پر اللہ کی طرف سے گرفت ہوئی، اور حضور ﷺ کو صبر و استقامت کی تعلیم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے یہی کہا، فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوتِ (سورۂ قلم:۴۸) مچھلی والے کی طرح نہ ہوجانا کہ جلدی سے غصے میں آکے، اپنی قوم کو چھوڑ کے چل دو، اپنے رَبّ کے حکم کی وجہ سے صبر کیجئے، مشکلات کو برداشت کیجئے۔ تو یہ لغزش ہے حضرت یونس علیہ السلام کی جس کو اگر ہم اپنے حالات کے طور پر دیکھیں، تو یہ کوئی گناہ والی بات نہیں ہے، نہ کوئی گرفت کی بات ہے، ایک قوم کو سمجھاتے ہیں، نہیں سمجھتی تو غصے کے ساتھ ان سے علیحدہ ہوجانا اور ان کو کہنا کہ اچھا! اب تمہیں اللہ سمجھائے گا، بظاہر یہ بات بالکل ٹھیک ہے اور جواز کے درجے کی ہے، اور نبی کا جذبہ یہی ہوا کرتا ہے، بُغض فی اللہ کے طور پر ان سے علیحدہ ہوگئے لیکن صراحتاً چونکہ ہجرت کی اجازت نہیں آئی تھی، بس اس بات کی وجہ سے ان پہ گرفت ہوئی ہے۔ (کسی سوال کے جواب میں فرمایا) دِنوں کی تعیین نظر سے نہیں گزری کہ وہ کتنے دِن تک ٹھہرے۔[1]

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

وَاِنَّ يُوْنُسَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ: اور بے شک یونس علیہ السلام البتہ رسولوں میں سے تھے، اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ: فلك مشحون: بھری ہوئی کشتی، لدی ہوئی کشتی۔ یہ لفظ آپ کے سامنے سورۂ یٰسٓ میں بھی گزرا ہے، وَاٰيَةٌ لَّهُمْ اَنَّا حَمَلْنَا ذُرِّيَّتَهُمْ فِي الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ (سورۂ یٰسٓ:۴۱) اَبَقَ بھاگنے کو کہتے ہیں، لیکن لغتِ عرب کے اندر ''اَبَقَ'' کا معنی ہوتا ہے کسی غلام کا اپنے آقا سے اس کی اجازت کے بغیر بھاگ جانا، تو یہاں یہ لفظ استعمال کیا گیا ان کے منصب کے لحاظ سے، گویا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اجازت کے بغیر جو گئے تو ایسے تھے جیسا کہ غلام نافرمان ہو کے بھاگ جائے، یہ ان کے منصب کے تقاضے سے ان کی اس لغزش کو اتنے سخت الفاظ سے ذکر کیا جارہا ہے۔ جیسے کہتے ہیں عوفَ العبدِ قدرَ التقرُّب، ''مقرباں را بیش بود حیرانی'' یہ بات اسی محاورے کے تحت ہے کہ جتنا کوئی مقرب زیادہ ہوتا ہے وہ پریشان زیادہ ہوا کرتا ہے، اور اس کے اُوپر عتاب زیادہ ہوتا ہے، گرفت زیادہ ہوتی ہے، معمولی معمولی لغزشوں سے بھی درگزر نہیں کیا جاتا، بلکہ اس کے اُوپر سخت تنبیہ آتی ہے۔ نافرمان اور مخالف لوگوں کے ساتھ اس قسم کا برتاؤ نہیں ہوا کرتا۔ اِذْ اَبَقَ اِلَى الْفُلْكِ الْمَشْحُوْنِ: جبکہ وہ بھاگ کھڑے ہوئے بھری ہوئی کشتی کی طرف، یعنی شہر سے نکلے اور کشتی کی طرف چلے گئے، فَسَاهَمَ: ساهَمَ مُساهَمَةً: دوسروں کے ساتھ مل کے قرعہ اندازی کرنا۔ پھر وہ قرعہ اندازی میں شریک ہوئے، فَكَانَ

(۱) ایک دن، ۳ دن، ۷ دن، ۲۰ دن، ۴۰ دن، یہ تمام اقوال نقل کر کے علامہ آلوسی نے لکھا ونی البحر ما یدل علی انه لم یصح عنه فی مدة لبثه فی بطن الحوت.

مِنَ الْمُدْحَضِیْنَ: تو وہی شکست خوردہ لوگوں میں سے تھے، مدحض: شکست خوردہ۔ یعنی وہی اس زد میں آگئے، قرعہ انہی کے خلاف نکلا۔ فَالْتَقَمَهُ الْحُوْتُ: اِلْتَقَمَ: نگل لینا۔ پس لقمہ بنالیا اُن کو مچھلی نے، وَهُوَ مُلِیْمٌ: اور یونس علیہ السلام ملیم تھے۔ مُلِیْمٌ اَلَامَ یُلِیْمُ سے ہے۔ اس کا ترجمہ دو طرح سے کیا جاتا ہے، ملیم نفسہ حضرت یونس علیہ السلام اپنے آپ کو ملامت کرنے والے تھے، جب مچھلی نے نگلا تو اپنے آپ پہ ملامت کرتے تھے کہ یہ میں نے کیا کیا مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ یا اس کا معنی ہوتا ہے قابلِ ملامت کام کرنے والے، انہوں نے قابلِ ملامت کام کیا تھا، یعنی اس قسم کا کام کر چکے تھے جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پہ یہ ملامت ہوئی۔ وہ قابلِ ملامت کام کرنے والے تھے، یا اپنے آپ کو ملامت کرنے والے تھے، دونوں طرح سے ترجمہ اس کا ہوسکتا ہے (مظہری)۔ فَلَوْلَآ اَنَّهٗ كَانَ مِنَ الْمُسَبِّحِیْنَ: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ وہ مسبحین میں سے تھے، اللہ کی تسبیح پڑھنے والے تھے، اللہ کو یاد کرنے والے تھے، اگر یہ بات نہ ہوتی لَلَبِثَ فِیْ بَطْنِهٖۤ اِلٰى یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ: تو البتہ ٹھہرے رہتے مچھلی کے بطن میں قیامت کے دن تک، اس دن تک جس میں لوگ اُٹھائے جائیں گے، اس دن تک مچھلی کے پیٹ میں ٹھہرے رہتے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قیامت تک وہ مچھلی زندہ رہتی، اور مچھلی کے پیٹ میں حضرت یونس علیہ السلام بھی پڑے رہتے، اس کا یہ مقصد نہیں، اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ قیامت تک اُن کو مچھلی کے پیٹ سے نکلنا نصیب نہ ہوتا، بلکہ اس کے اندر ہی ان کی وفات ہوجاتی، مچھلی ان کو کھاجاتی، وہ مچھلی کے پیوند ہوجاتے، قیامت تک ان کو مچھلی کے پیٹ سے نکلنا نصیب نہ ہوتا، پھر جس دن باقی لوگ زندہ ہو کر اُٹھتے تو اس دن حضرت یونس علیہ السلام بھی اُٹھ جاتے۔ ''قیامت تک نکلنا نصیب نہ ہوتا'' مطلب یہ ہے کہ ایسا واقعہ نہ ہوتا کہ حضرت یونس علیہ السلام نکل آتے، بلکہ یہ نکلنے کا واقعہ پھر قیامت کو ہی پیش آتا، مچھلی ان کو کھاجاتی اور وہ اس کا جزوِ بدن بن جاتے، جس طرح سے ہم کہتے ہیں کہ ''یہ مردہ قبر سے قیامت تک نہیں نکلے گا'' تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہیں وہ پیوست ہوگیا، جس وقت قیامت آئے گی تو اللہ تعالیٰ دوبارہ اُٹھائیں گے۔ تو یہ مطلب نہیں کہ قیامت تک یہ مچھلی زندہ رہتی اور مچھلی کے پیٹ میں یونس علیہ السلام اسی طرح سے مقید رہتے، نہیں، مطلب یہ ہے کہ قیامت سے پہلے نہ نکلتے، مچھلی کے پیٹ میں ان کو موت آجاتی، مچھلی ان کھاجاتی، وہ ہضم ہوجاتے۔ فَنَبَذْنٰهُ بِالْعَرَآءِ: عراء خالی میدان کو کہتے ہیں۔ پھر ہم نے پھینک دیا اُس کو خالی میدان میں، وَهُوَ سَقِیْمٌ: اس حال میں کہ وہ کمزور تھے، بیمار تھے۔

وَاَنْۢبَتْنَا عَلَیْهِ شَجَرَةً مِّنْ یَّقْطِیْنٍ: اور اُگایا ہم نے اُن کے اُوپر بیل دار درخت۔ مِّنْ یَّقْطِیْنٍ یہ شَجَرَةً کا بیان ہے، شَجَرَةً عام ہے یَقْطِیْن خاص ہے۔ یَقْطِیْن بیل دار چیز کو کہتے ہیں، شَجَرَةً ہر اگنے والی چیز کو کہا جاسکتا ہے، ایک شجرہ وہ ہوتا ہے جس کا تنا ہو اور وہ تنے پہ کھڑا ہوتا ہے، اور ایک شجرہ یہ ہوگیا جو زمین پہ پھیل جاتا ہے، تو یہ زمین پہ پھیلنے والا درخت تھا جو اللہ تعالیٰ نے یونس علیہ السلام کو سایہ کرنے کے لیے اُگا یا، اور وہ درخت کیا تھا؟ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کدو کی بیل تھی، پھر وہ کسی جھاڑی پر پھیلا دی ہو، یا کوئی وہاں چھوٹا موٹا درخت ہو جس کے اپنے پتے نہیں تھے، وہ سایہ نہیں دے سکتا تھا، تو اللہ تعالیٰ نے اس کے اُوپر وہ بیل چڑھادی جس کی بنا پر حضرت یونس علیہ السلام پہ سایہ ہوگیا، ورنہ کدو کی بیل اگر زمین کے اوپر پھیلی ہوئی ہو تو وہ اس انداز کی نہیں ہوتی کہ کوئی شخص اس کے سائے میں بیٹھ سکے، تو پھر یہی توجیہ کی جائے گی کہ کوئی جھاڑی تھی جس کے اُوپر اس بیل کو چڑھادیا گیا، یا کوئی درخت تھا جس کے اپنے پتے نہیں تھے جو سایہ دیتے، تو سائے کے طور پر وہ بیل اس کے اُوپر چڑھادی گئی، اور ایک آدھ درخت

اور وہ بھی پتوں سے خالی، اگر کھڑا ہو تو وہ عراء ہونے کے منافی بھی نہیں، ایک آدھ درخت اگر اس طرح سے کھڑا ہو کہ جس کی صرف لکڑی سی نمایاں ہے، سایہ نہیں ہے، تو یہ چٹیل میدان ہونے کے منافی نہیں ہے، اس لیے عراء کے باوجود اگر ایک درخت کا وجود مان لیا جائے جو خود سائے کے لیے کافی نہیں تھا، اس کے اوپر اللہ تعالیٰ نے بیل چڑھا دی، تو دونوں باتیں اپنی جگہ ٹھیک ہو جاتی ہیں۔ ورنہ بظاہر اشکال ہے کہ بیل کے سائے میں حضرت یونس علیہ السلام کس طرح سے بیٹھ سکتے ہیں؟ تو کوئی ایسی صورت بن گئی ہوگی۔

وَاَرْسَلْنٰهُ اِلٰى مِائَةِ اَلْفٍ اَوْ يَزِيْدُوْنَ: بھیجا ہم نے یونس علیہ السلام کو ایک لاکھ کی طرف یا وہ زیادہ تھے۔ ''یا وہ زیادہ تھے'' یہ بات محاورے کے مطابق ہے کہ اگر کسر کو چھوڑ دیا جائے تو ایک لاکھ کہہ سکتے ہیں، کسر کا اعتبار کر لیا جائے تو وہ ایک لاکھ سے زیادہ تھے، عرب کے اندر خاص طور پر کسر کو گرا کے بات کر لیا کرتے تھے، جیسے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے متعلق بھی کئی روایات میں آتا ہے کہ آپ کی عمر ساٹھ سال ہوئی، تو وہاں دوسری روایات کے ساتھ مطابقت کرنے کے لئے یہی توجیہ ہے، باقی اصح روایات میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر تریسٹھ سال ہے، اور بخاری شریف کی بعض روایات میں ساٹھ سال کا ذکر بھی ہے، تو وہاں پھر توجیہ یہی ہے کہ کسر کو چھوڑ دیا گیا ہے، جب کسر دوسرے عقد کی طرف قریب چلی جائے تو اس کو پورا کر کے ذکر کر دیتے ہیں، مثلاً ۶۸ یا ۶۹ ہو تو اس کو ۷۰ کے ساتھ تعبیر کر دیں گے، اور اگر ۶۱، ۶۲، ۶۳ ہو تو اس کو ۶۰ کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں، یہ بات محاورے میں آتی رہتی ہے، اگر نصف سے آگے بڑھ جائے دوسرے عقد کی طرف تو اس کو اوپر کی طرف پورا کر دیتے ہیں، اور نصف سے نیچے ہو تو اس کو بسا اوقات نیچے والے عقد کے ساتھ ہی تعبیر کر دیتے ہیں، تو یہاں بھی جن کی طرف حضرت یونس علیہ السلام بھیجے گئے تھے، اگر کسر کا اعتبار نہ کیا جائے تو ایک لاکھ تھے، کسر کا اعتبار کر لیا جائے تو ایک لاکھ سے زیادہ تھے۔ فَاٰمَنُوْا: پھر وہ لوگ ایمان لے آئے، فَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِيْنٍ: پھر ہم نے اُن کو فائدہ پہنچایا ایک وقت تک۔ ایک وقت سے ان کی اپنی عمر مراد ہے، کہ پھر ان کو عذاب کے ساتھ ہلاک نہ کیا گیا، بلکہ امن وعافیت کے ساتھ ہم نے ان کی عمر تک ان کو فائدہ پہنچایا...... یہاں تک واقعات کا سلسلہ ختم ہو گیا۔

فرشتوں اور جنوں کے متعلق مشرکین کا عقیدہ اور اس کا رَدّ

آپ حضرات کو یاد ہوگا کہ سورت کے شروع میں شرک کی تردید تھی، خصوصیت کے ساتھ فرشتوں اور جنات کے متعلق، آگے پھر اسی مضمون کی طرف عود ہے۔ فرشتوں کے متعلق اُن کا عقیدہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور یہ اللہ کے چہیتے ہیں، جو چاہیں اللہ سے کروا لیتے ہیں منوا لیتے ہیں، اس جذبے کے تحت ہی وہ لوگ ان کو پکارتے تھے، اور ان کی پوجا کرتے تھے۔ اور جنوں کو وہ اپنے لیے سہارے سمجھتے تھے، کہ یہ عالم الغیب ہیں، ان کا ملاءِ اعلیٰ کے ساتھ رابطہ ہے، وہاں سے یہ حالات معلوم کر لیتے ہیں، ہمیں آنے والی باتیں بتاتے ہیں، تو یہاں بھی شروع سورت کی طرح اب اسی مضمون کی تردید ہے...... فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ: یہاں اللہ تعالیٰ اس انداز سے تردید فرماتے ہیں کہ...... پہلی بات تو یہ ہے کہ لوگوں سے یہ پوچھو کہ جب یہ لڑکیاں اپنے لیے پسند نہیں کرتے، اور لڑکی کی نسبت اپنے لیے عیب سمجھتے ہیں، تو پھر یہ اللہ تعالیٰ کی طرف اپنے خیال کے مطابق اس عیب کو کیوں

منسوب کرتے ہیں؟ کسی کے گھر میں لڑکی پیدا ہو جانا فی الواقع عیب نہیں ہے، یہ ایک عرفی بات ہے جو کہی جا رہی ہے کہ جس عرف کے اندر لڑکیوں کی نسبت کو عیب سمجھا جاتا ہے، تو اس عرف میں رہنے والوں کے لئے تو یہ سزاوار نہیں ہے کہ لڑکیوں کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف کریں جبکہ اس عرف کے اندر یہ بات ایک بے عزتی کی ہے اور عیب کی ہے، اُس عرف کا اعتبار کرتے ہوئے یہ بات کہی جا رہی ہے...... دوسری بات یہ کہی جا رہی ہے کہ انہوں نے جو یہ کہا کہ اللہ کی بیٹیاں ہیں، تو کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا ہے؟ ان کے پاس کیا دلیل ہے؟ کہ فرشتے مؤنث ہیں لڑکیاں ہیں، کیا یہ اس وقت موجود تھے جب ہم نے فرشتوں کو بنایا تھا؟ اور یہ دیکھ رہے تھے کہ یہ لڑکیاں ہیں؟...... اور تیسری بات یہ کہی جا رہی ہے کہ جب یہ اللہ کی بیٹیاں بناتے ہیں تو پھر ان بیٹیوں کی مائیں کن کو قرار دیتے ہیں؟ تو مشرکین کا عقیدہ یہ تھا کہ ان کی مائیں جنوں کی بیٹیاں ہیں، سردار جنوں کی بیٹیاں ان کی مائیں ہیں۔ اب یہ کتنی قبیح بات ہے نعوذ باللہ! ''نقلِ کفر، کفر نہ باشد!'' کہ اللہ کے لئے بیوی ثابت کی جائے، اور پھر جس قسم کے بیوی اور خاوند کے تعلقات ہیں اُن کا تصور اللہ کی ذات کے متعلق کیا جائے، اور پھر پیدا بیٹیاں ہوں، تو کوئی عقل مند اس قسم کی بات کر سکتا ہے؟ وہ سوچتے نہیں اس بات کو؟ کہ کیا اللہ تعالیٰ کا تعلق ان جنوں کی بیٹیوں کے ساتھ ویسا ثابت کریں گے جس طرح سے خاوند بیوی کا ہوتا ہے؟ اور پھر اس کے نتیجے میں پیدا فرشتے ہوں گے؟ اب مائیں جنات کی بیٹیاں ہوں، اور نعوذ باللہ! باپ اللہ ہو، اور پیدا فرشتے ہو جائیں، کتنی بے جوڑ بات ہے، جس کو اُردو کے محاورے میں کہا کرتے ہیں کہ ''کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا'' تو یہ بھی کہیں کی اینٹ اور کہیں کا روڑا جوڑ کے ایک کنبہ بنا لیا، کہ اللہ تعالیٰ نے جنات کے گھر شادیاں کیں تو بیویاں جنات ہو گئیں اور پیدا فرشتے ہو گئے۔ یہ ساری کی ساری خلافِ عقل باتیں ہیں، اُن کو کہا جا رہا ہے کہ تم عقل سے کام نہیں لیتے؟ یہ باتیں بھلا کرنے کی ہیں؟ کسی سمجھ دار آدمی کی زبان پہ یہ بات آ سکتی ہے؟ اسی طرح سے دُوسری جگہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا أَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّ لَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ (سورۂ انعام: ۱۰۱) اللہ کی اولاد کیسے ہو سکتی ہے؟ اللہ کی تو بیوی ہی کوئی نہیں، تو بیوی کا تصور اللہ تعالیٰ کے متعلق کرنا یہ بھی عیب ہے۔ تو تم اللہ کو جمیع صفاتِ کمال کے ساتھ موصوف اپنی زبان سے قرار دیتے ہوئے پھر یہ عیب کیوں لگاتے ہو؟ اور اللہ کے لئے بیٹیوں اور بیویوں کو کیوں ثابت کرتے ہو؟ تو نہ اللہ کی نسبت جنوں کی طرف ہے، اور نہ یہ فرشتے مؤنث ہیں، نہ یہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، یہ سارے ہی تمہارے عقائد غلط ہیں۔ جب یہ عقائد غلط ہیں تو تم ان کے نام پر چڑھاوے چڑھاؤ، ان کو اپنی مشکلات کے اندر پکارو، اور ان کو اپنا کارساز سمجھو، ان کو مشکل کشا سمجھو، اور ان کی تصویریں بنا کے ان کے سامنے سجدے کرو، یہ ساری کی ساری تمہاری حماقتیں ہیں، ان کی بنا کسی دلیل پر نہیں، نہ عرفی دلیل پر، نہ عقلی دلیل پر، نہ نقلی دلیل پر۔ اللہ نے کوئی کتاب ایسی نہیں اُتاری کہ جس میں یہ بات بتائی ہو کہ جنوں کے ساتھ میرا رشتہ ہے اور فرشتے میری بیٹیاں ہیں۔ عقل بھی اس کے خلاف، نقل بھی اس کے خلاف، تو پھر تم نے یہ واہیات عقیدے کہاں سے اختیار کر لیے؟ اس انداز کے ساتھ یہاں اُن کے اس شرک کی یہاں تردید کی جا رہی ہے۔

خلاصۂ آیات

……فَاسْتَفْتِهِمْ اَلِرَبِّكَ الْبَنَاتُ وَلَهُمُ الْبَنُوْنَ: ان سے آپ پوچھئے، کیا تیرے رَبّ کے لئے بیٹیاں ہیں؟ اور ان کے لیے بیٹے ہیں؟ یعنی اپنے لیے تو بیٹوں کی نسبت کو پسند کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف بیٹیاں منسوب کردیں۔ اَمْ خَلَقْنَا الْمَلٰٓئِكَةَ اِنَاثًا وَّهُمْ شٰهِدُوْنَ: کیا پیدا کیا ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں، اور یہ حاضر تھے موجود تھے مشاہدہ کرنے والے تھے؟ یہ دیکھ رہے تھے؟ کہ ہم نے فرشتوں کو لڑکیاں بنایا ہے۔ اَلَاۤ اِنَّهُمْ مِّنْ اِفْكِهِمْ لَيَقُوْلُوْنَ ۙ وَلَدَ اللّٰهُ: بے شک یہ اپنے جھوٹ بولنے کی وجہ سے البتہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد جنی، اللہ صاحبِ اولاد ہے، ان کی یہ بات جھوٹ بولنے کی وجہ سے ہے۔ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ: اس بات میں بالکل جھوٹے ہیں، جس کے اندر کوئی واقعہ نہیں ہے، اللہ نے کوئی اولاد اختیار نہیں کی۔ اِفک بھی بدترین قسم کے جھوٹ کو کہتے ہیں، یہ لفظ پہلے بھی اسی سورت میں آپ کے سامنے آیا اَئِفْكًا اٰلِهَةً دُوْنَ اللّٰهِ تُرِيْدُوْنَ، اور سورۂ نور میں بھی یہ لفظ آیا تھا اِنَّ الَّذِيْنَ جَآءُوْ بِالْاِفْكِ عُصْبَةٌ مِّنْكُمْ۔ اپنے بدتر جھوٹ کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ اللہ نے اولاد جنی، اللہ صاحبِ اولاد ہے، بے شک وہ اس بات میں البتہ جھوٹے ہیں۔ اِنَّ مستقل تاکید کے لئے، لَكٰذِبُوْنَ پر لام مستقل تاکید کے لئے، اور جملہ اسمیہ مستقل تاکید کا مفہوم ادا کرتا ہے۔ اَصْطَفَى الْبَنَاتِ عَلَى الْبَنِيْنَ: اَصْطَفٰی اصل میں تھا اَاِصْطَفٰی، پہلا ہمزہ استفہام ہے، اور درمیان میں ہمزہ وصلی تھا جس کو گرا دیا گیا، پڑھنے میں بھی اور لکھنے میں بھی۔ کیا چنی بیٹیاں اللہ تعالیٰ نے بیٹوں پر؟ مَا لَكُمْ ۫ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ: تمہیں کیا ہو گیا؟ تم کیسے فیصلے کرتے ہو؟ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا تم سمجھتے نہیں؟ تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؟ اَمْ لَكُمْ سُلْطٰنٌ مُّبِيْنٌ: کیا تمہارے پاس کوئی واضح دلیل ہے اس کی؟ یعنی کوئی عقلی دلیل ہے؟ فَاْتُوْا بِكِتٰبِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: لے آؤ تم اپنی کوئی کتاب اگر تم سچے ہو، یعنی کوئی نقلی دلیل ہے تو وہی لے آؤ، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی کتاب اُتری ہو، اور اس کتاب کے اندر اس بات کو بیان کیا گیا ہو، ایسی بات ہے تو وہ دکھا دو۔ وَجَعَلُوْا بَيْنَهٗ وَبَيْنَ الْجِنَّةِ نَسَبًا: اور کیا انہوں نے اللہ کے درمیان اور جنوں کے درمیان نسب، ان کی آپس میں نسبت کر دی، اللہ کی نسبت جنوں کے ساتھ اور جنوں کی نسبت اللہ کے ساتھ، یوں رشتہ داری ثابت کر دی۔ وَلَقَدْ عَلِمَتِ الْجِنَّةُ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ: البتہ تحقیق جان لیا جنوں نے کہ بے شک وہ بھی حاضر کیے ہوئے ہیں، وہ بھی اللہ کے سامنے مجرمانہ طور پر حاضر ہوں گے، جس طرح سے انسان حاضر ہوں گے۔ جنوں کو تو پتا ہے، ''مدعی ست گواہ چست'' جن تو اپنے آپ کو نہیں سمجھتے کہ ہم اللہ کے رشتہ دار ہیں، اور انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کی رشتہ داری قائم کر دی، جنوں کو پتا ہے کہ جس طرح سے باقی انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب و کتاب کے لیے حاضر کیے جائیں گے تو یہ بھی حاضر کیے جائیں۔ سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يَصِفُوْنَ: اللہ پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں، اِلَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ: مگر اللہ کے مخلص بندے یہ اِنَّهُمْ لَمُحْضَرُوْنَ سے مستثنیٰ ہے (عام تفاسیر)، جن حاضر کیے جائیں گے سوائے اللہ کے ان بندوں کے جو کہ مخلص ہیں، تو جنوں میں جو اللہ کے چنے ہوئے بندے ہیں، وہ بھی مغفور ہوں گے، وہ اس طرح سے پکڑ کے نہیں لائے جائیں گے۔ فَاِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ: بے شک تم اور وہ چیزیں جن کی تم عبادت کرتے ہو، مَاۤ اَنْتُمْ عَلَيْهِ بِفٰتِنِيْنَ: عَلَيْهِ کی ضمیر اللہ کی طرف راجع ہے۔ بے شک تم اللہ تعالیٰ کے خلاف کسی کو گمراہی میں ڈالنے والے نہیں، اِلَّا مَنْ هُوَ صَالِ الْجَحِيْمِ گمراہی کو

جو کہ جہنم میں داخل ہونے والا ہے، یعنی تم کسی کو گمراہ نہیں کرسکتے، ہاں! جس کی قسمت میں جہنم میں لکھی ہے اور وہ جہنم میں جانے والا ہے، وہی تمہارے پیچھے لگ جائے گا۔

فرشتوں کا مقام، فرشتوں کی زبانی!

آگے فرشتوں کی زبان سے اپنے مقام کی وضاحت ہے۔ وَمَامِنَّآ اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ: یہ جبریل علیہ السلام کی زبان سے گویا کہ فرشتوں کی جماعت کی ترجمانی کی جارہی ہے، جس میں یہ بتایا جارہا ہے کہ ہم تو اللہ کے سامنے ہروقت صف بستہ رہتے ہیں، دست بستہ رہتے ہیں اس کے حکم کی تعمیل میں، اور اللہ کی ہروقت تسبیح کرتے ہیں، تو ہم اللہ کے شریک کدھر سے ہوگئے؟ جو لوگ ہمیں یعنی فرشتوں کی جماعت کو اللہ کا شریک ٹھہراتے ہیں وہ سارے کے سارے خطاکار ہیں۔ مَامِنَّآ نہیں ہے ہم میں سے کوئی بھی، اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ مگر اس کا ایک مقام معلوم ہے، اس کا ایک مرتبہ متعین ہے۔ وَّاِنَّا لَنَحْنُ الصَّآفُّوْنَ: اور بے شک ہم البتہ صفیں باندھنے والے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے ہروقت صف بستہ رہتے ہیں، جیسے وَالصّٰٓفّٰتِ صَفًّا کے اندر ذکر کیا گیا تھا۔ وَاِنَّا لَنَحْنُ الْمُسَبِّحُوْنَ: اور بے شک ہم البتہ اللہ کی تسبیح بیان کرنے والے ہیں، ہروقت اللہ کی تسبیح تحمید میں لگے رہتے ہیں۔

مشرکینِ مکہ اپنی بات سے پھر گئے

وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ: یہاں سے مشرکینِ مکہ کو ملامت ہے، جیسے پہلے آپ کے سامنے سورۂ فاطر کے آخر میں یہ بات ذکر کی گئی تھی، کہ مشرکینِ مکہ میں سے بعض لوگ جس وقت اہلِ کتاب کی باتیں سنتے تو اُن کے دل میں بھی حسرت آتی، کہ ہمارے پاس بھی کوئی آتا اور اس طرح سے اللہ کی کتاب آتی، تو ہم بھی اُس کو تسلیم کرتے، اور ان لوگوں کی طرح اس کتاب کی بے قدری نہ کرتے۔ اللہ تعالیٰ وہی باتیں انہیں یاد دلاتا ہے کہ اب جب اللہ کا نبی آگیا، کتاب آگئی، تو تمہیں چاہیے تھا کہ اس کی قدر کرتے۔ وَاِنْ كَانُوْا لَيَقُوْلُوْنَ: یہ ان مخففہ من المثقلہ ہے، اِن شرطیہ نہیں۔ بے شک بات یہ ہے کہ یہ لوگ البتہ کہا کرتے تھے، لَوْ اَنَّ عِنْدَنَا ذِكْرًا مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ: اگر ہمارے پاس کوئی نصیحت کی بات ہوتی پہلے لوگوں کی طرف سے، اگر ہمارے پاس کوئی ذکر اس طرح سے منتقل ہو کے آتا پہلے لوگوں کی طرف سے، لَكُنَّا عِبَادَ اللّٰهِ الْمُخْلَصِيْنَ: تو ہم البتہ اللہ کے چنے ہوئے بندے ہوتے۔ فَكَفَرُوْا بِهٖ: اور جب ان کے پاس ذکر آگیا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت آگئی تو انہوں نے اس کا انکار کیا۔ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ: پس ان کو عنقریب پتا چل جائے گا کہ اس انکار کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔

غلبہ ہمیشہ رسولوں کو ہی ملتا ہے، اس پر ایک اِشکال اور جواب

وَلَقَدْ سَبَقَتْ كَلِمَتُنَا لِعِبَادِنَا الْمُرْسَلِيْنَ: البتہ تحقیق سبقت لے گئی ہماری بات ہمارے مرسل بندوں کے لئے، اِنَّهُمْ لَهُمُ

الْمَنْصُوْرُوْنَ: بے شک وہ البتہ مدد کیے ہوئے ہیں، وَاِنَّ جُنْدَنَا لَهُمُ الْغٰلِبُوْنَ: اور بے شک ہمارا لشکر ہی البتہ غلبہ پانے والا ہے، یعنی مشرکین کی مخالفت ہمارے حق کو مغلوب نہیں کر سکتی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ بات طے شدہ ہے کہ رسولوں کو مدد دی جاتی ہے، اور جو اللہ کا لشکر ہوتا ہے وہ غالب آ کے رہتا ہے، اوّل تو دنیا کے اندر ہی غلبہ نمایاں ہو جاتا ہے حسی طور پر۔ ورنہ آخرت کے فیصلے میں تو یقیناً یہ غالب ہوں گے۔ اور دلیل اور حجت کے اعتبار سے تو ہر وقت اہل حق غالب ہی رہتے ہیں، کسی وقت بھی مغلوب نہیں ہوتے۔ گویا تو دلیل و حجت کا غلبہ مراد ہے، یہ تو اللہ نے ہر رسول کو دیا، کوئی مشرک قوم کوئی کافر قوم اُن کے مقابلے میں حجت اور دلیل میں غالب نہیں آ سکی۔ اور اگر حسی طور پر غلبہ مراد لیا جائے تو اس میں بظاہر یہ اشکال ہے کہ کئی انبیاء علیہم السلام اپنے مخالفین کے سامنے مغلوب ہو گئے، جیسے مخالفین کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے، اس اشکال کو دور کرنے کے لئے کہا جا رہا ہے کہ وہ بھی غالب ہی ہیں، اگر عارضی طور پر ان کافروں کو غلبہ ہو ہی گیا، نتیجہ بہر حال انبیاء علیہم السلام کے حق میں ہی ہے۔ تو دنیا کے اندر اگر اللہ نے اس طرح سے نصرت نہیں فرمائی یا غلبہ نہیں دیا، تو آخرت میں یقیناً اُن کا غلبہ نمایاں ہو جائے گا۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ: یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پیٹھ پھیر جائیے ایک وقت تک، یعنی ایک وقت تک آپ ان سے اعراض کیجئے۔ وَاَبْصِرْهُمْ: آپ ان کو دیکھتے رہیے، فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ: عنقریب وہ بھی دیکھ لیں گے کہ کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اَفَبِعَذَابِنَا يَسْتَعْجِلُوْنَ: کیا یہ ہمارے عذاب کو جلدی طلب کرتے ہیں؟ جب ان کے سامنے کوئی عذاب کی بات ہوتی تھی تو کہتے تھے: "لے آؤ وہ عذاب" کتنی آیات کے اندر یہ بات آ گئی ہے۔ "کیا ہمارے عذاب کو یہ جلدی طلب کرتے ہیں" فَاِذَا نَزَلَ بِسَاحَتِهِمْ: جس وقت وہ عذاب ان کے صحن میں اُتر پڑے گا، فَسَآءَ صَبَاحُ الْمُنْذَرِيْنَ: تو ان ڈرائے ہوئے لوگوں کی صبح بہت خراب ہوگی، پھر ان کی صبح اچھی نہیں گی جس دن وہ عذاب آ گیا، وَتَوَلَّ عَنْهُمْ حَتّٰى حِيْنٍ: آپ ان سے اعراض کر جائیے ایک وقت تک، وَّاَبْصِرْ: اور دیکھتے رہیے، فَسَوْفَ يُبْصِرُوْنَ یہ بھی دیکھ لیں گے۔ سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ: اللہ تعالیٰ پاک ہے، غلبے والا ہے، پاک ہے ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔ اس میں اُن ساری آیات کا خلاصہ آ گیا جو کہ توحید پر دلالت کرنے والی تھیں۔ مشرکین جس قسم کی باتیں اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں، جس میں اللہ کی ذات کو عیب لگایا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ان سب سے پاک ہے۔ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ انبیاء علیہم السلام کا ذکر بھی آیا تھا، اُن کے اُوپر بار بار سلام آئے، تو گویا کہ مسئلہ رسالت وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ کے اندر آ گیا۔ سلام ہے رسولوں پر۔ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: اور سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رَبّ العالمین ہے۔

کفارۂ مجلس کے لیے دُعا، اور آخری تین آیات کی فضیلت

یہ (آخری تین) آیات بھی فضیلت والی ہیں، مجلسوں کے اختتام پر عام طور پر ان کو پڑھنا چاہیے اور عبادت کے بعد

بھی۔حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس مجلس میں انسان بیٹھے اور مختلف قسم کی باتیں کرے، اچھی ہوں بُری ہوں، تو اس مجلس کے آخر میں اگر یہ اللہ کا ذکر آجائے، تو اس مجلس میں کوئی کوتاہی ہوئی ہو، وہ معاف ہوجاتی ہے۔اور اگر کوئی نیکی کا کام کیا تھا، تو اللہ تعالیٰ اس کے اوپر مہر لگا دیتے ہیں، وہ محفوظ ہوجاتی ہے۔اس بارے میں اکثر روایات کے اندر تو الفاظ یہی آتے ہیں: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ ''[1] یہ تین جملے مجلس کے آخر میں پڑھ لیے جائیں، تو یہ کفارۃ المجلس کہلاتے ہیں۔اور اسی طرح سے بعض روایات میں ان تین آیات کے پڑھنے کا ذکر بھی آتا ہے کہ مجلس کے اختتام پر اگر ان کو پڑھ لیا جائے تو یہ بھی مجلس کے لیے کفّارہ بن جاتی ہیں (ابن کثیر، آلوسی)۔اگر کوئی غلطی کوتاہی، کوئی لفظ اُونچا نکل گیا تو معاف ہوجائے گا، اور اگر کوئی نیکی کی بات ہوئی ہے یا نیکی کا کام کیا ہے تو وہ مہر زدہ ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو محفوظ فرما دیتے ہیں۔

***

(۱) ابوداؤد ۲/۱۱ ۳ باب فی کفارۃ المجلس. مشکوٰۃ ۱/ ۲۱۴ باب الدعوات، فصل ثانی۔نیز ۱/ ۲۱۶ باب الدعوات، فصل ثالث کی پہلی حدیث۔

سورة ص

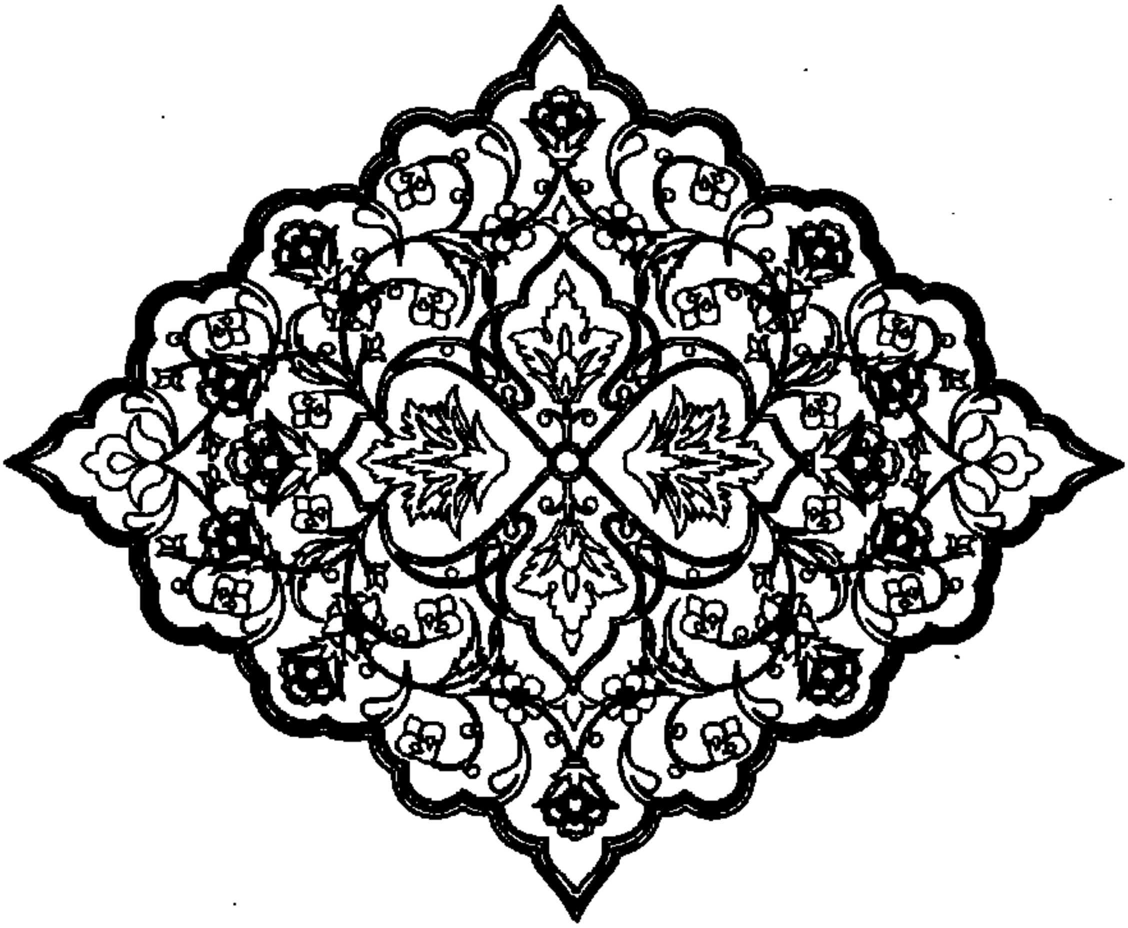

آیاتہا ۸۸ — ۳۸ سورۃ صٓ مکیۃ ۳۸ — رکوعاتہا ۵

سورۂ ص مکہ میں نازل ہوئی، اس کی اٹھاسی آیات اور پانچ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

صٓ وَالْقُرْاٰنِ ذِی الذِّکْرِ ۝١ بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فِیْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ ۝٢ کَمْ
صٓ نصیحت والے قرآن کی قسم ① بلکہ وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا گھمنڈ میں ہیں اور ضد میں ہیں ② کتنی ہی
اَهْلَکْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِیْنَ مَنَاصٍ ۝٣ وَعَجِبُوْٓا اَنْ
جماعتوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے قبل، پھر انہوں نے چیخ و پکار کی، اور وہ وقت بچنے کا وقت نہیں تھا ③ اور انہوں نے تعجب کیا اس بات پر کہ
جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ وَقَالَ الْکٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ کَذَّابٌ ۝٤ اَجَعَلَ
آ گیا ان کے پاس انہی میں سے ڈرانے والا، کافروں نے کہا یہ تو جادوگر ہے جھوٹا ہے ④ کیا اس نے
الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عُجَابٌ ۝٥ وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ
سب آلہہ کو ایک ہی اِلٰہ قرار دے دیا؟ بے شک یہ عجیب ترین چیز ہے ⑤ ان کافروں کے سردار چل دیے (یہ کہتے ہوئے) کہ
امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰٓی اٰلِهَتِکُمْ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ ۝٦ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی
چلو، اور جمے رہو اپنے معبودوں پر، بے شک یہ البتہ ایک چیز ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے ⑥ نہیں سنی ہم نے یہ بات
الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ اِنْ هٰذَآ اِلَّا اخْتِلَاقٌ ۝٧ ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّکْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا بَلْ
پچھلی ملت میں، نہیں ہے یہ مگر جھوٹ تراشا ⑦ کیا اس پر ذکر اُتارا گیا ہمارے درمیان سے؟ بلکہ
هُمْ فِیْ شَکٍّ مِّنْ ذِکْرِیْ بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ ۝٨ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ
وہ میرے ذکر کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، بلکہ انہوں نے ابھی تک میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا ⑧ کیا ان کے پاس
رَحْمَةِ رَبِّکَ الْعَزِیْزِ الْوَهَّابِ ۝٩ اَمْ لَهُمْ مُّلْکُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا
ہیں تیرے رَبّ کی رحمت کے خزانے؟ (ایسا رَبّ) جو کہ عزیز وہاب ہے ⑨ یا ان کے لئے سلطنت ہے آسمانوں اور زمین کی، اور ان چیزوں کی جو

بَيْنَهُمَا ۚ فَلْيَرْتَقُوا فِي الْأَسْبَابِ ۝١٠ جُندٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُومٌ مِّنَ الْأَحْزَابِ ۝١١

ان دونوں کے درمیان میں ہیں، چاہیے کہ وہ چڑھ جائیں اسباب میں ⑩ یہ چھوٹا سا لشکر ہے یہاں شکست خوردہ، گروہوں میں سے ⑪

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَعَادٌ وَفِرْعَوْنُ ذُو الْأَوْتَادِ ۝١٢ وَثَمُودُ وَقَوْمُ لُوطٍ

جھٹلایا ان سے پہلے نوح کی قوم نے اور عاد نے اور میخوں والے فرعون نے ⑫ اور ثمود نے اور قوم لوط نے

وَأَصْحَابُ لْـَٔيْكَةِ ۚ أُولَٰئِكَ الْأَحْزَابُ ۝١٣ إِن كُلٌّ إِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ عِقَابِ ۝١٤

اور اصحاب ایکہ نے، یہی ہیں گروہ ⑬ نہیں تھے یہ سارے کے سارے مگر ان میں سے ہر ایک نے جھٹلایا رسولوں کو پس میرا عذاب ثابت ہو گیا ⑭

خلاصۂ آیات مع تحقیق بعض الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ صٓ: حروفِ مقطعات میں سے ایک حرف ہے، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ اور بعض حضرات نے اس کو سورت کا نام قرار دیا ہے۔ وَالْقُرْاٰنِ ذِي الذِّكْرِ: واؤ قسمیہ ہے۔ ذکر والے قرآن کی قسم! ذکر: نصیحت، یاددہانی۔ جس طرح سے قرآنِ کریم کے ساتھ حکیم کی صفت آتی ہے کہ وہ حکمت سے بھرا ہوا ہے، اسی طرح سے یہ قرآنِ کریم ذِی الذِّکْرِ بھی ہے، اور بعض آیات میں اِس کو ذِکر کا مصداق قرار دیا ہے۔ معنی اس کا یہی ہے کہ یاددہانی والا قرآن، یا نصیحت والا قرآن۔ قرآنِ کریم انسان کو یاددہانی کرواتا ہے۔ کس چیز کی؟ جو باتیں اللہ نے انسان کی فطرت میں ودیعت رکھی ہیں، جو فطرت کے تقاضے ہیں، انسان کو وہ یاد دلاتا ہے۔ پچھلی تاریخ کے اندر مختلف اُمتوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا جو معاملہ ہوا وہ یاد دلاتا ہے، اور ہر شخص کو اور ہر قوم کو اس کا انجام یاد دلاتا ہے، ایسی ہی بہت ساری باتیں ہیں، جن کی یاددہانی قرآنِ کریم کراتا ہے، اور یہی باتیں نصیحت پر مشتمل ہیں۔ جوابِ قسم یہاں محذوف ہے۔ ذکر والے قرآن کی قسم، آپ اللہ کے رسول ہیں، جو باتیں مشرک آپ کے متعلق کہتے ہیں وہ غلط ہیں، قیامت آنے والی ہے، جس قسم کے حقائق قرآن بیان کرتا ہے جوابِ قسم میں وہی سامنے آجائیں گے۔ مشرکین جس قسم کی باتیں کہتے ہیں وہ صحیح نہیں، خود قرآن اس بات پر شاہد ہے۔ چونکہ قرآنِ کریم ایک بہت بڑا معجزہ ہے رسول اللہ ﷺ کا، آپ کے نبی ہونے کی دلیل ہے، اس لیے مشرک اگر آپ کو ساحر کہتے ہیں، شاعر کہتے ہیں، کاہن کہتے ہیں، جو بھی کہتے ہیں مشرکین کی وہ باتیں ٹھیک نہیں، اور اُن کے ٹھیک نہ ہونے کے لئے خود یہی کتاب شاہد ہے۔ پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا تھا کہ اکثر و بیشتر قسمیں مابعد والے مضمون کے لئے شہادت ہوتی ہیں، اور یہاں شہادۃ اسی طرح سے قائم ہو جائے گی۔ بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ عِزَّةٍ وَّشِقَاقٍ: بلکہ وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا عزۃ اور شقاق میں ہیں، عِزَّةٍ سے یہاں گھمنڈ اور غرور مراد ہے، اور شِقَاقٍ: ضد۔ یہ باب مفاعلہ کا مصدر ہے، آپس میں ضد کرنا۔ یعنی آپ تو صحیح ہیں، مشرکین کی باتیں غلط ہیں، مشرکین کا دعویٰ کسی دلیل پہ مبنی نہیں، بلکہ وہ محض گھمنڈ میں ہیں، اور ضد میں ہیں۔ اپنے غرور اور ضد کی وجہ سے وہ آپ کی

باتوں کو قبول نہیں کرتے۔ یہ ان کی نفسیات ذکر کر دی گئیں، چونکہ آپ کی بات ماننے میں بظاہر اُن کو آپ کے سامنے جھکنا پڑتا ہے، آپ کی اطاعت اور اتباع کرنی پڑتی ہے، اُن کی اپنی سرداریاں جاتی ہیں، جو وہ ذہنی طور پر اپنی برتری قائم کیے ہوئے ہیں اس کو ٹھیس پہنچتی ہے، تو یہ گھمنڈ اور یہ ضد یہ تعصب اُن کو ماننے نہیں دیتا، ورنہ اُن کا کوئی دعویٰ کسی دلیل پر مبنی نہیں۔

کَمْ اَهْلَكْنَا مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ قَرْنٍ فَنَادَوْا وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ: یہ انہی کافروں کو جو کہ ضد میں ہیں اور تعصب میں ہیں گھمنڈ میں ہیں، اُن کو ایک تنبیہ ہے۔ مِنْ قَرْنٍ یہ کَمْ کی تمیز ہے۔ کتنی ہی جماعتوں کو ہم نے ہلاک کر دیا ان سے قبل، فَنَادَوْا: یہ نداء سے ہے، پھر انہوں نے چیخ و پکار کی، شور وغل کیا، وَّلَاتَ حِيْنَ مَنَاصٍ: لَاتَ اصل کے اعتبار سے ''لَا'' ہی ہے، اس میں ''تَ'' کا اضافہ ہو گیا، اور جس وقت ''لَا'' کے ساتھ ''تاء'' کا اضافہ ہو جائے تو اس وقت خاص طور پر وقت کی نفی کے لیے آیا کرتا ہے۔ اور مناص: ہٹنے کی جگہ، اور اگر مصدر ہو تو بمعنی ہٹنا بچنا۔ اور لَاتَ کا اسم محذوف ہے، لات الحین حین مناص (نسفی وغیرہ)۔ پھر انہوں نے شور وغوغا کیا، فریاد کی شور مچایا، چیخے چلائے، اور وہ وقت بچنے کا وقت نہیں تھا، یعنی اس وقت اُن کا شور مچانا، توبہ استغفار کرنا، اللہ کے سامنے فریاد کرنا کام نہ آیا، کیونکہ وہ وقت کوئی بچنے کا وقت نہیں تھا، وہ وقت جا چکا تھا، کیونکہ جب اللہ تعالیٰ کا عذاب سامنے آجاتا ہے تو پھر اگر کوئی شخص ایمان بھی لاتا ہے یا توبہ استغفار کرتا ہے تو اس کے ایمان کا اور توبہ استغفار کا کوئی اعتبار نہیں۔ تو اس سے ان کافروں کو تنبیہ کی ہے کہ آج تو تم ضد اور تعصب میں ہو، اور اگر تم پیچھے کی طرف نگاہ پھیرو، ماضی کے واقعات کو دیکھو تو تمہیں پتا چلے گا کہ بہت ساری جماعتیں تھیں جن کو تم سے زیادہ شان وشوکت حاصل تھی لیکن جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے گرفت ہوئی تو ان کی ساری ہوا نکل گئی اور ساری شان وشوکت جاتی رہی، پھر اس موقع پر وہ چیخ و پکار کرنے لگے لیکن وقت ہاتھ سے جا چکا تھا پھر وہ چیخ و پکار کسی کام نہ آئی۔

وَعَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ: ان کافروں کے لئے یہ عجیب بات ہے، انہوں نے تعجب کیا اس بات پر کہ آگیا ان کے پاس انہی میں سے ڈرانے والا۔ ''انہی میں سے'' ان کی قوم میں سے ان کی جنس میں سے، یعنی انسان، بشر، قریشی اور ہاشمی۔ انہوں نے تعجب کیا کہ آگیا ان کے پاس ڈرانے والا انہی میں سے۔ وَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا سٰحِرٌ كَذَّابٌ: کافروں نے کہا یہ تو جادوگر ہے جھوٹا ہے۔ جادوگر کہتے تھے آپ ﷺ کی باتوں کی تاثیر کی طرف دیکھتے ہوئے کہ جو شخص ان کو توجہ سے سنتا ہے متاثر ہوتا ہے، وہ کہتے تھے کہ یہ تو جادوگر ہے جو دوسروں کو اپنی باتوں سے متاثر کر لیتا ہے۔ یا جو حضور ﷺ معجزات ظاہر فرماتے تھے، مختلف قسم کے خوارقِ عادت واقعات جو اللہ تعالیٰ نے آپ کے ہاتھ پر ظاہر کیے، ان معجزات کے اعتبار سے آپ کو کہتے تھے کہ یہ جادو کے کرتب ہیں کرشمے ہیں جو یہ دکھاتا ہے۔ جس طرح سے فرعون نے اور فرعونیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر کہا تھا کہ یہ جادوگر جو لاٹھی کو اس نے سانپ بنا لیا، اور ہاتھ کو اس نے سفید کر لیا، تو معجزات کے اعتبار سے جادو کہتے تھے اور آپ کو جادوگر کہتے تھے، اور یا پھر وہی بات کہ آپ ﷺ کی گفتگو میں جو تاثیر تھی تو کہتے تھے کہ یہ جادوگر ہے، لوگوں کے اوپر جادو کر لیتا ہے جس کی بنا پر لوگ اس کے تابع ہو جاتے ہیں اس کی باتوں سے متاثر ہوتے ہیں۔

اور دعویٔ نبوت میں یہ جھوٹا ہے جو کہتا ہے کہ میرے اُوپر وحی آتی ہے، اللہ کے فرشتے آتے ہیں، اللہ میرے سے ہم کلام ہوتا ہے، ان باتوں کے اندر یہ جھوٹا ہے.....تو کذاب کہنے کی وجہ اُن کی یہ تھی کہ حضور ﷺ میں وہ دو باتیں دیکھتے تھے، جن کی بنا پر

وہ کہتے تھے کہ یہ نبی نہیں ہوسکتا۔ ایک تو یہ کہ بشر ہے انسان ہے، اور بشر ہو اور اللہ کا رسول ہو جائے یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ کتنی ہی آیات کے اندر تمام مشرک اقوام کی طرف سے یہ شبہ ظاہر کیا گیا کہ بشر اللہ کا رسول نہیں ہوسکتا، تم تو ہم جیسے بشر ہو، اللہ کے رسول کیسے ہوگئے؟ تو گویا کہ اُن کے ذہن کے اندر بشریت اور رسالت میں منافات تھی، لیکن بشر ہونا وہ یقیناً جانتے تھے، چونکہ یہ چیز مشاہدے میں داخل تھی، مشاہدہ قطعی دلائل میں سے ہے، وہ دیکھتے تھے کہ یہ عبداللہ کا بیٹا ہے، آمنہ کا بیٹا ہے، عبدالمطلب کا پوتا ہے، ہمارا بھتیجا ہے، اور جو اِنسان ہونے کے دلائل ہوتے ہیں، بشر ہونے کے جو خواص ہیں، وہ سارے کے سارے پائے جاتے ہیں۔ تو ان خصوصیات کی بنا پر بشر ہونا تو یقینی تھا، اب آگے وہ رِسالت کی صفت کو تسلیم نہیں کرتے تھے۔ اب اگر کوئی شخص رسول مان لے اور بشر ہونے کی نفی کرے، تو یہ ذہن وہی مشرکانہ ہے جو کہ رِسالت اور بشریت کے جمع ہونے کا قائل نہیں ہے، اور ان دونوں باتوں کے اُوپر ایمان لانا ضروری ہے کہ آپ رسول بھی تھے، اور بشر بھی تھے، بشریت بھی قطعی ہے اور آپ کی رسالت بھی قطعی ہے، اور ان دونوں کے درمیان منافات کا عقیدہ جہالت ہے، رسول مان کے بشریت کی نفی کی جائے یا بشر مان کے رسالت کی نفی کی جائے، حاصل دونوں کا ایک ہے کہ ان دونوں کے اندر وہ منافات سمجھتے ہیں...... دوسری وجہ شبہ اُن کے لئے یہ تھی کہ وہ کہتے تھے کہ اگر اللہ نے کوئی رسول بنانا ہی ہے تو کوئی ٹھاٹھ باٹھ والے آدمی کو بنا تا، لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ (سورۂ زخرف: ۳۱) اگر یہ واقعی اللہ کی کتاب ہے تو کسی بڑے آدمی پہ اُترتی، قریتین سے مراد مکہ اور طائف ہیں، یہ دونوں قریب قریب شہر تھے، تو بقول ان کے کہ بڑے بڑے سیٹھ پڑے ہوئے ہیں، بڑے بڑے سرمایہ دار ہیں، بڑے بڑے صاحبِ ریاست ہیں، محلات والے ہیں، ریوڑوں والے ہیں، خادموں والے ہیں۔ تو اگر اللہ نے کسی کو رسول بنانا تھا تو کسی ٹھاٹھ باٹھ والے کو بناتا، اتنا بڑا اللہ! زمین و آسمان کا مالک! اور رسول بنانے کے لئے اُس کو یہی ایک مفلس اور نادار ملا؟ جس کو کھانے کے لئے بھی میسر نہیں، تو گویا کہ آپ کی مفلسی اور ناداری، یہ بھی ان کے لیے ایک مستقل امتحان کا باعث بنی ہوئی تھی، وہ سمجھتے تھے کہ شاید نبوت اور رسالت بھی دُنیا کی دولتوں کی طرح ایک دولت ہے، جو سونے چاندی کو کما سکتا ہے سونے چاندی کے ڈھیر لگا سکتا ہے یہ دولت بھی اسی کو حاصل ہونی چاہیے۔ تو اللہ تعالیٰ کی مقبولیت کے لئے ظاہری دُنیا کا ہونا، دولت مند ہونا، دُنیا کے اسباب کا مہیا ہونا، گویا کہ ان کے نزدیک ضروری تھا۔ تو اگر اللہ تعالیٰ کسی کو اپنا سفیر بناتا، نمائندہ بناتا، تو چاہیے تھا کسی ٹھاٹھ باٹھ والے کو بناتا۔ جیسے آگے اس بات کی طرف اشارہ آئے گا، یہ بات ان کے لئے باعث تعجب تھی۔

اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا: پھر آپ کا دعویٰ بھی اُن کے لیے ایک باعث تعجب تھا کہ ہم تو اس وقت یہ سمجھے بیٹھے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حکومت جو قائم کر رکھی ہے، تو اس میں بہت سارے اللہ کے نمائندے ہیں، مددگار ہیں، اس کے قائم مقام ہیں، اللہ نے اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں۔ اور یہ کہتا ہے کہ صرف ایک ہی اِلٰہ ہے۔ اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا: کیا اس نے سب آلہہ کو ایک ہی اِلٰہ قرار دے دیا؟ باقی سب کی اُلوہیت ختم کردی؟ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ: بے شک یہ چیز البتہ عجیب ترین ہے، عُجَابٌ یہ عجیب کا مبالغہ ہے، یعنی اتنے آلہہ کی اُلوہیت کو ختم کر کے ایک اِلٰہ قرار دے دینا، یہ تو بہت ہی عجیب بات ہے۔ ان کا ذہن یہ تھا کہ اتنی بڑی کائنات کو ایک اکیلا کیسے سنبھالے گا؟ جب تک اُس کے ساتھ معاون نہ بنائے جائیں۔ اور اس ایک فقرے میں عرب کے لیے

اشتعال انگیزی بھی ہے، گویا کہ تمام عرب کو مشتعل کرنے والی بات ہے، چونکہ ہر قبیلے نے اپنا اپنا الٰہ علیحدہ بنا رکھا تھا، تو وہ یہ تاثر دینا چاہتے ہیں کہ اس شخص کا طرزِ عمل تو ایسا ہے کہ سب الٰہ ختم کر دے گا، کسی قبیلے کا کوئی اِلٰہ نہیں رہے گا، یہ کہتا ہے کہ بس ایک ہی الٰہ ہے۔ ''کیا اس نے سب آلہہ کو ایک اِلٰہ واحد کر دیا؟ قرار دے دیا اس نے آلہہ کو الٰہ واحد؟''

وَانْطَلَقَ الْمَلَاُ مِنْهُمْ اَنِ امْشُوْا وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ: مَلَأ: سرداروں کے گروہ کو کہتے ہیں، یہ لفظ بہت دفعہ آپ کے سامنے گزرا۔ انْطَلَقَ: چل دیا۔ چل دیا ان میں سے سرداروں کا گروہ، ان کافروں کے سردار چل دیے اَنِ امْشُوْا: یہ کہتے ہوئے کہ چلو، وَاصْبِرُوْا عَلٰۤى اٰلِهَتِكُمْ: اور جمے رہو اپنے معبودوں پر۔ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ: بے شک یہ البتہ چیز ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے، یہ تو کوئی چاہی ہوئی چیز ہے، ارادہ کی ہوئی چیز ہے۔ مَا سَمِعْنَا بِهٰذَا فِی الْمِلَّةِ الْاٰخِرَةِ: نہیں سنی ہم نے یہ بات پچھلی ملت میں، اِنْ هٰذَاۤ اِلَّا اخْتِلَاقٌ نہیں ہے یہ مگر جھوٹ تراشنا۔ اختلاق افتراء کے معنی میں ہے، بات گھڑ لینا۔ نہیں ہے یہ مگر بات بنانا۔ ءَاُنْزِلَ عَلَیْهِ الذِّكْرُ مِنْۢ بَیْنِنَا: کیا اس پر ذکر اتارا گیا ہمارے درمیان سے؟ بَلْ هُمْ فِیْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِیْ: بلکہ وہ میرے ذکر کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں، بَلْ لَّمَّا یَذُوْقُوْا عَذَابِ: بلکہ انہوں نے ابھی تک میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا۔ اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآىِٕنُ رَحْمَةِ رَبِّكَ: کیا ان کے پاس ہیں تیرے رَبّ کی رحمت کے خزانے؟ الْعَزِیْزِ الْوَهَّابِ ایسا رَبّ جو کہ عزیز وہاب ہے، اَمْ لَهُمْ مُّلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَهُمَا: یا ان کے لئے ہے آسمانوں اور زمین کی سلطنت، اور ان چیزوں کی سلطنت جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، فَلْیَرْتَقُوْا فِی الْاَسْبَابِ چاہیے کہ وہ چڑھ جائیں اسباب میں۔ اسباب سبب کی جمع ہے۔ سبب: ذریعہ، رَسّی۔ اور یہاں سیڑھیوں کے معنی میں بھی اس کو کیا گیا ہے کہ آسمان تک رسیاں تان کے اوپر چڑھ جائیں، یا سیڑھیاں لگا کر اُوپر چڑھ جائیں۔ ''سبب'' اصل میں ''ذریعے'' کو کہتے ہیں جو کسی چیز کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہو، اس لئے رَسّی پر بھی بولا جاتا ہے، چونکہ رَسّی اُوپر سے لٹکا کے نیچے والے لوگ رَسّی کے ذریعے سے اُوپر چڑھ جاتے ہیں، اور سبب راستے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جُنْدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ: جند: لشکر کو کہتے ہیں۔ یہ چھوٹا سا لشکر ہے یہاں شکست خوردہ اَحزاب میں سے۔ احزاب: حزب کی جمع ہے، گروہوں میں سے، یعنی جو گروہ پہلے انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کرتے رہے ہیں، ان گروہوں میں سے یہ بھی ایک چھوٹا سا شکست خوردہ لشکر ہے یہاں۔ یہ اشارہ ہوگا مشرکینِ مکہ کی طرف۔

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ: جھٹلایا ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے عَادٌ وَّفِرْعَوْنُ ذُو الْاَوْتَادِ: اور عاد نے اور فرعون ذُو الْاَوْتَادِ نے، اوتاد: وَتَد کی جمع ہے، وتد کہتے ہیں میخ کو۔ میخوں والا فرعون۔ میخوں والے فرعون سے اشارہ یا تو اس کی فوجوں کی کثرت کی طرف ہے، کہ جہاں اس کی فوج اُترتی تھی، خیمے لگاتے تھے، اور کیلے جو گاڑتے تھے تو میدان کے اندر میخیں ہی میخیں، اور کیلے ہی کیلے ہو جاتے، تو یہ اس کے لشکروں کی کثرت کی طرف اشارہ ہے، اور اس وقت وہ فرعون ذُو الْاَوْتَادِ کہلاتا ہوگا، کھونٹوں والا فرعون، میخوں والا فرعون، یعنی جس کی فوج اتنی کثرت کے ساتھ ہے کہ جہاں وہ اُتریں وہاں میخیں ہی میخیں اور کیلے ہی کیلے ہو جاتے ہیں، پھر اس کا معنی ہو جائے گا ''لشکروں والا فرعون۔'' یا وہ فرعون ذُو الْاَوْتَادِ بایں معنی کہلاتا تھا جیسا کہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''بیان القرآن'' میں بیان فرمایا، کہ فرعون جس کے کھونٹے گڑ گئے تھے، یعنی مضبوط سلطنت والا فرعون، جس کی سلطنت مضبوط

تھی، جس کے کیلے گڑ گئے تھے، کسی شخص کا کسی جگہ جم جانا، ہلائے نہ ہلنا، کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے تو یہاں کیلے گاڑ لیے ہیں، تو یہ مفہوم بھی ہوسکتا ہے، اور جب ہم کسی سے بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ بھئی! ہمارے یہاں کوئی کیلے تو نہیں گڑے ہوئے، جب ضرورت ہوگی، موقع پیش آئے گا، ہم اُٹھ کے چل دیں گے۔ تو کیلے گاڑ لینا ایک قسم کے جمنے کی طرف اشارہ ہوتا ہے، وہ فرعون ایسا تھا جس نے کیلے گاڑ لیے تھے، کھونٹے گاڑ لیے تھے یعنی مضبوط سلطنت والا فرعون، جو کسی کا ہلایا ہلتا نہیں تھا۔ ''میخوں والے فرعون نے۔'' وَثَمُوْدُ وَقَوْمُ لُوْطٍ وَّاَصْحٰبُ لْئَیْكَةِ: اور ثمود نے، قومِ لوط نے اور اَصحابِ اَیکہ نے۔ اَصحابِ اَیکہ سے مراد اَصحابِ مدین ہیں۔ اُولٰٓئِكَ الْاَحْزَابُ: یہی ہیں گروہ جن کا ذکر پیچھے آیا تھا، مَهْزُوْمٌ مِّنَ الْاَحْزَابِ شکست خوردہ گروہوں میں سے یہ بھی ایک چھوٹا سا لشکر ہے شکست خوردہ، یہ جو اَحزاب کا لفظ آیا تھا وہ یہی اَحزاب ہیں جن کو ذکر کیا گیا۔ اِنْ كُلٌّ اِلَّا كَذَّبَ الرُّسُلَ: نہیں تھے یہ سارے کے سارے مگر ان میں سے ہر ایک نے جھٹلایا رسولوں کو، فَحَقَّ عِقَابِ: عقاب کی ب کے نیچے جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے۔ میرا عذاب ثابت ہوگیا، ان کی تکذیب کی وجہ سے میرا عذاب ثابت ہوگیا۔

تفسیر

اِبتدائی آیات کا شانِ نزول

یہ جو اِبتدائی آیات آپ کے سامنے پڑھی گئی ہیں، مفسرین نے ان کا شانِ نزول ذِکر کیا ہے، مکہ معظمہ میں سرورِ کائنات ﷺ نے جب توحید کی دعوت شروع کی، تو عام طور پر تو آپ ﷺ کی برادری آپ ﷺ کے خلاف ہوگئی تھی، لیکن آپ کے حقیقی چچا ابوطالب جو بچپن سے آپ ﷺ کے سرپرست تھے۔ ۹ سال کی آپ ﷺ کی عمر تھی جب آپ ﷺ کے دادا عبدالمطلب وفات پاگئے تھے، اور اس کے بعد سرورِ کائنات ﷺ کی سرپرستی ابوطالب کے ہاتھ آگئی تھی، ان کے سپرد ہوگئی تھی۔ ابوطالب حضرت علی رضی اللہ عنہ کے والد ہیں، ان کا اصل نام ''عبد مناف'' ہے، لیکن بڑے بیٹے کا نام چونکہ ''طالب'' تھا جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی تھے، اور وہ کُفر کے زمانے میں مرگئے تھے، باقی تین بھائی مسلمان ہوئے ہیں، جعفر، عقیل اور علی رضی اللہ عنہم، یہ تینوں صحابی ہیں، تینوں مسلمان ہوئے، لیکن ''طالب'' جو بڑے بیٹے تھے، وہ کُفر کے زمانے میں ہی مرگئے تھے، اُس بڑے بیٹے کی وجہ سے ان کی کنیت ''ابوطالب'' ہے، ہاشمی خاندان کے معزز فرد تھے۔ ۹ سال کی عمر سے وہ حضور ﷺ کے سرپرست تھے، اور انہی کی سرپرستی میں حضور ﷺ کی شادی ہوئی، سارا وقت گزرا، تو چالیس سال کی عمر میں جس وقت آپ ﷺ نے اِظہارِ نبوّت کیا، تو اس وقت عام طور پر ہاشمی وقریشی جتنے تھے، مخالف ہوگئے، لیکن یہ آپ ﷺ کے حامی رہے، اِیمان تو نہیں لائے جیسے پہلے آپ کی خدمت میں عرض کردیا گیا تھا کہ ان کا خاتمہ کُفر پہ ہوا ہے، آخر وقت تک یہ اپنے مسلک پہ رہے ہیں، اپنا مسلک انہوں نے چھوڑا نہیں، لیکن حضور ﷺ کے ساتھ خیرخواہی اور ہمدردی میں انہوں نے کمی نہیں کی، ساری قوم کے مقابلے میں یہ ڈٹے ہوئے تھے حضور ﷺ کی حمایت میں۔ جب ابوطالب بیمار ہوئے، تو رُؤسائے مشرکین ابوجہل وغیرہ نے آپس میں مشورہ کیا کہ ابوطالب کی زندگی میں تو ہم ابوطالب کا لحاظ کرتے رہے، اور ان (رسول اللہ ﷺ) کو ہم نے کچھ نہیں کہا، جو ہمارے معبودوں کو بُرا بھلا کہتے

رہے۔اب ابوطالب کا آخری وقت ہے، اگر یہ اسی طرح سے وفات پاگیا، اس کے بعد اگر ہم نے کوئی تشدد کیا تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو! ابوطالب کی زندگی میں تو ان کو جرأت نہ ہوئی، اور ان کے مرنے کے بعد انہوں نے کیسا طریقہ اختیار کرلیا۔تو بہتر یہ ہے کہ ہم ابوطالب سے فیصلہ کُن بات کرلیں، اور انہیں کہیں کہ اب ہمارے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے، جس طرح سے بھی ہو آپ اپنے بھتیجے کو روکیں، وہ ہمارے آلہہ کی مخالفت نہ کرے۔تو یہ وفد بنا کے ابوطالب کے پاس چلے گئے، جا کے اپنا مدعا ظاہر کیا کہ جس طرح سے بھی ہو اس کو منواؤ، ہمارے معبودوں کی مخالفت یہ چھوڑ دے، باقی اگر اس کا کوئی اپنا مسلک ہے تو اپنے مسلک پر عمل کرے، ہمارے معبودوں کی مخالفت نہ کرے۔جب سب نے اکٹھے ہو کے ابوطالب کے سامنے یہ بات کہی تو ابوطالب نے حضور ﷺ کو بلایا، بلانے کے بعد ذکر کیا کہ بھتیجے! یہ اس مقصد کے لئے آئے ہیں، کہتے ہیں کہ تُو ان کے معبودوں کی مخالفت چھوڑ دے۔تو ساری بات سننے کے بعد سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا تھا کہ چچا! یہ مجھے کیا دے سکتے ہیں، اور ان کے پاس ہے کیا؟ اگر کوئی شخص سورج لا کے میرے ایک ہاتھ پر رکھ دے، اور دُوسرے ہاتھ پر چاند رکھ دے، مطلب یہ تھا کہ نظامِ شمسی جتنا ہے وہ سب میرے کنٹرول میں دے دے، تو بھی میں اس بات کو چھوڑنے کے لئے تیار نہیں (دیکھئے سیرت ابن ہشام وغیرہ)۔اور اسی موقع پر آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ جو بات میں ان سے کہتا ہوں، ان کے فائدے کی ہے۔یہ میرا ایک کلمہ قبول کرلیں، میری ایک بات یہ قبول کرلیں، تو عرب کی سرداری بھی ان کے لئے، اور عجم بھی ان کے تابع ہوجائیں گے۔وہ کہنے لگے: وہ ایک بات کیا ہے؟ اس قسم کی بات جس کے ساتھ عرب بھی تابع ہوجائیں اور عجم بھی تابع ہوجائیں، ایک کیا ہم تو دس ماننے کو تیار ہیں، تو حضور ﷺ نے فرمایا کہ وہی بات جو میں کہتا رہتا ہوں "لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ" کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، معبود اِلٰہ صرف ایک ہے، بس ایک اِلٰہ کا قول کرلو، اس بات کو تم تسلیم کرلو، عرب بھی تمہارے تابع، عجم بھی تمہارے تابع۔جب حضور ﷺ نے یہ آخری بات کہی اور اپنے اندر ذرا بھی لچک نمایاں نہیں کی، تو اس وقت وہ اُٹھ کے چل دیئے۔(۱) آپ کو معلوم ہے کہ مجلس سے جب انسان چلتا ہے، تو اُٹھ کے چل بھی دیتا ہے اور ساتھ کہتا ہے کہ چلو چلو، یہاں بات نہیں بنتی۔تو وَانْطَلَقَ اور اَنِ امْشُوْا یہ دو لفظ جو آئے ہیں ان کا یہی معنی ہے کہ اُٹھ کے چل دیے اور کہنے لگے کہ چلو، یہ تو اپنی ہٹ کا پکا ہے، اور یہ چیز تو ایسی ہے جس کا ارادہ کیا جا چکا ہے، یہ کسی طرح سے باز آنے والا نہیں، اس لئے جاؤ، اور جا کر اپنے آلہہ کے اُوپر جم جاؤ، اس کے کہنے کی بنا پر اپنے آلہہ کو چھوڑو نہیں، اس طرح سے بات کرکے وہ اُٹھ کے چلے گئے۔تب اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے یہ ابتدائی آیات اُتریں، جن میں اُن کے اسی طرزِ عمل کو نمایاں کیا گیا ہے اور اُن کو کچھ دھمکایا گیا ہے کہ تم اپنے مستقبل کو سوچو! پہلے بھی ایسے لوگ تھے جن کو بڑی شان وشوکت حاصل تھی، اسی طرح سے اللہ کے رسول آئے، وہ انسان ہی تھے، اسی قوم سے تعلق رکھتے تھے جس قوم کی طرف وہ آئے، اور ان قوموں نے ان کی تکذیب کی، تو اس تکذیب کے نتیجے میں وہ تباہ کردیے گئے، اللہ کا عذاب آگیا، اور جب اللہ کا عذاب آیا تو پھر انہوں نے بہت چیخ و پکار کی، لیکن وقت گزر چکا تھا، پھر وہ بچ نہ سکے۔تو اس شانِ نزول کے تحت جس وقت آپ ان آیات کے مفہوم پہ غور کریں گے تو بات اچھی طرح سے سمجھ میں آجاتی ہے۔تو یہ وہی نقشہ ہے کہ انہوں نے جو تبصرہ کیا کہ یہ کیا ہوگیا کہ سارے آلہہ کو اس نے ایک ہی اِلٰہ بنادیا، یہ تو بڑی عجیب بات ہے، ہم سب کو

---

(۱) تفسیر ابن کثیر۔نیز ترمذی ۲/۲۵۸، کتاب التفسیر۔سورۃ ص مختصراً۔

چھوڑ کر ایک کو کس طرح سے مان سکتے ہیں کہ سب کی اُلوہیت کو ختم کر دیں۔ پھر ان میں جو سردار تھے وہ اُٹھ کر چل دیے، یہ کہتے ہوئے کہ چلو: وَاصْبِرُوْا عَلٰٓى اٰلِهَتِكُمْ: اپنے آلہہ کے اوپر جمے رہو، یعنی یہ اگر مضبوطی کے ساتھ ان کی تردید کرتا ہے تو تم بھی مضبوطی سے جم جاؤ، اس کے ہلائے ہلو نہیں۔ ''صبر کرو اپنے آلہہ پر!''

''اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ'' کے دو مفہوم

اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ یُّرَادُ: اس کا ترجمہ دو طرح سے ہو سکتا ہے...... هٰذَا کا معنی یہ ہے کہ حضور جو بات کہتے ہیں (یعنی توحید) یہ تو چیز ایسی ہے جس کا ارادہ کیا جا چکا ہے، یہ چاہی ہوئی بات ہے، اب یہ باز آنے والے نہیں، یہ پختہ ارادے کے ساتھ اس بات پر لگے ہوئے ہیں (جلالین وغیرہ)...... یا یہ کوئی مطلب کی بات ہے جس کا ارادہ کیا جاتا ہے، یہ بتاتے نہیں، ان کی کوئی غرض اندر سے ہے، یہ کوئی مطلب کی بات ہے جو یہ کہہ رہے ہیں، اس کا مفہوم یوں بھی ذکر کیا گیا ہے، ''بیان القرآن'' میں اس کا مفہوم یہی ذکر کیا گیا ہے، کہ بے شک یہ کوئی مطلب کی بات ہے، یہ کسی مقصد کے تحت کہی جا رہی ہے، جو یہ ارادہ کیے ہوئے ہیں وہ ظاہر نہیں کرتے، اور ہے کوئی مطلب کی بات...... اور یہ مفہوم بھی اس کا ذکر کیا گیا ہے، کہ هٰذَا کا اشارہ ہے ''صَبر عَلَی الاٰلِهة'' کی طرف ہے، یعنی تم اس بارے میں پختہ ارادہ کر لو کہ ہم نے اپنے آلہہ کے اُوپر صبر کرنا ہے، کسی کے کہے اپنے ان آلہہ کو چھوڑنا نہیں ہے، تمہارے قدم ڈگمگانے نہ پائیں، یہ چیز ہے جس کا ارادہ کیا جائے، یعنی تم اس کا پختہ ارادہ کر لو کہ اپنے آلہہ کو چھوڑنا نہیں ہے، اگر یہ باز نہیں آتا تو تم بھی باز نہ آؤ، یہ اس قسم کا مفہوم ہے کہ چلو جا کر اپنے طریقے پر پکے رہو (آلوسی)۔

حق کے اِنکار کے لئے مشرکین کے شبہات اور ان کا جواب

باقی یہ بات جو کہتا ہے اور اس کو منسوب کرتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بھی یہی دین تھا، اسماعیل علیہ السلام کا بھی یہی دین تھا، جو ہمیں یہ بتاتا ہے کہ تمہاری پچھلی تاریخ یہی ہے، جس کی بنیاد توحید پر تھی، تو ہم نے تو اپنی پچھلی ملّت میں یہ بات تو سنی نہیں، ہمارے آباؤ اجداد تو یہی طریقہ بتاتے آئے ہیں، اور اسی طریقے کے اُوپر ہم جمے ہوئے ہیں، تو گویا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مسلک کی وضاحت حضور صلی اللہ علیہ وسلم جو فرماتے تھے، تو اس کی یوں تغلیط کرتے ہیں کہ ہم نے پچھلوں سے تو یہ بات سنی نہیں، ہمارے پیچھے والے جو تھے ہمارے آباؤ اجداد، انہوں نے تو ہمارے سامنے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ یہ جھوٹ بولتا ہے جو کہتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کا مسلک بھی ایسے تھا کہ اِلٰہ ایک ہی ہے، اور کوئی اور آلہہ نہیں ہیں، یہ سب گھڑی ہوئی بات ہے۔ ملت آخرۃ سے ان کا اپنا دین اور ملّت مراد ہے، یعنی اپنے آباؤ اجداد کے زمانے میں تو ہم نے یہ بات نہیں سنی، پچھلی ملّت سے ان کا اپنا دین مراد ہے، ہم اپنا مسلک اور مذہب جو نسلاً بعد نسلٍ سنتے آ رہے ہیں اس میں تو یہ بات ہے نہیں، یہ گھڑی ہوئی بات ہے...... اور پھر آ گئے وہی، کہ یہ کہتا ہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ تو کیا یہ نصیحت ہم میں سے اسی پر ہی اُتری تھی؟ اس کی کیا حیثیت ہے؟ کسی

بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُتری؟ جس طرح سے میں نے عرض کیا کہ دوشبہات بنیادی طور پر اُن کے دل میں آتے تھے، جواُن کو چین نہیں لینے دیتے تھے۔ ایک تو یہ ہے کہ بشر اللہ کا رسول کیسے ہوگیا؟ دوسرا یہ کہ اگر اللہ نے رسول بنانا ہی تھا تو کسی بڑے آدمی کو بناتا، کسی سرمایہ دار کو، جس کے پاس وسائل ہوتے، کھاتا پیتا ہوتا، اس لئے وہ کبھی کہتے کہ آپ کے پاس باغ کوئی نہیں، آپ کے پاس تو سونے کا محل ہونا چاہیے، آپ کے ساتھ فرشتوں کی فوج ہونی چاہیے، جیسے سورۂ فرقان کے اندر آپ کے سامنے تفصیل آئی تھی، اور سورۂ بنی اسرائیل میں بھی۔ [1] تو یہ بات بھی اُن کے لئے شبہ کا باعث تھی کہ فقیر آدمی کو اللہ نے رسول کس طرح سے بنادیا، یہ وہی تحقیر ہے جو وہ یہاں کرتے ہیں۔ ''کیا اس پر ذکر اتارا گیا ہمارے درمیان سے؟''

بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ مِّنْ ذِكْرِيْ: بلکہ وہ میرے ذکر کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ نہیں کہ اگر ان کے خیال کے مطابق کسی بڑے آدمی پر اُترتا تو وہ مان لیتے، ان کو اس بارے میں ہی تردد ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسی نصیحت کسی پہ اُترا بھی کرتی ہے۔ اور یہ جو باتیں کرتے ہیں یا ان کے دماغ کے اندر جو شک ہے جو ان کو چین نہیں لینے دیتا تو اس کی بھی کوئی معقول وجہ نہیں، وجہ صرف یہی ہے کہ ابھی تک انہوں نے میرے عذاب کا مزہ نہیں چکھا، اور جس دِن ایک تھپڑ ان کے لگ گیا، ان کے سب ہوش ٹھکانے آجائیں گے، اور ان کی سب شیخیاں نکل جائیں گی، بَلْ لَّمَّا يَذُوْقُوْا عَذَابِ، لَمَّا اور لَمْ میں فرق تو آپ سمجھتے ہیں، لَمْ کے اندر صرف ماضی کی نفی ہوتی ہے، آگے کی طرف کوئی اشارہ نہیں ہوتا۔ اور لَمَّا کے اندر ماضی کی نفی بھی ہوتی ہے اور آئندہ توقع بھی ہوتی ہے۔ ''ابھی تک عذاب نہیں چکھا'' جس کا مطلب یہ ہے کہ اب وقت قریب آگیا ہے جب میں اُن کو مزہ چکھاؤں گا، اور جس وقت عذاب کا مزہ ان کو چکھاؤں گا اس وقت ان کی ساری شیخیاں کرکری ہوجائیں گی...... اور یہ جو کہتے ہیں کہ ذکر اور نصیحت اس پہ نہیں اترنی چاہیے تھی، کسی بڑے آدمی پر اترنی چاہیے تھی، تو کیا اللہ کی رحمت کے خزانوں کے مالک یہ ہیں؟ کہ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں، اور اُن کی مرضی کے خلاف اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کسی کو نہ دے۔ اب یہاں سونا چاندی کے مقابلے میں نبوّت اور رسالت اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مصداق قرار دی گئی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہے دیدے، خزانے ان کے قبضے میں تو نہیں ہیں۔ کیا ان کے پاس ہیں تیرے رَبّ کی رحمت کے خزانے؟ ایسا رَبّ جو کہ عزیز ہے وہاب ہے۔ عزیز: غالب ہے، زبردست ہے، اُس کے ارادے میں کوئی شخص رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ وھاب: عطا کرنے والا ہے، بہت دینے والا ہے۔ اُس کی رحمت کے خزانے کیا ان کے پاس ہیں؟ سورۂ زُخرف کے اندر اس مضمون کی تفصیل آئے گی، وہاں بھی اللہ تعالیٰ اسی مضمون کو ذکر فرمائیں گے، پھر آگے یہ حوالہ دیں گے نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا (آیت: ۳۲) کہ ہم تو یہ ظاہری رزق بھی خود ان کے درمیان تقسیم کرتے ہیں، جو جتنا چاہے حاصل کرلے ایسا نہیں ہے، ان کی دُنیاوی معیشت بھی ہم ان کے درمیان تقسیم کرتے ہیں، جس کو چاہیں فقیر بنادیں، جس کو چاہیں محتاج بنادیں، جس کو چاہیں زیادہ دے دیں۔ تو دُنیوی روزی پر بھی ان کا کوئی زور نہیں

(۱) سورۂ بنی اسرائیل آیت ۹۰ تا ۹۳۔ سورۂ فرقان، آیت ۸۔

چلانا، تو اللہ تعالیٰ کی رحمت جو کہ دین والی ہے، اخلاق والی ہے، اللہ کے نزدیک مقبولیت، یہ ان کے کنٹرول میں کس طرح سے ہو سکتی ہے؟ یا زمین و آسمان اور مَا بَیْنَهُمَا کی سلطنت ان کے لئے ہے؟ کہ ان کی مرضی کے بغیر اس کائنات میں کوئی کام نہ کیا جاسکے۔ اگر یہ ایسے ہی ہیں تو پھر رسیاں تان کر آسمان پر چڑھ جائیں، جا کے حکومت پہ قبضہ کر لیں، پھر اپنی مرضی کے مطابق چلاتے رہیں۔ یا ان کے اُوپر جو اللہ کی رحمت اُتر رہی ہے، فرشتے اُتر رہے ہیں، اُوپر جا کے اس رحمت کو منقطع کر لیں۔ یہ تعجیز ہے، گویا کہ اُن کے عجز کو نمایاں کرنے کے لئے کہا جارہا ہے کہ جب تم زمین آسمان میں کوئی زور نہیں رکھتے، آسمان پر چڑھ کے تم کنٹرول نہیں سنبھال سکتے، تو پھر تم کس بات پر بڑیں مار رہے ہو؟ اُچھلتے کس بات پر ہو؟ نہ اللہ کی رحمت کے خزانے تمہارے قبضے میں، اور نظمِ سلطنت جتنا بھی ہے زمین و آسمان میں، نہ اس میں تمہارا کوئی دخل۔

آگے نتیجہ مذکور ہے، جُنۡدٌ مَّا هُنَالِكَ مَهۡزُوۡمٌ مِّنَ الۡاَحۡزَابِ: گروہوں میں سے ایک چھوٹا سا شکست خوردہ لشکر ہے، جو کہ یہاں موجود ہے۔ بڑے بڑے لشکروں والے اور بڑے بڑے حزب آئے تھے، سب شکست کھا گئے، ان میں سے یہ بھی ایک چھوٹا سا لشکر ہے جو موجود ہے، ایک وقت آئے گا یہ بھی شکست کھا جائیں گے۔ چنانچہ بدر کے اندر یہ بات پوری ہوگئی کہ واقعی یہ شکست کھا گئے۔ حضور ﷺ بدر میں جس وقت رات کو دُعا کرتے رہے تھے، تو جس وقت اپنے عریش سے چھپر سے باہر نکلے ہیں، اس وقت سورۂ قمر کی وہ آیت پڑھ رہے تھے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ شکست کھا جائیں گے سَیُهۡزَمُ الۡجَمۡعُ وَیُوَلُّوۡنَ الدُّبُرَ یہ آیت پڑھتے ہوئے باہر نکلے کہ یہ جماعت عنقریب شکست دے دی جائے گی اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے۔[1] تو جس کا مطلب یہ تھا کہ رات کو اللہ تعالیٰ کے سامنے حضور ﷺ نے جو لجاجت کی، اور دُعا کے لئے ہاتھ پھیلائے تھے، تو جنگ تو رات کو ہی جیت لی تھی، دن کو صرف اس کا اظہار ہونا تھا۔ تو اتنے یقین کے ساتھ آپ نے یہ بات کہہ دی تھی کہ یہ جماعت شکست کھا جائے گی، اور پیٹھ پھیر کر بھاگ جائیں گے، چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ تو جنگ تو رات کو ہی جیتی جا چکی تھی، اللہ تعالیٰ کے سامنے راز و نیاز کے ساتھ ہی، اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے ساتھ ہی، اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیش گوئی ہوگئی تھی کہ یہ بھاگ جائیں گے۔ تو یہ بھی وہی اشارہ ہے کہ کیا ہے، یہ چند ایک پھر رہے ہیں، جو شکست خوردہ لوگ ہیں، انہی اَحزاب میں سے ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے عذاب کے ساتھ تباہ کیا تھا...... آگے اس کا نمونہ دکھا دیا کہ ان سے پہلے بھی قومِ نوح نے، عاد نے، اور لشکروں والے فرعون نے (ذُو الۡاَوۡتَادِ کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا) ثمود، قومِ لُوط اور اَصحابِ ایکہ نے سب نے تکذیب کی تھی، یہی ہیں وہ گروہ جن کا ذکر کیا کہ یہ بھی انہی میں سے ایک گروہ ہے۔ اَحزاب: حزب کی جمع ہے۔ ''نہیں تھے یہ سارے کے سارے مگر جھٹلایا ان میں سے ہر کسی نے'' کُلٌّ کے لفظ کی مناسبت سے کَذَّبَ میں مفرد کی ضمیر لوٹ رہی ہے۔ فَحَقَّ عِقَابِ تو میرا عذاب ان کے اُوپر ثابت ہوگیا۔

---

(۱) بخاری ۱/۴۰۹، باب ما قیل فی درع النبی۔ مشکوٰۃ ۲/۵۳۱، باب فی المعجزات۔ فصل اول۔ نوٹ: -ان میں ''قبہ'' کا لفظ ہے۔ البتہ ابن کثیر، الانفال:۱۱ کے تحت ''عریش'' کا لفظ ہے۔

وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ ﴿۱۵﴾ وَقَالُوْا رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا
نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر ایک ہی چیخ کا، نہیں ہوگا اس کے لئے کوئی توقف ﴿۱۵﴾ اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں اے ہمارے رَبّ! ہمیں جلدی دے دے
قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۱۶﴾ اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ ۚ
ہمارا حصہ عذاب کا حساب کے دن سے پہلے ہی ﴿۱۶﴾ صبر کر ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں، اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر جو قوت والا تھا
اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۱۷﴾ اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ ﴿۱۸﴾
بے شک وہ رُجوع کرنے والا تھا ﴿۱۷﴾ بے شک ہم نے مطیع کر دیا پہاڑوں کو اس کے ساتھ، تسبیح پڑھتے تھے وہ پہاڑ شام کے وقت اور صبح کے وقت ﴿۱۸﴾
وَالطَّيْرَ مَحْشُوْرَةً ۭ كُلٌّ لَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۱۹﴾ وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ ﴿۲۰﴾
اور مسخر کیا ہم نے پرندوں کو جو جمع کیے ہوئے تھے، سارے کے سارے اللہ کے لئے رُجوع کرنے والے تھے ﴿۱۹﴾ ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا، ہم نے اس کو حکمت بھی دی اور فیصلہ کن خطاب بھی دیا ﴿۲۰﴾

تفسیر

کفار کو تنبیہ، اور لفظ ''فَوَاق'' کی تحقیق

وَمَا يَنْظُرُ هٰٓؤُلَآءِ اِلَّا صَيْحَةً وَّاحِدَةً مَّا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ: نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر ایک ہی چیخ کا۔ صَاحَ يَصِيْحُ: چیخنے کو کہتے ہیں۔ نہیں انتظار کرتے یہ مگر ایک ہی چیخ کا۔ مَا لَهَا مِنْ فَوَاقٍ: نہیں ہوگا اس کے لئے کوئی کسی قسم کا توقف۔ فَوَاق کا معنی ہوا کرتا ہے کہ تھوڑا سا وقت جو جانور کے دو دفعہ دُودھ دوہنے کے درمیان میں ہوا کرتا ہے، دو دفعہ دُودھ دوہنے کا مطلب یہ ہوتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا دُودھ دوہنے والوں کو، کہ وہ تھن کو پکڑتے ہیں اور اس کو دھارتے ہیں، دھار نکلتی ہے تو پھر چھوڑ دیتے ہیں، چھوڑنے کے بعد پھر اس میں دُودھ آجاتا ہے، تو پھر دوبارہ اس طرح سے دباتے ہیں تو دُودھ نکلتا ہے۔ تو یہ دو دفعہ دھارنے کے درمیان میں تھوڑا سا جو وقت ہے، اس کو بھی ''فُواق'' کہتے ہیں۔ یا یہ طریقہ ہوا کرتا ہے کہ ایک دفعہ دُودھ نکال لیا، پھر تھوڑی دیر وقفہ کرتے ہیں، مثلاً بچہ چھوڑ دیتے ہیں اور وہ جا کے پھر تھنوں میں منہ مارتا ہے، تو پھر دُودھ اُتر آتا ہے تو دوبارہ پھر دوہتے ہیں، اُونٹنیوں میں بھی ایسے ہے، بھینسوں میں بھی بسا اوقات ایسے کرتے ہیں۔ بعض جانوروں کو عادت ہوتی ہے کہ دوہتے ہوئے دُودھ کو وہ اُوپر چڑھا لیتے ہیں، بعد میں پھر بچہ چھوڑا جاتا ہے تو وہ منہ مارتا ہے اور دُودھ اُتر آتا ہے، تو تھوڑے وقفے کے بعد پھر دوہتے ہیں۔ پہلا وقفہ تو بالکل ہی ایک لمحہ ہوتا ہے، سیکنڈ دو سیکنڈ کا۔ اور دُوسرا وقفہ چند منٹوں پر مشتمل ہوتا ہے، گھنٹوں پر مشتمل وہ بھی نہیں ہوتا۔ ایک دفعہ دُودھ دوہنے کے بعد وقفہ دیا، اور وقفہ دینے کے بعد پھر دُودھ نکالا ''فُواق'' اس وقفے کو کہتے ہیں۔ تو مطلب یہ ہوتا ہے کہ بہت قلیل وقفہ۔ تو مَا لَهَا

مِنْ فَوَاقٍ کا معنی ہے کہ اس صیحہ کے لئے فواق نہیں ہوگا، یعنی اتنا سا بھی توقف نہیں ہوگا جتنا دو دفعہ دُودھ دو ہنے کے درمیان ہوتا ہے، کہ وہ صیحہ آئی اور ہلاکت مسلسل ہو جائے گی، کوئی توقف نہیں ہوگا۔ مفہوم اس کا یوں نکل آئے گا: ''مَالَهَا مِنْ تَوَقُّفٍ مِقْدَارَ فَوَاقٍ'' (آلوسی) اس صیحہ کے لئے فواق کی مقدار بھی توقف نہیں ہوگا، جب وہ آئے گی تو فوراً خاتمہ ہو جائے گا۔ تو صیحة واحدة سے وہ عذاب کا وقت بھی مراد ہو سکتا ہے، جس طرح سے پچھلی اُمتوں کو تباہ کیا گیا، تو وہاں صیحہ کا اکثر ذکر ہے کہ صیحہ ہوا، ایک چیخ پڑی، جس کے ساتھ وہ سارے کے سارے تباہ ہو گئے۔ اور نفخۂ اُولیٰ کی طرف بھی اشارہ ہو سکتا ہے۔

مشرکین اپنے منہ آپ موت مانگتے تھے

وَقَالُوْا: اور یہ کافر لوگ کہتے ہیں رَبَّنَا عَجِّلْ لَّنَا قِطَّنَا قَبْلَ يَوْمِ الْحِسَابِ: اے ہمارے رَبّ! ہمیں جلدی دے دے ہمارا حصہ حساب کے دِن سے پہلے ہی۔ یہ وہ بطورِ استہزا کے کہتے تھے، جب حضور ﷺ انہیں بتاتے کہ ایک یومِ حساب آنے والا ہے، اللہ تعالیٰ اس میں محاسبہ کرے گا، اور اس کے بعد بدکرداروں کو عذاب دے گا۔ تو وہ کہتے اے اللہ! جو تُو ہمیں یومِ حساب میں دینے والا ہے، وہ ہمارا حصہ دُنیا میں ہی ہمیں جلدی دے دے۔ جیسا کہ سورۂ اَنفال میں یہ لفظ آئے تھے، مشرکین نے دُعا کی تھی: اَللّٰهُمَّ إِنْ كَانَ هٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً مِّنَ السَّمَآءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيْمٍ (سورۂ اَنفال: ۳۲) یہ باتیں جو یہ کرتے ہیں، اگر یہ سچی ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھر برسا دے، یا ہمارے پاس کوئی دردناک عذاب لے آ۔ تو اپنے منہ موت مانگتے تھے، اس طرح سے بربادی مانگتے تھے۔ یوں نہیں کہتے تھے کہ اے اللہ! اگر یہ حق ہے تو ہمیں سمجھنے کی توفیق دے، یا ہمیں قبول کرنے کی توفیق دے، ہماری عقل فہم کھول دے تا کہ ہمیں سمجھ میں آجائے کہ یہ حق ہے۔ اس طرح سے دُعا کرتے، اللہ سے توفیق مانگتے، تو ممکن ہے حقیقت ان کے سامنے نمایاں ہو جاتی۔ لیکن وہ تو کہتے تھے کہ اگر یہ حق ہے تو بھی ہم اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں، اس کے مقابلے میں مرجانا بہتر سمجھتے ہیں، کہ اگر یہ باتیں سچی ہیں جو یہ کہتا ہے، ہمیں تو موت ہی دے دے، ہم ان کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ ہوتا تھا اُن کا مفہوم۔ اور یہ ضد کی اِنتہا ہے کہ کوئی آدمی کہے اگر یہ باتیں سچی ہیں تو مجھے موت منظور ہے، میں یہ بات ماننے کے لئے تیار نہیں، میں وہ وقت دیکھنا نہیں چاہتا جس وقت ہم اس حقیقت کو تسلیم کریں، اس سے مرجانا ہم بہتر سمجھتے ہیں، اس طرح سے وہ اپنے منہ سے عذاب مانگتے تھے۔

داؤد علیہ السلام کے تذکرے سے حضور ﷺ کو تسلی اور مشرکین کو تنبیہ

اِصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ: یہاں سے سرورِ کائنات ﷺ کے لئے تسلی ہے، کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں آپ ان کو سہتے رہیے، جو یہ بولتے ہیں آپ صبر کے ساتھ اس کو برداشت کرتے جائیے۔ صبر کا مفہوم یہی ہوتا ہے کہ آپ مشتعل نہ ہوں۔ ''صبر کر ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں۔'' وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ: اور ہمارے بندے داؤد کو یاد کر، ذَا الْأَيْدِ جو قوت والا تھا، إِنَّهٗٓ أَوَّابٌ بے شک وہ اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا تھا۔ ہمارے بندے داؤد کا ذکر کیجئے، اس کو یاد کیجئے، اس میں دونوں کے لئے عبرت ہے۔ حضور ﷺ کے لئے تو اس میں اس طرح سے نصیحت ہے کہ دیکھو! وہ بادشاہ بھی تھے، شان و شوکت والے بھی تھے، لیکن اس کے باوجود بڑے حلیم بڑے

بُردبار تھے، اور لوگوں کی غلطیوں کو لغزشوں کو بے اعتدالیوں کو برداشت کرتے تھے، جلدی سے انتقام پر نہیں اُتر آتے تھے۔ آپ ان کا واقعہ یاد کریں گے تو آپ کو بھی اسی طرح سے صبر اور تحمل کی توفیق ہوگی۔ جیسا کہ قرآنِ کریم کی عادت ہے کہ ایک بات کہی جاتی ہے، بعد میں واقعات کے ساتھ اس کو پختہ کیا جاتا ہے۔ تو داؤد علیہ السلام کے واقعہ کو آپ یاد کیجئے تاکہ آپ کو بھی صبر نصیب ہو، اور آپ بھی ان باتوں کو برداشت کرسکیں، جس طرح سے داؤد علیہ السلام باوجود اس جاہ وجلال کے لوگوں کی باتوں کو برداشت کرتے...... اور داؤد علیہ السلام کے قصے کو ذکر کرنے میں مشرکین کے لئے تنبیہ بھی ہے، کہ تم تھوڑے سے مال و دولت کے اُوپر غرور میں آگئے، میرے بندے داؤد کو یاد کرو، ان کو کتنی مضبوط سلطنت اللہ نے دی تھی، اور کتنا مضبوط ان کا ملک تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اللہ کی طرف رُجوع کرتے تھے، یہ قوت اور طاقت اُن کے لئے غرور اور گھمنڈ کا باعث نہیں بنی۔ اپنی کوتاہی کسی قسم کی ہو، اس پر ذرا سا بھی ان کو تنبہ ہوتا تو فوراً توبہ اور اِستغفار کرنے لگ جاتے تھے، اللہ کے سامنے جھکتے تھے، گڑگڑاتے تھے، تمہاری طرح وہ اکڑتے نہیں تھے۔ تو داؤد علیہ السلام کا واقعہ ذکر کرو، تاکہ یہ لوگ کچھ نصیحت حاصل کریں کہ دُنیا کے مال و دولت پر غرور نہیں کرنا چاہیے، گھمنڈ نہیں کرنا چاہیے۔ اچھے لوگ وہی ہوا کرتے ہیں جن کے جذبات شکر کے ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا ہر وقت وہ شکر ادا کریں، اگر کسی قسم کی کوتاہی اور لغزش ہوجائے اور کسی اعتبار سے ان کو تنبہ ہوجائے تو اس تنبہ کے بعد وہ فوراً اللہ کے سامنے گڑگڑانے لگ جائیں۔ مشرکین کے لئے اس اعتبار سے اس میں سبق ہے۔ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوٗدَ ذَا الْاَيْدِ: اَید: قوت کو کہتے ہیں۔ جو قوت والا تھا۔ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ: بے شک وہ اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔

داؤد علیہ السلام کا معجزہ

اِنَّا سَخَّرْنَا الْجِبَالَ مَعَهٗ يُسَبِّحْنَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِشْرَاقِ: بے شک ہم نے مطیع کردیا پہاڑوں کو اس کے ساتھ، تسبیح پڑھتے تھے وہ پہاڑ صبح اور شام۔ عشی: شام کا وقت۔ اشراق: صبح کا وقت۔ یہی اوقات ہوں گے حضرت داؤد علیہ السلام کے تسبیح پڑھنے کے، اور انہی میں پہاڑ بھی حضرت داؤد علیہ السلام کے ساتھ تسبیح پڑھتے تھے۔ داؤد علیہ السلام بہت خوش آواز تھے، اور اُن کی جو زَبور ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا شعروں کی شکل میں تھی، تو جب یہ نغمات حضرت داؤد علیہ السلام پڑھتے تو ایک تو دِل کا سوز اور پھر یہ خوش آوازی! تو گویا کہ اردگرد کی ساری کائنات مست ہوجاتی تھی، پتھر کیا، پہاڑ کیا، سب اللہ تعالیٰ کی تسبیح پڑھتے داؤد علیہ السلام کے ساتھ، ان کی آواز میں اپنی آواز شامل کرکے، اور معجزۃً حضرت داؤد علیہ السلام ان سب آوازوں کو سنتے تھے سمجھتے تھے۔ ویسے تو اللہ کی تسبیح ہر چیز ہی پڑھتی ہے، لیکن ہم سنتے سمجھتے نہیں ہیں، داؤد علیہ السلام کے سامنے ان کی تسبیح بالکل نمایاں ہوجاتی۔ تو پھر آپ اندازہ کیجئے کہ ایک اللہ کا بندہ اپنے درد اور سوز کے ساتھ جب اللہ کی حمد کررہا ہو، اور اُس کے اردگرد پرندے بھی اکٹھے ہوجائیں، اور اسی طرح سے نباتات کیا، پہاڑ کیا، پتھر کیا، سب اسی طرح سے اللہ کے سامنے توبہ اِستغفار کے کلمات ادا کررہے ہوں، تو کیسی کیفیت انسان کے اُوپر طاری ہوتی ہے، اور کس طرح سے انسان اللہ تعالیٰ کے عشق کے اندر مست ہوکر اللہ کو یاد کرتا ہے۔ تو داؤد علیہ السلام کے یاد کرنے کے اوقات میں یہی کیفیت پیدا ہوجایا کرتی تھی کہ اردگرد سارے ذاکرین ہی ذاکرین ہوتے، اور اللہ کی ساری کائنات ہی ذِکر کرتی ہوئی معلوم ہوتی، اس میں حضرت

داؤد علیہ السلام کو اور زیادہ سرور اور مستی حاصل ہوتی۔''ہم نے مسخر کیا پہاڑوں کو ان کے ساتھ، تسبیح پڑھتے تھے وہ پہاڑ شام کے وقت اور صبح کے وقت۔'' اشراق: سورج کے نکلنے کا وقت، جب سورج روشن ہوتا ہے۔انہی اوقات میں ہمارے لئے بھی نمازیں ہیں اور تسبیح کے اوقات ہمارے بھی یہی ہیں، ان اوقات میں نماز پڑھنا اللہ کو یاد کرنا زیادہ باعث فضیلت ہے۔وَالطَّيْرَ مَحْشُورَةً: اور مسخر کیا ہم نے پرندوں کو جو جمع کیے ہوئے تھے۔محشورۃ: جمع کیے ہوئے۔یہ مضمون آپ کے سامنے پہلے گزر چکا۔كُلٌّ لَّهٗۤ اَوَّابٌ: سارے کے سارے ہی اللہ کے لئے رُجوع کرنے والے تھے، اللہ کی طرف رُجوع کرنے والے تھے۔

''فصل الخطاب'' کے دو مفہوم

وَشَدَدْنَا مُلْكَهٗ: ہم نے اس کی سلطنت کو مضبوط کیا، وَاٰتَيْنٰهُ الْحِكْمَةَ وَفَصْلَ الْخِطَابِ: ہم نے اُس کو حکمت بھی دی اور فیصلہ کُن خطاب بھی دیا۔سلطنت ان کی مضبوط تھی، اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حکمت، دانش مندی، عقل مندی اور تفقہ نصیب فرمایا۔اور اسی طرح سے ان کو خطاب ان کو ایسا دیا تھا جو فیصلہ کُن ہوتا، کسی مسئلے پر وہ گفتگو کرتے تو اُن کی گفتگو فیصلہ کُن ہوتی...... یا ''خطاب'' سے مراد یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دو آدمیوں کے درمیان میں جھگڑا ہوتا، جس میں ان کی آپس میں مخالفت ہوتی، تو ان کے درمیان فیصلہ کرنے کی قوت ہم نے داؤد علیہ السلام کو دی، یوں بھی اس کا مفہوم ادا کیا جا سکتا ہے۔فیصلہ کُن خطاب: یعنی آپ کا خطاب فیصلہ کُن ہوتا تھا، یا لوگوں کی مخالفت جو مخاصمت پر مشتمل ہوتی، اس کا فیصلہ کرنا ہم نے آپ کو دیا تھا، یعنی یہ سلیقہ اور صلاحیت دی تھی جس کی بنا پر وہ ہر جھگڑے کا فیصلہ اچھی طرح کر لیتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ ۘ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ ﴿۲۱﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ فَفَزِعَ

کیا آپ کے پاس جھگڑنے والوں کی خبر آئی؟ جب انہوں نے عبادت خانے کی دیوار پھلانگی ﴿۲۱﴾ جب داخل ہوئے وہ داؤد پر پھر داؤد ان کی طرف

مِنْهُمْ قَالُوْا لَا تَخَفْ ۚ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ فَاحْكُمْ بَيْنَنَا

سے گھبرا گئے، وہ کہنے لگے: آپ خوف نہ کریں، ہم دو پارٹیاں ہیں جھگڑنے والی، ہم میں سے بعض نے بعض پر زیادتی کی ہے، ہمارے درمیان حق کے مطابق

بِالْحَقِّ وَلَا تُشْطِطْ وَاهْدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ ﴿۲۲﴾ اِنَّ هٰذَاۤ اَخِيْ ۫ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ

فیصلہ کیجئے، اور انصاف سے نہ نکلیں اور ہماری راہنمائی کیجئے سیدھے راستے کی طرف ﴿۲۲﴾ بے شک یہ میرا بھائی ہے، اس کے لئے ننانوے

نَعْجَةً وَّلِيَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ ۫ فَقَالَ اَكْفِلْنِيْهَا وَعَزَّنِيْ فِي الْخِطَابِ ﴿۲۳﴾ قَالَ لَقَدْ

دُنبیاں ہیں اور میرے لیے ایک ہی دُنبی ہے، یہ کہتا ہے کہ اس دُنبی کا مجھے کفیل بنا دے، اور میرے اُوپر غالب آ گیا ہے گفتگو میں ﴿۲۳﴾ داؤد نے کہا تحقیق

ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ الْخُلَطَآءِ لَيَبْغِىْ بَعْضُهُمْ عَلٰى

زیادتی کی ہے تیرے پر اس نے تیری دُنبی کو اپنی دُنبیوں کی طرف ملانے کے سوال کے ساتھ، اور شرکاء میں سے کثرت سے البتہ زیادتی کیا کرتے ہیں بعض

بَعْضٍ اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَقَلِيْلٌ مَّا هُمْ ؕ وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ

بعض پر مگر وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں اور وہ تھوڑے ہیں، داؤد سمجھ گئے کہ بے شک ہم نے اس کو آزمائش میں ڈالا ہے

فَاسْتَغْفَرَ رَبَّهٗ وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ ۩ ﴿۲۴﴾ فَغَفَرْنَا لَهٗ ذٰلِكَ ؕ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا

پس اس نے معافی مانگی اپنے رَبّ سے، اور گر پڑا اس حال میں کہ رُکوع کرنے والا تھا، اور اس نے رُجوع کیا ﴿۲۴﴾ پھر ہم نے اس کی یہ چیز بخش دی، اور بے شک

لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۲۵﴾ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلْنٰكَ خَلِيْفَةً فِى الْاَرْضِ فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ

اس کے لئے ہمارے پاس البتہ قرب ہے اور اچھا ٹھکانا ہے ﴿۲۵﴾ اے داؤد! بے شک ہم نے تجھے بنایا نائب زمین میں، پس تو فیصلہ کیا کر لوگوں کے درمیان

بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ

حق کے مطابق اور خواہش کی پیروی نہ کیا کر، یہ (خواہش کی اتباع) تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی، بے شک وہ لوگ جو اللہ کے راستے

سَبِيْلِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌۢ بِمَا نَسُوْا يَوْمَ الْحِسَابِ ﴿۲۶﴾ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ

سے بھٹک جاتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے یوم حساب کو بھول جانے کی وجہ سے ﴿۲۶﴾ نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان کو اور زمین کو

وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ؕ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ

اور ان چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں بے حکمت، یہ خیال ہے ان لوگوں کا جو کافر ہیں، پس بربادی ہے کافروں کے لئے یعنی

النَّارِ ﴿۲۷﴾ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِى الْاَرْضِ ز

آگ ﴿۲۷﴾ کیا بنادیں گے ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان لوگوں کی طرح جو زمین میں فساد مچاتے ہیں؟

اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ ﴿۲۸﴾ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ لِّيَدَّبَّرُوْٓا اٰيٰتِهٖ وَ

یا بنادیں گے ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح؟ ﴿۲۸﴾ یہ کتاب ہے، ہم نے اس کو اُتارا آپ کی طرف، یہ برکت والی ہے، تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں اور

لِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۹﴾ وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ ؕ نِعْمَ الْعَبْدُ ؕ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۳۰﴾ ط

تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں ﴿۲۹﴾ اور ہم نے داؤد کو سلیمان عطا کیا، بڑا اچھا بندہ تھا سلیمان، بے شک وہ (اللہ کی طرف) رُجوع کرنے والا تھا ﴿۳۰﴾

اِذْ عُرِضَ عَلَیْهِ بِالْعَشِیِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ ﴿۳۱﴾ فَقَالَ اِنِّیْۤ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ

قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب پیش کیے گئے سلیمان پر شام کے وقت عمدہ گھوڑے ﴿۳۱﴾ سلیمان نے کہا: بے شک میں نے مال کی محبت کو اختیار کیا

ذِكْرِ رَبِّیْ ۚ حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ ﴿۳۲﴾ رُدُّوْهَا عَلَیَّ ؕ فَطَفِقَ مَسْحًۢا بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ ﴿۳۳﴾

اپنے رَبّ کے ذِکر سے غافل ہوتے ہوئے یہاں تک کہ سورج پردے میں چھپ گیا ﴿۳۲﴾ ان گھوڑوں کو میرے اُوپر واپس لاؤ، پس وہ پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے ﴿۳۳﴾

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ وَهَلْ اَتٰىكَ نَبَؤُا الْخَصْمِ: خصم: مفرد جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے، جھگڑنے والا، جھگڑنے والے، اور یہاں جمع کے معنی میں ہے۔ کیا آپ کے پاس جھگڑنے والوں کی خبر آئی؟ نبا: خبر، واقعہ۔ اِذْ تَسَوَّرُوا الْمِحْرَابَ: تَسَوَّرَ: دیوار پھلانگنا۔ جب انہوں نے عبادت خانے کی دیوار پھلانگی۔ جب وہ دیوار پھلانگ کے عبادت خانے میں داخل ہوگئے، یعنی دیوار پر سے کودے اور عبادت خانے میں داخل ہوگئے۔ سُور کہتے ہیں بڑی دیوار کو۔ سُوْرُ الْبَلَدِ: شہر کے اردگرد جو فصیل ہوتی ہے۔ اِذْ دَخَلُوْا عَلٰى دَاوٗدَ جب داخل ہوئے وہ جھگڑنے والے داوٗد علیہ السلام پر۔ فَفَزِعَ مِنْهُمْ: پھر حضرت داوٗد علیہ السلام ان کی طرف سے گھبراگئے، گھبراہٹ میں پڑ گئے۔ قَالُوْا: وہ جھگڑنے والے کہنے لگے لَا تَخَفْ: آپ خوف نہ کریں۔ خَصْمٰنِ بَغٰى بَعْضُنَا عَلٰى بَعْضٍ: ہم دو پارٹیاں ہیں جھگڑنے والی، ہم دو جھگڑنے والے ہیں، ہم میں سے بعض نے بعض کے اُوپر زیادتی کی ہے۔ فَاحْكُمْ بَیْنَنَا بِالْحَقِّ: ہمارے درمیان حق کے مطابق فیصلہ کردیجئے۔ وَلَا تُشْطِطْ: اور شَطط اختیار نہ کیجئے۔ شطط کا معنی اصل میں ہوتا ہے حد سے نکل جانا، مطلب یہ ہے کہ اپنا فیصلہ ٹھیک ٹھیک کریں، انصاف سے نہ نکلیں۔ جس کا مفہوم ان الفاظ میں بیان کرسکتے ہیں، کہ ظلم نہ کرنا۔ وَاهْدِنَاۤ اِلٰى سَوَآءِ الصِّرَاطِ: اور ہماری راہنمائی کیجئے سیدھے راستے کی طرف، دُرست راستے کی طرف ہماری راہنمائی کیجئے۔ اِنَّ هٰذَاۤ اَخِیْ: یہ آگے مقدمے کی صورت ہے۔ بے شک یہ میرا بھائی ہے۔ بھائی سے ضروری نہیں کہ حقیقی بھائی مراد ہو، بلکہ معاملہ شریک بھائی، قومی بھائی، جس طرح سے دو آدمی مل کے کاروبار کرتے ہیں، وہ دونوں آپس میں ایک دوسرے کو 'بھائی وال' کہتے ہیں، کہ یہ اس معاملے میں اس کاروبار میں میرا 'بھائی وال' ہے۔ تو یہاں اَخِیْ سے ایسا ہی اَخِیْ مراد ہے (آلوسی)۔ یہ میرا بھائی ہے۔ لَهٗ تِسْعٌ وَّتِسْعُوْنَ نَعْجَةً: نَعْجَةً: کہتے ہیں دُنبی کو۔ اس کے لئے ننانوے دُنبیاں ہیں۔ وَّلِیَ نَعْجَةٌ وَّاحِدَةٌ: اور میرے لئے ایک ہی دُنبی ہے۔ فَقَالَ اَكْفِلْنِیْهَا: یہ میرا بھائی کہتا ہے کہ اس دُنبی کا مجھے کفیل بنادے، یعنی وہ بھی میرے سپرد کرے۔ وَعَزَّنِیْ فِی الْخِطَابِ: اور میرے اُوپر غالب آگیا ہے گفتگو میں۔ خِطَاب مُخَاطَبَة: آپس میں گفتگو کرنا۔ یہاں اِس آپس کی گفتگو سے مراد وہی جھگڑے کی گفتگو ہے، بحث ومباحثہ جس طرح سے ہوا کرتا ہے، اس آپس کی گفتگو میں وہ میرے پہ غالب آگیا ہے۔ قَالَ: داوٗد علیہ السلام نے کہا لَقَدْ ظَلَمَكَ بِسُؤَالِ نَعْجَتِكَ اِلٰى نِعَاجِهٖ: تحقیق زیادتی کی ہے تیرے پر اس تیرے بھائی نے تیری دُنبی کو اپنی دُنبیوں کی طرف ملانے کے سوال

کے ساتھ، یعنی تجھ سے اس نے جو سوال کیا ہے کہ تیری دُنبی کو اپنی دُنبیوں کی طرف ملا لے، یعنی یہ کہتا ہے کہ اپنی دُنبی بھی میرے سپرد کردے، اس سوال میں اس نے تیرے پہ زیادتی کی ہے۔ ''بسبب مانگنے تیری دُنبی کے اپنی دُنبیوں کی طرف''، ''سوال کرنا تیری دُنبی کا اپنی دُنبیوں کی طرف، یعنی اپنی دُنبیوں کے ملانے کی طرف'' کہ اس دُنبی کو میری دُنبیوں میں ملادے، یہ سوال کرکے تیرے بھائی وال نے تیرے پہ زیادتی کی ہے۔ وَاِنَّ كَثِيۡرًا مِّنَ الۡخُلَطَآءِ: خلطاء: خلیط کی جمع ہے، خلیط شریک کو کہتے ہیں۔ شرکاء میں سے کثرت سے البتہ زیادتی کیا کرتے ہیں بعض بعض پر۔ اِلَّا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: مگر وہ لوگ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، وَقَلِيۡلٌ مَّا هُمۡ: اور وہ تھوڑے ہیں، یعنی اکثر شرکاء کی عادت یہی ہے کہ بعض بعض کے اُوپر زیادتی کیا کرتا ہے، ایک دوسرے کا حق نہیں پہچانتے، دوسرے کے حق کو دبانے کی کوشش کرتے ہیں، دوسرے کے حق کو اپنے حق کے ساتھ ملانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ شرکاء کی عادت ہے، کاروبار میں جو شریک ہوتے ہیں ایسا کرتے ہیں۔ ہاں! البتہ جو ایمان لے آئیں اور نیک عمل کریں، ان میں یہ جذبہ نہیں ہوتا، وہ دوسرے کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں، دوسرے کے حق کو مارنے کی، دبانے کی کوشش نہیں کرتے لیکن ایسے تھوڑے ہوتے ہیں، ورنہ اکثر کا حال یہی ہے کہ دوسرے کے حقوق پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔

وَظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ: داؤد سمجھ گئے، داؤد علیہ السلام نے گمان کیا کہ بے شک ہم نے اس کو آزمائش میں ڈالا ہے، فَاسۡتَغۡفَرَ رَبَّهٗ: پس اس نے معافی مانگی اپنے ربّ سے، وَخَرَّ رَاكِعًا وَّاَنَابَ: اور گر پڑا اس حال میں رُکوع کرنے والا تھا، اور اس نے اللہ کی طرف رُجوع کیا۔ اَنَابَ يُنِيۡبُ: رُجوع کرنا۔ فَغَفَرۡنَا لَهٗ ذٰلِكَ: پھر ہم نے اس کو بخش دیا، ہم نے اس کی یہ چیز بخش دی، جس سے اس نے معافی مانگی تھی وہ چیز ہم نے معاف کردی۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنۡدَنَا لَزُلۡفٰى وَحُسۡنَ مَاٰبٍ: اور بے شک اس کے لئے ہمارے پاس البتہ قُرب ہے۔ زلفیٰ: قربیٰ کے معنی میں ہے۔ اس کو ہمارے پاس قُرب ہے نزدیکی حاصل ہے، اس کا مرتبہ ہے۔ وَحُسۡنَ مَاٰبٍ: اور اچھا ٹھکانا ہے۔ مآب: ٹھکانا۔ حسن: اچھا۔ اس کے لئے ہمارے پاس قُرب ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔ يٰدَاوٗدُ اِنَّا جَعَلۡنٰكَ خَلِيۡفَةً فِى الۡاَرۡضِ: اے داؤد! بے شک ہم نے تجھے بنایا نائب زمین میں، فَاحۡكُمۡ بَيۡنَ النَّاسِ بِالۡحَـقِّ: پس تو فیصلہ کیا کر لوگوں کے درمیان حق کے مطابق، وَلَا تَتَّبِعِ الۡهَوٰى: اور خواہش کی پیروی نہ کیا کر، فَيُضِلَّكَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ: یہ خواہش کی اتباع تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی، اِنَّ الَّذِيۡنَ يَضِلُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ: بے شک وہ لوگ جو اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں، لَهُمۡ عَذَابٌ شَدِيۡدٌ: ان کے لئے دردناک عذاب ہے، بِمَا نَسُوۡا يَوۡمَ الۡحِسَابِ: ''ما'' مصدریہ ہے۔ یومِ حساب کو بھول جانے کی وجہ سے، چونکہ وہ یومِ حساب کو بھول گئے، انہوں نے یومِ حساب کو یاد نہیں رکھا، اس یومِ حساب کو بھول جانے کی وجہ سے ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

تفسیر

داؤد علیہ السلام کے پاس جھگڑا لانے والوں کا واقعہ

ان آیات میں حضرت داؤد علیہ السلام کا ایک واقعہ ذکر کیا گیا ہے، واقعے کی صورت یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے اوقات کو تقسیم کر رکھا تھا، ایک وقت فصلِ خصومات کے لئے تھا، بیٹھتے تھے، لوگ اپنے جھگڑے لے کر آتے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام

اُن کا فیصلہ کرتے تھے، اور ایک وقت ان کا خلوت میں اللہ کی یاد اور حمد وثنا کے لئے گزرتا تھا، وقت متعین کیا ہوا تھا جس میں وہ علیحدگی اختیار کرتے تھے، عبادت خانے میں جا کے عبادت کرتے تھے۔ تو ایک دفعہ وہ اپنے عبادت خانے میں عبادت کر رہے تھے، باہر والے اِحاطے کا دروازہ بند تھا، یا پھر وہاں پہریدار اور بواب موجود ہوگا جو ایسے موقع پر کسی کو اندر نہیں آنے دیتا تھا، اور آپ کی خلوت کے اندر خلل نہیں ڈالنے دیتا تھا۔ دو آدمی تھے یا زیادہ تھے، بہر حال کچھ جھگڑنے والے آئے، انہوں نے دیکھا کہ دروازہ بند ہے، یا دروازے کی طرف کوئی دربان کھڑا ہے، وہ آگے جانے نہیں دے گا، اور اِن میں جلد بازی تھی، اور اُدھر حضرت داؤد علیہ السلام کے اخلاقِ کریمانہ پر اعتماد بھی تھا، ورنہ اتنے بڑے دُنیا کے حاکم، وقت کے بادشاہ، وقت کے عظیم الشان پیغمبر بھی، تو دُوسرے کی طرف سے اتنی جرأت کر لینا یہ عجیب ہے، لیکن انہوں نے یہ جرأت کی اور دِیوار پھلانگ گئے۔ اب یہ دِیوار پھلانگ کے اندر جو گئے تو حضرت داؤد علیہ السلام ان کو دیکھ کر گھبرا گئے، اور یہ گھبراہٹ طبعی ہے، جس طرح سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے سامنے فرشتے انسانوں کی شکل میں گئے تھے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے سامنے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا، اور انہوں نے نہ کھایا یا ہاتھ نہ بڑھے، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام پر بھی ہیبت طاری ہوگئی تھی، کہ یہ جو آئے ہیں اور میرا کھانا نہیں کھاتے، تو یہ کسی بُرے اِرادے سے آئے ہیں، یہ کہیں دُشمن نہ ہوں، یہ ایک طبعی گھبراہٹ ہے جو اِنسان پر ایسے موقع پہ طاری ہوا کرتی ہے، تو حضرت داؤد علیہ السلام پر بھی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ ایسے وقت میں دربانوں سے بچ بچا کر دِیوار پھلانگ کر جو آئے ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کسی اچھے اِرادے سے نہیں آئے، جو دُشمن ہوتے ہیں نقصان پہنچانے کے لیے یہی صورت اختیار کرتے ہیں، اور وہ آنے والے بھی تاڑ گئے کہ ہمارا اس طرح سے آنا حضرت داؤد علیہ السلام کے لئے گھبراہٹ کا باعث بن گیا ہے، تو فوراً آگے سے وہ تسلی کے الفاظ کہتے ہیں کہ آپ خوف نہ کریں، ہم کوئی دُشمن نہیں ہیں، اندیشہ نہ کریں، بلکہ ہم میں ایک جھگڑا ہو گیا ہے، ہم اس کا فیصلہ کروانا چاہتے ہیں، دیر ہم کر نہیں سکتے تھے، جلدی فیصلہ کروانا تھا، اس لئے ہم دِیوار پھلانگ کر آگئے، ہمارے اس معاملے میں آپ انصاف کریں، کسی قسم کی زیادتی نہ کریں، اور نہ ہمارے اس فیصلے کو کسی دوسرے وقت پر ٹالیں، لَا تُشۡطِطۡ کا یہ مفہوم بھی ہے کہ پرے نہ ہٹائیں اس واقعے کو، مؤخر نہ کریں، ابھی فیصلہ کریں، اور ٹھیک ٹھیک کریں۔ یہ بات کرنے کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام متوجہ ہوئے ہوں گے، اُن پہ ناراض نہیں ہوئے، سمجھ گئے کہ کوئی ضرورت مند ہیں، چلو! اس طرح سے آگئے، اُن سے صورتِ واقعہ پوچھی، دونوں میں سے ایک شخص صورتِ واقعہ بیان کرتا ہے، کہتا ہے جی! ہمارا ایک معاملہ مشترکہ تھا، اور سو دُنبیاں تھیں، جن میں سے میرے حصے میں میرے خیال کے مطابق ایک دُنبی آتی ہے، اور اس کے حصے میں ننانوے دُنبیاں جاتی ہیں، لیکن یہ واقعہ کو یوں خلط ملط کر رہا ہے کہ وہ ایک بھی مجھے دینے کے لئے تیار نہیں، اس پر بھی قبضہ جمانا چاہتا ہے، اور کہتا ہے کہ وہ بھی مجھے دے دے۔ جب اس نے یہ بات نقل کی (قرآنِ کریم نے یہ واقعہ یہیں تک ہی نقل کیا) تو اس کی یہ بات سُن کے حضرت داؤد علیہ السلام نے ناصحانہ انداز میں یا ہمدردی کے لب ولہجے میں اُس شخص سے یہ کہا کہ یہ تو واقعی تیرے بھائی کی زیادتی ہے، جو ایک دُنبی بھی تجھے نہیں دیتا، اور واقعے کو خلط کر کے ایک دُنبی کو بھی قبضانا چاہتا ہے، یہ تو اس کی بڑی زیادتی ہے۔ اور شرکاء اس قسم کی زیادتی کیا ہی کرتے ہیں، جہاں کاروبار میں شرکت ہو، تو ایک شریک دوسرے کے ساتھ اس قسم کی دھاندلی کا ارتکاب کرتا ہی ہے۔ ہاں! البتہ اگر کوئی مؤمن ہو، نیک عمل کرے آخرت پر اس کا یقین

ہو، تو وہ اس قسم کی دھاندلی نہیں کیا کرتے، بلکہ وہ ایک دوسرے کے حقوق کا تحفظ کرتے ہیں۔ حضرت داؤد علیہ السلام نے آگے یہ بات کہی کہ مؤمنین صالحین تو ایسی دھاندلی نہیں کیا کرتے، لیکن ایسے شرکا تھوڑے ہوتے ہیں، زیادہ تر ایسے ہی ہیں جو معاملے کو خلط کر کے دوسرے کے حق پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں...... یہاں تک بات نقل کرنے کے بعد قرآنِ کریم یہ کہتا ہے کہ داؤد علیہ السلام فوراً سمجھ گئے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میری ایک آزمائش ہے، فوراً اللہ تعالیٰ سے اِستغفار کیا توبہ کی۔ اور آگے لفظ قرآنِ کریم نے بولے: خَرَّ رَاكِعًا: رَاكِعًا: یہاں ساجِدًا کے معنی میں ہے۔ خَرَّ خُرُورًا: گر پڑنا۔ اللہ کے سامنے جھکتے ہوئے گر گئے، سجدہ کیا......جس طرح سے احادیث کے اندر آتا ہے، یہی وجہ ہے کہ سننے والے بھی اس آیت کے اُوپر سجدہ کرتے ہیں، کہ جب داؤد علیہ السلام نے سجدہ کیا، یہ داؤد علیہ السلام کا سجدہ بطورِ توبہ کے ہے، اور حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ ہم بطورِ شکر کے یہاں سجدہ ادا کریں گے کہ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کی توبہ کو قبول کیا، تو جیسے داؤد علیہ السلام نے اس موقع پہ سجدہ کیا تھا ہمیں بھی اس موقع پر سجدہ کرنا چاہیے۔[1] اَحناف کے نزدیک یہاں سجدہ واجب ہے، شوافع کے نزدیک واجب نہیں، ان کے نزدیک سورۂ حج میں دو سجدے ہیں، ہمارے نزدیک سورۂ حج میں ایک ہے اور سورۂ ص میں بھی ہے۔ اور ہمارا اور ان کا اس بات پر اتفاق ہے کہ قرآنِ کریم میں سجدے چودہ ہی ہیں، لیکن فرق یوں پڑ گیا کہ ان کے نزدیک سورۂ حج میں دو ہیں، اور ہمارے نزدیک سورۂ حج میں ایک ہے۔ ان کے نزدیک سورۂ ص میں سجدہ نہیں ہے، اور اَحناف کے نزدیک سورۂ ص میں سجدہ ہے......تو اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدہ کیا، اللہ تعالیٰ نے انہیں معاف کر دیا، جس بات سے انہوں نے معافی مانگی تھی اللہ نے معاف کر دیا، اور ساتھ یہ بشارت بھی سُنا دی کہ وہ تو ہمارا مقرب ہے، اور اس کا ہمارے پاس بڑا اچھا ٹھکانا ہے۔ یہ ہے اس واقعے کا حاصل جو آپ کے سامنے ان آیات میں پڑھا گیا۔

واقعۂ داؤد علیہ السلام کے متعلق اِسرائیلی خرافات اور ان کا رَدّ

اب یہاں سوال یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کا کیا امتحان تھا؟ اور ان کی صورتِ مقدمہ سے اپنی کس بات پر حضرت داؤد علیہ السلام متنبہ ہوئے؟ اور حضرت داؤد علیہ السلام نے کس بات کی معافی مانگی؟ یہ سوال یہاں اُبھرتا ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں صراحت نہیں کی، کہ حضرت داؤد علیہ السلام کو کیا تنبہ ہوا؟ اور وہ اس صورتِ مقدمہ کے ساتھ اپنی کس لغزش کی طرف متوجہ ہوئے؟ اس لئے اس کی تفصیل کرتے ہوئے مفسرین کی یہاں مختلف آرا ہیں۔......بعض تو خرافات قسم کی باتیں ہیں، جو اِسرائیلیات میں مذکور ہیں، اِسرائیلی کتابوں میں موجود ہیں، اور بعض مفسرین نے بے اِحتیاطی کے ساتھ وہی بات اُٹھا کے یہاں بھی لکھ دی، لیکن وہ بالکل خرافات ہیں اور اس کے لیے کوئی کسی قسم کی گنجائش نہیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق وہ تصور کیا جائے۔ اِسرائیلی صحیفوں میں حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف ایک واقعہ منسوب کیا گیا ہے، اور وہ اس طرح کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے گھر میں ننانوے بیویاں تھیں، ایک کم سو، اور ایک دفعہ داؤد علیہ السلام کہیں مکان کی چھت پر چڑھے، اور پڑوس میں گھر تھا اُن کے کسی فوجی افسر کا، جو کہ لشکروں کی

---

(۱) نسائی ۱/۱۱۱، باب سجود القرآن۔ مشکوٰۃ ۱/۹۴، باب سجود القرآن، فصل ثالث۔ ولفظه: اَنَّ النَّبِيَّ ﷺ سَجَدَ فِي ص وَقَالَ: سَجَدَهَا دَاوُدُ تَوْبَةً وَنَسْجُدُهَا شُكْرًا۔

قیادت کیا کرتا تھا، اس کا نام ''اوریا'' لکھا ہے، اس کی بیوی کہیں نہارہی تھی، داؤد علیہ السلام کی اس کے اُوپر نظر پڑی، نظر پڑنے کے بعد داؤد علیہ السلام کے دل میں اس کی محبت آگئی۔ ان خرافات میں تو آگے بھی معاملہ ہے کہ پھر اس کو بلایا، اور بلانے کے بعد نعوذ باللہ! اس کے ساتھ مصاحبت کا ارتکاب کیا، ان اِسرائیلی روایات کے اندر تو یہ جز بھی ہے، اور پھر ''اوریا'' کو کسی بہانے کے ساتھ کسی جنگ میں بھیجا، اور دوسرے لوگوں کو تاکید کی کہ اس کو کسی خطرناک مقام میں لے جانا تاکہ یہ وہاں مرجائے، قتل ہوجائے، چنانچہ ایسے ہوا، اس تدبیر کے تحت اس کو قتل کروایا، اور قتل کروا کے پھر اس کی بیوی کو اُٹھالیا۔ تو فرشتوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے تنبہ کیا، یہ ننانوے دُنبیاں اور ایک دُنبی کا واقعہ ذِکر کر کے حضرت داؤد علیہ السلام سے فیصلہ جو کروایا، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے فیصلہ یہ دیا کہ یہ تو بڑی زیادتی ہے کہ ننانوے دُنبیاں ہیں، اور پھر وہ ایک دُنبی کو حاصل کرنا چاہتا ہے، تو پھر فوراً ان کا ذہن اپنے اس واقعے کی طرف متوجہ ہوا، جس کے بعد توبہ اِستغفار کی، کہ یہ غلطی تو مجھ سے بھی ہوئی ہے کہ میرے گھر میں ننانوے بیویاں موجود تھیں، اور ''اوریا'' کی ایک بیوی تھی، وہ بھی میں نے اس طرح سے ہتھیانے کی، اور حاصل کرنے کی کوشش کی، اس پر حضرت داؤد علیہ السلام نے توبہ کی، اور اللہ تعالیٰ نے توبہ قبول کی، اور قرب اور اچھے مرتبے کی بشارت دی، اِسرائیلی روایات کے اندر یہ واقعہ موجود ہے (دیکھئے: ''معارف القرآن'')، واقعے کی نشست خود بتاتی ہے کہ یہ ان خرافات میں سے ہے، جو اِسرائیلی افسانہ نگاری کے طور پر کیا کرتے ہیں۔ اور اس قسم کی عشق بازی کا تصور نبی کے متعلق نہیں کیا جاسکتا، پھر اس اِسرائیلی روایت میں تو صراحتاً نعوذ باللہ! حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف زِنا کی نسبت بھی کی گئی ہے، تو اس کو اسلامی ذہن کس طرح سے برداشت کرسکتا ہے؟ اس لئے یہ واقعہ تو خرافات میں داخل ہے، اس کا تو اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔ لیکن بعض مفسرین نے بے احتیاطی کرتے ہوئے اس میں سے بعض اجزاء تو اُڑادیے، مثلاً اس کو بلانا اور بلا کے اس کے ساتھ ناجائز تعلق کے طور پہ مصاحبت کرنا، یہ جز تو ان مفسرین نے اسلامی روایات میں نہیں دیا، باقی واقعے کو نقل کردیا، وہ یہ سمجھے کہ یہ قرآنِ کریم کے الفاظ کے زیادہ مطابق ہے، تو اس سے اس کی تفسیر زیادہ اچھی طرح سے واضح ہوجاتی ہے۔ لیکن جو محقق قسم کے مفسر ہیں، انہوں نے اس واقعے کی تردید کی، اور کہا کہ قرآنِ کریم کی آیات کی تفسیر میں اس واقعے کو نقل کرنا ٹھیک نہیں ہے۔

اور بعض حضرات نے اسی واقعے سے تفسیر اَخذ کرنے کی کوشش کی، انہوں نے تعبیر یوں کردی کہ اصل واقعہ یوں ہوگا کہ بنی اسرائیل میں کوئی شخص کسی دوسرے سے مطالبہ کرلے، کہ تُو اپنی بیوی کو طلاق دے دے، تاکہ عدّت گزر جانے کے بعد میں اس سے نکاح کرلوں، اس کو معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا، نہ مروّت کے خلاف سمجھا جاتا تھا، یہ بات ان کے اندر واقع تھی، جس طرح سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب مدینہ منورہ ہجرت کر کے گئے ہیں تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ انصاریوں کے جس خاندان کے حصے میں آئے تھے، جو ان کا بھائی بنایا گیا تھا مواخات کے تحت جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان کی تھی، بھائی چارہ کیا تھا، تو ''بخاری شریف'' میں روایت آتی ہے کہ اس نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ پیش کش کی تھی، کہ میری جتنی جائیداد ہے، میرا جتنا مال ہے، میرے ساتھ اس کو آدھا آدھا تقسیم کرلے، اور میری دو بیویاں ہیں، اور تُو کہے تو میں ان دو میں سے ایک کو طلاق دے دیتا ہوں، جب اس کی عدّت گزر جائے گی تو تُو اس سے نکاح کرلینا، تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے کہا تھا کہ نہ! ''بَارَكَ اللّٰهُ

لَكَ فِي أَهْلِكَ وَمَالِكَ ''اللہ تعالیٰ تیرے مال واہل کے اندر برکت دے، یہ تجھے ہی نصیب ہوں، مجھے تو بازار کا راستہ بتادو، میں تو تجارت کر کے اپنا گزارہ کروں گا۔[1] چنانچہ انہوں نے بازار میں تجارت شروع کردی، بعد میں جب اللہ نے حیثیت دی تو پھر اپنا نکاح کسی دوسری جگہ کرلیا۔ تو جیسے انہوں نے پیشکش کی تھی کہ میں ایک بیوی کو طلاق دے دیتا ہوں، اور حلال ہونے کے بعد تو اس کے ساتھ نکاح کرلینا، تو بنی اسرائیل میں بھی اس طرح سے تھا کہ کوئی شخص کسی دوسرے سے مطالبہ کرلے، کہ تُو اپنی بیوی کو طلاق دے دے تاکہ میں پھر بعد میں اس سے نکاح کرلوں، تو اس کو کوئی خلاف مروّت نہیں سمجھا جاتا تھا، تو حضرت داؤد علیہ السلام نے بھی اسی طرح سے ''اوریا'' سے مطالبہ کیا کہ تُو اس کو طلاق دے دے، لیکن چونکہ آپ بادشاہ بھی تھے اور وہ آپ کے تابع تھا، اور بڑے آدمی کا اپنے تابع سے اس قسم کا مطالبہ کرنا، اس میں یہ اندیشہ ہوا کرتا ہے کہ تابع کا دِل نہیں چاہتا، لیکن بڑے ہونے کی حیثیت سے دباؤ مان کر وہ طلاق دے دے اور علیحدگی اختیار کرلے، اور اس کو طیبِ نفس نہ ہو، دِل کی خوشی کے ساتھ وہ یہ کام نہ کرے، بلکہ اپنے سے اُونچے عہدے دار کے دباؤ میں آ کے اس قسم کا کام کرلے، اس لئے یہ بات حضرت داؤد علیہ السلام کی شان کے منافی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اس واقعے کے ذریعے سے حضرت داؤد علیہ السلام کو متنبہ کیا...... تو بعض مفسرین نے یہ انداز اختیار کرلیا، تو گویا کہ جس قسم کی بات اسرائیلی روایت میں منسوب کی گئی تھی حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف، وہ تو نہ لی، لیکن واقعے کی تصویر وہیں سے اَخذ کی کہ صورت یہ بنالی، تو حضرت داؤد علیہ السلام متنبہ ہوگئے کہ مجھے ایسا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، تو اس واقعے کے ساتھ اُن کو اس بات کی طرف توجہ ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کی، اِستغفار کی، اللہ کے سامنے جھک گئے، سجدے میں گر گئے، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کی لغزش جو تھی، جو اُن کے دِل میں ایک خواہش پیدا ہوئی تھی اپنے ماتحت کی بیوی حاصل کرنے کی، وہ اللہ تعالیٰ نے معاف کردی، معاف کرنے کے بعد اُن کو قرب اور اچھے مرتبے کی بشارت دی...... تو کچھ احتیاط کرنے والوں نے یہ واقعہ یوں بیان کردیا، لیکن اس میں بھی آپ دیکھ رہے ہیں کہ رُوح وہی ہے جو اِسرائیلی روایت میں تھی، اس لئے محققین کے نزدیک یہ بات بھی صحیح نہیں۔

واقعۂ داؤد علیہ السلام کی پہلی صحیح توجیہ

تو پھر وہ کون سی بات ہے جس کی بنا پر حضرت داؤد علیہ السلام متنبہ ہوئے؟ متنبہ ہونے کے بعد اللہ کے سامنے جھکے، اور جھک کے اللہ سے معافی مانگی، حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے تو ''بیان القرآن'' میں یہ انداز اختیار کیا ہے کہ اصل میں حضرت داؤد علیہ السلام کے سامنے جس وقت یہ مقدمہ پیش ہوا، تو صورت ایسی اختیار کی گئی کہ جس میں حاکمِ وقت کو اِشتعال آتا ہے، عدالت میں نہیں بیٹھے کہ صاحبِ مقدمہ آئے اور آ کے مقدمہ پیش کرے، خلوت کا وقت ہے، پھر اجازت لے کر اندر نہیں آئے، بلکہ دیوار کو پھلانگ کر آئے، یہ بھی ایک قسم کی بدتہذیبی ہے اور بڑی گستاخی ہے، اور پھر سامنے آئے تو گفتگو اس انداز میں کی گویا کہ حاکم کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ آپ ہم سے ڈر رہے ہیں، آپ کو ڈرنا نہیں چاہیے۔ بڑے کے سامنے جا کر اس طرح سے بات کرنا، کہ ''آپ کو ڈرنا نہیں چاہیے، آپ سیدھا سیدھا فیصلہ کریں، اور انصاف کریں'' جس میں یہ ہے کہ گویا کہ انصاف نہ کرنے کا اندیشہ بھی ہے، یہ

(۱) بخاری ۱/ ۵۳۳، کتاب المناقب، باب إخاء النبی۔ نیز ۱/ ۵۶۱۔ ۲/ ۷۵۹۔ ۲/ ۷۷۷۔

سارے کا سارا انداز انہوں نے ایسا اختیار کیا، کہ اگر کوئی دُنیوی قسم کا حاکم ہوتا تو فوراً ان کا فیصلہ سننے کی بجائے ان کے اُوپر کوئی دفعہ قائم کر کے اُن کو گرفتار کرتا اور سزا دیتا، اُن کی یہ حرکتیں قابلِ برداشت نہیں تھیں، لیکن حضرت داؤد علیہ السلام چونکہ بہت ہی حلم والے، بہت ہی عفو والے تھے، انہوں نے سب باتوں کو برداشت کیا، برداشت کرنے کے بعد جس وقت مقدمہ سُنا، اور مدّعی کا بیان سُنا تو بیان سنتے ہی اس کی بات سے متاثر ہو کر مدعاعلیہ کے خلاف بات کرنی شروع کر دی، ابھی مدّعی نے بیان دیا ہے اور مدعاعلیہ کا بیان سامنے نہیں آیا، اس سے نہیں پوچھا کہ یہ جو کہتا ہے کہ اس کی ایک دُنبی بھی تُو دبانا چاہتا ہے تو تیرا کیا بیان ہے؟ تُو کیا کہتا ہے؟ اس سے نہیں پوچھا بلکہ مدّعی کی بات سے متاثر ہو کر فوراً اس کی حمایت میں بات کرنی شروع کر دی۔ اور قواعدِ شریعت میں یہ کسی حد تک حاکم کی بے احتیاطی ہے کہ مدعاعلیہ سے پوچھے بغیر اس قسم کی باتیں کرنی شروع کر دیں جس میں مدّعی کی حمایت نکلے۔ عدالت میں جس وقت مدّعی اور مدعاعلیہ دونوں موجود ہوں تو حاکم کو کوئی ایسی بات نہیں کرنی چاہیے جس سے ایک فریق کی حمایت ٹپکے، بلکہ دوسرے کا بیان بھی سنے، دوسرے کا بیان سننے کے بعد جو بات سمجھ میں آئے بطور فیصلہ کے، وہ سُنا دینی چاہیے...... تو اس سے بظاہر کچھ طرف داری ہے۔ تو ان حالات میں حضرت داؤد علیہ السلام سے یہ لغزش جو ہوئی...... پہلا حصہ تو قابلِ تعریف ہے کہ حلم اور بُردباری کا معاملہ فرمایا...... لیکن یہ ذرا سی لغزش کہ فیصلے کی نوعیت میں حضرت داؤد علیہ السلام نے مدّعی کی حمایت کی باتیں کرنی شروع کر دیں، جس سے فوراً اُن کو تنبہ ہوا، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور استغفار کی...... تو نبی کی جو تھوڑی سی لغزش ہوا کرتی ہے وہ اس کو بھی بہت محسوس ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ بھی اس معاملے کو ایسے ذِکر کیا کرتے ہیں، جس طرح سے آپ کی خدمت میں پہلے بھی عرض کیا تھا حضرت یونس علیہ السلام کے واقعے میں، یہ اُن کے اُونچے مرتبے کی وجہ سے ہوتا ہے کہ ذرا سی لغزش ہوتی ہے تو اس کے اُوپر یوں گرفت ہو جاتی ہے، اور ان کو بھی اتنا احساس ہوتا ہے، کہ جس طرح سے ہمیں بڑے سے بڑا جرم کر کے بھی ایسا احساس نہیں ہوتا، جس طرح سے انبیاء علیہم السلام کو ایک خلافِ اَولیٰ بات کے صادر ہونے کے ساتھ احساس ہوا کرتا ہے...... حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعے کی تقریر یوں کر دی، تو معلوم ہوا کہ پہلے جو دو تعبیریں اختیار کی گئی ہیں اُن میں یہ مقدمہ فرضی تھا، اور ہو سکتا ہے آنے والے فرشتے ہوں، لیکن یہ جو توجیہ کی گئی ہے تو اس توجیہ میں مقدمہ حقیقی معلوم ہوتا ہے، اور آنے والے انسان تھے۔

اور دُوسرے حضرات کچھ یوں کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مخفی رکھا ہے، تو ہمیں بھی اس کی تفصیل کرنے کی ضرورت نہیں، اللہ بہتر جانتا ہے کہ کون سا واقعہ تھا؟ جس واقعے کی بنا پر حضرت داؤد علیہ السلام کو تنبہ ہوا، اور انہوں نے توبہ اور اِستغفار کی، اور اگر بیان کرنا چاہیں تو یوں کر سکتے ہیں اِبہام کے ساتھ، کہ دُنیا میں یہ واقعات ہوتے رہتے ہیں کہ جو شخص صاحبِ اِقتدار ہوتا ہے، اس کو بسا اوقات اپنی شخصی ضرورت یا ملکی ضرورت کے تحت ایسے تصرفات کرنے پڑتے ہیں جو کسی کی شخصی ملکیت کے خلاف ہوتے ہیں، اور حکومت کی ضرورت کے تحت یا اپنی ضرورت کے تحت لوگ فیصلہ کر دیتے ہیں، اور مالکوں کی رضا کی رعایت نہیں رکھتے، جس طرح دُنیا کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ ایک بادشاہ مثال کے طور پر محل بنوانا چاہتا ہے، چونکہ وہ دُنیادار ہے، آخرت کا فکر تو اس کو ہوتا نہیں، تو محض اپنے محلوں کی دیواریں سیدھی کرنے کے لئے کتنوں کی جھونپڑیوں پر بلڈوزر پھروا دیتے ہیں، اور کتنے بسنے والے لوگوں کو اُجاڑ دیتے ہیں، اور اپنے محل کی طرف سڑک نکالنے کے لئے کتنوں کو جائیدادوں سے بے دخل کر دیتے ہیں، شخصی

ضرورتوں کے تحت بھی اس قسم کے فیصلے کرتے رہتے ہیں اور لوگوں کے حقوق کی رعایت نہیں رکھتے، بسااوقات ملکی ضرورت کے تحت بھی ایسے فیصلے کر لیتے ہیں کہ جس میں بعض لوگوں کے اُوپر زیادتی ہوجاتی ہے، دُنیادار بادشاہوں میں تو اس قسم کے واقعات ہوتے رہتے ہیں، اور یہ نبی بھی تھے اور بادشاہ بھی تھے، لیکن ضرورت کبھی اس قسم کی آسکتی ہے کہ جس کو اپنی حقیقی ضرورت سمجھ کر انسان کوئی فیصلہ کرنا چاہے، جس میں کسی صاحبِ حق کے حق کے اُوپر زد آتی ہو، تو اس قسم کا کوئی ارادہ حضرت داؤد علیہ السلام نے فرمایا ہوگا، کوئی ایسا کام کرنے کا جس میں کسی صاحبِ حق کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا، تو اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت ہی ان کو متنبہ کردیا کہ دیکھو! اس طرح سے کسی دوسرے کے حق پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کرنا، دوسرے کی رضا کے بغیر کوئی چیز لینا، یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ تو اس قسم کا کوئی ارادہ حضرت داؤد علیہ السلام نے کیا ہوگا۔ اور ابھی کوئی نوبت ایسی نہیں آئی تھی، لیکن اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ اپنی طرف سے ان کے سامنے پیش کردیا۔ چاہے وہ واقعہ حقیقی ہو، چاہے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو بھیج کر متوجہ کیا ہو، تو یہ بات ان کے سامنے بروقت آگئی، جس سے وہ متنبہ ہوگئے، کہ واقعی ہمیں حکومت کی سطح پر ہوتے ہوئے اس قسم کے فیصلے نہیں کرنے چاہئیں، جن میں دوسرے کے حق کے اُوپر کوئی زد آتی ہو۔ تو فوراً ہی متنبہ ہوکر اللہ تعالیٰ کے سامنے تائب ہوگئے، استغفار کرنے لگ گئے۔ تو اس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اُن کو اس بات سے بچالیا، جس قسم کی خواہش اُن کے دل میں پیدا ہوئی ہوگی۔ تو یوں بھی بعض حضرات نے توجیہ کی ہے، اور اس طرح سے بھی کہا کہ اس میں کوئی جرم نہیں منسوب کیا گیا حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف، اور نہ اس قسم کی کوئی خرافات بنائی گئیں، جس طرح سے کہ اسرائیلی روایتوں میں ہیں، یعنی ارادہ کیا ہو یا خواہش ایسی ہو، کہ ایسا کرلیا جائے، لیکن اس فیصلے کے ضمن میں کسی شخص کے حق میں زد پڑتی ہو، تو اللہ تعالیٰ نے قبل از وقت اس قسم کا مقدمہ سامنے پیش کرکے، حضرت داؤد علیہ السلام کو متوجہ کردیا، کہ یہ نہ کرنا، یہ ٹھیک نہیں۔ تو حضرت داؤد علیہ السلام متوجہ ہوگئے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور استغفار کرلی۔

بہرحال یہ انداز ایک اچھا انداز ہے کہ اس طرح بات کی جائے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف گناہ کی، یا کسی ایسی بات کی نسبت نہ ہو، جو نبی کی شان کے مناسب نہیں ہے۔ ورنہ پھر سلامتی کا راستہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مبہم رکھا، ہم بھی مبہم رکھیں، ہمیں اِس کی تفسیر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کوئی واقعہ ایسا تھا کہ حضرت داؤد علیہ السلام متوجہ ہوگئے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے متوجہ کیا ہے، میری لغزش کی طرف۔ تو فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور استغفار کیا۔ (۱)

حضرت داؤد علیہ السلام کو نصیحتِ اِلٰہی

اور آگے اللہ تعالیٰ کی طرف سے حضرت داؤد علیہ السلام کو کچھ نصیحت ہے۔ سامنے اگرچہ حضرت داؤد علیہ السلام کو رکھا گیا، لیکن سُنانا سب کو مقصود ہے۔ کہ اے داؤد! ہم نے تجھے زمین کے اندر خلیفہ بنایا۔ اور جو بھی اقتدار پہ ہوتا ہے، بادشاہ ہے، وہ اللہ کا خلیفہ ہی ہے۔ تُو نائب ہے اس زمین میں۔ اس کائنات کے اندر تیرا مالکانہ تصرف نہیں ہے، بلکہ تُو نائب ہونے کی حیثیت سے ہے، لہٰذا اس میں اس کے حکم کے رعایت رکھنی چاہیے، جو کہ اصل ہے جس کے آپ نائب ہیں، اور وہ اصل ہیں اللہ تعالیٰ، لہٰذا اس زمین میں رہتے

---

(۱) اس واقعے کی ایک مزید بہترین توجیہ اگلی آیات کے بعد دیکھیں۔

ہوئے جہاں تک آپ کو اقتدار حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی تنفیذ کیجئے، اس میں مالکانہ تصرف ٹھیک نہیں ہے، ''زمین میں ہم نے آپ کو خلیفہ بنایا ہے، لوگوں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کیا کیجئے اور کبھی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے''، کہ دل جس طرح سے چاہے اس طرح سے کرلیں، جس طرح سے کہ دُنیادار بادشاہوں کا اور دُنیادار حاکموں کا حال ہوا کرتا ہے کہ اپنی خواہشات کو پورا کرنا چاہتے ہیں چاہے لوگوں کے گلے ہی کٹوانے پڑیں، اور لوگوں کے مکانات ہی ڈھانے پڑیں، اور ان کے اُوپر بلڈوزر چلوانے پڑیں، یہ اپنی خواہشات کی رعایت رکھا کرتے ہیں۔ جو اللہ کا نبی ہو اور اللہ کا نیک بندہ ہو اس کو حکومت پر آنے کے بعد اس قسم کے جذبات نہیں رکھنے چاہئیں۔ اس میں یہ ضروری نہیں کہ حضرت داوٗد علیہ السلام کے جذبات ایسے ہوں، یہ ایک نصیحت کی جارہی ہے، جس طرح سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کرکے کہا جاتا ہے کہ آپ ان اہلِ کتاب کی خواہشات پر نہ چلیں لَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ (سورۂ مائدہ: ۴۸) اگر آپ ان کی خواہشات پر چلیں گے تو یہ ہوجائے گا (سورۂ بقرہ: ۱۲۰، ۱۴۵)۔ اس قسم کی آیات آتی ہیں، اسی طرح اگر آپ بھی شرک کریں گے تو آپ کے عمل حبط ہوجائیں گے (سورۂ زُمر: ۶۵) یہ بات محض ایک سمجھانے کے لئے ہوتی ہے، خطاب نبی کو ہے، سُنانا دُوسروں کو مقصود ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کو حکم دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے کہا تھا: طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ (سورۂ بقرہ: ۱۲۵) میرے گھر کو صاف ستھرا رکھو، تو اس کا یہ معنی نہیں کہ پہلے وہ صاف ستھرا نہیں تھا، بلکہ آئندہ کے لئے تاکید کرنی مقصود ہے۔ تو یہاں بھی حضرت داوٗد علیہ السلام کو یہ جو ہدایات دی جارہی ہیں، تو اس میں بھی تاکید کرنی مقصود ہے داوٗد علیہ السلام کے لئے بھی، اور بعد میں آنے والے لوگوں کے لئے بھی، کہ جو بھی زمین کے اندر حاکم ہو بادشاہ ہو، اس کو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کا نائب سمجھے اور لوگوں کے مقدمات اس کے سامنے آئیں تو ٹھیک ٹھیک فیصلہ کیا کرے، اور اپنی خواہشات کو دخل نہ دے، خواہشات کے پیچھے نہ لگے، کیونکہ خواہشات انسان کو اللہ کے راستے سے بھٹکا دیتی ہیں۔ لَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى: خواہش کی اتباع نہ کر، فَيُضِلَّكَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: یہ خواہش کی اتباع تجھے اللہ کے راستے سے بھٹکا دے گی۔ ھُدیٰ اور ھَویٰ یہ دونوں باتیں آپس میں متقابل ہیں، جو شخص متبع ہُدیٰ ہو وہ کبھی متبعِ ہویٰ نہیں ہوسکتا، جو متبعِ ہویٰ ہو وہ متبع ہُدیٰ نہیں ہوسکتا۔ اپنی خواہش کو چھوڑو، قواعد دیکھو، اللہ کا قانون دیکھو کہ کیا چاہتا ہے؟ اسی بات کی طرف سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے اس فرمان سے متوجہ کیا: ''لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ'' کوئی شخص تم میں سے کامل مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنی خواہش کو اس چیز کے تابع نہ کردے جو میں لے کے آیا ہوں۔[1] اگر خواہشات اَحکام کے تابع ہوجائیں گی کہ وہی چاہو جو اللہ چاہتا ہے، تب تو ٹھیک ہے، اور اگر اللہ کے قانون کی پروا نہ کرو، اپنی خواہشات کو سامنے رکھو گے، تو یقیناً سیدھے راستے سے بھٹک جاؤ گے۔ اِنَّ الَّذِيْنَ يَضِلُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: جو اللہ کے راستے سے بھٹک جاتے ہیں اُن کے لیے سخت عذاب ہے یومِ حساب کو بھول جانے کی وجہ سے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کے راستے سے بھٹکنا اور خواہش کی اتباع کرنا تبھی ممکن ہے جب انسان کو یومِ حساب یاد نہ رہے، اور اگر کوئی شخص یومِ حساب کو یاد رکھے، اس کو پتا ہو کہ میں نے اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے اور میرا محاسبہ ہوگا، تو پھر ایسے وقت میں انسان خواہشات کے پیچھے نہیں لگا کرتا، اِتباعِ شہوت ہوگی ہی تب جب انسان قیامت کو بھول جاتا ہے..... حقیقتاً بھول جائے یا حکماً بھول جائے،

(۱) مشکوٰۃ ۱/ ۳۰ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ، فصل ثانی، بحوالہ شرح السنۃ للبغوی۔

کیونکہ جو علم انسان کو ہو اور اس کے مطابق عمل نہ کیا جائے، تو ایسے ہی ہے جیسے علم ہے ہی نہیں، وہ علم نہیں ہوتا جہل ہی ہوتا ہے، جس کے اُوپر عمل مرتب نہ ہو، تو ایک آدمی کہتا ہے کہ میں آخرت کا قائل ہوں، جنت دوزخ کا قائل ہوں، محاسبے کا قائل ہوں، پھر بھی وہ کجی اختیار کرتا ہے، تو یوں سمجھو کہ اس کا ایمان ہی نہیں ہے، یہ علم نہ ہونے کے برابر ہے۔ تو ''یومِ حساب کو بھول جانے کی وجہ سے ان کو سخت عذاب ہوگا''، اگر یومِ حساب ان کو یاد ہوتا تو پھر یہ راستے سے نہ بھٹکتے اور اپنی خواہشات کی اتباع نہ کرتے۔

ماقبل سے ربط اور خلاصۂ آیات

اب یہاں چونکہ یومِ حساب کا ذِکر آ گیا، اسی مناسبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اگلی آیات میں آخرت کی یاددہانی کرائی ہے اور اس میں ایک حکمت کو واضح فرمایا ہے۔ وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا: نہیں پیدا کیا ہم نے آسمان کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں بے حکمت۔ باطل: بے کار، بے حکمت۔ بے مصلحت ہم نے ان کو پیدا نہیں کیا۔ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یہ خیال اُن لوگوں کا ہے جو کافر ہیں، کافر تو اس کائنات کی تخلیق کو بے مقصد ہی سمجھتے ہیں، لیکن اللہ نے ان کو بے مصلحت پیدا نہیں کیا۔ ''یہ خیال ہے اُن لوگوں کا جو کافر ہیں'' فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنَ النَّارِ: پس بربادی ہے کافروں کے لئے یعنی آگ۔ مِنَ النَّارِ یہ ویل کا بیان ہے۔ بربادی ہے اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے کُفر کیا یعنی آگ۔ اَمْ نَجْعَلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَالْمُفْسِدِيْنَ فِي الْاَرْضِ: کیا بنادیں گے ہم ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اُن لوگوں کی طرح؟ جو زمین میں فساد مچاتے ہیں، اَمْ نَجْعَلُ الْمُتَّقِيْنَ كَالْفُجَّارِ: یا بنادیں گے ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح؟ فُجّار: فاجر کی جمع ہے۔ جو اللہ سے ڈرنے والے ہیں ان کو فاجروں کی طرح بنادیں گے؟ كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ اِلَيْكَ مُبٰرَكٌ: یہ کتاب ہے ہم نے اس کو اُتارا آپ کی طرف، یہ برکت دی ہوئی ہے، مبارک ہے، برکت والی ہے۔ لِّيَدَّبَّرُوْا اٰيٰتِهٖ: تاکہ لوگ اس کی آیات میں تدبر کریں، وَلِيَتَذَكَّرَ اُولُوا الْاَلْبَابِ: اور تاکہ عقل والے نصیحت حاصل کریں...... آگے آرہا ہے حضرت سلیمان علیہ السلام کا واقعہ۔

یومِ حساب کے لئے ایک عقلی دلیل

ان آیات کا حاصل یہ ہے کہ جس یومِ حساب کا ذِکر آیا، اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اس کا آنا ضروری ہے، بہت ہی پیاری دلیل بیان فرمائی کہ اگر یومِ حساب نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ زمین آسمان اس کا کوئی اچھا نتیجہ نکلنے والا نہیں یہ مخلوق جتنی بھی پیدا کی، اللہ تعالیٰ نے یہ سارے کا سارا ایک کھیل ہی کھیلا ہے، جس طرح سے بچے کھیل کھیلتے ہیں، جس وقت جی بھر گیا، اس کو ختم کردیا، کوئی اس کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ تو زمین وآسمان کی تخلیق کیا کوئی کھیل کے طور پر ہوئی ہے؟ ہم کوئی لہو ولعب کے اندر تو مبتلا نہیں ہیں، لہو ولعب کے طور پر تو ان کو پیدا نہیں کیا گیا، بلکہ اللہ نے ان میں حکمت رکھی ہے، اور وہ حکمت یہی ہے کہ اس میں لوگ تدبر کرکے تفکر کرکے اللہ کی توحید کو اختیار کریں اور آخرت کا یقین لائیں، اگر آخرت ہونے والی نہیں جس طرح سے کافروں کا خیال ہے، کہ آخرت نہیں آئے گی اور یومِ حساب نہیں ہوگا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ دنیا کے اندر ایک شخص نے تو ایمان اور عمل صالح والی زندگی

اختیار کی، ہر بُرے کام سے بچتا رہا، اپنی خواہشات کو مٹاتا رہا، دوسروں کے حقوق کی رعایت رکھتا رہا، قدم قدم وہ سوچ سوچ کے اُٹھا رہا ہے اور پریشانی برداشت کر رہا ہے، جس طرح سے کہ ایمان اور عملِ صالح کی زندگی آپ دیکھتے ہیں کہ بہت ریاضت اور مجاہدے کی زندگی ہے، قدم قدم پر انسان کو محتاط رہنا پڑتا ہے، اپنی خواہشات کو چھوڑنا پڑتا ہے، ذمہ داریاں قبول کرنی پڑتی ہیں، ایمان اور عملِ صالح تو یہی ہے، حرام سے بچو، مکروہات سے بچو، یہ کام کرو، وہ نہ کرو، ایمان اور عمل صالح والے کی زندگی ایسے ہوتی ہے جس طرح سے کوئی شخص جیل میں ہو، کہ ہر وقت حکام کے اَحکام کی رعایت رکھنی پڑتی ہے، اپنی مرضی کے ساتھ کوئی کام نہیں کرسکتا۔ ایک نے تو ایسی زندگی گزاری، اور ایک نے اس قسم کی زندگی گزاری جس طرح سے کہ سانڈ کھلا پھر رہا ہے، جہاں چاہا منہ مارا، جدھر سے چاہا کھالیا، اور جب چاہا اپنی خواہش پوری کرلی، ایک نے زندگی ایسے گزاری، حرام حلال کی پروا نہیں کی، جس طرح سے آپ فساق اور فجار کو دیکھتے ہیں، اپنا پیٹ بھرنے کے لئے اگر ان کو کسی کا گوشت بھی کھانا پڑے تو کھا جاتے ہیں، اپنی پیاس بجھانے کے لئے یتیموں کا خون بھی پی جاتے ہیں، اور جو عیش وعشرت وہ چاہتے ہیں کرتے ہیں، اور اس کے لئے کوئی سیدھا راستہ اختیار نہیں کرتے، لوگوں کے خون پسینے کی کمائی رات کو اُڑا کر لے جاتے ہیں اور جا کے اس کے ساتھ عیش وعشرت کرتے ہیں، ایک آدمی نے ایسی زندگی گزاری۔ اور اگر آخرت آنے والی نہیں تو مرنے کے بعد دونوں برابر ہوگئے، تو پھر اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ انسان کو چاہیے کہ عیش کرے جس طرح سے بھی میسر ہو، پھر تو مفسدین والی زندگی اچھی معلوم ہوتی ہے کہ انسان دُنیا کے اندر کم از کم اپنی خواہشات تو پوری کرتا رہے، اور عیش وعشرت تو کرلے، اگر آخرت سامنے نہ آئے تو پھر تو مفسدین اور مؤمنین دونوں مرنے کے بعد برابر ہوجائیں گے، اور اللہ تعالیٰ کی حکمت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ مؤمنین اور مفسدین کو برابر ٹھہرائے، متقین اور فاجر نتیجے کے اعتبار سے برابر ہوجائیں، یہ اللہ کی حکمت کا تقاضا نہیں۔ یہ بہت ٹھوس دلیل ہے کہ ایک نے تو فسق وفجور کی زندگی گزاری، اپنی ہر خواہش کو پورا کیا، ظلم وستم کرکے اپنی لذت کو پورا کرتا رہا، اور ایک نے مجاہدے اور ریاضت کی زندگی گزاری، ایک شخص سردی کی راتوں میں گرم بستر میں پڑا رہتا ہے، وہ اُٹھتا ہی نہیں جس وقت تک کہ سورج اُونچا نہ ہوجائے، اور پوری طرح سے راحت آرام کا وقت نہ آجائے، کہ سردی چلی جائے، اور ایک ہے کہ بیچارہ صبح اُٹھتا ہے ٹھنڈے پانی سے وضو کرتا ہے، وضو کرنے کے بعد نماز پڑھتا ہے، سردی برداشت کرتا ہے، گرمی کے روزے رکھتا ہے، حرام حلال کی فکر رکھتا ہے، قدم قدم سوچ کر اُٹھاتا ہے، اور ایک نے بالکل لااُبالی زندگی گزاری، کھانے میں، پینے میں، رہنے سہنے میں، باقی خواہشات میں۔ تو مرنے کے بعد اگر کوئی نتیجہ سامنے آنے والا نہیں تو کامیاب زندگی تو پھر ان مفسدین کی ہے، کامیاب زندگی تو ان فجار کی ہے، تو پھر آپ کس طرح سے کہہ سکتے ہیں کہ اچھے لوگ یہ ہیں، اچھے تو پھر وہی ہیں جنہوں نے دُنیا میں اپنی خواہشات پوری کرلیں، اور کوئی عقل مند آدمی نہیں کہہ سکتا کہ نیک اور بد دونوں برابر ہیں، تو ان کا فرق جو نمایاں ہوگا مرنے کے بعد دوسرے جہان میں تو ہوسکتا ہے، ورنہ دُنیا کے اندر تو آپ دیکھیں گے کہ فاسق فاجر اس قسم کے لااُبالی قسم کے لوگ زیادہ عیش وعشرت میں مبتلا ہیں۔ تو یہ ایک عقلی دلیل ہے اس بات کی کہ کوئی نہ کوئی اگلا جہان آنا چاہیے جس میں جا کر فاسق فاجر اور مؤمن متقی کے درمیان میں فرق نمایاں ہو، اگر ان کے درمیان فرق نمایاں نہ ہو تو پھر اس دُنیا کے

اندر رہتے ہوئے حق باطل کی تقسیم کوئی تقسیم نہیں ہے، اچھائی بُرائی کی تقسیم کوئی تقسیم نہیں ہے، بلکہ انسان کو چاہیے کہ اپنی خواہشات پوری کرے جس طرح سے بھی ہو، پھر دُنیا کے اندر فساد ہی فساد ہوگا، دُنیا کے اندر کبھی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ حکمت ہے، اور اس حکمت کا پورا ہونا ضروری ہے، تو جو لوگ یومِ حساب کا عقیدہ نہیں رکھتے وہ سمجھتے ہیں کہ یہ کائنات ساری کی ساری بے حکمت ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ کہ ہم متقی اور فاجر کو، فاسق فاجر کو اور مؤمن صالح کو ایک کر دیں، ایسا نہیں ہوگا، دونوں کے درمیان میں فرق ہوگا، دُنیا میں رہتے ہوئے فرق نہیں ہوتا بلکہ یہاں تو یہ عیش وعشرت کرتے ہیں، تو لازمی بات ہے کہ مرنے کے بعد ایک اور جہان آئے گا جس جہان کے اندر جا کے ان دونوں کے درمیان میں فرق ہوگا، اسی بات کو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کے اندر واضح فرمایا جو حضور ﷺ پر اُتاری، تو لوگوں کو چاہیے کہ ان آیات میں تدبر کریں، اور عقل والوں کو چاہیے کہ اس سے نصیحت حاصل کریں، تو یومِ حساب کو یاد رکھو، جس وقت یومِ حساب یاد ہوگا تو پھر انسان خواہشات کی اتباع نہیں کرے گا، اور اس کا نتیجہ آخرت میں جا کے بالیقین اچھا سامنے آئے گا، تو یومِ حساب کی مناسبت سے یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ آخرت کے عقیدے کی بات کر دی، آگے پھر واقعہ آ گیا۔

سلیمان علیہ السلام کا تذکرہ اور اس کا مقصد

وَوَهَبْنَا لِدَاوٗدَ سُلَيْمٰنَ: اور ہم نے داؤد علیہ السلام کو سلیمان عطا کیا۔ سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ ہم نے عطا کیا داؤد کو سلیمان۔ نِعْمَ الْعَبْدُ: بڑا اچھا بندہ تھا سلیمان۔ نِعْمَ الْعَبْدُ هُوَ۔ الْعَبْدُ یہ نِعْمَ کا فاعل ہے، اور هُوَ مخصوص بالمدح نکالیں گے، یہ ضمیر لوٹے گی سلیمان کی طرف۔ سلیمان اچھا بندہ تھا۔ اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ: بے شک وہ بھی اللہ کی طرف رجوع کرنے والا تھا۔ مشرکین کے لئے اس میں بھی تنبیہ ہے کہ سلیمان علیہ السلام بادشاہ کے بیٹے، خود بادشاہ اور بہت عظیم الشان بادشاہ، لیکن اس بادشاہی میں آ کے وہ غرور میں مبتلا نہیں ہوئے، اکڑے نہیں، اور اللہ کے ہاں باغی نہیں ہوئے، بلکہ بہت اچھے بندے تھے۔ اور کسی شخص کا اس سے بڑھ کے کوئی کمال نہیں کہ اللہ کہہ دے کہ یہ بہت اچھا بندہ ہے، کیونکہ انسان کا کمال عبدیت میں ہی ہے، اور جب اس عبدیت کا اللہ تعالیٰ بھی اعتراف کر لے، کہ یہ بندہ میرا بڑا اچھا بندہ ہے، تو اس سے زیادہ اور تعریف کیا ہو سکتی ہے!! وہ بھی اللہ کی طرف رُجوع کرنے والے تھے۔ تو یہ لوگ جو تھوڑے سے سرمایے کے حاصل ہونے کے بعد سرکش ہو گئے، اللہ کے اَحکام کی پروا نہیں کرتے، اس لئے ان کو یہ سُنایا جا رہا ہے کہ جو سمجھدار ہوتے ہیں نیک فطرت ہوتے ہیں وہ تو بڑے سے بڑے بادشاہ بننے کے بعد بھی اللہ کی طرف ہی جھکتے ہیں اور اس کا شکر ادا کرتے ہیں، سورۂ نمل کے اندر بھی ان کے واقعات کی تفصیل آئی تھی۔

خلاصۂ آیات

اِذْ عُرِضَ عَلَيْهِ بِالْعَشِيِّ الصّٰفِنٰتُ الْجِيَادُ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب پیش کیے گئے سلیمان پر شام کے وقت۔ ''عشی'' کا

وقت زوال کے بعد کا وقت ہوتا ہے۔ الصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ: عمدہ گھوڑے۔ صافنات: صافن کی، اور جیاد: جواد کی جمع ہے، بہترین عمدہ گھوڑے اچھی نسل کے۔ فَقَالَ: سلیمان علیہ السلام نے کہا، اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ: خیر: سے مال مراد ہے۔ میں نے مال کی محبت کو اختیار کیا...... عَنْ ذِكْرِ رَبِّیْ: اس کا ترجمہ بھی دو طرح سے ہے۔ اپنے رَبّ کے ذِکر سے غافل ہوتے ہوئے، اپنے رَبّ کے ذِکر سے اِعراض کرتے ہوئے میں نے مال کی محبت اختیار کی۔[1] حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ: یہاں تک کہ وہ سورج پردے میں چھپ گیا۔ تَوَارَتْ کی ضمیر سورج کی طرف لوٹ رہی ہے۔ چونکہ عشی کے لفظ سے جو دِن کے آخری حصے کی طرف اشارہ ہے، تو اس سے ذہن سورج کی طرف خود بخود منتقل ہو جاتا ہے، کہ عشی کا وقت وہی ہوتا ہے جب سورج زوال کی طرف چلا گیا ہو، جب زوال کی طرف چلا گیا تو آگے اس کا چھپنا قریب ہوتا ہے، تو تَوَارَتْ کی ضمیر اُدھر لوٹ گئی۔ حتّٰی کہ وہ سورج پردے میں چھپ گیا۔ رُدُّوْهَا عَلَیَّ: ان گھوڑوں کو میرے اُوپر واپس لاؤ۔ رُدُّوْ یہ امر کا صیغہ ہے۔ اپنے خدام سے کہا: ان گھوڑوں کو مجھ پہ واپس لاؤ۔ فَطَفِقَ مَسْحًاۢ بِالسُّوْقِ وَالْاَعْنَاقِ: سُوق ساق کی جمع ہے، ساق پنڈلی کو کہتے ہیں، اور اعناق عُنُق کی جمع ہے، عُنق گردن کو کہتے ہیں۔ مَسْحًا: اس کا فعل محذوف ہے یَمْسَحُ مسحًا۔ پس وہ پنڈلیوں اور گردنوں پر ہاتھ صاف کرنے لگے۔ طفِق افعالِ شروع میں سے ہے۔ ہاتھ صاف کرنے سے مراد ہے کہ تلوار لے کر اُن کو مارنے لگ گئے، اُن کی گردنیں کاٹنے لگ گئے، اور ان کی کونچیں کاٹنے لگ گئے، یعنی وہ سارے کے سارے گھوڑے انہوں نے قتل کر دیے یا اللہ کے راستے میں قربان کر دیے۔

سلیمان علیہ السلام کے گھوڑوں کا واقعہ اور اس کی پہلی تفسیر

یہ ایک واقعہ نقل کیا حضرت سلیمان علیہ السلام کا جس میں ان کے اوّاب ہونے کا ذِکر ہے، کہ وہ اللہ کی طرف رُجوع کرنے والے تھے۔ جو ترجمہ آپ کے سامنے کیا گیا ہے، اس ترجمے کے تحت تفسیر یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے بہت سارے گھوڑے جہاد کے لئے رکھے ہوئے تھے، جیسے کہ صاحبِ حکومت کو ضرورت پیش آتی ہے جہاد کرنے کی، تو ان کو بھی جہاد کرنے کی ضرورت پیش آتی تھی، اور گرد کا فر حکومتیں تھیں، تو گھوڑے پال رکھے تھے، ان گھوڑوں کو ایک دفعہ معائنہ کے لئے انہوں نے سامنے منگوایا، گھوڑے دیکھ رہے تھے، دیکھنے میں کچھ اس طرح سے مشغول ہوئے، چونکہ مجاہد کے لئے گھوڑا ایک بہت محبوب سامان ہے، ان کو دیکھتے ہوئے، ان کا معائنہ کرتے ہوئے، وقت کے گزرنے کی طرف توجہ نہیں ہوئی، تو شام کو وہ کوئی نماز پڑھا کرتے تھے، جس طرح سے ہمارے ہاں عصر کی نماز ہے، اس کام میں لگنے کی وجہ سے حضرت سلیمان علیہ السلام کی وہ نماز قضا ہو گئی اور سورج چھپ گیا، دھیان نہیں آیا کہ میں نماز پڑھ لوں، جس وقت سورج چھپ گیا تو فوراً تنبہ ہوا کہ میں تو اللہ کے ذِکر سے غافل ہو گیا اس مال کی محبت میں، جب یہ خیال آیا تو فوراً ان گھوڑوں کو بلوایا، غیرت کے طور پر، جو گھوڑے اللہ کے ذِکر سے غفلت کا باعث بنے تھے، اُن کو

(۱) دوسرا ترجمہ "دوسری تفسیر" کے عنوان کے تحت دیکھیں۔

منگوایا اور جتنے تھے سب اللہ کے راستے میں قربان کردیے، یعنی اس غیرت میں آ کے کہ یہ اللہ سے غفلت کا باعث بنے ہیں تو ان سب کو اللہ کے راستے میں قربان کردیا، اس سے ان کی اَوّابیت نمایاں ہوئی کہ جو چیز اللہ کے ذِکر سے ان کو دُوسری طرف متوجہ کرنے والی تھی وہ رکھنی ہی گوارا نہیں کی، بلکہ وہ بھی اللہ کے راستے میں قربان کردی، گھوڑے سارے کے سارے قتل کردیے، ممکن ہے کہ ان کی شریعت کے اندر گھوڑے کی قربانی ہو، تو اللہ کے نام پہ سارے کے سارے قربان کردیے۔ اس ترجمے کے تحت تو اس کی تفسیر یہ ہے، اور اکثر مفسرین نے یہی اختیار کی ہے۔ اس میں یہی ظاہر کرنا مقصود ہے کہ دیکھو! وہ اللہ کے ایسے بندے تھے کہ اگر وقت پر ان کو اللہ کے ذِکر سے غفلت ہوگئی، تو چاہے کتنا مالی نقصان برداشت کیا، لیکن غیرت کے تقاضے کے تحت ان سب کو قربان کردیا، تو اللہ کو یاد کرنا اور وقت پر اللہ کی یاد میں مشغول ہونا ان کے نزدیک کتنا اہم تھا۔ اور نماز کا قضا ہونا چونکہ غیر قصدی تھا اس لئے ہم اس کو گناہ نہیں کہہ سکتے، کسی کام میں مشغول ہونے کی وجہ سے فرصت نہ ملے، جس طرح سے سرورِ کائنات ﷺ کی بھی غزوۂ خندق میں عصر کی نماز قضا ہوئی،(۱) کافروں نے اتنا موقع ہی نہیں دیا کہ آپ ﷺ نماز پڑھ لیتے، اسی طرح سے سہو اور نسیان ہوجائے، فجر کی نماز ایک دفعہ حضور ﷺ کی قضا ہوئی کہ آنکھ نہیں کھلی، بلال رضی اللہ عنہ کی ڈیوٹی لگائی تھی کہ ہمیں وقت پہ جگادینا، لیکن اُن کو بھی نیند آگئی، حدیث شریف میں یہ واقعہ آتا ہے، یہ سفر کا واقعہ ہے کہ سفرِ جہاد پر تھے، تھکے تھکائے رات کے آخری حصے میں لیٹ گئے، وقت پر آنکھ نہیں کھلی،(۲) اس قسم کے واقعات میں انسان معذور ہوتا ہے، یہ گناہ نہیں، بعد میں پھر اس کی تلافی کرلی جاتی ہے۔ تو حضرت سلیمان علیہ السلام کو بھی ایسے ہی معاملہ پیش آیا کہ جہاد کی کوئی مہم تھی، جس کی تیاری کے لئے وہ گھوڑوں کو دیکھ رہے تھے، اور یہ گھوڑے جہاد کا سامان ہیں، اور ادھر توجہ ایسی ہوئی کہ عبادت کا اور اللہ کی یاد کا جو وقت تھا وہ چُوک گیا، ذہن میں نہیں رہا حتیٰ کہ سورج غروب ہوگیا، تو پھر اس کی تلافی کے لئے انہوں نے اللہ کے سامنے توبہ اور اِستغفار بھی کی، اور اسی طرح سے گھوڑے بھی سارے کے سارے اللہ کے نام پر قربان کردیے۔ اکثر مفسرین نے تو اس کی تفسیر یوں کی ہے۔

دُوسری تفسیر

بعض نے دوسرا انداز اختیار کیا، دونوں باتیں ہی تفاسیر میں لکھی ہوئی ہیں، اس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام بادشاہ ہونے کے باوجود جہاد کی تیاری میں خود مشغول ہوتے تھے، جہاد کے سامان کی خود پڑتال کرتے، اسی ضرورت کے تحت انہوں نے اپنے اصطبل سے دیکھنے کے لئے گھوڑے منگوائے، تو جس وقت وہ گھوڑوں کو دیکھ رہے تھے، تو دیکھتے ہوئے یہ بات بھی کہہ رہے تھے کہ مجھے اس مال کے ساتھ محبت ہے لیکن اپنے رَبّ کے ذِکر کی وجہ سے، ان کے مال ہونے کی حیثیت سے نہیں، چونکہ یہ سامانِ جہاد ہے اس لئے مجھے ان کے ساتھ محبت ہے، محبت کا اظہار کررہے تھے، مجاہد کو اپنی تلوار سے محبت ہوتی ہے، اپنے

(۱) مَلأَ اللہُ بُیُوتَھُمْ وَقُبُورَھُمْ نَارًا شَغَلُونَا عَنِ الصَّلَاۃِ الْوُسْطٰی حَتّٰی غَابَتِ الشَّمْسُ (بخاری ۱/ ۴۱۰، باب الدعاء علی المشرکین)

(۲) مسلم ۱/ ۲۳۸، باب قضاء الصلاۃ الفائتۃ۔ مشکوۃ ج۱/ ۳۰۸، باب تاخیر الأذان فصل اول۔ نوٹ: غزوہ خیبر سے واپسی پر یہ واقعہ پیش آیا تھا۔

گھوڑے سے محبت ہوتی ہے، جس سامان کے ساتھ اس نے جہاد کرنا ہوتا ہے اس کے ساتھ محبت تو ہوتی ہے۔ ظاہر یہ کر رہے تھے کہ میرا قلب جو ان گھوڑوں کے ساتھ لگا ہوا ہے، اور ان سے جو میں محبت کر رہا ہوں، یہ کوئی دنیاداری نہیں، بلکہ یہ بھی رَبّ کی یاد کی کے لئے ان سے محبت کرتا ہوں، چونکہ جہاد بھی ایک عبادت ہے، محبت کا اظہار کیا اور محبت کا اظہار کرنے کے بعد وہ گھوڑے رُخصت کر دیے، جس وقت وہ گھوڑے آنکھوں سے غائب ہو گئے، تو اسی محبت کے تقاضے سے ان کو پھر واپس بلوایا، واپس بلوانے کے بعد پھر اُن کی کمر پر ان کی گردن پر اور ان کی کونچوں پہ ہاتھ پھیرنے لگے، جس طرح سے جانور رکھنے والے اپنے جانور کے ساتھ محبت کا اظہار کرتے ہوئے یوں ہی تھپکایا کرتے ہیں، گردن پر بھی ہاتھ پھیرتے ہیں، پنڈلیوں پر بھی ہاتھ پھیرتے ہیں، تو اس طرح سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے ان کے ساتھ محبت کا اظہار کیا، اس واقعہ میں ان کی اوابیت یوں نمایاں ہو جائے گی کہ جہاد کا ان کو کس طرح سے شوق تھا، اور سامانِ جہاد کے ساتھ وہ کس طرح سے محبت رکھتے تھے، اور جہاد بھی اللہ کے ذکر کے قائم کرنے کا ایک ذریعہ ہے تو حضرت سلیمان علیہ السلام کا اللہ کی یاد کا ذکر اس انداز سے آیا کہ جانوروں کے ساتھ بھی اگر وہ محبت کرتے تھے، تو اللہ کے ذِکر کی وجہ سے اور اللہ کی عبادت کے لئے کرتے تھے، ورنہ ان کا جانوروں کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ واقعہ اس انداز سے ذکر کیا گیا، جس میں یہ بات خاص طور پر سامنے آجاتی ہے، کہ چونکہ وہ گھوڑے جہاد کے لئے رکھے تھے، تو اُن کو قربان نہیں کیا، قتل نہیں کیا، بلکہ ان کے ساتھ محبت کا اظہار کیا، پھر ترجمہ یوں ہو جائے گا" جب پیش کئے گئے اُن پر شام کے وقت عمدہ جید گھوڑے، تو کہا سلیمان علیہ السلام نے "یعنی جب وہ گھوڑوں کا معائنہ کر رہے تھے اِنِّیْٓ اَحْبَبْتُ حُبَّ الْخَیْرِ میں نے مال کی محبت کو اختیار کیا ہے عَنْ ذِکْرِ رَبِّیْ اب اس ترجمے میں "عن" کو سببیہ بنائیں گے" اپنے رَبّ کی یاد کی وجہ سے"...... پہلے عَن کے اندر ہم نے اِعراض والا معنیٰ پیدا کیا تھا "اپنے رَبّ کے ذکر سے اعراض کرتے ہوئے میں نے مال سے محبت کی" جس میں ان کو پھر ندامت ہوئی۔ اب دوسری تفسیر کے مطابق یہ ندامت کی بات نہیں، بلکہ اب یہ اظہار کر رہے ہیں کہ اگر مجھے مال کے ساتھ محبت ہے تو اللہ کے ذِکر کی وجہ سے ہے، "عن" "سببیہ ہو گیا" "بے شک میں نے مال کے ساتھ محبت کی اللہ کے ذکر کی وجہ سے" حَتّٰی تَوَارَتْ بِالْحِجَابِ: یہاں تک کہ وہ گھوڑے نظروں سے غائب ہو گئے، تو تَوَارَتْ کی ضمیر یہ الصّٰفِنٰتُ الْجِیَادُ کی طرف چلی گئی، "حتّٰی کہ وہ گھوڑے نظروں سے غائب ہو گئے" تو سلیمان علیہ السلام نے اسی محبت کے لئے پھر ان کو بلا لیا، رُدُّوْهَا عَلَيَّ: خدام سے کہا کہ ان گھوڑوں کو میری طرف واپس لاؤ، جب گھوڑے واپس آئے تو طَفِقَ مَسْحًۢا: مَسْحًا مفعول مطلق ہے، اور فعل محذوف ہے، یہاں مَسْحًا قتل کرنے کے لئے نہیں، تلوار ہاتھ میں لے کر تلوار مارنے کے معنی میں نہیں کہ ہاتھ صاف کرنے لگے گھوڑوں پر، یعنی ان کو قتل کرنے لگ گئے، نہیں! بلکہ اب مطلب یہ ہو گا کہ ان کی گردنوں پر اور ان کی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرنے لگ گئے۔ یہ بھی اسی محبت کے اظہار کے لئے۔ یہ تفسیر بھی اختیار کی گئی ہے۔ اور پہلی تفسیر کی بنا زیادہ تر آثارِ منقولہ پر ہے، اور اس دُوسری تفسیر کے لئے بھی بنیاد موجود ہے، دونوں باتیں صحیح ہیں، جو بات بھی لے لی جائے ٹھیک ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا ثُمَّ اَنَابَ ﴿۳۴﴾ قَالَ رَبِّ
البتہ تحقیق ہم نے آزمائش میں ڈالا سلیمان کو اور ہم نے ان کی کرسی پر ایک جسد ڈال دیا، پھر وہ متوجہ ہوئے ﴿۳۴﴾ کہا انہوں نے اے میرے رب!
اغْفِرْ لِيْ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ﴿۳۵﴾
مجھے بخش دے اور مجھے عطا کر ایسا مُلک جو نہ مناسب ہو کسی کے لئے میرے بعد، بے شک تُو بہت عطا کرنے والا ہے ﴿۳۵﴾
فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ رُخَآءً حَيْثُ اَصَابَ ﴿۳۶﴾ وَالشَّيٰطِيْنَ كُلَّ بَنَّآءٍ
پس ہم نے مسخر کر دیا ان کے لئے ہوا کو، چلتی تھی ان کے حکم کے مطابق نرم نرم جہاں وہ پہنچنا چاہتے ﴿۳۶﴾ اور مسخر کر دیا ہم نے جنّات کو ہر عمارت بنانے والے کو
وَّغَوَّاصٍ ﴿۳۷﴾ وَّاٰخَرِيْنَ مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ ﴿۳۸﴾ هٰذَا عَطَآؤُنَا فَامْنُنْ اَوْ
اور غوطہ لگانے والے کو ﴿۳۷﴾ اور کچھ اور شیاطین جو جکڑے ہوئے تھے زنجیروں میں ﴿۳۸﴾ یہ ہماری عطا ہے پس تُو احسان کر یا
اَمْسِكْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۳۹﴾ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴿۴۰﴾
روک کے رکھ، بغیر کسی حساب کے ﴿۳۹﴾ بے شک اس سلیمان کے لئے ہمارے پاس البتہ قُرب ہے اور اچھا ٹھکانا ہے ﴿۴۰﴾

واقعۂ داؤد علیہ السلام کی ایک اور توجیہ

کل کے سبق میں حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے میں اس آیت کی شرح کرتے ہوئے کہ ظَنَّ دَاوٗدُ اَنَّمَا فَتَنّٰهُ، مختلف توجیہات کی تھیں کہ حضرت داؤد علیہ السلام کس طرح سے متوجہ ہوئے؟ وہ کون سی بات تھی جس کو حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے لئے آزمائش سمجھ لیا، اور اِستغفار کیا، اللہ کی طرف جھکے۔ ایک توجیہ اس میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ نے بھی نقل کی ہے، کل وہ بیان سے رہ گئی تھی، انہوں نے ''مستدرک حاکم'' کے حوالے سے حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کا ایک اثر نقل کیا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اپنے گھر والوں کے اوقات تقسیم کر رکھے تھے، اور اُن کا عبادت خانہ کسی وقت بھی اللہ کی یاد سے خالی نہیں ہوتا تھا، یعنی باری باری اس میں داخل ہوتے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے، جو اُن کی شریعت کے مطابق تھی جس طرح سے اللہ کا حکم تھا، تو ایک دفعہ حضرت داؤد علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے اس انتظام کو یوں ذکر فرمایا کہ یا اللہ! دیکھو، میں نے کیسا اچھا انتظام کر رکھا ہے، کہ میرا گھر کبھی بھی تیری یاد سے خالی نہیں ہوتا، کوئی نہ کوئی شخص تیری یاد میں ضرور لگا ہوا ہوتا ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام بھی آخر بشر ہی ہوتے ہیں، سہو نسیان اور بعض چیزوں کی بھول چوک انسان کا خاصہ ہے، ''نَسِيَ اٰدَمُ فَنَسِيَتْ ذُرِّيَّتُهٗ''(۱) تو بعض پہلو گفتگو میں بسا اوقات زیرِ نظر نہیں رہتے، اس گفتگو میں حضرت داؤد علیہ السلام کا انداز کچھ ایسا ہو گیا گویا کہ وہ اپنے

(۱) ترمذی ۲/ ۱۳۸، کتاب التفسیر، سورۂ اعراف۔ مشکوٰۃ ۱/ ۲۳، باب الایمان بالقدر، فصل ثالث۔

حُسنِ انتظام کے اُوپر فخر کر رہے ہیں، گویا فاخرانہ اَنداز میں کہا کہ دیکھو! میں نے کیسا اچھا انتظام کر رکھا ہے کہ ہر وقت تیری یاد ہوتی ہے، کسی وقت بھی میرا عبادت خانہ تیری یاد سے خالی نہیں ہوتا۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ داؤد! یہ سب میری توفیق کی وجہ سے ہے، اگر میں حفاظت اُٹھالوں تو تُو اِنتظام برقرار نہیں رکھ سکتا، تو میں کسی دِن تجھے آزمائش میں ڈالوں گا اور اپنی حفاظت اُٹھالوں گا، پھر دیکھوں گا کہ تُو یہ انتظام کس طرح سے بحال رکھتا ہے؟ چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ ایک دِن حضرت داؤد علیہ السلام کا نمبر تھا، اور اس عبادت خانے میں عبادت کرنے کا وقت تھا، اور یہ صورت پیش آگئی جس کی تفصیل آپ کے سامنے گزری ہے، تو حضرت داؤد علیہ السلام فوراً متوجہ ہوئے اپنی اس بات کی طرف جو ان کی زبان سے نکلی تھی، اور اسی لغزش کے اُوپر انہوں نے توبہ اور اِستغفار کی۔ مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ نے یہ توجیہ کی ہے، اور صاحبِ ''قصص القرآن'' نے بھی اسی کو اَصح قرار دیا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادتِ شریفہ ہے کہ جس وقت کوئی بندہ نیکی کا کام کرے اور پھر اُس کو اللہ کی توفیق کی طرف منسوب کرے، کہ یا اللہ! تُو نے مجھے توفیق دی، تو اللہ تعالیٰ بندے کی مدح کرتا ہوا اس کام کو بندے کی طرف منسوب کرتا ہے، کہ میرے بندے! تُو نے یہ کام کیا۔ اور اگر کوئی بندہ اپنی طرف نسبت کرتا ہے کہ یا اللہ! میں نے یہ کام کیا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب ملتا ہے کہ بندے! میں نے تجھے توفیق دی۔ تو اسی انداز کی لغزش حضرت داؤد علیہ السلام سے ہوئی، کہ انہوں نے اپنے حُسنِ انتظام کو اللہ تعالیٰ کی توفیق قرار دینے کی بجائے ظاہری الفاظ میں اپنی طرف اس کو منسوب کرلیا، اور اللہ تعالیٰ کی یہ عادت ہے کہ اپنے مقبول بندوں کی ذرا ذرا لغزش کے اُوپر گرفت فرماتے ہیں، جو ان کے قُرب اور اعلیٰ درجہ پر ہونے کی دلیل ہوتی ہے، تو اسی وجہ سے حضرت داؤد علیہ السلام کو آزمائش میں ڈال دیا گیا، اور حضرت داؤد علیہ السلام اپنے اس انتظام کو بحال نہ رکھ سکے، تب اُن کو اپنی اس بات کی طرف توجہ ہوئی، کہ جو بات میرے منہ سے نکلی تھی اس کی بنا پر آج میرے لیے یہ فتنہ پیش آگیا۔ اس تفسیر کی بنا چونکہ ایک اثر صحیح پہ رکھی گئی ہے اس لئے بعض حضرات اسی تفسیر کو اَولیٰ قرار دیتے ہیں۔ باقی تفصیلات آپ کے سامنے کل عرض کردی گئی تھیں۔

خلاصۂ آیات

وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ: البتہ تحقیق ہم نے آزمائش میں ڈالا سلیمان علیہ السلام کو، وَاَلْقَيْنَا عَلٰى كُرْسِيِّهٖ جَسَدًا: اور ہم نے سلیمان علیہ السلام کی کُرسی پر ایک جسد ڈال دیا۔ جسد سے دھڑ مراد ہے، بظاہر ایسے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے بے جان ہو۔ ثُمَّ اَنَابَ: پھر سلیمان علیہ السلام متوجہ ہوئے، قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِيْ: کہا سلیمان علیہ السلام نے کہ اے میرے رَبّ! مجھے بخش دے۔ وَهَبْ لِيْ مُلْكًا: اور مجھے عطا کر ایسا ملک، لَّا يَنْۢبَغِيْ لِاَحَدٍ مِّنْۢ بَعْدِيْ: جو نہ مناسب ہو کسی کے لئے میرے بعد، اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ: بے شک تو بہت عطا کرنے والا ہے۔ فَسَخَّرْنَا لَهُ الرِّيْحَ: پس ہم نے مسخر کردیا اس کے لئے ہوا کو، تَجْرِيْ بِاَمْرِهٖ: چلتی تھی اس کے حکم کے مطابق، رُخَآءً: نرم نرم، حَيْثُ اَصَابَ: جہاں وہ پہنچنا چاہتے۔ وَالشَّيٰطِيْنَ: اور مسخر کردیا ہم نے جنات کو۔ شیاطین سے جنات مراد ہیں۔ مسخر کردیا ہم نے اس کے لئے شیاطین کو، جنات کو، كُلَّ بَنَّآءٍ وَّغَوَّاصٍ: ہر عمارت بنانے والے کو اور غوطہ لگانے والے کو، غاصَ يَغُوْصُ: گھسنا۔ اور غواص: غوطہ لگانے والا۔ بَنَّآءٍ: عمارت بنانے والا۔ یہ سورت سبا میں تفصیل آئی تھی کہ وہ جنات سمندر میں غوطے لگا کر موتی بھی نکالتے تھے، اور اسی طرح وہ

عمارات بھی بناتے تھے، کیا کیا چیزیں بناتے تھے اس کی تفصیل بھی سورۂ سبا میں آگئی تھی۔ وَاٰخَرِيْنَ: اور کچھ اور شیاطین مُقَرَّنِيْنَ فِي الْاَصْفَادِ: جو جکڑے ہوئے تھے زنجیروں میں۔ اَصفاد صَفَد کی جمع ہے، صفد: زنجیر کو کہتے ہیں۔ هٰذَا عَطَآؤُنَا: یہ ہماری عطا ہے۔ فَامْنُنْ اَوْ اَمْسِكْ: پس تُو احسان کر، یا روک کے رکھ۔ بِغَيْرِ حِسَابٍ: اس کا تعلق هٰذَا عَطَآؤُنَا کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے، یہ ہماری عطا ہے بغیر کسی حساب کے، یعنی بے شمار ہم نے تجھے عطا کردی، اس کا مدار محاسبۂ اعمال پر نہیں ہے کہ جیسے کسی کا عمل ہو ویسے اس کو عطا کی جائے، بلکہ یہ بغیر کسی حساب کے ہے۔ اور آگے پھر دو اختیار ذِکر کردیے کہ تُو چاہے احسان کر، ہماری اس عطا کے ساتھ مخلوق کو فائدہ پہنچا، احسان کر، یا تو اس کو روک کے رکھ، یعنی تُو اَب اس میں تصرف کرسکتا ہے، باقی آگے مخلوق پر احسان کرو گے تو اور اجر وثواب ملے گا، روک کے رکھو گے تو اللہ کے سامنے جواب دہی ہوگی، اُمْنُنْ اور اَمْسِكْ دونوں باتیں ذِکر کردی گئیں، باقی ان میں سے کون سا اچھا طریقہ ہے؟ اس کو آپ نے اپنے عقل وفہم کے مطابق اختیار کرنا ہے، چنانچہ حضرت سلیمان علیہ السلام ان خزانوں سے خود فائدہ نہیں اُٹھاتے تھے بلکہ مخلوق کو ہی فائدہ پہنچایا، یعنی اُمْنُنْ پر عمل کیا، اَمْسِكْ پر عمل نہیں کیا، روک کے نہیں رکھا بلکہ مخلوق کے اُوپر خرچ کیے، تو بِغَيْرِ حِسَابٍ کا تعلق هٰذَا عَطَآؤُنَا کے ساتھ ہوگیا ''ہماری یہ بے شمار عطا ہے جو ہم نے آپ کو دے دی۔'' اور بِغَيْرِ حِسَابٍ کا تعلق اُمْنُنْ اور اَمْسِكْ کے ساتھ بھی لگایا گیا ہے، تو احسان کر مخلوق پر یا روک کے رکھ، تُو محاسب نہیں ہے، تجھ سے حساب نہیں لیا جائے گا، بغیر حساب کے ہم نے تجھے یہ دے دی، اگر لوگوں کے ساتھ آپ اچھا برتاؤ کریں گے یا روک کے رکھیں گے، اللہ نے آپ کو اس میں مالکانہ تصرف دے دیا، اللہ تعالیٰ اس کا حساب آپ سے نہیں لے گا کہ آپ نے کیا کیا، کیا نہیں کیا۔ مفسرین نے اس کا یہ مفہوم بھی بیان کیا ہے (مظہری)۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ: بے شک اس سلیمان کے لئے ہمارے پاس البتہ قرب ہے اور اچھا ٹھکانا ہے۔

تفسیر

سلیمان علیہ السلام کی آزمائش کا واقعہ، اور محققین کا مسلک

یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کے واقعے کا تتمہ ہے۔ پہلے الفاظ جو آپ کے سامنے آئے کہ ہم نے سلیمان علیہ السلام کو آزمائش میں ڈال دیا، اور ان کی کُرسی کے اُوپر ایک جسد ڈال دیا، اس ''جسد'' سے کیا مراد ہے؟ اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو کیا فتنہ پیش آیا؟ اس میں بھی مفسرین کی مختلف آرا ہیں، قرآنِ کریم میں اس کی تفصیل نہیں بتائی گئی کہ وہ فتنہ کیا تھا؟ اور وہ جسد کیا تھا؟ جس کو کُرسی کے اُوپر ڈال دیا گیا، اور صحیح احادیث میں بھی اس آیت کو عنوان بنا کے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی بات بطورِ تفسیر کے فرمائی ہو، ایسا بھی نہیں ہے، اس لئے یہاں بھی محققین نے مسلک کچھ ایسے ہی اختیار کیا کہ جب اللہ تعالیٰ نے اس بات کو مبہم رکھا ہے، اور اس کی تفصیل ہمارے سامنے ذِکر نہیں کی، تو ہمیں بھی اس کے درپے نہیں ہونا چاہیے، کوئی آزمائش تھی جو حضرت سلیمان علیہ السلام کو پیش آئی، اور اُن کی کُرسی اور اُن کا عرش، اُس کے اُوپر کوئی دھڑ بے جان ڈال دی گئی، تفصیلات اللہ بہتر جانتے ہیں، جب ہمارے سامنے تفصیل نہیں کی

گئی تو ہم اس کے درپے نہیں ہوتے، جس چیز کو اللہ نے مبہم رکھا ہے، ہم بھی اس کو مبہم ہی رکھیں، سلامتی اسی میں ہے، اپنی طرف سے کوئی بات نہ کہیں، جس طرح سے حضرت داؤد علیہ السلام کے واقعے میں بھی یہی صورت اختیار کی گئی تھی۔

اِسرائیلی خرافات اور بعض مفسرین کی بے اِحتیاطی

اور بعض حضرات نے کچھ واقعات کے ساتھ اس فتنے کی تفصیل کی ہے، اور تفصیل کرتے ہوئے ایک طرز تو وہی اسرائیلیوں کا ہے، جیسے حضرت داؤد علیہ السلام کے بارے میں انہوں نے مختلف واقعات بیان کئے افسانہ نگاری کے طور پر، جو انبیاء علیہم السلام کی شان کے مناسب نہیں ہیں، اپنی عادت کے مطابق جس طرح سے ایک افسانہ بنایا جاتا ہے تو اس طرح سے وہ واقعات افسانوی انداز کے تھے، حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق بھی ایسے ہی واقعات اسرائیلی کتابوں میں موجود ہیں، اور اُنہی واقعات کو بے احتیاطی کے ساتھ بعض مفسرین نے اُٹھا کے اس آیت کی تفسیر میں لکھ دیا، آپ "جلالین" کے حاشیے میں پڑھیں گے، وہ واقعہ مذکور ہے، اور دُوسری کتابوں میں بھی ہے، "خازن" وغیرہ میں، لیکن محققین کے نزدیک اس واقعے کو اس آیت کی تفسیر بنانا کسی اعتبار سے بھی دُرست نہیں ہے، بنی اسرائیل حضرت سلیمان علیہ السلام کو پیغمبر نہیں سمجھتے بلکہ وہ ایک بادشاہ سمجھتے ہیں، اس لئے انہوں نے اس معاملے میں بے احتیاطی کی، وہ تو انبیاء علیہم السلام کے سلسلے میں بھی محتاط نہیں ہیں، بدکاری تک کے واقعات وہ انبیاء کی طرف منسوب کردیتے ہیں نعوذ باللہ! تو جب کسی کے متعلق اُن کا نبی ہونے کا عقیدہ ہی نہ ہو، محض اس کو بادشاہ ہی سمجھیں، تو وہ اس بارے میں کیا احتیاط کرسکتے ہیں، اور ہمارے ہاں تو قرآنِ کریم کی صراحت کے ساتھ حضرت سلیمان علیہ السلام پیغمبر ہیں، معصوم پیغمبر ہیں، اللہ تعالیٰ کے ہاں ان کو قرب حاصل ہے، بہت بڑی تعریف ہے جو اللہ نے ان کی کی، نِعْمَ الْعَبْدُ: سلیمان بڑا اچھا بندہ تھا۔ تو کوئی ایسا واقعہ اُن کی طرف منسوب کرنا مناسب نہیں۔

اسرائیلی روایات میں تو یوں ذِکر کیا گیا ہے، کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی ایک انگوٹھی تھی جس میں تسخیر کی تاثیر تھی، اس لئے عام طور پر لوگ "نقشِ سلیمانی" کا ذِکر کیا کرتے ہیں، سلیمان علیہ السلام کی انگوٹھی کا تذکرہ تفسیروں میں آتا ہے، تو انگوٹھی کے اندر تسخیر تھی، وہ سلیمان علیہ السلام کے پاس رہتی تو جن بھی ان کے مسخر تھے، پرندے بھی، اور ہر چیز ان کی مسخر ہوتی تھی، ایک دفعہ حضرت سلیمان علیہ السلام وہ انگوٹھی اپنی بیوی "جرادہ" یا اُمِّ ولد "امینہ" کے سپرد کر کے کہیں گئے تو کوئی جن سلیمان علیہ السلام کی شکل میں آگیا، اور آ کے اس نے وہ انگوٹھی لے لی، جب انگوٹھی لے لی تو وہ سارے کے سارے اسی جن کے مسخر ہوگئے اور حضرت سلیمان علیہ السلام بغیر تسخیر کے رہ گئے، اور اس نے آکر تخت پر قبضہ کرلیا، سلیمان علیہ السلام کی کرسی پہ آکر بیٹھ گیا، اور اس نے حکومت کرنی شروع کردی، بڑے لمبے لمبے قصے ہیں، پھر انگوٹھی اس سے کہیں گم ہوگئی، دریا میں گری، مچھلی نے کھائی، وہ مچھلی سلیمان علیہ السلام کے پاس آئی، تو سلیمان علیہ السلام کو دوبارہ وہ انگوٹھی ملی، انگوٹھی ملنے کے ساتھ پھر دوبارہ حکومت ان کے ہاتھ میں آئی (جلالین، ابن کثیر، قرطبی)۔ اس قسم کی خرافات کثرت کے ساتھ اسرائیلی روایات میں موجود ہیں، اور اسی کے کچھ حصے ہمارے بعض مفسرین نے اپنی تفسیروں میں نقل کردیے، چونکہ وہ واقعہ

اسرائیلی کتابوں میں مذکور ہے، اور وہ سمجھتے ہیں کہ یہاں آزمائش کا ذکر ہے، تو شاید یہ آزمائش یہی ہو جو حضرت سلیمان علیہ السلام پر ڈالی گئی تھی، لیکن محققین مفسرین اس کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔

''وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ'' کی دُوسری تفسیر صحیح حدیث سے

البتہ صحیح روایات میں ایک واقعہ موجود ہے، ''بخاری شریف'' میں کئی جگہ موجود ہے، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے انبیاء علیہم السلام کے واقعات بیان کرتے ہوئے حضرت سلیمان علیہ السلام کا یہ واقعہ ذکر کیا ہے، اگرچہ اس روایت میں یہ عنوان اختیار نہیں کیا گیا کہ وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ کی تشریح کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ واقعہ بیان کیا ہو، لیکن بعض مفسرین نے اُس واقعے کو اِس آیت کے ضمن میں ذکر کر کے اِس آیت کی تشریح اُس واقعے کے ساتھ کی ہے، ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہی واقعہ ذِکر کیا، ''فوائدِ عثمانی'' میں حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی نے یہی واقعہ ذِکر کیا۔ اس واقعے کا حاصل یہ ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام نے ایک دفعہ مجلس میں یہ قسم کھائی کہ میں اپنی بیویوں کے پاس جاؤں گا اور وہ ساری کی ساری حاملہ ہوں گی، اور وہ شہسوار جنیں گی جو اللہ کے راستے میں جہاد کریں گے، دِل میں اس وقت کچھ خیال بھی آیا، جس طرح سے فرشتہ کسی بات کو اِلقاء کرتا ہے قلب میں، کہ ''ان شاء اللہ'' کہہ لیجئے، اللہ کی مشیت کا تذکرہ کر لیجئے، لیکن حضرت سلیمان علیہ السلام سے یہ سہو ہو گیا کہ انہوں نے اپنی زبان سے ''ان شاء اللہ'' نہیں کہا، اور بارہا آپ کے سامنے یہ بات واضح کر دی گئی کہ انبیاء علیہم السلام کی بہت معمولی معمولی لغزشیں اللہ تبارک وتعالیٰ پکڑتے ہیں، اور اس کے اُوپر ان کو تنبیہ بھی ہوتی ہے، جس پر وہ توبہ اِستغفار کرتے ہیں، جس سے ان کے درجات مزید بلند ہوتے چلے جاتے ہیں اور اُن کی شان نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اُن کا قرب زیادہ نمایاں ہوتا ہے، کہ اُن کی معمولی سے معمولی لغزش کو بھی رہنے نہیں دیا جاتا، بلکہ اس کو صاف کر دیا جاتا ہے۔ بہرحال نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اپنی بیویوں کے پاس گئے، لیکن ان میں سے سوائے ایک عورت کے کوئی بھی حاملہ نہ ہوئی، اور جو حاملہ ہوئی اس نے بھی بچہ جو تھا، اسقاط جس طرح سے ہو جایا کرتا ہے، قبل از وقت وضع کر دیا، اور وہ بے جان تھا، مردہ بچہ جنا۔[1] تو یہ بات چونکہ مجلس میں ہوئی تھی، اس لیے پتا تو سب کو تھا، تو ''قابلہ'' یعنی دایہ جو تھی وہی مردہ بچے کو لائی، اور لا کر سلیمان علیہ السلام کے سامنے اُن کے تخت پر رکھ دیا، اور کہا کہ لو! آپ کی قسم کا یہ نتیجہ ہے، اس وقت حضرت سلیمان علیہ السلام کو تنبہ ہوا کہ میں نے جو اس بات کو ایسے کہہ دیا تھا، اور اللہ کی مشیت کی طرف اُس کو منسوب نہیں کیا یہ اُس کی سزا ملی ہے، اس کی وجہ سے یہ بے برکتی ہوئی، تو تب انہوں نے توبہ کی اور استغفار کیا، اللہ تبارک وتعالیٰ سے معافی مانگی۔ تو یہاں آزمائش میں ڈالنے کا مطلب یہی ہے کہ جو ارادہ انہوں نے کیا تھا پورا نہ ہوا، ان کی مراد سامنے نہ آئی، بلکہ یہ صورتِ حال سامنے آ گئی کہ ایک ہی بچہ پیدا ہوا، اور وہ بھی بے جان، تو جَسَدًا سے یہاں وہی بے جان بچہ مراد ہے جو کہ دایہ نے، قابلہ نے لا کر اُن کے سامنے ان کے تخت پر رکھ دیا تھا۔ تب وہ متوجہ ہوئے اور ''ان شاء اللہ'' نہ کہنے کی بنا پر انہوں نے

(۱) بخاری ۲/ ۹۹۳ باب الاستعفاء فی الایمان۔ نیز ۱/ ۳۹۵۔ ۱/ ۴۸۷۔ ۲/ ۹۸۲۔ ۲/ ۹۸۹۔ حدیث کا مضمون یہاں تک ہے آگے مفسرین کا مضمون ہے۔

توبہ کی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے معافی مانگی۔ حضرت سلیمان علیہ السلام کی بیویاں کتنی تھیں؟ اس کے بارے میں روایات مختلف ہیں، کم سے کم ساٹھ کا ذکر ہے، اور زیادہ سے زیادہ ۱۰۰ کا ذکر بھی ہے۔[۱] اور شاید غیر صحیح روایات میں اس سے بھی زیادہ مذکور ہوں۔

مودودی صاحب نے اپنی عادت کے مطابق صحیح حدیث کا مذاق اُڑایا

مودودی صاحب نے اس روایت کو ذکر کر کے اپنی عادت کے مطابق اس کا خوب مذاق اُڑایا ہے۔ پہلے تو اس روایت کی توثیق کی کہ فلاں فلاں کتاب میں مذکور ہے، بالکل صحیح روایت ہے، اور بعد میں اِس کے مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''سند کے زور سے اس قسم کی روایت کو گلے سے اُتارنے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔'' پہلے پہلے یہ تفسیر کا جزء ان کا شائع ہوا ان کے ''ترجمان القرآن'' میں، تو اس میں میں نے پڑھا تھا، بعد میں ''تفہیم'' کے اندر بھی یہ مضمون موجود ہے لفظوں کے فرق کے ساتھ۔ بہرحال پھر وہ حساب لگانے بیٹھ گئے، کہ اگر کم سے کم بیویوں والی روایت لی جائے کہ ساٹھ بیویاں تھیں، تو حساب لگاؤ کہ ایک بیوی کے پاس جانے کے لئے کتنے وقت کی ضرورت ہوتی ہے؟ اور رات کتنی لمبی ہوسکتی ہے؟ زیادہ سے زیادہ رات بارہ گھنٹے لمبی ہوگی، سورج غروب ہونے سے لے کے سورج کے طلوع ہونے تک، اور اگر ساٹھ بیویاں ہوں تو ایک گھنٹے میں پانچ بیویوں کے پاس جانا پڑے گا، اور ایک ایک بیوی کے حصے میں کتنے منٹ آئے؟ تو کیا ایک اللہ کا نبی سورج کے چھپتے ہی سورج کے طلوع ہونے تک اسی شغل میں لگا رہا؟ اس انداز کے ساتھ اس روایت کا انہوں نے مذاق اُڑایا اور اس کو بالکل رَدّ کر دیا۔ اس وقت میرے پاس ''تفہیم القرآن'' کی وہ جلد نہیں ہے، معلوم نہیں کہیں گم ہوگئی، کُتب خانے میں بھی موجود نہیں، ورنہ وہ عبارت میں آپ کو پڑھ کے سُناتا،[۲] جس سے خبثِ باطن نمایاں ہے، کہ احادیث کی عظمت کو کس طرح سے مجروح کیا جاتا ہے، جبکہ پہلے سارے کا سارا زور بھی لگایا ہے کہ یہ روایت صحیح ہے۔

مذکورہ حدیث روایۃً اور درایۃً دُرست ہے

حالانکہ جب سے یہ روایات سامنے آئیں، شُراح ان روایات کی تشریح کرتے ہیں، کوئی مخفی بات نہیں ہے، ''مشکوٰۃ'' میں یہ روایت موجود ہے،[۳] بخاری میں کئی جگہ آئی ہوئی ہے، کم از کم تین جگہ تو ہے، علماء اس کو ہمیشہ پڑھتے رہتے ہیں، اس کے ساتھ ساتھ اس کی تشریح بھی کرتے رہتے ہیں، لیکن کبھی اس قسم کے استحالے پیش نہیں آئے، اور ذہن کے اندر یہ اُلجھنیں پیش نہیں آئیں جس قسم کی مودودی صاحب کو پیش آگئیں، بنیادی طور پر بات یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو اپنے اُوپر قیاس کر لینا اور ان کے

---

(۱) بخاری ۲/ ۱۱۱۳ پر ساٹھ کا ذکر ہے۔ ۱/ ۴۸۷ پر ستر کا ذکر ہے۔ ۲/ ۹۸۲ پر نوّے کا ذکر ہے۔ اور ۲/ ۸۸۷ پر ۱۰۰ کا ذکر ہے۔

(۲) ''تفہیم القرآن'' کی عبارت یوں ہے: ''ایسی روایات کو محض صحتِ سند کے زور پر لوگوں کے حلق سے اُتروانے کی کوشش کرنا دین کو مضحکہ بنانا ہے۔ ہر شخص خود حساب لگا کر دیکھ سکتا ہے کہ جاڑے کی طویل ترین رات میں بھی عشاء اور فجر کے درمیان دس گیارہ گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا۔ اگر بیویوں کی کم سے کم تعداد ۶۰ ہی مان لی جائے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت سلیمان علیہ السلام اس رات بغیر دَم لیے فی گھنٹہ ۶ بیویوں کے حساب سے مسلسل دس گھنٹے یا گیارہ گھنٹے مباشرت کرتے چلے گئے۔ کیا یہ عملاً ممکن بھی ہے؟ الخ''

(۳) مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۸، باب بدء الخلق وذکر الانبیاء، فصل اول۔ بخاری کے حوالے گزر چکے۔ نیز مسلم ۲/ ۴۹، باب الاستثناء۔ ترمذی ۱/ ۲۸۰، باب فی الاستثناء فی الیمین

معاملات کو اپنے اُوپر قیاس کر کے ناپنا تولنا شروع کر دینا یہی خرابی ہے، جس سے پھر بہت ساری باتوں میں پیچیدگی پیش آ جاتی ہے، حالانکہ انبیاء علیہم السلام کے واقعات کو اپنے پیمانوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔

واقعۂ معراج سے تائید

جس وقت سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا واقعۂ اِسراء اور واقعۂ معراج بیان کیا تھا، کہ میں مکہ معظمہ سے بیت المقدس گیا، وہاں یہ واقعات پیش آئے، بیت المقدس سے آسمان پہ گیا وہاں یہ واقعات پیش آئے، اور رات کو واپس بھی آ گئے، تو مشرکینِ مکہ کی سمجھ میں بھی تو یہ بات نہیں آتی تھی کہ مکہ معظمہ سے قافلہ چلتا ہے تو ایک مہینے میں بیت المقدس پہنچتا ہے، مہینہ جانے میں لگے اور مہینہ آنے میں لگے، تو یہ شخص کس طرح سے کہتا ہے، کہ میں رات کو گیا اور رات کو ہی واپس آ گیا، اُن کو یہ تیز رفتاری سمجھ میں نہیں آتی تھی، چونکہ اس کو اپنے اُوپر ہی قیاس کرتے تھے کہ ہم تو ایسا نہیں کر سکتے، تیز سے تیز سواری بھی لے لیں، تو ایک مہینے سے کم نہیں لگتا، اور یہ رات کو گئے اور رات کو ہی واپس کس طرح سے آ گئے؟ لیکن آنے والے حالات نے یہ تیز رفتاری کی جو صورتِ حال ہمارے سامنے نمایاں کی ہے، اس کے بعد اس کا اِمکان ثابت ہو گیا، کہ تیز رفتاری کی حد ہی کوئی نہیں، جو چیز مہینوں میں طے ہوتی تھی وہ منٹوں میں طے ہو سکتی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ تو اپنے انبیاء علیہم السلام کو معجزے کے طور پر بہت ساری چیزیں عطا فرماتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے تو کوئی بات مشکل ہی نہیں، جس طرح سے معراج کا واقعہ پیش آیا کہ اگر کوئی شخص ظاہری اسباب کے طور پر اس کو اِختیار کرتا، تو برس خرچ ہوتے، اور سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے سارے کا سارا سفر، جانا اور آنا، اور پورے کے پورے واقعات چند لمحوں میں دیکھ لیے، یعنی دُنیا والوں کے نزدیک وہ چند لمحے تھے، اور آپ کے نزدیک یہ سارا کا سارا کتنا لمبا سفر تھا؟ اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام کسی کام کو کریں، وقت اس کے اُوپر پورا لگے، لیکن اس دُنیا کے وقت کے اندر یہ وسعت نکال لی جائے، بظاہر دیکھنے میں وقت کم خرچ ہوا لیکن حقیقت میں کام پورے کا پورا ہو گیا، تو انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کے واقعات اس قسم کے بہت ہیں اور کتابیں بھری پڑی ہیں۔ تو نبی کے واقعے کو اپنے اُوپر قیاس کر کے اس طرح سے پھبتیاں کسنا یہ دِین داری نہیں ہے، یہ دِل کے اندر عظمت نہ ہونے کی علامت ہے، حدیث کی عظمت نہیں اور کُتبِ حدیث کی کوئی عظمت نہیں جس کی بنا پر یوں نشتر چلانے شروع کر دیے جاتے ہیں، یہ مناسب نہیں ہے۔

اولیاء اللہ کے حیرت انگیز اَحوال

آپ حضرات قرآنِ پاک پڑھتے ہیں، میں پڑھنے کی کوشش کروں تو آدھ گھنٹے میں ایک پارہ ختم کروں گا، دُوسرا کوئی حافظ ہوگا، پندرہ منٹ میں پارہ پڑھ لے گا، کوئی اور زیادہ تیز رفتار حافظ ہوگا پڑھے گا بھی صاف، اور دس منٹ میں پارہ پڑھ لے گا، یہ آپ کے سامنے واقعات ہیں، اور حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمۃ اللہ علیہ کی ایک کرامت ''حکایات اولیاء'' میں لکھی ہوئی ہے، یہ کتاب ''اَرواحِ ثلاثہ'' جس کو ''حکایاتِ اولیاء'' کے نام سے شائع کیا ہے، اور اِس کا ذِکر ''فیض الباری'' میں حضرت سیّد انور شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بھی کیا ہے، اسی بات کو ثابت کرتے ہوئے کہ وقت کا معیار ہر کسی کے لیے علیحدہ علیحدہ ہوتا ہے، ایک آدمی کو کام

کرنے کے لئے جتنا وقت چاہیے دوسرا آدمی وہی کام بہت اچھے انداز سے کرے گا، لیکن اس کا اتنا وقت خرچ نہیں ہوتا، ہمارے حساب سے وقت کم خرچ ہوتا ہے، کہتے ہیں کہ حضرت مولانا محمد اسماعیل صاحب رحمۃ اللہ علیہ دہلوی عصر کی نماز کے بعد مغرب تک قرآنِ کریم ترتیل کے ساتھ پڑھ کر ختم کر دیا کرتے تھے، اچھے انداز کے ساتھ پڑھتے ہوئے عصر سے لے کے مغرب تک پورا قرآن مجید ختم کر دیا کرتے تھے، اب آپ جانتے ہیں کہ عصر اگر مثلِ اوّل کے بعد بھی پڑھ لی جائے، یعنی مثلِ ثانی کا اختتام نہ لیا جائے، مثلِ ثانی کے اختتام کے بعد تو غروب تک صرف گھنٹہ سوا گھنٹہ باقی ہوتا ہے، اگر مثلِ اوّل کے اِختتام پر بھی عصر پڑھ لی جائے تو اڑھائی، پونے تین، تین گھنٹے سے زیادہ وقت نہیں ہوتا، اب عصر کی نماز پڑھنے کے بعد قرآنِ کریم کی تلاوت شروع کریں، اور تین گھنٹے کے اندر قرآن ختم ہو جائے، تو ایک گھنٹے میں دس پارے پڑھے گئے، اگر تین گھنٹے لیے جائیں (زیادہ سے زیادہ وسیع وقت لیا جائے تو تین گھنٹے سے زیادہ نہیں) تو ایک گھنٹے میں دس پارے پڑھے گئے، چھ منٹ میں پارہ، اور وہ بھی ترتیل کے ساتھ، اور کوئی دُوسرا آدمی پڑھنا چاہے تو اس طرح سے نہیں پڑھ سکتا، تو بعض لوگوں نے مطالبہ کیا حضرت سید رحمۃ اللہ علیہ سے کہ ہم نے سُنا ہے کہ آپ اس طرح سے قرآنِ کریم پڑھ لیتے ہیں، تو حضرت شیخ (کشمیریؒ) لکھتے ہیں کہ انہوں نے لوگوں کے سامنے پڑھ کر مغرب تک قرآنِ کریم ختم کر کے دکھا دیا۔[1] یہ تو عصر سے لے کے مغرب تک قرآنِ کریم ختم کرنے کی مثال خود ہمارے بزرگوں میں قریب کے زمانے میں موجود ہے۔ لیکن اس مضمون کی تفصیل کرتے ہوئے حضرت شیخ شیخنا الانور رحمۃ اللہ علیہ اور بہت سارے واقعات بیان فرماتے ہیں اولیاء اللہ کے، کہ کسی کو دِن میں نو قرآن ختم کرنے کی عادت تھی، کسی کو کتنے قرآن ختم کرنے کی عادت تھی۔ اور خود ''ترمذی'' کے اندر اس قسم کے واقعات ہیں بعض بزرگوں کے، اِمام ترمذی نے نقل کیے، بعض راویوں کے متعلق جو اتنا ذِکر اور اتنی نماز پڑھتے تھے کہ آج اگر ہم اپنے پیمانے پر اس کو ناپنا چاہیں تو ممکن ہی نہیں کہ چوبیس گھنٹے کے اندر وہ کام ہو جائے باقی ضروریات کے ساتھ ساتھ۔ اسی طرح تصوّف کے اِمام شہاب الدین سہروردی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق لکھا ہے کہ یومیہ ساٹھ قرآن مجید ختم کیا کرتے تھے۔[2] اب باقی ضروریات زندگی کی اپنی جگہ، سونا، کھانا، نمازیں پڑھنا، اور باقی ضروریات اپنی جگہ، تو چوبیس گھنٹے پر ساٹھ قرآن مجید کو تقسیم کرو تو بھلا، کتنا وقت آتا ہے؟

گمراہی کی بُنیاد

اب ان واقعات کو اپنے اُوپر کس طرح سے قیاس کرلیں؟ اور بھی اس قسم کے عجیب وغریب واقعات حضرت شیخ (کشمیریؒ) نے نقل کیے ہیں۔ اور جہاں معجزے اور کرامت کی بات آجائے اس کو انسان اپنے اعمال پر یا اپنے احوال پر قیاس کر کے حل کرنے کی کوشش نہ کرے، یہ بنیادی گمراہی ہے، اس لیے اگر ایسا واقعہ پیش آ گیا ہو، حضرت سلیمان علیہ السلام بیویوں کے پاس گئے ہوں، اور اللہ تعالیٰ نے اُن کے اوقات میں برکت دی ہو، ہمارے لحاظ سے وقت کم ہے، لیکن اُن کے لحاظ سے وقت میں

---

(۱) ''ارواحِ ثلاثہ'' ص۵٦ حکایت نمبر ۵۳۔ فیض الباری ۳۰۷/۵، کتاب التفسیر، سورۃ بنی اسرائیل، باب قولہ: وآتینا داؤد زبوراً کے تحت۔

(۲) فیض الباری ۳۰۷/۵، کتاب التفسیر، سورۃ بنی اسرائیل، باب قولہ وآتینا داؤد زبوراً کے تحت۔ کان الشیخ السہروردی یفعلہ ستین مرۃ فی یوم

وسعت ہوگئی ہو، جس طرح صوفیہ کے ہاں طیِ زمان اور طیِ مکان کی اِصطلاح ہے، مکان بھی سمٹ جاتا ہے، یعنی فاصلہ زیادہ ہوتا ہے لیکن وہ اس کو جلدی سے طے کرلیتے ہیں، اسی طرح سے وقت کے اندر بھی اس قسم کا تصرف ہوجاتا ہے، وقت سمٹتا ہے، وقت پھیلتا ہے، کرامات کے تحت یہ باتیں آتی ہیں، تو ایسے ہی واقعہ ان کے ساتھ بھی پیش آیا ہوا عجاز کے طور پر، تو اس کا انکار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

''لَاَطُوفَنَّ اللَّيْلَةَ'' کا ایک اور مفہوم

اور اگر اس روایت کا مطلب یوں سمجھ لیا جائے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام کا مطلب یہ تھا کہ میں اپنی بیویوں کے پاس جاؤں گا، اللَّيْلَةَ کا لفظ حدیث شریف میں ہے، آج کی رات اپنی بیویوں کے پاس جاؤں گا لاطوفن الليلة، جس کا معنی متبادر یوں سمجھا جاتا ہے کہ سب بیویوں کے پاس آج کی رات ہی جانے کی قسم کھائی تھی، لیکن اگر طواف کی اِبتدا الليلة میں ہوجائے کہ آج کی رات میں اپنی بیویوں کے پاس جاؤں گا یعنی جانا شروع کردوں گا، باقی! جانا معمول کے مطابق ہی ہو جس طرح سے ہوتا ہے، اگر یہ توجیہ کرلی جائے تو سرے سے کوئی اِشکال ہی باقی نہیں رہتا، روایت بھی اپنی جگہ صحیح رہے گی، اور ظاہری طور پر بھی کوئی اِشکال باقی نہیں ہے، آج کی رات طواف کی اِبتدا ہے کہ میں آج کی رات جانا شروع کروں گا، باقی! جائیں گے کتنی بیویوں کے پاس؟ اور کتنے وقت میں جائیں گے؟ وہ معمول کے مطابق جس طرح سے ہوتا ہے، اگر اتنی سی تاویل اس لفظ میں کرلی جائے تو سرے سے کوئی اِشکال ہی باقی نہیں رہتا، تو کیا ضرورت ہے کہ ہم صحیح روایت کو جو کہ بخاری میں موجود ہے، بار بار آئی ہوئی ہے، ہم اس قسم کے عقلی اِحتمالات نکال کے اُس کو رَدّ کرنے کی کوشش کریں، اس کا اثر دُوسرے پڑھنے والوں پر اچھا نہیں پڑتا، باقی روایتوں کی عظمت بھی اُن کے دِل میں کیا باقی رہے گی؟ وہ سمجھیں گے کہ جو عقل کے مطابق ہو اُس کو قبول کرلو، جس کو اپنی عقل قبول نہیں کرتی اُس کو رَدّ کردو، تو ہمارے حضرات کے نزدیک یہ انداز اچھا نہیں ہے۔

تو یہ تفسیر بھی کی گئی ہے اس واقعے کے تحت، اگرچہ حدیث شریف میں یہ عنوان اختیار نہیں کیا گیا کہ یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت کی تفسیر کے طور پر ہی بیان کیا ہے، لہٰذا متعین نہیں کرسکتے لیکن اقرب الی الفاظ القرآن اس واقعے کو بنا سکتے ہیں۔

''وَلَقَدْ فَتَنَّا سُلَيْمٰنَ'' کی تیسری تفسیر

اور بعض جدید مفسرین نے قرآن کریم کے الفاظ کے تحت ایک بات ذکر کی ہے کہ حضرت سلیمان علیہ السلام داؤد علیہ السلام کے بعد جب بادشاہ ہوئے ہیں، تو ان پر کچھ دشمنوں نے چڑھائی کی اور وہ غالب آتے چلے گئے، اتنا غالب آگئے کہ اکثر علاقے حضرت سلیمان علیہ السلام کے انہوں نے چھین لیے، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کا اقتدار ان کے اپنے مرکز میں بند ہوکر رہ گیا، اور جب کسی بادشاہ کے ساتھ یہ صورت حال پیش آجائے کہ اس کے علاقے دُشمن چھین لے اور وہ اپنے شہر کے اندر محصور ہو کے رہ جائے، تو انتہائی درجے کا نڈھال کمزور غمزدہ ہو کے بیٹھا ہوا نظر آتا ہے، تو ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے بدن ہے اور جان نہیں، تو یہ حضرت سلیمان علیہ السلام کی آزمائش تھی کہ ان کو اس قسم کے غموں میں اور فکروں میں ڈال دیا گیا، کہ وہ اپنے تخت کے اُوپر یوں پڑے ہوئے تھے جس طرح سے کوئی

بے جان چیز پڑی ہوئی ہوتی ہے، جان ہی نہیں ہوتی، غمزدہ انسان کی جس طرح سے تصویر ہوتی ہے، تو انبیاء علیہم السلام کو جب بھی کوئی کسی قسم کا واقعہ پیش آیا کرتا ہے تو فوراً سمجھا کرتے ہیں کہ یہ ہماری ہی کوتاہی کا نتیجہ ہے، اللہ نے ہمیں ہماری کسی کوتاہی کے نتیجے میں آزمائش میں ڈال دیا، تو حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اسی طرح سے کہا کہ یا اللہ! مجھ سے جو غلطی ہوگئی مجھے معاف کر دے، اور مجھے ایسی سلطنت عطا فرما کہ میرے بعد وہ کسی کے لئے مناسب نہ ہو، اس دور میں بھی نہ ہو، اور بعد کے دور میں بھی نہ ہو۔ تو جب اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ اور استغفار کی، اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح سے دُعا کی، تو اللہ نے وہ آزمائش کا دور ختم کر دیا، ختم کرنے کے بعد اُن کی حکومت کو وسعت دی، جنوں پرندوں اور ہر چیز کے اُوپر ان کی حکومت ہوگئی، پھر اُن کا مدمقابل اس زمانے میں بھی کوئی بادشاہ نہیں تھا، اور بعد میں آنے والی تاریخ میں بھی حضرت سلیمان علیہ السلام کسی کو حکومت نصیب نہیں ہوئی، تو اس آزمائش سے یہ آزمائش مراد لے لی جائے۔ اور انہوں نے تاریخ کی کسی کتاب کا حوالہ تو نہیں دیا، ویسے اتنا ہی لکھا ہے کہ تاریخ سے یہ بات ثابت ہے کہ اِبتدا اِبتدا میں حضرت سلیمان علیہ السلام اس طرح سے دشمنوں کے سامنے مغلوب ہو گئے تھے کہ ان کی حکومت مرکز میں بند ہو کے رہ گئی اور وہ غمزدہ اپنے تخت کے اوپر پڑے ہوئے تھے جس طرح سے ایک افسردہ آدمی ہوا کرتا ہے، تو اسی کو یوں ذکر کیا کہ گویا کہ لاش تھی اور اس میں جان نہیں تھی۔ بعد میں انہوں نے توبہ کی، استغفار کی، جس طرح سے نیک لوگوں کی عادت ہے کہ اللہ کی طرف سے کوئی آزمائش پیش آجائے فوراً کہتے ہیں کہ یا اللہ! ہم سے کوئی کوتاہی ہوگئی ہو تو معاف کر دے اور ہمیں عافیت نصیب فرما، اسی طرح سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے دعا کی، اللہ نے یہ آزمائش کا دور ختم کیا، اور ان کو ایک بے نظیر حکومت عطا فرمائی جس کی مثال نہ اُس زمانے میں موجود تھی اور نہ بعد میں اس کی کوئی مثال آئی..... تو انہوں نے ان الفاظ کو اس انداز سے ادا کیا ہے۔

بہر حال اتنا یقینی ہے کہ سلیمان علیہ السلام پر کوئی آزمائش آئی تھی، اور انہوں نے توبہ استغفار کیا، جس کے بعد اللہ تعالیٰ نے وہ آزمائش ختم کر دی، اتنی بات الفاظ سے نکلتی ہے، باقی! اس میں کون سا واقعہ مراد ہے؟ اس میں مفسرین کی مختلف آراہیں جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کر دیں، اور دِکھانا یہاں یہی ہے کہ ثُمَّ اَنَابَ کہ وہ ہر معاملے میں اللہ کی طرف رُجوع کرتے تھے، اور توبہ استغفار کرتے تھے۔ کوئی نعمت نصیب ہوتی تو اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے تھے، کوئی آزمائش آجاتی تو توبہ اور استغفار کرتے اور صبر کے ساتھ واقعے کو گزارتے تھے، واقعے کی یہ جو رُوح ہے وہ ہمارے سامنے نمایاں ہے۔

سلیمان علیہ السلام کی عظیم سلطنت

قَالَ رَبِّ اغْفِرْ لِیْ: سلیمان علیہ السلام نے کہا کہ اے اللہ! مجھے بخش دے، مجھ سے کوئی کوتاہی ہوگئی تو اس سے درگزر فرما۔ اور مجھے ایسی سلطنت، ایسا ملک دے کہ نہ مناسب ہو کسی کے لئے میرے بعد، ''میرے بعد'' یعنی میرے زمانہ کے بعد کوئی ایسا بادشاہ نہ ہو، کسی کو ایسی سلطنت نہ ملے۔ یا ''میرے سوا'' کے ساتھ بھی ترجمہ کیا گیا ہے، یعنی اس زمانے میں بھی میرے سوا کسی کے پاس اس قسم کی سلطنت نہ ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو پھر ایسی سلطنت عطا فرمائی۔ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ یہ ان کی دُعا کا حصہ ہے، کہ تو بہت عطا کرنے والا ہے۔ ''پھر ہم نے مسخر کر دیا اس کے لئے ہوا کو، چلتی تھی اس کے حکم کے ساتھ نرم نرم'' یعنی بظاہر کتنی تیز چلنے والی ہو لیکن

اُن کو ایسی معلوم ہوتی تھی جیسے نرم نرم چل رہی ہے، حَیْثُ اَصَابَ: جہاں بھی وہ پہنچنا چاہتے، غُدُوُّهَا شَهْرٌ وَّ رَوَاحُهَا شَهْرٌ (سورۂ سبا: ۱۲) کے لفظ پہلے آپ کے سامنے آئے تھے، کہ اس کا صبح کو چلنا بھی ایک مہینے کی مسافت ہوتا تھا، شام کو چلنا بھی ایک مہینے کی مسافت ہوتا تھا، مہینے کے فاصلے گھنٹوں میں طے ہو جاتے اس ہوا کی وجہ سے، یہ بھی اعجاز تھا جو اللہ تعالیٰ نے حضرت سلیمان علیہ السلام کو دیا، آج لوگ ہوا پر اُڑتے ہیں اور مہینوں کے سفر گھنٹوں میں طے کرتے ہیں لیکن ظاہری اسباب کے تحت، اور معجزہ بغیر ظاہری اسباب کے ہوتا ہے۔ وَالشَّیٰطِیْنَ: اور ہم نے شیاطین کو، جنّات کو مسخر کر دیا سلیمان علیہ السلام کے لیے، ہر عمارت بنانے والے کو غوطہ لگانے والے کو۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ وہ جنوں سے دونوں قسم کے کام لیتے تھے، عمارتیں بھی بنواتے تھے اور دریا میں غوطہ زنی بھی کرواتے اور موتی نکلواتے۔ ''اور کچھ اور بھی تھے جو کہ زنجیروں میں جکڑے رہتے'' جنوں کے جکڑنے کے لیے اُن کی شان کے مطابق ہی زنجیریں ہوں گی، جس طرح سے آج کل عاملین عمل کرتے ہوئے بعض جنوں کو مسخر کر لیتے ہیں اور اُن کو مقید کر لیتے ہیں، اسی طرح سے حضرت سلیمان علیہ السلام نے بھی اُن کو زنجیروں میں جکڑا ہوا تھا، یا تو یہ سرکش قسم کے جنّ ہوں گے جو نافرمانی کرتے ہوں گے، یا ویسے ہی جس طرح سے ایک ریزرو فورس رکھی ہوتی ہے اس طرح سے اُن کو اپنے پاس رکھتے ہوں گے، جب ضرورت ہوتی ہو گی اُن سے کام لے لیتے ہوں گے، بہر حال زنجیروں کے اندر کوئی جکڑے ہوئے اور بھی تھے۔ اور پھر اور ہم نے اِنعام یہ کیا کہ کہا کہ ہماری یہ عطا ہے، آپ احسان کریں مخلوق پر یا اس کو روک کے رکھ لیں، ہماری طرف سے کوئی حساب نہیں، یہ اعزاز اور بھی زیادہ نمایاں ہو گیا۔ وَاِنَّ لَهٗ عِنْدَنَا لَزُلْفٰى وَحُسْنَ مَاٰبٍ: بے شک اس کے لئے ہمارے نزدیک البتہ قرب ہے اور بہت اچھا ٹھکانا ہے۔ یہ اُن کی مقبولیت کی طرف اشارہ ہو گیا۔

وَاذْكُرْ عَبْدَنَآ اَيُّوْبَ ۘ اِذْ نَادٰى رَبَّهٗٓ اَنِّىْ مَسَّنِىَ الشَّيْطٰنُ بِنُصْبٍ وَّعَذَابٍ ﴿۴۱﴾

ہمارے بندے ایوب کو یاد کیجیے، جب پکارا انہوں نے اپنے رَبّ کو، بے شک مجھ کو شیطان نے مشقت اور تکلیف پہنچائی ﴿۴۱﴾

اُرْكُضْ بِرِجْلِكَ ۚ هٰذَا مُغْتَسَلٌۢ بَارِدٌ وَّشَرَابٌ ﴿۴۲﴾ وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اَهْلَهٗ وَمِثْلَهُمْ

(ہم نے کہا کہ) تُو اپنا پاؤں مار، یہ نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کا ﴿۴۲﴾ اور ہم نے عطا کیا ان کو ان کا اہل، اور اُن جیسے اور بھی

مَّعَهُمْ رَحْمَةً مِّنَّا وَذِكْرٰى لِاُولِى الْاَلْبَابِ ﴿۴۳﴾ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ

ان کے ساتھ اپنی طرف سے رحمت کے طور پر، اور عقل مندوں کی نصیحت کے لئے ﴿۴۳﴾ اور لے اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا اور مار تُو اس کے ذریعے سے،

وَلَا تَحْنَثْ ۭ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ﴿۴۴﴾ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَآ

اور تُو حانث نہ ہو، ہم نے پایا اس کو صبر کرنے والا، بہت اچھا بندہ تھا، بے شک وہ اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا تھا ﴿۴۴﴾ یاد کیجیے ہمارے بندے

إِبْرٰهِيمَ وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ أُولِي الْأَيْدِي وَالْأَبْصَارِ ﴿٤٥﴾ إِنَّا أَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ

ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو، جو ہاتھوں والے اور آنکھوں والے تھے ۴۵ ہم نے خاص کیا اُن کو ایک خاص بات کے ساتھ،

ذِكْرَى الدَّارِ ﴿٤٦﴾ وَإِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٧﴾ وَاذْكُرْ

وہ ہے آخرت کی یاد ۴۶ اور بے شک وہ ہمارے نزدیک البتہ چُنے ہوئے پسندیدہ لوگوں میں سے تھے ۴۷ اور یاد کیجئے

إِسْمٰعِيلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ ۖ وَكُلٌّ مِنَ الْأَخْيَارِ ﴿٤٨﴾ هٰذَا ذِكْرٌ ۚ وَإِنَّ لِلْمُتَّقِينَ

اسماعیل کو اور الیسع کو اور ذاالکفل کو، یہ سارے کے سارے ہی پسندیدہ لوگوں میں سے تھے ۴۸ یہ یاددہانی ہے، بے شک متقین کے لئے

لَحُسْنَ مَآبٍ ﴿٤٩﴾ جَنّٰتِ عَدْنٍ مُفَتَّحَةً لَهُمُ الْأَبْوَابُ ﴿٥٠﴾ مُتَّكِئِينَ فِيهَا يَدْعُونَ

اچھا ٹھکانا ہے ۴۹ ہمیشگی کے باغات، کھلے ہوئے ہوں گے ان کے لئے دروازے ۵۰ تکیہ لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے ان باغات میں، منگوائیں گے

فِيهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ وَشَرَابٍ ﴿٥١﴾ وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ أَتْرَابٌ ﴿٥٢﴾ هٰذَا

ان باغات میں بہت میوہ اور پینے کی چیز ۵۱ اور ان کے پاس ایسی عورتیں ہوں گی جو نظر کو بند رکھنے والی ہیں، ہم عمر ہیں ۵۲ یہ ہے

مَا تُوعَدُونَ لِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿٥٣﴾ إِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا مَا لَهُ مِنْ نَفَادٍ ﴿٥٤﴾ هٰذَا ۚ وَإِنَّ

وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو حساب کے دن ۵۳ بے شک یہ ہمارا رزق ہے، نہیں ہے اس کے لئے ختم ہونا ۵۴ یہ بات تو ہو چکی، بے شک

لِلطّٰغِينَ لَشَرَّ مَآبٍ ﴿٥٥﴾ جَهَنَّمَ ۚ يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿٥٦﴾ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوقُوهُ

سرکشوں کے لئے بُرا ٹھکانا ہے ۵۵ یعنی جہنم، داخل ہوں گے یہ لوگ اس میں، پھر وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے ۵۶ یہ گرم پانی اور پیپ ہے، چاہیے کہ یہ لوگ

حَمِيمٌ وَغَسَّاقٌ ﴿٥٧﴾ وَآخَرُ مِنْ شَكْلِهِ أَزْوَاجٌ ﴿٥٨﴾ هٰذَا فَوْجٌ مُقْتَحِمٌ مَعَكُمْ

اس کا مزہ لیں ۵۷ اور بھی اس کی شکل کا کئی قسم کا عذاب ۵۸ یہ جماعت گھسنے والی ہے تمہارے ساتھ

لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۚ إِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ ﴿٥٩﴾ قَالُوا بَلْ أَنْتُمْ ۖ لَا مَرْحَبًا بِكُمْ ۖ أَنْتُمْ

ان کے لئے کوئی مرحبا نہیں، یہ بھی جہنم میں داخل ہونے والے ہیں ۵۹ وہ کہیں گے: بلکہ تم ہی، کہ تمہارے لئے کوئی مرحبا نہیں، تم

قَدَّمْتُمُوهُ لَنَا ۖ فَبِئْسَ الْقَرَارُ ﴿٦٠﴾ قَالُوا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا فَزِدْهُ عَذَابًا

اس عذاب کو ہمارے سامنے لائے ہو، یہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے ۶۰ کہیں گے اے ہمارے رب! جو شخص اس عذاب کو ہمارے سامنے لایا ہے اس کو زیادہ

ضِعْفًا فِي النَّارِ ﴿٦١﴾ وَقَالُوا مَا لَنَا لَا نَرَىٰ رِجَالًا كُنَّا نَعُدُّهُم مِّنَ الْأَشْرَارِ ﴿٦٢﴾

ہوئے عذاب دُگنا جہنم میں ﴿۶۱﴾ اور جہنمی کہیں گے کہ کیا ہو گیا ہمیں، نہیں دیکھتے ہم کچھ لوگوں کو جن کو ہم برے شمار کیا کرتے تھے ﴿۶۲﴾

أَتَّخَذْنَاهُمْ سِخْرِيًّا أَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْأَبْصَارُ ﴿٦٣﴾ إِنَّ ذَٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ أَهْلِ النَّارِ ﴿٦٤﴾

کیا ہم نے ان کو ٹھٹھا بنایا یا ان سے آنکھیں کج ہو گئیں؟ ﴿۶۳﴾ یہ بات البتہ بالکل حق ہے یعنی جہنمیوں کا آپس میں جھگڑنا ﴿۶۴﴾

تفسیر

خلاصۂ آیات

وَاذْكُرْ عَبْدَنَا أَيُّوبَ: ہمارے بندے ایوب علیہ السلام کو یاد کیجئے، إِذْ نَادَىٰ رَبَّهُ أَنِّي مَسَّنِيَ الشَّيْطَانُ بِنُصْبٍ وَعَذَابٍ: جب پکارا انہوں نے اپنے رَبّ کو، دُعا کی، اور دُعا کا مضمون یہ تھا ''بے شک مجھ کو شیطان نے نُصب اور عذاب پہنچایا ہے۔'' نُصب: مشقت، تکلیف۔ اور عذاب بھی تکلیف کو کہتے ہیں۔ ''مجھے مشقت پہنچائی اور عذاب پہنچایا شیطان نے۔'' مَسّ کے بعد باء تعدیہ کی آ گئی اس لیے معنی پہنچانے کے ساتھ کریں گے، پیچھے لفظ آیا تھا مَسَّنِيَ الضُّرُّ وَأَنتَ أَرْحَمُ الرَّاحِمِينَ (سورۂ انبیاء: ۸۳) مجھے تکلیف پہنچی ہے اور تُو ارحم الراحمین ہے۔ اور یہاں باء تعدیہ کی آ گئی تو معنی ہو گا پہنچا دی۔ ''بے شک مجھ کو شیطان نے مشقت اور تکلیف پہنچائی'' ارْكُضْ بِرِجْلِكَ ہم نے کہا کہ تو اپنا پاؤں مار۔ رَکض: ایڑ لگانا، پاؤں مارنا، جس طرح سے سواری پر انسان بیٹھا ہوتا ہے تو سواری کو ہانکنے کے لئے ایڑی مارتا ہے تو اس کو بھی رکض دابہ کہتے ہیں۔ ''اپنا پاؤں مار'' هَٰذَا مُغْتَسَلٌ بَارِدٌ وَشَرَابٌ: پاؤں ماریں گے تو پانی پھوٹ پڑے گا۔ مُغْتَسَل: نہانے کی چیز۔ بَارِد: ٹھنڈی۔ شَرَاب: پینے کی چیز۔ تو مُغْتَسَل سے یہاں نہانے کا پانی مراد ہے۔ ''یہ نہانے کا ٹھنڈا پانی ہے اور پینے کا'' یعنی اس میں نہاؤ بھی اور پیو بھی۔ وَوَهَبْنَا لَهُ أَهْلَهُ: اور ہم نے عطا کیا ان کو ان کا اہل، وَمِثْلَهُم مَّعَهُمْ: اور ان جیسے اور بھی ان کے ساتھ، رَحْمَةً مِّنَّا: اپنی طرف سے رحمت کے طور پر، وَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ: اور عقل مندوں کی نصیحت کے لیے۔ عقل مندوں کی نصیحت کے لئے اور اپنی طرف سے رحمت کے طور پر ہم نے ان کے اہل ان کو عطا کیے اور اتنے اور بھی ان کے ساتھ، ان جیسے اور بھی ان کے ساتھ۔ وَخُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا: اور لے اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا۔ ضغث کہتے ہیں تنکوں کے ایک مٹھے کو، جس طرح سے پہلے سورۂ یوسف میں لفظ آیا تھا أَضْغَاثُ أَحْلَامٍ (آیت: ۴۴) مجموعۂ خیالات، وہاں بھی ذکر کیا تھا کہ ضغث اصل میں گھاس وغیرہ کے مختلف قسم کے تنکے جو اکٹھے کر لیے جاتے ہیں ان کا گٹھا باندھ لیا جائے تو اس کو ضغث کہتے ہیں۔ ''لے تو اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا'' فَاضْرِب بِّهِ: اور مار تُو اس کو، اس کے ذریعے سے مار، وَلَا تَحْنَثْ: اور تُو حانث نہ ہو، إِنَّا وَجَدْنَاهُ صَابِرًا: ہم نے پایا اس کو صبر کرنے والا۔ نِّعْمَ الْعَبْدُ: بہت اچھا بندہ تھا، إِنَّهُ أَوَّابٌ: بے شک وہ اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا تھا۔

حضرت ایوب علیہ السلام پر آزمائش

حضرت ایوب علیہ السلام یہ بھی اسرائیلی انبیاء میں سے ہیں، ان آیات میں اُن کی بھی ایک آزمائش مذکور ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو بھی ایک آزمائش میں ڈال دیا تھا، پہلے سورۂ انبیاء کے اندر بھی ان کا کچھ ذِکر آیا تھا، ان پر آزمائش جو آئی تھی، آیات سے معلوم یوں ہوتا ہے کہ کسی بدنی تکلیف کے اندر بھی مبتلا کردیے گئے تھے اور مالی مشکلات میں بھی مبتلا کردیے تھے، بیمار ہوئے، بیماری ان کو کون سی لگی؟ اس میں بھی اسرائیلیوں نے بڑے بڑے قصے بیان کیے ہیں، کہ ان کے بدن پر پھوڑے نکل آئے تھے، سارا بدن گل گیا تھا، کیڑے پڑ گئے تھے، ہر وقت راکھ کے ڈھیر پہ بیٹھے ہوئے ٹھیکروں کے ساتھ اپنے بدن کو کھجلاتے رہتے تھے، کوئی نفرت کی وجہ سے قریب نہیں آتا تھا، اس قسم کے قصے کہانیاں اسرائیلی روایات میں بہت مذکور ہیں۔ بہرحال صحیح حدیث میں اس کے متعلق کچھ نہیں آیا، بس اتنا معلوم ہوتا ہے کہ کسی تکلیف کے اندر یہ مبتلا ہوئے تھے، باقی ایسی تکلیف جو لوگوں کے لیے باعثِ نفرت ہو یہ بظاہر انبیاء علیہم السلام کی شان کے خلاف ہے، اللہ بہتر جانتا ہے کہ کیا تکلیف تھی؟ بہرحال آزمائش کے طور پر ان کو مالی مشکلات بھی پیش آئیں، اور مالی مشکلات جب پیش آئیں تو ان کے اہل وعیال کچھ متفرق ہوگئے، کچھ مر گئے، جس طرح سے عادت ہے کہ جب انسان کسی آزمائش میں پڑتا ہے تو متعلقین رشتہ دار بھی تتر بتر ہوجاتے ہیں اِدھر اُدھر، ایک بیوی تھی جو فرماں بردار رہی اور ان کی خدمت گزار رہی، اور اس بیوی کے متعلق ''مظہری'' میں ہے کہ اُس کا نام ''رحمۃ'' تھا۔ اور وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بیٹی تھی، مِن امرأۃ العزیز، یعنی اس نسل سے تھی، تو اُن کی اولاد سے تھیں، ''مظہری'' کے اندر یہ لفظ ہیں سورۂ یوسف کی تفسیر میں، رحمت، یوسف علیہ السلام کی بیٹی، من بطن زلیخا، اور ایوب علیہ السلام کی بیوی اس کو ذکر کیا ہوا ہے، اس کے علاوہ باقی کچھ مر گئے، کچھ اِدھر اُدھر منتشر ہوگئے، تو حضرت ایوب علیہ السلام نے پھر اللہ کے سامنے توبہ اور اِستغفار کی، دُعا کی، جس طرح انبیاء علیہم السلام کی عادت ہے، جب کوئی اچھی چیز پیش آتی ہے تو اُس کی نسبت اللہ کی طرف کیا کرتے ہیں کہ یا اللہ! تُو نے مجھے یہ چیز دی، اور جب کوئی تکلیف پیش آجائے یا کوئی مرضی کے خلاف بات پیش آجائے، تو یا انسان اُس کو اپنے نفس کی طرف منسوب کیا کرتا ہے یا شیطان کی طرف منسوب کیا کرتا ہے، کہ یا اللہ! مجھے میرے نفس کی طرف سے یہ تکلیف پہنچی، میں اپنے نفس کی طرف سے اس مصیبت میں مبتلا ہوگیا، یا شیطان کی طرف سے مجھے یہ تکلیف پہنچی، کیونکہ اس قسم کے جو حالات ہوتے ہیں ان میں کسی نہ کسی درجے میں خبیث شیاطین کا ظاہری طور پر کوئی نہ کوئی اثر ہوتا ہے، انسان سے کوئی لغزش ہوگئی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ پکڑ لیں، تو تکلیف بھیجنے والے تو اللہ ہیں لیکن کسی نہ کسی درجے میں انسان کا نفس یا شیطان اس کا سبب بن جاتا ہے، تو اسی طرح سے حضرت ایوب علیہ السلام نے بھی یہاں یہی کہا کہ اُس کی طرف سے مجھے مشقت پہنچی ہے، تکلیف پہنچی ہے۔ اور یہ بھی مراد ہوسکتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام بیمار ہوئے، بیماری میں بہت زیادہ مبتلا ہوئے، اہل وعیال بھی تتر بتر ہوگئے، مالی مشکلات پیش آئیں، تو ایسے موقع پر شیطان پھر وسوسے قلب میں ڈالتا ہے، جس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ صبر کے خلاف کوئی حرکت ہوجائے، یا کوئی شکایت کا لفظ زبان سے نکل جائے، شیطان اس قسم کے وسوسے ڈالتا ہے، تو اچھے آدمی کو ان وسوسوں کے ساتھ بھی تکلیف پہنچتی ہے، تو اس نصب اور عذاب سے وسوسے بھی مراد لیے جاسکتے ہیں، کہ

یااللہ! ان مشکلات میں پھنسا ہوں، تو اب شیطان ہر وقت مجھے پریشان کرتا ہے، میرے دل میں مختلف قسم کے خیالات آتے ہیں، ایسا نہ ہو کہ میں اپنی کمزوری کی بنا پر زبان سے کوئی شکوے کا لفظ نکال بیٹھوں، یا کوئی بے صبری کی حرکت کر بیٹھوں، اس لیے تُو مجھے شفا عطا فرما، اس طرح سے اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کی، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا دور ختم ہوا، کہا گیا کہ تُو اپنا پاؤں مار، یہاں سے پانی نکلے گا، اور وہ پانی نہانے کا بھی ہے اور پینے کا بھی ہے، اس میں غسل کرو اور پانی پیو، صحت ہو جائے گی، چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ جب انہوں نے اپنی ایڑی زمین پر ماری تو وہاں سے چشمہ پھوٹا، اور اس پانی کو انہوں نے پیا بھی اور اس کے ساتھ غسل بھی کیا، تو اللہ تعالیٰ نے جو بیماری تھی دُور کر دی، اور جس وقت وہ صحت مند ہو گئے تو پھر ان کے اہل وعیال بھی اُن کو مل گئے، اہل وعیال کے ملنے کی دو صورتیں ہیں، اگر تو وہ اس فقر وفاقہ کی وجہ سے منتشر ہو گئے تھے تو واپس آ گئے، اور اگر وہ وفات پا گئے تھے تو اللہ تعالیٰ نے اُن کو نئے سرے سے اور اولاد دی جو کہ پہلی اولاد جیسی ہی تھی، اور اس کے ساتھ اور بھی دے دی، اور بھی اضافہ کر دیا، مثال کے طور پر پہلے اگر چار بیٹے تھے تو چار کی بجائے آٹھ بیٹے پیدا ہو گئے، تو پہلے اہل وعیال کی طرح چار بھی مل گئے اور اس کی طرح اور زیادہ بھی مل گئے، یہ صورت بھی ہو سکتی ہے۔ اور ''بیان القرآن'' میں کچھ ایسی روایت بھی نقل کی گئی ہے کہ جو پہلے فوت ہو گئے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ ان کو دوبارہ زندہ کر دیا، حضرت ایوب علیہ السلام کے لئے، اگر ایسا ہو گیا ہو تو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے اور انبیاء علیہم السلام کے لئے معجزے کے طور پر ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ پہلے اہل وعیال بھی واپس آ گئے، منتشر ہو گئے تھے تو واپس آ گئے، وفات پا گئے تھے تو اللہ نے دوبارہ زندہ کر دیا، ورنہ مطلب یہ ہے کہ نئے سرے سے اُن کو اہل وعیال دیے لیکن بالکل پہلوں جیسے تھے، یوں سمجھو کہ پہلی مقدار بھی مل گئی، اور اتنا اللہ تعالیٰ نے اور بھی اضافہ فرما دیا، تو اس طرح سے اللہ نے ان کے صبر کا امتحان لیا، اور آخر وقت تک وہ صابر رہے، تو اللہ تعالیٰ نے اُن کے صبر کی تعریف کی۔

ایوب علیہ السلام کی قسم کیا تھی؟

انہی آیات کے ضمن میں ایک واقعہ یہ بھی آیا، خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا فَاضْرِبْ بِّهٖ: اپنے ہاتھ میں تو ایک مٹھا لے، پھر اس مٹھے کے ساتھ مار، اور تو حانث نہ ہو۔ ان الفاظ کی کیا مراد ہے؟ لَا تَحْنَثْ سے اتنا تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے کوئی قسم کھائی تھی، اللہ تعالیٰ اس قسم کو پورا کرنے کا طریقہ یہاں بتاتے ہیں، کہ تو ایک مٹھا ہاتھ میں لے لے، اور اُس کو مار دے، تیری قسم پوری ہو جائے گی، تو اس قسم کے خلاف نہ کر، حانث نہ ہو، باقی مٹھا پکڑ کر کس کے مارنا ہے؟ اس کی تشریح بھی صحیح روایات کے اندر موجود نہیں ہے، یہاں بھی مفسرین کی مختلف آرا ہیں۔ ''بیان القرآن'' میں حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے امام احمد سے ایک روایت نقل کرتے ہوئے اس کی تشریح یوں کی ہے، کہ وہ بیوی جو حضرت ایوب علیہ السلام کی خدمت گزار تھی، ہر وقت وہ ساتھ لگی رہتی تھی، ایک دفعہ شیطان اس سے ملا طبیب کی صورت میں، جیسے معالج ہے، اور اس نے کہا کہ میں تیرے شوہر کا علاج کرتا ہوں، اس کو شفا ہو جائے گی، لیکن میری طرف سے شرط یہ ہے کہ جس وقت شفا ہو جائے بس تُو اتنا کہہ دینا کہ تُو نے شفا دی ہے، اس شفا کی نسبت میری طرف کر دینا، باقی! میں اور کوئی فیس نہیں لیتا، کوئی پیسے نہیں لیتا، تو بیوی نے جا کر ایوب علیہ السلام کے سامنے ذکر کیا، کیونکہ جب انسان تکلیف میں ہوتا

ہے، پریشانی میں ہوتا ہے، تو جدھر سے بھی سہارا ملے اُدھر سے لینے کی کوشش کرتا ہے، ایوب علیہ السلام تو پیغمبر تھے، بیوی تو آخر نبی نہیں تھی، اُن کے حالات پیغمبروں سے مختلف ہو سکتے ہیں، تو ہو سکتا ہے کہ اس نے اس انداز میں حضرت ایوب علیہ السلام سے ذِکر کیا، گویا کہ اس نے اس تدبیر کو قبول کر لیا، کہ ٹھیک ہے علاج کر دو، جب آرام ہو جائے گا تو میں کہہ دُوں گی، کہ تُو نے شفا دِی ہے۔ جب حضرت ایوب علیہ السلام کے سامنے اس بات کو ذِکر کیا تو حضرت ایوب علیہ السلام نے فرمایا کہ وہ تو شیطان ہوگا جو اس قسم کی بات کہتا ہے، اور تُو اس کی باتوں سے متأثر ہو گئی، اور اس قسم کی بات تُو نے میرے سامنے کی ہے، تو قسم کھالی کہ جب میں صحت مند ہو جاؤں گا تو تجھے سو ڈنڈے لگاؤں گا، تیرے سو کوڑا لگاؤں گا، اس طرح سے حضرت ایوب علیہ السلام نے غصے میں آ کے، یہ بُغض فی اللہ ہے، شیطان سے نفرت ہے، کہ شیطان کو اتنی جرأت ہو گئی کہ وہ آ کے اس قسم کی باتیں کرنے لگ گیا، اور بیوی پر غصہ آیا کہ تُو اس بات کو سمجھ نہ سکی جو تُو اس سے متأثر ہو گئی، اور اس کے سامنے تُو نے ایسی بات کر دی گویا کہ اس کی تدبیر کو تُو نے قبول کر لیا، تو تنبیہ کے طور پر یہ کہا کہ جب صحت ہو جائے گی تو سو ڈنڈا تیرے لگاؤں گا، حضرت ایوب علیہ السلام یہ قسم کھالی۔ تو بعد میں جس وقت اُن کو صحت حاصل ہو گئی، اب وہ بیوی فرماں بردار تھی، بیچاری ہر وقت خدمت کرتی تھی، اور اس سے کوئی ایسا جرم بھی صادر نہیں ہوا تھا، اب سو ڈنڈے کا جواز اس کے لئے کیا رہ گیا! بظاہر تو کوئی ایسی بات نہیں معلوم ہوتی، اب اگر اُس کے سو نہیں لگائیں گے تو ایسی صورت میں قسم ٹوٹتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے پھر اُن کو ایک حیلہ بتایا جو حضرت ایوب علیہ السلام کی خصوصیت ہے کہ تُو اپنی قسم کو یوں پورا کر لے، کہ سو تنکا اپنے ہاتھ میں لے لے ایک مٹھے کی شکل میں، اور ایک دفعہ اس کو مار دے، تو قسم تیری پوری ہو جائے گی، قسم نہیں ٹوٹے گی۔ اور اس روایت کے ذِکر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ جو نُصب اور عذاب حضرت ایوب علیہ السلام نے ذکر کیا کہ شیطان نے مجھے تکلیف پہنچائی ہے، تو اس تکلیف سے یہ تکلیف بھی مراد ہو سکتی ہے، کہ میری اس تکلیف کی بنا پر، بیماری کی بنا پر وہ اتنا جَری ہو گیا کہ میرے گھر والوں کو اب وہ کُفر و شرک کی تلقین کرتا ہے، یہ بھی ایک تکلیف دِہ بات تھی جو پیش آئی، جس کی بنا پر حضرت ایوب علیہ السلام نے پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے اِلحاح اور زاری کی، کہ یا اللہ! شیطان تو اب اتنا بڑھتا آ رہا ہے اور اس قسم کے وسوسے ڈال رہا ہے، اس کو اتنی جرأت ہوتی جا رہی ہے، مجھے بڑی تکلیف پہنچی اس کی طرف سے، تُو مجھے شفا عطا فرما، تاکہ ان کے حوصلے ٹوٹ جائیں، اور میرے گھر والوں کو پریشان کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تو حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس واقعے کو نقل کر کے اس آیت کو حل کیا کہ یہ مٹھا پکڑ کے جو مارنے کا ذِکر کیا ہے تو بیوی کو مارنا مراد ہے۔ اور جو لَا تَحْنَثْ سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم کھائی تھی، تو اس قسم سے یہی قسم مراد ہے، کہ انہوں نے اپنی بیوی کے سو ڈنڈے مارنے کی قسم کھائی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے ان کو حیلہ بتا دیا جس کے ساتھ اُن کی قسم پوری ہو جائے، بہرحال اس اثر کو لے لیا جائے تو لفظوں کے تحت یہ بات حل ہو جاتی ہے، اور باقی اس کے علاوہ کوئی دوسری بات صحیح روایات میں موجود نہیں۔ اور ''تدبر القرآن'' میں مولانا امین احسن اصلاحی نے ذِکر کیا ان لفظوں کی طرف دیکھتے ہوئے، کہ ہو سکتا ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے اپنے نفس کو تنبیہ کرنے کے لئے کوئی قسم کھالی ہو، یعنی اپنے دِل میں کوئی اس قسم کا وسوسہ آیا، یا زبان پر کوئی شکایت کا لفظ آنے لگا، تو اپنے آپ کو تنبیہ کرنے کے لئے یہ قسم کھالی ہو کہ میں اپنے آپ کو یہ سزا دوں گا، یہ سو ڈنڈے لگاؤں گا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنے آپ کو مارنے کے لئے کہہ دیا کہ ایک مٹھا ہاتھ میں لے لو اور اپنے آپ کو مار لو، بہرحال جو صورت بھی ہو اتنا تو یقینی طور پر معلوم

ہے کہ حضرت ایوب علیہ السلام نے کوئی قسم کھائی تھی، اور اللہ تعالیٰ نے اس قسم کو بچانے کے لئے اُن کو یہ تدبیر بتائی، کہ ڈنڈے مارنے کی بجائے یہ صورت اختیار کرلو، اور یہ ایک حیلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے بتایا، اب اگر کوئی دوسرا شخص اس قسم کی قسم کھالے کہ میں کسی کے سو ڈنڈے لگاؤں گا، تو اس طرح سے ایک مٹھا مارنے کے ساتھ اس کی قسم پوری نہیں ہوگی اگر تکلیف نہ ہو، یا کوئی تیلی بدن کو لگنے سے رہ جائے، بلکہ اگر وہ نہ مارے تو حانث ہوگا، حانث ہونے کے بعد اس کو اسی طرح سے کفارہ ادا کرنا پڑے گا جس طرح سے کہ کفارہ دیا جاتا ہے۔ خُذْ بِيَدِكَ ضِغْثًا: اپنے ہاتھ میں ایک مٹھا لے لے، فَاضْرِبْ بِّهٖ: اور اس کے ساتھ مار لے۔ کس کو مار لے؟ اپنے آپ کو، یا اپنی بیوی کو؟ دونوں قسم کی باتیں آپ کی خدمت میں عرض کردیں۔ ''اور تو حانث نہ ہو'' اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا: یہ تعریف ہے حضرت ایوب علیہ السلام کی، کہ ہم نے ان کو صابر پایا، بہت مشکلات میں ہم نے ان کو ڈالا، لیکن وہ اس کو برداشت ہی کرتے چلے گئے، آزمائش میں پورے اُترے، کوئی بے صبری کی بات انہوں نے نہیں کی، نِعْمَ الْعَبْدُ: بہت اچھے بندے تھے، اِنَّهٗۤ اَوَّابٌ: بے شک وہ اللہ کی طرف رُجوع کرنے والے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام قوتِ عملیہ اور علمیہ والے تھے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاذْكُرْ عِبٰدَنَاۤ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ: یاد کیجئے ہمارے بندے ابراہیم اور اسحاق اور یعقوب کو علیہم السلام۔ یعقوب پوتے ہیں اور حضرت ابراہیم دادا ہیں۔ اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ: ہاتھوں والے اور آنکھوں والے، یعنی یہ انبیاء علیہم السلام جن کا ذکر ہوا یہ ہاتھوں والے بھی تھے اور آنکھوں والے بھی تھے، ہاتھ اور آنکھ دونوں کا ذکر کرکے مراد یہ ہے کہ ان میں قوتِ عملیہ بھی تھی اور قوتِ علمیہ بھی تھی، آنکھ دیکھنے کا ذریعہ ہے جس سے معلومات حاصل ہوتی ہیں، اور کاموں کی نسبت ہاتھوں کی طرف ہوا ہی کرتی ہے، تو وہ صاحبِ بصیرت تھے، صاحبِ عمل تھے، اُن کی قوتِ عملیہ بھی اعلیٰ درجے کی تھی اور قوتِ بصیرت، قوتِ علمیہ بھی اعلیٰ درجے کی تھی، تو عضو کے ذکر سے مقصود وہ قوت ہوا کرتی ہے جو اس عضو سے حاصل ہوتی ہے، جیسے کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص دِل والا ہے، اب آپ جانتے ہیں کہ دِل تو ہر کسی کا ہوتا ہے، لیکن دِل والا کہہ کر اُس کی بہادری کی طرف یا حوصلے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہوتا ہے، ''بہت سخی ہے بہت بہادر ہے بہت دِل والا ہے۔'' اور ''فلاں کام کرنا دِل گردے والے کا کام ہے'' تو دِل گردہ تو ہر کسی میں ہوتا ہے، لیکن اس سے مراد ہی قوت اور ہمت ہے، کہ جو کوئی شخص قوت اور ہمت والا ہو حوصلے والا ہو برداشت والا ہو وہی کام کرسکتا ہے، اسی طرح سے یہاں جس وقت ہم یہ لفظ بولیں گے کہ یہ ہاتھوں والے تھے، تو کام چونکہ ہاتھوں کے ذریعے سے کیے جاتے ہیں، اس لیے اشارہ اس بات کی طرف ہوگیا، کہ ان کی قوتِ عملیہ اعلیٰ درجے کی تھی، '' آنکھوں والے تھے'' صاحبِ بصیرت تھے، ہر چیز کو دیکھتے تھے، سمجھتے تھے، علم ان کا کامل تھا، تو اُولِي الْاَيْدِيْ وَالْاَبْصَارِ کا یہ مفہوم ہوگیا۔

انبیاء علیہم السلام اور آخرت کی یاد

اِنَّاۤ اَخْلَصْنٰهُمْ بِخَالِصَةٍ ذِكْرَى الدَّارِ: ہم نے خالص کیا اُن کو ایک خالص بات کے ساتھ۔ خالصۃ سے بدل ہے ذِکْرَی

الدَّارِ، گھر کی یاد۔ ہم نے ایک خاص بات کے ساتھ خاص کیا، چُن لیا، یعنی ان کو ایک خاص بات کی توفیق دی، وہ ہے گھر کی یاد۔ دار سے دارِ آخرت مراد ہے۔ مطلب یہ ہوگیا کہ یہ آخرت کو یاد کرنے والے تھے، آخرت کو دار کے ساتھ تعبیر کیا کیونکہ حقیقت کے اعتبار سے گھر وہی ہے، دُنیا تو ایک سرائے فانی ہے جس میں انسان عارضی طور پر آیا ہے، چلا جائے گا۔ اسٹیشنوں پر اور بسوں کے اڈوں پر جس طرح سے مسافر خانے بنے ہوئے ہوتے ہیں، مسافر آتے ہیں، تھوڑی دیر ٹھہرتے ہیں، اپنا وقت آجاتا ہے تو آگے کوچ کر جاتے ہیں، تو یہ دُنیا بھی ایک قسم کا مسافر خانہ ہے، لاکھوں کی تعداد میں اس میں روز نفوس پیدا ہوتے ہیں، اور لاکھوں کی تعداد میں یہاں سے ہر روز کوچ کرتے ہیں، تو صحیح گھر اگر ہے تو آخرت ہی ہے، کہ جس میں جا کر بسنا ہے، اور پھر وہاں زوال نہیں ہے، اسی لیے حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''اَلدُّنْیَا دَارُ مَنْ لَّا دَارَ لَهٗ'' دُنیا اس شخص کا گھر ہے جس کا کوئی گھر نہیں،[1] یعنی اگر کسی شخص نے دُنیا کو ہی گھر سمجھا ہے، اور کوئی دوسرا گھر اس نے نہیں بسایا، تو یوں سمجھو کہ یہ بے گھر ہے، اس کا کوئی گھر نہیں ہے، دُنیا کو گھر سمجھا تھا، دُنیا چھوٹ جائے گی، اور اور کوئی گھر بنایا نہیں، تو بے گھر ہی ہوگا۔ تو صحیح گھر وہی ہے کہ جس میں انسان قیام کرے، جس میں دوام ہو، جہاں سے کوئی نکالے نہیں، جو اپنے سے چھوٹے نہیں، اور یہ بات اگر صادق آتی ہے تو آخرت کے گھر پر ہی صادق آتی ہے۔ تو انبیاء علیہم السلام کو اللہ تعالیٰ نے اس خالص بات کے لیے چُن لیا، کہ وہ آخرت کو یاد رکھتے تھے، جس سے اس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ آخرت کی یاد ہی اصل کے اعتبار سے سعادت کی کنجی ہے، اگر کسی شخص میں علم بھی ہے، کام کرنے کی ہمت بھی ہے، لیکن آخرت کی یاد نہیں، تو ایسے شخص کی صلاحیتیں اس کے لئے فتنہ بن جایا کرتی ہیں، اس کے لئے کامیابی کا ذریعہ نہیں بنا کرتیں، تو کامیابی تبھی ہوتی ہے کہ انسان میں قوتِ عمل بھی ہو، اور انسان کو علم بھی حاصل ہو جائے، ساتھ ساتھ آخرت کی یاد بھی ہو، آخرت کی یاد کے ساتھ انسان کا علم بھی نکھرتا ہے اور عمل بھی سیدھی لائن پر رہتا ہے، تو انبیاء علیہم السلام کی یہ خاص بات ذِکر کی کہ وہ آخرت کو یاد رکھنے والے تھے۔ وَاِنَّهُمْ عِنْدَنَا لَمِنَ الْمُصْطَفَيْنَ الْاَخْيَارِ: اور بے شک وہ ہمارے نزدیک البتہ چُنے ہوئے پسندیدہ لوگوں میں سے تھے۔ اَخیار خیر کی جمع ہے۔ مُصطفَین: اِصْطَفٰى يَصْطَفِيْ: چُن لینا۔ مصطفیٰ: چُنا ہوا۔ تو یہ اس کی جمع ہے...... وَاذْكُرْ اِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَذَا الْكِفْلِ: اور یاد کیجئے اسماعیل کو، اور الیسع کو، اور ذا الکفل کو۔ الیسع اور ذا الکفل کے تفصیلی حالات قرآن وحدیث میں نہیں آئے، صرف ناموں کے ساتھ ہی ان کا تعارف ہے، پہلے بھی ان کا ذِکر ہو چکا، اور حضرت اسماعیل علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحب زادہ ہیں۔ وَكُلٌّ مِّنَ الْاَخْيَارِ: یہ سارے کے سارے ہی پسندیدہ لوگوں میں سے تھے۔

انبیاء علیہم السلام کے ذِکر سے مقصود

هٰذَا ذِكْرٌ: یہ یاددہانی ہے، یہ نصیحت ہے جو ہو چکی۔ یاد ہوگا آپ کو! انبیاء علیہم السلام کا ذکر اس مناسبت سے آیا تھا کہ مشرکین کے مقابلے میں سرورِ کائنات ﷺ کو صبر اور استقامت کی تلقین کی گئی تھی، تو صبر و استقامت کی تلقین کرتے ہوئے انبیاء علیہم السلام کے یہ واقعات شروع کیے گئے تھے، حضرت داؤد علیہ السلام کا واقعہ بیان ہوا، حضرت سلیمان علیہ السلام کا، اور حضرت ایوب علیہ السلام کا، جن میں اُن کی

(۱) مسند احمد رقم ۲۴۴۱۹۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۴۲، کتاب الرقاق، فصل ثالث۔

اوّابیت، اللہ کی طرف رُجوع کرنا، اور اللہ کی یاد، یہ خاص طور پر ذکر کی گئی تھیں۔ اور ان حضرات کے ذکر سے مشرکین کے لئے بھی تنبیہ تھی، کہ کتنے بڑے بڑے یہ لوگ ہوئے، اللہ کے مقبول بندے تھے لیکن ہر وقت اللہ کو یاد کرتے تھے، آخرت کو یاد رکھتے تھے، دُنیا کے اندر اگر اُن کو شہنشاہی حاصل ہوئی، بادشاہت ملی، یا دوسری قسم کی عظمت حاصل ہوئی، تو وہ عظمت اللہ کی یاد سے غافل کرنے کا باعث نہ بنی، اور تم لوگ تھوڑی تھوڑی چیزوں پر ہی غرّہ ہو، اور غرور میں آ کے تکبّر میں آ کے اللہ تعالیٰ کو بھلائے ہوئے ہو، آخرت کو یاد نہیں کرتے، آخرت کے متعلق عقیدہ نہیں رکھتے، اس مناسبت سے انبیاء ؑ کے واقعات ذکر کئے گئے تھے، اب آگے آخرت کا ذکر تفصیلی آرہا ہے۔ هٰذَا ذِكْرٌ: یہ نصیحت ہے جو ہو چکی آپ کے سامنے، نصیحت کے طور پر یہ باتیں آگئیں۔

متقین کا انجام

وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ: اب آخرت میں جو جزا، سزا ہے، اس کی کچھ تفصیل کی جارہی ہے۔ بے شک متقین کے لئے اچھا ٹھکانا ہے۔ مآب: ٹھکانا۔ اٰبَ يَؤُبُ: لوٹنا۔ اوّاب: اسی سے ہی ہے، بہت زیادہ لوٹنے والا، اللہ کی طرف رجوع کرنے والا۔ اور حُسنِ مآب کے اندر صفت کی اضافت موصوف کی طرف ہے (آلوسی)۔ اللہ سے ڈرنے والوں کے لئے بہت اچھا ٹھکانا ہے۔ اچھے ٹھکانے کا بیان یہ ہے جَنّٰتِ عَدْنٍ: ہیشگی کے باغات۔ مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ: ان متقین کے لئے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے، وہ جو باغات ہیں ہیشگی کے اُن کے دروازے اِن متقین کے لئے کھلے ہوئے ہوں گے، یہ ایک اعزاز ہے، جب کسی مہمان کی آمد ہوتی ہے تو لوگ دروازے کھول کے دروازوں پر کھڑے ہوئے استقبال کیا کرتے ہیں، مہمانوں کا انتظار کیا کرتے ہیں، اور اگر کسی مہمان کے آنے کی توقع ہو لیکن گھر والے دروازے بند کر کے بیٹھے رہیں، اور وہ باہر آ کر دروازہ کھٹکھٹاتا رہے اور اندر سے کوئی بولے ہی نہ، یا دیر سے نکلے، مہمان کو دروازے پہ انتظار کرنا پڑے، یہ اعزاز نہیں ہے۔ متقین چونکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مہمان ہوں گے، اور اِن کا اِکرام اس طرح سے ہوگا جس طرح سے مہمانوں کا ہوا کرتا ہے۔ تو جنات کے دروازے کھول دیے جائیں گے، فرشتے وہاں استقبال کے لئے کھڑے ہوں گے، تَتَلَقّٰىهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ جس طرح قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا ہے (سورۂ انبیاء: ۱۰۷) ان کا استقبال فرشتے کریں گے، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ، اس طرح سے ان پر آوازیں ڈالی جائیں گی، طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِيْنَ (سورۂ زمر: ۷۳) بڑے اچھے لوگ ہو، تم بڑی اچھی حالت میں ہو، آ جاؤ اندر ہمیشہ کے لئے، کبھی تمہیں نکالا نہیں جائے گا، یہ استقبالیہ فقرے ہیں جو مہمان کے اعزاز اور اکرام کے لئے بولے جایا کرتے ہیں، اور اس کے مقابلے میں جہنّم والوں کے لئے جو بات ذکر کی گئی، سورۂ زمر کے آخر میں آئے گا، کہ جب وہ آئیں گے تو دروازے کھولے جائیں گے، جس طرح سے جیل کا دروازہ بند ہی ہوتا ہے، جب مجرم لایا جاتا ہے تو دروزہ کھولتے ہیں، کھول کے اس کو اندر دھکیل کے دروازہ بند کر دیتے ہیں۔ تو "جنتیوں کے لئے اس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے، مُّفَتَّحَةً لَّهُمُ الْاَبْوَابُ: کھلے ہوئے ہوں گے ان کے لئے دروازے، مُتَّكِـِٕيْنَ فِيْهَا: ٹیک لگانے والے ہوں گے، تکیہ لگا کے بیٹھنے والے ہوں گے ان باغات میں۔ يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِفَاكِهَةٍ كَثِيْرَةٍ وَّشَرَابٍ: دَعَا يَدْعُوْ: بلانا، منگوانا۔ منگوائیں گے ان باغات میں بہت میوہ اور پینے کی چیز۔ جس طرح ایک شاہانہ ٹھاٹھ ہوتی ہے، تختوں پہ بیٹھے ہیں تکیے لگا کے، خدام

آگے پیچھے رہے ہیں، جس پھل کو جی چاہے گا اشارہ کریں گے، وہ فوراً ان کے پاس آئے گا، جو چیز پینے کو جی چاہے گا وہ چیز ملے گی، جیسے بہت ہی عیش وعشرت کی مجلس ہوا کرتی ہے، تو اس میں کھانے کی چیزیں بھی مہمانوں کے سامنے پیش کی جاتی ہیں، پینے کی چیزیں بھی پیش کی جاتی ہیں، تو ہر قسم کا عیش اور آرام انہیں حاصل ہوگا، وَعِنْدَهُمْ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اَتْرَابٌ: اور ان کے پاس ایسی عورتیں ہوں گی جو نظر کو نیچا رکھنے والی ہیں، نظر کو بند رکھنے والی ہیں۔ اَتْرَابٌ: تِرْبٌ کی جمع ہے، ہم عمر۔ یعنی ان جنتیوں کے ساتھ عمر کا تناسب ہوگا، اور جس وقت عمر کا تناسب ہوا کرتا ہے تو اُنس اور محبت جلدی ہوجایا کرتی ہے۔ عمر کے فرق کی صورت میں جلدی سے مناسبت پیدا نہیں ہوا کرتی۔ ''جنتیوں کے ساتھ وہ ہم عمر ہوں گی، اور اپنی نظروں کو جھکائے ہوئے ہوں گی'' اپنے خاوند کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھیں گی، جس میں ان کی عفت اور پاک دامنی کی طرف اشارہ ہے۔ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ: یہ ہے وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو، لِيَوْمِ الْحِسَابِ: حساب کے دن۔ لام وقت کے معنی میں ہے وقت یومِ الحساب۔ حساب کے دِن کے لئے جس چیز کا تم وعدہ دیے جاتے ہو یہ وہ چیز ہے۔ اِنَّ هٰذَا لَرِزْقُنَا: بے شک یہ ہمارا رزق ہے، جو ہم نے جنتیوں کو دیا، متقین کو دیا، مَا لَهٗ مِنْ نَّفَادٍ: نہیں ہے اس کے لئے ختم ہونا، نَفاد ختم ہونے کو کہتے ہیں، یہ رزق ختم نہیں ہوگا، یہ بھی اسی طرح سے قائم دائم رہے گا جس طرح سے جنتیوں کی زندگی جنت کے اندر قائم دائم رہے گی۔ یہ نَفِدَ کا لفظ پہلے بھی آیا تھا، مَّا نَفِدَتْ كَلِمٰتُ اللّٰهِ (سورۂ لقمان: ۲۷) مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ (سورۂ نحل: ۹۶) جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہوجائے گا، جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ باقی رہنے والا ہے۔ تو نَفاد ختم ہونے کو کہتے ہیں، ''یہ ہمارا رزق ہے، اس کے لئے ختم ہونا نہیں۔''

سرکشوں کا انجام

هٰذَا: یہ بات تو ہوچکی، آپ نے سُن لی، اب دوسرا پہلو لے لیجئے۔ وَاِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ: جس طرح پیچھے آیا اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ، یہاں آگیا اِنَّ لِلطّٰغِيْنَ لَشَرَّ مَاٰبٍ: تو یہ مقابلۃً دوسرا پہلو آگیا۔ بے شک سرکشوں کے لئے بُرا ٹھکانا ہے۔ مآب: ٹھکانا۔ شر مآب: بُرا ٹھکانا۔ طاغین: طُغیان سے ہے، سرکش قسم کے لوگ، جو یہاں فرماں بردار نہیں ہیں، اللہ کے احکام کو مانتے نہیں۔ ''بے شک سرکشوں کے لئے بُرا ٹھکانا ہے'' بُرے ٹھکانے کا بیان جَهَنَّمَ آگیا، جیسے وہاں جَنّٰتِ عَدْنٍ بیان آیا تھا۔ ''وہ بُرا ٹھکانا جہنم ہے'' يَصْلَوْنَهَا ۚ فَبِئْسَ الْمِهَادُ: داخل ہوں گے یہ لوگ اس جہنم میں، پھر وہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ مِہاد: اصل میں آرام کی جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان آرام کرتا ہے، تو بئس المهاد: وہ بہت ہی بُری جگہ ہے، بہت بُرا ٹھکانا ہے۔ هٰذَا ۙ فَلْيَذُوْقُوْهُ حَمِيْمٌ وَّغَسَّاقٌ: هٰذا حمیمٌ وغساقٌ فلیذوقوہُ، یہ گرم پانی اور غساق ہے۔ غساق: کہتے ہیں پیپ کو، لہو کو، زخموں سے جو چیز ٹپکا کرتی ہے یہ زرد قسم کا پانی وہ غساق کا مصداق ہے، فَلْيَذُوْقُوْهُ: چاہیے کہ یہ لوگ اس کا مزہ لیں، اس کو چکھیں، یعنی جس طرح سے وہاں اُن کو 'فاکھہ کثیر'' اور ''شراب'' دیا جائے گا، ہر قسم کے لذیذ سے لذیذ تر میوے اُن کے سامنے پیش کیے جائیں گے، عمدہ سے عمدہ مشروبات پیش کیے جائیں گے، ان کے سامنے مہمانی جو ہوگی وہ حمیم اور غساق کی ہوگی۔ تو جہنمیوں کو اس کا مزہ چکھنا چاہیے، یعنی کھانے پینے کے لئے ان کو یہ چیزیں دی جائیں گی، وَّاٰخَرُ مِنْ شَكْلِهٖۤ اَزْوَاجٌ: یہ تو بطور نمونہ کے ذکر کردیا حمیم اور غساق۔ ازواج: مختلف قسمیں۔ اور بھی

اس سے ملتا جلتا کئی قسم کا عذاب۔ اٰخَرُ: اور۔ مِنْ شَكْلِهٖ: اسی شکل کا، جو پیچھے حمیم اور غساق آیا ہے۔ ''اسی شکل کا اور بھی کئی قسم کا عذاب۔'' اَزْوَاج: کئی قسمیں۔ یہاں عذاب کی کئی قسمیں مراد ہیں۔ ''اور بھی اس سے ملتا جلتا کئی قسم کا عذاب'' اس آیت کا ترجمہ یوں ہی کرتا ہے، ''اور بھی اس کی شکل کا کئی قسم کا عذاب۔''

اہلِ جنّت کا اتفاق اور اہلِ جہنّم کا آپس میں جھگڑا

هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ ۚ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ ۚ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ: جس طرح سے جنتیوں کے آرام کی ایک یہ بات بھی نقل کی جاتی ہے کہ یہ آپس میں محبت کے ساتھ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، ایک دوسرے کو مرحبا کہیں گے، اور خوشی کے ساتھ ملیں گے، مجلسیں لگائیں گے اور آپس میں دُنیا کے تذکرے بھی کریں گے، اللہ کی رحمت کو یاد کریں گے، دوستوں کا تذکرہ بھی ہوگا، آخر اللہ کی حمد وثنا کے اُوپر مجلس ختم ہوگی۔ متقابلین کی صفت آئی ہے کہ ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، کسی کے دِل میں کوئی کینہ بغض نہیں ہوگا، ایک دوسرے سے کوئی لڑے بھڑے گا نہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ سارے کے سارے جنّتی اس طرح سے ہوں گے جس طرح سے ان کے سینے میں ایک ہی دِل ہے۔[1] یعنی خواہشات سب کی ایک جیسی ہوں گی، دِلوں میں اختلاف نہیں ہوگا کہ کوئی کچھ چاہے اور کوئی کچھ چاہے۔ اور جہنمیوں کے اندر آپس میں اختلاف ہوگا، جس طرح سے اُن کو ظاہری طور پر عذاب ہوگا گرم پانی کا، آگ کا، کھانے کے لئے پیپ دی جائے گی، تو اسی طرح سے یہ رُوحانی عذاب ہے کہ ان کی آپس میں تُوتکار بھی ہوگی، اور آپس میں ان کے جُوتے بھی چلیں گے، گالی گلوچ کریں گے، لڑیں گے، جھگڑیں گے، تو آپ جانتے ہیں کہ جن گھروں کے اندر یہ لڑائی پڑی رہے وہ تو خوش حال بھی ہوں تو ان کی زندگی تلخ ہوجاتی ہے، چہ جائیکہ اُدھر تنگی بھی ہو، کھانے کو نہیں ملتا، پہننے کو نہیں ملتا، سردی گرمی کا دفاع موجود نہیں ہے، اور اس کے باوجود گھر میں لڑائی بھی ہے، تو اس سے بڑھ کے اور عذاب کیا ہوسکتا ہے؟ تو جہنمیوں میں یہی ہوگا کہ ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف علیحدہ، اور یہ رُوحانی کوفت علیحدہ، کہ کوئی ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی نہیں کرے گا، بلکہ ایک دوسرے کے اُوپر لعنت پھٹکار کریں گے، ایک دوسرے کے اُوپر الزام دیں گے، آگے یہ نقشہ کھینچا ہے۔ هٰذَا فَوْجٌ مُّقْتَحِمٌ مَّعَكُمْ: ترتیب یوں معلوم ہوتی ہے کہ لیڈروں کو اور قائدین کو تو پہلے پہنچا دیا جائے گا جہنّم میں، اور وہ جس وقت جہنّم میں بیٹھے ہوں گے تو ان کے تابعین، متبعین، پچھلگ لوگ، دُنیا کے اندر جو ضعفاء کا مصداق تھے وہ بعد میں آئیں گے، تو جب وہ اس جماعت کو آتا ہوا دیکھیں گے تو پھر آپس میں ایک دوسرے کو کہیں گے، کہ یہ فوج بھی تمہارے ساتھ جہنّم میں گھسنے والی ہے۔ مقتحم کا معنی گھسنے والی۔ یہ جماعت گھسنے والی ہے تمہارے ساتھ۔ لَا مَرْحَبًا بِهِمْ: ان کے لئے مرحبا نہیں، جب کسی سے ناراضگی کا اظہار کرنا ہو تو اس وقت ایسے ہی کہتے ہیں: لا مرحبا، لا اهلًا ولا سهلًا۔ آنے والے مہمان کو جس طرح سے ''اهلًا وسهلًا ومرحبًا'' کہا جاتا ہے کہ آپ اپنے گھر ہی آرہے ہیں، آپ نرم زمین پہ آرہے ہیں، اور آپ کے لے کشادہ جگہ موجود ہے، ہمارے دلوں میں وسعت ہے، ہمارے گھر میں وسعت ہے، اس قسم کی مہمان کے سامنے اس کی حوصلہ افزائی کے لئے کی جاتی ہیں۔

(۱) بخاری ۱/۴۶۰، باب ماجاء فی صفة الجنة۔ مشکوٰۃ ۲/۴۹۶، باب صفة الجنة، فصل اول۔ قُلُوْبُهُمْ عَلٰى قَلْبِ رَجُلٍ وَّاحِدٍ لَا اخْتِلَافَ بَيْنَهُمْ وَلَا تَبَاغُضَ.

اور جب کسی سے ناراضگی کا اظہار کرنا ہو، وہ سامنے آ رہا ہو تو کہتے ہیں: ''لا اھلًا ولا سھلًا ولا مرحبًا'' کہ نہ تمہارے لیے یہاں اہل نہ سہل نہ مرحبا، کچھ بھی نہیں، تمہیں کوئی خوش آمدید کہنے والا یہاں موجود نہیں ہے، تو لَا مَرْحَبًاۢ بِهِمْ کا یہی معنی ہے، ان کو مرحبا نہیں، یعنی ان کو مرحبا نہیں کہا جائے گا، وہ آپس میں کہیں گے کہ ان کے لئے مرحبا نہیں ہے، ان کے لئے ہمارے پاس کوئی جگہ نہیں، یعنی ان کا آنا ہمارے لیے کوئی باعثِ خوشی نہیں ہے۔ یہ اُن کی طرف سے بیزاری کا اظہار ہوگا۔ اِنَّهُمْ صَالُوا النَّارِ: یہ بھی جہنم میں داخل ہونے والے ہیں، یعنی وہ کہیں گے ''ان کے لئے کوئی مرحبا نہیں، کوئی خوش آمدید نہیں، یہ بھی جہنم میں داخل ہونے والے ہیں''، آگے جب وہ سنیں گے کہ یہ ہمیں لَا مَرْحَبًا کہہ رہے ہیں، تو وہ آگے سے کہیں گے کہ قَالُوْا بَلْ اَنْتُمْ لَا مَرْحَبًاۢ بِكُمْ: کہیں گے بلکہ تم ہی، کہ تمہارے لیے کوئی مرحبا نہیں، تم پہ لعنت ہے، تم پہ پھٹکار ہے، ''تمہارے لیے کوئی مرحبا نہیں'' اَنْتُمْ قَدَّمْتُمُوْهُ لَنَا: تم اس عذاب کو ہمارے سامنے لائے ہو۔ فَبِئْسَ الْقَرَارُ: یہ بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے۔ تمہاری اِقتدا کی وجہ سے، تمہارے پیچھے لگنے کی وجہ سے تو ہم اس جہنم میں آئے، اور آج ہمیں دیکھ دیکھ کے تم ہمیں لَا مَرْحَبًا کہہ رہے ہو، یہ لَا مَرْحَبًا تمہارے لیے ہے، تم اس عذاب کو ہمارے سامنے لائے ہو۔ فَبِئْسَ الْقَرَارُ: بہت ہی بُرا ٹھکانا ہے، قَالُوْا رَبَّنَا مَنْ قَدَّمَ لَنَا هٰذَا: اسی آپس کی لڑائی بھڑائی کے اندر پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے دُعا کریں گے، کہیں گے کہ اے ہمارے ربّ! جو شخص اس عذاب کو ہمارے سامنے لایا ہے، فَزِدْهُ عَذَابًا ضِعْفًا فِي النَّارِ: اس کو زیادہ دے عذاب دُگنا جہنم میں، اس کو جہنم کے اندر دُگنا عذاب دے، اس طرح سے اپنے دِل کی بھڑاس نکالیں گے ایک دوسرے کے لئے بددُعائیں کر کے۔

جہنمی کن لوگوں کو یاد کریں گے

وَقَالُوْا: پھر وہ جہنمی آپس میں تذکرہ کریں گے، کہیں گے کہ مَا لَنَا: کیا ہو گیا ہمیں، لَا نَرٰى رِجَالًا: نہیں دیکھتے ہم کچھ لوگوں کو، كُنَّا نَعُدُّهُمْ مِّنَ الْاَشْرَارِ: جن کو ہم اَشرار میں شمار کیا کرتے تھے۔ اَشرار شر کی جمع ہے۔ جن کو ہم بُرا کہا کرتے تھے، جن کو ہم سمجھتے تھے کہ یہ شرارتی لوگ ہیں، انہوں نے آ کے پھوٹ ڈال دی، فتنے اُٹھا دیے، مراد اس سے مؤمنین ہیں، کہ جس وقت اللہ کا ایک نبی آتا ہے، آ کے دعوت دیتا ہے اسلام کی ایمان کی، تو لوگ اس کے ساتھ مل جاتے ہیں، اور ان کے ساتھ ملنے کی وجہ سے قوم میں پھوٹ تو پڑتی ہے، تو مشرکین کہتے تھے یہ شرارتی لوگ ہیں، دیکھو! انہوں نے کس طرح سے آ کے فساد برپا کر دیا، بڑے بُرے لوگ ہیں، دیکھو! کس طرح سے یہ آلہہ کی توہین کرتے ہیں، ہمارے معبودوں کو کس طرح سے بُرا بھلا کہتے ہیں، ہمارے آبا وَاجداد کو جہنمی کہتے ہیں، بڑے بُرے لوگ ہیں۔ تو جن کو ہم بُرے شمار کیا کرتے تھے، ہمیں کیا ہو گیا وہ آج یہاں نظر نہیں آتے، یعنی جس طرح سے جنتی یاد کریں گے اپنے دوستوں کو، سورۂ صافات میں آیا تھا کہ ایک جنتی اپنے دوست کو یاد کرے گا جو اس کے سامنے آخرت کا انکار کیا کرتا تھا، پھر وہ اُس کو جھانکے گا، وہ جہنم میں نظر آئے گا، یہ واقعہ آپ کے سامنے گزر چکا، تو اسی طرح سے جہنمی بھی یاد کریں گے اپنے ان دوستوں کو جن کو کہا کرتے تھے یہ بڑے بُرے لوگ ہیں، دیکھو! آلہہ کی توہین کرتے ہیں، معبودوں کو بُرا بھلا

کہتے ہیں، ہمارے آباء واجداد کو جہنمی کہتے ہیں، باپ دادے کے طریقے کو ضلالت کہتے ہیں، بڑے بڑے لوگ ہیں، تو جن کو ہم بُرے کہا کرتے تھے، بُرے شمار کیا کرتے تھے، کیا ہو گیا کہ آج ہمیں وہ نظر نہیں آتے؟ اَتَّخَذْنٰهُمْ سِخْرِيًّا اَمْ زَاغَتْ عَنْهُمُ الْاَبْصَارُ: اَتَّخَذْنٰهُمْ یہ اصل میں تھا: اَاِتَّخَذْنٰهُمْ کیا ہم نے ان کو ٹھٹھا بنایا، یا ان سے آنکھیں کج ہو گئیں؟ یعنی وہ واقع میں بُرے نہیں تھے، ہم ان کا ایسے ہی مذاق کرتے رہے، یا تھے تو واقعی بُرے لیکن جہنم میں پڑے ہوئے ہمیں نظر نہیں آتے، تو واقعہ پھر ان کے سامنے آئے گا کہ وہ جہنم میں نہیں ہیں، بلکہ وہ اللہ کے مقبول بندے تھے، اللہ نے ان کو جنت کے اندر یہ یہ نعمتیں دیں، جیسا کہ سورۂ مؤمنون کے آخر میں آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کہے گا کہ میرے ایسے بندے تھے جن کو تم یوں کیا کرتے تھے، اُن کی ہنسی مذاق اُڑایا کرتے تھے، آج میں نے ان کو نوازا ہے، اور ان کو یہ نعمتیں دی ہیں۔ یہ مستقل ان کے لئے ایک رُوحانی تکلیف ہوگی، اپنی مصیبت کے ساتھ ساتھ اگر انسان دیکھے کہ میرا مخالف، میرا دُشمن خوش حال ہے، تو یہ انسان کے لئے مستقل تکلیف ہوتی ہے، جہنمیوں کے لئے ایک یہ بھی عذاب کا پہلو ہے کہ ان کے سامنے آئے گا، کہ جن کو ہم بُرا کہا کرتے تھے، آج وہ خوش حال ہیں اور ہمارا یہ حال ہو رہا ہے، ''کیا ہم نے اُن کو مذاق بنایا یا ان سے آنکھیں کج ہو گئیں'' کہ وہ نظر نہیں آ رہے، اِنَّ ذٰلِكَ لَحَقٌّ تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ: اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''یہ بات البتہ بالکل حق ہے، واقع کے مطابق ہے یعنی جہنمیوں کا آپس میں جھگڑنا'' یہ جہنمیوں کے جھگڑنے کا قصہ جو ہم نے آپ کو سُنایا ہے اس کو ایسے نہ سمجھ لیجیو کہ یہ کوئی افسانہ ہے، بالکل حق اور سچی بات ہے، ایسے ہی ہوگا، اور جہنمی آپس میں یوں ہی جھگڑیں گے۔

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ﴿٦٥﴾ رَبُّ السَّمٰوٰتِ

آپ کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تو ڈرانے والا ہوں، اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو کہ اکیلا ہے سب کو سنبھالنے والا ہے ﴿۶۵﴾ وہ رَبّ ہے آسمانوں کا

وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ﴿٦٦﴾ قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ ﴿٦٧﴾ اَنْتُمْ عَنْهُ

اور زمین کا اور ان چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، وہ زبردست ہے مغفرت والا ہے ﴿۶۶﴾ آپ کہہ دیجئے یہ بہت بڑی خبر ہے ﴿۶۷﴾ جس سے تم

مُعْرِضُوْنَ ﴿٦٨﴾ مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰٓى اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ﴿٦٩﴾ اِنْ يُّوْحٰٓى اِلَيَّ

اعراض کر رہے ہو ﴿۶۸﴾ مجھے کوئی علم نہیں ملأ اعلیٰ کا جبکہ آپس میں وہ جھگڑتے ہیں ﴿۶۹﴾ نہیں وحی کی جاتی میری طرف

اِلَّآ اَنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿٧٠﴾ اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ

مگر اسی بات کی کہ میں تو صریح ڈرانے والا ہوں ﴿۷۰﴾ جبکہ کہا تیرے رَبّ نے فرشتوں کو: بے شک میں پیدا کرنے والا ہوں ایک بشر

طِيْنٍ ۝٧١ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ۝٧٢ فَسَجَدَ

گارے مٹی سے (٧١) جس وقت میں اس کو دُرست کرلوں اور اس کے اندر اپنی رُوح ڈال دُوں پس گر پڑو تم اس کے لئے سجدہ کرنے والے (٧٢) سجدہ کیا

الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۝٧٣ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اِسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝٧٤

سب فرشتوں نے اکٹھے ہی (٧٣) سوائے ابلیس کے، وہ متکبر ہوگیا اور کافروں میں سے ہوگیا (٧٤)

قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ ؕ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ

اللہ نے کہا کہ اے ابلیس! کس چیز نے روکا تجھے سجدہ کرنے سے اس چیز کے لئے جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا، کیا تُو نے اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیا، یا تو

مِنَ الْعَالِيْنَ ۝٧٥ قَالَ اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ ؕ خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ ۝٧٦

ہے ہی بڑے لوگوں میں سے؟ (٧٥) اس نے کہا: میں اس سے بہتر ہوں، مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے (٧٦)

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۝٧٧ وَّاِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْٓ اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ۝٧٨

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نکل جا یہاں سے! بے شک تُو مردود ہے (٧٧) اور تیرے اُوپر لعنت ہے قیامت کے دِن تک (٧٨)

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ۝٧٩ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ

ابلیس کہنے لگا کہ اے میرے ربّ! مجھے مہلت دے دے اس دن تک جس میں لوگ اُٹھائے جائیں گے (٧٩) اللہ نے فرمایا بے شک تو

الْمُنْظَرِيْنَ ۝٨٠ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ۝٨١ قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٨٢ اِلَّا

مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے (٨٠) وقتِ معلوم کے دِن تک (٨١) وہ کہنے لگا کہ تیری عزّت کی قسم! البتہ ضرور گمراہ کروں گا میں ان سب کو (٨٢) مگر

عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ ۝٨٣ قَالَ فَالْحَقُّ ۡ وَالْحَقَّ اَقُوْلُ ۝٨٤ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ

تیرے بندے ان میں سے جو چُنے ہوئے ہوں گے (٨٣) اللہ نے فرمایا: یہ بات حق بات اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں (٨٤) البتہ ضرور بھر دُوں گا میں جہنم کو

مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۝٨٥ قُلْ مَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ وَّمَآ اَنَا

تجھ سے اور ان لوگوں سے جو تیرے پیچھے لگیں ان بنی آدم میں سے سب کو اکٹھا کرکے (٨٥) آپ کہہ دیجئے کہ میں اس پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، اور نہ

مِنَ الْمُتَكَلِّفِيْنَ ۝٨٦ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝٨٧ وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ ۝٨٨

میں بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں (٨٦) نہیں ہے یہ قرآن مگر نصیحت سب جہانوں کے لئے (٨٧) البتہ ضرور جان لو گے تم اس کی خبر کچھ وقت کے بعد (٨٨)

تفسیر

اِثباتِ رِسالت اور صفاتِ باری

قُلْ اِنَّمَآ اَنَا مُنْذِرٌ ۖ وَّمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ: پھر یہ عود ہو گیا پہلے مضمون کی طرف۔ جیسے ابتدا میں توحید کا تذکرہ تھا، اور سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا، تو سورت کے آخر میں پھر وہی مضمون آ گیا۔ آپ انہیں کہہ دیجئے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تو ڈرانے والا ہوں، تمہیں منا لینا اور سیدھے راستے پہ لے آنا میرے بس کی بات نہیں، میں تو ڈرانے والا ہوں، اور کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے جو کہ اکیلا ہے اور سب کو سنبھالنے والا ہے۔ قہار کا معنیٰ ہوتا ہے کنٹرولر جو سب کو کنٹرول میں لے لے اور کوئی شخص بھی اس کے کنٹرول سے باہر نہ ہو، تو ہے بھی اکیلا اور ہے بھی سب کو سنبھالنے والا۔ وہ تعجب کے طور پر کہتے تھے اَجَعَلَ الْاٰلِهَةَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۖ اِنَّ هٰذَا لَشَيْءٌ عُجَابٌ (سورۂ ص: ۵) اس نے اتنے سارے خداؤں کا ایک ہی بنا دیا؟ یہ بڑی عجیب بات ہے، جس کا حاصل یہ تھا کہ اتنی بڑی کائنات کو وہ اکیلا کیسے سنبھالے، تو اللہ تعالیٰ کی صفات میں ''قہار'' کی صفت کو ذکر کیا جاتا ہے، جس کا معنیٰ یہ ہے کہ وہ سب پر غالب ہے، سب کو سنبھالنے والا ہے، کوئی اس کے کنٹرول سے باہر نہیں ہے،'' کوئی معبود نہیں سوائے اللہ کے، وہ اکیلا ہے اور قہار ہے، دباؤ والا ہے، سب کو سنبھالنے والا ہے۔'' رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا: وہ رَبّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور اُن چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں، الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ: وہ زبردست ہے اور مغفرت والا ہے، بخشنے والا ہے، اپنے بندوں کی کوتاہیوں کو معاف کرتا ہے جس کی وجہ سے جلدی عذاب نہیں آتا، بندے کتنی گستاخیاں کرتے ہیں، کتنی کوتاہیاں کرتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ غفار ہے، بہت حد تک درگزر کرتا ہے۔

قُلْ هُوَ نَبَؤٌا عَظِيْمٌ: آپ کہہ دیجئے یہ بہت بڑی خبر ہے۔ ''ھو'' ضمیر کا مرجع بعض مفسرین نے رسول اللہ ﷺ کے اپنے دعوئ رسالت کو بنایا (عام تفاسیر) کہ میں نے یہ جو تمہیں خبر دی ہے کہ میں منذر ہوں، میں ڈرانے والا ہوں، یہ معمولی خبر نہیں، بہت بڑی خبر ہے جس سے تم اِعراض کر رہے ہو اور اس بات کی طرف تم دھیان ہی نہیں دے رہے۔ یا ''ھو'' ضمیر کا مرجع توحید ہے جو مَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ میں مذکور ہے (نیسابوری) کہ یہ توحید کی خبر جو میں تمہیں دے رہا ہوں یہ بہت عظیم خبر ہے، اور تم اس سے اِعراض کر رہے ہو، تم اس کی طرف دھیان ہی نہیں دے رہے۔ یا ''ھو'' ضمیر لوٹ سکتی ہے تَخَاصُمُ اَهْلِ النَّارِ کی طرف (آلوسی) کہ جہنمیوں کے جھگڑے کی خبر جو میں نے دی ہے کہ یوں طاغون لوگ سرکش جو اللہ کے نافرمان ہیں جہنم میں جائیں گے، اور وہاں جا کر یوں آپس میں جھگڑیں گے، اور ان کی آپس میں لڑائی بھڑائی ہو گی، رُوحانی جسمانی عذاب میں مبتلا ہوں گے، یہ بہت بڑی خبر ہے جس کی اہمیت تمہیں محسوس کرنی چاہیے، اور تم اس سے اعراض کرنے والے ہو، تم اس سے متاثر ہی نہیں ہوتے۔

دلیلِ نبوّت اور مشرکین کو تنبیہ

باقی آگے دلیلِ نبوّت ہے، کہ میں یہ جو خبریں تمہیں دے رہا ہوں مَلَاِ اعلیٰ کی، کہ فرشتوں میں یہ گفتگو ہوئی، جہنمی یہ گفتگو

کریں گے، مجھے ان چیزوں کا کیا علم ہے؟ اگر اللہ نہ بتاتا، نہ تو میرے پاس کوئی ذریعہ ہے، نہ میں نے پُرانی کتابیں، پچھلی کتابیں پڑھیں کہ وہاں سے نقل کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ مجھے بتاتے ہیں تو میں تمہیں خبر دیتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کا بتانا یہی میری نبوّت کی دلیل ہے، ورنہ مَلَإِ اعلیٰ میں کیا گفتگو ہوتی ہے؟ جہنمی آپس میں کیا گفتگو کریں گے؟ فرشتے آپس میں کن باتوں میں بحث مباحثہ کرتے ہیں؟ مجھے ان باتوں کی کیا خبر؟ یہ تو اللہ تعالیٰ نے بتائیں تو پتا چلا۔ اب مَلَإِ اعلیٰ کی ایک گفتگو جو کہ آدم علیہ السلام کے پیدا کرنے کے وقت ہوئی تھی، بطور نمونے کے اس کو آگے نقل کیا جا رہا ہے، کہ دیکھو! یہ واقعہ جو نقل کر رہا ہوں کہ آدم علیہ السلام کو پیدا کرتے وقت اللہ اور فرشتوں کے درمیان میں کیا گفتگو ہوئی تھی، یہ اللہ کے بتانے کے بغیر کیسے پتا چل سکتا ہے، یہ علوم جو تمہارے سامنے ظاہر کرتا ہوں تو یہ میرے لیے دلیلِ نبوّت ہیں، تو اس واقعے کا نقل کرنا یوں تو دلیلِ نبوّت بن گیا، اور مشرکین کو اس بات میں تنبیہ ہے کہ تم دیکھو! تم شیطان کے راستے پر چل رہے ہو، یا آدم علیہ السلام کی نسل ہو کے آدم کی اولاد کی طرح آدم علیہ السلام کے طریقے پر چلنے والے ہو؟ آدم علیہ السلام کا طریقہ تو اللہ کی فرماں برداری ہے، اور اِبلیس اس وقت سے آدم علیہ السلام کا دُشمن ہے جب سجدہ نہ کرنے کی وجہ سے اُس کو ٹھکرا دیا گیا، تو اللہ کے حکم کی نافرمانی کرنے کی بنا پر وہ مردود ہوا، اور آدم علیہ السلام کی نسل سے وہ انتقام لے رہا ہے، اور تم لوگ دانستہ نادانستہ اِبلیس کے شکار ہو گئے ہو، تو انہوں نے جو طغیان اور سرکشی اختیار کر رکھی تھی اللہ کے اَحکام کے سامنے، تو اِبلیس کا واقعہ اُن کے لیے ذِکر کیا جا رہا ہے، کہ اللہ کے حکم کو نہ ماننا اِبلیس کی سُنّت ہے آدم علیہ السلام کی نہیں، اس مناسبت سے آگے آدم علیہ السلام اور اِبلیس کا واقعہ ذِکر کیا جا رہا ہے۔ اور چونکہ یہ مَلَإِ اعلیٰ کی گفتگو ہے، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نقل کر رہے ہیں، یہ علامت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو علم دیا، اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ اطلاع دی، اور یہی آپ کے لیے دلیلِ نبوّت ہے، یوں اس کا ربط ماقبل کے ساتھ ہو جائے گا۔

مَا كَانَ لِيَ مِنْ عِلْمٍۭ بِالْمَلَاِ الْاَعْلٰۤى: مَلَأ جماعت کو کہتے ہیں، اعلیٰ: عالی شان، اوپر والی جماعت، اس سے مراد فرشتے ہیں، "مجھے کوئی علم نہیں مَلَإِ اعلیٰ کا، اِذْ یَخْتَصِمُوْنَ: جبکہ آپس میں وہ جھگڑتے ہیں، آپس میں گفتگو کرتے ہیں، کسی مسئلے پر بحث مباحثہ کرتے ہیں، مذاکرہ کرتے ہیں، تو مجھے کیا پتا، "نہیں ہے مجھے کوئی علم مَلَإِ اعلیٰ کا، اُوپر کی مجلس کا، عالی شان مجلس کا" یعنی فرشتوں کی مجلس، "جبکہ وہ آپس میں گفتگو کرتے ہیں" اِنْ یُّوْحٰۤى اِلَیَّ اِلَّاۤ اَنَّمَاۤ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ: نہیں وحی کی جاتی میری طرف مگر اسی بات کی کہ میں تو صریح ڈرانے والا ہوں، مجھے اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی کے ذریعے سے یہ منصب دیا ہے کہ میں کھول کھول کے بیان کرنے والا ہوں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو بات آتی ہے وہ میں تمہیں بتا دیتا ہوں۔ نذیر مبین اُس موقع محل کے مطابق ذکر کیا جا رہا ہے ورنہ جس طرح سے آپ نذیر ہیں اسی طرح سے بشیر بھی ہیں، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اگر بشارت کا مضمون آتا ہے وہ تمہیں سنا دیتا ہوں، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی ڈرانے کا مضمون آتا ہے تو وہ تمہیں سنا دیتا ہوں۔

آدم علیہ السلام کے سامنے فرشتوں کو سجدہ کرنے کا حکم

اِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ: اِذْ قَالَ کا تعلق یا تو یَخْتَصِمُوْنَ سے لگا لیجیے۔ جبکہ وہ آپس میں گفتگو کر رہے تھے جب یہ واقعہ پیش آیا۔ یا دی اُذْکُرْ نکال لیں (آلوسی) قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ کہا تیرے رَبّ نے فرشتوں کو، اِنِّیْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ طِیْنٍ: بے شک

میں پیدا کرنے والا ہوں بشر مٹی سے۔ طِین: گارے کو کہتے ہیں جو پانی اور مٹی مل کر بنتا ہے۔ اور یہ واقعہ بہت دفعہ آپ کے سامنے گزر چکا۔ ''پیدا کرنے والا ہوں میں ایک بشر طین سے، گارے مٹی سے۔'' فَاِذَا سَوَّیْتُهٗ: جس وقت میں اس کو درست کرلوں، اس کے اعضا وغیرہ ٹھیک کرلوں، اس کی ظاہری شکل صورت بنالوں، وَنَفَخْتُ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِیْ: اور پھر اس کے اندر میں اپنی رُوح ڈال دوں۔ رُوْحِیْ یہ اضافت تشریف کے لیے ہے، روح بھی اللہ کی مخلوق ہے، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ (سورۂ اسراء: ۸۵) یہ بھی اَمرِ رَب کے ساتھ ہی ظاہر ہوئی ہے، اور اللہ کی طرف اس کو نسبت کیا جارہا ہے اس کی شرافت کے طور پر، جس طرح سے بیت اللہ، ناقۃ اللہ، کتاب اللہ، یہ اضافتیں تشریف کے لئے ہیں، اللہ کا گھر، اللہ کی ناقہ، اسی طرح سے آدم کے اندر جو رُوح پھونکی اس کو بھی اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا کہ میری رُوح ہے، یعنی خصوصیت کے ساتھ عالی شان میری پیدا کی ہوئی، قُلِ الرُّوْحُ مِنْ اَمْرِ رَبِّیْ میں جس طرح سے ذکر کردیا گیا، اور اس کی تشریح بایں معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی بہت ساری صفات کا مظہر بنایا ہے، انسانی رُوح اللہ تعالیٰ کی صفات کے ظہور کا ذریعہ ہے، ''جب میں اس میں اپنی رُوح ڈال دوں'' فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِیْنَ: قَعُوْا یہ اَمر کا صیغہ ہے۔ پس گر پڑو تم اس آدم کے لئے سجدہ کرنے والے، یعنی اس کے سامنے سجدہ میں گر پڑنا، آدم کی طرف منہ کر کے توجہ کر کے سجدہ کرنا۔ سجدہ آدم کو یا اللہ کو؟ یہ بحث آپ کے سامنے پہلے گزر چکی، بہر حال آدم کو مسجود الیہ بنایا کہ اس کی طرف منہ کر کے سجدہ کریں، جس طرح سے ہم بیت اللہ کا اعزاز کرتے ہیں کہ بیت اللہ کی طرف منہ کر کے سجدہ کرتے ہیں لیکن سجدہ بیت اللہ کو نہیں، سجدہ اللہ کو ہے، اسی طرح سے آدم کی شرافت ظاہر کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے آدم کو بھی ملائکہ کے سامنے ایسے ہی نمایاں کیا جس طرح سے کہ بیت اللہ ہمارے سامنے ہے، کہ فرشتے اُدھر متوجہ ہو کر سجدہ کریں، سجدہ اللہ کے لئے لیکن قبلہ کی جگہ آدم، تعظیم تو پھر بھی آدم کی ہوگئی۔ اور یا آدم کو سجدہ کروایا ہو سجدۂ تعظیم، ہماری شریعت میں یہ جائز نہیں ہے، پہلے یہ جائز تھا، یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا، اسی طرح سے فرشتوں نے آدم کو سجدہ کیا، یہ سجدۂ تعظیمی ہے جس میں عبادت والا مفہوم نہیں ہوتا، اللہ کا حکم مانتے ہوئے اس کی عظمت کا اقرار کردیا۔ ''گر جاؤ اس کے لئے سجدہ کرنے والے۔''

اِبلیس اَڑ گیا

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ: سجدہ کیا سب فرشتوں نے اکٹھے ہی، سارے کے سارے فرشتے بیک وقت اکٹھے ہی سجدے میں گر گئے۔ كُلُّهُمْ کا معنی سارے کے سارے، کوئی نہیں بچا، اَجْمَعُوْنَ کا معنی اکٹھے ہی، یہ نہیں کہ کبھی کوئی آکر سجدہ کر گیا، کبھی کوئی آکر سجدہ کر گیا۔ فوج اکٹھی کی اکٹھی کسی کے سامنے سلامی پیش کرتی ہے اور اطاعت کا اظہار کرتی ہے تو اس میں اور شان نمایاں ہوتی ہے، اور ایک ایک آئے اور آکے مصافحہ کرتا جائے اور سلام کرتا جائے تو اس میں وہ شان نمایاں نہیں ہوتی، تو فرشتے جتنے تھے سارے کے سارے اکٹھے ہی سجدے میں گر گئے، اِلَّآ اِبْلِیْسَ سوائے ابلیس کے، یہ مستثنیٰ منقطع ہے کیونکہ یہ ملائکہ میں شامل نہیں، لیکن حکم اس کو بھی تھا سجدہ کرنے کا، چونکہ یہ فرشتوں کے اندر خلط ملط رہتا تھا، اور یہ جو لوگوں کے اندر مشہور ہے کہ یہ

فرشتوں کا اُستاد تھا، یہ بات ایسے ہی واعظانہ ہے، فرشتے اس سے پڑھتے نہیں تھے، اس سے تعلیم نہیں حاصل کرتے تھے، فرشتوں کو تو اللہ نے جس اِستعداد پہ پیدا کیا وہ اس پہ ہیں، ان کو کسی سے سیکھنے پڑھنے کی ضرورت نہیں، علم حاصل کرنا فرشتوں کا کام نہیں ہے، اس لیے اس کو "اُستاذِ ملائکہ" کے طور پر جو ذکر کیا جاتا ہے، یہ بات غلط ہے، ہاں! البتہ عبادت گزار تھا، چونکہ جنّات کو اللہ نے صلاحیت دی ہے اُوپر تک جانے کی، تو یہ بھی اُوپر فرشتوں کے ساتھ خلط ملط رہتا تھا، بڑا عبادت گزار تھا، لیکن عبادت گزار ہونے کے ساتھ ساتھ کچھ متکبر بھی تھا، بس یہ تکبر ہی اس کو لے بیٹھا، اَبٰی وَاسْتَكْبَرَ جس طرح سے قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا (سورۂ بقرۃ: ۳۴)، اور جیسے ہمارے شیخ (سعدیؒ) کہتے ہیں:

تکبر عزازیل را خوار کرد بزندانِ لعنت گرفتار کرد

(کریما سعدی)

تو اس کی جوانانیت تھی اس نے اس کو برباد کر دیا۔ "سوائے ابلیس کے" اِسْتَكْبَرَ وہ متکبر ہو گیا، اس نے اللہ کی بات نہ مانی، وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ: اور کافروں میں سے ہو گیا۔ اور مشرکین کو یہ سنانا مقصود ہے کہ اب تم دیکھو! کس کے طریقے پر چل رہے ہو؟ اللہ کے حکم کی مخالفت کر کے ابلیس ملعون ہوا اور آج تم اسی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے ہو۔

تخلیقِ آدم کی نسبت اللہ کے ہاتھوں کی طرف، اور اللہ کی صفاتِ متشابہات کا حکم

قَالَ يٰۤاِبْلِيْسُ: اللہ تعالیٰ نے کہا کہ اے ابلیس! مَا مَنَعَكَ اَنْ تَسْجُدَ لِمَا خَلَقْتُ بِيَدَيَّ: کس چیز نے روکا تجھے سجدہ کرنے سے اس چیز کے لئے جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔ مَا مَنَعَكَ مِنْ اَنْ تَسْجُدَ: یہاں مِن مقدر ہے۔ کس چیز نے روکا تجھے سجدہ کرنے سے اس چیز کے لئے جس کو میں اپنے ہاتھوں سے بنایا...... یہاں اللہ تعالیٰ نے آدم کو بنانے کی نسبت اپنے ہاتھوں کی طرف کی ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاتھ ہیں، جس طرح سے قرآنِ کریم میں یہ نسبت آئی يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (سورۂ فتح: ۱۰)، حدیث شریف میں آتا ہے "يَدُ اللهِ على الجماعةِ"(۱) جماعت پر اللہ کا ہاتھ ہوتا ہے، اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ (سورۂ فتح: ۱۰) ان کے ہاتھوں پہ اللہ کا ہاتھ ہے۔ ہم اس لفظ پر ایمان لاتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ ہیں، لیکن کیسے؟ کیفیت نہیں متعین کی جا سکتی، کما یلیق بشانہ جیسے اس کی شان کے لائق ہے، اللہ کے لیے "وجہ" کا ذکر آیا (البقرۃ: ۱۱۵، وغیرہ)، "قدم" کا ذکر حدیث شریف میں ہے۔(۲) "ساق" کا ذکر ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی پنڈلی ننگی کریں گے، يَوْمَ يُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ سورۂ "نٓ" میں ہے، حدیثِ شفاعت کے اندر "ساق" کا ذکر موجود ہے،(۳) لیکن اس کا کوئی تصور نہیں کیا جا سکتا کسی صورت میں بھی، بس یوں ہی کہیں گے: کما یلیق بشانہ! جیسے اس کی شان کے لائق ہے...... لیکن یہاں سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو پیدا کرنے

---

(۱) ترمذی ۳۹/۲ باب ما جاء فی لزوم الجماعۃ۔ مشکوٰۃ ۳۰/۱ باب الاعتصام، فصل ثانی، عن ابن عمرؓ

(۲) بخاری ۹۸۵/۲ باب الحلف بعزۃ اللہ الخ۔ ولفظ الحدیث: لَا تَزَالُ جَهَنَّمُ تَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَزِيْدٍ حَتّٰى يَضَعَ رَبُّ الْعِزَّةِ فِيْهَا قَدَمَهٗ فَتَقُوْلُ قَطْ قَطْ الخ

(۳) بخاری ۱۱۰۷/۲۔ مسلم ۱۰۲/۱۔ مشکوٰۃ ۴۹۰/۲۔ ولفظ البخاری: فَيَكْشِفُ عَنْ سَاقِهٖ۔ ولفظ مسلم: فَيُكْشَفُ عَنْ سَاقٍ

میں کوئی خاص کرم اور شرف بخشا ہے آدم کو، اور ان کی تخلیق عام مخلوق سے علیحدہ ہوئی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ فرشتوں نے اللہ تعالیٰ سے کہا کہ یا اللہ! تُو نے آدم کو اور آدم کی اولاد کو ایسا بنایا ہے کہ یہ کھاتے ہیں، پیتے ہیں، سواریاں کرتے ہیں، لذتیں اُٹھاتے ہیں، تو اِجْعَلْ لَهُمُ الدُّنْيَا وَلَنَا الْآخِرَةَ، اب یوں کردے کہ ان کے حصے میں دُنیا آجائے، ہمارے حصے میں آخرت آجائے، دُنیا میں یہ کھاپی لیں جو کچھ ہے، آگے ان کو جنت میں نہ لایا جائے، اور آخرت کی نعمتیں ہمارے لئے رہ جائیں، فرشتوں نے اللہ تعالیٰ کے سامنے یہ درخواست کی، حدیث شریف میں روایت موجود ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں بھی گزری، تو اللہ تعالیٰ فرمانے لگے کہ جس مخلوق کو میں نے کلمۂ کُن کے ساتھ پیدا کیا ہے، کہ کہا کہ ہوجا، وہ ہوگئی، میں اس کو اُن کے برابر کیسے کرسکتا ہوں کہ جس کو میں نے اپنے ہاتھوں سے پیدا کیا۔[1] اُس حدیث میں بھی آدم علیہ السلام کی تخلیق کی نسبت ہاتھوں کی طرف کی گئی کہ آدم کو تو میں نے اپنے ہاتھوں سے بنایا ہے، اور فرشتوں کو میں نے کلمۂ کُن سے پیدا کردیا، کہ کہا: کُن، فیکون۔ وہاں سے فرق معلوم ہوتا ہے کہ آدم کے پیدا کرنے میں خاص اعزاز اور تشریف ہے جو باقی مخلوق میں نہیں ہے۔

''بشر'' کی فضیلت نوع کے اعتبار سے ہے نہ کہ افراد کے اعتبار سے

اور وہ روایت دلیل ہے کہ فی حدذاتہٖ نوع کے اعتبار سے بشر، ملائکہ سے افضل ہے، نوع کے اعتبار سے!!! جہاں نوع کا مقابلہ نوع کے ساتھ ہوا کرتا وہاں افراد کی بات نہیں ہوتی، افراد تو آدم علیہ السلام کی اولاد میں ایسے بھی ہوں گے کہ جو شیطان سے بھی بدتر ہیں، شیطان کے بھی اُستاذ ہیں، شیطان کے بھی کان کترتے ہیں، ایسے بھی ہیں اولادِ آدم میں جن کی موجودگی میں شیطان ابلیس بھی انگشت بدنداں رہ جاتا ہوگا کہ ایسی شرارتیں مجھے بھی نہیں سوجھیں جیسے یہ آدم کی اولاد کرتی ہے، پہلے آدم کی اولاد کو دھکا تو ابلیس ہی لگاتا ہے، لیکن چونکہ آدم کی اولاد میں صلاحیتیں اللہ نے بہت رکھی ہیں، اور یہ مدرکِ کلیات ہے، ایک ایک کلیہ سے پھر یہ سینکڑوں نہیں، لاکھوں جزئیات نکالتا ہے، جتنا مدرکِ کلیات یہ ہے، جیسے منطقی کہتے ہیں نا، کہ انسان کی شرف مدرکِ کلیات ہونے میں ہی ہے، تو یہ ایسا مدرکِ کلیات ہے کہ ایک کلیہ اس کے ہاتھ میں آتا ہے تو پھر اس میں سے لاکھوں جزئیات نکالتا ہے، جہاں تک شیطان کے باپ کا ذہن بھی نہیں جاتا ہوگا، تو ایسے وقت میں پھر شیطان بھی حیران رہ جاتا ہے، وہ بھی دیکھتا رہ جاتا ہے، تو یہ ہے افراد کی بات، لیکن جہاں تک نوع کا تعلق ہے نوعِ بشر ملائکہ کے مقابلے میں افضل ہے، اس لیے انبیاء علیہم السلام تو تمام ملائکہ سے افضل ہیں، اور اسی طرح سے اولیاء اللہ نیک لوگ یہ بھی بعض فرشتوں کے مقابلے میں افضل ہوسکتے ہیں، خاص فرشتوں کے مقابلے میں نہ سہی، خاص سے مراد ہیں حاملینِ عرش یا حضرت جبریل، میکائیل، اِسرافیل اور عزرائیل، جن کا خصوصیت کے ساتھ ذِکر آیا ہوا ہے۔ بہرحال یہ آگے بحث علیحدہ ہے، نوع کے اعتبار سے بشر افضل ہے فرشتوں کے مقابلے میں، افراد میں فرق پڑسکتا ہے، جس طرح سے آپ کہتے ہیں کہ مرد عورت کے مقابلے میں افضل ہے، یہ تفضیل بھی نوع کے اعتبار سے ہے، ورنہ بعضی بعضی عورتیں ہر لحاظ سے مرد سے فوقیت لے جاتی ہیں۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے یہ شرف ظاہر کیا کہ میں نے اس کو اپنے دونوں ہاتھوں سے بنایا، تجھے اس کو سجدہ

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۵۱۰ باب بدء الخلق، فصل ثانی کا آخر، بحوالہ: بیہقی لَا اَجْعَلُ مَنْ خَلَقْتُهُ بِيَدَيَّ وَنَفَخْتُ فِيهِ مِنْ رُوحِي كَمَنْ قُلْتُ لَهُ كُنْ فَكَانَ.

کرنے سے کس نے روکا؟ اَسْتَكْبَرْتَ اَمْ كُنْتَ مِنَ الْعَالِيْنَ: اَسْتَكْبَرْتَ کا ہمزہ بھی استفہام کا ہے۔ اصل میں تھا اَءِسْتَكْبَرْتَ کیا تُو نے بلاوجہ اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیا، یا تُو ہے ہی بڑے لوگوں میں سے؟ تُو نے تکبّر کیا، تُو نے اپنے آپ کو بڑا سمجھ لیا، یا تُو ہے ہی عالی لوگوں میں سے، عالی شان لوگوں میں سے؟

اصل شرف کمالاتِ رُوحانی کی وجہ سے ہوتا ہے

وہ کہتا ہے جی! دوسری شق ہے، بلاوجہ تو میں بڑا نہیں بنا، اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ: میں اس سے بہتر ہوں، میرے لیے علو ثابت ہے جس کی بنا پر میں عالی ہو کر اس کے سامنے کیوں جھکوں، یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس نے اپنی منطق بگھارنی شروع کر دی، اَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ: میں اس سے بہتر ہوں، دلیل یہ دے دی خَلَقْتَنِيْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِيْنٍ: مجھے تُو نے آگ سے پیدا کیا ہے اور اس کو مٹی سے پیدا کیا ہے، پاؤں کے نیچے روندی جاتی ہے، گارا، کیچڑ، اس سے تُو نے اس کو بنایا، اور مجھے آگ سے بنایا جو روشن ہے بلندی کی طرف جانے والی ہے، تو میں اس کو سجدہ کس طرح سے کردوں؟ اللہ تعالیٰ نے آدم کو جو شرف دیا ہے وہ اس کے کمالاتِ رُوحانی کی وجہ سے ہے، اس کا علم، اس کا عمل، اس کی معرفت، جو اللہ تعالیٰ نے اس کو عطا فرمائی، وہاں کمال اس وجہ سے ہے۔ یہ نسب اور نسبت کو نہیں دیکھا کہ اس کی نسبت مٹی کی طرف ہے، گارے کی طرف ہے، پانی کی طرف ہے، کس چیز کی طرف ہے، چیز بنی ہوئی کس چیز سے ہو، مادّہ اس کا کوئی ہو، میٹیریل اس میں کوئی استعمال ہوا ہو، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ بننے کے بعد اس کے لئے کیا کمالات ثابت ہیں؟

نسب و نسل پر فخر کرنا اِبلیسی سُنّت ہے

اور شیطان کے سامنے صرف اپنا نسب نامہ ہی تھا، کہ میں چونکہ آگ سے نکلا ہوں، اور آگ افضل ہے مٹی کے مقابلے میں، تو مجھے بھی افضل ہی ہونا چاہیے، اس نے یہ فخر جو کیا ہے تو محض نسب کی بنا پر کیا ہے، اب انسانوں کے اندر بھی اگر یہ بات ہو کہ کوئی اپنی نسل اور نسب کی وجہ سے عالی دماغ ہے اور دوسروں کی تحقیر کرتا ہے، تو یہ بعینہٖ سُنّتِ اِبلیس ہے۔ اگر کوئی شخص اپنی نسل اور نسبت کی بنا پر فخر کرتا ہے دوسروں کے مقابلے میں، ایک ہے کہ اللہ تعالیٰ رُوحانی کمال کسی کو دے دے جس کی بنا پر اس کی عظمت دوسروں کے مقابلے میں ثابت ہو جائے، وہ ایک علیحدہ بات ہے، لیکن صرف خاندانی نسبت کے طور پر کہ چونکہ یہ فلاں خاندان سے نکلا ہے اور وہ خاندان عزّت و حرمت والا تھا، اور یہ وہاں سے پیدا ہونے والا ہے تو اس کو بھی وہی عزت حاصل ہونی چاہیے، یہ شیطانی ذہن ہے، اس لئے کوئی کسی خاندان سے ہو، کسی باپ کی اولاد ہو، بڑے سے بڑے کی اولاد ہو، اگر اس کو اپنے طور پر کمالات ثابت نہیں ہیں تو اس کے لئے کوئی عزت اور شرف نہیں ہے، نہ اس کو یہ حق پہنچتا ہے کہ ''پدرم سلطان بود'' کا نعرہ لگا کے دوسروں کی تحقیر کرے، دیکھنا یہ ہے کہ اس کے لئے اپنا کوئی کمال ہے یا نہیں۔ تو یہاں اس نے اپنی نسبت پر فخر کیا کہ میری نسبت آگ کی طرف ہے، اور اِس کی نسبت مٹی کی طرف ہے، اور آگ مٹی کے مقابلے میں افضل ہے۔ یہ بھی اس کی اپنی بنائی ہوئی بات ہے، ورنہ جتنے بھی عناصر ہیں اللہ تعالیٰ نے ہر عنصر کے اندر کچھ ایسی خوبیاں رکھی ہیں جو دوسرے میں نہیں ہیں، تو یہ کہنا کہ آگ کلیۃً مٹی سے افضل ہے یہ بات بھی غلط ہے، آگ میں اِفساد ہی اِفساد ہے، جلانا ہے، خراب کرنا ہے، مٹی ہر چیز کی پرورش کرتی ہے، کس

قسم کے خزانوں کو محفوظ رکھے ہوئے ہے، اس میں اور بھی بہت ساری خوبیاں ہیں، تو اضع اور انکسار تو ہے ہی مٹی میں، آگ میں تعلّی اور سرکشی ہے، وہی اثر یہاں (شیطان میں) دکھایا۔

ابلیس پر پھٹکار، اور مشرکین کو واقعہ سُنانے کا مقصد

قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ: تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کی دلیل کا جواب نہیں دیا، کہ تیرا فلاں مقدمہ غلط ہے اس لیے نتیجہ غلط، بلکہ یہاں جو معاملہ کیا ہے حاکمانہ کیا ہے کہ میرا پیدا کیا ہوا، میرا بنایا ہوا، میرا بندہ میرے سامنے یوں اکڑتا ہے؟ فَاخْرُجْ: نکل جا یہاں سے، ملعون، بے شک تو مردود ہے، یہ حاکمانہ بات ہے، فَاخْرُجْ مِنْهَا: نکل جا اس جنّت سے یا اس آسمان سے، فَإِنَّكَ رَجِيْمٌ: تو مردود ہے، وَإِنَّ عَلَيْكَ لَعْنَتِيْ إِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ: اور تیرے پہ لعنت ہے قیامت کے دِن تک، اور قیامت کے دِن کے بعد تو پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ رحمت ہو جائے، جو قیامت کے دِن تک ملعون رہے اس کے بعد پھر اس کے مرحوم ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ تو یہ قصہ سُنایا جا رہا ہے مشرکین مکہ کو، کہ تم بھی یونہی ملعون ہو جاؤ گے اگر شیطان کے طریقے پر چلے اور اللہ کا حکم نہ مانا۔ ابلیس کہنے لگا رَبِّ فَأَنْظِرْنِيْ: سورۂ اَعراف میں زیادہ تفصیل سے یہ واقعہ گزرا، اور ابتدا میں سورۂ بقرہ میں بھی آیا تھا۔ کہنے لگا کہ اے میرے رَبّ! مجھے مہلت دے دے إِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ: اس دِن تک جس میں لوگ اُٹھائے جائیں گے، یعنی قیامت تک مجھے مہلت دے، تاکہ میں بھی زور آزمائی کر کے دیکھ لوں تیرے اس چہیتے کے خلاف اور اس کی اولاد کے خلاف، جس کو تُو نے اتنا مکرم مشرف بنایا کہ میں نے سجدہ نہیں کیا تو مجھے دھتکار دیا، تو ذرا مجھے بھی پھر مقابلے کے لئے نکلنے دے، آپ کو دِکھاؤں کہ اس میں کیا کمال ہیں، یہ بھی اور زیادہ اس کی اکڑ اور اس کے تکبّر کی بات تھی۔

قیامت تک شیطان کو مہلت اور شیطان کا عزم

قَالَ فَإِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بے شک تو مہلت دیے ہوؤں میں سے ہے، إِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ: وقتِ معلوم کے دِن تک۔ اس سے وہی قیامت کا دِن مراد ہے، وہی دِن جو ہے قیامت کا اس کا ابتدائی حصہ فنا ہونے کا ہے اور پچھلا حصہ اس کے اُٹھنے کا ہے، وہ ایک ہی دِن ہے، اس لیے اس نے قیامت کے دِن تک مہلت مانگی تھی، چاہے عنوان یہی رکھا يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ، اور وقتِ معلوم سے بھی وہی قیامت کا دِن مراد ہے، تو نفخِ اُولیٰ جس وقت ہو گا تو قیامت کا دِن شروع ہو گیا، اس وقت شیطان بھی فنا ہو جائے گا، اور وہی دِن يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ بھی ہے، اس لیے اس کی دُعا جو تھی قیامت کے دِن تک کی، وہ قبول ہو گئی، قَالَ فَبِعِزَّتِكَ لَأُغْوِيَنَّهُمْ أَجْمَعِيْنَ: وہ ابلیس کہنے لگا کہ تیری عزّت کی قسم! البتہ ضرور گمراہ کروں گا میں ان سب کو، ان سب کو گمراہ کروں گا، إِلَّا عِبَادَكَ مِنْهُمُ الْمُخْلَصِيْنَ: مگر تیرے بندے ان میں سے جو چُنے ہوئے ہوں گے، جو مخلص بندے ہیں جو اخلاص کے حامل ہوں گے اور تو بھی ان کو اپنی عبادت کے لئے چُن لے گا ان کے اخلاص کی برکت سے، تو وہ بچ جائیں گے ان کو میں گمراہ نہیں کر سکوں گا، اور باقی سب کو گمراہ کر دوں گا، قَالَ فَالْحَقُّ وَالْحَقَّ أَقُوْلُ: اللہ تعالیٰ نے فرمایا میری طرف سے بھی بات سُن لو ایک حق بات، اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں، ''میری طرف سے یہ بات حق ہے اور میں حق ہی کہا کرتا ہوں'' لَأَمْلَأَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ

مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ: یہ بات میری طرف سے سُن لو، یہ واقع کے مطابق ہے، حق ہی ہے، اس میں کوئی کسی قسم کی شک شبہ کی گنجائش نہیں، کہ البتہ ضرور بھر دُوں گا میں جہنّم کو تجھ سے اور تیرے متبعین سے سب سے، جو بھی تیری پیروی کرنے والے ہوں گے۔ ''تجھ سے اور ان لوگوں سے جو تیرے پیچھے لگیں گے ان بنی آدم میں سے، سب کو اکٹھا کر کے میں ضرور جہنّم کو بھر دُوں گا'' میری طرف سے بھی یہ حق بات سُن لو۔

حضور ﷺ کی زبانی کُفّار کو خیر خواہانہ نصیحت اور وعید

قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ: یہ آخر میں پھر سرورِ کائنات ﷺ سے اعلان کروایا جارہا ہے کہ تم لوگ کان کھول کر سنو، میں تمہارا خیر خواہ ہوں، نہ تو میرے اندر کوئی حرص اور لالچ ہے، کہ میں دُنیا کمانے کے لئے اس قسم کی باتیں کررہا ہوں، اور نہ میرے اندر تصنع اور بناوٹ ہے، کہ حقیقت نہ ہو اور میں بناوٹ کے طور پر بڑا بننے کے لئے اس قسم کی باتیں کروں، دونوں باتیں ہی نہیں ہیں، اس لئے میں تمہیں اِخلاص کے ساتھ کہتا ہوں کہ تمہارا طریقہ غلط ہے، تمہاری ہمدردی کے طور پر کہتا ہوں کہ تم اس طریقے کو چھوڑ دو، ورنہ آخرت میں وہی انجام تمہارا ہوگا جو اِبلیس کا ہوا، اور جہنّم کے قصے جو تمہیں سُنائے گئے ہیں وہ ایک واقعہ ہے، میں ان سے بچانے کے لئے تمہارے سامنے خیر خواہی سے یہ باتیں کرتا ہوں، ''آپ کہہ دیجئے کہ میں اس تعلیم پر یا اس قرآن پر تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا'' کہ دُنیا کے طلب کرنے کے لئے میں یہ باتیں تمہارے سامنے، ''نہ میں بناوٹ کرنے والوں میں سے ہوں'' کہ حقیقت کچھ ہو اور ظاہر کچھ کروں، خواہ مخواہ تصنع کروں تکلّف کروں بناوٹ کروں، ایسی بات بھی نہیں، ''نہیں ہے یہ قرآن مگر نصیحت سب جہانوں کے لئے'' وَلَتَعْلَمُنَّ نَبَاَهٗ بَعْدَ حِيْنٍ: البتہ ضرور جان لو گے تم اس کی خبر کچھ وقت کے بعد، اس کی خبر جان لو گے، اس کی خبر تمہارے سامنے آجائے گی، کیا مطلب؟ کہ جو باتیں یہ بتاتا ہے جب وہ واقعہ بن کر سامنے آئیں گی تو سمجھو خبر ظاہر ہوگئی، جو بات میں کہہ رہا ہوں یہ بات تمہارے سامنے آجائے گی، بات کے سامنے آنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس چیز کی خبر دی جارہی ہے اس کا مصداق سامنے آجائے گا۔ ''ضرور جان لو گے تم اس قرآن کی خبر کو کچھ وقت کے بعد۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُورَةُ الزُّمَرِ

آیاتها ۷۵ ۳۹ سُوْرَةُ الزُّمَرِ مَكِّيَّةٌ ۵۹ رکوعاتها ۸

سورۂ زُمر مکہ میں نازل ہوئی، اور اس میں پچھتر آیتیں ہیں، آٹھ رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِيْزِ الْحَكِيْمِ ① اِنَّآ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ

یہ اللہ کی طرف سے اُتاری ہوئی کتاب ہے، جو زبردست ہے حکمت والا ہے ① بے شک ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری ٹھیک

فَاعْبُدِ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ② اَلَا لِلّٰهِ الدِّيْنُ الْخَالِصُ ؕ وَالَّذِيْنَ

پس تُو عبادت کر اللہ کی اس حال میں کہ تُو طاعت کو اس کے لئے خالص کرنے والا ہے ② خبردار! اللہ ہی کے لئے ہے خالص طاعت، اور وہ لوگ جو

اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۘ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى ؕ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ

اللہ کے علاوہ اولیاء اختیار کرتے ہیں یہ کہتے ہوئے کہ ہم نہیں پُوجا کرتے ان کی مگر اس لئے تاکہ یہ ہمیں قریب کردیں اللہ کی طرف درجے میں، بے شک اللہ

بَيْنَهُمْ فِيْ مَا هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ؕ۬ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ ③ لَوْ

ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس بات میں جس میں یہ اختلاف کرتے ہیں، بے شک اللہ ہدایت نہیں دیتا اس کو جو جھوٹا ناشکرا ہے ③ اگر

اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ

ارادہ کرتا اللہ تعالیٰ اولاد اختیار کرنے کا تو چُنتا اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا، وہ پاک ہے، وہ اللہ

الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ ④ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ ۚ يُكَوِّرُ الَّيْلَ عَلَى

اکیلا ہے اور سب کو سنبھالنے والا ہے ④ پیدا کیا اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، لپیٹتا ہے رات کو

النَّهَارِ وَيُكَوِّرُ النَّهَارَ عَلَى الَّيْلِ وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ يَّجْرِيْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ

دن پر اور لپیٹتا ہے دن کو رات پر، اور مسخر کیا اس نے چاند کو اور سورج کو، ہر کوئی چلتا ہے ایک وقتِ معین تک،

اَلَا هُوَ الْعَزِيْزُ الْغَفَّارُ ⑤ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَ

خبردار! وہی زبردست ہے اور بخشنے والا ہے ⑤ پیدا کیا اس نے تمہیں ایک نفس سے، پھر بنایا اسی نفس سے اس کی بیوی کو، اور

أَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْأَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ أَزْوَاجٍ ۚ يَخْلُقُكُمْ فِي بُطُوْنِ أُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْ

اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے حیوانات کی آٹھ قسمیں اُتاریں، پیدا کرتا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں ایک دفعہ پیدا کرنے

بَعْدِ خَلْقٍ فِي ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ ۚ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ فَأَنّٰى

کے بعد اور پیدا کرنا، تین تاریکیوں میں، یہی اللہ تمہارا رَبّ ہے، اس کے لئے سلطنت ہے، کوئی معبود نہیں اس کے علاوہ، پھر تم کدھر

تُصْرَفُوْنَ ۝٦ إِنْ تَكْفُرُوْا فَإِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنْكُمْ ۖ وَلَا يَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ وَإِنْ

پھیرے جاتے ہو ⑥ اگر تم ناشکری کرو تو بے شک اللہ تم سے غنی ہے، اور نہیں پسند کرتا وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری کو، اور اگر

تَشْكُرُوْا يَرْضَهُ لَكُمْ ۗ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ أُخْرٰى ۗ ثُمَّ إِلٰى رَبِّكُمْ

تم اللہ کی شکرگزاری کرتے ہو تو اس کو وہ تمہارے لیے پسند کرتا ہے، کوئی نفس بوجھ اُٹھانے والا بوجھ نہیں اُٹھائے گا کسی دوسرے نفس کا، پھر تمہارے رَبّ کی

مَّرْجِعُكُمْ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۗ إِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝٧ وَإِذَا

طرف ہی تمہارا لوٹنا ہے، پھر تمہیں خبر دے گا وہ ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے، بے شک وہ دِلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے ⑦ جب

مَسَّ الْإِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِيْبًا إِلَيْهِ ثُمَّ إِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ

انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پکارتا ہے اپنے رَبّ کو اس کی طرف رُجوع کرتا ہوا، پھر جس وقت اس کا رَبّ اس کو نعمت دے دیتا ہے اپنی جانب سے

نَسِيَ مَا كَانَ يَدْعُوْٓا إِلَيْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ أَنْدَادًا لِّيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۗ قُلْ

تو بھول جاتا ہے اس تکلیف کو جس کے ازالے کی طرف وہ اپنے رَبّ کو بلاتا تھا، اور بناتا ہے اللہ کے لئے شرکاء تاکہ بھٹکا دے اللہ کے راستے سے، آپ

تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖ إِنَّكَ مِنْ أَصْحٰبِ النَّارِ ۝٨ أَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ آنَاۤءَ الَّيْلِ

کہہ دیجئے کہ فائدہ اُٹھالے اپنے کُفر کے ساتھ تھوڑی دیر، بے شک تو جہنم والوں میں سے ہے ⑧ کیا وہ شخص جو فرماں بردار ہے رات کی ساعات میں،

سَاجِدًا وَّقَآئِمًا يَّحْذَرُ الْآخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ ۗ قُلْ هَلْ

اس حال میں کہ سجدہ کرنے والا ہے، قیام کرنے والا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے، اپنے رَبّ کی رحمت کی اُمید کرتا ہے، آپ کہہ دیجئے کیا

يَسْتَوِي الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ وَالَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ۗ إِنَّمَا يَتَذَكَّرُ أُولُوا الْأَلْبَابِ ۝٩ ع

وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم نہیں رکھتے یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ عقل والے لوگ ہی نصیحت حاصل کیا کرتے ہیں ⑨

تفسیر

ماقبل سے ربط اور سورت کا مضمون

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ ''زُمر'' کا لفظ لیا گیا ہے سورت کے آخری رُکوع سے: وَسِیْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى جَهَنَّمَ زُمَرًا۔ زُمَرًا: زُمرۃ کی جمع ہے گروہ درگروہ کے معنی میں۔ سورت مکی ہے، اس لیے اس میں اُصولِ دِین کا ذِکر ہے۔ پچھلی سورت کا اِختتام قرآنِ کریم کے تذکرے پر ہی ہوا تھا: اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ لِّلْعٰلَمِیْنَ، تو اس سورت کا افتتاح بھی قرآنِ کریم کے ذِکر سے ہی ہو رہا ہے۔ اور عمومی طور پر اس میں مضمون اِثباتِ توحید ہے، اور کُفران، ناشکری سے روکنا مقصود ہے، شکر گزاری کی طرف توجہ دِلائی جا رہی ہے، اللہ پر ایمان لانا اور اس کو وحدہٗ لاشریک لہٗ جاننا، یہ شکر کا اعلیٰ فرد ہے۔ مشرکین کے لئے دُنیا اور آخرت کے عذاب کی وعید ہے، باقی مضامین جس طرح سے مکی سورتوں میں ہوا کرتے ہیں اسی طرح سے ہیں، یعنی توحید، رِسالت، معاد، یہ آپس میں خلط ملط ہیں، اور ان کے متعلقات۔ اِثباتِ توحید کے ساتھ رَدِّ شرک ہوجاتا ہے، اور آخرت کے متعلق ان کے جس قسم کے شبہات تھے ان کا جواب آجاتا ہے، اور اسی طرح سے رِسالت کا تذکرہ بھی ہوگا اپنے متعلقات کے ساتھ۔

عظمتِ قرآن اور اِثباتِ رِسالت

تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ: تنزیل: مصدر ہے، تھوڑا تھوڑا کرکے اُتارنا، اہمیت کے ساتھ اُتارنا اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے۔ اور اَنْزَلَ اِنْزَال یہ دفعۃً واحدۃً اُتارنے کے متعلق بولا جاتا ہے۔ یہ مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، اللہ کی طرف سے اُتاری ہوئی کتاب، ''یہ اللہ کی طرف سے اُتاری ہوئی کتاب ہے، ایسا اللہ جو کہ عزیز ہے، حکیم ہے۔'' اور یہ دو صفتیں اللہ تعالیٰ کی اکثر و بیشتر ذِکر کی جاتی ہیں، ''عزیز'' میں اس کے غالب اور قوت والے ہونے کی طرف اشارہ ہے کہ زبردست ہے، اور حکیم: حکمت والا ہے۔ تو جب یہ کتاب ایسے اللہ کی طرف سے اُتاری گئی ہے جو زبردست ہے، تو اس میں اشارہ اس بات کی طرف ہوجائے گا کہ نہ ماننے والوں کے لئے سزا دینا اس کے لئے مشکل نہیں، اور ایسے ہی اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ یہ کتاب کسی کمزور کی درخواست نہیں ہے کہ جس کے ماننے نہ ماننے کا تمہیں اختیار ہو، اور اگر تم مانو تو تمہاری مہربانی، نہ مانو تو تمہیں کچھ کہا نہ جائے، جب کوئی کمزور آدمی درخواست دیا کرتا ہے، سائل کی درخواست جس طرح سے ہوا کرتی ہے، تو اس میں دوسرا آدمی لاپروائی کے ساتھ غور کرتا ہے، تو یہ کوئی سائل کی درخواست نہیں، یہ اللہ کی طرف سے اَحکام کا مجموعہ ہے جو تمہیں دیا گیا، اور وہ اللہ زبردست ہے، اس لیے اس کا ماننا ضروری ہے، اور جو لوگ نہیں مانیں گے وہ دُنیا میں یا آخرت میں یا دونوں جہانوں میں سزا پائیں گے، باقی رہی یہ بات کہ مخالفت کرنے والوں کو فوراً سزا کیوں نہیں ہوجاتی؟ تو اس کے ساتھ لفظ ''حکیم'' میں اس اِشکال کا جواب ہے کہ چونکہ وہ حکمت والا ہے، اپنی حکمت کے تحت وہ مخالفین کو مہلت دیتا ہے، یہ نہیں کہ گرفت ہوگی نہیں۔ تو اس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت کا ذِکر بھی ہوگیا، ''تنزیلِ کتاب'' یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رِسالت کا بیان بھی ہے، کہ جب یہ کتاب اللہ کی طرف سے اُتاری ہوئی

ہے تو جس پر اُتاری گئی ہے وہ اللہ کا رسول ہے، اِنَّآ اَنۡزَلۡنَآ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ: بے شک ہم نے آپ کی طرف کتاب اُتاری بِالۡحَقِّ: ٹھیک ٹھیک، حق کے ساتھ، واقعی اَمر کے ساتھ، یعنی جو کچھ اس میں بیان کیا گیا ہے واقع کے مطابق ہے، ''حق'' کا مفہوم یہ ہوا کرتا ہے۔ صدق اور حق: جو چیز واقع کے مطابق ہو، جو بات واقع کے مطابق ہو۔ اِس میں کوئی جھوٹ نہیں، کذب نہیں، اس میں کوئی خلافِ واقعہ بات نہیں ہے۔ جو کچھ کتاب میں بیان کیا گیا ہے واقعہ یہی ہے، اس کی ہر ہر بات مطابق للواقع ہے۔

عبادت اور طاعتِ مطلقہ صرف اللہ کے لئے

فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ: پس تُو عبادت کر اللہ کی اس حال میں کہ تُو طاعت کو اس کے لئے خالص کرنے والا ہے، اَلَا لِلّٰہِ الدِّیۡنُ الۡخَالِصُ: خبردار! اللہ ہی کے لئے ہے خالص طاعت، خالص دِین، وَالَّذِیۡنَ اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ: اور وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ اولیاء اختیار کرتے ہیں۔ اولیاء: ولی کی جمع، دوست، کارساز، حمایتی۔ جو اللہ کے علاوہ اولیاء اختیار کرتے ہیں مَا نَعۡبُدُہُمۡ اِلَّا لِیُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَی اللّٰہِ زُلۡفٰی: یہ ان اختیار کرنے والوں کا قول ہے، قَائِلِیۡنَ مَا نَعۡبُدُہُمۡ (آلوسی) یہ کہتے ہوئے، یہ عقیدہ رکھتے ہوئے کہ ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر اس لیے تاکہ یہ ہمیں قریب کردیں اللہ کی طرف، زُلۡفٰی: قربٰی کے معنی میں ہے، یُقَرِّبُوۡا کا مفعول مطلق ہے۔ تاکہ اللہ تعالیٰ کی طرف ہمیں نزدیکی میں بڑھادیں، اللہ تعالیٰ کا قُرب ہمیں دلادیں، ہمیں اللہ کے قریب کردیں، اِنَّ اللّٰہَ یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ فِیۡ مَا ہُمۡ فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ: بے شک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس بات میں جس میں کہ یہ اختلاف کرتے ہیں۔

آپ کی طرف کتاب حق کے مطابق اُتاری گئی، ٹھیک ٹھیک اُتاری گئی، اس کا تقاضا یہ ہے کہ صرف اللہ کی عبادت کیجئے، اور اطاعت کو اسی کے لئے خالص کیجئے، نہ عبادت اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی، نہ اطاعتِ مطلقہ اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی، یہی وجہ ہے کہ حضور ﷺ نے اعلان فرمایا: ''لَا طَاعَۃَ لِمَخۡلُوۡقٍ فِیۡ مَعۡصِیَۃِ الۡخَالِقِ''[1] جہاں خالق کی نافرمانی لازم آتی ہو وہاں کسی کی طاعت نہیں ہے، اصل کے اعتبار سے اطاعت اللہ کی، اور اللہ تعالیٰ کے کہنے کی وجہ سے اللہ کے رسول کی، اور مخلوق میں سے کوئی شخص اس قسم کا حکم دے جو اللہ تعالیٰ کی طاعت کے خلاف ہو، اللہ کی معصیت پر مشتمل ہو، تو اس کا کہنا نہیں مانا جائے گا، عبادت بھی حق اسی کا ہے اور طاعت بھی حق اس کا ہے۔ خطاب حضور ﷺ کو ہے اور سمجھانا سب کو مقصود ہے کہ کتاب کے اُتارنے کا اعلیٰ مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے لیے ہی عبادت ہو، عبادت اللہ کی کی جائے، کسی دوسرے کو عبادت میں اس کے ساتھ شریک نہ کیا جائے۔

''عبادت'' کا مفہوم

''عبادت'' کا مفہوم آپ کے سامنے بارہا ذکر کیا جاچکا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کسی کو نافع اور ضار سمجھ کر، اپنے اُوپر متصرف خیال کرتے ہوئے، اُس کے سامنے غایت درجے کی تعظیم بجالانا، اس کے سامنے تذلل اختیار کرنا، اپنے اُوپر کسی کی قدرتِ کاملہ سمجھتے ہوئے کہ میرا بنانا بگاڑنا سنوارنا اسی کے اختیار میں ہے، اسی کے ارادے کے ساتھ ہی میری قسمت بن سکتی ہے، اسی کے اشارے کے ساتھ ہی بگڑ سکتی ہے، میرے نفع نقصان کا مالک وہی ہے، اپنے اُوپر متصرف سمجھتے ہوئے کسی کے سامنے غایت

(۱) مشکوٰۃ ۳۲۱/۲، کتاب الامارۃ، فصل ثانی، بحوالہ شرح السنۃ۔ نیز مسلم ۱۲۵/۲، پر الفاظ یوں ہیں: لَا طَاعَۃَ فِیۡ مَعۡصِیَۃِ اللّٰہِ.

درجے کا تذلل اختیار کرنا اور اس کی انتہائی تعظیم بجالانا یہ ''عبادت'' ہے! تو اللہ کی خالص عبادت کا مطلب یہی ہے کہ اُس کو نافع اور ضار سمجھو، اس کے علاوہ کسی کے ہاتھ میں نفع اور ضرر نہیں، اور اپنے تمام اُمور میں اسی کو متصرف جانو، دولت، صحت، اولاد جس کی طلب انسان کی طبیعت کے اندر پڑی ہوئی ہے، سب کا دینا، چھیننا، نہ دینا، یہ سب اللہ کے اختیار میں ہے، کسی دوسرے کے اختیار میں نہیں۔ تو اپنے اُمور میں متصرف جانتے ہوئے اپنے نفع اور نقصان کا مالک سمجھتے ہوئے، اپنے اُوپر پوری طرح سے اس کی قدرت کو جانتے اور مانتے ہوئے اس کے سامنے تذلل اختیار کرنا اور اس کی غایت درجہ تعظیم بجالانا یہ ''عبادت'' ہے! تو اس میں اس بات کی طرف اشارہ کر دیا گیا کہ یہ عقائد سارے کے سارے اللہ کے متعلق ہی رکھے جاسکتے ہیں، کسی دوسرے کے متعلق نہیں رکھے جاسکتے، ہم عبودیت اور عبدیت کا اقرار اور اظہار اگر کریں گے تو اسی قدرتِ کاملہ والے کے سامنے کریں گے، کسی دوسرے کے سامنے نہیں کرتے۔ ''عبادت کیجئے اللہ کی اس حال میں خالص کرنے والے ہو اسی کے لئے طاعت کو، خبردار! طاعتِ خالصہ اللہ ہی کے لئے ہے، دِینِ خالص اللہ ہی کے لئے ہے۔'' دِین کا معنی بندگی کے ساتھ بھی کیا گیا ہے، اور دِین کا معنی طاعت کے ساتھ بھی کیا گیا ہے، ''طاعتِ خالصہ اسی کے لئے ہے۔''

''عبادت'' کی قبولیت کے لئے شرکِ جلی اور شرکِ خفی سے پاک ہونا شرط ہے

خالص کے لفظ کے اندر اس بات کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں عبادت اور طاعت وہی قبول ہے جو بالکل خلوص پر مبنی ہو، جس میں شرک کا شائبہ نہ پایا جائے۔ اور ایک تو شرک ظاہری ہے، کہ جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم بجالائیں اسی طرح سے دوسروں کی بھی کریں، جس طرح سے اللہ تعالیٰ کو متصرف یا اپنے نفع نقصان کا مالک سمجھیں کسی دوسرے کو بھی سمجھیں، اور شرکِ جلی کے مقابلے میں ایک شرکِ خفی ہے جس کو ''ریا'' کہتے ہیں، ''ریا'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان طاعت تو بجالاتا ہے بظاہر اللہ تعالیٰ کی، لیکن دِل کی تہہ میں دِکھلاوا مقصود ہے مخلوق کو، تاکہ اس عبادت اور طاعت کے ظاہر کرنے کے ساتھ دوسروں سے انسان عزت حاصل کرے، اور دوسرے لوگ اس کو نیک سمجھیں، بڑا سمجھیں، اس قسم کے جذبے کے تحت جو عبادت کی جاتی ہے وہ ''ریاکاری'' ہے، تو یہ بھی خالص نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''مَنْ صَلّٰی یُرَائِیْ فَقَدْ اَشْرَكَ'' جس نے نماز دِکھلاوا کرتے ہوئے پڑھی اس نے بھی مشرکوں جیسا کام کیا۔[1] تو اللہ کی رضا کے اندر بھی کسی دوسرے کو شریک نہ مانا جائے، عبادت کی جائے تو مقصود صرف اللہ کی رضا ہو، اور اسی کا کہنا ماننا مقصود ہو، مخلوق کو دِکھلاوا، مخلوق سے تعریف سننا، مخلوق کی نظروں میں عظمت حاصل کرنا، یہ بھی مقصود نہ ہو، تب جا کے وہ طاعت اور عبادت خالص ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ ایسی ہی طاعت اور عبادت کا حق دار ہے۔

مشرکین کا، فرشتوں کی عبادت سے مقصد اور اس کی تردید

آگے مشرکین پر تردید ہوگئی۔ مشرکینِ مکہ کے حالات آپ سُن چکے، کہ زیادہ تر وہ فرشتوں کو اور جنوں کو پُوجتے تھے، جنوں کو تو پُوجتے تھے ان کے ضرر سے بچنے کے لئے، تاکہ ہمیں کوئی نقصان نہ پہنچائیں، اور فرشتوں کو پُوجتے تھے ان کو اللہ کی بیٹیاں قرار

---

(۱) مسند احمد رقم ۱۷۱۴۰، مشکوٰۃ ۲/۴۵۵ باب الریاء فصل ثالث۔

دے کر، اور یہ نظریہ رکھتے ہوئے کہ وہ اللہ کے مقرب ہیں، اللہ کے چہیتے ہیں، اللہ کو جو چاہیں منوا لیتے ہیں، ہم اگر ان کے ساتھ عبادت کا معاملہ کریں گے تو وہ ہم پہ خوش ہوں گے، خوش ہو کر وہ ہمیں اللہ کے قریب درجہ دلا دیں گے، ہماری ضروریات اللہ کے سامنے پیش کرتے ہیں، اور اللہ کے ہاں ان کی سفارش رد نہیں ہوتی، اس قسم کے نظریے وہ فرشتوں کے متعلق رکھتے تھے، اور پھر فرشتوں کے نام پر فرضی صورتیں انہوں نے بنا رکھی تھیں، حالانکہ فرشتے انہوں نے دیکھے نہیں، لیکن اپنے طور پر ذہنی تخیل کے تحت بُت تراشے، جن کو یہ سمجھتے تھے کہ یہ مورتیاں انہی کی ہیں، اور ان مورتیوں کے ساتھ وہ تعظیم کا معاملہ کرتے تھے، اصل مقصود ان کا یہ ہوتا تھا کہ وہ فرشتے ہم پہ خوش ہوں، جب ہم ان کی پُوجا کریں گے تو اللہ تعالیٰ کے دربار میں ہمیں عزت دلائیں گے، ہماری ضروریات پوری کروائیں گے، سورۂ فاطر کے اندر خاص طور پر اس کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی گئی تھی، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جن لوگوں نے اللہ کے علاوہ اور اولیاء بنالئے، کارساز سمجھ لیے، اللہ کی حکومت کو دُنیوی حکومت پر قیاس کرتے ہوئے، کہ جس طرح سے دُنیا کا کوئی بادشاہ ہوتا ہے، تو اس کے مقربین جو ہوتے ہیں، اُن کا قرب حاصل کر لیا جائے تو وہ بادشاہ کا مقرب بنا دیتے ہیں، بادشاہ سے ضروریات پوری کروا دیتے ہیں، تو اسی قسم کا نظریہ مشرکین کا تھا، وہ کہتے تھے کہ ہم اِن کی عبادت اگر کرتے ہیں تو اس لیے کرتے ہیں تاکہ یہ ہمیں اللہ کی طرف نزدیکی دلوادیں، اللہ کا قرب ہمیں ان کی وجہ سے نصیب ہو جائے، یہ عقیدہ رکھتے ہوئے جو عبادت کرتے ہیں مَا نَعْبُدُهُمْ إِلَّا لِيُقَرِّبُونَا إِلَى اللَّهِ زُلْفَىٰ، تو اس عقیدے کے باوجود ان کا یہ عمل جتنا ہے وہ شرک قرار پایا، اور یہ سارے مشرک ہوئے، اگرچہ وہ اللہ تعالیٰ کے برابر نہ ٹھہرائیں ہر حیثیت میں، ان کو اللہ کے ماتحت ہی سمجھیں، لیکن نَعْبُدُ کے اندر جو لفظ ہے، اور وہ صاحب لسان تھے، وہ عبادت کے مفہوم کو بھی سمجھتے تھے، تو اپنا جو معاملہ وہ ان کے ساتھ کرتے تھے اُس کو عبادت قرار دیتے تھے، کہتے تھے کہ ہم ان کی عبادت کرتے ہیں، اس بات کا وہ اعتراف کرتے تھے کہ جیسے اللہ کی عبادت کرتے ہیں اِن کی بھی عبادت کرتے ہیں، لیکن ان کی عبادت کرنے سے مقصد ہمارا کیا ہے؟ تاکہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں، براہِ راست ہم اللہ تک پہنچ نہیں سکتے، ہماری وہاں رسائی نہیں ہے، اور یہ اللہ کے چہیتے ہیں، ہماری سفارش کریں گے۔ تو جو یہ عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہیں یہ بھی مشرک، اب یہ دُنیا میں سمجھائے ہوئے اگر نہیں سمجھتے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن اِن کے درمیان اور ان کے فریقِ مخالف یعنی مؤمنین کے درمیان عملی فیصلہ کرے گا، دلیل کے ساتھ تو فیصلہ یہیں ہو گیا، اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب کے اندر واضح کر دیا کہ ان کا یہ عقیدہ ٹھیک نہیں، عبادت خالص اللہ کی ہونی چاہیے، کسی دوسرے کو اس عبادت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ عملی فیصلے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مؤمنین کو جزا دی جائے، اُن کا انجام اچھا سامنے آجائے، اور کافروں کو مشرکوں کو جہنم میں ڈال دیا جائے تو عملی طور پر فیصلہ ہو جائے گا، جس کے بعد کوئی کسی قسم کا خفا نہیں رہے گا۔ ''جو لوگ اللہ کے علاوہ اولیاء اختیار کرتے ہیں، یہ عقیدہ رکھتے ہوئے، یا یہ کہتے ہوئے کہ نہیں پُوجا کرتے ہم ان کی مگر اس لیے تاکہ وہ ہمیں قریب کر دیں اللہ کی طرف از روئے درجے کے، درجے میں قریب کر دیں'' یہ زُلْفٰی مفعول مطلق بطور تاکید ہو کے ہے۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس بات میں جس میں کہ یہ اختلاف کرتے ہیں۔'' ایک فریق یہ ہو گا مشرکین کا، اور دوسرا فریق ہو جائے گا موحدین کا، اور فیصلے سے مراد عملی فیصلہ ہے۔

”اِنَّ اللہَ لَا یَھْدِیْ...اِلخ“ کے دو مفہوم

اِنَّ اللہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ: ھَدٰی یَھْدِیْ: راستہ دِکھانا، مقصد تک پہنچانا۔ ”ارادۃ الطریق“ اور ”ایصال الی المطلوب“ یہ دونوں معنی ”ہدایت“ کے آیا کرتے ہیں۔ ”شرح تہذیب“ کے مقدمے میں آپ نے پڑھے۔ اگر تو یہاں معنی یوں کیا جائے کہ ”بے شک اللہ تعالیٰ راستہ نہیں دکھاتا ان لوگوں کو جو کہ کاذب کفار ہیں“ (کاذب: کا معنی جھوٹے، کَفّار: کے معنی ناشکرے) پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ باوجود اس بات کے کہ یہ توحید کا مضمون انتہائی واضح ہے، لیکن یہ لوگ توحید کا راستہ اختیار نہیں کرتے، اللہ تعالیٰ ان کو اس راستے پر نہیں چلاتا، چونکہ ان کو جھوٹ بولنے کی عادت ہے اور ناشکرے ہیں، جس وقت تک یہ جھوٹ اور ناشکری سے توبہ نہیں کریں گے اس وقت تک کبھی بھی یہ توحید والے راستے پر نہیں چل سکتے، تو لَا یَھْدِیْ یہ دُنیا میں مراد ہوگیا، اللہ تعالیٰ ان کو توحید کا راستہ اختیار کرنے کی توفیق نہیں دیتا جس وقت تک یہ جھوٹ کو نہ چھوڑیں۔ اِنَّ اللہَ لَا یَھْدِیْ مَنْ ھُوَ کٰذِبٌ کَفَّارٌ: کاذب کے معنی جھوٹا، اور کفار: ناشکرا۔ ”اللہ تعالیٰ کاذب اور کَفّار کو ہدایت نہیں دیتا“ لفظی معنی اس کا یہ ہے، کاذب اور کَفّار دونوں کا مصداق ہے مشرک، مشرک کے اندر یہ دونوں صفتیں پائی جایا کرتی ہیں، مشرک جھوٹا بھی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتا ہے، کہتا ہے کہ فلاں شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی مرضیات میں دخیل ہے، اللہ تعالیٰ کو منالیتا ہے، اُس کی سفارش رَدّ نہیں ہوتی، یا اللہ تعالیٰ کا شریک کار ہے، حکومت چلانے میں اس کا معاون ہے، اللہ تعالیٰ نے کوئی شعبہ مکمل طور پر اس کے سپرد کر رکھا ہے، تو یہ جتنی باتیں مشرک کرتے ہیں ان میں وہ جھوٹے بھی ہیں، اور پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ ناشکرے بھی ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا کھاتے ہیں لیکن گُن دُوسروں کے گاتے ہیں، نعمتیں اللہ کی، فائدہ ان سے اُٹھاتے ہیں، لیکن سجدہ کسی دُوسرے کے سامنے کرتے ہیں، تعظیم کسی دُوسرے کی بجالاتے ہیں، اس طرح سے وہ اللہ کے ناشکرے بھی ہوتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ جھوٹے کو اور ناشکرے کو ہدایت نہیں دیتا۔ اس ہدایت سے اگر تو دُنیوی ہدایت مراد ہو تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جس وقت تک کوئی شخص جھوٹ اور ناشکری سے باز نہ آئے اللہ تعالیٰ اس کو صحیح راستے پہ چلنے کی توفیق نہیں دیتا، اس لئے باوجود اس بات کے کہ توحید کی راہ بالکل واضح ہے، اور کتاب اللہ نے خوب اچھی طرح سے کھول کھول کر اس بات کو بیان کر دیا، اور یہ لوگ مانتے نہیں، تو آپ کو اس سے تعجب نہیں ہونا چاہیے، اصل یہ ہے کہ کذب اور ناشکری ان دونوں باتوں نے ان کے اندر حق قبول کرنے کی صلاحیت کو ختم کر دیا ہے، تو ایسے جھوٹے اور ایسے ناشکرے ہدایت قبول نہیں کیا کرتے۔ پھر اس پہلے مفہوم کے مطابق اللہ تعالیٰ یہ اپنی عادت بیان فرمارہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو سیدھے راستے پہ چلنے کی توفیق نہیں دیتا، سیدھے راستے پہ چلنے کی توفیق اسے ہی ہوتی ہے جو جھوٹ سے بھی توبہ کرلے اور ناشکری سے بھی باز آجائے، اور مشرک کے اندر یہ دونوں باتیں پائی جایا کرتی ہیں، وہ جھوٹا بھی ہوتا ہے ناشکرا بھی ہوتا ہے..... اور اگر یہاں آخرت کا معاملہ مراد لیا جائے تو پچھلی آیت کے اندر چونکہ ذکر کیا گیا کہ اِنَّ اللہَ یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ فِیْ مَا ھُمْ فِیْہِ یَخْتَلِفُوْنَ اللہ تعالیٰ ان کے درمیان فیصلہ کرے گا اس چیز میں جس میں کہ یہ اختلاف کرتے ہیں، اور فیصلے سے عملی فیصلہ مراد ہے کہ موحدین کو جنت میں بھیج دے گا، مشرکین کو جہنم میں بھیج دے گا، یہ عملی فیصلہ ہے۔ تو پیچھے فیصلے کا ذکر ہے، اور وہ فیصلہ

کیا ہوگا، اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِیْ مَنْ هُوَ كٰذِبٌ كَفَّارٌ میں ان مشرکوں کا انجام بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کاذب اور کفار، ناشکرے اور جھوٹے کو اس کے مقصد تک نہیں پہنچائے گا، مقصد ہے نجات، تو جو جھوٹ بولتا ہے اور ناشکرا ہے تو وہ نجات نہیں پاسکے گا، تو اس فیصلے کی گویا کہ ایک شق یہاں بیان کردی گئی، اس کے مقابلے میں جو سچ بولتے ہیں، سچی بات کہتے ہیں اور اللہ کی شکر گزاری کرتے ہیں ان کا انجام خود سامنے آجائے گا کہ وہ اپنے مقصد تک پہنچ جائیں گے، مقصد کیا ہے؟ آخرت کی راحت حاصل کرنا اور آخرت کی نجات کو حاصل کرنا، تو یہ کاذب اور کفار نجات نہیں حاصل کرسکیں گے، تو اس صورت میں ہدایت سے مراد ہدایت اخروی ہوجائے گی کہ اللہ تعالیٰ ان کو مقصد تک نہیں پہنچائے گا، اور مقصد ہے نجات، اللہ تعالیٰ کی رضا، اور آخرت کی راحت (آلوسی)۔

اللہ کی طرف اولاد کی نسبت ہر لحاظ سے غلط ہے

فرشتوں کے متعلق ان کا عقیدہ چونکہ اولاد کا تھا، کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اولاد کی جگہ رکھا ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں ہیں، جیسے سورۂ صافات کے آخر میں ذکر آیا تھا، اور اسی عقیدے کی بنا پر وہ ان کی پوجا کرتے تھے، اور ان کی تعظیم بجالاتے تھے، تو آگے اسی نظریہ اولاد کی تردید ہے، لَوْ اَرَادَ اللّٰهُ اَنْ یَّتَّخِذَ وَلَدًا لَّاصْطَفٰى مِمَّا یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ: اگر ارادہ کرتا اللہ تعالیٰ اولاد اختیار کرنے کا، (اَنْ یَّتَّخِذَ مصدر کی تاویل میں ہوکر اَرَادَ کا مفعول ہے) اگر ارادہ کرتا اللہ تعالیٰ اولاد اختیار کرنے کا، تو چُنتا اپنی مخلوق میں سے جس کو چاہتا۔ لَاصْطَفٰى اصل میں لَاِصْطَفٰىھَا، ہمزہ وصل گرگیا۔ البتہ چُنتا اپنی مخلوق میں سے جو چاہتا۔ لَوْ کے ساتھ اس جملے کو ذکر کیا گیا، اور آپ جانتے ہیں کہ لَوْ: ''بالفرض'' کے لئے ہوتا ہے، لَوْ كَانَ فِیْهِمَآ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورۂ انبیاء: ۲۲) زمین وآسمان میں اللہ کے سوا اگر کوئی اور معبود ہوتے تو ان میں فساد برپا ہوجاتا، تو لَوْ: ''بالفرض'' کے لئے ہوا کرتا ہے۔ اور ''بالفرض'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ثانی کی نفی کو گویا کہ پہلے کی نفی کے لئے دلیل بنایا جاتا ہے۔ تم دیکھ رہے ہو کہ زمین وآسمان میں فساد نہیں ہے، تو یہ علامت ہے اس بات کی کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور آلہہ بھی نہیں ہیں، تو انتفاء ثانی دلیل ہوا کرتی ہے انتفاء اوّل کے لئے۔ اب یہاں ''بالفرض'' کے طور پر یہ بات ذکر کی جارہی ہے کہ بالفرض اللہ تعالیٰ اولاد اختیار کرنے کا ارادہ کرتا تو اپنی مخلوق میں سے ہی کسی کو چُنتا، اور مخلوق میں سے کسی کو اولاد چُن لینا محال ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی اولاد مخلوق نہیں ہوسکتی، اولاد ہم جنس ہوا کرتی ہے، تو اگر اللہ کی اولاد ہوتی تو وہ بھی اُلوہیت کی صفتیں لئے ہوئے ہوتی، جو مخلوق ہے جو مملوک ہے وہ اللہ تعالیٰ کا ہم جنس نہیں، جب ہم جنس نہیں تو غیر جنس کے متعلق اولاد کا ارادہ کرنا ہی محال ہے۔ اگر ارادہ کرتا تو اولاد مخلوق میں سے ہی اختیار کرتا، اور مخلوق اولاد ہو نہیں سکتی، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ارادہ ہی نہیں کیا، جب اللہ تعالیٰ نے اولاد حاصل کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا تو تم اللہ تعالیٰ کی طرف اس بات کو کس طرح سے منسوب کرتے ہو کہ اللہ کی اولاد ہے؟ اللہ نے تو ارادہ ہی نہیں کیا اولاد اختیار کرنے کا، اور اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا ارادہ کرنا محال ہے، ''لَوْ'' کے تحت جس طرح سے اشارہ کردیا گیا۔ کیوں محال ہے؟ کہ اولاد ہم جنس ہوتی ہے، اور اللہ تعالیٰ کے علاوہ جو کچھ ہے وہ سب اس کی مخلوق ہے، اور مخلوق اپنے خالق کی ہم جنس ہوتی نہیں، اور غیر جنس کو اولاد بنالیا جائے یہ عیب ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات عیب سے پاک ہے، تو یہ کتنی موٹی بات ہے کہ اللہ کے علاوہ باقی سب کو مخلوق بھی قرار

دو، اور پھر مخلوق ہونے کے ساتھ ساتھ اللہ کی اولاد بھی قرار دو، تو جس کا مطلب یہ ہوگیا کہ تم اللہ کی طرف غیر جنس اولاد کو منسوب کرتے ہو، تو جس طرح سے تمہارے گھر میں اگر کوئی غیر انسان پیدا ہوجائے تو تمہارے لئے عیب ہے، تو کیا اللہ تعالیٰ کی طرف غیر جنس اولاد کی نسبت عیب نہیں ہے؟ اور اللہ تعالیٰ کی ذات عیب سے پاک ہے، تو جب مخلوق میں سے کسی کو اولاد بنایا نہیں جاسکتا تو مخلوق میں سے کسی کو اولاد بنانے کا ارادہ بھی محال ہے، تو اللہ تعالیٰ نے سرے سے اولاد اختیار کرنے کا ارادہ ہی نہیں کیا، جب ارادہ ہی نہیں کیا تو اس کے لئے اولاد ہو کہاں سے جائے گی؟ اور ہو بھی تو کون سی ہوسکتی ہے؟ کیونکہ اللہ کے علاوہ تو باقی سب مخلوق ہیں، اس لئے تمہارا یہ نظریہ بالکل عقل کے بھی خلاف ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اطلاع بھی دے دی کہ میں نے تو ارادہ ہی نہیں کیا، نہ یہ ارادہ کیا جاسکتا ہے، کیونکہ اگر ارادہ کرتا تو مخلوق میں سے کسی کو اختیار کرتا، اور مخلوق میری اولاد ہو نہیں سکتی، کیونکہ وہ ہم جنس نہیں ہے، اور غیر جنس کو اگر میری اولاد قرار دیتے ہو تو یہ عیب ہے، سُبْحٰنَهٗ کے اندر اس کی نفی کردی، کہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہر عیب سے پاک ہے، لہٰذا یہ نظریہ سرے سے باطل ہے، اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو اپنی اولاد نہیں بنایا۔ مشرکین چونکہ فرشتوں کو اولاد قرار دیتے تھے تو اس لئے نفی یہاں ہم فرشتوں کو سامنے رکھ کے کرتے ہیں، باقی جہاں عیسائیوں کا تذکرہ ہے جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دیا، تو ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی نفی کی، کیونکہ اولاد کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف عیب ہے، سُبْحٰنَهٗ کے اندر اس نظریے کی تردید آگئی۔ اب ''لَوْ'' کے تحت یہ مسئلہ نکل آیا کہ اولاد ہونا تو کجا، اولاد کا ارادہ کرنا ہی اللہ تعالیٰ کے لئے ناممکن ہے، ممتنع ہے، محال ہے، کیونکہ اللہ کے علاوہ جو کچھ ہے سب مخلوق، اور مخلوق کو اولاد بنانے کا مطلب یہ ہے کہ غیر جنس کو اولاد بنادیا گیا، اور غیر جنس کا اولاد ہونا عیب ہے، اور اللہ تعالیٰ کی ذات کا عیوب سے پاک ہونا یہ عقلاً ضروری ہے، تو اس قسم کا ارادہ اللہ تعالیٰ کیسے فرماسکتے ہیں جو کہ اس کے بیان کردہ قواعد کے تحت ہی اس کے لئے ممتنع ہے، اس کی ذات کی طرف یہ عیب منسوب نہیں کیا جاسکتا، تو ''بالفرض'' کے طور پر اس بات کو ذکر کیا، کہ بالفرض اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا اولاد اختیار کرنے کا تو وہ اپنی مخلوق میں سے ہی چنتا جس کو چاہتا، اور مخلوق کو اولاد بنایا نہیں جاسکتا، لہٰذا اللہ نے ارادہ ہی نہیں کیا، اللہ تعالیٰ اس عیب سے پاک ہے کہ غیر جنس کو اس کی اولاد قرار دیا جائے۔

اِثباتِ توحید اور رَدِّ شرک کے لئے صفاتِ باری کا ذِکر

هُوَ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ: اس کے اندر توحید کا اثبات ہوگیا۔ قہار کے لفظ میں خاص طور پر اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ مشرکین جو اللہ کے لئے بیٹے بیٹیاں تجویز کرتے تھے، یا اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرکاء تجویز کرتے تھے، تو ان کا نظریہ یہ تھا کہ اکیلا اللہ تعالیٰ اتنی بڑی حکومت کیسے چلائے گا؟ جس طرح سے دُنیا کے اندر بادشاہ اپنے بیٹوں سے، اپنے معاونین سے کام لیتے ہیں اور انتظام چلاتے ہیں، تو اسی طرح سے اکیلا اللہ ساری مخلوق کو سنبھال نہیں سکتا، تو اس نے بھی اسی طرح سے اپنے معاون اور شریک کار بنا رکھے ہیں۔ تو لفظ قہار میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ وہ اکیلا ہی سب کو سنبھالنے والا ہے، اس کو اپنے لیے کسی معاون کی ضرورت نہیں، کیونکہ قہار کا معنی آپ کے سامنے ذکر کیا تھا کہ اس لفظ کو اگر آپ آج کل کی اِصطلاح میں کسی لفظ کے ساتھ اس مفہوم کو ادا کرنا چاہیں تو ''کنٹرولر'' اس کا مفہوم ہے، کنٹرول کرلینے والا، سب کو سنبھال لینے والا، سب کے اُوپر غالب، اور اُس کو اِس

انتظام کو سنبھالنے کے لئے کسی معاون کی اور کسی شریک کی ضرورت نہیں ہے، تو لفظ قہار میں اس بات کی طرف اشارہ آ گیا، گویا کہ مشرکین کے نظریے کی جڑ کاٹ دی گئی اس لفظ قہار کے تحت، کہ وہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کو اپنا کام چلانے کے لئے دوسرے معاونوں کی ضرورت ہے، تو اللہ نے کہہ دیا کہ وہ تو واحد، قہار ہے، اور قہار ہوتا وہی ہے جس کو کسی معاون کی ضرورت نہ ہو، سب کے اُوپر وہ اکیلا ہی کنٹرول کرلے اور سب کو خود اکیلا ہی ضبط کرلے۔ تو اولاد والے نظریے کی جو بنیاد تھی، ان کے دِل کا جو چور تھا، اس کو اس لفظ کے اندر ظاہر کر دیا گیا۔ ''اللہ تعالیٰ اکیلا ہے اور سب کو سنبھالنے والا ہے'' خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ: اب آگے یہی ذکر کیا جارہا ہے کہ اللہ کے علاوہ جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق ہے، ''پیدا کیا اس نے آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، مصلحت کے ساتھ'' یہ باطل نہیں، اللہ نے بے کار پیدا نہیں کیا، اس میں بہت حکمت اور مصلحت ہے۔ یُكَوِّرُ الَّیْلَ عَلَى النَّهَارِ: لپیٹتا ہے رات کو دِن پر اور لپیٹتا ہے دِن کو رات پر وَسَخَّرَ الشَّمْسَ وَالْقَمَرَ: اور مسخر کیا اس نے چاند کو اور سورج کو كُلٌّ یَّجْرِیْ لِاَجَلٍ مُّسَمًّى: ہر کوئی چلتا ہے ایک وقتِ معین تک، اَلَا هُوَ الْعَزِیْزُ الْغَفَّارُ: خبردار! وہی زبردست ہے اور بخشنے والا ہے۔ تکویر کا معنیٰ ہوتا ہے ایک چیز کو لپیٹنا، جیسے ''کورِ عمامہ'' یہ پگڑی کا پیچ ہوتا ہے، تو رات کو دِن کے اُوپر لپیٹ دینے کا مطلب یہ ہے کہ دِن کی روشنی کے اوپر اللہ تعالیٰ رات کو اس طرح سے چڑھا دیتا ہے، گویا کہ اس کی تاریکی کے اندر روشنی لپٹ گئی، ظاہر نہیں ہو رہی، اور دوسرے وقت میں اللہ تعالیٰ دِن کو رات کے اُوپر اس طرح سے چڑھا دیتا ہے گویا کہ دِن کی روشنی میں رات کو لپیٹ لیا، یہ وقت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کے جو تصرفات ہیں اُن کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے۔ آسمانوں اور زمین کو پیدا اسی نے کیا، دِن اور رات کا چکر سب اسی کے اختیار میں ہے، سورج اور چاند کو اسی نے مسخر کیا، کام میں لگا رکھا ہے، اور ایک وقت معین تک یہ چلتے ہیں، اور وہ وقت معین جب آجائے گا تو یہ سارے کا سارا کام ختم ہو جائے گا، اجل مسمّٰی سے مراد قیامت، قیامت تک یہ چلیں گے جب تک اللہ تعالیٰ کو منظور ہے۔

توبہ کی ترغیب

وہ زبردست ہے، غفار ہے، بخشنے والا ہے، یہاں غفار کا ذِکر کر کے گویا کہ توبہ کی طرف دعوت دی ہے، کہ تم نے اس خالق کی شان میں چاہے جتنی گستاخیاں کرلیں، اور اس کی زمین وآسمان سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے تم ناشکری کرتے رہے، لیکن اب بھی اگر توبہ کرلو، اور اللہ کے سامنے اپنے قصور کا اِعتراف کرلو، تو وہ بخشنے والا بھی ہے، صرف یہ نہیں کہ زبردست ہے کہ نافرمانی کرنے والوں کو پیٹتا ہی جاتا ہے، بلکہ وہ معاف کرنے والا بھی ہے، غفار بھی ہے، تو اس میں ترغیب ہے توبہ کی۔

حضرت حوّاء کی تخلیق کس طرح ہوئی

خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ: پہلے عالمِ اکبر کا ذکر تھا کہ آسمان اور زمین کی خلقت کا ذِکر کر دیا، اور اب آگے عالمِ اصغر، انسان کی خلقت کا ذِکر ہے، ''پیدا کیا اس نے تمہیں ایک نفس سے'' ثُمَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا: پھر بنایا اسی نفس سے اس کی بیوی کو۔ اس کے دو مطلب آپ کے سامنے ذِکر کئے گئے تھے، کہ آدم علیہ السلام سے ہی کچھ مادّہ لے کر بنیاد اُٹھائی گئی حضرت حوّاء کی، گویا کہ نفسِ آدم سے

حوّاء کو پیدا کیا گیا، اَشہر یہی ہے، اور بعض مفسرین یوں بھی ذکر کرتے ہیں کہ جنسِ آدم سے حوّاء کو بنایا گیا، یعنی انسانی جنس سے ہی اللہ تعالیٰ نے حضرت حوّاء کو بنادیا۔ پیدا مستقل کیا۔ جس طرح سے آدم کو پیدا کیا تھا اسی طرح حوّاء کو پیدا کردیا، تو مِنْهَا کا مطلب ہے من جنسها کہ نفسِ واحد کی جنس سے اس کی بیوی بنادی، یا اسی سے کچھ ماخذ اور مادّہ لے کر اس سے حضرت حوّاء کو پیدا کردیا، جیسے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم علیہ السلام کی پسلی سے اللہ تعالیٰ نے حوّاء کا مادہ لیا، اور اس سے حوّاء کو بنایا۔ ''پیدا کیا تمہیں ایک نفس سے پھر بنایا اسی سے اس کی بیوی کو۔''

اللہ نے تخلیقِ اِنسان کے ساتھ اس کی بقاء کا سامان بھی پیدا فرمایا ہے

وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ: یہ آپ کے لئے بقاء کا سامان ہے۔ اتارا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے آٹھ قسموں کو چوپایوں سے۔ اَنعام: یہ نَعَم کی جمع ہے۔ نعم: مویشی۔ عرب کے اندر زیادہ تر گھروں میں چار قسم کے جانور ہی پالے جاتے تھے: بھیڑ، بکری، گائے اور اُونٹ، اور ان کے نر مادّہ کو اگر لے لیا جائے تو یہ آٹھ قسمیں بن جاتی ہیں جن کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَنعام میں گزری۔ تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں پیدا بھی کیا، پیدا کرنے کے بعد تمہاری بقاء کا سامان بھی پیدا کیا، کیونکہ عرب کے اندر زندگی جو گزرتی تھی تو زیادہ تر اس میں مویشی سے وہ لوگ فائدہ اُٹھاتے تھے، انہی کا دُودھ پیتے، انہی کا گوشت کھاتے، انہیں کے چمڑوں سے خیمے بناتے تھے، انہی کے بالوں سے کپڑے بناتے تھے، تو ان کی بودوباش میں زیادہ تر دخیل یہی حیوانات تھے۔

اَنْزَلَ: اللہ نے اُتارے۔ اُتارنے کا ذکر یہاں جو کیا ہے، تو چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہر کام کی تدبیر ہوتی ہے اور اس کی تدبیر کے تحت ہی ہر چیز زمین میں پیدا ہوتی ہے، تو عالمِ خفاء سے جو چیز بھی عالمِ ظہور کی طرف آتی ہے، تو چونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی تدبیر کے تحت آتی ہے، اس لئے اس کو ''اِنزال'' کے لفظ سے تعبیر کردیا جاتا ہے، گویا کہ اللہ کی طرف سے حکم آیا تو یہ چیز ظاہر ہوئی اور یہ چیز پیدا ہوئی، اس اعتبار سے اس کو ''اِنزال'' سے تعبیر کیا، یہاں حیوانات کے متعلق یہ لفظ بولا ہے، اور سورۂ حدید کے اندر ہے اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ حدید کے متعلق بھی یہی لفظ بولا کہ اللہ تعالیٰ نے لوہا اُتارا، وہاں بھی اُتارنے سے یہی مراد ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم نازل ہوا اور زمین کے اندر یہ چیز پیدا ہوئی، تو تدبیر چونکہ ہر اَمر کی اللہ کی طرف سے ہوتی ہے، عرشِ اِلٰہی کی طرف سے اَحکام آتے ہیں، جس کی بنا پر ان چیزوں کو اَنْزَلَ کے ساتھ تعبیر کردیا جاتا ہے۔ ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے حیوانات کی آٹھ قسمیں اُتاریں'' یعنی پیدا فرمائیں، ظاہر فرمائیں، آٹھ قسموں سے مراد: بھیڑ، بکری اُونٹ اور گائے، نر اور مادہ مل کر یہ آٹھ قسمیں ہوگئیں۔

''تین تاریکیوں'' میں اِنسانی تخلیق کے مراحل اللہ تعالیٰ کے کمالِ قدرت کا نمونہ ہیں

يَخْلُقُكُمْ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ: پیدا کرتا ہے تمہیں تمہاری ماؤں کے پیٹوں میں بار بار پیدا کرنا، ایک دفعہ پیدا کرنے کے بعد اور پیدا کرنا، یعنی ایک کیفیت پر پیدا کرنے کے بعد دُوسری کیفیت پر پیدا کرنا، مسلسل یہ تخلیق ہوتی ہے، فِيْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ: تین تاریکیوں میں، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ: یہی اللہ تمہارا ربّ ہے، اس کے لئے سلطنت ہے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں اس کے علاوہ، فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ پھر تم کدھر پھیرے جاتے ہو...... خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ سے اُن درجات کی طرف اشارہ ہے

جو بچے پہ طاری ہوتے ہیں، تدریجاً اس کی تخلیق ہوتی ہے، جیسے قرآنِ کریم میں دُوسری آیات میں تفصیل ذکر کی گئی، پہلے نطفے کی شکل میں رحمِ مادر میں جاتا ہے، پھر اس کے بعد علقہ یعنی جما ہوا خون بنتا ہے، پھر اس کے بعد مضغہ یعنی گوشت بنتا ہے، پھر اس کے اندر ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں، پھر ہڈیوں کے اُوپر گوشت چڑھایا جاتا ہے، پھر اس کے اندر رُوح پھونکی جاتی ہے، یہ جو درجات ہیں تو خَلْقًا مِّنْۢ بَعْدِ خَلْقٍ میں انہی درجات کی طرف اشارہ ہے، ایک دفعہ پیدا کرنے کے بعد پھر اور پیدا کرنا، ایک کیفیت پر پیدا کرنے کے بعد دُوسری کیفیت پر پیدا کرنا، مسلسل اللہ تعالیٰ اس طرح سے تمہیں مختلف طریقوں سے پیدا کرتا ہے ماؤں کے پیٹوں میں۔ اور فِیْ ظُلُمٰتٍ ثَلٰثٍ: تین تاریکیوں میں۔ اللہ تعالیٰ کی یہ تخلیق اندھیروں میں ہے، تاریکیوں میں ہے جہاں تمہیں کچھ نظر نہیں آتا، تو اللہ تعالیٰ کا کامل علم اور کامل قدرت اس میں نمایاں ہے۔ ''تین تاریکیاں'' کس طرح سے ہوگئیں؟ ایک تو یہ پیٹ کا چمڑا ہو گیا، پھر آگے رحم کا لفافہ ہو گیا، اور پھر رحم کے اندر بچہ جو بنتا ہے تو اس کے اُوپر پھر ایک باریک سی جھلی ہوتی ہے، جس طرح سے پیاز کے دو چھلکوں کے درمیان میں ایک معمولی سی جھلی ہوتی ہے، بہت پتلا سا پردہ، اسی طرح سے بچہ اس جھلی کے اندر لپٹا ہوا ہوتا ہے، یہ جھلی بچے کے ساتھ ہی خارج ہوتی ہے، آپ نے کبھی بکریوں کو اور بھینسوں کو بچہ دیتے ہوئے دیکھا ہوگا کہ جس وقت ان کا بچہ باہر آتا ہے تو ایک جالے میں لپٹا ہوا ہوتا ہے، پھر باہر آنے کے بعد اس جالے کو دُور کیا جاتا ہے، تو وہ جھلی بچے کے ساتھ ہی باہر آتی ہے، تو بطنِ مادر ہو گیا، پھر آگے رحم ہو گیا، رحم کے آگے پھر جھلی ہوگئی، تو یہ تاریکی در تاریکی ہے جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ انسان کی نازک ترین مشین بناتے ہیں، تو کتنی بڑی حکمت ہے اللہ تعالیٰ کی، اور کتنی بڑی قدرت نمایاں ہے، اور اللہ تعالیٰ کا علم کامل کس طرح سے نمایاں ہے، کہ باریک سے باریک پرزوں والی انتہائی نازک قسم کی مشین بنائی، اور اتنی تاریکیوں میں۔ تو جو تمہاری تخلیق اس طرح سے کرتا ہے، تمہارے لئے بقاء کے لئے سامان پیدا کرتا ہے، یہی اللہ تمہارا ربّ ہے، اسی کی سلطنت ہے، اس کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، تو بات بالکل واضح ہے، تو تمہیں کدھر پھیرا جا رہا ہے؟ یعنی کون دھکے دے دے کر تمہیں سیدھے راستے سے ہٹا رہا ہے؟ کہ تم اس کی رُبوبیت کے متعلق صحیح عقیدہ نہیں رکھتے، اور اس کی اُلوہیت کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

شکر اور ناشکری دونوں کیفیتیں اللہ کی پیدا کردہ ہیں لیکن ایک پسند اور دوسری ناپسند ہے

اِنْ تَكْفُرُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِیٌّ عَنْكُمْ ۗ وَلَا یَرْضٰى لِعِبَادِهِ الْكُفْرَ ۚ: اگر تم ناشکری کرو۔ یہ کُفر: کُفْرَان سے ہے چونکہ پیچھے نعمتوں کا ذکر آ رہا ہے۔ اگر تم ناشکری کرو تو اللہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں، بے شک اللہ تعالیٰ تم سے غنی ہے۔ غنی کا معنی غیر محتاج، اس کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں، یہ نہیں کہ تمہاری شکر گزاری کے ساتھ اس کے ملک میں کوئی ترقی ہوتی ہے، تمہارے کُفران اور ناشکری کے ساتھ اس کی سلطنت میں کوئی فرق آتا ہے، ایسی بات نہیں ہے، اگر تم اللہ کے شکر گزار نہیں بنتے تو اللہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ''نہیں پسند کرتا وہ اپنے بندوں کے لئے ناشکری کو'' یعنی بندے اگر ناشکری کرتے ہیں تو اللہ کا بگڑتا کچھ نہیں، لیکن بندوں کے لئے اللہ تعالیٰ کو ناشکری پسند نہیں ہے، کیونکہ اس میں بندوں کا اپنا ہی نقصان ہے۔ اور اگر تم شکر کرتے ہو، یہ اِنْ تَكْفُرُوْا کا معنی ناشکری کے ساتھ جو کیا تو اسی تقابل کی بنا پر، کہ آگے آگیا وَاِنْ تَشْكُرُوْا: اور اگر تم اللہ کی شکر گزاری کرتے ہو یَرْضَهُ لَكُمْ تو اس کو وہ

تمہارے لئے پسند کرتا ہے، یعنی اگرچہ تخلیق اللہ کی ہے، کُفر کے متعلق بھی اور ایمان کے متعلق بھی، شکر ہو، ناشکری ہو، سب ہوتا اللہ کے ارادے کے ساتھ ہی ہے، جس طرح سے تقدیر کے متعلق عقیدہ ہے، تخلیق اللہ کی ہے، یہ کیفیتیں پیدا اللہ ہی کرتا ہے، اللہ کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے جو کچھ ہوتا ہے، لیکن ایک کے ساتھ اللہ کی رضا متعلق ہے، اور ایک کے ساتھ اللہ کی رضا متعلق نہیں ہے، اگر کوئی شخص ناشکری کرتا ہے تو اس پر اللہ کی رضا نہیں ہے، اللہ ناراض ہوتا ہے، یہ بات اللہ کے ہاں ناپسندیدہ ہے، اور اگر کوئی شکر گزاری کو اختیار کرتا ہے تو اللہ اس کے اوپر خوش ہوتا ہے۔

باقی یہ وہم اپنے دماغ سے نکال دو کہ یہاں تو کرتے رہو ناشکری (اور ناشکری کا اعلیٰ فرد شرک ہے، کہ عبادت جو اللہ کا حق تھا وہ غیر اللہ کے ساتھ لگا دیا) اور پھر تم یہ سہارے تلاش کیے رکھو کہ فلاں ہمیں بچالے گا، ہماری ذمہ داری کوئی دوسرا اُٹھالے گا، یہ بات غلط ہے، یہ ذہن سے نکال دو وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی: وَازِرَةٌ یہ نفس کی صفت ہے، کوئی نفس بوجھ اُٹھانے والا بوجھ نہیں اُٹھائے گا کسی دوسرے نفس کا ۔ وِزْرَ نَفْسٍ اُخْرٰی۔ جو گناہ کیا ہے، جو کچھ اعمال کیے ہیں، ان کا بوجھ خود برداشت کرنا ہوگا، کوئی دوسرا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ ''پھر تمہارے رَبّ کی طرف ہی تمہارا لوٹنا ہے، پھر تمہیں خبر دے گا وہ ان کاموں کی جو تم کیا کرتے تھے۔'' اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: بے شک وہ دلوں کی باتوں کو جاننے والا ہے۔ صدور: صدر کی جمع ہے، علیمٌ بِاَقْوَالٍ ذَاتِ الصُّدُوْرِ، راز اور بھید کی نسبت سینے کی طرف بھی ہوتی ہے، دِل کی طرف بھی ہوتی ہے۔ ''دِلوں کے بھید''، ''سینوں کے راز'' دونوں طرح سے لفظ بولے جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا کوئی حال اللہ تعالیٰ سے مخفی نہیں، بلکہ جو کچھ تمہارے دِلوں میں یا سینوں میں چھپا ہوا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بھی جاننے والے ہیں۔

''توحید'' فطرت کا تقاضا ہے!

وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ وَجَعَلَ لِلّٰهِ اَنْدَادًا لِّیُضِلَّ عَنْ سَبِیْلِهٖ ؕ قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِیْلًا ۖۗ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ: جب انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے۔ ضُرّ: نقصان، تکلیف۔ دَعَا رَبَّهٗ مُنِیْبًا اِلَیْهِ: پکارتا ہے اپنے رَبّ کو اس کی طرف رجوع کرتا ہوا، ثُمَّ اِذَا خَوَّلَهٗ نِعْمَةً مِّنْهُ: پھر جس وقت اس کا رَبّ اس کو نعمت دے دیتا ہے اپنی جانب سے، نَسِیَ مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلَیْهِ مِنْ قَبْلُ: بھول جاتا ہے اس تکلیف کو (مَا سے مراد وہی ضُرّ ہے) بھول جاتا ہے اس تکلیف کو جس کے اِزالے کی طرف وہ اپنے رَبّ کو بُلاتا تھا، مَا كَانَ یَدْعُوْۤا اِلٰی كَشْفِهٖ (نسفی)، جس تکلیف کے ازالے کی طرف وہ اپنے رَبّ کو بُلاتا تھا اس تکلیف کو بھی بھول جاتا ہے، اس سے قبل جس چیز کے اِزالے کی طرف وہ اس کو بُلاتا تھا وہ اس کو بھول جاتا ہے، ''اور بناتا ہے اللہ کے لئے شرکاء'' انداد: نِدٌّ کی جمع ہے۔ ''تاکہ بھٹکا دے اللہ کے راستے سے'' خود بھی گمراہ ہوتا ہے، دُوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ مزے اُڑالے تُو اپنے کُفر سے تھوڑی دیر، بے شک تُو جہنم والوں میں سے ہے'' تَمَتَّعْ: فائدہ اُٹھالے بِكُفْرِكَ: اپنے کُفر کے ساتھ، یعنی یہ کُفر کی بہار چند روزہ دیکھ لو، مزے اُڑالو، اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ: بے شک تُو جہنم والوں میں سے ہے..... اس میں یہ ظاہر کیا کہ انسان جس وقت کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہے، اور ظاہری سہارے اس کے ٹوٹ

جاتے ہیں، پھر صرف اللہ اس کے سامنے ہوتا ہے، اسی کے سامنے یہ لجاجتیں کرتا ہے۔ اور ہم اپنی زندگی میں بھی اگر غور کریں، تو درجہ بدرجہ ہماری زندگی میں بھی یہ بات نمایاں ہے، ہمیں جس وقت کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو پہلے تو ہم اپنے اردگرد کے یار دوست حکماء، ڈاکٹر، اطباء کی طرف جھانکتے ہیں، (یہ درجہ بدرجہ کی بات کر رہا ہوں، مشرکوں والی بات تو نہیں ہے، لیکن سمجھانے کے لئے ایک بات عرض کرتا ہوں) ہم اپنے طور پر جو اَسباب اِردگرد ہیں، جن سے فائدہ اُٹھانے کی اللہ نے ہمیں اجازت دی ہے، ہم ان اسباب کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، یہ دوا کر، وہاں سے علاج کروا، یہ ٹیکہ لگوا، فلاں ڈاکٹر سے مشورہ کر، کسی حکیم سے دوائی لے، اس وقت تک ہمارے ذہن میں پوری طرح سے لجاجت اور اِلحاح اور تضرع اللہ کی جانب نہیں ہوتا، جس وقت تک ہماری نظر ظاہری اسباب پہ ہوتی ہے، اور ایک درجہ ایسا بھی آتا ہے کہ ظاہری اسباب سے انسان کو مایوسی ہو جاتی ہے، ڈاکٹروں کے علاج سے کوئی فائدہ نہیں ہو رہا، اطباء کی تدبیریں ناکام رہ گئیں، اور یہ دَم درود اور پھونکا پھانکی یہ بھی ہم کر کرا لیتے ہیں، تعویذ گنڈا بھی کرا لیتے ہیں، اس کے بعد بھی صحت کی اور تکلیف کے اِزالے کی کوئی صورت سمجھ نہیں آتی، جس وقت یہ ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں، تو پھر انسان کہتا ہے کہ اب اللہ کے علاوہ کوئی دُوسرا سہارا نہیں، پھر جس طرح سے اللہ کے سامنے انسان ہاتھ پھیلاتا ہے اور زاری کرتا ہے، یہ اس وقت تک نہیں ہوتی جس وقت تک انسان کی نظر ظاہری اسباب پر ہوتی ہے، تو جس طرح سے ہماری زندگی کے اندر یہ فرق آپ کو معلوم ہے، ہم اسباب کی طرف نظر ڈالے ہوئے ہیں، جن اسباب سے فائدہ اُٹھانے کی اور ظاہری تدبیر کرنے کی اللہ نے ہمیں اجازت دی ہے، بشرطیکہ ان کو مؤثرِ حقیقی نہ سمجھا جائے، لیکن ایک انسان چونکہ ظاہر کی طرف مائل ہوتا ہے تو اس کے تحت یہ درجات آپ کو اپنے مزاج میں بھی سمجھ میں آتے ہیں، کہ انسان ظاہری اسباب کی موجودگی میں پوری طرح سے اللہ کی طرف متوجہ نہیں ہوتا، جب ظاہری اسباب سے انسان بالکل مایوس ہو جاتا ہے، دیکھ لیتا ہے کہ اب کوئی سہارا نہیں، تو پھر اللہ کی طرف ٹوٹے ہوئے دِل کے ساتھ متوجہ ہوتا ہے، پھر اللہ کے سامنے روتا ہے اور ہاتھ پھیلاتا ہے، اور یہی وقت ہوتا ہے جس وقت پھر اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمت انسان کو سنبھالتی ہے۔ مشرکین اسی طرح سے کرتے تھے کہ وہ بالکل جن کو اپنا فریادرس سمجھتے تھے، کارساز سمجھتے تھے تو ان کا رُجحان ان کی طرف ہی ہوتا، لیکن جب کوئی ایسی مصیبت پہنچ جاتی کہ یہاں ٹکریں مار مار کر دیکھ لیں یہاں سے کچھ نہ ہو سکا، اور وہ بھی سمجھ جاتے کہ یہ معاملہ اب ان کے بس سے باہر ہے، تو پھر وہ اللہ کی طرف رُجوع کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس سے معلوم ہو گیا کہ میں نے فطرت میں یہی چیز ڈالی ہے کہ کارساز اللہ ہی ہے، دُوسرے نہیں، لیکن یہ انسان ان واقعات سے سبق حاصل نہیں کرتا، جب تکلیف ہوتی ہے تو اللہ کی طرف متوجہ ہوتا ہے، اور جب اللہ کی طرف سے کوئی نعمت مل جاتی ہے، تو پھر وہی ناشکری، کہ فلاں شخص نے دوائی دی تھی جس سے فائدہ ہو گیا، فلاں کی جگہ ہم نے چڑھاوا چڑھایا تھا اس نے ہماری یہ تکلیف دُور کر دی، پھر یہ نسبتیں غیراللہ کی طرف کرنی شروع کر دیتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ سے پھر انسان کا ذہن ہٹ جاتا ہے، یہ ایک شکایت کی بات ہے کہ اصل فطرت کی آواز وہی ہے جب ظاہری سہاروں کے ٹوٹ جانے کے بعد انسان کے دِل سے جو بات اُبھرتی ہے، اور وہ صرف یہی ہے کہ اللہ کارساز ہے، اللہ کے علاوہ کوئی دُوسرا بنانے والا نہیں۔

’’موحد‘‘ اور ’’مشرک‘‘ میں بنیادی فرق

اس لئے موحد پہلے ہی اِدھر پہنچا ہوا ہوتا ہے، توحیدِ کامل یہ ہے کہ انسان اگر اَسباب کو اختیار بھی کرے تو اس کے ذہن میں یہ نہ ہو کہ شفا یہاں سے ہوگی یا تکلیف کا اِزالہ یہاں سے ہو جائے گا، بلکہ موحد کا ذہن یہ ہوا کرتا ہے کہ ہم اللہ کی اجازت کے تحت یہ ایک تدبیر اختیار کر رہے ہیں، باقی! فائدہ ہونا، نہ ہونا یہ اللہ کے اختیار میں ہے، دوا ہم لیں گے لیکن شفا اللہ کے ہی ہاتھ میں ہے، موحد کا ذہن پہلے دِن سے یہی ہوتا ہے، اس لئے وہ اسباب اختیار تو کرتا ہے، نظر اللہ پہ ہی ہوتی ہے، مشرک کا ذہن ایسا نہیں ہوتا، وہ سب کچھ انہی اسباب کو سمجھ لیتا ہے جو اِردگرد پھیلے ہوئے ہوتے ہیں، اور جب یہاں سے مایوسی ہوتی ہے تب اسے اللہ یاد آتا ہے، تو موحد اور مشرک میں فرق یہی ہے، جیسے کہ ایک جگہ قاضی ثناء اللہ صاحب ﷫ پانی پتی کہتے ہیں کہ: ’’اَلنَّظْرُ اِلَی الْاَسْبَابِ مَعَ الْغَفْلَةِ عَنِ الْمُسَبِّبِ یُنَافِی التَّوْحِیْدَ‘‘ کہ اسباب پر نظر ڈالنا، اور مسبب کی طرف دھیان نہ رہنا، یعنی یہ خیال نہ رہنا کہ ہے سب کچھ اللہ کے اختیار میں، جو کچھ نتیجہ آئے گا وہ سب اللہ کی طرف سے آئے گا، یہ اسباب ظاہری ہم اختیار کر رہے ہیں، ان کے اندر تاثیر رکھنے والا بھی اللہ ہی ہے، اگر یہ نظریہ ذہن سے اوجھل ہو جاتا ہے، اور مسبب کی طرف دھیان نہیں رہتا، کہتے ہیں یہ بھی توحید کے منافی ہے۔ ’’فَالْمُوَحِّدُوْنَ هُمُ الصُّوْفِيَّةُ‘‘[1] حقیقت کے اعتبار سے موحد صوفیہ ہی ہیں کہ جن کی نظر ہمیشہ اللہ پہ رہتی ہے، اور وہ اسباب کی طرف اس طرح سے دھیان نہیں دیتے، کہ کسی چیز کے حاصل ہونے کی نسبت اسباب کی طرف کریں، مطلب یہ ہے کہ مقامِ توحید یہی ہے کہ انسان اسباب اختیار کرے بھی تو ان اسباب کو مؤثر نہ سمجھے، موحد اور مشرک میں یہی فرق ہے، موحد اور مسلم یہ سمجھتا ہے کہ یہ اسباب اللہ کے بنائے ہوئے ہیں، تاثیر بھی اللہ کی رکھی ہوئی ہے، اللہ چاہے گا تو فائدہ پہنچے گا، اگر اللہ نہیں چاہے گا تو فائدہ نہیں پہنچے گا، اور کافر اور مشرک یہ سمجھا کرتا ہے کہ یہی اسباب سب کچھ ہیں، یہیں سے فرق شروع ہو جاتا ہے، تو اَسباب ہم اختیار کرتے ہیں، جب ظاہری اسباب ختم ہو جاتے ہیں پھر پوری طرح سے اِلحاح اور زاری ہم میں بھی پیدا ہوتی ہے، وہ انسان کی طبیعت کے لحاظ سے ہے، ورنہ نظر موحد کی پہلے ہی اللہ تعالیٰ پہ ہوتی ہے کہ ان اسباب کے اندر اَثر کا ہونا، نہ ہونا یہ بھی اللہ کے رکھنے کے ساتھ ہے۔ تو جس وقت انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے، تو وہ اپنے رَبّ کو پکارتا ہے، اس کی طرف رجوع کرتا ہوا، یعنی ظاہری سہارے سارے چھوٹ جاتے ہیں، اور جب اللہ اس کو نعمت دے دیتا ہے اپنی جانب سے تو وہ اس تکلیف کو بھی بھول جاتا ہے جس تکلیف کے اِزالے کے لئے اس سے قبل وہ پکار رہا تھا، انسان خوش حالی میں آتا ہے تو پچھلی تکلیفیں بھول جاتا ہے، ورنہ اگر وہ پچھلی تکلیفوں کو یاد رکھتا تو خوش حالی میں آکر متکبر نہ ہوتا بلکہ اللہ کا شکرگزار رہتا، اور اللہ کے لئے شرکاء قرار دے لیتا ہے، خود بھی گمراہ ہوتا ہے، دوسروں کو بھی گمراہ کرتا ہے، اس کے طرزِ عمل سے دوسروں میں بھی ضلالت پھیلتی ہے، جس طرح سے ائمۃ الکفر کرتے تھے یعنی مشرکین کے سردار، خود گمراہ ہوتے، دوسروں کو بھی گمراہ کرتے۔ ’’قرار دیتا ہے وہ انسان اللہ کے لئے شرکاء تاکہ گمراہ کرے اللہ کے راستے سے‘‘ جب دوسروں کو گمراہ کرتا ہے تو خود اپنی گمراہی تو پہلے آگئی۔ ’’تو آپ کہہ دیجئے کہ اپنے کُفر کے سبب سے تم فائدہ

---

(۱) تفسیر مظہری، سورۂ یوسف آیت ۱۰۶ کے تحت۔

اُٹھالو کچھ روز'' آج تم اپنے ان کُفریہ عقائد کے اوپر خوش ہو، تمہیں یہ لذیذ معلوم ہوتے ہیں، یہ بہار چند روز دیکھ لو۔ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ: بےشک تُو جہنم والوں میں سے ہے۔ یہ آخرت کی طرف اشارہ ہوگیا۔

وقوعِ آخرت کی عقلی حکمت

اب آگے اللہ تبارک وتعالیٰ آخرت کے وقوع کے متعلق فرماتے ہیں کہ وہ ضرور آئے گی، کیونکہ اگر آخرت نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فرماں بردار، نافرمان، فاسق، فجار، انجام کے لحاظ سے سب ایک جیسے ہوجائیں، ایسا نہیں ہوا کرتا، اور یہ بات آپ کے سامنے بارہا ذکر کی جاچکی، اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ: کیا وہ شخص جو اطاعت کرنے والا ہے، فرماں بردار ہے رات کی ساعات میں (اٰنَآءَ: ساعات کے معنی میں ہے) جو رات کی ساعات میں فرماں برداری کرنے والا ہے، اطاعت کرنے والا ہے، اس حال میں کہ سجدہ کرنے والا ہے، قیام کرنے والا ہے، آخرت سے ڈرتا ہے، اپنے رَبّ کی رحمت کی اُمید کرتا ہے، تو کیا یہ شخص اور دُوسرا شخص آپس میں برابر ہوسکتے ہیں؟ ایک آدمی رات غفلت سے گزارتا ہے، کبھی اللہ کا نام نہیں لیتا، اور ایک رات کو عبادت کرتا ہے، طاعت کرتا ہے، کبھی سجدے میں ہے، کبھی رُکوع میں ہے، کبھی قیام میں ہے، اور پھر خوف ورجاء دونوں کیفیتیں اس کے اُوپر طاری ہیں، آخرت کا ڈر بھی ہے، اللہ کی رحمت کی اُمید بھی ہے، تو کیا ایسا صالح آدمی اور جس کے یہ حالات نہ ہوں کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟ جب یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے تو یہ نتیجہ ظاہر ہوگا تو عالمِ آخرت میں ظاہر ہوسکتا ہے، دُنیا میں تو بسا اوقات دوسرے (بُرے) آدمی زیادہ کامیاب زندگی گزارتے ہیں، اگر آخرت نہ ہو تو مرنے کے بعد تو پھر سارے برابر ہوگئے؟ اس طرح سے انجام دونوں کا ایک نہیں ہوسکتا۔

علم والے کون ہیں؟

دُوسرا عنوان اس میں آگیا کہ'' کیا وہ لوگ جو علم رکھتے ہیں اور جو لوگ علم نہیں رکھتے، کیا یہ دونوں برابر ہوسکتے ہیں؟'' برابر نہیں، یہاں ''علم'' سے بھی اللہ تعالیٰ کی صفات کا علم مراد ہے، جس کے نتیجے میں اُوپر والی عملی زندگی آتی ہے۔ یہاں الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو اَمَّنْ هُوَ قَانِتٌ اٰنَآءَ الَّيْلِ سَاجِدًا وَّقَآىِٕمًا يَّحْذَرُ الْاٰخِرَةَ وَيَرْجُوْا رَحْمَةَ رَبِّهٖ کے عنوان کے ساتھ ذکر کیا گیا، الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ کا مصداق یہ لوگ ہیں، یعنی ایسا علم رکھنے والے جو اللہ تعالیٰ کی معرفت ہے، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو پہچانتے ہیں، اور اس کی ذات وصفات کے تقاضے کے ساتھ پھر اس کی عبادت کرتے ہیں، اس سے ڈرتے بھی ہیں اور اُس کی رحمت سے اُمید بھی رکھتے ہیں، تو الَّذِيْنَ يَعْلَمُوْنَ کا مصداق یہ لوگ ہیں، اور جن کے اُوپر یہ کیفیت طاری نہیں، تو اگر لفظی طور پر کچھ وہ جانتے بھی ہیں، اور چند الفاظ ان کو یاد بھی ہیں، تو پھر بھی وہ لَا يَعْلَمُوْنَ کا مصداق ہیں، ''علمے کہ راہِ حق نماید جہالت است'' جس علم کے اُوپر عمل مرتب نہ ہو، جس علم کے ساتھ صحیح راستے پر چلنے کی توفیق نہ ہو، اس کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، اس لئے جہاں بھی اہلِ علم کی تعریف آتی ہے، اللہ تعالیٰ اُولوالعلم کے درجات بیان کرتے ہیں، یا اَصحابِ علم کی حدیث شریف میں یا قرآنِ کریم میں تعریف نقل

کی گئی ہے، تو اس "علم" سے وہی "علم" مراد ہے جو اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے تعلق رکھتا ہے، اور ذات وصفات کا "علم" حاصل ہونے کے بعد پھر اس کے اُوپر عمل بھی مرتب ہوتا ہے، ورنہ اگر اس کے اوپر عمل مرتب نہ ہو تو انسان کے حق میں وہ علم اور جہل دونوں برابر ہیں، تو یہاں یَعْلَمُوْنَ کا مصداق یہی لوگ ہیں جو راتوں کو اس طرح سے اللہ کی عبادت کرتے ہیں، کبھی سجدے میں ہیں، کبھی قیام میں ہیں، اور ان کے دل کے اندر اللہ کا خوف بھی ہے اور اللہ تعالیٰ کی رحمت کی اُمید بھی ہے، تو اس قسم کے لوگ یہ ہیں یَعْلَمُوْنَ کا مصداق، ان کا "علم" صحیح ہے، جس "علم" کے تحت ان کے سامنے ان کا راستہ نمایاں ہوا، اور اس راستے کے اُوپر ان کو چلنے کی توفیق ہوئی، اور جو لوگ نہیں جانتے، جن کے پاس علم نہیں ہے، اور وہ نہیں سمجھتے کہ ہم آئے کہاں سے، اور جا کدھر رہے ہیں، ہمارا انجام کیا ہونے والا ہے؟ یہ دونوں آپس میں برابر نہیں ہو سکتے۔

اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ: عقل والے لوگ ہی نصیحت حاصل کرتے ہیں۔ عقل سے کام لو، عقل سے کام لینے کے بعد تمہیں پتا چلے گا کہ ان کا انجام برابر نہیں، اس لئے جو لوگ اللہ کے ناشکرے ہیں، کھاتے ہیں اور غراتے ہیں، غفلت کے ساتھ اپنا وقت گزار رہے ہیں، تو ان کے متعلق وہی بات ہے جس طرح سے پیچھے ذکر کیا گیا اِنَّکَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ، ان کے لئے تو یہ فیصلہ سنا دیا گیا، اور اللہ تعالیٰ کا کھانے کے بعد اس کا شکر ادا کرنے والے، عبادت کی زندگی گزارنے والے، یہ لوگ کامیاب ہیں، عقل مندوں کا یہی کام ہے کہ ان باتوں کو سوچ کر نصیحت حاصل کریں، اِنَّمَا یَتَذَکَّرُ اُولُوا الْاَلْبَابِ: سوائے اس کے کچھ نہیں کہ نصیحت حاصل کرتے ہیں عقل والے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ ۭ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا

آپ کہہ دیجئے اے میرے وہ بندو! جو ایمان لائے، اپنے رَبّ سے ڈرتے رہو، ان لوگوں کے لئے جو اس دُنیا میں اچھے کام کرتے ہیں

حَسَنَةٌ ۭ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ ۭ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿۱۰﴾

بھلائی ہے، اللہ کی زمین کشادہ ہے، اس کے سوا کچھ نہیں کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر پورا پورا دیا جائے گا بغیر حساب کے ﴿۱۰﴾

قُلْ اِنِّيْٓ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۙ﴿۱۱﴾

آپ یہ بھی کہہ دیجئے بے شک میں حکم دیا گیا ہوں کہ عبادت کروں اللہ کی اس حال میں کہ خالص کرنے والا ہوؤں اس کے لئے طاعت کو ﴿۱۱﴾

وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۲﴾ قُلْ اِنِّيْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ

اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں تمام مسلمانوں میں سے اوّل ہو جاؤں ﴿۱۲﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اگر میں نے اپنے رَبّ کی نافرمانی کی تو مجھے بڑے

عَذَابَ يَوۡمٍ عَظِيۡمٍ ⑬ قُلِ اللّٰهَ اَعۡبُدُ مُخۡلِصًا لَّهٗ دِيۡنِيۡ ⑭

دِن کے عذاب کا خطرہ ہے⑬ آپ کہہ دیجئے کہ میں اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں اس حال میں کہ اپنی طاعت کو اسی کے لئے خالص کرنے والا ہوں⑭

فَاعۡبُدُوۡا مَا شِئۡتُمۡ مِّنۡ دُوۡنِهٖ ؕ قُلۡ اِنَّ الۡخٰسِرِيۡنَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ وَ

تم اللہ کے علاوہ جس کو چاہو پوجتے رہو، آپ کہہ دیجئے کہ بے شک خسارہ پانے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خسارے میں ڈال دیا اپنی جانوں کو، اور

اَهۡلِيۡهِمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ ؕ اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الۡخُسۡرَانُ الۡمُبِيۡنُ ⑮ لَهُمۡ مِّنۡ فَوۡقِهِمۡ ظُلَلٌ

اپنے اہل وعیال کو قیامت کے دِن، خبردار! یہ بہت ہی کھلا خسارہ ہے⑮ ان کے اُوپر سے بھی آگ کے سائبان ہوں گے

مِّنَ النَّارِ وَمِنۡ تَحۡتِهِمۡ ظُلَلٌ ؕ ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللّٰهُ بِهٖ عِبَادَهٗ ؕ يٰعِبَادِ

اور ان کے نیچے سے بھی آگ کے سائبان ہوں گے، یہی چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، اے میرے بندو!

فَاتَّقُوۡنِ ⑯ وَالَّذِيۡنَ اجۡتَنَبُوا الطَّاغُوۡتَ اَنۡ يَّعۡبُدُوۡهَا وَاَنَابُوۡۤا اِلَى اللّٰهِ لَهُمُ

مجھ سے ڈرکے رہو⑯ وہ لوگ جو بچتے ہیں طاغوت سے یعنی اس کی عبادت کرنے سے اور اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان کے لئے

الۡبُشۡرٰى ۚ فَبَشِّرۡ عِبَادِ ⑰ الَّذِيۡنَ يَسۡتَمِعُوۡنَ الۡقَوۡلَ فَيَتَّبِعُوۡنَ اَحۡسَنَهٗ ؕ

بشارت ہے، میرے بندوں کو بشارت دے دیجئے⑰ جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں، پھر بہترین بات کی اتباع کرتے ہیں،

اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمۡ اُولُوا الۡاَلۡبَابِ ⑱ اَفَمَنۡ حَقَّ عَلَيۡهِ

یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی، یہی لوگ ہیں عقل والے⑱ کیا پھر وہ شخص جس کے اُوپر ثابت ہوگیا

كَلِمَةُ الۡعَذَابِ ؕ اَفَاَنۡتَ تُنۡقِذُ مَنۡ فِى النَّارِ ⑲ لٰكِنِ الَّذِيۡنَ اتَّقَوۡا رَبَّهُمۡ لَهُمۡ

عذاب کا کلمہ، کیا پھر تو چھڑانے والا ہے اس شخص کو جو کہ جہنم میں ہے؟⑲ لیکن وہ لوگ جو اپنے ربّ سے ڈرتے ہیں ان کے لئے

غُرَفٌ مِّنۡ فَوۡقِهَا غُرَفٌ مَّبۡنِيَّةٌ ۙ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ ؕ وَعۡدَ اللّٰهِ ؕ

بالاخانے ہوں گے جن کے اُوپر سے اور بالاخانے بنے ہوئے ہوں گے، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں، یہ اللہ کا وعدہ ہے

لَا يُخۡلِفُ اللّٰهُ الۡمِيۡعَادَ ⑳ اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنۡزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَسَلَكَهٗ

اللہ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کیا کرتا⑳ اے مخاطب! کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ نے اُتارا آسمان سے پانی، پھر اس کو جاری کر دیا

يَنَابِيعَ فِي الْأَرْضِ ثُمَّ يُخْرِجُ بِهِ زَرْعًا مُّخْتَلِفًا أَلْوَانُهُ ثُمَّ يَهِيجُ

چشموں میں جو زمین میں موجود ہیں پھر نکالتا ہے اس کے ذریعے سے اللہ کھیتی، جس کی قسمیں مختلف ہیں، پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے

فَتَرَاهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَجْعَلُهُ حُطَامًا ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَذِكْرَىٰ لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿٢١﴾

پھر تُو اس کو دیکھتا ہے زرد، پھر اللہ تعالیٰ اس کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، اس میں البتہ یاددہانی ہے عقل والوں کے لئے ﴿۲۱﴾

تفسیر

مؤمنین کے لئے ہدایات

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ قُلْ يٰعِبَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوْا رَبَّكُمْ: قُلْ میں خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو ہے۔ آپ فرمادیں، کہہ دیں، يٰعِبَادِ: یہ اللہ کی کلام ہے جو سرورِ کائنات ﷺ نقل فرما رہے ہیں، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے پیغام پہنچایا جارہا ہے کہ اے میرے بندو!، یہ اس لئے کہہ رہا ہوں کہ يٰعِبَادِ ی میں یائے متکلم سے سرورِ کائنات ﷺ مراد نہیں ہیں، آپ سے یہ نہیں کہا جارہا کہ لوگوں کو يٰعِبَادِ کہہ کر خطاب کیجئے کہ اے میرے بندو! اور ''میرے بندو'' سے مراد حضور ﷺ کے بندے، یہ مطلب نہیں، کیونکہ عباد کی نسبت اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف ہے، رسول اللہ ﷺ کی طرف نہیں۔ تو یہ ''يٰعِبَادِ'' اللہ کی کلام ہے جو رسول اللہ ﷺ کو پہنچانے کے لئے کہا گیا ہے، گویا کہ اللہ کے رسول اللہ کے نمائندہ ہونے کے اعتبار سے اللہ کی طرف سے کہہ رہے ہیں، آپ لوگوں کو ''اے میرے بندو!'' الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہ عباد کی صفت ہے، ''کہہ دیجئے! اے میرے وہ بندو! جو ایمان لائے'' اتَّقُوْا رَبَّكُمْ: اپنے رَبّ سے ڈرتے رہو۔ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةٌ: فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا کا تعلق اَحْسَنُوْا کے ساتھ ہے۔ ان لوگوں کے لئے جو اس دُنیا میں اچھے کام کرتے ہیں بھلائی ہے۔ وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ: اللہ کی زمین کشادہ ہے، اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ: اِنَّمَا حصر کے لئے۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر پورا پورا دیا جائے گا بغیر حساب کے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ایمان لانے والے بندوں کو ہدایات دی ہیں، اور پیچھے ذکر ان کا تھا جو کافر تھے، قُلْ تَمَتَّعْ بِكُفْرِكَ قَلِيْلًا ۖ اِنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ: کافروں کو کہا گیا تھا، ان میں سے ہر ایک کو خطاب کر کے، کہ کُفر کی بہار چند دن تک لے لو، فائدہ اُٹھالو، اور انجام تمہارا یہ ہے کہ تم جہنم والوں میں سے ہو، تو اب اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو یہ ہدایات دیتے ہیں کہ کافر اگر نصیحت سے متاثر نہیں ہوتے یا نصیحت کو قبول نہیں کرتے تو نہ سہی، لیکن میرے وہ بندے جو ایمان لے آئے، انہیں آپ یہ پیغام دے دیں کہ وہ اپنے رَبّ سے ڈرتے رہیں، اور رَبّ سے ڈرنے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس کے اُحکامات کی مخالفت نہ ہونے پائے، خلاف ورزی نہ ہونے پائے، اپنے رَبّ سے ڈرتے رہیں، ڈرنے کا انجام یہ ہوگا کہ جس وقت آپ اپنے رَبّ سے ڈریں گے اور اس کی عبادت کریں گے تو دُنیا اور آخرت کی بھلائی نصیب ہوگی۔

''صفتِ اِحسان'' کیا ہے؟

ان لوگوں کے لئے جو اس دُنیا میں صفتِ اِحسان حاصل کرتے ہیں، ہر کام کو اچھے طریقے سے کرتے ہیں، اچھے کام کرتے ہیں، بھلے کام کرتے ہیں۔ یا ''اِحسان'' کا وہی معنی جو حدیثِ جبریل میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ سے جبریل علیہ السلام نے پوچھا تھا (''مشکوٰۃ شریف'' کی کتاب الایمان کی پہلی روایت ہے) کہ 'مَا الْاِحْسَانُ؟' اِحسان کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا 'اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ'[1] اللہ کی عبادت ایسے طور پر تُو کرے گویا کہ تُو اللہ کو دیکھ رہا ہے، کیونکہ تُو اگر نہیں دیکھ رہا تو وہ تو تجھے دیکھ ہی رہا ہے۔ بہر حال یہ تصور کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں، اللہ ہمارے سامنے ہے، اس تصور کے ساتھ اللہ کی عبادت کرنا یہ ''اِحسان'' ہے! آپ جانتے ہیں کہ جس وقت کوئی شخص یہ سمجھے ہوئے ہو، اور ہر وقت اس کو یہ بات مستحضر ہو کہ اللہ مجھے دیکھ رہا ہے، تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہیں ہوتی، شاگرد اُستاد کے سامنے ہوتا ہے تو کتنا محتاط ہوتا ہے، مُرید پیر کے سامنے ہوتا ہے تو کتنا محتاط ہوتا ہے، اولاد اپنے ماں باپ کے سامنے ہوتی ہے تو کتنی محتاط ہوتی ہے، تو یہ حرکت اور شرارت کرنے کی نوبت اس وقت آتی ہے جب شاگرد یہ سمجھتا ہے کہ میں اُستاد کی نظروں سے غائب ہوں، مُرید یہ سمجھتا ہے کہ شاید پیر مجھے نہیں دیکھ رہا، اور والدین کی نظروں سے علیحدہ ہو کر بچہ شرارت کرتا ہے، جب اس کو پتا ہوتا ہے کہ میرے ماں باپ کو پتا نہیں چلے گا۔ تو جب ایک بندہ اپنے مالک کو، اپنے مولیٰ کو، اور اپنے خالق کو اس طرح سے سمجھے گا کہ وہ مجھے دیکھ رہا ہے اور میں اس کے سامنے ہوں، گویا کہ میری آنکھوں کے سامنے وہ ہے اور میں اس کے سامنے ہوں، تو ایسی صورت میں پھر اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی مخالفت نہیں ہو سکتی، تو جو یہ جذبہ پیدا کر لیتے ہیں، صفتِ اِحسان حاصل کر لیتے ہیں، ان کے لئے بھلائی ہے۔

دُنیا میں بھی حقیقی بھلائی ''محسنین'' کو ملتی ہے

یہ فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا کو ہم نے جوڑ دیا اَحْسَنُوْا کے ساتھ، کہ جو دنیا میں اچھے کام کرتے ہیں، صفتِ احسان کو حاصل کرتے ہیں ان کے لئے بھلائی ہے۔ اور فِیْ هٰذِهِ الدُّنْيَا کا تعلق مابعد کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے کہ ''دنیا میں بھی ان کے لئے بھلائی ہے'' بھلائی ایک تو ظاہری ہوتی ہے جس کو دُنیا کے ساز و سامان کے ساتھ آپ تعبیر کر لیں کہ اس کو اچھی حالت نصیب ہو گئی جس کو دُنیادار دیکھنے والے اچھی حالت کہتے ہیں، اور ایک بھلائی حقیقی ہے کہ اللہ تعالیٰ اطمینانِ قلب نصیب فرما دے، عافیت دے دے، دل اور دماغ کو سکون اور راحت رہے، یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور اللہ کے ساتھ صحیح تعلق قائم کر لیتے ہیں تو اس دُنیوی زندگی میں دلوں کا چین اور دلوں کا سکون صرف انہی کو نصیب ہوتا ہے، سامانِ عیش کی بہتات اگرچہ غافل لوگوں کو اور کافروں کو حاصل ہو، یہ سامانِ عیش کی بہتات انسان کو خود سکون اور اطمینان نہیں بخشتی، سکون اور اطمینان ایک علیحدہ چیز ہے، ایک آدمی چٹائی پر لیٹا ہوا ہو اور اس کو اطمینان کے ساتھ نیند آ جائے، تو جس وقت وہ اُٹھے گا ہلکا پھلکا ہو گا، اس کو راحت حاصل ہو گی، آرام ہو گا، ہشاش بشاش ہو گا، اور ایک آدمی نرم گدوں پر لیٹا ہوا ہے، اس کے اردگرد خدام ہیں، کمرہ ایئر کنڈیشنر ہے، ہر قسم کی راحت اور آرام کے اسباب اس کو

---

(۱) بخاری ص ۱۲، عن ابی ہریرۃ۔ مشکوٰۃ ص ۱۱ عن عمر بن الخطاب

حاصل ہیں، لیکن دل دماغ اس کا پریشان ہے اور اس کو نیند نہیں آتی، ساری رات وہ کروٹیں لیتا ہے، اور رات اس طرح سے گزار کر جب وہ صبح اُٹھے گا تو ایسے ہوگا جیسے بدن چور چور ہے، اور اس کے جوڑ جوڑ میں درد ہے، تو اس کے مقابلے میں یہ مسکین راحت اور آرام میں ہے جس کو سکون کی نیند آگئی، اور وہ اُٹھا ہے تو اس کا بدن ہلکا پھلکا ہے، تو دیکھا یہ جایا کرتا ہے کہ حقیقت کیا ہے راحت کی؟ اور دُنیا کے اندر سکون اور اطمینان یہی اصل چیز ہے، اگر سامانِ عیش تو حاصل ہو لیکن انسان کو خود راحت اور سکون نہ ہو، تو سامانِ عیش کو لے کر انسان کیا کرے گا؟ ایک مجرم جس کو پتا ہو کہ میرے پیچھے پولیس لگی ہوئی ہے، وہ دسترخوان پر بیٹھا ہو، اور اس کے سامنے ہزاروں نعمتیں رکھی ہوئی ہوں، لیکن وہ ہر وقت کبھی یوں جھانکتا ہے، کبھی یوں جھانکتا ہے، کہ کہیں کوئی دیکھنے والا آتو نہیں رہا، کوئی پکڑنے والا آتو نہیں رہا، تو اس کو اس کھانے میں کیا لطف آئے گا؟ اور ایک مسکین چاہے خشک روٹی کھاتا ہے، لیکن اس کو کوئی خوف نہیں، کوئی خطرہ نہیں، تو سکون اور اطمینان اِس کو نصیب ہے، لیکن انسان کی یہ ایک بہت بنیادی فکری غلطی ہے کہ وہ سامانِ عیش کو عیش سمجھتا ہے، راحت کے اسباب کو وہ راحت سمجھتا ہے، یہ بات نہیں ہے، اسباب اور سامان ایک علیحدہ چیز ہے، راحت اور سکون ایک علیحدہ چیز ہے۔

تو دُنیا کے اندر بھی حسنہ، اچھی حالت، عافیت، سکون، اطمینان انہی لوگوں کو حاصل ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہیں اور صفتِ اِحسان کو اَپناتے ہیں، اس دعوے کی تکذیب نہیں کی جاسکتی، واقعات کو اگر آپ دیکھیں گے تو آپ کے سامنے یہ حقیقت روزِ روشن کی طرح واضح ہوجائے گی، کہ حقیقی عافیت سکون راحت آرام انہی لوگوں کو ہے جن کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ صحیح ہے، ان کے دِلوں میں سکون ہے اطمینان ہے، اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ (سورۂ رعد: ۲۸) قرآنِ کریم جس طرح سے دعوے کی صورت میں کہتا ہے، کہ کان کھول کر سُن لو! دِلوں کو اِطمینان اور سکون اگر حاصل ہوتا ہے تو اللہ کی یاد سے ہی حاصل ہوتا ہے، تو اس لئے اگر فِیْ هٰذِهِ الدُّنْیَا کو حَسَنَةٌ کے ساتھ لگادیا جائے تو یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے، ''میرے بندوں سے کہہ دیجئے'، جو میرے بندے ایمان لے آئے (بڑا شرف ہے اس لفظ میں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنے بندے قرار دیا، خطاب اس طرح سے فرمایا) کہ وہ اپنے ربّ سے ڈرتے رہیں، ان لوگوں کے لئے جو اس دُنیا میں نیکی کرتے ہیں، اچھائی کرتے ہیں، بھلائی کرتے ہیں، بھلی حالت ہے۔ حَسَنَةٌ سے بھلی حالت مراد ہے، جیسے اس دعا میں تلقین کی گئی رَبَّنَاۤ اٰتِنَا فِی الدُّنْیَا حَسَنَةً وَّ فِی الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً (سورۂ بقرہ: ۲۰۱) معلوم ہوگیا کہ دُنیا میں بھی ''حسنہ'' مطلوب ہے، اور آخرت میں بھی ''حسنہ'' مطلوب ہے، ''حسنہ'' سے اچھی حالت مراد ہے جو آپ کے لئے مفید ہو، جس میں مضرت کا پہلو نہ ہو، جس میں اللہ کی رضا شامل ہو، ''حسنہ'' اسے کہتے ہیں، تو دُنیا اور آخرت میں ''حسنہ'' انہی لوگوں کو نصیب ہے جو صفتِ اِحسان کو حاصل کرلیتے ہیں۔

''ہجرت'' کی ترغیب

وَاَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ: اللہ کی زمین وسیع ہے۔ اس جملے کا یہاں مطلب یہ ہے کہ اللہ سے ڈرنا ہے، اللہ کی مخالفت سے بچنا ہے، اللہ کے اَحکام کی پابندی کرنی ہے، اور اگر ایک علاقے میں رہتے ہوئے تم اس کے اوپر کامیابی نہیں حاصل کرسکتے، وہاں لوگ

تمہیں مجبور کرتے ہیں کہ تم اللہ کی نافرمانی کرو تو علاقے کو قربان کردو، اپنے وطن کو چھوڑ دو، وطن کو چھوڑ دو گے تو یہ نہیں کہ تمہیں کہیں جگہ نہیں ملے گی، اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ: اللہ کی زمین بہت وسیع ہے، یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت اس وقت اُتری تھی جبکہ ہجرت کے ظاہری اسباب پیدا ہونا شروع ہو گئے تھے، اور مسلمانوں نے مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ کی طرف یا دوسرے علاقوں کی طرف ہجرت شروع کر دی تھی، یا ہجرت کے اسباب پیدا ہو رہے تھے کہ مکہ معظمہ کی سرزمین تنگ ہو رہی تھی، وہاں اللہ تعالیٰ کی عبادت کرنے میں مشکلات پیش آ رہی تھیں، اور مسلمان علاقے کو چھوڑنے کے متعلق سوچ رہے تھے، اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ: اللہ کی زمین کشادہ ہے، تو ماقبل کے ساتھ اس جملے کا یہی جوڑ ہوا، کہ جس علاقے میں رہتے ہوئے تم اللہ کا تقویٰ نہیں اپنا سکتے اس علاقے کو چھوڑ دو، اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔

مشکلات پر صبر کرنے والوں کے لئے بشارت

اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ: سوائے اس کے نہیں کہ صبر کرنے والوں کو ان کا اجر بے شمار دیا جائے گا، بغیر حساب کے دیا جائے گا۔ یہاں صابر کا لفظ جو آیا تو صَابِرٌ عَلَى الْمُصِيْبَةِ یعنی مصیبت پر صبر کرنے والے مراد ہیں، تو اَرْضُ اللّٰهِ وَاسِعَةٌ میں جو ہجرت کا راستہ دکھایا ہے کہ تم اپنے علاقے کو چھوڑ کر دوسرے علاقے میں چلے جاؤ، تو جب انسان اپنے علاقے کو چھوڑتا ہے، اپنی جائیداد کو ترک کرتا ہے، مکانات کو ترک کرتا ہے، وہاں رہتے ہوئے حصولِ رزق کے جو اسباب اس کو میسر تھے ان سے منہ موڑتا ہے، رشتہ داروں سے اور برادری سے تعلق توڑتا ہے، تو واقعہ یہ ہے کہ انسان کو بڑی مشکلات پڑتی ہیں، دوسرے علاقے میں جائے گا تو جس وقت تک پورے اسباب مہیا نہیں ہوں گے تو تنگیاں ہی تنگیاں ہوتی ہیں، تو اللہ تعالیٰ اگر ہمت دے تو پھر آگے جا کے اللہ تعالیٰ کی طرف سے وسعت بھی ہو جاتی ہے، اس لئے فرمایا کہ اس راستے میں جو تکلیفیں پیش آئیں ان کو برداشت کرو، صبر کی صفت اپناؤ، جو لوگ صابر ہوتے ہیں، اللہ کے راستے میں مشکلات برداشت کرتے ہیں، اللہ کی طاعت اور عبادت کے لئے مخالفتیں برداشت کرتے ہیں ان کو اللہ اجر دے گا، اور اتنا دے گا کہ جو کسی کے شمار میں نہیں آئے گا، بے حساب، یہ کثرت کی طرف اشارہ ہے، بہت کثرت کے ساتھ ان کو ان کا اجر دیا جائے گا، تو اس میں صبر کی تلقین ہو گئی اور صابرین کے لئے اچھے انجام کی بشارت ہو گئی۔

انبیاء علیہم السلام جس چیز کے داعی ہوتے ہیں سب سے پہلے خود عمل کرتے ہیں

قُلْ اِنِّيْۤ اُمِرْتُ اَنْ اَعْبُدَ اللّٰهَ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّيْنَ ۙ وَاُمِرْتُ لِاَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ الْمُسْلِمِيْنَ: یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم اپنے پہ رکھ کر ایک بات کو ذکر کر رہے ہیں، سنانا دوسروں کو مقصود ہے، ''آپ یہ بھی کہہ دیجئے بے شک میں حکم دیا گیا ہوں کہ عبادت کروں اللہ کی اس حال میں کہ خالص کرنے والا ہوں اس کے لئے طاعت کو، اور میں حکم دیا گیا ہوں اس بات کا کہ ہو جاؤں میں اوّل المسلمین، تمام مسلمانوں میں سے اوّل ہو جاؤں، اس بات کا مجھے حکم دیا گیا ہے۔ قُلْ اِنِّيْۤ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ: آپ کہہ

دیجئے کہ میں ڈرتا ہوں کہ اگر میں نے اپنے رَبّ کی نافرمانی کی (اَخَافُ کا مفعول آ گیا عَذَابَ یَوْمٍ عَظِیْمٍ) اگر میں نے اپنے رَبّ کی نافرمانی کی تو مجھے بڑے دِن کے عذاب کا خطرہ ہے۔

قُلْ اِنِّیْٓ اُمِرْتُ میں یہ بات ظاہر کردی گئی کہ جس طرح سے عام لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کی عبادت کریں تو نبی کو بھی یہی حکم ہے، اور نبی چونکہ داعی ہوتا ہے، اور داعی کا کام یہ ہے کہ جس چیز کی طرف دعوت دے سب سے پہلے خود اسے قبول کرے، اور اس کے اُوپر عمل کر کے دِکھائے، تو حضور ﷺ جب توحید کی طرف دعوت دیتے تھے تو سب سے پہلے توحید کو قبول کرنے والے بھی خود ہی تھے، اور تمام انبیاء ﷩ کی شان یہی ہوتی ہے کہ جس حقیقت کی طرف وہ لوگوں کو بلاتے ہیں اس حقیقت کے اوپر خود عمل پیرا بھی ہوتے ہیں، اللہ کی عبادت کی طرف بُلائیں گے تو خود عبادت سب سے زیادہ کریں گے، دُنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کی دعوت دیں گے تو ان کے ہر ہر عمل ہر ہر قول میں آخرت کی ترجیح نمایاں ہوگی، یہ نہیں ہوگا کہ لوگوں کو تو کہیں کہ دُنیوی لذات چھوڑ دو اور آخرت کے لئے مشقتیں برداشت کرو، اور خود سب سے زیادہ عیاشی کریں اور سب سے زیادہ لذتوں سے لطف اندوز ہوں، ایسا نہیں ہوا کرتا، نبی جس حقیقت کی طرف بُلایا کرتا ہے خود اس کو قبول کرتا ہے، اور سب سے پہلے قبول کر کے اس کے اُوپر عمل کر کے دِکھاتا ہے، تو یہاں وہی بات ہے کہ آپ کہہ دیجئے کہ مجھے بھی حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنی طاعت کو اللہ کے لئے خالص کرتا ہوا اللہ کی عبادت کروں، اور مجھے یہ حکم بھی دیا گیا ہے کہ اسلام لانے والوں میں سے سب اوّل میں ہوں، یعنی سب سے پہلے اس بات کو قبول میں کروں، چنانچہ اسی کے مطابق ہی آگے آ گیا کہ قُلِ اللّٰهَ اَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهٗ دِیْنِیْ: پہلے تو اَمر کا ذِکر تھا، اور آگے اس کے مطابق اپنے طرزِ عمل کا ذکر آ گیا۔ آپ کہہ دیجئے کہ میں اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، جس طرح سے مجھے حکم دیا گیا، اس حال میں کہ اپنے دِین کو اپنی طاعت کو اسی کے لئے خالص کرنے والا ہوں، فَاعْبُدُوْا مَا شِئْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ: یہ مشرکین سے لاتعلقی ہے، کہ تم پُوجتے رہو جس کو چاہو اللہ کو چھوڑ کے، میں تو خالص اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، تم اللہ کے علاوہ جس کو چاہو پُوجتے رہو۔

اصل خسارہ آخرت کا ہے

قُلْ اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِیْهِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ: آپ یہ بھی کہہ دیجئے کہ بے شک خسارہ پانے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے خسارے میں ڈال دیا اپنی جانوں کو اور اپنے اہل و عیال کو قیامت کے دن، اَلَا ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِیْنُ: خبردار! یہ بہت ہی کھلا خسارہ ہے۔ یہ بہت بڑی ایک حقیقت ہے جس کی طرف اس میں متوجہ کیا گیا، ایمان لانے میں وہ لوگ بعض خسارے محسوس کرتے تھے کہ اگر ہم ایمان لائیں گے تو ہمارا یہ جاہ چھوٹ جائے گا، جاہ کے اعتبار سے، مرتبے کے لحاظ سے ہم خسارے میں آ جائیں گے، کہ پہلے تو ہم سردار ہیں، پھر ہمیں تابع ہو کر رہنا پڑے گا، اور اسی طرح سے وہ سمجھتے تھے کہ حرام طریقے سے جو کمائیاں آ رہی ہیں، بتوں کے چڑھاوے ہیں، یا دوسری چیزیں ہیں، آمدنی کے حرام ذرائع، وہ چھوڑنے پڑتے ہیں، جب انسان اسلام لاتا ہے، ایمان قبول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ کا تقویٰ اختیار کرتا ہے تو بہت ساری چیزیں ہیں جو انسان کو اپنی زندگی سے خارج کرنی پڑتی ہیں، اور بظاہر انسان اس کو خسارہ سمجھتا ہے، کہ اگر میں نے تجارت میں صحیح اُصول اپنا لیا تو شاید اتنا نفع نہ ہو جتنا میں کم تول کے کما لیتا

ہوں، یا جتنا میں جھوٹ بول کے دھوکا دے کے کمالیتا ہوں، اگر یہ طرز میں چھوڑ دوں گا تو مجھے خسارہ ہو جائے گا، اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو وظائف عائد ہوتے ہیں، زکوٰۃ ہے، خیرات ہے، صدقات ہیں، تو ان کے دینے میں بسا اوقات انسان خسارہ محسوس کرتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں سرورِ کائنات ﷺ کو، کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ دُنیا کا خسارہ کوئی خسارہ نہیں ہے، اس لئے کہ یہ آنی اور وقتی چیزیں ہیں، ایک وقت میں اگر انسان کوئی خسارہ اُٹھاتا ہے تو دوسرے وقت میں اس کی تلافی بھی کر لیتا ہے، سب سے زیادہ خسارہ پانے والے وہ لوگ ہوں گے جو آخرت میں قیامت کے دِن اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو خسارے میں ڈال بیٹھے، سب سے بڑے خسارہ پانے والے وہ ہیں، وجہ یہ ہے کہ اُس خسارے کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوگی، اور وہ آنی اور وقتی نہیں ہوگا بلکہ دائمی ہوگا، ابدی ہوگا، جس سے جان چھڑانے کا کوئی طریقہ نہیں ہوگا، اس لئے موازانہ یوں کیا کرو کہ جو طرزِ عمل ہم اختیار کر رہے ہیں، جو ہمارا طرزِ زندگی ہے اس میں کہیں ہم آخرت میں جا کر خسارے میں تو نہیں رہ جائیں گے، یہ فکر کرنا چاہیے، باقی! اگر کسی صحیح اصول کو اپنانے کی وجہ سے دنیا کے اندر خسارہ سامنے آتا ہے تو یہ خسارہ کوئی خسارہ نہیں ہے، ایک طرف سے انسان گھاٹا اُٹھاتا ہے دوسری طرف سے نفع پالیتا ہے، ایک وقت میں خسارے میں ہوتا ہے دوسرے وقت میں وہ نفع میں چلا جاتا ہے، تو دُنیا کا خسارہ اتنا ڈرنے کی چیز نہیں جتنا آخرت کا خسارہ ڈرنے کی چیز ہے، اس لیے فرمایا کہ جو اپنے آپ کو آخرت کے معاملے میں خسارے میں ڈالتے ہیں، قیامت کے دِن جن کے اہل وعیال خسارے میں پڑ گئے تو وہ ہے کھلا خسارہ جس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔

ہر شخص اپنے اپنے درجے کے لحاظ سے ذِمّے دار ہے

اَهْلِيْهِمْ: کا لفظ ساتھ ذکر کر کے یہ بات ظاہر کر دی کہ انسان پر ذمہ داری صرف اپنی نہیں ہے، اگر کوئی شخص خود غلط زندگی اختیار کرتا ہے تو اپنے آپ کو برباد کرتا ہے، اور اگر اپنے دباؤ کے ساتھ، اپنے اثر ورسوخ کے ساتھ اولاد کو کسی غلط راستے پر ڈال جاتا ہے، یا اپنے خاندان کے اندر کوئی غلط رسم ورواج جاری کر جاتا ہے تو وہ خود بھی برباد ہوتا ہے اور اپنے اہل وعیال کو بھی برباد کرتا ہے، تو اس کا یہ ظلم اپنے آپ پر نہیں، اپنے خاندان پر بھی ہے۔ جیسے سورۂ تحریم میں آئے گا قُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا: اپنے آپ کو بھی بچاؤ اور اپنے بال بچوں کو بھی، اپنے خاندان کو بھی جہنم سے بچاؤ، ''كُلُّكُمْ رَاعٍ وَكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَعِيَّتِهٖ''(۱) ہر شخص اپنے اپنے درجے کے لحاظ سے راعی ہے، اور اس سے اس کی رعایا کے متعلق پوچھا جائے گا، تو جو خاندان کا سربراہ ہوتا ہے اس کے اُوپر دوہری ذمہ داری ہے، اپنی بھی اور اپنے خاندان کی بھی، اس لئے ہمیشہ کوشش کرو اپنے زیرِ اثر افراد کو بھی نیک بنانے کی، نیکی کے راستے پہ ڈالنے کی، ترغیب دے کر نیکی کے راستے پر چلانے کی، ایسا نہ ہو کہ خود بھی بدعمل ہو جاؤ اور اپنی اولاد کے لئے بھی بری راہ جاری کر جاؤ، یا اپنے اثر ورسوخ کے ساتھ دباؤ ڈال کر ان کو دِین سے پھیر جاؤ، اور کسی غلط راستے کے اُوپر ان کو چلتا کر دو، تو ایسی صورت

(۱) بخاری ۱/ ۱۲۲، باب الجمعہ فی القری۔ نیز ۱/ ۳۴وغیرہ۔ مشکوٰۃ ۲/ ۳۲۰، کتاب الامارۃ عن عبد اللہ بن عمر

میں اپنے آپ کو برباد کرنے والے بھی بن جاؤ گے، اور اپنے اہل وعیال کو برباد کرنے والے بھی بن جاؤ گے، ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ کا یہی معنی ہے کہ یہ کھلا خسارہ ہے، اس میں کوئی نفع کا پہلو نہیں، دُنیا کے خساروں کی یہ پوزیشن نہیں ہوا کرتی۔

حقیقی مفلس کون ہے؟

ایک دفعہ سرورِ کائنات ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے ایک سوال کیا، یہی حقیقت سمجھانے کے لئے، پوچھا کہ مَا الْمُفْلِسُ؟ تم میں مفلس کون ہے؟ تم مفلس کس کو سمجھتے ہو؟ تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے وہی جواب دیا جو عام طور پر مفلس کا مفہوم ہے، کہ جس کے پاس پیسے نہ ہوں، دِرہم اور دنانیر نہ ہوں، وہ مفلس ہے، کیونکہ مفلس یہ عربی لفظ ہے، اَفْلَسَ سے ہے۔ فلس پیسے کو کہتے ہیں، اور اَفْلَسَ: مسلوب الفلس ہوجانا، یعنی جس کے پاس پیسے نہ ہوں، فلس سے خالی ہوگیا، اس کو مفلس کہتے ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ میری اُمّت کا اعلیٰ درجے کا مفلس وہ شخص ہے جو قیامت کے دِن آئے گا، اور اس کے پاس ہر قسم کی نیکی ہوگی، لیکن کسی پر اس نے ظلم کیا ہوگا، کسی کو اس نے گالی دی ہوگی، کسی کی عزّت کو نقصان پہنچایا ہوگا، کسی کا حق مارا ہوگا، اور وہاں سارے کے سارے دعوے دار آجائیں گے، وہاں دِرہم ودَنانیر کے ساتھ تو فیصلہ ہوگا نہیں، لوگوں کے حقوق میں اس کی نیکیاں دے دی جائیں گی، نیکیاں اس کی ختم ہوجائیں گی، اور اہلِ حقوق کے حقوق ابھی ختم نہیں ہوں گے۔ پھر ان اہلِ حقوق کے گناہ لے کر اس کے اُوپر ڈالنے شروع کردیے جائیں گے، اور نتیجتاً اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا،(1) جب آیا تھا تو بہت نیکیاں لے کر آیا تھا، اور جب اللہ کی دربار سے فیصلہ ہوکر فارغ ہورہا ہے، تو لوگوں کے گناہ سر پر اُٹھا کر جہنم میں جارہا ہے، حقیقی مفلس وہ ہے۔ کیونکہ وہاں اس افلاس کا اس کے پاس کوئی علاج نہیں ہوگا، اس لئے اس کو اعلیٰ درجے کا مفلس قرار دیا۔ تو یہاں بھی وہی بات ہے کہ ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِينُ: یہ ایسا کھلا خسارہ ہے کہ جس میں کوئی نفع کا پہلو نہیں، اور اس میں کوئی تاویل نہیں ہوسکے گی، اور اس خسارے کی کسی طریقے سے تلافی نہیں ہوسکے گی۔ تو دیکھنے کی بات یہ ہے کہ کہیں ہم آخرت کا خسارہ تو نہیں حاصل کررہے، ایمان قبول کرنے سے تم دُنیا کے خسارے سے ڈرتے ہو، دُنیا کا خسارہ ڈرنے کی چیز نہیں ہے، اس کا حل ہزاروں طریقوں سے ہوجاتا ہے، یہ وقتی چیز ہے، آنی چیز ہے، ایک طرف سے خسارہ دوسری طرف سے نفع، لیکن آخرت کا خسارہ خسارہ ہی ہے، جس میں کوئی نفع کی صورت نہیں ہے۔

آخرت کے خسارے کی جھلک

اور اس خسارے کی ایک صورت یہ واضح ہوگئی، ان کا انجام لَهُمْ مِّنْ فَوْقِهِمْ ظُلَلٌ مِّنَ النَّارِ وَمِنْ تَحْتِهِمْ ظُلَلٌ: ظُلَلٌ: ظُلَّۃٌ کی جمع ہے، ظلہ سائبان کو کہتے ہیں۔ ان کے اُوپر سے بھی آگ کے ظُلل ہوں گے، اور ان کے نیچے سے بھی آگ کے ظلل ہوں گے، یعنی سائبانوں کی طرح آگ اُوپر نیچے سے محیط ہوگی، جس طرح سے کسی شخص کے اُوپر نیچے ہر طرف سے پردہ کردیا جائے اور اس کو چھپالیا جائے آگ اسی طرح سے ہوگی، سائبانوں کی طرح محیط ہوگی اُوپر سے بھی اور نیچے سے بھی، ذٰلِكَ يُخَوِّفُ اللهُ بِهٖ عِبَادَهٗ: یہی

(1) مسلم ۳۲۰/۲، باب تحریم الظلم۔ مشکوٰۃ ۴۳۵/۲، باب الظلم فصل اول، عن ابی ہریرۃؓ

چیز ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے، یٰعِبَادِ فَاتَّقُوْنِ: اے میرے بندو! مجھ سے ڈر کے رہو، تا کہ تم اس بُرے انجام سے بچ جاؤ۔ یہی بُرا انجام ہے جس سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو ڈراتا ہے۔

نیک لوگوں کا انجام

اور اس کے مقابلے میں دوسرے لوگوں کا ذِکر ہے، چونکہ تقابل کے ساتھ حقیقت واضح ہوتی ہے اس لئے قرآنِ کریم ہمیشہ صالحین کا ذِکر کرتا ہے بُروں کو ذکر کرنے کے بعد، اور اگر پہلے صالحین کا ذِکر آجائے تو اس کے بعد بُروں کا ذِکر کیا جاتا ہے، تا کہ دونوں جماعتیں اچھی طرح سے بالمقابل آکر نمایاں ہوجائیں، وَالَّذِيْنَ اجْتَنَبُوا الطَّاغُوْتَ: وہ لوگ جو بچتے ہیں طاغوت سے اَنْ يَّعْبُدُوْهَا: یعنی اس کی عبادت کرنے سے۔ یہ طاغوت سے بدلِ اشتمال ہے، جو لوگ طاغوت سے بچتے ہیں یعنی اس کی عبادت کرنے سے بچتے ہیں، وَاَنَابُوْٓا اِلَى اللّٰهِ: اور اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، لَهُمُ الْبُشْرٰى: ان کے لئے بشارت ہے فَبَشِّرْ عِبَادِ: میرے بندوں کو بشارت دے دیجئے۔ بندوں سے کون سے بندے مراد ہیں؟ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ: جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں، فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ: پھر اس کی بہترین حصے کی اتباع کرتے ہیں، اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰىهُمُ اللّٰهُ: یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت دی وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُوا الْاَلْبَابِ: یہی لوگ ہیں عقل والے۔ الباب: لُبّ کی جمع ہے، لب: خالص عقل کو کہتے ہیں، ''عقل والے یہی ہیں۔''

طاغوت: یہ لفظ طغیان سے لیا گیا ہے، سرکشی کرنا، طاغوت اس کو کہتے ہیں جو سرکش ہو، اور مراد اس سے ہر وہ شخص ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ سے سرکش ہے، خود اللہ کی عبادت کرتا نہیں، اللہ کے احکام کو قبول نہیں کرتا، اور دوسروں کو بھی ضلالت اور گمراہی کی دعوت دیتا ہے، دوسروں کے لئے بھی گمراہی کا باعث بنتا ہے، اس لئے ''طاغوت'' کا مصداق شیطان بھی ہے، ''طاغوت'' کا مصداق آلہہ باطلہ بھی ہیں، اور ''طاغوت'' کا مصداق گمراہ کن لیڈر اور قائد بھی ہیں، جو خود گمراہ ہوتے ہیں اور اپنے پیچھے قوم کو لگا کے گمراہی میں ڈال دیتے ہیں، تو جو لوگ اس قسم کے طاغوتوں سے بچتے ہیں، ان کی پُوجا نہیں کرتے، ان کی عبادت نہیں کرتے، ان کے سامنے تذلّل اختیار نہیں کرتے، عبدیت کا تعلق اُن کا اِن کے ساتھ نہیں ہوتا، اور وہ اللہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، ان کے لئے اچھے انجام کی بشارت ہے، تو میرے بندوں کو بشارت دے دیجئے۔

اللہ کے مقبول بندے کون ہوتے ہیں؟

میرے بندے کون سے ہیں؟ مقبول بندے، مشرف بندے، جن کی یہ عادت نہیں کہ جب ان کو کوئی نصیحت کرنے لگے تو وہ پہلے ہی لڑ پڑیں، بات کرنے والے کی بات نہ سنیں، منہ نوچنے کے لئے تیار ہوجائیں، جس طرح سے مشرکین کی عادت تھی کہ قرآنِ کریم اگر پڑھا جاتا ان کے سامنے، حضور ﷺ پڑھنے کی کوشش کرتے، تو وہ آگے سے شور مچاتے، بات سنتے ہی نہیں تھے، اور یوں جھانکتے گویا کہ پڑھنے والے کے اُوپر حملہ کرنے لگے ہیں، سورۂ حج میں جس طرح سے لفظ آیا تھا يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ (سورۂ حج: ۷۲) قریب ہے کہ وہ حملہ ہی کردیں، لَيُزْلِقُوْنَكَ بِاَبْصَارِهِمْ (سورۂ قلم) آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھتے ہیں، تو اچھے بندے یہ نہیں ہوتے جو بات کو سنتے ہی نہیں، غور ہی نہیں کرتے، بات کرنے والے کا منہ نوچتے ہیں، اسے خود منہ چڑاتے ہیں، اس کی بات کو

خلط کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ تو بد بخت ہوا کرتے ہیں، میرے اچھے بندے وہ ہیں جو بات کو توجہ سے سنتے ہیں، اَلْقَوْل سے اللہ کا قول ہی مراد ہو تو مطلب ہوگا کہ قرآنِ کریم کو توجہ سے سنتے ہیں، جب ان کے سامنے اللہ کا قول پیش کیا جاتا ہے تو خوب توجہ کرتے ہیں پھر احسن القول کی اتباع کرتے ہیں۔

''فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ'' کے تین مفہوم

تو اللہ تعالیٰ کے اقوال چونکہ سارے ہی احسن ہیں، تو ''بہترین بات کی اتباع کرتے ہیں''، یہ فی حد ذاتہٖ اس کی تعریف کرنا مقصود ہے، احسن کے ساتھ کسی کا مقابلہ کرنا مقصود نہیں ہے، ''قول کو توجہ سے سنتے ہیں پھر بہترین قول کی اتباع کرتے ہیں''، تو اگر ''قول'' سے اللہ تعالیٰ کا قول مراد لیا جائے تو ''احسن'' سے مطلقاً اس کا حُسن بیان کرنا مقصود ہے، کسی سے مقابلہ کرنا مقصود نہیں (عثمانی)...... اور اگر اس میں تفضیل کا معنی باقی رکھنا ہو، تو پھر یوں بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں بسا اوقات دو قسم کی باتیں ہوتی ہیں ایک اعلیٰ اور ایک ادنیٰ، جس کو ہم رُخصت اور عزیمت سے تعبیر کرتے ہیں، مثال کے طور پر کسی نے آپ کے اُوپر زیادتی کر دی تو اصل حکم تو یہی ہے کہ اُسے معاف کر دو، لیکن اگر آپ اپنے طبعی جذبات سے مغلوب ہو جائیں تو انتقام لینے کی بھی اجازت ہے لیکن برابر سرابر، تو یہ بات توجہ سے سنتے ہیں، پھر جو بہترین حصہ ہے اس کی اتباع کرتے ہیں، یعنی کوشش کرتے ہیں عزیمت کو اپنانے کی، اور اللہ تعالیٰ نے جو رخصت دی ہے اس کی طرف اپنے آپ کو نہیں لے جاتے، کہ رُخصتیں تلاش کر کر کے اپنے آپ کو کاہل اور سست بناتے چلے جائیں، بلکہ اعلیٰ سے اعلیٰ معیار قائم کرنے کی کوشش کرتے ہیں، اگر یہ مفہوم بیان کر لیا جائے تو پھر ''احسن'' کے اندر تفضیل والا معنی بھی ٹھیک ہے (مظہری، آلوسی)...... اور اگر ''قول'' کو عام رکھا جائے پھر تو ''احسن'' ٹھیک ہے ہی، ''قول'' کو عام رکھنے کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر کسی کی بات سنتے ہیں، دوست کی، دشمن کی، اچھے کی، بُرے کی، جو بھی ان کو سنانا چاہے، لیکن اندھے بہرے ہو کر کسی کے پیچھے نہیں لگتے، غور کرتے ہیں، اس میں سے جو بہترین بات ہوتی ہے اس کو اختیار کرتے ہیں (آلوسی)، اب کوئی مشرک آ جائے شرک کی ترغیب دینے والا، بات تو اس کی بھی سن لیتے ہیں، پھر موحد آ گیا کوئی توحید کی دعوت دینے والا آ گیا تو بات اس کی بھی سن لیتے ہیں، غور کرنے کے بعد جو اس میں سے احسن ہے اس کو قبول کر لیتے ہیں۔ تعصب نہیں، پارٹی بازی نہیں، اور اندھا دھند کسی کی اتباع نہیں، تو یہ ہیں میرے بندے جن کو بات سننے کی عادت ہے، پھر اس بات کے اچھے حصے کو قبول کرنے کی عادت ہے، ''یہ لوگ ہیں جن کو اللہ تعالیٰ سیدھے راستے پہ چلنے کی توفیق دیتا ہے'' گویا کہ ہدایت حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے، اللہ کی طرف سے یہ قاعدہ قانون متعین ہے، کہ جذبات سے خالی ہو کر بات سنو، جو بات اچھی ہے اس کو قبول کر لو، تو تم سیدھے راستے پہ چلو گے، اللہ کی طرف سے تمہیں ہدایت نصیب ہو جائے گی، ''اور یہی اصل میں عقل والے ہیں'' تو عقل مند آدمی وہ ہوتا ہے جو بات کو توجہ سے سنے، جذبات سے خالی ہو کر، تعصب سے خالی ہو کر، پھر اچھی بات کو قبول کر لے، عقل والوں کا کام یہی ہوتا ہے، ''اور یہی لوگ ہیں جو کہ اللہ کی ہدایت سے فائدہ اُٹھاتے ہیں۔''

زبردستی ہدایت نہیں دی جاسکتی

اَفَمَنْ حَقَّ عَلَيْهِ كَلِمَةُ الْعَذَابِ ۭ اَفَاَنْتَ تُنْقِذُ مَنْ فِي النَّارِ: کیا پھر وہ شخص جس کے اوپر کَلِمَةُ الْعَذَاب ثابت ہوگیا، کیا پھر تو چھڑانے والا ہے اس شخص کو جو کہ جہنم میں ہے؟ یہ سوال کی ایک شق ہے، اس میں دوسری شق محذوف ہے، اس کی مثالیں بہت دفعہ آپ کے سامنے گزر گئیں، یعنی ایک تو یہ بندے ہیں جن کا ذِکر اُوپر آیا، اور ایک وہ ہیں جن کے اوپر ان کی بدکرداری کی وجہ سے کَلِمَةُ الْعَذَاب ثابت ہوگیا، کَلِمَةُ الْعَذَاب سے وہی کلمہ مراد ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے جواب میں کہا تھا لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (سورۂ ص:۸۵) کہ میں تجھ سے اور تیرے متبعین سے جہنم کو بھر دوں گا، اور وہ شیطان کی اتباع کی بنا پر اس کلمے کی زد میں آگئے، تو کیا جس کے لئے جہنم میں جانے کا فیصلہ ہی ہوگیا اس کے اعمال کی بنا پر، تو آپ اس کو زبردستی سیدھے راستے پر چلا سکتے ہیں؟ آپ اس کو چھڑا سکتے ہیں؟ ایسا نہیں ہوسکتا۔

اپنے رَبّ سے ڈرنے والوں کا انجام

لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ: لیکن وہ لوگ جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں، لَهُمْ غُرَفٌ مِّنْ فَوْقِهَا غُرَفٌ مَّبْنِيَّةٌ: غُرَفٌ غرفۃ کی جمع ہے۔ غرفۃ بلند و بالا عمارت کو کہتے ہیں، جس کو ہم اپنی زبان میں بالاخانے کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، بالا خانہ، چوبارہ۔ تو جو ذی شان عمارت ہو، بلند و بالا، چاہے وہ چوبارہ نہ بھی ہو، یعنی عمارت کے اُوپر دوسری عمارت نہ بھی ہو تو بھی وہ غرفۃ کا مصداق ہوتی ہے، اور یہاں منزلوں کی طرف اشارہ ہے، ''ان کے لئے بالا خانے ہوں گے جن کے اُوپر سے اور بالا خانے بنے ہوئے ہوں گے۔'' لٰكِنِ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ میں لکن اِستدراک کے لئے ہو تو اِستدراک کا معنی یہ بھی آتا ہے کہ ایسا حکم بیان کرنا جو پہلے حکم کے خلاف ہو، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ لکن تاکید کے لئے ہو، تو اس وقت لکن البتہ کے معنی میں ہوگا، یعنی جن پہ کَلِمَةُ الْعَذَاب ثابت ہوگیا اور جو جہنم میں جانے والے ہیں ان کو راہِ راست پہ لانا تو آپ کے بس کی بات نہیں ہے، البتہ جو لوگ اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں ان کے لئے بالاخانے ہیں، اور ان بالاخانوں کے اُوپر اور بالاخانے بنے ہوئے ہیں، جاری ہوں گی ان کے نیچے سے نہریں۔

وَعْدَ اللّٰهِ: یہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے۔ وَعْدَ اللّٰهِ مفعول مطلق ہے وَعَدَ اللّٰهُ وَعْدًا، اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے وعدے کے خلاف نہیں کیا کرتا۔ اس لئے یہ نیک بندے اللہ سے ڈرنے والے ضرور اس وعدے کو پہنچ کر رہیں گے۔

اللہ تعالیٰ کا نظامِ آب پاشی

اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اے مخاطب! کیا تو نے دیکھا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اتارا آسمان سے پانی، فَسَلَكَهٗ يَنَابِيْعَ فِي الْاَرْضِ: يَنَابِيْعَ: يَنْبُوْع کی جمع ہے۔ يَنْبُوْعًا کا لفظ آپ کے سامنے سورۂ اسراء (آیت:۹۰) میں آیا تھا، ینبوع کہتے ہیں پھوٹنے والے چشمے کو۔ نَبَعَ الماءُ: پانی پھوٹنا۔ تو ینبوع چشمہ ہوگیا، اور يَنَابِيْعَ اس کی جمع ہوگئی، فِي الْاَرْضِ یہ يَنَابِيْعَ کی صفت ہے (نسفی) زمین میں چشمے۔'' کیا تو دیکھتا نہیں کہ بے شک اللہ نے آسمان سے پانی اُتارا، پھر داخل کر دیا اس کو زمین میں چشموں

کے اندر، جاری کیا اس کو، چلایا اس کو، داخل کیا اس کو چشموں میں جو زمین میں موجود ہیں۔ یہ اللہ تعالیٰ کا نظامِ آب پاشی ہے جس طرح سے آپ دیکھتے ہیں کہ اصل مخزن پانی کا تو اللہ کے علم میں آسمانوں کی جانب ہی ہے، جس طرح سے اللہ اس کو اُتارتا ہے، جو بھی اس کی حکمت کا تقاضا ہے، کثرت کے ساتھ بارش برستی ہے، پانی اوپر سے اُترتا ہے، آگے اس پانی کو مخلوق کے فائدے کے لئے اللہ تعالیٰ محفوظ کرتے ہیں، ایک زمانے میں پانی اتارتے ہیں، اور پھر دوسرے وقت میں انسانوں کے کام لانے کے لئے اس کو محفوظ رکھتے ہیں، محفوظ رکھنے کی ایک تو یہ صورت ہے کہ کروڑہا منوں کے حساب سے پانی کو برف کی شکل میں جما کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر محفوظ کر دیا جاتا ہے، جب وہ برف کی شکل میں جما ہوا ہوتا ہے تو نہ سڑتا ہے، نہ اس میں بدبو پیدا ہوتی ہے، نہ اس میں کوئی جراثیم پیدا ہوتے ہیں، صاف ستھرا پانی کروڑہا من جس کا آپ اندازہ بھی نہیں لگا سکتے، وہ ایک وقت میں اُتار کر پہاڑوں کی چوٹیوں پر محفوظ کر دیا جاتا ہے، یہاں سے وہ آہستہ آہستہ زمین میں بھی سرایت کرتا ہے، پہاڑوں سے نیچے، اور پھر وہ سرایت کرنے کے بعد کہیں تو قدرتی طور پر چشمے پھوٹتے ہیں، اور وہ چشموں کی شکل میں پھوٹ کر نہریں بنتی ہیں، نالیاں بنتی ہیں، آگے جمع ہوتا ہے، دریا بنتے ہیں، میدانی علاقوں میں وہ پانی آتا ہے چشموں سے پھوٹ کے، تو ان پانیوں سے لوگ فائدہ اُٹھاتے ہیں، اور اسی طرح سے اس کو زمین کی نچلی سطح میں بھیج دیا جاتا ہے، یہ مٹی کے ساتھ خلط ملط ہو کے زمین کے نیچے بہتا چلتا رہتا ہے، جب چاہیں آپ نلکا لگا کے، ٹیوب ویل لگا کے، کنواں کھود کے اس پانی کو نکال لیتے ہیں، اور اپنی ضرورتیں پوری کرتے ہیں، جب وہ مٹی کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے تو فلٹر ہو کے صاف ستھرا آتا ہے، اس میں کوئی گندگی اور کوئی کسی قسم کی بات نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا کہ پانی اللہ تعالیٰ نے اتارا، پھر اس کو کس طرح سے زمین میں جاری کیا، زمین کے سوتوں میں زمین کے چشموں میں وہ جاری ہوتا ہے، اللہ اس کو داخل کرتا ہے۔

کھیتی میں عقل مندوں کے لئے کون سی نشانی ہے؟

اور پھر اسی پانی کی برکت سے اللہ کھیتی نکالتا ہے یُخْرِجُ بِهٖ زَرْعًا: نکالتا ہے اس کے ذریعے سے کھیتی مُّخْتَلِفًا اَلْوَانُهٗ: جس کی قسمیں مختلف ہیں۔ الوان: لون کی جمع ہے، لون رنگ کو کہتے ہیں اور یہ قسم کے معنی میں بھی آتا ہے، قسم قسم کی کھیتی پیدا ہوتی ہے، مختلف قسم کے پھل، مختلف قسم کے پھول، کیا کیا نباتات اُگتی ہیں اسی پانی کی برکت سے، ثُمَّ یَهِیْجُ: پھر وہ زرع خشک ہو جاتی ہے، یَهِیْجُ کی ضمیر زَرْعًا کی طرف جا رہی ہے، پھر وہ کھیتی خشک ہو جاتی ہے، فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا: پھر تو اس سبز کھیتی کو زرد دیکھتا ہے، جب وہ پھوٹتی ہے تو کیسی سرسبز اور کیسی فرحت بخش ہوتی ہے، کتنی اچھی لگتی ہے، پھر تو اس کو دیکھتا ہے زرد، ثُمَّ یَجْعَلُهٗ حُطَامًا: پھر اللہ تعالیٰ اس کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ: اس میں البتہ یاد دہانی ہے عقل والوں کے لئے، اگر اس میں غور کریں تو عقل مندوں کو ایک بات یاد آتی ہے اس کو دیکھ کے، وہ کیا بات یاد آتی ہے؟ ایمان سے جو لوگ محروم ہیں وہ زیادہ تر دُنیا کی محبت کی وجہ سے محروم ہوتے ہیں، جیسے میں نے پہلے عرض کیا کہ ان کو یہ خطرہ ہوتا ہے اگر ہم نے اس ایمان کو قبول کیا تو ہمارا فلاں مفاد ختم

ہوجائے گا، ہماری لذات ختم ہوجائیں گی، ہماری عیش وآرام کی زندگی ختم ہوکے مجاہدے کی زندگی اپنانی پڑے گی، تو حبِ دنیا اور لذت پرستی یہ ایک ایسی چیز ہے جو انسان کو نیکی اختیار کرنے سے مانع ہے، اللہ تعالیٰ اس مثال کے ساتھ آپ کو یہ بات یاد دلاتے ہیں کہ یہ ایک عارضی اور فانی چیز ہے، اس کے اُوپر اپنی دائمی راحت کو قربان نہ کرو، نباتات کو تم دیکھتے ہو پھوٹتی ہے اُگتی ہے تو کیسی سرسبز ہوتی ہے؟ لیکن چند دنوں کے بعد وہ خشک ہوجاتی ہے، اس کا رنگ پیلا پڑ جاتا ہے، اس میں کوئی خوشنمائی باقی نہیں رہتی، پھر ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے، ریزہ ریزہ ہوجانے کے بعد پھر غلہ علیحدہ بھوسہ علیحدہ، کس طرح سے اس کو چھانٹ لیا جاتا ہے، تو انسان کی زندگی بھی بالکل اسی طرح سے ہے، دُنیوی بہار بھی چندروزہ ہوتی ہے، کوئی عیش وآرام کی حالت ہو اس کو دُنیا میں دوام نہیں ہے، اور انسان کے اندر بھی جوش وخروش اور جوانی کی بہار یہ بھی چند دِن ہی ہوتی ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے، بڑھتا ہے، آخر ایک وقت میں جوان ہوجاتا ہے، تو جوان ہونے کے بعد کس طرح سے تن کے چلتا ہے، تکبر میں ہوتا ہے، سمجھتا ہے کہ میرے جیسا کوئی طاقتور ہی نہیں، ہر جگہ وہ مکا لہراتا ہے، اور دوسرے کے سامنے سینہ کھول کے اپنی بڑائی ظاہر کرتا ہے، لیکن آخر کتنے دِن تک، اگر اسی جوانی میں موت نہ آئے، تو آخر آہستہ آہستہ کھیتی کی طرح خشک تو ہونا ہی ہے، نہ یہ رنگ رہے گا، نہ رُوپ رہے گا، نہ حُسن رہے گا، نہ جمال رہے گا، نہ یہ قد نہ قامت، کمر ٹیڑھی ہوجائے گی، ٹانگیں قوت سے خالی ہوجائیں گی، بازو جواب دے جائیں گے، تو ذرا اس وقت کو دیکھو! کیا یہ فصل کے خشک ہونے کا زمانہ جس طرح سے ہوتا ہے، کہ فصل میں حُسن کی صفت جتنی ہوتی ہے وہ سب ختم ہوجاتی ہے، تو کیا انسان کی فصل خشک نہیں ہوتی؟ یہ بھی تو آخر میں جا کے بڑھاپے میں ایسے ہی ہوجاتا ہے، آخر مر جاتا ہے۔ تو نباتات کو دیکھ دیکھ کے اس چیز کو یاد کرو، اللہ تعالیٰ تمہارے سامنے ہر روز یہ مثال لاتا ہے، تو انسان کی زندگی بھی ایسے ہی ہے، تو اس چندروزہ بہار کے اُوپر مست ہوجانا اور آخرت کی سعادت حاصل کرنے کی کوشش نہ کرنا یہ کوئی عقل مندی نہیں، عقل مندوں کے لئے اس مثال میں یاددہانی ہے، اگر غور کریں تو انہیں دنیا کی فنائیت سمجھ میں آتی ہے، اور اپنے متعلق بھی یہی بات سمجھ میں آتی ہے کہ یہ چندروزہ جوانی، چندروزہ حُسن وجمال، اس کے اوپر کوئی فخر وناز نہیں کرنا چاہیے، اور نہ اپنی قوتوں کے اُوپر اعتماد کرکے انسان کو اللہ کے مقابلے میں بغاوت اور سرکشی اختیار کرنی چاہیے، یہ عقل مندی کا تقاضا نہیں ہے، یہ تو چندروزہ فصلِ بہار ہے، اور ایک وقت آئے گا کہ خشک ہوکے ریزہ ریزہ ہوجائے گی۔

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۭ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ
کیا پھر وہ شخص کہ اللہ نے اس کے سینے کو کھول دیا اسلام کے لئے، اور وہ اپنے رَبّ کی طرف سے ایک نُور پر ہے، پھر خرابی ہے ان لوگوں کے لئے
قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۲﴾ اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ
جن کے دِل سخت ہیں اللہ کی یاد سے، یہی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۲۲﴾ اللہ تعالیٰ نے اُتاری بہترین بات

كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ ۖ تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ ۚ ثُمَّ

اس حال میں کہ وہ ملتی جلتی کتاب ہے بار بار دہرائی ہوئی، جولوگ اپنے رب سے ڈرتے ہیں ان کے بدن اس کتاب سے کانپ اُٹھتے ہیں، پھر

تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ ۗ ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۗ

ان کے چمڑے اوران کے دِل اللہ کے ذکر کی طرف نرم ہو جاتے ہیں، یہ اللہ کی ہدایت ہے جس کو چاہتا ہے وہ اس کے ذریعے سے ہدایت دیتا ہے

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿٢٣﴾ اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ

اور جس کو اللہ بھٹکا دے تو اس کو کوئی راستہ دِکھانے والا نہیں ﴿٢٣﴾ کیا پھر وہ شخص جو اپنے چہرے کو ڈھال بنائے گا بُرے عذاب کی قیامت

الْقِيٰمَةِ ۗ وَقِيْلَ لِلظّٰلِمِيْنَ ذُوْقُوْا مَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿٢٤﴾ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ

کے دِن، اور ظالموں سے کہا جائے گا کہ مزہ چکھو ان اعمال کا جو تم کیا کرتے تھے ﴿٢٤﴾ ان لوگوں نے بھی جھٹلایا جو

قَبْلِهِمْ فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿٢٥﴾ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ

ان سے پہلے گزرے ہیں، پھر ان کے پاس عذاب آ گیا ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو شعور بھی نہیں تھا ﴿٢٥﴾ پھر اللہ نے ان کو مزہ چکھایا رُسوائی کا

فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٦﴾ وَلَقَدْ ضَرَبْنَا

دُنیوی زندگی میں، آخرت کا عذاب تو بہت بڑی شئ ہے، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ لوگ سمجھ جائیں ﴿٢٦﴾ البتہ تحقیق بیان کیا ہم نے

لِلنَّاسِ فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٧﴾ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا

لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر عجیب مضمون تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿٢٧﴾ اس حال میں کہ یہ عربی قرآن ہے

غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ﴿٢٨﴾ ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِيْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ

کجی والا نہیں ہے، تاکہ یہ اللہ کی نافرمانی سے بچیں ﴿٢٨﴾ اللہ نے مثال بیان کی ایک آدمی کی جس میں کئی شرکاء ہیں آپس میں ضد کرنے والے

وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ ۗ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ۗ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ ۚ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٢٩﴾

اور ایک آدمی کی مثال بیان کی جو پورے کا پورا ایک ہی آدمی کا ہے، کیا یہ دونوں حالت کے اعتبار سے برابر ہیں؟ سب صفتیں اللہ کے لئے ہیں بلکہ ان میں

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ ﴿٣٠﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ ﴿٣١﴾

سے اکثر علم ہی نہیں رکھتے ﴿٢٩﴾ آپ کو بھی موت آنے والی ہے اور یہ بھی مرنے والے ہیں ﴿٣٠﴾ پھر تم قیامت کے دن اپنے رب کے سامنے جھگڑو گے ﴿٣١﴾

تفسیر

شرحِ صدر والے اور سخت دِل والے برابر نہیں

اَفَمَنْ شَرَحَ اللّٰهُ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ فَهُوَ عَلٰى نُوْرٍ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَوَيْلٌ لِّلْقٰسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ مِّنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ۚ اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: کیا پھر وہ شخص کہ اللہ تعالیٰ نے اس کے سینے کو کھول دیا اسلام کے لئے، اور وہ اپنے رَبّ کی طرف سے ایک نُور پر ہے، پھر خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دِل سخت ہیں اللہ کی یاد سے (قاسیہ یہ لفظ قساوت سے لیا گیا ہے، قساوت: سختی کو کہتے ہیں) یہی صریح گمراہی میں ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ بعض لوگ تو ایسے ہیں جو اُوپر والی مثالوں میں غور اور تدبر کر کے عقل سے کام لیتے ہیں، کام لینے کے بعد ان کو حقیقت سمجھ میں آجاتی ہے اور ان کا سینہ کھل جاتا ہے اور وہ اسلام کو قبول کر لیتے ہیں، اسلام کے لئے شرحِ صدر ان کو حاصل ہو گیا، ان کے سامنے ایک روشنی آجاتی ہے اللہ کی جانب سے، روشنی میں وہ اپنے ماضی کو بھی دیکھتے ہیں، مستقبل کو بھی سمجھتے ہیں، ان کو یہ پتا چل جاتا ہے کہ ہم کہاں سے آئے؟ اور ہم نے کدھر جانا ہے؟ اور ہماری اس زندگی کا انجام کیا ہے؟ ان کو یہ نُور حاصل ہو جاتا ہے، تو اَفَمَنْ کے ساتھ ایک شق مذکور ہوگئی، دوسری شق کو دوسرے انداز میں ذکر کیا گیا، تو کیا ایسا شخص اور دوسرا شخص آپس میں برابر ہو سکتا ہے؟ جن کے دل سخت ہیں، اللہ کی یاددہانی کے باوجود بھی وہ متاثر نہیں ہوتے، ان کے قلب میں قساوت ہے، نہ ان کو اپنے ماضی میں کچھ نظر آتا ہے، اندھیرے میں پڑے ہوئے ہیں، نہ مستقبل میں ان کو کچھ نظر آتا ہے، ان کو کوئی پتا نہیں کہ ہم آئے کہاں سے؟ اور جا کدھر رہے ہیں؟ ان کے سامنے ایک یہ نقد دُنیا ہے، بس کھالو، اور عیش اُڑالو، اس کے بعد آگے پیچھے کچھ بھی نہیں، تو یہ دونوں قسم کے لوگ آپس میں کسی صورت بھی برابر نہیں ہو سکتے، تو تم ان لوگوں میں بنو جو اللہ کی طرف سے ایک نُور کو حاصل کر کے اپنے ماضی اور مستقبل کو دیکھتے اور سوچتے ہوئے چلتے ہیں، ایسے لوگوں میں شامل نہیں ہونا چاہیے جن کے قلوب سخت ہو گئے اور اللہ کی یاددہانی کے باوجود ان کے دِلوں میں نرمی نہیں آتی، یہ تو صریح گمراہی میں ہیں، یہ تو اندھیر ہی اندھیر ہے، ان سے پوچھو کہ تم آئے کہاں سے ہو؟ تو یہ نہیں بتا سکتے، اندھیر ہے، اور تم جا کہاں رہے ہو؟ ان کو یہ بھی کوئی پتا نہیں، بس یہ نقد کے حامل ہیں کہ یہاں رہتے ہوئے عیش کر لو، آرام کر لو، زیب و زینت حاصل کر لو، اس سے زیادہ ان کے سامنے کوئی بات ہی نہیں، ''خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جن کے دل سخت ہو گئے اللہ کی یاد سے، یعنی اللہ کی یاد سے متاثر نہیں ہوتے (ذِکر: تذکیر کے معنی میں لے لیا جائے تو ''اللہ کی یاددہانی سے متاثر نہیں ہوتے'') یہی صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔''

قرآنِ کریم کی عظمت اور ڈرنے والوں پر اس کے اثرات

اَللّٰهُ نَزَّلَ اَحْسَنَ الْحَدِيْثِ كِتٰبًا مُّتَشَابِهًا مَّثَانِيَ: جس طرح پیچھے پانی کو اُتارنے کا ذِکر آیا تھا تو یہاں ہدایت معنوی کے اُتارنے کا ذِکر آیا، یہ بھی ایک معنوی پانی ہے جس کے ساتھ لوگوں کی رُوحوں کو غذا ملتی ہے، ''اللہ تعالیٰ نے اُتاری بہترین بات اس حال میں کہ یہ ملتی جلتی کتاب ہے'' یعنی یہ ایک ایسی کتاب ہے جس کے ہر حصے آپس میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں، اعجاز کے

اعتبار سے بھی، صداقت کے اعتبار سے بھی، کتاب کا کوئی جز دوسرے جز کے خلاف نہیں، جہاں سے آپ قرآنِ کریم کو کھول کر پڑھیں گے حقیقت ایک ہی آپ کے سامنے میں آئے گی، اللہ کی عبادت کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے، نافرمانی سے روکا جارہا ہے، شرک سے روکا جارہا ہے، توحید کی تعلیم دی جارہی ہے، آخرت کی یاددہانی ہے، چاہے انداز کوئی اختیار کیا گیا ہو لیکن حقیقت سب میں ایک ہے، ملتی جلتی کتاب ہے۔ مَثَانِیَ: یہ مثنی کی جمع ہے۔ مثنی: دوہرائی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، دوہری کی ہوئی، مَثَانِیَ کا معنی بار بار دوہرائی ہوئی، یعنی یہ ایسی کتاب ہے جس میں بہت ساری باتیں بار بار دوہرائی گئی ہیں، ان کی اہمیت کے طور پر اور سمجھانے کے لئے، جس طرح آپ دیکھتے ہیں کہ یہی مضامین مختلف انداز کے ساتھ اللہ تعالیٰ بار بار بیان فرماتے ہیں، وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِلنَّاسِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ (سورۂ کہف: ۵۴) تو یہ تصریف، مختلف عجیب مضمونوں کو بار بار بیان کرنا یہی مثانی ہے۔ ''اللہ نے اُتاری بہترین بات اس حال میں کہ وہ ملتی جلتی کتاب ہے بار بار دوہرائی ہوئی۔'' تَقْشَعِرُّ مِنْهُ جُلُوْدُ الَّذِيْنَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُمْ: اِقْشَعَرَّ جِلْدُهٗ، جِلد فاعل ہے، اس کا معنی ہوتا ہے رونگٹے کھڑے ہوجانا، رونگٹے کھڑے ہونے کا مطلب سمجھتے ہیں؟ جب انسان کے قلب میں کوئی خوف سا آتا ہے تو انسان کے اُوپر کپکپی سی طاری ہوتی ہے، اور بال کھڑے ہوجاتے ہیں، اس کو اِقْشَعَرَّ جِلْدُهٗ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، تو آپ اس کا یوں بھی مطلب بیان کرسکتے ہیں کہ ''جو لوگ اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں ان کے بدن اس کتاب سے کانپ اُٹھتے ہیں'' یہ مفہوم بھی لفظوں کے مطابق بالکل صحیح ہے، ''جو لوگ اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں ان کے اس کتاب سے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں''، جب یہ کتاب ان کے سامنے پڑھی جاتی ہے اور وہ اس کو سمجھتے ہیں، ان کے سامنے آتی ہے، تو اللہ کا خوف قلب میں ہوتا ہی ہے، اور اللہ کے خوف کی باتیں یہ قرآنِ کریم یاد دلاتا ہے، اللہ کی قدرت اور عظمت، اچھے بُرے انجام کی تفصیل جب ان کے سامنے آتی ہے تو وہ اس سے کانپ اُٹھتے ہیں، یعنی متاثر ہوتے ہیں، اور ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں، ثُمَّ تَلِيْنُ جُلُوْدُهُمْ وَقُلُوْبُهُمْ اِلٰى ذِكْرِ اللّٰهِ: لَانَ يَلِيْنُ: نرم ہونا۔ پھر ان کے چمڑے اور ان کے قلوب نرم ہوجاتے ہیں اللہ کے ذِکر کی طرف۔ تلین کے اندر میلان والا معنی ہے (ابن جزی)۔ ان کے بدن اور ان کے قلوب نرم ہوکے اللہ کے ذِکر کی طرف مائل ہوجاتے ہیں، بدن اور قلوب کے نرم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اصل تو نرمی قلوب میں ہی آتی ہے، لیکن جس وقت قلب نرم ہوتا ہے تو بدن کے اوپر بھی تواضع کے آثار طاری ہوتے ہیں، انسان ایسے ہوتا ہے کہ جس طرح سے دبا دبا سا ہے، اس کے بدن میں وہ قوت معلوم نہیں ہوتی، اکڑ نہیں معلوم ہوتی، بخلاف ان کے کہ جن کے دل میں تکبر ہوتا ہے، تکبر تو ہوگا قلب میں لیکن گردن بھی اکڑی ہوئی ہوگی، اور جس وقت چلیں گے تو اُن کی چال ڈھال سے ہر چیز سے تختی نمایاں ہوتی ہے، کہ ان کے قلوب کے اندر تکبر اور بڑائی ہے، تواضع اگر ہو تو بدن کے اوپر آثار اور ہوا کرتے ہیں، تکبر ہو تو بدن کے اُوپر آثار اور ہوا کرتے ہیں، تو بدن بھی قلب کے تابع ہے، اگر قلب میں تواضع ہو تو بدن کے اوپر بھی تواضع کے آثار ہوتے ہیں، انسان دیکھنے میں ڈھیلا ڈھالا اور نرم سا معلوم ہوگا، گردن اس کی جھکی ہوئی ہوگی، آنکھ اس کی نیچی ہوگی، چلے گا تو اس میں بھی تواضع معلوم ہوگی، اور اگر قلب کے اندر تکبر ہو تو اس کی ہیئت اور ہوتی ہے، گردن اکڑی ہوئی ہوگی، اور پاؤں بھی وہ دبا دبا کے اُٹھا اُٹھا کے رکھے گا، دیکھنے والا سمجھتا ہے کہ اس کو اپنی قوت اور اپنی بڑائی کا بڑا احساس

ہے، تو جو لوگ اللہ سے ڈرتے ہیں ان کا حال یہ ہوا کرتا ہے کہ قرآنِ کریم کو سنیں تو ان کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں، اور پھر ان کے دل اور ان کے بدن نرم ہو کر اللہ کے ذکر کی طرف متوجہ ہوجائیں۔

ہدایت کس کو ملتی ہے؟ اور گمراہ کون ہوتا ہے؟

ذٰلِكَ هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَآءُ: یہ کتاب جس کی شان اُوپر ذکر کی گئی یہ اللہ کی ہدایت ہے، جس کو چاہتا ہے وہ اس کے ذریعے سے ہدایت دیتا ہے، یعنی جس کو چاہتا ہے اس کو قبول کرنے کی اور اس پر عمل کرنے کی توفیق دیتا ہے، لیکن چاہتا کس کے متعلق ہے؟ جو اس کے قاعدے پہ چلنے والے ہیں، تدبر کرتے ہیں، تفکر کرتے ہیں، ضد اور ہٹ دھرمی کو چھوڑ دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت قبول کرنے کی توفیق دے دیتا ہے، "اور جس کو اللہ بھٹکا دے تو اس کو کوئی راستہ دکھانے والا نہیں" یعنی جو اللہ کے قانون کی زد میں آگیا تو زبردستی اس کو کوئی شخص ہدایت پہ نہیں لاسکتا، اور اللہ بھٹکاتا اُسے ہی ہے جو اپنے ارادے کے ساتھ غلط راستہ اختیار کرتے ہیں، چونکہ ہر کیفیت کا خالق اللہ ہے اس لئے نسبت اس کی طرف کردی، اگر آپ مثال کے طور پر "لودھراں" کو جانا چاہتے ہیں تو "لودھراں" جانے والی سڑک کو اختیار کروگے تو اللہ تعالیٰ تمہیں 'لودھراں' پہنچادے گا، اور اگر جانا تو آپ "لودھراں" چاہتے ہیں اور آپ قصد اور ارادے کے ساتھ "دُنیاپور" کی سڑک پر چل پڑتے ہیں تو اللہ تعالیٰ نے تمہیں بھٹکادیا، یہ کیفیت پیدا تو اللہ نے کی ہے، لیکن اس کا ظہور آپ کے ارادے اور عمل سے ہوتا ہے، اللہ نے قاعدہ تمہیں بتادیا، اس قاعدے پر چلو، اللہ تعالیٰ تمہیں سیدھے راستے پر چلاتا ہوا منزل پہ پہنچادے گا، اور دُوسرا راستہ بھی اللہ نے بتادیا کہ یہ ٹیڑھا راستہ ہے، اگر اس پہ چلنے کی کوشش کروگے تو اللہ تمہیں بھٹکادے گا، بُرے نتیجے تک تمہیں اللہ پہنچادے گا۔ تو ایک راستہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں بتایا اچھے مقصد تک پہنچنے کا، اس پر چلوگے تو اللہ تمہیں اچھے مقصد پہ پہنچائے گا۔ پانی پیو، روٹی کھاؤ، دُودھ پیو، اللہ تعالیٰ تمہیں صحت دے گا، قوت دے گا، یہ اس کے پیدا کئے ہوئے قانون کے مطابق آپ نے عمل کیا تو اللہ تعالیٰ قوت اور صحت دے گا، زہر بھی اللہ نے پیدا کی ہے، زہر کھانے کے بعد موت بھی اللہ ہی پیدا کرتا ہے، اب یہ طریقہ بتادیا کہ اگر یہ کھاؤگے تو مرجاؤگے، تو اگر کھاؤگے تو موت بھی اللہ ہی دے گا۔ اسی طرح سے انسان اپنے قصد اور ارادے کے ساتھ اگر اچھے اُصول اپناتا ہے تو اللہ تعالیٰ اسے سیدھے راستے پہ چلنے کی توفیق دیتا ہے اور اچھے مقصد تک پہنچادیتا ہے، یہ مطلب ہوتا ہے اس کا، اللہ بھٹکاتا انہیں ہی ہے جو اللہ کے قانون کی زد میں آجاتے ہیں، اور سیدھے راستے پر انہیں ہی چلاتا ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق سیدھا چلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

جہنم میں عذاب کا تھپیڑا براہِ راست چہرے پر لگے گا

اَفَمَنْ يَّتَّقِيْ بِوَجْهِهٖ سُوْٓءَ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: کیا پھر وہ شخص جو بچتا ہے اپنے چہرے کے ساتھ بُرے عذاب سے قیامت کے دن۔ اِتِّقَاء اصل میں بچنے کو کہتے ہیں، عام طور پر مترجمین اس کا ترجمہ کرتے ہیں کہ "جو شخص اپنے چہرے کو سپر بناتا ہے ڈھال بناتا ہے بُرے عذاب سے" اس کا مطلب اصل میں یوں ہے کہ جب کوئی شخص آپ کو کوئی سزا دینا چاہے، وہ مارنے لگتا ہے تو آپ دیکھتے ہیں کہ فوراً آپ اپنے ہاتھ کے اوپر اس مار کو روکتے ہیں اور اپنے چہرے پر نہیں آنے دیتے، ٹانگوں پہ مار

برداشت کریں گے، بدن کے دوسرے حصوں پر برداشت کرلیں گے، چہرے کو بہرصورت آپ بچانے کی کوشش کرتے ہیں، اور چہرے کو سزا سے بچانے کے لئے ہاتھ کو بطور ڈھال کے استعمال کرتے ہیں، آپ ہاتھ کے ذریعے سے بچتے ہیں، چہرے کے اُوپر سزا نہیں آنے دیتے، طریقہ یہی ہے کسی کے منہ کے اُوپر مارنے لگو تو وہ فوراً وہ ہاتھ آگے کرلے گا، تو اس کا ہاتھ ڈھال ہے چہرے کو بچانے کے لئے، لیکن جس وقت لوگ جہنم میں ڈالے جائیں گے تو ہاتھ تو پس پشت باندھ دیے جائیں گے، اور جب عذاب آئے گا تو عذاب کو روکنے کے لئے ہاتھ تو آگے آئے گا نہیں، کہ عذاب آپ کے ہاتھ پہ لگ جائے اور چہرے پر نہ آئے، بلکہ وہ عذاب کا تھپیڑا براہِ راست چہرے پر لگے گا، تو یوں سمجھو کہ اس عذاب کے سامنے آپ کا چہرہ ہی ڈھال ہے، کوئی چیز ایسی نہیں ہوگی جو عذاب کو چہرے سے روک دے اور چہرے تک نہ آنے دے، اور چہرہ انسان کے بدن میں سے اشرف جز ہے، جس کو بچانے کے لئے انسان پوری پوری کوشش کرتا ہے، تو جب وہ عذاب کا تھپیڑا براہِ راست چہرے پر ہی آئے گا تو باقی بدن کے بچنے کی کیا صورت ہے؟ ''کیا پھر وہ شخص جو کہ ڈھال بنائے گا بُرے عذاب کی اپنے چہرے کو قیامت کے دِن'' یعنی جس طرح سے انسان ہاتھ پر روکنے کی کوشش کرتا ہے تو ہاتھ تو اس وقت بندھے ہوئے ہوں گے، جکڑے ہوئے ہوں گے، تو عذاب کا تھپیڑا جب آئے گا تو براہِ راست منہ پر ہی لگے گا، تو بچنے کا یہاں یہی معنی ہے ''اپنے چہرے کو ڈھال بنائے گا بُرے عذاب کی قیامت کے دِن، اور ظالموں سے کہا جائے گا کہ چکھو اس چیز کو جو تم کیا کرتے تھے، مزہ چکھو ان اعمال کا جو تم کیا کرتے تھے'' تو سوال کی دوسری شق سامنے آگئی کہ کیا یہ شخص اور وہ شخص جس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوش حالی نصیب ہوگئی، یہ آپس میں برابر ہوسکتے ہیں؟ کوئی صورت ہی نہیں۔

کافروں کے لئے دُنیا وآخرت میں رُسوائی ہے

كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ: ان لوگوں سے جو پہلے گزرے ہیں انہوں نے بھی جھٹلایا، یعنی یہ حقائق جو پیش کیے جارہے ہیں کہ کُفر وشرک کا نتیجہ دُنیا اور آخرت میں یہ نکلنے والا ہے، تو پہلے انبیاء ﷩ نے بھی یہ حقائق بیان کئے تھے تو ان سے پہلے لوگوں نے بھی جھٹلایا، فَاَتٰىهُمُ الْعَذَابُ: پھر ان کے پاس عذاب آگیا مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ: ایسی جگہ سے جہاں سے ان کو شعور بھی نہیں تھا، وہ سمجھتے ہی نہیں تھے کہ اِدھر سے بھی عذاب آسکتا ہے، وہ سمجھتے تھے کہ ہم نے قلعے بنائے ہوئے ہیں، ہم نے قوت جمع کی ہوئی ہے، کون ہے جو ہمیں دُنیا کے اندر شکست وریخت کرسکتا ہے؟ لیکن اللہ کا عذاب ایسے طور پر آگیا جس کا ان کو خیال بھی نہیں تھا، فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ الْخِزْيَ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: پھر اللہ تعالیٰ نے ان کو مزہ چکھایا رُسوائی کا دُنیوی زندگی میں، وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَكْبَرُ: آخرت کا عذاب تو بہت بڑی شئ ہے۔ دُنیا میں اللہ نے ان کو رُسوا کیا، جیسے قوموں کے قصے آپ کے سامنے آئے، اور آخرت کا عذاب تو اس کے مقابلے میں بہت بڑا ہے، لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ: کیا ہی اچھا ہو کہ یہ لوگ جان لیں، ان لوگوں کو پتا چل جانا چاہیے، اگر یہ لوگ جان لیں تو پھر اس عذاب سے بچنے کی کوشش کریں، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ لوگ سمجھ جائیں، ان کو علم حاصل ہوجائے۔

قرآن کی زبان، اُسلوب اور مقصد

وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ: البتہ تحقیق بیان کیا ہم نے لوگوں کے لئے اس قرآن میں ہر عجیب مضمون، ہر قسم کی مثال بیان کی حقیقت کو سمجھانے کے لئے، لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں۔ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا: یہ هٰذَا الْقُرْاٰن سے حال ہے۔ اس حال میں کہ یہ عربی قرآن ہے، غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ: عوج: کجی کو کہتے ہیں۔ کجی والا نہیں ہے، لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ: تاکہ یہ اللہ کی نافرمانی سے بچیں، یہ اللہ کے عذاب سے بچیں۔ عربی میں قرآن آیا، یہ عربوں کے اُوپر براہِ راست ایک نعمت اور احسان ہے کہ کتاب ان کی زبان میں آئی، سیدھی سادی کتاب ہے، جس میں کوئی کسی قسم کی پیچیدگی نہیں ہے، عین فطرت کے مطابق ہے، اور یہ ہم نے اس لئے اُتاری تاکہ یہ لوگ اس کی ہدایات پر عمل کریں، اللہ کی ناراضگی سے، یا، اللہ کے عذاب سے بچیں، کُفر وشرک سے بچیں، يَتَّقُوْنَ کا مفعول جو چاہیں نکال لیں۔

''موحد'' اور ''مشرک'' کی مثال

آگے شرک کی مذمت کے لئے ایک مثال دی ہے جیسے وَلَقَدْ ضَرَبْنَا لِلنَّاسِ فِي هٰذَا الْقُرْاٰنِ مِنْ كُلِّ مَثَلٍ میں ذِکر کیا کہ ہم نے مثالوں کے ساتھ حقائق سمجھائے ہیں، تو آگے بھی ایک مثال ہے، مثال اس طرح سے کہ وہ دور ایسا تھا، جب یہ قرآن اُتر رہا تھا اس وقت غلامی عام تھی، گھر گھر غلام تھے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دیکھو! تمہارے اپنے معاشرے میں ایک غلام تو ایسا ہوسکتا ہے جو ایک کا ہی مملوک ہے، اسی کے احکام اس کو ماننے پڑتے ہیں، اسی کی خدمت کرنی پڑتی ہے، ایک غلام تو یہ دیکھ لو، آخر تمہارے گھروں میں موجود ہیں، اور ایک غلام دو چار آدمیوں کے درمیان میں مشترک بھی ہوسکتا ہے، کہ اس کے مالک کئی ہوں، اور وہ مالک ہوں بھی آپس میں ضد کرنے والے، ضدی، اب ایسا غلام جو کہ چار پانچ مالکوں کا مملوک ہے یا دو تین کا مملوک ہے، اور وہ ہوں بھی آپس میں ایک دوسرے کے مخالف، تو وہ غلام کتنا پریشان ہوگا؟ کہ وہ کچھ حکم دے رہا ہے، وہ کچھ حکم دے رہا ہے، کبھی وہ اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے گا، کبھی اس کو خوش کرنے کی کوشش کرے گا، دن رات کسی وقت بھی اس کو سکون نہیں آسکتا، اس طرح سے مشرک کی مثال تو اس غلام کی ہے جو کئی مالکوں کے درمیان میں مشترک ہے اور ان کی آپس میں ضد ہے، اور موحد کی مثال اس غلام کی ہے جو ایک ہی مالک کا ہے، جو ایک ہی مالک کا ہو، جس نے ایک کو ہی خوش کرنا ہے، اور اسی کے اَحکام کو پورا کرنا ہے تو وہ کتنے سکون اور اطمینان کے ساتھ رہے گا، بمقابلہ اس کے جو کبھیوں کی طرف جھانکتا ہے، کبھی کسی کے احکام کی بجا آوری کرنی پڑتی ہے، کبھی کسی کو خوش کرنا پڑتا ہے، کبھی کوئی ناراض ہوگیا، کبھی کوئی ناراض ہوگیا، تو جس طرح سے چند مالکوں کے تحت رہنے والا غلام پریشان ہوتا ہے مشرک بھی اسی طرح سے پریشان ہے، موحد کے سامنے تو ایک دروازہ ہے، وہ تو جب دیکھے گا اللہ کی طرف ہی دیکھے گا، اللہ کے سامنے ہی ہاتھ پھیلائے گا، کسی اور کی طرف اس کا قلب متوجہ ہی نہیں، اور مشرکوں کو دیکھ لو کہ آج اس مزار پر جارہے ہیں، پرسوں اس مزار پر جارہے ہیں، کبھی کسی کے ہاں چڑھاوے چڑھا رہے ہیں، کبھی کسی کے ہاں چڑھاوے چڑھا رہے ہیں، ہر طرف پریشان پھرتے ہیں، اسی طرح سے جتنے آلہہ کوئی تجویز کرلے گا اتنے ہی گویا کہ اپنے اُوپر مالک مسلط کر رہا ہے، تو

اس میں سوائے پریشانی کے کچھ حاصل نہیں ہے، ایک خدا تو ماننا پڑتا ہے، اس کے بغیر تو چارہ نہیں، کیونکہ اس کے بغیر انسان کی ناتوانی اور عجز کا کوئی سہارا نہیں ملتا، اگر کوئی خدا بھی نہ مانا جائے تو اپنے عجز کے لئے کوئی سہارا نہیں ہے، ایک کو ماننے کے لئے تو فطرت مجبور ہے، لیکن ایک سے زائد ماننا اور اپنے اُوپر مسلط کرنا یہ فطرت کے خلاف ہے، یہ بات اس مثال سے سمجھائی۔

''اللہ تعالیٰ نے مثال بیان کی ایک آدمی کی جس میں کئی شرکاء ہیں آپس میں ضد کرنے والے'' مُتَشٰکِسُوْنَ: آپس میں مخالفت اور ضد کرنے والے، وَرَجُلًا سَلَمًا لِّرَجُلٍ: اور ایک آدمی کی مثال بیان کی اللہ تعالیٰ نے جو کہ پورے کا پورا ایک ہی آدمی کا ہے، هَلْ یَسْتَوِیٰنِ مَثَلًا: کیا یہ دونوں مثال کے اعتبار سے برابر ہیں؟ حالت کے اعتبار سے برابر ہیں؟ برابر نہیں ہیں، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ: سب صفتیں اللہ کے لئے ہیں، اور اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ یہ کلمہ شکر بھی ہے، یعنی اللہ کا شکر ہے کہ حقیقت بالکل نمایاں ہے، بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ: لیکن یہ لوگ مانتے نہیں، بلکہ ان میں سے اکثر علم ہی نہیں رکھتے، جانتے ہی نہیں، ان مثالوں کو سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کرتے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی

تو یہاں نہیں سمجھتے تو نہ سہی، آخرت میں اللہ تعالیٰ ان کے درمیان میں فیصلہ کردے گا، اِنَّكَ مَیِّتٌ: آپ بھی مرنے والے ہیں، آپ کو بھی موت آنے والی ہے، وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ: اور یہ بھی مرنے والے ہیں ثُمَّ اِنَّكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ: پھر تم قیامت کے دن اپنے رَبّ کے سامنے جھگڑو گے، جھگڑا لے جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ نے بھی آخر کار وہیں جانا ہے اور یہ بھی آخر کار وہیں جانے والے ہیں، اگر یہاں دُنیا کے اندر رہتے ہوئے دلائل کے ساتھ فیصلہ نہیں ہوتا تو وہاں جا کے اللہ تعالیٰ عملاً فیصلہ فرمادیں گے، یہ آخرت کے حوالے کے ساتھ گویا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اطمینان دلایا جارہا ہے کہ یہ کشاکشی دائمی نہیں، آخر ایک دِن آپ کو بھی موت آئے گی، اور ان کو بھی موت آئے گی، پھر اللہ کے سامنے پیش ہوں گے، وہاں جا کے تمہارا جھگڑا ہوگا، تو اللہ تعالیٰ وہاں عملی فیصلہ فرمادیں گے، عملی فیصلے کا ذکر اگلی آیات میں آرہا ہے۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا یَصِفُوْنَ○ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِیْنَ○ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ○

عقیدہ ''حیات النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم''

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ اِنَّكَ مَیِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّیِّتُوْنَ۝ ثُمَّ اِنَّكُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ عِنْدَ رَبِّكُمْ تَخْتَصِمُوْنَ: کل کے سبق میں اختتام پر یہ آیت آئی تھی، تو اس آیت کا موقع محل تو یہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے ایک قسم کی تسلی ہے، کہ آج یہ لوگ آپ سے جھگڑتے ہیں اور سمجھائے ہوئے سمجھتے نہیں، حالانکہ کتنی واضح واضح مثالیں اللہ تعالیٰ بیان فرماتے ہیں، جیسے پچھلی آیت کے اندر مثال کا ذکر ہے ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا رَّجُلًا فِیْهِ شُرَكَآءُ مُتَشٰكِسُوْنَ... الخ، تو آپ بھی مرنے والے ہیں یہ بھی مرنے والے ہیں، موت کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے پیشی ہوگی، اور وہاں سب کے جھگڑوں کے فیصلے ہوجائیں گے، جس میں ان کا جو جھگڑا ہے توحید کے متعلق، اس کا فیصلہ بھی ہوجائے گا، اور اسی فیصلے کے متعلق ہی اگلی آیات میں تذکرہ آرہا ہے کہ حق کو قبول کرنے والے کامیاب ہوں گے، اور

حق کی تکذیب کرنے والے ناکام ہوجائیں گے اس فیصلے میں۔ تو یہاں آگیا اِنَّکَ مَیِّتٌ: آپ میّت ہیں، جس کا مطلب ہے کہ آپ مرنے والے ہیں۔ عام طور پر کچھ لوگ جھگڑا چلاتے ہیں انبیاء ﷺ کی حیات کا، اور اس آیت کو بھی استدلال میں پیش کیا کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں آگیا اِنَّکَ مَیِّتٌ پس حضور ﷺ مر گئے، معلوم ہو گیا کہ مرے ہوئے ہیں، بس اتنا سا استدلال ہے، تو محلِ نزاع کو سمجھنے کے بعد جھگڑا ختم ہوجاتا ہے، کہ یہ آیت اُس پہ دلالت کرتی ہے یا نہیں کرتی؟ یہ بات بالکل واضح بیّن اور مسلّم ہے کہ انبیاء ﷺ کو موت آتی ہے، اور حضور ﷺ کو بھی موت آئی، اور ''مَاتَ النَّبِیُّ'' کہنا جائز ہے، ''اَلنَّبِیُّ مَیِّتٌ'' یہ بھی اطلاق درست ہے، ان باتوں میں کوئی جھگڑا نہیں، حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک سوائے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سب کو موت آئی، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بھی ایک وقت پہ آئے گی، موت کے ورود میں اختلاف نہیں ہے، کہ ان آیات سے استدلال کیا جائے کہ اَفَاۡئِنۡ مَّاتَ (سورۂ آل عمران: ۱۴۴) یا اِنَّکَ مَیِّتٌ، یا حدیث شریف میں جہاں حضور ﷺ کے لئے موت کا اطلاق آیا، ان روایات سے یا ان آیات سے استدلال کیا جائے، یہ تو تب ٹھیک ہے کہ اگر کوئی سرے سے انکار کرے کہ موت ہی نہیں آئی، موت کا ورود ہی نہیں ہوا، پھر تو ان آیات کو استدلال میں لایا جائے، لیکن جب موت کا اقرار ہے کہ موت آئی ہے، میّت کہہ سکتے ہیں، مات النبی ٹھیک ہے، تو پھر ان آیات وروایات سے استدلال کرنے کا کیا مطلب؟ جھگڑا تو اس بات میں ہے کہ موت کے ورود کے بعد، برزخ میں منتقل ہونے کے بعد برزخ میں ان کی کیفیت کیا ہے؟ ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ انبیاء ﷺ کے اجساد بالکل محفوظ ہوتے ہیں اور انبیاء ﷺ کے اجساد کے ساتھ ان کی ارواح کا تعلق اتنا ہوتا ہے کہ یہی ''جسدِ عنصری'' جس کو آپ کہتے ہیں، اس میں حس ہوتی ہے، اور اسی جسد کے ساتھ انبیاء ﷺ اللہ تعالیٰ کی عبادت بھی کرتے ہیں اور صلوٰۃ وسلام بھی سنتے ہیں اور صلوٰۃ وسلام پڑھنے والوں کو جواب بھی دیتے ہیں، اور اسی کو ہم ''حیاتِ انبیاء ﷺ'' سے تعبیر کرتے ہیں، شہداء کے متعلق بھی حیات کا قول ہے تو اسی طرح سے ہے کہ ان کی ارواح کا تعلق ابدان کے ساتھ ہوتا ہے، اور باقی اموات کے مقابلے میں ان کے اوپر زندگی کے آثار زیادہ ہوتے ہیں، اور شہداء کے متعلق بھی موت کا اطلاق ہے۔

منکرینِ حیات کا موقف اور اس کا رَدّ قرآن کی روشنی میں

اور جو لوگ ''حیاتِ انبیاء'' کا انکار کرتے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ان کے اجسام بالکل بے حس، بے جان، بغیر کسی شعور کے اور بغیر کسی علم کے برزخ میں پڑے ہوئے ہیں، اور ان کی روح جہاں ہے بس اپنی عیش میں ہے، وہ اجساد کے ساتھ ارواح کا تعلق اس طرح سے نہیں مانتے کہ ان اجساد کے اندر زندگی کا قول کیا جائے، یہ بات ہے محلِ نزاع۔ باقی موت کے ورود میں جھگڑا نہیں ہے۔ شہداء کے متعلق تو قرآنِ کریم کی آیات آئیں جو آپ کے سامنے واضح کردی گئی تھیں، سورۂ آل عمران میں اور سورۂ بقرہ میں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَا تَقُوۡلُوۡا لِمَنۡ یُّقۡتَلُ فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ اَمۡوَاتٌ ؕ بَلۡ اَحۡیَآءٌ (سورۂ بقرہ: ۱۵۴) یہاں بھی قرآنِ کریم نے قول سے منع کیا کہ جو اللہ کے راستے میں قتل کئے جائیں ان کو اموات نہ کہا کرو، وہ زندہ ہیں، اور دوسری آیت میں ہے وَلَا تَحۡسَبَنَّ الَّذِیۡنَ قُتِلُوۡا

فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْیَآءٌ (آل عمران:۱۶۹) جو اللہ کے راستے میں قتل کر دیے گئے ان کو اموات سمجھا بھی نہ کرو بلکہ وہ زندہ ہیں، اس لئے شہداء کے متعلق عنوان جو اقرب الی الفاظ القرآن ہے وہ ''اَحیاء'' کا ہے، ''اموات'' کا نہیں، جب بھی تذکرہ کریں تو آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ شہداء اَحیاء ہیں، یہ بات قرآنِ کریم کے الفاظ کی طرف زیادہ قریب ہے، باقی یہ کہ ان کو حیات کس قسم کی حاصل ہے؟ اس میں بحث ہوسکتی ہے، اس میں مختلف توجیہات کی جاسکتی ہیں، اس میں مختلف اقوال بھی ہو سکتے ہیں، لیکن جہاں تک عنوان کا تعلق ہے تو عنوان اَحیاء کا آنا چاہیے۔

عقیدۂ ''حیات النبی'' اَحادیث کی روشنی میں

اسی طرح انبیاء ؑ کے متعلق اگرچہ قرآنِ کریم میں صراحتاً مذکور نہیں کہ ان کو اَحیاء کہا گیا ہو، لیکن احادیثِ صحیحہ اس بارے میں کثرت کے ساتھ موجود ہیں۔ شہداء کی طرح قرآنِ کریم میں ایسی کوئی آیت نہیں کہ جس میں انبیاء ؑ کو اَحیاء کہا گیا ہو، شہداء کے متعلق تو دو آیات موجود ہیں، قرآنِ کریم میں انبیاء ؑ کے متعلق ایسی کوئی آیت نہیں جس میں ان کے اوپر صراحتاً ''وفات'' کے بعد ''اَحیاء'' کا لفظ بولا گیا ہو، لیکن روایات موجود ہیں۔ ''نَبِیُّ اللّٰہِ حَیٌّ یُرْزَقُ''(۱) اللہ کا نبی زندہ ہوتا ہے اس کو رزق دیا جاتا ہے۔ یہ بات ویسی ہے جس طرح سے قرآنِ کریم میں شہداء کی متعلق آئی بَلْ اَحْیَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ یُرْزَقُوْنَ بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے رَبّ کے پاس رزق دیے جاتے ہیں۔ تو ''نَبِیُّ اللّٰہِ حَیٌّ یُرْزَقُ'' یہ بات بھی ویسی ہے۔ اسی طرح ''اَلْاَنْبِیَاءُ اَحْیَاءٌ فِیْ قُبُوْرِهِمْ یُصَلُّوْنَ''(۲) انبیاء اپنی قبروں میں زندہ ہوتے ہیں اور نماز بھی پڑھتے ہیں۔ اور لیلۃ المعراج میں سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں کہ میں موسیٰ ؑ کی قبر کے پاس سے گزرا تو موسیٰ ؑ قبر میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔(۳) اس طرح سے اُن کی عبادات کا تذکرہ بھی آتا ہے۔ اور حضور ﷺ نے صحابہ کرام ؓ کو ایک دفعہ کہا (''مشکوٰۃ شریف'' میں روایت موجود ہے) کہ جمعہ کے دِن میرے اُوپر درود کثرت سے پڑھا کرو تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جائے گا، تو صحابہ ؓ نے پوچھا کہ یارسول اللہ! ہماری صلوٰۃ آپ پر کس طرح سے پیش کی جائے گی؟ حالانکہ ''قَدْ اَرَمْتَ'' آپ تو بوسیدہ ہوچکے ہوں گے، پھر ہمارا صلوٰۃ وسلام آپ پر کس طرح سے پیش کیا جائے گا، تو ان کے جواب میں حضور ﷺ نے فرمایا: ''اِنَّ اللّٰہَ حَرَّمَ عَلَی الْاَرْضِ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ''(۴) یا ''اَنْ تَاْکُلَ اَجْسَادَ الْاَنْبِیَاءِ''(۵) اللہ تعالیٰ نے زمین کو اوپر حرام کردیا ہے کہ زمین انبیاء ؑ کے اجساد کو کھائے، زمین انبیاء ؑ کے اجساد کو کھانہیں

(۱) ابن ماجہ ص۱۱۸، باب ذکر وفاتہ ودفنہ کا آخر۔ مشکوٰۃ ۱/۱۲۱، باب الجمعہ، فصل ثالث۔
(۲) مسند ابی یعلیٰ ۶/۱۴۷ مسند انس، ثابت بنانی عن انس، رقم ۳۴۲۵۔ حیاۃ الانبیاء للبیہقی۔ مجمع الزوائد ۸/۲۱۱ باب ذکر الانبیاء۔ وغیرہ
(۳) مسلم ۲/۲۶۸، کتاب الفضائل، باب من فضائل موسیٰ علیہ السلام۔
(۴) ابوداؤد ۱/۱۵۰، باب تفریع ابواب الجمعۃ۔ ۱/۲۱۴، باب فی الاستغفار کا آخر۔ مشکوٰۃ ۱/۱۲۰، باب الجمعہ، فصل ثانی۔
(۵) ابن ماجہ ص۱۱۸، باب ذکر وفاتہ ودفنہ کا آخر۔ مشکوٰۃ ۱/۱۲۱، باب الجمعہ، فصل ثالث۔

سکتی، اجساد محفوظ ہیں، لیکن ان دونوں باتوں میں جوڑ کیا ہے؟ صحابہ ﷺ تو کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! ہمارا سلام وصلوٰۃ آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا؟ حالانکہ آپ بوسیدہ ہو چکے ہوں گے، حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ بوسیدہ نہیں ہوں گے بلکہ زمین کے اُوپر اَجسادِ انبیاء ﷺ کو حرام کر دیا گیا ہے، زمین ان کو کھا نہیں سکتی۔ جواب یہ ہونا چاہیے تھا، اِن موجودہ نام نہاد محققین کے نظریے کے مطابق، کہ صلوٰۃ وسلام بدن پہ تو پیش نہیں ہونا جو تمہیں اِشکال ہو گیا، صلوٰۃ وسلام تو رُوح پر پیش ہوگا، رُوح تو زندہ ہی ہے، تو جواب یہ ہونا چاہیے تھا آج کل کے محققین کے مطابق، کہ جب اس کا تعلق رُوح کے ساتھ ہی ہے، بدن کے ساتھ تعلق ہی نہیں، اور صحابہ کرام ﷺ کو اشکال یہ پیش آیا تھا کہ مرنے کے بعد جس طرح سے عام اموات بظاہر دیکھنے میں ایسے ہی ہے کہ ہڈیاں بوسیدہ ہوجاتی ہیں، گوشت گل سڑ جاتا ہے، ریزہ ریزہ ہوجاتا ہے، مٹی ہوجاتے ہیں، تو صلوٰۃ وسلام کیسے پیش کیا جائے گا؟ صحابہ ﷺ کو اِشکال تبھی ہوا کہ وہ یہ سمجھے تھے کہ انبیاء ﷺ کو صلوٰۃ وسلام جو پیش کیا جاتا ہے تو رُوح مع الجسد پر کیا جاتا ہے، حضور ﷺ کی مراد یہ ہے، اس پر اِشکال ہوا کہ آپ پر کیسے پیش کیا جائے گا؟ آپ تو بوسیدہ ہوگئے ہوں گے، تو جواب میں ان کا شبہ زائل کر دینا چاہیے تھا آج کل کی تحقیق کے مطابق، کہ بھئی! تمہیں یہ شبہ کیوں ہوا؟ کہ بدن محفوظ نہیں ہوں گے، بوسیدہ ہوگئے ہوں گے، صلوٰۃ وسلام کا تعلق تو رُوح سے ہے، رُوح تو بوسیدہ نہیں ہوگی، آج کل کے محققین کے مطابق یہی جواب ہونا چاہیے تھا، لیکن حضور ﷺ نے یہ جواب نہیں دیا کہ تمہاری صلوٰۃ وسلام کا تعلق تو میری رُوح سے ہے اور رُوح کے بوسیدہ ہونے کا سوال ہی نہیں، بلکہ جواب یہ دیا کہ انبیاء ﷺ کے اَجساد محفوظ ہوتے ہیں اور زمین اُن کو کھا نہیں سکتی، تو معلوم ہوگیا کہ صلوٰۃ وسلام جو حضور ﷺ کے اوپر پیش کیا جاتا ہے تو اس پیشی میں اِس جسد کا بھی دخل ہے، جسد کی محفوظیت کا بھی دخل ہے، اس لیے رُوح مع الجسد انبیاء ﷺ قبور میں موجود ہیں، اور صلوٰۃ وسلام کو اسی جسد کے ساتھ سنتے ہیں جس طرح سے اس زندگی کے اندر سنتے تھے، اس روایت کا مطلب یہ ہوا۔

''برزخ'' کی کیفیات کس طرح معلوم ہوسکتی ہیں؟

باقی برزخ کے حالات چونکہ ہم آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے، وہ جہان دوسرا ہے، تو اگر آپ دیکھیں، اور دیکھنے کے بعد کوئی آپ کو بے حس پڑا ہوا معلوم ہو تو اس میں کوئی اشکال نہیں ہونا چاہیے، جہان بدلا ہوا ہے، اُن کی صحیح کیفیات یا وحی کے ذریعے سے معلوم ہوں گی کہ سرورِ کائنات ﷺ واضح فرمائیں گے، یا اللہ تعالیٰ اگر کسی کو کشفِ صحیح دے دے اور فراستِ صحیحہ دے دے تو اس کے ساتھ بھی برزخ کے احوال معلوم ہوجاتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ جن اولیاء اللہ کو کشف حاصل ہے ان کے نزدیک روضۂ اقدس میں سرورِ کائنات ﷺ کی زندگی اجلی بدیہیات میں سے ہے، ان کو اس میں کوئی کسی قسم کا اشکال نہیں۔ اور ہماری چونکہ وہ باطنی آنکھیں نہیں ہیں جن کے ساتھ برزخ کے حالات معلوم ہوتے ہیں، اس لیے اگر ہمیں وہاں کوئی چیز معلوم نہ ہو تو اس میں قصور ہمارا

ہے، یہ بات واقعے کے خلاف نہیں ہے۔ چمگادڑ اگر دِن کو سورج نہ دیکھے تو اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ سورج موجود نہیں ہے، بلکہ اس کی اپنی آنکھوں میں صلاحیت ہی نہیں کہ وہ دیکھ سکے، تو اتنی کثرت کے ساتھ اولیاء اللہ اپنے کشف کو ذِکر کرتے ہیں اور انبیاء ﷺ کی قبور پر جاتے ہیں، اُن کو انبیاء ﷺ کی زندگی کا احساس ہوتا ہے کہ جن کو ہم جھوٹے نہیں کہہ سکتے۔ اس لیے عقیدہ یہی ہے۔ عام اموات کی حیات کے بھی ہم قائل ہیں قبور میں، لیکن اس کمزور اور ضعیف درجے میں کہ جس کے ساتھ اُن کو دُکھ کا، درد کا، خوشی کا، راحت کا احساس ہوتا ہے، اور انہیں جا کر سلام کہا جائے تو وہ بھی سنتے ہیں، باقی! کیفیت پر ہم بحث نہیں کر سکتے، یہ عالمِ آخرت کی بات ہے، کشف کے ساتھ معلوم ہو سکتی ہے، ہم مشاہدہ نہیں کروا سکتے۔

''عالمِ برزخ'' کو ''عالمِ دُنیا'' پر قیاس نہیں کیا جاسکتا

لٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ: شعور کا مطلب ہی یہی ہے کہ تم اپنے حواس کے ساتھ اس چیز کو معلوم نہیں کر سکتے، یہ بھی اگر معلوم ہو سکتی ہے تو قوتِ کشفی کے ساتھ ہی معلوم ہو سکتی ہے، یا اتنی بات ہم نقل کر سکتے ہیں جتنی احادیث کے اندر آ گئی، یہ کوئی ضابطہ کلی کے تحت ہم بیان نہیں کر سکتے، کہ ایسا ہوتا ہے، یہ ہوتا ہے، اور نہ اس کا مشاہدہ کیا جاسکتا ہے۔ اور یوں کہنا کہ دیکھو جی! ہزاروں مَن مٹی کے نیچے آ گئے، اور اب تو قبر کے اُوپر دیواریں بنی ہوئی ہیں، پردے چڑھے ہوئے ہیں، قبر بھی نظر نہیں آتی، اگر وہاں کسی زندہ کو بٹھا دیا جائے تو باہر کی آواز وہاں نہیں جاتی، تو جو وفات پا گئے ہیں وہ کس طرح سے سنتے ہیں؟ یہ گمراہی کی بنیاد ہے کہ آخرت کے مسائل کو ظاہر کے اوپر قیاس کر کے حل کیا جائے، آخرت کے مسائل کو ظاہر کے اوپر قیاس کر کے حل نہیں کیا جاسکتا، وہ عالم دوسرا ہے، اس عالم میں کیا کیفیات ہوا کرتی ہیں وہ اس دُنیا پر ہم قیاس کر کے نہیں بیان کر سکتے۔

تو اجمالی سی بات اس میں یہی ہے کہ ان آیات کے ساتھ استدلال نہیں کیا جاسکتا، نہ یہ آیات اس بات پر دلالت ہی کرتی ہیں کہ حضور ﷺ مر گئے، ان آیات کا تو مطلب ہے کہ پیش گوئی کی جارہی ہے کہ موت آئے گی یا موت آسکتی ہے، موت بعید نہیں۔

قرآن سے وقوعِ موت پر اِستدلال تحریف ہے

اَفَاۡىِٕنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ (سورۂ آل عمران: ۱۴۴) کیا اگر آپ ﷺ کو موت آ گئی یا قتل کر دیے گئے، اگر ایسا ہو گیا تو کیا تم پھر ایڑیوں پر پھر جاؤ گے؟ اس آیت کا بھی یہ معنی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ قرآنِ کریم نے خبر دے دی، کہ آپ ﷺ مر گئے، یہ استدلال سرے سے بے موقع ہے، یہاں سے اگر استدلال کیا جاسکتا ہے تو امکانِ موت کا کیا جاسکتا ہے، اور موت کے استبعاد کو دفع کرنے کے لئے کیا جاسکتا ہے، جیسے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے خطبے میں یہی آیات پڑھی تھیں، تو یہی مقصد تھا کہ بتادیا

جائے کہ نبی کو موت آنا کوئی مستبعد نہیں ہے، نبی کو موت آسکتی ہے، اس لیے یوں نہ سمجھو کہ یہ نبی وفات کیسے پا گیا؟ یہ آیت اس بات پر دلالت نہیں کرتی کہ حضور ﷺ پر موت آ گئی۔ کیوں؟ میں پوچھتا ہوں کہ یہ آیت اُتری کس پر ہے؟ (حضور ﷺ پر) آپ ﷺ کی زندگی میں اُتری ہے یا وفات کے بعد؟ (زندگی میں)۔ تو پھر اس کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ آپ ﷺ کو موت آ گئی؟ جو آیت حضور ﷺ کی زندگی میں اُتر رہی ہے اور آپ ﷺ پر اُتر رہی ہے، تو کیا اس کا مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ حضور ﷺ کو موت آ گئی؟ (نہیں)۔ قرآنِ کریم کی تو ایک ایک آیت حضور ﷺ کی حیات کی دلیل ہے۔ ہاں آپ کی وفات ہو چکی ہوتی، بعد میں یہ آیت اُترتی، اور صحابہ ﷺ اس کو ضمیمے کے طور پر ساتھ ملا دیتے، پھر آپ کہہ سکتے تھے کہ قرآنِ کریم نے خبر دے دی کہ آپ ﷺ کو موت آ گئی۔ تو جو آیت اُتری آپ ﷺ کی زندگی میں ہے اور اُتری آپ ﷺ پر ہے تو اس آیت کا یہ مطلب کیسے ہو گیا کہ آپ ﷺ کو موت آ گئی؟ جیسے کہتے ہیں کہ انجیل کے محرف ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے، کہ اس میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی سُولی کا اور موت کا قصہ نقل کیا ہوا ہے، اگر یہ اِنجیل حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اُتری تھی تو اُن کی وفات کا قصہ اس میں کیسے آ گیا؟ میں نے ایک کتاب لکھی ہو اور میری موت کا واقعہ اس میں آ گیا ہو تو کوئی عقل منداس کو مانے گا؟ اگر وہ کتاب میری لکھی ہوئی ہے تو میری موت کا واقعہ اس میں کیسے آ گیا؟ تو جو آیات اُتری حضور ﷺ پر ہیں، اور آپ کی زندگی میں اُتری ہیں، اور خاص طور پر مکی زندگی میں، تو کیا اسی وقت ہی خبر دیدی گئی تھی کہ حضور ﷺ کو موت آ گئی؟ اس لیے موت کو ثابت کرنے کے لئے ان آیات سے اِستدلال سرے سے تحریف ہے۔ ان سے زیادہ سے زیادہ اِستدلال کیا جا سکتا ہے تو یہ کیا جا سکتا ہے کہ انبیاء علیہم السلام پر موت آسکتی ہے، آپ ﷺ پر بھی آسکتی ہے، موت مستبعد نہیں، یوں نہ سمجھو کہ نبی کو موت نہیں آیا کرتی، آخر ایک دِن آپ ﷺ نے بھی مرنا ہے، آپ ﷺ پر بھی موت آئے گی، تو اس کو پیش گوئی پر محمول کر سکتے ہیں، اِمکان پر محمول کر سکتے ہیں کہ یہاں سے موت کا اِمکان ثابت ہوتا ہے، عدم استبعاد پر محمول کر سکتے ہیں کہ موت کوئی بعید نہیں ہے، لیکن قرآنِ کریم کی کسی آیت سے یہ ثابت کرنا کہ موت آ گئی، یہ بالکل خلافِ واقع بات ہے، قرآنِ کریم کی جتنی آیات ہیں سب حضور ﷺ کی زندگی میں اُتری ہیں، اس لیے ایک ایک آیت حضور ﷺ کی حیات کی دلیل ہے، کسی آیت سے موت ثابت نہیں کی جا سکتی، ہاں! یہ معلوم ہوا کہ نبی پہ موت آتی ہے، آسکتی ہے، آپ ﷺ پر بھی آسکتی ہے، کوئی بعید نہیں، اس لیے اگر نبی پر موت آ جائے تو تم اس کو بعید نہ سمجھنا، اور یوں نہ کہنے لگ جانا کہ نبی مر گیا تو اب ہم بھی اس دِین کو چھوڑتے ہیں، ان آیات کا یہ مفہوم ہے، باقی! واقع کے لحاظ سے حضور ﷺ کو موت آ گئی، یہ کہاں سے ثابت ہوا؟ روایاتِ حدیث سے، کہ واقعی آپ ﷺ کو موت آئی، اور موت کے اَحکام آپ ﷺ پر لگے، آپ ﷺ کو غسل دیا گیا، آپ ﷺ کو دفن کیا گیا، جس طرح سے موت کے اَحکام ہیں، یہ چیزیں سرے سے مختلف فیہ ہی نہیں ہیں، مختلف فیہ بات ہے تو یہ ہے کہ وفات کے بعد دفن ہو جانے کے بعد، عالمِ برزخ میں منتقل ہونے کے بعد، اب آپ ﷺ کی

کیا کیفیت ہے؟ اس کے بارے میں قرآن کریم کی کوئی آیت یا حدیث لاؤ، جس سے پتا چلے کہ حضور ﷺ کی قبر میں حالت یہ ہے، جبکہ حضور ﷺ نے خود بتایا کہ اللہ کا نبی قبر میں زندہ ہوتا ہے، اللہ کے نبی قبر میں زندہ ہوتے ہیں نماز بھی پڑھتے ہیں ... بھی اس قسم کی صفتیں بیان کی گئیں۔

بدن کی حیات کے لئے رُوح کا بدن میں ہونا ضروری نہیں

باقی! قبر میں زندگی کے لئے رُوح کا قبر میں ہونا ضروری نہیں، رُوح قبر میں ہو تو کوئی حرج نہیں، عالمِ بالا میں ہو تو کوئی حرج نہیں، جہاں بھی ہوگی اس کا تعلق اس جسد کے ساتھ رہے گا اور وہ زندہ بھی ہوگا، رُوح کا وہاں مقید ہونا ضروری نہیں ہے، جس طرح سے نیند کی حالت میں ہماری رُوح نکل جاتی ہے لیکن نکلنے کے باوجود اتنا تعلق قائم رہتا ہے کہ ہمارے بدن میں زندگی ہوتی ہے، خود قرآنِ کریم میں صراحتاً آئے گا کہ نیند کے وقت میں اللہ تعالیٰ رُوحوں کو قبض کرتا ہے،[1] تو اسی طرح سے روح کسی جگہ ہو اور اس کا تعلق بدن کے ساتھ قائم ہو اور بدن زندہ ہو، تو اس میں کوئی اِشکال نہیں۔ لہٰذا ایسی روایات جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ارواح علّیّین میں ہوتی ہیں، جنّت میں ہوتی ہیں، چلتی پھرتی ہیں، یہ بھی حضور ﷺ کی برزخ میں جسدی زندگی کے خلاف نہیں ہے، کیونکہ جسدی زندگی کے لئے رُوح کا جسد کے اندر ہونا ضروری نہیں، بلکہ تعلق بھی کافی ہے، اس قسم کا تعلق جو کہ حیات کا اثر پیدا کرے۔ جیسے نیند کی حالت میں قرآنِ کریم کہتا ہے کہ رُوح قبض کی جاتی ہے، لیکن قبض ہونے کے باوجود سونے والے کے ساتھ اتنا سا تعلق بحال رہتا ہے کہ اس کو زندگی حاصل ہے، اگرچہ اس کے ظاہری حواس معطل ہیں لیکن اتنا تعلق تو معلوم ہوگیا کہ رُوح کے قبض ہونے کے باوجود اتنا تعلق ہوتا ہے جس سے زندگی باقی رہتی ہے، تو اس سے یہ دلیل ملتی ہے کہ زندگی باقی رہنے کے لئے رُوح کا بدن میں ہونا ضروری نہیں، رُوح باہر ہو اور بدن کے ساتھ اللہ تعالیٰ اس کا تعلق قائم کردیں، جس طرح سے سورج کہیں ہے لیکن اس کا تعلق زمین سے ہے کہ یہاں روشنی اور گرمی حاصل ہے، اسی طرح سے رُوح جہاں بھی ہو اس کا بدن کے ساتھ اس طرح سے تعلق ہو کہ بدن کے اندر حیات کے آثار ہوں یہ بات کوئی بعید نہیں، ایسا ہوسکتا ہے۔

اِنَّكَ مَيِّتٌ وَّاِنَّهُمْ مَّيِّتُوْنَ: بے شک تُو بھی مرنے والا ہے، اور بے شک یہ بھی مرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ موت سب کو آئے گی، پھر اللہ کے سامنے پیشی سب کی ہوگی، وہاں تمہارے جھگڑوں کے فیصلے کردیے جائیں گے۔

---

(۱) اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا (پارہ ۲۴ سورۃ زُمر، آیت ۴۲)

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ وَكَذَّبَ بِالصِّدْقِ اِذْ جَآءَهٗ ؕ اَلَيْسَ فِيْ

پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ بولے اور سچائی کو جھٹلائے جب وہ سچائی اس کے پاس آجائے، کیا کافروں کا

جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖۤ اُولٰٓئِكَ هُمُ

ٹھکانا جہنم میں نہیں؟ ﴿۳۲﴾ اور جو سچائی کو لایا اور جس شخص نے سچائی کی تصدیق کی، یہی لوگ ہیں

الْمُتَّقُوْنَ ﴿۳۳﴾ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۴﴾

(جہنم سے) بچنے والے ﴿۳۳﴾ ان کے لئے وہ چیز ہوگی ان کے رَبّ کے پاس جو وہ چاہیں گے، محسنین کا بدلہ یہی ہے ﴿۳۴﴾

لِيُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ عَمِلُوْا وَيَجْزِيَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِيْ كَانُوْا

تاکہ دُور ہٹادے اللہ ان سے ان کے وہ بدترین اعمال جو انہوں نے کیے، اور دے ان کو ان کا اُجر ان بہترین اعمال کے بدلے جو یہ

يَعْمَلُوْنَ ﴿۳۵﴾ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَيُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖ ؕ وَ

کیا کرتے تھے ﴿۳۵﴾ کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟ اور ڈراتے ہیں یہ آپ کو ان سے جو اللہ کے علاوہ ہیں، اور

مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ ﴿۳۶﴾ وَمَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ مُّضِلٍّ ؕ اَلَيْسَ

جس کو اللہ بھٹکادے اس کو کوئی سیدھے راستے پر لانے والا نہیں ﴿۳۶﴾ اور جس کو اللہ راہِ راست پر لے آئے اُس کو کوئی بھٹکانے والا نہیں، کیا

اللّٰهُ بِعَزِيْزٍ ذِي انْتِقَامٍ ﴿۳۷﴾ وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

اللہ زبردست نہیں؟ انتقام لینے والا نہیں؟ ﴿۳۷﴾ اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کس نے کیا

لَيَقُوْلُنَّ اللّٰهُ ؕ قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ

البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے، آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ، اگر اللہ میرے متعلق ارادہ کرلے کسی تکلیف کا،

هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖۤ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ ؕ قُلْ

کیا وہ دُور ہٹانے والے ہیں اس اللہ کی بھیجی ہوئی تکلیف کو؟ یا ارادہ کرلے اللہ میرے متعلق کسی رحمت کا، کیا وہ اللہ کی رحمت کو روکنے والے ہیں؟ آپ کہہ

حَسْبِيَ اللّٰهُ ؕ عَلَيْهِ يَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ﴿۳۸﴾ قُلْ يٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ اِنِّيْ

دیجئے میرے لئے اللہ کافی ہے، بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے ﴿۳۸﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اے میری قوم! عمل کرو تم اپنی حالت پر، میں

عَامِلٌ ۚ فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ مَنْ يَّاْتِيْهِ عَذَابٌ يُّخْزِيْهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ

(اپنی جگہ پر) کام کرنے والا ہوں، پس عنقریب تم جان لوگے ﴿۳۹﴾ کہ کون ہے جس کے پاس آتا ہے عذاب جو اس کو رُسوا کردے گا اور اُتر پڑے

مُّقِيْمٌ ﴿۴۰﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ ۚ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ ۚ

اس پر ٹھہر جانے والا عذاب ﴿۴۰﴾ بے شک ہم نے اُتاری آپ پر کتاب لوگوں کے لئے حق کے ساتھ، جو کوئی ہدایت حاصل کرے گا تو اپنے فائدے کے لئے کرے گا

وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۴۱﴾

اور جو کوئی بھٹک جائے گا تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کی گمراہی کا وبال اُسی پہ پڑے گا، آپ ان کے اُوپر مسلط کئے ہوئے نہیں ہیں ﴿۴۱﴾

تفسیر

سب سے بڑا ظالم کون؟ اور اس کا انجام

فَمَنْ اَظْلَمُ: پھر کون بڑا ظالم ہے اس شخص سے جو اللہ پر جھوٹ بولے اور صدق کو جھٹلائے جب وہ صدق اس کے پاس آجائے، کیا جہنّم میں کافروں کا ٹھکانا نہیں؟ یعنی ہے۔ یہ اِستفہام تقریری ہے۔ یعنی جس وقت اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے اس وقت پھر یہ صورت سامنے آئے گی کہ جس نے اللہ پر جھوٹ بولا یا سچائی کو جھٹلایا اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہوگا، اس کو وہ سزا ہوگی جو سب سے بڑے ظالم کے لیے ہوتی ہے۔ كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ: اللہ پر جھوٹ بولا، جس طرح سے مشرکین جھوٹ بولتے ہیں کہ اللہ نے فلاں کو بیٹا بنایا، اللہ نے فلاں کو اپنے کام میں شریک کرلیا، فلاں اللہ کا شفیع ہے، یہ سب کذب علی اللہ ہے، پچھلے اسباق میں ایک جگہ آپ کے سامنے آیا تھا کہ مشرک جھوٹا بھی ہوتا ہے ناشکرا بھی ہوتا ہے (سورۂ زُمر: ۳) تو كَذَبَ عَلَى اللّٰهِ یہ سب مشرکوں پہ صادق آئے گا جو اللہ پہ جھوٹ بولتے ہیں اور سچائی کو جھٹلاتے ہیں، اِذْ جَآءَهٗ: جب وہ صدق ان کے سامنے آگیا تو اس کو جھٹلاتے ہیں، یعنی اگر کوئی صدق سچی بات حقیقی بات مخفی ہو اور کوئی شخص اس کو نہ جان سکے، تو کسی درجے میں عذر بھی ہے، لیکن انبیاء ﷺ جس وقت آجاتے ہیں اور سچی باتیں لوگوں کے سامنے بیان کردیتے ہیں پھر تو حال یہ ہوتا ہے کہ سچائی سامنے آکر کھڑی ہوگئی، اور ایسے وقت بھی اگر کوئی شخص اُس کو جھٹلاتا ہے تو یہ تو دوپہر کے وقت سورج کی تکذیب والی بات ہے، تو یہ شخص اللہ کے ہاں پھر معذور نہیں ہوتا، تو اِذْ جَآءَهٗ کے اندر یہی بات آگئی کہ سچائی کو جھٹلایا ایسے وقت میں جب سچائی اس کے سامنے آگئی، یعنی نبی کی وضاحت کے ساتھ اور نبی کے بیان کرنے کے ساتھ۔ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْكٰفِرِيْنَ: تو کافرین کا مصداق یہی لوگ ہوئے جو اللہ پر جھوٹ بولتے ہیں اور سچی باتوں کو جھٹلاتے ہیں، انبیاء ﷺ کی بات کی تصدیق نہیں کرتے، صدق کا مصداق یہاں وہی باتیں ہیں جو حضور ﷺ نے بیان کیں، چاہے کلام اللہ کی شکل میں، چاہے اپنی جانب سے کلام اللہ کی تشریح کے طور پر، اس لیے قرآن اور حدیث یہ دونوں ہی صدق

کا مصداق ہیں، تو ان کافروں کا ٹھکانا جہنّم میں نہیں؟ یعنی ضرور ہے، ایسے کافر جہنّم میں ہی جانے چاہئیں، جہنّم میں ہی جانے کے لائق ہیں، ان کا کوئی دوسرا ٹھکانا نہیں۔

حق کی تصدیق کرنے والوں کا انجام

وَالَّذِیْ جَآءَ بِالصِّدْقِ: اور جو صدق کو لایا، اس کا مصداق نبی ہو گیا، وَصَدَّقَ بِهٖۤ: اور جس شخص نے صدق کی تصدیق کی، اس سے عام مؤمنین مراد ہو گئے، اُولٰٓىٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ: یہی لوگ ہیں اللہ کے عذاب سے بچنے والے، جہنّم سے بچنے والے، یہی لوگ متقی ہیں، یہی لوگ جہنّم سے بچنے والے ہیں۔ متقون اتقاء سے ہے بچنا، پیچھے چونکہ کافروں کے لئے جہنّم کو ٹھکانا قرار دیا گیا تھا تو یہاں متقون کا مفہوم ہو جائے گا جہنّم سے بچنے والے لَهُمْ مَّا یَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ: یہ بہت بڑا اعزاز ہے اور بہت بڑی کامیابی ہے، کہ اُن کے لیے وہ چیز ہو گی ان کے رَبّ کے پاس جو وہ چاہیں گے، اپنے رَبّ کے پاس وہ جائیں گے تو ان کو وہ چیز ملے گی جو وہ چاہیں گے، ان کی ہر خواہش پوری کی جائے گی۔ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِیْنَ: محسنین کا بدلہ یہی ہے، تو یہ لوگ محسنین ہوئے جو سچائی لاتے ہیں اور سچائی کی تصدیق کرتے ہیں، یہی جہنّم کے عذاب سے بچیں گے، آخرت میں انہی کی ہر خواہش پوری کی جائے گی، اور محسنین کے لئے بدلہ یہی ہوتا ہے، لِیُكَفِّرَ اللّٰهُ عَنْهُمْ: تاکہ دُور ہٹا دے اللہ تعالیٰ ان سے، اَسْوَاَ الَّذِیْ عَمِلُوْا: جو کچھ انہوں نے کیا اس میں سے بدتر چیز کو، ان کے بُرے اعمال کو اللہ تعالیٰ ان سے دُور کر دے، یعنی ان کے گناہ معاف کر دے، ان کی غلطیاں ہٹا دے، وَیَجْزِیَهُمْ اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ الَّذِیْ كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ: اور دے ان کو ان کا اجر ان بہترین اعمال کے بدلے جو یہ کیا کرتے تھے، ان کے اچھے اعمال کا ان کو بدلہ دے، اور ان کے بُرے اعمال ان سے دُور ہٹا دے، آخرت کو سامنے لانے کا ایک مقصد یہ بھی ہے۔ لِیُكَفِّرَ اللّٰهُ: تاکہ دُور ہٹا دے اللہ تعالیٰ اِن سے اِن کے وہ بدترین اعمال جو انہوں نے کیے، اور دے ان کو اجر ان بہترین اعمال کا جو یہ کیا کرتے تھے۔

شانِ نزول

اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ ؕ وَ یُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ: ان آیات کے شانِ نزول میں نقل کیا ہے کہ مشرکین سرورِ کائنات ﷺ کو ڈرایا کرتے تھے، کہ آپ ہمارے معبودوں کی مخالفت نہ کیجئے، ورنہ یہ آپ کو کسی مصیبت میں مبتلا کر دیں گے (مظہری)، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَلَیْسَ اللّٰهُ بِكَافٍ عَبْدَهٗ: کیا اللہ اپنے بندے کے لئے کافی نہیں؟ یعنی کافی ہے، اللہ کے بندے کو اللہ کافی ہے، وَ یُخَوِّفُوْنَكَ بِالَّذِیْنَ مِنْ دُوْنِهٖ: اور ڈراتے ہیں یہ آپ کو ان سے جو اللہ کے علاوہ ہیں، اللہ کے علاوہ دوسرے آلہہ، چاہے وہ اُن کے خیال کے مطابق فرشتے ہیں، جنّات ہیں، کوئی بھی ہیں، ان سے یہ ڈراتے ہیں، ''ڈراتے ہیں آپ کو ان چیزوں سے جو اللہ کے علاوہ ہیں'' وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ: جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اس کو کوئی سیدھے راستے پر لانے والا نہیں، یعنی اللہ پر اعتماد نہ کرنا، اللہ کو کافی نہ سمجھنا، دوسروں کا خوف و خطرہ محسوس کرنا، یہ تو ایک ضلالت ہے جس کے اندر یہ لوگ مبتلا ہیں، اور جو

اس قسم کی غلطیوں میں پڑ جاتے ہیں، اللہ ان کو راستے سے بھٹکا دیتا ہے، تو کوئی اُن کو سیدھے راستہ پر لانے والا نہیں، اس میں مشرکین کی ضلالت کو واضح کر دیا۔

موحد کی شان

تو اس آیت میں یہ بتا دیا گیا کہ جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور موحد ہے، تو اس کو چاہیے کہ وہ اللہ کو ہی کافی سمجھے، اگر غیر اللہ سے کوئی ڈراتا ہے چاہے کسی مقصد کے تحت، اللہ کی نافرمانی کروانے کے لیے کوئی غیر اللہ کا خوف دلاتا ہے، تو غیر اللہ سے ڈرنا نہیں چاہیے، توحید کی شان یہی ہے، اور موحد کی شان یہی ہے کہ غیر اللہ کا خوف اپنے دِل میں نہ رکھے، بلکہ ہر معاملے میں زندگی کی ہر منزل میں اللہ کو اپنے لیے کافی سمجھے، کیونکہ اللہ کی مشیت کے بغیر کوئی چیز واقع نہیں ہو سکتی اور کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، جیسے آگے صراحت کی جارہی ہے، اَلَیْسَ اللّٰہُ بِعَزِیْزٍ ذِی انْتِقَامٍ: کیا اللہ تعالیٰ زبردست نہیں؟ انتقام لینے والا نہیں؟ یعنی ہے۔ تو جب اللہ عزیز بھی ہے اور انتقام لینے والا بھی ہے تو اس میں اس کی قدرت آگئی، غالب ہے بدلہ لینے والا ہے، طاقتور ہے کوئی اس سے چھوٹ نہیں سکتا، انتقام لینے والا ہے کہ اپنے مخالفین سے، اپنے انبیاء ﷺ کی تکذیب کرنے والے سے وہ انتقام بھی لے گا۔

شرک کی حقیقت

وَلَىِٕنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: اگر آپ ان سے سوال کریں کہ آسمانوں کو پیدا کس نے کیا، اور زمین کو پیدا کس نے کیا؟ البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے۔ خالق تو اسی کو مانتے ہیں لیکن پھر شرک کہاں سے آگیا؟ خالق ماننے کے بعد اس کائنات کے اندر متصرف صرف اسی کو نہیں مانتے، بلکہ متصرف اوروں کو بھی مانتے ہیں، مشرکین کا شرک یہیں سے آیا، ورنہ وہ خالق کسی دوسرے کو نہیں مانتے تھے، وہ کہتے تھے کہ زمین اور آسمان کو پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے، لیکن پیدا کرنے کے بعد اس کا نظام سنبھالنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ دوسروں کو بھی شریک کر لیا ہے، یہ تھی بنیادی غلطی جو مشرکین کو لگتی ہے، اور قرآنِ کریم بار بار واضح کرتا ہے کہ جیسے خالق وہ ہے، مالک بھی وہ ہے، متصرف بھی ہے، بادشاہ بھی ہے، اور اُس کا کوئی شریک کار نہیں، ذرّے ذرّے کے اُوپر قبضہ اُسی کا ہے، اور ہر چیز کے متعلق علم اسی کا ہے، یہ عقیدہ اگر اپنے قلب کے اندر اُتار لیا جائے تو تب صحیح طور پر توحید سمجھ میں آتی ہے، اور اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ واقعی پیدا کرنے والا تو اللہ ہے اور حقیقی مالک بھی وہ ہے، لیکن اس نے اپنے ساتھ معاون دُوسروں کو بنا رکھا ہے، اور اُن کو کچھ اختیارات دے رکھے ہیں، اور وہ شعبے انہی سے متعلق ہیں، ہمیں کسی شعبے میں ضرورت ہو تو درخواست انہی کے پاس دی جائے، جس طرح سے دُنیوی حکومت ہوا کرتی ہے، یہیں سے پھر شرک آتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ پیدا کرنے والا بھی وہی، تو آگے بتانا یہ مقصود ہے کہ ہر کسی کا تصرف بھی اسی کے قبضے میں ہے، جس پہ چاہے وہ رحم کرے، جس کو چاہے وہ سزا دے، کوئی روکنے والا نہیں، ہر قسم کا تصرف اسی کا ہے۔

نفع نقصان کا مالک صرف اللہ ہے

قُلْ اَفَرَءَيْتُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ بتلاؤ تم، مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ، اِنْ اَرَادَنِيَ اللّٰهُ بِضُرٍّ: اگر اللہ تعالیٰ میرے متعلق ارادہ کرلے کسی تکلیف کا، هَلْ هُنَّ كٰشِفٰتُ ضُرِّهٖٓ: کیا وہ اللہ کی بھیجی ہوئی تقدیر کو دُور ہٹانے پر قادر ہیں؟ کیا وہ دُور ہٹانے والے ہیں اس اللہ کی بھیجی ہوئی تکلیف کو؟ اَوْ اَرَادَنِيْ بِرَحْمَةٍ: یا ارادہ کرلے اللہ تعالیٰ میرے متعلق کسی رحمت کا، هَلْ هُنَّ مُمْسِكٰتُ رَحْمَتِهٖ: کیا وہ اللہ کی رحمت کو روکنے والے ہیں؟ اس سوال میں ان کا یہی عجز ظاہر کیا ہے، کہ اگر اللہ تکلیف پہنچائے تو اللہ کی مشیت کے بغیر اس کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں، یہ اختیار اللہ نے کسی کو نہیں دیا کہ بیماری اللہ کی طرف سے آئے اور تم یہ سمجھو کہ فلاں کو پکارو تو بیماری دُور ہوجائے گی، فلاں کا چڑھاوا چڑھادو تو بیماری دُور ہوجائے گی، ایسی بات نہیں ہے، جیسے آج بھی مشرک قسم کا ذہن رکھنے والے لوگ قبور کے اُوپر چڑھاوے چڑھاتے ہیں، بزرگوں کی نذر و نیاز دیتے ہیں اسی خیال سے کہ اس سے تکلیف دفع ہوجائے گی، تو قرآنِ کریم اس آیت میں صراحت کرتا ہے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی تکلیف کو کوئی دُور کرنے والا نہیں، دُور بھی کرے گا تو صرف اللہ ہی کرے گا، یہ تصرف بھی اسی کا ہی ہے۔ اور ایسے ہی تم خطرے محسوس کرتے ہو کہ اللہ نے تو ہمیں اولاد دے دی، لیکن اگر فلاں خوش نہ ہوا تو اولاد مرجائے گی، اگر فلاں کا ہم نے چڑھاوا نہ چڑھایا تو اولاد کو نقصان ہوجائے گا، یہ بات بھی نہیں ہے، نہ تمہارے مال کو کوئی نقصان پہنچاسکتا ہے، نہ تمہاری اولاد کو کوئی نقصان پہنچاسکتا ہے، اللہ تم پر رحم کرے تو اس رحم کو کوئی روکنے والا نہیں، تو ہر قسم کا تصرف جتنا بھی ہے وہ سب اللہ کا ہے، کسی دوسرے کا اس میں دخل نہیں، یہ ذہن آجانے کے بعد پھر انسان اپنے آپ کو اللہ کا محتاج سمجھتا ہے، باقی ساری کائنات سے مستغنی ہوجاتا ہے، خوفِ ضرر اور نفع کا لالچ یہی دو چیزیں ہیں جو انسان کو دوسرے کے دروازے پر جھکاتی ہیں، اور قرآنِ کریم بانگ دُہل کہتا ہے کہ یہ دونوں شعبے اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں، نفع بھی اسی کے ہاتھ میں ہے نقصان بھی اسی کے ہاتھ میں ہے، جس وقت تک اس جذبے کو پختہ نہیں کیا جائے گا اور اس خیال کو اپنے قلب میں جمایا نہیں جائے گا تو صحیح طور پر توحید نہیں آتی، ہمارا شیخ یہی بات کہتا ہے، شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں:

موحد چہ در پائے ریزی زرش — چہ شمشیرِ ہندی نہی بر سرش
امید وہراسش نہ باشد زِکس — بریں است بنیادِ توحید وبس[1]

کہ موحد کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر اس کے سامنے تم سونے کے ڈھیر لگادو اس کو اس کے خیال سے بدلنے کے لئے، یا اس کے سر کے اُوپر تم ہندی تلوار لے کے کھڑے ہوجاؤ، اور اسے کہو کہ اپنے اس خیال کو تو چھوڑ دے، کہتے ہیں کہ اس کے لئے وہ دونوں باتیں برابر ہیں، سونے کا ڈھیر اور تلوار، دونوں چیزیں اس کے نزدیک برابر ہیں، اس کو نہ کسی سے خوف ہوتا ہے نہ کسی سے طمع ہوتی ہے، بریں است بنیادِ توحید وبس، توحید کی بنیاد اسی بات پہ ہے، کہ انسان مخلوق میں سے کسی سے نہ نفع کے حصول کی تمنا رکھے اور نہ

(۱) گلستان، باب ہشتم کا آخر۔ نوٹ: اگلے اشعار گلستان، باب اول، حکایت ۲۵ پر موجود ہیں۔

خوف ضرر، بلکہ ان دونوں کو براہِ راست اللہ کے ہاتھ میں سمجھے، تب جا کے انسان کا توحید کا عقیدہ صحیح ہوتا ہے۔ دوسری جگہ ''گلستاں'' میں فرماتے ہیں:

گر گزندت زِ خلق مرنج — کہ نہ راحت رسد زِ خلق نہ رنج

از خدا داں خلاف دشمن ودوست — کہ دلِ ہر دو در تصرف اوست

گرچہ تیر از کماں ہمی گذرد — از کماں دار بیند اہلِ خرد

بڑی پیاری بات کہی، کہ بسا اوقات مخلوق کی طرف سے تکلیف پہنچ جاتی ہے، اگر مخلوق کی طرف سے تمہیں کوئی تکلیف پہنچ جائے تو رنجیدہ نہ ہوا کرو، کہ مخلوق کی طرف سے نہ انسان کو راحت پہنچتی ہے نہ رنج، حقیقت کے اعتبار سے مخلوق کے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے، نہ راحت مخلوق کی طرف سے پہنچتی ہے، نہ رنج مخلوق کی طرف سے پہنچتا ہے، دشمن ودوست کے برخلاف راحت اور رنج کو اللہ کی طرف سے سمجھو، کیا مطلب؟ کہ دوست سے اگر راحت پہنچ گئی تو بھی سمجھو کہ اللہ نے پہنچائی، دشمن سے اگر تکلیف پہنچ گئی تو بھی سمجھو کہ اللہ نے پہنچائی، کیونکہ دونوں کے دل ہی اسی کے تصرف میں ہیں، ایک شخص کا دل تیری مخالفت میں پھیر دیا، وہ تیرے لیے باعثِ تکلیف بن گیا، اور ایک شخص کا دل تیری موافقت میں پھیر دیا، وہ تیرے لیے باعثِ راحت ہو گیا۔ بات سمجھ گئے؟ اللہ کی طرف سے سمجھو، دوست اور دشمن کی طرف سے نہیں، نہ تکلیف کو دشمن کی طرف سے سمجھو، نہ راحت کو دوست کی طرف سے سمجھو، اللہ کی طرف سے جانو، دلیل کیا؟ کہ دونوں کا دل اللہ کے تصرف میں ہے، ایک شخص کا دل تمہاری مخالفت میں پھیر دیا وہ تمہیں تکلیف پہنچانے کا ذریعہ بن گیا، اگر اللہ اس کا دل تمہاری مخالفت میں نہ پھیرتا تو یہ تکلیف نہ پہنچاتا، اور ایک شخص کا دل تمہاری موافقت میں پھیر دیا وہ تمہارے لیے باعثِ راحت ہو گیا، اگر اللہ کا تصرف یہ نہ ہوتا اور اس کے دل میں تیری محبت نہ آتی، یا اس کے دل کو تیری موافقت میں نہ پھیرا جاتا تو یہ تیرے لیے باعثِ راحت نہ بنتا۔ اس کی آگے مثال دے دی، کہتے ہیں کہ ایک آدمی تیر مارتا ہے، اور یہ تیر اگرچہ کمان میں سے نکل کے آیا ہے، لیکن جس کے جا کے لگتا ہے اس کو کمان پہ غصہ نہیں آیا کرتا ہے، کمان دار پہ غصہ آیا کرتا ہے جو کمان چلاتا ہے، عقل مند آدمی اس کو کمان چلانے والے کی طرف سے سمجھا کرتا ہے، کمان کی طرف سے نہیں سمجھا کرتا۔ تو مخلوق جو ہے وہ تو سمجھو کہ اللہ کی ایک قسم کی کمان ہے، اسی سے راحت نکل کے تم تک پہنچی تو بھی اللہ نے پہنچائی، اور اس سے تکلیف نکل کے تم تک پہنچی تو بھی اللہ نے پہنچائی، تو تم اپنا تعلق اس کے ساتھ سیدھا رکھو جس کے قبضے میں لوگوں کے دل ہیں، اگر اس کے ساتھ تمہارا تعلق ٹھیک ہو گیا تو مخلوق کے دل تمہاری محبت کی طرف پھیر دے گا، سب تجھے آنکھوں پہ بٹھائیں گے اور ہاتھوں پہ اُٹھائے پھریں گے، جس کی محبت اللہ تعالیٰ مخلوق کے دل میں ڈال دیتے ہیں تو مخلوق کس طرح سے پیچھے پیچھے اس کی گرد چاتی پھرتی ہے، اور اس کے راستے میں آنکھیں بچھاتے ہیں، ہاتھوں پہ اُٹھائے پھرتے ہیں۔ اور اگر اللہ تعالیٰ مخلوق کے دل میں کسی کا بغض ڈال دیتے ہیں تو جدھر جاتا ہے وہ تکلیف ہی اٹھاتا ہے، اس لیے راحت رنج جو کچھ ہے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کی مخلوق کی طرف نسبت نہیں، اللہ کسی پہ فضل فرمانا چاہے تو کوئی مخلوق ایسی نہیں جو اس فضل کو روک دے، جس طرح سے سورۂ یونس کے آخر میں

آ یا تھا اِنْ یُّرِدْكَ بِخَیْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهٖ، اور اگر اللہ تعالیٰ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو کسی کے بس میں نہیں ہے کہ اس مشکل کو دُور کر دے، اس لیے اپنا تعلق اللہ کے ساتھ سیدھا رکھو، جب یہ بات ہو گی تو تب جا کے صحیح توحید سمجھ میں آئے گی۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ نے خلق کو ذکر کر کے کہ زمین و آسمان کو پیدا کرنے والا وہی، تو آگے اپنے تصرف کو ذکر کیا کہ تصرف بھی پورے کا پورا اسی کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہے نقصان پہنچا دے جس کو چاہے نفع پہنچا دے، یہ اختیار اللہ تعالیٰ نے کسی دوسرے کو نہیں دیا، تو جب بات یہ ہے تو میں غیروں سے کیوں ڈروں؟ یہ آپ کو دوسروں سے ڈراتے ہیں تو ڈرنے کی کون سی بات ہے؟ سب کچھ فضل رحمت جو کچھ ہے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے، کوئی ضرورت نہیں کسی سے ڈرنے کی، اس لیے آپ صاف کہہ دیجئے، حَسْبِیَ اللّٰهُ: میرے لیے اللہ کافی ہے، مجھے اور کسی کی ضرورت نہیں، عَلَیْهِ یَتَوَكَّلُ الْمُتَوَكِّلُوْنَ: بھروسہ کرنے والوں کو اسی پر بھروسہ کرنا چاہیے، وہی اس قابل ہے کہ اس کے اوپر اعتماد کیا جائے اور اس کے اوپر بھروسہ کیا جائے، اس کے علاوہ کوئی اس قابل نہیں کہ اس کے اوپر توکل کیا جائے۔

عذاب دو قسم کے ہوتے ہیں

قُلْ یٰقَوْمِ اعْمَلُوْا عَلٰی مَكَانَتِكُمْ: یہ قطع منازعت ہوتی ہے، کہ جھگڑا ختم نہیں ہوتا تو آخری بات یوں کہہ دو۔ آپ کہہ دیجئے کہ اے میری قوم! عمل کرو تم اپنی حالت پر، اپنی جگہ پہ تم کام کرتے رہو، اِنِّیْ عَامِلٌ: میں اپنی جگہ پہ کام کرنے والا ہوں، فَسَوْفَ تَعْلَمُوْنَ: پس عنقریب تم جان لو گے، مَنْ یَّاْتِیْهِ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ: کون ہے وہ شخص کہ آتا ہے اس کے پاس عذاب جو اس کو رُسوا کر دے گا، وَیَحِلُّ عَلَیْهِ عَذَابٌ مُّقِیْمٌ: اور اُتر پڑے گا اس کے اوپر ٹھہر جانے والا عذاب، عذابِ مقیم: ٹھہر جانے والا عذاب، یعنی تم اگر نہیں مانتے تو تم اپنی حالت پر عمل کرتے رہو، میں اپنے حال پر عمل کرنے والا ہوں، تمہیں عنقریب پتا چل جائے گا، کہ رُسوا کرنے والا عذاب کس کے پاس آتا ہے؟ اور ایسا عذاب کس پہ اُترتا ہے جو وہاں ڈیرے ہی ڈال دے گا۔ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب اور تکلیفیں دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک ہیں جو بطور تنبیہ کے آتی ہیں، وہ تو ایک جھونکے کی طرح آئیں اور گزر گئیں، مؤمنین صالحین پر بھی آتی ہیں، دوسروں پر بھی آتی ہیں، جس میں کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مؤمنین کے لئے کفارۂ سیئات کا پہلو ہوتا ہے، یا کسی غلطی کے اوپر تنبیہ کرنی مقصود ہوتی ہے، اور کافروں کو بھی جھنجھوڑنا مقصود ہوتا ہے کہ ان کا تکبر ختم ہو جائے اور اللہ کے سامنے جھکیں۔ اور ایک عذاب وہ ہوا کرتا ہے جو رسوا کرنے کے لئے آتا ہے، وہ تو پھر جب آتا ہے تو ٹھہر ہی جاتا ہے، پھر وہ ہر طرح سے بیخ کنی کرتا ہے، جس وقت تک وہ کسی کو ختم نہیں کر دیتا، پھر وہ چلتا نہیں ہے۔ جیسے کہ انبیاء ﷺ کے مخالفین کے اُوپر عذاب آئے، جنہوں نے دُنیا میں اُن کو رسوا کیا اور پوری طرح سے برباد کر دیا، تمہیں پتا چل جائے گا کہ ایسا عذاب کس پہ آتا ہے۔ عَذَابٌ یُّخْزِیْهِ: ایسا عذاب جو اس کو رُسوا کر دے گا، اور اتر پڑے گا اس کے اوپر عذاب مقیم، ٹھہر جانے والا عذاب۔

حق واضح ہوگیا، جو چاہے اس کو اختیار کرلے

اِنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ لِلنَّاسِ بِالْحَقِّ: بے شک ہم نے اُتاری آپ پر کتاب لوگوں کے لئے حق کے ساتھ، جس میں اَمرِ واقعی کو واضح کردیا گیا، حق اور باطل کی کشمکش میں کتاب نے آ کے حق کو واضح کردیا۔ فَمَنِ اهْتَدٰى فَلِنَفْسِهٖ: جو کوئی ہدایت حاصل کرے گا تو اپنے فائدے کے لئے کرے گا، وَمَنْ ضَلَّ: اور جو کوئی بھٹک جائے گا، ضلالت میں جا پڑے گا، فَاِنَّمَا يَضِلُّ عَلَيْهَا: اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس کی گمراہی کا وبال اُسی پہ پڑے گا۔ علیٰ ضرر کے لئے ہوتا ہے، لام نفع کے لئے ہوتا ہے۔ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ: آپ ان کے اُوپر کوئی متعین کیے ہوئے نہیں ہیں، مسلط کیے ہوئے نہیں ہیں، کہ آپ کی ذمہ داری ہو کہ آپ نے زبردستی ان کو سیدھے راستے پہ چلانا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۚ فَيُمْسِكُ الَّتِيْ

اللہ قبض کرتا ہے نفسوں کو ان کی موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت نہیں آیا ان کو اللہ قبض کرتا ہے ان کی نیند میں، پھر روک لیتا ہے اللہ اُس کو

قَضٰى عَلَيْهَا الْمَوْتَ وَيُرْسِلُ الْاُخْرٰۤى اِلٰۤى اَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ

جس کے اُوپر اس نے موت طاری کردی، اور چھوڑ دیتا ہے دوسرے کو ایک وقت متعین تک، اس میں البتہ نشانیاں ہیں

لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۴۲ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ ؕ قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا

ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں ۝۴۲ کیا انہوں نے اللہ کے علاوہ کوئی شفعاء اختیار کر رکھے ہیں؟ آپ کہہ دیجئے کہ اگرچہ نہ وہ کوئی

يَمْلِكُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ ۝۴۳ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا ؕ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

اختیار رکھتے ہوں اور نہ وہ کوئی سمجھ ہی رکھتے ہوں ۝۴۳ آپ کہہ دیجئے کہ شفاعت ساری کا ساری اللہ ہی کے لئے ہے، اسی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی

وَالْاَرْضِ ؕ ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝۴۴ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ

اور زمین کی، پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے ۝۴۴ جس وقت اللہ وحدہٗ کو ذکر کیا جاتا ہے تو منقبض ہوجاتے ہیں دل

الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ۚ وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ اِذَا هُمْ

اُن لوگوں کے جو کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے، اور جب ذکر کیا جاتا ہے ان کا جو اللہ کے علاوہ ہیں اچانک وہ

يَسْتَبْشِرُوْنَ ﴿٤٥﴾ قُلِ اللّٰهُمَّ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ عٰلِمَ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ

خوش ہو جاتے ہیں ﴿۴۵﴾ آپ کہہ دیجئے اے اللہ! اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! اے غیب اور شہادت کے جاننے والے!

اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيْ مَا كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

تو فیصلہ کرے گا اپنے بندوں کے درمیان اس چیز میں جس میں کہ یہ اختلاف کرتے تھے ﴿۴۶﴾ اگر ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا

مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ، تو البتہ فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑانا چاہیں گے بُرے عذاب سے قیامت کے دن

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا وَ

اور ظاہر ہو جائے گی ان کے لئے اللہ کی جانب سے وہ چیز جس کا یہ گمان بھی نہیں کرتے تھے ﴿۴۷﴾ اور ان کے اعمال کی سزائیں ان کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی

حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿٤٨﴾ فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ؗ ثُمَّ اِذَا

اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس کا یہ استہزا کیا کرتے تھے ﴿۴۸﴾ پھر جس وقت انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے، پھر جس وقت

خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا ۙ قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ ؕ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ

ہم اپنی جانب سے کوئی نعمت دے دیتے ہیں تو کہتا ہے: سوائے اس کے نہیں کہ دیا گیا میں یہ خوش حالی اپنے علم کی بنا پر، بلکہ یہ نعمت ایک آزمائش ہے

وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٩﴾ قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا

لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ﴿۴۹﴾ تحقیق کہی تھی یہی بات ان لوگوں نے جو ان سے پہلے گزرے ہیں، جو کچھ وہ کرتے تھے وہ

كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿٥٠﴾ فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ؕ وَالَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْ هٰٓؤُلَآءِ

ان کے کچھ کام نہ آیا ﴿۵۰﴾ ان کے اعمال کی سزائیں ان کو پہنچ گئیں، اور جن لوگوں نے ظلم کیا ان لوگوں میں سے

سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا ۙ وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ﴿٥١﴾ اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ

عنقریب ان کو بھی ان کی بداعمالیوں کی سزا پہنچے گی اور یہ عاجز کرنے والے نہیں ہوں گے ﴿۵۱﴾ کیا ان کو علم نہیں بے شک اللہ تعالیٰ

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾

کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے، اس میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہتے ہیں ﴿۵۲﴾

تفسیر

قبضِ رُوح نینداور موت میں

اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الۡاَنۡفُسَ حِیۡنَ مَوۡتِہَا: اللہ قبض کرتا ہے، وصول کرتا ہے جانوں کواُن کی موت کے وقت، حِیۡنَ مَوۡتِہَا: ھا ضمیر انفس کی طرف راجع ہے۔ اللہ وفات دیتا ہے نفسوں کوان کی موت کے وقت، وَالَّتِیۡ لَمۡ تَمُتۡ: اور جس کی موت کا وقت نہیں آیا، جو نہیں مرے، جن پہ موت طاری نہیں ہوئی، فِیۡ مَنَامِہَا: توان کواللہ قبض کرتا ہےاُن کی نیند میں۔ ''اللہ تعالیٰ وفات دیتا ہے نفسوں کوان کی موت کے وقت اور جن کی موت نہیں آئی ان کووفات دیتا ہےان کی نیند میں، ان کی جانیں قبض کرلیتا ہےان کی نیند میں'' تو معلوم ہوگیا کہ موت کے وقت بھی قبضِ نفس، توفیِ نفس ہوتا ہےاور نیند کے وقت بھی، توقبضِ رُوح دونوں صورتوں میں ہوا، لیکن ایک میں قبضِ رُوح کامل ہوگیا کہ رُوح کا تعلق اس بدن سے توڑ دیا گیا، جس کی وجہ سے اس میں باطنی طور پر بھی حیات نہیں رہتی، اور ایک قبض ہوتا ہے اس طرح سے کہ حواس معطل ہوگئے، باقی! اتنا تعلق رہتا ہے کہ اندر کی مشین چلتی رہتی ہے، تو توفی کی دوقسمیں ہوئیں، موت کے وقت بھی اللہ تعالیٰ روح قبض کرتے ہیں، اور نیند کے وقت بھی روح قبض کرتے ہیں، فَیُمۡسِکُ الَّتِیۡ قَضٰی عَلَیۡہَا الۡمَوۡتَ: پھرروک رکھتا ہے اللہ تعالیٰ اُن کوجن کے اُوپر موت طاری کردیتا ہے، ان کی روح کو توروک رکھتا ہے یعنی اس طرح سے نہیں چھوڑتا جس طرح سے سونے والے کی رُوح کو چھوڑ کے دوبارہ اسی طرح سے زندہ کردیا جاتا ہےاور وہ زمین پر چلتا پھرتا ہے۔

اِحیائے موتیٰ کے واقعات آیتِ بالا کے خلاف نہیں

باقی! روک رکھنے کا یہ معنی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ روکنے کے بعد پھر چھوڑتا نہیں، معجزے کے طور پر جولوگ زندہ ہوئے، اللہ تعالیٰ نے ان کی موت کے وقت روح قبض کی، قبض کرنے کے بعد نبی کے معجزے کے طور پر رُوح چھوڑ بھی دی، انبیاء علیہم السلام کے معجزات اِحیائے موتیٰ کے آئے یا نہیں آئے؟ قرآنِ کریم کے اندر نصِ قطعی کے تحت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ ذکر کیا گیا اُحۡیِ الۡمَوۡتٰی بِاِذۡنِ اللّٰہِ (سورۂ آل عمران: ۴۹) اللہ کی اجازت کے ساتھ میں موتیٰ کو زندہ کرتا ہوں، توجس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کسی مردے کوزندہ کرتے تھے تو کیا اس کی رُوح واپس نہیں آتی تھی؟ اب یہ کہنا کہ جب اللہ نے روک لی تو دوبارہ وہ چھوڑتا ہی نہیں ہے، یہ بات ان معجزات کے خلاف ہے، تواس میں ایک عام عادت ذکر کرنی مقصود ہے کہ اللہ تعالیٰ روک لیتا ہے، عام عادت یہی ہے کہ پھر دوبارہ اس طرح سے نہیں چھوڑتا کہ انسان ویسے زندہ ہوجائے جس طرح سے سویا ہوا آدمی اُٹھ کر دوبارہ اپنی زندگی شروع کردیتا ہے، لیکن اگر کبھی خرقِ عادت کے طور پر، کسی نبی کے معجزے کے طور پر اللہ تعالیٰ مردے کو دوبارہ زندہ کرنا چاہے تو اللہ کو کون روکنے والا ہے؟ تو یہ ایک عام عادت کا ذکر ہے۔ تو یہاں چھوڑنے سے مراد ہے کہ ایسے طور پر نہیں چھوڑتا جس طرح سے سوئے ہوئے کی رُوح کو چھوڑ دیتا ہے کہ دوبارہ اسی طرح سے زندہ ہوکر اپنے سارے کے سارے کام کرنے لگ جائے، بلکہ جس کو موت آگئی اللہ اس کی رُوح کو روک لیتا ہے، اس طرح سے چھوڑتا نہیں، لیکن کبھی خرقِ عادت کے طور پر اگر چھوڑ دے تو یہ آیت اس کے منافی نہیں، یہ اس لئے کہہ

رہا ہوں کہ بعض لوگ احیائے موتی کا انکار کرتے ہوئے کہ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ سے کوئی مردہ زندہ نہیں ہوسکتا، جس طرح سے نیچری قسم کے لوگ ہیں، وہ اس آیت سے اِستدلال کرتے ہیں کہ قرآنِ کریم میں تو آ گیا کہ موت کے وقت جس کی رُوح قبض کرلیتا ہے پھر اللہ چھوڑتا ہی نہیں، تو پھر یہ کیسے کہا جائے کہ فلاں نبی کے معجزے کے طور پر مردہ زندہ ہوگیا تھا؟ تو اس میں ایک عام عادت کا ذِکر کرنا مقصود ہے، اور چھوڑنے سے مراد ایسے طور پر چھوڑنا ہے کہ جس طرح سے پہلے زندہ تھا، زمین کے اوپر چلتا پھرتا تھا کام کرتا تھا، ایسے طور پر اس کی رُوح کو چھوڑ دے، موت کے بعد یہ اللہ کی عام عادت نہیں، جس طرح سے کہ نیند کے بعد رُوح کو چھوڑا جاتا ہے کہ نیند کے بعد آدمی بیدار ہوتا ہے اور جس طرح سے پہلے تھا ویسے ہی ہوجاتا ہے، لیکن خرقِ عادت کے طور پر اگر رُوح چھوڑ دے اور پھر وہ اسی طرح سے دُنیوی زندگی میں آکے بالکل بیدار ہوجائے جس طرح سے ایک عام زندہ آدمی ہوا کرتا ہے، خرقِ عادت کے طور پر اگر ایسا ہوجائے تو یہ آیت اس کا انکار نہیں کرتی، اس میں ایک عام عادت کا بیان ہے، اس لئے نبی کے معجزے کے طور پر جو مردہ زندہ ہوتا تھا وہ اسی طرح سے زندہ ہوتا تھا جس طرح سے سویا ہوا آدمی بیدار ہوجاتا ہے، اور وہ رُوح اسی طرح سے واپس آجاتی تھی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا معجزہ تو قرآنِ کریم میں منصوص ہے، اور ان کے علاوہ اور واقعات بھی آتے ہیں۔ ''اللہ وفات دیتا ہے نفسوں کو ان کی موت کے وقت، اور جو مرا نہیں، جس کو موت نہیں آئی اس کو وفات دیتا ہے اس کی نیند میں، پھر روک لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو جس کے اوپر اس نے موت طاری کردی، اور چھوڑ دیتا ہے دوسرے کو'' اِلَیٰۤ اَجَلٍ مُّسَمًّی: ایک وقت متعین تک۔

''نیند'' موت کی نظیر ہے

جب تک اس کی موت کا وقت نہیں آئے گا اس وقت تک اللہ تعالیٰ سلاتا رہتا ہے، جگاتا رہتا ہے، نیند میں رُوح کو قبض کرتا رہتا ہے، دوبارہ چھوڑتا رہتا ہے، جس سے موت و حیات کا ادل بدل ہونا انسان کے سامنے روز واضح ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ بعث بعد الموت کو بیان کرنے کے لئے نیند کو مثال میں لایا جاتا ہے، ''اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ'' ''نیند موت کی بہن ہے (اَخ تو بھائی کو کہتے ہیں لیکن اُردو میں چونکہ ''نیند'' کا لفظ مؤنث استعمال ہوتا ہے تو اس لیے اس کا ترجمہ ''بہن'' کے ساتھ کیا جائے گا) ''اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ'' نیند موت کی بہن ہے، یعنی دونوں ایک جیسی ہیں، قبضِ روح دونوں میں ہوتا ہے، اسی لیے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم جب سوئے ہوئے اُٹھا کرتے تھے تو یہ دُعا پڑھتے تھے، اور اسی دُعا کے پڑھنے کی تلقین کی ہے، ''اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَحْیَانَا بَعْدَ مَا اَمَاتَنَا وَاِلَیْهِ النُّشُوْرُ''(۱) اللہ کا شکر ہے جس نے ہمیں موت دینے کے بعد دوبارہ زندہ کردیا، اور اُسی کی طرف ہی نشور ہے، گویا کہ اس نیند اور نیند سے اُٹھنے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم بعث بعد الموت کے ساتھ تشبیہ دیا کرتے تھے کہ یہ ایسے ہی ہے جیسے کسی کو موت دینے کے بعد اس کو بیدار کردیا جائے، اور ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: ''اَیَنَامُ اَهْلُ الْجَنَّةِ یَا رَسُوْلَ الله!'' کیا جنت والے سوئیں گے بھی؟ جنت میں جائیں گے تو وہاں نیند بھی آئے گی؟ سوئیں گے بھی؟ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''اَلنَّوْمُ اَخُو الْمَوْتِ

(۱) بخاری ۲/ ۹۳۶ باب ما یقول اذا اصبح۔ مشکوٰۃ ۱/ ۲۰۸ باب ما یقول عند الصباح والمساء والمنام، فصل اول۔

وَلَا يَمُوْتُ اَهْلُ الْجَنَّةِ "[1] نیند تو موت کی بہن ہے، اور جنت میں جیسے موت نہیں اس کی بہن بھی نہیں، یعنی جنت میں نیند بھی نہیں آئے گی۔

نبی اور غیر نبی کی نیند میں فرق

تو جب نیند اور موت ان دونوں کو آپس میں ایک دوسرے کی مثل قرار دے دیا گیا۔ ویسے علمی لطیفے کے طور پر ایک بات عرض کروں، نبی اور غیر نبی کی نیند میں بھی فرق ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا، کتنی ہی روایات میں ہے، "بخاری شریف" میں موجود ہے کہ "تَنَامُ عَيْنَايَ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي "[2] میری آنکھیں سوتی ہیں، میرا دِل نہیں سوتا، میرا دِل بیدار رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نبی اگر کوئی خواب دیکھتا ہے تو سچا ہوتا ہے، نبی کو خواب میں بھی وحی ہوتی ہے، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خواب دیکھ کے ہی بیٹے کو ذبح کرنے کی تیاری کر لی تھی، اس لیے نبی کا باطن بیدار ہوتا ہے، اب سوتے تو آپ بھی ہیں، سوتا نبی بھی ہے، لیکن کیا دونوں کی کیفیت ایک ہے؟ آپ سوتے ہیں تو کسی چیز کی خبر نہیں، ٹانگ اُدھر کو گئی، بازو ادھر کو گیا، کپڑے کھلے ہوئے ہیں، اور دھڑا دھڑ ہوا چھوڑ رہے ہیں، پتا ہی نہیں چلتا کیا ہو رہا ہے اور نبی سوتا ہے تو اس کی آنکھیں سوئی ہوئی ہوتی ہیں قلب بیدار ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ نومِ انبیاء ناقضِ وضو نہیں ہے، نبی سو جائے تو اس کا وضو نہیں ٹوٹتا، کیونکہ اُس کو اپنے بدن کے متعلق پورے کا پورا احساس ہوتا ہے، کہ میرے اُوپر کوئی حدث طاری ہوا یا نہیں؟ اگر سونے کی حالت میں حدث طاری ہو جائے تو بھی ان کو پتا ہے، اس لئے اُٹھ کے وضو بھی کر لیتے ہیں، اور اگر حدث طاری نہیں ہوا تو بھی اُن کو پتا ہے، ورنہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے نیند بذاتِ خود وضو کے لیے ناقض نہیں ہے، نیند ناقض اسی لیے ہے، حضور ﷺ نے فرمایا: "اِنَّمَا الْعَيْنَانِ وِكَاءُ السَّهِ" دونوں آنکھیں جو ہیں یہ تو دُبر کا تسمہ ہیں، جب یہ جاگتی ہیں تو دُبر کا تسمہ کسا ہوا ہوتا ہے، "فَاِذَا نَامَتِ الْعَيْنُ اسْتَطْلَقَ الْوِكَاءُ" جب آنکھ سو جاتی ہے تو تسمہ ڈھیلا ہو جاتا ہے۔[3] تو ہوا جو پیٹ میں ہے جس کا تقاضا ہے نکلنے کا، تو نکلتی ہے اور پتا چلتا نہیں، جس کی بنا پر نوم کو قائم مقام قرار دے دیا گیا خروجِ ریح کے، اور وضو کے ٹوٹنے کا حکم لگا دیا گیا، یہی فلسفہ ہے نا؟ جو حدیث شریف میں آیا ہے، نوم کو جو ناقض قرار دیا گیا تو اس کی وجہ یہی قرار دی ہے کہ ہوا کا خروج ہو جاتا ہے اور پتا چلتا نہیں، اور جس کا دِل بیدار ہے، جیسے آپ آنکھیں بند کر کے لیٹے ہوئے ہوں اور دِل بیدار ہو تو وضو نہیں ٹوٹتا، کیونکہ آپ کو پتا ہے کہ خروجِ ریح ہوا ہے کہ نہیں ہوا؟ تو انبیاء علیہم السلام کے چونکہ باطنی حواس بیدار ہوتے ہیں، اس لیے ان کو پتا ہوتا ہے کہ حدث طاری ہوا یا نہیں ہوا؟ اس لیے ان کی نیند ناقض نہیں ہے، ہاں! البتہ لیٹے ہوئے ہوں، اور اُن کو پتا چل گیا کہ حدث ہو گیا ہے تو ایسی صورت میں اُٹھ کے وضو بھی کر لیں گے، اور اگر حدث نہیں ہوا تو وضو نہیں کریں گے، ان کا صرف سو جانا ناقض نہیں ہے۔

---

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۰، باب صفۃ الجنۃ، فصل ثالث۔ شعب الایمان، رقم ۴۴۱۶۔

(۲) ابوداؤد ۱/ ۲۷، باب الوضوء من النوم۔ نوٹ: بخاری ۱/ ۱۵۴، باب قیام النبی باللیل میں لفظ ہیں: اِنَّ عَيْنَيَّ تَنَامَانِ وَلَا يَنَامُ قَلْبِي

(۳) سنن دارمی، رقم ۷۴۹، باب الوضوء من النوم۔ مشکوٰۃ ۱/ ۴۱، باب ما یوجب الوضوء، فصل ثانی۔ نیز ابوداؤد ۱/ ۲۷۔ وابن ماجہ ۱/ ۳۷، مختصراً

نبی اور غیر نبی کی موت اور حیات بعد الموت میں فرق

تو جب نینداور موت دونوں ایک دوسرے کی مثال ہیں، اور نوم کے اندر فرق کتنا واضح ہے نبی اور غیر نبی کا، تو اسی طرح سے اگر موت کی کیفیت میں بھی فرق ہو تو اس میں کون سا استبعاد ہے؟ کہ ایک موت ہمیں آئے گی، ایک موت انبیاء علیہم السلام کو آتی ہے، اور دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، بس اس فرق کو ذہن میں رکھیے، اس سے زیادہ بحث کرنے کی ضرورت ہی نہیں، نبی مرتا ہے لیکن ہماری طرح نہیں، وہ بھی برزخ میں منتقل ہوتا ہے لیکن وہاں اس کی کیفیت ہماری طرح نہیں، عام اموات میں اور انبیاء میں فرق ہے، جس طرح سے عام اموات اور شہداء میں فرق ہے، بس اس فرق کا آپ عقیدہ رکھیں، باقی کتنا فرق ہے؟ یہ پیائش کرنا آپ کے اور میرے بس کی بات نہیں ہے، اتنا سا بھی اگر آپ عقیدہ رکھ لیں گے تو بالکل صحیح ہے، اور اس کے بعد کسی قسم کا اشکال نہیں، کہ نبی کی موت کو عام لوگوں کی موت کی طرح نہ سمجھو، اور نبی کی برزخی زندگی کو عام لوگوں کی برزخی زندگی کی طرح نہ سمجھو۔ عام عوام میں، اولیاء میں، شہداء میں، انبیاء میں اپنے اپنے درجے کے اعتبار سے برزخ کی زندگی میں فرق ہے، اس لیے موت کے بعد حضور ﷺ کی زندگی یا دیگر انبیاء علیہم السلام کی زندگی کو برزخی کہہ سکتے ہیں، لِکونِہا فی البرزخ، کیونکہ وہ زندگی برزخ میں ہے، ''المہند علی المفند'' جو علمائے دیوبند کے عقیدے کے متعلق رسالہ ہے، جو حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوری رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے، تو اس میں یہی لفظ ہیں کہ انبیاء علیہم السلام زندہ ہیں اور ان کی حیات دُنیوی ہے، ''برزخیۃٌ لِکونِہا فی عالمِ البرزخ''[1] اور اُس کو ''برزخی زندگی'' بھی کہہ سکتے ہیں چونکہ عالمِ برزخ میں گزر رہی ہے، باقی اس کی صحیح کیفیت کس طرح سے سمجھائی جا سکتی ہے؟ جبکہ وہ دُوسرا عالم ہے! تو جس طرح نوم میں فرق ہے اسی طرح سے موت میں بھی فرق ہے، اور قبضِ رُوح دونوں میں ہوتا ہے اور دونوں کی کیفیت علیحدہ علیحدہ ہے۔

تو موت کے بعد اللہ کی عادت یہی ہے کہ دوبارہ نہیں چھوڑتا، کہ انسان پھر اسی طرح سے زندگی اختیار کرلے، نیند کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ چھوڑتے ہیں ایک وقت متعین تک، یعنی جب تک کہ موت کا وقت نہیں آتا، قبض بھی کرتے رہتے ہیں، چھوڑتے بھی رہتے ہیں، اور یہ نمونہ ہمارے سامنے ہر روز آتا ہے، اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَفَكَّرُوْنَ: اس میں البتہ نشانیاں ہے ان لوگوں کے لئے جو سوچتے ہیں، جن کو سوچنے کی عادت ہے وہ بعث بعد الموت کے عقیدے کو اس نوم سے سمجھ سکتے ہیں، یہ گویا کہ مشق ان کے سامنے روز ہوتی ہے، کہ کس طرح سے موت آتی ہے اور کس طرح سے بعد میں زندگی ہوگی۔

مشرکین کے عقیدۂ شفاعت کی تردید اور صحیح عقیدۂ شفاعت کا اِثبات

اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ شُفَعَآءَ: باقی ان کو چاہیے کہ یہ آخرت کا عقیدہ اختیار کر کے آخرت کی فکر کریں، لیکن یہ شفعاء کا عقیدہ اختیار کر کے آخرت سے بےفکر ہوئے بیٹھے ہیں، کہتے ہیں کہ ہمارے سفارشی ہیں جو مشکلات میں کام آتے ہیں، اگر بالفرض! آخرت ہوئی تو بھی یہ ہمارے کام آجائیں گے، تو اب آگے شفاعت کے عقیدے کی تردید کی جارہی ہے۔ ''کیا انہوں نے اللہ کے

(۱) ''المہند علی المفند'' سوال خامس کے جواب کے تحت۔

علاوہ کوئی شفعاء اختیار کر رکھے ہیں؟" قُلْ اَوَلَوْ كَانُوْا لَا يَمْلِكُوْنَ شَيْئًا وَّلَا يَعْقِلُوْنَ: آپ کہہ دیجئے کیا وہ شفعاء، شفعاء ہیں؟ وہ سفارش کریں گے؟ وہ شفاعت کرنے والے ہیں؟ اگرچہ نہ وہ کوئی اختیار رکھتے ہوں نہ وہ کوئی سمجھ ہی رکھتے ہوں؟ یعنی نہ اُن کو کسی قسم کا اختیار ہے نہ وہ حالات کو صحیح سمجھتے ہیں، پھر بھی تم اُن کو شفعاء سمجھتے ہو؟ قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا: آپ کہہ دیجئے کہ شفاعت کا اختیار تو سارے کا سارا اللہ ہی کو ہے، جس کو اجازت دیں گے وہی سفارش کر سکے گا، جس کے لئے اجازت دیں گے اسی کی کی جا سکے گی، اس لیے شفاعت کا عقیدہ باصلہٖ باطل نہیں ہے، ہم بھی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام، اولیاء، شہداء، حفاظ، علماء شفاعت کریں گے، لیکن ہمارا شفاعت کا عقیدہ اسی عقیدے کے تحت ہے کہ لِلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِيْعًا کہ شفاعت ہے ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے، جس کو اجازت دے گا وہ کرے گا، جس کے لئے اجازت دے گا اس کے لئے کرے گا، شفیع کا عند اللہ مقبول ہونا ضروری ہے، جس کی سفارش کی جائے اُس کا مؤمن ہونا ضروری ہے، پھر اللہ کا اذن ضروری ہے، جب یہ ساری چیزیں پائی جائیں گی تب شفاعت ہوگی، اور یہ فرق کہ ہم کس قسم کا عقیدہ رکھتے ہیں شفاعت کے متعلق، اور مشرکین کا عقیدہ کیا تھا، یہ پہلے کئی دفع واضح کر چکا ہوں۔ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اسی کے لیے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، ثُمَّ اِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: پھر اسی کی طرف تم لوٹائے جاؤ گے۔

توحید کے تذکرے کے وقت مشرک کی کیفیت

وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: جس وقت ذکر کیا جاتا ہے اللہ کو وَحْدَهٗ، اللہ وحدہٗ کو جب ذکر کیا جاتا ہے، یعنی یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے، اُس کا کوئی شریک نہیں، اور سارے عالم میں تصرف اسی کا چلتا ہے، تو منقبض ہو جاتے ہیں دِل ان لوگوں کے جو کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔ تو اللہ کی توحید کا تذکرہ سُن کر مشرکوں کے دِلوں میں انقباض آتا ہے، اِشْمَاَزَّتْ: رُک جاتے ہیں، سکڑ جاتے ہیں، منقبض ہو جاتے ہیں، جس طرح سے غیر پسندیدہ بات سامنے آتی ہے تو اِنسان کا دِل منقبض ہو جاتا ہے، "جب اللہ وحدہٗ کا ذِکر آئے تو سکڑ جاتے ہیں دِل ان لوگوں کے جو کہ آخرت پر ایمان نہیں لاتے۔" وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖۤ: اور جب ذِکر کیا جاتا ہے ان کا جو اللہ کے علاوہ ہیں، اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ: اچانک وہ خوش ہو جاتے ہیں۔ یہ بھی مشرکوں کی کیفیت ہے کہ شرکاء کا ذِکر بڑے خوش ہو کر سنتے ہیں، کیونکہ شرکاء کے ذِکر کے ساتھ ان سے ذمہ داری ٹلتی ہے، اوّل تو آخرت کے عقیدے سے بچتے ہیں، اور اگر آخرت کی بات سامنے آتی بھی ہے تو شفعاء کا سہارا اُن کو بے خوف کر دیتا ہے، لیکن جب اللہ وحدہٗ کا ذِکر کیا جائے اور اس کا مالک ہونا اس کا حاکم ہونا بیان کیا جائے تو ایسے وقت میں پھر اُن کے دِلوں کے اُوپر اِنقباض طاری ہوتا ہے، جیسے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ "مشرک کا خاصہ ہے کہ گو بعض وقت زبان سے اللہ کی عظمت ومحبت کا اِعتراف کرتا ہے، لیکن اس کا دِل اکیلے خدا کے ذِکر اور حمد وثنا سے خوش نہیں ہوتا، ہاں! دوسرے دیوتاؤں یا جھوٹے معبودوں کی تعریف کی جائے تو مارے خوشی کے اُچھلنے لگتے ہیں، جس کے آثار اُن کے چہرے پر نمایاں ہوتے ہیں، افسوس! یہی حال آج بہت سے نام نہاد مسلمانوں کا دیکھا جاتا ہے کہ خدائے واحد کی قدرت وعظمت اور اس کے علم کی لامحدود وسعت کا بیان ہو تو چہروں پر انقباض کے آثار ظاہر ہوتے ہیں، مگر کسی پیر، فقیر کا ذِکر آ جائے اور جھوٹی سچی کرامات اناپ شناپ بیان کر دی جائیں تو چہرے کھِل

پڑتے ہیں، اور دِلوں میں جذباتِ مسرت وانبساط جوش مارنے لگتے ہیں، بلکہ بسا اوقات توحیدِ خالص کا بیان کرنے والا اُن کے نزدیک منکرِ اولیاء سمجھا جاتا ہے، فالی اللہ المشتکی وھو المستعان'' (تفسیر عثمانی)۔ تو یہ مشرکوں کی خاصیت ہے کہ اللہ کی عظمت اور اللہ کی قدرت کو سننا نہیں چاہتے، ہاں! البتہ پیروں، فقیروں کی غلط سلط کرامتیں بیان کرو تو پھر بڑا اُچھلتے ہیں اور بڑے خوش ہوتے ہیں۔ ''جب ذِکر کیا جاتا ہے اس کے علاوہ دُوسروں کا، اچانک وہ خوش ہوجاتے ہیں۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

ضدی لوگوں کا معاملہ اللہ کے سپرد کردیجئے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ قُلِ اللّٰهُمَّ: ''آپ کہہ دیجئے، اے اللہ! اے آسمانوں اور زمین کو پیدا کرنے والے! اے غیب اور شہادت کے جاننے والے!، تو فیصلہ کرے گا اپنے بندوں کے درمیان اس چیز میں جس میں کہ یہ اختلاف کرتے تھے۔'' سرورِ کائنات ﷺ کو یہ دُعا تلقین کی گئی، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ لوگ چونکہ ضد میں ہیں اور بات مانتے نہیں، اس لئے آپ ان کی فکر چھوڑ دیجئے، اور اِن کا معاملہ اللہ کے سپرد کردیجئے، یہ اللہ کے سپرد کرنے کا ایک عنوان ہے کہ اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ کہ یا اللہ! بس تو ہی فیصلہ کرے گا ان باتوں کے بارے میں جن میں یہ اختلاف کرتے ہیں۔ فاطر پیدا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ فَاطِرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: پیدا کرنے والے آسمانوں کے اور زمین کے۔ یہ منادیٰ ہے، مضاف ہونے کی وجہ سے منصوب ہے۔ ''اے اللہ! اے آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے والے! غیب اور شہادت کے جاننے والے!'' غیب اور شہادت کا ذِکر آگیا کہ ہر چیز تیرے سامنے ہے، کسی کا کوئی حال تجھ سے مخفی نہیں، کیونکہ فیصلہ صحیح تبھی ہوسکتا ہے کہ جب فریقین کے حالات معلوم ہوں، اور اگر فریقین کے حالات صحیح معلوم نہ ہوں تو صحیح فیصلہ نہیں ہوسکتا، تو اللہ تعالیٰ کو سب حالات ٹھیک ٹھیک معلوم ہیں، چاہے کسی کے ظاہر ہیں، چاہے چھپے ہوئے ہیں۔

قیامت کے دِن کُفّار کی بے بسی، اور اِیمان کی قدروقیمت کا احساس

اور فیصلہ ہوجانے کے بعد کافر اور مشرک جب اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے تو اس وقت ان کا یہ حال ہوگا، وَلَوْ اَنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: اگر ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا وہ سب کچھ ہو جو زمین میں ہے، وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ: اور اتنا اور بھی اس کے ساتھ، (مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: زمین میں جتنے خزانے ہیں وہ سارے کے سارے، وَّمِثْلَهٗ مَعَهٗ: اور اتنے اور بھی ان کے ساتھ)، اگر یہ ساری کی ساری چیزیں ان لوگوں کے لئے ہوں جنہوں نے ظلم کیا، ظلم سے مراد شرک، جنہوں نے شرک کا ارتکاب کیا، لَافْتَدَوْا بِهٖ مِنْ سُوْٓءِ الْعَذَابِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ تو البتہ فدیہ دے کر اپنے آپ کو چھڑانا چاہیں گے برے عذاب سے قیامت کے دِن' قیامت کے دِن اپنے آپ کو عذاب سے چھڑانے کے لئے سب کچھ دینے کے لئے تیار ہوں گے لیکن اس وقت ان سے وہ فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ اِفتداء کا معنی ہوتا ہے کوئی چیز دے کر اپنے آپ کو چھڑانا، لَافْتَدَوْا بِهٖ: تو جو کچھ زمین میں ہے یہ سارا اور اس کے ساتھ اتنا اور بھی اگر ان ظالموں کے پاس ہو تو یہ اپنے آپ کو چھڑانا چاہیں گے اس کا فدیہ دے کر برے عذاب سے قیامت کے

دن، مطلب یہ ہے کہ آج جو ذرا ذرا سے مال و دولت کے پیچھے کھپ کھپا رہے ہیں، اور ایمان اس لیے قبول نہیں کرتے، سمجھتے ہیں کہ ہمارے دُنیوی مفاد کو نقصان پہنچتا ہے، لیکن جب قیامت کے دِن بُرا عذاب ان کے سامنے آئے گا، بدتر عذاب سامنے آئے گا، تو ایسی صورت میں اگر سارے کے سارے خزانے جو زمین میں موجود ہیں وہ بھی اور اتنا اور بھی ساتھ ہو، تو چاہیں گے کہ یہ لے لیا جائے اور ہمیں چھوڑ دیا جائے، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ صراحت کردی گئی کہ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ (سورۂ مائدہ:۳۶) اگر یہ فدیہ دینا چاہیں گے تو ان سے قبول نہیں کیا جائے گا، اوّل تو یہ سارے خزانے ہوں گے کس کے پاس؟ یعنی بالفرض ہوں تو یہ فدیہ میں دے کر چھوٹنا چاہیں گے، لیکن یہ فدیہ ان سے قبول نہیں کیا جائے گا۔ اسی سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں ایمان کی قدر و قیمت کا، کہ مرنے کے بعد دُوسری زندگی میں سونے چاندی کے پہاڑ اگر آپ کے پاس ہوں تو ان کے ساتھ آپ نجات نہیں خرید سکیں گے، وہاں نجات اگر ملے گی تو ایمان اور عملِ صالح سے ملے گی، اس سے ایمان اور عملِ صالح کی قیمت کا اندازہ کر لیجئے، کہ ساری زمین کے خزانے بھی اس کے مقابلے میں کم ہیں، لیکن آج چونکہ یہ معاملہ سامنے نہیں ہے اس لئے لوگ ٹکے ٹکے کے پیچھے اپنے ایمان کو ضائع کر دیتے ہیں۔

وَبَدَا لَهُمْ مِّنَ اللهِ مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ: اور ظاہر ہو جائے گا اُن کے لئے اللہ کی جانب سے وہ جس کا یہ گمان بھی نہیں کرتے تھے، جس کے متعلق ان کا گمان بھی نہیں تھا وہ چیز ان کے سامنے آجائے گی۔ ماضی کے ساتھ اس کو تعبیر کیا جا رہا ہے، اور واقعہ قیامت کا ہے۔ یعنی ان کا گمان یہ تھا جیسے ہم دُنیا کے اندر خوش حال ہیں، ہمیں عزّت حاصل ہے، اوّل تو آخرت آئے گی نہیں، یہ بھی ان کے گمان سے بالاتر چیز ہے اور وہ آخرت سامنے آجائے گی، اور پھر انہوں نے جو شفعاء بنا رکھے تھے سمجھتے تھے کہ اگر آخرت آ گئی تو وہ ہمیں اللہ کے دربار میں عزّت دلا دیں گے لِيَكُوْنُوْا لَهُمْ عِزًّا (سورۂ مریم:۸۱) اور وہاں ہمیں عذاب سے چھڑا لیں گے، ان کی سفارش کے ساتھ، ان کی کوشش سے ہم بچ جائیں گے، تو وہ بھی غلط ثابت ہو جائے گا، وہ کوئی کام نہیں آسکیں گے، تو مَا لَمْ يَكُوْنُوْا يَحْتَسِبُوْنَ کے اندر یہ ساری چیزیں شامل ہیں۔ ''ظاہر ہو جائے گی ان کے لئے اللہ کی جانب سے وہ چیز جو یہ گمان بھی نہیں کرتے تھے''، وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا: مَا كَسَبُوْا: جو کچھ انہوں نے کیا، سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا: ان کے کیے ہوئے کاموں میں سے بُرے کام ان کے لیے ظاہر ہو جائیں گے، یوں بھی لفظی معنی کیا جا سکتا ہے جس کا حاصل یہ ہوگا کہ ان کی بداعمالیاں ان کے سامنے آجائیں گی جو اَب دنیا میں رہتے ہوئے ان کو یاد نہیں ہیں کہ ہم کیا کیا کیے بیٹھے ہیں؟ وہ سب ان کی بداعمالیاں ان کے سامنے آجائیں گی (نسفی)۔ اور سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا بول کر مَا كَسَبُوْا کی سزائیں بھی مراد ہو سکتی ہیں، جیسے جَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا (سورۂ شوریٰ:۴۰) جزاء کو بھی سیئہ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، بُرے عمل کی جزاء سیئہ کہلاتی ہے، ''ان کے اعمال کی سزائیں ان کے سامنے ظاہر ہو جائیں گی''، تو خود سَيِّاٰتُ کا معنی ہی سزائیں اور سختیاں کر لیں تو بھی ٹھیک ہے (آلوسی)۔ اور اگر سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا سے ان کے بُرے اعمال ہی مراد لیے جائیں تو جزاء کا لفظ پہلے محذوف بھی نکالا جا سکتا ہے۔ ''ان کے بُرے اعمال کا بدلہ ان کے سامنے ظاہر ہو جائے گا'' (آلوسی)۔ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: اور گھیر لے گی ان کو وہ چیز جس کا یہ استہزا کیا کرتے تھے، جس کا مذاق اُڑایا کرتے تھے۔ اس سے مراد عذاب ہے، کیونکہ جب کافروں کے سامنے عذاب کا تذکرہ آتا تھا تو وہ ہنستے تھے، مذاق اُڑاتے تھے، آج وہی مذاق اُڑائی ہوئی چیز، جس کے ساتھ یہ استہزا کیا کرتے تھے وہی ان کو چاروں طرف سے محیط ہو جائے گی۔

مشرک کی بے صبری اور ناشکری کا شکوہ

فَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ ضُرٌّ دَعَانَا ثُمَّ اِذَا خَوَّلْنٰهُ نِعْمَةً مِّنَّا قَالَ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ: پھر جس وقت انسان کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے تو ہمیں پکارتا ہے (ضُرٌّ: تکلیف۔ دَعَانَا: ہمیں پکارتا ہے) پھر جس وقت ہم اس کو اپنی جانب سے کوئی نعمت دے دیتے ہیں، خوش حالی دے دیتے ہیں، تو کہتا ہے اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ: سوائے اس کے نہیں کہ دیا گیا میں یہ خوش حالی اپنے علم کی بنا پر، میں نے اپنے علم اور فن کے ساتھ اس خوش حالی کو حاصل کیا ہے۔ بَلْ هِيَ فِتْنَةٌ: یہ اس کے علم کے ساتھ حاصل کی ہوئی چیز نہیں، اس کے کمال کی بنا پر حاصل کردہ چیز نہیں، بلکہ یہ نعمت ایک آزمائش ہے، وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن لوگوں کے اکثر جانتے نہیں ہیں، اکثر لوگوں کو علم نہیں کہ یہ اللہ دیتا ہے اور آزمائش کے طور پر دیتا ہے۔ اس میں وہی انسان کے متعلق شکوہ ہے جو بار بار آپ کے سامنے گزر چکا، کہ جب تکلیف پہنچ جاتی ہے، ہر طرف سے اس کی آس ٹوٹ جاتی ہے پھر تو اللہ کو پکارتا ہے، آگے پیچھے تو اللہ وحدہٗ کا ذِکر سُن کے اس کے دِل میں انقباض آتا ہے، یہ اللہ وحدہٗ کا ذِکر بھی سننا نہیں چاہتا، اور اپنے شرکاء کا ذِکر سُن سُن کر بہت خوش ہوتے ہیں، جس طرح سے اسی رُکوع میں پیچھے آپ کے سامنے گزرا، لیکن جب کسی تکلیف کی زد میں آجاتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ شرکاء کے بس میں نہیں کہ اس تکلیف کو دُور کر سکیں پھر وہ اللہ کو پکارتا ہے، اور پھر جس وقت اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اس تکلیف کو دُور کر کے کوئی خوش حالی دے دیتے ہیں تو پھر وہ اس خوش حالی کی نسبت اللہ کی طرف نہیں کرتا، اگر وہ اللہ کی طرف اس کی نسبت کرتا تو یہ شکر گزاری ہے، یوں کہتے کہ "یہ تکلیف اللہ نے ختم کردی اور اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ راحت اور آرام دے دیا" تو یہ شکر گزاری ہے، لیکن انسان کی طبیعت میں بے صبری کے ساتھ ساتھ ناشکری بھی ہے، کہ اس خوش حالی کے حاصل ہوجانے کے بعد اس نعمت کو یا تو غیر اللہ کے پلے میں ڈال دیتا ہے، کہ فلاں نے ہمیں یہ دے دی، فلاں کے کرم سے، فلاں کی برکت سے یہ چیز ہمیں مل گئی، اللہ کی طرف اُس کی نسبت ہی نہیں کرتا، یا پھر اُس کو اپنے علم وفن اور قابلیت کا نتیجہ قرار دیتا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ دونوں ہی شرک کے شعبے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کوئی نعمت دے تو انسان اس کو یا غیر اللہ کی طرف منسوب کردے کہ یہ فلاں نے دی ہے، یا اپنے کمال کا نتیجہ اس کو قرار دے کہ ہم نے اس کو اپنی قابلیت اور اہلیت کے ساتھ کمالیا ہے، یہ دونوں ہی شرک کے شعبے ہیں۔

موحد ومشرک کی نظر میں فرق

تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ نعمت اور خوش حالی جو ملتی ہے یہ آزمائش کے طور پر ملتی ہے، آزمائش اس میں یہی ہے کہ اس کے اُوپر شکر گزاری کرتے ہیں یا نہیں؟ اور اگر کوئی شخص اس کا واسطہ بنتا ہے، یا انسان نے اپنی محنت مشقت اور قابلیت کے ساتھ اس چیز کو حاصل کیا ہے، تو یہ محض ظاہری واسطہ ہے، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے دینے والا اللہ ہی ہے۔ کیونکہ آپ کی سائنس، آپ کی قابلیت، آپ کی اہلیت، آپ کی فنکارانہ مہارت، وہ بھی تو آخر اللہ کا ہی عطیہ ہے۔ تو کافر اور مشرک اس پردے سے پیچھے نہیں دیکھ سکتا، اور موحد اس پردے کے پیچھے بھی دیکھتا ہے۔ کسب کو، اِکتساب کو، مہارت کو، اللہ تعالیٰ نے ایک پردہ بنا دیا ہے، تو مشرک کی آنکھ اس پردے تک رہ جاتی ہے، اور موحد یہ دیکھتا ہے کہ آخر یہ قابلیت اور اہلیت جو ہمیں دی گئی ہے یہ بھی تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی

ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ ہمیں عقل نہ دیتا، اللہ تعالیٰ ہمارے اعضا میں قوت نہ رکھتا، تو ہم اپنے اعضا کے ساتھ یا اپنی سوچ اور فکر کے ساتھ اس چیز کو کیسے کما لیتے؟ بس موحد اور مشرک میں یہ ایک بنیادی فرق ہے کہ موحد کی نظر حقیقت تک جاتی ہے، وہ ان پردوں کے پیچھے جھانک کے دیکھ لیتا ہے کہ اصل قوت اور طاقت اللہ ہی کی متصرف ہے، اور مشرک ان ظاہری پردوں پہ رہ جاتا ہے، اس لیے کوئی انسان واسطہ بنا تو یہ اس کے سامنے سجدہ ریزہ ہو گیا، یا اس کو اپنی قابلیت اور اہلیت کا نتیجہ قرار دینے لگ گیا، تو اس میں ناشکری کے ساتھ ساتھ اللہ کے ساتھ ان اسباب کی شرکت بھی ہے، گویا کہ ان اسباب پر اعتماد کر کے ان کو بھی اللہ کا شریک ٹھہرا لیتا ہے، تو یہاں یہی بات کہی گئی کہ دی ہوئی اللہ کی ہے، لیکن تمہارا کسب، تمہارا اکتساب، اور دُوسرے رِجال جو ظاہری واسطہ بنتے ہیں کسی نعمت کے حاصل ہونے کا، یہ ایک پردہ ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ تمہیں اس نعمت کے ذریعے سے آزماتا ہے، لیکن اکثر لوگوں کو علم نہیں، وہ اس حقیقت تک پہنچتے نہیں ہیں۔

پہلے لوگوں کے انجام سے عبرت حاصل کرو

اسی پر اللہ تبارک وتعالیٰ تنبیہ کرتے ہیں، قَدْ قَالَهَا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: یہی بات کہی تھی ان لوگوں نے بھی جو ان سے پہلے گزرے ہیں، پس نہ کام آیا ان کے جو کچھ وہ کرتے تھے۔ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ یہ مَآ اَغْنٰى کا فاعل ہے، جو کچھ وہ کرتے تھے ان کی کارروائیاں ان کے کچھ کام نہ آئیں۔ یہ بات پہلے لوگوں نے بھی کہی تھی کہ ہم نے یہ خوش حالی اپنی قابلیت کے ساتھ حاصل کی ہے، خصوصیت کے ساتھ آپ کے سامنے قارون کا واقعہ گزر چکا، کہ قارون کے سامنے جس وقت یہ بات ذِکر کی گئی تھی کہ اللہ کے دیے ہوئے مال میں سے اللہ کی مخلوق پر احسان کر، تو اس نے بھی یہی کہا تھا، اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ عِنْدِيْ (سورۂ قصص: ۷۸) یہ تو مجھے میری قابلیت کی بنا پر دیا گیا ہے، میں نے اپنی قابلیت اور اہلیت سے کمایا ہے، یہ بات اس نے بھی کہی تھی لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اُس کو اس کے خزانوں اور اس کی حویلی سمیت زمین میں دھنسا دیا تو قابلیت کسی کام نہ آئی، جو کچھ کارروائیاں وہ کرتے تھے وہ اُن کو عذاب سے نہ بچا سکیں۔ تو اللہ تعالیٰ یہی تنبیہ ان مشرکین کو کرتے ہیں کہ یہ بات پہلوں نے بھی کہی تھی لیکن جب اللہ کی گرفت میں آجاتے ہیں تو سب قابلیتیں اور سب فن فنون، اور سائنسیں سب رکھی رہ جاتی ہیں، اور کوئی کسی کے کچھ کام نہیں آتی، ''تحقیق کہی تھی یہی بات ان لوگوں نے جو ان سے پہلے ہیں۔'' اَغْنٰى عَنْهُ کا ترجمہ آپ کے سامنے کئی دفعہ ذِکر کیا، فائدہ پہنچانا، دُور ہٹانا، کام آنا، یوں اس کا مفہوم ذِکر کر دیا جاتا ہے۔ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ''جو کچھ وہ کماتے تھے وہ کمائی اُن کے کچھ کام نہ آئی'' فَاَصَابَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا: سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا کا لفظ اوپر بھی آیا تھا اسی طرح سے یہاں اس کا ترجمہ کر لیجئے۔ ''اُن کے بداعمال اُن کو پہنچ گئے، یا اُن کے اعمال کی سزائیں اُن کو پہنچ گئیں۔'''' اور جن لوگوں نے ظلم کیا ان لوگوں میں سے'' موجودہ لوگوں میں سے، یعنی جس طرح سے پہلوں کے سامنے اُن کی بدکرداریاں بداعمالیاں آگئیں، تو موجودہ لوگوں میں سے جو لوگ ظالم ہیں، گناہ گار ہیں، کفر وشرک کے اندر مبتلا ہیں، سَيُصِيْبُهُمْ سَيِّاٰتُ مَا كَسَبُوْا: عنقریب ان کو بھی ان کی بداعمالیاں پہنچیں گی، ان کی بداعمالیوں کی سزا ان کو بھی پہنچے گی، وَمَا هُمْ بِمُعْجِزِيْنَ: اور یہ عاجز کرنے والے نہیں ہوں گے۔

رزق کی تقسیم صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے

اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا: کیا ان کو علم نہیں، اَنَّ اللّٰهَ يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ: بے شک اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے، وَيَقْدِرُ: اور تنگ کرتا ہے، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ: اس میں البتہ نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لانا چاہتے ہیں، یہاں يُؤْمِنُوْنَ ارادۂ ایمان کے معنی میں ہے۔ ایمان لانا چاہیں تو اس میں بھی لوگوں کے لئے نشانی ہے، وہ نشانی واقعات ہیں مشاہدات ہیں، کہ جس وقت آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا، کہ رزق کی تقسیم واقعی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کتنی واضح بات ہے کہ ایک بچہ پیدا ہونے میں مختار نہیں ہے، کہ میں کہاں پیدا ہوں، کہاں پیدا نہ ہوں، ایک بڑے زمین دار کے گھر پیدا ہو گیا، پیدا ہوتا ہی خوش حالی میں ہے، جس کو آج کل کے محاورے میں کہتے ہیں کہ منہ میں سونے چاندی کا چمچہ لے کر پیدا ہوا، پیدا ہوتا ہی ہے تو اس کا حال یہ ہوتا ہے کہ گویا کہ اس کے منہ میں سونے چاندی کا چمچہ ہے، اب یہ جو اس بچے کو پیدا ہونے کے بعد راحت حاصل ہو رہی ہے، ہر قسم کے اسبابِ راحت حاصل ہیں، اس میں اس کا کیا کمال ہے؟ بڑا ہوتا ہے تو غیر اختیاری طور پر اس کو بڑوں کی جائیداد وراثت میں مل جاتی ہے، کوئی محنت اور مشقت اس کو نہیں کرنی پڑتی۔ اور ایک بچہ ایک غریب گھر میں پیدا ہو جاتا ہے کہ پیدا ہونے کے بعد اُس کو بسا اوقات چوسنے کے لئے چوسنی بھی گھر مہیا نہیں ہوتی، اور اسباب تو کیا مہیا ہونے ہیں، کس طرح سے فقر اور مسکنت کے ساتھ پیدا ہوتے ہی وہ تنگی میں ہے، اب اس بچے کا اس میں کیا قصور؟ اور اُس بچے کا اس میں کیا کمال تھا؟ یہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم ہے، کسی کو غریب گھر میں پیدا کر دیا، کسی کو اُمیر گھر میں پیدا کر دیا۔ پھر ایسے واقعات بھی آپ کے سامنے ہیں کہ ایک شخص اپنی زندگی میں کروڑوں اربوں کا مالک ہوتا ہے، بلکہ تخت و سلطنت کا مالک ہوتا ہے، لیکن ایسا انقلاب آتا ہے کہ در بدر ٹھوکریں کھاتا پھرتا ہے، یا جیل کی کوٹھڑی میں بند ہو جاتا ہے، تخت چھن جاتے ہیں، تاج اُتر جاتے ہیں، اور اپنی کروڑوں روپے کی دولت سے انسان فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، در بدر دھکے کھاتا ہوا ختم ہو جاتا ہے۔ اور ایسی مثالیں بھی آپ کے سامنے ہوں گی کہ ایک انسان فقر و فاقہ میں پلتا ہے، پھلتا پھولتا ہے، لیکن اس کے بعد کوئی ایسا واقعہ پیش آ جاتا ہے کہ سلطنتوں کے مالک بن جاتے ہیں، بہت بڑے بڑے کاروبار کے مالک بن جاتے ہیں، فیکٹریوں کے مالک بن جاتے ہیں، اگر آپ اپنے دائیں بائیں دیکھیں گے تو اس قسم کی مثالیں آپ کے سامنے واضح ہیں، غربت و افلاس سے غناء اور دولت کی طرف، اور دولت اور ثروت سے غربت و افلاس کی طرف لوگ منتقل ہوتے رہتے ہیں، کسی کو غیر اختیاری طور پر ہی بغیر کسی محنت کے اتنی دولت حاصل ہو جاتی ہے کہ اس کے حساب میں بھی نہیں آتی، اور کسی نے زندگی بھر محنت کی ہوتی ہے لیکن اپنی دولت اور پیسے سے بھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

مشرکین کی عقل کا فتور

تو یہ مثالیں ایسی ہیں کہ اگر انسان غور کرے تو اس کے سامنے کوئی مخفی نہیں ہیں، اس لیے کہیں اَوَلَمْ يَرَوْا کے ساتھ اس کو ذکر کیا جاتا ہے (سورۂ روم: ۳۷)، کہیں اَوَلَمْ يَعْلَمُوْٓا کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے، ''یہ لوگ دیکھتے نہیں؟ کیا ان لوگوں کو پتا نہیں؟'' معلوم ہو گیا کہ ان حالات کے سامنے ہونے کے باوجود جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ رزق کی کشادگی یا رزق کی تنگی یہ انسان کی اپنی محنت اور

مشقت سے تعلق رکھتی ہے، یا رزق کی تقسیم اللہ کے ہاتھ میں نہیں ہے، تو کہنا پڑتا ہے کہ ایسے شخص کی عقل میں فتور ہے، ورنہ دائیں بائیں اس قسم کے واقعات پھیلے ہوئے ہیں، کہ اگر آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ رزق کی تقسیم واقعی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جس کو چاہتا ہے خوش حال کر دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے تنگ حال کر دیتا ہے۔ لیکن خوش حالی اللہ تعالیٰ کے نزدیک پسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں، اور معاش کے اندر تنگی اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناپسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں، اس کی اس میں حکمتیں ہیں، کسی کو تنگی پہنچا کر صبر کے ذریعے سے آزماتا ہے، کسی کو خوش حالی پہنچا کر شکر کے ذریعے سے آزماتا ہے۔ تو مشرکین اگر اس بات کے اُوپر فخر اور ناز کرتے ہیں کہ جب ہم دُنیا کے اندر خوش حال ہیں تو یہ ہماری قابلیت کا نتیجہ ہے، تو آخرت میں بھی ہم ایسے خوش حال ہی ہوں گے، تو یہ بھی ان کی عقل کا فتور ہے۔ ایسی بات نہیں۔ اس بات کو اللہ تعالیٰ نے قرآن کے اندر بہت دفعہ دوہرایا کہ رزق کی کشادگی اور رزق کی تنگی اللہ کے ہاتھ میں ہے، اس کا تعلق انسان کی محنت، مشقت کے ساتھ نہیں، مقصد اس میں یہ ہے کہ اگر کسی کا رزق تنگ ہے تو وہ بھی صبر کے ساتھ وقت گزارے، اور کہے کہ اللہ کی حکمت اسی میں ہے، اور اگر کوئی خوش حال ہے تو فخر اور ناز نہ کرے، اس میں کوئی قابلیت کا دخل نہیں، یہ بھی اللہ کی دَین ہے، معلوم نہیں کس وقت چھین لے، ایک ہی جھٹکے کے اندر تخت و تاج والے گداگر بن جاتے ہیں، کوئی دیر ہی نہیں لگتی، جب رات کو سوتے ہیں تو بادشاہ ہوتے ہیں، صبح اُٹھتے ہیں تو انقلاب آیا ہوا ہوتا ہے اور دربدر دھکے کھاتے پھرتے ہیں۔ مثالیں دُنیا کے اندر بھری پڑی ہیں، کوئی نہ سوچے تو اور بات ہے۔

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ

آپ کہہ دیجئے اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے نفسوں کے اُوپر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوؤ، اللہ تعالیٰ

يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ﴿۵۳﴾ وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ وَ

سارے ہی گناہ معاف کر دیتا ہے، بے شک وہ غفور رحیم ہے ﴿۵۳﴾ اور اپنے ربّ کی طرف توجہ کرو اور

اَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ ﴿۵۴﴾ وَاتَّبِعُوْٓا اَحْسَنَ

اُسی کے فرماں بردار ہو جاؤ، قبل اس سے کہ تمہارے پاس عذاب آ جائے پھر تم مدد نہیں دیے جاؤ گے ﴿۵۴﴾ پیروی کرو بہترین چیز کی

مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَكُمُ الْعَذَابُ بَغْتَةً وَّاَنْتُمْ

جو تمہاری طرف اُتاری گئی تمہارے ربّ کی طرف سے قبل اس کے کہ آ جائے تمہارے پاس عذاب اچانک اور تمہیں

لَا تَشْعُرُوْنَ ﴿۵۵﴾ اَنْ تَقُوْلَ نَفْسٌ يّٰحَسْرَتٰى عَلٰى مَا فَرَّطْتُّ فِيْ جَنْۢبِ اللّٰهِ وَاِنْ

پتا بھی نہیں ہوگا ﴿۵۵﴾ تاکہ نہ کہے کوئی نفس ہائے افسوس! میرے کوتاہی کرنے پر اللہ کی جناب میں، اور بے شک

كُنْتُ لَمِنَ السّٰخِرِيْنَ (۵۶) اَوْ تَقُوْلَ لَوْ اَنَّ اللّٰهَ هَدٰىنِيْ لَكُنْتُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ (۵۷)

تھا میں البتہ ٹھٹھا کرنے والوں میں سے (۵۶) یا نہ کہے کوئی نفس کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دیتا تو میں بھی متقین میں سے ہوجاتا (۵۷)

اَوْ تَقُوْلَ حِيْنَ تَرَى الْعَذَابَ لَوْ اَنَّ لِيْ كَرَّةً فَاَكُوْنَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ (۵۸) بَلٰى

یا نہ کہے کوئی نفس جس وقت عذاب دیکھے گا کاش! کہ میرے لیے لوٹنا ہو، تو میں بھی نیکوکاروں میں سے ہوجاؤں گا (۵۸) کیوں نہیں،

قَدْ جَآءَتْكَ اٰيٰتِيْ فَكَذَّبْتَ بِهَا وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ (۵۹) وَيَوْمَ

آئی تھیں تیرے پاس میری آیات، تُو نے ان کو جھٹلایا، اور تُو بڑا بنا، اور تُو کافروں میں سے تھا (۵۹) اور قیامت

الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ ؕ اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ

کے دن دیکھے گا تُو ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ پر جھوٹ بولا کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے، کیا جہنم میں

مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ (۶۰) وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ ۫ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ

متکبرین کا ٹھکانا نہیں؟ (۶۰) اور نجات دے گا اللہ ان لوگوں کو جو اللہ سے ڈرتے ہیں ان کی کامیابی کی جگہ میں، نہیں پہنچے گی ان کو برائی

وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۶۱) اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۫ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ (۶۲) لَهٗ

نہ وہ غمزدہ ہوں گے (۶۱) اللہ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کو، اور وہ ہر چیز کے اوپر نگہبان ہے (۶۲) اسی کے لئے ہیں

مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ (۶۳)

چابیاں آسمانوں کی اور زمین کی، اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اللہ کی آیات کے ساتھ، یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں (۶۳)

تفسیر

قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ: یہ بھی لوگوں کو توبہ اور استغفار کی تلقین ہے۔

شانِ نزول اور توبہ کی ترغیب

شانِ نزول میں ذکر کیا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے حضور ﷺ کے سامنے اس بات کو ذکر کیا تھا، کہ اگر ہم ایمان اور اسلام اب قبول بھی کرلیں تو کیا فائدہ ہوگا؟ جب ہم زندگی میں اتنے بڑے بڑے جرم کیے بیٹھے ہیں، اتنی دیر تک ہم نے کفر و شرک کیا ہے،

اگر وہ معاف نہ ہوا تو پھر ہمارے ایمان قبول کرنے کا کیا فائدہ ہوگا؟ (مظہری)۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ تسلی دی کہ انہیں کہہ دو کہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہ ہوو، توبہ کرلو، اللہ تعالیٰ سارے گناہ معاف کردے گا، چنانچہ قاعدہ بھی یہی ہے کہ زندگی کے اندر مایوسی کی کوئی بات نہیں، کوئی جرم ایسا نہیں کہ جس کے اِزالے کی اور اس کے دفع کرنے کی تدبیر اللہ نے نہ بتائی ہو، اور اُس تدبیر کو اختیار کرکے اس جرم سے انسان بری نہ ہوسکتا ہو، جیسے فارسی میں کسی نے اسی مفہوم کو ادا کیا ہے:

باز آ باز آ ہر آنچہ ہستی باز آ گر کافر و گبر و بُت پرستی باز آ
ایں درگہِ ما، درگہِ نومیدی نیست صد بار اگر توبہ شکستی باز آ

کہ جیسے بھی ہو آجاؤ، آتش پرست ہو، بُت پرست ہو، مشرک ہو، کسی کے لئے ہمارا دروازہ بند نہیں ہے، حتیٰ کہ ایک دفعہ اگر توبہ کرلی اور پھر دوبارہ گناہ ہوگیا، پھر بھی ہمارا دروازہ بند نہیں، سو دفعہ بھی اگر توبہ توڑ چکے ہو باز آؤ، آجاؤ، اللہ کی رحمت سے مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہاں! البتہ اگر اسی کُفر و شرک پر خاتمہ ہوگیا یا غرغرے کی کیفیت شروع ہوگئی، تو اس کے بعد پھر اللہ کی رحمت کے دروازے بند ہیں، اس لیے دیر نہ کرو، جتنی جلدی ہوسکتی ہے اس وقت سے فائدہ اُٹھاؤ اور اللہ کی رحمت سے فائدہ اٹھاؤ۔ قُلْ: آپ بیان کردیجئے، اعلان کردیجئے، یٰعِبَادِیَ: یہ اللہ کی کلام ہے جو حضور ﷺ پہنچانا چاہتے ہیں، اللہ کی جانب سے کہا جارہا ہے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنے نفسوں کے اوپر زیادتی کی ہے، لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ: اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوو، اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا: اللہ تعالیٰ سارے ہی گناہ معاف کردیتا ہے، وہ غفار ہے، سارے ہی گناہ معاف کرسکتا ہے، تم ایک دفعہ آکے معافی مانگو تو سہی، لیکن اگر شرک پر خاتمہ ہوگیا تو پھر اس کے بعد اللہ کا اعلان ہے کہ وہ کچھ معاف نہیں کرے گا، بلکہ کی ہوئی نیکیاں برباد ہوجائیں گی، گناہ سارے کے سارے لازم ہوجائیں گے۔ زندگی کے اندر مایوسی کی کوئی بات نہیں، اللہ کے سامنے آؤ اور اپنے گناہوں کا اعتراف کرو، معافی مانگو، اللہ تعالیٰ معاف کردے گا، بے شک وہ غفور رحیم ہے۔ پندنامہ کے شعر میں اسی آیت کی طرف اشارہ ہے:

مغفرت دارم اُمید اَز لطفِ تو زانکہ خود فرمودۂ لا تقنطوا

میں تیری مہربانی سے مغفرت کی اُمید رکھتا ہوں، چونکہ تُو نے خود ہی کہہ دیا ہے لَا تَقْنَطُوْا: مایوس نہ ہوو، تو ہم مغفرت کی اُمید لگائے ہوئے ہیں۔ تو توبہ کا دروازہ کھلا ہے، کیسا ہی جرم کیوں نہ ہو، اللہ تعالیٰ کے سامنے جاکے اقرار کرکے انسان رو لے، اور اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق اس کی تلافی کرنا چاہے تو تلافی ہوجاتی ہے۔

ابھی توبہ کرلو، ورنہ بعد میں پچھتاوا ہوگا

وَاَنِيْبُوْٓا اِلٰى رَبِّكُمْ: اور اپنے ربّ کی طرف توجہ کرو، متوجہ ہوجاؤ اپنے رَبّ کی طرف، وَاَسْلِمُوْا لَهٗ: اور اسی کے فرماں بردار

ہو جاؤ، مِنۡ قَبۡلِ اَنۡ یَّاۡتِیَکُمُ الۡعَذَابُ: قبل اس سے کہ تمہارے پاس عذاب آجائے، ثُمَّ لَا تُنۡصَرُوۡنَ: پھر تم مدد نہیں دیے جاؤ گے۔
وَاتَّبِعُوۡۤا اَحۡسَنَ مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ: پیروی کرو بہترین چیز کی جو تمہاری طرف اُتاری گئی، مَاۤ اُنۡزِلَ اِلَیۡکُمۡ سے قرآن مراد ہے، اور اس کو احسن کہا جا رہا ہے، کیونکہ اس کی تعلیمات پہلی کتابوں کے مقابلے میں بھی زیادہ حُسن و جمال لیے ہوئے ہیں (قرطبی)، یا ویسے فی حد ذاتہٖ حسن ثابت کرنا مقصود ہو، کسی سے مقابلہ نہ کیا جائے تو بھی ٹھیک ہے، تفضیل کا صیغہ بسا اوقات تفضیل کے معنی سے خالی ہو کر فی حد ذاتہٖ صفت کے لئے آتا ہے (قرطبی)۔ ''پیروی کرو بہترین اس چیز کی جو تمہاری طرف اُتاری گئی تمہارے رَبّ کی طرف سے قبل اس کے کہ آجائے تمہارے پاس عذاب اچانک اور تمہیں پتا بھی نہیں ہوگا'' اَنۡ تَقُوۡلَ نَفۡسٌ یّٰحَسۡرَتٰی: لِئَلَّا تقُوۡلَ (نسفی) ایسا نہ ہو کہ کوئی نفس کہے۔ یعنی آج اللہ کی طرف انابت اختیار کرلو، اس کے اَحکام کی فرماں برداری کرلو، جو بہترین باتیں تمہاری طرف اُتاری گئی ہیں ان کی پیروی کرلو، کہیں ایسا نہ ہو کہ پھر یوں کہنا پڑے۔ ''تا کہ نہ کہے کوئی نفس، ہائے افسوس!'' عَلٰی مَا فَرَّطۡتُّ فِیۡ جَنۡۢبِ اللّٰہِ: مَا فَرَّطۡتُّ میں مَا مصدریہ ہے۔ میرے کوتاہی کرنے پر اللہ کی جناب میں، ''اللہ کی جانب، اللہ کے باب میں، اللہ کی جناب میں کوتاہی کرنے پر ہائے افسوس! اور بے شک تھا میں البتہ ٹھٹھا کرنے والوں میں سے'' پھر یوں چیخو گے اور پھر یوں اس طرح سے اپنا منہ نوچو گے، لیکن پھر کچھ نہیں بن سکے گا، ''ساخرین میں سے تھا'' جب اللہ کی کوئی بات سامنے آتی تھی تو میں مذاق اُڑاتا تھا، جس طرح سے آج بھی جاہلوں کی عادت ہے کہ جب اُن کے سامنے کوئی دِین کی بات کی جائے تو آگے سے ہنسی اُڑاتے ہیں، تو ساخرین یہی ہیں، ''ہائے افسوس میرے کوتاہی کرنے پر اللہ کی جناب میں'' وَاِنۡ کُنۡتُ لَمِنَ السّٰخِرِیۡنَ: اِن مخففہ من المثقلہ ہے، یہ ''اِن'' شرطیہ نہیں۔ بے شک تھا میں ٹھٹھا کرنے والوں میں سے۔ اَوۡ تَقُوۡلَ لَوۡ اَنَّ اللّٰہَ ہَدٰىنِیۡ لَکُنۡتُ مِنَ الۡمُتَّقِیۡنَ: یا ایسا نہ ہو کہ یوں کہے (اَوۡ تَقُوۡلَ یہ وہی لِاَنۡ لَا تَقُوۡلَ ہے) تا کہ نہ کہے کوئی نفس کہ اگر اللہ تعالیٰ مجھے ہدایت دیتا تو میں بھی متقین میں سے ہو جاتا، حسرت اور افسوس کے ساتھ یوں کہے گا، اَوۡ تَقُوۡلَ حِیۡنَ تَرَی الۡعَذَابَ: یا کوئی یوں کہے گا جس وقت کہ عذاب دیکھے گا (تَقُوۡلَ کی ضمیر نفس کی طرف لوٹ رہی ہے، یہ واحد مؤنث کا صیغہ ہے) یا کہے کوئی نفس، ایسا نہ ہو کہ کہے کوئی نفس جس وقت کہ عذاب دیکھے گا، لَوۡ اَنَّ لِیۡ کَرَّۃً کاش! کہ میرے لئے لوٹنا ہو، فَاَکُوۡنَ مِنَ الۡمُحۡسِنِیۡنَ: تو میں بھی نیکو کاروں میں سے ہو جاؤں گا۔ یہ اس وقت چیخے گا جس وقت عذاب دیکھے گا، تو کبھی منہ سے کچھ نکلے گا، کبھی کچھ نکلے گا۔ کبھی کہے گا، ہائے افسوس! میں نے بڑی کوتاہی کی، مجھے کوتاہی کرنی نہیں چاہیے تھی، کبھی حسرت اور افسوس کے طور پر کہے گا کہ ہائے کاش! اللہ تعالیٰ مجھے اگر ہدایت دیتا تو میں بھی متقین میں سے ہو جاتا، اور کبھی یوں کہے گا کہ ہائے کاش! میں واپس چلا جاؤں، تو اب جا کر نیک کام کر آؤں، پریشانی کے اندر، وحشت کے اندر، پھر اس قسم کی باتیں کرے گا۔

بَلٰی قَدۡ جَآءَتۡکَ اٰیٰتِیۡ فَکَذَّبۡتَ بِہَا: یہ درمیان میں جو بات آئی تھی کہ لَوۡ اَنَّ اللّٰہَ ہَدٰىنِیۡ اس کے جواب کے طور پر بات کہی جا رہی ہے کہ ہدایت تو تیرے پاس آئی تھی۔ ''کیوں نہیں! تیرے پاس ہماری آیات آئی تھیں'' اللہ نے تو تجھے ہدایت دی تھی، تو یہ کیسے کہتا ہے کہ اللہ نے مجھے ہدایت نہیں دی، اللہ نے تو تیرے سامنے راستہ نمایاں کیا تھا، لیکن تُو نے خود سستی کی نہیں مانا۔ ''کیوں

نہیں! آئی تھیں تیرے پاس میری آیات، تُو نے اُن کو جھٹلایا' وَاسْتَكْبَرْتَ وَكُنْتَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ: اور تُو بڑا بنا۔ اور اِستکبار یہی ہوتا ہے کہ حق بات کو قبول نہ کیا جائے،'' تو بڑا بنا اور تُو کافروں میں سے تھا۔'' وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ تَرَى الَّذِيْنَ كَذَبُوْا عَلَى اللّٰهِ: اور قیامت کے دن دیکھے گا تُو ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ پر جھوٹ بولا، یعنی جو دلیل کے ساتھ بات نہیں کرتے، اپنی طرف سے من گھڑت باتیں بناتے ہیں، جس طرح سے آپ کے سامنے ذکر کیا گیا، کہ ہر مشرک جھوٹا ہوتا ہے، جو اللہ کے متعلق جھوٹی باتیں کرتا ہے،'' دیکھے گا تُو'' یہ خطاب ہر کسی کو ہے۔'' دیکھے گا تُو ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ پر جھوٹ بولا، کہ ان کے چہرے سیاہ ہوں گے''، آج یہ تمہیں بڑے گورے سفید نظر آ رہے ہیں، بنے سنورے ہوئے، لیکن جب اللہ کے سامنے جائیں گے سب کے منہ سیاہ ہوں گے، وُجُوْهُهُمْ مُّسْوَدَّةٌ: ان کے منہ سیاہ ہوں گے، اَلَيْسَ فِيْ جَهَنَّمَ مَثْوًى لِّلْمُتَكَبِّرِيْنَ: کیا جہنم میں متکبرین کا ٹھکانا نہیں؟ یقینی ہے۔ یہ اِستفہام کے طور پر ذکر کیا جارہا ہے کہ متکبرین جو اللہ کی بات کو قبول نہیں کرتے ان کے متعلق یہ بات بہت ہی واضح ہے کہ ان کا ٹھکانا جہنم میں ہے، جس سے پوچھو وہ یہی کہے گا کہ اللہ کے سامنے تکبر کرنے والوں کا ٹھکانا سوائے جہنم کے اور ہو کیا سکتا ہے۔

اہلِ ایمان کی کامیابی

وَيُنَجِّي اللّٰهُ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا بِمَفَازَتِهِمْ: اور نجات دے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جو اللہ سے ڈرتے ہیں، بِمَفَازَتِهِمْ: فَازَ يَفُوْزُ: کامیاب ہونا۔ مَفَازَة: اگر اس کو ظرف کے معنی میں لے لیں، کامیابی کی جگہ (جلالین)۔'' اللہ تعالیٰ نجات دے گا متقین کو اُن کی کامیابی کی جگہ میں'' یعنی جنت میں پہنچا دے گا، یہی نجات ہے۔ اگر ظرف کے ساتھ اک ترجمہ کیا جائے تو یوں ہوگا، اور اگر مصدر میمی کے ساتھ ترجمہ کیا جائے تو بھی ٹھیک ہے (آلوسی)۔'' نجات دے گا اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو جنہوں نے تقویٰ اختیار کیا اُن کی کامیابی کے ساتھ، فوز وفلاح کے ساتھ۔'' حضرتِ شیخ (الہندؒ) نے ترجمہ اُن کے بچاؤ کی جگہ کیا ہے، یہ ظرف والا معنی ہے۔ لَا يَمَسُّهُمُ السُّوْٓءُ: اُن کو کوئی بُرائی نہیں پہنچے گی، نہیں پہنچے گی اُن کو برائی، وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ وہ غمزدہ ہوں گے۔

صفاتِ الٰہیہ کا بیان

اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۙ وَّهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ: اللہ پیدا کرنے والا ہے ہر چیز کو، اور وہ ہر چیز کے اوپر نگہبان ہے، ذمہ دار ہے۔ وکیل: کہتے ہیں مَوْكُوْلٌ اِلَيْهِ الْاَمْرُ جس کے معاملہ سپرد کیا ہوا ہو۔ تو پیدا کرنے والا بھی وہی ہے اور اس کے اس کا نگہبان بھی وہی ہے، ذمہ دار بھی وہی ہے، اور آگے ذکر کیا جارہا ہے کہ متصرف بھی وہی ہے۔ لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: مَقَالِيْدُ یہ مِقْلِيد، یا مِقْلاد کی جمع ہے (مظہری)۔ یہ چابی کو کہتے ہیں۔ تو بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ کلید جو فارسی کا لفظ ہے مقلید اُس سے معرب ہے (نسفی)۔ کلید فارسی میں چابی کو کہتے ہیں، اور جس مکان کی چابی جس کے ہاتھ میں ہوتی ہے تو اس میں تصرف کرنے کا حق اسی کو ہی ہوتا ہے۔ تو زمین وآسمان کی چابیاں اللہ کے پاس ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین وآسمان کے اندر تصرف صرف اللہ کو حاصل ہے، بغیر اللہ کی اجازت کے نہ زمین وآسمان سے کوئی شخص کچھ حاصل کرسکتا ہے، نہ کوئی دوسرا تصرف کرسکتا ہے، یہ سب خزانے اسی

کے قبضے میں ہیں۔''اسی کے لئے ہیں چابیاں آسمانوں کی اور زمین کی''، تو چابیاں ذِکر کر کے اصل میں تصرف ذِکر کرنا مقصود ہے کہ قبضہ مکمل اسی کا ہے، چابیاں اسی کے پاس ہیں، تصرف وہی کرتا ہے۔''اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اللہ کی آیات کے ساتھ، یہی لوگ خسارہ پانے والے ہیں۔''

قُلۡ اَفَغَيۡرَ اللّٰهِ تَاۡمُرُوۡٓنِّيۡٓ اَعۡبُدُ اَيُّهَا الۡجٰهِلُوۡنَ ﴿۶۴﴾ وَلَقَدۡ اُوۡحِيَ اِلَيۡكَ وَ

آپ کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! کیا اللہ کے غیر کے متعلق تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں اس کی پُوجا کروں ﴿۶۴﴾ حالانکہ وحی کردی گئی تیری طرف اور

اِلَى الَّذِيۡنَ مِنۡ قَبۡلِكَ ۚ لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ

ان لوگوں کی طرف جو تجھ سے پہلے گزرے ہیں کہ اگر تُو نے شرک کیا تو تیرا عمل ضائع ہوجائے گا اور تُو خسارہ پانے والوں

الۡخٰسِرِيۡنَ ﴿۶۵﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعۡبُدۡ وَكُنۡ مِّنَ الشّٰكِرِيۡنَ ﴿۶۶﴾ وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ

میں سے ہوجائے گا ﴿۶۵﴾ بلکہ تُو اللہ کی ہی عبادت کر، اور ہوجا شکر گزاروں میں سے ﴿۶۶﴾ نہیں اندازہ کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کا

حَقَّ قَدۡرِهٖ ۖ وَالۡاَرۡضُ جَمِيۡعًا قَبۡضَتُهٗ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطۡوِيّٰتٌۢ

اس کا اندازہ کرنے کا حق، اور زمین ساری کی ساری اس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دِن، اور آسمان لپیٹے ہوئے ہوں گے

بِيَمِيۡنِهٖ ؕ سُبۡحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشۡرِكُوۡنَ ﴿۶۷﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوۡرِ

اس کے دائیں ہاتھ میں، اللہ پاک ہے اور بالاتر ہے ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں ﴿۶۷﴾ صور میں پھونک ماری جائے گی،

فَصَعِقَ مَنۡ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِي الۡاَرۡضِ اِلَّا مَنۡ شَآءَ اللّٰهُ ؕ ثُمَّ نُفِخَ فِيۡهِ اُخۡرٰى

پس بے ہوش ہوجائیں گے وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں مگر جن کے متعلق اللہ چاہے، پھر اس صور میں دوسری پھونک ماری جائے گی

فَاِذَا هُمۡ قِيَامٌ يَّنۡظُرُوۡنَ ﴿۶۸﴾ وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّهَا وَوُضِعَ الۡكِتٰبُ وَ

پس اچانک وہ سارے لوگ کھڑے جھانکتے ہوں گے ﴿۶۸﴾ اور روشن ہوجائے گی زمین اپنے ربّ کے نُور کے ساتھ اور کتاب رکھی جائے گی اور

جِايۡٓءَ بِالنَّبِيّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ وَقُضِيَ بَيۡنَهُمۡ بِالۡحَقِّ وَهُمۡ لَا يُظۡلَمُوۡنَ ﴿۶۹﴾

لایا جائے گا نبیوں کو اور گواہوں کو، اور فیصلہ کیا جائے گا لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ اور ان پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی ﴿۶۹﴾

وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۰﴾

پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس جو اس نے کیا، اور اللہ خوب جانتا ہے ان کاموں کو جو یہ لوگ کرتے تھے ﴿۷۰﴾

تفسیر

غیر اللہ کی عبادت جہالت کیسے ہے؟

قُلْ اَفَغَيْرَ اللّٰهِ تَاْمُرُوْٓنِّيْٓ اَعْبُدُ اَيُّهَا الْجٰهِلُوْنَ: مطلب یہ ہوا کہ یہ باتیں تو ساری کی ساری واضح ہیں، پیدا کرنے والا وہی، متصرف وہی، ہر قسم کا اختیار اسی کو حاصل ہے، تو ان باتوں کے جاننے کے باوجود اے جاہلو! تم مجھے کہتے ہو کہ میں اللہ کے علاوہ کسی اور کی پُوجا کروں؟ جاھلون: یعنی جو ان حقائق کو نہیں سمجھتے وہ جاہل ہیں، جاہل کا معنی ہوا کرتا ہے جو علم اور عقل کے مقابلے میں اپنی خواہش اور جذبات کی اتباع کرنے والا ہو، تو جو علم کے مطابق نہیں چلتے، عقلی دلیل کے ساتھ اپنی بات کو نہیں ثابت کرتے، یا عقل کے ساتھ ثابت شدہ حقائق کو تسلیم نہیں کرتے، محض اپنی خواہشات اور جذبات کے پیچھے چلنے والے ہیں، تو ایسے جاہلوں کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے کہ ہمارے سامنے علم کی روشنی ہے، ہمارے سامنے عقل کے تقاضے ہیں، اور تم محض خواہشات اور جذبات پر چلنے والے ہو، خود اندھے ہو اور دوسرے آنکھوں والوں کو بھی چاہتے ہو کہ یہ بھی اندھے بن جائیں، یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ تو علم اور عقل کی روشنی میں اگر آپ نے کوئی فیصلہ کیا ہے، تو اس کے خلاف جو بھی کہے گا وہ جاہل ہے، کیونکہ اس کے مقابلے میں اگر بات آسکتی ہے تو جذبات کی آسکتی ہے، خواہشات کی آسکتی ہے، اندھی تقلید کی آسکتی ہے، رسم و رواج کی آسکتی ہے، علم و عقل کے مقابلے میں علم کی بات کہاں سے آئے گی؟ اس لئے جو حقیقت علم اور عقل کے ساتھ ثابت ہو جائے اُس کے مقابلے میں جو نظریہ بھی ہوگا وہ جہالت ہے، اس لیے یہاں خطاب کیا جا رہا ہے کہ ”آپ کہہ دیجئے کہ اے جاہلو! کیا اللہ کے غیر کے متعلق تم مجھے حکم دیتے ہو کہ میں اس کی پُوجا کروں؟“ تو اللہ کے غیر کی عبادت کرنا یہ جہالت ہے، جو لوگ محض اتباعِ اسلاف کی بنا پر، اتباعِ آباء کی بنا پر، رسم و رواج کے تقاضے سے، محض اپنی خواہشات کے تحت، اپنے جذبات کے تحت کرتے تھے، ورنہ علم و عقل کی روشنی میں اللہ کے غیر کی عبادت کا کوئی معنی نہیں ہے۔ ”اے نادانو! اے جاہلو! تم مجھے حکم دیتے ہو؟ کہ میں اللہ کے غیر کی پُوجا کروں۔“

”شرک“ سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں

وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ: حالانکہ تیری طرف وحی کر دی گئی اور ان لوگوں کی طرف وحی کر دی گئی جو تم سے پہلے گزرے ہیں، یعنی تمام انبیاء ﷺ کی طرف، کیا وحی کر دی گئی؟ یہ مضمون وحی کے ذریعے سے پہنچا دیا گیا لَئِنْ اَشْرَكْتَ: کہ اگر تو نے شرک کیا لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ: تو تیرا عمل ضائع ہو جائے گا، وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ: اور تو خسارہ پانے والوں میں سے ہو جائے گا، یعنی یہ ضابطہ جو ہے کہ شرک کی بنا پر اعمال حبط ہوتے ہیں اور آخرت میں خسارہ نمایاں ہوگا، یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو آپ کی طرف بھی

وحی کی گئی اور آپ سے پہلے تمام انبیاء علیہم السلام کی طرف وحی کی گئی۔ جیسا کہ سورۂ انبیاء کے اندر آیا تھا کہ کوئی نبی نہیں آیا مگر ہم نے اس کی طرف وحی یہی کی ہے کہ لَا اِلٰہَ اِلَّا اَنَا (آیت: ۲۵) میرے بغیر کوئی معبود نہیں، تو یہ ایک ایسی حقیقت ہے جو صرف آپ پر نہیں اُتاری گئی، بلکہ تمام انبیاء تک یہی بات پہنچائی گئی کہ جو شرک کرے گا اُس کا عمل حبط ہو جائے گا، اور آخرت میں اس کا خسارہ نمایاں ہے، تو تمہارے کہنے کی بنا پر میں غیر اللہ کو نہیں پوجتا، بَلِ اللّٰہَ فَاعْبُدْ: اللہ کی طرف سے کہا جا رہا ہے بلکہ تو اللہ ہی کی عبادت کر، وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ: اور ہو جا شکر گزاروں میں سے، کیونکہ شرک سب سے بڑی ناشکری ہے۔

کافروں نے اللہ کی قدر نہیں پہچانی

وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ: قَدَرَ: اندازہ کرنے کو کہتے ہیں۔ نہیں اندازہ کیا انہوں نے اللہ کا اُس کا اندازہ کرنے کا حق، یعنی اللہ کی انہوں نے قدر نہیں پہچانی، اللہ کی عظمت اور اس کی حیثیت کو انہوں نے نہیں جانا۔ ''نہیں اندازہ کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کا جس طرح سے اندازہ کرنے کا حق ہے''، ''نہیں پہچانا، نہیں قدر جانی انہوں نے اللہ کی'' اپنی زبان میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرتوں کا، اللہ تعالیٰ کی عظمتوں کا انہوں نے صحیح اندازہ نہیں کیا جو لکڑی پتھر کو بھی اٹھا کے اللہ کے ساتھ شریک کر دیا، اللہ کی مخلوق کو اُٹھا کے اللہ کے ساتھ شریک کر دیا، انہوں نے اللہ کی کیا قدر پہچانی؟ ''نہیں اندازہ کیا انہوں نے اللہ تعالیٰ کا اس کا اندازہ کرنے کا حق۔''

قدرتِ الٰہی کا بیان اور صفاتِ متشابہات کے متعلق وضاحت

''اور زمین ساری کی ساری اُس کی مٹھی میں ہوگی قیامت کے دن، اور آسمان لپیٹے ہوئے ہوں گے اس کے دائیں ہاتھ میں'' یہ اللہ کی عظمت کا بیان ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ تو اتنا عظیم قدرت والا ہے کہ ساری کی ساری زمین اس کی مٹھی میں ہوگی، اور آسمان بھی لپیٹ کے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے۔ مطویات: لپیٹے ہوئے ہوں گے۔ طَوٰی یَطْوِیْ: لپیٹنا۔ زمین مٹھی میں ہوگی، آسمان لپیٹے ہوئے اس کے دائیں ہاتھ میں ہوں گے، یہ بات تو اپنی جگہ واضح ہے کہ ان لفظوں میں یہ نمایاں کیا جا رہا ہے کہ زمین آسمان سب اللہ کی مٹھی میں اور اللہ کے ہاتھوں میں ہے، اور یہ ہمارا بھی محاورہ ہے کہ جب کسی چیز کے اوپر مکمل قبضہ اور تسلط ذکر کرنا ہو تو کہتے ہیں کہ ''فلاں چیز تو میری مٹھی میں ہے!''، ''فلاں چیز تو لپٹی ہوئی میرے ہاتھ میں ہے!'' تو یہ قبضہ اور تصرف تو نمایاں ہے، باقی مٹھی کس طرح سے اللہ تعالیٰ بھریں گے، اور آسمانوں کو لپیٹ کے دائیں ہاتھ پہ کس طرح سے رکھیں گے؟ یہ چیز متشابہات میں داخل ہے، جس طرح سے اللہ تعالیٰ کی صفات کی ہم کوئی تشبیہ یا مثال نہیں دے سکتے، یہاں بھی اس کو کسی مثال سے نمایاں نہیں کیا جا سکتا، یہ تصور بھی اپنے دماغ میں نہ لائیں کہ ہم اپنا ہاتھ پھیلا کر کہیں کہ اس طرح سے آسمان لپیٹ کر اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ پہ رکھے ہوئے ہوں گے، اور اس طرح سے اللہ نے مٹھی بھری ہوئی ہوگی، تشبیہ سے اللہ پاک ہے، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (سورۂ شوریٰ: ۱۱) اس جیسی کوئی چیز نہیں، جس کی بنا پر ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، جو صورت اس وقت سامنے آئے گی سب دیکھ لیں گے، اللہ کی شان کے مطابق جس طرح سے ہے ویسی بات ہو جائے گی، لیکن جو اس کا حاصل ہے کہ زمین آسمان کے اوپر مکمل قبضہ قدرت اللہ کا ہے، اور یہ اللہ

کے ہی ہاتھ میں ہے اس کا تصرف پورے کا پورا اللہ کے اختیار میں ہے، یہ بات اپنی جگہ ثابت ہے، باقی یمین کی مثال یا مٹھی بھرنے کی مثال ہم نہیں دے سکتے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی صفات کو ہم کسی مثال کے ساتھ واضح نہیں کر سکتے، لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (سورۂ شوریٰ:۱۱)، اس تشبیہ سے بچنا ضروری ہے، جب بھی اس قسم کی بات آتی ہے اللہ کے ہاتھ کی، یا اللہ کے پاؤں کی، جس طرح سے حدیث میں پاؤں کا ذکر ہے، سورۂ ن کے اندر ''ساق'' کا ذکر ہے، اور مختلف آیات کے اندر اللہ کے ''وجہ'' کا ذکر ہے، یا روایات میں اللہ کے اُترنے کا، اللہ کے آنے کا ذکر ہے، ان تمام صفات کے متعلق اہلِ سنّت والجماعت کا مسلک یہی ہے: کما یلیق بشانہ، جیسے اللہ کی شان کے لائق ہے ہم اس پر ایمان لاتے ہیں، اس کو ہم کسی مثال کے ساتھ واضح نہیں کر سکتے۔ اس لیے سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ، تو ساتھ ہی سُبْحٰنَهٗ آ گیا کہ اللہ تعالیٰ ہر عیب سے پاک ہے، اور بلند و بالاتر ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے، یا ان چیزوں سے جن کو یہ شریک ٹھہراتے ہیں۔

دو نفخوں کے وقت کیفیت

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ: صور میں پھونک ماری جائے گی، فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ: پس بے ہوش ہوجائیں گے وہ سب جو آسمانوں میں ہیں اور جو زمین میں ہیں، اِلَّا مَنْ شَآءَ اللّٰهُ: مگر جن کے متعلق اللہ چاہے، وہ اس سے بچ جائیں گے، اس سے حاملینِ عرش مراد ہیں، یا بڑے فرشتے جبریل علیہ السلام، اسرافیل علیہ السلام، میکائیل علیہ السلام، عزرائیل علیہ السلام یہ مراد ہیں۔ اور پھر ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ بعد میں ان کو اپنی قدرت کے ساتھ علیحدہ موت دے، بہر حال مَنْ شَآءَ اللّٰهُ میں یہ ذکر کر دیا گیا کہ جس کو اللہ چاہے گا وہی بچے گا، باقی جو کچھ زمین اور آسمان میں ہے نفخِ صور کے ساتھ سب بے ہوش ہوجائیں گے، پہلے بے ہوشی طاری ہوگی، اس کے بعد جو زندہ ہوں گے، مر جائیں گے، اور جو پہلے مر چکے ہوں گے ان کی رُوحوں پر بھی بے ہوشی طاری ہو جائے گی، ثُمَّ نُفِخَ فِيْهِ اُخْرٰى: پھر اس صور میں دُوسری پھونک ماری جائے گی، فَاِذَا هُمْ قِيَامٌ يَّنْظُرُوْنَ: پس اچانک وہ سارے لوگ کھڑے جھانکتے ہوں گے، یعنی نفخِ صور کے ساتھ ہی سارے اُٹھ کھڑے ہوں گے جس طرح سے حیرت اور حیرانی کے ساتھ انسان نئے واقعے کو دیکھتا ہے، ویسے دیکھ رہے ہوں گے۔ تو یہ جو آیا تھا کہ اللہ کی قدر انہوں نے نہیں کی، اللہ کی عظمت انہوں نے نہیں پہچانی، تو یہ عظمت ذکر کی جارہی ہے، کہ زمین و آسمان اسی کے قبضے میں، اور اس کی قدرت ایسی ہے کہ ایک ہی نفخے کے ساتھ ساری کی ساری مخلوق تباہ ہوجائے گی، اور ایک ہی پھونک کے ساتھ سارے کے سارے اُٹھ کر کھڑے ہوجائیں گے، اللہ تعالیٰ کی عظمت تو ایسی ہے، اللہ تعالیٰ کا تصرف تو اس قسم کا ہے!

حساب و کتاب کے وقت کی کیفیت

وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا: یہ حساب و کتاب کے لئے جب اللہ تعالیٰ نزول فرمائیں گے اس وقت کی کیفیت ہے۔ ''روشن ہوجائے گی زمین اپنے رَبّ کے نُور کے ساتھ'' وَوُضِعَ الْكِتٰبُ: اور کتاب رکھی جائے گی، کتاب سے یہاں نامۂ اعمال مراد

ہے، وَجِایْٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّهَدَآءِ: اور نبیوں کو لایا جائے گا، شہداء کو لایا جائے گا، جو گواہ بننے والے ہیں، جس میں علماء، اولیاء سب شامل ہیں، اور یہ ساری اُمّت دُوسری اُمّتوں کے مقابلے میں بطور گواہ کے حاضر کی جائے گی، اسی طرح سے انسان کے اعضا بھی شہداء میں داخل ہیں، ''لایا جائے گا نبیوں کو اور گواہوں کو'' وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ: اور فیصلہ کیا جائے گا لوگوں کے درمیان حق کے ساتھ، اور ان پر کوئی زیادتی نہیں ہوگی'' لَا یُظْلَمُوْنَ کا معنی ہوتا ہے کہ کسی کی نیکی بلاوجہ برباد نہیں کی جائے گی، گناہ کی زیادہ سزا نہیں دی جائے گی، بس جو اس کے متعلق اللہ کا ضابطہ اور حکمت ہے اسی کے مطابق ہی فیصلہ ہوگا، باقی! کسی کا گناہ معاف کر دیا جائے یہ تو رحمت ہے، کسی کی نیکی پہ زیادہ ثواب دے دیا جائے یہ تو کرم ہے، اس قسم کی رحمت اور کرم تو اللہ کے ہاں ہوگا، لیکن گناہ نہ کیا ہو اور سزا مل جائے، یا نیکی بلاوجہ برباد کر دی جائے، ایسا نہیں ہوگا۔ وَوُفِّیَتْ کُلُّ نَفْسٍ مَّا عَمِلَتْ: پورا پورا دیا جائے گا ہر نفس جو اس نے کیا ہے۔ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَا یَفْعَلُوْنَ: اور اللہ خوب جانتا ہے ان کاموں کو جو یہ لوگ کرتے تھے، کسی کا کوئی فعل اللہ سے مخفی نہیں، اللہ کے علم میں ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ ہر نفس کو اس کے کیے کا پورا پورا بدلہ دے گا۔

وَسِیْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی جَهَنَّمَ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْهَا فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا وَ
چلایا جائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا جہنّم کی طرف گروہ در گروہ، حتیٰ کہ جب وہ آئیں گے اس جہنّم کے پاس تو اس کے دروازے کھولے جائیں گے اور
قَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ یَتْلُوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ رَبِّكُمْ وَ
کہیں گے ان کو جہنّم کے منتظم، کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے تمہی میں سے، تلاوت کرتے تھے تم پر وہ تمہارے رَبّ کی آیات اور
یُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا ؕ قَالُوْا بَلٰی وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ ﴿۷۱﴾
ڈراتے تھے تمہیں تمہارے اس دِن کی ملاقات سے، وہ کہیں گے کہ کیوں نہیں، لیکن کلمۂ عذاب ثابت ہوگیا کافروں پر ﴿۷۱﴾
قِیْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَكَبِّرِیْنَ ﴿۷۲﴾ وَ
کہا جائے گا انہیں کہ داخل ہو جاؤ جہنّم کے دروازوں میں، ہمیشہ رہنے والے ہو گے اس جہنّم میں، متکبرین کا بُرا ٹھکانا ہے ﴿۷۲﴾ اور
سِیْقَ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا رَبَّهُمْ اِلَی الْجَنَّةِ زُمَرًا ؕ حَتّٰۤی اِذَا جَآءُوْهَا وَفُتِحَتْ
چلایا جائے گا ان لوگوں کو جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں جنّت کی طرف گروہ در گروہ، حتیٰ کہ جب یہ اس جنّت کے پاس آئیں گے اور اس کے دروازے
اَبْوَابُهَا وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا سَلٰمٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُمْ فَادْخُلُوْهَا خٰلِدِیْنَ ﴿۷۳﴾
کھلے ہوئے ہوں گے، اور جنّت کے منتظمین کہیں گے ان کو، تم پر سلام، تم بہت اچھے لوگ ہو، داخل ہو جاؤ اس جنّت میں اس حال میں کہ ہمیشہ رہنے والے ہو ﴿۷۳﴾

وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ

اور جنتی کہیں گے: شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، اور وارث بنا دیا ہمیں زمین کا، ہم ٹھکانا پکڑتے ہیں جنت سے

حَیْثُ نَشَآءُ ۚ فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِیْنَ ﴿۷۴﴾ وَتَرَی الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّیْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ

جہاں چاہتے ہیں، عمل کرنے والوں کا اجر بڑا اچھا ہے ﴿۷۴﴾ اور اے مخاطب! دیکھے گا تو فرشتوں کو کہ وہ گھیرا ڈالنے والے ہوں گے عرش کے اردگرد

یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ۚ وَقُضِیَ بَیْنَهُمْ بِالْحَقِّ وَقِیْلَ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۷۵﴾

تسبیح بیان کرتے ہوں گے اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ، اور لوگوں کے درمیان میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا، اور سب پکاریں گے کہ سب صفتیں اللہ کے لئے ہیں جو ربّ العالمین ہے ﴿۷۵﴾

کافروں کا انجام

اس بدلے کے بعد پھر مخلوق دو حصوں میں تقسیم ہو جائے گی، بعضے مجرم مشرک ہوں گے جن کو جہنم کی طرف لے جایا جائے گا، بعضے نیک ہوں گے جن کو جنت کی طرف لے جایا جائے گا، اب ان کے انجام کی کچھ تفصیل ہے۔ وَسِیْقَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْٓا اِلٰی جَهَنَّمَ زُمَرًا: سوق: چلانا۔ چلایا جائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا جہنم کی طرف گروہ در گروہ، زُمَرًا: زمرۃ زمرۃ کے معنی میں ہے، گروہ در گروہ یعنی ایک ایک درجے کے کافر اور مشرک ایک گروہ کے بن جائیں گے، جس طرح سے مؤمنین میں درجات کا فرق ہے کافرین مشرکین میں بھی تو فرق ہے، کوئی کسی درجے کا، کوئی کسی درجے کا، تو زُمَرًا سے وہی گروہ در گروہ مراد ہیں۔ ''حتیٰ کہ جب وہ آئیں گے اس جہنم کے پاس'' فُتِحَتْ اَبْوَابُهَا: اُس کے دروازے کھولے جائیں گے، وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَآ: اور کہیں گے اُن کو جہنم کے خازنین۔ خزنۃ: خازن کی جمع ہے، انتظام کرنے والے فرشتے۔ کہیں گے ان کو جہنم کے خازن، جہنم کے منتظم، اَلَمْ یَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ: یعنی دروازہ کھول کے اندر کو دھکے بھی دیں گے اور ساتھ ساتھ یہ تنبیہ بھی کریں گے۔ کیا تمہارے پاس رسول نہیں آئے تھے تمہی میں سے، یَتْلُوْنَ عَلَیْكُمْ اٰیٰتِ رَبِّكُمْ: تلاوت کرتے تھے تم پر وہ تمہارے ربّ کی آیات، وَیُنْذِرُوْنَكُمْ: اور ڈراتے تھے تمہیں لِقَآءَ یَوْمِكُمْ هٰذَا: تمہارے اس دن کی ملاقات سے، کیا تمہارے پاس ایسے رسول نہیں آئے؟ قَالُوْا بَلٰی: وہ کہیں گے کہ کیوں نہیں، آئے، بَلٰی کا معنیٰ ''آئے ہیں'' وَلٰكِنْ حَقَّتْ كَلِمَةُ الْعَذَابِ عَلَی الْكٰفِرِیْنَ: لیکن کلمۂ عذاب ثابت ہو گیا کافروں پر۔ ''کلمۂ عذاب'' سے لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (سورۂ ہود: ۱۱۹) والی بات مراد ہے۔ اور اپنے آپ کو کافر قرار دیں گے، کافر قرار دے کر کہیں گے کہ کلمۂ عذاب ثابت ہو گیا۔ قِیْلَ ادْخُلُوْٓا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ: کہا جائے گا انہیں کہ داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، خٰلِدِیْنَ فِیْهَا: ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس جہنم میں، فَبِئْسَ مَثْوَی الْمُتَكَبِّرِیْنَ: متکبرین کا بُرا ٹھکانا ہے۔ معلوم ہو گیا کہ ان کا کفر جو تھا وہ زیادہ تر تکبر کی وجہ سے تھا کہ اپنے آپ کو بڑا مانتے تھے، اللہ تعالیٰ کی بات کو مانتے نہیں تھے۔

مؤمنین کا انجام

''چلایا جائے گا ان لوگوں کو جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں جنت کی طرف گروہ در گروہ، حتیٰ کہ جب یہ اس جنت کے پاس آئیں گے اور اس کے دروازے کھلے ہوئے ہوں گے'' وَفُتِحَتْ اَبْوَابُهَا: یہاں واؤ آ گئی، جس طرح سے مہمان کے استقبال کے لئے انسان دروازے کھول کر پہلے ہی کھڑا ہوتا ہے، اور وہاں ہے کہ ان کے آنے پر دروازے کھولے جائیں گے، جس طرح سے جیل کا دروازہ تبھی کھولتے ہیں جب مجرم دروازے پہ آ جائے، اور پھر دروازہ کھول کے اس کو اندر دھکیل کے دروازہ بند کر دیتے ہیں، اور جنت کے دروازے پہلے ہی کھلے ہوئے ہوں گے، فرشتے استقبال کے لئے کھڑے ہوں گے تَتَلَقّٰهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ (سورۂ انبیاء: ۱۰۳) آگے بڑھ بڑھ کے ملیں گے، سلام کہیں گے، ''چلایا جائے گا ان لوگوں کو جو اپنے رَبّ سے ڈرتے ہیں جنت کی طرف گروہ در گروہ حتیٰ کہ جب اس جنت کے پاس آئیں گے اور اس کے دروازے کھول دیے جائیں گے'' وَقَالَ لَهُمْ خَزَنَتُهَا: اور اس جنت کے خازنین، منتظمین کہیں گے ان کو، سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ طِبْتُمْ: تم پر سلام، تم بہت اچھے لوگ ہو، یہ طِبْتُمْ ایسے ہی ہے جس طرح سے شاد باش، خوش رہو، بہت بھلے لوگ ہو، خوش آمدید، طِبْتُمْ کے اندر یہ ساری کی ساری چیزیں داخل ہیں، ''تم بہت اچھے لوگ ہو، بڑے اچھے پاکیزہ لوگ ہو'' فَادْخُلُوْهَا: داخل ہو جاؤ اس جنت میں، خٰلِدِيْنَ: اس حال میں کہ ہمیشہ رہنے والے ہو۔ اُن کو اس طرح سے کہا جائے گا۔

اِختتام اللہ کی حمد پر ہوگا

تو جب یہ سارا عملی فیصلہ ہو جائے گا تو اس وقت جنتی کہیں گے: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِيْ صَدَقَنَا وَعْدَهٗ: شکر ہے اس اللہ کا جس نے ہم سے اپنا وعدہ سچا کر دکھایا، انبیاء ﷺ کی زبان سے جو وعدے کیے تھے وہ سچے کیے، وَاَوْرَثَنَا الْاَرْضَ نَتَبَوَّاُ مِنَ الْجَنَّةِ حَيْثُ نَشَآءُ: اور وارث بنا دیا ہمیں زمین کا، ہم رہتے ہیں ٹھکانا پکڑتے ہیں جنت سے جہاں چاہتے ہیں، فَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے یا جنتی خود کہیں گے۔ عمل کرنے والوں کا اجر بڑا اچھا ہے۔ وَتَرَى الْمَلٰٓئِكَةَ حَآفِّيْنَ مِنْ حَوْلِ الْعَرْشِ: اور اے مخاطب! دیکھے گا تو فرشتوں کو کہ وہ گھیرا ڈالنے والے ہوں گے عرش کے اردگرد، تعظیم کے طور پر گھیرے ڈالے کھڑے ہوں گے، يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ: اور اپنے رَبّ کی حمد کرتے ہوں گے اور اس کی تسبیح بیان کرتے ہوں گے، اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہوں گے اس کی حمد کے ساتھ، یعنی اللہ کی تسبیح تنزیہ اور اس کے کمالات کے ساتھ اس کے ترانے گاتے ہوں گے، وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْحَقِّ: اور لوگوں کے درمیان میں ٹھیک ٹھیک فیصلہ کر دیا جائے گا۔ وَقِيْلَ: اور جس وقت یہ فیصلہ سامنے آ جائے گا، اللہ کا عدل، اللہ کا انصاف، اللہ کی حکمت سب پہ نمایاں ہو جائے گی تو پھر سب پکاریں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: سب صفتیں سب اچھے کمالات اللہ کے لیے ہیں جو رَبّ العالمین ہے، گویا کہ اُس مجلس کا اختتام بھی اسی حمد پر ہوگا، اور جس وقت جنتی آپس میں بیٹھیں گے اور بیٹھ کے آپس میں گفتگو کریں گے باتیں کریں گے، تو آپ کے سامنے پہلے سورۂ یونس میں آیا تھا وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (آیت: ۱۰)

وہ بھی اپنی گفتگو کا اختتام اسی پہ کریں گے اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ، کیونکہ اس فیصلے کے ساتھ اور اس تصرف کے ساتھ اللہ کے کمالات سارے کے سارے نمایاں ہو جائیں گے۔

لفظ ''سَوق'' کے دو مفہوم

تو یہ دونوں فریقوں کا انجام آ گیا۔ سَوق کا لفظ یہاں جو ذِکر کیا گیا ہے یہ دونوں کے متعلق ایک ہی ہے۔ ایک سوق ہے ہانکنا کہ دھکے دے کے کسی کو لے جایا جائے جس طرح سے جانوروں کو لے جاتے ہیں، ایک ہے شوق دِلا دِلا کر بھگانا، تو جنتیوں کو جو جنّت کی طرف چلایا جائے گا تو یہ شوق دِلا دِلا کے گویا کہ اُبھار اُبھار کے، یہ شوق دِلا کے اُبھارا جا رہا ہوگا، اور جہنمیوں کو جو جہنّم کی طرف چلایا جائے گا تو وہ ایسے ہوگا کہ جانا تو چاہیں گے نہیں، پیچھے سے جس طرح سے دھکے دیے جاتے ہیں تو اس طرح لے جایا جائے گا، یعنی لفظ دونوں جگہ اگرچہ ایک ہی بولا گیا ہے، لیکن دونوں کی حقیقت میں بڑا فرق ہے، ایک ہے جذبات اُبھار کر، شوق دِلا کر چلانا، اور ایک ہے زبردستی دھکے دے کے لے جانا، جہنمیوں کو گروہ در گروہ جہنّم کی طرف اس طرح سے لے جایا جائے گا، اور جنتیوں کو شوق دِلا کر لے جایا جائے گا (دیکھیے جلالین)۔ بہرحال اس مجلس کا خاتمہ جو ہوگا تو اسی پر ہی ہوگا: اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ......!

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

اَسْتَغْفِرُ اللهَ. اَسْتَغْفِرُ اللهَ الَّذِيْ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّوْمُ وَاَتُوْبُ اِلَيْهِ

وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ○

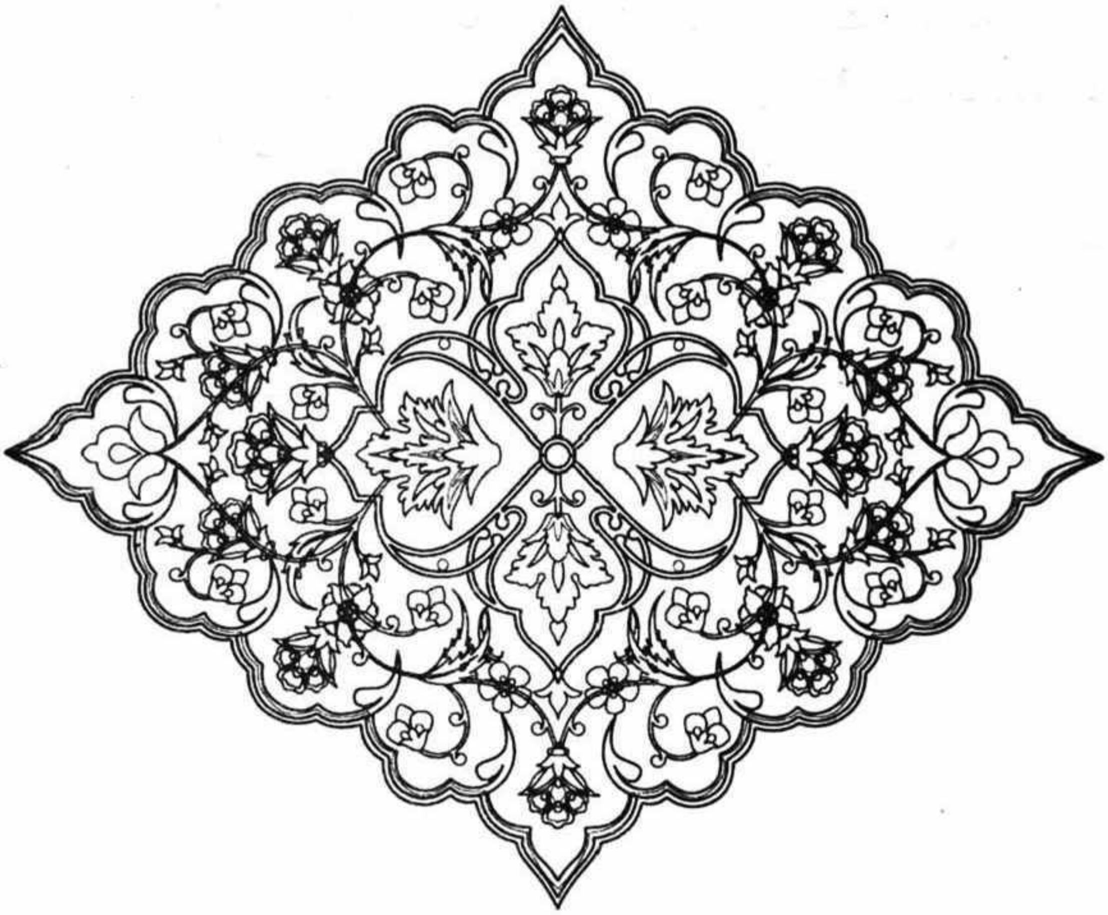

سُورَةُ المُؤْمِنِ

رکوعاتھا ۹ ۴۰ سُوْرَۃُ الْمُؤْمِنِ مَکِّیَّۃٌ ۶۰ اٰیاتھا ۸۵

سورۂ مؤمن مکہ میں نازل ہوئی، اور اس میں پچاسی آیتیں ہیں، نو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

حٰمٓ ۝۱ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ ۝۲ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ

حٰمٓ ۱ یہ اُتاری ہوئی کتاب ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے علم رکھنے والا ہے ۲ گناہ معاف کرنے والا ہے، توبہ قبول

التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ لَآ اِلٰہَ اِلَّا ہُوَ اِلَیْہِ الْمَصِیْرُ ۝۳ مَا

کرنے والا ہے، سخت سزا والا ہے، قدرت والا ہے، کوئی معبود نہیں مگر وہی، اسی کی طرف ہی لوٹنا ہے ۳ نہیں

یُجَادِلُ فِیْٓ اٰیٰتِ اللّٰہِ اِلَّا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَلَا یَغْرُرْکَ تَقَلُّبُہُمْ فِی الْبِلَادِ ۝۴

جھگڑا کرتے اللہ کی آیات کے بارے میں مگر وہی جو کافر ہیں، نہ دھوکے میں ڈال دے تجھ کو ان لوگوں کا چلنا پھرنا شہروں میں ۴

کَذَّبَتْ قَبْلَہُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِہِمْ وَہَمَّتْ کُلُّ اُمَّۃٍۭ بِرَسُوْلِہِمْ

جھٹلایا اِن سے پہلے قوم نوح نے اور قوم نوح کے بعد بہت سارے گروہوں نے، ہر اُمّت نے اپنے رسول کے متعلق ارادہ کیا

لِیَاْخُذُوْہُ وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ لِیُدْحِضُوْا بِہِ الْحَقَّ فَاَخَذْتُہُمْ فَکَیْفَ کَانَ

تاکہ اس کو پکڑ لیں، اور جھگڑا کیا انہوں نے باطل کے سہارے سے تاکہ پھسلا دیں اس باطل کے ساتھ حق کو پھر میں نے ان کو پکڑ لیا، پس کیسا تھا

عِقَابِ ۝۵ وَکَذٰلِکَ حَقَّتْ کَلِمَتُ رَبِّکَ عَلَی الَّذِیْنَ کَفَرُوْٓا اَنَّہُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۶

میرا سزا دینا ۵ ایسے ہی ثابت ہوگئی تیرے رَبّ کی بات ان لوگوں پر جنہوں نے کُفر کیا کہ یہ لوگ جہنّم والے ہیں ۶

اَلَّذِیْنَ یَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَہٗ یُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّہِمْ وَیُؤْمِنُوْنَ بِہٖ وَ

وہ فرشتے جو اُٹھاتے ہیں عرش کو اور وہ فرشتے جو عرش کے اِردگرد ہیں، وہ پاکی بیان کرتے ہیں اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ اور اس پر ایمان لاتے ہیں اور

یَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا رَبَّنَا وَسِعْتَ کُلَّ شَیْءٍ رَّحْمَۃً وَّعِلْمًا فَاغْفِرْ

استغفار کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے، اے ہمارے رَبّ! تُو ہر چیز سے وسیع ہے از روئے رحمت اور علم کے، پھر تُو بخش دے

لِلَّذِيْنَ تَابُوْا وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ⑦ رَبَّنَا

ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی اور تیرے راستے کی اتباع کی، اور اُن کو آگ کے عذاب سے بچا⑦ اے ہمارے پروردگار

وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ ِالَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَ

اور داخل کر انہیں ہمیشگی کے باغات میں جن کا تُو نے ان سے وعدہ کیا ہے، اور داخل کر ان کو جو صالح ہیں ان کے آباء میں سے اور

اَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ ؕ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ⑧ وَقِهِمُ السَّيِّاٰتِ ؕ وَمَنْ

ان کی بیویوں میں سے اور ان کی اولاد میں سے، بے شک تُو ہی زبردست ہے، حکمت والا ہے⑧ اور بچا ان کو سختیوں سے، اور جس کو

تَقِ السَّيِّاٰتِ يَوْمَئِذٍ فَقَدْ رَحِمْتَهٗ ؕ وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ⑨

تُو نے اس دن سختیوں سے بچا لیا، تُو نے اس کے اُوپر رحم کیا، اور یہی بڑی کامیابی ہے⑨

تفسیر

سورت کا تعارف اور اس کی فضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ یہاں سے سورۂ احقاف تک سات سورتیں "حٰمٓ" سے شروع ہوتی ہیں، یہ سات سورتیں جن کو "آلِ حٰمٓ" یا "حوامیم" کہا جاتا ہے، حضرت ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا: "آل حٰمٓ دیباجُ القرآنِ" دیباج ریشمی کپڑے کو کہتے ہیں، مراد اس سے زینت ہے۔ سورۂ مؤمن کی ابتدائی آیات کی فضیلت بھی بعض روایات میں موجود ہے، یا خاصیت کہہ لیجئے، "مسندِ بزار" میں اپنی سند کے ساتھ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شروع دن میں آیۃ الکرسی اور سورۂ مؤمن کی پہلی تین آیتیں حٰمٓ سے اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ تک پڑھ لے وہ اس دن ہر بُرائی اور تکلیف سے محفوظ رہے گا۔ اس کو "ترمذی" نے بھی روایت کیا ہے، جس کی سند میں ایک راوی متکلم فیہ ہے۔ "ابوداؤد" اور "ترمذی" میں باسنادِ صحیح حضرت مہلب بن ابی صفرہ سے روایت ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھ سے ایسے شخص نے روایت کی جس نے خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ آپ کسی جہاد کے موقع پر رات میں حفاظت کے لئے فرما رہے تھے کہ اگر رات میں تم پر چھاپہ مارا جائے، تو تم حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْنَ پڑھ لینا، جس کا حاصل لفظ حٰمٓ کے ساتھ یہ دُعا کرنا ہے کہ ہمارا دُشمن کامیاب نہ ہو۔ اور بعض روایات میں حٰمٓ لَا يُنْصَرُوْا ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ جب تم حٰمٓ کہو گے تو دُشمن کامیاب نہ ہوگا، اس سے معلوم ہوا کہ حٰمٓ دُشمن سے حفاظت کا قلعہ ہے۔ حضرت ثابت بنانیؒ فرماتے ہیں کہ میں حضرت مصعب بن زبیر کے ساتھ کوفہ کے علاقہ میں تھا، میں ایک باغ کے اندر چلا گیا، کہ دو رکعت پڑھ لوں، میں نے نماز سے پہلے حٰمٓ المؤمن کی آیتیں اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ تک پڑھیں، اچانک دیکھا کہ ایک شخص میرے پیچھے ایک

سفید خچر پر سوار کھڑا ہے، جس کے بدن پر یمنی کپڑے ہیں، اس شخص نے مجھ سے کہا کہ جب تم غَافِرِ الذَّنْبِ کہو، تو اس کے ساتھ یہ دُعا کرو: ''یَاغَافِرَ الذَّنْبِ اِغْفِرْلِیْ'' یعنی اے گناہوں کے معاف کرنے والے! مجھے معاف کردے، اور جب تم پڑھو قَابِلِ التَّوْبِ تو یہ دُعا کرو: ''یَاقَابِلَ التَّوْبِ اِقْبَلْ تَوْبَتِیْ'' یعنی اے توبہ کے قبول کرنے والے! میری توبہ قبول فرما، پھر جب پڑھو شَدِیْدِ الْعِقَابِ تو یہ دُعا کرو: ''یَاشَدِیْدَ الْعِقَابِ لَاتُعَاقِبْنِیْ'' یعنی اے سخت عقاب والے! مجھے عذاب نہ دیجئے، اور جب ذِی الطَّوْلِ پڑھو تو یہ دُعا کرو: ''یَاذَا الطَّوْلِ طُلْ عَلَیَّ بِخَیْرٍ'' یعنی اے اِنعام واحسان کرنے والے! مجھ پر اِنعام فرما۔ ثابت بنانی کہتے ہیں کہ میں یہ نصیحت اس سے سننے کے بعد جو اُدھر دیکھا تو وہاں کوئی نہ تھا، میں اس کی تلاش میں باغ کے دروازے پر آیا، لوگوں سے پوچھا کہ ایک ایسا شخص یمنی لباس میں یہاں سے گزرا ہے؟ سب نے کہا کہ ہم نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا۔ ثابت بنانی کی ایک روایت میں یہ بھی ہے کہ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ الیاس علیہ السلام تھے، دوسری روایت میں اس کا ذکر نہیں، یہ سب روایات اِبنِ کثیرؒ نے اپنی تفسیر کے اندر ذکر کی ہیں۔ اِبنِ کثیرؒ نے اِبنِ اَبی حاتمؒ کی سند سے نقل کیا ہے کہ ایک اہلِ شام میں سے بڑا بارُعب قوی آدمی تھا، وہ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے پاس آیا کرتا تھا، کچھ عرصہ تک وہ نہ آیا، تو فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے لوگوں سے اس کا حال پوچھا، لوگوں نے کہا: امیر المؤمنین! اس کا حال نہ پوچھئے، وہ تو شراب میں بدمست رہنے لگا، فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے اپنے منشی کو بلایا اور کہا کہ یہ خط لکھو: ''مِنْ عُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ اِلٰی فُلَانِ بْنِ فُلَانٍ. سَلَامٌ عَلَیْكَ! فَاِنِّیْ اَحْمَدُ اِلَیْكَ اللهَ الَّذِیْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِیْدِ الْعِقَابِ ذِی الطَّوْلِ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اِلَیْهِ الْمَصِیْرُ'' پھر حاضرینِ مجلس سے کہا کہ سب مل کر اس کے لئے دُعا کرو کہ اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو پھیر دے اور اس کی توبہ قبول فرمائے۔ فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ نے جس قاصد کے ہاتھ یہ خط بھیجا تھا اُس کو ہدایت کردی تھی کہ یہ خط اُس کو اس وقت تک نہ دے جب تک وہ نشے سے ہوش میں نہ آئے، اور کسی دوسرے کے حوالے نہ کرے۔ جب اس کے پاس حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کا یہ خط پہنچا اور اس نے پڑھا تو بار بار ان کلمات کو پڑھتا اور غور کرتا رہا کہ اس میں مجھے سزا سے ڈرایا بھی گیا ہے، اور معاف کرنے کا وعدہ بھی کیا ہے، پھر رونے لگا اور شراب خوری سے باز آگیا، اور ایسی توبہ کی کہ پھر اس کے پاس نہ گیا۔ حضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کو جب اس اثر کی خبر ملی تو لوگوں سے فرمایا کہ ایسے معاملات میں تم سب کو ایسا ہی کرنا چاہیے کہ جب کوئی بھائی کسی لغزش میں مبتلا ہو جائے تو اس کو دُرستی پر لانے کی فکر کرو اور اس کو اللہ کی رحمت کا بھروسہ دلاؤ اور اللہ سے اس کے لئے دُعا کرو کہ وہ توبہ کرلے، اور تم اس کے مقابلے پر شیطان کے مددگار نہ بنو، یعنی اس کو بُرا بھلا کہہ کر، یا غصہ دِلا کر اگر دِین سے دُور کردو گے تو یہ شیطان کی مدد ہوگی (معارف القرآن)۔

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ یہاں سے سورۂ اَحقاف تک ہر سورت ''حٰمٓ'' سے شروع ہوتی ہے، یہ سات سورتیں ہیں جن کو ''حوامیم'' یا ''آلِ حٰمٓ'' کہا جاتا ہے، حدیث شریف میں ان سورتوں کو ''لُبابُ القرآن'' قرار دیا گیا ہے۔[1] لُباب کہتے ہیں خلاصے کو، یہ سات سورتیں ایسی ہیں جن میں نہایت آسان انداز کے ساتھ اللہ تبارک وتعالیٰ نے مقاصدِ اِسلام کو واضح فرمایا ہے، مضامین وہی ہیں جو ''مکی'' سورتوں میں ہوا کرتے ہیں، لیکن انداز نہایت دِلنشین اور آسان ہے۔

---

(۱) عن ابن عباس قال: اِنَّ لِکُلِّ شَیْءٍ لُبَابًا وَاِنَّ لُبَابَ الْقُرْاٰنِ الْحَوَامِیْمُ (روح المعانی. ابن کثیر. مظہری وغیرہ)۔

صفاتِ الٰہی کے ذریعے ترغیب وترہیب

حٰمٓ: یہ حروفِ مقطعات میں سے ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذَالِكَ۔ تَنْزِيْلُ الْكِتٰبِ: یہ مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، یعنی هٰذَا الْكِتَابُ مُنَزَّلٌ کے معنی میں۔ یہ اُتاری ہوئی کتاب ہے اللہ کی طرف سے جو زبردست ہے، علم رکھنے والا ہے، غَافِرِ الذَّنْبِ: گناہ معاف کرنے والا ہے، قَابِلِ التَّوْبِ: توبہ قبول کرنے والا ہے، شَدِيْدِ الْعِقَابِ: سخت سزا والا ہے۔ عقاب بابِ مفاعلہ کا مصدر ہے، عَاقَبَ مُعَاقَبَةً: سزا دینا۔ ذِي الطَّوْلِ۔ طَول: اِنعام، قدرت، اِحسان، ان سب معنی میں آتا ہے۔ قدرت والا ہے۔ حضرتِ شیخ الہندؒ ترجمہ فرماتے ہیں مقدور والا، اس کا یہی معنی ہے کہ طَول قدرت کے معنی میں ہے۔ اور فضل واحسان کے معنی میں بھی آتا ہے، تو ذِي الطَّوْلِ کا معنی ہوگا کہ اللہ تعالیٰ فضل واحسان والا ہے۔ ''کوئی معبود نہیں مگر وہی، اسی کی طرف ہی لوٹنا ہے۔'' کتاب اللہ کا یہاں ذِکر کرکے سرورِ کائنات ﷺ کی رِسالت کا بیان آ گیا، اور آگے جو اللہ تعالیٰ کی صفات ذِکر کی گئی ہیں وہ ساری کی ساری ترغیب اور ترہیب کے لئے منشا ہیں۔ یہ کتاب زبردست کی طرف سے آئی ہے، مخالفت کرنے والوں کو سزا دے گا، جس طرح سے پہلے بھی اس قسم کے الفاظ آئے تو ذِکر کیا گیا تھا کہ اس میں اللہ کی کتاب کی عظمت نمایاں ہے، کہ اس کو کسی سائل کی درخواست نہ سمجھنا، کہ مانو یا نہ مانو، یہ زبردست کی طرف سے آئی ہوئی کتاب ہے جو ہر طرح سے غالب ہے، غلبہ رکھنے والا ہے۔ علم وحکمت سے بھری ہوئی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ غافر الذنب، قابل التوب ہے، گناہ کو معاف کرتا ہے توبہ قبول کرتا ہے۔ تو غافر الذنب جو آ گیا اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ شان ہے کہ بسا اوقات بغیر توبہ کے بھی معاف کر دیتے ہیں، اور اگر کوئی توبہ کرے تو توبہ کو قبول بھی کرتے ہیں، یہ اس کی رحمت کی نشانی ہے۔ اور پھر ساتھ وہ سخت سزا دینے والا بھی ہے، اس کا سزا دینا بڑا سخت ہے، یہ دوسری شان آ گئی، کیونکہ ایمان کا کمال یہی ہے کہ وہ رَجاء اور خوف کے درمیان درمیان ہو، اللہ تعالیٰ کا غافر الذنب اور قابل التوب ہونا اگر رَجاء کے لئے منشا بنتا ہے تو اس کا شدید العقاب ہونا یہ خوف کے لئے منشا بنتا ہے۔ اور ذِي الطَّوْلِ کے اندر پھر ترغیب کا پہلو ہے اور ترہیب بھی ہے، اگر اس کا معنی قدرت والا لیں گے تو اس میں ترہیب کا پہلو ہے، فضل واحسان والا معنی لیں گے تو اس میں ترغیب کا پہلو ہے۔ آگے نتیجہ آ گیا، یہ کتاب اللہ جو آپ کے سامنے ہے اس کی تعلیم کا حاصل بھی یہی ہے، اور اللہ تعالیٰ کی صفات جو آپ کے سامنے ذِکر کی گئیں ان کا نتیجہ بھی یہی ہے کہ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: اس کے بغیر کوئی معبود نہیں۔ اور اِلَيْهِ الْمَصِيْرُ: اس میں معاد کا ذِکر آ گیا، لوٹنا اسی کی طرف ہی ہے، مرنے کے بعد سب دوبارہ اُٹھیں گے تو اسی کی طرف ہی جائیں گے۔

کافروں کی خوش حالی دھوکے کا باعث نہ بن جائے

مَا يُجَادِلُ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ اِلَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: يُجَادِلُ مجادلہ سے ہے، جھگڑا کرنا۔ نہیں جھگڑا کرتے اللہ کی آیات کے بارے میں مگر وہی جو کافر ہیں، یعنی اللہ تعالیٰ کی نشانیاں تو ایسے واضح ہیں کہ اگر کوئی شخص کفر پر ہی تلا ہوا نہ ہو تو اس میں کوئی جھگڑے کی گنجائش نہیں، ''نہیں جھگڑا کرتے اللہ کی آیات میں مگر وہی لوگ جو کافر ہیں'' فَلَا يَغْرُرْكَ تَقَلُّبُهُمْ فِي الْبِلَادِ: غَرَّ يَغُرُّ: دھوکے میں ڈالنا۔ تَقَلُّبٌ: چلنا پھرنا۔ بِلاد: بلد کی جمع، بلد: شہر کو کہتے ہیں۔ شہروں کے اندر ان کا چلنا پھرنا تجھے دھوکے میں نہ ڈالے۔ کیا

مطلب؟ کفر کیے ہوئے ہیں اور اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑا کرتے ہیں، اُن کو تسلیم نہیں کرتے، جھٹلانے کی کوشش کرتے ہیں، اہلِ ایمان کے ساتھ جھگڑا کرتے ہیں، اور اللہ تعالیٰ زبردست ہے، شَدِیْدُ الْعِقَاب ہے، سخت سزا دینے والا ہے، پھر ان کے جھگڑے کے باوجود اللہ ان کو سزا نہیں دیتا، اور اپنی قدرت کے تحت ان کو فنا نہیں کرتا، اور وہ شہروں کے اندر دندناتے پھرتے ہیں، تجارت کے سفر کرتے ہیں، جس طرح سے مکہ معظمہ کے مشرکین جو اصل مجادلین تھے، وہ سردیوں میں بھی تجارت کا سفر کرتے تھے یمن کی طرف، گرمیوں میں سفر کرتے تھے شام کی طرف، دونوں سفروں کا ذکر سورۂ لِاِیلاف کے اندر آیا ہوا ہے رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ، سردی اور گرمی کے سفر سے فائدہ اُٹھاتے تھے، خوش حال تھے، شہروں میں چلت پھرت تھی۔ تو دیکھ کر کبھی کسی دھوکے میں نہ آجائیو! کہ اگر یہ اللہ کے نافرمان ہیں، واقعی کافر ہیں، مشرک ہیں، اللہ کی آیات میں جھگڑا کرنے والے ہیں، اللہ سے باغی ہیں، تو اللہ تعالیٰ ان کو پکڑتا کیوں نہیں، یہ اس طرح سے خوش حالی کے ساتھ مزے کیوں اُڑاتے پھرتے ہیں، شہروں کے اندر کیوں دندناتے پھرتے ہیں؟ تو اس دھوکے میں نہ آجائیو، یہ بہت تھوڑی سی مہلت ہے جو اُن کو دی گئی ہے، خطاب سرورِ کائنات ﷺ کو ہے سُنانا باقیوں کو مقصود ہے، کہ ان کی اس عارضی خوش حالی کو دیکھ کر، ان کی چلنے پھرنے کو دیکھ کر، (جس طرح سے آج بھی کافر لوگ، اللہ کے دِین کے منکر، بلکہ اللہ کے وجود تک کے منکر، وہ آج کاروں میں دوڑے پھرتے ہیں، ہوائی جہازوں میں اُڑے پھرتے ہیں، ان کے پاس ظاہری شان وشوکت ہے) تو بھی ان کو دیکھ کر اس دھوکے میں نہ آجائیو کہ یہ لوگ ٹھیک ہیں، یا یہ کسی عذاب میں مبتلا ہونے والے نہیں ہیں، تو ان کی یہ خوش حالی تمہارے لیے دھوکے کا باعث نہ بن جائے۔ ''نہ دھوکے میں ڈال دے تجھ کو ان لوگوں کا چلنا پھرنا شہروں میں۔''

مشرکینِ مکہ اور گزشتہ مکذبین میں مماثلت

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوحٍ وَّالْاَحْزَابُ مِنْۢ بَعْدِهِمْ: جھٹلایا ان سے پہلے قومِ نوح نے اور قومِ نوح کے بعد بہت سارے گروہوں نے۔ مِنْۢ بَعْدِهِمْ کی ضمیر قومِ نوح کی طرف لوٹ گئی، اَحزاب کی تفصیل آگے بھی آرہی ہے، قومِ عاد، قومِ ثمود، اور اسی طرح سے قومِ فرعون یہ سارے کے سارے ٹولے گروہ جتنے بھی پیدا ہوئے یہ قومِ نوح کے بعد ہیں، تو الاَحزاب کا مصداق یہی ہیں، ''جھٹلایا ان سے قبل نوح کی قوم نے، اور نوح کی قوم کے بعد مختلف گروہوں نے'' وَهَمَّتْ كُلُّ اُمَّةٍ بِرَسُوْلِهِمْ: ہر اُمت نے اپنے رسول کے متعلق ارادہ کیا، لِيَاْخُذُوْهُ: تاکہ اس کو پکڑلیں۔ یہ پکڑنا گرفتار کرنے کے لئے، قید کرنے کے لئے، یا قتل کرنے کے لئے ہے۔ یہ جتنی بھی جماعتیں گزری ہیں سب نے اپنے رسول کی مخالفت کی اور سب نے ارادہ کیا کہ اس کو پکڑ کے ماردیں، قتل کردیں، ''تاکہ پکڑلیں اس کو'' وَجٰدَلُوْا بِالْبَاطِلِ: اور انہوں نے باطل کے سہارے سے جھگڑا کیا، لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ: تاکہ پھسلادیں اس باطل کے ساتھ حق کو، باطل کردیں حق کو۔ اِدْحَاض: پھسلا دینا۔ یہاں مغلوب کرنے کے معنی میں ہے۔ جھگڑا کیا انہوں نے باطل کے ساتھ، یعنی غلط باتیں بے بنیاد باتیں لے کے جھگڑے اٹھائے تاکہ اس باطل کے ذریعے سے حق کو پھسلادیں، فَاَخَذْتُهُمْ: پھر میں نے اُن کو پکڑلیا، تو جس طرح وہ جدال بالباطل کرتے تھے، تو یہ قرآن کریم کے مخاطب بھی یجادلون بالباطل ہیں، اور جیسے انہوں نے اپنے

رسول کی تکذیب کی تھی یہ بھی رسول کی تکذیب کر رہے ہیں، حالات تو ایک جیسے ہی ہیں، وہاں بھی اللہ تعالیٰ نے کچھ دیر کے لئے مہلت دی تھی، وہ لوگ دندناتے رہے، توان کو بھی کچھ مہلت دے رکھی ہے، جب معاملہ سر سے ہی لگ گیا فَاَخَذْتُهُمْ: تو پھر میں نے ان کو پکڑا، فَكَيْفَ كَانَ عِقَابِ: عقابِ باء کے نیچے جو کسرہ ہے یہ یائے متکلم پر دلالت کرتا ہے۔ میرا سزا دینا کیسے تھا؟ یعنی پھر آپ نے دیکھ ہی لیا کہ میں نے پھر ان کو سزا کس طرح سے دی؟ وَكَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا: جس طرح سے ان پر یہ عذاب کا کلمہ ثابت ہوا تھا ایسے ہی ثابت ہوگئی تیرے رب کی بات ان لوگوں پر جنہوں نے کفر کیا، وہ بات یہی ہے اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ: کہ یہ لوگ جہنم والے ہیں، ان کا جہنمی ہونا ثابت ہو گیا، كَلِمَتُ رَبِّكَ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کے جواب میں کہی تھی لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكَ وَمِمَّنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ اَجْمَعِيْنَ (سورۂ ص:۸۵) وہ بات ان کے اوپر ثابت ہوگئی (جلالین)۔ حاصل اس کا یہی ہے کہ اَنَّهُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ یہ سب کے سب جہنم والے ہیں۔

مؤمنین کی مقبولیت عند اللہ وعند الملائکہ

آگے مؤمنین کی مقبولیت کا ذکر ہے، جو ایمان لے آتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرتے ہیں، کفر وشرک سے باز آجاتے ہیں وہ عند اللہ مقبول ہیں، اور مقربینِ الٰہی کے بھی وہ محبوب ہیں، عرش کے اِردگرد جتنے فرشتے ہیں وہ سب ان کے لیے دُعائیں کرتے ہیں، اس میں مؤمنین کی عظمت نمایاں ہے۔ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ: وہ فرشتے جو اُٹھاتے ہیں عرش کو، اور وہ فرشتے جو عرش کے اردگرد ہیں۔ عرش کو اُٹھانے والے فرشتے اس وقت تو چار ہیں،[1] جو قیامت کے دن آٹھ ہوجائیں گے۔ قرآنِ کریم کے اندر اس کی صراحت ہے (سورۂ حاقہ)۔ اور مَنْ حَوْلَهٗ کی تعداد کوئی متعین نہیں کہ وہ کتنے ہیں؟ وَمَا يَعْلَمُ جُنُوْدَ رَبِّكَ اِلَّا هُوَ (سورۂ مدثر:۳۱) تیرے رب کی لشکروں کی تعداد کوئی نہیں جانتا سوائے اس کے۔ تو حاملینِ عرش یعنی عرش کو اُٹھانے والے اور عرش کے اردگرد جو فرشتے ہیں يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ: وہ پاکی بیان کرتے ہیں اللہ کی اس حال میں کہ متلبس ہیں اس کی حمد کے ساتھ، یعنی ان کے ذکر کے اندر دونوں پہلو ہیں تسبیح اور تحمید، تسبیح کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ کہتے ہیں "سبحان اللہ" اے اللہ! تیرے اندر کوئی نقص کی بات نہیں، کوئی عیب کی بات نہیں، تُو ہر عیب سے پاک ہے، یہ سلبی پہلو ہے۔ اور تحمید کا معنی ہوتا ہے "الحمد للہ" کہنا، کہ اے اللہ! جتنی کمال کی صفتیں ہیں وہ ساری تیرے اندر پائی جاتی ہیں، تو ہر صفتِ کمال کے ساتھ موصوف ہے۔ اور یہ دونوں باتیں فرشتے بطور ذکر کے ادا کرتے ہیں، سبحان اللہ والحمد للہ۔ جو شخص یہ زبان سے ادا کرتا ہے تو گویا کہ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ اس پر صادق آجاتا ہے۔ "وہ فرشتے اپنے رب کی تسبیح بیان کرتے ہیں اس کی حمد کے ساتھ متلبس ہوتے ہوئے" یعنی ان کا حمد کے ساتھ بھی تعلق ہوتا ہے، جہاں اللہ تعالیٰ کے لئے وہ سلبی پہلو ذکر کرتے ہیں کہ اللہ میں کوئی نقص اور عیب کی صفت نہیں پائی جاتی، وہاں اللہ تعالیٰ کے لئے صفاتِ کمال کو ثابت بھی کرتے ہیں۔ وَيُؤْمِنُوْنَ بِهٖ: اور وہ فرشتے اللہ پر ایمان لاتے ہیں۔ وَيَسْتَغْفِرُوْنَ

(۱) دیکھئے: ابن کثیر وعام کتبِ تفسیر۔ چار کا ذکر مختلف احادیث میں ہے۔

لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: استغفار کرتے ہیں ان لوگوں کے لئے جو ایمان لے آئے، مؤمنوں کے لئے وہ استغفار کرتے ہیں۔ اور وہ استغفار کس طرح سے کرتے ہیں؟ استغفار کا لفظی معنی ہے: مغفرت طلب کرنا۔ اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتے مؤمنین کے لئے، اور یوں کہتے ہیں: رَبَّنَا وَسِعْتَ كُلَّ شَيْءٍ رَّحْمَةً وَّعِلْمًا: اے اللہ! تُو ہر چیز سے وسیع ہے از روئے رحمت کے اور علم کے، تیری رحمت بھی ہر چیز کو شامل، تیرا علم بھی ہر چیز کو محیط۔ فَاغْفِرْ لِلَّذِيْنَ تَابُوْا: پھر تُو بخش دے ان لوگوں کو جنہوں نے توبہ کی، یعنی کفر اور شرک سے۔ وَاتَّبَعُوْا سَبِيْلَكَ: اور انہوں نے تیرے راستے کی اتباع کی، وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ: اور اُن کو بھڑکنے والی آگ کے عذاب سے بچا۔ جحیم: جلنے والی آگ۔ آگے کے عذاب سے انہیں بچا۔ "قِ" امر کا صیغہ ہے۔ وَقٰى يَقِيْ: بچانا۔ رَبَّنَا: اے ہمارے پروردگار! وَاَدْخِلْهُمْ جَنّٰتِ عَدْنِ: پہلے عذاب سے بچانے کا ذکر ہے، آگے نعمتوں کے حصول کا ذکر ہے۔ اور داخل کر انہیں ہیشگی کے باغات میں، الَّتِيْ وَعَدْتَّهُمْ وہ باغات جن کا تُو نے ان سے وعدہ کیا ہے۔

ایمان کے بغیر نجات ممکن نہیں

وَمَنْ صَلَحَ مِنْ اٰبَآئِهِمْ وَاَزْوَاجِهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ: اور داخل کر باغات میں اُن کو جو کہ صالح ہیں اُن کے آباء میں سے اور اُن کی ازواج میں سے اور اُن کی ذُریات میں سے، ان کے آباؤ اجداد میں سے اور ان کی بیویوں اور اولاد میں سے جو صالح ہیں، "صالح" ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جو جنت کے لائق ہیں، جن کا خاتمہ ایمان پر ہوا، کیونکہ یہ بات بارہا آپ کے سامنے ذکر کی جا چکی کہ نجات کے لئے ایمان شرط ہے، جس وقت تک کوئی شخص ایمان نہیں لائے گا اُس کی نجات نہیں ہوسکتی، اور اگر کسی شخص کے پاس ایمان نہ ہوا تو اس کا کوئی رشتہ دار، باپ ہو، یا بیٹا ہو، یا بھائی ہو، کتنے ہی اعلیٰ عہدے پر فائز کیوں نہ ہو، کتنے ہی اعلیٰ درجات اس کو کیوں نہ حاصل ہو جائیں وہ کام نہیں آسکتا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قصہ اسی لیے سُنایا گیا کہ وہ اپنے باپ کے کام نہ آئے، نوح علیہ السلام کا قصہ ذکر کیا گیا کہ وہ اپنے بیٹے کے کام نہ آئے، نوح علیہ السلام اور لُوط علیہ السلام کی بیویوں کا ذکر ہوا کہ یہ خاوند اپنی بیویوں کے کام نہ آسکے، یہ سارے کے سارے قصے اسی لیے بیان کیے جاتے ہیں تا کہ یہ بات اچھی طرح سے نمایاں ہو جائے کہ اگر ایمان پر خاتمہ نہ ہوا تو کوئی آپ کا رشتہ دار، چاہے آپ کے اُصول میں سے ہو، چاہے فروع میں سے ہو، یا دوسرے تعلق رکھنے والوں میں سے ہو، اور وہ خود کتنا ہی مقبولِ بارگاہ کیوں نہ ہو، وہ کام نہیں آئے گا۔

ہاں! البتہ اگر مرنے والے کا خاتمہ ایمان پر ہو گیا، ایسی صورت میں اگر کوئی اس کا قریبی، باپ یا بیٹا اُونچے درجے کا ہے، تو اللہ تعالیٰ اس اُونچے درجے والے کے اعزاز و اکرام کی وجہ سے نچلے درجے والوں کو ترقی دے کر اس کے ساتھ ملحق کر دیں گے، بیویوں کی ترقی خاوندوں کی وجہ سے ہوگی، خاوندوں کی ترقی بیویوں کی وجہ سے ہوگی، آباء کی ترقی اولاد کی وجہ سے ہوگی، اولاد کی ترقی آباء کی وجہ سے ہوگی، اور اسی طرح سے دوست احباب ایک دوسرے کے کام آئیں گے، اُستاذ شاگرد ایک دوسرے کے کام آئیں گے، پیر مرید ایک دوسرے کے کام آئیں گے، تو رفعِ درجات کے لیے تو یہ تعلق کام آسکتا ہے، نفسِ دُخولِ جنت کے لئے

نہیں اگر خاتمہ ایمان پہ نہ ہوا۔ تو یہاں مَنْ صَلَحَ کا یہی معنی ہے کہ وہ دُعا کرتے ہیں کہ یا اللہ! ان کے آباء، ذُرّیات اور اَزواج میں سے جو جنّت میں جانے کے لائق ہیں انہیں بھی ان کے ساتھ جنت میں داخل کر دے، تو ترقیِ درجات اس نسبت کی بنا پر ہوگی۔ اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ایمان ہے لیکن عمل خراب ہے، جس کی بنا پر جہنّم میں چلے گئے، تو اس نسبت کی بنا پر، تعلق کی بنا پر سفارش اور شفاعت کے ذریعے سے جہنّم سے نجات بھی ہوسکتی ہے، جنّت کے اندر رفعِ درجات بھی ہوں گے، نسب کا یہ فائدہ یقیناً پہنچے گا لیکن اگر ایمان نہ ہوا تو پھر کوئی فائدہ نہیں، تو مَنْ صَلَحَ سے یہاں مؤمنین ہی مراد ہیں، کہ ان کے آباء، ان کی اولاد، ان کی ازواج میں سے جو مؤمنین ہیں، جنّت میں جانے کے لائق ہیں، اُن کو بھی اِن کے ساتھ جنّت میں داخل کر دے۔ گویا کہ مؤمنینِ متقین کے لئے دُعا کرتے ہیں تو اُن کے متعلقین کے لئے بھی دُعا کرتے ہیں۔

قیامت کے دِن جو سختیوں سے بچ گیا وہی کامیاب ہے

وَقِهِمُ السَّیِّاٰتِ: اس کا یہ معنی بھی کیا جاسکتا ہے کہ اِس وقت دُنیا میں ان کو بُرے اعمال سے بچا، نیکی کی توفیق دے۔ سیئات سے اعمالِ سیئات مراد ہیں۔ ''اِن کو بُرے اعمال سے بچا، جس کو تُو نے اس دِن بُرے اعمال سے بچالیا اس کے اُوپر تُو نے رحم کیا'' اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے کہ دُنیا کے اندر انسان بُرے اعمال سے بچ جائے اور نیکی کی توفیق ہو جائے۔ اور ''سیئات'' کے بارے میں آپ کے سامنے بارہا یہ بات ذِکر کی جاچکی کہ گناہ کی سزا کو بھی ''سیئہ'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا (سورۂ شوریٰ: ۴۰) تو پھر ''سیئات'' سے یہ مراد بھی ہوسکتا ہے کہ ان کو سختیوں سے اور سزاؤں سے محفوظ رکھ، پھر یہ قیامت کے متعلق ہوگا، اور جس کو تُو نے اس دِن سختیوں سے بچالیا، سزاؤں سے محفوظ رکھ لیا، فَقَدْ رَحِمْتَهٗ تُو نے اُس کے اُوپر رحم کیا، وَذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِیْمُ: اور سختیوں سے اور سزاؤں سے بچ جانا یہی بڑی کامیابی ہے۔ تو ''سیئات'' سے بُرے اعمال بھی مراد ہو سکتے ہیں، بُرے اعمال کی سزائیں بھی مراد ہوسکتی ہیں، اور قیامت کے دِن کی سختیاں بھی مراد ہوسکتی ہیں، سیئات کے لفظ میں سب کی گنجائش ہے (آلوسی)۔ ''بچا ان کو برائیوں سے، سختیوں سے، سزاؤں سے، بُرے اعمال سے، جس کو تُو نے بچالیا اس دِن سختیوں سے تو اس کے اُوپر رحم کیا اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔''

یہ تو مسلمانوں کا، ایمان والوں کا، اسلام والوں کا اعزاز ہے۔ آگے کُفّار کی مذمت ہے، قرآنِ کریم میں یہ دونوں مضمون آپس میں متقابل بیان ہوا کرتے ہیں، صالحین کا ذِکر ہوتا ہے تو ساتھ بدبختوں کا ذِکر بھی آجاتا ہے، بدبختوں کا ذِکر ہوتا ہے تو مقابلے میں نیک بخت بھی ذِکر کر دیے جاتے ہیں، بِضِدِّهَا تَتَبَیَّنُ الْاَشْیَاءُ، کلام کی فصاحت، بلاغت کا تقاضا یہی ہوتا ہے، کہ دونوں راستے واضح کر دیے جائیں، دونوں گروہوں کے حالات واضح کر دیے جائیں، تاکہ انسان اپنی عقل وفکر کے ساتھ سوچ لے کہ میں کس فریق میں شامل ہوں، میرے لئے کس فریق میں شامل ہونا بہتر ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا يُنَادَوْنَ لَمَقْتُ اللَّهِ أَكْبَرُ مِن مَّقْتِكُمْ أَنفُسَكُمْ إِذْ تُدْعَوْنَ

بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا آواز دیے جائیں گے، کہ اللہ کی بیزاری بڑی تھی بمقابلہ تمہاری بیزاری کے اپنے آپ سے، جس وقت تم بلائے جاتے

إِلَى الْإِيمَانِ فَتَكْفُرُونَ ⑩ قَالُوا رَبَّنَا أَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَأَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ

تھے ایمان کی طرف پھر تم کفر کرتے تھے ⑩ وہ کہیں گے: اے ہمارے رب! تُو نے ہمیں موت دی دو مرتبہ اور ہمیں زندہ کیا دو مرتبہ

فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوبِنَا فَهَلْ إِلَىٰ خُرُوجٍ مِّن سَبِيلٍ ⑪ ذَٰلِكُم بِأَنَّهُ إِذَا دُعِيَ اللَّهُ وَحْدَهُ

پس ہم نے اعتراف کرلیا اپنے گناہوں کا، کیا جہنم سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ ⑪ یہ اس سبب سے ہے کہ بے شک بات یہ تھی کہ جس وقت اللہ وحدہٗ کو پکارا جاتا

كَفَرْتُمْ ۖ وَإِن يُشْرَكْ بِهِ تُؤْمِنُوا ۚ فَالْحُكْمُ لِلَّهِ الْعَلِيِّ الْكَبِيرِ ⑫

تو تم انکار کرتے تھے، اور اگر اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جاتا تھا تو ایمان لے آتے تھے، پس فیصلہ اللہ ہی کے لئے ہے جو علوّ والا ہے، کبریائی والا ہے ⑫

هُوَ الَّذِي يُرِيكُمْ آيَاتِهِ وَيُنَزِّلُ لَكُم مِّنَ السَّمَاءِ رِزْقًا ۚ وَمَا يَتَذَكَّرُ إِلَّا مَن

وہی ہے جو تمہیں دِکھاتا ہے اپنی نشانیاں اور تمہارے لیے آسمان کی طرف سے رزق اُتارتا ہے، اور نصیحت حاصل نہیں کرتا مگر وہی جو

يُنِيبُ ⑬ فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ وَلَوْ كَرِهَ الْكَافِرُونَ ⑭ رَفِيعُ

اللہ کی طرف رُجوع کرے ⑬ پھر تم اللہ کو ہی پکارو اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہو اس کے لئے طاعت کو، اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں ⑭ وہ بلند

الدَّرَجَاتِ ذُو الْعَرْشِ يُلْقِي الرُّوحَ مِنْ أَمْرِهِ عَلَىٰ مَن يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ

درجوں والا ہے، عرش والا ہے، ڈالتا ہے رُوح اپنے حکم سے جس کے اُوپر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے

لِيُنذِرَ يَوْمَ التَّلَاقِ ⑮ يَوْمَ هُم بَارِزُونَ ۖ لَا يَخْفَىٰ عَلَى اللَّهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ ۚ

تاکہ وہ بندہ ملاقات کے دِن سے ڈرائے ⑮ جس دِن وہ سارے کھلے میدان کی طرف نکلنے والے ہوں گے، کوئی چیز مخفی نہیں ہوگی ان کی طرف سے اللہ پر،

لِّمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ۖ لِلَّهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ⑯ الْيَوْمَ تُجْزَىٰ كُلُّ نَفْسٍ بِمَا

کس کے لئے ہے آج سلطنت؟ اللہ کے لئے ہے جو اکیلا ہے اور سب کو سنبھالنے والا ہے ⑯ آج بدلہ دیا جائے گا ہر نفس

كَسَبَتْ ۚ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَرِيعُ الْحِسَابِ ⑰ وَأَنذِرْهُمْ يَوْمَ الْآزِفَةِ

اپنے کیے کا آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں ⑰ اور آنے والی مصیبت کے دِن سے انہیں ڈرا

اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ كٰظِمِیْنَ ۬ؕ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ

جب کہ دِل گلوں کے پاس پہنچنے والے ہوں گے، اپنی کیفیت کو دبانے والے ہوں گے، نہیں ہوگا ظالموں کے لئے کوئی گرم جوش دوست، نہ کوئی سفارشی

یُّطَاعُ ؕ ﴿۱۸﴾ یَعْلَمُ خَآىِٕنَةَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ ﴿۱۹﴾ وَاللّٰهُ یَقْضِیْ بِالْحَقِّ ؕ

جس کا کہنا مانا جائے ﴿۱۸﴾ جانتا ہے اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو اور ان باتوں کو جو کہ دِل چھپاتے ہیں ﴿۱۹﴾ اللہ فیصلہ کرے گا حق کے مطابق

وَالَّذِیْنَ یَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ لَا یَقْضُوْنَ بِشَیْءٍ ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ ﴿۲۰﴾

اور وہ جن کو پکارتے ہیں یہ لوگ اللہ کے علاوہ، وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے ﴿۲۰﴾

تفسیر

کافروں کو جہنم میں بدنی عذاب کے ساتھ رُوحانی عذاب بھی ہوگا

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا یُنَادَوْنَ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، پکارے جائیں گے، آواز دیے جائیں۔ کس وقت آواز دیے جائیں گے؟ جس وقت اللہ کے عذاب میں مبتلا ہوں گے، اور وہ اپنے آپ کو ملامت کریں گے، اپنے آپ سے نفرت کریں گے، اس دن اُن کو آواز دے کر کہا جائے گا کہ آج تم جس طرح سے اپنے آپ سے نفرت کرتے ہو، دُنیا میں اللہ تعالیٰ کو تم سے اس سے زیادہ نفرت تھی، جس وقت تمہیں ایمان لانے کی طرف بُلایا جاتا تھا اور تم ایمان نہیں لاتے تھے، اللہ تم سے اس سے زیادہ بیزار تھا جس طرح سے آج تم اپنی جانوں سے بیزار ہو رہے ہو۔ اس قسم کی تنبیہات یہ رُوحانی سزا ہے، اگر ایک آدمی بدنی تکلیف کے اندر مبتلا ہو جائے لیکن رُوحانی طور پر اُس کو راحت ہو، کوئی تسلی دینے والا موجود ہو، تو تکلیف ہلکی ہو جاتی ہے، اور اگر کوئی شخص سزا میں مبتلا بھی ہو اور دُوسرا اُوپر ملامت کرنے والا بھی کھڑا ہو، تو ایک تو بدنی تکلیف اور ملامت کرنے کے ساتھ ایک ذہنی اور رُوحانی تکلیف بھی ہوتی ہے، تو تکلیف دو چند ہو جاتی ہے، تو کافروں کو یہ دونوں قسم کی تکلیفیں ہوں گی، بدنی طور پر بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے اور اُوپر سے سرزنش، ڈانٹ ڈپٹ، ملامت، تنبیہ، شرمسار کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو باتیں ہوں گی، یہ مستقل قلبی اور رُوحانی اذیت کا باعث بنیں گی، تو عذاب دوہرا ہو جائے گا، ظاہراً و باطناً وہ عذاب کے اندر مبتلا ہو جائیں گے، ورنہ اگر ظاہری طور پر کوئی شخص بیماری میں مبتلا ہو گیا، یا کوئی چوٹ لگ گئی، اور دس آدمی اردگرد اس کو تسلی دینے والے موجود ہیں، اچھی اچھی باتیں کر کے دل دماغ کو قوت پہنچاتے ہیں تو تکلیف ہلکی ہو جاتی ہے، یہاں یہ قصہ نہیں ہوگا۔ ''بے شک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، آواز دیے جائیں گے'' لَمَقْتُ اللّٰهِ اَكْبَرُ مِنْ مَّقْتِكُمْ اَنْفُسَكُمْ: مَقت کہتے ہیں بیزار ہونے کو۔ اللہ کی بیزاری بڑی تھی بمقابلہ تمہاری بیزاری کے اپنے آپ سے۔ اللہ کی بیزاری کب؟ ''جس وقت کہ تم بُلائے جاتے تھے ایمان کی طرف پھر تم کُفر کرتے تھے'' جب تمہیں ایمان

کی دعوت دی جاتی تھی اور تم نہیں مانتے تھے تو اس وقت اللہ کو تم سے زیادہ نفرت تھی بہ نسبت آج تمہارے اپنے آپ سے نفرت کرنے کے، جس طرح سے تم اپنے آپ سے بیزار ہوئے بیٹھے ہو اللہ تعالیٰ اس وقت تم سے اس سے زیادہ بیزار تھا۔

دوموتوں اور دو زندگیوں کا اِقرار اور ناکام تمنّا

قَالُوْا: وہ کہیں گے۔ جب ان کو یہ تنبیہ کی جائے گی تو کہیں گے، رَبَّنَآ اَمَتَّنَا اثْنَتَيْنِ وَاَحْيَيْتَنَا اثْنَتَيْنِ: اے ہمارے رَبّ! تُو نے ہمیں دو دفعہ موت دے دی اور دو دفعہ زندہ کرلیا۔ اَمَتَّنَا: تُو نے ہمیں موت دی، اثْنَتَيْنِ: دو مرتبہ، وَاَحْيَيْتَنَا: اور تُو نے ہمیں زندہ کیا دو مرتبہ، فَاعْتَرَفْنَا بِذُنُوْبِنَا: پس ہم نے اعتراف کرلیا اپنے گناہوں کا، فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ: کیا جہنم سے نکلنے کا کوئی راستہ ہے؟ اِس وقت کوئی راستہ ہے نکلنے کا؟ ہم اپنی غلطی کا اعتراف کرتے ہیں، اور غلطی کا اعتراف کرنا توبہ ہے، ہم توبہ کرتے ہیں، ہمیں اپنی غلطی سمجھ میں آ گئی، واقعی تُو نے ہمیں دو موتیں دیں اور دو زندگیاں دیں، ہمیں یہ بات سمجھ میں آ گئی۔ دو موتیں کس طرح سے؟ ایک موت ہے آپ کے پیدا ہونے سے قبل کی، جس وقت آپ عناصر کی شکل میں پڑے ہوئے تھے، یا بے جان نطفے کی شکل میں تھے، تو اس میں کوئی حیات نہیں تھی وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا فَاَحْيَاكُمْ: پھر اللہ نے تمہیں زندگی دی، تمہارے اندر رُوح ڈالی، ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ پھر اللہ تعالیٰ تمہیں موت دے گا، ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ (سورۂ بقرہ:۲۸) پھر اللہ تعالیٰ تمہیں زندگی دے گا، یہ موت ہے جو اس وقت ہماری زندگی کے بعد آئے گی، اُس کے بعد پھر آخرت کی زندگی ہے، تو دو زندگیاں اور دو موتیں۔ کافر اس بات کو تو مانتے تھے کہ پہلے ہم نہیں تھے، اس موت کے وہ قائل تھے، اس کے بعد کی زندگی کا مشاہدہ تھا، اور اس کے بعد موت کا بھی مشاہدہ تھا، البتہ اگلی زندگی کا انکار تھا، تو تین درجوں کو وہ مانتے تھے، چوتھے کو نہیں مانتے تھے، اب کہتے وہ یہی ہیں کہ ہم بالکل سمجھ گئے کہ دو موتیں اور دو زندگیاں ہیں، دُنیا میں پیدا ہونے سے پہلے بھی بے حس، بے جان، مُردوں کی طرح پڑے ہوئے تھے، کوئی جان نہیں تھی، پھر اللہ نے جان دی، اور اس کے بعد پھر جان نکال لی، موت آ گئی، اور اس کے بعد پھر اگلی زندگی۔ تو اصل انکار تو اگلی زندگی کا تھا، اور پہلے تین درجوں کو تو وہ مانتے تھے، تو مطلب یہ ہو گیا کہ جس طرح سے پہلے تین درجے ہمارے مشاہدے میں تھے، اب چوتھے کا بھی مشاہدہ ہو گیا، واقعی تیری طرف سے ہم پر دو موتیں طاری ہو گئیں اور دو زندگیاں آ گئیں، ہم اپنی غلطیوں کا اقرار کرتے ہیں، ہمیں اچھی طرح سے حقیقت سمجھ میں آ گئی، تو کیا نکلنے کی طرف کوئی راستہ ہے؟ یہ اِستفہام بطور تمنّا کے ہے (مظہری)، یعنی ہمیں کوئی راستہ بتا، تاکہ ہم یہاں سے نکلیں اور جا کر اپنی غلطیوں کی تلافی کر کے آئیں۔ فَهَلْ اِلٰى خُرُوْجٍ مِّنْ سَبِيْلٍ کا جواب خود بخود واضح ہے، کہ اب نکلنے کا کوئی راستہ نہیں۔ ذٰلِكُمْ بِاَنَّهٗ: اور یہ عدمِ خروج، جہنم کے اندر ہمیشہ رہنا، عذاب میں مبتلا ہونا اس سبب سے ہے کہ بے شک قصہ یہ تھا، بات یہ تھی اِذَا دُعِيَ اللّٰهُ وَحْدَهٗ کہ جس وقت اللہ وحدہٗ کو پکارا جاتا، كَفَرْتُمْ: تو تم انکار کرتے تھے، اللہ وحدہٗ کا ذِکر سننا بھی گوارہ نہیں تھا، جس طرح سے پچھلی سورت میں آیا تھا وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ (آیت:۴۵) دلوں پہ اِنقباض طاری ہو جاتا تھا جب اللہ وحدہٗ کا ذِکر آتا تھا، وَاِنْ يُّشْرَكْ بِهٖ: اور اگر اس کے ساتھ شریک ٹھہرایا جاتا

تھا، تُؤْمِنُوْا: توتم ایمان لے آتے تھے۔ فَالْحُکْمُ لِلّٰہِ الْعَلِیِّ الْکَبِیْرِ: پس فیصلہ اللہ ہی کے لئے ہے جو کہ علو والا ہے، کبریائی والا ہے، اسی کے ہاتھ میں فیصلہ ہے، اب یہاں کسی کا کوئی زور نہیں چلے گا۔

دلائلِ قدرت

آگے وہی آیاتِ قدرت جو تدبر کے بعد ایمان کے لئے منشا بنتی ہیں۔ هُوَ الَّذِیْ یُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ: وہی ہے جو تمہیں دکھاتا ہے اپنی نشانیاں، وَ یُنَزِّلُ لَكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ رِزْقًا: اور تمہارے لئے آسمان سے رزق اُتارتا ہے، ''آسمان سے رزق اُتارنے'' کا مطلب یہی ہے کہ بارش اُتارتا ہے، اور اسی طرح سے چاند ستارے سورج کے اثرات زمین تک پہنچاتا ہے، جس کے ساتھ ہمارے لئے رزق مہیا ہوتا ہے، تو اَسبابِ رِزق جتنے ہیں وہ سب آسمان کی طرف سے اُترتے ہیں، وَ فِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ وَ مَا تُوْعَدُوْنَ (سورۂ ذاریات: ۲۲) تمہارا رزق آسمان میں ہے۔ ''آسمان کی طرف سے رِزق اُتارتا ہے'' وَمَا یَتَذَكَّرُ اِلَّا مَنْ یُّنِیْبُ: اور نصیحت حاصل نہیں کرتا مگر وہی جو اللہ کی طرف رُجوع کرے، اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہی ان آیات کو دیکھ کر نصیحت حاصل کرتا ہے، فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِیْنَ لَهُ الدِّیْنَ: جب رِزق وہی اُتارتا ہے، قدرتیں ساری، نعمتیں ساری اُسی کے لئے ثابت ہیں، پھر تم اللہ کو ہی پکارو اس حال میں کہ خالص کرنے والے ہو اس کے لئے طاعت کو، اگرچہ کافر ناپسند ہی کریں، کافر اگر خوش نہیں ہیں، کافر اس بات کو پسند نہیں کرتے تو نہ کریں، تم اللہ کو پکارو اور طاعت کو اللہ کے لئے خاص کرو، رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ: وہ اللہ بُلند درجوں والا ہے، ذِی الْمَعَارِجِ کا لفظ آگے سورۂ معارج میں آئے گا اُس کا بھی یہی معنی ہے، ''اللہ تعالیٰ بُلند درجوں والا ہے'' ظاہر کے طور پر نسبت چونکہ اللہ تعالیٰ کی بُلندی کی طرف آتی ہے، آسمانوں سے اُوپر، کرسی اور عرش سے بھی اُوپر، ان سب درجات کو طے کریں تو اللہ تک وصول ہوتا ہے، ''اللہ درجوں والا ہے۔'' یا ''درجے بلند کرنے والا ہے''، جس طرح سے دوسری جگہ آتا ہے نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَآءُ (سورۂ اَنعام: ۸۳) جس کو ہم چاہتے ہیں اس کے درجے بڑھا دیتے ہیں، تو رَفِیْعُ الدَّرَجٰتِ کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ وہ درجے بڑھانے والا ہے، یعنی مقبولین کے درجوں کو، جیسے هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ (آل عمران: ۱۶۳) وہ درجوں والے ہیں، تو اُن درجوں پر فائز کرنا اللہ ہی کا کام ہے۔ اور خود بھی اُونچے درجوں والا ہے۔ ذُو الْعَرْشِ: عرش والا ہے، یعنی صاحبِ سلطنت ہے، حاکم ہے، جس طرح سے صاحبِ تخت ہونے سے اشارہ حاکم ہونے کی طرف ہوا کرتا ہے۔

اللہ جس کو چاہتے ہیں اپنا نمائندہ بناتے ہیں

یُلْقِی الرُّوْحَ مِنْ اَمْرِهٖ: ڈالتا ہے رُوح اپنے حکم سے جس کے اُوپر چاہتا ہے۔ اس رُوح سے وحی مراد ہے۔ وحی ڈالتا ہے وحی اُتارتا ہے اپنے حکم سے جس کے اُوپر چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے، لِیُنْذِرَ یَوْمَ التَّلَاقِ تاکہ وہ بندہ ڈرائے ملاقات کے دن سے۔ اس میں وہی رِسالت کا ذِکر آ گیا کہ وہ شہنشاہِ حقیقی ہے، بادشاہِ حقیقی ہے، مالکِ حقیقی ہے، اپنا پیغام جس کے اُوپر چاہتا ہے اُتارتا ہے، پھر اس کو مکلّف کرتا ہے کہ آگے دوسرے بندوں کو ڈرائے، اللہ تعالیٰ کی شان اس سے بلند اور برتر ہے کہ ہر کسی کو

براہِ راست وہ پیغام دیتا پھرے کہ یہ کرو، وہ کرو، بلکہ اللہ تعالیٰ اپنا نمائندہ بناتا ہے، اس نمائندے کی بات ماننا، اللہ کی بات ماننا ہی ہے۔ التَّلَاقِ اصل میں ہے التلاقی، تلاقی یتلاقی: آپس میں ملنا۔ ''تاکہ ملاقات کے دن سے وہ بندہ ڈرائے۔''

قیامت کے مناظر

وہ ملاقات کا دن کون سا ہوگا؟ اسی سے بدل ہے یَوْمَ هُمْ بٰرِزُوْنَ: برز، بروز: کھلے میدان کی طرف نکلنا۔ جس دن وہ سارے کے سارے لوگ کھلے میدان کی طرف نکلنے والے ہوں گے، ظاہر ہونے والے ہوں گے۔ لَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْهُمْ شَيْءٌ: کوئی چیز مخفی نہیں ہوگی اُن کی طرف سے اللہ پر، ان کی ہر چیز اللہ کے سامنے ہوگی، اس وقت اللہ تعالیٰ کہے گا لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ: کس کے لئے ہے آج سلطنت؟ جواب واضح ہے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ: اللہ کے لئے ہے جو اکیلا ہے اور سب کو سنبھالنے والا ہے! قہار کا مفہوم آپ کے سامنے کئی دفعہ آیا کہ اصل اس کا مفہوم ایسے ہی ہے جس طرح سے آج کل ہم ''کنٹرولر'' کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔ ''جو سب پر کنٹرول کرنے والا ہے'' اور اس لفظ کے ساتھ بھی شرک کی منشا کو ختم کیا جاتا ہے، مشرکین کا ذہن یہ ہوتا تھا کہ اتنی بڑی سلطنت کو اکیلا اللہ کس طرح سے سنبھال لے گا؟ اس کو لازماً معاونین کی ضرورت ہے، اس لیے وہ معاونین تجویز کرتے تھے، تو اللہ کہتا ہے وہ تو واحد قہار ہے، ہے بھی اکیلا اور سب کو سنبھالنے والا ہے، اس سلطنت کو سنبھالنے کے لئے کسی معاون کی ضرورت نہیں۔ یہ جواب خود اللہ ہی دیں گے، یا اس وقت جو فرشتے موجود ہوں گے وہ جواب دیں گے، اور اگر نفخ ثانی کے بعد یہ واقعہ پیش آئے تو سارے انسان ہی میدانِ قیامت میں کھڑے ہوں گے تو وہ سارے ہی یہ بات پکاریں گے کہ لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ آج سمجھ میں آ گیا کہ واقعی یہ ساری کی ساری سلطنت اُسی اللہ ہی کے لئے ہے جو واحد ہے اور سب کو سنبھالنے والا ہے، اَلْيَوْمَ تُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ: آج بدلہ دے دیا جائے گا ہر نفس اپنے کیے کا، جو اس نے کیا اس کا بدلہ دے دیا جائے گا۔ توحید، رسالت، معاد یہ سب مضمون آپس میں خلط ہو کر آ رہے ہیں۔ لَا ظُلْمَ الْيَوْمَ: آج کوئی ظلم نہیں ہوگا، اِنَّ اللّٰهَ سَرِيْعُ الْحِسَابِ: اللہ تعالیٰ جلدی حساب لینے والے ہیں۔

وَاَنْذِرْهُمْ يَوْمَ الْاٰزِفَةِ: آزفہ: آنے والی۔ آگے بھی یہ لفظ آئے گا اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ ۝ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ (سورۂ نجم) آنے والی آ گئی اور اللہ کے علاوہ اس کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں۔ تو یہاں آزِفہ سے مراد وہی قیامت ہے۔ اور یہ صفت کا صیغہ ہے، یا تو آزفہ کو قیامت کے اسماء میں داخل کر لیجئے (عام تفاسیر) اور یا یہ ہے کہ مصیبت آزفہ کے معنی میں کر لیں، ''آنے والی مصیبت کے دن سے انہیں ڈرا'' اِذِ الْقُلُوْبُ لَدَى الْحَنَاجِرِ: حناجر حَنْجَرَةٌ کی جمع ہے، حنجرہ: حلق کو کہتے ہیں، قلوب قلب کی جمع۔ جس دن کہ دل گلوں تک پہنچنے والے ہوں گے۔ سورۂ احزاب کے اندر بھی یہ لفظ آیا تھا: بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ (آیت:۱۰) وہاں یہ محاورہ آپ کو سمجھایا تھا، ہمارے ہاں لفظ بولا جاتا ہے ''کلیجہ منہ کو آ گیا'' اُردو میں محاورہ یہ ہے کہ اتنی مصیبت اور اتنی دہشت تھی کہ کلیجہ منہ کو آ رہا تھا، اُردو میں محاورہ یوں ہے، اور عربی میں بَلَغَتِ الْقُلُوْبُ الْحَنَاجِرَ والا محاورہ ہے، قلوب حناجر کے پاس پہنچ گئے، دلوں کا حناجر کے پاس پہنچ جانا یہ اشارہ ہوتا ہے اس کیفیت کی طرف، آپ نے دیکھا ہوگا کبھی کوئی دہشت طاری ہو جائے، خوف سامنے آ جائے،

انسان کو معلوم ہو کہ اب کوئی آفت آنے والی ہے تو دل دھک دھک کرتا ہے اور اس طرح سے اور اس طرح اوپر کو چڑھتا ہے گویا کہ یہ باہر نکلنا چاہتا ہے، یہ کیفیت ہوا کرتی ہے، انسان دبانے کی کوشش کرتا ہے، طبیعت کو بھینچتا ہے اور کلیجہ ہے کہ دھک دھک کر رہا ہے، اس طرح سے ہے جیسے کہ باہر ہی نکل جائے گا، یہ اسی کیفیت کی طرف اشارہ ہے، ''جبکہ قلوب گلوں کے پاس پہنچنے والے ہوں گے۔'' كٰظِمِيْنَ: اور انسان دبانے والا ہوگا اپنی طبیعت کو، كَظْم کا معنی ہوتا ہے دبانا، كَظْمِ غَيْظ: غصے کو دبا لینا۔ كٰظِمِيْنَ: یہ حال واقع ہو جائے گا اصحابِ قلوب سے۔ اصحابِ قلوب کاظمین ہوں گے، اپنی کیفیت کو دبانے والے ہوں گے۔ بالکل یہی کیفیت طاری ہوتی ہے خوف اور ہراس کے وقت، انسان اپنے قلب کو ٹھکانے رکھنے کی کوشش کرتا ہے، دبانے والا ہوتا ہے، لیکن خوف و ہراس کی وجہ سے دل اس طرح سے دھڑکتا ہے، یوں معلوم ہوتا ہے جیسے باہر ہی آ جائے گا۔ مَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ حَمِيْمٍ وَّلَا شَفِيْعٍ يُّطَاعُ: نہیں ہوگا ظالموں کے لئے کوئی حمیم۔ حمیم: گرم جوش دوست، خیر خواہ، محبت کی گرمی رکھنے والا۔ ظالموں کے لئے کوئی محبت کرنے والا دوست نہیں ہوگا، نہ کوئی ایسا سفارشی ہوگا جس کا کہنا مانا جائے۔ يُطَاعُ: جس کی اطاعت کی جائے۔ حمیم: گرم جوش دوست کو کہتے ہیں، کوئی ان کے لئے گرم جوش دوست نہیں ہوگا، نہ کوئی سفارشی ہوگا جس کا کہنا مانا جائے۔

اللہ تعالیٰ کا علم بھی کامل ہے اور قدرت بھی کامل ہے

يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ: جانتا ہے اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو۔ خَآئِنَةَ مصدر ہے۔ آنکھوں کی خیانت کو جانتا ہے، اور ان باتوں کو جانتا ہے جن کو سینے چھپاتے ہیں۔ سینوں کے راز، دلوں کے بھید۔ صدور بول کر قلوب بھی مراد ہو سکتے ہیں، بھید اور راز کی نسبت دونوں طرف ہی آیا کرتی ہے، دل کی طرف بھی اور سینے کی طرف بھی، سینے کے راز، دل کے بھید جاننے والا ہے۔ جہاں بھی اللہ تعالیٰ باطل شفاعت کے نظریہ کی تردید فرماتے ہیں قرآنِ کریم میں، تو اس کے ساتھ ہی اپنی صفتِ علم کو ذکر فرمایا کرتے ہیں، یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سفارش جو ہوگی تو اس سفارش میں کسی حقیقت کو بدلا نہیں جا سکتا، ایسا ممکن نہیں کہ اللہ کوئی فیصلہ کرے اور دوسرا شخص جا کر کوئی غلطی نکال دے کہ یا اللہ! یہ بات ایسے نہیں تھی، آپ کو پتا نہیں چلا، حقیقت یہ ہے، جس طرح سے دُنیا میں لوگ فیصلے کرتے ہیں، تو وکلاء اُن کی غلطیاں نکال دیتے ہیں، بعضے پہلو انسان سے مخفی رہ جاتے ہیں، اللہ کے علم میں کوئی کسی قسم کا تغیر نہیں آئے گا، اس لئے اللہ کا فیصلہ جو ہوگا حق کے مطابق ہوگا، کسی کی سفارش حق کو باطل کر کے نہیں ظاہر کر سکتی، باطل کو حق کر کے نہیں ظاہر کر سکتی، اس لئے وہاں سفارش جو ہوگی سب حقیقت پر مبنی ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کے علم کے مطابق ہوگی، اللہ تعالیٰ کو معلوم ہوگا کہ فلاں شخص ایمان والا ہے، اس کے حق میں سفارش کی اجازت دی جائے گی، تو حق کے مطابق ہی بات سنی جائے گی، اللہ کے علم میں کوئی کسی قسم کا تغیر تبدل نہیں ہو سکتا، اس لئے شفاعت کے نظریے کی جب تردید کی جاتی ہے تو ساتھ اللہ تعالیٰ کے علم کو ظاہر کیا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے حق پہ مبنی ہیں، کسی کی سفارش حق کو باطل یا باطل کو حق نہیں بنا سکتی۔ اور آنکھوں کی خیانت، اور دلوں کے بھید ان کا ذکر کر دیا، یہ دونوں چیزیں ہیں جو انسان عام طور پر دوسرے سے مخفی رکھ لیتا ہے، اور کوئی شخص قادر نہیں ہوتا کہ جان لے۔ میں ایک چیز کی طرف دیکھتا ہوں، تو ضروری نہیں کہ آپ کو پتا چل جائے کہ میں اچھی نظر سے دیکھتا ہوں یا بری نظر سے

دیکھتا ہوں؟ اور اتنی جلدی انسان نظریوں کر کے بدل لیتا ہے کہ کسی کو پتا بھی نہیں چلتا، آپ کسی ناجائز چیز کی طرف دیکھتے ہیں، شہوت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، جوں ہی کسی دوسرے شخص کو دیکھیں گے آپ ایک لمحے میں آنکھ پھیر لیں گے، کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا کہ آپ کوئی جرم کر رہے ہیں۔ اور اسی طرح سے دلوں کے خیالات ہیں، تو جب اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے بھید بھی جانتا ہے، جو تم آپس میں ایک دوسرے کے نہیں جان سکتے، تو پھر کسی کا عمل کیا مخفی رہ سکتا ہے اللہ کے سامنے۔ تو خائنہ اگر مصدر ہو تو ''آنکھوں کی خیانت'' یوں ترجمہ کریں گے۔ اور اگر صفت کی اضافت موصوف کی طرف کر لی جائے تو الأعین الخائنۃ والا مفہوم بھی ہو سکتا ہے، خیانت کار آنکھیں (آلوسی)۔ ''جانتا ہے اللہ تعالیٰ آنکھوں کی خیانت کو اور ان باتوں کو جو کہ دل چھپاتے ہیں'' وَاللّٰهُ يَقْضِيْ بِالْحَقِّ: اس لئے اللہ کا فیصلہ حق کے مطابق ہوگا، اللہ سے کسی کی کوئی حقیقت مخفی نہیں ہے۔ ''اللہ فیصلہ کرے گا حق کے مطابق'' وَالَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ: اور وہ چیزیں جن کو پکارتے ہیں یہ لوگ اللہ کے علاوہ، لَا يَقْضُوْنَ بِشَيْءٍ: وہ کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ: بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا دیکھنے والا ہے۔

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ
کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں؟ پھر یہ دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں

كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ؕ وَمَا
وہ زیادہ سخت تھے اِن سے از روئے قوت کے اور از روئے زمین میں نشانات کے، اللہ نے ان کو پکڑ لیا ان کے گناہوں کی وجہ سے، اور نہیں تھا

كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ ﴿۲۱﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
ان کے لیے اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا ﴿۲۱﴾ یہ اس سبب سے ہوا کہ ان کے پاس ان کے رسول آتے تھے واضح دلائل لے کر

فَكَفَرُوْا فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۲۲﴾ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى
پھر انہوں نے کفر کیا، پھر اللہ نے ان کو پکڑ لیا، بے شک اللہ قوت والا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے ﴿۲۲﴾ البتہ تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ کو

بِاٰيٰتِنَا وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿۲۳﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَهَامٰنَ وَقَارُوْنَ فَقَالُوْا سٰحِرٌ
اپنی نشانیوں کے ساتھ اور کھلے غلبے کے ساتھ ﴿۲۳﴾ فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف، پھر کہا انہوں نے: یہ جادوگر ہے

كَذَّابٌ ﴿۲۴﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوا اقْتُلُوْا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ
جھوٹا ہے ﴿۲۴﴾ جس وقت وہ ان کے پاس حق بات لے کر آیا ہمارے پاس سے، وہ کہنے لگے: قتل کر دو ان لوگوں کے بیٹوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں

وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ ۭ وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۲۵﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ

اور زندہ رکھو ان کی عورتوں کو، نہیں تھی کافروں کی تدبیر مگر گمراہی میں ﴿۲۵﴾ فرعون نے کہا: چھوڑو مجھ کو

اَقْتُلْ مُوْسٰى وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ ۚ اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ

میں قتل کردوں موسیٰ کو، یہ بُلالے اپنے رَبّ کو، میں اندیشہ کرتا ہوں کہ یہ موسیٰ تمہارے دِین کو بدل دے گا، یا یہ زمین کے اندر فساد ظاہر

الْفَسَادَ ﴿۲۶﴾ وَقَالَ مُوْسٰٓى اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ ﴿۲۷﴾

کردے گا ﴿۲۶﴾ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں نے پناہ لی اپنے رَبّ کی اور تمہارے رَبّ کی ہر متکبر سے جو ایمان نہیں لاتا یوم حساب پر ﴿۲۷﴾

تفسیر

اَوَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ: کیا یہ لوگ زمین میں چلے پھرے نہیں، فَيَنْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِيْنَ كَانُوْا مِنْ قَبْلِهِمْ: پھر یہ دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا اُن لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں؟ كَانُوْا هُمْ اَشَدَّ مِنْهُمْ قُوَّةً: وہ لوگ اِن سے زیادہ سخت تھے اَز روئے قوت کے، وَّاٰثَارًا فِي الْاَرْضِ: اور زمین میں علامات اور نشانات کے اعتبار سے بڑے سخت تھے، بڑی بڑی عمارات، بڑے بڑے محلات، بڑے بڑے کارنامے ان کے صفحۂ ارض کے اُوپر نقش ہیں۔ آج ہی مغلیہ خاندان کو دیکھ لیجئے، جو آپ کے مُلک کے اندر گزرا ہے، کتنا بڑا خاندان اور کتنی بڑی ان کی سلطنت تھی، اٰثَارًا فِي الْاَرْضِ کے اعتبار سے وہ کتنے مضبوط تھے، کتنے بڑے بڑے ان کے قلعے، کتنے بڑے بڑے محلات اور یادگاریں آج بھی زمین کے اُوپر موجود ہیں، لیکن خاندان تلاش کرو تو نام ونشان بھی نہیں ہے، تو اِنسان بھروسا کرے تو کس چیز پہ کرے؟ سلطنت دیکھو تو ہندوستان کے پرلے کنارے سے لے کے کابل، قندھار تک ان کی سلطنت تھی، سارا کشمیر بھی اس میں، یہ ایک ہی سلطنت تھی مغلیہ خاندان کی، اور ان کے قلعے جا کے دیکھو تو آج لوگوں کے لئے سیرگاہ بنے ہوئے ہیں اور لوگ دیکھ دیکھ کے حیران ہوتے ہیں کہ اتنے بڑے بڑے مضبوط قلعے اور اتنے بڑے بڑے پتھر کہاں سے لے آئے؟ کس طرح سے اتنی بلندی کے اُوپر چڑھا دیے؟ ان کی بنی ہوئی مسجدیں، ان کے بنے ہوئے محلات لوگوں کے لئے آج سیرگاہ ہیں، آثارِ قدیمہ کے طور پر لوگ ان کو دیکھتے ہیں، لیکن خاندان کو تلاش کرو تو نام ونشان بھی نہیں ہے۔ تو اتنی بڑی بڑی سلطنتوں والے، اتنے بڑے بڑے قلعوں والے، اتنے بڑے بڑے محلات والے، اتنے مضبوط علامات اور آثار والے، اُن کا نام ونشان مٹ گیا تو تم کس بِرتے پر کود رہے ہو؟ تمہارے اندر کیا قوت اور طاقت ہے؟ جس کی بنا پر اکڑتے ہو، کہ ہم اللہ سے بچ جائیں گے اور اللہ ہم پر گرفت نہیں کرے گا۔ اگر چلو پھرو اور زمین کے اندر یہ نقشے دیکھو تو تمہیں پتا چلے کہ اللہ کی قدرت کے سامنے تو ہر شخص ہی پرِکاہ ہے، جس طرح سے گھاس کا تنکا ہوتا ہے اور ذرا سا سیلاب آتا ہے، ذرا سی ہوا آتی ہے، اس کو اُڑا بہا کے لے جاتی ہے، وہی حال انسانوں کا ہے، تو یہ زمین چل پھر کر دیکھیں تو ان کی ذرا آنکھ کھل جائے، جیسے سورۂ حج

میں آیا تھا کہ ان کے لئے آنکھیں ہو جائیں جن کے ساتھ یہ دیکھیں، اور ان کے لئے کان ہو جائیں جن کے ساتھ یہ سنیں، ان کے لئے دل ہو جائیں جن کے ذریعے سے یہ سمجھیں، (۱) چلنے پھرنے کے ساتھ اور یہ آثار دیکھنے سے بھی انسان کے اُوپر دُنیا کی فنائیت نمایاں ہوتی ہے، بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑے قلعے میں رہتا ہو، مضبوط محلات میں رہتا ہو، لیکن اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ ''کیا یہ چلتے پھرتے نہیں زمین میں کہ دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے ہیں، وہ زیادہ سخت تھے اِن سے از روئے قوت کے اور از روئے زمین میں نشانات کے۔'' آثار اثر کی جمع ہے، بڑی بڑی یادگاریں بڑے بڑے نشانات اُن کے تھے، فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ: اللہ نے ان کو پکڑ لیا ان کے گناہوں کی وجہ سے، وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ وَّاقٍ: اور نہیں تھا ان کے لئے اللہ کے عذاب سے کوئی بچانے والا۔ وَّاقٍ: واقی تھا۔ وَقٰی یَقِیْ: بچانا۔ جیسے کچھ آیات پہلے یہ لفظ آیا وَقِهِمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَانَتْ تَّاْتِيْهِمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: ان کا بنیادی جرم یہی تھا جس کی بنا پر وہ تباہ ہوئے۔ یہ اس سبب سے ہوا کہ اُن کے پاس ان کے رسول آتے تھے واضح دلائل لے کر، فَكَفَرُوْا: پھر انہوں نے کُفر کیا، فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ: پھر اللہ نے ان کو پکڑ لیا، اِنَّهٗ قَوِيٌّ شَدِيْدُ الْعِقَابِ: بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا ہے اور سخت سزا دینے والا ہے۔ مشرکینِ مکہ کو یہ سُنایا جا رہا ہے کہ تم بھی اسی جرم کا اعادہ نہ کرو، ورنہ انجام تمہارا بھی وہی ہوگا۔

موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

آگے واقعہ تفصیل کے ساتھ آ رہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا، بہت دفعہ یہ واقعہ گزر گیا، وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَا: البتہ تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی نشانیوں کے ساتھ۔ نشانیوں سے ان کے معجزات مراد ہیں، وَسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ: اور کھلے غلبے کے ساتھ۔ سلطانِ مبین: واضح دلیل۔ واضح دلیل سے عصائے موسیٰ والی دلیل مراد ہے (عام تفاسیر)، جس کا معجزہ ہونا بہت ہی نمایاں تھا، اور جس کے ذریعے سے ہر میدان میں موسیٰ علیہ السلام کو غلبہ حاصل ہوا، ''واضح دلیل کے ساتھ''، آیات عام نشانیاں ہو جائیں گی، سلطانِ مبین: واضح دلیل۔ سلطان ایسی دلیل کو کہتے ہیں جس کے ساتھ انسان دُوسرے پر تسلط حاصل کرتا ہے، غلبہ پانے کا ذریعہ، اس سے عصائے موسیٰ مراد ہے، اور قدرتی طور پر اُن کو جو رُعب اللہ نے دیا تھا، ہیبت دی تھی، جس کی بنا پر فرعون بھی ان تک ہاتھ نہیں بڑھا سکا، یہ بھی سُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ہے (آلوسی)۔ ''بھیجا ہم نے فرعون اور ہامان اور قارون کی طرف، پھر کہا انہوں نے: یہ جادوگر ہے جھوٹا ہے'' فرعون اور ہامان تو علی الاعلان کہتے تھے، اور قارون منافق تھا، در پردہ یہ بھی ایسے سمجھتا تھا، اس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ قصص میں آ گیا، فرعون کے ملازمین میں سے تھا، تھا یہ اسرائیلی، اور منافق تھا، اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے خلاف یہ بھی سازشیں کرتا رہتا تھا، تو پہلے دو صراحتاً کہتے تھے، یہ در پردہ کہتا تھا، یا تغلیباً، چونکہ یہ تھا اسی پارٹی کا، اگرچہ زبان سے ساحر، کذاب نہ کہتا ہو، لیکن جب ان میں شامل رہتا تھا تو فرعون اور ہامان کی بات اس کی طرف بھی منسوب ہوگئی، تو یہ کہنے لگے ''جادوگر ہے جھوٹا

(۱) اَفَلَمْ يَسِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَاۤ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا (سورۃ حج آیت: ۴۶)

ہے" یعنی یہ معجزات جو دکھارہا ہے تو یہ جادو کے ذریعے سے دکھارہا ہے، اور یہ اپنے آپ کو مُرسَل مِن اللہ جو کہتا ہے تو اس دعوے میں جھوٹا ہے ساحر کذاب کا یہ معنی ہوا۔

فرعونیوں کے منصوبے ناکام رہے

فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِالْحَقِّ: جس وقت وہ اُن کے پاس حق بات لے کر آیا ہمارے پاس سے، قَالُوا اقْتُلُوٓا اَبْنَآءَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ وَاسْتَحْيُوْا نِسَآءَهُمْ: وہ کہنے لگے: قتل کردو ان لوگوں کے بیٹوں کو جو اس کے ساتھ ایمان لاتے ہیں، اور زِندہ رکھو ان کی عورتوں کو۔ فرعون نے یہ ایک دفعہ سکیم تو بنائی تھی موسیٰ علیہ السلام کی ولادت سے پہلے، جس کے نتیجے میں موسیٰ علیہ السلام کو دریا میں ڈالنے کی نوبت آئی تھی، اور ایک سکیم اِن کی بنی تھی موسیٰ علیہ السلام کے آجانے کے بعد، جب وہ رسول بن کر آئے تو انہوں نے خیال کیا کہ جو لوگ اُس کو مانتے چلے جائیں اُن کی نسل قطع کردو، تا کہ یہ قوت نہ پکڑیں اور ان میں کثرت نہ پیدا ہو، اس سکیم پر عمل ہوا یا نہیں؟ اس کی تاریخ میں کوئی وضاحت نہیں ہے۔ "کہا انہوں نے کہ قتل کردو ان لوگوں کے بیٹوں کو جو ان کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور زندہ رکھو ان کی عورتوں کو" وَمَا كَيْدُ الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ: نہیں تھی کافروں کی تدبیر مگر گمراہی میں، یعنی اُن کی سب تدبیریں بے اثر رہیں، آخر حق غالب آ کر رہا، اور یہ حق کی مخالفت کرنے والے بے نام ونشان ہوکر رہے، یہی مطلب ہے اس کا "نہیں تھی کافروں کی تدبیر مگر گمراہی میں"، یعنی اس تدبیر سے ان کی گمراہی میں اضافہ ہوا، باقی! یہ کام کچھ نہ آئی۔

فرعون نے قوم کا ذہن پھیرنے کی کوشش کی

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ذَرُوْنِيْٓ اَقْتُلْ مُوْسٰى: فرعون نے کہا اپنے اُعیانِ سلطنت کو خطاب کرتے ہوئے، اپنے مجالسین کو، مصاحبین کو خطاب کرتے ہوئے، "مجھے چھوڑ دو میں قتل کردوں موسیٰ کو"، اس میں تاثر یہ دینا چاہتا ہے کہ میں قتل تو کرسکتا ہوں لیکن میرے ساتھیوں نے مجھے روکا ہوا ہے، چاہے اندر سے وہ دھڑکتا ہی ہو، ڈرتا ہی ہو، لیکن تاثر یہ دے رہا ہے کہ مجھے یہ اجازت نہیں دیتے، اگر یہ مجھے اجازت دے دیں تو میں تو کبھی سے اس کو اڑادیتا۔ "چھوڑ دو مجھ کو میں قتل کردوں موسیٰ کو" وَلْيَدْعُ رَبَّهٗ: یہ بلالے اپنے رَبّ کو اپنی مدد کے لئے، اِنِّيْٓ اَخَافُ اَنْ يُّبَدِّلَ دِيْنَكُمْ: میں اندیشہ کرتا ہوں کہ یہ موسیٰ تمہارے دِین کو بدل دے گا، اَوْ اَنْ يُّظْهِرَ فِي الْاَرْضِ الْفَسَادَ: یا یہ زمین کے اندر فساد ظاہر کردے گا، یعنی مجھے اس سے دو خطرے ہیں، اپنی قوم کو اُلّو بنانے کے لئے ظاہر کررہا ہے، کہ مجھے اجازت دو میں اسے قتل کردوں، دو خطرے ہیں، ایک تو تمہارا دین خراب کردے گا، مجھے یہ خطرہ ہے، تمہارے جو مذہبی نظریات چلے آرہے ہیں کہ تم اپنے بادشاہ کو رَبّ سمجھتے ہو، اسی کو سب کچھ سمجھتے ہو، یہ تو تمہارا دِین برباد کردے گا، اس کے آنے سے دِین کو خطرہ لاحق ہوگیا، اس کے آنے سے دِین خطرے میں پڑ گیا، تمہارے نظریات بدل جائیں گے، اور پھر زمین میں فساد ہوگا، بغاوت ہوجائے گی اور تمہاری سلطنت ختم ہوجائے گی، دینی دُنیوی دونوں اعتبار سے نقصان ہے، مجھے اجازت دو میں اسے قتل کردوں، اس سے دِین کا خطرہ بھی ہے اور دُنیا میں بھی فساد برپا ہونے کا خطرہ ہے، وَقَالَ مُوْسٰى: موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یوں یہ دھمکیاں دیتا ہے تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ لَّا يُؤْمِنُ بِيَوْمِ الْحِسَابِ: میں نے پناہ لی اپنے رَبّ کی اور تمہارے رَبّ

کی ہر متکبر سے جو ایمان نہیں لاتا یوم حساب پر، جو آخرت کا قائل نہیں ایسے ہر متکبر سے میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں، اللہ مجھے ان کے شر سے بچائے گا، مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ: ہر متکبر سے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ محاورے کے مطابق اس کا ترجمہ کرتے ہیں "ہر خر دماغ سے"، تو متکبر جو ہوتا ہے وہ "خر دماغ" ہی ہوتا ہے، یعنی گدھے کی طرح بوجھ کے اندر دبا ہوا ہوگا، ہر قسم کی ذلت، رُسوائی اس کے اُوپر ہوگی، لیکن اپنے آپ کو وہ سمجھتا ہے کہ میری دولتی کا کوئی جواب ہی نہیں، اس کا اپنی سوچ یہ ہوتی ہے، جب ہینگتا ہے تو یوں ہینگتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ بس سب کے اوپر آواز اسی کی غالب ہے، تو متکبر آدمی خر دماغ ہی ہوا کرتا ہے، اس لیے یہاں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے "متکبر" کا ترجمہ "خر دماغ" کے ساتھ کیا ہے، یعنی گدھے کی شان بھی ایسے ہی ہے، یہ بے عقلی کی علامت ہوتی ہے، عقل مند آدمی تو سوچتا ہے کہ ہم میں کتنا احتیاج ہے، ہم کتنے محتاج ہیں، ہم میں کتنے نقص ہیں کتنے عیب ہیں، اپنے نقص اور عیب کو اگر کوئی شخص سامنے رکھے تو پھر وہ ڈینگیں نہیں مارتا، دوسرے کے سامنے متکبر نہیں ہوا کرتا، تکبر وہی کرتا ہے جس کو اتنی عقل نہیں کہ اپنی کمی کمزوری کو سوچ سکے، "ہر متکبر سے جو یوم حساب پر ایمان نہیں لاتا"

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗٓ اَتَقْتُلُوْنَ رَجُلًا اَنْ
کہا ایک آدمی نے جو ایمان لانے والا تھا فرعون کے خاندان میں سے، چھپاتا تھا وہ اپنے ایمان کو: کیا قتل کرتے ہو تم ایک آدمی کو اس وجہ سے کہ
يَّقُوْلَ رَبِّيَ اللّٰهُ وَقَدْ جَآءَكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ مِنْ رَّبِّكُمْ ۭ وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا فَعَلَيْهِ
وہ کہتا ہے میرا رَبّ اللہ ہے، اور تحقیق لایا ہے وہ تمہارے پاس واضح دلائل تمہارے رَبّ کی طرف سے، اگر وہ جھوٹا ہے تو اس کے جھوٹ کا وبال
كَذِبُهٗ ۚ وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا يُّصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ
اسی پر پڑے گا، اور اگر وہ سچا ہے تو پہنچے گی تمہیں بعض وہ چیز جس سے وہ تمہیں ڈراتا ہے، بے شک اللہ نہیں ہدایت دیتا اس شخص کو جو
هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ ﴿۲۸﴾ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ ظٰهِرِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۡ فَمَنْ
حد سے نکلنے والا جھوٹا ہو ﴿۲۸﴾ اے میری قوم! آج کے دن تمہارے لیے سلطنت ہے اس حال میں کہ تم غالب آنے والے ہو ملک میں، پس کون
يَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ اِنْ جَآءَنَا ۭ قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِيْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰى وَمَآ
مدد کرے گا ہماری اللہ کے عذاب سے اگر وہ ہمارے پاس آ گیا؟ فرعون نے کہا کہ نہیں دکھاتا میں تمہیں مگر وہی چیز جو خود دیکھتا ہوں اور نہیں
اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ ﴿۲۹﴾ وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ
چلاتا میں تمہیں مگر درستی کے راستے پر ﴿۲۹﴾ کہا اس شخص نے جو ایمان لے آیا: اے میری قوم! بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر

مِثْلَ يَوْمِ الْأَحْزَابِ ﴿٣٠﴾ مِثْلَ دَأْبِ قَوْمِ نُوحٍ وَعَادٍ وَثَمُودَ وَالَّذِينَ مِنْ

احزاب کے دن کی مثل کا ﴿۳۰﴾ مثل حال قوم نوح کے، عاد کے، ثمود کے اور ان لوگوں کے

بَعْدِهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ يُرِيدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ ﴿٣١﴾ وَيَا قَوْمِ إِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ يَوْمَ

جو ان کے بعد گزرے ہیں، اور اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا ﴿۳۱﴾ اے میری قوم! بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر

التَّنَادِ ﴿٣٢﴾ يَوْمَ تُوَلُّونَ مُدْبِرِينَ مَا لَكُم مِّنَ اللَّهِ مِنْ عَاصِمٍ ۗ وَمَن يُضْلِلِ

یوم تناد کا ﴿۳۲﴾ جس دن کہ تم پیٹھ پھیر کر جاؤ گے، اللہ کے عذاب سے تمہیں کوئی بچانے والا نہیں ہوگا، اور جس کو اللہ بھٹکا دے

اللَّهُ فَمَا لَهُ مِنْ هَادٍ ﴿٣٣﴾ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ يُوسُفُ مِن قَبْلُ بِالْبَيِّنَاتِ فَمَا زِلْتُمْ فِي

پھر اس کو کوئی سیدھا راستہ دکھانے والا نہیں ﴿۳۳﴾ البتہ تحقیق تمہارے پاس یوسف آئے تھے اس سے قبل واضح دلائل لے کر، اور تم ہمیشہ رہے

شَكٍّ مِّمَّا جَاءَكُم بِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا هَلَكَ قُلْتُمْ لَن يَبْعَثَ اللَّهُ مِن بَعْدِهِ

شک میں اس بات کی طرف سے جس کو یوسف لے کر آئے تھے، حتیٰ کہ جس وقت یوسف کا انتقال ہوگیا تو تم نے کہا: ہرگز نہیں بھیجے گا اللہ اس کے بعد

رَسُولًا ۚ كَذَٰلِكَ يُضِلُّ اللَّهُ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ مُّرْتَابٌ ﴿٣٤﴾ الَّذِينَ يُجَادِلُونَ فِي

کوئی رسول، ایسے ہی بھٹکا دیتا ہے اللہ اُن لوگوں کو جو حد سے بڑھنے والے اور شک میں پڑنے والے ہوتے ہیں ﴿۳۴﴾ جو جھگڑا کرتے ہیں

آيَاتِ اللَّهِ بِغَيْرِ سُلْطَانٍ أَتَاهُمْ ۖ كَبُرَ مَقْتًا عِندَ اللَّهِ وَعِندَ الَّذِينَ آمَنُوا ۚ

اللہ کی آیات میں بغیر کسی دلیل کے جو ان کے پاس آئی ہو، اور یہ جھگڑا کرنا بڑا ہے ازروئے بیزارگی کے اللہ کے نزدیک اور مؤمنین کے نزدیک

كَذَٰلِكَ يَطْبَعُ اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ ﴿٣٥﴾ وَقَالَ فِرْعَوْنُ يَا هَامَانُ ابْنِ

ایسے ہی مُہر کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہر متکبر جبّار کے دِل پر ﴿۳۵﴾ فرعون نے کہا: اے ہامان! بنا

لِي صَرْحًا لَّعَلِّي أَبْلُغُ الْأَسْبَابَ ﴿٣٦﴾ أَسْبَابَ السَّمَاوَاتِ فَأَطَّلِعَ إِلَىٰ إِلَٰهِ مُوسَىٰ وَ

میرے لیے ایک محل تا کہ پہنچ جاؤں میں راستوں پر ﴿۳۶﴾ یعنی آسمان کے راستوں پر، پھر میں جھانک لوں موسیٰ کے خدا کی طرف، اور

إِنِّي لَأَظُنُّهُ كَاذِبًا ۚ وَكَذَٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوءُ عَمَلِهِ وَصُدَّ عَنِ السَّبِيلِ ۚ وَ

بے شک میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں۔ ایسے ہی مزین کر دیا گیا فرعون کے لئے اس کا بُرا کردار، اور وہ راستے سے روک دیا گیا، اور

مَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ ﴿۳۷﴾

نہیں تھی فرعون کی تدبیر مگر تباہی میں ﴿۳۷﴾

تفسیر

''مؤمنِ آلِ فرعون'' کی فرعونیوں کو نصیحتیں

جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے قتل کی دھمکی دی تو ایک شخص فرعون کی قوم میں سے مؤمن تھا، لیکن اس نے اپنا ایمان چھپایا ہوا تھا، یہ وہی شخص ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہاتھ سے قبطی قتل ہو گیا تھا اور فرعون کے دربار میں اس وقت موسیٰ علیہ السلام کے قتل کے متعلق مشورے ہونے لگے تھے، تو یہ بھاگا ہوا آیا تھا اطلاع دینے کے لئے، اور یہ کہا تھا کہ تیرے قتل کے مشورے ہو رہے ہیں، اِنَّ الْمَلَاَ يَاْتَمِرُوْنَ بِكَ لِيَقْتُلُوْكَ فَاخْرُجْ اِنِّيْ لَكَ مِنَ النّٰصِحِيْنَ (سورۂ قصص: ۲۰) تجھے قتل کرنے کے مشورے کر رہے ہیں، یہاں سے چلا جا، میں تیرا خیر خواہ ہوں، تو یہ وہی شخص ہے (مظہری)۔ تو اس وقت اس نے پھر اپنی قوم کو کچھ نصیحتیں کیں جس کے ساتھ اس کا ایمان ظاہر ہو گیا، آگے تفصیل کے ساتھ اس کی گفتگو ہے جو اپنی قوم کے سامنے وہ کرتا ہے۔

وَقَالَ رَجُلٌ مُّؤْمِنٌ ۖ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ: کہا ایک آدمی نے جو ایمان لانے والا تھا فرعون کی آل میں سے، فرعون کے خاندان میں ایک رَجلِ مؤمن تھا اس نے کہا، يَكْتُمُ اِيْمَانَهٗ: جو اپنا ایمان چھپاتا تھا، ''کہا ایک آدمی نے جو ایمان لانے والا تھا فرعون کے خاندان میں سے، چھپاتا تھا وہ اپنے ایمان کو، کیا قتل کرتے ہو تم ایک آدمی کو اس وجہ سے کہ وہ کہتا ہے میرا رَبّ اللہ ہے؟'' اس سے زیادہ اُس کا کیا قصور ہے؟ وہ چور نہیں، ڈاکو نہیں، اس میں کوئی کسی قسم کی عیب کی بات نہیں پائی جاتی، صرف اتنی بات وہ کہتا ہے کہ میرا رَبّ اللہ ہے، اس جرم کی بنا پر تم اس کو قتل کرنا چاہتے ہو؟ ''کیا قتل کرتے ہو تم ایک آدمی کو اس وجہ سے کہ وہ کہتا ہے کہ میرا رَبّ اللہ ہے، اور تحقیق لایا ہے وہ تمہارے پاس واضح دلائل تمہارے رَبّ کی طرف سے'' وَاِنْ يَّكُ كَاذِبًا: اگر وہ جھوٹا ہے، فَعَلَيْهِ كَذِبُهٗ: تو اس کے جھوٹ کا وبال اسی پر پڑے گا، وَاِنْ يَّكُ صَادِقًا: اور اگر وہ سچا ہے۔ يَكُ اصل میں يَكُنْ تھا۔ اگر وہ سچا ہے يُصِبْكُمْ بَعْضُ الَّذِيْ يَعِدُكُمْ: تو پہنچے گی تمہیں بعض وہ چیز جس سے وہ تمہیں ڈراتا ہے۔ يَعِدُ یہ وعید سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایک آدمی ہے تم چھوڑو، تمہارے خیال کے مطابق اگر جھوٹ بولتا ہے تو جھوٹ کا وبال اسی پہ آئے گا، جھوٹے کا جھوٹ کب تک چلے گا، اور اگر وہ سچا ہوا اور تم نے اس کے اوپر ہاتھ اٹھا لیا تو جس عذاب سے وہ تمہیں ڈراتا ہے اس عذاب کا بعض حصہ تمہیں دُنیا میں پہنچ سکتا ہے، تم برباد ہو جاؤ گے، اس لئے اس معاملے کو ذرا سوچ لو، ہاتھ نہ اُٹھانا، اگر وہ جھوٹا ہے تو اسی پر جھوٹ کا وبال پڑے گا، اور اگر وہ سچا ہے تو پہنچے گی تمہیں بعض وہ چیز جس سے وہ تمہیں ڈراتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِيْ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ كَذَّابٌ: بے شک اللہ تعالیٰ نہیں ہدایت دیتا اس شخص کو جو مسرف کذّاب ہو۔ مسرف: حد سے نکلنے والا۔ کذّاب: جھوٹا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مسرف کذّاب ہوا تو وہ اپنی بات میں کامیاب نہیں ہوگا، اور اگر تم مسرف کذّاب ہوئے تو تم اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ يٰقَوْمِ لَكُمُ الْمُلْكُ الْيَوْمَ:

اے میری قوم!" "اے میری قوم" یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے کوئی ہمدردی کے ساتھ سمجھانے والا ہوتا ہے،" میرے بھائیو!"
"بیان القرآن" میں ترجمہ اسی محاورے کے مطابق کیا گیا ہے "اے میرے بھائیو!" آج کے دن تمہارے لیے سلطنت ہے اس
حال میں کہ تم غالب آنے والے ہو ملک میں، غلبہ تمہیں حاصل ہے، فَمَنْ یَّنْصُرُنَا مِنْۢ بَاْسِ اللّٰهِ: اپنے آپ کو اس قوم میں شامل کر کے
وہ کہہ رہا ہے، کہ کون مدد کرے گا ہماری اللہ کے عذاب سے، اِنْ جَآءَنَا: اگر وہ ہمارے پاس آ گیا؟، اللہ کے عذاب سے بچانے
کے لئے ہماری مدد کون کرے گا اگر اللہ کا عذاب آ گیا جس طرح سے یہ شخص کہہ رہا ہے۔ فرعون نے اس کے جواب میں کہا
قَالَ فِرْعَوْنُ مَآ اُرِیْكُمْ اِلَّا مَآ اَرٰی: یہ اپنا اِخلاص واضح کر رہا ہے۔ فرعون نے کہا کہ نہیں دِکھاتا میں تمہیں مگر وہی چیز جو خود دیکھتا ہوں،
وَمَآ اَهْدِیْكُمْ اِلَّا سَبِیْلَ الرَّشَادِ: اور نہیں چلاتا میں تمہیں مگر دُرستی کے راستے پر، یعنی یہ نہیں کہ میرے دِل میں کچھ اور ہو، اُوپر سے کچھ
اور کہوں، میں دِل سے ہی اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں، اور اس لیے تمہیں وہی چیز دِکھاتا ہوں جو خود دیکھ رہا ہوں، اور میری رائے صحیح ہے،
میں تمہیں دُرستی کے راستے پر چلاتا ہوں، اس لئے میری بات مانو۔ وَقَالَ الَّذِیْٓ اٰمَنَ: کہا اس شخص نے جو ایمان لے آیا، یٰقَوْمِ اِنِّیْٓ
اَخَافُ عَلَیْكُمْ مِّثْلَ یَوْمِ الْاَحْزَابِ: اے میری قوم! بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر احزاب کے دِن کی مثل کا، یعنی پہلے جو مختلف
گروہ گزرے ہیں، جن کا ذکر ابتدائے سورت میں بھی آیا تھا، ان گروہوں پر جس قسم کا دِن آیا تھا مجھے بھی تم پر اسی قسم کے دِن کے
آنے کا اندیشہ ہے، احزاب کی آگے تفصیل آ گئی، مِثْلَ دَاْبِ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ وَالَّذِیْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ: داب حال کو کہتے ہیں۔ مثل
حال قومِ نوح کے، عاد کے، اور ثمود کے اور ان لوگوں کے جو اُن کے بعد گزرے ہیں، وَمَا اللّٰهُ یُرِیْدُ ظُلْمًا لِّلْعِبَادِ: اور اللہ تعالیٰ بندوں
کے لئے ظلم کا ارادہ نہیں کرتا۔ جو حال ان پہ آیا تھا اسی قسم کے حال کا مجھے تم پہ اندیشہ ہے، اور اللہ تعالیٰ جب فیصلہ فرماتے ہیں
انصاف کے مطابق فرماتے ہیں، اللہ کے فیصلے کے اندر ظلم نہیں ہوتا، "نہیں ارادہ کرتا اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے ظلم کا" وَیٰقَوْمِ:
اے میرے بھائیو! اے میری قوم! اِنِّیْٓ اَخَافُ عَلَیْكُمْ یَوْمَ التَّنَادِ: بے شک میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر یومِ تناد کا۔ تناد یہ بھی
باب تفاعل کا مصدر ہے۔ تَنَادِیْ: ایک دوسرے کو آوازیں دینا۔ یا تو اس سے وہ چیخ و پکار مراد ہے دُنیوی عذاب آنے کے بعد قوم
جس میں مبتلا ہوتی ہے، جب اس قسم کی کوئی آفت آیا کرتی ہے تو چیخ و پکار شروع ہو جاتی ہے، ایک دُوسرے کو بُلاتے ہیں، آوازیں
دیتے ہیں، تو عذاب کا دِن مراد ہے (تفسیر عثمانی)۔ یا قیامت کا دِن مراد ہے (عام تفاسیر)، قیامت کے دِن بھی مختلف آوازیں آئیں
گی، یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ (سورۂ ق: ۴۱)، نَادٰٓی اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ (الاعراف: ۴۴)، نَادٰٓی اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ (الاعراف: ۴۸)
اور اسی طرح سے جس وقت موت کو دُنبے کی شکل میں لایا جائے گا تو آواز دی جائے گی: "یا اھلَ الجنۃ لا موت! یا اھلَ النار لا
موت!" یہ سب ندائیں ہیں جن کا ذکر قرآنِ کریم میں ہے، اور خود "نفخ" کو بھی ندا کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے، تو قیامت کا دِن مراد
ہو جائے گا، یا دُنیوی عذاب کا دِن مراد ہے۔ چیخ و پکار کا دِن، یا آپس میں ایک دوسرے کو بلانے کا دِن۔ یَوْمَ تُوَلُّوْنَ مُدْبِرِیْنَ: جس
دِن کہ تم پیٹھ پھیرو گے، مڑو گے تم پیٹھ پھیر کر، اس سے یا تو وہی عذاب دیکھ کر بھاگنا مراد ہے یا قیامت کے دِن اپنے جہنمی ہونے کا
فیصلہ سُن کے جب پیٹھ پھیر کر میدان سے جہنم کی طرف جاؤ گے یہ تولّی مراد ہے۔ "جس دِن کہ تم پیٹھ پھیر کے جاؤ گے" مَا لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ
مِنْ عَاصِمٍ: اللہ کے عذاب سے تمہیں کوئی بچانے والا نہیں ہوگا، وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ: اور جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے، فَمَا لَهٗ مِنْ هَادٍ: پھر اس کو

کوئی سیدھا راستہ دکھانے والا نہیں۔ وَلَقَدْ جَآءَكُمْ يُوسُفُ مِنْ قَبْلُ بِالْبَيِّنٰتِ: البتہ تحقیق تمہارے پاس یوسف علیہ السلام آئے تھے اس سے قبل واضح دلائل لے کر، فَمَا زِلْتُمْ فِي شَكٍّ مِّمَّا جَآءَكُمْ بِهٖ: اور تم ہمیشہ رہے شک میں اس بات کی طرف سے جس کو یوسف علیہ السلام لے کر آئے تھے، تو یوسف علیہ السلام چونکہ اس سے پہلے آئے تھے اور اُن کی تاریخ کچھ چلی آ رہی تھی، اور یہ جَآءَكُمْ کے ساتھ جو کہا جا رہا ہے تو مراد اپنی قوم ہے، تمہارے پاس یعنی تمہارے بڑوں کے پاس یوسف علیہ السلام بھی آئے تھے، تم اُن کی باتوں میں بھی ہمیشہ شک کرتے رہے، حَتّٰۤى اِذَا هَلَكَ: حتیٰ کہ جس وقت یوسف علیہ السلام کا انتقال ہو گیا، قُلْتُمْ: تو تم نے کہا لَنْ يَّبْعَثَ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِهٖ رَسُوْلًا: ہرگز نہیں بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی رسول، یعنی اوّل تو تم اس کو رسول نہیں سمجھتے تھے، اور پھر تم مطمئن ہو گئے کہ چلو! یہ تھے یہ فوت ہو گئے، اب اس کے بعد کوئی دُوسرا آنے والا نہیں۔ ''ہرگز نہیں بھیجے گا اللہ تعالیٰ اس کے بعد کوئی رسول، ایسے ہی بھٹکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کو جو کہ حد سے بڑھنے والے اور شک میں پڑنے والے ہوتے ہیں'' جن کو کسی حقیقت کو جان کر ماننے کی عادت نہیں ہوتی وہ اسی طرح سے بھٹکتے رہتے ہیں، ''بھٹکا دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس شخص کو جو کہ مسرف مرتاب ہوتا ہے'' مُسرِف: حد سے بڑھنے والا۔ مُرتاب: شک میں پڑنے والا۔ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰهُمْ: یہ مَنْ هُوَ مُسْرِفٌ کی صفت آ گئی (نسفی)، جو جھگڑا کرتے ہیں اللہ کی آیات میں بغیر کسی دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو، كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اور یہ جھگڑا کرنا بڑا ہے ازروئے بیزارگی کے اللہ کے پاس اور ان لوگوں کے پاس جو ایمان لاتے ہیں، اللہ کے نزدیک اور مؤمنین کے نزدیک یہ بہت بیزاری کی بات ہے کہ انسان حق کے مقابلے میں بے دلیل ہی اَڑا رہے، اور خواہ مخواہ اڑنگے لگاتا رہے، بے دلیل ہی جھگڑے ڈالتا رہے۔ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ: ایسے ہی مُہر کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ہر متکبر جبار کے دِل پر۔ قَلْبِ مُتَكَبِّرٍ جَبَّارٍ یہ اضافت موصوف کی صفت کی طرف بھی ہو سکتی ہے، ہر متکبر جبار دِل پر، یا اضافی معنی کریں تو ترکیبی معنی یوں ہوگا کہ متکبر جبار کے ہر دِل پر یا پورے دِل پر (عام تفاسیر)، اصل میں تعمیم کرنی مقصود ہے کہ ہر متکبر، جبار کے قلب پر اللہ ایسی مُہر کر دیتا ہے کہ حق قبول کرنے کی اس میں صلاحیت نہیں رہتی، تو گویا کہ تکبر اور جبر، یہ چیزیں حق قبول کرنے سے مانع ہوتی ہیں، تو جو شخص تکبر کو چھوڑ دے، تواضع اختیار کر لے، حق قبول کرنے کی توفیق اسے ہی ہوتی ہے۔

فرعون کی سیاسی چال

وَقَالَ فِرْعَوْنُ يٰهَامٰنُ: ''فرعون نے کہا: اے ہامان!'' یہ بھی دیکھو! ایک اُلّو بنانے والی بات ہے، جس طرح سے آج حکومت سے کوئی مطالبہ کیا جائے اور حکومت اس بات کو ٹالنا چاہے، تو ''تحقیقاتی کمیٹی'' قائم کر دی جاتی ہے، جب ''تحقیقاتی کمیٹی'' قائم کر دی جائے گی تو قوم کے جذبات کچھ ٹھنڈے ہو جاتے ہیں، قوم مغالطے میں ہو جاتی ہے، تو تحقیق کرتے کرتے آگے معاملہ کہیں کا کہیں پہنچ جاتا ہے۔ تو جب اس مؤمن کی تقریر کے سامنے فرعون کو کوئی اور جواب نہ آیا تو فرعون اپنے وزیر ہامان سے کہتا ہے کہ لو! پھر ہم اس کی تحقیق کر ہی لیتے ہیں، اینٹیں پکاؤ، اور ایک بہت اُونچا محل بناؤ، جس کے اُوپر میں چڑھ کے آسمان تک پہنچ جاؤں، تو وہاں جا کر میں دیکھ آتا ہوں کہ کیا واقعی اُوپر کوئی خدا ہے؟ میں تو سمجھتا ہوں کہ موسیٰ جھوٹ کہتا ہے، میرے علاوہ الٰہ میں تو

کوئی جانتا ہی نہیں مَا عَلِمْتُ لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرِي (سورۂ قصص:۳۸)، تو میں تو اس کو جھوٹا ہی سمجھتا ہوں، تو گویا کہ یہ معاملہ کمیٹی کے سپرد کرلیا کہ چلو! ہم تحقیقات کر لیتے ہیں جو وہ کہتا ہے کہ رَبُّ العالمین کوئی اور بھی ہے، آسمانوں میں کوئی اور خدا بھی ہے، تو ہم تحقیق کر لیتے ہیں، اس معاملے میں ہمیں کوئی ضد نہیں ہے، ہم تحقیق کرتے ہیں اگر بات صحیح ثابت ہوگی تو ہم مان لیں گے، ہمارا خیال تو یہی ہے کہ یہ غلط کہہ رہا ہے، بس میں ہی ہوں جو کچھ ہوں، آسمانوں پر کوئی نہیں۔ یہ قوم کو دوسری طرف متوجہ کرنے کے لئے ایک شوشہ چھوڑ دیا۔'' کہنے لگا فرعون: اے ہامان! بنا میرے لئے ایک محل'' پہلے لفظ آئے تھے فَاَوْقِدْ لِيْ يٰهَامٰنُ عَلَى الطِّيْنِ (سورۂ قصص)، مٹی کے اُوپر آگ جلا، اس سے بھٹا جلانا مراد ہے، مٹی پہ آگ جلا کے جو اینٹیں پکائی جاتی ہیں، تو معلوم ہوتا ہے کہ اینٹیں پکانے کا رِواج فرعون سے پہلے سے چلا آ رہا ہے، لوگ اس طرح سے اینٹیں پکا کے عمارتیں بنایا کرتے تھے، ''بنا میرے لیے ایک محل' لَّعَلِّيْٓ اَبْلُغُ الْاَسْبَابَ ۝ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ: تا کہ پہنچ جاؤں میں راستوں پر یعنی آسمان کے راستوں پر۔ اَسْبَابَ السَّمٰوٰتِ یہ الْاَسْبَابَ سے بدل ہے۔ فَاَطَّلِعَ اِلٰٓى اِلٰهِ مُوْسٰى: پھر میں جھانک لوں موسیٰ کے خدا کی طرف، یعنی میں جھانک کے دیکھ آؤں کہ واقعی کوئی اِلٰہ ہے جس کو موسیٰ اِلٰہ کہہ رہا ہے۔ وَاِنِّيْ لَاَظُنُّهٗ كَاذِبًا: بے شک میں تو اس کو جھوٹا سمجھتا ہوں، وَكَذٰلِكَ زُيِّنَ لِفِرْعَوْنَ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ: اسی طرح سے مزین کر دیا گیا فرعون کے لئے اس کا بُرا کردار، وہ اپنے بُرے کردار پر مطمئن تھا، اس کو اپنی سب کارروئیاں اچھی لگ رہی تھیں، ''ایسے ہی مزین کر دیا گیا فرعون کے لئے اس کا بُرا کردار'' وَصُدَّ عَنِ السَّبِيْلِ: اور وہ راستے سے روک دیا گیا، وَمَا كَيْدُ فِرْعَوْنَ اِلَّا فِيْ تَبَابٍ: اور نہیں تھی فرعون کی تدبیر مگر تباہی میں، اس قسم کی تدبیروں کے ساتھ وہ ہر روز تباہی کی طرف ہی جا رہا تھا، اِس سے اُس کے حالات سدھر نہیں رہے تھے۔

وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ ۝۳۸ يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ
کہا اُس شخص نے جو ایمان لے آیا، اے میری قوم! میری اتباع کرو، میں تمہیں دُرستی کا راستہ دِکھاؤں گا ۝۳۸ اے میری قوم! سوائے اس کے نہیں کہ یہ
الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ ۡ وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ ۝۳۹ مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً فَلَا
دُنیوی زندگی چند روزہ سامان ہے، اور بے شک آخرت وہی قرار کا گھر ہے ۝۳۹ جو کوئی بُرا عمل کرے گا تو نہیں
يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا ۚ وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰٓئِكَ
بدلہ دیا جائے گا مگر اسی کے برابر، اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، مرد ہو یا عورت، اس حال میں کہ مؤمن بھی ہو، یہ لوگ
يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝۴۰ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى
جنت میں داخل ہوں گے، رِزق دیے جائیں گے بے حساب ۝۴۰ اے میری قوم! مجھے کیا ہو گیا کہ میں تو تمہیں نجات کی

النَّجٰوةِ وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ ۝۴۱ تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ

طرف بلاتا ہوں، اور تم مجھے جہنم کی طرف بلاتے ہو ۝۴۱ تم بلاتے ہو مجھے تاکہ میں اللہ کا انکار کروں اور میں شریک ٹھہراؤں اس کے ساتھ ایسی چیز کو

لِيْ بِهٖ عِلْمٌ ز وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ ۝۴۲ لَا جَرَمَ اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ

جس کے متعلق میرے پاس کوئی علم نہیں، اور میں تمہیں بلاتا ہوں زبردست، بخشنے والے کی طرف ۝۴۲ یہ پکی بات ہے بے شک وہ چیز جس کی طرف تم مجھے بلاتے ہو

لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ

نہیں ہے اس کے لئے کوئی پکار دُنیا میں نہ آخرت میں، اور ہمارا لوٹنا اللہ ہی کی طرف ہے، اور بے شک حد سے گزرنے والے

هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ ۝۴۳ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَآ اَقُوْلُ لَكُمْ ط وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ط

وہی جہنم والے ہیں ۝۴۳ عنقریب یاد کرو گے تم ان باتوں کو جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں، اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں،

اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۝۴۴ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ

بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کو دیکھنے والا ہے ۝۴۴ بچا لیا اللہ تعالیٰ نے اس مؤمن بندے کو ان کی بدترین تدبیروں سے اور گھیر لیا فرعون کو

سُوْٓءُ الْعَذَابِ ۝۴۵ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا ج وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ قف

بُرے عذاب نے ۝۴۵ آگ، پیش کیے جاتے ہیں وہ اس آگ پر صبح شام، جس دِن قیامت قائم ہوگی (تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے:)

اَدْخِلُوْٓا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ ۝۴۶ وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ فَيَقُوْلُ

داخل کردو فرعون کے لوگوں کو سخت عذاب میں ۝۴۶ یاد کیجئے جس وقت کہ جھگڑا کریں گے لوگ جہنم میں، پس کہیں گے

الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُنَّا لَكُمْ تَبَعًا فَهَلْ اَنْتُمْ مُّغْنُوْنَ عَنَّا نَصِيْبًا

ضعفاء ان لوگوں کو جو بڑے بنے ہوئے تھے: بے شک ہم تمہارے لیے تابع تھے، کیا تم دُور ہٹانے والے ہو ہم سے آگ کا

مِّنَ النَّارِ ۝۴۷ قَالَ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْٓا اِنَّا كُلٌّ فِيْهَآ لا اِنَّ اللّٰهَ قَدْ حَكَمَ بَيْنَ

کوئی حصہ؟ ۝۴۷ کہیں گے وہ لوگ جو بڑے بنے ہوئے تھے ہم سب ہی اس آگ میں پڑے ہوئے ہیں، بے شک اللہ نے بندوں کے

الْعِبَادِ ۝۴۸ وَقَالَ الَّذِيْنَ فِي النَّارِ لِخَزَنَةِ جَهَنَّمَ ادْعُوْا رَبَّكُمْ يُخَفِّفْ عَنَّا يَوْمًا

درمیان فیصلہ کیا ہے ۝۴۸ کہیں گے وہ لوگ جو جہنم میں ہیں جہنم کے منتظمین کو: تم اپنے رَبّ سے دُعا کرو کہ ہلکا کردے ہم سے کسی دن

مِّنَ الْعَذَابِ ﴿۴۹﴾ قَالُوْٓا اَوَلَمْ تَكُ تَاْتِيْكُمْ رُسُلُكُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۭ قَالُوْا بَلٰى ۭ

کچھ عذاب ﴿۴۹﴾ جہنم کے منتظمین کہیں گے: کیا تمہارے پاس تمہارے رسول واضح دلائل لے کر نہیں آئے تھے؟ جہنمی کہیں گے: کیوں نہیں!

قَالُوْا فَادْعُوْا ۚ وَمَا دُعٰٓؤُا الْكٰفِرِيْنَ اِلَّا فِيْ ضَلٰلٍ ﴿۵۰﴾

جہنم کے منتظمین کہیں گے کہ تم ہی پکارو، اور نہیں ہوگا کافروں کا پکارنا مگر گمراہی میں ﴿۵۰﴾

تفسیر

دُنیا کی فنائیت کے تصوّر کا فائدہ

واقعہ پورا کر لیجئے...... وَقَالَ الَّذِيْٓ اٰمَنَ يٰقَوْمِ اتَّبِعُوْنِ: کہا اس شخص نے جو ایمان لے آیا، اے میری قوم! میری بات مان لو، میری اتباع کرو، اَهْدِكُمْ سَبِيْلَ الرَّشَادِ: میں تمہیں دُرستی کا راستہ دِکھاؤں گا۔ یہ فرعون کی بات کے مقابلے میں آ گئی۔ فرعون کہتا تھا مَآ اَهْدِيْكُمْ اِلَّا سَبِيْلَ الرَّشَادِ، اور یہ مؤمن کہتا ہے میری بات مانو، میرے پیچھے چلو، میں تمہیں دُرستی کا راستہ دِکھاتا ہوں، يٰقَوْمِ اِنَّمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ: یہ ہے اصل نکتہ، دنیا کی فنائیت ذہن میں آ جائے تو پھر انسان بہت ساری برائیوں سے خود بچ جاتا ہے اور سوچنے کے اُوپر مجبور ہو جاتا ہے، جب دُنیا کی نعمتوں کے اندر دُنیا کی عیش وعشرت کے اندر مبتلا ہو، اور اسے موت یاد نہ ہو، ایسے وقت میں پھر انسان کسی کی بات سننے کے لئے تیار نہیں ہوتا۔ ''اے میری قوم! سوائے اس کے نہیں کہ یہ دُنیوی زندگی چند روزہ سامان ہے'' وَّاِنَّ الْاٰخِرَةَ هِيَ دَارُ الْقَرَارِ: اور بے شک آخرت وہی قرار کا گھر ہے، قرار پانے کا گھر ہے، مَنْ عَمِلَ سَيِّئَةً: جو کوئی بُرا عمل کرے گا، فَلَا يُجْزٰٓى اِلَّا مِثْلَهَا: نہیں دیا جائے گا مگر اسی کا مثل ہی، نہیں بدلہ دیا جائے گا مگر اس کے برابر، وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا: اور جو کوئی نیک عمل کرے گا، مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى: مرد ہو یا عورت۔ مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى یہ مَن کا بیان ہے۔ مذکر ہو یا مؤنث، جو نیک عمل کرے گا وَهُوَ مُؤْمِنٌ: اس حال میں کہ مؤمن بھی ہو۔ یہ مقامِ شرط میں ہے، کیونکہ عملِ صالح تبھی قبول ہوگا جب انسان مؤمن بھی ہو، فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ: یہ لوگ جنت میں داخل ہوں گے، يُرْزَقُوْنَ فِيْهَا بِغَيْرِ حِسَابٍ: رزق دیے جائیں گے بے حساب۔ وَيٰقَوْمِ مَا لِيْٓ اَدْعُوْكُمْ اِلَى النَّجٰوةِ: اے میری قوم! مجھے کیا ہو گیا کہ میں تو تمہیں نجات کی طرف بُلاتا ہوں، وَتَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَى النَّارِ: اور تم مجھے جہنم کی طرف بُلاتے ہو، تَدْعُوْنَنِيْ لِاَكْفُرَ بِاللّٰهِ: تم بُلاتے ہو مجھے تاکہ میں اللہ کا انکار کروں، وَاُشْرِكَ بِهٖ مَا لَيْسَ لِيْ بِهٖ عِلْمٌ: اور میں شریک ٹھہراؤں اس کے ساتھ ایسی چیز کو جس کے متعلق میرے پاس کوئی علم نہیں، وَّاَنَا اَدْعُوْكُمْ اِلَى الْعَزِيْزِ الْغَفَّارِ: اور میں تمہیں بُلاتا ہوں زبردست بخشنے والے کی طرف، لَا جَرَمَ: یہ پکی بات ہے اَنَّمَا تَدْعُوْنَنِيْٓ اِلَيْهِ: بے شک وہ چیز جس کی طرف تم مجھے بُلاتے ہو، لَيْسَ لَهٗ دَعْوَةٌ فِي الدُّنْيَا وَلَا فِي الْاٰخِرَةِ: نہیں ہے اس کے لئے کوئی پکار دُنیا میں نہ آخرت میں، نہ وہ دُنیا میں کسی ضرورت کے لئے بُلانے کے قابل ہے، اور نہ آخرت میں اس کے سامنے کوئی دُعا کی جا سکتی ہے، وَاَنَّ مَرَدَّنَآ اِلَى اللّٰهِ وَاَنَّ الْمُسْرِفِيْنَ هُمْ اَصْحٰبُ النَّارِ: اور ہمارا لوٹنا

اللہ ہی کی طرف ہے، اور بے شک حد سے گزرنے والے وہی جہنم والے ہیں۔ فَسَتَذْكُرُوْنَ مَاۤ اَقُوْلُ لَكُمْ: میں نے سب کچھ تمہیں کہہ لیا، آج تم میری باتیں سنتے نہیں ہو، سمجھتے نہیں ہو۔ عنقریب یاد کرو گے تم ان باتوں کو جو میں تمہیں کہہ رہا ہوں، وَاُفَوِّضُ اَمْرِيْۤ اِلَى اللّٰهِ: اور میں اپنا معاملہ اللہ کے سپرد کرتا ہوں، اِنَّ اللّٰهَ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ: بے شک اللہ تعالیٰ بندوں کو دیکھنے والا ہے۔ فَوَقٰىهُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا: ان لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ پھر فرعون اور فرعون کی قوم نے اس مؤمن بندے کو بھی تنگ کرنا شروع کر دیا ہوگا، اور اس کے پیچھے پڑ گئے ہوں گے، مخالفت شروع ہوگئی ہوگی، لیکن اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکے، ''بچا لیا اللہ تعالیٰ نے اس مؤمن بندے کو اُن کی بدترین تدبیروں سے، سَيِّاٰتِ مَا مَكَرُوْا جو تدبیریں انہوں نے کیں اس کی سیئات سے اللہ نے اس کو بچا لیا، وَحَاقَ بِاٰلِ فِرْعَوْنَ سُوْٓءُ الْعَذَابِ: اور گھیر لیا فرعون کو بُرے عذاب نے۔ وہ برا عذاب کیا ہے؟ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا: آگ پیش کیے جاتے ہیں وہ اس آگ پر صبح شام، یعنی صبح شام اُن کو جہنم دِکھائی جاتی ہے۔

عذابِ برزخ کی واضح دلیل

جس طرح سے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ مرنے کے بعد ہر شخص کو اُس کا ٹھکانا دِکھاتے ہیں، بُرے آدمی کو جنت دِکھاتے ہیں کہ اگر تو نیک ہوتا تو اس میں جاتا اور جہنم بھی دِکھاتے ہیں کہ تو اب اس میں ڈالا جائے گا، اور نیک آدمی کو جہنم بھی دِکھاتے ہیں کہ اگر تو بُرا ہوتا تو اس میں ڈالا جاتا، اور جنت بھی دِکھاتے ہیں کہ اب چونکہ تو نیک ہے تو تجھے یہاں لے جایا جائے گا،[1] اچھے انجام کی خبر سُن کر انسان خوش ہوتا ہے، بُرے انجام کو دیکھ کے انسان تکلیف میں پڑتا ہے، تو یہ عذابِ برزخ کی ایک صورت ہے، چاہے ان کو جہنم میں براہِ راست ڈالا نہ جائے لیکن صبح شام یہ دِکھانا کہ یہ جہنم ہے جس میں قیامت کے بعد تمہیں ڈالا جائے گا، یہ بہت بڑی ایک تکلیف ہے۔ تو عذابِ برزخ کے لئے یہ آیت واضح دلیل ہے، ''آگ، پیش کیے جاتے ہیں وہ اس آگ پر صبح شام'' وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ: جس دِن قیامت قائم ہوگی تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے، اَدْخِلُوْۤا اٰلَ فِرْعَوْنَ اَشَدَّ الْعَذَابِ: داخل کرو فرعون کے لوگوں کو، فرعون کے خاندان کو سخت عذاب میں، اب يَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ میں تو آخرت کا معاملہ آگیا، معلوم ہوگیا کہ اَلنَّارُ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا غُدُوًّا وَّعَشِيًّا یہ قیامت کے دِن سے پہلے کی بات ہے۔ اور یہ جس کو ہم ''برزخ'' سے تعبیر کرتے ہیں، مرنے کے بعد قیامت سے پہلے صبح شام اُن کو آگ کے اوپر پیش کیا جاتا ہے، اور یہ دِکھایا جاتا ہے کہ تمہارا انجام یہ ہونے والا ہے، حدیث شریف میں بھی تفصیل اس طرح سے ذکر کی گئی ہے۔

جہنمیوں کا آپس میں جھگڑا

وَاِذْ يَتَحَآجُّوْنَ فِي النَّارِ: اب یہ تابعین کو متبوعین سے توڑنا مقصود ہے، کہ آج جو بڑوں کے پیچھے لگ کے کُفر اور شرک کو اختیار کرتے ہیں، یہ بڑے بھی اس وقت کام نہیں آئیں گے، یہ مضمون بھی کئی دفعہ گزر گیا۔ ''یاد کیجئے جس وقت کہ جھگڑا کریں گے

(۱) ابن ماجہ ص ۳۱۵، باب ذکر القبر والبلی۔ مشکوۃ ۱/ ۲۷، باب اثبات عذاب القبر فصل ثالث، عن ابی ہریرۃ۔ نیز بخاری ۱/ ۱۷۸، باب المیت یسمع خفق النعال۔

لوگ جہنم میں، فَیَقُوۡلُ الضُّعَفٰٓؤُا لِلَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا: ضعفاء: سے کمزور مراد ہیں مرتبے کے لحاظ سے، مال کے لحاظ سے، بدن کے اعتبار سے نہیں، جو دُنیا میں کمزور سمجھے جاتے تھے، تابع تھے۔ کہیں گے ضعفاء ان لوگوں کو جو بڑے بنے ہوئے تھے، اِنَّا کُنَّا لَکُمۡ تَبَعًا: بے شک ہم تمہارے لیے تابع تھے، فَہَلۡ اَنۡتُمۡ مُّغۡنُوۡنَ عَنَّا نَصِیۡبًا مِّنَ النَّارِ: کیا تم دُور ہٹانے والے ہو ہم سے آگ کا کوئی حصہ؟ قَالَ الَّذِیۡنَ اسۡتَکۡبَرُوۡۤا: کہیں گے وہ لوگ جو بڑے بنے ہوئے تھے، اِنَّا کُلٌّ فِیۡہَاۤ: ہم سب ہی اس آگ میں پڑے ہوئے ہیں، اِنَّ اللّٰہَ قَدۡ حَکَمَ بَیۡنَ الۡعِبَادِ: بے شک اللہ نے بندوں کے درمیان فیصلہ کیا ہے، تو جب ہم بھی اس میں پڑے ہوئے ہیں تو ہم تم سے کیا دُور ہٹا سکتے ہیں۔

تخفیفِ عذاب کی درخواست مردُود ہو جائے گی

وَقَالَ الَّذِیۡنَ فِی النَّارِ: پھر سارے مل کر جہنم کے منتظمین سے کہیں گے۔ ''کہیں گے وہ لوگ جو جہنم میں ہیں'' لِخَزَنَۃِ جَہَنَّمَ: جہنم کے منتظمین کو، ادۡعُوۡا رَبَّکُمۡ: تم اپنے رَبّ سے دُعا کرو یُخَفِّفۡ عَنَّا یَوۡمًا مِّنَ الۡعَذَابِ: کہ اللہ تعالیٰ ہم سے کسی دِن تو عذاب ہلکا کردے، ہلکا کردے ہم سے کسی دِن عذاب، کچھ عذاب ہلکا کردے کسی دِن، تم ہی ہماری سفارش کردو۔ اور جہنم کے خازنین کہیں گے، اَوَلَمۡ تَکُ تَاۡتِیۡکُمۡ رُسُلُکُمۡ بِالۡبَیِّنٰتِ: کیا تمہارے پاس تمہارے رسول واضح دلائل لے کر نہیں آئے تھے؟ قَالُوۡا بَلٰی: جہنمی کہیں گے: کیوں نہیں! آئے تو تھے، قَالُوۡا فَادۡعُوۡا: تو فرشتے کہیں گے، وہ خزنہ جہنم کہیں گے کہ تم ہی پکارو، وَمَا دُعٰٓؤُا الۡکٰفِرِیۡنَ اِلَّا فِیۡ ضَلٰلٍ: اور نہیں ہوگا کافروں کا پکارنا مگر گمراہی میں، یعنی ان کے پکارنے کے اُوپر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا، اور اُن کی چیخ و پکار یا دُعا کرنے سے ان کو کوئی تخفیف حاصل نہیں ہوگی۔ ''نہیں ہوگی کافروں کی دُعا مگر گمراہی میں'' یعنی آخرت میں اگر اللہ کو پکاریں گے عذاب کے زائل کرنے کے لئے تو ان کی دُعا کے اوپر کوئی اثر مرتب نہیں ہوگا۔

سُبۡحَانَکَ اللّٰہُمَّ وَبِحَمۡدِکَ اَشۡہَدُ اَنۡ لَّاۤ اِلٰہَ اِلَّاۤ اَنۡتَ اَسۡتَغۡفِرُکَ وَاَتُوۡبُ اِلَیۡکَ

اِنَّا لَنَنۡصُرُ رُسُلَنَا وَالَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا وَیَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡہَادُ ﴿۵۱﴾

بے شک ہم البتہ مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی اور مؤمنوں کی دُنیوی زندگی میں اور جس دِن کہ گواہ کھڑے ہوں گے ﴿۵۱﴾

یَوۡمَ لَا یَنۡفَعُ الظّٰلِمِیۡنَ مَعۡذِرَتُہُمۡ وَلَہُمُ اللَّعۡنَۃُ وَلَہُمۡ سُوۡٓءُ الدَّارِ ﴿۵۲﴾ وَلَقَدۡ

جس دِن کہ نہیں نفع دے گا ظالموں کو ان کا معذرت کرنا، اور ان کے لیے لعنت ہوگی اور ان کے لیے بُرا انجام ہوگا دارِ آخرت میں ﴿۵۲﴾ البتہ تحقیق

اٰتَیۡنَا مُوۡسَی الۡہُدٰی وَاَوۡرَثۡنَا بَنِیۡۤ اِسۡرَآءِیۡلَ الۡکِتٰبَ ﴿۵۳﴾ ہُدًی وَّذِکۡرٰی

ہم نے موسیٰ کو ہدایت دی، اور وارث بنایا بنی اسرائیل کو کتاب کا ﴿۵۳﴾ اس حال میں کہ وہ کتاب راہنما تھی اور یاددہانی تھی

لِأُولِي الْأَلْبَابِ ﴿۵۴﴾ فَاصْبِرْ إِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ

عقل والوں کے لئے ﴿۵۴﴾ آپ برداشت کرتے رہیے، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور معافی مانگئے اپنے گناہ کے لئے، اور تسبیح بیان کیجئے

رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْإِبْكَارِ ﴿۵۵﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ بِغَيْرِ سُلْطٰنٍ

اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ صبح شام ﴿۵۵﴾ بے شک وہ لوگ جو جھگڑتے ہیں اللہ کی آیات کے بارے میں بغیر کسی دلیل کے جو

اَتٰىهُمْ ۙ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ ۚ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ

ان کے پاس آئی ہو، نہیں ہے ان کے دلوں میں مگر ایک بڑائی، نہیں ہیں وہ پہنچنے والے اس بڑائی کو، اللہ کی پناہ حاصل کیجئے، بے شک وہ

السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ ﴿۵۶﴾ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ وَلٰكِنَّ

سننے والا دیکھنے والا ہے ﴿۵۶﴾ البتہ پیدا کرنا آسمانوں کا اور زمین کا بڑا ہے لوگوں کے پیدا کرنے سے، لیکن

اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمَا يَسْتَوِي الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۙ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ﴿۵۷﴾ نہیں برابر اندھا اور دیکھنے والا، اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَلَا الْمُسِيْٓءُ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ

نیک عمل کئے اور نہ بدکردار، تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو ﴿۵۸﴾ بے شک قیامت البتہ آنے والی ہے

لَّا رَيْبَ فِيْهَا وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۵۹﴾ وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ

اس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے، لیکن اکثر لوگ مانتے نہیں ﴿۵۹﴾ اور تمہارا رَبّ کہتا ہے کہ مجھے ہی پکارو

اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ﴿۶۰﴾ ع

میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا، بے شک وہ لوگ جو تکبر کرتے ہیں میری عبادت سے، عنقریب داخل ہوں گے وہ جہنم میں ذلیل ہو کر ﴿۶۰﴾

تفسیر

اللہ کی مدد دُنیا و آخرت میں انبیاء علیہم السلام اور اہلِ ایمان کے ساتھ ہے

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اِنَّا لَنَنْصُرُ رُسُلَنَا: بے شک ہم البتہ مدد کرتے ہیں اپنے رسولوں کی، وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: اور ان لوگوں کی جو ایمان لائے، فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: دُنیوی زندگی میں، وَيَوْمَ يَقُوْمُ الْاَشْهَادُ: اور جس دن کہ اَشہاد کھڑے ہوں گے۔ اَشہاد

شاھد کی جمع ہے، جس طرح سے صاحب کی جمع اصحاب آ جاتی ہے، اور یَوۡمَ یَقُوۡمُ الۡاَشۡهَادُ سے قیامت کا دن مراد ہے۔ ہم اپنے رسولوں کی مدد کرتے ہیں اور مؤمنوں کی دُنیوی زندگی میں بھی اور قیامت کے دن بھی۔ قیامت کے دن تو مدد نمایاں ہے کہ جس وقت انبیاء علیہم السلام اور رُسل اپنے مخالفین کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہوں گے تو ان جھگڑوں کے اندر اللہ تعالیٰ نبیوں کو، رسولوں کو، مؤمنین کو غلبہ دیں گے، اور اُن کے مخالفین سارے کے سارے وہاں شکست خوردہ ہوں گے، وہاں تو اللہ تعالیٰ کی مدد نمایاں ہے، اور دُنیا میں جو قصے آپ کے سامنے ذکر کئے گئے ان میں بھی اکثر واقعات میں اللہ تعالیٰ کی مدد مخالفین کے مقابلے میں نمایاں ہے، کہ نبی کے مخالفین کو ہلاک کر دیا گیا تباہ کر دیا گیا، اور نبی اور اس کے ماننے والوں کو کامیابی دی گئی۔ اور کبھی کبھی ایسے بھی ہوتا ہے کہ دُنیا کے اندر ظاہری طور پر نبی اپنے مخالفین کے مقابلے میں مغلوب ہو جاتا ہے، جس طرح سے حضرت یحییٰ علیہ السلام کو اُن کے مخالفین نے قتل کیا، یا حضرت زکریا علیہ السلام کو اُن کے مخالفین نے قتل کیا، اور قرآنِ کریم نے جمع کا صیغہ بولا ہے یَقۡتُلُوۡنَ النَّبِیّٖنَ (سورۂ بقرہ: ۶۱) جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قتل کا واقعہ کئی نبیوں کے ساتھ پیش آیا، یہود انبیاء کو قتل کرتے تھے۔

ایک اِشکال اور اس کا جواب

تو اس میں بظاہر یہ اِشکال ہوتا ہے کہ دُنیوی زندگی میں اللہ تعالیٰ نے اپنے رسولوں کی مدد نہیں کی، بلکہ دُنیوی زندگی میں وہ دشمنوں کے مقابلے میں مغلوب ہو گئے، یہ اِشکال بظاہر ہوتا ہے، تو اس کا حل یہی ہے کہ مدد کا یہی مطلب نہیں ہوتا کہ مخالف پر اُس کو بالفعل غلبہ دے دیا جائے، بلکہ یہ بھی ایک مدد ہے کہ اس کے دشمنوں سے انتقام لے لیا جائے، اور ایسا کوئی واقعہ بھی پیش نہیں آیا کہ نبی کو اس کے دشمنوں نے پریشان کیا ہو یا قتل کر دیا ہو، پھر اُس کے مخالفین سے اللہ تعالیٰ نے انتقام نہ لیا ہو۔ تو کسی کے دشمن کو تباہ کر دینا، انتقام لے لینا، چاہے اُس کے قتل کے بعد ہی ہو، یہ بھی اس مقتول کی امداد ہے، اور اس طرح سے اگر آپ سوچیں گے تو ہر نبی اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصور ہے، اور ہر رسول اللہ کی طرف سے منصور ہے، اور اسی طرح سے مؤمنین صالحین ہر دور میں دُنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی اللہ تعالیٰ کی نصرت کو لیے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ کے منصور ہیں، یہاں ان کی دُنیوی مشکلات اللہ تعالیٰ حل فرماتے ہیں، مخالفین کے مقابلے میں غلبہ دیتے ہیں، اگر ظاہری طور پر مخالفین کبھی غالب آ بھی جائیں تو اللہ تعالیٰ ان مخالفین سے انتقام لیتے ہیں، اور کسی مخالف سے انتقام لے لینا یہ بھی ایک نصرت ہے، اس طرح سے اس اشکال کو اُٹھایا جا سکتا ہے۔
اس میں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی ہے، پیچھے فرعونیوں کے واقعات آ رہے تھے، خاص طور پر مؤمن آلِ فرعون کا قصہ ذکر کیا گیا، جس کے ضمن میں یہ تنبیہ کر دی گئی تھی کہ اگر تم نبی پہ ہاتھ اُٹھانے کی کوشش کرو گے، ان کو قتل کرنے کی کوشش کرو گے تو اللہ تعالیٰ ان کا حامی و ناصر ہے، دیکھو! آلِ فرعون کے مؤمن کو بھی اُنہوں نے قتل کرنے کی کوشش کی، اُس کے ساتھ بُری بُری تدبیریں کیں لیکن اللہ نے محفوظ رکھا، اگر اس قسم کی سازش کسی کے ذہن میں ہو تو مؤمن آلِ فرعون کے قصے کے آئینے میں وہ خود اپنا انجام دیکھ لے۔ اَشۡهاد: گواہ۔ کیونکہ قیامت کے دن ایک دوسرے کے مقابلے میں گواہیاں بھی ہوں گی، فرشتے بھی گواہیاں دیں گے، رسول بھی اپنی اُمتوں کے مقابلے میں بطورِ شاہد کے پیش ہوں گے، اور انسان کے اپنے اعضا، زمین، یہ سب گواہ کے طور پر پیش

ہوں گے، قرآنِ کریم کی مختلف آیات میں یہ بات تفصیل کے ساتھ ذکر کی گئی ہے، تو یَوْمَ یَقُوْمُ الْاَشْهَادُ سے مراد قیامت کا دن ہے، جس دِن کہ گواہ کھڑے ہوں گے گواہی دینے کے لئے۔

ظالموں کا بُرا انجام

یَوْمَ لَا یَنْفَعُ الظّٰلِمِیْنَ مَعْذِرَتُهُمْ: رسول اور مؤمنین کی تو نصرت ہوگی، اللہ تعالیٰ ان کو تو کامیابی دیں گے۔ اور یہ ظالم لوگ، ظالموں کا اعلیٰ مصداق ہوا کرتا ہے مشرکین، جس دِن کہ نہیں نفع دے گا ظالموں کو اُن کا معذرت کرنا، ان کا عذر کرنا۔ وہ عذر کریں گے، مختلف قسم کے بہانے پیش کریں گے لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وَلَهُمُ اللَّعْنَةُ: اور اُن کے لئے لعنت ہوگی، لعنت کا مفہوم ہے اللہ کی رحمت سے دُوری، وَلَهُمْ سُوْٓءُ الدَّارِ: دار سے دارِ آخرت مراد ہے، اور سُوْٓءُ الدَّارِ میں اضافت قوی ہے۔ ''اُن کے لئے بُرا انجام ہوگا آخرت میں، دارِ آخرت میں ان کے لیے بُرائی ہے، دارِ آخرت میں ان کا بُرا انجام ہوگا۔''

کتابُ اللہ سے فائدہ عقل والے ہی اُٹھاتے ہیں

وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسَى الْهُدٰى وَاَوْرَثْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْكِتٰبَ: البتہ تحقیق ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو ہدایت دی، اور وارث بنایا بنی اسرائیل کو کتاب کا، هُدًى وَّ ذِكْرٰى لِاُولِی الْاَلْبَابِ: اس حال میں کہ کتاب راہنما تھی اور یاد دہانی کرنے والی تھی عقل والوں کے لئے، عقل مندوں کے لئے وہ کتاب ذِکریٰ بھی تھی اور ہُدیٰ بھی تھی۔ تو جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی تھی ہم نے آپ کو بھی دی، اور اُن کے مقابل جو تھے وہ اگرچہ وقت کے بادشاہ تھے لیکن وہ ذلیل وخوار ہوئے، اور بنی اسرائیل کو اس ہدایت کا وارث بنایا، عقل مندوں نے اس سے فائدہ اُٹھایا، تو اللہ تعالیٰ نے دُنیوی اور آخروی کامیابی دی، اسی طرح سے آپ کو بھی کتاب دی ہے، اور آپ کے بھی مخالفین اپنے آپ کو بڑا خوش حال سمجھ کر اور صاحبِ اقتدار سمجھ کر آپ کی مخالفت کر رہے ہیں، لیکن یہ بھی ذلیل وخوار ہوں گے، اور آپ کی اُمت اس کتاب کی وارث ہوگی، اور عقل والے اس کتاب سے فائدہ اُٹھائیں گے، تو جو اس کتاب سے فائدہ نہیں اُٹھاتے، اِس کی یاد دہانی سے اور اس کی راہنمائی سے نفع حاصل نہیں کرتے تو یوں سمجھو! کہ عقل کے کورے ہیں، لِاُولِی الْاَلْبَابِ کا ذکر اس لیے کر دیا گیا۔

صبر، اِستغفار اور ذِکر کی تاکید

فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: آپ برداشت کرتے رہیے، بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، اللہ کے وعدے سے وہی نصرت کا وعدہ مراد ہے، کہ اب اگرچہ آپ کو پریشان کر رہے ہیں اور قوت اور اقتدار ان کے ہاتھ میں ہے، جیسے کی زندگی میں تھا، لیکن آپ برداشت کرتے رہیے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، ایک دِن غلبہ آپ کو ہوگا اور آپ کے ماننے والوں کو ہوگا۔ وَّاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِیِّ وَالْاِبْكَارِ: اور اپنے گناہ سے اِستغفار کرتے رہیے، وَّاسْتَغْفِرْ: معافی مانگیے، لِذَنْۢبِكَ: اپنے گناہ کے لئے، اپنے گناہ کی وجہ سے، استغفار کیجئے، اور صبح شام (عشی شام کا وقت ہو گیا، ابکار صبح کا وقت ہو گیا) تو یہاں عرب میں محاورہ شام کو پہلے ذِکر کرنے

کا اور صبح کو بعد میں ذکر کرنے کا ہے، ہماری زبان میں محاورہ اس کے برعکس ہے، ہم ''صبح وشام'' کہتے ہیں، ''صبح وشام اللہ کی تسبیح بیان کیجئے اس کی حمد کے ساتھ'' یعنی حمد بھی کیجئے اور تسبیح بھی کیجئے، اور تسبیح اور تحمید دونوں سے مراد اللہ کی یاد ہے، صبح شام اللہ کو یاد کیجئے اس کی تسبیح پڑھیے اس کی حمد کیجئے، سبحان اللہ والحمد للہ، اور صبح شام سے مراد جمیع اوقات ہیں، تو جس وقت آپ کثرت کے ساتھ اللہ کو یاد کریں گے تو اللہ کی یاد کے ساتھ قلب کو قوت حاصل ہوتی ہے، جب قوت حاصل ہوگی تو پھر مخالفین کی مخالفت برداشت کرنے کی طاقت آئے گی، اور جب اللہ کی طرف توجہ رہے گی تو مخالفین کی مخالفت کی طرف زیادہ توجہ بھی نہیں ہوگی، تو اطمینان اور سکون حاصل کرنے کا طریقہ یہی ہے کہ ہروقت اللہ کی تسبیح وتحمید میں لگے رہیے، دشمنوں کی دشمنی اور مخالفین کی مخالفت کا خیال نہ کیجئے، برداشت کیجئے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور یہ صبر کا دور ہے، بہت جلد اس کا نتیجہ سامنے آجائے گا۔

عقیدۂ ''عصمتِ انبیاء علیہم السلام''

اور درمیان میں یہ جو لفظ آ گیا وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ: اس میں ذنب کی نسبت کی گئی ہے رسول اللہ ﷺ کی طرف، کہ اپنے گناہ کی معافی مانگئے۔ ذنب کی نسبت یہاں بھی ہے اور دوسری مختلف آیات میں بھی ہے، سورۂ فتح میں ہے لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ، اور سورۂ محمد کے اندر بھی یہ لفظ آئیں گے وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ۔ تو یہ ذنب کی نسبت جو سرورِ کائنات ﷺ کی طرف کردی گئی، اس کی کیا حقیقت ہے؟ جب کہ اہلِ سنّت والجماعت کا یہ متفقہ عقیدہ ہے کہ نبی معصوم ہوتا ہے، ''معصوم'' کا مطلب یہ ہے کہ نبی سے گناہ نہیں ہوتا، بلکہ نبی گناہ کر ہی نہیں سکتا، اللہ تعالیٰ نے نبی کی فطرت اتنی پاک اور صاف بھی ہوئی ہوتی ہے اور اپنی حفاظت بھی ہروقت اس کے ساتھ لگائی ہوئی ہوتی ہے، نبی اللہ کی حفاظت میں ہوتا ہے، نبی گناہ نہیں کرسکتا، نبی معصوم ہوتا ہے، یہ اہلِ سنّت والجماعت متفق علیہ عقیدہ ہے۔ قبل اَز نبوّت بھی اور بعد اَز نبوّت بھی، صغائر کبائر دونوں سے نبی پاک ہوتا ہے، کیونکہ ذنب کی حقیقت ہے: اللہ کی نافرمانی، اور نبی تو مخلوق کے سامنے نمونہ بن کر آیا کرتا ہے اللہ کی فرماں برداری کے لئے، کہ اس کا قول، اس کا کردار، اس کا حال جو کچھ بھی ہے وہ لوگوں کے لئے نمونہ ہے، کہ اگر آپ اللہ کا فرماں بردار بننا چاہتے ہیں تو نبی کا نمونہ اختیار کیجئے، اور اگر اس نمونے کے اندر ہی خرابی آجائے اور وہی اللہ کا نافرمان ہوجائے، تو پھر باقیوں کے لئے ہدایت کا راستہ کس طرح سے واضح رہے گا؟ اس لیے اللہ تعالیٰ جس کو نبی بنا کر بھیجتا ہے وہ معصوم ہوتا ہے، اللہ کی طرف سے حفاظت بھی ہوتی ہے، اور خود اس نبی کی فطرت اس طرح سے پاک صاف ہوتی ہے، کہ اس کو گناہ سے یوں سمجھ لیجئے کہ طبعی طور پر ہی یوں نفرت ہوتی ہے کہ جس طرح سے آپ حضرات کو کسی غلیظ یا غلاظت سے نفرت ہوا کرتی ہے، جس طرح سے ایک باعقل، باہوش انسان گوبر نہیں کھا سکتا، پاخانہ نہیں کھا سکتا، اس کی طبیعت اس سے انکار کرتی ہے، اِباء کرتی ہے، اس کی طبیعت کی نظافت، لطافت ان چیزوں کو برداشت نہیں کرتی، تو معصیت یہ بھی ایک قسم کی رُوحانی غلاظت ہے، اور نبی کی فطرت اتنی صاف ہوتی ہے کہ اس سے طبعاً نفور ہوتا ہے، یعنی اس کی طبیعت کی طرف دیکھتے ہوئے یہ ممکن ہی نہیں کہ وہ معصیت سے آلودگی اختیار کرے، جس طرح سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ آپ عقل وہوش کے ساتھ گوبر نہیں کھا سکتے، تو ''کھانہ سکنے'' کا معنی یہی ہوتا ہے کہ نفرت ہے اور دُوری ہے، ورنہ

یہ کوئی ایسی بات نہیں کہ آپ ہاتھ میں اس کا لقمہ لے لیں، منہ میں ڈال لیں اور نگل لیں، نفسِ طاقت کی بات نہیں ہے، نفسِ طاقت ہونے کے باوجود طبیعت کے بُعد کو ہم یوں بیان کرتے ہیں کہ آپ کھا ہی نہیں سکتے۔ اسی طرح سے نبی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ نبی گناہ کر ہی نہیں سکتا، اس کی طبیعت میں اتنی نفرت اور اتنا بُعد ہوتا ہے اس سے، معصیت یہ رُوحانی غلاظت ہے۔

لفظِ ''ذنب'' کی انبیاء علیہم السلام کی طرف نسبت کیوں؟

لیکن انبیاء علیہم السلام کے لئے اس قسم کے لفظ بولے گئے ہیں جس سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ ان سے کوئی قصور ہوا، ان سے کوئی گناہ ہوا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ آپ کے سامنے گزرا تھا قبطی کے قتل کا، حضرت آدم علیہ السلام کا واقعہ اَکلِ شجرہ کا گزرا تھا، تو اِن واقعات کی توجیہ اُن مقامات میں کردی گئی تھی، حاصل ان سب کا یہی ہے کہ ''معصیت'' کا مطلب ہوتا ہے: جانتے بوجھتے ہوئے، پتا ہے کہ یہ اللہ کی نافرمانی ہے پھر بھی کوئی شخص اس پہ اِقدام کرے، یہ ہے ''معصیت'' کی حقیقت، پتا ہو کہ یہ چیز ممنوع ہے، اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ ہے، اللہ ایسا نہیں چاہتا، جانتے بوجھتے ہوئے پھر انسان اس کے اُوپر اِقدام کرتا ہے، جس طرح سے ہمارے گناہوں کی حیثیت یہی ہے، ہم جانتے بھی ہیں کہ یہ کام بُرا ہے، جھوٹ بولنا بُرا ہے، وغیرہ یہ سب چیزیں ہم سمجھتے ہیں، ہمیں عقل بھی ہوتی ہے، وقت پر سمجھ بھی ہوتی ہے، کوئی تاویل ہمارے ذہن میں نہیں ہوتی، لیکن اس کے باوجود ہم اِقدام کرلیتے ہیں، یہ ہے جس کو حقیقتاً ''معصیت'' کہا جاتا ہے۔ اور ایک شخص اللہ کی محبت میں، اللہ کی طاعت کے شوق میں ایک اِقدام کرتا ہے، لیکن چونکہ انسان ہے، جمیع پہلوؤں کا اِحاطہ نہیں ہوتا، بعض پہلو اس سے مخفی رہ جاتے ہیں، اسی محبت کے جوش میں، اسی اطاعت کے جذبے سے کوئی کام ایسا کرلے اور نتیجتاً معلوم ہو کہ اس میں غلطی ہوگئی، یہ معصیت نہیں، یہ صورۃً معصیت ہے، حقیقتاً معصیت نہیں ہے۔ اس لئے انبیاء علیہم السلام کے ایسے واقعات کو لغزش کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، زَلّاتُ الانبیاءِ۔ زَلّ کا معنی ہوتا ہے: پھسل جانا، پھسلنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ آپ کا گرنے کا ارادہ نہیں تھا، بلاقصد پاؤں پھسل گیا، اور بلاقصد پاؤں پھسلنے کی صورت میں اگر دامن آلودہ ہوجاتا ہے تو یہ حقیقتاً معصیت نہیں، اگرچہ صورت معصیت کی ہے، محبت کے جذبے سے اطاعت کے شوق سے وہ اس قسم کا کام کرگزریں کہ کوئی پہلو اُن کی نظر سے مخفی ہوجائے، اور اس مخفی رہنے کی وجہ سے وہ بات خلافِ اولیٰ ہوجائے، اگر کوئی دوسرا آدمی کرے تو اس کو صورۃً بھی گناہ نہیں کہہ سکتے، لیکن انبیاء علیہم السلام کی شان چونکہ بہت بُلند ہوتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے تعبیر ایسے انداز میں کرتے ہیں جس میں ذرا سختی نمایاں ہوتی ہے، یہ اُن کے مرتبے کے علوّ کی وجہ سے ہے، تو جہاں بھی کسی نبی کی طرف گناہ کی نسبت کی گئی ہے وہ ایسے ہی ہے، جیسے آدم علیہ السلام نے اگر شجرہ کھایا تھا تو اس جذبے سے کھایا تھا کہ میں اللہ کا مقرب بن جاؤں گا، فرشتہ ہوجاؤں گا، مجھے یہاں اللہ کے قرب میں دوام نصیب ہوجائے گا، اللہ کا قرب حاصل کرنے کے لئے یہ اقدام کرلیا۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایک مظلوم کی حمایت میں ظالم کے مکا مارا تھا، اور مظلوم کی حمایت کرنا اور ظالم کو تنبیہ کرنا یہ تو عبادت ہے، اور اسی جذبے کے تحت مظلوم کی حمایت کے تحت ہی انہوں نے ہاتھ اُٹھایا تھا، لیکن آگے انسان چونکہ تمام حالات پر محیط علم نہیں رکھتا تو اُن کو کیا پتا تھا کہ یہ مکا اس کی ایسی جگہ لگ جائے گا جس کے بعد یہ پانی بھی نہیں مانگے گا، تو اس قسم کی چیزیں بعض ہوتی ہیں، وہ انسان سے صادر ہوجاتی ہیں (نبی بھی ایک انسان ہوتا

ہے) بعض پہلوؤں کے مخفی ہونے کی وجہ سے، تو اُس کو اللہ تعالیٰ گناہ کے ساتھ تعبیر کر دیتے ہیں، ورنہ جس جذبے کے ساتھ وہ فعل صادر ہوا کرتا ہے وہ جذبہ معصیت نہیں ہوتا، وہ تو طاعت کا جذبہ ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کو راضی کرنے کا جذبہ ہوتا ہے۔ تو اسی طرح سے یہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کو جو صبر کی تلقین کی جارہی ہے، کہ آپ صبر کیجئے، ان حالات کو برداشت کرتے رہئے۔ ایک انسان ہے، اور اس کے اُوپر مسلسل سختیاں ہو رہی ہیں، اور وہ سختی برداشت کر رہا ہے دوسروں کی محض ہمدردی میں، جن کا خیر خواہ ہے وہی آگے سے پتھر مارتے ہیں، جن کی وہ بھلائی چاہتا ہے وہی آگے سے گالی دیتے ہیں، اور بلاوجہ تکلیفیں پہنچاتے ہیں، ایسے وقت میں دل کے اندر کبھی جوش آجاتا ہے، اور قوم کے خلاف کبھی کوئی انتقامی جذبہ اُبھرتا ہے۔ تو یہ جذبے کا اُبھرنا، پھر خاص طور پر آپ پر ایمان لانے والے مظلوم جب آپ کی آنکھوں کے سامنے پٹتے تھے، جو آپ کا کلمہ پڑھ لیتا دُنیا اس کی دشمن ہو جاتی تھی، اور اس کے اُوپر جس قسم کی سختیاں کرتے تھے وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے واقعات آپ نے سنے ہوئے ہیں، تو ایسے وقت میں قلب کے اندر ایک جوش سا آجانا یا انتقام کا جذبہ پیدا ہو جانا، اس کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے آپ کی شانِ رفیع کے خلاف قرار دیا، کہا کہ بالکل مستقل ہو کر برداشت کیجئے، اور اگر آپ کے دِل کے اندر کوئی اس قسم کی بات آتی ہے جو صبر کے منافی ہے، تو وہ آپ کا ایک قصور ہے، جس سے معافی مانگئے، یہ آپ کے علوِّشان کو بیان کرنا مقصود ہے، کہ صبر کے خلاف کوئی واہمہ بھی قلب کے اندر نہ آئے، اور اگر کبھی دشمنوں کے خلاف اس قسم کے انتقامی جذبات آتے ہیں، یا اُن کے متعلق اس قسم کا کوئی خیال آتا ہے تو سمجھو کہ یہ آپ کا ''ذنب'' ہے اور آپ کا قصور ہے، جس سے آپ کو معافی مانگنی چاہیے، تو صبر کے اعلیٰ سے اعلیٰ معیار پر پہنچانے کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تاکید کی جارہی ہے، اس لفظ کا موقع محل یہاں یہ ہے۔

کثرتِ ذِکر کی تاکید

اور صبح شام اللہ کا ذِکر کیجئے۔ عشی: یہ شام کا وقت ہوگیا، زوال سے بعد رات کے کچھ ابتدائی حصے تک عشی کا وقت پھیلا ہوا ہوتا ہے۔ یا تو اس سے عام ذِکر اذکار مراد ہیں، یا یہی شام کی نمازیں مراد ہیں: ظہر، عصر، مغرب، عشاء سب عشی میں آجائیں گی۔ اور ابکار یہ صبح کا وقت آگیا، جس میں صبح کی نماز بھی آسکتی ہے، یا عام ذِکر اذکار مراد ہیں۔ تو جہاں بھی دشمنوں کی مخالفت کو برداشت کرنے کا موقع ہوتا ہے، وہاں ذِکر کی کثرت کی تلقین کی جاتی ہے، کہ اللہ کو کثرت سے یاد کیجئے، جس سے یہ برداشت پیدا ہوگی۔

منکرین تکبر کی وجہ سے اَڑے ہوئے تھے

اِنَّ الَّذِیْنَ یُجَادِلُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِ اللّٰهِ بِغَیْرِ سُلْطٰنٍ اَتٰىهُمْ: بے شک وہ لوگ جو جھگڑتے ہیں اللہ کی آیات کے بارے میں بغیر کسی دلیل کے جو اُن کے پاس آئی ہو، اِنْ فِیْ صُدُوْرِهِمْ اِلَّا كِبْرٌ مَّا هُمْ بِبَالِغِیْهِ: نہیں ہے ان کے دِلوں میں مگر ایک بڑائی، اور وہ اس بڑائی کو پہنچنے والے نہیں ہیں، یعنی ان کا جھگڑا کسی دلیل کی بنا پر نہیں، بلکہ ان میں تکبر ہے، بڑائی ہے، اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر آپ کی اتباع کریں گے تو اس اتباع کی وجہ سے اُن کی بڑائی زائل ہو جائے گی، اپنی بڑائی کو باقی رکھنے کے لئے وہ آپ کی مخالفت کر رہے ہیں اس تکبر کی بنا پر، لیکن اب یہ بڑائی ان کو حاصل ہوگی نہیں، اب یہ شکست کھا جائیں گے، مغلوب ہوں گے، ذلیل ہوں

گے۔اگر یہ بڑا بننا چاہتے ہیں، بڑا بن کر رہنا چاہتے ہیں، اور آپ کی مخالفت اس جذبے سے کرتے ہیں تو یہ بڑائی اب ان کو حاصل ہونے والی نہیں ہے مَّا هُمْ بِبَالِغِيْهِ: نہیں ہیں وہ پہنچنے والے اس بڑائی کو، اب یہ اپنی سرداری کو بچا نہیں سکتے، جس طرح سے بڑا بن کے رہنا چاہتے ہیں اب یہ چیز ان کے لئے ختم ہوگئی۔ اِنْ فِيْ صُدُوْرِهِمْ: صدور صدر کی جمع، سینہ، اور یہ قلوب کے معنی میں ہے۔ ''نہیں ہے ان کے دلوں میں مگر بڑائی، اور نہیں ہیں یہ لوگ اُس بڑائی کو پہنچنے والے'' فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ: اللہ کی پناہ حاصل کیجئے، اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ: بے شک وہ سمیع بصیر ہے۔ جس طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو قتل کرنے کا مشورہ ہوا، قوم نے مخالفت کی، تو موسیٰ علیہ السلام نے کہا تھا کہ اِنِّيْ عُذْتُ بِرَبِّيْ وَرَبِّكُمْ مِّنْ كُلِّ مُتَكَبِّرٍ (سورۂ مؤمن: ۲۷) تو جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام اللہ کی پناہ لے کے بے خوف ہوگئے اسی طرح سے مخالفین کے مقابلے میں آپ بھی اللہ کی پناہ میں آجایئے۔ ''اللہ کی پناہ لیجئے، بے شک وہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔''

اِمکانِ قیامت کی دلیل

آگے عالمِ آخرت کا ذکر آگیا ''معاد'' کا۔ دین کی بنیادی باتوں میں یہ بھی داخل ہے، اور جن چیزوں میں وہ جھگڑا ڈالتے تھے ان میں یہ دو باتیں سرفہرست تھیں توحید اور آخرت، اللہ کی جو آیات توحید پر دلالت کرنے والی تھیں ان میں وہ جھگڑے ڈالتے تھے، اور اللہ کی جو آیات آخرت پر دلالت کرنے والی تھیں، بعث بعد الموت پر، ان میں بھی وہ جھگڑا ڈالتے تھے۔ لَخَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اَكْبَرُ مِنْ خَلْقِ النَّاسِ: البتہ پیدا کرنا آسمانوں کا اور زمین کا بڑا ہے لوگوں کے پیدا کرنے سے، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں، یعنی یہ جو شبہ کرتے ہیں کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کس طرح سے کیے جائیں گے؟ ہڈیاں بوسیدہ ہوجائیں گی تو ان میں زندگی کون ڈالے گا؟ تو یہ دیکھتے نہیں؟ کہ آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنا بظاہر تمہارے خیال کے اعتبار سے، انسانوں کے پیدا کرنے کے مقابلے میں بہت بڑا ہے، تو جب اللہ تعالیٰ اتنے بڑے کام پر قادر ہے تو انسانوں کا پیدا کرنا ابتداءً یا دوبارہ اس کے لئے کیا مشکل ہے؟ جو زمین وہ آسمان پر قادر ہے (اور اس مقدمے کو وہ تسلیم کرتے تھے، کہتے تھے کہ آسمان زمین کا خالق اللہ ہی ہے) جب اتنی بڑی چیز کو اللہ تعالیٰ بنالیتا ہے تو انسان کا پیدا کرنا کیا مشکل ہے؟ جس طرح سے دوسری جگہ آتا ہے وَهُوَ اَهْوَنُ عَلَيْهِ (سورۂ روم: ۲۷) کہ اس کا پیدا کرنا تو بہت ہی آسان ہے۔ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں، اس بات کو سمجھتے نہیں ہیں۔

وقوعِ قیامت کی مصلحت

یہ تو ہوگیا کہ اس میں اِمکان پیدا کرکے ذکر کردیا گیا کہ قیامت کا ہونا ممکن ہے، دوبارہ اُٹھایا جانا ممکن ہے۔ جو زمین آسمان کو پیدا کرسکتا ہے وہ انسانوں کو بڑی آسانی سے پیدا کرسکتا ہے۔ آگے مصلحت ذکر کی جارہی ہے کہ آخرت آنی چاہیے، ورنہ مطلب یہ ہوگا کہ نیک اور بُرے، اندھے سوانکھے سب برابر ہوگئے، جنہوں نے دُنیا کے اندر اندھوں کی طرح زندگی گزاری، کچھ نہیں دیکھا کہ کون سی بات اچھی ہے کون سی بُری ہے، اور بعضوں نے آنکھیں کھول کر وقت گزارا ہے، ہر اچھائی بُرائی میں وہ امتیاز کرتے ہیں، تو اگر قیامت نہیں آئے گی تو مرنے کے بعد یہ سب برابر ہوجائیں گے، تو یہ کون سی حکمت اور کون سا عدل ہے؟ کہ ایک

اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں ہر قسم کی خواہشات کو چھوڑے ہوئے ہے، اور مجاہدہ اور ریاضت کی زندگی اختیار کیے ہوئے ہے، اور ایک عیاشی کی زندگی گزارتا ہے، تو اگر مرنے کے بعد دوبارہ آخرت نہیں آئے گی، دوبارہ اٹھنا نہیں ہے اور اللہ کے سامنے پیش نہیں ہونا، پھر تو یہ سارے برابر ہو گئے، پھر فرق کیا رہا؟ یہ حکمت ہے کہ قیامت آنی چاہیے۔ پہلا ہے کہ قیامت آسکتی ہے، دوسرا ہے کہ اس کو آنا چاہیے، اور آگے خبر آجائے گی اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ لَّا رَيْبَ فِيْهَا کہ وہ آنے والی ہے اور اس کے آنے میں کوئی کسی قسم کا شک نہیں، تو تینوں درجے آ گئے، پہلے امکان ہے، اور پھر حکمت ہے کہ اس کو آنا چاہیے، آخرت ہونی چاہیے، اور پھر آگے خبر دے دی گئی کہ ہوگی، بلاشک وشبہ ہوگی، جس میں کوئی کسی قسم کا تردّد نہیں۔ ''نہیں برابر اندھا اور دیکھنے والا۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے نیک عمل کئے اور نہ بدکردار۔'' قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ: تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو، یعنی اگر آخرت نہ آئے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اندھے بہرے اور سوانکھے (دیکھنے والے) سب برابر ہو جائیں، اور اسی طرح سے صالحین اور بدکردار برابر ہو جائیں، پھر اس کا نتیجہ تو یہ ہوگا، اور ایسا نہیں ہو سکتا، جس نے دُنیا کے اندر اندھوں کی طرح زندگی گزاری اور جس نے آنکھیں کھول کر گزاری، ان کے انجام میں یقیناً فرق ہے، جو ایمان لائے اور اچھے کام کرتے ہیں اور جو بدکردار ہیں ان کے انجام میں یقیناً فرق ہے۔ اس لیے قیامت کے آنے میں ہی حکمت اور مصلحت ہے۔ قَلِيْلًا مَّا تَتَذَكَّرُوْنَ: تم بہت کم نصیحت حاصل کرتے ہو۔

اب اگلا تیسرا درجہ آ گیا، اِنَّ السَّاعَةَ لَاٰتِيَةٌ: یہ وقوع کی خبر دے دی گئی کہ بے شک قیامت البتہ آنے والی ہے، لَّا رَيْبَ فِيْهَا: اس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ تو پہلی آیت میں اِمکان تھا، اور دُوسرے درجے میں تھا کہ اس کی جانبِ وقوع راجح اور حکمت کے مطابق ہے اور تیسرے میں خبر دے دی گئی کہ وہ آ کے رہے گی، تو بات قطعی طور پر ثابت ہو گئی، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يُؤْمِنُوْنَ: لیکن اکثر لوگ مانتے نہیں۔ ''قیامت البتہ آنے والی ہے'' ساعۃ سے ساعتِ آخرت مراد ہے، ''اس کے آنے میں کوئی کسی قسم کا شبہ نہیں، لیکن اکثر لوگ مانتے نہیں۔''

اپنی حاجات میں غیر اللہ کو پکارنا شرک کیوں ہے؟

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ: اس کا تعلق توحید کے ساتھ ہے۔ تیرا ربّ کہتا ہے کہ مجھے ہی پکارو، میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا، اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ: بے شک وہ لوگ جو تکبر کرتے ہیں میری عبادت سے، سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ: عنقریب داخل ہوں گے وہ جہنم میں ذلیل ہو کر۔ اس میں دُعا کی تلقین کر دی گئی، اصل بات یہ ہے کہ مشرکین کا جو شرک تھا وہ دُعا کے ہی رنگ میں تھا زیادہ تر، اس لیے يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (سورۂ نحل: ۲۰ وغیرہ) اکثر و بیشتر عنوان یہی اختیار کیا گیا ہے، دُعا کا حاصل ہوتا ہے پکارنا، اور اس کا مفہوم یہ ہے کہ اپنی قضائے حاجات کے لئے کسی کو پکارنا، دفعِ ضرر کے لئے یا حصولِ نفع کے لئے۔ اور انسان جب کسی کو پکارتا ہے، اس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے، دامن پھیلاتا ہے، فریاد کرتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے اُوپر ہر طرح سے اس کی برتری تسلیم کر لی، اور اکثر و بیشتر پکارنے کا جذبہ انسان میں اسی وقت ہی پیدا ہوتا ہے جب وہ کسی ضرورت کو پورا کرنے کے لئے ظاہری اسباب سے عاجز آ جاتا ہے، ظاہری اسباب سے جب عاجز آ جاتا ہے تو پھر اس میں کسی غیبی طاقت کو

پکارنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے، جس کے متعلق اُس کا تصور یہ ہوتا ہے کہ اس کو مافوق الاسباب قدرت حاصل ہے، اور میرے بنانے بگاڑنے کے اس کو اِختیارات حاصل ہیں، اور میرے حالات کی اس کو پوری طرح سے خبر ہے، جس کو پکارا جائے اس کے متعلق عقیدہ یہی ہوتا ہے، میری پکار کو وہ سُن رہا ہے، میرے حالات سے وہ باخبر ہے، اور مجھے نفع پہنچانے پر، میرے سے نقصان دُور ہٹانے پر وہ ہر طرح سے قادر ہے اور قادر بھی ظاہری اسباب سے فوق، کیونکہ پکارنے کا جذبہ پیدا ہی اس وقت ہوتا ہے کہ جس وقت انسان ظاہری اسباب میں اپنے آپ کو عاجز پاتا ہے، جب وہ دیکھتا ہے کہ اب میری ہمت سے معاملہ باہر ہوگیا تب وہ کسی غیب کی طاقت کا سہارا لیتا ہے، یہ ہے دُعا کی حقیقت، اور آپ جانتے ہیں کہ کسی کے متعلق ایسا عقیدہ رکھ لینا جو دُعا کی حقیقت ہے، یہی اُلوہیت کا عقیدہ رکھنا ہے، کہ اُس کے سامنے انسان اپنے آپ کو پرلے درجے کا عاجز اور ذلیل قرار دے دیتا ہے، اور اس کو اپنے اُوپر پوری طرح سے قادر اور مختار سمجھ لیتا ہے۔

اب اللہ کی ذات کے علاوہ کون ہے کہ جس کے متعلق انسان کے دل میں اس قسم کے جذبات ہوں؟ اس لیے اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو اپنی حاجات کے لئے پکارنا بدترین قسم کا شرک ہے، کیونکہ اس میں اُلوہیت کی ساری کی ساری صفات اس کے لیے مان لی جاتی ہیں جس کو انسان غائبانہ اپنی حاجات کے لئے پکارتا ہے، ظاہری اسباب سے عاجز ہو کر مافوق الاسباب اُس کو قادر سمجھتا ہے، اپنے حالات سے باخبر سمجھتا ہے، اور اپنے کو نفع پہنچانے پر اس کو قادر سمجھتا ہے، نقصان دُور ہٹانے پہ قادر سمجھتا ہے، اتنی برتری جب وہ اپنے اُوپر تسلیم کر لیتا ہے تو تب اُس کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے، مصیبت کے وقت میں اس کے سامنے چیخ و پکار کرتا ہے، یہ اللہ کی ذات کے علاوہ کوئی دوسرا نہیں، اس لیے اپنی حاجات میں کسی دوسرے کو پکارنا بدترین قسم کا شرک ہے، اور یہ حیثیت اگر ہے تو بندے کے اوپر صرف اللہ کی ہے، کہ جب انسان چاروں طرف سے عاجز آجائے تو عاجز آنے کے بعد پھر جو ذات اس کے اُوپر اسباب کے خلاف، اسباب کے بغیر جو اُس پر قادر ہے، اس کے حالات سے خبر رکھنے والی، وہ صرف اللہ کی ذات ہے، پھر اس کو پکارو، پکارنے کے بعد اللہ وعدہ کرتا ہے کہ میں تمہاری اس پکار کو قبول کروں گا، اور اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کے اندر یہ طاقت نہیں کہ آپ کی پکار کو قبول کرلے اور آپ کی دُعا کو قبول کرلے۔

ہر دُعا قبول ہوتی ہے، لیکن قبولیت کی مختلف صورتیں ہیں

قبول کرنے کا یہاں کیا معنی؟ کہ اللہ کو پکار کے تم مایوس نہ ہوؤ، قبولیت کے دو درجے ہوا کرتے ہیں، سمجھانے کے لئے مثال دُوں بلاتشبیہ، کہ آپ ایک حاکم کے سامنے اس کے دفتر میں کوئی درخواست لے کر جاتے ہیں اپنی کسی ضرورت کی بنا پر، اب ایک درجہ تو قبولیت کا یہ ہے کہ آپ کی درخواست وصول کرلی گئی اور اس کو زیرِ غور کرلیا گیا، تو آپ کہتے ہیں کہ ہماری درخواست ہماری اپیل منظور ہوگئی، کہ حاکم نے وعدہ کرلیا ہے کہ میں اس کے اُوپر غور کروں گا، ایک قبولیت کا درجہ یہ ہے۔ اور ایک قبولیت کا درجہ یہ ہے کہ پھر اس کے اُوپر فیصلہ بھی آپ کے حق میں کردیا جائے، اور اگر آپ درخواست لے کر گئے اور حاکم نے پکڑی ہی نہیں، کہہ دیا کوئی حق نہیں ہے، کوئی موقع نہیں ہے درخواست لینے کا، ہم نہیں لیتے، یہ ہے حقیقت کے اعتبار سے رَدّ کردینا، ایک ہے کہ

درخواست آپ کی لے لی گئی اور وہ کہتا ہے کہ ہم ہمدردی کے ساتھ اس پہ غور کریں گے، یہ قبولیت کا پہلا درجہ ہے، پھر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کے بعد اس میں آپ کے مطابق فیصلہ بھی کر دیا جائے یہ قبولیت کا دوسرا درجہ ہے۔ یہ جو پہلا درجہ ہے کہ درخواست رَدّ کر دی جائے، لی نہ جائے، دُعا کے متعلق یہ بات نہیں، یہ تو ہر کسی کی دُعا قبول ہوتی ہے کہ جو بھی اللہ کے سامنے درخواست دیتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کی درخواست کو سنتا ہے اور لیتا ہے، یہ قبولیت کا درجہ تو یقیناً مہیا ہو گیا، مہیا ہو جانے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت، اپنی حکمت، اپنے عدل، اپنے فضل کے ساتھ اس دُعا پر توجہ دیتے ہیں، توجہ دینے کے بعد پھر حدیث شریف میں آتا ہے کبھی تو اللہ تعالیٰ اپنے بندے کو وہی چیز دے دیتے ہیں جو اس نے مانگی، اس کو اِنسان سمجھتا ہے کہ میری دُعا قبول ہو گئی، اور کبھی اس چیز کا دینا بندہ کے لئے مصلحت نہیں ہوتا، بلکہ اس چیز کے دینے میں اس بندے کا نقصان ہے جس نے اللہ کے سامنے زاری کی ہے، اللہ کے سامنے اِلحاح کیا ہے، انسان کا علم ناقص ہے، اللہ کا علم کامل ہے، اللہ سمجھتا ہے کہ یہ چیز اس کے لئے مناسب نہیں ہے، لیکن دُعا پھر بھی خالی نہیں جاتی، اللہ تعالیٰ اس کے برابر اس کی کوئی بُرائی، کوئی تکلیف دُور ہٹا دیتے ہیں، وہ مانگی ہوئی چیز تو نہیں دیتے البتہ تکلیف دُور ہو جاتی ہے، اور اگر ایسا موقع بھی نہ ہو تو پھر اللہ تعالیٰ اس دُعا کو جمع رکھتے ہیں اس کے نیک عمل کے طور پر، اور آخرت میں اس کے اُوپر ثواب دیں گے۔[1] اور اتنا ثواب دیں گے حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس وقت ان لوگوں کو بدلہ دیا جائے گا جن کی دُنیا کے اندر دُعا قبول نہیں ہوئی، تو جن کی دُعائیں قبول ہوئی تھیں وہ تمنا کریں گے کہ ہائے کاش! ہماری ایک دُعا بھی دُنیا میں قبول نہ ہوئی ہوتی، تا کہ ہم آخرت میں اتنا ثواب حاصل کر لیتے۔[2] بہرحال پکارا ہوا ضائع نہیں جاتا، اللہ تعالیٰ اس پکارنے پر توجہ فرماتے ہیں، توجہ فرمانے کے بعد حکمت اور مصلحت کے تحت جو چیز انسان کے لئے مفید ہوتی ہے وہ صورت اختیار فرماتے ہیں، بہرحال دُعا ضائع نہیں جاتی۔ اور اگر آپ کی ہر مانگی ہوئی چیز آپ کو دے دی جائے یہ رحمت اور فضل نہیں ہے، بلکہ یہ تو بسا اوقات آپ کے لئے دشمنی ہے، جس طرح سے آپ گھروں میں دیکھتے ہیں، بچے ایک وقت ماں باپ سے ایک چیز مانگتے ہیں، ماں باپ جب سمجھتے ہیں کہ کوئی حرج نہیں، بچے کے لئے مفید ہے، وہی دے دی جاتی ہے، اور ایک وقت میں بچہ ضد کرتا ہے کہ مجھے فلاں چیز لے کر دو، لیکن ماں باپ سمجھتے ہیں کہ یہ چیز اگر اس کو لے کر دی تو یہ اپنا کوئی نقصان کر بیٹھے گا، یا یہ اگر اس کو کھلا دیا گیا تو یہ بیمار ہو جائے گا، تو ہزار ضد کرے چیخے چلّائے، ایڑیاں رگڑے، اور زمین پہ لوٹ پوٹ ہو، جتنا چاہے اِلحاح اور زاری کرے، لیکن ماں باپ نہیں دیتے، بلکہ اس کو بہلانے کے لئے کوئی دُوسری چیز دے دیں گے، وہ گڑ کھانے کے لئے مانگتا ہے تو اس کو گڑ نہیں دیں گے، بسکٹ اس کے ہاتھ میں دے دیں گے، یا وہ کسی جگہ جانے کا تقاضا کرتا ہے تو وہاں نہیں لے کے جائیں گے اس کو کسی دُوسری طرف لے کے جائیں گے، یعنی یہ بدلے کے طور پر دُوسری چیز دے دی جاتی ہے، کبھی اس کو کوئی کھلونا دے کے بہلا دیا جاتا ہے، جو وہ مانگتا ہے وہ نہیں دیا جاتا، ماں باپ مفید سمجھتے ہیں تو وہ چیز دیتے ہیں، نہیں مفید سمجھتے تو ہزار روتا رہے اس کو کسی اور چیز کے ساتھ بہلانے کی کوشش کریں گے، وہ چیز نہیں دیں گے، کسی دوسرے وقت میں کچھ اور دینے کا وعدہ کر لیتے ہیں بچے کو بہلانے کے لئے،

---

(۱) مشکوۃ ۱/ ۹۶، کتاب الدعوات، فصل ثالث، عن ابی سعید الخدری۔ مسند احمد، رقم ۱۱۱۳۳۔

(۲) مستدرک حاکم ۱/ ۴۹۴ کتاب الدعاء والتکبیر۔ رقم ۱۸۱۹۔ فَيَقُولُ الْمُؤْمِنُ فِي ذَالِكَ الْمَقَامِ: يَالَيْتَهُ لَمْ يَكُنْ عُجِّلَ لَهُ فِي شَيْءٍ مِنْ دُعَائِهِ.

تو یہ بچے کے اُوپر ماں باپ کی شفقت ہے کہ ہر مانگی ہوئی چیز اس کو نہیں دی جاتی، اگر ہر مانگی ہوئی چیز بچے کو دے دی جائے تو بچہ نقصان میں جائے گا نفع میں نہیں۔ اسی طرح سے جو آپ کے منہ سے نکلے اور آپ مانگیں، وہی آپ کو دے دیا جائے تو اس میں آپ کا نقصان ہے نفع نہیں ہے، اور اللہ تعالیٰ یہ چیز اپنی رحمت اور فضل کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں، تو رحمت اور فضل کا تقاضا بھی ہے کہ جو آپ کے لئے مصلحت ہو وہ آپ کو دی جائے، جو مصلحت نہ ہو، وہ نہ دی جائے، اس لئے ہر دُعا قبول ہوتی ہے، اس تفصیل کے تحت اگر آپ سوچیں گے تو کوئی دُعا خالی نہیں جاتی۔

کثرتِ دُعا کی تاکید اور آدابِ دُعا

حضور ﷺ نے کثرت کے ساتھ تلقین کی کہ اللہ کے سامنے دُعا کیا کرو، دُعا کرنے والے کا دامن اللہ کی رحمت سے بھرتا ہے، چاہے اس کی صورت کوئی ہو۔ اور پھر کتنا رحم اور کرم ہے اس کا کہ دُنیا میں انسان اگر انسان سے کوئی چیز مانگتا ہے تو جس سے مانگی جائے وہ نفرت کرتا ہے تنگ آجاتا ہے، لیکن حدیث شریف میں آتا ہے کہ ''اِنَّ اللہَ یُحِبُّ الْمُلِحِّیْنَ فِی الدُّعَاءِ''[1] کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے جو اَڑ اَڑ کر دُعا کرتے ہیں، زاری کے ساتھ، اِلحاح کے ساتھ، اور اِصرار کے ساتھ جو دُعا کرتے ہیں، وہ اللہ کو بڑے اچھے لگتے ہیں، اس لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ جب دُعا کیا کرو تو یوں نہ کہا کرو: ''اَللّٰھُمَّ اغْفِرْ لِیْ اِنْ شِئْتَ، اِرْحَمْنِیْ اِنْ شِئْتَ، اُرْزُقْنِیْ اِنْ شِئْتَ'' اے اللہ! مجھے بخش دے، اگر تُو چاہے، مجھ پر رحم کر، اگر تُو چاہے، مجھے رزق دے دے، اگر تُو چاہے، اللہ کی مشیت کے ساتھ اس کو معلق نہ کیا کرو، اپنی طرف سے پختہ کر کے مانگو، باقی اللہ کو کوئی مجبور کرنے والا تو ہے نہیں، وہ کرے گا تو وہی جو چاہے گا،[2] لیکن تم اپنی طرف سے کمزوری نہ دِکھاؤ، اپنی طرف سے جو مانگو پوری طرح سے زور لگا کے مانگو، اور اس یقین کے تحت مانگو کہ یہ قبول ہوگی، اور ''مَنْ لَمْ یَسْأَلِ اللہَ یَغْضَبْ عَلَیْهِ''[3] جو اللہ سے نہیں مانگتے اللہ ان پہ ناراض ہوتا ہے، اللہ کہتا ہے یہ بندے کا تکبّر ہے کہ میرے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار نہیں کرتا اور میری طرف اپنا احتیاج ظاہر نہیں کرتا، تو اس پہ اللہ ناراض ہوتا ہے، تو یہ دُعا کی جو تلقین کی گئی کہ مجھے پکارو، میں تمہاری دُعا قبول کروں گا، یہ بھی مشرکین کی شرک کی رَگ کاٹنے والی بات ہے، کیونکہ شرک جو آتا ہے وہ اسی طرح سے غائبانہ کسی دُوسرے کو پکارنے کی صورت میں ہی آتا ہے، اور پھر حدیث شریف میں فرمایا گیا ''اِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ''[4] دُعا ہی عبادت ہے، یعنی عبادت کی حقیقت سب سے زیادہ کامل طریقے سے دُعا میں موجود ہے۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ: اور تمہارے رَبّ نے کہا کہ مجھے پکارو، میں تمہاری پکار قبول کروں گا۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ: بے شک وہ لوگ جو میری عبادت سے تکبّر کرتے ہیں، سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِیْنَ: عنقریب داخل ہوں گے وہ جہنّم میں ذلیل ہو کر۔ دٰخِرِیْنَ کا معنی ذلیل ہو کر۔ یہاں پہلے دُعا کا حکم دیا گیا، اور اگلے حصے میں عبادت سے تکبّر کرنے والوں کے

---

(۱) مسند الشهاب القضاعی ۲/ ۱۳۵، رقم ۱۰۶۹۔
(۲) بخاری ۲/ ۹۳۸، باب لیعزم المسئلة. مشکوٰۃ ۱/ ۱۹۴، کتاب الدعوات، فصل اول۔
(۳) ترمذی ۲/ ۱۷۵، ابواب الدعوات. مشکوٰۃ ۱/ ۱۹۵، کتاب الدعوات، فصل ثانی۔
(۴) ابن ماجه ص ۲۷۱، کتاب الدعاء۔ نیز ترمذی ۲/ ۱۶۰، تفسیر سورۃ المؤمن. مشکوٰۃ ۱/ ۱۹۴، کتاب الدعوات، فصل ثانی۔

لئے جہنم کی وعید آئی، جس سے یہ مطلب بظاہر سمجھ میں آیا کہ دُعا عبادت ہے اور دُعا نہ کرنا یہ استکبار عن العبادۃ ہے، جو آدمی اللہ کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا تو گویا کہ وہ اللہ کی عبادت سے تکبر کرتا ہے، کیونکہ عبادت کا حاصل ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے عبدیت کا اظہار، اپنی بے چارگی کا اظہار، اپنے عجز کا اظہار، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ معنی سب سے زیادہ دُعا میں پایا جاتا ہے، اس لئے دُعا کی تاکید آئی، جتنا عجز اور درماندگی اللہ تعالیٰ کے سامنے بے چارگی اور مسکنت دُعا میں نمایاں ہے، اتنی کسی میں نمایاں نہیں، حضور ﷺ دُعا مانگا کرتے تھے، اور اس طرح سے ہاتھ پھیلاتے کَالْمُسْتَطْعِمِ الْمِسْكِيْنِ جس طرح سے کوئی مسکین کسی دُوسرے سے کھانا مانگتا ہوا ہاتھ پھیلاتا ہے،[1] اس طرح سے ہاتھ پھیلاتے تھے صحابہ ؓ کہتے ہیں کہ ہمیں حضور ﷺ کی بغلوں کے اندر کے حصے کی سفیدی نظر آجایا کرتی تھی،[2] اور یہ تبھی نظر آسکتی ہے کہ جب ہاتھ خوب لمبے کر کے پھیلیں، اور جب اس طرح سے اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے تو کتنی مسکنت نمایاں ہے۔ اور ہاتھ اُٹھا کر جو ہم مانگ لیا کرتے ہیں تو یہ بھی دُعا کی ایک صورت ہے، یہ دُعا کا ادب ہے کیونکہ اس میں مزید عجز اور بے چارگی کا اظہار ہوتا ہے، ورنہ دُعا اصل کے اعتبار سے وہ الفاظ ہیں جو انسان اپنی زبان سے ادا کرتا ہے، یہ ہاتھ اُٹھانا دُعا نہیں، یہ دُعا کا ادب ہے، تو جس وقت زبان سے انسان مانگے اور ہاتھ بھی پھیلائے تو اس کے ساتھ انسان کا عجز زیادہ نمایاں ہے۔ پھر اس طرح سے (جیسے عام معمول ہے) ہاتھ اُٹھائیں گے تو بغلوں کی سفیدی نمایاں نہیں ہوگی، حضور ﷺ کا بسا اوقات مانگنا جو ذکر کیا جاتا ہے تو صحابہ ؓ کہتے ہیں: ''حَتّٰى رَأَيْنَا بَيَاضَ إِبْطَيْهِ'' حضور ﷺ نے اس طرح سے ہاتھ اُٹھائے اور پھیلائے کہ ہم نے آپ ﷺ کی ابطین کی بیاض دیکھ لی،[3] یعنی ابطین کے اندر کا حصہ نظر آجاتا، چادر اوڑھی ہوئی ہوتی، اور جس وقت چادر اوڑھی ہوئی ہو اور اس طرح (خوب لمبے کر کے) انسان ہاتھ پھیلاتا ہے، تو سامنے بیٹھنے والوں کو یہ (بغلوں کے اندر والا) حصہ نظر آجاتا ہے، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور ﷺ جس وقت مانگتے تھے تو اس طرح سے ہاتھ پھیلاتے تھے کالمستطعم المسکین۔ اور اس میں دُعا کی قبولیت کی اُمید اور زیادہ ہوجاتی ہے اگر انسان زبان سے بھی کہے اور ہاتھ بھی پھیلائے۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں: ''إِنَّ رَبَّكُمْ حَيِيٌّ كَرِيْمٌ'' تمہارا رَبّ بہت باحیا ہے، بہت باکرم ہے، ''يَسْتَحْيِيْ مِنْ عَبْدِهٖ'' اپنے بندے سے وہ حیا کرتا ہے، ''إِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ إِلَيْهِ'' جس وقت بندہ اس کے سامنے ہاتھ اُٹھاتا ہے، ''أَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا'' کہ اللہ تعالیٰ ان ہاتھوں کو خالی لوٹا دے،[4] جس وقت بندہ اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو حیا آتی ہے، کہ اللہ تعالیٰ ان ہاتھوں کو خالی واپس کردے۔ تو جب ہاتھ پھیلتے ہیں تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت کے ساتھ ان ہاتھوں کو خالی واپس نہیں کرتا، لیکن صورت

(۱) عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ، قَالَ رَأَيْتُ رَسُوْلَ اللهِ ﷺ يَدْعُوْ بِعَرَفَةَ يَدَاهُ إِلٰى صَدْرِهٖ كَاسْتِطْعَامِ الْمِسْكِيْنِ. (سنن کبریٰ بیہقی ۵/۱۱۷، باب افضل الدعاء دعاء یوم عرفہ)

(۲) مشکوۃ ۱/۱۹۶، کتاب الدعوات، فصل ثالث۔ يَرْفَعُ يَدَيْهِ فِي الدُّعَاءِ حَتّٰى يُرٰى بَيَاضُ إِبْطَيْهِ۔ نیز بخاری ۲/ ۹۴۴، باب الدعاء عند الوضوء. مسلم ۱/ ۲۹۳، کتاب صلوۃ الاستسقاء

(۳) ابن حبان ۷/ ۱۰۹، رقم ۲۸۶۰۔ نیز بخاری ۱/ ۱۴۰، باب رفع الناس، و باب رفع الامام وغیرہ

(۴) مشکوۃ ۱/ ۱۹۵، کتاب الدعوات، فصل ثانی۔ ترمذی ۲/ ۱۹۶، احادیث شتی من ابواب الدعوات سے کچھ پہلے۔

وہی جو آپ کے سامنے تفصیل عرض کردی گئی، کہ اگر حکمت اور مصلحت ہو تو وہی چیز آپ کو دے دی جاتی ہے، اور اگر اللہ تعالیٰ کی حکمت کا تقاضا نہیں ہوتا تو وہ چیز نہیں دی جاتی، اس کے بدلے میں کوئی تکلیف آپ سے دُور ہٹادی جاتی ہے، اور اگر یہ صورت بھی نہ ہو تو آخرت کے لئے آپ کی دُعا کو ذخیرہ کر کے رکھ لیا جاتا ہے اور آخرت میں اللہ تعالیٰ ثواب دے گا۔ بہرحال دُعا کی ہوئی ضائع نہیں جاتی، باقی جتنی بھی عبادات ہیں، اگر آپ ان کو دُنیا کے نفع کے لئے کریں گے تو وہ عبادات ضائع ہوجاتی ہیں، لیکن یہ دُعا اگر اپنی دُنیوی ضرورت کے لئے بھی کرو تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی ثواب دیتے ہیں، حتیٰ کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ اگر نمک کی ضرورت ہے تو بھی اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، حتیٰ کہ اگر تم میں سے کسی کے جوتے کا تسمہ ٹوٹ جائے تو وہ بھی اللہ سے مانگو۔[1] تھوڑی تھوڑی چیز کے لئے اللہ سے مانگو گے، اللہ کی طرف عجز اور بے چارگی کا اظہار ہوگا تو اللہ کی رحمت زیادہ متوجہ ہوگی۔ اور مشرک جب اللہ کے در کو چھوڑتا ہے اور مختلف دروں پہ ہاتھ پھیلاتا ہے تو ذلیل ہوتا پھرتا ہے، کیونکہ ان کے اختیار میں کچھ نہیں، نہ ان کو علم حاصل نہ قدرت حاصل۔

وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ: تمہارا ربّ کہتا ہے کہ مجھے پکارو، میں تمہاری پکار کو قبول کروں گا، بے شک جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں (تو عبادت سے تکبر کرنے کی یہ صورت ہوئی، کہ انسان دُعا کرنے سے عار کرے اور اللہ کے سامنے ہاتھ پھیلانے سے شرمائے، یہ ہے اللہ کی عبادت سے استکبار) عنقریب لوگ داخل ہوں گے جہنم میں ذلیل ہوکر۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے رات بنائی تاکہ تم اس میں سکون حاصل کرو، اور دِن کو روشن بنایا، بے شک اللہ تعالیٰ

لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ ۝۶۱ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ

البتہ فضل والے ہیں لوگوں پر، لیکن اکثر لوگ شکر نہیں کرتے ۝۶۱ یہی اللہ تمہارا ربّ ہے

خَالِقُ كُلِّ شَیْءٍ ۘ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۡ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ۝۶۲ كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِیْنَ كَانُوْا

ہر چیز کو پیدا کرنے والا، کوئی معبود نہیں مگر وہی، تم کہاں پلٹے جارہے ہو؟ ۝۶۲ اسی طرح سے پلٹے جاتے تھے وہ لوگ جو

بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝۶۳ اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً

اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے ۝۶۳ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا، اور آسمان کو چھت بنایا

(۱) ترمذی ۲/۲۰۱، ابواب المناقب سے کچھ پہلے۔ مشکوۃ ۱/۱۹۶، کتاب الدعوات، فصل ثالث۔

وَصَوَّرَكُمْ فَأَحْسَنَ صُوَرَكُمْ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبَاتِ ۚ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ ۖ

اور تمہیں صورتیں دیں، اور تمہاری صورتوں کو اچھا کیا، اور تمہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، یہی اللہ تمہارا رب ہے،

فَتَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٤﴾ هُوَ الْحَيُّ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ فَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ

برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے ﴿۶۴﴾ وہی زندہ ہے، کوئی معبود نہیں اس کے علاوہ، پس تم اسی کو پکارا کرو خالص کرتے ہوئے اس کے لئے

الدِّينَ ۗ الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٦٥﴾ قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ

اطاعت کو، سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین ہے ﴿۶۵﴾ آپ کہہ دیجئے کہ میں منع کر دیا گیا ہوں کہ میں عبادت کروں ان کی

تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَمَّا جَاءَنِيَ الْبَيِّنَاتُ مِن رَّبِّي وَأُمِرْتُ أَنْ أُسْلِمَ لِرَبِّ

جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، جب کہ آ گئے میرے پاس واضح دلائل میرے رب کی طرف سے، اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں فرماں بردار ہو جاؤں

الْعَالَمِينَ ﴿٦٦﴾ هُوَ الَّذِي خَلَقَكُم مِّن تُرَابٍ ثُمَّ مِن نُّطْفَةٍ ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ

رب العالمین کے لئے ﴿۶۶﴾ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے، پھر نطفے سے، پھر جمے ہوئے خون سے، پھر

يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا ثُمَّ لِتَبْلُغُوا أَشُدَّكُمْ ثُمَّ لِتَكُونُوا شُيُوخًا ۚ وَمِنكُم مَّن

وہی نکالتا ہے تمہیں بچے بنا کر، پھر (تمہیں مہلت دیتا ہے) تا کہ تم پہنچ جاؤ اپنی جوانی کو، پھر تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ، اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو

يُتَوَفَّىٰ مِن قَبْلُ ۖ وَلِتَبْلُغُوا أَجَلًا مُّسَمًّى وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿٦٧﴾ هُوَ الَّذِي يُحْيِي وَ

اس سے قبل ہی وفات پا جاتے ہیں، اور (اللہ تمہیں مہلت دیتا ہے) تا کہ تم پہنچ جاؤ ایک وقت معین کو، اور تا کہ تم عقل حاصل کرو ﴿۶۷﴾ وہی ہے جو

يُمِيتُ ۖ فَإِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ﴿٦٨﴾

زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے، جس وقت فیصلہ کرتا ہے وہ کسی امر کا، سوائے اس کے نہیں کہ اسے کہہ دیتا ہے: ہو جا! پس وہ ہو جاتا ہے ﴿۶۸﴾

تفسیر

آیاتِ قدرت

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الَّیْلَ لِتَسْكُنُوْا فِیْهِ: آگے پھر وہی آیاتِ قدرت آ گئیں جن میں احسان کا پہلو بھی ہے۔ اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے رات بنائی تا کہ تم اس میں سکون حاصل کرو، وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا: اور دن کو روشن بنایا'' تا کہ تم اس میں کام کرو''،

لِتَسْكُنُوا فِيهِ کے مقابلے کے طور پر یہ بات سمجھ میں آگئی۔ مُبصر: روشن۔ اَبْصَرَ کا اصل معنی ہے دیکھنا۔ مُبصِر: دیکھنے والا۔ چونکہ یہ دیکھنے کا ذریعہ بنتا ہے اس لئے اس دن کو مبصر کہہ دیا گیا۔ ترجمہ اس کا یونہی کر دیا جاتا ہے "دن کو روشن بنایا تا کہ تم اس میں کام کرو"، اور مُبْصِرًا کے مقابلے میں لیل کے ساتھ مُظْلِمًا کا لفظ آجائے گا" اللہ نے تمہارے لئے رات تاریک بنائی تا کہ تم اس میں آرام کرو" تاریکی کو سکون میں بڑا دخل ہے، اس لئے روشنی میں بسا اوقات نیند نہیں آتی، اندھیرا ہو جائے تو فوراً نیند آجاتی ہے، اور لِتَسْكُنُوا فِيهِ کے تقابل کے طور پر وَالنَّهَارَ مُبْصِرًا کے بعد لِتَعْمَلُوا فِيهِ یہ لفظ محذوف نکال لیا جائے گا" تا کہ تم اس میں کام کرو"۔ اِنَّ اللّٰهَ لَذُوْ فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ بے شک اللہ تعالیٰ البتہ فضل والے ہیں لوگوں پر، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُوْنَ لیکن اکثر لوگ ناقدرے ہیں، شکر نہیں کرتے، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ: یہی اللہ تمہارا رب ہے ہر چیز کو پیدا کرنے والا، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں مگر وہی، فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ: تم کہاں پلٹے جا رہے ہو، تمہیں کدھر اُلٹا کیا جا رہا ہے؟ یعنی تم سوچتے نہیں، اور پھر تم اُلٹی راہ اختیار کر رہے ہو، جو خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ہے اس کو نہیں پکارتے، جس کو ہر قسم کی قدرت حاصل ہے اس کے سامنے عجز کا اظہار نہیں کرتے، اور جس کے ہر قسم کے انعامات ہیں اس سے رحمت طلب نہیں کرتے، بلکہ عاجز مخلوق کے پیچھے لگے ہوئے ہو، تو تم کہاں پلٹے جا رہے ہو، اُلٹا چکر تمہیں کہاں سے آرہا ہے، كَذٰلِكَ يُؤْفَكُ الَّذِيْنَ كَانُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ: اسی طرح سے پلٹے جاتے تھے وہ لوگ جو اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَرْضَ قَرَارًا: اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کو ٹھہرنے کی جگہ بنایا۔ قرار مَقَرّ کے معنی میں ہے۔ وَّالسَّمَآءَ بِنَآءً: اور آسمان کو چھت بنایا، وَّصَوَّرَكُمْ: اور تمہیں صورتیں دیں، تمہاری شکل بنائی، فَاَحْسَنَ صُوَرَكُمْ: اور تمہاری صورتوں کو اچھا کیا، کتنی اچھی شکل صورت دی، وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ: اور تمہیں پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا، ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ: یہی اللہ تمہارا رب ہے، فَتَبٰرَكَ اللّٰهُ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ: برکت والا ہے اللہ جو تمام جہانوں کا رب ہے۔ هُوَ الْحَيُّ: وہی حقیقتاً زندگی والا ہے، جس کے اُوپر کبھی موت نہیں آئے گی، اور جس کو موت آئے وہ تو خود عاجز ہوا،" وہی زندہ ہے" لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ: کوئی معبود نہیں اس کے علاوہ فَادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ: پس تم اسی کو پکارا کرو اس حال میں کہ تم خالص کرنے والے ہو اس کے لئے اعتقاد کو، دین کو، اطاعت کو، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو رب العالمین ہے، قُلْ اِنِّيْ نُهِيْتُ: آپ کہہ دیجئے کہ میں منع کر دیا گیا ہوں، اَنْ اَعْبُدَ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: کہ میں عبادت کروں ان کی جن کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، لَمَّا جَآءَنِيَ الْبَيِّنٰتُ مِنْ رَّبِّيْ جب کہ آگئے میرے پاس واضح دلائل میرے رب کی طرف سے۔ بیّنات میرے پاس آگئیں، میرے رب کی طرف سے جب واضح دلائل میرے پاس آگئے تو میں اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی عبادت کس طرح سے کر سکتا ہوں؟" بے شک میں روک دیا گیا ہوں کہ میں عبادت کروں ان کی جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے علاوہ جب پہنچ گئیں میرے پاس بیّنات میرے رب کی جانب سے" وَاُمِرْتُ اَنْ اُسْلِمَ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: اور میں حکم دیا گیا ہوں کہ میں فرماں بردار ہو جاؤں رب العالمین کے لئے۔ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ تُرَابٍ وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا مٹی سے، ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ: پھر نطفے سے، ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ: پھر جمے ہوئے خون سے، ثُمَّ يُخْرِجُكُمْ طِفْلًا پھر وہی نکالتا ہے تمہیں بچے بنا کر۔ طفل: بچے کو کہتے ہیں، یہاں اَطفال کے معنی میں ہے (مظہری)، چھوٹے چھوٹے بچوں کی شکل میں تمہیں نکالتا ہے۔ ثُمَّ لِتَبْلُغُوْا اَشُدَّكُمْ: پھر تمہیں مہلت دیتا ہے تا کہ تم پہنچ جاؤ اپنی جوانی کو، قوت اور طاقت کی انتہا کو پہنچ جاؤ۔ ثُمَّ

لِتَكُوْنُوْا شُيُوْخًا: پھر اور تمہیں مہلت دیتا ہے تا کہ تم بوڑھے ہو جاؤ، وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى مِنْ قَبْلُ: اور تم میں سے بعض وہ ہیں جو اس سے قبل ہی وفات پا جاتے ہیں، جوان ہونے سے قبل، بوڑھے ہونے سے قبل، وَلِتَبْلُغُوْا اَجَلًا مُّسَمًّى: اور اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے تمہیں تا کہ تم پہنچ جاؤ اپنے ایک وقت معین کو، وَلَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تا کہ تم عقل حاصل کرو، یعنی اس چیز کو دیکھو، دیکھنے کے بعد سوچو سمجھو اور اللہ کی قدرت کو سمجھنے کے بعد اس کی توحید کو اختیار کرو۔

ہر اِنسان کی اِبتدا مٹی سے کیسے ہے؟

''مٹی سے پیدا کرتا ہے'' یا تو یہ آدم علیہ السلام کی طرف اشارہ ہے جو براہِ راست مٹی سے بنائے گئے، اور آگے نسل نطفے سے چلائی گئی، اور نطفہ پھر جما ہوا خون بنتا ہے، پھر گوشت بنتا ہے، پھر اس میں ہڈیاں پیدا ہوتی ہیں، جس طرح سے سورۂ مؤمنون کے اندر اس کی تفصیل آئی تھی۔ اور یا یہ ہے کہ آج بھی ہماری ابتدائی منزل مٹی ہی ہے، مٹی سے ہی ہمارا وجود اُٹھتا ہے، مٹی سے غذائیں پیدا ہوتی ہیں، وہ غذائیں ہم کھاتے ہیں، اسی سے خون بنتا ہے، اسی سے آگے نطفہ بنتا ہے، اسی سے آگے پھر نسل چلتی ہے، تو اِبتدا آج بھی مٹی سے ہی ہے۔ یعنی آدم علیہ السلام کی وساطت سے بھی ہم براہِ راست مٹی سے بنے، اور آج غذا کی وساطت سے بھی ہم مٹی ہی سے ہی بنتے ہیں، غذا کھاتے ہیں تو اسی سے ہی نطفہ تیار ہوتا ہے، اسی سے پھر آگے نسل چلتی ہے، پہلی منزل مٹی ہے، پھر نطفہ ہے، پھر نطفے کے بعد یہ جو تغیرات آتے ہیں کہ جما ہوا خون ہے، پھر جب پیدا ہوتے ہیں چھوٹے سے بچے کی شکل میں تو نہ کوئی عقل نہ کوئی صلاحیت اور نہ اس میں کوئی قوت نہ شدت، پھر اللہ تعالیٰ مہلت دیتا ہے جس کے بعد جوانی آتی ہے، بڑھاپا آتا ہے، اور کسی کو اس سے قبل ہی وفات دے دی جاتی ہے، ''اور اللہ تعالیٰ تمہیں مہلت دیتے ہیں تا کہ تم اپنے اجل مسمّٰی، وقتِ معین کو پہنچ جاؤ'' جتنا وقت اللہ نے کسی کے لئے متعین کیا ہے۔ ''اور تا کہ تم عقل حاصل کرو۔''

اِثباتِ معاد کے لئے تخلیقِ اَوّل کا ذِکر

هُوَ الَّذِيْ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: وہی ہے جو زندگی دیتا ہے اور وہی ہے جو موت دیتا ہے۔ فَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا جس وقت فیصلہ کرتا ہے وہ کسی امر کا تو اس کو کوئی زیادہ اہتمام نہیں کرنا پڑتا، فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ سوائے اس کے نہیں کہ اسے کہہ دیتا ہے: ہو جا! پس وہ ہو جاتا ہے، اللہ کی قدرت كُنْ فَيَكُوْنِي ہے، اس کو کسی اہتمام کی ضرورت نہیں، تو جب پہلے اس نے تمہیں مٹی سے بنایا تو اب تم یہ اِشکال کرتے ہو کہ ءَاِذَا كُنَّا تُرٰبًا کہ جب ہم مٹی بن جائیں گے تو کیا دوبارہ اُٹھیں گے؟ تو پہلے تم کسی چیز سے بنے تھے؟ پہلے بھی تو مٹی سے ہی بنے تھے۔ مشرکین اِشکال یہی کرتے تھے نا، کہ جس وقت ہم عظاماً و تراباً ہو جائیں گے، ہڈیاں بن جائیں گے، مٹی بن جائیں گے، مٹی میں خلط ملط ہو جائیں گے، تو پھر کون ہمیں اُٹھائے گا؟ تو اللہ تعالیٰ بتاتا ہے کہ تمہیں پہلے بھی تو مٹی سے ہی اُٹھایا ہے، اس لئے یہ کون سی نئی بات ہے جو تم کہہ رہے ہو، جس نے پہلے تمہیں مٹی سے بنایا وہی دوبارہ بنا لے گا۔

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِ اللّٰهِ ؕ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ ۚ (۶۹) الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا

کیا آپ دیکھتے نہیں ان لوگوں کی طرف جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑے ڈالتے ہیں، وہ کہاں پھیرے جا رہے ہیں (۶۹) جو لوگ جھٹلاتے

بِالْكِتٰبِ وَبِمَاۤ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا ۛ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۙ (۷۰) اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْۤ

ہیں کتاب کو اور اس چیز کو جس کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا، ان کو عنقریب پتا چل جائے گا (۷۰) جب کہ طوق ان کی

اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ ؕ يُسْحَبُوْنَ ۙ (۷۱) فِي الْحَمِيْمِ ۙ ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ ۚ (۷۲) ثُمَّ

گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں، گھسیٹے جائیں گے (۷۱) گرم پانی میں، پھر جہنم میں جھونک دیئے جائیں گے (۷۲) پھر

قِيْلَ لَهُمْ اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ۙ (۷۳) مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا بَلْ

ان سے کہا جائے گا: کہاں ہیں وہ چیزیں جن کو تم شریک ٹھہرایا کرتے تھے (۷۳) اللہ کے علاوہ؟ وہ کہیں گے: وہ سب چیزیں ہم سے گم ہوگئیں، بلکہ

لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْـًٔا ؕ كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ (۷۴) ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

اس سے قبل ہم کسی چیز کو بھی نہیں پکارتے تھے، اسی طرح سے اللہ کافروں کو بھٹکاتا ہے (۷۴) یہ اس سبب سے ہے کہ تم

تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ ۚ (۷۵) اُدْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ

زمین میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور تم اکڑتے تھے (۷۵) داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ (۷۶) فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ۚ

اس حال میں کہ تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو، بُرا ٹھکانا ہے تکبّر کرنے والوں کا (۷۶) آپ صبر کیجئے، اللہ کا وعدہ سچا ہے

فَاِمَّا نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِيْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا يُرْجَعُوْنَ (۷۷)

اگر دکھلا دیں ہم آپ کو بعض اس چیز کا جو ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں، یا ہم آپ کو وفات دے دیں، تو وہ ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے (۷۷)

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ وَمِنْهُمْ مَّنْ

البتہ تحقیق بھیجا ہم نے بہت سے رسولوں کو آپ سے قبل، ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا بیان ہم نے آپ پر کر دیا، اور ان میں سے بعض وہ بھی

لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ ؕ وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۚ فَاِذَا

ہیں جو ہم نے آپ پر بیان نہیں کئے، اور کسی رسول کے لئے نہیں تھا کہ وہ کوئی معجزہ لے آئے مگر اللہ کی اجازت کے ساتھ، جب

جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۷۸﴾

اللہ کا حکم آجاتا ہے تو حق کے مطابق فیصلہ کر دیا جاتا ہے، اس موقع پر باطل پرست خسارے میں پڑ جاتے ہیں ﴿۷۸﴾

تفسیر

حق کے بارے میں جھگڑنے والوں کا انجام

اَلَمْ تَرَ اِلَى الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِ اللّٰهِ: کیا آپ دیکھتے نہیں ان لوگوں کی طرف جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑے ڈالتے ہیں۔ جھگڑے یہی معاد کے بارے میں بھی اور توحید کے بارے میں بھی۔ اَنّٰى يُصْرَفُوْنَ: وہ کہاں پھیرے جا رہے ہیں؟ اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِالْكِتٰبِ: وہ لوگ جنہوں نے کتاب کو جھٹلایا، وَبِمَآ اَرْسَلْنَا بِهٖ رُسُلَنَا: اور ان باتوں کو جھٹلایا جن کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا، فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ: عنقریب اِن کو پتا چل جائے گا، ان کی تکذیب کا نتیجہ ان کے سامنے آجائے گا۔ ''جو لوگ جھٹلاتے ہیں'' اَلَّذِيْنَ کے بعد جو كَذَّبُوْا ہے اس میں مضارع والا ترجمہ بھی کیا جاسکتا ہے، ''جو لوگ جھٹلاتے ہیں کتاب کو اور اس چیز کو جس کے ساتھ ہم نے اپنے رسولوں کو بھیجا'' جو خیالات جو نظریات دے کر بھیجا، فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ: ان کو عنقریب پتا چل جائے گا، اِذِ الْاَغْلٰلُ فِيْٓ اَعْنَاقِهِمْ وَالسَّلٰسِلُ: جبکہ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں۔ اَغلال کا لفظ سورۂ یٰسٓ میں آیا تھا، یہ غُلٌّ کی جمع ہے، غل طوق کو کہتے ہیں جو گلے میں ڈالا جاتا ہے۔ سلاسل: سِلْسِلَةٌ کی جمع ہے، زنجیریں۔ طوق ان کی گردنوں میں ہوں گے اور زنجیریں ان کے ہاتھ پاؤں میں ہوں گی، زنجیروں میں کسے ہوئے ہوں گے۔ يُسْحَبُوْنَ: گھسیٹے جائیں گے، فِي الْحَمِيْمِ: گرم پانی میں، ثُمَّ فِي النَّارِ يُسْجَرُوْنَ: پھر جہنم میں جھونک دیے جائیں گے، یعنی کبھی اُن کو گھسیٹ کے گرم پانی کی طرف لائیں گے، کبھی براہِ راست آگ میں ڈال دیں گے۔

قیامت کے دِن معبودانِ باطلہ کا ''لاشئ محض'' ہونا نمایاں ہوجائے گا

ثُمَّ قِيْلَ لَهُمْ: پھر ان سے کہا جائے گا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۷۳﴾ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ: کہاں ہیں وہ چیزیں جن کو تم شریک ٹھہرایا کرتے تھے اللہ کے علاوہ؟ قَالُوْا ضَلُّوْا عَنَّا: وہ کہیں گے وہ سب چیزیں ہم سے گم ہوگئیں، بَلْ لَّمْ نَكُنْ نَّدْعُوْا مِنْ قَبْلُ شَيْئًا: بلکہ اس سے قبل ہم کسی چیز کو بھی نہیں پکارتے تھے، اس میں شرک کا انکار کرنا مقصود نہیں ہے کہ ہم شرک نہیں کرتے تھے، بلکہ ان کا مطلب یہ ہے کہ اب پتا چل گیا کہ جن کو ہم پکارتے تھے وہ تو لاشئ محض تھے، وہ تو کچھ بھی نہیں تھے، تو اب ہم کہہ سکتے ہیں کہ گویا کہ ہم کسی چیز کو بھی نہیں پکارتے تھے، ان کا لاشئ محض ہونا نمایاں ہوگیا (نسفی)، جس طرح سے آپ کسی چیز کو اپنے واہمہ کے طور پر تخلیق کر کے اس کو اپنا معبود بنالیں، لیکن جب حقیقت سامنے آئے گی تو آپ سمجھیں گے کہ یہ تو کوئی شئے ہی نہیں تھی جس کو میں پوج رہا تھا، ایسے ہی

بات تھی جس کے دھوکے میں میں آیا ہوا تھا، آپ ایک آدمی کو اچھا سمجھ کے اس کے پیچھے لگ جاتے ہیں، بعد میں جب اس کی بُرائی ظاہر ہوتی ہے تو کہتے ہیں کہ یار! وہ تو کچھ نہیں نکلا، لاشیٔ محض تھا۔ تو یہاں وہی بات ہے کہ اب ہمیں پتا چل گیا کہ ہم تو کسی شیئے کو بھی نہیں پکار رہے تھے، وہ شیئے ہی کوئی نہیں تھی، اُن کا کوئی وجود ہی نہیں تھا جن کو ہم پکار رہے تھے، اب یہ حسرت نمایاں کریں گے، كَذٰلِكَ يُضِلُّ اللّٰهُ الْكٰفِرِيْنَ: اسی طرح سے اللہ کافروں کو بھٹکاتا ہے۔

''فرح'' اور ''مرح'' کا مفہوم

ذٰلِكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَفْرَحُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَمْرَحُوْنَ: یہ اس وقت تمہیں جو سزا ہو رہی ہے یہ اس سبب سے ہے کہ تم زمین میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور تم اَکڑتے تھے، اِتراتے تھے۔ فرح: خوش ہونا۔ مرح: اِترانا جس میں دوسروں کی تحقیر بھی ہوتی ہے۔ فرح دو قسم کی ہے، ایک ہے فرحِ بطر، اور ایک ہے فرحِ شکر۔ فرحِ شکر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کوئی نعمت حاصل ہوئی، اور آپ اس کی نسبت اللہ کی طرف کر کے خوش ہوں کہ اللہ نے ہمیں یہ دے دی، یہ فرح مطلوب ہے۔ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا (سورۂ یونس: ۵۸) جس طرح سے وہاں آیا تھا کہ اس نعمت کے حاصل ہونے پر خوشیاں مناؤ، یہ خوشی ہے اللہ کی طرف نعمت کی نسبت کرنے کے بعد، کہ اللہ نے ہمیں یہ چیز دے دی، یہ خوشی شکر کی خوشی ہے، یہ مطلوب ہے۔ اور ایک فرحِ بطر ہے کہ کوئی نعمت حاصل ہوگئی، اس کو اِنسان سمجھے کہ میں نے اپنی قابلیت سے کمالی، اور اللہ کی طرف اس کی نسبت بھی نہیں کرتا، اور لذتیں اُڑاتا ہے، عیش پرستی کرتا ہے، یہ فرحِ بطر ہے۔ اس لئے یہاں فرح کے ساتھ بِغَيْرِ الْحَقِّ کی قید لگادی، تم دنیا کے اندر ناحق خوشیاں منایا کرتے تھے۔ اور مرح اَکڑنے اور اِترانے کو کہتے ہیں، یہ تو بہرحال مذموم ہے، اس لئے یہاں بِغَيْرِ الْحَقِّ کی قید نہیں لگائی۔ ''یہ اس سبب سے ہوا کہ تم زمین میں ناحق خوشیاں مناتے تھے اور تم اکڑا کرتے تھے'' اُدْخُلُوْۤا اَبْوَابَ جَهَنَّمَ: داخل ہو جاؤ جہنم کے دروازوں میں، خٰلِدِيْنَ فِيْهَا: اس حال میں کہ تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہو، فَبِئْسَ مَثْوَى الْمُتَكَبِّرِيْنَ: بُرا ٹھکانا ہے تکبر کرنے والوں کا۔ تکبر ہی اصل میں اُمّ الخبائث ہے جس کی بنا پر انسان حق کے قبول کرنے سے رُکتا ہے۔ اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، اپنی بڑائی ذہن میں لانا، اور حق بات کو قبول نہ کرنا، اور دوسروں کی تحقیر کرنا، یہی اصل میں بنیاد ہے جس سے انسان بہت سارے مفاسد کے اندر مبتلا ہوتا ہے۔

حضور ﷺ کو تسلی اور مشرکین کو وعید

پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ اِن متکبرین کے مقابلے میں آپ صبر کیجئے، اللہ کا وعدہ سچا ہے، کہ یہ ذلیل وخوار ہو کے رہیں گے اور اللہ تعالیٰ آپ کو اور آپ کے ماننے والوں کو غلبہ دے گا۔ اور یہ ضروری نہیں کہ ان کے اُوپر عذاب یا ان کے اُوپر گرفت آپ کی زندگی میں ہو جائے، زندگی میں بھی ہو سکتی ہے جس طرح سے بدر کے اندر یہ پٹے اور ان کی خوب اچھی طرح تذلیل ہوئی، ان کا تکبر اور ان کا خناس نکلا، لیکن اگر آپ کی زندگی میں ان کو کوئی عذاب نہ پہنچے اور ان پر گرفت نہ ہو تو یہ خیال نہ کرنا کہ یہ چھوٹ جائیں گے، چھوٹیں گے کسی صورت میں بھی نہیں، اگر مصلحت ہوگی تو آپ کی زندگی میں عذاب بھیج دیا جائے گا،

نہیں تو آپ مطمئن رہیں، فَاِمَّا نُرِیَنَّكَ: اِمَّا اصل میں اِن مَا ہے۔ اگر دکھلا دیں ہم آپ کو بَعْضَ الَّذِیْ نَعِدُهُمْ بعض اس چیز کا جو ہم نے ان سے وعدہ کرتے ہیں، جس عذاب کا ہم ان سے وعدہ کرتے ہیں اگر اس کا کچھ حصّہ ہم آپ کو دکھادیں، اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ: یا ہم آپ کو وفات دے دیں، کوئی فرق نہیں پڑتا، فَاِلَیْنَا یُرْجَعُوْنَ: وہ ہماری طرف ہی لوٹائے جائیں گے۔ وہ بہرصورت ہمارے قبضے میں ہیں، چاہے آپ کی زندگی میں ہم کچھ عذاب نمایاں کردیں، چاہے آپ کی وفات ہوجائے اور ان پر عذاب آپ کی زندگی میں نہ آئے، بچ کے کہیں نہیں جاسکتے، یہ پانی گزرنا آخرانہی پلوں کے نیچے سے ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی تعداد قطعی طور پر معلوم نہیں

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ مِنْهُمْ مَّنْ قَصَصْنَا عَلَيْكَ: البتہ تحقیق بھیجا ہم نے بہت سے رسولوں کو آپ سے قبل، ان میں سے بعض وہ ہیں جن کا بیان ہم نے آپ پر کردیا، وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّمْ نَقْصُصْ عَلَيْكَ: اور ان میں سے بعض وہ بھی ہیں جو ہم نے آپ پر بیان نہیں کئے۔ اسی لیے ہمارا عقیدہ یہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام اللہ کی طرف سے بے شمار آئے ہیں جن کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے، جن کے نام ہمارے سامنے قرآن اور حدیث میں ذکر کردیے گئے ہم ان پر بھی ایمان لاتے ہیں، اور جن کے نام ہمارے سامنے ذکر نہیں کئے گئے اور اللہ نے وہ بھیجے ہیں ہم ان کو بھی تسلیم کرتے ہیں، اس لئے نبیوں اور رسولوں کی تعداد متعین کر کے ایمان نہیں لایا جاتا، کیونکہ کسی دلیل قطعی کے ساتھ ثابت نہیں، کہ کتنے نبی آئے اور کتنے رسول آئے، ایک خبرِ واحد ہے، جو ظن کے لئے مفید ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبیوں کا گروہ ایک لاکھ چوبیس ہزار پر مشتمل ہے، اور رسول تین سو تیرہ ہیں۔(1) لیکن وہ روایت اس درجے کی نہیں کہ اس کو عقیدے کی بنیاد بنالیا جائے، اور اس میں کمی وبیشی کو ناجائز قرار دیا جائے، اس لئے ہم اپنے ایمان کا اظہار یونہی کیا کرتے ہیں کہ ''ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم وبیش نبی جو اللہ کی طرف سے آئے ہم سب کو تسلیم کرتے ہیں'' تعداد متعین کر کے ایمان نہیں لایا جایا کرتا، اللہ تعالیٰ نے بعضوں کا ذکر کیا ہے، بعضوں کا ذکر نہیں کیا، اور قرآن وحدیث کے اندر تو بہت کم انبیاء علیہم السلام کا ذکر ہے، بہت کم نام آئے ہیں، زیادہ سے زیادہ بیس پچیس ہوں گے، باقی! تعداد بہت زیادہ ہے۔ ''ان میں سے بعض وہ ہیں جن کو ہم نے آپ پہ بیان کیا ہے اور بعض وہ ہیں کہ جن کو ہم نے آپ پہ بیان نہیں کیا۔''

اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی نبی معجزہ نہیں دِکھا سکتا

وَمَا كَانَ لِرَسُوْلٍ اَنْ يَّاْتِيَ بِاٰيَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ: اور کسی رسول کے لئے نہیں تھا کہ وہ کوئی معجزہ لے آئے مگر اللہ کی اجازت کے ساتھ۔ ان آیتوں میں اشارہ اس طرف ہے کہ مشرکین جب مخالفت کرتے تھے، یا اپنے ایمان لانے کے لئے بعض معجزات دکھانے کا مطالبہ کرتے تھے، تو شاید حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں خیال آتا ہو کہ اللہ تعالیٰ ایسا کوئی معجزہ دکھا ہی دے تاکہ یہ مان جائیں، اس قسم کی کوئی بات سامنے آہی جائے تاکہ یہ ظالم اگر مانتے نہیں تو برباد ہی ہوجائیں، ایسے جذبات دل میں آسکتے ہیں جس کی بنا پر اللہ کہتا

---

(1) مشکوۃ ۲/۵۱۱ باب بدء الخلق وذکر الانبیاء، فصل ثالث۔ مسند احمد، رقم ۲۲۲۸۸، مسند ابی امامہ الباھلی

ہے کہ آپ صبر سے رہیے، برداشت کرتے رہیے، پہلے انبیاء ﷺ کا حال بھی ایسے ہی گزرا ہے، اگر کوئی معجزہ لاتے تھے تو اللہ کی اجازت کے ساتھ ہی آتا تھا، فَإِذَا جَآءَ أَمْرُ اللَّهِ قُضِيَ بِالْحَقِّ: جب اللہ کا حکم آجاتا ہے تو حق کے مطابق فیصلہ کردیا جاتا ہے، وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْمُبْطِلُونَ: اُس موقع پر باطل پرست خسارے میں پڑ جاتے ہیں، جب اللہ کی طرف سے فیصلہ ہوتا ہے تو ان باطل پرستوں کا خسارہ نمایاں ہوجاتا ہے، آپ صبر کے ساتھ ان حالات کو برداشت کرتے جائیے۔

اَللّٰهُ الَّذِیْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۹﴾ وَلَكُمْ

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لیے چوپائے بنائے تاکہ ان میں سے بعض پہ تم سواری کرو، اوران میں سے بعض کو تم کھاتے ہو ﴿۷۹﴾ اور تمہارے لیے

فِیْهَا مَنَافِعُ وَلِتَبْلُغُوْا عَلَیْهَا حَاجَةً فِیْ صُدُوْرِكُمْ وَعَلَیْهَا وَعَلَى الْفُلْكِ

ان چوپایوں میں منافع ہیں، تاکہ تم پہنچ جاؤ ان پر سواری کرکے اس ضرورت تک جو تمہارے دِلوں میں ہے، اوران جانوروں پر اور کشتیوں پر

تُحْمَلُوْنَ ﴿۸۰﴾ وَیُرِیْكُمْ اٰیٰتِهٖ ۖ فَاَیَّ اٰیٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ ﴿۸۱﴾ اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی

تم اُٹھائے جاتے ہو ﴿۸۰﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نشانیاں دِکھاتا ہے، تم اللہ کی نشانیوں میں سے کس نشانی کا انکار کروگے؟ ﴿۸۱﴾ کیا یہ مشرکین چلے پھرے نہیں

الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا كَیْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۭ كَانُوْٓا اَكْثَرَ مِنْهُمْ وَ

زمین میں؟ کہ دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، وہ ان سے تعداد میں بھی زیادہ تھے اور

اَشَدَّ قُوَّةً وَّاٰثَارًا فِی الْاَرْضِ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَلَمَّا

ان سے قوت میں بھی زیادہ تھے اور زمین میں نشانات کے اعتبار سے بھی زیادہ تھے، جو کچھ وہ کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آیا ﴿۸۲﴾ جب

جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا

ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، تو جو علم ان کے پاس تھا وہ اسی پر خوش رہے، اور جس چیز کے ساتھ استہزا کرتے تھے

بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۸۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا

اسی نے ان کو گھیر لیا ﴿۸۳﴾ پھر جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا تو کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے اللہ وحدہٗ پر اور کفر کیا ہم نے ان چیزوں کے ساتھ

بِهٖ مُشْرِكِیْنَ ﴿۸۴﴾ فَلَمْ یَكُ یَنْفَعُهُمْ اِیْمَانُهُمْ لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا ۭ سُنَّتَ اللّٰهِ

جن کو ہم شریک ٹھہراتے تھے اللہ کا ﴿۸۴﴾ پھر ان کے ایمان نے ان کو نفع نہ دیا جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا، یہ اللہ کا جاری کیا ہوا طریقہ ہے

الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ ۚ وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۸۵﴾

جو گزر گیا اللہ کے بندوں میں، ایسے موقع پر کافر خسارے میں پڑ جاتے ہیں ﴿۸۵﴾

تفسیر

دلائلِ قدرت اور اِنعاماتِ الٰہی

اَللّٰهُ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ الْاَنْعَامَ: اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے چوپائے بنائے۔ لِتَرْكَبُوْا مِنْهَا تاکہ ان میں سے بعض پہ تم سواری کرو، وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ اور ان میں سے بعض کو تم کھاتے ہو۔ یہ مضمون بھی پہلے گزر چکا۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَنَافِعُ: اور تمہارے لئے ان چوپایوں میں منافع ہیں۔ بہت منافع ہیں، سواری کے بھی ہیں، کھانے کے بھی ہیں، دُودھ کے بھی ہیں، اُن کے چمڑوں سے ہم فائدہ اُٹھاتے ہیں، بالوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، ہڈیوں آنتڑیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، حتّٰی کہ گوبر، لید سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، ان کا دُودھ پیتے ہیں، دُودھ سے آگے کتنی نعمتیں تیار کرتے ہیں، لسی ہے، مکھن ہے، دہی ہے، پنیر ہے، اور اس سے آگے کتنے مرکبات بنتے ہیں، یہ سب حیوانوں کا فیض ہے جو ہم اُٹھاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے جو جانوروں کو پیدا کیا، ہماری زندگی کے منافع کے اندر ان کا کتنا دخل ہے؟ ''تمہارے لئے اس میں منافع ہیں'' وَلِتَبْلُغُوْا عَلَيْهَا حَاجَةً فِيْ صُدُوْرِكُمْ: تاکہ پہنچ جاؤ تم ان اَنعام پر سواری کر کے اُس ضرورت تک جو تمہارے دلوں میں ہے، تم اپنے دل میں ایک حاجت طے کر لیتے ہو کہ ہم نے فلاں جگہ جانا ہے تو تم جانوروں پر سواری کر کے پہنچتے ہو، ''تاکہ پہنچ جاؤ تم ان جانوروں پر سوار ہو کر اپنی ضرورت کو جو تمہارے دِلوں میں ہے۔'' وَعَلَيْهَا: اور ان جانوروں پر وَعَلَى الْفُلْكِ تُحْمَلُوْنَ اور کشتیوں پر تم اُٹھائے جاتے ہو۔ جانوروں پر بھی چڑھے پھرتے ہو، اور سمندر کے اندر کشتیوں پر بھی چڑھے پھرتے ہو، تو یہ کتنا اللہ کا اِنعام ہے؟ یہ زمین کی جو آبادی ہے، کرہ جو ہے، آپ کو معلوم ہوگا، کبھی اس کا نقشہ دیکھو، یہ تین حصے پانی ہے، تقریباً تہائی حصہ خشکی ہے،(۱) جس کے اُوپر آبادی ہے۔ اور پھر وہ چوتھا حصہ جس کے اوپر آبادی ہے وہ بھی اکٹھا نہیں، وہ بھی ٹکڑے ٹکڑے، علیحدہ علیحدہ، درمیان میں سمندر حائل ہیں، دریا حائل ہیں، ٹکڑے ٹکڑے نمایاں کر دیے۔ اب انسانوں کی ایک دوسرے تک ضروریات ہیں، اگر اللہ تعالیٰ پانی کو ایسا نہ بناتا کہ اس کے اُوپر کشتی چل سکتی، یا لکڑی کو ایسا نہ بناتا کہ وہ پانی کے اُوپر تیر سکتی، یا اللہ تعالیٰ نے دوسرے جو قوانین بنائے ہیں فطری طور پر، کائنات کے اندر اگر یہ نہ ہوتے، تو ایک خطے والے دوسرے خطے تک کس طرح سے پہنچتے؟ یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے پانیوں کو عبور کرنے کی بھی انسان کو صلاحیت دی، خشکی کے میدان عبور کرنے کی بھی انسان کو صلاحیت دی اور آسانیاں میسر فرمائیں، ایک ایک چیز اللہ کی نعمت ہے، ان کو دیکھتے جاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرتے چلے جاؤ۔ وَيُرِيْكُمْ اٰيٰتِهٖ: اللہ تعالیٰ تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، فَاَيَّ اٰيٰتِ اللّٰهِ تُنْكِرُوْنَ: تم اللہ کی نشانیوں میں سے کس نشانی کا انکار کرو گے؟ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی بہت نشانیاں ہیں اور بہت انعامات ہیں۔

---

(۱) تقریباً ۷۰.۸ فیصد پانی، اور ۲۹.۲ فیصد خشکی ہے۔

واقعات بھی اِنسان کے لئے بہت بڑا واعظ ہیں

أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ: کیا یہ مشرکین چلے پھرے نہیں زمین میں؟ فَيَنظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ: پھر دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ: یہ پھر وہی اِبتدا والا مضمون آ گیا، یاد ہوگا! اِبتدا میں بھی اسی قسم کی آیات آئی تھیں، پھر آخر میں یہی تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اگر یہ آیاتِ تنزیلیہ سے نہیں سمجھتے تو یہ ذرا زمین پر چل پھر کے واقعات کی زبان سے سُن لیں، تو ان کو پتا چل جائے گا کہ بدکرداری کے نتائج کیا ہوتے ہیں۔ دیکھو! ایک تو آپ کو دلیل کے ساتھ بتایا جائے کہ "نشے کا انجام اچھا نہیں ہے، اگر کوئی بچہ نشے کا عادی ہو جائے تو وہ دُنیا میں بھی برباد ہو جاتا ہے اور آخرت میں بھی برباد ہوگا" یہ تو علم کے انداز میں ایک بات آپ کے سامنے ذِکر کر دی گئی، ایک یہ ہے کہ تمہیں پکڑا جائے، لے جایا جائے، اور نشے کے مارے ہوئے لوگ تمہیں دِکھائے جائیں کہ دیکھو! یہ خوش حال گھرانے کے تھے، اچھے لوگ تھے، جب ان کو نشے کی عادت پڑی تو نہ ان کی شکل رہی، نہ ان کی عقل رہی، نہ ان کے پاس مال رہا، جائیدادیں برباد کر لیں، دَر دَر دھکے کھاتے پھرتے ہیں، جب ان کا نشہ ٹوٹا ہوتا ہے تو کس طرح سے کتوں کی طرح یہ دَر دَر مانگتے ہوئے پھرتے ہوتے ہیں، کہ کہیں سے کوئی پیسہ ملے تو ہم افیون خرید کر کھائیں، تو یہ انسانوں کا ذلیل ترین طبقہ جب تمہیں آنکھوں سے دکھایا جائے، مختلف جگہ جو بھنگی چرسی پڑے ہوئے ہوتے ہیں، دِکھا کے کہا جائے کہ دیکھو ان کو، دیکھ کے عبرت حاصل کرو، یہ نتیجہ ہے نشہ خوری کا، تو آپ جانتے ہیں کہ یہ بھی ایک بہت بڑا واعظ ہے، واقعات کو دیکھنا اور واقعات کو دیکھ کے یہ سمجھنا کہ دیکھو! بُرے عمل کا کیسا بُرا نتیجہ نکلا، یہ بھی انسان کی طبیعت کے اُوپر اثر انداز ہوتا ہے۔ ایسے ہی بداخلاقی کے واقعات ہیں، ایسی مثالیں آپ کے سامنے ہوں گی کہ جن لوگوں کو چکلوں میں جانے کی عادت پڑ گئی، کس طرح سے وہ جائیدادیں برباد کر بیٹھے، یا جن جوانوں کو اور کوئی بُری عادت پڑ جاتی ہے، تو وہ کس طرح سے اپنی صحت کو برباد کر لیتے ہیں؟ کس طرح اپنی عزت کو برباد کر لیتے ہیں؟ تو ایک تو یہ ہے کہ ان چیزوں کی بُرائی علمی دلائل کے ساتھ آپ کے ذہن میں اُتاری جائے، اور ایک ہے کہ یہ واقعات دکھا دیے جائیں کہ دیکھو! فلاں شخص یہ تھا، اس نے یہ بُری عادت اختیار کی، نتیجہ یہ نکلا، یہ بھی بہت مؤثر ہوتی ہے۔ اس لئے دُنیا کے اندر چلنا پھرنا اور قوموں کے حالات کو دیکھنا، ان کی بربادی کے نشانات دیکھ کے یہ سمجھنا، کہ دیکھو! اللہ کی قدرت جس وقت کسی کو فنا کرنے لگے تو قوت و طاقت والے بھی اس طرح سے اڑ جاتے ہیں جس طرح سے گرد و غبار اُڑتی ہے، تو اس سے بھی انسان کے ذہن کے اُوپر ایک اثر پڑتا ہے، تو اللہ تعالیٰ اِدھر متوجہ کرتے ہیں کہ اگر ان کو یہ آیاتِ تنزیلیہ سے سمجھ میں نہیں آتی، تو کیا یہ زمین میں چل پھر کے واقعات نہیں دیکھ سکتے؟ کہ ان کو عقل آ جائے "کیا یہ چلے پھرے نہیں؟ کہ دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے ہیں" كَانُوا أَكْثَرَ مِنْهُمْ: وہ ان سے تعداد میں بھی زیادہ تھے، وَأَشَدَّ قُوَّةً: اور ان سے قوت میں بھی زیادہ تھے، وَآثَارًا فِي الْأَرْضِ: اور زمین میں نشانات کے اعتبار سے بھی زیادہ تھے، بعینہٖ اسی طرح کے لفظ پہلے اسی سورت میں گزر چکے ہیں۔ اُن کے نشانات ان کی علامات زمین میں بہت نمایاں ہیں، بڑے بڑے قلعے، بڑے بڑے محلات، بڑے بڑے مقبرے، جا کے دیکھو! کیا کیا ان کی یادگاریں کھڑی ہیں۔ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ: جو کچھ وہ

کرتے تھے وہ ان کے کچھ کام نہ آیا، جب اللہ تعالیٰ کے عذاب کا جھاڑو آیا تو ان کے قلعے قُلعے یوں ہی صاف ہو گئے جس طرح سے گھر کے اندر عورتیں جھاڑو کے ساتھ مکڑی کے جالے کو صاف کر دیتی ہیں، ایک ہی حرکت کے اندر سارا سمیٹا جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ کے سامنے ان کے بروجِ مشیدہ اور یہ بڑے بڑے قلعے کیا رُکاوٹ پیدا کر سکتے ہیں؟'' جو کچھ انہوں نے کیا تھا، جو کچھ وہ کرتے تھے ان کے کچھ کام نہ آیا۔''

دُنیوی علوم کی وجہ سے اِنسان اور حیوان میں اِمتیاز نہیں ہو سکتا

فَلَمَّا جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ: جب ان کے پاس ان کے رسول آئے واضح دلائل لے کر، فَرِحُوْا بِمَا عِنْدَهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ، یہ دیکھو! بات سمجھنے کی ہے، رسول جس وقت ان کے پاس واضح دلائل لے کر آئے تو جو علم ان کے پاس تھا وہ اسی پر خوش رہے۔ ان کے پاس علم کون سا تھا؟ علم معاش، کہ کمایا کس طرح سے جاتا ہے؟ کھایا کس طرح سے جاتا ہے؟ انبیاء ﷺ کے علوم کے بغیر دُنیا میں جتنے علوم ہیں سب کا حاصل یہی ہے کہ کمایا کس طرح سے جاتا ہے؟ کھایا کس طرح سے جاتا ہے؟ منہ سے ڈالنا کس طرح سے ہے؟ اور نیچے سے نکالنا کس طرح سے ہے؟ سارے کا سارا حاصل اتنا ہی ہے، اور کیا ہے! یعنی انسان کی ساری کوشش اور انسان کا سارے کا سارا علم صرف یہاں سے لے کر یہاں تک سفر کرانے کے لئے ہے۔ تو علم معاش کا حاصل یہی ہے کہ انسان کھانے کے لئے کمائے، اور کھانے کے بعد جو نتیجہ ہے وہ آپ کے سامنے ہے۔ جس طرح سے ہمارے مولانا غلام غوث ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے، کہ جو اِنسان اللہ سے غافل ہے وہ تو پاخانہ بنانے کی ایک مشین ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو جو پاکیزہ، صاف ستھری، خوشبودار ہوتی ہیں، کھاتا جائے اور بدبودار کر کے پھینکتا چلا جائے، یہ قدرتی کھاد فیکٹریاں ہیں، اس سے زیادہ انسان کی زندگی کا کیا حاصل ہے؟ تو جو علم ان کے پاس ہے وہ علمِ معاش ہے، جس کو سورۂ رُوم کے اندر کہا تھا: يَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، اچھا مکان بنالیا، اچھا لباس لے لیا، کھانے کے لئے مختلف چیزیں مہیا کرلیں۔ اور یہ حیوانیت سے آگے تجاوز نہیں ہے، دُنیا کے اندر جتنے بھی حیوان ہیں، وہ اپنے کھانے کی فکر کرتے ہیں، اپنے رہنے کی فکر کرتے ہیں، کوئی اپنا بل کھودتا ہے، کوئی گھونسلا بناتا ہے، کوئی کسی صورت میں اپنے رہنے کی جگہ بناتا ہے، نَر اور مادّہ کا آپس میں میلان ہے، بچوں کے ساتھ شفقت ہے، کون سی چیز ایسی ہے جو باقی حیوانات میں نہیں پائی جاتی؟ تو اگر اِنسان کے علم کا منتہا یہی ہے تو اس میں اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ اللہ تعالیٰ نے عام حیوانوں سے آپ کو جو ناطق بنا کر ممتاز کیا ہے، دریابندۂ معقولات، کہ آپ عقل سے بھی کام لو اور انجام کو بھی سوچو، جو انسان انجام کو نہیں سوچتا وہ حیوان سے آگے نہیں ہے، حیوان بھی انجام کو نہیں سوچتا، انسان بھی انجام نہیں سوچتا، تو جو علم ان کے پاس تھا جس کو ہم ''علمِ معاش'' کہتے ہیں وہ اسی پر ہی خوش، اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے علوم زیادہ اچھے ہیں بمقابلہ ان علوم کے جو انبیاء ﷺ لے کے آئے۔

پُرانی بیماری آج بھی موجود ہے

اور آج بھی یہی بیماری ہے، آج قرآن اور حدیث کے مقابلے میں لوگ سائنس پر اور اپنے دوسرے علوم پر اس طرح

سے مطمئن ہیں، کہ انبیاء ﷺ کے علوم کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے، یہی بیماری پُرانے لوگوں میں تھی۔ ''جب آئے رسول ان کے پاس واضح دلائل لے کر تو خوش ہوگئے اسی چیز پر جو ان کے پاس تھی علم سے''، مِّنَ الْعِلْمِ یہ ما کا بیان ہے، جو علم ان کے پاس تھا وہ اسی پر خوش رہے، وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: يَسْتَهْزِءُوْنَ سے اس بات کی طرف اشارہ ہوگیا کہ وہ انبیاء ﷺ کے علوم کا مذاق اُڑاتے تھے، جو کچھ انبیاء ﷺ ان کے سامنے ذکر کرتے تھے، وہ اِستہزا کرتے تھے۔ تو جس چیز کے ساتھ اِستہزا کرتے تھے، اسی نے ان کو گھیر لیا۔ فَلَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا: پھر جب انہوں نے دیکھا ہمارا عذاب، پھر لگے چیخ و پکار کرنے، قَالُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗ وَكَفَرْنَا بِمَا كُنَّا بِهٖ مُشْرِكِيْنَ: جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھا کہنے لگے کہ ہم ایمان لے آئے اللہ وحدہٗ پر، اور کُفر کیا ہم نے ان چیزں کے ساتھ جن کو ہم شریک ٹھہراتے تھے اللہ کا، جن کو ہم اللہ کا شریک ٹھہراتے تھے، جن پہ ہم اعتماد کرتے تھے، ان سب کا ہم انکار کرتے ہیں۔

اِیمان لانا کب نافع نہیں؟

فَلَمْ يَكُ يَنْفَعُهُمْ اِيْمَانُهُمْ: پھر ان کے ایمان نے ان کو نفع نہ دیا، لَمَّا رَاَوْا بَاْسَنَا: جب انہوں نے ہمارا عذاب دیکھ لیا۔ یہ مسئلہ آپ کے سامنے آچکا ہے کہ عذابِ آخرت منکشف ہونے کے بعد پھر ایمان لانا نافع نہیں ہے، فرعون کا پڑھا ہوا کلمہ فرعون کے کام نہ آیا، اسی طرح سے جب عالمِ آخرت منکشف ہوجاتا ہے، اس وقت اگر کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو ایمان کا کوئی فائدہ نہیں، سُنَّتَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ فِيْ عِبَادِهٖ: یہ اللہ کا جاری کیا ہوا طریقہ ہے جو گزر گیا اللہ کے بندوں میں، وَخَسِرَ هُنَالِكَ الْكٰفِرُوْنَ ایسے موقع پر کافر خسارے میں پڑجاتے ہیں، جو عالمِ آخرت کو دیکھنے کے بعد اِیمان لاتے ہیں وہ کافر ہی رہتے ہیں، اور ان کا خسارہ نمایاں ہوتا ہے، باقی! اس وقت کا ایمان کسی کام نہیں آیا کرتا، سمجھنا ہے تو اَب سمجھ لو!

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُورَةُ حم السَّجْدَةِ

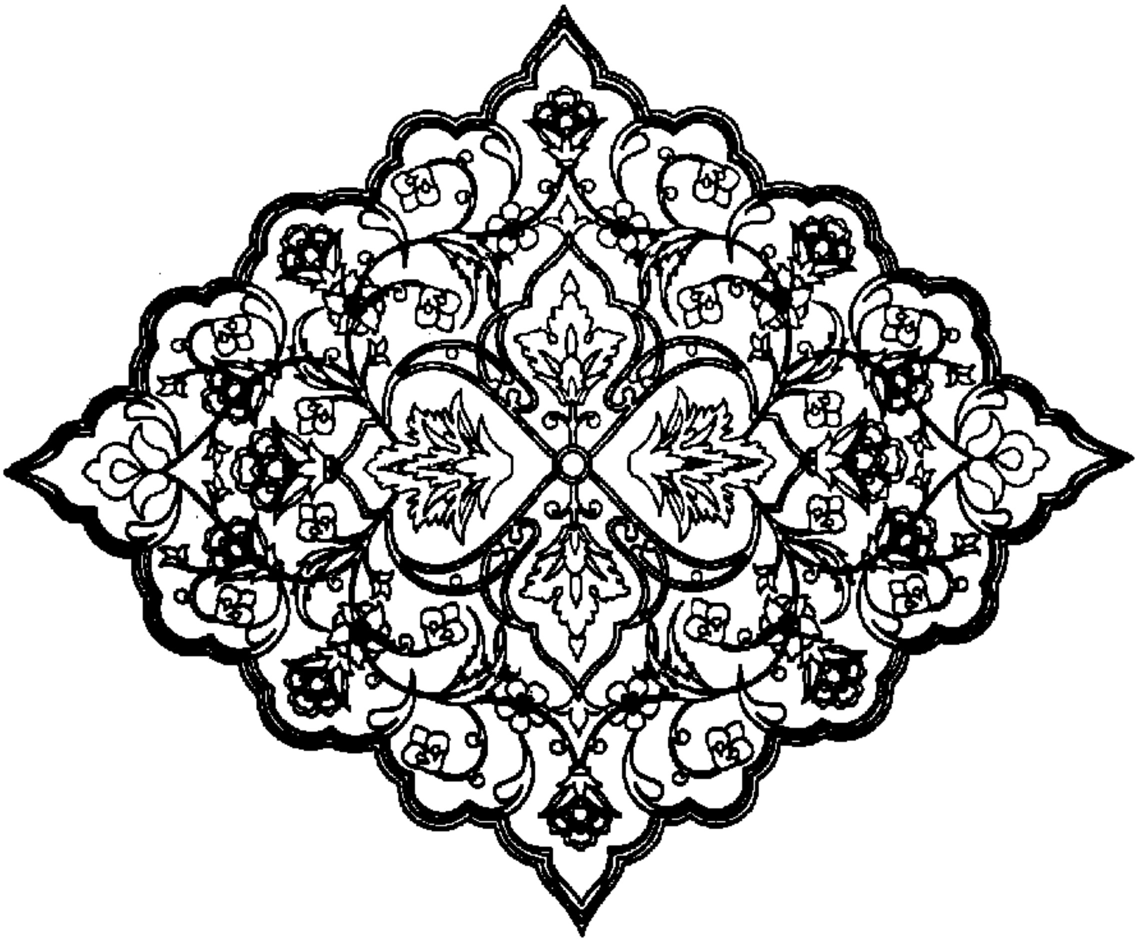

آیاتها ۵۴ ۴۱ سورۃ حٰم السجدۃ مکیۃ ۶۱ رکوعاتها ۶

سورۂ حٰمٓ سجدہ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی چوّن آیتیں ہیں، چھ رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

حٰمٓ ۞ تَنۡزِیۡلٌ مِّنَ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ ۞ کِتٰبٌ فُصِّلَتۡ اٰیٰتُہٗ

حٰمٓ ① یہ باتیں رحمٰن ورحیم کی طرف سے اُتاری ہوئی ہیں ② یہ کتاب، اس کی آیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، اس حال میں

قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّقَوۡمٍ یَّعۡلَمُوۡنَ ۞ بَشِیۡرًا وَّنَذِیۡرًا ۚ فَاَعۡرَضَ اَکۡثَرُہُمۡ

کہ یہ عربی قرآن ہے ان لوگوں کے نفع کے لیے جو علم رکھتے ہیں ③ اس حال میں کہ بشارت دینے والا اور ڈرانے والا ہے، پھر اعراض کیا ان میں سے اکثر نے

فَہُمۡ لَا یَسۡمَعُوۡنَ ۞ وَقَالُوۡا قُلُوۡبُنَا فِیۡۤ اَکِنَّۃٍ مِّمَّا تَدۡعُوۡنَاۤ اِلَیۡہِ وَفِیۡۤ اٰذَانِنَا وَقۡرٌ

پس وہ سنتے ہی نہیں ④ اور وہ کہتے ہیں کہ ہمارے دل پردوں میں ہیں اس چیز سے جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے، اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے

وَّمِنۡۢ بَیۡنِنَا وَبَیۡنِکَ حِجَابٌ فَاعۡمَلۡ اِنَّنَا عٰمِلُوۡنَ ۞ قُلۡ اِنَّمَاۤ اَنَا بَشَرٌ مِّثۡلُکُمۡ

اور ہمارے اور تیرے درمیان پردہ ہے، پس تُو کام کر، ہم بھی کام کرنے والے ہیں ⑤ آپ کہہ دیجئے اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہوں،

یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اَنَّمَاۤ اِلٰـہُکُمۡ اِلٰہٌ وَّاحِدٌ فَاسۡتَقِیۡمُوۡۤا اِلَیۡہِ وَاسۡتَغۡفِرُوۡہُ ؕ

میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، پس تم اس کی طرف سیدھے ہو جاؤ اور اس سے معافی مانگو

وَوَیۡلٌ لِّلۡمُشۡرِکِیۡنَ ۞ الَّذِیۡنَ لَا یُؤۡتُوۡنَ الزَّکٰوۃَ وَہُمۡ بِالۡاٰخِرَۃِ ہُمۡ کٰفِرُوۡنَ ۞ اِنَّ

اور مشرکوں کے لئے خرابی ہے ⑥ جو زکوۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں ⑦ بے شک

الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَہُمۡ اَجۡرٌ غَیۡرُ مَمۡنُوۡنٍ ۞ ع

وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے اجر ہے جو ختم نہیں ہوگا ⑧

***

تفسیر

سورت کا تعارف اور مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورہ حٰم سجدہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی چوّن آیتیں ہیں، چھ رُکوع ہیں۔ پچھلی سورت بھی حٰمٓ سے شروع ہوئی تھی، اور یہ سات سورتیں ہیں جن کے شروع میں لفظ حٰمٓ آیا ہوا ہے، اور انہی کو ''حوامیم'' کہا جاتا ہے، لباب القرآن (قرآنِ کریم کا خلاصہ)، قرآنِ کریم میں بیان کردہ مضامین بہت اچھے اور سہل انداز سے، تفصیل کے ساتھ ان سورتوں میں بیان کردیئے گئے ہیں، چونکہ یہ ساری سورتیں ہی حٰمٓ سے شروع ہوتی ہیں تو اس لئے فرق کرنے کے لئے کسی نام کا ساتھ اضافہ کردیا جاتا ہے، پچھلی سورت حٰمٓ المؤمن تھی اور یہ حٰمٓ السجدۃ ہے، تو حٰمٓ کا لفظ ابتدا سے لے لیا گیا، اور چونکہ اس میں ایک آیت سجدے کی آرہی ہے، اور باقی حٰمٓ سورتیں جتنی ہیں ان میں کوئی آیت سجدہ نہیں، اس لئے اس کو حٰمٓ السجدۃ کے ساتھ تعبیر کردیا جاتا ہے، یا بعض روایات میں اس کا نام حٰمٓ فُصِّلَتْ کے ساتھ بھی ذکر کیا گیا ہے، چونکہ شروع کے اندر اس میں لفظ فُصِّلَتْ بھی آیا ہوا ہے، سورتوں کے درمیان فرق کرنے کے لئے یہ اضافہ ہے۔ باقی! مضامین اس میں ویسے ہی ہیں جس طرح سے ''مکی'' سورتوں میں ہوا کرتے ہیں، اور ملتی جلتی باتیں ہیں۔

عظمتِ قرآن

حٰمٓ: یہ حروفِ مقطعات ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ۔ تَنْزِيْلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ: جس طرح سے پچھلی سورت قرآنِ کریم کے تذکرے سے شروع کی گئی تھی اسی طرح سے یہ بھی قرآنِ کریم کے تذکرے سے شروع کی گئی ہے، اگر اس کتاب کو اللہ کی کتاب مان لیا جائے تو اس میں بیان کردہ ساری باتیں ماننی آسان ہوجائیں گی، پھر رسالت کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے اور توحید کا مسئلہ بھی حل ہوجاتا ہے اور آخرت کا معاملہ بھی سمجھ میں آجاتا ہے، اگر اس بات پر عقیدہ پکا ہوجائے کہ یہ جو کچھ ہے اللہ کی طرف سے اُتارا ہوا ہے، یہ اللہ کی باتیں ہیں، پھر کسی بات میں اِشکال نہیں ہوگا، اس لئے بنیاد اسی مضمون سے اُٹھائی جاتی ہے۔ تَنْزِيْلٌ یہ مصدر ہے هٰذَا مُنَزَّلٌ مِّنَ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، یوں ہوجائے گی بات، تنزیل مصدر اسم مفعول کے معنی میں ہوجائے گا، ''یہ باتیں رحمٰن ورحیم کی طرف سے اُتاری ہوئی ہیں۔''

لفظِ ''رحمٰن ورحیم'' کے ذِکر کا مقصد

رحمٰن رحیم ان دو لفظوں کو بار بار دوہرایا جاتا ہے، جیسے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، رحمٰن اور رحیم کے درمیان فرق جس طرح سے آپ عام کتابوں میں پڑھتے رہتے ہیں، کہ رحمٰن کے اندر رحمت کا مبالغہ زیادہ ہے، اور رحیم کا لفظ بھی رحمت سے لیا گیا ہے، رحمٰن الدنیا والاٰخرۃ، رحیم الاٰخرۃ یا رحیم الدنیا، فرق کرنے کے لئے کہہ دیا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت کی وسعت کو بیان کرنے کے لئے کہ دُنیا میں بھی اس کی رحمت ہے اور آخرت میں بھی، یہ لفظ بڑھائے جاتے ہیں، اور ان لفظوں کو ذکر کرکے

اشارہ اس بات کی طرف کرنا مقصود ہے کہ جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے اُتارا گیا یہ سراپا رحمت ہے، اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ تمہیں یہ ہدایات دی جارہی ہیں، تو جس وقت کسی شخص کو شفقت اور رحمت کے تقاضے سے کوئی بات بتائی جائے تو اس کی طبیعت میں قبول کرنے کا تقاضا ہوتا ہے، دشمن کی بات نہیں کوئی مانا کرتا، مخالف کی بات نہیں کوئی مانا کرتا، لیکن اپنے مہربان کی تو ماننی چاہیے۔ جیسے کہ عزیز اور حکیم کا لفظ بڑھایا جائے تو وہ بھی ایک قسم کی قبولیت کی طرف ترغیب ہے، زبردست کی بات ہے اس کی مخالفت نہ کرنا، اور یہ حکمت والے کی بات ہے اس کو کہیں اپنی عقل کے خلاف یا اپنے علم اور حکمت کے خلاف سمجھ کے نہ ٹھکرانا، اتارنے والا بڑا حکیم ہے، اس لئے اس کی بات ہی حکمت کے مطابق ہے، دانش مندی کے مطابق ہے، زبردست ہے اس کی مخالفت نہ کرنا، تو یہ دو لفظ بھی اس کی قبولیت کی طرف داعی ہیں کہ اس کو قبول کرو، اسی طرح سے جب رحمٰن ورحیم ذکر کر دیا تو اس میں اشارہ کر دیا گیا کہ یہ اس نے اُتاری ہے جو ایسا مہربان ہے جس جیسا کوئی مہربان نہیں، اور صرف وقتی طور پر مہربان نہیں، دائمی طور پر مہربان ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی، تو جب ایسے کی طرف سے یہ اُتاری جارہی ہے، رحمت کا تقاضا ہے، شفقت کا تقاضا ہے، اور رحمت اس کی کامل ہے، تو جو باتیں اس کی طرف سے آئی ہیں سمجھ لیجئے کہ انہی میں تمہارا فائدہ ہے، اور ان کے چھوڑنے میں تمہارا فائدہ نہیں، تو اس لفظ کے بڑھانے سے گویا کہ کتاب کی باتوں کو قبول کرنے کی طرف ایک ترغیب ہے،''یہ رحمٰن ورحیم کی طرف سے اُتاری ہوئی باتیں ہیں۔''

قرآنِ کریم کے اوّلین مخاطب عربی ہیں

كِتٰبٌ فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ: یہ لفظ سورۂ ہود کے شروع میں بھی آیا تھا۔'' یہ کتاب، اس کی آیات تفصیل کے ساتھ بیان کی گئی ہیں، جُدا جُدا کی گئی ہیں، کھول کھول کے بیان کی گئی ہیں'' قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا: اس حال میں کہ یہ عربی قرآن ہے، عربی ہونے کو بطور اِنعام کے ذکر کیا جارہا ہے، چونکہ اس کے مخاطبِ اوّل عربی ہیں،'' یہ عربی قرآن ہے'' لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ: یہ فُصِّلَتْ کے متعلق ہے''تفصیل کی گئی ہے اُن لوگوں کے نفع کے لئے جو کہ جاننا چاہتے ہیں، جو سمجھ دار ہیں، جو علم رکھتے ہیں، جاہل اپنی جہالت پہ اَڑا رہے تو کوئی فائدہ نہیں اُٹھائے گا، علم والے لوگ اس سے فائدہ اُٹھائیں گے، یا مطلب یہ ہے کہ جو جاننا چاہتے ہیں وہ لوگ فائدہ اُٹھائیں گے۔ یا اس کو كَآئِنًا کے متعلق کر کے قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا کی طرح اس کو بھی حال بنالیجئے، کتاب چونکہ مذکر ہے تو فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ میں مؤنث کا صیغہ استعمال ہوا ہے اٰيٰتُهٗ کی وجہ سے، اور تقدیر عبارت ہوگی قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا كَآئِنًا لِّقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ''اس حال میں کہ یہ عربی قرآن ہے اور ہونے والا ہے یہ ان لوگوں کے لئے، اتارا گیا ہے یہ ان لوگوں کے لئے'' یہ مفہوم بھی اس کا ہوسکتا ہے کہ اس کو تنزیل کے متعلق کر لیجئے، مُنَزَّلٌ لقومٍ يعلمون، ہر طرح سے اس کے مفہوم کو واضح کیا جاسکتا ہے۔

قرآنِ کریم بشیر ونذیر ہے

بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا: یہ بھی (کتاب سے) حال ہے،[1] اور کتاب چونکہ لفظوں میں مذکر ہے تو اس لئے یہاں مذکر کے صیغے آئیں گے، اور ترجمہ ہم مؤنث کے ساتھ کریں گے کیونکہ کتاب اُردو کے اندر مؤنث استعمال ہوتی ہے، اور اگر لفظِ قرآن کے ساتھ

(۱) دیکھئے روح المعانی۔ عام طور پر اس کو قرآناً کی صفت بنایا گیا ہے۔

تعبیر کریں گے تو اُردو میں بھی مذکر ہی استعمال ہوتا ہے،''اس حال میں کہ یہ قرآن بشیر ونذیر ہے۔'' بشیر: بشارت دینے والا۔ نذیر: ڈرانے والا۔ بشارت دینے والا، یعنی وہ یہ بتاتا ہے کہ جو اس کی ہدایات کے مطابق چلیں گے اُن کا انجام بڑا اچھا ہے، یہ اچھے انجام کی گارنٹی دیتا ہے، اور مخالفت کرنے والوں کو ڈرانے والا ہے کہ ان کا انجام اچھا نہیں ہے، یہ بھی کسی بات کے منوانے کے لئے ایک انداز ہوا کرتا ہے، بتایا جائے کہ اس بات کو قبول کرنے کا انجام اچھا ہے اور اس کو قبول نہ کرنے کا انجام بُرا ہے۔

سماع کی نفی کرنے سے مقصود قبولیت کی نفی ہے

فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ: پھر اِعراض کیا اِن میں سے اکثر نے پس وہ سنتے ہی نہیں۔ یہ لَا يَسْمَعُوْنَ وہی اِصطلاح ہے جو آپ کے سامنے ذِکر کی تھی کہ سمع کی نفی سے اصل میں قبولیت کی نفی کرنی مقصود ہوتی ہے، اور یہ ہماری زبان کا بھی محاورہ ہے، جب ہم کسی کو بار بار نصیحت کریں اور وہ نصیحت سے متاثر نہ ہو تو ہم یہی کہتے ہیں کہ''میں نے تو ہزار دفعہ سمجھایا وہ سنتا ہی نہیں'' تو یہ قبول کرنے کی نفی ہوتی ہے، ورنہ وہ سارے کے سارے کانوں سے بہرے نہیں تھے کہ حضور ﷺ کی آواز ان کے کانوں میں نہ جاتی ہو، تو سماع کی نفی کرنے سے قبولیت کی نفی کرنی مقصود ہے، فَاَعْرَضَ اَكْثَرُهُمْ: پھر ان میں سے اکثر نے منہ موڑ لیا، فَهُمْ لَا يَسْمَعُوْنَ: وہ سنتے ہی نہیں، یعنی سنی اَن سنی کر دیتے ہیں، سننے سے جو متاثر نہیں ہوتے تو ایسے سننے کا کوئی فائدہ ہی نہیں۔

مشرکین کی ضد اور اس کا نتیجہ

وَقَالُوْا: سنتے نہیں، قبول نہیں کرتے، بلکہ اس طرح سے بیزاری کا اظہار کرتے ہیں جب اللہ کا رسول ان کو سناتا ہے، وَقَالُوْا: وہ کہتے ہیں قُلُوْبُنَا فِيْٓ اَكِنَّةٍ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ: ہمارے دل پردوں میں ہیں، اَكِنَّةٍ یہ كِنَان کی جمع ہے، پردے کے معنی میں، اور كِنٌّ بھی چھپنے کی جگہ کو اور پردے کی جگہ کو کہتے ہیں جس کی جمع اَكْنَانٌ آتی ہے، سورۂ نحل (آیت:۸۱) میں لفظ اس طرح سے آیا تھا، ''ہمارے دل پردوں میں ہیں اس چیز سے جس کی طرف تو ہمیں بلاتا ہے'' وَفِيْٓ اٰذَانِنَا وَقْرٌ: وَقْرٌ کہتے ہیں بوجھ کو، ثقل۔ کانوں میں ثقل کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ کان بہرے ہو گئے، اس لئے ثقلِ سماعت کا لفظ بولا کرتے ہیں بہرے پن کے لئے، کہ کانوں میں ثقل پیدا ہو گیا،''اور ہمارے کانوں میں بوجھ ہے، ڈاٹ ہے'' وَّمِنْۢ بَيْنِنَا وَبَيْنِكَ حِجَابٌ: ہمارے اور تیرے درمیان پردہ ہے فَاعْمَلْ اِنَّنَا عٰمِلُوْنَ: پس تو کام کر، ہم بھی کام کرنے والے ہیں، مطلب یہ ہے کہ وہ مایوس کرنا چاہتے ہیں کہ آپ جس طرح سے چاہیں، ہمیں سنانے کی کوشش کریں، سمجھانے کی کوشش کریں، لیکن تیری باتوں کی طرف سے تو ہمارے دل پردے میں آ گئے، غلاف چڑھ گئے، جس طرح سے پیچھے یہود کا ذکر کیا گیا تھا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ (سورۂ بقرہ:۸۸)، اور نہ ہمارے کان تیری بات سننے کے لئے تیار ہیں، تو یوں سمجھ کہ ہمارے کان تیری باتوں سے بہرے ہیں، اور ہم میں اور تجھ میں بڑا حجاب حاصل ہے، ہم ایک نہیں ہو سکتے، اس لئے تو اپنے طور پر کام کرتا رہ، ہم اپنے طور پر کام کرتے ہیں، ہمارا تیرا کیا تعلق؟ یہ لاتعلقی کے اظہار کے لئے اس قسم کے لفظ بولے جایا کرتے ہیں، اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے بھی کافروں کی مذمت کرتے ہوئے ایسی باتیں کہی ہیں کہ ان کے دلوں پہ حجاب پڑ گیا یا ہم نے ان

کے دلوں پہ حجاب ڈال دیا،[1] اس کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ یہ چونکہ ضد میں آئے ہوئے ہیں، ضد میں آنے کی وجہ سے یہ اپنی صلاحیتیں کھو بیٹھے ہیں، اب اسی طرح سے ہے جس طرح سے درمیان میں دیوار حائل ہوگئی، آپ کی باتیں سُن کر یہ قبول نہیں کرتے، متأثر نہیں ہوتے۔ وہی کیفیت اپنی وہ ذِکر کرتے ہیں، واقعہ بھی یہی ہے کہ جب ایک شخص کی آپ کے ساتھ مخالفت ہوجائے، آپ اس کے مقابلے میں ضد میں آجائیں، وہ ہزار لجاجت کر کر کے آپ کو کوئی بات سمجھائے، اور آپ کی ہمدردی کا واسطہ دے کر آپ کو سمجھائے، لیکن بالکل اس طرح سے ہوتا ہے جیسے اس کی بات یہاں کان سے ٹکرا کر واپس ہوجاتی ہے، نہ اندر جاتی ہے نہ قلب تک پہنچتی ہے، یہ ضد کا ایک نتیجہ ہے کہ سارے کے سارے باطنی دروازے گویا کہ بند ہوجاتے ہیں اور باہر کی بات اثر انداز نہیں ہوا کرتی، جس وقت چاہیں آپ آپس میں اس بات کا تجربہ کرسکتے ہیں کہ جس کے متعلق عقیدت نہ ہو اور جس کے متعلق انسان ضد میں آجائے تو اس کی بات بالکل قلب تک نہیں پہنچتی، وہ ایسے ہوتا ہے جیسے حجاب حائل ہوجائے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم تیری باتوں سے اتنے بیزار ہیں، تیری باتیں ہمیں پسند نہیں ہیں، یوں سمجھ کہ ہمارے کانوں میں ثقلِ سماعت ہوگیا، ڈاٹ آگئے ہمارے کانوں میں، ہمارے کان میں تیری بات نہیں آتی، نہ ہمارا دل ان کو قبول کرنے کے لئے تیار ہے، وہ ایسے ہے جیسے اس کے اُوپر پردے پڑ گئے ہوں، اور ہمیں تیرے سے کوئی اُنس نہیں ہے، ہمارے اور تیرے درمیان بھی رُکاوٹ ہے، حجاب واقع ہوگئے، تو اپنی جگہ کام کرتا رہ، ہم اپنی جگہ کام کرتے ہیں، یہ لاتعلقی کی بات ہوا کرتی ہے کہ ہمارا تیرا کوئی تعلق نہیں ہے۔

مشرکین کی ضد کا جواب

قُلْ: آپ کہہ دیجئے ان کی اس ضد کے جواب میں، اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ میں تم جیسا انسان ہوں، یُوْحٰۤى اِلَیَّ: میری طرف وحی کی جاتی ہے کہ اَنَّمَاۤ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، فَاسْتَقِیْمُوْۤا اِلَیْهِ: پس تم اس کی طرف سیدھے ہوجاؤ، وَاسْتَغْفِرُوْهُ: اور اس سے معافی مانگو، وَوَیْلٌ لِّلْمُشْرِكِیْنَ: اور مشرکوں کے لئے خرابی ہے، الَّذِیْنَ لَا یُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ: جو زکوۃ نہیں دیتے، وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ: اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں لَهُمْ اَجْرٌ غَیْرُ مَمْنُوْنٍ: ان کے لئے اجر ہے غیر منقطع، مَنَّ قَطَعَ کے معنی میں غَیْرُ مَمْنُوْنٍ: جو ختم نہیں ہوگا، قطع کیا ہوا نہیں ہوگا، تو آپ ان کے جواب میں یہ کہہ دیجئے، اس جواب کا حاصل یہ ہے کہ اگر تم نے یہ ٹھان ہی لی ہے کہ ماننا نہیں، تو سُن لو! کہ مجھ میں منوانے کی طاقت نہیں ہے، میں تم جیسا ایک انسان ہوں، تمہارے قلوب پر میرا قبضہ نہیں کہ میں تمہارے قلوب کو سیدھا کردوں، میں تم جیسا ایک انسان ہوں، اور اللہ نے مجھے یہ امتیاز بخشا ہے کہ اپنی طرف سے میرے پہ ایک وحی اُتاری (جس میں آپ کی رسالت کا ذکر آگیا) یہ اللہ کی طرف سے بخشا ہوا امتیاز ہے، ورنہ میں انسان ہی ہوں، اور اس امتیاز کی بنا پر سب انسانوں سے ممتاز ہوگئے۔ اور اس وحی میں اللہ تعالیٰ نے اُتارا کیا ہے؟ کوئی خلاف عقل بات نہیں

(۱) وَجَعَلْنَا عَلٰی قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ یَّفْقَهُوْهُ وَفِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا (پارہ ۷، سورۃ الانعام، آیت: ۲۵) نیز پارہ ۱۵، سورۃ الاسراء: ۴۶، پارہ ۱۵، سورۃ الکہف: ۵۷۔

اُتاری، یہی تو کہا ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے، اس وحی میں کوئی عجیب مضمون نہیں ہے، پس تم اسی کی طرف متوجہ ہو جاؤ، فَاسْتَقِيْمُوْٓا اِلَيْهِ کا معنیٰ ''اپنے چہرے کو سیدھا کر لو اس کی طرف'' ٹیڑھے نہ ہوؤ کہ کبھی کسی کی طرف جھکتے ہو کبھی کسی کی طرف جھکتے ہو، اسی کی طرف سیدھے ہو جاؤ، اور اپنے گناہوں کی اسی سے معافی مانگو۔ اور جو لوگ اس کے ساتھ شریک ٹھہرانے والے ہیں مشرکین، اس وحی کے اندر یہ مضمون بھی بیان کیا گیا ہے جو میری طرف وحی کی گئی، کہ مشرکین کے لئے خرابی ہے، مشرکین کے لفظ میں یہ بات آ گئی کہ خرابی کی وجہ اِشراک ہے، اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہرانا، اور پھر ساتھ ساتھ دوسری باتیں بھی ہو گئیں کہ جب وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں اللہ کی باتوں کو مانتے نہیں ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آتا ہے اس کی وہ مخالفت کرتے ہیں، مثلاً یہی ہمدردیٔ خلائق کے طور پر اللہ تعالیٰ نے اگر یہ حکم دیا ہے کہ اپنا مال دوسروں کے اُوپر خرچ کرو، تو جیسے سورۂ یٰس میں آیا تھا کہ اس ضد میں آ کے وہ اس خیر محض کو بھی قبول کرنے کے لئے تیار نہیں، کہتے تھے اَنُطْعِمُ مَنْ لَّوْ يَشَآءُ اللّٰهُ اَطْعَمَهٗٓ (آیت:۴۷) کہ اگر اللہ چاہتا تو کھلاتا، جب اللہ ان کو نہیں کھلانا چاہتا تو ہم کیوں کھلائیں؟ وہ ضد میں آ کے اس قسم کی باتیں کرنے لگ جاتے تھے، ''جو زکوٰۃ نہیں دیتے'' اور یہ زکوٰۃ نہ دینا یہ بھی چونکہ کفر کی بنا پر ہی تھا تو یہ ایک قسم کی کفر کی مذمت ہے ''جو زکوٰۃ نہیں دیتے اور وہ آخرت کا انکار کرنے والے ہیں۔'' زکوٰۃ کا حکم تو مکہ معظمہ میں ہی اُتر آیا تھا، نماز کے ساتھ ساتھ ہی زکوٰۃ کا حکم بھی تھا، یہ علیحدہ بات ہے کہ مقادیر کا متعین کرنا، نصاب کا متعین کرنا، کہ فلاں نصاب میں سے اتنی دی جائے گی، یہ تفصیلات مدینہ منورہ میں جا کر مرتب ہوئی ہیں، ورنہ فرضیتِ زکوٰۃ کی مکہ معظمہ میں ہی ہو گئی تھی۔ اور آگے یہ بشارت دے دی، یہ بھی وحی کے اندر مضمون آیا ہے، ''بے شک وہ لوگ جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں ان کے لئے اجر ہے جو ختم نہیں ہو گا، دائمی اجر۔''

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ۭ

آپ کہہ دیجئے کیا تم انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا کیا زمین کو دو دنوں میں، اور اس کے لئے تم مقابل بناتے ہو؟

ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ۹ۚ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِيْهَا وَقَدَّرَ

یہی تمام جہانوں کو پالنے والا ہے ۹ اور اس زمین کے اندر جمے رہنے والے پہاڑ بنا دیئے زمین کے اوپر سے، اور اس میں برکت رکھی، اور مقدر کیا

فِيْهَآ اَقْوَاتَهَا فِيْٓ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ ۭ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ ۱۰ ثُمَّ اسْتَوٰٓى اِلَى السَّمَآءِ وَ

زمین کے اندر زمین کی خوراکوں کو چار دن میں، یہ برابر ہیں سوال کرنے والوں کے لئے ۱۰ پھر اللہ تعالیٰ متوجہ ہوا آسمان کی طرف اور

هِيَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا ۭ قَالَتَآ اَتَيْنَا طَآئِعِيْنَ ۱۱

وہ دھوئیں کی شکل میں تھا، پھر کہا اس آسمان کو اور زمین کو کہ آؤ تم دونوں خوشی کے ساتھ یا ناگواری سے، ان دونوں نے کہا ہم آ گئے خوشی سے ۱۱

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا ۭ وَزَيَّنَّا

پھر اللہ نے بنا دیا ان کو سات آسمان دو دنوں میں، اور وحی بھیجی ہر آسمان میں اس کے متعلق حکم کی، اور مزین کردیا ہم نے

السَّمَآءَ الدُّنْيَا بِمَصَابِيْحَ ۖ وَحِفْظًا ۭ ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿۱۲﴾ فَاِنْ

قریب والے آسمان کو چراغوں کے ساتھ، اور ہم نے اس کو خوب محفوظ کیا، یہ اندازہ ہے عزیز علیم کا ﴿۱۲﴾ پھر بھی اگر

اَعْرَضُوْا فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ صٰعِقَةً مِّثْلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوْدَ ﴿۱۳﴾ اِذْ جَآءَتْهُمُ

یہ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے تمہیں ڈرا دیا ایک آفت سے جو کہ عاد و ثمود کی آفت کی طرح ہوگی ﴿۱۳﴾ جبکہ آئے ان کے پاس

الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ قَالُوْا لَوْ شَآءَ

رسول ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے یہ بات لے کر کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو، تو انہوں نے کہا اگر ہمارا رب

رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰۗىِٕكَةً فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۴﴾ فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا فِي

چاہتا تو فرشتے اُتار دیتا، پس بے شک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ﴿۱۴﴾ پھر عاد، انہوں نے تو تکبر کیا

الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً ۭ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ

زمین میں ناحق اور وہ کہنے لگے کہ کون زیادہ سخت ہے ہم سے ازروئے قوت کے؟ کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک وہ اللہ جس نے

خَلَقَهُمْ هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً ۭ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ﴿۱۵﴾ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

ان کو پیدا کیا وہ زیادہ سخت ہے ان سے ازروئے قوت کے، اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے ﴿۱۵﴾ پھر بھیج دی ہم نے ان کے

رِيْحًا صَرْصَرًا فِيْٓ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۭ

اُوپر زور دار ہوا بے برکت دِنوں میں، تاکہ چکھائیں ہم انہیں رُسوائی کا عذاب دُنیوی زندگی میں

وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَاَمَّا ثَمُوْدُ فَهَدَيْنٰهُمْ

اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی زیادہ رُسوائی کا باعث ہے، اور وہ مدد نہیں کئے جائیں گے ﴿۱۶﴾ اور ثمود، ان کو بھی ہم نے راستہ دکھایا

فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى فَاَخَذَتْهُمْ صٰعِقَةُ الْعَذَابِ الْهُوْنِ بِمَا كَانُوْا

پس پسند کیا انہوں نے گمراہی کو ہدایت کے مقابلے میں، پھر پکڑ لیا ان کو ذلیل کرنے والے عذاب کی آفت نے بسبب ان کاموں

يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۷﴾ وَنَجَّيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَكَانُوْا يَتَّقُوْنَ ﴿۱۸﴾

کے جو وہ کرتے تھے ﴿۱۷﴾ اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور وہ اللہ سے ڈرتے تھے ﴿۱۸﴾

تفسیر

توحید کی دعوت

قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ: اب یہ توحید کے اختیار کرنے کے لئے دعوت دی جارہی ہے اللہ کی قدرت کو ذکر کر کے، سورۂ بقرہ کے اندر بھی ابتدا ابتدا میں عنوان ایسے ہی آیا تھا كَيْفَ تَكْفُرُوْنَ بِاللّٰهِ وَكُنْتُمْ اَمْوَاتًا (آیت:۲۸) وہاں سے یہ مضمون شروع ہوا تھا۔ آپ کہہ دیجئے اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِيْ يَوْمَيْنِ: کیا تم انکار کرتے ہو اس ذات کا جس نے پیدا کیا زمین کو دو دنوں میں، وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗۤ اَنْدَادًا: اور اس کے لئے تم مقابل بناتے ہو، شرکاء بناتے ہو۔ انداد ندٌّ کی جمع ہے۔ ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ یہی جس نے زمین کو دو دن میں پیدا کیا یہی ربّ العالمین ہے، تمام جہانوں کو پالنے والا ہے، رُبوبیت کسی اور کے لئے ثابت نہیں، دو دن میں تو زمین کو بنایا، وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ: اور اس زمین کے اندر ثابت رہنے والے پہاڑ بنا دیئے۔ جِبالًا رَوَاسِیَ۔ رَوَاسِیَ صفت کا صیغہ ہے راسیۃ کی جمع ہے، قُدُوْرٍ رّٰسِيٰتٍ یہ لفظ سورۂ سبا کے اندر بھی آتا ہے جمی رہنے والی دیگیں، ہانڈیاں۔ تو رَوَاسِیَ یہاں پہاڑ ہیں جِبالًا رَوَاسِیَ، جمے رہنے والے پہاڑ بنا دیئے زمین کے اُوپر سے، وَبٰرَكَ فِيْهَا: اور اس زمین کے اندر منافع رکھے، برکت نفع کثیر کو کہتے ہیں، ''یہ چیز بابرکت ہے'' یعنی اس سے بہت نفع پہنچ رہا ہے، اور بے برکت وہ ہوتی ہے جس سے کوئی فائدہ نہ ہو، تو بٰرَكَ فِيْهَا کا معنی ہو گیا اس زمین کے اندر منافع رکھے، اس زمین میں برکت رکھی، وَقَدَّرَ فِيْهَاۤ اَقْوَاتَهَا: اور اس زمین کے اندر زمین کے اقوات کو مقدر کیا، اقوات قُوت کی جمع ہے، قُوت خوراک کو کہتے ہیں، اور زمین کی طرف نسبت اس کی اس تعلق کی بنا پر ہے کہ وہ زمین میں پیدا ہوتی ہے۔ وَجَعَلَ فِيْهَا رَوَاسِيَ مِنْ فَوْقِهَا: بنائے اس نے زمین کے اندر پہاڑ اوپر سے، زمین کے اوپر پہاڑ قائم کیے، وَبٰرَكَ فِيْهَا: اور اس میں برکت رکھی، زمین میں برکت رکھی یعنی منافع رکھے، ''اور مقدر کیا زمین کے اندر زمین کی خوراکوں کو'' خوراکوں کی نسبت زمین کی طرف کر دی اس تعلق کی بنا پر کہ اس میں پیدا ہوتی ہیں، فِيْۤ اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ: چار دن میں۔

''سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ'' کے دو مفہوم

سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ: سَوَآءً: اِسْتَوَتْ سَوَآءً برابر ہو گئے برابر ہونا، یعنی پورے چار دن میں، لِلسَّآئِلِيْنَ: سوال کرنے والوں کے لئے، اس کا مطلب دو طرح سے ذکر کیا گیا ہے، یا تو سائلین سے مراد یہ ہے کہ کسی نے سوال کیا ہو گا زمین اور آسمان کی خلقت کے متعلق، تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ دو دن میں تو زمین بنائی گئی اور دو دن میں اس کے اندر یہ سارے کے سارے سلسلے قائم کئے گئے پہاڑوں کے اور اقوات کے، مجموعہ چار دن ہو گئے، اور پورے چار دن، ''پوچھنے والوں کے لئے'' یعنی

پوچھنے والوں کے لئے یہ جواب پورا ہوگیا کہ اِسْتَوَتْ سَوَآءً یہ چار دن پورے تھے جس میں یہ سارے کا سارا کام ہوا۔ اور فِیْ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ یہ پچھلے دو دنوں سمیت ہیں یعنی دو دن میں یہ ہوگیا، پھر چار دن میں یہ کام مکمل ہوگیا، مجموعہ چار دن میں، کیونکہ قرآن کریم کی بہت ساری آیات کے اندر واضح کیا گیا ہے کہ زمین آسمان کو اللہ تعالیٰ نے ستة ایام میں پیدا کیا ہے یعنی چھ دن میں۔

اور یا لِلسَّآئِلِيْنَ کا یہ معنی ہے کہ اس کو قَدَّرَ کے متعلق کر لیجئے، سائلین سے مراد ہے طالبینِ رزق، جو رزق کا مطالبہ کرنے والے ہیں، رزق کا سوال کرنے والے ہیں یعنی حاجت مند، چاہے زبان سے سوال کریں یا نہ کریں، یہ فطرت کے اندر جو رزق کی اور قوت حاصل کرنے کی طلب ہے اس کے اعتبار سے طالبینِ رزق کو سائلین کے ساتھ تعبیر کیا جارہا ہے، یعنی جن کے اندر اللہ تعالیٰ نے رزق کی طرف احتیاج رکھا ہے، گویا کہ فطرت کے طور پر وہ سائل ہیں رزق کے لئے، تو لِلسَّآئِلِيْنَ کا تعلق قَدَّرَ کے ساتھ ہو جائے گا تو معنی یہ ہو جائے گا کہ "طالبینِ رزق کے لئے اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر اَقوات کو مقدر کیا" اس کے اندر خوراکیں رکھیں ان لوگوں کے لئے جو کہ طالب رزق ہیں، جو رزق کو طلب کرنے والے ہیں، جو اپنی فطرت اور طبیعت کے لحاظ سے اللہ سے رزق کا سوال کرنے والے ہیں، ان کے لئے اللہ تعالیٰ نے رزق اور خوراکیں جتنی تھیں وہ اس زمین کے اندر مقدر کر دیں، اور پھر سَوَآءً کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے سواءً بسواء: ان کی حاجات کے مطابق، یعنی یہ خوراکوں کی تقدیر جو ہوئی تو حاجات کے مطابق ہوئی، جیسی ان کی ضرورتیں تھیں ویسی اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر قوت (روزی) مقدر کر دی، اب ایک علاقے کے رہنے والے، جس قسم کی خوراک ان کے موافق ہے اللہ تعالیٰ نے اس علاقے کے اندر ویسی ہی خوراک پیدا کی ہے، تو زمین کے مختلف خطوں میں مختلف چیزیں پیدا کی ہیں، اپنے علاقے کی پیداوار اس علاقے کے لوگوں کے لئے موافق ہوتی ہے، یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، تو سَوَآءً لِّلسَّآئِلِيْنَ کا معنی یہ بھی ہوسکتا ہے، طالبینِ رزق کے لئے اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر زمین کی قُوتوں کو مقدر کیا، سَوَآءً لحاجاتهم ان کی حاجات کے برابر سرابر جیسی ان کی ضروریات تھیں ویسی اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر خوراکیں مقدر کر دیں، اور یہ واقعہ ہے کہ اللہ کی مخلوق جتنی بھی ہے، چاہے وہ انسان ہیں، چاہے حیوانات ہیں، کیڑے مکوڑے ہیں، طالبینِ رزق سارے ہیں، چرند، پرند، درند، کیڑے مکوڑے، کل دواب جو زمین کے اُوپر چلتے پھرتے ہیں، بمع انسان کے، دریاؤں کے اندر مچھلیاں یہ بھی آخر قوت (روزی) کی طالب ہیں، تو اس میں صرف انسان کی بات ہی نہیں ہے، جو بھی کھانے پینے کے محتاج ہیں سائلین میں سارے آگئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے ان کی قوتوں (روزیوں) کو مقدر کیا ہے، ہر طالب رزق اپنے رزق کو پاتا ہے اور اسی زمین سے پاتا ہے، تو زمین اللہ تعالیٰ نے کتنا بڑا گودام بنا دیا، کہ اس میں سے اس کی ساری مخلوق نکال نکال کے کھا رہی ہے، جتنی ضروریات زندگی پیش آتی ہیں سب کا مخزن اس زمین کو بنا دیا گیا، یہ یوں سمجھ لیجئے جس طرح سے اللہ تعالیٰ کا ایک بٹوہ ہے، اس میں سے نکالتے جاؤ اور کھاتے جاؤ، کہیں کمی نہیں محسوس ہوتی۔ تو اس طرح سے بھی اس کا ترجمہ کیا گیا ہے، تو دو طرح ترجمہ ہوگیا، یہ دن برابر ہیں یعنی پورے چار دن میں یہ سارا کام ہوا، اور سوال کرنے والوں کے لئے یہ بات واضح ہوگئی۔ سائلین: سوال کرنے والے، پوچھنے والے۔ اور دوسرا ترجمہ ہوگیا کہ رزق کے طالبین کے لئے اللہ نے اقوات کو مقدر کیا، اور ان کی حاجات کے برابر مقدر کیا، کہ جیسی جیسی ضروریات پیش آتی ہیں جتنی جتنی ضرورت پیش آتی ہے اسی زمین میں سے ان کی قوت (روزی) نکلتی چلی آتی ہے، اور سائلین

سے طالبینِ رزق مراد ہے۔ اور اس طالبین میں صرف انسان نہیں بلکہ جتنی چیزیں بھی رزق کھانے والی ہیں، کیڑے مکوڑے ہیں، پرندے ہیں ہوا میں اُڑنے والے، مچھلیاں ہیں پانی میں، جنگلوں میں پھرنے والے درندے ہیں، اور اسی طرح سے گھاس وغیرہ چرنے والے، سارے کے سارے، جتنی بھی جان دار مخلوق ہے، سب سائلین ہیں، گویا کہ اپنی فطرت کے لحاظ سے وہ رزق کے طالب ہیں چاہے زبان سے سوال نہ کریں، اللہ نے ان کے لئے قوتوں (روزیوں) کو مقدر کیا، اور ان کی حاجات کے مساوی مقدر کیا، ہر کسی کی ضرورت اسی زمین سے پوری ہوتی ہے۔

ہر چیز شعور رکھتی ہے

ثُمَّ اسْتَوٰۤی اِلَی السَّمَآءِ: پھر اللہ تعالیٰ متوجہ ہوا آسمان کی طرف وَهِیَ دُخَانٌ: اور وہ دُھوئیں کی شکل میں تھا۔ فَقَالَ لَهَا: پھر کہا اس آسمان کو، وَلِلْاَرْضِ: اور زمین کو، ائْتِيَا: آؤ تم دونوں، طَوْعًا اَوْ كَرْهًا: خوشی کے ساتھ یا ناگواری سے، یعنی میرے اَحکام قبول کرو، میری اطاعت کی طرف آؤ خوشی سے یا ناگواری سے، قَالَتَآ: ان دونوں نے کہا، اَتَيْنَا طَآىِٕعِيْنَ: ہم آگئے خوشی سے، اس حال میں کہ ہم دل کی خوشی کے ساتھ کام کرنے والے ہیں، مطلب کیا ہوا؟ کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں خطاب کیا کہ اَحکام تو تمہارے اُوپر جاری ہوں گے، اس سے تو انکار ہو نہیں سکتا (یہ تکوینی اَحکام جتنے زمین آسمان کے اُوپر جاری ہوتے ہیں) باقی! اب تمہاری مرضی، تم ان کو خوشی کے ساتھ قبول کرو یا ناگواری سے، قبول بہر حال کرنے پڑیں گے، تو انہوں نے جواب دیا کہ نہیں جی! ہم تو خوشی سے قبول کرتے ہیں، جو بھی آپ کا تصرف ہوگا ہم بالکل خوشی سے قبول کرتے ہیں، ہمیں کسی قسم کا کوئی اعتراض نہیں ہے، تو زمین آسمان چاہے آپ کو بے جان نظر آئیں لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ تو ہر چیز بات بھی کرتی ہے اور اللہ کی بات سمجھتی بھی ہے اِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ (سورۂ اسراء: ۴۴) کے تحت جس طرح سے ذِکر کیا تھا، تو زمین بھی مخاطب ہوئی اور آسمان بھی مخاطب ہوا، دونوں نے اطاعت کا اظہار کیا کہ جو بھی اَحکام آپ کی طرف سے آئیں گے ہم ان کو خوشی کے ساتھ گوارا کریں گے، چاہے وہ اَحکام اختیاری نہیں تکوینی ہیں۔

تکوینی اور تشریعی اَحکام

اِس بات کو سمجھ لیجئے! انسان کو اللہ تعالیٰ نے مکلف بنایا، اس کو اِختیار اور ارادہ دیا، اس پر بھی اَحکام دو قسم کے جاری ہوتے ہیں، ایک اَحکام اختیاری ہیں جن کے کرنے نہ کرنے کا تمہیں مختار کر دیا گیا، چاہے اس کے ساتھ سزا یا اِنعام کا سلسلہ لگا دیا گیا، مثلاً حکم دے دیا گیا نماز پڑھو، لیکن ساتھ تمہیں اتنا اختیار بھی ہے کہ پڑھنا چاہو تو پڑھ بھی سکتے ہو، نہیں پڑھنا چاہتے تو چھوڑ بھی سکتے ہو، یہ علیحدہ بات ہے کہ ساتھ اِنعام اور سزا کا سلسلہ ہے، پڑھو گے تو اِنعام پاؤ گے، نہیں پڑھو گے تو جُوتے کھاؤ گے۔ اور بعض اَحکام اس قسم کے ہیں کہ جن میں آپ کے ماننے نہ ماننے کا اختیار کوئی نہیں، ان کو تکوینی احکام کہا جاتا ہے، جس طرح سے بیماری ہے، بیماری آتی ہے اللہ کے حکم کے تحت، اس کے قبول کرنے نہ کرنے کا آپ کو کوئی اختیار نہیں، موت آتی ہے، اللہ کے حکم کے تحت آتی ہے، لیکن اس کے قبول کرنے نہ کرنے کا آپ کو کوئی اختیار نہیں، اولاد مرتی ہے، مال ضائع ہوتا ہے، اور اس قسم کے نقصانات پہنچتے ہیں کہ جن کے قبول کرنے نہ کرنے کا آپ کو اختیار نہیں دیا گیا۔

تکوینی اَحکام میں اِنسانوں کی دوقسمیں

لیکن اس میں بھی انسانوں کے دوحال ہوتے ہیں، کوئی اللہ کے ان تکوینی اَحکام کوخوشی سے قبول کر لیتے ہیں، اور کوئی اِعتراض بھی کرتے جاتے ہیں، لیکن بچنے کی کوئی صورت نہیں، یہ اَحکام جاری ہوکر رہتے ہیں، ایک آدمی بیمار ہوتا ہے، دِل میں اللہ سے خوش ہے کہ یااللہ! تیری طرف سے یہ ایک امتحان ہے، توصبر کی توفیق دے اور مجھے اس امتحان میں کامیاب کر، تو اللہ کی طرف سے جوتصرف ہوتا ہے اس کوخوشی سے قبول کر لیتے ہیں، چاہے وہ تکلیف کی بات ہی کیوں نہ ہولیکن قلب میں اعتراض نہیں آتا، موت سامنے آتی ہے تو اس کوخوشی سے قبول کر لیتے ہیں، ہنستے کھیلتے ہوئے اس کا استقبال کرتے ہیں، اور کوئی چیختے چلّاتے ہوتے ہیں، مرنا بہرحال ہے۔ تو تکوینی اَحکام میں بھی انسان کے قلب کے اندر اللہ کے متعلق رضا بھی ہوتی ہے ناراضگی بھی، ناراضگی والے بدبخت ہوتے ہیں، جو اللہ کے تصرفات کے اوپر راضی رہتے ہیں وہ نیک بخت ہوتے ہیں، صرف یہی نہیں کہ اختیاری افعال کو انسان خوشی سے کرتا ہے، نہیں! غیر اختیاری افعال کو بھی خوشی کے ساتھ انسان قبول کرتا ہے بشرطیکہ اس کو اللہ کے ساتھ محبت ہو اور اللہ کے ساتھ تعلق ہو، اور اس تصرف کے پیش آجانے کے بعد......! بچہ تو ہر کسی کا مرتا ہے، لیکن اگر اللہ کے ساتھ تعلق نہیں ہے کوئی بچہ مرا تو اس کی زبان پر شکایت آئے گی، روئے گا، بے صبری کا مظاہرہ کرے گا، اور اللہ کے متعلق بسا اوقات وہ نازیبا لفظ بھی بول دیتا ہے، مرتو اس کا بھی گیا، اور ایک آدمی ہے کہ بچہ اس کا مرا ہے لیکن اس نے اس تصرف کوخوشی سے قبول کر لیا کہ اللہ کو یونہی منظور تھا، اسی کی امانت تھی، اسی نے دی، اسی نے لے لی۔ تو اب یہ تصرف تکوینی ہے لیکن ایک آدمی اس کوخوشی سے قبول کرتا ہے اور دوسرا ناگواری سے قبول کرتا ہے، تو ناگواری سے قبول کرنے والے بدبخت ہیں، خوشی سے قبول کرنے والے نیک بخت ہیں، چاہے وقتی طور پر تکلیف دونوں کو ہوئی، لیکن دونوں میں فرق سمجھ گئے یا نہیں؟ یعنی ظاہری طور پر اگر ہائے کی آواز بھی آئے، رونے کا ذکر بھی ہو، تو بھی قلب کی کیفیت کے درمیان فرق ہوتا ہے، کہ انسان اپنی طبعی مجبوری کے تحت آنسو بھی بہاتا ہے، بسا اوقات ان آنسوؤں کا روکنا اپنے اختیار میں نہیں ہوتا، چوٹ لگتی ہے تو ہائے بھی زبان سے نکل جاتی ہے، لیکن قلبی کیفیت کے درمیان فرق ہوتا ہے، کہ ایک آدمی دل سے راضی ہے اور اس کے جو آنسو بہہ رہے ہیں تو ایک طبعی تقاضے سے بہہ رہے ہیں، اور ایک آدمی رو بھی رہا ہے اور دِل میں بے صبرا بھی ہے اور اللہ کے اِس تصرف پر اعتراض بھی ہے۔ جس طرح سے ہم ان تکوینی احکام کے متعلق رضا اور عدم رضا کی دونوں صفتیں رکھتے ہیں اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کو خطاب کرکے پوچھا کہ بولو! میرے تصرفات پہ راضی رہوگے یا ناراض ہوگے؟ کہتے ہیں نہیں جی! بالکل راضی ہیں، جس طرح سے آپ کا تصرف ہوگا ہم اس کوخوشی کے ساتھ قبول کرتے ہیں، یہ تکوینی اَحکام کے متعلق بات ہے، اور تکوینی اَحکام کے تحت بھی یہ دونوں کیفیتیں ہوا کرتی ہیں، کہ رضا بہ قضا انسان ہے یا نہیں؟ اللہ کے فیصلے پر انسان راضی ہے یا نہیں؟ اسی طرح سے زمین وآسمان کو یہ بات کہی گئی۔

فَقَضٰىهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ فِيْ يَوْمَيْنِ: پھر اللہ نے بنادیا ان کو (هُنَّ ضمیر ما یؤول کے اعتبار سے دُخان کی طرف لوٹ رہی ہے، چونکہ دُخان کے سات آسمان بننے والے تھے) بنادیئے اللہ تعالیٰ نے وہ سات آسمان دودنوں میں، وَاَوْحٰى فِيْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا: وحی بھیجی ہر آسمان میں اس کے متعلق حکم کی، جو بھی احکام اس سے متعلق تھے، وَزَيَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْيَا: اور مزین کردیا ہم نے قریب والے آسمان کو بِمَصَابِيْحَ: چراغوں کے ساتھ، وَحِفْظًا: وَحَفِظْنَاهَا حِفْظًا اور ہم نے اس کو خوب محفوظ کیا شیاطین کی آمدورفت سے، شیاطین کے تصرف سے، ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ: یہ اندازہ ہے عزیز العلیم کا، یہ اندازہ کرنا ہے یہ تدبیر ہے عزیز العلیم کی، یعنی جو زبردست بھی ہے، ہر قسم کا علم رکھنے والا بھی ہے۔

آسمان وزمین کی تخلیق اور آیات میں تطبیق

ان آیات کے ترجمے سے آپ کے سامنے یہ بات آگئی کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں زمین اور آسمان کو پیدا کرنے کی کچھ تفصیل بیان فرمائی ہے، اور مجموعہ دوسری طرف ذکر کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ نے زمین وآسمان کی تخلیق چھ دِن میں کی، تو یہ کام سارے کا سارا چھ دِن میں ہوا ہے، اور چھ دِن میں ہونے کی صورت یہ ہوئی کہ دو دِن میں تو زمین کو بنایا، پھر دو دِن میں اس کے اندر یہ ساری کی ساری چیزیں رکھیں، پھر دو دِن میں آسمان کو بنادیا، چھ دِن پورے ہوگئے، تو اَرْبَعَةِ اَيَّامٍ پچھلے دو دِن کے مجموعے کے ساتھ ہے، جس طرح سے میں نے پہلے آپ کی خدمت میں عرض کیا۔ اس میں ترتیب سمجھ میں یوں آتی ہے کہ زمین پہلے بنائی اور آسمان اللہ نے بعد میں بنایا، اور بعض آیات قرآنِ کریم میں ایسی ہیں جن کے اندر ترتیب اس کے اُلٹ نظر آتی ہے ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ ۚ بَنٰهَا ﴿۲۷﴾ رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰىهَا ﴿۲۸﴾ وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰىهَا ﴿۲۹﴾ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰىهَا: اللہ نے زمین اس آسمان کے بعد بچھائی، یہ سورۂ نازعات میں ہے، تو وہاں ترتیب اس کے کچھ برعکس معلوم ہوتی ہے، لیکن حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تمام آیات اور روایات کی طرف دیکھ کے جو بات معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے تو زمین کا مادّہ بنایا، زمین کا مادّہ بنانے کے بعد پھر آسمان کا مادّہ پیدا کیا جو کہ دُخان کی شکل میں تھا، پھر اس زمین کو پھیلایا، پھر اُس دُخان کے سات آسمان بنائے، تو جب اس طرح سے درجات نکال لئے جائیں گے تو من وجہٍ زمین کی خلقت مقدم ہے، اور من وجہٍ آسمان کی، یعنی پہلے زمین کا مادّہ بنایا جس طرح سے یہاں پہلے زمین کو ذِکر کردیا، پھر آسمان کا مادّہ پیدا کیا جو کہ دُخان کی شکل میں تھا، اس طرح سے تو آسمان کی خلقت زمین سے بعد ہوگئی، پھر زمین کو پھیلایا، اس اعتبار سے زمین کا پھیلانا آسمان کے پیدا کرنے کے بعد ہوگیا، اور پھر زمین کے پھیلانے کے بعد پھر دُھوئیں کی شکل میں جو آسمانوں کا مادّہ موجود تھا پھر ان کو سات آسمانوں کی شکل دے دی، جس طرح سے اس آیت کے اندر تفصیل ذِکر کی گئی، یوں وہ آیات ساری کی ساری آپس میں مطابق ہوجائیں گی (''بیان القرآن'' البقرہ:۲۹)۔۔۔ تو یہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کائنات کی کچھ تفصیل ذِکر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنے خالق ہونے کو واضح فرمایا اور حاکم ہونے کو واضح فرمایا، کہ زمین وآسمان پر پھر احکام نازل کئے، اور یہ پہلا آسمان جو آسمانِ دنیا ہے اس کو ستاروں کے ساتھ مزین کیا، مصابیح سے یہی

ستارے مراد ہیں، اور اس کو محفوظ کیا، اب شیاطین اس کے اوپر جا نہیں سکتے، وہی ستارے ان کی حفاظت کا ذریعہ بھی ہو گئے، اور یہ سارے کا سارا عزیز العلیم کا اندازہ ہے، یہ اسی کی تقدیر ہے، تو ایسے خالق اور مالک کو ماننا چاہیے، اور اس کی مخالفت خطرناک نتائج سامنے لائے گی، یہ حاصل ہے اس کا، جس طرح سے ابتدا میں یہ آیت آگئی، کہ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ۔

پہلی قوموں کے انجام سے عبرت پکڑو

فَاِنْ اَعْرَضُوْا: پھر بھی اگر یہ لوگ اعراض کرتے ہیں اور اس طرح سے تفصیل کے ساتھ سمجھانے کے باوجود بھی یہ مانتے نہیں ہیں، فَقُلْ اَنْذَرْتُكُمْ: تو آپ کہہ دیجئے کہ میں تمہیں ڈراتا ہوں، صٰعِقَةً: یہ لفظ پہلے بھی کئی دفعہ گزرا، صَعِقَ يَصْعَقُ اصل میں بے ہوش ہونے کو کہتے ہیں، فَصَعِقَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ (سورۂ زمر: ۶۸) یہ لفظ آیا تھا، جب نفحہ ہوگا، صور میں پھونک ماری جائے گی تو زمین آسمان میں جتنے لوگ ہوں گے سب بے ہوش ہو جائیں گے، تو پھر صاعقہ سے مراد ایسی آفت اور مصیبت ہوتی ہے جو انسان کے حواس کو خراب کر دے، جس میں انسان کے حواس تک ٹھیک نہ رہیں، بے ہوش کر دینے والی، مدہوش کر دینے والی مصیبت، اس لئے اس کو کڑک سے بھی تعبیر کر دیا جاتا ہے، بجلی کی کڑک جس کے اندر انسان اپنے حواس کھو بیٹھے، اور ایسے ہی آفت اور مصیبت بھی مراد ہو سکتی ہے، تو یہاں آفت کے معنی میں ہی ہے تاکہ ہر قسم کے عذاب کو یہ شامل ہو جائے۔ ''پھر اگر یہ اعراض کریں تو آپ کہہ دیجئے کہ میں نے تمہیں ڈرا دیا ایک آفت سے جو کہ عاد وثمود کی آفت کی طرح ہوگی'' جس طرح سے ان کے اُوپر ایک آفت آئی تھی اور وہ اس آفت کے ساتھ تباہ ہو گئے میں بھی تمہیں ایسی آفت سے ڈراتا ہوں۔ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ: اُن میں کیا واقعہ پیش آیا تھا، اب یہ تم دیکھ لو کہ تمہارا واقعہ اس کے مطابق ہے یا نہیں ہے؟ اِذْ جَآءَتْهُمُ الرُّسُلُ مِنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ: جبکہ آئے ان کے پاس رسول ان کے آگے سے، ان کے پیچھے سے، یعنی سمجھانے کے لئے آگے پیچھے سے ہر طرف سے آئے، بار بار ان کو سمجھاتے ہیں، سمجھانے والا جس وقت آتا ہے آپ کبھی پیٹھ پھیر لیتے ہیں تو پیچھے سے آوازیں دے کر سمجھاتا ہے، اور کبھی آپ کے سامنے آتا ہے اور آپ کو مخاطب کر کے سمجھاتا ہے، یہی سمجھانے کے طریقے ہوتے ہیں، ہر طرف سے انسان آتا ہے سمجھانے کے لئے۔ ''جب آئے ان کے پاس رسول ان کے سامنے سے اور ان کے پیچھے سے یہ بات لے کر اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ: کہ اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کرو'' قَالُوْا: تو انہوں نے کہا لَوْ شَآءَ رَبُّنَا لَاَنْزَلَ مَلٰٓئِكَةً: اگر ہمارا رب چاہتا تو فرشتے اُتار دیتا، یعنی اگر اس نے کوئی رسول بھیجنا ہی تھا تو فرشتوں کو بھیجتا، اس نے انسان کو کیوں بنا کر بھیجا؟ یعنی نبیوں کے بشر ہونے کو انہوں نے اپنے انکار کے لئے منشا بنا لیا، ''اگر چاہتا ہمارا رب تو اُتار دیتا فرشتے'' فَاِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ: پس بے شک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے، انہوں نے جواب یہ دیا، اور یہ سنایا اس لئے جا رہا ہے کہ تم اپنے حال کو ان کے حال کے مطابق کر کے دیکھو! کہ تمہارے جذبات اور تمہارے حالات ایسے تو نہیں جیسے اس عاد وثمود کے تھے؟ اگر ایسے ہی ہیں تو پھر اسی قسم کے انجام کا اندیشہ کرنا چاہیے۔

قومِ عاد کا تکبر اور اس کا انجام

فَاَمَّا عَادٌ فَاسْتَكْبَرُوْا: پھر عاد، انہوں نے تو تکبر کیا زمین میں ناحق، ناحق بڑے بنے حالانکہ ان کو کوئی بڑائی حاصل نہیں تھی، وَقَالُوْا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً: اور ان کو اپنی قوت کے اوپر اتنا ناز تھا کہ وہ نعرہ لگا بیٹھے کہ کون زیادہ سخت ہے ہم سے از روئے قوت کے، یعنی قوت میں ہم ہی سب سے زیادہ ہیں، اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَهُمْ: کیا انہوں نے دیکھا نہیں کہ بے شک وہ اللہ جس نے ان کو پیدا کیا هُوَ اَشَدُّ مِنْهُمْ قُوَّةً: وہ زیادہ سخت ہے ان سے از روئے قوت کے، اپنے خالق کو بھول گئے، ان کو یہ خیال نہیں آیا کہ جس نے پیدا کیا ہے وہ زیادہ قوت والا ہے، وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ: اور وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے، فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا: یہ جو بہت قوت والے تھے، بڑے قد وقامت والے، ہوا کا مقابلہ نہ کر سکے، ''پھر ہم نے ان کے اُوپر ہوا بھیج دی'' رِيْحًا صَرْصَرًا: رِیح صرصر وہ ہوا کرتی ہے کہ جس میں چلتے وقت آواز پیدا ہو، یہ جھکڑ جس وقت چلتے ہیں اور آندھی آتی ہے تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ صرصر کی آواز آتی ہے، تو یہ لفظ اسی کی آواز سے ماخوذ ہے، ''ہم نے ان کے اُوپر زوردار ہوا، جھکڑ ہوا بھیج دی جس کے چلتے وقت شور برپا ہوتا تھا'' فِيْۤ اَيَّامٍ نَّحِسَاتٍ: بے برکت دنوں میں، وہ دِن ان کے لئے بے برکت تھے، چونکہ عاد کے اُوپر عذاب جو آیا تھا سَبْعَ لَيَالٍ وَّثَمٰنِيَةَ اَيَّامٍ (سورۂ حاقہ) سات راتیں اور آٹھ دِن ان کے اُوپر ہوا مسلط رہی، جب آٹھ دِن مسلط رہی تو ہفتے کے تو سارے دِن اس میں آگئے، تو اگر دِنوں کو منحوس قرار دیا جائے تو پھر بابرکت دِن بچا کون سا؟ یہاں کسی دِن کو منحوس کہنا مراد نہیں ہے، اُن کے حق میں یہ بے برکت دِن تھے، اور وہی دِن جو ہیں دُوسروں کے لئے بابرکت بھی ہوتے ہیں، اس لئے وقت میں فی حدذاتہ کسی قسم کی نحوست نہیں ہے، بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آندھی بدھ کے دِن شروع ہوئی تھی، بدھ کے دِن ہی جا کر ختم ہوئی، آٹھ دِن چلتی رہی، اور وہ پٹخ پٹخ کر مارے، جس طرح سے قرآنِ کریم نے نقشہ کھینچا ہے کہ فَتَرَى الْقَوْمَ فِيْهَا صَرْعٰى: تو قوم کو دیکھتا ہے اس میں پچھاڑ کے پھینکے ہوئے تھے وہ، كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ (سورۂ حاقہ) جس طرح کھجور کے کھوکھلے تنے ہوں اور اکھاڑ کے پھینک دیے جائیں اس طرح سے پھینک دیئے گئے، جو یہ نعرے لگاتے تھے کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً، ہوا کا ایک تھپیڑا برداشت نہیں کر سکے، ''بھیج دی ہم نے ان کے اوپر زوردار ہوا بے برکت دنوں میں'' لِّنُذِيْقَهُمْ عَذَابَ الْخِزْيِ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: تا کہ چکھائیں ہم انہیں رسوائی کا عذاب دنیوی زندگی میں، وَلَعَذَابُ الْاٰخِرَةِ اَخْزٰى: اور آخرت کا عذاب تو بہت ہی زیادہ رُسوائی کا باعث ہے، اس سے بھی زیادہ رُسوائی کا باعث ہے، وَهُمْ لَا يُنْصَرُوْنَ: اور وہ مدد نہیں کئے جائیں گے۔

قومِ ثمود کا انجام

وَاَمَّا ثَمُوْدُ: اور ثمود، فَهَدَيْنٰهُمْ: ان کو بھی ہم نے راستہ دکھایا، ان کے سامنے بھی ہم نے ہدایت واضح کی، راستہ دکھایا، فَاسْتَحَبُّوا الْعَمٰى عَلَى الْهُدٰى: پس پسند کیا انہوں نے عمیٰ کو ھُدیٰ کے مقابلے میں، عمیٰ سے گمراہی مراد ہے اندھا پن، یعنی ہم نے راستہ دکھایا لیکن انہوں نے آنکھیں کھولی ہی نہیں، آنکھیں کھولنے کی بجائے انہوں نے اندھا رہنا ہی پسند کرلیا، ہدایت کے مقابلے

میں انہوں نے گمراہی کو پسند کیا، فَاَخَذَتۡهُمۡ صٰعِقَةُ الۡعَذَابِ الۡهُوۡنِ: پھر پکڑ لیا ان کو ذلت کے عذاب کی کڑک نے، ذلت کے عذاب کی آفت نے (جیسے پہلے صاعقہ کا ترجمہ آپ کو سمجھایا)، ذلت والے، ذلیل کرنے والے عذاب کی آفت نے انہیں پکڑ لیا، بِمَا كَانُوۡا يَكۡسِبُوۡنَ: بسبب ان کاموں کے جو وہ کیا کرتے تھے، وَنَجَّيۡنَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَكَانُوۡا يَتَّقُوۡنَ: اور ہم نے نجات دی ان لوگوں کو جو کہ ایمان لائے اور وہ اللہ سے ڈرتے تھے، یا، کفر و شرک سے بچتے تھے ان کو ہم نے نجات دے دی۔ تو یہ نقشہ دکھایا ان کو جیسے یہ ذکر کیا تھا کہ اَنۡذَرۡتُكُمۡ صٰعِقَةً مِّثۡلَ صٰعِقَةِ عَادٍ وَّثَمُوۡدَ، اور عاد و ثمود کے حال کو واضح کر کے یہ بتایا ہے کہ تم سوچو! کہ کہیں تمہارے یہ حالات تو نہیں ہیں، اگر تمہارے حالات بھی ایسے ہوئے تو انجام تمہارا بھی ایسے ہی ہوگا۔

وَيَوۡمَ يُحۡشَرُ اَعۡدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ فَهُمۡ يُوۡزَعُوۡنَ ⑲ حَتّٰٓى اِذَا مَا جَآءُوۡهَا

اور جس دن کہ جمع کئے جائیں گے اللہ کے دشمن آگ کی طرف، پھر ان کو روکا جائے گا⑲ حتیٰ کہ جب وہ لوگ اس آگ کے پاس آجائیں گے

شَهِدَ عَلَيۡهِمۡ سَمۡعُهُمۡ وَاَبۡصَارُهُمۡ وَجُلُوۡدُهُمۡ بِمَا كَانُوۡا يَعۡمَلُوۡنَ ⑳ وَقَالُوۡا

گواہی دیں گے ان پر ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے چمڑے ان کاموں کی جو وہ کیا کرتے تھے⑳ اور کہیں گے وہ

لِجُلُوۡدِهِمۡ لِمَ شَهِدۡتُّمۡ عَلَيۡنَا ؕ قَالُوۡۤا اَنۡطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِىۡۤ اَنۡطَقَ كُلَّ شَىۡءٍ وَّهُوَ

اپنے چمڑوں کو تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے دی؟ وہ کہیں گے کہ بلوایا ہمیں اللہ نے جس نے بلوایا ہر چیز کو، اسی نے

خَلَقَكُمۡ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّاِلَيۡهِ تُرۡجَعُوۡنَ ㉑ وَمَا كُنۡتُمۡ تَسۡتَتِرُوۡنَ اَنۡ يَّشۡهَدَ

تمہیں پیدا کیا پہلی مرتبہ اور اسی کی طرف ہی تم لوٹائے جاتے ہو㉑ نہیں چھپا کرتے تھے تم اس اندیشے سے کہ گواہی دیں گے

عَلَيۡكُمۡ سَمۡعُكُمۡ وَلَاۤ اَبۡصَارُكُمۡ وَلَا جُلُوۡدُكُمۡ وَلٰكِنۡ ظَنَنۡتُمۡ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعۡلَمُ

تم پر تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں اور تمہارے چمڑے، لیکن تمہارا گمان یہ تھا کہ اللہ جانتا نہیں

كَثِيۡرًا مِّمَّا تَعۡمَلُوۡنَ ㉒ وَذٰلِكُمۡ ظَنُّكُمُ الَّذِىۡ ظَنَنۡتُمۡ بِرَبِّكُمۡ اَرۡدٰٮكُمۡ فَاَصۡبَحۡتُمۡ مِّنَ

بہت سارے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو㉒ یہی تمہارا گمان جو تم نے اپنے رب کے متعلق کیا، اس نے تمہیں برباد کر دیا، پس ہو گئے تم

الۡخٰسِرِيۡنَ ㉓ فَاِنۡ يَّصۡبِرُوۡا فَالنَّارُ مَثۡوًى لَّهُمۡ ۚ وَاِنۡ يَّسۡتَعۡتِبُوۡا فَمَا هُمۡ مِّنَ الۡمُعۡتَبِيۡنَ ㉔

خسارہ پانے والوں میں سے㉓ پھر اگر یہ لوگ صبر کریں تو بھی آگ ان کا ٹھکانا ہے، اور اگر وہ راضی کرنا چاہیں گے، تو ان کے اوپر رضا نہیں ہوگی㉔

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَحَقَّ

اور ہم نے متعین کردیے ان کے لئے ساتھی، پس وہ مزین کرتے ہیں ان کے لئے ان چیزوں کو جو ان کے سامنے ہیں اور جو ان کے پیچھے ہیں، اور ان کے اوپر

عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْۤ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۲۵﴾

بات ثابت ہوگئی اس حال میں کہ یہ داخل ہونے والے ہیں ان جماعتوں میں جو ان سے پہلے گزر گئیں جنوں اور انسانوں کی، بے شک یہ خسارہ پانے والے ہیں ﴿۲۵﴾

تفسیر

قیامت کے دن اللہ کے دُشمنوں کی حالت

وَيَوْمَ يُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَى النَّارِ: یہ آخرت کا ذِکر آ گیا، دُنیوی عذاب کو ذِکر کرنے کے بعد آخرت کے عذاب کی کچھ تفصیل ہے،'' قابلِ ذکر ہے وہ دِن جس دِن کہ جمع کیے جائیں گے اللہ کے دُشمن آگ کی طرف'' فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ: پھر ان کے گروہ درگروہ بنائے جائیں گے، ان کی پارٹیاں بنائی جائیں گی، ایک ایک درجے کے لوگ علیحدہ علیحدہ اکٹھے کیے جائیں گے، جس طرح سے مؤمنین کے درجات مختلف ہیں، کافروں کے بھی اسی طرح سے مختلف ہوں گے، یا يُوْزَعُوْنَ کا معنی یہ ہے کہ ان کو روکا جائے گا، اگلوں کو روکا جائے گا تا کہ پچھلوں کو ساتھ شامل کرلیا جائے، جس طرح سے سورۂ نمل کے اندر یہ لفظ آیا تھا وَحُشِرَ لِسُلَيْمٰنَ جُنُوْدُهٗ: سلیمان علیہ السلام کے لئے ان کے لشکر جمع کئے گئے، فَهُمْ يُوْزَعُوْنَ: پھر ان کو روکا جاتا تھا انتظام بحال کرنے کے لئے تا کہ پچھلے ساتھ مل کر سارے اکٹھے ہو جائیں، تو يُوْزَعُوْنَ کا یہ ترجمہ بھی کیا جاسکتا ہے''ان کو روکا جائے گا''

اَعضا گواہی دیں گے

حَتّٰۤى اِذَا مَا جَآءُوْهَا: مَا زائدہ ہے۔ حتیٰ کہ جب وہ لوگ اس آگ کے پاس آجائیں گے، جہنم سامنے ہوگی، شَهِدَ عَلَيْهِمْ سَمْعُهُمْ: گواہی دیں گے اُن پر اُن کے کان، وَاَبْصَارُهُمْ: اور ان کی آنکھیں، وَجُلُوْدُهُمْ: اور ان کے چمڑے، بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: ان کاموں کے ساتھ جو وہ کیا کرتے تھے، یعنی یہ ان کے اعضا جو ہیں، یہی سارے کے سارے شاہد ہوں گے اور ان کی ساری کی ساری بداعمالیاں نمایاں کردیں گے، وَقَالُوْا لِجُلُوْدِهِمْ: جس وقت ان کے اَعضا بولیں گے تو وہ اپنے اَعضا سے کہیں گے۔ جلود، جلد کی جمع ہے، جلد چمڑے کو کہتے ہیں، اور چمڑا چونکہ سارے بدن کے اَعضا کے اُوپر محیط ہوتا ہے اس لئے یہاں جلود سے تمام اَعضا مراد ہیں (آلوسی)،'' کہیں گے وہ اپنے چمڑوں کو'' یعنی اپنے اَعضا کو، یعنی بدن کے مختلف اَعضا، ان سے کہیں گے لِمَ شَهِدْتُّمْ عَلَيْنَا: تم نے ہمارے خلاف گواہی کیوں دے دی؟ یہ اپنے اَعضا کو خطاب کر کے کہیں گے، قَالُوْۤا اَنْطَقَنَا اللّٰهُ الَّذِيْۤ اَنْطَقَ كُلَّ شَيْءٍ:

وہ کہیں گے کہ بلوایا ہمیں اللہ نے جس نے بلوایا ہر چیز کو، ہر چیز کو نطق دینے والا اللہ ہے اسی نے آج ہمیں بھی بُلا لیا، تو اس کے بُلانے کے سامنے ہم کس طرح سے چپ رہ سکتے تھے؟ جب اللہ نے بلایا ہم بول پڑے۔

جدید اِیجادات نے شرعی حقائق کا سمجھنا آسان کردیا ہے

اَعضا کی گواہی کا ذکر سورۂ یٰسٓ میں بھی آپ کے سامنے آیا تھا، وہاں ذکر کیا تھا کہ قرآن اور حدیث نے ہمارے سامنے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان جو کچھ کرتا جاتا ہے وہ سارے کا سارا اس کے اَعضا کے اندر ریکارڈ ہوتا چلا جاتا ہے، اور آج یہ بات سمجھنی کوئی مشکل نہیں رہی، کہ ہمارے سامنے اس قسم کی چیزیں آجاتی ہیں جو بظاہر بے جان معلوم ہوتی ہیں، لیکن انسان کی آواز اور اس کے کردار کو ہر طرح سے وہ ضبط کرلیتی ہیں، فوٹو کے اندر کس طرح سے انسان کی شکل ضبط ہوجاتی ہے، اور یہ جو ٹیلی ویژن میں متحرک تصویریں دکھائی جاتی ہیں تو اس میں ایک ایک حرکت کو ضبط کرلیا جاتا ہے، اور ٹیپ ریکارڈ جو رکھی ہوئی ہے تو یہ ایک ایک لفظ کو کس طرح سے ضبط کرتی چلی جارہی ہے، اب ان چیزوں کو سمجھنا کوئی مشکل نہیں رہا، جس طرح سے زمانہ نبوّت سے دُور ہوتا چلا جارہا ہے اور لوگوں کے ایمان کے اندر ضعف آتا جارہا ہے تو اللہ کی طرف سے اس قسم کی ایجادات بھی سامنے آرہی ہیں جو بندوں کے ہاتھ سے ہی ہورہی ہیں، جن کے ساتھ ان حقائق کا سمجھنا آسان ہوگیا، اور پہلے جس وقت انبیاء ﷺ بیان کرتے تھے تو لوگ اپنی قوتِ ایمان کے ساتھ ان چیزوں کو سمجھ لیتے تھے، اس وقت لوگوں کے ذہن میں اس قسم کے اِشکالات نہیں آتے تھے کہ یہ بے جان چیزیں کس طرح سے بولیں گی؟ اور آج چونکہ ایمان میں ضعف آگیا اور زمانہ نبوّت سے دُور ہوگیا تو لوگ اس قسم کے شبہات نکالتے ہیں، تو اللہ نے مثالیں ہمارے سامنے رکھ دیں کہ دیکھو! بولنے کے لئے کوئی زبان ہی ضروری نہیں ہوتی، ایک بے جان چیز ہے اور اس میں کس طرح سے الفاظ محفوظ ہوجاتے ہیں؟ اسی طرح سے تمہارے ہاتھ کو بلایا جائے گا وہ بھی بولنے لگ جائے گا، پاؤں کو بلایا جائے گا یہ بھی بولنے لگ جائے گا، بدن کے جس حصے سے سوال کیا جائے گا وہ سارے کا سارا جواب دے گا، اور آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے وہ آنکھ میں فلم ہوتا چلا جارہا ہے، اس لئے یہ حقائق سمجھنے آج آسان ہوگئے ہیں۔ ''وہ کہیں گے کہ بلالیا ہمیں اس اللہ نے جس نے کہ بلایا ہر چیز کو'' وَهُوَ خَلَقَكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ: اسی نے تمہیں پیدا کیا پہلی مرتبہ، وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ: اور اسی کی طرف ہی تم لوٹائے جاتے ہو۔

اِرتکابِ معصیت کی ایک وجہ علمِ اِلٰہی کا اِستحضار نہ ہونا ہے

وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَتِرُوْنَ اَنْ يَّشْهَدَ عَلَيْكُمْ سَمْعُكُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُكُمْ وَلَا جُلُوْدُكُمْ: نہیں چھپا کرتے تھے تم اس اندیشے سے، مخافۃ اَنْ يَّشْهَدَ، نہیں چھپا کرتے تھے تم اس اندیشے سے کہ گواہی دیں گے تم پر تمہارے کان اور نہ اس اندیشے سے کہ گواہی دیں گی تم پر تمہاری آنکھیں، نہ اس اندیشے سے کہ گواہی دیں گے تم پر تمہارے چمڑے۔ وَلٰكِنْ ظَنَنْتُمْ: لیکن تمہارا گمان یہ تھا کہ اَنَّ اللّٰهَ لَا يَعْلَمُ كَثِيْرًا مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ: کہ اللہ جانتا نہیں بہت سارے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو۔ یہ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں تفصیل عرض کی تھی کہ انسان معصیت کا ارتکاب جب بھی کرتا ہے تو اِخفاء کے جذبے سے کیا کرتا ہے، انسان گناہ کرتا ہے تو چھپانے کے جذبے سے کرتا ہے، جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کا کسی کو پتا نہیں چلے گا، اور اگر انسان کے ذہن میں یہ رہے کہ ہمارا گناہ چھپا نہیں رہ سکتا، یہ تو ظاہر

ہونے والی بات ہے، کئی گواہ اردگرد کھڑے ہیں جو کہ اس کے اوپر گواہی دے دیں گے کہ اس شخص نے یہ جرم کیا ہے تو پھر انسان کو گناہ کرنے کی جرأت نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں تم جو چھپ چھپ کے گناہ کیا کرتے تھے تو وہ تمہارا چھپنا اس وجہ سے نہیں ہوتا تھا کہ تمہیں ڈر لگتا تھا کہ کہیں ہمارے اعضا ہم پہ گواہی نہ دے دیں، کیونکہ اعضا سے تو تم جدا ہو سکتے ہی نہیں تھے، ادھر تو تمہارا دھیان ہی نہیں جاتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ سی آئی ڈی کے آدمی پیچھے لگائے ہوئے ہیں، یہ جاسوس ہمارے پیچھے لگے ہوئے ہیں، ان سے ڈر نہیں ہوتا تھا تمہیں، تم اس لئے چھپ چھپ کے کرتے تھے کہ تمہارا خیال یہ تھا، تمہارا گمان یہ تھا (چاہے ان کے دل میں یہ بات نہ ہو لیکن حال سے استنباط کر کے یہ بات ذکر کی جا رہی ہے) گویا کہ تم اللہ سے چھپتے تھے اور سمجھتے تھے کہ ہم جس وقت چھپ کے کام کریں گے تو اللہ کو پتا نہیں چلے گا، ورنہ اگر تم اللہ کے محیط علم کے قائل ہوتے اور تمہیں یہ اندیشہ ہوتا کہ ہمارے اعضا ہمارے گواہ ہیں، یہ ایک وقت گواہی دے کر ہمارے جرم کو ظاہر کر دیں گے تو پھر تم معصیت کس طرح سے کرتے؟ تم نے اللہ کے علم کے متعلق صحیح عقیدہ نہیں رکھا، اور یہ انجام تمہارے سامنے نہیں تھا کہ تمہارے اعضا تمہارے خلاف گواہی دیں گے، اس لئے تم چھپ چھپ کر جرم کیا کرتے تھے، یہ دونوں باتیں اگر انسان کے ذہن میں ہوں کہ اللہ جانتا ہے اور اللہ سے ہم چھپ نہیں سکتے اَلَمْ يَعْلَمْ بِاَنَّ اللّٰهَ يَرٰى (سورۂ علق)، اور اسی طرح سے اگر انسان کو یہ بات مستحضر ہو کہ بدن کے اعضا ہی ہمارے خلاف گواہ ہو جائیں گے اور یہ زمین ہمارے خلاف گواہی دے گی تو پھر چھپ چھپ کے انسان جرم کہاں کرتا ہے، یہ چھپنے کا جذبہ پیدا ہی تب ہوتا ہے کہ جب اس کو اللہ کے علم کا استحضار نہیں رہتا اور اپنے اعضا کے متعلق اس قسم کا تصور نہیں ہوتا کہ کسی وقت گواہی یہ دے کر پکڑا دیں گے۔ تو علم کا استحضار یہ گناہ سے روکنے والی بات ہے، وَذٰلِكُمْ ظَنُّكُمُ الَّذِیْ ظَنَنْتُمْ بِرَبِّكُمْ: یہی تمہارا گمان جو تم نے اپنے رب کے متعلق کیا، اَرْدٰىكُمْ: اس گمان نے تمہیں برباد کر دیا، اگر تم اللہ کے علمِ محیط کے قائل ہو جاتے اور یہ سمجھتے کہ اللہ کے سامنے کوئی چیز چھپی ہوئی نہیں ہے، تو تم بدکرداریوں میں مبتلا نہ ہوتے، آج تمہارا انجام اچھا ہوتا، "یہی تمہارا گمان جو تم نے اپنے رب کے ساتھ کیا اس نے تمہیں برباد کر دیا" فَاَصْبَحْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِیْنَ: پس ہو گئے تم خسارہ پانے والوں میں سے۔

کفّار کو نہ صبر کام آئے گا نہ توبہ قبول ہوگی

فَاِنْ يَّصْبِرُوْا فَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ: پھر اگر یہ لوگ صبر کریں تو بھی آگ ان کا ٹھکانا ہے، یعنی یہ نہیں کہ صبر کی وجہ سے ان پر رحم آجائے گا اور یہ چھوٹ جائیں گے، صبر کریں تو بھی جہنم ٹھکانا ہے، صبر نہیں کریں گے تو بھی ٹھکانا ہے، جس طرح سے دوسری جگہ آیا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا (سورۂ طور:۱۶) کہ صبر کرو یا نہ کرو، اب نکلنے کی کوئی صورت نہیں ہے، وَاِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِیْنَ: مُعْتَبِیْن یہ لفظ عتاب سے لیا گیا ہے، عتاب کہتے ہیں غصے کو، اَعْتَبَ اِعْتَابًا یہ سلبِ عتاب کے معنی میں ہے، باب افعال کا ایک خاصہ ہے سلبِ ماخذ، اَعْتَبَ کا معنی سلبِ عتاب، تو مُعتَب کہتے ہیں اس شخص کو جس سے سلبِ عتاب کر لیا گیا ہو، عتاب اس سے زائل کر دیا گیا ہو، استعتاب کا معنی ہوتا ہے کہ سلبِ عتاب کا مطالبہ کرنا، "اگر وہ راضی کرنا چاہیں گے تو ان کے اوپر رضا نہیں ہوگی" یہ اس کا اصل مفہوم ہے، یعنی اگر وہ یہ چاہیں کہ ان سے عتاب کو زائل کر دیا جائے تو ان سے عتاب کو زائل نہیں کیا جائے گا، وہ ان

لوگوں میں سے نہیں ہوں گے جن سے عتاب کو زائل کر دیا جاتا ہے، اِنْ يَّسْتَعْتِبُوْا: اگر وہ ازالۂ عتاب کا مطالبہ کریں گے، فَمَا هُمْ مِّنَ الْمُعْتَبِيْنَ: تو وہ ان لوگوں میں سے نہیں ہوں گے جن سے عتاب زائل کر دیا جاتا ہے۔ اس مفہوم کو محاورۃً اگر آپ ادا کرنا چاہیں تو ''اگر وہ توبہ کریں گے تو ان کی توبہ قبول نہیں کی جائے گی، اگر وہ راضی کرنے کی کوشش کریں گے تو ان کے اُوپر رضا نہیں ہوگی'' یہ اس کا مفہوم ہے۔ اور لفظی ترجمہ اسی طرح سے ہے ''اگر وہ یہ مطالبہ کریں کہ ان سے عتاب زائل کر دیا جائے تو وہ عتاب زائل کیے ہوئے لوگوں میں سے نہیں ہوں گے'' ان سے عتاب زائل نہیں کیا جائے گا، یعنی ہمیشہ ان کے اُوپر عتاب رہے گا، ناراضگی رہے گی، اب اس ناراضگی کے زائل کرنے کی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ یہ مفہوم سمجھ گئے؟

کافروں کے خسارے کا فیصلہ ہو چکا ہے

وَقَيَّضْنَا لَهُمْ قُرَنَآءَ: قُرناء قرین کی جمع ہے، ''اور ہم نے متعین کر دیے ان کے لئے ساتھی'' اور ان قرناء سے شیاطین مراد ہیں، فَزَيَّنُوْا لَهُمْ مَّا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ: پس وہ مزین کرتے ہیں ان کے لئے ان چیزوں کو جو ان کے سامنے ہیں اور جو ان کے پیچھے ہیں، اگلے پچھلے حالات، آگے پیچھے عیش وعشرت کا سامان مزین کرتے ہیں، وَحَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ: اور ان کے اُوپر بات ثابت ہوگئی، فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ: اس حال میں کہ یہ داخل ہونے والے ہیں جماعتوں میں جو ان سے پہلے گزر گئے، یعنی دوسری جماعتوں میں داخل ہو کر، دوسری جماعتوں کے ساتھ اِن پر بھی بات ثابت ہوگئی، ''جو جماعتیں ان سے پہلے گزری ہیں جنوں اور انسانوں کی'' سب کے متعلق مشترکہ فیصلہ یہ ہوا کہ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ: کہ بے شک یہ خسارہ پانے والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ ۝۲۶

کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کُفر کیا: نہ سُنا کرو اِس قرآن کو اور اس میں لغو حرکتیں کیا کرو شاید کہ تم غالب آجاؤ ۝۲۶

فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا ۙ وَّلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا

پس البتہ ضرور چکھائیں گے ہم ان لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا سخت عذاب، اور البتہ ضرور بدلہ دیں گے ان کو ان کے بدترین اعمال کا جو

يَعْمَلُوْنَ ۝۲۷ ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ النَّارُ ۚ لَهُمْ فِيْهَا دَارُ الْخُلْدِ ۭ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا

یہ کیا کرتے تھے ۝۲۷ اللہ کے دشمنوں کا یہی بدلہ ہے یعنی جہنم، ان کے لئے اس میں ہمیشگی کا گھر ہے، بدلہ دیے گئے بسبب اس کے کہ وہ

بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُوْنَ ۝۲۸ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ

ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے ۝۲۸ کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، اے ہمارے رَبّ! دِکھا دے ہمیں وہ دونوں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا

الْجِنِّ وَالْاِنْسِ نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ ﴿۲۹﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ

یعنی جن اور انسان، کریں گے ہم ان دونوں کو اپنے قدموں کے نیچے تا کہ وہ ہو جائیں اسفلین میں سے ﴿۲۹﴾ بے شک وہ لوگ

قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا

جو کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے، پھر اس بات پر ڈٹ جاتے ہیں ان کے اوپر فرشتے اُترتے ہیں یہ بات لے کر کہ نہ تم خوف کرو اور نہ غم کرو

وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ﴿۳۰﴾ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي

اور جنت کی بشارت سُن لو جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے ﴿۳۰﴾ ہم تمہارے دوست ہیں دُنیوی زندگی میں بھی اور

الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ ﴿۳۱﴾

آخرت میں بھی، تمہارے لئے اُس جنت میں وہ چیز ہے جس کو تمہارا جی چاہے گا، اور تمہارے لئے وہ چیز ہے جس کو تم طلب کرو گے ﴿۳۱﴾

نُزُلًا مِّنْ غَفُوْرٍ رَّحِيْمٍ ﴿۳۲﴾

اس حال میں کہ یہ مہمانی ہے غفور رحیم کی طرف سے ﴿۳۲﴾

تفسیر

قرآن کی آواز کو دبانے کے لئے مشرکین کی ایک اوچھی تدبیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ: کہا ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا نہ سنا کرو اس قرآن کو، وَالْغَوْا فِيْهِ: اور اس میں شور مچایا کرو، لغو حرکتیں کیا کرو، لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ: تا کہ تم غالب آجاؤ، یا، شاید کہ تم غالب آجاؤ۔ کفار اور مشرکین جب قرآنِ کریم کا دلائل کے ساتھ مقابلہ نہ کر سکے تو انہوں نے جدال بالباطل، غلط باتوں کے ساتھ شبہات پیدا کر کے جھگڑنے کی کوشش کی، اور اس میں بھی بار بار شکست ہوئی تو پھر انہوں نے یہ ایک طریقہ تجویز کیا، یہ آپس میں ایک دوسرے سے کہتے ہیں کہ جس وقت محمد ﷺ اللہ کا قرآن پڑھیں، وعظ اور تبلیغ کے طور پر، تو تم اس میں شور مچانے لگ جایا کرو، سنا نہ کرو، کوئی نہ کوئی ہنگامہ کھڑا کر دیا، جہاں بھی کوئی ایسی مجلس لگی جس میں حضور ﷺ قرآن سنائیں تو اس میں شور و غوغا کے ذریعے سے معاملے کو خراب اور خلط ملط کرنے کی کوشش کرو، ہو سکتا ہے کہ اسی طرح سے ہی غالب آجاؤ، تو حق کے مقابلے میں اپنے مسلک کو وہ غالب کرنے کے لئے جو تدبیریں اختیار کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی ان کی اوچھی تدبیر ہے، ''نہ سنا کرو اس قرآن کو'' یعنی آپس میں ایک دوسرے کو کہتے ہیں، کان ہی نہ لگاؤ، دھیان ہی نہ کرو، وَالْغَوْا فِيْهِ: قرآن میں لغو کرو، یعنی قرآنِ کریم کی مجلس میں، جہاں قرآنِ کریم

پڑھا جائے، حضور ﷺ لوگوں کو سنانے سمجھانے کے لئے پڑھیں تو وہاں شور وغوغا شروع کر دیا کرو، اِلْغَوْا: لغو سے لیا گیا ہے، بک بک لگا دیا کرو، لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ: شاید کہ تم غالب آجاؤ، اسی طرح سے ہی قرآنِ کریم کی آواز کو دبالو۔ فَلَنُذِيْقَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَذَابًا شَدِيْدًا: یہ ایسے لوگوں کے لئے وعید ہے جو قرآنِ کریم کی باتوں کو لغو حرکتوں کے ذریعے سے دبانے کی کوشش کرتے ہیں، یہ کافر لوگ، ''پس البتہ ضرور چکھائیں گے ہم ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا سخت عذاب'' وَلَنَجْزِيَنَّهُمْ اَسْوَاَ الَّذِيْ كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: اور البتہ ضرور بدلہ دیں گے ان کو ان کے بدترین اعمال کا جو یہ کیا کرتے تھے، اور ان بدترین اعمال میں سے ایک عمل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کو توجہ سے سنتے نہیں اور لغو حرکتوں کے ساتھ اس کی آواز کو دبانا چاہتے ہیں۔

قرآنِ کریم کو سننے کے متعلق شرعی اَحکام

تو یہاں مفسرین نے اشارہ کیا ہے اس بات کی طرف کہ قرآنِ کریم جس وقت پڑھا جا رہا ہو اس وقت توجہ کر کے ادب کے ساتھ اس کو سننا چاہیے، ایک تو ہے کہ نماز یا خطبے میں قرآنِ کریم کا پڑھنا، کہ امام جب نماز میں تلاوت کر رہا ہو تو اِنصات اور اِستماع فرض ہے، اسی طرح جب خطیب خطبے میں قرآنِ کریم پڑھ رہا ہو تو دو وجہ سے اِنصات اور اِستماع فرض ہے ایک تلاوتِ قرآن کی وجہ سے، دوسرا جزوِ خطبہ ہونے کی وجہ سے۔ البتہ عام مجالس کے اندر اگر قرآنِ کریم پڑھا جا رہا ہو، جیسے ایک شخص تلاوت کر رہا ہے، جلسے میں تلاوت ہوتی ہے، یا ریڈیو پہ تلاوت ہوتی ہے، ریڈیو کھول دیا جاتا ہے اور تلاوت کی آواز آ رہی ہے، تو ایسے وقت میں بھی ادب یہی ہے کہ آپس میں باتوں میں نہ لگو اور شور برپا نہ کرو، بلکہ قرآنِ کریم کو توجہ کے ساتھ سنو، ادھر توجہ نہ کرنا اور اپنی باتوں میں لگے رہنا، یا اپنے دوسرے کاموں میں لگے رہنا، یہ مؤمنانہ شان کے منافی ہے۔ ہاں! البتہ اگر کوئی اس نیت سے شور مچائے تاکہ کوئی شخص قرآنِ کریم نہ سنے اور ادھر توجہ نہ کرے، ہم اپنے شور کے اندر اس آواز کو دبالیں، پھر یہ کُفر ہے۔ اس جذبے کے بغیر جس طرح سے بعض مؤمن، ایمان والے، اہلِ ایمان جلسوں میں یا مجلسوں میں قرآنِ کریم کی تلاوت کے وقت میں آپس میں باتیں کرتے رہتے ہیں، اس کو تو ادب کے خلاف ہی کہا جائے گا، کیونکہ ان کا مقصد قرآنِ کریم کی آواز کو دبانا نہیں ہوتا، اور نہ ان کا یہ مقصد ہوتا ہے کہ ہم شور مچائیں تاکہ کوئی دوسرا نہ سنے، اس لئے ان کا بولنا تو ادب کے خلاف ہے، خارجِ صلوٰۃ میں قرآنِ کریم کا سننا فرض نہیں، لیکن بہرحال ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ جب اللہ کی کتاب پڑھی جائے تو انسان توجہ کے ساتھ اس کو سنے، اپنی گفتگو میں لگنا اپنی باتوں میں لگنا یہ مناسب نہیں ہوتا۔ اور اس کو دبانے کے لئے اور خلط کرنے کے لئے شور مچانا یہ کُفر ہے، اس جذبے کے تحت شور مچانا تاکہ کوئی دوسرا نہ سُن سکے، تو ایسے لوگوں کے لئے یہ وعید سنائی گئی کہ ہم ان کو سخت عذاب کا مزہ چکھائیں گے، اور ان کے بدترین اعمال کا ان کو ضرور بدلہ دیں گے۔

اللہ کے دُشمنوں کے ٹھکانا

ذٰلِكَ جَزَآءُ اَعْدَآءِ اللّٰهِ: یہی بدلہ ہے اللہ کے دشمنوں کا، اللہ کے دشمن انہیں کہا گیا ہے جو قرآنِ کریم سنتے نہیں یا سننے نہیں دیتے، شور مچا کے اس کی آواز کو دبانا چاہتے ہیں، یہ اعداء اللہ ہیں، اللہ کے دشمن، اللہ کے دین کے دشمن، اللہ کے رسول کے دشمن،

اولیاء اللہ کے دشمن، یہ سب اعداء اللہ کا مصداق ہیں، ''اللہ کے دشمنوں کا یہی بدلہ ہے'' النَّارُ: یہ اس جزا کا بیان ہے، یعنی جہنم، ''اللہ کے دشمنوں کا یہی بدلہ ہے یعنی جہنم'' لَهُمْ فِيهَا دَارُ الْخُلْدِ: ان کے لئے اس میں ہیشگی کا گھر ہے، جَزَآءً بِمَا كَانُوا بِاٰيٰتِنَا يَجْحَدُونَ: يُجْزَوْنَ جَزَآءً (نسفی) بدلہ دیئے گئے بدلہ دیا جانا ہماری آیات کے انکار کرنے کا، اور بِمَا كَانُوا میں مَا مصدر یہ ہے، ہماری آیات کا انکار کرنے کی وجہ سے، بسبب اس کے کہ وہ ہماری آیات کا انکار کیا کرتے تھے۔

کُفرِ جحود کیا ہے؟

اور جحود ہوا کرتا ہے کہ جب دِل میں تو اِنسان مانتا ہے اور اُوپر سے انکار کرتا ہے، فرعونیوں کے متعلق جیسے یہی لفظ آیا تھا جَحَدُوا بِهَا وَاسْتَيْقَنَتْهَا اَنْفُسُهُمْ (سورۂ نمل: ۱۴) ان کے دِلوں میں تو یہ یقین تھا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ بیان فرمار ہے ہیں یہ اللہ کی طرف سے آیات ہیں اور موسیٰ اللہ کا رسول ہے، لیکن اس کے باوجود وہ زبانوں سے انکار کرتے رہے، اس کو کُفرِ جحود کہا جاتا ہے، جس طرح سے زبان سے انسان مانتا ہو اور دِل سے انکار کرتا ہو تو اس کو کُفرِ نفاق کہا جاتا ہے، تو دِل میں جانتا ہوا زبان سے انکار کرے تو یہ کُفرِ جحود ہے۔

کُفّار کا اپنے پیشواؤں پر اظہارِ غصہ!

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا رَبَّنَآ اَرِنَا الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا مِنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ: کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، یہ ماضی کا صیغہ استعمال کیا اور یہ واقعہ ہے قیامت کا، اللہ تعالیٰ کے سامنے ماضی حال مستقبل سب برابر ہیں، اور آپ اپنی علمی اصطلاح میں کہا کرتے ہیں کہ تحقق وقوع کی وجہ سے مستقبل کو ماضی سے تعبیر کر دیا، چونکہ یہ بات یقینی ہے کہ وہ ایسا کہیں گے تو یوں سمجھو کہ کہہ ہی رہے ہیں یا انہوں نے کہہ ہی دی، یہ فصاحت بلاغت کے اُصولوں میں آپ پڑھتے ہیں کہ جو بات یقیناً ہونے والی ہوتی ہے اس کو بسا اوقات ماضی کے ساتھ تعبیر کر دیا جاتا ہے، گویا کہ وہ ہو ہی گئی، تو ترجمہ یہاں مضارع کے ساتھ ہی کریں گے چونکہ ہمارے لئے واقعہ یہی ہے کہ یہ قیامت کو ایسا ہوگا، ''کہیں گے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا، اے ہمارے رَبّ!'' اَرِ: اَمر کا صیغہ، دکھا دے ہمیں، الَّذَيْنِ اَضَلّٰنَا: وہ دونوں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا، الَّذَيْنِ تثنیہ آ گیا، ''وہ دونوں جنہوں نے ہمیں گمراہ کیا یعنی جن اور انسان'' تو یہ دو نوعیں مراد ہیں، نوعِ جن میں سے جو ہماری گمراہی کا باعث بنے اور نوعِ انسان میں سے جو ہماری گمراہی کا باعث بنے یہ دونوں ہمارے سامنے نے آ، ہمیں دکھا دے، نَجْعَلْهُمَا تَحْتَ اَقْدَامِنَا: کریں گے ہم ان دونوں کو اپنے قدموں کے نیچے، لِيَكُوْنَا مِنَ الْاَسْفَلِيْنَ: تا کہ ہو جائیں وہ دونوں اسفلین میں سے، اسفل: سب سے نیچے، یعنی کافر اور مشرک جس وقت اللہ کے عذاب کو دیکھیں گے تو پھر ان کو اپنے لیڈروں کے اُوپر غصہ آئے گا، اور وہ سمجھیں گے کہ فلاں نے ہمیں بہکایا، جنوں میں سے بھی شیاطین ہیں جو انسان کو بہکاتے ہیں، ان کا بھی اِدراک ان کو ہو جائے گا اور یقین ہو جائے گا، اور انسان بھی ہیں جو ایک دوسرے کی گمراہی کا باعث بنتے ہیں، تو وہ کہیں گے کہ یا اللہ! یہ دونوں قسمیں جن اور انسان، یہ ہمارے سامنے لے آ جو ہماری گمراہی کا باعث بنے ہیں، ''ہم ان کو اپنے پاؤں کے نیچے روندیں گے تا کہ وہ نچلے درجے میں ہو جائیں'' ہم سے بھی نیچے چلے جائیں، تو ہمیں ایک دفعہ

دکھادے۔دُنیا کے اندر رہتا ہوا انسان اپنے دوستوں پر، اپنے لیڈروں پر، اپنے قائدوں کے اُوپر جان چھڑکتا ہے، اور ہر قسم کی قربانی دینے کی کوشش کرتا ہے، اور اللہ کا رسول بُلاتا رہے، سمجھاتا رہے، اس کی طرف توجہ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کی باتوں کی طرف دھیان نہیں کرتا، اپنے دوستوں کے پیچھے لگتا ہے، لیڈروں کے پیچھے لگتا ہے، تو قیامت کے دن پھر انہی پر ہی سب سے زیادہ غصہ آئے گا، کہیں گے کہ آج اگر ہمیں نظر آجائیں، تو ہم ان کو اپنے پاؤں سے روندیں گے، پاؤں کے نیچے لے لیں گے تاکہ وہ نچلے درجے میں چلے جائیں، یہ ان کا انجام واضح کیا گیا ہے جو آج دوستیوں اور یاریوں کی بنا پر ایک دوسرے کے پیچھے لگ کر گمراہی میں جارہے ہیں۔

عقیدۂ رُبوبیت کی اہمیت

مقابلے میں دوسری قسم! اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ: بے شک وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے، ثُمَّ اسْتَقَامُوْا: پھر اس کے اُوپر اِستقامت اختیار کرتے ہیں، اس بات پر ڈٹ جاتے ہیں، جم جاتے ہیں، اور اس کو کسی صورت میں چھوڑتے نہیں، تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: ان کے اُوپر فرشتے اُترتے ہیں یہ بات لے کر اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا: کہ نہ خوف کرو، نہ حزن کرو، وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ: خوش ہو جاؤ اس جنت کے ساتھ جس کا تم وعدہ کئے جاتے تھے۔

قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ: ہمارا رَبّ اللہ ہے یعنی اللہ ہی ہے، کسی دوسرے کو وہ رَبّ نہیں سمجھتے، ''رَبّ'' کا مفہوم آپ کے سامنے بارہا ذکر کر دیا گیا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ قرآنِ کریم کی اِبتدا جو ہوئی وہ بھی اللہ کو رَبّ العالمین قرار دینے کے ساتھ ہی ہوئی، قرآنِ کریم کا اختتام جو کیا گیا تو قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کا ذکر کیا گیا، تو اِبتدا، اِنتہا دونوں میں اللہ کی رُبوبیت کو واضح کیا گیا ہے، اور جس وقت اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا تھا، آدم علیہ السلام کی پشت سے ان کی ساری اولاد نکالی تھی، تو سب سے پہلی آواز اللہ تعالیٰ کی جو انسانوں کے کان میں ڈالی گئی تھی بدءِ فطرت میں، وہ بھی یہی ہے اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ (سورۂ اَعراف: ۱۷۲) کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟ تو سب سے پہلے جو تعارف کرایا اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کا تو لفظِ رَبّ کے ساتھ ہی کروایا، جیسے کہ واقعہ آپ کے سامنے گزر چکا سورۂ اَعراف میں، اور احادیث میں بھی اس کی تفصیل موجود ہے، اور ہم نے بھی جو اقرار کیا تھا تو یہی کیا تھا بَلٰى۔ بَلٰى کا معنی کہ آپ ہمارے رَبّ ہیں، اَنْتَ رَبُّنَا تو ہمارا رَبّ ہے، تو سب سے پہلے پوچھا بھی یہی گیا، اور دنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی مطالبہ اسی بات کا ہی ہے اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا کہ اپنا رَبّ اللہ کو قرار دو، اللہ ہی کو اپنا رَبّ سمجھو، پھر اسی کے اوپر ڈٹے رہو، زندگی اسی طرح سے گزارو، اور اس زندگی کو گزار کے جس وقت آپ عالمِ برزخ کی طرف منتقل ہوں گے، عملی زندگی ختم ہوگی، تو وہاں جو سب سے پہلے سوال ہوگا وہ بھی آپ جانتے ہیں کہ یہی ہے، قبر کے اندر جو سوال کیا جاتا ہے وہ کیا ہے؟ مَنْ رَّبُّكَ؟ تیرا رَبّ کون ہے؟ تو مرنے کے بعد سب سے پہلے سوال بھی اسی چیز کا ہی ہے، تو اندازہ کیجئے! کہ اللہ کی رُبوبیت اور اللہ کو رَبّ جاننا یہ کتنا محیط ہے، کتاب اللہ کی اِبتدا اسی سے ہوئی، کتاب اللہ کو ختم اسی عنوان پہ کیا گیا، اور انسانوں کی ابتدا بھی اسی سے ہوئی کہ اللہ کی طرف سے سب سے پہلا یہی لفظ انسان کے کان میں ڈالا گیا، اور اسی کے متعلق ہی سوال کیا گیا، اقرار کروایا گیا، اور

مرنے کے بعد جس وقت پھر آگے امتحان ہوگا اور آپ کی جانچ پڑتال ہوگی کہ آپ زندگی کیسے گزار کے آئے ہیں؟ تو سب سے پہلے یہی مسئلہ پوچھا جائے گا کہ تیرا رَبّ کون ہے؟ اور زندگی کے اندر مطالبہ بھی اسی عقیدے کے اُوپر اِستقامت کا ہے کہ اللہ کو اپنا رَبّ کہو، اور پھر اسی کے اُوپر ہی ڈٹے رہو، کوئی شخص تمہیں اس سے پھسلانے نہ پائے، تو یہ رُبوبیت کا مسئلہ کتنا محیط ہے، اسی سے ہی بنیاد اُٹھتی ہے سارے کے سارے ایمان کی، یہی ایمان کی بنیاد ہے۔

اور ''رَبّ'' کا مفہوم ہوا کرتا ہے جس کو آپ اپنی زبان میں ''پالن ہار'' کہتے ہیں، پالنے والا، یعنی ضروریات پوری کرنے والا۔ وہی پیدا کرتا ہے، وہی ضروریات پوری کرتا ہے، بس یہ چھوٹا سا مفہوم ہے لفظ ''رَبّ'' کا، حاصل اس کا یہ ہے کہ جب ضرورتیں پوری کرنے والا اسے ہی سمجھو گے تو پھر تم کسی دوسرے کے دروازے پہ جھکو گے کیسے؟ دوسروں کے سامنے جا کر جھکتے تو اسی لئے ہو، تم سمجھتے ہو کہ یہ ہماری ضرورت اس سے متعلق ہے یہ پوری کرے گا، اور اگر آپ اپنے آپ کو کسی دوسرے کا محتاج ہی نہ سمجھیں سوائے اللہ کی ذات کے، تو پھر کسی دوسرے کے سامنے جھکنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، تو اگر اللہ تعالیٰ کی رُبوبیت کو صحیح طور پر سمجھ لیا جائے تو اس سے پھر توحید کی بنیاد اُٹھتی ہے، کہ انسان اپنے پیدا کرنے والا بھی اسے ہی سمجھتا ہے اور اپنے بنانے بگاڑنے والا بھی اسی کو سمجھتا ہے، اور ضرورتیں پوری کرنے والا بھی اسی کو سمجھتا ہے، کوئی ضرورت ہو، دِینی ہو یا دُنیوی ہو وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہی متعلق ہے، جب یہ عقیدہ ہو جائے گا تو نفع وضرر کا مالک اسے ہی سمجھو گے، اور اسی کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ گے، اسی کی طرف ہی جھکو گے، کسی دوسرے کی طرف انسان کا قلب متوجہ ہوتا ہی نہیں، بس انسان کے ذہن میں اگر احتیاج آئے گا تو اللہ ہی کی طرف آئے گا، اور اپنی مشکل کے وقت میں پکارے گا تو اسی اللہ ہی کو پکارے گا، کسی چیز کی ضرورت ہوگی اور کوئی ضرورت محسوس کرے گا تو اسی کے سامنے ہی ہاتھ پھیلائے گا، دامن پھیلائے گا، بس اتنا سا نکتہ ہے اگر کسی کی سمجھ میں آ گیا تو یوں سمجھو کہ ایمان کی صحیح بنیاد قلب کے اندر پیدا ہو گئی۔

بریں است بنیادِ توحید و بس (۱)

توحید کی بنیاد اگر ہے تو اسی بات پر ہی ہے کہ نفع وضرر کا مالک اسی کو سمجھتے ہوئے اپنی ہر قسم کی ضروریات اسی سے متعلق کرو اور اپنے اوپر ہر قسم کا تصرف اسی کا ہی مانو، تو جس نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا پھر اس کے اُوپر ڈٹ گیا تو سمجھو! کہ اس کا ایمان صحیح ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مقبول ہے، آگے پھر سلسلہ......! جس طرح سے ایک بیج سے شجر پھیلتا ہے، درخت نکلتا ہے، تو شاخیں پھوٹیں گی، جب مانتے ہو کہ پیدا کرنے والا وہی ہے، مانتے ہو کہ کھلاتا پلاتا وہی ہے یُطۡعِمُنِیۡ وَیَسۡقِیۡنِ (سورۂ شعراء:۷۹)، اور آپ کی سب ضروریات پوری وہی کرتا ہے، وہ منعم ہے تو شکر گزاری بھی اُسی کی، اطاعت بھی اسی کی، محبت بھی اسی کی، اسی سے آگے پھر سارے کا سارا احکام کا سلسلہ شروع ہو جائے گا، کہ جس کا کھاتے ہو پھر اسی کی اطاعت کرو، اسی کے گن گاؤ، اور سارا معاملہ آگے چلتا چلا جائے گا، بنیاد صحیح قائم ہو جانی چاہیے قلب میں، تو اس لئے رَبُّنَا اللّٰہُ کہہ کے اس کے اُوپر جو جم جانے والے ہیں، جو اللہ کو اپنا رَبّ قرار دے کر اس کے اوپر ڈٹ جاتے ہیں، پھر کسی کے ہلائے ہلتے نہیں، ان کے خیالات میں تزلزل نہیں آتا، یہی کامیاب

(۱) ''گلستان'' باب ہشتم کا آخر۔

ہیں، ان کے اُوپر فرشتے اُترتے ہیں، موت کے وقت اُتریں گے، قبروں سے نکلتے وقت اُتریں گے، میدانِ محشر میں آئیں گے، اور بشارتیں سنائیں گے۔

اِستقامت علی الدین والوں کے لئے اِنعامات

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا: بے شک وہ لوگ جو کہتے ہیں کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے، پھر وہ استقامت اختیار کرتے ہیں اور اسی کے اوپر جمے رہتے ہیں، ڈٹ جاتے ہیں تَتَنَزَّلُ عَلَیْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: ان کے اُوپر فرشتے اُترتے ہیں یہ پیغام دیتے ہوئے، اس بات کو لے کر کہ نہ تم خوف کرو اور نہ غم کرو، اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا: خوف اور حزن یہ دو لفظ بھی آپ کے سامنے آتے رہتے ہیں اور ان کا فرق کئی دفعہ ذکر کیا، خوف ہوا کرتا ہے آنے والے حالات سے، ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو جائے، اور حزن ہوا کرتا ہے گزشتہ حالات پر جو پیچھے گزر گئے، مثلاً ایک شخص کا کوئی قریبی عزیز بیمار ہے تو اس اندیشے سے کہ یہ مر جائے گا، اس کی موت کا تصور کر کے انسان جو کانپتا ہے یہ تو خوف ہے، اور اس کی وفات کے بعد جو قلب کو صدمہ ہوتا ہے یہ حزن ہے، تو اَلَّا تَخَافُوْا کا مطلب یہ ہوگا کہ آئندہ کے لئے کوئی خوف نہ کرو، آگے تمہارے لئے معاملہ آسان ہی آسان ہے، قبر میں آسانی ہوگی، قبر سے اُٹھنے کے بعد بشارت دیں گے، محشر میں آسانی ہوگی، اور محشر سے فارغ ہونے کے بعد حساب کتاب سے فارغ ہونے کے بعد جنت کی طرف جائیں گے تو جنت کے دروازوں پر کھڑے ہوئے یہی بشارتیں دیں گے، دنیا کے چھوٹنے کا کوئی غم نہ کرو اور آئندہ کا کوئی کسی قسم کا اندیشہ نہ کرو، اس طرح سے انسان کے لئے پھر خوشی اور مسرت کے دروازے کھل جاتے ہیں، فرشتے ان کو یہ بشارتیں دیتے ہیں، وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ: جنت کی بشارت سُن لو جس کا تم وعدہ دیے جاتے تھے، تو یہ نتیجہ ہے رَبُّنَا اللّٰهُ اور اور اس کے اُوپر اِستقامت اختیار کرنے کا۔ نَحْنُ اَوْلِیٰٓؤُكُمْ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَفِی الْاٰخِرَةِ: ہم تمہارے دوست ہیں دُنیوی زندگی میں بھی اور آخرت میں بھی، فرشتے یہ بات بھی دل میں اِلقاء کرتے ہیں کہ دُنیوی زندگی میں بھی ہم تمہارے دوست، اور آخرت میں بھی ہم تمہارے دوست، دُنیوی زندگی میں دوست کس طرح سے؟ کہ جب آپ کا احتیاج اللہ ہی کی طرف ہوگا تو اللہ کے فرشتے آپ کے معاون ہیں، اللہ کی نصرت ہر وقت شاملِ حال رہتی ہے۔ اور آخرت میں بھی تمہارے دوست ہیں، یہی جگہ بہ جگہ بشارت دینا، سلام کہنا، محبت کا اظہار کرنا، یہ سب ان کی دوستی کا اظہار ہے۔

ہر خواہش صرف جنت میں پوری ہوگی

وَلَكُمْ فِیْهَا مَا تَشْتَهِیْٓ اَنْفُسُكُمْ: تمہارے لئے اس جنت میں وہ چیز ہوگی جس کو تمہارے جی چاہیں گے، اور یہی ایک لفظ بہت ساری نعمتوں کو شامل ہے، جس کو تمہارا جی چاہے گا وہی تمہارے لئے ہوگا، دُنیا میں انسان کتنا بڑا بادشاہ ہو جائے، ہفت اقلیم کا مالک ہو جائے، لیکن وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ میری جو بھی خواہش ہو وہ پوری ہو جاتی ہے، میں جو چاہوں ویسے ہو جاتا ہے، دنیا کے اندر رہتے ہوئے یہ ممکن نہیں ہے، انسان چاہتا کچھ ہے اور ہوتا کچھ ہے، کتنی ہی باتیں انسان کی خواہشات کے خلاف چلتی ہیں، جیسے عربی میں ایک شعر آتا ہے:

مَا كُلُّ مَا يَتَمَنَّى الْمَرْءُ يُدْرِكُهُ تَجْرِي الرِّيَاحُ بِمَا لَا تَشْتَهِي السُّفُن
(متنبی)

کہ جو بھی انسان خواہش کرے اس کو پالے دنیا میں ایسا نہیں ہوتا، بسا اوقات ناموافق اور مخالف ہوائیں بھی چلتی رہتی ہیں، تو دنیا کے اندر انسان کی ہر خواہش پوری ہو جائے یہ ممکن نہیں، اور یہ ایک بہت واضح سی بات ہے، انسان کی بنیادی خواہش ہے کہ میں صحت مند رہوں، مجھے بیماری نہ لگے، تو کیا کوئی آدم زاد دنیا میں ایسا ہے جو ہمیشہ صحت مند رہے اور اس کو کبھی بیماری نہ آئے، انسان کی واضح خواہش یہ ہے کہ میں جوان رہوں بوڑھا نہ ہوں، کیا جس کی عمر طویل ہو جائے تو ایسا ممکن ہے کہ کوئی شخص دائماً جوان ہی رہے اور اس کے اوپر بڑھاپا نہ آئے؟ اور انسان کی واضح خواہش یہ ہے کہ میں زندہ رہوں اور مجھے موت نہ آئے، تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی آدمی ہو، دنیا میں پیدا ہوا پھر اس کو موت نہ آئے؟ کتنی موٹی موٹی خواہشات ہیں لیکن نہیں پوری ہوتیں، اور باقی! روزمرہ میں ہم کچھ کھانا چاہتے ہیں وہ چیز دستیاب نہیں ہوتی، کوئی چیز ہم پینا چاہتے ہیں وہ چیز مہیا نہیں آتی، اور اور بھی کتنی ضروریات ہماری ایسی ہوتی ہیں جن کے متعلق ہماری خواہشات ہوتی ہیں لیکن وہ خواہشات پوری نہیں ہوتیں۔ اور جنت میں ایسے ہوگا کہ جو چیز جی میں آئے گی وہی ملے گی، اللہ تعالیٰ بندے کو وہاں اس طرح سے نوازیں گے، ''تمہارے لئے اس جنت میں وہ چیز ہے جس کو تمہارا جی چاہے گا'' وَلَكُمْ فِيهَا مَا تَدَّعُونَ: اور تمہارے لئے وہ چیز ہے جس کو کہ تم طلب کرو گے، دل میں خواہش پیدا ہو، زبان سے کہو، ہر چیز ملے گی۔

نُزُلًا مِّنْ غَفُورٍ رَّحِيمٍ اس حال میں کہ یہ مہمانی ہے غفور رحیم کی طرف سے، غفور! کہ اس نے کوتاہیاں جو تھیں وہ معاف کر دیں، رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوا کہنے والے بھی بسا اوقات انسانی کمزوریوں کی بنا پر کچھ کوتاہیاں کر سکتے ہیں، لیکن جب عقیدہ ان کا صحیح ہوگا، جذبہ بھی ہے کہ اللہ ہمارا رَبّ ہے، اور اسی پر وہ ڈٹنا چاہتے ہیں، تو چھوٹی موٹی کوتاہیاں اللہ معاف کر دے گا، اور رحیم ہے کہ گناہ معاف کرنے کے بعد پھر فائدہ ہی فائدہ پہنچایا۔

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ
کون زیادہ اچھا ہے ازروئے بات کے اس شخص سے جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے اور یہ کہے کہ میں
الْمُسْلِمِيْنَ ۝۳۳ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ۭ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ
مسلمانوں میں سے ہوں ۝۳۳ بھلائی اور برائی برابر نہیں ہوتی، دفع کیجئے اس خصلت کے ذریعے سے جو کہ اچھی ہے
فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝۳۴ وَمَا يُلَقّٰىهَآ اِلَّا
پس اچانک وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان عداوت ہے، ایسا ہو جائے گا گویا کہ وہ دوست ہے گرم جوش ۝۳۴ اور نہیں دیے جاتے یہ خصلت

الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝٣٥ وَاِمَّا يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ

مگر وہی لوگ جو مستقل مزاج ہوتے ہیں اور نہیں دیئے جاتے یہ خصلت مگر بہت بڑے نصیبے والے ۳۵ اگر شیطان کی طرف سے تجھے کوئی وسوسہ پیش آجائے

فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝٣٦ وَمِنْ اٰيٰتِهِ الَّيْلُ وَالنَّهَارُ

تو اللہ کی پناہ لیا کر، وہ سننے والا جاننے والا ہے ۳۶ اللہ کی نشانیوں میں سے ہے رات اور دن،

وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ ۭ لَا تَسْجُدُوْا لِلشَّمْسِ وَلَا لِلْقَمَرِ وَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ الَّذِيْ

سورج اور چاند، نہ سجدہ کرو سورج کو اور نہ چاند کو، اور سجدہ کیا کرو اس اللہ کو جس نے

خَلَقَهُنَّ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝٣٧ فَاِنِ اسْتَكْبَرُوْا فَالَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ

ان کو پیدا کیا، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو ۳۷ اور اگر یہ لوگ تکبر کریں تو وہ فرشتے جو اللہ کے پاس ہیں

يُسَبِّحُوْنَ لَهٗ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَهُمْ لَا يَسْـَٔمُوْنَ ۝٣٨ۧ وَمِنْ اٰيٰتِهٖٓ اَنَّكَ تَرَى

وہ تو رات دن اس کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اُکتاتے نہیں ۳۸ اللہ کی آیات میں سے ہے کہ تُو دیکھتا ہے

الْاَرْضَ خَاشِعَةً فَاِذَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَاۗءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ ۭ اِنَّ الَّذِيْٓ اَحْيَاهَا

زمین کو دَبی دَبائی، جب ہم اس کے اُوپر پانی اُتارتے ہیں تو حرکت کرتی ہے اور پھولتی ہے، بے شک وہ جس نے اس زمین کو زندہ کر دیا

لَمُحْيِ الْمَوْتٰى ۭ اِنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝٣٩ اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اٰيٰتِنَا

وہی مُردوں کو زندہ کرنے والا ہے، بے شک وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۳۹ بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات میں کجی اختیار کرتے ہیں

لَا يَخْفَوْنَ عَلَيْنَا ۭ اَفَمَنْ يُّلْقٰى فِي النَّارِ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ يَّاْتِيْٓ اٰمِنًا يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ

وہ ہم پر مخفی نہیں ہیں، کیا پھر وہ شخص جو آگ میں ڈال دیا جائے وہ بہتر ہے یا وہ شخص؟ جو آئے گا امن کی حالت میں قیامت کے دن،

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ ۙ اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝٤٠ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا

عمل کرو جو تم چاہتے ہو، بے شک وہ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ۴۰ بے شک وہ لوگ جو نصیحت کا انکار کرتے ہیں جس وقت نصیحت

جَاۗءَهُمْ ۚ وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ ۝٤١ۙ لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ

پاس آگئی (تو وہ غلطی پر ہیں)، بے شک قرآن البتہ بہت غلبے والی کتاب ہے ۴۱ نہیں آسکتا اس کے پاس باطل اس کے سامنے سے، نہ

خَلْفِهٖ ؕ تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ ﴿۴۲﴾ مَا يُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِيْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ

اس کے پیچھے سے، یہ اُتاری ہوئی ہے حکیم اور حمید کی طرف سے ﴿۴۲﴾ نہیں کہی جاتی آپ کو مگر وہی بات جو کہی گئی رسولوں کو

قَبْلِكَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۴۳﴾ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا

آپ سے پہلے، بے شک تیرا رَبّ البتہ مغفرت والا ہے اور دردناک عذاب والا ہے ﴿۴۳﴾ اگر ہم اس کو قرآن

اَعْجَمِيًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰيٰتُهٗ ؕ ءَاَعْجَمِيٌّ وَّعَرَبِيٌّ ؕ قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ

عجمی بنادیتے تو یہ کہتے کہ کیوں نہیں کھول کر بیان کی گئیں اس کی آیتیں، کیا کتاب عجمی اور رسول عربی؟ آپ کہہ دیجئے یہ ان لوگوں کے لئے جو

اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ ؕ وَالَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّهُوَ عَلَيْهِمْ

ایمان لاتے ہیں ہدایت ہے اور شفا ہے، اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے ان کے کانوں میں بوجھ ہے، اور وہ قرآن ان کے اُوپر

عَمًى ؕ اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍ بَعِيْدٍ ﴿۴۴﴾

گمراہی کا باعث ہے، یہی لوگ ہیں جو آواز دیے جا رہے ہیں دُور جگہ سے ﴿۴۴﴾

تفسیر

داعی خود عامل ہو تبھی اثر مرتب ہوتا ہے

وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ: کون زیادہ اچھا ہے از روئے بات کے اس شخص سے جو اللہ کی طرف بلائے وَعَمِلَ صَالِحًا: اور نیک عمل کرے وَّقَالَ اِنَّنِيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ: اور یہ کہے کہ میں مسلمانوں میں سے ہوں، سب سے اچھی بات اس شخص کی ہے، یعنی جو اللہ کی طرف دعوت دیتا ہے، دعوت تبھی دے گا جس وقت پہلے اللہ کی بات کو قبول کرے گا، تو حاصل یہ ہوا کہ اللہ کی باتوں کو قبول کرنے کے بعد اللہ کی باتوں کی طرف دعوت دینے والا اور پھر اس کے مطابق عمل کرنے والا اس سے اچھی بات کسی کی نہیں، عَمِلَ صَالِحًا کی قید اس لئے لگادی کہ دعوت الی اللہ کے اوپر فائدہ اور اثر مرتب تبھی ہوتا ہے جب خود داعی کا عمل بھی اس کے مطابق ہو، اور اگر داعی (دعوت دینے والا) خود اس کے اوپر عمل نہیں کرتا تو ایسی صورت میں اس دعوت کے اوپر اثرات نہیں مرتب ہوا کرتے، یعنی بے عمل کے لئے وعظ کہنا اگرچہ جائز ہے اس میں کوئی شک نہیں، یہ نہیں! کہ جو شخص خود عمل نہ کرے تو کسی کو نیکی کا پتا بھی نہ بتائے، کسی دوسرے کو بھی نیکی کی بات نہ بتائے، ایسی بات نہیں ہے، اگر کوئی شخص خود عامل نہیں اور وہ کوئی نیکی کی بات جانتا ہے تو دوسرے کو بتانی چاہیے، ہوسکتا ہے اسے عمل کی توفیق ہوجائے۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ اگر داعی خود عامل نہ ہو تو اس کی دعوت کے اوپر

اچھے اثرات نہیں مرتب ہوتے، اچھے اثرات تبھی مرتب ہوا کرتے ہیں کہ جس وقت اپنے قول کے مطابق اپنا عمل بھی ہو، تو جن لوگوں کے اندر یہ صفت پائی جائے کہ ان کا قول ان کے عمل کے مطابق ہے یا ان کا عمل ان کے قول کے مطابق ہے تو ان کی دعوت کے اوپر اچھے اثرات مرتب ہوا کرتے ہیں، یہ طبعی طور پر ایک بات ہے کہ میں اگر کسی شخص کو ایک بات بتاتا ہوں اور اس کی اہمیت دلاتا ہوں لیکن خود میری زندگی میں وہ نظر نہیں آتی تو سننے والا بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ اگر یہ اتنی اہم ہے تو یہ خود اس پر عمل کیوں نہیں کرتا، یہ تو ایک دلیل کے طور پر میری بات کو ٹھکرا دیا جائے گا، اور ایک طبعی اثر ہے بغیر دلیل کے کہ عامل کی بات دوسرے میں بھی عمل پیدا کرتی ہے، اور اگر خود انسان عامل نہ ہو، قول ہی ہو تو آپ کی باتیں سننے سے دوسرا بھی باتیں ہی بنانے لگ جائے گا، باتیں ہی کرنے لگ جائے گا، باقی! عمل کی توفیق اس کو بھی نہیں ہوگی، اس لئے وَعَمِلَ صَالِحًا ساتھ ذکر کر دیا گیا۔

حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے وعظ کے اندر ایک واقعہ بیان کیا ہوا ہے کہ ایک بچّہ گُڑ بہت کھاتا تھا، تو اس کی ماں اس کو ایک بزرگ کے پاس لے گئی کہ اس کو ذرا نصیحت کر دو، سمجھا دو، یہ گُڑ زیادہ نہ کھایا کرے، تو وہ فرمانے لگے کل لے کر آنا، جس وقت کل لے کر گئی تو اس بزرگ نے اس بچّے سے محبت کے ساتھ کہا کہ بیٹے! گُڑ نہ کھایا کرو، اس میں یہ نقصان ہے، یہ نقصان ہے، یہ تکلیف ہو جائے گی، اس طرح سے نصیحت کر دی، تو وہ عورت پوچھتی ہے کہ اس بات کے لئے آج کا وعدہ کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ بات آپ کل بھی تو کہہ سکتے تھے، وہ کہنے لگے کہ کل میں نے اس لئے نہیں کہی کہ اس وقت میں نے خود گُڑ کھایا ہوا تھا، تو میری بات بچّے پہ اثر انداز نہ ہوتی، آج میں نے خود احتیاط برتی ہے، جب احتیاط برتی ہے تو میں نے اس کو سمجھایا ہے تو اس کے اوپر اثر ہوگا۔(1) یہ واقعہ ہے یعنی کسی دلیل کے ساتھ سمجھ میں آئے یا نہ آئے، کہ قول عمل وہی پیدا کرتا ہے کہ جو خود عامل سے پیدا ہوتا ہے، ورنہ اگر باتیں ہی کرنی ہوں، باتیں ہی سنی ہوں، تو سننے والا جو ہے وہ باتیں تو کرنے لگ جائے گا، عمل کی توفیق نہیں ہوگی، آج ہمارے وعظوں میں، ہماری تقریروں میں، ہمارے جلسوں میں اثرات اسی لئے نہیں رہے کہ ہم گفتار کے غازی ہیں، کردار کے غازی نہیں ہیں، تو ہمارا جہاد جتنا بھی ہے، وہ سب زبان کے درجے کی حد تک ہی ہے، عمل کے ساتھ ہم دین نہیں پھیلاتے، یہی وجہ ہے کہ اس کے اثرات بھی ویسے ہی ہیں۔ تو دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ کے ساتھ عَمِلَ صَالِحًا کی قید لگائی، سب سے اچھی بات اس شخص کی ہے جو خود دین کو قبول کرتا ہے پھر دین کی طرف دعوت دیتا ہے پھر اس کے مطابق عمل بھی کرتا ہے۔

داعی اپنے کام پر فخر بھی محسوس کرتا ہو

اور پھر اس دین کو اور اس کے قبول کرنے کو اور اس دین کی اشاعت کو اپنے لئے فخر بھی سمجھتا ہے قَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ، یہ نہیں کہ شرم کے مارے اس بات کا اظہار نہیں کرتا، کہتا ہے کہ میں اللہ کا فرماں بردار ہوں، زبان سے اس بات کا اقرار کرتا ہے، وہ اس اسلام کے قبول کرنے کو، دین کے قبول کرنے کو اپنے لئے فخر سمجھتا ہے، ایک عزت سمجھتا ہے کہ اللہ نے ہمیں نصیب فرمائی، اپنی زبان سے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔

---

(1) "ملفوظات حکیم الامت" ج۹ ص ۲۸، ملفوظ نمبر ۳۳، ج۱۵ ص ۲۸۷، ملفوظ نمبر ۱۱۲

داعی کو چاہیے کہ بُرائی کا بدلہ اچھائی سے دے

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ: حسنہ اور سیئہ برابر نہیں ہوتیں، دونوں کا اثر ایک جیسا نہیں ہے۔ حسنہ: بھلائی۔ سیئہ: بُرائی۔ بھلائی اور بُرائی برابر نہیں ہوتی، اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ: یہ داعی الی اللہ کے لئے گویا کہ ایک ادب ہے کہ اگر تم دِین کے لئے داعی بننا چاہتے ہو تو اس اُصول کو ہمیشہ یاد رکھو کہ حسنہ اور سیئہ برابر نہیں ہیں، حسنہ کے اثرات اور ہوتے ہیں، سیئہ کے اثرات اور ہوا کرتے ہیں، اگر کوئی شخص تمہارے ساتھ سیئہ کا ارتکاب کرتا ہے، بُرائی کا ارتکاب کرتا ہے تو تم اس کا بدلہ بُرائی سے نہ دو، تم اس کا بدلہ بھلائی سے دو، جس وقت تم اس بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دو گے تو بُرائی کا بدلہ بُرائی سے دینے کے ساتھ تو شر پھیلتا ہے، اور بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کے ساتھ بھلائی غالب آجائے گی، اگر آپ سیئہ کا بدلہ سیئہ دیں گے تو اس سے کوئی اچھے نتائج نہیں نکل سکتے، اچھے نتائج تبھی نکلتے ہیں کہ اگر آپ کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کرے تو تم اس کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، انبیاء ﷺ کا ہمیشہ یہی طریقہ ہوتا ہے کہ لوگ انہیں گالیاں دیتے ہیں، پتھر مارتے ہیں، ان کے سامنے رُکاوٹیں کھڑی کرتے ہیں، حد سے زیادہ ان کی بُرائی کرتے ہیں، لیکن انبیاء ﷺ جب کریں گے بھلائی ہی کریں گے، اسی طرح سے آخر دشمن کا دِل بھی آہستہ آہستہ نرم ہو جاتا ہے، عام طور پر پڑھا کرتے ہیں کہ:

سلام اس پر کہ جس نے گالیاں سُن کر دُعائیں دِیں

کہ لوگ گالیاں دیتے تھے اور وہ آگے سے دُعائیں دیا کرتے تھے تو ان کے لئے سلام کہا جاتا ہے، تو معلوم ہو گیا کہ انبیاء ﷺ کی عظمت یہی ہے، گالیاں دینا کافروں کا کام ہوتا ہے، اور گالیاں سُن کر دُعائیں دینا انبیاء ﷺ کا کام ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ یہاں یہی فرماتے ہیں کہ حسنہ اور سیئہ برابر نہیں، آپ بُرائی کو اچھائی کے ساتھ دفع کیجئے، اِدْفَعْ بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ: دفع کیجئے اس خصلت کے ذریعے سے جو کہ اچھی ہے فَإِذَا الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ: پس اچانک یہ واقعہ پیش آئے گا، اِذا مفاجاتیہ ہے، الَّذِي بَيْنَكَ وَبَيْنَهُ عَدَاوَةٌ: وہ شخص کہ تیرے درمیان اور اس کے درمیان عداوت ہے كَأَنَّهُ وَلِيٌّ حَمِيمٌ: ایسا ہو جائے گا کہ گویا کہ وہ دوست ہے گرم جوش، حمیم کہتے ہیں جو محبت کی گرمی رکھنے والا ہو، محبت کی گرمی رکھنے والا دوست ہے وہ ایسا ہو جائے گا۔ یہاں یہ جو بتایا گیا کہ بُرائی کو دفع اچھائی کے ساتھ کیجئے، اور اس کا نتیجہ یہ ذکر کیا گیا کہ اگر تم یہ خصلت اختیار کرو گے تو جس کے درمیان اور تمہارے درمیان عداوت ہے وہ بھی گویا کہ گرم جوش دوست بن جائے گا، اسی کو ہمارے شیخ سعدی رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

بدی را بدی سہل باشد جزا — اگر مردی اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَا(1)

کہ بُرائی کا بدلہ بُرائی کے ساتھ دینا بڑی آسان بات ہے، ایک آدمی آپ کے اینٹ مارتا ہے تو آپ کا جی چاہتا ہے اس کے پتھر مارنے کو، اور پتھر مار کے بڑا خوش ہو جائیں گے کہ میں نے اینٹ کا جواب پتھر سے دے دیا، جیسے کہ آج کل سیاست چل رہی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے دو، "بدی را بدی سہل باشد جزا" اس میں انسان کا نفس خوش ہوتا ہے، اگر کسی نے بُرائی کی تو اس کے

---

(1) "بوستان" باب دوم، حکایت حاتم طائی کے بعد والی حکایت۔

مقابلے میں اس سے زائد اس کو بدلہ دے دیا جائے تو انسان کے اپنے نفس کو شفا حاصل ہوتی ہے، لیکن عداوتیں بڑھ جاتی ہیں، فسادات شروع ہوجاتے ہیں۔ ''اگر مردی'' اگر تو بہادر ہے تو اَحْسِنْ اِلٰی مَنْ اَسَآءَ جو شخص بُرا کام کرتا ہے تو اس کے ساتھ بھلائی سے پیش آ، یہ ہے مردوں والی بات اور بہادروں والی بات، اینٹ کا جواب پتھر سے دینا آسان ہے، لیکن اینٹ کو برداشت کرکے مارنے والے کو دُعائیں دینا اور اس کے ساتھ اخلاق سے پیش آنا یہ بہت مشکل کام ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کی سُنّت ہے، اچھے نتائج اسی سے نکلتے ہیں۔

مذکورہ اُصول بچھو صفت اِنسانوں کے لئے نہیں ہے!

لیکن یہ اچھا نتیجہ اسی وقت نکلے گا......! یہاں مفسرین سلامتیٔ فطرت کی قید لگاتے ہیں، بشرطیکہ وہ آپ کا مخالف کچھ نہ کچھ فطرت کی سلامتی رکھتا ہو، پھر جس وقت آپ اس کی بُرائی کو برداشت کرکے بھلا برتاؤ کریں گے تو ایسے وقت میں وہ متأثر ہوگا، لیکن اگر مخالف ہے ہی عقربی فطرت، بچھو جیسا ہے، کہ آپ اس کے ساتھ ہزار بھلائی کریں احسان کریں وہ ڈنگ مارنے سے باز نہیں آتا تو یہ جو شریعت میں مسئلہ ہے جہاد بالسیف کا وہ ایسے ہی لوگوں کے لئے ہے، اُن کا پھر سر کوٹنا پڑتا ہے اس کے بغیر پھر معاملہ نہیں ٹھیک ہوتا، بچھو کی فطرت ہے ڈنگ مارنا، اور وہ کوئی عداوت کی بنا پر ہی ڈنگ نہیں مارا کرتا، اس کی فطرت ہے، تم ہزار اس کے ساتھ پیار کرو، ہزار اس کے اوپر احسان کرو، لیکن جس وقت ہاتھ لگاؤ گے مارے گا وہ ڈنگ، چونکہ اس کی فطرت ہے، تو اس کا پھر علاج جوتے کے ساتھ کیا جاتا ہے یا اس کی سوئی کھینچ لینے کے ساتھ کیا جاتا ہے، اس کے بغیر آپ اس کو متأثر نہیں کرسکتے، نہ اس کے شر سے بچ سکتے ہیں، پھر دفعِ شر کے لئے اگلا درجہ جہاد بالسیف کا بھی ہے۔ بچھو کے متعلق مشہور ہے نا کہ نہر کے کنارے پر کہیں کھڑا تھا، نہر عبور کرنا چاہتا تھا (سمجھانے کے لئے ایک مثال ہے) تو کچھوے نے کہیں دیکھ لیا، پوچھا کہ میاں بچھو! کیا بات ہے؟ یہاں کیوں کھڑے ہو؟ وہ کہتا ہے نہر عبور کرنا چاہتا ہوں، لیکن پانی زیادہ ہے، اس لئے ڈر بھی رہا ہوں، تو وہ کہنے لگا کہ میری پشت پر بیٹھ جاؤ، میں تجھے نہر کے دُوسری طرف اُتار آتا ہوں، اپنی پشت پر بٹھالیا (یہ واقعہ بچوں کی حکایتوں کی کتابوں میں لکھا ہوا ہوتا ہے) تو جس وقت وہ اس کو اُوپر بٹھا کے لیے جارہا تھا، وسطِ نہر میں گیا تو اس کو ایسے معلوم ہوا جیسے اس کی پشت کے اُوپر یہ کوئی چیز رگڑ رہا ہے، وہ اپنی دُم اور سوئی جو تھی وہ رگڑ رہا ہے، کچھوا پوچھتا ہے کہ میاں بچھو! یہ کیا ہے؟ تو وہ کہتا ہے کہ جی! مجھے معلوم ہے بلکہ یقین ہے کہ میں آپ کو نقصان نہیں پہنچا سکتا لیکن میں عادت سے مجبور ہوں، یقین ہے کہ میں تیرا بگاڑ کچھ نہیں سکتا لیکن میں عادت سے مجبور ہوں، یہ عادت پوری کررہا ہوں۔ تو یہ اس بات کا اظہار کیا کہ بچھو عادت سے مجبور ہے، ہزار کوشش کرو، وہ ڈنگ مارنے سے باز نہیں آسکتا، تو بعض انسانوں کی فطرت بھی عقارب جیسی ہوتی ہے، بَعْضُ الْاَقَارِبِ كَالْعَقَارِبِ، یہ آپ نے ''روضۃ الأدب'' میں فقرہ پڑھا تھا کہ بعض رشتے دار بھی بچھوؤں کی طرح ہوتے ہیں، تو ایسے لوگوں کے لئے یہ مسئلہ نہیں، وہاں پھر ان کے شر کو دفع کرنے کے لئے شریعت نے دوسری تدبیر بھی بتائی ہے، لیکن عام طور پر ایسے ہوتا ہے کہ اگر کسی مخالفت اور اس کی ایذا رسانی کے مقابلے میں نرم برتاؤ اختیار کیا جائے تو كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ گویا کہ وہ مخلص دوست بن جائے گا۔ ''گویا کہ'' کا مطلب یہ ہے کہ چاہے اس کے

دل میں آپ کی محبت نہ اُترے، لیکن وہ بھی مجبور ہوگا اخلاق کا جواب اخلاق کے ساتھ دینے پر، دِل میں اس کے جذبات کیسے ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ عداوت کا اظہار نہیں کر سکے گا اگر آپ بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دیں گے، کَاَنَّ کے لفظ کے اندر یہ بات ذکر کردی گئی، ضروری نہیں کہ دل کے اندر محبت اُتر جائے، لیکن ظاہری طور پر وہ ایسا ہو جائے گا گویا کہ وَلِیٌّ حَمِیْمٌ ہے، عداوت کا اظہار نہیں کر سکے گا اگر آپ بُرائی کا جواب بھلائی کے ساتھ دیں گے۔

''صبر وتحمل'' اعلیٰ ترین صفات

وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الَّذِیْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ: نہیں دیے جاتے یہ خصلت جو اوپر ذکر کی گئی کہ بُرائی کے مقابلے میں بھلائی کرو، نہیں دیے جاتے یہ خصلت مگر وہی لوگ جو مستقل مزاج ہوتے ہیں، جو صبر کرنے والے ہیں، برداشت کرنے والے ہیں، جن کے اندر صفت صبر کی ہو وہی اس خصلت کو اپنا سکتے ہیں کہ بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دیں، ورنہ جن کی طبیعت میں ذرا سا بھی اشتعال ہے وہ تو دوسرے کی بُرائی پر مشتعل ہو کر بسا اوقات اس سے زیادہ برائی کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، یہ عادت انہی کو نصیب ہوتی ہے، بُرائی کا بدلہ بھلائی سے دینے کی خصلت انہی کو نصیب ہوتی ہے جو کہ صبر کرنے والے ہیں۔ وَمَا یُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِیْمٍ: اور نہیں دیئے جاتے یہ خصلت مگر بہت بڑے نصیبے والے، جن کا بہت بڑا نصیبہ ہوتا ہے اچھے حصے والے ہوتے ہیں آخرت میں ان کو بہت زیادہ عظیم ثواب ملنے والا ہے یہ خصلت انہی کو نصیب ہوتی ہے، ان لفظوں میں یہ ترغیب دے دی کہ صبر کیا کرو، برداشت کیا کرو، اشتعال انگیزی چھوڑ دو، جلدی سے کسی بات کے اوپر مشتعل ہو جانا جذبات میں آ جانا اگر یہ بات ہوگی تو پھر تم داعی الی اللہ بننے کے قابل نہیں ہو، داعی الی اللہ بننے کے لئے ضروری ہے کہ انسان صبر کرے، صبر کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسری طرف سے اشتعال انگیزی ہو تو خود تحمل سے پیش آئے، دوسری طرف سے ایذا پہنچائی جائے تو اس کو برداشت کرو، بلکہ دوسروں کے لئے بھلائی کی اور اچھائی کی فکر کرو، اور ان کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو، تب جا کے تمہاری اس دعوت کے اندر اور اس قول کے اندر اچھے اثرات پیدا ہو سکتے ہیں، ورنہ جہاں مخالفین کی طرف سے ذرا سی بات ہوئی تو آپ بھی جذبات میں آ جائیں آپ بھی اشتعال میں آ جائیں اور آپ بھی اسی طرح سے سختی کے مقابلے میں سختی کرنے لگ جائیں، بدزبانی کے مقابلے میں بدزبانی کرنے لگ جائیں تو اس میں شفائے غیظ تو ہے، لیکن اس میں دِین کی دعوت کا تقاضا پورا نہیں ہوتا۔

داعی کو اللہ کی پناہ میں آنے کی تلقین

وَاِمَّا یَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ: اگر شیطان کی طرف سے تجھے کوئی نزغہ پیش آ جائے، اگر شیطان کوئی نزغہ لگا دے، نزغہ چوکا لگانے کو کہتے ہیں، یہاں وسوسہ ڈالنا مراد ہے،'' تو اللہ کی پناہ لیا کر، وہ سننے والا جاننے والا ہے'' یعنی شیطان کی طرف سے وسوسہ آیا، وہ تجھے بہکاتا ہے دشمن کے مقابلے میں بُرائی کرنے پر، بُرائی کرنے والے کے مقابلے میں غصہ دلاتا ہے، تو فوراً اللہ کی پناہ پکڑا کرو، وہ سننے والا جاننے والا ہے۔

مخلوق کو سجدہ جائز نہیں

آگے پھر آیاتِ قدرت آگئیں، وَمِنْ اٰیٰتِهِ الَّیْلُ وَالنَّهَارُ: اللہ کی نشانیوں میں سے ہے رات اور دن سورج اور چاند" یہ اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہیں، اللہ کی مخلوق میں سے ہیں اور اللہ کی قدرت کی نشانیوں میں سے ہیں۔" نہ سجدہ کیا کرو سورج کو اور نہ سجدہ کیا کرو چاند کو اور سجدہ کیا کرو اس اللہ کو جس نے ان کو پیدا کیا اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو" اس آیت میں یہ واضح کیا گیا کہ سورج ہو یا چاند، یہ آسمان کی طرف بہت بڑی بڑی اللہ کی نشانیاں ہیں، ان کو سجدہ کرنا ٹھیک نہیں، اگر کوئی شخص ان کو سجدہ کرتا ہے تو وہ غلطی پر ہے، سجدہ اس کو کرنا چاہیے جس نے ان کو پیدا کیا، تو خالق کے لئے سجدہ ہے مخلوق کے لئے سجدہ نہیں، یہاں سے اُصول یہ نکل آیا، تو یہاں ذکر اگرچہ سورج اور چاند کا ہوا لیکن سورج چاند کے علاوہ جو چیز بھی ہو، چاہے وہ جن ہے، انسان ہے، فرشتہ ہے، پانی ہے، آگ ہے، درخت ہے، پتھر ہے، جو چیز بھی ہے وہ ساری کی ساری چونکہ مخلوق ہی ہے، تو جب وہ مخلوق ہے تو اسی اُصول کے تحت مخلوق کے لئے سجدہ نہیں، سجدہ خالق کے لئے ہے، تو ان چیزوں میں سے سجدہ کسی کے لئے بھی جائز نہ ہوا، سجدہ اسی کو کرنا چاہیے جو خالق ہے، انبیاء مخلوق ہیں تو انبیاء کے لئے سجدہ نہیں، اولیاء مخلوق ہیں تو اولیاء کے لئے سجدہ نہیں، نہ زندگی میں نہ موت کے بعد، کسی اینٹ پتھر درخت کو سجدہ نہیں کیا جاسکتا، کیونکہ یہ سارے کے سارے مخلوق ہیں۔

"سجدۂ تعظیمی" اور "سجدۂ عبادت" میں فرق

پھر سجدہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ہے جس کو آپ "سجدۂ تعظیمی" کہتے ہیں، اور ایک "سجدۂ عبادت" ہے، "سجدۂ تعظیمی" اور "سجدۂ عبادت" حرام ہونے میں تو دونوں شریک ہیں، وہ بھی حرام اور وہ بھی حرام، لیکن "سجدۂ عبادت" کفر ہے، "سجدۂ تعظیمی" کفر نہیں ہے، کیونکہ کفر اور شرک یہ کسی زمانے میں بھی مشروع نہیں رہا، اور قرآنِ کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ "سجدۂ تعظیم" یہ کسی زمانے میں مباح تھا، یا مروّج تھا، پُرانے زمانے میں لوگ جب بڑے کو سلام کیا کرتے تھے تو سجدے کی صورت میں کردیتے تھے، قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا کہ فرشتوں سے اللہ تعالیٰ نے آدم کو سجدہ کروایا، قرآنِ کریم میں ہی مذکور ہے کہ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو سجدہ کیا، تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سجدۂ تحیہ، سجدۂ سلام، سجدۂ تعظیم یہ کسی زمانے میں مشروع تھا، لیکن باتفاقِ اُمت، اَحادیثِ صحیحہ کے اندر یہ بات آئی ہوئی ہے جس کے اُوپر اِجماعِ اُمت ہے کہ ہماری شریعت میں تحیۃً کسی کو سجدہ کرنا یہ بھی حرام ہے، اور اگر کوئی شخص تحیۃً سجدہ کرتا ہے تو کافر نہیں ہوا، حرام کا مرتکب ہے، لیکن ان دونوں میں فرق آپ کس طرح سے کریں گے؟ کہ یہ سجدۂ تحیہ ہے یا سجدۂ عبادت ہے؟ سجدے کی صورت تو ایک ہی جیسی ہوگی، لیکن سجدۂ تحیہ ہے یا سجدۂ عبادت ہے، دونوں کے درمیان میں فرق کس چیز سے ہوتا ہے؟ فرق ہوا کرتا ہے انسان کے نظریے اور عقیدے سے، اگر تو اس کو اپنے اُوپر مختار جان کے اور اس کے متصرف ہونے کا عقیدہ رکھ کے اپنے نفع نقصان کا تعلق اس کے ساتھ مانتا ہوا انسان سجدہ کرتا ہے، جو اُلوہیت کی خصوصیات ہیں، ان کو مانتا ہوا اگر کوئی شخص سجدہ کرتا ہے، تو یہ "سجدۂ عبادت" ہے اور شرک ہے۔ اور اگر قطع نظر اس سے وہ کہتا ہے یہ میرے جیسا بندہ ہے، اللہ کی اُلوہیت میں شریک نہیں، خدا کی خدائی میں اس کا کوئی کسی قسم کا حصہ نہیں، بس اس

کو اللہ نے عظمت دی ہے، یہ اچھا ہے، نیک ہے، ہمارا اُستاذ ہے یا پیر ہے، اس لئے ہم اس کی تعظیم کرتے ہوئے اس کے سامنے جھکتے ہیں، تو ایسی صورت میں اس کو حرام کا مرتکب کہیں گے، وہ کافر نہیں ہے۔ لیکن اگر وہ بت کو سجدہ کرے، کسی تصویر کو سامنے رکھ کے سجدہ کرے، یہ شعارِ کُفر ہے، تو ایسی صورت میں اگر اس کا عقیدہ صحیح بھی ہو تو بھی ظاہری طور پر اس پر کُفر کا حکم لگا دیا جائے گا، اگر ان چیزوں کو سجدہ کرتا ہے جو کہ شعارِ کُفر میں داخل ہو چکی ہیں، جیسے سجدہ کرنا بت کو، سجدہ کرنا صلیب کو، یا سجدہ کرنا آگ کو، چونکہ یہ چیزیں پُوجی جاتی ہیں اور مشرکین کا یہ طریقہ ہے، تو مشرکین کے طریقے کو اپنانے کی بنا پر اور اس شعار کو اختیار کرنے کی بنا پر وہ فقہی نقطۂ نظر سے ظاہری طور پر کافر ہو جائے گا، لیکن اصل کے اعتبار سے کُفر اور شرک لازم آتا ہے مسجود الیہ میں وہ صفات ماننے سے جو کہ اُلوہیت کا خاصہ ہیں، اس لئے اگر کوئی شخص کسی قبر کو سجدہ کرتا ہے مثال کے طور پر، یا بعض لوگ اپنے پیر کو سجدہ کرتے ہیں تو وہاں بھی پوچھا جائے گا کہ تمہارا کیا نظریہ ہے، اگر ان کا نظریہ یہ ہو جس کے ساتھ شرک لازم آتا ہے تو ان کا یہ سجدہ ''سجدۂ عبادت'' ہے، اور اگر ان کے نظریات یہ نہ ہوں جن کی بنا پر شرک لازم آتا ہے تو پھر ان کا سجدہ ''سجدۂ تعظیم'' یا ''سجدۂ تحیہ'' کہلائے گا، یہ حرام ہے، یہ لوگ فاسق اور فاجر ہیں، لیکن ان کو مشرک نہیں کہہ سکتے، یہ فرق کرنا ضروری ہے، کیونکہ ''سجدۂ عبادت'' کسی زمانے میں بھی مشروع نہیں رہا، اور یہ سجدہ جو مشروع تھا ''سجدۂ تحیہ'' ہے، تو جب یہ مشروع رہا ہے تو ہم اس کو شرک نہیں کہہ سکتے، اور فرق ہوگا تو نظریے کے اعتبار سے ہوگا، ورنہ ظاہری صورت میں کوئی فرق نہیں ہے۔

سَرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے لئے بھی سجدے کو منع کیا ہے

تو اس سے یہ اُصول نکلا ہے کہ مخلوق کے لئے سجدہ نہیں، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک صحابی (قیس بن سعدؓ) کسی دُوسری جگہ (حیرۃ) گیا، اور وہاں جا کے دیکھا کہ وہ لوگ اپنے سردار (مرزُبان) کو سجدہ کرتے ہیں، تو اس کے دِل میں خیال آیا کہ اس طرح کی تعظیم کے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم زیادہ حق دار ہیں، ہم بھی جائیں گے تو ہم بھی آپ کو سجدہ کریں گے، آپ کے سامنے سجدہ کرنا چاہیے، تو جب وہ آیا تو آ کے اس نے ذِکر کیا کہ یا رسول اللہ! میں نے فلاں جگہ لوگوں کو اپنے سردار کو سجدہ کرتے ہوئے دیکھا ہے، تو اس کے تو حق دار آپ زیادہ ہیں کہ ہم آپ کو سجدہ کیا کریں، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ یہ بتاؤ! کہ میری وفات کے بعد اگر میری قبر کے پاس سے گزرو گے تو اس کو بھی سجدہ کرو گے؟ وہ کہنے لگا کہ نہیں جی! اس کو تو سجدہ نہیں کروں گا، جس کا مطلب ہے کہ وہ اتنا سمجھ چکا تھا کہ قبر کو سجدہ تو بالکل نہیں ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بس! پھر عبادت اللہ ہی کی کرو، سجدہ بھی اسی کو ہی کرو، او کما قال علیہ الصلاۃ والسلام۔[1] مطلب یہ تھا کہ جب میری ایک وقت قبر بننے والی ہے تو سجدہ تو حَیٌّ لَا یَمُوْتُ کے لئے ہے، حَیٌّ قَیُّوْم کے لئے ہے، جس کے اوپر کبھی بھی موت طاری نہ ہو اور ہمیشہ حیات والا ہو، سجدہ اسی کو کرنا چاہیے، جب میری قبر کو سجدہ نہیں کرو گے اور قبر کو

---

(۱) ابوداود ج ۱ ص ۲۹۱، باب فی حق الزوج علی المرأۃ. مشکوۃ ۲/ ۲۸۲، باب عشرۃ النساء، فصل ثالث۔ حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا آخری جواب یوں ہے: لا تفعلوا۔

سجدہ کرنا جائز نہیں تو جس کی قبر بننے والی ہے تو اس کے لئے بھی سجدہ جائز نہیں۔ یا دوسری روایت ہے کہ صحابہ نے کہا کہ یا رسول اللہ! آپ کو یہ بہائم اور یہ درخت وغیرہ سجدہ کرتے ہیں (جیسے واقعات حدیث شریف میں معجزے کے طور پر ہیں کہ ایک اُونٹ آیا اس نے آ کے سامنے سر رکھا جس طرح سے وہ سجدہ کرتا ہے تو حضور ﷺ نے اس کے مالک کو بلایا، مالک کو بلا کے کہا کہ یہ تیری شکایت کرتا ہے کہ تُو کام زیادہ لیتا ہے اور اس کو خوراک کم دیتا ہے،[1] اس قسم کے واقعات حدیث شریف میں ہیں، درختوں کے جھکنے کے بھی ہیں) تو آپ ہمیں بھی اجازت دیجیے، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہ! "اُعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ "[2] عبادت تو صرف اللہ کی چاہیے، مطلب یہ کہ اب ہماری شریعت میں سجدہ ایک ہی ہے جس کو "سجدۂ عبادت" کہتے ہیں، "سجدۂ تحیہ" ہمارے ہاں نہیں ہے، اور "سجدۂ عبادت" صرف اللہ کے لئے ہوتا ہے کسی اور کے لئے ہوتا ہی نہیں، "سجدۂ تعظیم" بھی سرے سے ختم ہو گیا، تو اب عبادت اللہ ہی کی کرو، وَاَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ، اور اپنے بھائی کی عزت کرو، یعنی میں بھی تمہارا بنی آدم میں ہونے کی وجہ سے بھائی ہوں، تو میری عزت کرو۔

"تقویۃ الایمان" پر غلط بیانی کی نشان دہی

یہی روایت ہے کہ جس کا ترجمہ حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ نے کیا ہے۔ ان کی جو کتاب ہے "تقویۃ الایمان" یہی روایت ہے جس کا ترجمہ کیا ہے، جس کے اُوپر مخالفین شور مچاتے ہیں کہ لو جی! حضور ﷺ کو بھائی کہہ دیا، حضور ﷺ کو بھائی کہہ دیا، تو "اَكْرِمُوْا اَخَاكُمْ" کا ترجمہ اس کے بغیر اور ہو کیا سکتا ہے؟ کہ عبادت اللہ کی کرو، اور اپنے بھائی کی عزت کرو، اور اپنے بھائی سے مراد میں خود، کہ میں تمہارا بھائی ہوں ایک انسان ہونے کے اعتبار سے، ویسے بھی کسی کے چچے کے لڑکے، کسی کے ماموں کے لڑکے، اگرچہ حقیقی بھائی حضور ﷺ کا کوئی نہیں تھا، لیکن اگر حقیقی ہوتا بھی تو اس میں کیا حرج ہے؟ یہ بات کوئی نبوّت کے منافی تو نہیں ہے، اور قرآنِ کریم نے تمام انبیاء ﷺ کو ان کی قوم کے اَخ کے طور پر ہی ذکر کیا ہے، اِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا ایسے ہی ہے نا؟ اور اسی طرح سے اِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ذکر کئے ہیں، تو بھائی ہونے میں کون سی بات ہوا کرتی ہے؟ بنی آدم جتنے ہیں وہ سب آپس میں بھائی بھائی ہیں اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (سورۂ حجرات: ۱۰) سارے مؤمن آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو اس روایت کا ترجمہ کیا ہے اُس کتاب کے اندر، جس کے بعد انہوں نے کہا کہ بنی آدم سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، کوئی بڑا کوئی چھوٹا، کسی کو اللہ نے بڑائی دے دی، اور کسی کو بڑائی حاصل نہیں ہے، اس عبارت کو لے کے سارے کے سارے شور مچاتے پھرتے ہیں کہ "دیکھو جی! حضور ﷺ کو بڑا بھائی کہہ دیا، یہ تو حضور ﷺ کو بڑے بھائی کے برابر سمجھتے ہیں" حالانکہ اس میں ترجمہ اسی روایت کا ہی ہے جو

(۱) مشکوٰۃ ۲/۵۴۰، باب المعجزات، فصل ثانی، عن یعلی بن مرۃ

(۲) مسند احمد ج ۱۳ ص ۱۸ / مشکوٰۃ ج ۲ ص ۲۸۳، باب عشرۃ النساء، فصل ثالث۔

میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں کہ حضور ﷺ نے فرمایا: اَکْرِمُوْا اَخَاکُمْ! عبادت تو اللہ کی کرو اور اپنے بھائی کی عزت کرو، عزت کرنے کا جو طریقہ ہے۔

اب مخلوق کو سجدہ کسی بھی تاویل سے جائز نہیں

باقی! اِس شریعت میں اب ''سجدۂ تعظیمی'' ختم ہو گیا، یہاں سجدہ اگر ہے تو صرف ''سجدۂ عبادت'' ہے، اور وہ صرف اللہ کے لئے ہوسکتا ہے، کسی دوسرے کے لئے نہیں ہے، تو یہاں سے یہ اُصول نکلا کہ سجدہ خالق کے لئے ہے، مخلوق کے لئے نہیں، اور اللہ کے علاوہ کائنات میں جو کچھ ہے وہ سب مخلوق ہے، معلوم ہو گیا کہ سجدہ ان کے لئے نہیں ہے، ماں باپ کے لئے نہیں ہے، بیوی کے لئے اپنے خاوند کے لئے نہیں ہے کہ بیوی خاوند کو سجدہ کرے، اُستاذ کے لئے نہیں ہے، پیر کے لئے نہیں ہے، نبی کے لئے نہیں ہے، فرشتے کے لئے نہیں ہے، جن کے لئے نہیں ہے، آگ، پانی، درخت، پتھر، سورج، چاند، جن کو بھی لوگوں نے پوجا، جن کی عبادت کرتے ہیں، سجدہ کرتے ہیں یہ سب غلط، یہ سب مخلوق ہیں، سجدہ ہوسکتا ہے تو خالق کو ہوسکتا ہے مخلوق کو نہیں، یہاں سے یہ اُصول نکل آیا۔ ''اگر اللہ کی عبادت کرتے ہو'' یعنی یہ تاویل بھی نہ کرو کہ اصل عبادت تو اللہ کی ہے، ہم اگر ان کو سجدہ کرتے ہیں تو اللہ کی عبادت کے لئے کرتے ہیں اور حقیقت میں ہم ان کی عبادت نہیں کرتے، جیسے مشرکین کہتے تھے مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (سورۂ زُمر: ۳) ہم نہیں عبادت کرتے ان کی مگر اس لئے تاکہ یہ ہمیں اللہ کے پاس درجے کے اعتبار سے بڑھا دیں، یہ نظریہ بھی غلط، اگر اللہ کی عبادت کرنی مقصود ہے تو سجدہ بھی صرف اسی کے لئے ہے کسی غیر کے لئے نہیں۔ ''اور اگر یہ لوگ تکبر کریں'' اس حق بات کو قبول نہیں کرتے جو تکبر کا حاصل ہے، تو پھر یاد رکھیں! اللہ کا تو کچھ بگڑتا نہیں ''جو اللہ کے پاس ہیں'' یعنی فرشتے ''وہ فرشتے جو اللہ کے پاس ہیں تسبیح بیان کرتے ہیں اس کی دِن رات، اور وہ اُکتاتے نہیں'' اللہ کے فرشتے جو اللہ کے پاس ہیں وہ تو صبح وشام رات دِن اللہ کی تسبیح بیان کرتے ہیں اور اُکتاتے نہیں۔

اِثباتِ معاد کے لئے اِحیائے اَرض کا ذِکر

''اللہ کی آیات میں سے ہے کہ تو دیکھتا ہے زمین کو دبی دبائی'' خَاشِعَةً: دبی پڑی ہے، فَاِذَاۤ اَنْزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ: جب ہم اس کے اُوپر پانی اُتارتے ہیں اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ: تو حرکت کرتی ہے اور پھولتی ہے، حرکت میں آجاتی ہے اور پھولتی ہے، اِنَّ الَّذِيْۤ اَحْيَاهَا لَمُحْيِ الْمَوْتٰى: بے شک وہ جس نے اس زمین کو زندہ کر دیا وہی مردوں کو زندہ کرنے والا ہے۔ یہ دلیل ہے اِثباتِ معاد کے لئے اور بارہا اس کا تذکرہ ہو گیا، اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: بے شک وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔

''اِلحاد'' کا مفہوم اور ''مُلحدین'' کے لئے وعید

اِنَّ الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا: بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات میں اِلحاد اختیار کرتے ہیں، اِلحاد کا لفظ لحد سے لیا گیا ہے،

لحد کا معنی ہوتا ہے ایک طرف کو ہٹ جانا، ایک طرف کو مائل ہو جانا، یہ قبر جو کھودی جاتی ہے اور قبر میں لحد بنایا کرتے ہیں تو اس کو بھی لحد اسی لئے کہتے ہیں کہ وہ ایک طرف کو ہٹا کے بنائی جاتی ہے، تو اَلْحَدَ کا معنی ہوتا ہے کجی اختیار کرنا، سیدھے راستے کو چھوڑ کے ٹیڑھ اختیار کر لینا، تو اَلَّذِیْنَ یُلْحِدُوْنَ فِیْۤ اٰیٰتِنَا کا معنی ہوگا جو ہماری آیات میں ٹیڑھے چلتے ہیں، کجی اختیار کرتے ہیں، ان کا صحیح مطلب نہیں سمجھتے اور اس کے مطابق عقیدہ نہیں رکھتے، لَا یَخْفَوْنَ عَلَیْنَا: وہ ہم پر مخفی نہیں ہیں، ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ تو اِلحاد کا یہاں یہ معنی ہے، ہمارے ہاں جو ''ملحد'' کا لفظ استعمال کیا جاتا ہے کہ ''فلاں شخص ملحد ہے''، تو اس کا معنی بھی یہ ہوتا ہے کہ اس نے اِلحاد اختیار کیا ہوا ہے، اور اِصطلاحاً اس کی مراد یہ ہوا کرتی ہے کہ وہ قرآنِ کریم کے اَحکام کو اور اللہ کی باتوں کو ماننے کا دعویٰ تو کرتا ہے، لیکن ان کی مراد غلط بیان کرتا ہے جو اُمّت کے اِجماع کے خلاف ہے، ایسے شخص کو کہتے ہیں ''ملحد'' اور ''بے دین''، یہ بھی کافر ہے، کُفرِ اِلحاد، کُفرِ اِلحاد کا معنی یہی ہوا کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کا مفہوم ایسا بیان کرنا جو مقصودِ شارع نہیں ہے، جیسے یہ منکرین حدیث وغیرہ کرتے ہیں، سب ''ملحد'' ہیں، ان کے سامنے ذکر آئے اِقامت الصلوٰۃ کا، وہ کہتے ہیں کہ ہم مانتے ہیں کہ نماز قائم کرنی چاہیے، اِقامتِ صلوٰۃ کو مانتے ہیں لیکن اس اِقامتِ صلوٰۃ سے کیا مراد ہے؟ کہتے ہیں کہ بس اللہ کی طرف ذرا توجہ کر لی جائے اِقامتِ صلوٰۃ ہوگئی، اب اگر وہ اِقامتِ صلوٰۃ کے لفظ کو مانیں لیکن اس کی مراد ایسی بیان کریں جو مقصودِ شارع نہیں ہے تو یہ اِلحاد ہے۔ یا جس طرح سے مرزائی ''خاتم النّبیین'' کے لفظ کو ماننے کا دعویٰ تو کرتے ہیں، لیکن اس کی مراد میں گڑبڑ کرتے ہیں کہ ''خاتم النّبیین'' سے مراد یہ ہے کہ مستقل نبیوں میں سے آخری نبی یہی ہیں، غیر مستقل نبی اور بھی آسکتے ہیں، یا ظلی بروزی کی اِصطلاح بنالی، کہ جو اسی نبی کے ماتحت رہ کر اپنی نبوّت چلائیں ایسے نبی آسکتے ہیں، تو لفظ کو مان لینا اور اس کی مراد میں گڑبڑ کر دینا، اور شریعت کے خلاف اس کی مراد کو قرار دے دینا یہ ہوتا ہے ''اِلحاد''، تو گویا کہ وہ خفیہ طور پر دِین میں تحریف کرتے ہیں، ایک علی الاعلان تحریف ہوا کرتی ہے کہ اللہ کی کسی بات کا صراحتاً انکار کر دیا جائے، اور ایک ہے کہ مانا جائے لیکن اس کی مراد کو غلط کر دیا جائے، اور یہ دونوں ہی کُفر ہیں، ''بے شک وہ لوگ جو ہماری آیات میں اِلحاد اختیار کرتے ہیں کجی اختیار کرتے ہیں وہ ہم پہ مخفی نہیں ہیں۔'' اَفَمَنْ یُّلْقٰی فِی النَّارِ خَیْرٌ اَمْ مَّنْ یَّاْتِیْۤ اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ: کیا پھر وہ شخص جو آگ میں ڈال دیا جائے وہ بہتر ہے یا وہ شخص جو آئے گا امن کی حالت میں قیامت کے دن، ظاہری بات ہے کہ جو اٰمِنًا یَّوْمَ الْقِیٰمَةِ آئے گا وہی بہتر ہے، کرلو جو تم چاہتے ہو، اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ: عمل کرو جو تم چاہتے ہو، اِنَّهٗ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ: بے شک وہ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے، یہ وعید کے طور پر ہے، یہ آپ کو اجازت نہیں دی جا رہی کہ جو کچھ چاہو کرلو، یہ دھمکانا مقصود ہے کہ بہت اچھا! کرتے رہو جو کچھ کرتے ہو، ہم سے کوئی بات مخفی نہیں۔

قرآن کی عظمت اور منکرین کا انجام

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِالذِّكْرِ لَمَّا جَآءَهُمْ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے ذکر کا انکار کیا جب وہ ذکر ان کے پاس آیا، ذکر سے

قرآنِ کریم مراد ہے، اور اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کی خبر یہاں محذوف نکالیں گے مُعَذَّبُوْنَ، عذاب دیے جائیں گے، یا خبر یوں نکالیں کہ وہ خاطی ہیں، غلطی پر ہیں، اگلے الفاظ اس کے اوپر دال ہیں، اور یا یہ ہے کہ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا کا جواب (یعنی خبر) اُولٰٓئِكَ یُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِیْدٍ جو آگے آئے گا، وہ بھی نکالا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ ایسے ہیں جو دُور سے پکارے جارہے ہیں، جن کو بات سمجھ میں نہیں آتی اور ان کے اوپر کوئی کسی قسم کا اثر نہیں پڑتا، ''بے شک وہ لوگ جو نصیحت کا انکار کرتے ہیں جس وقت نصیحت ان کے پاس آگئی (اور اس کا مصداق قرآنِ کریم ہے) تو وہ غلطی پہ ہیں۔'' وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِیْزٌ: بے شک یہ قرآن البتہ بہت زور آور کتاب ہے۔ عزیز: غالب، جس کی ہر بات پُرزور ہے، ظاہری طور پر بھی اس میں بڑی ہیبت اور بڑا زور، اور اس کے اَحکام میں اس کی باتوں میں نصیحتوں میں سب میں غلبہ نمایاں ہے، ''بے شک وہ ایک عزیز کتاب ہے، بہت عزّت والی، بہت غلبے والی'' لَّا یَاْتِیْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَیْنِ یَدَیْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ: نہیں آسکتا، اس کے پاس باطل اس کے سامنے سے نہ اس کے پیچھے سے، علی الاعلان باطل مقابلہ کرکے بھی اس پہ غلبہ نہیں پاسکتا، کسی خفیہ راستے سے بھی اس میں باطل نہیں گھس سکتا، یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ذکر کیا گیا ہے کہ باطل اس پہ اثر انداز نہیں ہوسکتا، نہ لفظی حیثیت سے نہ معنوی حیثیت سے، یہ ویسی بات ہے جیسے آپ کے سامنے پہلے آیت آئی تھی اِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ (سورۂ حجر:۹) ہم اس کی حفاظت کرنے والے ہیں، تو حفاظت اس کی نمایاں ہے کہ باطل اس میں کسی طرح سے نہیں گھس سکتا، نہ اس میں لفظاً تحریف ہوسکتی ہے نہ معنًی، اور اگر کوئی تحریف کرنے کی کوشش کرے تو اس کی کوشش ہمیشہ ناکام ہوئی اور ہوتی رہے گی، اور یہ اللہ کی کتاب جیسے آئی تھی ویسی محفوظ ہے، ''نہیں آسکتا اس کے پاس باطل اس کے سامنے سے نہ اس کے پیچھے سے'' تَنْزِیْلٌ مِّنْ حَكِیْمٍ حَمِیْدٍ: یہ اتاری ہوئی ہے حکیم اور حمید کی طرف سے۔

تسلّیٔ رسول

مَا یُقَالُ لَكَ اِلَّا مَا قَدْ قِیْلَ لِلرُّسُلِ مِنْ قَبْلِكَ: یہ حضور ﷺ کے لئے تسلّی ہے، نہیں کہی جاتی آپ کو مگر وہی بات جو کہی گئی رسولوں کو آپ سے پہلے، اِنَّ رَبَّكَ لَذُوْ مَغْفِرَةٍ: بے شک تیرا ربّ البتہ مغفرت والا ہے، وَّذُوْ عِقَابٍ اَلِیْمٍ: اور دردناک عذاب والا ہے، یہ دونوں صفتیں اللہ کی نمایاں کی گئیں، لَذُوْ مَغْفِرَةٍ میں اُمید دِلائی ہے، ذُوْ عِقَابٍ اَلِیْمٍ کے اندر وعید ہے، اِنَّ الْاِیْمَانَ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ۔

''خوئے بدرا بہانہ بسیار''

وَلَوْ جَعَلْنٰهُ قُرْاٰنًا اَعْجَمِیًّا لَّقَالُوْا لَوْلَا فُصِّلَتْ اٰیٰتُهٗ: یہ بھی ان کے ایک شبہ کا جواب ہے، کافر کہا کرتے تھے کہ جب یہ رسول عربی ہے اور اس کے اوپر کتاب بھی عربی میں اُتری، تو خواہ مخواہ شبہ پڑتا ہے کہ اس نے خود بنالی، اور اگر یہ رسول عربی ہوتا اور اس

کے اوپر کتاب کسی اور زبان میں اترتی تو کم از کم یہ شبہ نہ ہوتا کہ اس نے یہ خود بنالی، یعنی جدال بالباطل کی ایک یہ بھی صورت ہے کہ وہ یوں کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ نہ ماننے کے لئے بہانہ چاہیے، ''خوائے بدرا بہانہ بسیار''، اب یہ یوں کہتے ہیں، اور اگر یہ کتاب اُتار دی جاتی عربی کے علاوہ کسی دوسری زبان میں پھر یہ کہتے کہ عجیب بے ڈھنگی بات ہے کہ رسول تو عربی ہے اور کتاب عجمی؟ یہ بھی کوئی جوڑ ہے؟ یا مخاطب تو عربی ہیں اور جو کتاب اُتاری جارہی ہے وہ عجمی ہے؟ پھر یہ یوں کہنے لگ جاتے، تو کوئی نہ کوئی انہوں نے بہانہ بنانا ہے نہ ماننے کے لئے۔ ''اگر ہم اس کو قرآن عجمی بنادیتے تو یہ کہتے کہ کیوں نہیں کھول کر بیان کی گئیں اس کی آیتیں'' ءَ اَعْجَمِیٌّ وَّ عَرَبِیٌّ: کیا کتاب عجمی اور رسول عربی؟ پھر یہ یوں اعتراض اُٹھاتے۔

قرآن مؤمنین کے لئے شفا اور کُفّار کے لئے باعثِ گمراہی ہے

قُلْ هُوَ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّ شِفَآءٌ: آپ کہہ دیجئے یہ ان لوگوں کے لئے جو ایمان لاتے ہیں ہدایت ہے اور شفا ہے، وَالَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ: اور جو لوگ ایمان نہیں لاتے فِیْۤ اٰذَانِهِمْ وَقْرٌ وَّ هُوَ عَلَیْهِمْ عَمًى: ان کے کانوں میں بوجھ ہے اور وہ قرآن ان کے اُوپر گمراہی کا باعث ہے، اندھاپن ان کا بڑھتا جارہا ہے اس قرآنِ کریم کے ذریعے سے، عمیٰ اندھے پن کو کہتے ہیں یعنی قرآنِ کریم ان کے اُوپر عمیٰ ہے، ان کے لئے مزید گمراہی کا باعث بنتا ہے، جیسے جیسے اللہ کی باتیں آئیں گی اور وہ انکار کریں گے گمراہی بڑھتی چلی جائے گی، جیسے مفسرین مثال دیتے ہیں کہ یہ سورج بذاتِ خود روشنی ہے، لیکن چمگادڑ کو اندھا کرنے کا ذریعہ ہے کہ چمگادڑ اندھیرے میں تو دیکھتی ہے، جیسے جیسے سورج کی چمک بڑھتی جاتی ہے اس کی بینائی ختم ہوتی چلی جاتی ہے، تو اس کی وجہ سورج میں نقص نہیں، اس کی آنکھ میں خرابی ہے، جس طرح ہمارے شیخ (سعدیؒ) کہتے ہیں:

گر نہ بیند بروز شپرہ چشم   چشمۂ آفتاب را چہ گناہ[1]

اگر دِن کو چمگادڑ کی آنکھ نہیں دیکھتی تو اس میں آفتاب کا تو کوئی قصور نہیں ہے، یہ اس کی اپنی آنکھ کا قصور ہے، اسی طرح سے کافر، جس طرح سے قرآنِ کریم کی روشنی بڑھتی جاتی ہے ان کا اندھا پن زیادہ نمایاں ہوتا چلا جارہا ہے، ان کی گمراہی میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے، ایک آیت اُتری اس کا انکار کیا، ایک گمراہی، دُوسری اُتری، انکار کیا، گمراہی میں اضافہ ہوگیا، جس طرح سے مؤمن درجہ بدرجہ ایمان لاتے ہیں تو ان کا نُورِ ایمان بڑھتا چلا جاتا ہے، تو کافر انکار کرتے ہیں تو کُفر کی ظلمت بڑھتی چلی جاتی ہے، مؤمنوں کے لئے یہ ہدایت اور شفا ہے، یعنی راہنمائی بھی ہے اور اس راہنمائی کو قبول کر لیتے ہیں تو ان کی بیماریاں بھی دُور ہوتی ہیں، رُوحانی بیماریوں کے لئے بھی شفا ہے، اور بدنی اور جسمانی بیماریوں کے لئے بھی شفا ہے، جیسے کہ تعویذ گنڈہ اور اس قسم کی چیزوں میں

(۱) ''گلستان سعدی''، باب اوّل، حکایت نمبر ۵۔

قرآنِ کریم کی آیات تجربہ ہے کہ بہت ساری بیماریوں کے لئے شفا کا باعث بھی بن جاتی ہیں، لیکن اصل میں قرآنِ کریم اُتاما گیا ہے رُوحانی شفا کے لئے، یہ نسخۂ شفا رُوحانیت کے لئے ہے۔

کافروں کی مثال

اُولٰٓئِكَ يُنَادَوْنَ مِنْ مَّكَانٍۢ بَعِيْدٍ: یہی لوگ ہیں جو پکارے جا رہے ہیں دُور جگہ سے، ''دُور جگہ سے'' پکارے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا، کیونکہ جس کو دُور سے پکارا جائے بسا اوقات اس کے کان میں آواز تو پہنچ جاتی ہے لیکن وہ لفظوں کو نہیں سمجھتا، تو ان کے نہ سمجھنے کی یہ تعبیر ہے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جیسے ان کو دُور سے پکارا جا رہا ہو۔ ماننے والا جو بات کو مان لیتا ہے وہ ایسے ہے جیسے اس کو قریب سے بات بتائی گئی اور وہ مان گیا، اور جو نہیں ماننے والا وہ یوں سمجھو کہ چاہے بلانے والا پاس کھڑا ہے لیکن وہ اس سے کوسوں دُور ہے، دُور ہونے کی وجہ سے جب اسے بلایا جاتا ہے تو وہ سمجھتا کچھ نہیں، ''یہی لوگ ہیں جو آواز دیے جا رہے ہیں دُور جگہ سے۔''

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ
ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی پھر اس میں اختلاف کیا گیا، اگر نہ ہوتی ایک بات جو تیرے رَبّ کی طرف سے سبقت لے گئی
لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۴۵﴾
تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، اور بے شک یہ لوگ اس قرآنِ کریم کی طرف سے شک میں ہیں جو ان کو تردد میں ڈالنے والی ہے ﴿۴۵﴾
مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿۴۶﴾
جو کوئی شخص نیک عمل کرے گا وہ اپنے نفع کے لئے کرے گا، اور جو کوئی بُرا عمل کرے گا تو اس کا وبال اسی پہ پڑنے والا ہے، تیرا رَبّ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ﴿۴۶﴾

تفسیر

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی اور مخالفین کو تنبیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ: لَقَدْ تاکید کے لئے ہے، ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی، فَاخْتُلِفَ

فِیْہِ: پھر اس میں اختلاف کیا گیا یعنی کسی نے مانا کسی نے نہ مانا، اور کسی نے کتاب کو اُصولی طور پر تو تسلیم کرلیا لیکن آگے اس کی ہدایات کو تسلیم نہ کیا، وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ: اگر نہ ہوتی ایک بات جو تیرے رَبّ کی طرف سے سبقت لے گئی، لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ تو ان کے درمیان فیصلہ کردیا جاتا، ان اختلاف کرنے والوں کے درمیان عملی فیصلہ کردیا جاتا، مخالفت کرنے والوں کو برباد کردیا جاتا، وَاِنَّهُمْ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ: اور بے شک یہ لوگ اس قرآن کریم کی طرف سے شک میں ہیں جو ان کو تردد میں ڈالنے والی ہے......
پچھلے رُکوع کے اختتام پر قرآنِ کریم کا ذکر آیا تھا دونوں قسم کے لوگ ذکر کئے گئے تھے قُلْ هُوَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا هُدًى وَّشِفَآءٌ میں ماننے والوں کے لئے قرآنِ کریم کا ہدایت اور شفا ہونا مذکور تھا، اور اگلی آیت کے اندر نہ ماننے والوں کا ذکر تھا کہ یہ لوگ ایسے ہیں جیسے ان کے کانوں میں بوجھ ہے کوئی بات سنتے ہی نہیں، اور جیسے جیسے قرآنِ کریم اترتا جارہا ہے ان کی گمراہی میں اضافہ ہوتا چلا جارہا ہے۔ تو یہ الفاظ جو آگے ذکر کئے گئے ہیں یہ سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے لئے بھی ہیں اور مخالفین کے لئے وعید پر بھی مشتمل ہیں، کہ اگر یہ لوگ قرآنِ کریم کے بارے میں اختلاف کئے ہوئے ہیں تو یہ کوئی نئی بات نہیں، اس سے قبل موسیٰ علیہ السلام کو تورات دی گئی تھی (اور یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ دی گئی تھی، جیسے کہ لَقَدْ کے لفظ سے تاکید معلوم ہوتی ہے) تو اس کو بھی لوگوں نے تسلیم نہیں کیا، کسی نے مانا کسی نے نہ مانا، فَاخْتُلِفَ فِيْهِ، تو یہ اختلاف اس کتاب کے بارے میں بھی ہوا۔ اور اللہ تعالیٰ نے ایک بات طے کرلی کہ دُنیا میں انسان کو مختار بنا کے چھوڑا ہوا ہے اور اصل جزا اور سزا کا سلسلہ آخرت میں ہے، اگر یہ بات طے شدہ نہ ہوتی تو جب انہوں نے اللہ کی کتاب کے ساتھ اختلاف کیا تھا تو اسی وقت ان کو برباد کردیا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی اس طے شدہ بات کے مطابق ان کو مہلت دیئے ہوئے ہے، اور جس طرح سے اُن لوگوں نے اختلاف کیا تھا تورات کے بارے میں اسی طرح سے یہ موجودہ لوگ یہ بھی قرآنِ کریم کی طرف سے شک میں مبتلا ہیں جو ان کو چین نہیں لینے دیتی، آئے دِن شبہات ان کے دِلوں میں پیدا ہوتے ہیں۔ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا: جو کوئی شخص نیک عمل کرے گا وہ اپنے نفع کے لئے کرے گا، اور جو کوئی بُرا عمل کرے گا تو اس کا وبال اسی پہ پڑنے والا ہے، یہ مؤمنین اور کافرین دونوں کے متعلق ذکر کردیا گیا، اگر کوئی اللہ کی کتاب کو قبول کرکے اس کی ہدایات پر عمل کرتا ہے تو فائدہ اسی کو پہنچے گا، اور اگر کوئی بُرا کام کرتا ہے (بُرے کام کا حاصل یہی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پرواہ نہ کی جائے، اس کی کتاب کو تسلیم نہ کیا جائے) تو اس کا وبال اسی پہ پڑنے والا ہے۔ وَمَا رَبُّكَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ: تیرا رَبّ بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں، تو یہ اِس آخرت کے فیصلے کی طرف گویا کہ اشارہ کیا، کہ فیصلہ آخرت میں ہوگا اور اس اصول کے تحت ہوگا کہ نیک عمل کرنے والے اچھے بدلے کو حاصل کرلیں گے، اور برے کام کرنے والوں پر ان کی برائی کا وبال پڑے گا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے زیادتی کسی پہ نہیں ہوگی، زیادتی کی یہ دونوں صورتیں ہیں کہ کسی کی نیکی کو بلاوجہ ضائع کردیا جائے اور کسی کے اوپر نا کردہ گناہ کا عذاب ڈال دیا جائے، ایسا نہیں ہوگا۔

اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ ؕ وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا وَمَا تَحْمِلُ مِنْ

اللہ ہی کی طرف لوٹایا جاتا ہے قیامت کا علم، نہیں نکلتے پھل اپنے لفافوں سے اور نہیں حاملہ ہوتی

اُنْثٰى وَلَا تَضَعُ اِلَّا بِعِلْمِهٖ ؕ وَيَوْمَ يُنَادِيْهِمْ اَيْنَ شُرَكَآءِىْ ۙ قَالُوْٓا

کوئی مؤنث اور نہیں وضع کرتی مگر اللہ کے علم کے ساتھ ہی، جس دِن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا کہ میرے شرکاء کہاں ہیں؟ مشرکین کہیں گے

اٰذَنّٰكَ ۙ مَا مِنَّا مِنْ شَهِيْدٍ ۚ ﴿۴۷﴾ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ

ہم نے آپ کو بتلا دیا کہ ہم میں سے کوئی اقرار کرنے والا نہیں ﴿۴۷﴾ گم ہو جائیں گی ان سے وہ سب چیزیں جن کو یہ پُکارا کرتے تھے اس سے قبل،

وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿۴۸﴾ لَا يَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَيْرِ ۫ وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ

اور وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ ان کے لئے کوئی بچنے کی جگہ نہیں ﴿۴۸﴾ نہیں اُکتاتا انسان بھلائی مانگنے سے، اور اگر اس کو کوئی شر پہنچ جاتا ہے

فَيَـُٔوْسٌ قَنُوْطٌ ﴿۴۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ

تو بالکل ہی مایوس اور آس توڑ کے بیٹھ جاتا ہے ﴿۴۹﴾ اور اگر ہم اس کو رحمت چکھا دیتے ہیں اپنی جانب سے تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی تھی

لَيَقُوْلَنَّ هٰذَا لِيْ ۙ وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً ۙ وَّلَئِنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ

تو البتہ ضرور کہے گا وہ کہ یہ میرے لئے ہے، اور نہیں سمجھتا میں قیامت کو قائم ہونے والی، اور اگر میں لوٹا دیا گیا اپنے ربّ کی طرف

اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى ۚ فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا ۫

تو میرے لئے اس کے پاس بھی اچھی حالت ہے پھر ہم ضرور خبر دیں گے ان لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا ان کاموں کی جو انہوں نے کئے ہیں،

وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ ﴿۵۰﴾ وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ اَعْرَضَ وَ

اور ہم ضرور مزہ چکھائیں گے انہیں سخت عذاب کا ﴿۵۰﴾ اور جب ہم انسان کے اُوپر کوئی اِنعام کرتے ہیں تو وہ منہ موڑ جاتا ہے اور

نَاٰ بِجَانِبِهٖ ۚ وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ ﴿۵۱﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ

اپنے پہلو کے ساتھ دُور ہٹ جاتا ہے، اور جس وقت اس کو شر پہنچتا ہے تو پھر وہ لمبی چوڑی دُعا والا ہوتا ہے ﴿۵۱﴾ آپ کہہ دیجئے کہ تم بتلاؤ

اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ مَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ ﴿۵۲﴾

اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہوا پھر تم نے اس کا انکار کر دیا، تو کون زیادہ بھٹکا ہوا ہے اس شخص سے جو کہ دُور کی مخالفت میں پڑا ہوا ہے ﴿۵۲﴾

سَنُرِيْهِمْ اٰيٰتِنَا فِي الْاٰفَاقِ وَفِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَهُمْ
عنقریب دکھائیں گے ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں اور ان کے اپنے نفسوں میں حتیٰ کہ اُن کے لئے واضح ہوجائے گا
اَنَّهُ الْحَقُّ ۭ اَوَلَمْ يَكْفِ بِرَبِّكَ اَنَّهٗ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ ۵۳ اَلَآ اِنَّهُمْ فِيْ
کہ یہ قرآن حق ہے، کیا تیرا رب کافی نہیں یعنی یہ بات کافی نہیں؟ کہ وہ ہر چیز کے اُوپر نگہبان ہے ۵۳ خبردار! بے شک یہ لوگ
مِرْيَةٍ مِّنْ لِّقَاۗءِ رَبِّهِمْ ۭ اَلَآ اِنَّهٗ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطٌ ۵۴
شک میں ہیں اپنے رَبّ کی ملاقات سے، خبردار! بے شک وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے ۵۴

تفسیر

قیامت کا علم صرف اللہ ہی کو ہے

جب آخرت کے فیصلے کا ذکر ہوا تو یہاں پھر خواہ مخواہ ان لوگوں کے دلوں میں سوال پیدا ہوتا تھا کہ آخر یہ قیامت آئے گی کب؟ قرآنِ کریم کی بہت ساری آیات میں بارہا یہ ذکر کیا گیا، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ آگے قیامت کے متعلق ذکر فرماتے ہیں، اِلَيْهِ يُرَدُّ عِلْمُ السَّاعَةِ: اللہ ہی کی طرف لوٹایا جاتا ہے قیامت کا علم، یعنی اس کے وقوع کی تعیین کا علم، اللہ ہی کی طرف لوٹایا جاتا ہے، کسی دوسرے کو اس کا علم حاصل نہیں، وَمَا تَخْرُجُ مِنْ ثَمَرٰتٍ مِّنْ اَكْمَامِهَا: ثَمَرٰتٍ ثمرہ کی جمع پھل، اکمام کِمٌّ کی جمع، پھل کے اوپر جو لفافہ ہوا کرتا ہے، جس طرح سے کھجوروں کے خوشے نکلتے ہیں تو ان کے اوپر وہ گابھا جس کے اندر وہ چھپے ہوئے ہوتے ہیں اس کو کِمّ کہا جاتا ہے، ''نہیں نکلتے پھل اپنے لفافوں سے'' وَمَا تَحْمِلُ مِنْ اُنْثٰى: اور نہیں حاملہ ہوتی کوئی مؤنث وَلَا تَضَعُ: اور نہیں وضع کرتی اِلَّا بِعِلْمِهٖ: مگر اللہ کے علم کے ساتھ ہی۔ یہ اللہ کے علم کا احاطہ ذکر کردیا گیا، جس میں اصل یہ ذکر کرنا مقصود ہے کہ تعیین کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قیامت کا علم کسی کو نہیں دیا، مشکوۃ شریف میں کتاب الایمان میں آپ نے پہلی روایت پڑھی تھی جو ''حدیثِ جبریل'' کے نام سے مشہور ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تھے اور چند ایک سوالات کئے تھے تو آپ نے ان کے جوابات دیئے۔ تو اس کا چوتھے نمبر کا سوال یہ تھا کہ قیامت کب آئے گی؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا تھا کہ ''مَا الْمَسْئُوْلُ عَنْهَا بِاَعْلَمَ مِنَ السَّائِلِ'' جس سے قیامت کے متعلق پوچھا جارہا ہے وہ پوچھنے والے سے زیادہ نہیں جانتا۔[1] یعنی اس کے متعلق نہ تجھے پتا ہے نہ مجھے پتا ہے، ''مَن وتو برابریم درنادانستن'' جس طرح سے شیخ محدث دہلوی اس کا ترجمہ کرتے ہیں، کہ میں اور تُو نہ جاننے میں برابر ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ نے یہ نہیں فرمایا کہ میں نہیں جانتا، یا یوں نہیں کہا کہ تُو نہیں جانتا، بلکہ فرمایا ''سائل'' کے مقابلے

---

(۱) بخاری ار۱۲ باب سوال جبریل۔ مشکوۃ کی دوسری حدیث۔

میں ''مسئول عنہا'' زیادہ نہیں جانتا، جس میں ایک عموم کا عنوان اختیار کرلیا گیا کہ کوئی پوچھنے والا ہو کہ قیامت کب آئے گی؟ کسی سے بھی پوچھنے والا ہو کہ کب آئے گی؟ دونوں کا علم برابر ہے، کسی کو پتا نہیں، جس میں جمیع انبیاء علیہم السلام جمیع ملائکہ جمیع انسان آگئے، کہ جس سے بھی پوچھو گے، جو بھی مسئول عنہا ہوگا، قیامت کے متعلق جس سے بھی پوچھا جائے گا اور جو کوئی بھی پوچھنے والا ہو، کسی کو پتا نہیں، نہ مسئول عنہا کو پتا ہے، نہ سائل کو پتا ہے، یہ علم اللہ تعالیٰ نے اپنے ساتھ خاص کیا ہے، اور کسی چیز کا پتا نہ ہونا، کسی کی تعیین کے طور پر اس کا وقت معلوم نہ ہونا یہ اس کے نہ ہونے کی دلیل نہیں، اللہ تعالیٰ کا علم محیط ہے اور اس سے کوئی چیز مخفی نہیں، جس طرح سے نمونے کے طور پر یہ چند چیزیں ذکر کردی گئیں کہ دُنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے کسی درخت کو پھل آتا ہے، وہ پھل اپنے لفافے سے نکلتا ہے، یا کوئی مؤنث حاملہ ہوتی ہے، یا کوئی مؤنث بچہ وضع کرتی ہے، جو کچھ ہے سب اس کے علم کے مطابق ہے، اس کے علم سے کوئی چیز خارج نہیں، تو جس کا علم اتنا محیط ہے وہی قیامت کی تعیین کو جانتا ہے کہ کس وقت ہوگی، انسانوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت یہ تعیین کا علم نہیں دیا، تو تعیین کا علم نہ ہونے سے کسی شبہ میں نہیں پڑنا چاہیے، اور بھی بہت ساری باتیں ایسی ہیں جو تمہیں معلوم نہیں اور اللہ کو معلوم ہیں اور وہ واقعتاً ہوتی ہیں، یہ نہیں کہ تمہارے علم میں نہ ہو تو وہ ہوتی ہی نہیں، فکر یہ کرنی چاہیے کہ جب یہ آجائے گی تو اس کے عذاب سے اور اس کی مصیبتوں سے چھوٹنے کا کیا طریقہ ہے؟

قیامت کے دِن مشرکین کا حال

اور یہی مشرکین جو قیامت کا انکار کرتے ہیں اور اللہ کی باتوں کو نہیں مانتے، بے فکری کے ساتھ کفر و شرک میں لگے ہوئے ہیں، آگے ان کا حال ذکر کیا جا رہا ہے وَیَوْمَ یُنَادِیْهِمْ اَیْنَ شُرَكَآءِیْ: جس دِن اللہ تعالیٰ انہیں آواز دے گا کہ میرے شرکاء کہاں ہیں؟ شُرَكَآءِیْ یعنی بزعم شما، جن کو تم شرکاء سمجھتے تھے، ورنہ حقیقت کے اعتبار سے تو اللہ کا شریک کوئی نہیں، جن کو تم شریک سمجھتے تھے وہ میرے شرکاء کہاں ہیں؟ قَالُوْٓا: مشرکین کہیں گے اٰذَنّٰكَ ہم نے آپ کو بتلا دیا، ہم نے آپ کو اطلاع دے دی، اٰذَنَ اِیْذَانًا: اطلاع دینا، ''ہم نے آپ کو بتلا دیا'' مَامِنَّا مِنْ شَهِیْدٍ: ہم سے کوئی شہید نہیں، شہید کا معنی اپنے نفس پر شہادت دینے والا، جس کو اقرار کرنے والا کہتے ہیں، شہادت علی النفس کا معنی ہوتا ہے اقرار کرنا، ہم میں کوئی اقرار نہیں کرتا کہ تیرا کوئی شریک ہے، یہ جھوٹ بولیں گے اور انکار کردیں گے کہ ہم تو کسی کو شریک سمجھتے ہی نہیں وَاللّٰهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِیْنَ (سورۂ انعام: ۲۳) قسمیں کھا کھا کر کہیں گے کہ ہم تو مشرک تھے ہی نہیں، ہم تو تیرا شریک کسی کو ٹھہراتے ہی نہیں تھے، یوں بھی اس آیت کا ترجمہ کیا گیا ہے ''ہم نے آپ کو بتلا دیا کہ ہم میں سے کوئی اس بات کا اقرار کرنے والا نہیں ہے کہ تیرا کوئی شریک ہے۔'' اور شہید کا معنی مشاہدہ کرنے والا بھی ہوسکتا ہے ''ہم نے آپ کو بتا دیا کہ ہم میں سے کوئی مشاہدہ کرنے والا نہیں'' یعنی وہ ہمیں نظر نہیں آتے، پتا نہیں کہاں چلے گئے، ہمارے سامنے نہیں ہیں، جس طرح سے اگلے الفاظ میں اسی مفہوم کو واضح کیا گیا، وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا یَدْعُوْنَ مِنْ قَبْلُ: گم ہو جائیں گی ان سے وہ سب چیزیں جن کو یہ پکارا کرتے تھے اس سے قبل، وَظَنُّوْا مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِیْصٍ: اور وہ لوگ سمجھ جائیں گے کہ ان کے لئے کوئی بچنے کی جگہ

نہیں، مَحِیْص ظرف کا صیغہ ہے حَاصَ حَیْصَۃً: ایک طرف کو ہٹنا۔ محیص: ہٹنے بچنے کی جگہ ان کے لئے نہیں، وہ اس بات کو سمجھ جائیں گے۔ یہ تو مشرکین کا آخرت کا انجام ذکر کیا۔

دُنیا کے اندر مشرک کا حال

آگے دُنیا کے اندر مشرک کے کچھ احوال! جس کا حاصل یہ ہے کہ اس کو چونکہ اللہ تعالیٰ سے تعلق ہوتا نہیں، اس کے قلب میں ایمان کا وزن نہیں ہوتا، اس کا قلب ایمان سے خالی ہوتا ہے، تو نہ یہ راحت کی حالت میں برقرار رہتا ہے، اور نہ یہ کسی مصیبت کی حالت میں کسی اچھے حال پہ رہتا ہے، تو اس کا دونوں صورتوں میں حال بُرا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ خوش حالی دے دے تو پھر یہ فخر اور غرور میں آ جاتا ہے، اللہ کا شکر ادا نہیں کرتا، اور اگر کسی تکلیف کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے تو پھر یہ صبر نہیں کرتا، بلکہ شکوہ شکایت اور چیخ وپکار پہ اتر آتا ہے، یہ شرک کی وجہ سے اور ایمان نہ ہونے کی وجہ سے انسان کے قلب کا حال ہوتا ہے کہ نہ خوش حالی میں وہ راہِ راست پہ رہے اور نہ بدحالی میں راہِ راست پہ رہے، اور ایمان کی برکت سے انسان کو ایک استقامت نصیب ہوتی ہے، اگر اللہ تعالیٰ اسے خوش حالی دیتے ہیں تو شکر گزار رہتا ہے تو بھی اس کا ربط اللہ سے نہیں ٹوٹتا، اور اگر اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت اس کو کسی امتحان میں ڈال دیتا ہے تو بھی اس کا تعلق اللہ سے رہتا ہے صبر کے ساتھ، اور آئندہ امید لگائے رکھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تکلیف کو زائل کر دیں گے، تو اس صورت میں بھی اُس کا ربط اللہ سے نہیں ٹوٹتا۔ لَا یَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ مِنْ دُعَآءِ الْخَیْرِ: دعاءِ الخیر میں مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ سَئِمَ یَسْـَٔمُ: اُکتانا۔ نہیں اُکتاتا انسان بھلائی مانگنے سے، یعنی ترقی کی ہوس اس میں بہت ہے، ہر وقت اپنے لیے یہ بھلائی کا طالب ہے، خوش حالی اور ترقی کا طالب ہے، لَا یَسْـَٔمُ الْاِنْسَانُ: نہیں اُکتاتا انسان بھلائی طلب کرنے سے، بھلائی مانگنے سے، وَاِنْ مَّسَّهُ الشَّرُّ: اور اگر اس کو کوئی شر پہنچ جاتا ہے۔ شر: بُرا حال جو اس کی مرضی کے خلاف ہے۔ اگر اس کو کوئی شر پہنچ جاتا ہے فَیَئُوْسٌ قَنُوْطٌ: دونوں مبالغے کے صیغے ہیں، تو پھر یہ مایوس ہو جاتا ہے اور آس توڑنے والا ہے، یؤس قنوط دونوں کا مفہوم ایک جیسا ہے لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ (سورۂ زُمر: ۵۳) یہ پہلے لفظ آپ کے سامنے آیا تھا، لَا تَایْـَٔسُوْا مِنْ رَّوْحِ اللّٰهِ (سورۂ یوسف: ۸۷) تو یَئِسَ یہ بھی مایوس ہونے کے معنی میں ہوتا ہے، اور قَنِطَ یہ بھی مایوس ہونے کے معنی میں ہوتا ہے، تو یؤس قنوط یہ دو لفظ بطور مزید مبالغے اور تاکید کے آگئے، وہ بالکل ہی مایوس اور آس توڑ کے بیٹھ جاتا ہے، دل اس کا ٹوٹ جاتا ہے، آئندہ کے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو توقع ہی نہیں رہتی کہ مجھے کوئی خیر اور بھلائی ملے گی اس طرح سے آس توڑ کے بیٹھ جاتا ہے۔

''کامیابی'' کو اپنا کمال سمجھنا ایک دھوکا ہے

وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ رَحْمَةً مِّنَّا مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ: اور اگر ہم اس کو رحمت چکھا دیتے ہیں اپنی جانب سے، رحمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں، خوش حالی دے دیتے ہیں ہم اپنی جانب سے، مِنْۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ: تکلیف کے بعد جو اس کو پہنچی تھی، لَیَقُوْلَنَّ هٰذَا لِیْ ''وَمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً: البتہ ضرور کہے گا وہ، هٰذَا لِیْ: یہ میرے لائق ہے، مجھے اپنی اہلیت اور قابلیت کے ساتھ یہ چیز حاصل ہوئی، میں اسی کے لائق تھا کہ مجھے یہ ترقی حاصل ہوگئی، یہ مال دولت میں وسعت حاصل ہوگئی، یہ جاہ اور مرتبہ مل گیا، هٰذَا لِیْ: یہ میرے لئے ہے

یعنی میں اس کے لائق ہوں، مجھے قابلیت کی بنا پر یہ بات ملی ہے، یعنی اس نعمت کے حاصل ہوتے ہی رحمت کے حاصل ہوتے ہی یہ پھول جاتا ہے، اور اپنی حقیقت کو پھر بھول جاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ سے اس کا ربط نہیں رہتا، پھر فوراً اس کو اپنی قابلیت کا تصور آجاتا ہے کہ میں نے فلاں کام کیا تھا، اپنی محنت کی تھی، اپنی استعداد کے ساتھ میں نے اس چیز کو حاصل کیا، اللہ تعالیٰ کی طرف اس کی نسبت توڑ دیتا ہے، اور پھر جب پیٹ بھر جاتا ہے کھانے کو ملتا ہے تو پھر یوں بھی ڈینگیں مارتا ہے کہ کیا ہوتی ہے قیامت؟ کوئی قیامت نہیں آئے گی، پھر اس قسم کی حقیقتوں کو بھی جھٹلاتا ہے۔ اور اگر آئے گی تو جس طرح سے ہمیں یہاں اللہ نے خوش حال رکھا ہے وہاں بھی ہم خوش حال ہی ہوں گے، جیسے یہاں ہم اچھے ہیں وہاں بھی اچھے ہی ہوں گے، اور کافر مشرک اس قسم کی باتیں کیا ہی کرتے تھے، جیسے سورۂ کہف میں دو ساتھیوں کی گفتگو جو آئی تھی تو اس میں یہی باتیں آئی تھیں وَّلَىِٕنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا (آیت:۳۶) اگر میں چلا بھی گیا تو وہاں میرے لئے بھلائی ہی بھلائی ہوگی، اس قسم کے الفاظ اور بھی سورتوں میں آئے ہیں۔ ''کہتا ہے کہ یہ میرے لئے ہے'' یعنی میں اسی کے لائق تھا، ''اور نہیں سمجھتا میں قیامت کو قائم ہونے والی'' وَّلَىِٕنْ رُّجِعْتُ اِلٰى رَبِّيْٓ: اور اگر میں لوٹا دیا گیا اپنے رَبّ کی طرف، اِنَّ لِيْ عِنْدَهٗ لَلْحُسْنٰى: تو میرے لئے اس کے پاس بھی اچھی حالت ہے، یعنی پھر وہ یوں ڈینگیں مارنے لگ جاتا ہے، فَلَنُنَبِّئَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِمَا عَمِلُوْا: پھر ہم ضرور خبر دیں گے ان لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا ان کاموں کی جو انہوں نے کئے ہیں، وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنْ عَذَابٍ غَلِيْظٍ: اور ہم ضرور مزہ چکھائیں گے انہیں سخت عذاب کا۔

عذابِ غلیظ: سخت عذاب۔

خوشی اور غم کی حالت میں کافر کی دُعا میں فرق

وَاِذَآ اَنْعَمْنَا عَلَى الْاِنْسَانِ: اور جب ہم انسان کے اُوپر کوئی انعام کرتے ہیں، اَعْرَضَ: تو وہ منہ موڑ جاتا ہے، وَنَاٰ بِجَانِبِهٖ: اور اپنے پہلو کے ساتھ دُور ہٹ جاتا ہے، خوش حال کردینے کے بعد پھر وہ ہماری پروا نہیں کرتا، ہم سے لاتعلق ہوجاتا ہے، ہمارے اَحکام سے منہ موڑ کے چل دیتا ہے۔ نَاٰی یَنْاٰی: دُور ہونا۔ دُور ہوتا ہے وہ اپنے پہلو کے ساتھ، ''اعراض کر جاتا ہے اور اپنے پہلو کے ساتھ دُور ہٹ جاتا ہے، پہلو تہی کر جاتا ہے'' وَاِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ: اور جس وقت اس کو شر پہنچتا ہے، فَذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ: پھر وہ لمبی چوڑی دُعا والا ہوتا ہے، پھر ہر وقت چیخ پکار کرتا ہے، ہائے اللہ! میں کیا کروں؟ ہائے اللہ! یوں ہوجائے، اس طرح سے چیخ و پکار کرنے لگ جاتا ہے۔ عریض: عرض والی چیز جس کو چوڑی کہتے ہیں، اور جو عرض والی ہوا کرتی ہے طول اس کے مطابق ہی ہوا کرتا ہے، تو کسی چیز کو چوڑی قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ لمبی بھی وہ اسی حساب سے ہی ہے، جیسے اللہ تعالیٰ نے جنّت کا عرض ذکر کیا عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ وَالْاَرْضُ (آل عمران: ۱۳۳) جنّت کی چوڑائی اتنی ہے جتنی کہ آسمان اور زمین، تو اس کے اندازے سے لمبائی خود معلوم ہوجائے گی، تو اس لئے یہاں ترجمہ یوں ہی کیا جائے گا ''لمبی چوڑی دُعاؤں والا ہوتا ہے'' بہت چیخ و پکار کرتا ہے۔ اور یہ اس کا دُعا کرنا کوئی اللہ کی رحمت سے اُمید لگانے کی بنا پر نہیں ہوتا، بلکہ جزع فزع کے طور پر جس طرح سے انسان اپنی زبان سے چیخ و پکار کرتا ہے، دل میں مایوسی ہوتی ہے، قنوط ہے، ہائے اللہ! یہ کیا ہوگیا، ہائے اللہ! یوں ہوجانا چاہیے، ہائے اللہ! اب میں کیا کروں، بے صبری کے ساتھ چیخ

و پکار کرتا ہوا اس طرح سے وہ بولتا ہے، تو ذُوْ دُعَآءٍ عَرِيْضٍ سے یہ مراد ہے، ورنہ دل کے اندر مایوسی ہوتی ہے، اس کو کوئی اُمید نہیں ہوتی کہ اللہ کی طرف سے کچھ حاصل ہوگا، اللہ کے ساتھ اس کا ربط نہیں ہوتا، اپنی اس جزع فزع کے طور پر زبان سے اس قسم کی چیخ و پکار کرتا ہے۔

قرآن کے متعلّق دونوں پہلو سامنے رکھ کر کفّار کو دعوتِ فکر

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهٖ: اب آخر میں پھر قرآنِ کریم کا ہی تذکرہ ہے، کافروں سے یہ کہا جارہا ہے جو قرآنِ کریم کو تسلیم نہیں کرتے تھے کہ تم ذرا اس انداز سے سوچو کہ ایک اللہ کا بندہ یہ کہتا ہے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے آئی ہے، اور تم یہ کہتے ہو کہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے، ایک دعویٰ تمہارا ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں، اور ایک دعویٰ اِس اللہ کے بندے کا ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے، ان دونوں باتوں میں ذرا غور کرو، تم جو کہتے ہو کہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے تو تمہارے پاس بھی اس کا کوئی واضح ثبوت نہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے نہیں، اور وہ جو کہتا ہے کہ اللہ کی جانب سے ہے وہ اگرچہ اپنی جگہ دلائل رکھتا ہے لیکن تم اس کو تسلیم نہیں کرتے، لیکن ذرا غور کیجئے کہ اگر یہ قرآنِ کریم اللہ کی طرف سے نہ ہو اجس طرح سے تم یہ کہتے ہو تو ماننے والوں کا کوئی کسی قسم کا نقصان نہیں، جنہوں نے اس کو اللہ کی کتاب سمجھا ہے ان کا کوئی کسی قسم کا نقصان نہیں ہوگا، کیونکہ زیادہ سے زیادہ یہ ہوگا کہ مرنے کے بعد دونوں برابر ہوجائیں گے، مٹی ہوجائیں گے، نہ تمہیں کوئی سزا ہوگی اور نہ انہیں کوئی سزا ہوگی جنہوں نے اس قرآن کو اللہ کی کتاب مانا اور اس کو قبول کرلیا، مرنے کے بعد سب برابر ہیں، اگر تمہاری بات سچی نکل آئی تو مرنے کے بعد سب برابر ہیں، کسی کا کوئی نقصان نہیں، اور اگر دوسری شق واقع ہوگئی کہ یہ واقعی اللہ کی کتاب ہے، پھر تم سوچو کہ نہ ماننے والوں کا انجام کیا ہوگا؟ اس لئے اگر تم اس انداز کے ساتھ سوچو گے تو بھی ماننے ہی میں فائدہ ہے، انکار کرنے میں بہرحال نقصان ہے...... جس طرح سے دو دوست آپس میں گفتگو کررہے تھے، ایک آخرت کا انکار کررہا تھا اور دوسرا کہہ رہا تھا کہ نہیں! آخرت ہے، مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب کتاب کے لئے پیش ہونا ہے، اور ایک کہہ رہا تھا کہ نہیں! ایسا نہیں، تو جو آخرت کا قائل تھا وہ کہنے لگا دیکھو! میں آپ سے ایک ہمدردی کی بات کرتا ہوں کہ اگر تیری بات صحیح نکل آئی کہ آخرت نہیں ہے، مرنے کے بعد اللہ کے سامنے پیش نہیں ہونا تو میرا کوئی نقصان نہیں ہے، کیونکہ میں یہ کہتا ہوں کہ اللہ کے سامنے پیش ہونا ہے، تو کہتا ہے نہیں ہونا، کوئی حرج نہیں، مرجائیں گے، کس نے پوچھنا ہے، نہ تجھے کوئی پوچھے نہ مجھے کوئی پوچھے، لیکن اگر میری بات صحیح نکل آئی تو پھر انکار کرنے والے اپنا انجام سوچ لیں، یعنی ان دونوں باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد تم دیکھو کہ انسان کے لئے درستی اور صلاح اور کامیابی کا پہلو کون سا ہے؟ اگر مرنے کے بعد اُٹھنا نہیں ہے تو جو قائل ہے اس کا بھی کچھ نہیں بگڑا، جو نہیں قائل اس کا بھی کچھ نہیں بگڑا، مرنے کے بعد مٹی ہوگئے، سب برابر، لیکن اگر یہ خیال یہ دوسرا گمان یہ وہم ہی سہی، لیکن اگر یہ واقع ہوگیا، واقع ہونے کے بعد پھر جو انکار کرنے والے ہیں پھر ان کے پلے کچھ نہیں ہے، پھر وہ برباد ہوجائیں گے، اس لئے مستقبل کی فکر کرنے والوں کو یوں ہی چاہیے کہ یہ اثباتی پہلو لے کر اس کے لئے تیاری رکھیں، اگر واقع ہوگئی تو ٹھیک ہے تمہاری تیاری تمہارے کام آجائے گی، اگر واقع نہ ہوئی تو

نقصان کوئی نہیں، یعنی سمجھانے کے لئے ایک انداز یہ بھی ہے کہ فائدے کا پہلو بہرحال اس میں ہے کہ تم آخرت کا عقیدہ اختیار کرو اور اس کے مطابق تیاری رکھو، اور اگر تم نے آخرت کا عقیدہ اختیار ہی نہ کیا اور اس کے مطابق تیاری نہ کی اور وہ واقع ہوگئی تو اس صورت میں پھر نقصان ہی نقصان ہے...... اسی طرح سے یہاں دو باتیں ہیں کہ اگر یہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں جس طرح سے تم کہتے ہو، اور کوئی شخص اس کو اللہ کی طرف سے سمجھتا ہے، تو مرنے کے بعد دونوں برابر ہو جاؤ گے، قرآنِ کریم کو اللہ کی کتاب سمجھنے والے کو پھر کوئی نہیں پوچھے گا، کیونکہ مرنے کے بعد جب آخرت آنی ہی نہیں اور اللہ کے سامنے جانا ہی نہیں، تو اگر کسی نے اس کو اللہ کی کتاب سمجھ لیا تو کیا؟ نہ سمجھا تو کیا؟ لیکن اگر واقعی یہ اللہ کی جانب سے ہوا اور تم اس کا انکار کرتے رہے تو پھر اپنا انجام سوچ لو۔ ان دونوں پہلوؤں کو سامنے رکھنے کے بعد انسان کے لئے بہتری بہرحال اسی میں ہے کہ اس کو اللہ کی کتاب سمجھے اور آخرت کے واقع ہونے کا قائل ہو اور اس کے مطابق تیاری رکھے، تب انسان کسی خطرے سے دوچار نہیں ہوگا، دوسرا پہلو بہرحال نقصان دِہ ہے، یعنی دلائل سے قطع نظر اگر دونوں باتوں کو سامنے رکھ کر سوچا جائے تو بھی فائدہ اسی میں معلوم ہوتا ہے کہ آخرت کا قول کرو اور اس کتاب کو اللہ کی کتاب سمجھو، یہاں اسی طرح سے ان کو قرآنِ کریم میں غور کرنے کی دعوت دی جارہی ہے۔ قُلْ أَرَأَيْتُمْ: آپ کہہ دیجئے کہ تم بتلاؤ! إِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ: اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہوا، ثُمَّ كَفَرْتُمْ بِهِ: پھر تم نے اس کا انکار کردیا، مَنْ أَضَلُّ مِمَّنْ هُوَ فِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ: تو کون زیادہ بھٹکا ہوا ہے اس شخص سے جو کہ دُور کی ضد میں، دُور کی مخالفت میں پڑا ہوا ہے، کیونکہ اللہ کی کتاب کی مخالفت یہ انسان کو بہت دُور پھینک دیتی ہے، جو اتنی دُور کی مخالفت میں پڑا ہوا ہے پھر اس سے زیادہ بھٹکا ہوا کون ہوگا؟

قرآن کی صداقت نمایاں ہو کر رہے گی

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ: عنقریب دکھائیں گے ہم ان کو اپنی نشانیاں آفاق میں، آفاق یہ اُفق کی جمع ہے، اُفق اصل کے اعتبار سے آسمان کے کنارے کو کہتے ہیں، لیکن آفاق کا لفظ بول کے اطرافِ عالم مراد ہوتے ہیں، دُنیا کے کنارے، اردگرد، "ہم ان کو اپنی نشانیاں دکھائیں گے آفاق میں" وَفِي أَنْفُسِهِمْ: اور ان کے اپنے نفسوں میں، حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ: حتیٰ کہ ان کے لئے واضح ہو جائے گا کہ یہ قرآن حق ہے واقع کے مطابق ہے، پیچھے جو دو احتمال ذکر کئے گئے تھے کہ اللہ کی جانب سے ہے یا اللہ کی جانب سے نہیں ہے جس طرح سے تم کہتے ہو، اس میں ایک پہلو کا اثبات ہوگیا کہ یہ واقعی اللہ کی جانب سے ہے، اور اس کی مخالفت کرنے والے بہت دُور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، ہم اس کی صداقت کی نشانیاں ان کو عنقریب اردگرد بھی دکھائیں گے اور خود ان کے اپنے نفسوں میں بھی دکھائیں گے، جس کے ساتھ ان کے سامنے واضح ہو جائے گا کہ قرآنِ کریم ایک سچی کتاب ہے اور اللہ کی جانب سے ہے۔ ان نشانیوں سے مراد یہ ہے کہ عنقریب اسلام غالب آئے گا، فتوحات حاصل ہوں گی، اور اردگرد کے ممالک فتح ہوں گے، اور خود مشرکینِ مکہ اس کے سامنے مغلوب ہوں گے، اور قرآنِ کریم کی پیش گوئیوں کے مطابق ان کے اُوپر حالات پیش آئیں گے، جس سے ان کو پتا چل جائے گا کہ یہ واقعی اللہ کی طرف سے ہے اور یہ واقعی سچی کتاب ہے، آنے والے حالات ان کے سامنے اس حقیقت کو نمایاں کردیں گے۔

تسلی رسول

اَوَلَمْ یَکْفِ بِرَبِّکَ اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ: بِرَبِّکَ یہ لَمْ یَکْفِ کا فاعل ہے، باء اس کے اوپر زائدہ ہے، جیسے کَفٰی بِاللّٰہِ شَہِیْدًا میں لفظ اللہ کے اوپر باء زائدہ ہے، اور اَنَّہٗ عَلٰی کُلِّ شَیْءٍ شَہِیْدٌ یہ بِرَبِّکَ سے بدل ہے۔ ''کیا تیرا رَبّ کافی نہیں یعنی یہ بات کافی نہیں؟ کہ وہ تیرا رَبّ ہر چیز کے اوپر نگہبان ہے؟'' یعنی جب تیرا رَبّ ہر چیز کے اوپر نگہبان ہے، یا ہر چیز کے اوپر گواہ ہے، ہر حقیقت اس کے سامنے ہے، تو جب تیرا رَبّ کہہ رہا ہے کہ تو واقعی اللہ کا رسول ہے اور یہ کتاب میری کتاب ہے، تو اس کی شہادت کے بعد کسی اور کی شہادت کی کیا ضرورت ہے؟ کوئی مانے یا نہ مانے اللہ کا شہید ہونا ہی کافی ہے، اللہ کا گواہ ہونا ہی کافی ہے، یہ حضور ﷺ کے لئے ایک تسلی کا لفظ ہے، ''کیا تیرا رَبّ کافی نہیں یعنی اس کی یہ بات کافی نہیں؟ کہ وہ ہر چیز کے اُوپر نگہبان ہے، ہر چیز کے اُوپر گواہ ہے'' تو اس نے جب گواہی دے دی کہ یہ میری کتاب ہے اور آپ میرے رسول ہیں، اور گواہی آیاتِ تنزیلیہ کے ذریعے سے بھی اور معجزات کے ذریعے سے بھی، تو یہ اللہ کی شہادت کافی ہے، اَلَآ اِنَّہُمْ فِیْ مِرْیَۃٍ مِّنْ لِّقَآءِ رَبِّہِمْ: خبردار! بے شک یہ لوگ شک میں ہیں اپنے رَبّ کی ملاقات سے، اَلَآ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیْءٍ مُّحِیْطٌ: خبردار! بے شک وہ ہر چیز کا احاطہ کرنے والا ہے۔

***

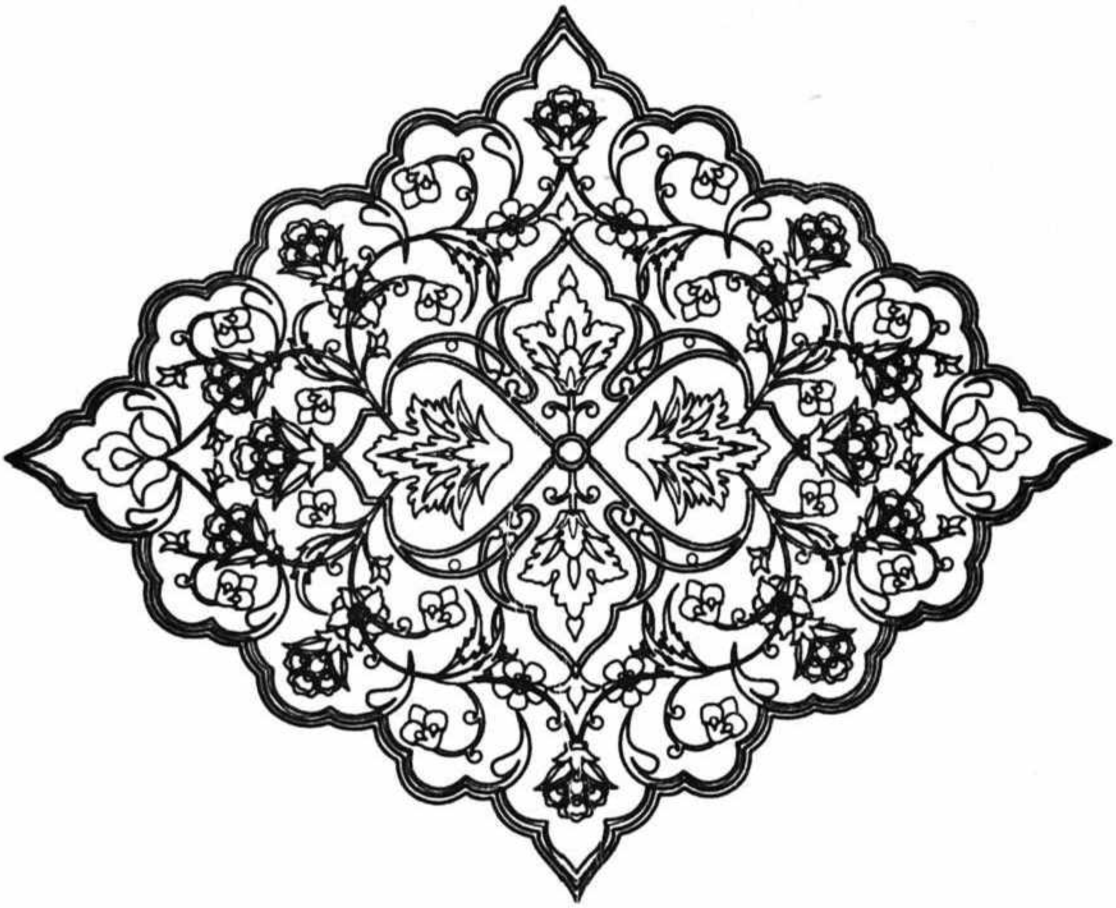

سُورَةُ الشُّورَىٰ

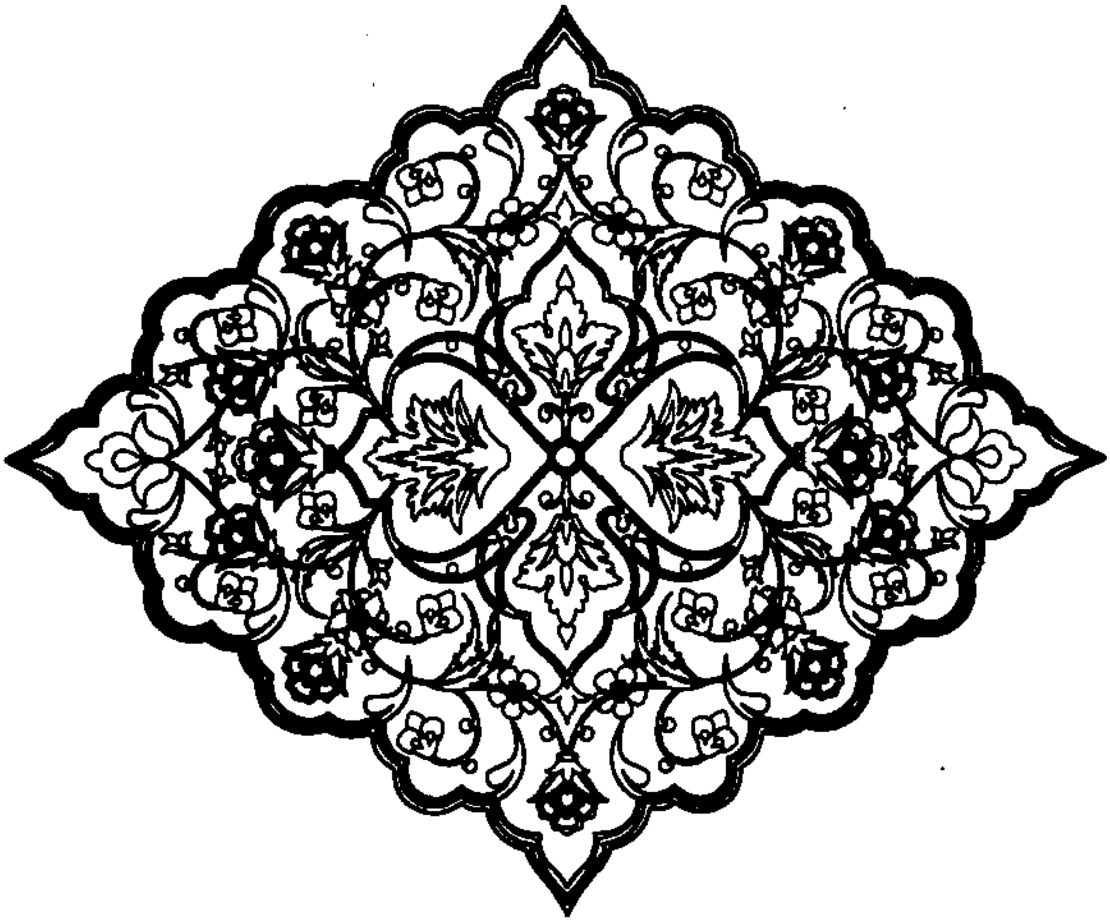

آیاتہا ۵۳ ۴۲ سورۃ الشوری مکیۃ ۶۲ رکوعاتہا ۵

سورۂ شوریٰ مکہ میں نازل ہوئی، اوراس کی ترپن آیتیں ہیں اور پانچ رکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بڑا مہربان نہایت، رحم کرنے والا ہے

حٰمٓ ۞ عٓسٓقٓ ۞ کَذٰلِکَ یُوۡحِیۡۤ اِلَیۡکَ وَ اِلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکَ ۙ اللّٰہُ الۡعَزِیۡزُ

حٰمٓ ① عٓسٓقٓ ② اللہ جو زبردست ہے حکمت والا ہے اسی طرح وحی بھیجتا ہے آپ کی طرف اور اُن لوگوں کی طرف جو آپ سے پہلے

الۡحَکِیۡمُ ③ لَہٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الۡاَرۡضِ ؕ وَ ہُوَ الۡعَلِیُّ الۡعَظِیۡمُ ④ تَکَادُ

گزرے ہیں ③ اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وہ علو والا ہے، عظمت والا ہے ④ قریب ہے کہ

السَّمٰوٰتُ یَتَفَطَّرۡنَ مِنۡ فَوۡقِہِنَّ وَ الۡمَلٰٓئِکَۃُ یُسَبِّحُوۡنَ بِحَمۡدِ رَبِّہِمۡ

آسمان پھٹ جائیں اپنے اُوپر سے، اور فرشتے تسبیح بیان کرتے ہیں اللہ کی اس حال میں کہ وہ متلبس ہیں اپنے ربّ کی حمد کے ساتھ،

وَ یَسۡتَغۡفِرُوۡنَ لِمَنۡ فِی الۡاَرۡضِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ اللّٰہَ ہُوَ الۡغَفُوۡرُ الرَّحِیۡمُ ⑤ وَ الَّذِیۡنَ

اور وہ فرشتے اِستغفار کرتے ہیں ان کے لئے جو زمین میں ہیں، خبردار! بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ⑤ اور وہ لوگ جنہوں

اتَّخَذُوۡا مِنۡ دُوۡنِہٖۤ اَوۡلِیَآءَ اللّٰہُ حَفِیۡظٌ عَلَیۡہِمۡ ۫ۖ وَ مَاۤ اَنۡتَ عَلَیۡہِمۡ بِوَکِیۡلٍ ⑥ وَ کَذٰلِکَ

نے اللہ کے علاوہ کارساز بنالیے اللہ ان کے اُوپر نگہبان ہے، آپ ان کے اُوپر متعین کیے ہوئے نہیں ⑥ اور ایسے ہی

اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ قُرۡاٰنًا عَرَبِیًّا لِّتُنۡذِرَ اُمَّ الۡقُرٰی وَ مَنۡ حَوۡلَہَا وَ تُنۡذِرَ

وحی کیا ہم نے آپ کی طرف عربی قرآن تاکہ آپ ڈرائیں مکہ والوں کو اور ان کے اردگرد والوں کو، اور تاکہ ڈرائیں آپ خصوصیت کے ساتھ

یَوۡمَ الۡجَمۡعِ لَا رَیۡبَ فِیۡہِ ؕ فَرِیۡقٌ فِی الۡجَنَّۃِ وَ فَرِیۡقٌ فِی السَّعِیۡرِ ⑦

اکٹھا کرنے کے دن سے، جس کے آنے میں کوئی کسی قسم کا شک نہیں، ایک گروہ جنت میں ہوگا اور ایک گروہ بھڑکنے والی آگ میں ہوگا ⑦

وَ لَوۡ شَآءَ اللّٰہُ لَجَعَلَہُمۡ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً وَّ لٰکِنۡ یُّدۡخِلُ مَنۡ یَّشَآءُ فِیۡ رَحۡمَتِہٖ ؕ وَ الظّٰلِمُوۡنَ

اگر اللہ چاہتا تو کردیتا ان کو ایک ہی جماعت، لیکن داخل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں، اور ظالموں

مَا لَهُمْ مِّنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۝۸ اَمِ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ ۚ فَاللّٰهُ هُوَ الْوَلِيُّ

کے لئے کوئی ولی اور کوئی مددگار نہیں ⑧ کیا انہوں نے اللہ کے علاوہ اور کارساز تجویز کر لئے ہیں؟ کارساز تو صرف اللہ ہی ہے،

وَهُوَ يُحْيِ الْمَوْتٰى ۫ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۹

وہی مُردوں کو زندہ کرے گا، وہی ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے ⑨

تفسیر

سورت کے مضامین اور ماقبل سے ربط

سورۂ شوریٰ ''مکی'' ہے، اور اس کی ترپن آیتیں ہیں، پانچ رُکوع ہیں۔ نام اس سورت کا اس آیت سے ماخوذ ہے جو آگے آئے گی وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ، مؤمنین کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان کا معاملہ آپس میں مشورے سے طے ہوتا ہے، تو ''شوریٰ'' مشورے کو کہتے ہیں، یہ لفظ آگے آرہا ہے، نام اسی سے لیا گیا۔ اور یہ ''مکی'' سورت ہے تو اس کے مضامین بھی اسی طرح سے ہی ہیں جس طرح سے ''حوامیم'' کے مضامین آپ کے سامنے ذکر ہوتے چلے آرہے ہیں۔ قرآنِ کریم اور وحی کے ساتھ ہی اس کی ابتدا ہو رہی ہے جس طرح سے پچھلی سورتوں کی تھی، اور پچھلی سورت کے اختتام میں بھی قرآنِ کریم کی حقانیت کا ہی بیان تھا، اور آگے بھی اللہ کی طرف سے آمدہ وحی کی حقانیت مذکور ہے، اِس طرح سے پچھلی سورت کا اختتام اور اِس سورت کی اِبتدا آپس میں مناسب ہو جاتی ہیں۔ مضامین آپس میں ملتے جلتے ہیں، وہی اُصولِ ثلاثہ کا ذکر ہے اور ان کے متعلقات کا، یعنی اِثباتِ توحید، جس کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ اپنی آیاتِ توحید ذِکر فرماتے ہیں، نشانیاں، قدرت، اِنعامات، جس کے ضمن میں پھر رَدِّ شرک بھی ہو جاتا ہے، اور اِثباتِ رسالت، انبیاء ﷩ کے تذکرے کے ساتھ، اور ان کی طرف جو اللہ نے وحی بھیجی اس کے ذِکر کے ساتھ اِثباتِ رسالت ہے، اور اس بارے میں ان کے شبہات کی تردید، اور آخرت کا تذکرہ۔

وحی کی حقیقت

حٰمٓ ۝ عٓسٓقٓ یہ حروفِ مقطعات ہیں، اللهُ أعلمُ بمرادِهٖ بذالك۔ كَذٰلِكَ يُوْحِيْٓ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ: ایسے ہی وحی بھیجتا ہے اللہ تعالیٰ آپ کی طرف اور ان لوگوں کی طرف جو آپ سے پہلے گزرے ہیں ایسا اللہ جو کہ عزیز حکیم ہے، اللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یہ يُوْحِيْ کا فاعل ہے۔ اللہ جو عزیز ہے حکیم ہے، ایسے ہی آپ کی طرف وحی بھیجتا ہے، جس طرح سے یہ سورتیں اُتر رہی ہیں، اور اُن لوگوں کی طرف بھی جو آپ سے پہلے گزرے ہیں۔ وحی کا لفظ آپ کے سامنے پہلے بھی کئی دفعہ گزرا، یہ اصل میں اِشارۂ سریعہ کو کہتے ہیں جلدی سے اشارہ کر دینا، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی جو آتی ہے وہ اسی طرح سے ہی ہے جس طرح سے بجلی کوندی اور اللہ کے نبی تک وہ بات پہنچ گئی، ضروری نہیں کہ دوسرے لوگوں کو اس کا احساس بھی ہو، بسا اوقات احساس ہو بھی جاتا تھا، یہ تفصیل آپ کے

سامنے آچکی، اور اس سورت کے آخر میں خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے وحی کی اقسام آئیں گی کہ اللہ تعالیٰ اپنے نبی تک اپنی بات پہنچاتا ہے تو اس کے کتنے طریقے ہیں، آخری رُکوع میں اس کا ذِکر آئے گا۔ اَللّٰهُ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ یہ يُوْحِيْٓ کا فاعل ہے، ''اللہ جو زبردست ہے حکمت والا ہے اسی طرح وحی بھیجتا ہے آپ کی طرف اور ان لوگوں کی طرف جو آپ سے پہلے گزرے ہیں۔''

اللہ کی صفات

لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اسی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ وہ علوّ والا ہے، عظمت والا ہے۔ علیّ: علوّ والا۔ عظیم: عظمت والا۔ علوّ کے اندر یہ بات آجائے گی کہ ساری صفاتِ کمال اس کے لیے ثابت ہیں، عظمت میں یہ بات آجائے گی کہ اس میں کوئی کسی قسم کی نقص کی بات نہیں پائی جاتی، عیب کی بات نہیں پائی جاتی، مالک وہی ہے، ہر قسم کا علوّ اور عظمت اسی کے لئے ثابت ہے۔

قریب ہے کہ آسمان پھٹ پڑیں

تَكَادُ السَّمٰوٰتُ يَتَفَطَّرْنَ مِنْ فَوْقِهِنَّ وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ: تَكَادُ افعالِ مقاربہ میں سے ہے، قریب ہے کہ آسمان پھٹ جائیں اپنے اُوپر سے، یعنی اُوپر سے ثقل محسوس کرتے ہوئے پھٹ جائیں، تفطّر: پھٹنا، کیوں پھٹ جائیں؟ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کے فرشتے اتنی کثیر تعداد میں آسمان کے اُوپر موجود ہیں کہ چار انگشت کی جگہ بھی خالی نہیں، ہر جگہ اللہ کا فرشتہ اللہ کی عبادت میں لگا ہوا ہے اور سجدہ ریز ہے،[1] جو عبادت اللہ نے اس کے لئے متعین کی، کتنی کثیر مخلوق اللہ نے آسمانوں کے اُوپر پیدا کی ہے، اس کے ثقل کے ساتھ آسمان پھٹ جائیں ایسا بھی ہوسکتا ہے، جیسے اس روایت میں اشارہ موجود ہے...... اور آسمان کا تفطر اس طور پر بھی ہے کہ دُنیا میں رہنے والے کُفر اور شرک کی باتیں کرتے ہیں، اور یہ اس قسم کی باتیں ہیں کہ جن پر اللہ تعالیٰ کا غضب ٹوٹ سکتا ہے، اور اللہ کے غضب کے ساتھ یہ آسمان ہی پھٹ جائے، جس طرح سے سورۂ مریم کے اندر اس مضمون کی تفصیل آئی تھی۔

''تسبیح'' اور ''حمد'' کا مفہوم

وَالْمَلٰٓئِكَةُ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ: اور فرشتے اپنے رَبّ کی تسبیح کرتے ہیں، اور اپنے رَبّ کی حمد بیان کرتے ہیں، ترکیب ظاہر کرتے ہوئے ترجمہ آپ یوں کیا کرتے ہیں کہ ''تسبیح بیان کرتے ہیں اللہ کی اس حال میں کہ وہ متلبس ہیں اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ'' یعنی اس کی تسبیح بھی کرتے ہیں اور اس کی حمد بھی، اس کی پاکی کے ترانے گاتے ہیں، اس کو کمالات کے ساتھ موصوف قرار دیتے ہیں، سبحان کے اندر یہ بات آیا کرتی ہے کہ اس میں کوئی نقص کی بات نہیں پائی جاتی، حمد میں یہ بات آتی ہے کہ اس میں سب کمالات پائے جاتے ہیں، تو جب ''سبحان اللہ والحمد للہ'' کہہ دیا جائے تو گویا کہ دونوں پہلوؤں سے اللہ کی تعریف ہوجاتی

(۱) مشکوۃ ص۴۵۷ عن ابی ذر ؓ، باب البکاء، فصل ثانی۔ ترمذی ۵۷/۲، باب قول النبی ﷺ: لو تعلمون ما اعلم. والذی نفسی بیدہ! ما فیھا موضع اربع اصابع...الخ.

ہے، کہ اس میں عیب اور نقص کی بات کوئی نہیں اور اس کے لئے سب صفاتِ کمال ثابت ہیں، اس لئے "سبحان الله والحمدلله" یہ جامع ذکر ہے، اللہ تعالیٰ کو یاد کرنے کے لئے ایک ایسا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے لئے بھی متعین کیا ہوا ہے، فرشتے بھی "سبحان الله والحمدلله"، "سبحان الله ربّ العالمين"، اسی قسم کی تسبیحات پڑھتے ہیں۔

فرشتوں کا اِستغفار کن کے لئے ہوتا ہے؟

وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِمَنْ فِي الْاَرْضِ: اور وہ فرشتے اِستغفار کرتے ہیں ان کے لئے جو کہ زمین میں موجود ہیں، پچھلی سورت (سورۂ مؤمن) میں آیا تھا: وَيَسْتَغْفِرُوْنَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وہ مؤمنوں کے لئے اِستغفار کرتے ہیں، یہاں لِمَنْ فِي الْاَرْضِ آ گیا، تو یا لِمَنْ فِي الْاَرْضِ سے مؤمنین ہی مراد لے لیجئے، پھر تو دونوں آیتیں آپس میں مطابق ہو جائیں گی، اور یا مَنْ فِي الْاَرْضِ کو اگر عام رکھا جائے تو پھر فرشتوں کا اِستغفار عام انسانوں کے لئے بھی ہے، جب انسان کُفر کرتا ہے، شرک کرتا ہے تو فرشتے کانپ جاتے ہیں انسان کی ان بداعمالیوں سے، لیکن اللہ تعالیٰ کے سامنے درخواست کرتے ہیں کہ اے اللہ! تُو اپنے بندوں پہ رحم فرما، ان کے اُوپر جلدی عذاب نازل نہ کر، اِن کو مہلت دے دے، ان کو ڈھیل دے دے، یہ دُعا تو ان کی عام انسانوں کے لئے ہے، اور مؤمنین کے لئے پھر خصوصیت سے بھی وہ اِستغفار کرتے ہیں، جس کی تفصیل آپ کے سامنے پچھلی سورت کے پہلے رُکوع میں آئی تھی غالباً سورۂ مؤمن میں، "اِستغفار کرتے ہیں ان کے لئے جو زمین میں ہیں" اَلَآ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ: خبردار! بےشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، تو اس کے غفور رحیم ہونے کی وجہ سے ہی یہ زمین والے لوگ بچے ہوئے ہیں، باوجود اس قسم کی گستاخیاں کرنے کے اور اس قسم کی شوخیوں کے۔

تسلّیٔ رسول

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءَ: وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے علاوہ کارساز بنا لئے، اللہ کا دروازہ چھوڑ دیا، اور کارساز بنا لیے، اللّٰهُ حَفِيْظٌ عَلَيْهِمْ: اللہ ان کے اُوپر نگہبان ہے، ان کے اعمال ان کے اقوال سب کی حفاظت اللہ کر رہا ہے، سب اس کے سامنے ہیں، "اللہ ان کے اُوپر نگہبان ہے" سب باتیں اس کو یاد ہیں، وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ: آپ ان کے اُوپر متعین کیے ہوئے نہیں، ان کو سزا دینا ان پر عذاب نازل کرنا یہ آپ کے ذِمّے نہیں، ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، آپ کے ذِمّے تو یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو ہدایات آپ کو دی جا رہی ہیں آپ ان کو سمجھاتے جائیے۔

"مکہ مکرمہ" مرکزی حیثیت رکھتا ہے

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا: اور ایسے ہی وحی کیا ہم نے آپ کی طرف عربی قرآن لِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى: تاکہ آپ ڈرائیں اُمّ القریٰ کو۔ قُریٰ قریہ کی جمع ہے بستی۔ اور اُمّ القریٰ: بستیوں کی اصل، بستیوں کا مرکز، اس سے مکہ معظمہ مراد ہے،

مکہ معظمہ اپنے اردگرد کے علاقے کے لئے مرکز تھا، اور جتنی دُنیا اس وقت آباد ہے خشکی کی سب کے لئے اس کی حیثیت مرکزی ہے، یعنی اس کو مرکزیت حاصل ہے ہر لحاظ سے، رُوحانی طور پر بھی، اور اللہ تعالیٰ نے اس کی بناوٹ رکھی بھی ایسی جگہ ہے کہ اس مُلک کو اس ظاہری دُنیا کے اندر بھی مرکزی حیثیت حاصل ہے، وَمَنْ حَوْلَهَا: اور اس کے اردگرد والوں کو، یعنی اِبتداءً آپ مکہ والوں کو ڈرائیں اور ان کے اردگرد والوں کو، چونکہ اوّلیت انہی کو حاصل ہے، حضور ﷺ مکہ معظمہ میں آئے، قرآنِ کریم عربی میں اُترا، تو اوّل مخاطب اس کے یہی لوگ ہیں، وَتُنْذِرَ يَوْمَ الْجَمْعِ: اور تاکہ ڈرائیں آپ خصوصیت کے ساتھ جمع کے دِن سے، یعنی جس دِن اللہ تعالیٰ مخلوق کو اکٹھا کرے گا، جمع یجمع: اکٹھا کرنا، ''اکٹھا کرنے کے دِن سے'' لَا رَيْبَ فِيهِ: جس کے آنے میں کوئی کسی قسم کی شک نہیں، فَرِيقٌ فِي الْجَنَّةِ وَفَرِيقٌ فِي السَّعِيرِ: اس جمع کے دِن میں پھر یہ دوگروہ بن جائیں گے، ایک گروہ جنّت میں ہوگا اور ایک گروہ بھڑکنے والی آگ میں ہوگا۔

اللہ نے اِنسان کو اِختیار کیوں دیا ہے؟

وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَجَعَلَهُمْ أُمَّةً وَاحِدَةً: اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ان سب لوگوں کو ایک ہی جماعت بنادیتا، زبردستی ایک ہی طریقے پہ چلادیتا، انسان کی فطرت، اس کی طبیعت، اس کا رُجحان ایسا کردیتا کہ سارے حق کو قبول کرتے، باطل کی طرف جاتا ہی کوئی نہ، لیکن اللہ تعالیٰ نے انسان کو اِختیار دے کر دُنیا کے اندر چھوڑا ہے، یہ اس کی حکمت کا تقاضا ہے، اس لئے آپ ڈراتے رہیے، جب یہ انجام ایسے ہی ہوگا کہ ایک گروہ جنّت میں جانا ہے اور ایک دوزخ میں جانا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اختیار بھی دیا ہے، تو کوئی مانے گا کوئی نہیں مانے گا، آپ پر اس قسم کی ذمہ داری نہیں، آپ کا فرض تو یہ ہے کہ آپ اُمّ القریٰ کے رہنے والوں کو، اہلِ مکہ کو اور اِردگرد والوں کو ڈراتے رہیے، ''اگر اللہ چاہتا تو کردیتا ان کو ایک ہی جماعت، لیکن داخل کرتا ہے جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت میں، اور ظالموں کے لئے کوئی ولی نہیں اور کوئی مددگار نہیں'' نہ ان کا کوئی کارساز ہے، اور نہ ان کا کوئی مددگار ہے، اپنے ظلم کی بنا پر وہ برباد ہوں گے، کوئی ان کو بچانے والا نہیں ہوگا۔

قدرتِ الٰہی

أَمِ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ أَوْلِيَاءَ: کیا انہوں نے اللہ کے علاوہ اور کارساز تجویز کرلئے ہیں؟ فَاللَّهُ هُوَ الْوَلِيُّ: کارساز تو صرف اللہ ہی ہے، اس کے اندر حصر کردیا، وہی کارساز ہے، اسی کو ہی کارساز سمجھنا چاہیے، کوئی دوسرا نہیں جو تمہارے کام بناسکے، بگڑی بنانے والا اس کے بغیر کوئی نہیں، وَهُوَ يُحْيِي الْمَوْتَىٰ: وہی مردوں کو زندہ کرتا ہے، وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ: وہی ہر چیز پہ قدرت رکھنے والا ہے، نہ کسی کو یہ طاقت ہے کہ مردوں کو زندہ کرسکے، اور نہ کسی کے لئے قدرتِ مطلقہ ہے، ہر چیز پر قدرت بھی اسی کی، زندگی دینا بھی اسی کا کام، کارسازی اسی کے لئے ہی ہے، تو اس کو چھوڑ کر جو دوسروں کو کارساز بنائے ہوئے ہیں وہ یقیناً غلطی پر ہیں اور بھٹکے ہوئے ہیں۔

وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡہِ مِنۡ شَیۡءٍ فَحُکۡمُہٗۤ اِلَی اللّٰہِ ؕ ذٰلِکُمُ اللّٰہُ رَبِّیۡ عَلَیۡہِ تَوَکَّلۡتُ ٭ۖ

جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے، یہی اللہ میرا رَبّ ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا

وَاِلَیۡہِ اُنِیۡبُ ﴿۱۰﴾ فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ؕ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا

اور اسی کی طرف میں رُجوع کرتا ہوں ⑩ وہی آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے، بنائے اس نے تمہارے لیے تمہارے نفسوں سے جوڑے،

وَّمِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا ۚ یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡہِ ؕ لَیۡسَ کَمِثۡلِہٖ شَیۡءٌ ۚ وَہُوَ السَّمِیۡعُ

اور چوپاؤں سے بھی جوڑے بنائے، اللہ تعالیٰ پھیلاتا ہے تمہیں اس تدبیر میں، اللہ جیسی کوئی چیز نہیں، وہ سننے والا ہے

الۡبَصِیۡرُ ﴿۱۱﴾ لَہٗ مَقَالِیۡدُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۚ یَبۡسُطُ الرِّزۡقَ لِمَنۡ یَّشَآءُ وَ

دیکھنے والا ہے ⑪ اسی کے لئے چابیاں ہیں آسمانوں کی اور زمین کی، جس کے لئے چاہتا ہے رِزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے

یَقۡدِرُ ؕ اِنَّہٗ بِکُلِّ شَیۡءٍ عَلِیۡمٌ ﴿۱۲﴾ شَرَعَ لَکُمۡ مِّنَ الدِّیۡنِ مَا وَصّٰی بِہٖ نُوۡحًا

تنگ کر دیتا ہے، وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ⑫ مشروع کیا اللہ نے تمہارے لیے وہی دِین جس کی وصیت کی اس نے نوح علیہ السلام کو

وَّالَّذِیۡۤ اَوۡحَیۡنَاۤ اِلَیۡکَ وَمَا وَصَّیۡنَا بِہٖۤ اِبۡرٰہِیۡمَ وَمُوۡسٰی وَعِیۡسٰۤی اَنۡ اَقِیۡمُوا

اور جو آپ کی طرف وحی کیا، اور جس کے ساتھ وصیت کی ابراہیم علیہ السلام کو اور موسیٰ علیہ السلام اور عیسیٰ علیہ السلام کو، کہ اسی دِین کو

الدِّیۡنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوۡا فِیۡہِ ؕ کَبُرَ عَلَی الۡمُشۡرِکِیۡنَ مَا تَدۡعُوۡہُمۡ اِلَیۡہِ ؕ اَللّٰہُ

قائم رکھو اور اس کے اندر پھوٹ نہ ڈالو، گراں گزرتی ہے مشرکین پر وہ بات جدھر آپ ان کو دعوت دیتے ہیں، اللہ تعالیٰ

یَجۡتَبِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یَّشَآءُ وَیَہۡدِیۡۤ اِلَیۡہِ مَنۡ یُّنِیۡبُ ﴿۱۳﴾ وَمَا تَفَرَّقُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ

چُن لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہتا ہے، اور رہنمائی کرتا ہے اپنی طرف اس شخص کی جو اللہ کی طرف رُجوع کرتا ہے ⑬ نہیں پھوٹ ڈالی انہوں نے مگر

بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ ؕ وَلَوۡلَا کَلِمَۃٌ سَبَقَتۡ مِنۡ رَّبِّکَ اِلٰۤی اَجَلٍ

بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آ گیا، آپس میں ضد کے طور پر، اگر نہ ہوتی ایک بات جو سبقت لے گئی تیرے رَبّ کی طرف سے ایک وقت

مُّسَمًّی لَّقُضِیَ بَیۡنَہُمۡ ؕ وَاِنَّ الَّذِیۡنَ اُوۡرِثُوا الۡکِتٰبَ مِنۡۢ بَعۡدِہِمۡ لَفِیۡ شَکٍّ مِّنۡہُ

معین تک، تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان، بے شک وہ لوگ جو کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد، وہ بھی اس کتاب کی طرف سے شک میں

مُرِیْبٍ ﴿۱۴﴾ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ ۚ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ ۚ

پڑے ہوئے ہیں ایسی شک جوان کو تردد میں ڈالے ہوئے ہے ﴿۱۴﴾ آپ اسی بات کی دعوت دیتے رہیں، اور جیسے آپ کو حکم دیا گیا اسی پر جمے رہیں،

وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ ۚ وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ ۚ وَاُمِرْتُ

اور ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیے، اور اعلان کر دیجئے کہ جو کتاب اللہ نے اُتاری میں اس پہ ایمان لایا، اور مجھے حکم دیا گیا ہے

لِاَعْدِلَ بَیْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ؕ لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ؕ

کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں، اللہ ہی ہمارا رب ہے اور وہی تمہارا رب ہے، ہمارے لیے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل ہیں،

لَا حُجَّةَ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ ؕ اَللّٰهُ یَجْمَعُ بَیْنَنَا ۚ وَاِلَیْهِ الْمَصِیْرُ ﴿۱۵﴾ وَالَّذِیْنَ

ہمارے اور تمہارے درمیان میں کوئی جھگڑا تکرار نہیں ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اکٹھا کرے گا، اور اسی کی طرف ہی لوٹنا ہے ﴿۱۵﴾ اور وہ لوگ

یُحَآجُّوْنَ فِی اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِیْبَ لَهٗ حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَعَلَیْهِمْ

جو کہ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں بعد اس کے کہ اس کو قبول کر لیا گیا، ان کا جھگڑا باطل ہے ان کے رب کے سامنے، اور ان کے اُوپر

غَضَبٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴿۱۶﴾ اَللّٰهُ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِیْزَانَ ؕ

غضب ہے اور ان کے لئے سخت عذاب ہے ﴿۱۶﴾ اللہ وہی ہے جس نے اُتاری کتاب حق کے مطابق، اور اُتاری اس نے میزان،

وَمَا یُدْرِیْكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِیْبٌ ﴿۱۷﴾ یَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِهَا ۚ

تجھے کیا پتا شاید کہ قیامت قریب ہی ہو ﴿۱۷﴾ جلدی طلب کرتے ہیں اس قیامت کو وہ لوگ جو کہ اس پہ ایمان نہیں لاتے

وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مُشْفِقُوْنَ مِنْهَا ۙ وَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهَا الْحَقُّ ؕ اَلَآ اِنَّ الَّذِیْنَ

اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ تو اس قیامت سے ڈرنے والے ہیں، اور وہ یقین کرتے ہیں کہ یہ قیامت حق ہے، خبردار! جو لوگ

یُمَارُوْنَ فِی السَّاعَةِ لَفِیْ ضَلٰلٍۢ بَعِیْدٍ ﴿۱۸﴾ اَللّٰهُ لَطِیْفٌۢ بِعِبَادِهٖ

جھگڑتے ہیں قیامت کے بارے میں، وہ بہت دور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۱۸﴾ اللہ اپنے بندوں پہ مہربانی کرنے والا ہے،

یَرْزُقُ مَنْ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِیُّ الْعَزِیْزُ ﴿۱۹﴾

رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اور وہ قوت والا ہے زبردست ہے ﴿۱۹﴾

تفسیر

وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِیۡهِ مِنۡ شَیۡءٍ فَحُکۡمُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ: جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے، اللہ کی طرف ہے، مسئلۂ توحید اگر مختلف فیہ ہو گیا ہے تو اس کا فیصلہ بھی اللہ کے سپرد، عملی فیصلہ تو آخرت میں ہوگا، دُنیا کے اندر اللہ تعالیٰ دلائل کے ساتھ فیصلہ فرماتے ہی ہیں، ''جس چیز میں بھی تم اختلاف کرو'' مِنۡ شَیۡءٍ یہ مَا کا بیان ہے، فَحُکۡمُهٗۤ اِلَی اللّٰهِ: پس اس کا حکم اللہ کے سپرد ہے، اس کا فیصلہ اللہ کے سپرد ہے، اللہ کے حوالے ہے، ذٰلِکُمُ اللّٰهُ رَبِّیۡ عَلَیۡهِ تَوَکَّلۡتُ: یہی اللہ میرا رب ہے، اسی پر میں نے بھروسا کیا، وَاِلَیۡهِ اُنِیۡبُ: اور اسی کی طرف میں رجوع کرتا ہوں، فَاطِرُ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ: وہی آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کرنے والا ہے۔

بیوی کا ہم جنس ہونا ایک نعمت

جَعَلَ لَکُمۡ مِّنۡ اَنۡفُسِکُمۡ اَزۡوَاجًا: بنائے اس نے تمہارے لئے تمہارے نفسوں سے جوڑے، بیویاں، تمہاری ہم جنس بیویاں تمہارے لئے بنائیں، یہاں ''ہم جنس'' ہی مراد ہیں، کیونکہ ہر کسی کی بیوی اس سے نہیں بنتی، یہ اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہمارے لئے ہماری بیویوں کی ہماری جنس سے ہے، بات سمجھ گئے؟ حضرت آدم علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے جہاں اللہ نے فرمایا کہ اللہ نے پیدا کیا پھر اس سے ان کی بیوی کو بنایا خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا (سورۂ نساء:۱) تو وہاں بھی ترجمہ اسی طرح سے بعض حضرات نے کیا کہ اس کی جنس سے اس کی بیوی بنائی، لیکن چونکہ تفسیری روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حوا کی تخلیق آدم علیہ السلام سے ہی کوئی جزء لے کر کی گئی تھی اس لئے خَلَقَ مِنۡهَا زَوۡجَهَا کا وہاں یہ معنی بھی ہے کہ اس کی بیوی اسی سے پیدا کی، روایات کے قرینے سے۔ لیکن یہاں تو بات واضح ہے کہ ''اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفسوں سے تمہاری بیویاں بنائیں'' یہاں وہ معنی نہیں لے سکتے کہ تمہارے نفسوں سے پیدا کیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ تمہاری جنس سے بنائیں، جیسے تم ہو ویسے تمہاری بیویاں بنا دیں۔

چوپایوں کے لئے بھی اللہ نے جوڑے بنائے

وَّمِنَ الۡاَنۡعَامِ اَزۡوَاجًا: اور اللہ تعالیٰ نے چوپایوں سے بھی جوڑے بنائے، نر اور مادہ کے جوڑے چوپایوں میں بھی ہیں، یَذۡرَؤُکُمۡ فِیۡهِ: فِیۡهِ کی ضمیر اس تدبیر کی طرف جا رہی ہے (عام تفاسیر) جو خلقِ ازواج کے طور پر ذکر کی گئی، اللہ تعالیٰ پھیلاتا ہے تمہیں اسی تدبیر میں، یعنی تمہارے لئے تمہاری بیویاں بنائیں، چوپایوں کے لئے ان کے جوڑے بنائے، اس تدبیر کے ساتھ اللہ تمہاری نسل چلاتا ہے، یَذۡرَؤُکُمۡ: اللہ تمہیں پھیلاتا ہے اس تدبیر کی وجہ سے (یعنی فی سببیہ ہے، آلوسی) اسی طرح سے اللہ تمہیں بکھیرتا ہے، پھیلاتا ہے۔

اللہ کی صفات کو سمجھنے کے لئے ایک اہم اُصول

لَیۡسَ کَمِثۡلِهٖ شَیۡءٌ: اللہ جیسی کوئی چیز نہیں، اس کو کسی چیز کے ساتھ تشبیہ نہیں دی جا سکتی، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کو سمجھنے

کے لئے اور اس کے متعلق نظریہ اور عقیدہ رکھنے کے لئے لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ ایک بنیادی چیز ہے، اس لئے اہلِ حق اہلِ سنت کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی تعبیر ایسے طور پر نہ کرو کہ اللہ کی مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آجائے، اور یہی بات بہت دفعہ آپ کے سامنے واضح کر چکا ہوں، مثلاً اللہ تعالیٰ کے لئے ہاتھ کا ذکر ہے، اب اگر ہم یہ سمجھیں گے کہ اللہ کا ہاتھ ایسا ہے جس طرح سے ہمارا، تو یہ تو پھر مثلیت قائم ہوگئی، یوں نہیں کہا جائے گا، اسی طرح اللہ کے لئے چہرے کا ذکر ہے، اور اسی طرح سے اللہ کے لئے حدیث شریف میں پاؤں کا ذکر ہے، قرآنِ کریم میں ساق اور پنڈلی کا ذکر ہے یَوْمَ یُکْشَفُ عَنْ سَاقٍ (سورۂ قلم)، اور صفات اس کی مذکور ہیں، آنا جانا ثابت ہے، بولنا ثابت ہے، دیکھنا ثابت ہے، سننا ثابت ہے، پکڑنا ثابت ہے، ارادہ ثابت ہے، یہ ساری کی ساری صفات اللہ تعالیٰ کے لئے ذکر کی جاتی ہیں، تو اس میں اہلِ حق کا عقیدہ یہی ہے: کَمَا یَلِیْقُ بِشَانِہٖ، جس طرح سے اس کی شان کے لائق ہے، ہم اپنے طور پر اس کی کوئی مثال نہیں دے سکتے کہ وہ ایسا ہے، مثال دیں گے تو مخلوق کے ساتھ تشبیہ لازم آجائے گی، اور یہ قطعی طور پر آپ کے سامنے واضح کر دیا گیا لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کہ اللہ جیسی کوئی چیز نہیں کہ جس کے ساتھ تشبیہ دے کر آپ اللہ کو سمجھ سکیں، اس کی صفات پر ہم ایمان لاتے ہیں، جس طرح سے اللہ نے ذکر کیا، اس کی ذات اور صفات کو ہم مانتے ہیں: کَمَا ھُوَ بِاَسْمَائِہٖ وَصِفَاتِہٖ، لیکن کَمَا یَلِیْقُ بِشَانِہٖ، جس طرح سے اس کی شان کے لائق ہے۔

اور اصل بات بھی یہی ہے کہ کسی چیز کی صفت کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ پہلے آپ نے اس چیز کو سمجھا ہوا ہو اور اس کی حقیقت آپ کے سامنے نمایاں ہو، تب جا کے اس کی صفت سمجھ میں آیا کرتی ہے، جب تک آپ کسی چیز کی حقیقت سے واقف نہیں ہوں گے اس کی صفت سے کَمَا حَقُّہٗ آپ واقف نہیں ہو سکتے، مثلاً ایک صفت ہے آنا اور جانا، یہ ایک روزمرہ کی بات ہے، اب آنے کی کتنی صورتیں ہیں؟ ہم کہتے ہیں کہ زید آیا، تو جب ہم زید کو جانتے ہیں کہ زید انسان ہے تو اس کا آنا بھی ہم سمجھ گئے کہ وہ کس طرح سے آتا ہے، ہم کہتے ہیں بادل آیا، اب بادل کی حقیقت اگر کوئی شخص نہ جانتا ہو تو سمجھے گا کہ شاید بادل بھی یوں ہی دو ٹانگوں پہ چل کر آتا ہے جس طرح سے زید آتا ہے، تو یہ سمجھنا کتنا غلط ہوگا، اور جو شخص بادل کی حقیقت کو جانتا ہے جس وقت کہا جائے گا کہ بادل آیا تو وہ فوراً سمجھ جائے گا کہ وہاں آنے کا کیا مطلب ہے، اور جب ہم کہتے ہیں کہ نہر میں پانی آیا، تو اگر کوئی شخص نہر کو نہیں جانتا اور اس کے پانی کو نہیں سمجھتا، تو وہ یہ سمجھ سکتا ہے کہ شاید پانی بھی زید کی طرح آتا ہے یا بادل کی طرح آتا ہے، اور اگر کسی شخص کے سامنے نہر کا مفہوم اور پانی کا مفہوم ہے تو جب ہم کہیں گے کہ پانی آیا تو فوراً سمجھ جائے گا کہ پانی کس طرح سے آتا ہے، اور اسی طرح سے ہم جس وقت سفر پہ جا رہے ہوتے ہیں تو ہم کہتے ہیں لاہور آگیا، یا ادھر (مغرب کی طرف) کو جاتے ہیں تو ہم کہتے ہیں کہ "لودھراں" شہر آگیا، اب یہاں "لودھراں" کا آنا، یا چلتے ہوئے "لاہور" کا آنا وہ آپ سمجھتے ہیں کہ جو "لاہور" اور "لودھراں" کی حقیقت کو جانتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ شہر کس طرح سے آتے ہیں، نہ یہ بادل کی طرح آتے ہیں نہ پانی کی طرح آتے ہیں نہ زید کی طرح آتے ہیں، کچھ بھی نہیں، اسی طرح ہاتھی آیا، ہاتھی کا آنا اس کی شان کے مطابق آپ تب سمجھیں گے جبکہ آپ ہاتھی کو جانتے ہیں، میرے دل میں خیال آیا، تو خیال کا آنا اس طرح سے ہے جیسے بادل آیا کرتا ہے؟ یا خیال اس طرح سے آیا کرتا ہے جس طرح سے ہاتھی یا شیر آتا ہے؟ اور اسی طرح بخار آگیا، اب بخار کے متعلق آنے کا لفظ ہے، یہ دیکھو! ایک "آنا" ہے، اور اس کی کتنی

صورتیں بنتی ہیں، اگر کوئی شخص موصوف کو نہیں جانتا تو اس کی صفت کو کس طرح سے سمجھے گا؟ کتنا فرق ہے ایک چیز کے آنے میں اور دوسری چیز کے آنے میں، یہ ایک نمونہ دکھایا آپ کو اس معاملے میں کہ جس وقت تک موصوف کی حقیقت سمجھ نہ آئے اس وقت تک اس کی صفت کا صحیح تصور نہیں کیا جاسکتا، اور اللہ تعالیٰ کی ذات ہماری عقل وفکر سے ماوراء ہے، ہم اس کی حقیقت کو نہیں پاسکتے، حقیقت کو پہچان نہیں سکتے، اس لئے ہم اس کی صفات کا بھی کماحقہ تصور نہیں کر سکے، اس لئے جس وقت ''سلم '' آپ کو پڑھائی جاتی ہے تو اس میں ابتدا یہی ہے: ''سُبْحَانَهٗ مَا أَعْظَمَ شَانَهٗ لَا يُحَدُّ وَلَا يُتَصَوَّرُ '' نہ اس کی کوئی حد حقیقی کی جاسکتی ہے نہ اس کا کوئی تصور کیا جاسکتا ہے، تو اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کے متعلق عقیدہ رکھا جاتا ہے، ہم صفات کا انکار نہیں کرتے اور ذات کا انکار نہیں کرتے، ذات کو مانتے ہیں صفات کو بھی مانتے ہیں، لیکن اس کی کوئی شکل متعین کر کے تشبیہ دے کے نہیں مان سکتے، ہم کہیں گے: كَمَا يَلِيْقُ بِشَانِهٖ، جیسے اس کی شان کے لائق ہے، وجہ آپ کی خدمت میں عرض کردی کہ جس وقت تک موصوف کی حقیقت کو انسان نہ جانتا ہو تو صفت کا صحیح تصور کرہی نہیں سکتا، اور اللہ تعالیٰ کی صفات کے بارے میں لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ یہ ایک بنیادی حیثیت ہے کہ جب بھی اللہ تعالیٰ کا تذکرہ کریں ایسے طور پر کریں کہ کسی مخلوق کے ساتھ تشبیہ نہ لازم آئے، یہی اہلِ حق کا مسلک ہے۔

وَهُوَ السَّمِيْعُ الْبَصِيْرُ: وہ سننے والا ہے دیکھنے والا ہے، یہاں بھی یہی بات! اللہ تعالیٰ سننے والا ہے، لیکن کبھی ایسے خیال نہ کرو کہ جس طرح سے ہم کان کے ذریعے سے سنتے ہیں، تو اللہ کا بھی اسی طرح سے ہمارے کان جیسا کوئی کان ہوگا اس سے وہ سنتا ہے، ہم آنکھ کے ذریعے سے دیکھتے ہیں اللہ بھی اسی طرح آنکھ کے ذریعے دیکھتا ہے، یہ بات نہیں ہے، بلکہ كَمَا يَلِيْقُ بِشَانِهٖ، کس طرح سے سنتا ہے؟ جیسے اس کی شان کے لائق ہے! کس طرح سے دیکھتا ہے؟ جیسے اس کی شان کے لائق ہے! لیکن اتنی بات یقینی ہے کہ مسموعات میں سے کوئی چیز اس سے مخفی نہیں، اور اسی طرح مبصرات میں سے بھی کوئی چیز اس سے مخفی نہیں، جو چیزیں دیکھی جاتی ہیں وہ بھی سب اس کے علم میں ہیں، اس کا علم کامل ہے،، اور اسی طرح جو چیزیں سنی جاتی ہیں وہ بھی اس کے علم میں، باقی سمع کس طرح سے ثابت ہے؟ بصر کس طرح سے ثابت ہے؟ كَمَا يَلِيْقُ بِشَانِهٖ! جیسے اس کی شان کے لائق ہے!

لَهٗ مَقَالِيْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اسی کے لئے چابیاں ہیں آسمانوں کی اور زمین کی، یہ مقالید کا لفظ پہلے سورۂ زُمر میں بھی آیا تھا، مِقْلِید کی جمع ہے، جس کو فارسی میں ''اِقلید'' کہتے ہیں، چابی، اور جس کے قبضے میں چابیاں ہوا کرتی ہیں تصرف وہی کرسکتا ہے، تو یہ اللہ تعالیٰ کے تصرف کو ذکر کرنا مقصود ہے کہ آسمان اور زمین کی چابیاں اسی کے قبضے میں ہیں، سب خزانے اسی کے قبضے میں ہیں۔

''رِزق'' کے مفہوم میں وسعت

يَبْسُطُ الرِّزْقَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَقْدِرُ: جب چابیاں اسی کے پاس ہیں، خزانے اسی کے قبضے میں ہیں، تو جس کے لئے چاہتا ہے رزق کشادہ کرتا ہے اور جس کے لئے چاہتا ہے تنگ کردیتا ہے، جس کو جتنا چاہے دیتا ہے، اور ''رزق'' کا لفظ صرف روٹی، کپڑے پر ہی نہیں بولا جاتا، ''رزق'' روٹی، کپڑا، مکان پر ہی بند نہیں، ''رزق'' تو مطلقاً اللہ کے دینے کو کہتے ہیں، رزّاق ہے وہ دیتا ہے، صحت اسی میں داخل، علم اسی میں داخل، طاقت اسی میں داخل، اقتدار اسی میں داخل، اللہ تعالیٰ جس کے لئے جو مناسب سمجھتا

ہے جس مقدار میں سمجھتا ہے دیتا ہے، سب اسی کے قبضے میں ہے، ہر قسم کے خزانے اسی کے قبضے میں ہیں، جتنا چاہے جس کو چاہے جس وقت چاہے دے، کسی دوسرے کا اس میں کوئی تصرف نہیں ہے، تو اللہ تعالیٰ کے رزاق ہونے کی شانیں مختلف ہیں، ایک کے لئے اللہ نے اپنی حکمت کے مطابق مالی وسعت مناسب سمجھی، اس کو مالی وسعت دے دی اور اس کو صحت سے محروم کردیا، ایک کو اللہ نے صحت کے خزانے میں سے وافر مقدار دے دی، اگرچہ اس کو مال اتنا نہیں دیا، کسی کے لئے اللہ تعالیٰ نے علم کا خزانہ کھول دیا، علم ہی علم دے دیا، چاہے اس کو ٹانگوں سے اور پاؤں سے کسی درجے میں محروم کردیا، اور کسی کو اللہ تعالیٰ نے کوئی چیز دے دی، کسی کو کوئی چیز دے دی، اس کی نعمتوں سے خالی کوئی بھی نہیں ہے، سمجھ گئے بات؟ آپ نے دیکھا ہوگا دُنیا کے اندر بعض لوگ اولاد کو ترستے ہیں اور وہ سمجھتے ہیں کہ اگر لاکھوں روپے بھی خرچ ہوجائیں تو ہم خرچ کرنے کے لئے تیار ہیں اللہ تعالیٰ کوئی بچہ دے دے، اور ایک کے پاس اگر مال دولت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے بچوں کی قطاریں لگا رکھی ہیں، وہ کیسے سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے کچھ نہیں دیا، اس کو تو ایسی قیمتی چیز دے دی کہ دُوسرا شخص کتنی ہی دولت خرچ کرے تو اس نعمت کو حاصل نہیں کرسکتا، اور ایک آدمی کے پاس اگر پیسوں کی کمی ہے تو اللہ نے اس کو صحت کتنی اچھی دے دی، اور اگر ایک کے پاس سونے چاندی کے ڈھیر لگادیے تو اس کو صحت سے محروم کردیا، ہر وقت ڈاکٹر سرہانے کھڑا ہے، اور اس نے واویلا کر رکھا ہے۔

نعمت کی قدر کا اِحساس کس کو ہوتا ہے؟

اب آپ دیکھیں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ کی نعمتوں سے ہر شخص فائدہ اُٹھاتا ہے، کسی کو اللہ کسی طرح سے دیتا ہے، کسی کو کسی طرح سے دیتا ہے، یہ علیحدہ بات ہے کہ جو نعمت اپنے پاس ہوتی ہے اس کی انسان کو قدر نہیں ہوتی، اور دوسرے کے پاس دیکھتا ہے تو اس کے اُوپر للچائی ہوئی نظر ڈالتا ہے، حالانکہ اگر آپ موازنہ کریں گے تو آپ کے پاس ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ دوسرے لوگ ان نعمتوں کو ترستے ہیں جو آپ کے پاس ہیں، اب ایک آدمی سے اللہ تعالیٰ ٹانگیں لے لے اور اس کو کار دے دے، اب وہ کار میں بیٹھا ہوا جارہا ہو تو آپ دیکھ کے کہیں گے کہ کتنا اچھا آدمی ہے دیکھو! اس کے پاس کار ہے، لیکن اُس سے پوچھو! کہ اگر کوئی شخص آپ سے کار لے لے اور ٹانگیں آپ کو دے دے تو آپ اس مبادلے پہ خوش ہیں؟ وہ کہے گا ہزار دفعہ خوش ہوں، کار مجھ سے لے لو اور مجھے ٹانگیں دے دو، تو کیا آپ اس بات کی قدر نہیں کرتے؟ کہ کار اگر آپ کے پاس نہیں ہے تو کم از کم ٹانگیں تو سالم ہیں، دس کاریں خرچ کرکے بھی کوئی ایک ٹانگ نہیں خرید سکتا، اور جو ٹانگوں والی راحت ہے وہ کار میں کہاں میسر؟ اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اگر کسی کو کسی دوسری نعمت سے نوازا ہے تو ساتھ اس کو آنکھوں سے نابینا کردیا، اور اگر آپ کے پاس وہ نعمت نہیں ہے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو آنکھیں دے رکھی ہیں، تو جو شخص بھی آپ کے سامنے آئے جس وقت آپ انصاف کے ساتھ توازن کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ اگر بعض نعمتیں اس کے پاس ہیں تو بعض نعمتوں سے محروم بھی ہے، اور بعض نعمتیں میرے پاس ہیں جو اس کے پاس نہیں ہیں، اور اگر قدر و قیمت کے طور پر موازنہ کیا جائے گا تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہم کسی حیثیت میں کم نہیں ہیں، لیکن انسان اس طرح سے سوچنے کا عادی نہیں ہے، اس لیے جو دوسرے کے پاس ہوتا ہے اس کا تو یہ احساس کرتا ہے کہ دیکھو! فلانے کے پاس یہ نعمت ہے،

لیکن جس سے وہ دوسرا آدمی محروم ہے وہ اس کی نظر میں نہیں ہے، اور اپنی محرومی کا احساس ہوتا ہے کہ فلانی چیز میرے پاس نہیں ہے، لیکن جس قسم کی نعمتیں حاصل ہیں ان کا احساس نہیں، اس لئے انسان کے صبر وشکر کے اندر کمی آجاتی ہے، ورنہ اگر آپ غور کریں گے تو غور کرنے کے ساتھ آپ کو معلوم ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو کسی سے کم نہیں رکھا، ایسی نعمتیں دے رکھی ہیں جن سے دوسرے لوگ محروم ہیں، کہ اگر آپ اندازہ لگائیں تو آپ کو معلوم ہوجائے گا کہ ہمارے اُوپر بھی اللہ تعالیٰ کی بڑی نوازشیں ہیں۔

حضرت حکیم العصرؒ کے اُستاذ کا اپنے نابینا ہونے پر اللہ کا شکر

ہمارے ایک اُستاذ تھے، آج بھی وہ شیخ الحدیث ہیں جامعہ ربانیہ (ٹوبہ ٹیک سنگھ) میں، حافظ نذیر احمد صاحب، نابینا ہیں،[۱] وہ فرمایا کرتے تھے کہ میں تو اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ اللہ نے مجھ سے آنکھیں لے لیں، ورنہ ہمارا خاندان اور ہمارے خاندان کا ماحول ایسا تھا کہ اگر میں آنکھوں والا ہوتا تو جس طرح سے میرے دوسرے بھائی سکولوں میں پڑھے، سکولوں میں پڑھ کر ملازمتوں کی طرف چلے گئے، میں بھی اسی راستے پہ چلتا، اللہ نے مجھے نابینا کر کے مسجد میں پہنچا دیا، تو اپنے قرآن کی نعمت دے دی، دیوبند کے فاضل، اور اِس وقت شیخ الحدیث ہیں، اب اُن کے دِل میں چونکہ علم کی قدر ہے، اور یہ علم ان کو بظاہر آنکھوں کے جانے سے ملا، تو وہ اس بات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اللہ نے آنکھیں لے لیں علم تو دے دیا، اگر یہ آنکھیں رہ جاتیں تو جس طرح سے خاندان کے باقی افراد دُنیا کی طرف نکل گئے تو مجھے بھی والدین اسی راستے پہ دوڑاتے۔

صبر وشکر کب نصیب ہوتا ہے؟

اب یہ تو اللہ جانتا ہے کہ کس کے لئے کون سی چیز بہتر ہے، اس لئے انسان ہمیشہ اُن چیزوں کو سوچے جو اللہ نے دی ہوئی ہیں، اُن کے اُوپر شکر ادا کرے، اور اگر کسی بات سے اپنے آپ کو محروم دیکھتا ہے تو خیال کرے کہ اس کے مقابلے میں اللہ نے دیا کیا کچھ ہے، اس انداز کے ساتھ اگر انسان سوچے تو پھر صبر شکر بڑا نصیب ہوتا ہے، ورنہ انسان اگر اپنی محرومی کا احساس کرے دوسرے کی نعمتوں پر نظر ڈالے تو ناشکرا ہوجاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کشادہ کرتا ہے رزق جس کے لئے چاہتا ہے اور تنگ کرتا ہے، تو ''رزق'' صرف روٹی کا نام نہیں ہے، دُنیا کے اندر جتنی نعمتیں انسان کو ملتی ہیں سب ''رزق'' کا مصداق ہیں، کسی کو اللہ کچھ دیتا ہے کسی کو کچھ دیتا ہے، محروم کسی کو نہیں رکھتا، اِنَّهٗ بِكُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ: وہ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے، اپنے علم وحکمت کے مطابق فیصلے کرتا ہے، جس کے لئے جو چیز مناسب ہے اس کو عطا کرتا ہے، اس لئے ہمارے شیخ (سعدیؒ) تسلی دیتے ہوئے کہتے ہیں نا:

آں کس کہ توانگرت نمی گرداند ۔۔۔ او مصلحتِ تو از تو بہتر داند

یعنی کسی تنگ روزی والے کو کہتے ہیں کہ جو تجھے تونگر نہیں بناتا وہ تیری مصلحت تجھ سے بہتر جانتا ہے، جیسے اس کی مثال دی اسی حکایت میں ساتھ ہی کہ ''پدر را عسل بسیار است ولیکن پسر گرمی دارست''[۲] کہ باپ کے پاس تو شہد کے ٹین بھرے پڑے

(۱) شیخ ۲۰۰۷ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے ہیں، اللہ ان کی لحد پر اربوں کھربوں رحمتیں نازل فرمائے (آمین)۔

(۲) ''گلستان'' باب سوم، حکایت نمبر ۱۵۔

ہیں، بہت شہد ہے، لیکن بیٹے کا مزاج گرم ہے، اس لئے وہ چاٹنے نہیں دیتا۔ تو اللہ کے خزانوں میں کمی نہیں کہ تمہیں زیادہ دے دے گا تو اس کے خزانے میں کمی آجائے گی، نہیں! اللہ تعالیٰ کی حکمت اور مصلحت اسی میں ہے، تمہارے حق میں جو بہتر ہے بس اللہ کا شکر ادا کرو جس حال میں وہ رکھے، اسی میں حکمت اور اسی میں مصلحت ہے، ورنہ اللہ کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔ ''وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔''

تمام انبیاء علیہم السلام کا دِین ایک ہی ہے

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ: مشروع کیا اللہ تعالیٰ نے تمہارے لئے وہی دین (مِّنَ الدِّيْنِ یہ ''مَا'' کا بیان ہے) جس کی وصیت کی اس نے نوح علیہ السلام کو اور جو آپ کی طرف وحی کیا اور جس کے ساتھ وصیت کی ابراہیم کو اور موسیٰ اور عیسیٰ کو علیہم السلام، اور حاصل اس کا یہ ہے کہ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ: اسی دِین کو قائم رکھو، وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ: اور اس کے اندر فرقہ بازی نہ کرو، اس میں پھوٹ نہ ڈالو، یعنی جو طریقہ اللہ نے تمہیں بتایا ہے یہی طریقہ پہلے سے چلا آرہا ہے، اسی کے متعلق ہی وصیت نوح علیہ السلام کو کی تھی، یہی آپ کی طرف وحی کیا، اسی کے متعلق وصیت ابراہیم علیہ السلام کو کی، موسیٰ علیہ السلام کو کی، عیسیٰ علیہ السلام کو کی، یہ معروف معروف پیغمبر ذکر کردیے، اور پیغمبروں کے ذکر میں حضرت نوح علیہ السلام کو ذکر کیا، آدم علیہ السلام کو ذکر نہیں کیا، حالانکہ آدم علیہ السلام بھی اللہ کے نبی تھے، اصل بات یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کے زمانے میں حق اور باطل کا ٹکراؤ نہیں تھا، یہ ٹکراؤ شروع ہوا ہے نوح علیہ السلام کے زمانے میں، سب سے پہلے نبی جو کہ شرک کی تردید کے لئے آئے ہیں وہ نوح علیہ السلام ہیں، اور اس سے پہلے لوگ ایک ہی طریقے پر تھے، زیادہ تر ان کو جو اَحکام دیے جاتے تھے وہ اپنی زندگی سدھارنے کے، معاش وغیرہ کے متعلق تھے، دِینی اُصول سب کے ایک تھے، کسی کا اختلاف نہیں تھا، تو حضرت نوح علیہ السلام کا زمانہ یہ زمانہ ہے کہ جس میں کُفر و شرک شروع ہوا، اور اس شرک کی تردید کے لئے حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائے۔ اور آگے حضرت ابراہیم علیہ السلام، موسیٰ علیہ السلام، عیسیٰ علیہ السلام، ان کا تعارف اس زمانے میں عام تھا۔ دِین سے مراد ہیں یہاں اُصول، بنیادی حقیقتیں، اور یہ سب انبیاء علیہم السلام میں مشترک رہی ہیں، مثلاً توحید کے سب قائل تھے، رسالت سب کے نزدیک، اور آخرت کا عقیدہ سب کا، باقی عملی اَحکام کے اندر کچھ نہ کچھ شریعتوں میں اختلاف یہ پہلے سے چلا آرہا ہے، اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے، بنیادی اُصول تمام انبیاء علیہم السلام کے ایک ہی ہیں، اور وقتی مصلحت کے طور پر اگر اَحکام میں کچھ تغیر تبدل ہوتا رہا تو اس کی کوئی بات نہیں، اَقِيْمُوا الدِّيْنَ: اسی دِین کو قائم رکھو اور اس کے اندر پھوٹ نہ ڈالو، اُصولوں میں اختلاف کرنا دُرست نہیں ہے۔ كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ: گراں گزرتی ہے مشرکین پر وہ بات جدھر آپ ان کو دعوت دیتے ہیں، جدھر آپ انہیں بلاتے ہیں، اس سے مراد توحید ہے جو کہ تمام انبیاء علیہم السلام کا عقیدہ چلا آرہا ہے، اَللّٰهُ يَجْتَبِيْٓ اِلَيْهِ مَنْ يَّشَآءُ: ''اللہ تعالیٰ چُن لیتا ہے اپنی طرف جس کو چاہتا ہے اور راہنمائی کرتا ہے اپنی طرف اس شخص کی جو اللہ کی طرف رُجوع کرتا ہے'' اللہ کی طرف ارادۃً رُجوع کیا جائے، اللہ کی طرف توجہ کی جائے، پھر اللہ کی طرف سے توفیق ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ سیدھے راستے پر چلا دیتے ہیں۔

دِینِ حق سے اختلاف کی وجہ ضد ہے

وَمَا تَفَرَّقُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ: نہیں پھوٹ ڈالی انہوں نے، نہیں اختلاف کیا انہوں نے مگر بعد اس کے کہ ان کے پاس علم آ گیا، بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ: آپس میں ضد کے طور پر، وَلَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ: ''اگر نہ ہوتی ایک بات جو سبقت لے گئی تیرے رَبّ کی طرف سے ایک وقتِ معین تک تو فیصلہ کر دیا جاتا ان کے درمیان، بے شک وہ لوگ جو کتاب کے وارث بنائے گئے ان کے بعد'' لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ: وہ بھی اس کتاب کی طرف سے شک میں پڑے ہوئے ہیں ایسا شک جو ان کو تردّد میں ڈالے ہوئے ہے، لوگوں کے اندر مذہبی طور پر جو اختلاف پیدا ہوا اس کی اصل بنیاد آپس میں ضد اور آپس میں اختلاف پر ہے، پہلے دُنیوی اَغراض مختلف ہوتی ہیں، دُنیوی اَغراض کو پورا کرنے کے لئے پھر مذہب کو ذریعہ بنالیا جاتا ہے، اور آہستہ آہستہ مذہب کے اُصول بھی بدل جاتے ہیں، قرآنِ کریم میں یہی حقیقت زیادہ تر نمایاں کی گئی کہ پہلے اختلافات اپنے ہوتے ہیں، شہوات کے، خواہشات کے، اور اپنے اَغراض کے، اور بعد میں مذہب کے اندر بھی اسی طرح سے پھوٹ ڈال لی جاتی ہے، علم کے حاصل ہوجانے کے بعد، اللہ تعالیٰ کی طرف سے وضاحت ہوگئی، پھر بھی آپس میں ضدا ضدی کے طور پر انہوں نے پھوٹ ڈالی ہے، اللہ نے فیصلہ آخرت تک معلق کر رکھا ہے، اگر یہ بات نہ ہوتی تو دُنیا کے اندر ہی ان کا فیصلہ کر دیا جاتا۔ اور پھر تورات وانجیل کے بعد جن لوگوں کو وارث بنایا گیا، جن کو یہ کتاب دی گئی (اس سے مراد سرورِ کائنات ﷺ کے مخاطبین ہیں) یہ بھی اس کو قبول نہیں کر رہے، یہ بھی اس میں اختلاف کر رہے ہیں، شک کر رہے ہیں جو ان کو تردّد میں ڈالے ہوئے ہے، مطلب یہ ہے کہ ان کا فیصلہ بھی اسی طرح سے ہے جس طرح سے پچھلے لوگوں کو ڈھیل دی گئی، مہلت دی گئی، ان کو بھی اسی طرح سے ڈھیل دی جارہی ہے۔ فَلِذٰلِكَ فَادْعُ: آپ اسی بات کی دعوت دیتے رہیے، اگر مشرکوں کو ناگوار گزرتی ہے تو گزرتی رہے، آپ اِدھر دعوت دیتے رہیں، اس بات کے لئے بلاتے رہیں۔

اِستقامت سب سے بڑی کرامت ہے

پچھلی آیات کے اندر یہ ذکر کیا گیا تھا كَبُرَ عَلَى الْمُشْرِكِيْنَ مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ: مَا تَدْعُوْهُمْ اِلَيْهِ: جس چیز کی طرف آپ ان کو بُلاتے ہیں، اور وہ بُلا کس چیز کی طرف رہے تھے؟ اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ: دِین کو قائم کرو، جس میں بنیادی مسئلہ توحید کا ہے، کیونکہ جس وقت تک عقیدۂ توحید پختہ نہ ہو دِین کی بنیاد ہی قائم نہیں ہوتی، تو آپ جس دِین کی طرف بُلا رہے ہیں جس توحید کی دعوت دے رہے ہیں مشرکین کو یہ بات بہت گراں گزرتی ہے، ان کو گراں گزرتی ہے تو گزرتی رہے، فَلِذٰلِكَ فَادْعُ: آپ اس چیز کے لئے دعوت دیتے رہیں، پہلا حکم تو یہ دیا گیا، آپ اس بات کی طرف بلاتے رہیں، دعوت دیتے رہیں، ان کی گرانی کی پروا نہ کریں۔ وَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ: اور جیسے آپ کو حکم دیا گیا اس پر جمے رہیں، اس پر اِستقامت اختیار کریں، استقامت کا مطلب ہوتا ہے دوام اختیار کرنا، پابندی کے ساتھ اس کام کو کرنا جو ذمے لگا دیا گیا، اسی لیے اولیاء اللہ میں یہ بات مشہور ہے کہ ''الاستقامۃ فوق الکرامۃ'' یعنی کسی ولی سے کوئی کرامت ظاہر نہ ہو لیکن وہ دِین کے تقاضوں پر مستقیم ہو، اس نے اِستقامت اختیار کر رکھی ہو، اللہ کے اَحکام کو مانتا ہے، منہیات سے بچتا ہے، تو یہ سب کرامتوں سے بڑی کرامت ہے، سرورِ کائنات ﷺ کو جو حکم دیا گیا کہ جیسے آپ کو حکم دیا گیا ہے

آپ اسی طرح سے اِستقامت اختیار کریں، یہ بہت بڑی اہم بات ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ پوچھا: یارسول اللہ! آپ بوڑھے ہوگئے، شِبْتَ (شابَ يَشِيبُ: بال سفید ہوجانا، بوڑھا ہوجانا) تو آپ نے فرمایا: شَيَّبَتْنِي سُوْرَةُ هُوْدٍ! مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کردیا،[1] "تو سورۂ ہود کی طرف جو نسبت کی کہ "مجھے سورۂ ہود نے بوڑھا کردیا" تو علماء فرماتے ہیں کہ ایک تو سورۂ ہود کے اندر اُمم سابقہ کے بہت واقعات نقل کیے گئے ہیں کہ ان اُمتوں نے اپنے انبیاء علیہم السلام کی نافرمانی کی تو ان کو برباد کردیا گیا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فکر لگی رہتی تھی کہ کہیں میری اُمت میری مخالفت نہ کرے، اوران پر کوئی ایسا عذاب نہ آجائے، اور فکر اور غم انسان کو بوڑھا کردیا کرتا ہے، اور یا پھر نسبت کی گئی ہے اُسی آیت کی طرف کہ سورۂ ہود میں بھی یہ حکم آیا فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ (آیت:۱۱۲) جیسے آپ کو حکم دیا گیا آپ اِستقامت اختیار کریں، یہ بہت فکر کی بات ہے کہ اِستقامت میں کمی نہ آئے، جو حکم دیا گیا اس پر ڈٹ جائیں، اسی پر قائم رہیں، اس کی مخالفت نہ ہونے پائے۔ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ: یہ سلبی پہلو ہے، اللہ کے حکم کی پابندی کیجئے اور دائماً کیجئے اچھی طرح سے کیجئے اور لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ لگئے، اگر لوگ آپ سے کوئی دِین کے خلاف کام کروانا چاہتے ہیں اللہ کے حکم کے خلاف آپ کو چلانا چاہتے ہیں تو ان کی بات نہ مانیے، اور اللہ کے حکم کے خلاف جو بات بھی ہو وہ ہوی کا مصداق ہے، "ان لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلیے۔"

صاف لفظوں میں اعلانِ حق کا حکم

اور آپ اپنے مسلک کا صاف اعلان کردیجئے وَقُلْ اٰمَنْتُ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ كِتٰبٍ: اللہ نے جو کتاب اُتاری میں اس پہ ایمان لاتا ہوں، جو مجھ پر اُتاری ہے اُس کو بھی مانتا ہوں، جو پہلے اُتاری گئی ہیں اُن کو بھی مانتا ہوں، "ایمان لایا میں اس چیز کے ساتھ جو اللہ نے اُتاری" مِنْ كِتٰبٍ یہ "مَا" کا بیان ہے، جب اس کو "مَا" کے ساتھ اکٹھا کرلیں گے تو ترجمہ اس طرح سے ہوگا "جو کتاب اللہ نے اُتاری میں اس پہ ایمان لایا" وَاُمِرْتُ لِاَعْدِلَ بَيْنَكُمْ: اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں تمہارے درمیان عدل کروں، عدل برابری کرنے کو کہتے ہیں، اس کا یہ مفہوم بھی ہے کہ میں اپنے اور تمہارے درمیان عدل کروں، جو اَحکام تمہیں دیتا ہوں برابر سرابر اپنے اُوپر بھی ان کو نافذ کرتا ہوں، یہ نہیں کہ تمہیں ایک کام کرنے کے لئے کہہ دوں اور پھر اس کے مطابق خود نہ چلوں، اللہ تعالیٰ کے اَحکام کے سلسلے میں میں اور تم برابر ہیں، جو تمہیں کرنے کے لئے کہتا ہوں خود بھی کرتا ہوں، جس چیز سے تمہیں روکتا ہوں خود بھی رُکتا ہوں، اس معاملے میں میرا اور تمہارا حال ایک ہے، اور یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ تمہارے درمیان عدل کو قائم کروں، انصاف کو قائم کروں، معاملات کا فیصلہ انصاف کے مطابق کروں، اَللّٰهُ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ: اللہ ہی ہمارا رب ہے اور وہی تمہارا رَب ہے، لَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ: ہمارے لئے ہمارے عمل ہیں اور تمہارے لئے تمہارے عمل ہیں، لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ: ہمارے اور تمہارے درمیان میں کوئی بحث وتکرار نہیں، بات صاف صاف ہے، کوئی جھگڑنے کی ضرورت نہیں، ہمارا مسلک یہ ہے

(۱) مشکوۃ ۴۵۸/۲، باب البکاء، فصل ثانی۔ ولفظه: شَيَّبَتْنِي سُوْرَةُ هُوْدٍ وَاَخَوَاتُهَا/ نیز ترمذی ۱۶۵/۲، ابواب التفسیر۔ تفسیر سورۃ الواقعۃ/ شمائل ترمذی، رقم:۴۲۔

کہ اللہ کی طرف سے جو اُترے ہم اس کو مانتے ہیں، عدل وانصاف کے ہم پابند ہیں، اللہ کو ہی اپنا رَبّ سمجھتے ہیں، کسی اور کو رَبّ نہیں سمجھتے، اور اگر اس کے مطابق چلو گے تو تمہارا فائدہ ہوگا، ورنہ ہمارے عمل ہمارے سامنے آئیں گے تمہارے عمل تمہارے سامنے آئیں گے، اس میں کوئی حُجّت اور تکرار کرنے کی ضرورت نہیں، لَا حُجَّةَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ، حُجّت سے یہاں بحث جدال جھگڑا تکرار مراد ہے، "ہمارے اور تمہارے درمیان کوئی جھگڑا تکرار نہیں ہے" اَللّٰهُ يَجْمَعُ بَيْنَنَا: یہ آخرت کے عقیدے کا اعلان ہو گیا، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اکٹھا کرے گا، وَاِلَيْهِ الْمَصِيْرُ: اور اسی کی طرف ہی لوٹنا ہے۔ وَالَّذِيْنَ يُحَآجُّوْنَ فِي اللّٰهِ: اور وہ لوگ جو کہ اللہ کے معاملے میں جھگڑتے ہیں، اللہ کے دِین کے معاملے میں، جو لوگ جھگڑا کرتے ہیں اللہ کے معاملے میں مِنْۢ بَعْدِ مَا اسْتُجِيْبَ لَهٗ: بعد اس کے کہ اس کو قبول کرلیا گیا، اللہ کے دِین کو قبول کرلیا گیا، بہت سارے سمجھ دار لوگوں نے اس کو قبول کرلیا، اس کے باوجود وہ جھگڑتے جارہے ہیں، عقل مند لوگوں کا قبول کرنا یہ بھی ایک حقانیت کی دلیل ہوتی ہے، حُجَّتُهُمْ دَاحِضَةٌ: ان کی حُجّت باطل ہے۔ دَحَض اصل میں پھسلنے کو کہتے ہیں، لِيُدْحِضُوْا بِهِ الْحَقَّ یہ لفظ سورۂ کہف میں آیا ہے، تاکہ پھسلا دیں اس کے ذریعے سے، باطل کردیں اس کے ذریعے سے حق کو۔ "ان کی حُجّت باطل ہے، ان کا جھگڑا باطل ہے" عِنْدَ رَبِّهِمْ: ان کے رَبّ کے سامنے، یعنی ان کی دلیل کوئی وزنی نہیں، نہ ان کے پاس کوئی دلیل ہے، "ان کا جھگڑا باطل ہے اُن کے رَبّ کے سامنے" وَعَلَيْهِمْ غَضَبٌ: اور ان کے اُوپر غضب ہے، وَلَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ: اور ان کے لئے سخت عذاب ہے، ایسے لوگوں پہ اللہ ناراض ہے اور ان کے لئے سخت سزا ہوگی۔

"میزان" کا مصداق

اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ: اللہ وہی ہے جس نے اُتاری کتاب حق کے مطابق، واقع کے مطابق، وَالْمِيْزَانَ: اور اُتاری اس نے میزان، میزان یہ آلہ کا صیغہ وَزَنَ سے، وَزَنَ يَزِنُ: تولنا۔ میزان: تولنے کا آلہ۔ اس سے مراد یہ ترازو بھی ہوسکتی ہے جس کے ذریعے سے ہم چیزوں کو تولتے ہیں، اور یہ اللہ نے اُتاری، جس طرح سے قرآنِ کریم میں آتا ہے وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ (سورۂ حدید: ۲۵) ہم نے لوہا اُتارا، اللہ کی طرف سے اس کی تخلیق اور اس کا اظہار، اس کو اِنزال سے تعبیر کیا گیا ہے، اور اللہ نے یہ میزان اُتاری، تم اس میزان کو صحیح طریقے سے استعمال کرو، اَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيْزَانَ (سورۂ رحمٰن: ۹) وزن ٹھیک کیا کرو، اور میزان کے اندر خسارہ نہ ڈالا کرو، یہ اللہ کی پیدا کردہ چیز ہے، اس کے ساتھ حقوق میں انصاف قائم ہوتا ہے، کتنا آپ نے لینا ہے کتنا آپ نے دینا ہے، اس حساب کے لئے اللہ نے میزان اتاری، تو تم آپس میں لین دین جتنا ہے اس ترازو کے ذریعے سے صحیح صحیح کیا کرو، کسی کا حق تلف کرنے کی کوشش نہ کیا کرو، تو یہ میزان جو آئی ہے یہ حقوق العباد میں گویا کہ عدل وانصاف قائم کرنے کے لئے آئی ہے، اس کی رعایت رکھو۔ تو کتاب اُتری حق کے ساتھ، اس میں حقوق اللہ بھی واضح ہوگئے، اور حقوق العباد کی صحیح ادائیگی کے لئے اللہ تعالیٰ نے میزان اُتاردی، تو اس سے یہی ترازو مراد لیا جاسکتا ہے جس کے ساتھ ہم چیز لیتے وقت تولتے ہیں یا دیتے وقت تولتے ہیں، اس میں کمی بیشی کرنا، دھوکا دینے کی کوشش کرنا جس کو "تطفیف" کہا جاتا ہے، وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ میں جس کا ذکر آیا، اور جو بیماری قوم شعیب میں تھی، یہ دُنیوی اور اُخروی عذاب کا باعث ہے..... اور یا "میزان" سے مراد یہ قانونِ عدل ہے؛

کہ اللہ تعالیٰ نے جو معیار اُتار دیا جس کے ذریعے سے حق اور باطل کا فرق معلوم ہوتا ہے، تو یہ عام ہو جائے گا جس میں یہ ترازو بھی شامل ہے، اور جو ضابطے اللہ نے اُتارے جن کے ذریعے سے حق اور باطل کا امتیاز ہوتا ہے وہ بھی ''میزان'' کا مصداق ہیں، ''اللہ نے کتاب اُتاری حق کے ساتھ'' یعنی اس میں حق کو واضح کر دیا گیا، واقعی بات اس میں نمایاں کر دی گئی، ''اور اللہ نے میزان اُتاری۔''

اِثباتِ قیامت

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّ السَّاعَةَ قَرِيبٌ: تجھے کیا پتا، تجھے کیا چیز اطلاع دیتی ہے شاید کہ قیامت قریب ہی ہو، لَعَلَّ اِتْيَانَ السَّاعَةِ قَرِيبٌ شاید کہ قیامت کا آنا قریب ہی ہو، تمہیں اس کا احتمال ہر وقت ہونا چاہیے کہ شاید جلدی ہی قیامت آجائے، اور اس اندیشے کے تحت تمہیں چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرو، اور اس قیامت کو دُور نہ سمجھو۔ يَسْتَعْجِلُ بِهَا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِهَا: جلدی طلب کرتے ہیں اِس قیامت کو وہ لوگ جو کہ اس پہ ایمان نہیں لاتے، وہ تو کہتے ہیں کہ جلدی جلدی قیامت آجائے، اِستہزا کے طور پر، ہنسی مذاق کے طور پر وہ یوں مطالبہ کرتے ہیں تکذیب کی وجہ سے، ''جلدی مچاتے اِس قیامت کے ساتھ وہ لوگ جو اس پر ایمان نہیں لاتے'' وَالَّذِينَ آمَنُوا مُشْفِقُونَ مِنْهَا: اور جو لوگ ایمان لاتے ہیں وہ تو اس قیامت سے ڈرنے والے ہیں، ان کے دِل پر تو ہر وقت اس کی ہیبت ہے، وہ تو اس تصوّر سے کانپتے ہیں کہ قیامت آئے گی اور ہم اللہ کے سامنے پیش ہوں گے اور اپنے اعمال کا حساب دینا پڑے گا، اس محاسبے کے تصوّر سے وہ کانپتے ہیں ڈرتے ہیں، تو مؤمن کا کام یہی ہے کہ اس قسم کی بات پر اِستہزا نہ کرے، بلکہ اس خطرے کے تحت ہمیشہ چوکنا رہے ''وہ ڈرنے والے ہیں اس قیامت سے'' وَيَعْلَمُونَ أَنَّهَا الْحَقُّ: اور وہ یقین کرتے ہیں کہ یہ قیامت حق ہے، واقعی ایک اَمر ہے، یہ محض کوئی افسانہ نہیں ہے، أَنَّهَا الْحَقُّ: وہ ساعت حق ہے، واقع کے مطابق ہے، وہ جانتے ہیں، أَلَا إِنَّ الَّذِينَ يُمَارُونَ فِي السَّاعَةِ: خبردار! جو لوگ قیامت کے بارے میں جھگڑے کرتے ہیں، جھگڑا یہی کہ کہتے تھے کہ نہیں آئے گی، مُردوں کو کس طرح سے زندہ کیا جائے گا، ''جو لوگ جھگڑتے ہیں قیامت کے بارے میں'' لَفِي ضَلَالٍ بَعِيدٍ: وہ بہت دُور کی گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں، وہ حق کے قریب بھی نہیں، بہت دُور پڑے ہوئے ہیں۔

رزق کی وسعت کوئی کمال نہیں

اللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ: یہ بار بار چیز دوہرائی جارہی ہے چونکہ مشرکین کا زیادہ تکبر جو تھا وہ اسی وسعتِ رزق کی بنا پر ہی تھا، کھاتے پیتے تھے اس لیے غراتے تھے اور باتیں بناتے تھے، اگر رزق کی وسعت نہ ہو، صبح وشام روٹی کی فکر پڑی رہے تو پھر انسان میں اتنی اکڑ نہیں ہوتی، جب کھانے پینے کو وافر ملے ضرورتیں ساری پوری ہوں تو ایسے وقت میں پھر انسان باتیں بناتا ہے، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ بار بار اس بات کو ذکر فرماتے ہیں کہ رزق کی وسعت یہ کوئی کمال نہیں ہے، اور نہ اللہ کے نزدیک یہ مقبول ہونے کی دلیل ہے، اَللَّهُ لَطِيفٌ بِعِبَادِهِ: اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ مہربانی کرنے والا ہے، لطف وکرم والا ہے، لطیف یہ لُطف سے لیا گیا ہے۔ لطف: احسان کرنا، مہربانی کرنا۔ تو لطیف ہو گیا احسان کرنے والا مہربانی کرنے والا، اور اس کے اندر مفہوم

باریک بین کا بھی ہوتا ہے جس میں علم کا احاطہ بھی ہے، ''اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ مہربانی کرنے والا ہے'' یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ: رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، وَهُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ: اور وہ قوت والا ہے زبردست ہے۔ تو رزق اللہ تعالیٰ کی مشیت پر ہے، مہربانی کرتا ہوا، اپنی مہربانی کے تقاضے سے، احسان کرتا ہوا، اپنے احسان کے تقاضے سے جس کو چاہتا ہے جتنا چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور یہ کل آپ کی خدمت میں عرض کر دیا گیا تھا کہ ''رزق'' صرف روٹی کو نہیں کہتے، جتنی نعمتیں اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے ملتی ہیں وہ سب ''رزق'' کا مصداق ہیں، اور یہ اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے تحت تقسیم کرتا رہتا ہے جس طرح سے چاہتا ہے۔

وسعتِ رزق کے لئے ایک بہترین وظیفہ

''معارف القرآن'' میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے اس آیت کے اُوپر لکھا ہے، یہی: اَللّٰهُ لَطِیۡفٌۢ بِعِبَادِهٖ یَرۡزُقُ مَنۡ یَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الۡقَوِیُّ الۡعَزِیۡزُ: کہ حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ جو ہمارے تمام علمائے دیوبند کے شیخ ہیں، پیر ہیں، ان سے منقول ہے کہ جو کوئی شخص صبح کو ستر دفعہ اس آیت کو پڑھتا رہے دائماً، دوام اور پابندی کے ساتھ صبح کو ستر دفعہ پڑھنا وسعتِ رزق کا باعث ہے، ایسا شخص رزق کی تنگی سے محفوظ رہتا ہے۔

رزق مقدّر ہے

جس طرح سے بار بار آپ حضرات کو متوجہ کرتا رہتا ہوں کہ رزق چونکہ اللہ تعالیٰ کے قبضے میں ہی ہے، اور اس کو حاصل کرنے کے لئے انسان مختلف تدبیریں اختیار کرتا ہے، کچھ تدبیریں مادّی ہیں کچھ تدبیریں رُوحانی ہیں، مادّی تدبیر یہی ہے جو عام طور پر دُنیا جانتی ہے روزی کمانے کے لئے، رزق کمانے کے لئے، دُکان داری ہے، تجارت ہے، زراعت ہے، ملازمت ہے، مزدوری ہے، یہ سارے کے سارے کام رزق حاصل کرنے کے لئے ہیں، ان تدبیروں کے اختیار کرنے والوں کو بھی روزی اللہ ہی دیتا ہے، ورنہ آپ جانتے ہیں کہ دُکان دار مہینہ بھر بازار میں بیٹھتا ہے، مہینے کے بعد حساب کرے تو یہ ضروری نہیں کہ اس کو کوئی نفع حاصل ہو اور رزق حاصل ہو جائے، وہ پہلا سرمایہ بھی ضائع کر کے بیٹھ جاتا ہے، ایسے بھی خسارے پڑ جایا کرتے ہیں۔ کاشت کار محنت کرتا ہے، زمین میں بیج بکھیرتا ہے، بارہا اس طرح سے ہوتا ہے کہ یا تو فصل اُگتی نہیں یا اُگنے کے بعد تباہ ہو جاتی ہے، بارش کی کثرت کی وجہ سے یا قحط سالی کی وجہ سے، اولے پڑنے کی وجہ سے، اور ایسے واقعات روزمرہ آپ کے سامنے آتے رہتے ہیں کہ کٹی ہوئی فصل جل گئی، اور گندم نکال کے ڈھیر لگایا تھا رات کو چور لوٹ کے لے گئے، تو پھر بھی انسان رزق سے محروم ہو جاتا ہے، ضروری نہیں کہ جس کے زمین ہو، جو کاشت کاری کرتا ہے وہ رزق ضرور ہی حاصل کر لے۔ ملازم سارا مہینہ بے چارہ ملازمت کرتا ہے، تنخواہ لے کے چلتا ہے تو راستے میں جیب کٹ جاتی ہے، کوئی ایسا حادثہ ہو جاتا ہے جس میں یک دم ہی سارے پیسے لگ جاتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ یوں دکھاتا ہے، دکھا کے واپس لے لیتا ہے، تو ان واقعات کی کمی ہے آپ کے اردگرد جو اس قسم کے واقعات ہیں؟ کوئی کمی نہیں ہے! غور کرنے کی عادت نہیں! اگر اس میں غور کرنے کی عادت ہو تو انسان ان واقعات سے ہی سمجھ جاتا ہے کہ واقعی

روزی مقدر ہے، انسان اتنی سے ہی فائدہ اُٹھا سکتا ہے جتنی اللہ تعالیٰ نے کسی کی قسمت میں رکھی ہے، ورنہ دولت یوں آتی ہے، جھلک دکھا کے یوں نکل جاتی ہے اور انسان جھانکتا رہ جاتا ہے۔

اَسبابِ رِزق کاسۂ گدائی ہیں

تو یہ اسباب جو ظاہری طور پر اختیار کیے جاتے ہیں یہ اسباب سارے کے سارے کاسۂ گدائی ہیں، جس طرح سے گداگر کے ہاتھ میں ایک کاسہ ہوتا ہے اور وہ دروازے کے اُوپر جاتا ہے اور وہ اپنا کاسہ یوں آگے پھیلاتا ہے اور سوال کرتا ہے تو گھر والے اس میں کچھ ڈال دیتے ہیں، اب وہ جب جاکے اپنے گھر اس ''کاسے'' کو دیکھے گا تو اس میں سے اس کو روٹی مل جائے گی، آٹا نکل آئے گا، غلہ نکل آئے گا، تو یہ سمجھے کہ کاسہ مجھے رِزق دیتا ہے، یہ اس کی حماقت ہے، رِزق اس ہاتھ کی طرف سے آیا ہے جس نے اس کاسے میں ڈالا ہے۔ مثال کے طور پر، اسی طرح سے یہ اسباب بھی سارے کے سارے اللہ تعالیٰ کے سامنے کاسۂ گدائی ہیں، اس میں سے نکلے گا تبھی جب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ اس میں کوئی چیز ڈال دی جائے گی، اور اگر اللہ کی طرف سے اس میں کچھ نہ ڈالا جائے تو پھر یہ اسباب انسان کو رِزق مہیا نہیں کر سکتے، سب کچھ ہونے کے باوجود بھی انسان بھوکا مرجاتا ہے، کھانے کی نوبت ہی نہیں آتی۔

حصولِ رزق کے رُوحانی اسباب اور وظائف

تو ایسے ہی کچھ رُوحانی اسباب بھی ہیں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس رزق کے حاصل کرنے کے لئے، جو سرورِ کائنات ﷺ نے بیان فرمائے کہ فلاں کام کرو گے رِزق میں برکت ہوگی، اللہ تعالیٰ ضروریات پوری فرمائیں گے، سورۂ یٰسٓ صبح کے وقت پڑھنا، اس کے بارے میں آتا ہے: ''قُضِیَتْ حَوَائِجُہٗ'' اس سے ضرورتیں پوری ہوتی ہیں،[1] اور مغرب کے بعد سورۂ واقعہ پڑھی جائے رات کو تو ''لَمْ تُصِبْہُ فَاقَۃٌ'' حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایسے شخص کو فاقہ نہیں پہنچے گا، احتیاج نہیں پہنچے گا،[2] اور اسی طرح سے بعض آیات ہیں اور بعض وظائف ہیں جو اولیاء اللہ کے اندر، اَصحابِ رُوحانیت کے اندر چلے آرہے ہیں، اسی طرح سے ایک یہ آیت بھی بزرگوں نے لکھی کہ اس کو صبح کے وقت اگر ستر دفعہ پڑھنے کا معمول بنالیا جائے تو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے رزق کے اسباب مہیا ہوتے ہیں، رزق کی وسعت ہوجاتی ہے، اللہ تعالیٰ کے دینے کے بے شمار طریقے ہیں، کوئی ایک طریقہ نہیں ہے، مشہور ہے کہ جب اللہ دیتا ہے تو چھپّر پھاڑ کے دیتا ہے، تو یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ چھت پھٹ گئی اور اُوپر سے رزق برسنا شروع ہوجاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے بہت طریقے ہیں دینے کے۔

---

(۱) من قرء یٰسٓ فی صدر النھار قضیت حوائجہ (مشکوٰۃ، ۱/۱۸۹، فضائل قرآن، فصل ثالث، عن عطاء بن ابی رباح مرسلاً بحوالہ دارمی)

(۲) من قرء سورۃ الواقعۃ فی کل لیلۃ لم تصبہ فاقۃ ابدًا (مشکوٰۃ، ۱/۱۸۹، فضائل قرآن، فصل ثالث، عن ابن مسعودؓ)

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِيْ حَرْثِهٖ ۚ وَمَنْ كَانَ يُرِيْدُ حَرْثَ الدُّنْيَا

جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کے لئے اس کی کھیتی میں زیادتی کرتے ہیں، اور جو کوئی دُنیا کی کھیتی کا ارادہ کرتا ہے

نُؤْتِهٖ مِنْهَا وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ ﴿۲۰﴾ اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ

ہم اس کو اس کھیتی میں سے دیتے ہیں، اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ﴿۲۰﴾ کیا ان کے لئے کوئی ایسے شرکاء ہیں جنہوں نے مشروع کیا ہو ان کے لئے

الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ۭ وَاِنَّ

دین میں سے ایسی بات کو جس کی اللہ نے ان کو اجازت نہ دی ہو؟ اگر فیصلے کی بات نہ ہوتی تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا، اور بے شک

الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا وَهُوَ

ظالم لوگ، ان کے لئے دردناک عذاب ہے ﴿۲۱﴾ دیکھے گا تُو ظالموں کو ڈرنے والے ہوں گے اپنے کیے ہوئے اعمال سے، اور وہ

وَاقِعٌۢ بِهِمْ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا

ان پر واقع ہونے والا ہوگا، وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے وہ جنّات کے باغات میں ہوں گے، ان کے لئے وہ چیز

يَشَاۗءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ﴿۲۲﴾ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ

ہوگی جو یہ چاہیں گے ان کے رَبّ کے پاس، یہ بہت بڑی مہربانی ہے ﴿۲۲﴾ یہی چیز ہے جس کی بشارت دیتا ہے اللہ تعالیٰ

عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ قُلْ لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا

اپنے بندوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے، آپ کہہ دیجئے نہیں سوال کرتا میں تم سے اس تبلیغ پر کسی قسم کی اُجرت کا، مگر

الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى ۭ وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

قرابت کے سبب سے محبت، جو کوئی شخص نیکی کرتا ہے ہم اس نیکی کے اندر اور خوبی بڑھا دیتے ہیں، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اور

شَكُوْرٌ ﴿۲۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ۚ فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰي قَلْبِكَ ۭ

قدردان ہے ﴿۲۳﴾ کیا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے اُوپر جھوٹ تراش لیا، اگر چاہے اللہ تو آپ کے دِل پہ مُہر کر دے،

وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ﴿۲۴﴾ وَهُوَ

مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو اور ثابت کرتا ہے حق کو اپنے کلمات کے ساتھ، بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے دِلوں کی باتوں کو ﴿۲۴﴾ اللہ

الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ وَیَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ ﴿۲۵﴾ وَ

وہی ہے جو قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے، اور درگزر کرتا ہے بُرے اعمال سے، اور جانتا ہے ان سب کاموں کو جو تم کرتے ہو ﴿۲۵﴾

یَسْتَجِیْبُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَیَزِیْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ ؕ

قبول کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں (کی عبادت اور دُعا) کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، اور اپنے فضل سے ان کو زیادہ دیتا ہے،

وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ﴿۲۶﴾ وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ وَ

اور کافروں کے لئے سخت عذاب ہے ﴿۲۶﴾ اگر اللہ تعالیٰ کشادہ کردے روزی اپنے بندوں کے لئے البتہ سرکش ہوجائیں وہ زمین میں،

لٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ ؕ اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ ﴿۲۷﴾ وَهُوَ الَّذِیْ

لیکن اُتارتا ہے اندازے کے ساتھ جو چاہتا ہے، بے شک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے اور دیکھنے والا ہے ﴿۲۷﴾ اللہ وہ ہے جو

یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ ؕ وَهُوَ الْوَلِیُّ الْحَمِیْدُ ﴿۲۸﴾ وَ

اُتارتا ہے بارش لوگوں کے مایوس ہوجانے کے بعد، اور اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے، وہی کارساز ہے اور وہی تعریف کیا ہوا ہے ﴿۲۸﴾ اور

مِنْ اٰیٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَثَّ فِیْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ ؕ

اللہ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں کو پیدا کرنا اور زمین کو پیدا کرنا اور ان دواب کو پیدا کرنا جو اللہ نے زمین و آسمان کے اندر پھیلائے ہیں،

وَهُوَ عَلٰی جَمْعِهِمْ اِذَا یَشَآءُ قَدِیْرٌ ﴿۲۹﴾ ع

اور وہ ان سب کے اکٹھا کرنے پر جب چاہے گا قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۹﴾

تفسیر

آخرت بہترین کھیتی

مَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الْاٰخِرَةِ نَزِدْ لَهٗ فِیْ حَرْثِهٖ: جو شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے ہم اس کے لئے اس کی کھیتی میں زیادتی کرتے ہیں، وَمَنْ كَانَ یُرِیْدُ حَرْثَ الدُّنْیَا: اور جو کوئی دنیا کی کھیتی کا ارادہ کرتا ہے، نُؤْتِهٖ مِنْهَا: ہم اس کو اس کھیتی میں سے دیتے ہیں، وَمَا لَهٗ فِی الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِیْبٍ: اور اس کے لئے آخرت میں کوئی حصہ نہیں۔ پیچھے تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پہ مہربان ہے، رزق دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، آگے یہ دنیا اور آخرت کی کھیتی کا ذکر کر دیا، انسان دنیا کے اندر پیدا ہوا تو اس کی حیثیت ایک کاشت کار کی ہے، جس طرح

سے کاشت کار ایک کھیت کاشت کرتا ہے اور فائدہ اُٹھاتا ہے اسی طرح سے انسان ایک کاشت کار ہے، اس کے سامنے دو کھیتیاں ہیں، چاہے اپنی محنت کے ساتھ آخرت کی کھیتی کو آباد کرلے، چاہے اپنی محنت کے ساتھ دنیا کی کھیتی کو آباد کرے، لیکن اللہ تعالیٰ کی عادت دونوں کاشت کاروں کے ساتھ مختلف قسم کی ہے، اگر تو کوئی شخص آخرت کی کھیتی چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور عنایت اس کے اوپر زیادہ ہوتی ہے، آخرت کے لئے نیک عمل کرو یہ آخرت کی کھیتی ہے جو آپ بو رہے ہیں، اللہ اس میں اضافہ کرتا ہے، ایک نیکی کے بعد دوسری نیکی کی توفیق دے گا، جتنی نیکی کرو گے آگے نیکی کی توفیق بڑھتی چلی جائے گی، اور جتنا تم بوؤ گے اس سے کئی گنا زیادہ وہاں جاکے تم کاٹو گے، ایک نیکی دس گنا کرنے کا تو وعدہ ہے، اور آگے جتنا بھی کردے اس کا کوئی حد حساب ہی نہیں، جتنا خلوص ہوگا جتنی نیک نیتی ہوگی جتنی للّٰہیت ہوگی اتنا اس کھیتی کے اندر اضافہ ہوتا چلا جائے گا، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص حلال مال میں سے خلوص کے ساتھ ایک کھجور اللہ کے راستے میں خرچ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کھجور کو قبول فرماتے ہیں اور اس کو بڑھانا شروع کرتے ہیں، اور بڑھاتے بڑھاتے اس کو اتنا بڑا کردیتے ہیں جس طرح کہ اُحد پہاڑ،[1] اب آپ اندازہ کیجئے کہ اُحد پہاڑ کے برابر اگر کھجوریں آئیں، وزن کے لحاظ سے آئیں تو کتنی آجائیں گی، لاکھوں میں نہیں کروڑوں سے بڑھ جائیں گی، اور اگر اس کے ٹکڑے کھجوروں کے برابر کیے جائیں تو بھی کوئی کم نہیں ہیں، تو اس لیے ایک کے دس یہ کوئی متعین نہیں، بلکہ جتنا خلوص ہوتا چلا جائے گا جتنی للّٰہیت ہوگی، حلال مال میں سے خرچ کریں گے، اتنا اس میں اضافہ ہوتا چلا جائے گا، اللہ تعالیٰ اس کی کھیتی میں تو اضافہ کریں گے، اور دُنیا کے اندر بھی اس کو اللہ تبارک وتعالیٰ بقدرِ ضرورت دیتے ہیں، عزّت ورزق کے ساتھ نوازتے ہیں، عافیت دیتے ہیں، تو آخرت کی کھیتی کا ارادہ کرنے والے تو دُنیا اور آخرت دونوں جہانوں میں کامیاب رہتے ہیں، دُنیا تو جو مقدر ہے وہ ملتی ہی ہے، آخرت کی کھیتی بونے کے نتیجے میں کوئی بھوکا نہیں مرتا، دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ اس کو عافیت دیتے ہیں، چین دیتے ہیں، سُکھ دیتے ہیں، صحت، دولت جتنی مقدر ہے وہ ملتی ہے، تو دُنیا بھی آتی ہے اور آخرت بھی آگئی، اور جو کوئی دُنیا کی کھیتی کا ارادہ کرلے اور آخرت کا ارادہ ہی نہیں کرتا، اس کی تمام کی تمام کوشش دنیا کی آبادی کے لئے ہے، یہیں وہ دولت حاصل کرنا چاہتا ہے، رزق حاصل کرنا چاہتا ہے، شہرت حاصل کرنا چاہتا ہے، بڑا بننا چاہتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم اس میں سے کچھ اسے دے دیتے ہیں، یہاں یہ وعدہ نہیں کیا کہ جو کچھ وہ چاہے اس کو ضرور ملے گا، ایسا نہیں، اس میں سے اس کو کچھ دے دیتے ہیں، جتنا مقدر ہے اتنا اس کو مل جاتا ہے، وَمَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ: لیکن آخرت کے معاملے میں صاف جواب، آخرت میں کوئی حصہ نہیں، اس لیے جو لوگ اپنی پوری کی پوری کوشش دُنیوی اُمور پر ہی صَرف کردیتے ہیں ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ (سورۂ نجم: ۳۰) جس طرح سے آیا ہے کہ ان کے علم کا منتہا یہی ہے کہ دُنیوی زندگی کو آباد کرلیں، آخرت میں تو یہ بالکل خسارے میں ہیں، ان کے پلے کچھ نہیں ہوگا، جیسے سورۂ کہف کے آخری رُکوع میں آیا تھا هَلْ نُنَبِّئُكُمْ بِالْاَخْسَرِيْنَ اَعْمَالًا ۝ اَلَّذِيْنَ ضَلَّ

(۱) ابن کثیر. البقرۃ:۲۷۶ / نیز بخاری ۱/۱۸۹، باب الصدقہ من کسب طیب/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۶۷، باب فضل الصدقہ۔ نوٹ:- آخری دو میں اُحد کی جگہ جبل کا لفظ ہے۔

سَعْيُهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا، جن کی ساری کی ساری کوشش دُنیوی زندگی میں صَرف ہوگئی، یہی لوگ ہیں جو اعمال کے اعتبار سے سب سے زیادہ خسارے میں ہیں، تو یہاں بھی وہی بات ہے کہ وَمَالَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ نَّصِيْبٍ: ایسے شخص کو آخرت میں کوئی حصہ نہیں ملے گا۔

اللہ کی زمین پر اللہ کا ہی قانون چل سکتا ہے

اَمْ لَهُمْ شُرَكٰٓؤُا شَرَعُوْا لَهُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ: پچھلے رکوع میں آیا تھا کہ شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا، اب اگلی آیات کا تعلق اُس مضمون کے ساتھ ہے، ایک دِین تو اللہ تعالیٰ نے مشروع کیا، جب سے دُنیا شروع ہوئی اللہ نے اس دِین کی بنیاد ڈالی، نوح علیہ السلام نے اسی دِین کی تبلیغ کی، اور دوسرے انبیاء علیہم السلام حضرت ابراہیم موسیٰ عیسیٰ علیہم السلام سب نے اسی دِین کو پھیلایا، اسی دِین کے قائم کرنے کا اللہ کی طرف سے حکم دیا گیا، تو کیا اس دِین کے علاوہ کوئی اور دِین بھی ہے جو تمہارے لئے کسی نے تجویز کیا ہو؟ یہ اِستفہامِ انکاری ہے، یعنی کوئی دِین نہیں، اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی قانون اللہ کی مملکت کے اندر جاری نہیں کر سکتا۔ ''کیا ان کے لئے کوئی ایسے شرکاء ہیں جنہوں نے مشروع کیا ہو ان کے لئے دِین سے ایسی بات کو جس کی اللہ نے ان کو اجازت نہ دی ہو؟'' مَا لَمْ يَاْذَنْۢ بِهِ اللّٰهُ: جس کی اللہ نے اجازت نہ دی ہو، کیا اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی دِین بنانے والے کوئی شرکاء ہیں؟ یعنی کوئی نہیں، اللہ کی مملکت کے اندر کسی دوسرے کو اپنا قانون جاری کرنے کا کیسے حق حاصل ہو سکتا ہے۔

مکمل سزا قیامت میں ہوگی

وَلَوْلَا كَلِمَةُ الْفَصْلِ: اگر فیصلے کی بات نہ ہوتی، لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ: تو ان کے درمیان فیصلہ کر دیا جاتا۔ کلمة الفصل، ایک فیصلہ کُن بات اللہ کی طرف سے طے ہو گئی کہ پوری سزا آخرت میں ہوگی، ورنہ یہ باغی جو کہ اللہ کے قانون کی پابندی نہیں کرتے، اور دوسروں کی طرف نسبت کر کے اس دنیا کے اندر اپنا ضابطہ حیات بنائے ہوئے ہیں اور قانون نافذ کیے ہوئے ہیں تو ان باغیوں کو یہیں پوری پوری سزا دے دی جاتی، لیکن اللہ کی طرف سے ایک بات طے شدہ ہے کہ دُنیا میں انسان کو کچھ ڈھیل دیتا ہے، اور آخری بات قیامت کے دِن ہی ہوگی، ''ان کے درمیان فیصلہ ہو جاتا'' وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ: بے شک ظالم لوگ، ان کے لئے دردناک عذاب ہے۔ تَرَى الظّٰلِمِيْنَ مُشْفِقِيْنَ مِمَّا كَسَبُوْا: دیکھے گا تو ظالموں کو ڈرنے والے ہوں گے مَا كَسَبُوْا سے، جو کچھ انہوں نے کیا اس سے ڈرنے والے ہوں گے، یعنی قیامت کے دِن جب اُن کے اعمال سامنے آئیں گے تو اپنے اعمال سے وہ خوف کھائیں گے، اعمال سے خوف کھانے کا مطلب یہ ہے کہ اُس کی جزا سے اور اس کے بدلے سے خوف کھائیں گے جب وہ جہنم کی شکل میں سامنے آئیں گے، وَهُوَ وَاقِعٌۢ بِهِمْ: هُوَ ضمیر مَا كَسَبُوْا کی طرف راجع ہے، اور ان کا کسب ان پر واقع ہونے والا ہوگا، اب اس سے بچ نہیں سکیں گے، اپنے اعمال سے خوف کھائیں گے یعنی ان کے بدلے سے خوف کھائیں گے، اور ان کی جزا ان پہ واقع ہوگی، یعنی مَا كَسَبُوْا یہی عذاب کی شکل میں سامنے آ جائیں گے، انسان کے اعمال ہی ہیں جو عذاب کی مختلف شکلیں اختیار کر لیں گے، جس طرح سے انسان کی نیکیاں اچھائی کی صورت میں سامنے آئیں گی، جنت کی نعمتیں انسان کی نیکیاں ہی ہیں، وَوَجَدُوْا مَا عَمِلُوْا حَاضِرًا (سورۂ کہف: ۴۹) جو کچھ انہوں نے کیا سب سامنے موجود ہوگا، تو بُرے اعمال جب عذاب کی شکل میں آئیں گے تو اس

عذاب سے یہ ڈریں گے۔'' دیکھے گا تو ظالموں کو ڈرنے والے ہوں گے اپنے کیے ہوئے اعمال سے، اور جو کچھ انہوں نے کیا ہے وہ ان پہ واقع ہونے والا ہے۔''

اہلِ ایمان کی خوش حالی

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے، فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ: وہ جنّات کے باغات میں ہوں گے۔ روضات الجنات: روضہ: بھی باغ کو کہتے ہیں، جنت: بھی باغ کو کہتے ہیں، ایک جگہ اصطلاحی معنی لے لیجئے، ایک جگہ لغوی معنی لے لیجئے، جنّت کے باغات، چونکہ درجات مختلف ہیں اس لیے اس کو جمع کے ساتھ تعبیر کردیا گیا، مختلف جنتیں ہوں گی درجوں کے اعتبار سے، اور اس میں مختلف باغات ہوں گے، اور اعلیٰ اعلیٰ درجہ حدیث شریف میں آتا ہے فردوس کا ہے،(۱)

لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ: ان کے لئے وہ چیز ہوگی جو یہ چاہیں گے ان کے ربّ کے پاس، اور یہ بہت بڑی بات ہے مَّا يَشَآءُوْنَ: دُنیا کے اندر کوئی ہفت اقلیم کا بادشاہ بھی ہوجائے تو اس کی بھی ہر خواہش پوری نہیں ہوتی، لیکن جنّت میں چلے جانے کے بعد اللہ تعالیٰ جنتیوں کی ہر خواہش پوری کریں گے، جو جی میں آئے گا وہی ان کے ساتھ ہوگا، ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ: یہ بہت بڑی مہربانی ہے، ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ: یہی چیز ہے جس کی بشارت دیتا ہے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو، الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: ایسے بندے جو ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، یعنی یہی روضات الجنات جس کا ذِکر پیچھے آیا، اور یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر خواہش کی پوری کرے گا، اسی کی بشارت اللہ تعالیٰ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لے آئے اور انہوں نے نیک عمل کیے۔

انبیاء ﷺ کا تبلیغ سے مقصود دُنیا نہیں ہوتا

قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى: آپ کہہ دیجئے نہیں سوال کرتا میں تم سے اِس تبلیغ پر کسی قسم کی اُجرت کا، یہ درمیان میں جملہ بڑھادیا اپنے خلوص کو نمایاں کرنے کے لئے، کہ انہیں کہو کہ میں تمہیں جو باتیں بتارہا ہوں اس میں تمہارے ساتھ ہمدردی اور خیرخواہی ہی ہے، ورنہ میں تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، اور تمام انبیاء ﷺ اپنی تبلیغ کے دوران میں اس قسم کی باتیں دوہراتے ہیں، قرآنِ کریم میں آپ کے سامنے سب تفصیل گزرچکی، اس شبہ کو دُور کرنے کے لئے کہ ہماری اس دینی جدوجہد سے ہمیں کوئی دُنیا مقصود نہیں ہے، ہم اِس میں نہ کوئی جاہ چاہتے ہیں کہ بڑا بننے کی تمنا ہمارے دل میں ہے، نہ کوئی مال ہم چاہتے ہیں کہ اس ذریعے سے ہم کوئی اکٹھا کرنے چاہتے ہیں، جو کچھ بھی ہم کررہے ہیں سب مخلوق کی ہمدردی میں خیرخواہی میں کررہے ہیں، اگر قبول کرلوگے تو اس میں فائدہ تمہارا ہے، انبیاء ﷺ اپنی تبلیغ میں اس بات کو بار بار دوہراتے ہیں، اس لیے دینی جدوجہد کے اُوپر کوئی معاوضہ مطلوب نہیں یہ جو میں کررہا ہوں۔

''مودّۃ فی القربیٰ'' کا مطالبہ

اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِي الْقُرْبٰى: مودّت: محبّت کو کہتے ہیں، قُربیٰ: قرابت کے معنی میں ہے، ''مگر قرابت کے سبب سے محبت'' قرابت

(۱) بخاری ج ۱ ص ۳۹۱ باب درجات المجاهدين. مشكوة ۳۲۹/۲، كتاب الجهاد كى پہلى حديث، وغيره۔

کے سبب سے محبت کا سوال کرتا ہوں، اس کا مطلب یہ ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ ہاشمی تھے قریشی تھے اور تقریباً قریشیوں کے تمام بطون میں حضور ﷺ کی کوئی نہ کوئی رشتہ داری تھی، کسی کے ساتھ سسرال کی وجہ سے، کسی کے ساتھ ننہال کی وجہ سے، اور کسی کے ساتھ اپنے آباء و اجداد کی وجہ سے، باپ کے رشتے دار، باپ کا خاندان، ماں کے رشتے دار، اور اسی طرح سے نکاح کی وجہ سے رشتہ داری قائم ہوئی، تو ان خاندانوں میں حضور ﷺ کی رشتہ داریاں تھیں، اور جاہلیت کے زمانے میں خاص طور پر قبائلی زندگی میں رشتہ داری کو بہت اہمیت حاصل ہے، لوگ اپنے رشتہ دار کے ساتھ ہمدردی اور خیر خواہی رکھا کرتے ہیں، اگر وہ کوئی ناجائز کام بھی کر بیٹھتا ہے تو اس کی موافقت کرتے ہیں اُس کو تحفظ دیتے ہیں، اور اگر اس میں کوئی خوبی ہوتی ہے تو اس کو اپناتے ہیں، اس کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں، یہ رشتہ داری کا ایک حق ہوتا ہے، تو حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں تم سے کوئی اُجرت نہیں مانگتا، لیکن اتنا تو میرا حق ہے کہ رشتہ داری کی محبت تو قائم رکھو، اور رشتہ داری کی محبت کا کیا مطلب؟ کہ میرے ساتھ تم جو دشمنی کرنے لگ گئے، مقابلے میں آ کے کھڑے ہو گئے، کیا رشتہ دار کا ایک یہی حق ہوا کرتا ہے؟ دنیا کا طریقہ تو یہ ہے کہ اگر کسی کا کوئی رشتہ دار کوئی بات کرے تو اس کے قبیلے والے قوم والے اس بات کو توجہ سے سنتے ہیں، اگر وہ بات اچھی ہوتی ہے تو قبول کرتے ہیں، اور اگر وہ بات غلط ہوتی ہے تو اس کو سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں، اور اگر وہ کسی طرح سے نہ ہی مانے تو کم از کم وہ دشمنوں میں تو سرفہرست نہیں ہوتے، اس کو اور دوسرے لوگوں کو چھوڑ دیتے ہیں کہ چلو جس طرح سے چاہے کرتا پھرے، جہاں تک ممکن ہو تحفظ تو دیتے ہیں دشمنی نہیں کیا کرتے، قرابت دار کا یہ حق ہوتا ہے، اب میں بھی تمہارا ایک رشتہ دار ہوں، رشتہ داری کی محبت تو کم از کم تم قائم رکھو، اور آپ جانتے ہیں کہ رشتہ داری کی محبت یہ تو ان کا فرض ہے کہ رشتہ داری کی وجہ سے محبت کریں، اس کو اجر یا اُجرت نہیں قرار دیا جا سکتا، اس میں ایک عنوان ایسا اختیار کر لیا کہ تم چاہو تو اس کو اُجرت کہہ لو، جو چاہو کہہ لو، میں تم سے یہ سوال کرتا ہوں کہ رشتہ داری والی محبت تو قائم رکھو، اور میں تم سے کوئی کسی قسم کی اُجرت نہیں مانگتا، اور آپ جانتے ہیں کہ رشتہ داری کی محبت کا قائم رکھنا یہ تو ان کا اپنا فرض ہے، صلہ رحمی جاہلیت کے زمانے میں بھی فرضوں میں سے ایک اہم فرض سمجھی جاتی تھی، تو سرورِ کائنات ﷺ اس طرح سے ان کے عداوت کے جذبات کو مدہم کرنا چاہتے ہیں دشمنی کی آگ کو بجھانا چاہتے ہیں کہ تم اتنا سوچو کہ میں تمہارا رشتہ دار ہوں، اور میں بھی تمہاری طرف سے تمہاری محبت کا حق دار ہوں، میری بات کو اس طرح سے سنو جس طرح سے رشتہ داروں کی بات کو سنا جاتا ہے، اگر صحیح ہے تو اس کو قبول کرو، اور اگر غلط ہے تو مجھے نرمی کے ساتھ سمجھانے کی کوشش کرو، گفتگو کرو، مذاکرہ کرو، اور اگر تم کچھ بھی نہیں کر سکتے تو کم از کم قرابت داری کے ہی اُصول سے تم دشمنوں میں تو سرفہرست نہ آ جاؤ، میری بات کو توجہ سے سُن تو لو، نہیں تو مجھے چھوڑ ہی دو تا کہ دُوسروں میں میں کام کر دوں، دشمن تو نہ بنو، یہ ہے اس آیت کا صحیح مفہوم، اور آپ جانتے ہیں کہ موَدت فی القربیٰ یہ کوئی اُجرت نہیں ہے، لیکن عنوان ایسا اختیار کر لیا گیا کہ ہاں! میں یہ مطالبہ کرتا ہوں کہ میرے ساتھ رشتہ داروں والا سلوک کرو، رشتہ داروں والی میرے ساتھ محبت کرو، یہ تمہارا اپنا فرض ہے، یہ میرے عمل کی جزا نہیں ہے، اگر تم اس کو اُجرت سمجھتے ہو تو اُجرت سمجھ لو، حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے یہ کوئی اُجرت نہیں، حاصل اس آیت کا یہی ہوا کہ رشتہ داری کا ذکر کر کے حضور ﷺ اُن کی ہمدردیاں اُبھارنا چاہتے ہیں تا کہ وہ بات کو توجہ سے سنیں، اور توجہ سے سننے کے بعد قبول کرنے کی کوشش کریں، ورنہ پھر میری

مخالفت نہ کریں، اور مجھے دین کی اشاعت کرنے دیں۔'' آپ کہہ دیجئے کہ نہیں مانگتا میں تم سے اس تبلیغ پر کوئی کسی قسم کی اُجرت ہاں! قرابت کی محبت، قرابت کے سبب سے محبت کا سوال کرتا ہوں'' یہ مستثنیٰ منقطع کے طور پر ہے، کیونکہ مودت فی القربیٰ اجر کے اندر داخل نہیں ہے۔ یہ درمیان میں جملہ بڑھا دیا تھا صرف ان کے جذبات کو تحریک کرنے کے لئے کہ وہ کچھ توجہ کے ساتھ بات سننے لگ جائیں، ایک رشتہ داری کے اصول سے ہی سننے لگ جائیں، آگے مضمون وہی ہے جو پیچھے سے چلا آرہا ہے۔

اللہ قدردان ہے

وَمَنْ يَّقْتَرِفْ حَسَنَةً نَّزِدْ لَهٗ فِيْهَا حُسْنًا: جو کوئی شخص نیکی کرتا ہے ہم اس نیکی کے اندر اور خوبی بڑھا دیتے ہیں، یعنی اس نیکی کو زیادہ سے زیادہ اچھا کر کے قبول کرتے ہیں، اس کے اُوپر اصل اجر سے زیادہ اجر دیتے ہیں، اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ شَكُوْرٌ: بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا ہے اور قدردان ہے، غیر ارادی طور پر انسانی کمزوری سے کوئی غلطی ہو جائے تو اللہ معاف بھی کر دیتے ہیں، اور نیکی کرنے کے لئے انسان جو کوشش کرتا ہے اللہ تعالیٰ اُس کی قدر کرتے ہیں۔

دلیلِ نبوّت

اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا: کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس شخص نے اللہ کے اوپر جھوٹ تراش لیا؟ یہ باتیں جو ان کے سامنے پیش کی جارہی ہیں کتاب اللہ کی شکل میں، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ جھوٹ گھڑ لیا؟ یہ مضمون بہت دفعہ گزر گیا ہے، فَاِنْ يَّشَاِ اللّٰهُ يَخْتِمْ عَلٰى قَلْبِكَ: یہ اللہ پر آپ نے جھوٹ نہیں گھڑا، یہ جو کچھ دیا جارہا ہے آپ کو اللہ کی جانب سے دیا جارہا ہے، جیسے دیا جارہا ہے اسی طرح سے اگر اللہ چاہے تو اس کو واپس بھی لے سکتا ہے، اس میں آپ کا اختیار کچھ نہیں ہے، ''اگر چاہے اللہ تو آپ کے دل پہ مُہر کر دے'' آپ کے دل پر کوئی چیز نہ اُترے اور جو اُتر چکی ہے وہ بھی اللہ واپس لے لے، مطلب یہ ہے کہ ان علوم کے حاصل کرنے میں یا ان علوم کے باقی رکھنے میں تیرا کوئی اختیار نہیں، یہ جو کچھ ہے اللہ کی جانب سے آپ کو دیا جارہا ہے اور اللہ کی توفیق سے ہی یہ باقی ہے، یہی مضمون سورۂ اسراء میں بھی آیا تھا،[1] وَيَمْحُ اللّٰهُ الْبَاطِلَ وَيُحِقُّ الْحَقَّ: مٹاتا ہے اللہ تعالیٰ باطل کو اور ثابت کرتا ہے حق کو، ان لفظوں کی تقریر ''بیان القرآن'' میں یوں کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی یہ عادت مبارکہ ہے کہ اگر کوئی شخص جھوٹی نبوّت کا دعویٰ کر لے تو اللہ تعالیٰ اس کے ہاتھ پر معجزات ظاہر نہیں کرتا، کوئی اس قسم کا خرقِ عادت واقعہ ظاہر نہیں ہونے دیتا، تاکہ لوگوں کے لئے گمراہی کا باعث نہ بن جائے، نبوّت کا جھوٹا دعویٰ چلا نہیں کرتا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی تائید آجائے، اس قسم کے تصرفات اس سے ظاہر ہو جائیں، بلکہ ایسے شخص کو جلدی ہی ذلّت کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کو خرقِ عادت اُمور نہیں دیے جاتے جن کو ہم ''معجزات'' سے تعبیر کرتے ہیں، جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام نے جادوگروں کے مقابلے میں کہا تھا کہ اگر یہ بات باطل ہے تو اللہ اس کو ثابت نہیں کرے گا، حق ہوگی تو ثابت کرے گا، تو یہاں بھی یہی بات ہے کہ اگر آپ کا یہ نبوّت کا دعویٰ جھوٹا ہوتا تو اللہ تعالیٰ اس کو مٹا دیتا، اور جب سچا ہے تو اللہ تعالیٰ دلائل کے ساتھ اس کو ثابت کر رہا ہے،'' مٹاتا ہے اللہ باطل کو اور ثابت کرتا ہے حق کو اپنے کلمات

---

(۱) وَلَئِنْ شِئْنَا لَنَذْهَبَنَّ بِالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ...الخ (سورۃ الاسراء:۸۶)

کے ساتھ" اپنے احکام کے ذریعے سے، احکام تکوینی بھی اور تنزیلی بھی، آیات بھی اُترتی ہیں اور معجزات بھی ہاتھ پر ظاہر ہوتے ہیں جس کے ساتھ حق ثابت ہوتا ہے، اِنَّهٗ عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: بے شک اللہ تعالیٰ جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کو، صُدور صدر کی جمع، صدر سینے کو کہتے ہیں، علیمٌ باقوالٍ ذاتِ الصُّدُورِ، اور باتوں کی نسبت سینے کی طرف بھی ہوا کرتی ہے اور باتوں کی نسبت دل کی طرف بھی ہوا کرتی ہے، "دلوں کے بھید" "سینے کے راز" دونوں طرح سے تعبیر کیا جاتا ہے، اللہ تعالیٰ ہر حال کو جانتے ہیں، تو اس لیے اگر آپ کا یہ دعویٰ سچا نہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ان معجزات کے ذریعے سے اور ان آیات کے ذریعے سے اس کو تقویت نہ پہنچاتا بلکہ اس کو مٹا دیتا، ان علوم کا آنا اور ان علوم کا باقی رہنا سب اللہ کی توفیق سے ہے، وگرنہ اگر اللہ نہ اُتارتا تو بھی آپ کو یہ علوم حاصل نہ ہوتے، اور اُترے ہوئے علوم اگر اللہ تعالیٰ واپس لینا چاہے تو بھی وہ لے سکتا ہے۔

توبہ کی حقیقت اور شرائط

وَهُوَ الَّذِیْ یَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ: اب یہ مخالفین کو توبہ کرنے کی ترغیب ہے، اللہ وہی ہے جو قبول کرتا ہے توبہ اپنے بندوں کی طرف سے، توبہ کا لفظ بھی آپ کے سامنے کئی دفعہ آچکا، تَابَ تَوْبَةً کا معنی ہوتا ہے رجوع کرنا، لوٹنا، اور تاب کی نسبت اللہ کی طرف بھی ہوتی ہے اور بندے کی طرف بھی ہوتی ہے، تَابَ اللهُ عَلَیْهِ، تو تَابَ الْعَبْدُ بھی کہتے ہیں، تاب اللہ بھی کہتے ہیں۔ "بندے نے توبہ کی" بندے کی توبہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ معصیت اختیار کر کے گویا کہ اس نے اللہ سے رُخ پھیر لیا تھا اور توبہ کا مطلب یہ ہے کہ پھر وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا، اللہ کی طرف لوٹ آیا، اور اللہ کی توبہ کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ جس وقت بندے نے نافرمانی اختیار کی تو اللہ نے بھی اعراض کر لیا، اور جس وقت بندہ اللہ کی طرف متوجہ ہو گیا اپنی غلطی کا اقرار کرتا ہے تو اللہ بھی اس کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اپنی رحمت کو اس پر لوٹا دیتا ہے۔ اور توبہ کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی غلطی کا اقرار کرے اور دل میں نادم ہو، آئندہ کے لئے عزم کرے کہ میں پھر یہ گناہ نہیں کروں گا، یہ ہے حقیقتِ توبہ، "اَلتَّوْبَةُ النَّدَمُ"(۱) توبہ اصل کے اعتبار سے ندامت کا نام ہے، قلب میں شرمساری ہو اپنے کیے ہوئے پر، اور پھر زبان سے انسان اعتراف کرے کہ مجھ سے غلطی ہو گئی اور میں عزم کرتا ہوں پختہ ارادہ کرتا ہوں کہ پھر ایسی غلطی نہیں کروں گا یہ ہے حقیقتِ توبہ۔ باقی! جو غلطی ہو گئی اس کی تلافی کرنے کے لئے اگر شریعت نے کوئی قاعدہ بتایا ہے تو اس کے مطابق تلافی کی جائے، مثال کے طور پر اگر آپ نے فرض نماز چھوڑی ہے اور یہ گناہ کیا ہے تو توبہ کا طریقہ یہ ہے کہ پہلے اس کو قضا کرو پھر اپنی اس غلطی کی معافی مانگو، جتنے بھی فرائض ہیں سب میں طریقہ یہی ہے جن کی قضا وغیرہ یا کفارہ اللہ نے رکھا ہے پہلے وہ ادا کرو، ادا کرنے کے بعد پھر معافی مانگو، اگر وہ ادا نہیں کرتے تو ایسی صورت میں کوئی توبہ نہیں ہے، حقوق العباد میں بھی اسی طرح سے ہے کہ اگر کسی بندے کو آپ نے کوئی نقصان پہنچایا ہے، مالی ہو، جانی ہو، عزت کا ہو، کچھ بھی ہو، تو اگر اس کی تلافی ادا کرنے کے ساتھ ہوتی ہے تو ادا کیجئے اس کا بدلہ دیجئے، ورنہ پہلے اس سے معاف کروائیے اور اس کے بعد اللہ کے سامنے توبہ کیجئے، اور اگر حق کسی کا آپ کے ذمے ہے اور صاحبِ حق آپ کو معلوم نہیں یا وہ فوت

(۱) تفسیر رازی سورۂ توبہ: ۱۰۲، بولفظہ: لان الاصل فی التوبة الندم/نوٹ: سنن ابن ماجہ ص ۳۱۳ باب ذکر التوبة میں مرفوعاً یہ الفاظ ہیں: الندم توبة۔

ہو گیا تو اس کے ورثاء کو دیجئے، ورثاء کو دے کر پھر اللہ تعالیٰ سے استغفار کیجئے، اور اگر اس کے ورثاء بھی معلوم نہ ہوں جس طرح سے کوئی ساتھی ہے، کسی سے آپ نے پیسے ادھار لے لیے، وہ چلا گیا، بعد میں پتا ہی نہیں وہ کہاں کا تھا، کدھر چلا گیا، زندہ ہے یا مر گیا تو اس کے نام پر صدقہ کر دیجئے، ایصالِ ثواب اس کو کیجئے، اور اگر کسی کی چغلی غیبت کی ہے اور اس سے براہِ راست معافی نہیں لی جاسکتی، کوئی ایسی صورت بن جائے تو اس کے لئے مغفرت کی دُعا کیجئے کثرت کے ساتھ، اس طرح سے آپ پہلے اس کا حق ادا کریں، حق ادا کرنے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی غلطی کا اقرار کر کے توبہ کریں تو اس قسم کی توبہ قبول ہوتی ہے، ورنہ گناہ کا جذبہ قلب میں اُسی طرح سے ہو اور جو کچھ پہلے کیا جا چکا ہے اس کی آپ تلافی نہ کریں، اور زبان سے توبہ استغفار کرتے رہیں، تو اس توبہ استغفار کا کوئی معنی نہیں، یہ بے روح چیز ہے، اس کے اُوپر کوئی کسی قسم کا اثر مرتب نہیں ہوگا، بلکہ غلطی بھی کرتے جائیں، دِل میں آئندہ اسی قسم کے گناہ کرنے کا ارادہ بھی ہو، اور زبان سے استغفار ہو، یہ تو ایک استہزا سا بن جاتا ہے، یہ حقیقتاً توبہ نہیں ہے، قلب میں ندامت ہونی چاہیے اپنے کیے پر، جس وقت انسان توبہ کرتے وقت اپنے پچھلے گناہ سے نادم ہو جائے تو وہ گناہ معاف ہو جائے گا، یہ علیحدہ بات ہے کہ آئندہ اپنی کمزوری کی بنا پر اُس گناہ کو پھر کر لے تو دوبارہ پھر توبہ کر لے، لیکن توبہ کرتے وقت یہ ارادہ نہیں ہونا چاہیے کہ میں نے یہ کام کرنا تو ہے ہی، اور ایسے ہی رسمی طور پہ توبہ کر رہا ہوں، ایسی صورت میں گناہ معاف نہیں ہوگا، توبہ کیجئے حقیقتاً، اُس وقت دل میں پختہ ارادہ ہو کہ آئندہ نہیں کروں گا، پھر اگر اپنی کسی کمزوری کی بنا پر اس میں انسان مبتلا ہو جائے تو دوبارہ توبہ کر لیجئے، توبہ کا دروازہ بند نہیں ہے، اس لیے حدیث شریف میں آتا ہے: ''مَا أَصَرَّ مَنِ اسْتَغْفَرَ وَإِنْ عَادَ فِي الْيَوْمِ سَبْعِيْنَ مَرَّةً''(۱) کہ جو شخص استغفار کرتا رہے، توبہ کرتا رہے، وہ گناہ پر مُصِر نہیں سمجھا جاتا اگرچہ وہ دِن میں ستر دفعہ ہی وہ گناہ کیوں نہ کرے۔ تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ توبہ صدقِ دل سے ہو جائے تو پچھلا گناہ معاف ہو جائے گا، اور اگر اپنی کسی مجبوری یا معذوری یا کسی غفلت اور غلطی کی بنا پر دوبارہ اس گناہ میں مبتلا ہو جائیں تو پچھلی توبہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا، آئندہ نئے سرے سے توبہ کر لیجئے، ایسی توبہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ قبول فرماتے ہیں، ورنہ دِل میں اگر ارادہ ہو، دوبارہ اُس گناہ کے کرنے کا تو پھر توبہ کی حقیقت مہیا نہیں ہوتی، اِسی کو کسی فارسی شاعر نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے تا کہ:

سُبحہ بر کف، توبہ بر لب، دل پُر اَز ذوقِ گناہ ‌ ‌ ‌ ‌ معصیت را خندہ می آید بر اِستغفارِ ما

کہتے ہیں کہ ہاتھ میں تو تسبیح پکڑی ہوئی ہے، ''توبہ بر لب'' توبہ توبہ توبہ، ہر وقت منکے پہ منکا گر رہا ہے اور اَسْتَغْفِرُ اللهَ اَتُوْبُ اِلَیْهِ پڑھا جا رہا ہے لیکن ''دل پُر اَز ذوقِ گناہ'' دِل اسی طرح سے گناہ کے شوق کے ساتھ بھرا ہوا ہے، کہتے ہیں کہ ایسے اِستغفار پر تو معصیت کھڑی ہنستی ہے کہ اس اِستغفار سے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، تو اگر ہم اس صورت میں اِستغفار کریں کہ دِل کے اندر اسی طرح سے وہ گناہ اپنایا ہوا ہو تو ایسے طور پر تو معصیت کو ہنسی آتی ہے کہ اس اِستغفار کے ساتھ مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچتا، تو قلب میں ندامت ہوگی تب جا کے توبہ کی حقیقت مہیا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ توبہ تب قبول فرماتے ہیں۔ وَیَعْفُوْا عَنِ السَّیِّاٰتِ:

(۱) ابوداؤد ج ۱ ص ۲۱۲ باب فی الاستغفار/ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۲۰۴ باب الاستغفار فصل ثانی/ نیز ترمذی ج ۲ ص ۱۹۶۔

اللہ تعالیٰ گناہوں سے درگزر فرماتے ہیں، ''اللہ وہی ہے جو قبول کرتا ہے توبہ کو اپنے بندوں سے اور درگزر کرتا ہے برے اعمال سے'' وَيَعْلَمُ مَا تَفْعَلُوْنَ: اور جانتا ہے ان سب کاموں کو جو تم کرتے ہو، وَيَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: قبول کرتا ہے اللہ تعالیٰ (اِسْتِجَاب: قبول کرنا) قبول کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کی عبادت اور دُعا کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، اور زیادہ دیتا ہے اُن کو اپنے فضل سے، ''جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو قبول کرتا ہے'' یعنی ان کی دُعا کو اور ان کی عبادت کو قبول کرتا ہے، وَيَزِيْدُهُمْ مِّنْ فَضْلِهٖ: اور اپنے فضل سے ان کو زیادہ دیتا ہے، وَالْكٰفِرُوْنَ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ: کافروں کے لئے سخت عذاب ہے، نہ ان کی کوئی نیکی قبول ہوتی ہے، نہ اللہ کا فضل ہی ان کے اُوپر ہوتا ہے، ان کے لئے سخت عذاب ہے۔

رِزق کی وسعت ہر ایک کے لئے کیوں نہیں؟

وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِي الْاَرْضِ وَلٰكِنْ يُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا يَشَآءُ: اگر اللہ تعالیٰ کشادہ کردے روزی اپنے بندوں کے لئے البتہ سرکش ہوجائیں وہ زمین میں، لیکن اُتارتا ہے اندازے کے ساتھ جو چاہتا ہے، اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِيْرٌۢ بَصِيْرٌ: بے شک وہ اپنے بندوں کی خبر رکھنے والا ہے اور دیکھنے والا ہے۔ یہاں پھر وہی رزق کا مسئلہ آگیا، اس سورت میں اس بات کو بار بار دوہرایا جارہا ہے، حاصل اِس کا یہ ہے کہ روزی کی تنگی اور روزی کی کشادگی یہ اللہ کی حکمت پہ ہے، بعض کو اللہ تعالیٰ کسی رزق سے محروم کردیتے ہیں بعض کو دیتے ہیں، اُس کی ایک حکمت کی طرف اشارہ کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ سب بندوں کے لئے رزق کو پھیلادے، ہر کسی کو روزی وسعت کے ساتھ حاصل ہوجائے، تو دنیا کا انتظام ہی برقرار نہیں رہ سکتا، لوگ سرکش ہوجائیں گے، آپس میں ایک دوسرے کی اطاعت نہیں کریں گے، ایک دوسرے کے کام نہیں آئیں گے۔ یہ بہت بڑی حکمت ہے جس کی طرف اللہ تعالیٰ نے یہاں اشارہ فرمایا، دُنیا کا نظم جو قائم ہے انسانی تمدّن کا اس کا مدار ہے احتیاج پر۔ احتیاج یعنی محتاج ہوجانا بذاتِ خود کتنی ہی بُری چیز ہے لیکن اس دُنیا میں خاص طور پر انسانی تمدّن کا بقاء احتیاج کے ساتھ ہے، ہم اگر ایک دوسرے کے محتاج رہیں تو ہم ایک دوسرے کا خیال رکھیں گے اور ایک دوسرے کے کام آئیں گے، اور اگر ہمیں ایک دوسرے کے ساتھ احتیاج نہ رہے تو ایسی صورت میں کوئی کسی کی رعایت نہیں کرے گا، کوئی کسی کے کام نہیں آئے گا، اور احتیاج باقی اسی طرح سے رہتی ہے کہ ایک چیز میرے پاس ہے آپ کے پاس نہیں ہے، آپ محتاج ہیں میرے ساتھ رابطہ رکھنے پر، اور ایک چیز آپ کے پاس ہے میرے پاس نہیں ہے تو میں ضرورت محسوس کروں گا آپ کی، اب اس نکتے پر نظر ڈالتے ہوئے اگر آپ دیکھیں گے تو مزدور سرمایہ دار اور دوسرے جتنے بھی کام کرنے والے لوگ ہیں، یا دُنیا میں جتنے بھی طبقات ہیں، کوئی طبقہ ایسا نہیں جو یہ کہے کہ میری ہر ضرورت خود پوری ہے، مجھے کسی دوسرے انسان کی ضرورت نہیں ہے، انسان اپنی ضروریات خود پوری نہیں کرسکتا، اپنی ضرورت کا کپڑا خود بنائے خود سیے خود پہنے خود دھوئے، اور اپنی ضرورت کی جوتی خود بنالے، خود اس کو استعمال کرے، خود ہی لے، اور اسی طرح سے اپنی خوراک خود بغیر کسی کی معاونت کے حاصل کرلے، کیا یہ ممکن ہے؟ ایک ایک چیز میں انسان کو دوسرے کی ضرورت پیش آتی ہے، اگر ایک شخص مال دار ہے تو اس کے پاس بدنی قوت نہیں

کام کرنے کے لئے، ایک شخص کے پاس بدنی قوت ہے تو اس کے پاس مال نہیں ہے، تو مال دار محتاج ہے اِس بدنی قوت والے کا، بدنی قوت والا محتاج ہے اِس مال دار کا، اس لیے آپس میں ملیں گے اور آپس میں کام چلائیں گے، اور اگر ہر کسی کے لئے یہ کشادگی کردی جاتی تو یہ احتیاج ختم ہوجاتا، اور اس احتیاج کے ختم ہونے کے نتیجے میں کوئی کسی کے ساتھ تعاون نہ کرتا، کوئی کسی کی ضرورت محسوس نہ کرتا، یہ تو آپس میں بغاوت ہوجاتی اور ایک دوسرے سے سرکشی ہوجاتی، جیسے تیسویں پارے میں بھی آئے گا اِنَّ الْاِنْسَانَ لَیَطْغٰۤی ۙ اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰی ؕ (سورۂ علق) جس وقت انسان اپنے آپ کو مستغنی سمجھنے لگ جاتا ہے تو اس کی طبیعت میں طغیان اور سرکشی آجاتی ہے، پھر وہ دوسرے کی رعایت نہیں کرتا اگر اپنے آپ کو دوسرے سے بے نیاز سمجھنے لگ جائے، تو یہ اللہ کی حکمت ہے کہ انسان کو دوسرے انسان کی طرف کسی نہ کسی چیز میں محتاج رکھتا ہے تا کہ ان کا آپس میں رابطہ رہے، آپس میں بھی سرکشی ہوتی ہے اور یہ واقعہ ہے کہ اگر رزق کشادہ کردیا جائے کہ ہر انسان کی ضرورت ہر طرح سے پوری کردی جائے تو پھر یہ اللہ کی طرف بھی اپنا احتیاج باقی نہیں رکھیں گے، یوں بھی دماغ خراب ہوجاتا ہے، تو انسان تو یہ چاہتا ہے کہ ہماری ہر ضرورت براہِ راست پوری ہو اور رزق کشادہ ہو، لیکن عالمی مصلحت اسی میں ہے کائنات کی مصلحت اسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی کو کم دیتا ہے کسی کو زیادہ دیتا ہے، اس سے دُنیا کا نظم قائم ہے، اسی نکتے کی طرف یہاں اشارہ فرمایا کہ "اگر اللہ تعالیٰ کشادہ کردے رزق اپنے بندوں کے لئے تو وہ زمین میں سرکش ہوجائیں" وَلٰكِنْ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ: اللہ تعالیٰ اندازے کے ساتھ اُتارتا رہتا ہے جو چاہتا ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ کے خزانے میں کمی نہیں، اس کے پاس خزانے ہیں، لیکن اپنی مشیت کے ساتھ اندازے کے ساتھ وہ اُتارتا ہے جس کے ساتھ انسان کی ضرورتیں بھی پوری ہوجائیں لیکن ساتھ ساتھ نظامِ عالم بھی باقی رہے، اور انسان کے اندر کسی نہ کسی درجے میں احتیاج الی اللہ بھی رہے اور آپس میں بھی ایک دوسرے کی ضرورت محسوس کریں اور ایک دوسرے کے کام آتے رہیں، اِنَّهٗ بِعِبَادِهٖ خَبِیْرٌۢ بَصِیْرٌ میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمام احوال کو جانتا ہے، وہی مصلحت سمجھتا ہے کہ کتنا اتارنا مصلحت ہے، کس کو دینا مصلحت ہے اور کس کو نہ دینا مصلحت ہے، تو اِس تصرف پر انسان کو راضی رہنا چاہیے، نہ تو مالدار کے لئے اس میں اکڑنے کی گنجائش ہے اور نہ ہی کسی غریب کے لئے اس میں کوئی مایوسی کی بات ہے، اللہ تعالیٰ کی اس حکمت کو مدنظر رکھتے ہوئے انسان کو مطمئن رہنا چاہیے۔

دلائلِ قدرت کے ذریعے اِثباتِ معاد

وَهُوَ الَّذِیْ یُنَزِّلُ الْغَیْثَ مِنْۢ بَعْدِ مَا قَنَطُوْا: اللہ وہ ہے جو اُتارتا ہے بارش لوگوں کے مایوس ہوجانے کے بعد، یعنی کبھی ایسے بھی نوبت آجاتی ہے، کھیتی بونے کا وقت ہے یا اس کی پرورش کا وقت ہے اور بارش نہیں ہوئی، تو لوگوں کے اُوپر مایوسی سی طاری ہوجاتی ہے، تو پھر اللہ بارش اُتارتا ہے، بارش اُتارنا اللہ کی نعمت ہے، لیکن ان حالات میں اُتارنا اس میں نعمت کا مفہوم زیادہ واضح ہوجاتا ہے، وَیَنْشُرُ رَحْمَتَهٗ: اور اپنی رحمت کو پھیلاتا ہے، رحمت کے پھیلانے سے مراد وہی نباتات کا اُگانا، رزق کا پھیلانا، جو بارش کے اُترنے کے ساتھ زمین میں آبادی ہوتی ہے، سورۂ رُوم کے اندر جس طرح سے آیا تھا فَانْظُرْ اِلٰۤى اٰثٰرِ رَحْمَتِ اللّٰهِ كَیْفَ یُحْیِ

الارض بعد موتہا کہ زمین کے بنجر ہونے کے بعد اللہ زمین کو کیسے آباد کرتا ہے اللہ کی رحمت کے آثار دیکھو، تو یہاں ینشر رحمتہ سے بھی نشرِ رحمت مراد ہے، وَهُوَ الْوَلِيُّ الْحَمِيدُ: وہی کارساز ہے اور وہی تعریف کیا ہوا ہے، تمام صفات کمال اسی کے لئے ثابت ہیں، وَمِنْ اٰيٰتِهٖ خَلْقُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اور اللہ کی نشانیوں میں سے ہے آسمانوں کو پیدا کرنا اور زمین کو پیدا کرنا، وَمَا بَثَّ فِيْهِمَا مِنْ دَآبَّةٍ: اور ان چیزوں کو پیدا کرنا جو اللہ تعالیٰ نے اِن کے اندر پھیلائی ہیں، مِنْ دَآبَّةٍ یہ مَا کا بیان ہے، جو دوابّ اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کے اندر پھیلائے ہیں ان کا پیدا کرنا یہ بھی اللہ کی قدرت سے ہے، زمین کے اندر جو دوابّ پھیلائے ہیں وہ تو اپنی آنکھوں کے سامنے ہیں اور اتنے ہیں جو آپ کے شمار میں بھی نہیں آتے، اور اسی طرح سے آسمان پر بھی دوابّ ہیں، کیونکہ دَبَّ یَدِبُّ چلنے والی چیز کو کہتے ہیں، رینگنے والی چیز کو، تو اس میں ملائکہ بھی آسکتے ہیں، اور اس کے علاوہ اور بھی اللہ تعالیٰ نے جنّات میں جو کچھ پیدا کیا ہے پرندے بھی ہیں سب چیز ہے، وہ سب دوابّ کا مصدق ہیں، اور ممکن ہے ان ستاروں سیاروں کے اندر بھی اسی طرح سے کوئی مخلوق ہو جو دوابّ کا مصداق بن جائے، تو ان کا پیدا کرنا سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں ہیں، تو جس طرح سے پیدا کرنا قدرت میں ہے وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ: یہ آخرت کے امکان کی طرف اشارہ کردیا، اور وہ ان سب کے اکٹھا کرنے پر جب چاہے گا قدرت رکھنے والا ہے، یعنی ان کو پھیلانے کے بعد اگر پھر اکٹھا کرنا چاہے تو اکٹھا کرنے پر بھی اُس کو قدرت اسی طرح سے حاصل ہے جس طرح سے اس کو پھیلانے کی قدرت حاصل تھی۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ﴿٣٠﴾

جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے پس وہ اسی چیز کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمائی، اور بہت ساری چیزوں سے اللہ درگزر فرما جاتے ہیں ﴿٣٠﴾

وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ فِي الْاَرْضِ ۚ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٣١﴾ وَ

اور نہیں ہو تم عاجز کرنے والے زمین میں، اور نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کے علاوہ کوئی کارساز اور نہ کوئی مددگار ﴿٣١﴾ اور

مِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿٣٢﴾ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ

اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں کشتیاں سمندر میں پہاڑوں کی طرح ﴿٣٢﴾ اگر اللہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے پھر ہو جائیں وہ کشتیاں ٹھہرنے والی

عَلٰى ظَهْرِهٖ ۭ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ ﴿٣٣﴾ اَوْ يُوْبِقْهُنَّ

سمندر کی پشت پر، اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو صبر کرنے والے ہیں، شکر کرنے والے ہیں ﴿٣٣﴾ یا ہلاک کر دے ان کشتی والوں کو

بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ ﴿٣٤﴾ وَّيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ

ان کے اعمال کی وجہ سے، بہت سارے عملوں سے اللہ درگزر کر جائے ﴿۳۴﴾ اور تا کہ جان لیں وہ لوگ جو ہماری آیات

فِيْٓ اٰيٰتِنَا ۭ مَا لَهُمْ مِّنْ مَّحِيْصٍ ﴿٣٥﴾ فَمَآ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا

میں جھگڑتے ہیں کہ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں ﴿۳۵﴾ جو چیز بھی تم دیے جاتے ہو یہ دُنیوی زندگی کا برتنے کا سامان ہے، اور جو کچھ

عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰي رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ ﴿٣٦﴾ وَالَّذِيْنَ

اللہ کے پاس ہے وہی بہتر اور وہی زیادہ باقی رہنے والا ہے ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائیں اور اپنے رَبّ پر بھروسا کریں ﴿۳۶﴾ جو لوگ

يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ وَالَّذِيْنَ

بچتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے اور جس وقت غصّے میں آجاتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں ﴿۳۷﴾ اور وہ

اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا

لوگ جو کہ اپنے رَبّ کی بات کو قبول کرتے ہیں اور نماز کو قائم کرتے ہیں اور ان کا معاملہ آپس میں مشورے سے ہوتا ہے اور جو کچھ

رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ﴿٣٨﴾ وَالَّذِيْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْيُ هُمْ يَنْتَصِرُوْنَ ﴿٣٩﴾ وَجَزٰۗؤُا سَيِّئَةٍ

ہم نے ان کو دیا ہے وہ اس کو خرچ کرتے ہیں ﴿۳۸﴾ اور وہ لوگ کہ جب ان کو کوئی ظلم پہنچ جاتا ہے تو بدلہ لیتے ہیں ﴿۳۹﴾ بُرائی کا بدلہ

سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَي اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ

بُرائی ہے اس کے برابر، جو کوئی معاف کر دے اور حالات کو دُرست کر لے اس کا اجر اللہ کے ذِمّے ہے، بے شک وہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو

الظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٠﴾ وَلَمَنِ انْتَصَرَ بَعْدَ ظُلْمِهٖ فَاُولٰۗىِٕكَ مَا عَلَيْهِمْ مِّنْ سَبِيْلٍ ﴿٤١﴾ اِنَّمَا السَّبِيْلُ

پسند نہیں کرتا ﴿۴۰﴾ اور جو کوئی شخص بدلہ لے لے اپنے مظلوم ہونے کے بعد، ان لوگوں پہ کوئی اِلزام نہیں ہے ﴿۴۱﴾ اِلزام تو

عَلَي الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ

ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پہ ظلم کرتے ہیں اور زمین کے اندر ناحق سرکشی اختیار کرتے ہیں، ان کے لئے دردناک

اَلِيْمٌ ﴿٤٢﴾ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴿٤٣﴾

عذاب ہے ﴿۴۲﴾ البتہ جو شخص صبر کر لے اور معاف کر دے، بے شک یہ بات ہمت کے کاموں میں سے ہے ﴿۴۳﴾

تفسیر

مصیبت کا سبب اکثر وبیشتر انسان کا اپنا بُرا عمل ہوتا ہے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ۔ وَمَآ اَصَابَكُمۡ مِّنۡ مُّصِیۡبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتۡ اَیۡدِیۡكُمۡ وَیَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِیۡرٍ۔ مِّنۡ مُّصِیۡبَةٍ یہ ''مَا'' کا بیان ہے، جو مصیبت بھی تمہیں پہنچتی ہے پس وہ اسی چیز کی وجہ سے ہے جو تمہارے ہاتھوں نے کمائی، تمہارے اپنے ہاتھوں کے کسب کی وجہ سے ہے، وَیَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِیۡرٍ: اور بہت ساری چیزوں سے اللہ تعالیٰ درگزر فرما جاتے ہیں، عَفَا یَعۡفُوۡ: درگزر کرنا، وَمَآ اَنۡتُمۡ بِمُعۡجِزِیۡنَ فِی الۡاَرۡضِ: اور نہیں ہو تم عاجز کرنے والے زمین میں، وَمَا لَكُمۡ مِّنۡ دُوۡنِ اللّٰہِ مِنۡ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیۡرٍ: اور نہیں ہے تمہارے لئے اللہ کے علاوہ کوئی کارساز اور نہ کوئی مددگار۔ پچھلی آیات میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ رزق کے متعلق ذکر کیا تھا وَلٰكِنۡ یُّنَزِّلُ بِقَدَرٍ مَّا یَشَآءُ، جس میں اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کے انعامات اس کی مشیت کے تحت ایک اندازے سے آیا کرتے ہیں۔ اِس آیت میں مصائب کے فلسفے کی طرف کچھ اشارہ کیا ہے کہ انسان پر جو مصیبتیں آتی ہیں وہ بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کے علم وحکمت کے تحت ہیں، لیکن اکثر وبیشتر مصیبت کا سبب انسان کا اپنا عمل ہوتا ہے، رحمت تو اللہ تعالیٰ کی براہِ راست آتی ہے، فضل اور مہربانی کے لئے تو اسباب کی ضرورت نہیں، وہ تو اللہ تعالیٰ بلا اسباب بھی دیتے ہیں، اور مصیبت اور تکلیف جو پہنچتی ہے وہ اکثر وبیشتر انسان کے کسب کی وجہ سے انسان کے اپنے عمل کی وجہ سے پہنچتی ہے، اس آیت کا ظاہر جس طرح سے آپ کے سامنے ہے کہ جو مصیبت بھی تمہیں پہنچے وہ تمہارے اپنے عملوں کی وجہ سے ہے، اور اپنے عمل سے مراد ہے بُرا عمل گناہ معصیت، کہ تم کوئی معصیت اختیار کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کے بتائے قواعد کی خلاف ورزی کرتے ہو جس کی بناء پر تمہیں تکلیف پہنچتی ہے، اور بظاہر اس میں حصر سا معلوم ہوتا ہے۔

ایک اِشکال

اور اس آیت کے ظاہر کی طرف دیکھتے ہوئے اِشکال یہ ہے کہ مصائب تو انبیاء علیہم السلام کو بھی پہنچے، اور تکلیفیں اور مصیبتیں چھوٹے بچوں پر بھی آتی ہیں، اولیاء اللہ، نیک لوگ سب اس گھیرے میں آجاتے ہیں، تو اولیاء اللہ اور نیک بندے ان میں تو خیر یہ احتمال ہے کہ وہ کوئی نہ کوئی اپنے درجے کے مطابق کوئی گناہ کریں اور کسی معصیت کا ارتکاب کریں تو اللہ کی طرف سے مصیبت آجائے، لیکن بچے تو معصوم ہوتے ہیں، اُن کے تو کسی عمل کو گناہ قرار ہی نہیں دیا جاسکتا، اور اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام بھی معصوم ہوتے ہیں، ان کے کسی کام کو بھی معصیت کیساتھ تعبیر نہیں کیا جاسکتا، تو پھر اُن کے اُوپر مصیبتیں کیوں آتی ہیں؟ ظاہری طور پر یہ ایک اشکال ہے۔

پہلا جواب: ''مخاطب مجرم ہیں''

اس کا جواب دیتے ہوئے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے اس آیت کے ترجمے میں دو لفظ بڑھائے ہیں انہی اِشکالات کو دُور

ہٹانے کے لیے، پہلے تو انہوں نے ترجمے میں یوں کہا کہ' اے گناہ گارو! تمہیں کوئی مصیبت نہیں پہنچتی'' تو کُمْ کا خطاب گناہ گاروں کو کیا، جو قرآنِ کریم کے مخاطب تھے اُس وقت، انبیاء ﷺ یا چھوٹے بچے اس کے مخاطب نہیں ہیں، بلکہ اہلِ مکہ جو آئے دِن مسلمانوں کے ساتھ اُلجھتے تھے اور قرآنِ کریم کی مخالفت کرنے کی بنا پر وہ مصیبتوں میں گھرے رہتے تھے، خاص طور پر قحط بہت طویل اور بہت محیط آیا تھا مکہ معظمہ میں، حضور ﷺ کی مخالفت کے نتیجے میں ان کو اللہ تعالیٰ نے قحط کے اندر مبتلا کر دیا تھا، اس قسم کی تکلیفیں اور مصیبتیں اُن پر جو آتی تھیں تو اُن کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ تم اس حقیقت کو سمجھو! یہ تمہاری بدکرداری کا نتیجہ ہیں، اور مشرکین قوموں کی عام طور پر عادت رہی ہے کہ جب بھی اس قسم کی کوئی تکلیف آتی تو اس کے ذمہ دار وہ انبیاء ﷺ کو ٹھہراتے، کہتے کہ تم آگئے، تمہاری نحوست یہ پڑی، جیسے موسیٰ علیہ السلام کے قصے کے اندر یہ باتیں آئی تھیں یَطَّیَّرُوْا بِمُوْسٰی وَمَنْ مَّعَهٗ (سورۂ اعراف: ۱۳۱)، اِنَّا تَطَیَّرْنَا بِکُمْ (سورۂ یٰس: ۱۸) یہ الفاظ قرآنِ کریم میں بار بار آئے ہیں، موسیٰ علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کی نحوست بتلاتے، اور انبیاء ﷺ کو کہتے کہ ہم تمہیں منحوس سمجھتے ہیں، تو ذِمّے داری ان پہ ڈالتے، اسی طرح سے مشرکینِ مکہ جب مصیبتوں کے اندر مبتلا ہوئے تو ان کا ذہن بھی ایسے ہوگا کہ یہ لوگ آئے اور انہوں نے ایسی باتیں کرنی شروع کیں تو ہم پر مصیبت آگئی، ہماری مصیبت کا سبب یہ بنے، انہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ تمہیں جو مصیبت پہنچتی ہے تمہارے اپنے کردار کی وجہ سے ہے۔ تو کُمْ کا خطاب گناہ گاروں کو ہے، یہاں بچے یا انبیاء ﷺ اس کے مخاطب ہی نہیں، تو لفظ کُمْ کے اندر یہ تخصیص کر کے بھی اِس اِشکال کو اُٹھایا جا سکتا ہے۔

دُوسرا جواب: ''نیک لوگوں پر حقیقتاً مصیبت نہیں آتی''

یا پھر ''مصیبت'' کا ترجمہ کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حقیقی مصیبت، یہاں مصیبت سے وہ مصیبت مراد ہے جو واقعۃً اور حقیقتاً بھی مصیبت ہو، اصل بات یہ ہے کہ ہم مصیبت اس چیز کو سمجھتے ہیں کہ جو ہماری مرضی کے خلاف واقعہ پیش آجاتا ہے، ہم صحت چاہتے ہیں، بیماری آگئی، ہمارے لیے یہ مصیبت ہے، ہم رِزق کی وسعت چاہتے ہیں، تنگی آگئی، یہ مصیبت ہے، ہم اولاد چاہتے ہیں، نہیں ملتی، یہ مصیبت ہے، بچوں کی زندگی چاہتے ہیں، وہ مرجاتے ہیں، یہ مصیبت ہے، کاروبار کی ترقی چاہتے ہیں، زوال آجاتا ہے، یہ مصیبت ہے، تو مصیبت اصل کے اعتبار سے وہ ہوا کرتی ہے جو اِنسان کی مرضی کے خلاف ہو، جو اِنسان کے خواہش کے خلاف اس کو واقعہ پیش آجاتا ہے، اس کو اِنسان ''مصیبت'' سمجھتا ہے، لیکن بسا اوقات ایک چیز ظاہری طور پر تو آپ کی مرضی کے خلاف پیش آئی جو آپ چاہتے نہیں تھے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے اس میں آپ کا نفع ہوگیا جس کا ابھی آپ کو پتا نہیں ہے، تو ایسی صورت میں وہ صورۃً تو مصیبت ہوگی حقیقت میں مصیبت نہیں ہے، ظاہری شکل اگرچہ دونوں کی ایک جیسی ہوگی لیکن ایک واقعہ پیش آئے گا کہ جس کے بعد آپ کو نقصان پہنچے گا، واقعۃً آپ خسارے میں جائیں گے، اور ایک واقعہ پیش آئے گا کہ ظاہری طور پر اگرچہ آپ کی خواہش کے خلاف ہونے پر وہ تکلیف دِہ ہے لیکن نتیجۃً وہ مفید، تو جس وقت اس کا نتیجہ سامنے آئے گا تو پھر یہ بات سمجھ میں آجائے گی کہ جس کو ہم نے مصیبت سمجھا تھا وہ مصیبت نہیں تھی وہ تو حقیقت کے اعتبار سے ہمارے لیے نعمت تھی، تو وہ صورۃً مصیبت ہے حقیقتاً مصیبت نہیں ہے۔ انبیاء ﷺ پر جو واقعات آتے ہیں وہ صورۃً مصیبت ہوتے ہیں، حقیقتاً مصیبت نہیں ہوتے،

ٹھیک ہے کہ اس میں بظاہر بدنی تکلیف ہوتی ہے یا کوئی مالی تنگی پہنچتی ہے یا کوئی ذہنی کوفت ہوتی ہے،لیکن اس کے نتیجے میں اللہ تبارک وتعالیٰ اُن کے درجات بلند کرتے ہیں اور بے شمار رُوحانی اور اُخروی نعمتوں کے ساتھ نوازتے ہیں، تو یہ تو ایک ایسی تجارت ہے کہ جس تجارت کے اندر انسان نفع میں رہتا ہے، کہ تھوڑی تکلیف اُٹھائی اور اِنعامات بہت لے لیے۔اور اسی طرح سے مؤمن کو، نیک آدمی کو، اولیاء اللہ کو جو تکلیف پہنچتی ہے، ان کے لئے کفارۂ سیئات کا باعث بنتی ہے، ان کے گناہ جھڑتے ہیں اور درجات بلند ہوتے ہیں، تو جس وقت یہ حقیقت سامنے آئے گی تو معلوم ہوجائے گا کہ یہ جو مصیبت تھی صورۃً مصیبت تھی، حقیقت کے اعتبار سے یہ ہمارے اُوپر اللہ کا بہت بڑا اِنعام تھا، جیسے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ ایک بندے کے لئے کوئی درجہ مقدر فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو وہاں پہنچانا ہے،لیکن اس کے اعمال اس درجے کو حاصل کرنے کے لئے، اللہ کی حکمت کے تحت جو اللہ تعالیٰ کے بنائے ہوئے ضابطے ہیں، ان کے مطابق وہ کافی نہیں ہوتے، تو پھر اللہ تعالیٰ اس کو کسی تکلیف اور مصیبت میں مبتلا کردیتے ہیں جس پر پھر وہ نیک بندہ صبر کرتا ہے تو اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ اس کو وہ درجہ دے دیتے ہیں۔[1] اب یہ چیز ظاہری طور پر تو مصیبت ہے، لیکن حقیقت کے اعتبار سے بہت بڑا اِنعام ہے۔ یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائیوں نے اُٹھا کر کنویں میں پھینکا، جس وقت وہ پھینک رہے تھے تو وہ بھی سمجھ رہے تھے ہم اس کو مصیبت میں مبتلا کررہے ہیں، اور جس وقت یوسف علیہ السلام کو پھینکا جارہا تھا تو ہوسکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام کے ذہن میں بھی ہو کہ یہ ایک بہت بڑی مصیبت ہے، لیکن آپ کو معلوم ہے کہ یہ کنویں میں پھینکا جانا ہی تختِ مصر کے حاصل کرنے کا ذریعہ بن گیا، تو جب یہ نتیجہ سامنے آیا تو نتیجہ سامنے آنے کے بعد تو معلوم ہوا کہ یہ ترقی کا زینہ تھا جس کو ہم سمجھ رہے تھے کہ مصیبت ہے، اور جس وقت تک یہ نتیجہ سامنے نہ آئے اس وقت تک انسان سمجھتا ہے کہ میں کسی مصیبت میں پھنس گیا، لیکن نتیجہ سامنے آنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہ مصیبت نہیں، یہ تو ترقی کا ایک ذریعہ تھا۔ خضر علیہ السلام نے کشتی والوں کی کشتی توڑ دی، اب آپ جانتے ہیں کہ کسی برتن کا ٹوٹ جانا کسی کشتی کا ٹوٹ جانا بظاہر ایک مصیبت ہے، اب دیکھنے میں تو یہ کہا جاسکتا تھا کہ یہ بڑا نقصان ہے جو پہنچادیا، بہت تکلیف ہے جو پہنچادی، لیکن جب نتیجہ سامنے آیا کہ اگر یہ تختہ اُکھڑا ہوا نہ ہوتا تو ظالم بادشاہ یہ کشتی ہی چھین لیتا، اور یہ تختہ اکھڑا ہوا تھا جس کی بنا پر بادشاہ نے اس کشتی کو نظر انداز کردیا، وہ مالکوں کے پاس رہ گئی، اب ایک تختے کا اکھڑنا تھا کہ کشتی بچ گئی اور اس کو تحفظ حاصل ہوگیا، تو نتیجۃً وہ تختے کا اکھڑنا نعمت ثابت ہوا نہ کہ مصیبت۔ تو مؤمنین کے لئے اس قسم کے واقعات جو پیش آتے ہیں صالحین کے لئے، انبیاء علیہم السلام کے لئے، اس کے اندر حقیقت کے اعتبار سے رُوحانی اور اُخروی درجات ہوتے ہیں، اور ان درجات کے سامنے آنے کے بعد یہ مصیبت مصیبت نہیں رہتی بلکہ یہ بہت بڑی نعمت معلوم ہوتی ہے، لیکن انسان کا چونکہ علم قاصر ہے، اس کو پتا نہیں کہ اس کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے، نتیجہ سامنے نہ ہونے کی بنا پر ان مصائب کو وہ سمجھتا ہے کہ میرے اُوپر کوئی آفتیں آگئیں، حالانکہ اگر اُن کے اوپر صبر کرلیا جائے جیسے کہ ایمان کا تقاضا ہے تو وہ واقعات انسان کے لئے رُوحانی ترقی کا باعث بنتے ہیں، تو وہ مصیبت صورۃً مصیبت ہوتی ہے حقیقتاً مصیبت نہیں ہوتی۔ تو حقیقتاً مصیبت کونسی ہوتی ہے؟ جو گناہ کی سزا کے

(1) ابوداؤد ۲ر ۸۴ باب الامراض المکفرۃ للذنوب/ مشکوۃ ۱ر ۱۳۷ باب عیادۃ المریض، فصل ثانی کا تقریباً آخر۔

طور پر آئے اور اس کے اُوپر دُنیوی اور اُخروی کوئی نفع مرتب نہ ہو، اور اس قسم کی مصیبتیں آپ جانتے ہیں کہ زیادہ تر کافروں پر ہی آتی ہیں، کیونکہ وہ کسی گناہ کی سزا میں یا عذاب میں مبتلا کردیا جاتا ہے، اور کسی آفت کے اندر ڈال دیا جاتا ہے، اور دُنیا اور آخرت میں ان کے سامنے اس کے عوض میں کوئی نفع آنے والا نہیں ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ آخرت میں جس وقت اللہ تعالیٰ اہلِ مصائب کو ثواب دیں گے تو جو اہلِ عافیت ہیں، جن کو دُنیا کے اندر کوئی کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچی، وہ تمنا کریں گے کہ ہائے کاش! دُنیا میں ہم پر ایسی مصیبتیں آتیں کہ ہمارے چمڑے قینچیوں سے کاٹے جاتے، تاکہ آج ہم بھی یہ ثواب حاصل کرتے۔[1] اس وقت معلوم ہوگا کہ ظاہری طور پر یہ واقعات جس کو ہم مصیبت سمجھتے تھے ہمارے لیے کتنے مفید ثابت ہوئے! اگر آپ اس کو مثال کے ساتھ سمجھنا چاہیں تو اس طرح سے سمجھ سکتے ہیں کہ ایک آدمی کے گھر میں چور نقب لگا کر ایک مَن گندم اُٹھا کر لے گئے، اور ایک آدمی خود اپنے گھر سے ایک مَن گندم اُٹھاتا ہے اور کھیت میں جا کر بکھیر دیتا ہے، ظاہری صورت تو دونوں کی ایک جیسی ہے کہ گھر سے ایک مَن گندم گئی، گھر سے ایک مَن گندم تو دونوں کی نکل گئی، بوری تو دونوں کی خالی ہوگئی، لیکن ان دونوں واقعوں میں مالک کا تاثر دیکھیے، جس کے گھر سے چوری ہوگئی وہ تو پریشان ہے کہ میرا نقصان ہوگیا، کیوں؟ کہ وہ سمجھتا ہے کہ جب چور لے گئے اس کا مجھے کوئی فائدہ پہنچنے والا نہیں، اس لیے وہ پریشان ہوتا ہے، اور ایک ہے کہ اس نے گندم لے جا کر مٹی میں بکھیر دی، بظاہر اس کے ہاتھ سے یہ بھی ضائع ہوگئی، لیکن چونکہ اس کو پتا ہے، اس کے علم میں ہے کہ یہ دوسرے وقت میں کئی گنا ہو کر واپس آئے گی، ایک مَن کے چالیس مَن بن کے واپس آئیں گے، اس انجام کے تصور کے ساتھ وہ خوش ہے، اور اس ایک مَن گندم کے گھر سے چلے جانے کے بعد اس کو کوئی دُکھ اور صدمہ نہیں ہے، اس خیال کی بنا پر چونکہ اس کے تجربے کے تحت اس کے علم میں ہے یہ بات کہ آج میں اس کو گھر سے نکال رہا ہوں اور کل کو یہ چالیس مَن ہو کر واپس آئے گی، دونوں میں فرق ہے یا نہیں؟ یہاں چونکہ ہمیں علم ہے، اپنے تجربے کے طور پر اس کا نتیجہ معلوم ہے اس لیے ہم اس کو خوشی سے برداشت کرلیتے ہیں، اور چور جو اُٹھا کے لے جاتے ہیں ہم سمجھتے ہیں کہ ان کا ہماری طرف کوئی نفع عود کرنے والا نہیں، جس کی وجہ سے ہم اس کو حقیقتاً نقصان سمجھتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو مسلمانوں پر آفتیں آتی ہیں یا مصیبتیں آتی ہیں ان کا بسا اوقات یہی پہلو ہوتا ہے کہ تھوڑی سی تکلیف میں مبتلا کر کے اس کے فوائد بہت سامنے آتے ہیں جس کی بنا پر وہ مصیبت حقیقت میں مصیبت نہیں رہتی۔ اسی طرح سے بچوں پر جو واقعات پیش آتے ہیں تو بچوں کو بھی اتنا عقل اور شعور نہیں ہوتا، وہ بھی ان کے ماں باپ کے لئے اصل کے اعتبار سے تکلیف اور مصیبت ہوتی ہے، اور اس کے ذریعے سے ان کے درجات بلند ہوتے ہیں، ان کے گناہ معاف ہوتے ہیں...... ! تو یہ دو لفظ بڑھانے کے ساتھ اس اِشکال کو حل کردیا گیا، یا تو خطاب گناہ گاروں کو ہے، مؤمنین، صالحین، معصومین کو یہ خطاب ہی نہیں، یعنی مشرکینِ مکہ جو اس قرآنِ کریم کے نزول کے بعد اس کی مخالفت کی بنا پر مصیبتوں میں مبتلا ہوئے تو انہیں بتایا جارہا ہے کہ یہ تمہارے کردار کا نتیجہ ہے، اور ان کی مصیبتیں واقعی ان کی بداعمالیوں کی نتیجے میں ہی تھیں، یا مصیبت سے حقیقتاً مصیبت مراد لے لیجئے پھر

(۱) ترمذی ج۲ ص۶۶ باب ما جاء فی ذھاب البصر / مشکوٰۃ ۱/ ۱۳۷ باب عیادۃ المریض فصل ثانی کا آخر، عن جابر۔

کُمۡ کو عام بھی رکھ سکتے ہیں کہ حقیقتاً مصیبت جب بھی تمہیں آئے گی تمہاری کسی بدکرداری کے نتیجے میں آئے گی، باقی ایسا اوقات صورت مصیبت کی ہوتی ہے حقیقت کے اعتبار سے وہ اللہ کا انعام ہوتا ہے، اس کو یہاں ذکر کرنا مقصود نہیں ہے، دونوں طرح سے اس اِشکال کو اُٹھایا جاسکتا ہے۔

اللہ کی طرف سے درگزر زیادہ، اور گرفت کم ہوتی ہے

وَيَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ: کثیر: سے مراد ہے: مَا كَسَبَتۡ میں سے کثیر، مَا كَسَبَتۡ میں سے بہت سے کاموں سے اللہ تعالیٰ درگزر ہی فرماجاتا ہے، ورنہ اگر ہر ہر حرکت پر تمہیں پکڑنا شروع کردے، تمہاری ہر غلطی کے اُوپر گرفت ہوجائے تو تم تو ایک لمحہ زندہ نہیں رہ سکتے، اور تمہارے اپنے اندر اتنی طاقت اور قوت نہیں ہے کہ تم اللہ کی گرفت کا مقابلہ کرسکو، تو جس سے معلوم یہ ہوا کہ جس طرح سے اللہ کا فضل بے پایاں ہے اور رحمت وسیع ہے، وہ تو اللہ تعالیٰ ہر کسی کو دیتے ہیں اور بہت وسعت کے ساتھ دیتے ہیں، چاہے ظاہری اسباب اس کے نہ پائے جائیں، بلا اسباب بھی دیتے ہیں، مصیبت میں بھی اللہ تعالیٰ کا رحم بایں معنی غالب ہے کہ انسان کئی بدکرداریاں کرتا ہے، اللہ تعالیٰ پہلے درگزر کرتے ہیں، ڈھیل دیتے ہیں، اور جس وقت انسان حد سے ہی بڑھ جاتا ہے تو پھر اس کے اُوپر گرفت ہوتی ہے، تو گویا کہ گرفت کم ہے اور درگزر کرنا زیادہ ہے۔

ایک عجیب واقعہ

واقعات میں ایک واقعہ لکھا ہے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے چوری کے الزام میں ایک شخص پکڑا ہوا آگیا، اور چوری اس پر ثابت ہوگئی، قاعدے کے مطابق اس کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا گیا، اس نے آگے سے اِلحاح اور زاری کرتے ہوئے کہا کہ جی! مجھے اب معاف کردیا جائے، یہ پہلا موقع ہے، اور میں آئندہ چوری نہیں کروں گا، یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے چوری کی اور میں پکڑا گیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ تم غلط کہتے ہو، ایسا تو ہوتا ہی نہیں کہ انسان پہلا گناہ کرے اور پہلے گناہ میں دھرلیا جائے، تُو عادی چور ہے، کتنی ساری چوریاں تُو نے کی ہوں گی جو چھپی رہیں، اللہ تعالیٰ نے درگزر کیا، لیکن جب تُو باز نہیں آیا اور بالکل ڈھٹائی پہ اُتر آیا تو آخر اللہ کی گرفت میں آگیا، اور پھر انہوں نے یہ آیت پڑھی کہ اللہ تو کہتے ہیں: يَعۡفُوۡا عَنۡ كَثِيۡرٍ، کہ تمہارے بہت سارے کاموں سے تو اللہ درگزر کرتا ہے، جب تم حد سے بڑھنے لگ جاؤ تو اللہ تعالیٰ تب تمہیں پکڑتا ہے، چنانچہ جب تحقیقات کی گئیں تو اور بھی کئی چوریاں اس کے ذِمّے ثابت ہوئیں اور وہ واقعی عادی چور معلوم ہوا۔[1] تو ہوتا واقعی اسی طرح سے ہے، آپ اپنی زندگی کے اندر بھی غور کرکے دیکھیں، جو شخص بھی کسی بُری حرکت کا عادی ہوجائے، ایسا نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ پردہ داری فرماتے ہیں، واقعات میں بہت سارے واقعات ایسے ہیں جو چھپے رہ جاتے ہیں، لیکن جب انسان بالکل ہی حد سے بڑھ جاتا ہے تو پردہ پھر ہی چاک ہوتا ہے، اور جس وقت اس قسم کی رُسوائی پیش آتی ہے تو یہ دلیل ہوتی ہے کہ اس کے پیچھے یہ عادت کے طور پر جرم کرتا ہے، یہ نہیں کہ یہ پہلا واقعہ

(۱) سنن کبریٰ بیہقی، ۲۷۶/۸، باب ما جاء فی الاقرار بالسرقة. إنَّ عُمَرَ أُتِيَ بِسَارِقٍ فَقَالَ: مَا سَرَقۡتُ قَطُّ قَبۡلَهَا. فَقَالَ: كَذَبۡتَ مَا كَانَ اللهُ لِيُسۡلِمَ عَبۡدًا عِنۡدَ أَوَّلِ ذَنۡبِهِ.

تھا جس کی بنا پر گرفت ہوگئی، یَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ سے اِدھر اشارہ ہے۔ ”اور تم عاجز کرنے والے نہیں ہو زمین میں“ یعنی اللہ تعالیٰ تمہیں ہر ہر بات پر پکڑنا چاہے، سزا دینا چاہے تو تم اس کو ہرا نہیں سکتے، تم عاجز نہیں کر سکتے، ”نہ تمہارے لیے اللہ کے علاوہ کوئی یار ہے نہ مددگار“ کوئی تمہارا کارساز نہیں، یہ اللہ کی رحمت ہے کہ تمہاری بہت ساری غلطیوں سے درگزر کرتا ہے، ورنہ اگر پکڑنا شروع کرے تو بچانے والا کوئی نہیں۔

کشتیوں میں دلائلِ قدرت

وَمِنْ اٰيٰتِهِ الْجَوَارِ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ: اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانیاں میں سے ہیں، الجوار جاریہ کی جمع ہے، اور اس سے مراد ہے چلنے والی کشتی، ”اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں کشتیاں سمندر میں“ الاعلام عَلَمٌ کی جمع ہے، ”پہاڑوں کی طرح“ پہاڑوں کی طرح کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح سے ہموار زمین میں پہاڑ یا ٹیلہ اُوپر کو اٹھا ہوا ہوتا ہے تو اسی طرح سے سمندر کی سطح کے اُوپر کشتیاں جو چلتی ہیں تو وہ بھی اسی طرح سے اُوپر کو اُٹھی ہوئی ہوتی ہیں، میدانی علاقوں میں پہاڑ نمایاں معلوم ہوتے ہیں اور سمندر کی سطح کے اُوپر کشتیاں، آپ سمندر کے کنارے پر کھڑے ہوں تو دُور تک دیکھیں گے تو جہاں جہاں جہاز کھڑا ہوتا ہے وہ اس طرح سے اُوپر کو اُٹھا ہوا معلوم ہوتا ہے جس طرح سے زمین کے اندر بڑے بڑے ٹیلے اور بڑے بڑے پہاڑ نظر آتے ہیں، ”اس کی نشانیوں میں سے ہیں چلنے والی کشتیاں سمندر میں پہاڑوں کی طرح“ یعنی پہاڑوں کی طرح اُوپر اُٹھی ہوئی، اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ: اگر اللہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرا دے، فَيَظْلَلْنَ رَوَاكِدَ عَلٰى ظَهْرِهٖ: پھر ہو جائیں گی وہ کشتیاں ٹھہرنے والی سمندر کی پشت پر، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّكُلِّ صَبَّارٍ شَكُوْرٍ: اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو صبر کرنے والے ہیں شکر کرنے والے ہیں۔ اِنْ يَّشَاْ يُسْكِنِ الرِّيْحَ جس زمانے میں یہ بات کہی جارہی ہے اُس زمانے میں کشتیوں کی آمد و رفت ہوا کے ذریعے سے ہوتی تھی، بادبانی کشتیاں ہوتی تھیں، اور وہ لوگ سمندروں کے طویل وعریض سفر انہی کشتیوں میں طے کرتے تھے اور ہوا کے ذریعے سے کرتے تھے، تو ہوا کا چلنا، موافق چلنا، نرم ہوا کا چلنا، یہ ایک بہت بڑی نعمت تھی جس کے ساتھ ان لوگوں کے سفر طے ہوتے تھے، سمندر کے ایک کنارے سے دُوسرے کنارے کی طرف جانا، وہاں سے سامانِ تجارت لانا، رزق کا سامان وہاں پہنچانا، اُس وقت یہ سلسلہ تھا، اور اس کا دارومدار چونکہ ہوا پر ہی تھا اس لیے قرآنِ کریم میں اللہ تعالیٰ نے کئی جگہ ذکر کیا کہ کبھی اللہ تعالیٰ اس طرح سے ہوا بھیج دیتے ہیں جو توڑ پھوڑ کرنے والی ہوتی ہے جھکڑ ہوتے ہیں، جس کے بعد پھر سمندر میں طوفان آجاتا ہے، کشتیوں کے ڈُوبنے کے خطرے پیدا ہوجاتے ہیں، پھر دیکھو تمہارے قلب کی کیا کیفیت ہوتی ہے، اسی طرح سے یہاں یہ احسان جتلایا کہ اللہ تعالیٰ نرم ہوا، موافق ہوا چلاتے ہیں جن کے ساتھ تمہارے یہ سفر طے ہوتے ہیں، اگر اللہ چاہے تو ہوا کو بالکل ہی ٹھہرا دے، تو جہاں کشتیاں کھڑی ہوں گی وہیں کی وہیں رہ جائیں گی، نہ ہوا آئے گی، نہ کشتی کو دھکا لگائے گی، نہ کشتی چلے گی، تو یہ چیزیں اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں، ان میں غور کرنے والوں کے لئے بہت ساری باتیں ہیں، لیکن یہ وہی شخص کر سکتا ہے کہ جو صبار ہو صبر کرنے والا ہو اور شکر گزار ہو، صبر وشکر یہ تمام نیک اعمال کے لئے گویا کہ بنیاد بنتے ہیں، مستقل مزاج ہے ذرا ذرا سی تکلیف میں گھبرانے والا نہیں، شکر گزار ہے کہ اللہ کی

طرف سے جتنے اِنعامات آجائیں ان کے اُوپر وہ زیادہ تکبر میں اور فخر میں مبتلانہیں ہوتا، ان لوگوں کے عقل اور فہم ٹھیک ہوتے ہیں اور یہی اِن سے صحیح نتائج اخذ کر سکتے ہیں، اَوْ يُوْبِقْهُنَّ بِمَا كَسَبُوْا وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ: اللہ چاہے تو ہوا کو ٹھہرادے اور وہ سمندر کی کشتیاں اُوپر ٹھہری رہیں (رَوَاكِدَ رَاكِدَةٌ کی جمع ہے، اور اَوْبَقَ: ہلاک کرنا) یا ہلاک کردے ان کشتیوں کو (هُنَّ ضمیر کشتیوں کی طرف لوٹ رہی ہے مراد اہلِ کشتی ہیں) یا ہلاک کردے ان کشتی والوں کو، بِمَا كَسَبُوْا: ان کے اعمال کی وجہ سے، وَيَعْفُ عَنْ كَثِيْرٍ: اور بہت سارے عملوں سے اللہ درگزر کر جائے، ورنہ یہ جو لوگ کشتیوں میں سفر کرنے والے ہیں اللہ کے گستاخ ہیں اللہ کے نافرمان ہیں، حق دار تو اسی بات کے ہیں کہ ان کو غرق کردیا جائے ہلاک کردیا جائے، لیکن اللہ درگزر کر جاتا ہے۔

ضدی لوگوں کو تنبیہ

وَيَعْلَمَ الَّذِيْنَ يُجَادِلُوْنَ فِيْۤ اٰيٰتِنَا: وَيَعْلَمَ کا معطوف علیہ محذوف ہے، اس کا تعلق يُوْبِقْ کے ساتھ ہے، یا اللہ ان کو ہلاک کردے لِيَنْتَقِمَ وَيَعْلَمَ تا کہ اللہ ان سے انتقام لے لے اُن کی بدکرداریوں کا، اور تاکہ جان لیں وہ لوگ جو ہماری آیات میں جھگڑتے ہیں کہ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں، یعنی اگر اللہ ان کو ہلاک کرے تو ہلاک کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے انتقام لے لیا، اور جب اللہ انتقام لے لے تو یہ لوگ جو جھگڑے کرتے ہیں، آج کسی بات کو مانتے نہیں ہیں، تو ان کو پتا چل جائے گا کہ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں جب اللہ انتقام لیتا ہے۔ يُوْبِقْهُنَّ لِيَنْتَقِمَ وَيَعْلَمَ، تاکہ اللہ انتقام لے لے اور تاکہ یہ لوگ جان لیں جو اللہ کی آیات کے بارے میں جھگڑتے ہیں کہ ان کا کوئی ٹھکانا نہیں۔ مَحِيْص: ہٹنے کی جگہ۔ ہٹنے بچنے کی ان کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے، ان کو اس بات کا پتا چل جائے گا۔

نہ دُنیا کو دوام ہے، نہ سامانِ دُنیا کو!

فَمَاۤ اُوْتِيْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ وَّاَبْقٰى لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ: محنتیں اور مصیبتیں سب اللہ کی طرف سے ذکر کرنے کے بعد یہ بتایا جارہا ہے کہ آخرت کی فکر کیا کرو، دُنیا کی عیش وعشرت کوئی چیز نہیں ہے، بہت بڑی بنیادی بات ہے جو اس میں ذکر فرمائی، ''جو چیز بھی تم دیئے جاتے ہو'' یعنی دُنیا کے اندر جو چیز بھی تمہیں ملتی ہے، فَمَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا: یہ دُنیوی زندگی کا برتنے کا سامان ہے، نہ تو دُنیوی زندگی میں دوام اور نہ اس سامان کے لئے دوام، اوّل تو زندگی میں ہی یہ چیزیں انسان سے چھوٹ جاتی ہیں، مال بھی آتا ہے اور جاتا ہے، اولاد بھی ملتی ہے اور فوت ہوتی ہے، جدا ہوجاتی ہے، علیحدہ ہوجاتی ہے، صحت، جوانی جو کچھ بھی اللہ کی طرف سے ملتا ہے کوئی پائیدار چیز نہیں، یہ بھی زندگی میں زائل ہوجاتی ہیں، صحت بھی گئی، جوانی بھی گئی، قوت بھی گئی، بہت عارضی ہوا کرتی ہیں، اور مال، دولت اگر اِنسان جمع کرتا بھی ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے تو چاہے کتنا ہی جمع کرلے لیکن اگر زندگی میں وہ جدا نہ ہوا تو مر کے انسان خود اس سے جدا ہوجائے گا، بہرحال ان کے لئے دوام نہیں ہے، دُنیا فانی ہے اور دُنیا کی ہر چیز فانی ہے، یہاں کسی چیز کے لئے بقاء اور دوام نہیں ہے۔ اگر آپ غور کریں......! تو چاہے آپ تو سطحی طور پر گزر جایا کرتے ہیں، منطق کا پہلا سبق ہے: ''اَلْعَالَمُ مُتَغَيِّرٌ'' یہ پہلا مقدمہ ہے جو آپ جوڑتے ہیں، اور دُوسرا مقدمہ جوڑ لیتے ہیں کہ ''كُلُّ مُتَغَيِّرٍ

حَادِثٌ" تو نتیجہ "فَالْعَالَمُ حَادِثٌ" آپ کے نزدیک یہ معمولی سے فقرے ہیں، لیکن یہ ایک بہت ٹھوس حقیقت ہے، عالم کا تغیر بھی اس کے فانی ہونے کی دلیل ہے، یہاں کسی چیز کے لئے بقا نہیں ہے، چیزیں آتی جاتی رہتی ہیں، اس کی فنائیت کو سمجھنے کے لئے بھی اس کا تغیر ایک مشاہداتی دلیل ہے، جس میں کوئی کسی قسم کے شک کی گنجائش ہی نہیں، یہاں بھوک کو بھی دوام نہیں، رجنے کو بھی دوام نہیں، آپ کو بھوک لگی آپ نے کھالیا، بھوک ختم ہوگئی، روٹی کھالی رَج گئے، لیکن اس کو بھی دوام نہیں ہے، تھوڑی دیر کے بعد وہ بھی ختم، خوشی کو دوام نہیں، غمی کو دوام نہیں، صحت کو دوام نہیں، بیماری کو دوام نہیں، مال اور دولت کو دوام نہیں ہے، یہ جتنی چیزیں ہیں سب تغیر پذیر ہیں اور سب بدلتی رہتی ہیں، جس سے انسان کو پتا چلتا ہے کہ یہ تو سائے کی طرح ہیں کبھی اِدھر کو ڈھلیں گی کبھی اُدھر کو ڈھلیں گی، تو یہ کون سی قابلِ اعتماد چیزیں ہیں، غور کرنے کی عادت نہیں ہے ورنہ "اَلْعَالَمُ مُتَغَیِّرٌ" یہی انسان کے لئے ایک بہت بڑا سبق ہے، اگر اسی کو اچھی طرح انسان سمجھ جائے تو دُنیا کی کسی چیز پہ دِل نہیں لگا سکتا، اس کو پتا ہے کہ جب اس کی حقیقت تغیر ہے، عالم کی جس وقت حقیقت ہم نے تغیر سمجھ لی کہ یہ زوال پذیر ہے تو ہم کس چیز پہ اعتماد کریں گے کہ یہ ہمارے پاس رہ جائے گی؟ اس ضابطے سے کوئی چیز باہر تو نہیں ہے، جب آپ نے "اَلْعَالَمُ مُتَغَیِّرٌ" کہہ دیا تو دُنیا کی کوئی چیز اس ضابطے سے باہر نہیں ہے، جب کوئی چیز بھی اس ضابطے سے باہر نہیں تو کس پہ اعتماد کرو گے؟ اگر تم نے اپنی دولت کو سمجھ لیا کہ یہ دائماً ہمارے پاس رہے گی تو تم اپنے منطق کے پہلے سبق کو بھول گئے کہ "اَلْعَالَمُ مُتَغَیِّرٌ"، اسی طرح سے اگر اپنے جاہ پر، جلال پر، کاروبار پر، کسی دوسری چیز پر اگر تم نے اعتماد کرلیا کہ یہ ہم سے نہیں جائے گی، یہ ہماری ہے ہمارے پاس ہی رہے گی تو "اَلْعَالَمُ مُتَغَیِّرٌ" کا سبق آپ کو یاد نہیں ہے، ورنہ اگر یہ سبق آپ نے پڑھا ہوا ہو تو کسی چیز پر بھی دُنیا میں اعتماد نہیں کر سکتے، ہر چیز زوال پذیر ہے، رشتے دار زوال پذیر ہیں، دوست زوال پذیر ہیں، جائیداد زوال پذیر ہے، اور انسان کو جتنی اپنے طور صفت صفات حاصل ہیں وہ ساری کی ساری زوال پذیر ہیں، انسان کس پہ اعتماد کرے؟ بہت ہی عارضی سی چیز ہے، پتا نہیں کس وقت یہ ڈھلک جائے، کس وقت یہ تغیر پذیر ہو جائے، تو یہاں یہی بات کہی جارہی ہے کہ جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا (دیکھو! عموم کے ساتھ ہے) جو کچھ بھی تمہیں دیا گیا وہ دُنیوی زندگی کا برتنے کا سامان ہے، اس میں عموم آگیا، تو بعض چیزیں دُنیا میں ایسی ہیں کہ جن کے اوپر انسان اعتماد کرتا ہے، وہیں دھوکا کھاتا ہے، اور بعض چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو عام طور پر لوگ زوال پذیر سمجھتے ہیں لیکن اکثر و بیشتر اپنے حالات اور خاص طور پر کسب پر، معاش پر، مال پر، دولت پر، دوستوں پر، رشتہ داروں پر انسان کے اندر ایک اعتماد کی کیفیت ہوتی ہے، لیکن یہ چیزیں کوئی باقی رہنے والی نہیں، یہ سب دُنیوی زندگی کا برتنے کا سامان ہے۔

آخرت کی لازوال نعمتیں اور اُن کے مستحق

وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَیْرٌ وَّاَبْقٰی: جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی بہتر اور وہی زیادہ باقی رہنے والا ہے، کیفیت کے اعتبار سے دنیا کی چیزوں کے مقابلے میں بہتر بھی ہے اور دائماً بھی ہے جس میں کبھی زوال نہیں آئے گا، تو جب یہ دو چیزیں آپس میں بالمقابل ہوگئیں تو آپ سوچ لیجئے کہ حاصل کرنے کے قابل کون سی چیز ہے؟ آخرت کی نعمتیں خیر اس لیے ہیں کہ دُنیا کی کوئی نعمت کدورت سے خالی

نہیں، اگر اس میں ایک راحت کا پہلو ہوتا ہے تو دوسرا تکلیف کا پہلو بھی ساتھ ہے، لیکن آخرت کی نعمتیں ایسی ہوں گی کہ جن میں خیریت ہی خیریت ہے، ان کے اندر کوئی نقصان یا ضرر کا پہلو نہیں، اور پھر یہ عارضی ہیں، تغیر پذیر ہیں اور وہ اَبقیٰ ہیں، زیادہ باقی رہنے والی ہیں۔ اور یہ چیزیں ہیں کن کے لئے؟ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَلٰی رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ: یہ ان کے حاصل کرنے کا طریقہ بتایا جارہا ہے، کہ آخرت جو بہتر ہے اور باقی رہنے والی ہے، وہ ان لوگوں کے لئے ہے جو ایمان لائیں اور اپنے رَبّ پر بھروسا کریں، تو گویا کہ ایمان اور توکل یہ ان نعمتوں کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، ایمان تو بنیاد ہے، جس وقت تک ایمان نہیں ہوگا تو آخرت میں کسی نعمت کے حاصل ہونے کا سوال ہی نہیں، اور اللہ پہ بھروسا کرنا، کہ کارساز اسی کو سمجھو، اسی کی تعلیم پر اعتماد کرو کہ جو طریقہ وہ بتاتا ہے وہی اچھا ہے، اس کے طریقے کے مقابلے میں کسی دوسرے طریقے پہ اعتماد نہ کرو، اللہ تعالیٰ کی باتیں ہی قابلِ اعتماد ہیں، اللہ کے وعدے قابلِ اعتماد ہیں، زندگی کے اندر سہارا سمجھنے کے لئے وہی قابلِ اعتماد ہے، دُنیا میں کوئی دوسرا سہارا نہیں، جس وقت یہ باطنی خلق توکل والا آجائے گا تو اس کے بعد پھر انسان کا اطاعت کا تعلق بھی اسی اللہ کے ساتھ ہوگا، کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوگا، ''جو ایمان لاتے ہیں اور اپنے رَبّ کے اوپر بھروسا کرتے ہیں۔''

اہلِ جنّت کی صفات

آگے ان کی کچھ صفات واضح کی جارہی ہیں، وَالَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ: جو لوگ بچتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کی باتوں سے، كَبٰٓىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اس کی تفسیر سورۂ نساء میں آئی تھی کہ کبیرہ گناہ کسے کہتے ہیں، فاحشہ کو اسی میں سے علیحدہ کر کے ذِکر کر دیا، چھوٹے موٹے گناہ جن کو صغائر کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے آخرت کی کی کامیابی کا مدار ان سے بچنے پر نہیں، کیونکہ ان سے بچنا بظاہر مشکل ہے، اور وہ اللہ تعالیٰ معاف بھی ایسے ہی کر دیتے ہیں، وہ تو ایسے ہے جیسے راہ چلتے گرد وغبار پڑ گیا تو یوں کیا اور جھاڑ دیا، وضو کی برکت سے معاف ہو گئے، نماز کی برکت سے معاف ہو گئے، نیکیوں کی برکت سے معاف ہوتے رہتے ہیں، جو قابلِ گرفت ہیں وہ بڑے بڑے گناہ ہیں اور بڑا گناہ وہی ہوتا ہے کہ جس سے اللہ نے روکا ہو، اس کے اُوپر لعنت آئی ہو یا غضب کے ساتھ وعید آئی ہو، یا نارِ جہنم کے ساتھ وعید آئی ہو، یا اس کے اندر نقصان اس قسم کا ہو جو ان گناہوں کے برابر ہوجائے جن کے اُوپر یہ وعیدیں آئی ہوئی ہیں، تو ان گناہوں کو بڑے گناہ کہا جاتا ہے، یا گناہوں کے سلسلے میں جو مقاصد کے درجے میں ہوتے ہیں وہ بڑے گناہ ہوتے ہیں، اس کی تفصیل سورۂ نساء میں آپ کے سامنے کی تھی، اور فواحش وہ ہو گئے جن کا تعلق شہوانی گناہوں کے ساتھ ہے بے حیائی، زنا اور اس کے مقدمات یہ فواحش میں داخل ہوں گے، ''جو بچتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے'' وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ یَغْفِرُوْنَ: اور جس وقت غصے میں آجاتے ہیں تو معاف کر دیتے ہیں، یہ بھی ان مؤمنین کی بات ہے، یعنی اُن کا بندوں کے ساتھ معاملہ عفو کرم اور درگزر کا ہوتا ہے، پکڑ دھکڑ اور ہر وقت اپنے غصّے کو جاری کرنا یہ ان کا کام نہیں ہوا کرتا، یہ جنّت کی نعمتیں ان لوگوں کو حاصل ہوں گی جن میں یہ صفت بھی ہو کہ جب ان کو غصہ آجائے تو درگزر

کر جائیں معاف کر دیں، وَالَّذِیْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّہِمْ: اور وہ لوگ جو کہ اپنے رَبّ کی بات کو قبول کرتے ہیں، وَ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ: خصوصیت سے نماز کو ذکر کر دیا، ''اور نماز کو قائم کرتے ہیں'' اللہ کی عبادت کرتے ہیں، نماز کو قائم کرتے ہیں۔

مشورے کی اہمیت وفوائد

وَاَمْرُہُمْ شُوْرٰی بَیْنَہُمْ: یہ آپس میں معاملات طے کرنے کا ایک طریقہ آ گیا، ''اور ان کا معاملہ آپس میں مشورے سے ہوتا ہے۔'' شُوْرٰی مصدر ہے، اس کے اُوپر ذُو کا لفظ محذوف مانیں گے، اَمْرُہُمْ ذُوْ شُوْرٰی، ان کا کام آپس میں مشورے سے ہوتا ہے، مشورہ ذاتی اُمور میں بھی لیا جاتا ہے اور اجتماعی اُمور میں بھی، ذاتی اُمور میں مشورہ لینا بہتر ہے اور عقل مندی ہے، کہ انسان اپنا ذاتی کام کرنے لگے تو دوسرے سے پوچھ لے کہ میں کس طرح سے کروں؟ کروں یا نہ کروں؟ ''مَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ''(۱) جو کام مشورے سے کرتا ہے کبھی شرمسار نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان ایک کام کرنے لگتا ہے، اپنے عقل اور فہم کے مطابق اس کی ایک تدبیر کرتا ہے، چونکہ انسان کا علم ناقص ہے تو بعض پہلو انسان سے مخفی رہ سکتے ہیں، جن کے سامنے نہ ہونے کی بنا پر وہ کام صحیح نہیں کرے گا، نتیجہ غلط نکل آئے گا، اور سمجھ دار آدمیوں سے اگر بات کر لی جائے، ان سے پوچھ لیا جائے تو ہوسکتا ہے کہ بعض پہلو آپ کے سامنے ہیں، بعض پہلو وہ آپ کے سامنے نمایاں کر دیں گے، تو سارے پہلو سامنے آ جانے کے بعد کام کرنا آسان ہو جائے گا، اچھے طریقے سے آپ سرانجام دے لیں گے، اس کو پورا کر لیں گے۔ تو ذاتی اُمور میں بھی مشورہ کر لینا بہتر ہوتا ہے، کہ دوسرے سے بات کر لو، بات کرنے کے بعد، مشورہ کر کے پھر آگے کام کرو۔ اور جس سے مشورہ لیا جائے چونکہ اس سے کام کے متعلق پوچھنا ہے تو اس کا بھی سمجھ دار ہونا ضروری ہے، جو اس کام کے متعلق بصیرت رکھتا ہو، پھر اس کا دیانت دار ہونا بھی ضروری ہے جس سے مشورہ لیا جائے، کیونکہ جب آپ اس سے پوچھیں گے تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ'' جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین سمجھا ہوا ہوتا ہے۔(۲) جو بات صحیح اس کے دِل میں آئے وہ بتائی تو اس نے امانت ادا کر دی، اور اگر دِل میں تو وہ سمجھتا ہے کہ کام یوں کرنا بہتر ہے، لیکن آپ کو دھوکے میں ڈال دیتا ہے، کہتا ہے نہیں! یوں نہ کرو، یوں کرو، غلط بیانی کر دیتا ہے، آپ کو جان بوجھ کر مشورہ غلط دیتا ہے، اس کے دِل میں تو کوئی اور بات آتی ہے، اور اَدا کوئی دوسری کر دیتا ہے، یہ خیانت ہے، تو دیانت دار آدمی مشورہ صحیح دے گا اور خائن آدمی مشورہ صحیح نہیں دے گا، بلکہ آپ کو کسی غلط راستے پہ ڈال کے نقصان پہنچا دے گا، اس لیے نیک آدمی، دیانت دار آدمی، سمجھ دار آدمی سے مشورہ کرنا چاہیے۔ تو شخصی اُمور میں اور ذاتی اُمور میں مشورہ کیا جائے یہ بھی بہتر ہے، اور اجتماعی اُمور تو مشورے کے ساتھ ہی طے کرنے چاہئیں تا کہ ہر کسی کا حق ادا ہو، اور اس مشترکہ اجتماعی اُمور کے اندر ایک شخصی رائے کو نافذ کرنا اس میں دوسرے لوگوں کی حق تلفی ہوتی ہے۔ یہاں بھی وہی بات ہے کہ سمجھ دار آدمیوں کو اکٹھا کرو، سمجھ دار آدمیوں کو اکٹھا کرنے کے بعد، ان میں سے ہر ایک کو یہ حق دو کہ اپنے دِل کی بات کہے، یہ نہ ہو کہ عنوان تو رکھا ہے کہ ''مجلسِ شوریٰ''

---

(۱) معجم صغیر، رقم الحدیث: ۹۸۰ / معجم اوسط، رقم الحدیث: ۶۶۲۷۔ ولفظ الحدیث: مَا خَابَ مَنِ اسْتَخَارَ وَلَا نَدِمَ مَنِ اسْتَشَارَ۔
(۲) ترمذی ۱۰۹/۲ باب ان المستشار مؤتمن۔ مشکوٰۃ ۴۳۰/۲ باب الحذر والتانی فی الامور فصل ثانی۔

بنالی اور کسی کو حاکم کی مرضی کے خلاف بولنے کی اجازت نہ ہو، جو مرضی کے خلاف بولا بس اسی کا رگڑا نکال دیا جائے، تو پھر مشورے کی حقیقت فوت ہو جاتی ہے، چاہے اس کی صورت باقی ہو۔ ہر شخص اپنے دل کی بات کہے جو اس کے دل میں ہے، اور پھر جو طے ہو جائے، اجتماعی طور پر طے ہو جائے یا اکثریت کے مشورے کے ساتھ طے ہو جائے، پھر اس کے مطابق کام کیا جائے، اسی میں خیر اور برکت ہوتی ہے۔ اسی لیے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ''اِذَا کَانَ اُمَرَاؤُکُمْ خِیَارَکُمْ'' جس وقت تمہارے اُمراء، تمہارے حاکم، تم میں سے بہترین لوگ ہوں، ''وَاَغْنِیَاؤُکُمْ سُمَحَاءَکُمْ'' اور تم میں سے دولت مند طبقہ سخی ہو، بخیل نہ ہو، ''وَاُمُوْرُکُمْ شُوْرٰی بَیْنَکُمْ'' اور تمہارے معاملات آپس میں مشورے سے طے ہوتے ہوں، ''فَظَهْرُ الْاَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ بَطْنِهَا'' اس وقت تمہارے لئے زمین کا ظاہر اس کے بطن سے بہتر ہے، یعنی ایسے دور میں زندگی بہتر ہے موت سے، جس وقت یہ تین باتیں ہوں کہ حاکم اچھے لوگ ہیں، اور مال دولت والے خزانے کے سانپ نہیں بلکہ اس مال دولت کو خرچ کرتے ہیں سخی ہیں، اور معاملات مشورے سے طے ہوتے ہیں، تو خیر و برکت ہی ہوگی ہر وقت، ایسے وقت میں زندگی موت کے مقابلے میں بہتر ہے۔ لیکن ''اِذَا کَانَ اُمَرَاؤُکُمْ شِرَارَکُمْ'' جب تمہارے حاکم تم میں سے بدترین قسم کے لوگ ہو جائیں، ''وَاَغْنِیَاؤُکُمْ بُخَلَاءَکُمْ'' اور تمہارے مال دار لوگ تم میں سے بخیل بن جائیں، ''وَاُمُوْرُکُمْ اِلٰی نِسَائِکُمْ'' اور تمہارے کام عورتوں کے سپرد ہو جائیں، کہ بیوی کے مشورے کے بغیر چل ہی نہیں سکتے، بس جو کہے وہی کرنا ہے نہ خود اپنی عقل سے کام لینا ہے، نہ کسی دوسرے بھائی سے پوچھنا ہے، ''فَبَطْنُ الْاَرْضِ خَیْرٌ لَّکُمْ مِنْ ظَهْرِهَا''(۱) تو ایسے موقع پر پھر زمین کا بطن تمہارے لیے زمین کے ظاہر سے بہتر ہے، یعنی ایسے زمانے میں زندگی کے مقابلے میں موت بہتر ہے، وہ زندگی کوئی زندگی نہیں جس وقت کہ یہ اُمور ہو جائیں کہ حاکم بدترین ہو گئے، دولت مند بخیل ہو گئے اور معاملات پر عورتیں مسلط ہو گئیں، ایسے وقت میں موت بہتر ہے اس زندگی سے، زندگی موت سے بدتر ہے، تو مشورے کے ساتھ جب کام کیے جاتے ہیں تو اس میں خیر و برکت ہوتی ہے۔

مشورہ کن باتوں میں ہے؟

لیکن مشورہ لینا کن باتوں میں ہے؟ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے منصوص نہیں، جو بات منصوص ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کے طور پر عائد ہے اس میں مشورہ نہیں کیا جایا کرتا، اب آپ بیٹھ کے مشورہ کرنے لگ جائیں کہ نماز آج پڑھنی ہے کہ نہیں پڑھنی، اس دفعہ رمضان شریف میں روزے رکھنے ہیں کہ نہیں رکھنے، ان باتوں کے اندر مشورے نہیں ہوا کرتے، جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے طے شدہ بات ہے اس کے اوپر تو اسی طرح سے عمل کرنا ہے، وہاں مشورے کی کوئی بات نہیں، ہاں! جس طرح سے حج آپ نے کرنا ہے تو یہ مشورہ کر لیں کہ کون سے ساتھی اختیار کریں، ہوائی جہاز میں درخواست دیں یا سمندری جہاز میں دیں، ان چیزوں میں مشورہ کیا جا سکتا ہے، تو منصوص اُمور کے اندر مشورہ نہیں ہوتا۔

(۱) ترمذی ۲/ ۵۲، ابواب الرؤیا سے کچھ پہلے۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۵۹، باب تغیر الناس، فصل ثانی۔

حقیقتِ جمہوریت

مشورے کے بعد پھر سب کا اتفاق ہو جائے یا اکثریت کے طور پر جو اُصول طے ہو جائے پھر اس کے مطابق انسان کو کام کرنا چاہیے۔ لیکن اس میں بنیاد اس بات پہ ہے کہ مشورہ دینے والے دیانت دار اور سمجھ دار ہوں۔ اور جس طرح سے آج کل یہ اسمبلیاں بن جاتی ہیں، لوگ دھاندلی کے ساتھ، دھونس کے ساتھ، مال کے ساتھ ووٹ خرید کے، برادریوں کے چکر سے چلے جاتے ہیں، یہ تو سارے کے سارے جاہل اکٹھے ہوتے ہیں، جو نہ سمجھ دار ہوتے ہیں، نہ ان کو کوئی عقل ہوتی ہے، نہ سمجھ، نہ بوجھ، ایسے لوگوں کا مشورہ کوئی شرعی حیثیت نہیں رکھتا، اس لئے اسمبلی جو کچھ پاس کردے اس کی حیثیت وہ نہیں ہے، کیونکہ وہ لوگ سارے کے سارے ایسے ہوتے ہیں جو اپنے زور کے ساتھ، اثر کے ساتھ، مال کے ساتھ ووٹ خرید کے، دھاندلی کے ساتھ کامیاب ہو کے جاتے ہیں، تو یہ تو سارے کا سارا فراڈ ہی ہے جو آج کل کی ''جمہوریت'' میں چلتا ہے، سمجھ دار آدمی اگر ایک بھی ہو تو اس کے مقابلے میں اس قسم کے سو آدمی بھی ہوں، تو اِس ایک آدمی کی رائے کو ترجیح دی جائے گی جس کی رائے کسی دلیل پر مبنی ہے اور وہ اس معاملے میں سمجھ رکھتا ہے، اسی لیے تو علامہ اقبالؒ کہتے ہیں:

گریز از طرزِ جمہوری، غلامِ پختہ کاری شو کہ از مغزِ دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید(۱)

جمہوری طرز سے بھاگو اور پختہ رائے کی غلامی اختیار کرو، ایک انسان کا خیال دو سو گدھے کے دماغ میں نہیں آ سکتا۔ ایک طرف دو سو گدھا ہو اور ایک طرف ایک انسان ہو، تو اِنسان کی فکر دو سو گدھے کے دماغ میں نہیں آ سکتی، تو اگر صرف گنتی ہی کرنی ہو کہ اِدھر آدمی زیادہ ہیں اور اُدھر کم ہیں تو ایک طرف اِمام غزالی رحمۃ اللہ علیہ ہو، اور اس کے مقابلے چار سو گدھے چرانے والے بیٹھے ہوں......! تو اِمام غزالی کی ایک ہی رائے چار سو پہ فائق ہے۔ اور آج کی ''جمہوریت'' میں تو بس ہاتھ گنے جاتے ہیں، آدمیوں کا وزن نہیں کیا جاتا، کہ اس میں سے رائے وزنی کس کی ہے؟ کس کی نہیں؟ یہی وجہ ہے کہ آئے دِن اس کے نتائج خطرناک قسم کے سامنے آتے ہیں۔ تو یہاں جو ''اسلامی مجلسِ شوریٰ'' ہوتی ہے وہ سمجھ دار لوگوں کی ہوتی ہے جو دِین و دُنیا میں مہارت رکھنے والے ہیں، قرآن و حدیث کے ماہر ہیں ان کی رائے جو ہوگی وہ اکثر و بیشتر ایسی ہوگی کہ ''مَا رَآى الْمُسْلِمُوْنَ حَسَنًا فَهُوَ عِنْدَ اللهِ حَسَنٌ ''(۲) کہ اس قسم کے مؤمن اکٹھے ہو کے اگر کسی بات کو اچھا قرار دے دیتے ہیں تو اللہ کے نزدیک بھی وہ اچھی ہوتی ہے، اسی میں پھر خیر و برکت ہوتی ہے۔

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ یہ بھی ان کی صفت ہوگئی کہ جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے وہ اس کو خرچ کرتے ہیں، جن کے لئے جنّت کی نعمتیں ہیں ان کی ایک صفت یہ بھی ہوگئی۔

(۱) ''پیامِ مشرق'' بعنوان: ''جمہوریت''۔

(۲) فضائل الصحابۃ لابن حنبل ۱/ ۳۶۷، رقم: ۵۴۱/ مسند احمد، رقم: ۳۶۰۰/ مستدرک حاکم ۳/ ۷۸، رقم: ۴۴۶۵۔

بدلہ لینے کی اجازت اور اس کی حدود

وَالَّذِیْنَ اِذَآ اَصَابَهُمُ الْبَغْیُ: اور وہ لوگ کہ جب ان پر کوئی ظلم ہو جاتا ہے، جب ان کو کوئی ظلم پہنچ جاتا ہے، هُمْ یَنْتَصِرُوْنَ: تو بدلہ لیتے ہیں، یہ بھی مؤمنین کی ایک صفت ہے، مطلب یہ ہے کہ مؤمنین کے لئے ہمیشہ معاف کرنا ہی ضروری نہیں کہ مؤمن کامل وہ ہوتا ہے جو ہمیشہ معاف ہی کرتا رہے، بلکہ مؤمن کامل کے لئے اس بات کی بھی اجازت ہے کہ اگر اس کو کوئی ظلم پہنچے تو وہ بدلہ بھی لے سکتا ہے، کیونکہ دونوں باتوں میں مصلحت ہوتی ہے، کسی وقت معاف کرنے سے حالات دُرست ہوتے ہیں، کسی وقت بدلہ لینے سے اور سَر کُوٹنے سے حالات دُرست ہوتے ہیں، جیسا موقع ہو ویسا کرلیا جائے، یعنی ہر وقت مؤمن دوسرے کے لئے ایک تر نوالہ اور سبز چارہ نہیں ہوتا کہ جو چاہے اس کو نگل جائے، جو چاہے چبا جائے، کمزوروں کے سامنے، اپنے ماتحتوں کے سامنے، چھوٹوں کے سامنے تو اِنسان کو نرم ہونا چاہیے، ان کی غلطیوں کو تو اِنسان معاف کرے، لیکن اگر کوئی متکبر، کوئی ظالم ظلم کرتا ہے اور تکبّر کے طور پر نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا ہے تو ایسے لوگوں کے سامنے مؤمن کو لوہے کا چنا بننا چاہیے کہ چبانے والے کا جبڑا تو ٹوٹ جائے لیکن چبایا نہ جائے، ایمان کا یہ بھی ایک تقاضا ہوتا ہے! تو اس لیے ہمیشہ معاف کرنا ہی ضروری نہیں، بلکہ بدلہ لینے کی اجازت بھی دے دی گئی کہ جب ان کو کوئی ظلم پہنچتا ہے تو وہ بدلہ لیتے ہیں۔ اس میں بدلہ لینے کا جواز مذکور ہے، لیکن اس میں ایک ضابطہ بتا دیا گیا کہ وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا: بُرائی کا بدلہ بُرائی کے برابر ہے، بدلہ لیتے وقت تجاوز نہیں کرنا چاہیے، جتنا نقصان اس نے تمہیں پہنچایا ہے اتنا سا تم اس سے انتقام لے سکتے ہو، بشرطیکہ وہ چیز فی حد ذاتہٖ معصیت نہ ہو، اور جو چیز فی حد ذاتہٖ معصیت ہو، وہاں بدلہ بالمثل نہیں ہوا کرتا، یعنی اگر ایک آدمی نے آپ کی ماں کو گالی نکالی ہے تو بدلہ لینے کا یہ مطلب نہیں کہ تم اس کی ماں کو گالی نکال دو، یا اگر ایک آدمی نے کسی کے خاندان میں کسی عورت کی عزّت کو ہاتھ ڈالا ہے تو اس کا بدلہ لینے کا یہ طریقہ نہیں کہ تم اس کے خاندان کی عزّت کو ہاتھ ڈال لو اور ان کی لڑکیوں کو ہاتھ ڈال دو، یہ فی حد ذاتہٖ معصیت ہیں، جو گناہ ہیں، ان میں جو اِنتقام لیا جاتا ہے وہ بالمثل نہیں ہوتا، وہاں پھر انسان شریعت کے ضابطے کے تحت دیکھ لیتا ہے کہ ایسا کرنے والے کو کیا سزا دی جاسکتی ہے؟ شرعی ضابطے کے تحت جو سزا ہو وہ دی جائے، پھر ایسی صورت میں بدلہ بالمثل نہیں ہوتا، ہاں! البتہ اگر آپ کے کسی نے تھپڑ لگا دیا تو اِنتقام آپ اُسی صورت میں لے سکتے ہیں کہ اس کے ایک تھپڑ لگا دیں، کسی نے کوئی مالی نقصان آپ کو پہنچا دیا تو آپ انتقام لے سکتے ہیں کہ اتنی ضمان اس سے لے لیں، یہ ہے ضابطہ! اور اگر اس نے کوئی ایسا کام کیا ہے جو معصیت ہے، کسی نے آپ کے بیٹے کو قتل کر دیا تو آپ کے لئے یہ جائز نہیں کہ آپ اس کے بیٹے کو قتل کریں، یہاں پھر عقل و ہوش کے ساتھ قاتل کو پکڑا جائے گا، قاتل کو سزا دی جائے گی۔

وَجَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا: بُرائی کا بدلہ بُرائی ہے اس کے برابر، فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ: جو کوئی معاف کردے اور حالات کو دُرست کرلے، یعنی آپس میں صلح کرلیں حالات کو ٹھیک کرلیں، فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ: اس کا اجر اللہ کے ذمّے ہے، اِنَّهٗ لَا یُحِبُّ الظّٰلِمِیْنَ: بے شک وہ اللہ تعالیٰ ظالموں کو پسند نہیں کرتا، وَلَمَنِ انْتَصَرَ: اور جو شخص بدلہ لے لے بَعْدَ ظُلْمِهٖ: اپنے مظلوم ہونے کے بعد، بعد اس کے کہ اس پہ ظلم کیا گیا، ظلم مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہے، فَاُولٰٓئِكَ مَا عَلَیْهِمْ مِّنْ سَبِیْلٍ: ان لوگوں پہ کوئی الزام نہیں ہے، اگر کوئی مظلوم ہونے کے بعد بدلہ لیتا ہے تو اللہ کی طرف سے اس پہ کوئی الزام نہیں، بشرطیکہ بدلہ برابر سرابر ہونا چاہیے، اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَى

الَّذِیۡنَ یَظۡلِمُوۡنَ النَّاسَ: اِلزام تو ان لوگوں پر ہے جو لوگوں پہ ظلم کرتے ہیں، وَ یَبۡغُوۡنَ فِی الۡاَرۡضِ بِغَیۡرِ الۡحَقِّ: اور زمین کے اندر ناحق سرکشی اختیار کرتے ہیں، اُولٰٓئِکَ لَهُمۡ عَذَابٌ اَلِیۡمٌ: ان کے لئے دردناک عذاب ہے، یعنی ظلم پہنچنے کے بعد برابر سرابر بدلہ لیا جائے تو اس شخص پر کوئی اِلزام نہیں، البتہ جو ظالم ہیں، چاہے کسی پر ابتداءً ظلم کریں، اور چاہے انتقام لیتے ہوئے حد سے بڑھ جائیں، یہ دونوں صورتوں میں ظالم ہیں، ان پر اللہ کی طرف سے الزام ہے، اللہ تعالیٰ ان کو سزا دے گا، ابتداءً ظلم کرنے والوں کو بھی اور انتقام کے طور پر حد سے بڑھ جانے والوں کو بھی، دونوں ہی ظالم کا مصداق ہیں۔ وَلَمَنۡ صَبَرَ وَ غَفَرَ: البتہ جو شخص صبر کرلے اور معاف کردے اِنَّ ذٰلِکَ لَمِنۡ عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ: عَزۡمِ الۡاُمُوۡرِ کا معنی ہوتا ہے مِنَ الۡاُمُوۡرِ الۡمَعۡزُوۡمَۃِ اُن کاموں میں سے ہیں جن کا عزم کرنا چاہیے، جس کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ ہمت کے کاموں میں سے ہیں، ان کاموں میں سے ہیں جن کا عزم انسان کو کرنا چاہیے، پختہ کاموں میں سے ہیں، "البتہ یہ بات ہمت کے کاموں میں سے ہے، ان کاموں میں سے ہے جن کا انسان کو عزم کرنا چاہیے" اگر کوئی معاف کردے۔

معاف کرنے کی فضیلت

تو ساری آیات کا آپ کے سامنے جو مفہوم گزرا اس میں حاصل یہی ہے کہ حتی الوسع تو کوشش یہی کرنی چاہیے کہ اگر کسی کے برتاؤ سے غصہ آجائے تو اس سے درگزر کیا جائے، لیکن اگر کوئی موقع محل ایسا ہے کہ درگزر کرنے کے ساتھ شرار اور پھیلتا ہے، کوئی شخص ظالم ہے متکبر ہے، وہ آپ کو تکلیف پہنچاتا ہے، اور آپ اگر درگزر کریں گے تو آپ کی اس نرم خوئی کو، کرم کو، اور آپ کی اس خوش اخلاقی کو وہ آپ کی کمزوری سمجھتا ہے، اور اس کو کمزوری سمجھ کر آئے دن اس کی زیادتی میں اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے، تو ایسے شخص سے درگزر کرنے کی بجائے اس سے انتقام لے لینا چاہیے، جب اس سے انتقام لیا جائے گا تو شر دفع ہوجائے گا، لیکن انتقام لینے میں بھی غصے میں انسان بے لگام نہ ہوجائے، بلکہ کوشش یہ کرے کہ جتنا سا نقصان اس نے پہنچایا ہے اس کے برابر سرابر ہی انتقام لے، جیسا برتاؤ اس نے کیا ہے ویسا کرے، بشرطیکہ وہ برتاؤ فی حد ذاتہٖ معصیت نہ ہو۔ لیکن اس کے باوجود بھی اگلے الفاظ یہی بتاتے ہیں کہ حتی الوسع معاف کردینا ہی بہتر ہے، تو معافی کو ترجیح ہے اور انتقام لینا چاہیے بصورتِ مجبوری جس کے بغیر انسان سمجھتا ہے کہ حالات دُرست نہیں ہوسکتے، جہاں انسان کو غور وفکر کرنے کے بعد جذبات سے خالی ہو کر سوچنے کے بعد یہ بات سامنے آجائے کہ جس وقت تک اس ظالم کا سر نہ کوٹا گیا، یا اس کا ہاتھ نہ مروڑا گیا، اس وقت تک یہ ظلم سے باز نہیں آئے گا، اور ہمارے معاف کرنے کے ساتھ یہ اور سرکش ہوتا ہے، تو ایسے وقت میں یہ فیصلہ دیا جاسکتا ہے کہ انتقام لینا بہتر ہے، مؤمن کی یہ دونوں شانیں ہیں اللہ کے پیارے بندوں کی، کہ وہ معاف بھی کرتے ہیں، ذاتی حقوق ہوں یا دوسری کسی قسم کی شرارت ہو، جہاں تک ہوسکے درگزر بھی کرتے ہیں لیکن ایسے نہیں کہ وہ درگزر ہی کرنا جانتے ہیں، بلکہ اگر موقع مناسب سمجھتے ہیں تو انتقام بھی لے لیتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی بھی دونوں شانیں ہیں معاف بھی کرتا ہے اور انتقام بھی لیتا ہے، تو اللہ والوں کو بھی ان دونوں چیزوں کی اجازت دی گئی ہے، لیکن ترغیب بہرحال حتی الوسع درگزر کی ہے، حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا تھا کہ یا اللہ! تجھے اپنے بندوں میں سے سب سے اچھا بندہ کون سا لگتا ہے؟ تیرے بندوں میں سے تیرے نزدیک سب سے اچھا اور پیارا بندہ کون سا ہے؟ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مَنۡ اِذَا

فَلَدْ غَفَرَ" جو قادر ہوکر معاف کردے،(1) یعنی وہ اپنے ساتھ کی گئی زیادتی کا بدلہ لے سکتا ہے، قدرت اس کو ہے، لیکن قدرت پانے کے بعد معاف کردے، وہ بندہ مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ تو یہاں بھی آیات کا رُجحان زیادہ تر یہی ہے کہ درگزر کی ترغیب زیادہ ہے بمقابلہ انتقام کے۔

وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ وَّلِيٍّ مِّنْۢ بَعْدِهٖ ؕ وَتَرَى الظّٰلِمِيْنَ لَمَّا رَاَوُا

اور جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے اس کے لئے کوئی کارساز نہیں اللہ کے بھٹکانے کے بعد، اور دیکھے گا تو ظالموں کو جس وقت کہ عذاب کو

الْعَذَابَ يَقُوْلُوْنَ هَلْ اِلٰى مَرَدٍّ مِّنْ سَبِيْلٍ ۚ﴿۴۴﴾ وَتَرٰىهُمْ يُعْرَضُوْنَ عَلَيْهَا

دیکھیں گے، تو وہ ظالم کہیں گے کیا لوٹنے کی طرف کوئی راستہ ہے؟ ﴿۴۴﴾ دیکھے گا تُو ان کو کہ وہ پیش کئے جائیں گے اس آگ پر،

خٰشِعِيْنَ مِنَ الذُّلِّ يَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِيٍّ ؕ وَقَالَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ

دبنے والے ہوں گے ذلت کی وجہ سے، دیکھیں گے وہ چھپی نگاہ سے، کہیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے بے شک کل درجہ کے

الْخٰسِرِيْنَ الَّذِيْنَ خَسِرُوْۤا اَنْفُسَهُمْ وَاَهْلِيْهِمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ اَلَاۤ اِنَّ الظّٰلِمِيْنَ

خسارہ پانے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو اور اپنے اہل وعیال کو خسارے میں ڈال دیا قیامت کے دن، خبردار! بے شک ظالم لوگ

فِيْ عَذَابٍ مُّقِيْمٍ ﴿۴۵﴾ وَمَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ اَوْلِيَآءَ يَنْصُرُوْنَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنْ

دائمی عذاب میں ہوں گے ﴿۴۵﴾ نہیں ہوں گے ان کے لئے کوئی کارساز جو ان کی مدد کریں اللہ کے علاوہ، اور جس کو

يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَمَا لَهٗ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ﴿۴۶﴾ اِسْتَجِيْبُوْا لِرَبِّكُمْ مِّنْ قَبْلِ اَنْ يَّاْتِيَ يَوْمٌ

اللہ بھٹکا دے اس کے لئے کوئی راستہ نہیں ﴿۴۶﴾ اے لوگو! اپنے ربّ کی بات مان لو قبل اس کے کہ ایسا دن آجائے

لَّا مَرَدَّ لَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ يَّوْمَئِذٍ وَّمَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِيْرٍ ﴿۴۷﴾ فَاِنْ

جس کے لئے لوٹنا نہیں ہوگا اللہ کی جانب سے، نہ تمہارے لئے اس دن کوئی ٹھکانا ہوگا اور نہ تمہارے لئے کوئی انکار کرنے والا ہی ہوگا ﴿۴۷﴾ اگر

اَعْرَضُوْا فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ؕ اِنْ عَلَيْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ ؕ وَاِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا

یہ اعراض کرتے ہیں تو ہم نے آپ کو ان کے اُوپر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، نہیں ہے آپ کے ذمے مگر پہنچا دینا، بے شک ہم جس وقت

(1) شعب الایمان ۱۰/۵۵۰، رقم ۷۹۷۴ / مشکوٰۃ ۲/۴۳۳ باب الغضب، فصل ثالث۔

الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً فَرِحَ بِهَا ۚ وَاِنْ تُصِبْهُمْ

انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت کا مزہ، چکھاتے ہیں تو اس رحمت کی وجہ سے وہ اکڑنے لگ جاتا ہے، اور اگر ان کو کوئی بری

سَيِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْهِمْ فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ ﴿٤٨﴾ لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ

حالت پہنچتی ہے ان اعمال کی وجہ سے جو انہوں نے آگے بھیجے تو پھر انسان ناشکرا ہو جاتا ہے ﴿٤٨﴾ اللہ ہی کے لیے سلطنت ہے آسمانوں کی

وَالْاَرْضِ ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ۭ يَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ اِنَاثًا وَّيَهَبُ لِمَنْ يَّشَآءُ

اور زمین کی، پیدا کرتا رہتا ہے جو چاہتا ہے، دیتا ہے جس کو چاہتا ہے لڑکیاں ہی لڑکیاں، اور دیتا ہے جس کو چاہتا ہے

الذُّكُوْرَ ﴿٤٩﴾ اَوْ يُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّاِنَاثًا ۚ وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا ۭ اِنَّهٗ عَلِيْمٌ

لڑکے ہی لڑکے ﴿٤٩﴾ یا اللہ جوڑ دیتا ہے انہیں لڑکے اور لڑکیاں، اور کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے اولاد، بے شک اللہ تعالیٰ ہی علم والا ہے

قَدِيْرٌ ﴿٥٠﴾ وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ

اور اللہ تعالیٰ ہی قدرت والا ہے ﴿٥٠﴾ نہیں کسی انسان کے لئے کہ اللہ اس سے کلام کرے مگر از روئے وحی کے یا پردے کے پیچھے سے یا

يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ ۭ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ ﴿٥١﴾

اللہ تعالیٰ رسول بھیج دے پھر وہ وحی کرے اللہ کے اِذن کے ساتھ جو چاہے، بے شک وہ عالی شان ہے اور حکمت والا ہے ﴿٥١﴾

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا ۭ مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا

اسی طرح سے ہم نے آپ کی طرف وحی کی ایک رُوح کی یعنی اپنے حکم کی، آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے، نہ آپ

الْاِيْمَانُ وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ

جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے، لیکن اللہ نے اس کتاب کو ایک روشنی بنا دیا، ہم اس کے ذریعے سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت

مِنْ عِبَادِنَا ۭ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿٥٢﴾ۙ صِرَاطِ اللّٰهِ

دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے، بے شک آپ تو راہنمائی کرتے ہیں صراطِ مستقیم کی طرف ﴿٥٢﴾ یعنی اس اللہ کے راستے کی طرف

الَّذِيْ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ ﴿٥٣﴾ؑ

جس کے لئے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، خبردار! اللہ کی طرف ہی اُمور لوٹتے ہیں ﴿٥٣﴾

تفسیر

قیامت کے دِن ظالموں کی بدحالی

وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰہُ: اور جس کو اللہ تعالیٰ بھٹکا دے فَمَا لَہٗ مِنْ وَّلِیٍّ: اس کے لئے کوئی کارساز نہیں مِنْ بَعْدِہٖ: اللہ کے بھٹکانے کے بعد اَیْ مِنْ بَعْدِ اِضْلَالِہٖ۔ وَتَرَی الظّٰلِمِیْنَ لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ: اور دیکھے گا تو ظالموں کو جس وقت کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے یَقُوْلُوْنَ: تو وہ ظالم کہیں گے ھَلْ اِلٰی مَرَدٍّ مِّنْ سَبِیْلٍ: کیا لوٹنے کی طرف کوئی راستہ ہے؟ یعنی اب کوئی صورت ہے کہ ہمیں واپس لوٹا دیا جائے؟ مَرَدٍّ یہ مصدر میمی ہے، رَدَّ یَرُدُّ: لوٹانا۔ کیا لوٹائے جانے کی طرف کوئی راستہ ہے؟ یعنی کوئی طریقہ ہے کہ ہم واپس لوٹا دیے جائیں؟ وَتَرٰىھُمْ یُعْرَضُوْنَ عَلَیْھَا "ھا" ضمیر جہنم کی طرف لوٹ رہی ہے جس کے اُوپر لَمَّا رَاَوُا الْعَذَابَ دلالت کرتا ہے، کیونکہ یہ عذاب جو ہوگا وہ جہنم ہی ہے، تو اس لئے مؤنث کی ضمیر اس کی طرف لوٹادی گئی جہنم کی تاویل سے، "دیکھے گا تُو ان کو کہ وہ پیش کیے جائیں گے اس آگ پر، جہنم پر" خٰشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ: ذِلّت کی وجہ سے دبنے والے ہوں گے، جس طرح سے ایک آدمی اپنے آپ کو باعزّت محسوس کرتا ہے تو پھولتا ہوا اور پھیلتا ہوا معلوم ہوتا ہے، گردن اس کی اُوپر کو اُٹھتی ہے، جس وقت انسان اپنے آپ کو باعزّت محسوس کرتا ہے، اور جس وقت کسی جگہ ذلیل ہوجاتا ہے، حالات اس کے خلاف ہوجاتے ہیں، تو دبا دبا سا، گھٹا گھٹا سا ہوجاتا ہے، یہاں خٰشِعِیْنَ مِنَ الذُّلِّ سے یہی مراد ہے، "دبنے والے ہوں گے ذِلّت کی وجہ سے" یَنْظُرُوْنَ مِنْ طَرْفٍ خَفِیٍّ: مخفی سی نظر کے ساتھ دیکھتے ہوں گے، سست نگاہ کے ساتھ دیکھتے ہوں گے، کیونکہ جب انسان غمزدہ ہو مصیبت میں پھنسا ہوا ہو، تو اس طرح سے آنکھیں لڑانا اور آنکھیں کھول کے دوسرے کی طرف دیکھنا نہیں ہوتا، بہت دبی دبائی نگاہ سے انسان دیکھتا ہے، تو طرفِ خفی سے یہی مراد ہے، "دیکھیں گے وہ کمزور نگاہ سے، دبی دبائی نگاہ سے، چھپی نگاہ سے" وَقَالَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا: کہیں گے وہ لوگ جو ایمان لائے اِنَّ الْخٰسِرِیْنَ الَّذِیْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَھُمْ وَاَھْلِیْھِمْ یَوْمَ الْقِیٰمَۃِ: بے شک کامل درجہ کے خسارہ پانے والے وہی لوگ ہیں جنہوں نے اپنی جانوں کو اور اپنے اہل وعیال کو خسارے میں ڈال دیا قیامت کے دِن، دُنیا میں بھی انسان بعض اُمور میں خسارہ پاتا ہے لیکن یہ کوئی خسارہ نہیں، کیونکہ اس کی تلافی کی یہاں ہزاروں صورتیں ہیں، اور اصل خسارہ پانے والے وہی لوگ ہیں جو آخرت میں خسارے میں پڑ گئے، اَلَآ اِنَّ الظّٰلِمِیْنَ فِیْ عَذَابٍ مُّقِیْمٍ: خبردار! بے شک ظالم لوگ دائمی عذاب میں ہوں گے، جو عذاب ٹھہر ہی جائے گا، ان کے اُوپر آ کے پھر کہیں جائے گا نہیں، وَمَا کَانَ لَھُمْ مِّنْ اَوْلِیَآءَ یَنْصُرُوْنَھُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰہِ: نہیں ہوں گے ان کے لئے کوئی کارساز جو ان کی مدد کریں اللہ کے علاوہ، "اور جس کو اللہ بھٹکا دے اس کے لئے کوئی راستہ نہیں۔"

قیامت آنے سے قبل اپنے رَبّ کا حکم مان لو

اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ: اے لوگو! اپنے رَبّ کی بات کو مانو، مِّنْ قَبْلِ اَنْ یَّاْتِیَ یَوْمٌ لَّا مَرَدَّ لَہٗ مِنَ اللّٰہِ: ایسے دِن کے آنے سے پہلے پہلے جس دِن کے لئے لوٹانا نہیں ہوگا اللہ کی جانب سے، جب وہ آگیا تو آہی گیا، پھر وہ واپس نہیں کیا جائے گا، اس دِن کے آنے سے پہلے پہلے اپنے رَبّ کا حکم مان لو، اِسْتَجِیْبُوْا لِرَبِّکُمْ: اے لوگو! اپنے رَبّ کی بات مان لو قبل اس کے کہ ایسا دِن آجائے

جس کے لئے لوٹانا نہیں ہے اللہ کی جانب سے، مَا لَكُمْ مِّنْ مَّلْجَاٍ یَّوْمَىٕذٍ وَّ مَا لَكُمْ مِّنْ نَّكِیْرٍ: نہ تمہارے لئے اس دن کوئی ملجا ہوگا (ملجا: ٹھکانا) اور نہ تمہارے لئے کوئی انکار کرنے والا ہی ہوگا، جو تمہاری وجہ سے اللہ کے تصرف پر کوئی انکار ہی کر سکے کہ ایسا کیوں کیا گیا؟ ایسا کیوں نہیں کیا؟ یہ ظاہری طور پر بھی اس کے اوپر گرفت کرنے والا کوئی نہیں ہوگا، "نہیں ہوگا تمہارے لیے کوئی انکار کرنے والا"

حضور ﷺ کو تسلی

فَاِنْ اَعْرَضُوْا: یہ حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اتنا سمجھانے کے باوجود بھی اگر یہ اعراض کرتے ہیں تو آپ کا اس میں کوئی نقصان نہیں، فَمَاۤ اَرْسَلْنٰكَ عَلَیْهِمْ حَفِیْظًا: ہم نے آپ کو ان کے اُوپر کوئی نگہبان بنا کر نہیں بھیجا، اِنْ عَلَیْكَ اِلَّا الْبَلٰغُ: نہیں ہے آپ کے ذِمّے مگر پہنچا دینا۔

اِنسان کی لاتعلقی کا شکوہ

وَ اِنَّاۤ اِذَاۤ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً: یہ آگے وہی انسان کا شکوہ ہے اس کی لاتعلقی کا، کہ انسان کی عادت یہ ہے کہ بے شک ہم جس وقت انسان کو اپنی طرف سے کوئی رحمت کا مزہ چکھاتے ہیں تو فَرِحَ بِهَا: اس رحمت کی وجہ سے وہ اِترانے لگ جاتا ہے، اکڑنے لگ جاتا ہے، وَ اِنْ تُصِبْهُمْ سَیِّئَةٌۢ بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ: اور اگر ان کو کوئی مصیبت پہنچتی ہے، کوئی بُری حالت پہنچتی ہے ان اعمال کی وجہ سے جو انہوں نے آگے بھیجے، فَاِنَّ الْاِنْسَانَ كَفُوْرٌ: تو پھر انسان ناشکرا ہو جاتا ہے، پچھلی نعمتیں بھی بھول جاتا ہے، ایسا ہوتا ہے گویا کہ اللہ کی طرف سے اس کو نعمت ملی ہی نہیں، یہ دونوں ہی اللہ تعالیٰ سے لاتعلقی کی علامات ہیں، یہ مضمون کئی دفعہ گزر گیا۔

بیٹے یا بیٹیاں دینے والا صرف اللہ

آگے پھر وہی توحید کا تذکرہ ہے، اللہ تعالیٰ اپنی مالکیت اور تصرفات کو ذِکر کرتے ہیں، لِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، بادشاہت اسی کے لئے ہے، تصرف بھی اسی کا ہے، یہ تصرف جو آگے نمایاں کیا جا رہا ہے یہ ہر وقت کا مشاہدہ ہے، ہر گھر میں یہ واقعات پیش آتے ہیں جس میں انسان محسوس کرتا ہے کہ واقعی اس میں ہمارا کوئی اختیار نہیں، اللہ جو چاہتا ہے وہی کرتا ہے، یَخْلُقُ مَا یَشَآءُ: پیدا کرتا رہتا ہے جو چاہتا ہے، یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ اِنَاثًا: اِناث: لڑکیاں، انثی کی جمع، یَهَبُ: وَهَبَ یَهَبُ سے، "دیتا ہے جس کو چاہتا ہے لڑکیاں" لڑکیاں ہی لڑکیاں دیتا جاتا ہے، ہزار کوشش کرلے، دُنیا بھر کے ڈاکٹر اکٹھے ہو جائیں، تعویذ گنڈے کرنے والے آجائیں، تدبیریں بتانے والے آجائیں، لڑکا نہیں ہوتا، جب اللہ نہ دینا چاہے تو لڑکا کہاں سے آجائے گا؟ لڑکیاں ہی لڑکیاں ہو جاتی ہیں، وَّ یَهَبُ لِمَنْ یَّشَآءُ الذُّكُوْرَ: اور دیتا ہے جس کو چاہتا ہے لڑکے ہی لڑکے، وہاں ہزار تدبیر کرلو، لڑکی نہیں ہوتی، تو یہ تصرف اللہ تعالیٰ کا ایسا ہے جس میں انسان ہر وقت اپنا عجز محسوس کرتا ہے کہ واقعی یہ من جانب اللہ ہی ہے، اس میں کسی کا کوئی زور نہیں، اَوْ یُزَوِّجُهُمْ ذُكْرَانًا وَّ اِنَاثًا: یا اللہ تعالیٰ جوڑ دیتا ہے انہیں لڑکے اور لڑکیاں، "هم" کی ضمیر ذُکور و اِناث دونوں کی طرف لوٹ رہی ہے تغلیباً، مذکروں کو مؤنث پر غلبہ دے کر، جوڑنے کا مطلب یہ نہیں کہ جوڑا جوڑا پیدا کر دیتا ہے، جس کو ہم جڑواں بچے کہتے ہیں تو اَم ملی، یہ مراد نہیں ہے، یعنی کسی کے گھر میں لڑکے بھی پیدا کر دیئے لڑکیاں بھی پیدا

کردیں، جس کو چاہتا ہے لڑکے بھی دیتا ہے، لڑکیاں بھی دیتا ہے، جوڑ کے دے دیتا ہے، جوڑ کے دینے کا معنی سمجھ گئے؟ جڑویں پیدا کرنا مراد نہیں ہے، یعنی کسی گھر میں صرف لڑکیاں، کسی گھر میں صرف لڑکے، کسی میں جوڑ کے دے دیئے، کہ لڑکیاں بھی دے دیں اور لڑکے بھی دے دیے، وَيَجْعَلُ مَنْ يَّشَآءُ عَقِيْمًا: اور کر دیتا ہے جس کو چاہتا ہے بے اولاد، یہ سب کے سب تصرف اللہ تعالیٰ کے چلتے ہیں، عقیم بے اولاد کو کہتے ہیں، یہ مَرد کی صفت بھی آتی ہے اور عورت کی بھی، اِنَّهٗ عَلِيْمٌ قَدِيْرٌ: بے شک اللہ تعالیٰ ہی علم والا ہے، اور اللہ تعالیٰ ہی قدرت والا ہے، یہ سب تصرف اس کے علم اور قدرت کی بنا پر ہیں، جس کے اندر کسی دوسرے انسان کا کوئی زور نہیں، یہ اپنے گھروں کے واقعات ہیں جن سے انسان سمجھ سکتا ہے کہ ہم اللہ کی قدرت کے سامنے عاجز ہیں، اور اللہ ہی جانتا ہے کہ کیا ہونے والا ہے اور کیا نہیں ہونے والا، حتّٰی کہ بچہ ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، چند لمحے اس کے پیدا ہونے میں باقی ہوتے ہیں تو بھی پتا نہیں ہوتا کہ لڑکا ہوگا یا لڑکی ہوگی، یہ علم اور قدرت جو بھی ہے سب اللہ کا کام کرتا ہے، والدین کا بھی اس میں کوئی اختیار نہیں چلتا۔

وحی کی صورتیں

آگے پھر اس مسئلۂ رسالت کو ذکر کیا ہوا ہے، مشرکین جس طرح سے کہتے تھے کہ اللہ تعالیٰ ہم سے بات کیوں نہیں کرتا، اگر ہم سے بات کرے تو ہم مانیں گے، اس قسم کے وہ شبہات جو ڈالتے تھے تو آگے وحی کی تقسیم اللہ نے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ بات کرتا ہے، ایسے طریقوں سے کرتا ہے، جس کے ساتھ چاہتا ہے کرتا ہے، ہر کسی کے ساتھ نہیں کرتا، وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ: نہیں کسی انسان کے لئے، یعنی کسی انسان کے لئے یہ لائق ہی نہیں اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ: کہ اللہ اس سے کلام کرے، اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا یہ تین طریقے بتا دیئے گئے، ''مگر از روئے وحی کے'' وحی: اِشارۂ سریع کو کہتے ہیں، یہاں اس سے اِلقاء فی القلب مراد ہے، دِل میں بات ڈال دینا براہِ راست، جس کو ''اِلہام'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، یا خواب میں کوئی چیز دکھا دینا وہ بھی یہاں وَحْيًا کا مصداق ہے، ''مگر از روئے وحی کے'' یعنی از روئے اشارے کے، دل میں ڈال دے، خواب دکھلا دے، یہ وحی کا مصداق ہوا، اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ: یا پردے کے پیچھے سے، کہ آواز سنائی دے اور نظر کچھ نہ آئے، جس طرح سے موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی بات سنی تھی، یا معراج میں حضور ﷺ نے اللہ تعالیٰ کی باتیں سنیں، اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا: یا اللہ تعالیٰ رسول بھیج دے، رسول سے یہاں فرشتہ مراد ہے، فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ: پھر وہ وحی کرے اللہ کے اِذن کے ساتھ جو چاہے، اور اکثر و بیشتر انبیاء علیہم السلام پر کتابیں جو اُتریں وہ اسی طرح سے ہیں کہ فرشتہ آتا ہے، پھر فرشتے کے آنے کی دو صورتیں ہیں، کبھی فرشتہ اصلی صورت میں ہوتا ہے، انبیاء علیہم السلام اس سے ربط پیدا کرتے ہیں، کبھی فرشتہ انسانی شکل میں آجاتا ہے، تو یہ ساری کی ساری صورتیں وحی کی ہیں، اور انبیاء علیہم السلام پر ان طریقوں میں سے کسی نہ کسی طریقے سے وحی آتی ہے اور اللہ کی بات پہنچتی ہے، ''یا بھیجتا ہے وہ رسول، پھر وحی کرتا ہے وہ رسول اللہ کی اجازت کے ساتھ جو چاہتا ہے، پہنچا دیتا ہے اللہ کی اجازت کے ساتھ جو چاہتا ہے'' اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ: بے شک وہ علوّ والا ہے، عالی شان ہے اور حکمت والا ہے، علوّ والا ہے کہ ہر کسی سے باتیں نہیں کرتا پھرتا، حکمت والا ہے کہ اپنی حکمت کے تحت اپنی باتیں بندوں تک پہنچاتا ہے، لیکن آگے طریقہ جو اپنی حکمت کے تحت اپنا لے۔

”کلام اللہ“ دِلوں کی حیات کا باعث ہے

وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ: اسی طرح سے ہم نے آپ کی طرف وحی کی، رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا: حضرت تھانوی ﷫ نے مِنْ اَمْرِنَا کو رُوْحًا کا بیان بنایا ہے۔ ”ہم نے آپ کی طرف وحی کی ایک روح کی یعنی اپنے حکم کی“، یا ”ہم نے اپنے حکم سے آپ کے پاس ایک رُوح بھیجی“ رُوح سے کلام اللہ مراد ہے، جس طرح سے یہ رُوح ہمارے بدن کی حیات کا باعث ہے تو اللہ کی یہ کلام قلوب کی حیات کا باعث ہے، اس لئے بھی اس کو رُوح سے تعبیر کیا جاتا ہے، ”ایسے ہی“ یعنی جس طرح سے انبیاء ﷩ کی طرف وحیاں بھیجی جاتی ہیں اسی طرح سے آپ کی طرف بھی اللہ نے ایک رُوح بھیجی اپنے حکم سے، یا، اللہ نے آپ کی طرف رُوح وحی کی یعنی اپنا حکم۔

آپ ﷺ پہلے کتاب اور اِیمان نہیں جانتے تھے

مَا كُنْتَ تَدْرِيْ مَا الْكِتٰبُ وَلَا الْاِيْمَانُ: آپ تو جانتے ہی نہیں تھے کہ کیا ہوتی ہے کتاب؟ اور نہ آپ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے؟ کیونکہ مکہ معظمہ میں سرورِ کائنات ﷺ نے جو اِبتداءِ زندگی گزاری، تو اس میں ایمان اور کتاب کی کیا تفصیل آپ کو معلوم تھی، نہ پتا تھا کہ کتاب اللہ کی طرف سے یوں اُترا کرتی ہے اور ایسی کتاب اُترے گی، تذکرہ تک نہیں کیا، چالیس سال تک کبھی زبان پہ یہ بات نہیں آئی، اور نہ آپ ایمان کو سمجھتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے، کون کون سی چیزیں ماننی ضروری ہیں؟ تب جا کے انسان ”مؤمن“ کہلاتا ہے، یہ تفصیلات ساری کی ساری اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے آپ کو پہنچائیں، ”آپ نہیں جانتے تھے کہ کتاب کیا ہوتی ہے، نہ آپ جانتے تھے کہ ایمان کیا ہوتا ہے۔“

قرآن نُورِ ہدایت

وَلٰكِنْ جَعَلْنٰهُ نُوْرًا: لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو جو آپ پر اُتاری ہے یہ قرآن، اللہ نے اس کو ایک روشنی بنادیا، نَّهْدِيْ بِهٖ مَنْ نَّشَآءُ مِنْ عِبَادِنَا: ہم اس کے ذریعے سے جس کو چاہتے ہیں ہدایت دیتے ہیں اپنے بندوں میں سے، وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ: بے شک تو تو راہنمائی کرتا ہے صراطِ مستقیم کی طرف، آپ کا کام راہنمائی ہے، باقی! اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اس نُور کے ذریعے سے مقصد تک پہنچا دیتا ہے، تو نَهْدِيْ بِهٖ میں ہدایت حاصل کر لینا مراد ہے، اور اِنَّكَ لَتَهْدِيْ کے اندر اِراءۃِ طریق مراد ہے، ”آپ صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کرتے ہیں یعنی اس اللہ کے راستے کی طرف جس کے لئے وہ سب کچھ ہے جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے“ اَلَآ اِلَى اللّٰهِ تَصِيْرُ الْاُمُوْرُ: خبردار! اللہ کی طرف ہی اُمور لوٹتے ہیں، ہر امر اللہ کے سامنے پیش ہوگا اور اسی کے ہاں سے فیصلہ صادر ہوگا۔

سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۝ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

سُورَةُ الزُّخْرُفِ

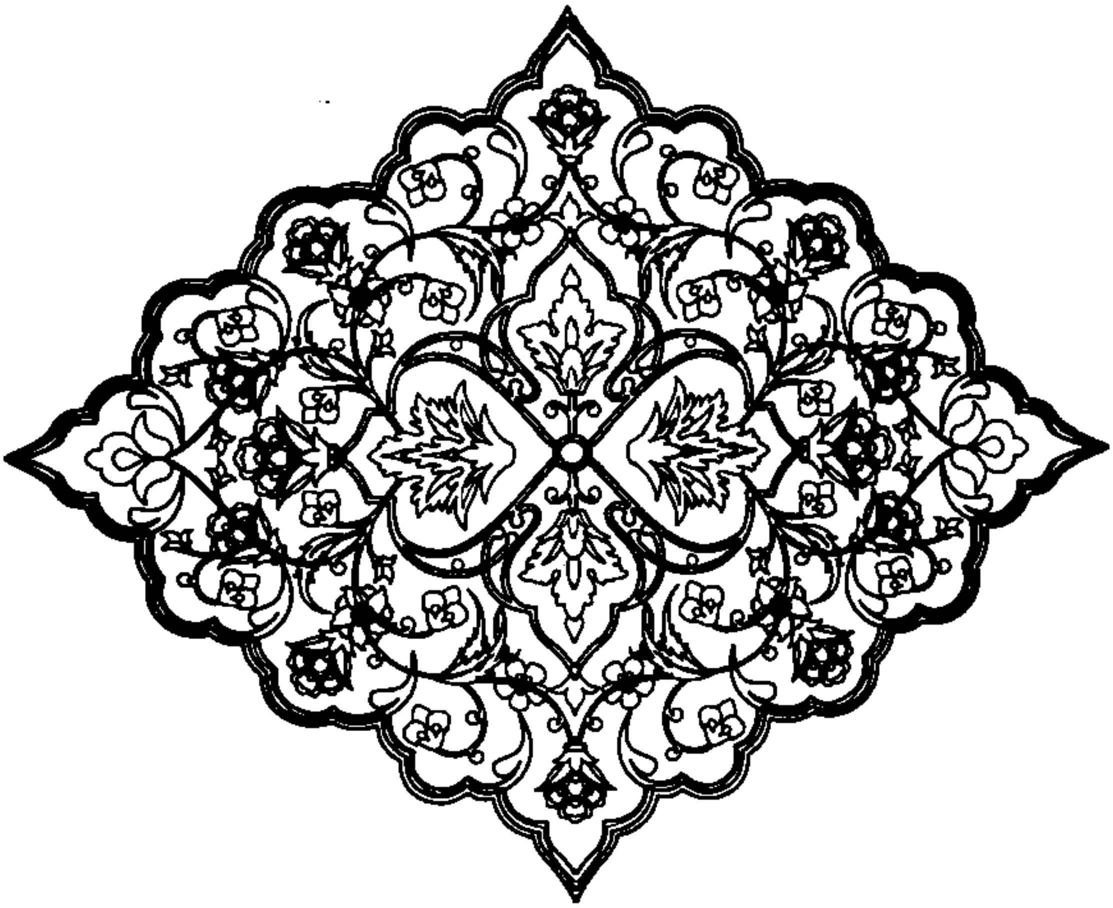

ایاتھا ۸۹ ۴۳ سورۃ الزخرف مکیۃ ۶۳ رکوعاتھا ۷

سورۃ زُخرف مکہ میں نازل ہوئی، اوراس کی نواسی آیتیں ہیں اور سات رُکوع ہیں

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَالۡکِتٰبِ الۡمُبِیۡنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّا جَعَلۡنٰہُ قُرۡءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّکُمۡ تَعۡقِلُوۡنَ ۚ﴿۳﴾ وَ اِنَّہٗ

حٰمٓ ﴿۱﴾ واضح کتاب کی قسم! ﴿۲﴾ بے شک ہم نے اس کتاب کو قرآنِ عربی بنایا تاکہ تم سمجھو ﴿۳﴾ بے شک یہ کتاب

فِیۡۤ اُمِّ الۡکِتٰبِ لَدَیۡنَا لَعَلِیٌّ حَکِیۡمٌ ؕ﴿۴﴾ اَفَنَضۡرِبُ عَنۡکُمُ الذِّکۡرَ صَفۡحًا

علو والی ہے، حکمت والی ہے اس حال میں کہ یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس ﴿۴﴾ کیا ہم تم سے نصیحت کو پھیر لیں اعراض کرتے ہوئے

اَنۡ کُنۡتُمۡ قَوۡمًا مُّسۡرِفِیۡنَ ﴿۵﴾ وَ کَمۡ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ نَّبِیٍّ فِی الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۶﴾ وَ مَا یَاۡتِیۡہِمۡ

اس سبب سے کہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو ﴿۵﴾ کتنے ہی نبی ہم نے پہلے لوگوں میں بھیجے ﴿۶﴾ اور نہیں آتا تھا ان کے پاس

مِّنۡ نَّبِیٍّ اِلَّا کَانُوۡا بِہٖ یَسۡتَہۡزِءُوۡنَ ﴿۷﴾ فَاَہۡلَکۡنَاۤ اَشَدَّ مِنۡہُمۡ بَطۡشًا وَّ مَضٰی

کوئی نبی مگر وہ اس کا استہزا کرتے تھے ﴿۷﴾ پھر ہم نے ہلاک کر دیا ان لوگوں کو جو بمقابلہ اہلِ مکہ کے زیادہ سخت تھے ازروئے پکڑ کے، اور پہلے

مَثَلُ الۡاَوَّلِیۡنَ ﴿۸﴾ وَ لَئِنۡ سَاَلۡتَہُمۡ مَّنۡ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضَ لَیَقُوۡلُنَّ خَلَقَہُنَّ

لوگوں کا حال گزر گیا ﴿۸﴾ اگر آپ ان سے سوال کریں کس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو؟ تو البتہ ضرور کہیں گے: پیدا کیا ان کو

الۡعَزِیۡزُ الۡعَلِیۡمُ ۙ﴿۹﴾ الَّذِیۡ جَعَلَ لَکُمُ الۡاَرۡضَ مَہۡدًا وَّ جَعَلَ لَکُمۡ فِیۡہَا سُبُلًا

عزیز علیم نے ﴿۹﴾ جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا، اور بنایا اس نے تمہارے لئے اس زمین کے اندر راستوں کو

لَّعَلَّکُمۡ تَہۡتَدُوۡنَ ۚ﴿۱۰﴾ وَ الَّذِیۡ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءًۢ بِقَدَرٍ ۚ فَاَنۡشَرۡنَا بِہٖ

تاکہ تم ہدایت پاؤ ﴿۱۰﴾ اور اللہ وہ ہے جس نے اُتارا آسمان سے پانی اندازے کے ساتھ، پھر ہم نے اُٹھایا اس پانی کے ذریعے سے

بَلۡدَۃً مَّیۡتًا ۚ کَذٰلِکَ تُخۡرَجُوۡنَ ﴿۱۱﴾ وَ الَّذِیۡ خَلَقَ الۡاَزۡوَاجَ کُلَّہَا وَ جَعَلَ لَکُمۡ مِّنَ

ایک بنجر علاقے کو، ایسے ہی تم (زمین سے) نکالے جاؤ گے ﴿۱۱﴾ وہ اللہ جس نے کہ سب قسمیں پیدا کیں، اور پیدا کیں تمہارے لیے

الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ ⑫ لِتَسْتَوٗا عَلٰى ظُهُوْرِهٖ ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ اِذَا

وہ چیزیں جن پر تم سوار ہوتے ہو یعنی کشتیاں اور چوپائے ⑫ تاکہ برابر ہو بیٹھو تم ان کی پشتوں پر، پھر تم اپنے رب کے احسان کو یاد کرو جس وقت

اسْتَوَیْتُمْ عَلَیْهِ وَتَقُوْلُوْا سُبْحٰنَ الَّذِیْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِیْنَ ⑬

تم اس کے اُوپر ٹھیک ہو کر بیٹھو، اور تاکہ کہو تم: پاک ہے وہ جس نے تابع کر دیا اس چیز کو ہمارے لیے، ہم اس کو اپنے قابو میں لانے

وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ ⑭

والے نہیں تھے ⑬ اور بے شک ہم اپنے رب کی طرف ہی لوٹنے والے ہیں ⑭

تفسیر

ماقبل سے ربط اور سورت کے مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ زُخرف مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی نواسی آیتیں ہیں اور سات رُکوع ہیں۔ یہ سورت بھی "حوامیم" میں سے ہے، جیسا کہ آپ کی خدمت میں اِبتداءً ذِکر کر دیا گیا تھا، اور جتنی سورتیں بھی "حٰمٓ" سے شروع ہوتی ہیں ان کی اِبتدا میں کتابُ اللہ کا ہی ذِکر ہے، اور پچھلی سورت کا اختتام بھی مسئلۂ رِسالت پر ہی ہوا تھا اور آگے افتتاح بھی اسی مسئلے سے کیا جارہا ہے، اور مضامین آپس میں ملتے جلتے ہیں، اس میں بھی اِثباتِ رِسالت، اِثباتِ توحید اور مشرکین جس قسم کا جدال سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کرتے تھے اس کی تفصیل آئے گی، پہلے کتابُ اللہ کا ہی ذِکر ہے۔

قرآن اپنی حقّانیت کے لئے خود دلیل ہے

حٰمٓ: یہ حروفِ مقطعات میں سے ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ، ان حروف سے اللہ کی جو مراد ہے، وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِیْنِ: واوَ قسمیہ ہے، واضح کتاب کی قسم، اس کا مصداق قرآنِ کریم ہے، اِنَّا جَعَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِیًّا لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: بے شک ہم نے اِس کتاب کو قرآنِ عربی بنایا تاکہ تم سمجھو۔ قرآنِ کریم میں جو قسمیں آیا کرتی ہیں آپ کے سامنے اس کی تفصیل آئی تھی کہ قسم کلام کی تاکید کے لئے ہوا کرتی ہے، اور قرآنِ کریم کی قسمیں اکثر و بیشتر مابعد والے مضمون کے لئے بطور شاہد ہوتی ہیں، تو یہاں بھی اگر شاہد بنایا جائے تو بالکل ٹھیک ہے، قرآنِ کریم کا من جانب اللہ ہونا اس کی دلیل خود یہ کتاب ہے، یعنی باہر سے دلیل لانے کی ضرورت نہیں، جس طرح سے کہا کرتے ہیں کہ "آفتاب آمد دلیل آفتاب" اگر کوئی شخص سورج کو سمجھنا چاہتا ہے تو سورج کی طرف ہی آنکھ کھول کر دیکھ لے، سورج کے وجود کے لئے، سورج کے ثبوت کے لئے، سورج سے واضح دلیل اور کوئی نہیں، اسی طرح سے قرآنِ کریم کو اگر آپ سمجھنا چاہیں تو خود اس کا اپنا اعجاز اور اس کے اندر جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے فطری دلائل قائم کیے ہیں وہ

سارے کے سارے خود اس کتاب کے من جانب اللہ ہونے کی واضح دلیل ہیں، تو گویا یہ کتاب بھی اپنی حقانیت کے لئے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے کے لئے بذاتِ خود ہی دلیل ہے، ''بے شک ہم نے اس کو قرآنِ عربی بنایا'' لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: کُمْ کا خطاب اہلِ مکہ کو ہے، چونکہ سورت ''مکی'' ہے، اولین مخاطب چونکہ قرآنِ کریم کے وہی لوگ تھے تو اس لئے ان کی رعایت رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کتاب کو عربی زبان میں اُتارا، یہ اُس علاقے کے لوگوں کے لئے ایک نعمتِ عظمیٰ ہے، وَاِنَّهٗ فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ لَدَيْنَا لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ: یہ ''ہٗ'' ضمیر بھی کتابِ مبین کی طرف لوٹ رہی ہے، اور لَعَلِيٌّ حَكِيْمٌ یہ اِنَّ کی خبر ہے، بے شک یہ قرآنِ عربی یا یہ کتابِ مبین البتہ علی حکیم ہے، علو والی ہے، حکمت والی ہے، فِيْۤ اُمِّ الْكِتٰبِ یہ حال واقع ہے لَعَلِيٌّ سے (آلوسی) ''اس حال میں کہ یہ اُمّ الکتاب میں ہے ہمارے پاس' لَدَيْنَا یہ اُمِّ الْكِتٰبِ سے بدل ہے (آلوسی)، ''اُمّ الکتاب'' سے مراد ''لوحِ محفوظ'' ہے، تمام کتابیں نازل ہونے سے قبل چونکہ ''لوحِ محفوظ'' میں ہی ضبط ہیں تو اللہ تعالیٰ یہ بیان فرماتے ہیں کہ یہ عالی شان کتاب، یہ پُرحکمت کتاب، ''اُمّ الکتاب'' کے اندر موجود ہے ہمارے پاس، تو لَدَيْنَا کو ''بیان القرآن'' میں اُمِّ الْكِتٰبِ کا بدل قرار دیا گیا ہے۔ اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کتاب کی عظمت کو بیان کیا کہ عالی شان ہے، پُرحکمت ہے، اور تمہارے سامنے آنے سے پہلے یہ ''اُمّ الکتاب'' میں ہمارے پاس موجود تھی، ''اُمّ الکتاب'' سے ''لوحِ محفوظ'' مراد ہے۔

اللہ کی رحمت کا تقاضا ہے کہ اس کی طرف سے نصیحت اُترتی رہے

اَفَنَضْرِبُ عَنْكُمُ الذِّكْرَ صَفْحًا اَنْ كُنْتُمْ قَوْمًا مُّسْرِفِيْنَ: ضَرَبَ کا صلہ عَنْ آجائے تو یہ پھیرنے کے معنی میں ہوتا ہے، کیا ہم تم سے نصیحت کو پھیرلیں اِعراض کرتے ہوئے اس سبب سے کہ تم حد سے گزرنے والے لوگ ہو، صفح بھی درگزر کرنے کو کہتے ہیں، اور صَفْحًا حال بھی ہوسکتا ہے اور نضرب کا مفعول مطلق بھی ہوسکتا ہے مِنْ غَيْرِ لَفْظِهٖ (آلوسی)، مطلب یہ ہوگیا کہ تم لوگ حد سے گزرنے والے ہو اس کتاب کی تکذیب میں اور اللہ کے رسول کی مخالفت میں، تو کیا تمہارے اس حد سے گزرنے کی وجہ سے ہم اِعراض کرتے ہوئے اپنی اس نصیحت کو تم سے پھیرلیں؟ یعنی ایسا نہیں ہوگا، ہم نے تو انسانوں کے اُوپر رحم کرتے ہوئے نصیحت بہرحال کرنی ہے، قبول کرنا نہ کرنا یہ آگے انسانوں کا کام ہے، اللہ تعالیٰ کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ انسان مانے یا نہ مانے اللہ تعالیٰ کی طرف سے نصیحت اُترتی رہے، یعنی تمہارے اس اِسراف کی وجہ سے حد سے تجاوز کرنے کی وجہ سے ہم یہ قرآن تم سے پھیریں گے نہیں۔ ذِکر نصیحت کو کہتے ہیں، اور صَفْحًا درگزر کرنا، اعراض کرنے کے معنی میں ہے۔ ''کیا پھر پھیرلیں ہم تم سے نصیحت اس سبب سے کہ تم حد سے گزرنے والے ہو'' یعنی ہم ایسا نہیں کریں گے، یہ اِستفہامِ انکاری ہے، کہ تمہارے اعراض کی وجہ سے، تمہارے اِسراف کی وجہ سے، تمہارے تکذیب اور اِستہزا کی وجہ سے کیا ہم اپنی نصیحت اُتارنا بند کردیں؟ ایسا نہیں ہوگا، ہم اپنی رحمت کے ساتھ اس نصیحت کو اُتارتے رہیں گے، باقی! جو سعادت مند ہیں وہ اس کو قبول کرلیں گے، اور جو بدبخت ہیں وہ اس کو قبول نہیں کریں گے۔

سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تسلی اور مشرکین کے لئے وعید

وَكَمْ اَرْسَلْنَا مِنْ نَّبِيٍّ فِي الْاَوَّلِيْنَ: مِنْ نَّبِيٍّ یہ كَمْ کی تمیز ہے، کتنے ہی نبی ہم نے پہلے لوگوں میں بھیجے، وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ نَّبِيٍّ اِلَّا

كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: اور نہیں آتا تھا ان کے پاس کوئی نبی مگر وہ اس کا اِستہزا کرتے تھے، اس کا مذاق اُڑاتے تھے، یعنی پہلے لوگوں سے بھی یہی بات چلی آرہی ہے، اس میں سرورِ کائنات ﷺ کے لئے ایک تسلی ہے کہ لوگ تو اعراض کرتے ہیں، مخالفت کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ اپنی نصیحت اُتارتا رہتا ہے، جس کے لئے آپ کے سامنے یہ بات واضح کی جارہی ہے کہ پہلے لوگوں میں بھی اللہ نے نبی بھیجے تھے، اور لوگوں نے اس نبی کا مذاق ہی اُڑایا، اس کے ساتھ اِستہزا کیا، فَاَهْلَكْنَآ اَشَدَّ مِنْهُمْ بَطْشًا: مِنْهُمْ کی ضمیر اہلِ مکہ کی طرف لوٹ رہی ہے جو سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ اِستہزا کا معاملہ کرتے تھے،'' پھر ہم نے ہلاک کردیا ان لوگوں کو جو بمقابلہ اہلِ مکہ کے زیادہ سخت تھے از روئے پکڑ کے'' بطش پکڑ کو کہتے ہیں، یعنی گرفت اور پکڑ کے اعتبار سے جو اہلِ مکہ کے مقابلے میں زیادہ سخت تھے ہم نے ان کو ہلاک کردیا، وَّمَضٰى مَثَلُ الْاَوَّلِيْنَ: اور پہلے لوگوں کا حال گزر گیا، پہلے لوگوں کے حال سے اِن کو عبرت حاصل کرنی چاہیے، وہ طاقت میں اور قوت میں اِن سے زیادہ تھے، لیکن جب انبیاء ﷺ کے ساتھ اِستہزا کے ساتھ پیش آئے تو ہم نے ان کو پکڑ لیا اور جب پکڑ لیا تو پھر ان سے انتقام لیا، جس طرح سے آگے آیا، نیست و نابود کر کے رکھ دیے، تو اس میں تنبیہ ہے قرآنِ کریم کے ساتھ مخالفت سے پیش آنے والوں کے لئے۔

اِثباتِ توحید و معاد کے لئے دلائلِ قدرت کا تذکرہ

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: یہاں سے کلام منتقل ہوگئی توحید کی طرف، یہ مضامین چونکہ بار بار ذکر ہو چکے ہیں اس لئے ان میں اب زیادہ تفصیل کی ضرورت نہیں ہے، اگر آپ ان سے سوال کریں مَّنْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: کس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو؟ تو البتہ ضرور کہیں گے خَلَقَهُنَّ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ: پیدا کیا ان کو عزیز علیم نے۔ عزیز: زبردست، غلبے والا۔ علیم: علم والا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو وہ عزیز بھی مانتے ہیں علیم بھی مانتے ہیں اور آسمان و زمین کا خالق بھی مانتے ہیں، ان سے اگر آپ سوال کریں گے تو اس بات کا وہ اقرار کریں گے، اور جب خالق مانتے ہیں تو مالک بھی وہی ہے، جب خالق اور مالک وہی ہوا تو پھر اس کے ساتھ یہ کسی دوسرے کو شریک کیوں ٹھہراتے ہیں؟ ان باتوں کو تسلیم کروا کر اور اللہ تعالیٰ کی صفات کو واضح کر کے اصل میں شرک کی رَدّ مقصود ہے۔'' ایسا اللہ جس نے کہ بنایا تمہارے لئے زمین کو مہد'' مھد: اصل میں بچھونے کو کہتے ہیں جس طرح سے بستر بچھا ہوا ہو اور کوئی شخص آرام کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ نے زمین کو ایسی ہی حالت میں بنایا ہے'' جس نے بنایا تمہارے لئے زمین کو بچھونا'' وَّجَعَلَ لَكُمْ فِيْهَا سُبُلًا: سُبُلًا سبیل کی جمع ہے، اور بنایا اس نے تمہارے لیے اس زمین کے اندر راستوں کو، لَّعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ: تاکہ تم ہدایت پاؤ، یہاں ہدایت سے ظاہری ہدایت مراد ہے، اللہ نے راستے بنادیے سڑکیں واضح کردیں تاکہ تم اپنے مطلب تک پہنچ جاؤ، ایک جگہ سے دوسری جگہ تم پہنچنا چاہتے ہو تو تمہیں راستہ مل جائے، تمہیں پہنچنے کا ذریعہ میسر آجائے، اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر اس لئے سڑکیں بنادیں راستے بنادیے، یہ بھی بہت بڑا انعام ہے، ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچنے کا راستہ نہ ہو تو انسان کو کتنی مشقت اور دقت پیش آتی ہے؟ یہ صاف ستھرے راستے انسان کو جلدی سے اس کے مطلب تک پہنچادیتے ہیں، یہاں اِہتداء سے بھی اِہتدائے ظاہری مراد ہے، زمین کے راستے جس ہدایت کو حاصل کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، اس کا مفہوم یہ ہوا کہ تاکہ

تم اپنے مقصد تک راہ پالو، جہاں تم جانا چاہتے ہو، وہاں آسانی کے ساتھ پہنچ جاؤ، اللہ تعالیٰ نے زمین کے اندر راستے بنا دیے، وَالَّذِیْ نَزَّلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً: اور اللہ وہ ہے جس نے اُتارا آسمان سے پانی، بِقَدَرٍ: اندازے کے ساتھ، فَاَنْشَرْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا: پھر ہم نے اُٹھایا اس پانی کے ذریعے سے ایک بنجر علاقے کو۔ بَلْدَةً: شہر، علاقہ مراد ہے۔ اور مَیْتًا سے بنجر مراد ہے، بَلْدَةً مَّيْتًا: بنجر علاقہ، ''ہم نے بنجر علاقے کو اس پانی کے ذریعے سے اُٹھا کھڑا کیا'' آباد کر دیا، اس میں نباتات اُگا دیں، گویا کہ زمین پہلے مری پڑی تھی، اور جس وقت پانی اُترتا ہے تو وہ لہلہانے لگ جاتی ہے، نباتات اس میں سے اُگتی ہے، یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے کہ مردہ چیز کے اندر جان ڈال دی، چنانچہ اسی کو بطور نمونہ پیش کر کے کہا جا رہا ہے كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ: اس لفظ سے معاد کی طرف بھی اشارہ کر دیا، ''ایسے ہی تم زمین سے نکالے جاؤ گے'' مرنے کے بعد چونکہ انسان پیوند خاک ہی ہوتا ہے، جیسی صورت بھی ہو جس طرح سے بھی ہو، آخر اِنتہا اس کی یہی ہے کہ زمین کے اجزاء کے ساتھ مل جاتا ہے، تو كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ کا مطلب یہ ہو گیا کہ قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ اسی طرح سے تمہیں نکال کھڑا کرے گا جس طرح سے اس خشک زمین میں سے نباتات کو نکالتا ہے۔ دِین کے بنیادی اُصول یہ تین ہی ہیں: توحید، رِسالت اور معاد، اور اِبتدائی آیات میں انہی کا ذِکر آ گیا، قرآنِ کریم کی حقانیت کو ذکر کر کے سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کو ذِکر کیا گیا، اور آگے یہ الفاظ جو آئے جس میں زمین و آسمان کا خالق اللہ کو ظاہر کیا گیا، اور پانی کا اُتارنے والا اسی کو قرار دیا گیا، زمین کو بچھونا بنانے والا اور اس میں سڑکیں اور راستے بنانے والا یہ اللہ تعالیٰ ہی ہے، اس سے توحید کی طرف اشارہ ہے، تو كَذٰلِكَ تُخْرَجُوْنَ میں معاد کا ذکر آ گیا، یہ بھی بنیادی عقیدہ ہے، اس کے بغیر بھی انسان مسلمان نہیں ہو سکتا، کہ مرنے کے بعد ایک وقت ایسا آئے گا کہ اللہ تعالیٰ سب کو نکالے گا، نکالنے کے بعد حساب کتاب ہو گا، جس کو ہم معاد کہتے ہیں، بعث بعد الموت کے ساتھ اسی کو تعبیر کیا جاتا ہے۔

جانوروں اور کشتیوں کی تخلیق اور فوائد

وَالَّذِیْ خَلَقَ الْاَزْوَاجَ كُلَّهَا: وہ اللہ جس نے کہ سب قسمیں پیدا کیں، ازواج زوج کی جمع ہے، جتنے جوڑے بھی دنیا میں ہیں کسی حیثیت سے ہوں، یا مطلقاً اقسام، ''جس نے کہ ساری کی ساری قسمیں پیدا کیں'' وَجَعَلَ لَكُمْ مِّنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ مَا تَرْكَبُوْنَ: مَا تَرْكَبُوْنَ یہ جَعَلَ کا مفعول ہے، اور بنایا اس نے تمہارے لئے ایسی چیز کو جس پہ تم سوار ہوتے ہو یعنی کشتیاں اور چوپائے، مِنَ الْفُلْكِ وَالْاَنْعَامِ یہ مَا تَرْكَبُوْنَ کا بیان ہے، ''بنائیں تمہارے لئے وہ چیزیں جن پہ تم سوار ہوتے ہو یعنی کشتیاں اور چوپائے'' کشتیوں پر بھی سواری کرتے ہو، چوپایوں پر بھی سواری کرتے ہو، خشکی کے اندر سواری چوپایوں پہ ہوتی تھی اور پانی کے اندر سواری کشتی پہ ہوتی تھی، اُس ماحول کے اعتبار سے اِن دونوں چیزوں کو ذکر کر دیا، اب ان کے علاوہ جتنی سواریاں ہیں وہ یوں سمجھئے کہ سب کشتیوں اور چوپایوں کی طرح ہی ہیں، يَخْلُقُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ سورۂ نحل کے اندر جس طرح سے آیا تھا (آیت: ۸) اللہ تعالیٰ نے سواریوں کا ذکر کیا پھر اس کے بعد ذکر کیا تھا کہ ایسی چیزوں کو پیدا کرتا رہتا ہے جو تمہارے علم میں بھی نہیں، تو اس وقت صرف کشتیاں اور

چوپائے سواری کے کام آتے تھے، بہت ساری چیزیں ایسی تھیں جو پیدا ہونے والی تھیں، اللہ نے پیدا کرنی تھیں، اور وہ لوگوں کے علم میں نہیں تھیں، ان کو اِجمال کے ساتھ ذکر کر دیا، اس لئے آج سواری کی جتنی بھی چیزیں ہیں ہوائی جہاز ہوں یا موٹریں ہوں، کاریں ہوں، ریل گاڑی ہو، جو صورت بھی ہے وہ سب اسی طرح سے ہے جس طرح سے اللہ نے فلک پیدا کی، چوپائے پیدا کئے، یہ بھی اللہ کی تخلیق ہیں، ان کا مادّہ جس سے یہ چیزیں تیار ہوتی ہیں، اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے، جس طرح سے کشتی لکڑی اور لوہے سے تیار ہوتی ہے تو وہ بھی اللہ کے پیدا کئے ہوئے ہیں، پھر انسان کو اللہ تعالیٰ نے اتنی عقل دے دی، فہم دے دیا، ہوش دے دیا، اس کو طریقہ بتادیا، اس لئے تخلیق جتنی بھی ہے سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہی ہے، چاہے اس کی صنعت میں انسانوں کا دخل ہو چاہے اس کی صنعت میں انسانوں کا دخل نہ ہو، تو گویا کہ دو قسم کی سواریاں ہو گئیں، بعض تو وہ ہیں جو براہِ راست اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اس میں انسان کی صنعت کا دخل نہیں، جیسے یہ گدھے، گھوڑے، اُونٹ وغیرہ جتنے بھی ہیں، اور بعض ایسی ہیں کہ جن کی صنعت کے اندر انسان کا دخل ہے، اور اس میں وہ چیزیں آجائیں گی جن کو اِنسان بناتا ہے، سائیکل ہو، موٹر ہو، کار ہو، ریل گاڑی ہو، ہوائی جہاز ہو، جو صورت بھی ہو، تو ساری سواریاں اس کے اندر آگئیں، ''اللہ تعالیٰ نے پیدا کیں تمہارے لئے وہ چیزیں جن کے اوپر تم سوار ہوتے ہو یعنی کشتیاں اور چوپائے'' لِتَسْتَوٗا عَلٰی ظُهُوْرِهٖ: تاکہ برابر ہو بیٹھو تم ان کی پشتوں پر، ظُہور ظَہر کی جمع ہے، ظَہر پشت کو کہتے ہیں، ''تاکہ تم ان کی پشتوں پر برابر ہو بیٹھو'' ثُمَّ تَذْكُرُوْا نِعْمَةَ رَبِّكُمْ: پھر تم اپنے رَبّ کے احسان کو یاد کرو، اِذَا اسْتَوَيْتُمْ عَلَيْهِ: جس وقت تم اس کے اُوپر ٹھیک ہو کے بیٹھو، وَتَقُوْلُوْا: اور تاکہ کہو تم، سُبْحٰنَ الَّذِيْ سَخَّرَ لَنَا هٰذَا وَمَا كُنَّا لَهٗ مُقْرِنِيْنَ وَاِنَّاۤ اِلٰى رَبِّنَا لَمُنْقَلِبُوْنَ: پاک ہے وہ جس نے تابع کر دیا اِن چیزوں کو ہمارے لئے اور ہم ان کو تابع کرنے کی طاقت رکھنے والے نہیں تھے اور بے شک ہم اپنے رَبّ کی طرف البتہ لوٹنے والے ہیں۔ تو سواری پر سوار ہو کر ان الفاظ کے ساتھ اللہ کا شکر ادا کیا کرو، جانور ہوں وہ ہم سے طاقت میں زیادہ ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کی طبیعت ایسی بنائی اور ہمیں اتنی عقل و ہوش دی کہ ہم ان کو تابع کر لیتے ہیں، اور ان کے اوپر چڑھ جاتے ہیں، ایک بچہ اتنے بڑے اُونٹ کی مہار پکڑ لیتا ہے اور اس پر سواری کرتا ہے اور جدھر کو چاہے چلاتا ہے، اسی طرح سے گھوڑے جیسا طاقتور جانور، اور گدھے وغیرہ خچریں جتنے بھی سواری کے جانور ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمارے قابو میں کر دیے، یہ اس کی ایک مہربانی ہے، ورنہ انسان ان کے مقابلے میں ضعیف مخلوق ہے، اگر یہ مقابلے پر آجائیں تو انسان ان کا مقابلہ نہیں کر سکتا، لیکن ان کو اللہ نے انسان کے سامنے مرعوب کر دیا، مسخر کر دیا، تو جس طرح سے چاہتا ہے یہ ان سے کام لیتا ہے، اسی طرح سے یہ آگ، لوہا، پانی جن کو اِنسان جوڑتا ہے، اس ترکیب کے ساتھ اپنے لئے سواریاں بناتا ہے، تو یہ بھی بہت بڑا اللہ تعالیٰ کا اِنعام ہے۔

سواری کی دُعا

تو ان کے اُوپر جب بھی چڑھو تو اللہ کے احسان کو یاد کرو، مؤمن کا کام یہی ہے، کافر اپنے اسباب پہ اعتماد کرتا ہے لیکن

مؤمن قدم قدم پہ اللہ کو یاد کرتا ہے، تو اُوپر چڑھ کے بیٹھو تو اسی وقت اللہ کے اس احسان کو یاد کرو اور اپنی زبان سے بھی یوں کہو، اس لئے سوار ہو کر یہ دُعا پڑھنا مسنون ہے، جس سواری پر بھی آپ چڑھیں، چاہے وہ موٹر ہے، کار ہے، سائیکل ہے، تانگہ ہے، حیوانات ہیں، ان کے اُوپر چڑھنے کے بعد یہ دُعا پڑھنی چاہیے، ''پاک ہے وہ جس نے مسخر کر دیا اس چیز کو ہمارے لئے، ہم اس کو اپنے قابو میں لانے والے نہیں تھے''، اور اس کے بعد پھر دُوسرے سفر کی طرف اشارہ ہو گیا کہ ''بے شک ہم اپنے رَبّ کی طرف ہی لوٹنے والے ہیں'' تاکہ اس دُنیا کے سفر سے ذہن منتقل ہو جائے آخرت کے سفر کی طرف۔

وَجَعَلُوا لَهُ مِنْ عِبَادِهِ جُزْءًا ۚ إِنَّ الْإِنْسَانَ لَكَفُورٌ مُبِينٌ ﴿۱۵﴾

انہوں نے بنایا اُس اللہ کے لئے اس کے بندوں میں سے جزء، بے شک انسان البتہ ناشکرا ہے واضح طور پر ﴿۱۵﴾

أَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنَاتٍ وَأَصْفَاكُمْ بِالْبَنِينَ ﴿۱۶﴾ وَإِذَا بُشِّرَ أَحَدُهُمْ

کیا اختیار کیا اللہ نے بیٹیوں کو اپنی مخلوق میں سے اور تمہیں خالص کر دیا بیٹوں کے ساتھ؟ ﴿۱۶﴾ اور جب بشارت دیا جائے ان میں سے کوئی

بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمَٰنِ مَثَلًا ظَلَّ وَجْهُهُ مُسْوَدًّا وَهُوَ كَظِيمٌ ﴿۱۷﴾ أَوَمَنْ يُنَشَّأُ فِي

اس چیز کی جس کو وہ رحمٰن کے لئے نمونہ قرار دیتا ہے تو ہو جاتا ہے سارا دِن اس کا چہرہ سیاہ، اور وہ گھٹنے والا ہوتا ہے ﴿۱۷﴾ کیا وہ جو پرورش دیا جاتا ہے

الْحِلْيَةِ وَهُوَ فِي الْخِصَامِ غَيْرُ مُبِينٍ ﴿۱۸﴾ وَجَعَلُوا الْمَلَائِكَةَ الَّذِينَ هُمْ عِبَادُ

زیب وزینت میں اور وہ جھگڑے میں واضح طور پر بیان کرنے والا نہیں ﴿۱۸﴾ اور بنایا انہوں نے فرشتوں کو لڑکیاں جو کہ اللہ کے

الرَّحْمَٰنِ إِنَاثًا ۚ أَشَهِدُوا خَلْقَهُمْ ۚ سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْأَلُونَ ﴿۱۹﴾ وَقَالُوا

بندے ہیں، کیا اُن کے پیدا کرنے کے وقت یہ موجود تھے؟ ان کی یہ شہادت لکھی جائے گی اور ان سے یہ پوچھا جائے گا ﴿۱۹﴾ اور وہ کہتے ہیں

لَوْ شَاءَ الرَّحْمَٰنُ مَا عَبَدْنَاهُمْ ۗ مَا لَهُمْ بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿۲۰﴾

کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کی پوجا نہ کرتے، اُن کو اس کے متعلق کوئی علم نہیں، نہیں ہیں وہ مگر اٹکل چلاتے ﴿۲۰﴾

أَمْ آتَيْنَاهُمْ كِتَابًا مِنْ قَبْلِهِ فَهُمْ بِهِ مُسْتَمْسِكُونَ ﴿۲۱﴾ بَلْ قَالُوا إِنَّا

کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے اس قرآن کے اُترنے سے پہلے؟ پھر وہ اس سے دلیل پکڑنے والے ہوں ﴿۲۱﴾ بلکہ کہتے ہیں کہ بے شک

وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ وَكَذٰلِكَ مَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ

پایا ہم نے اپنے آباء کو ایک طریقے پر اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر راہ پانے والے ہیں ﴿۲۲﴾ اور ایسے ہی، نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے

فِيْ قَرْيَةٍ مِّنْ نَّذِيْرٍ اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَآ ۙ اِنَّا وَجَدْنَآ اٰبَآءَنَا عَلٰٓى اُمَّةٍ وَّاِنَّا عَلٰٓى

کسی بستی کے اندر کوئی ڈرانے والا، مگر کہا اس بستی کے خوش حال لوگوں نے کہ بے شک پایا ہم نے اپنے آباء کو ایک طریقے پر اور ہم انہی

اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ ﴿۲۳﴾ قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا

کے نقشِ قدم پر اقتدا کرنے والے ہیں ﴿۲۳﴾ اس نبی نے کہا کہ کیا اگرچہ لے آؤں میں تمہارے پاس زیادہ اچھا راستہ بمقابلہ اس کے

وَجَدْتُّمْ عَلَيْهِ اٰبَآءَكُمْ ۗ قَالُوْٓا اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ ﴿۲۴﴾

جس کے اُوپر تم نے اپنے آباء کو پایا ہے، وہ کہنے لگے کہ بے شک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو ﴿۲۴﴾

فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ ﴿۲۵﴾ ع

پھر ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا، پھر تو دیکھ، کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا؟ ﴿۲۵﴾

تفسیر

رَدِّ شرک

وَجَعَلُوْا لَهٗ مِنْ عِبَادِهٖ جُزْءًا: اب یہ رَدِّ شرک آ گیا کہ اللہ تعالیٰ کی تو ایسی صفتیں اور ایسے انعامات ہیں، لیکن انسان کیسا ناشکرا اور بدفہم ہے کہ ”انہوں نے بنایا اس اللہ کے لئے اس کے بندوں میں سے جزء“ جزء سے یہاں اولاد مراد ہے، ”بنائی انہوں نے اللہ کے لئے اس کے بندوں میں سے اولاد“ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ مُّبِيْنٌ: بے شک انسان البتہ ناشکرا ہے واضح طور پر، بہت ہی ناشکرا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا کھاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے انعامات سے فائدہ اُٹھاتا ہے، لیکن پھر اللہ کی طرف ہی عیب لگاتا ہے، کیونکہ اللہ کی طرف اولاد کی نسبت یہ عیب ہے، ”اس کے بندوں میں سے اس کے لئے جزء بنا لیے۔“

مشرکینِ مکہ کا احمقانہ عقیدہ

اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا يَخْلُقُ بَنٰتٍ: پھر مشرکین کا عقیدہ چونکہ اکثر و بیشتر یہ تھا کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، مشرکینِ مکہ کے عقیدے میں اللہ کے لئے جو اولاد تجویز ہوتی تھی وہ لڑکیاں تھیں، اگرچہ اور مشرک قومیں ایسی تھیں جنہوں نے اللہ کے لئے بیٹے بھی تجویز کیے، عیسائی عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، یہود میں سے بعض لوگ عُزیر علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا کہتے تھے، لیکن مشرکینِ مکہ بیٹا ہونے کے طور

پر کسی کی نسبت نہیں کرتے تھے کہ فلاں اللہ کا بیٹا ہے، فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، اس لئے فرشتوں کی طرف منسوب کر کے وہ عورتوں کی شکل کے بُت بناتے، اور ان کو زنانے کپڑے پہناتے، اور ان کی پُوجا پاٹ کرتے تھے، انہی کے سامنے وہ بیٹھ کے ان کو پکارتے، ان کے سامنے اپنی حاجات پیش کرتے، عقیدہ ان کا یہ ہوتا تھا کہ یہ اللہ کی لڑکیاں ہیں، اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور اللہ تعالیٰ کی چہیتیاں ہیں، جس وقت یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے سفارش کریں گے تو اللہ اس سفارش کو رَدّ نہیں کر سکتا، اس لئے ہم ان کے سامنے اپنی درخواست پیش کرتے ہیں اور یہ اللہ سے منوالیتے ہیں۔ جیسے کہ شفعاء کے عقیدے کے تحت یہ بات آپ کے سامنے واضح کی گئی۔

اور خود حال یہ تھا کہ بیٹیوں کی نسبت اپنی طرف گوارا نہیں کرتے تھے، اگر کسی کے گھر لڑکی پیدا ہو جاتی اور اسے اطلاع دی جاتی کہ تیرے گھر لڑکی پیدا ہوگئی تو اس کا منہ سیاہ ہو جاتا، گھٹا گھٹا رہتا، شرم کے مارے لوگوں کے سامنے آنکھ نہ اُٹھاتا، گویا کہ لڑکی کی نسبت اپنے لیے تو عیب سمجھتے تھے، اور اسی عیب کو اللہ کی طرف منسوب کرتے تھے، تو یہی ان کی حماقت ظاہر کی جارہی ہے کہ اوّل تو اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا عقیدہ ہی غلط، پھر اگر اولاد تجویز بھی کی تو وہ جس کی نسبت ان کے نزدیک بھی عیب ہے، فی حدذاتہٖ لڑکی کوئی عیب کی بات نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی تخلیق ہے اور اس کی حکمت ہے، لڑکے لڑکیاں دونوں ہی اللہ پیدا کرتا ہے اور دونوں کے ساتھ ہی آگے نسل چلتی ہے، اگر صرف لڑکے ہی ہوتے لڑکیاں نہ ہوتیں تو آگے سلسلہ کس طرح سے چلتا؟ لڑکی بھی اللہ کی نعمت اور لڑکا بھی اللہ کی نعمت، دونوں ہی اللہ کی مخلوق ہیں، یہاں جو لڑکی کو لڑکوں کے مقابلے میں ایک عیب قرار دیا جارہا ہے، یہ ان کے اپنے معاشرے کی بات ہے، انہیں یہ کہا جارہا ہے کہ جس نسبت کو تم گوارا نہیں کرتے تو کم از کم تم تو اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف نہ کرو۔ اور ویسے بھی بمقابلہ لڑکے کے لڑکی میں کمال کم ہوتا ہے، جیسے آگے ظاہر کیا جارہا ہے کہ اس کو زیب و زینت کا شوق ہوتا ہے، اور جو بھی شخص زیب و زینت کے اندر مبتلا ہو اور اس کو بناوٹ سجاوٹ کی ہر وقت فکر پڑی رہے تو اہلِ علم لکھتے ہیں کہ یہ علامت ہے کہ یہ شخص ضعیف الرائے اور ضعیف العقل ہے، عقل مند آدمی زیب و زینت کے پیچھے زیادہ نہیں پڑا کرتا، وہ سادہ سیدھا رہ کر کمالات حاصل کرنے کی کوشش کیا کرتا ہے، لیکن جو ہر وقت زیب و زینت کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تو یہ عقل کی کمزوری کی دلیل ہے، اور عورتوں کی فطرت ہے کہ ان کو زیب و زینت کا بہت شوق ہوتا ہے، اس لئے شرعاً بھی ان کی فطرت کی رعایت رکھتے ہوئے ریشم، سونا، زیورات یہ سب عورتوں کے لئے حلال کر دیئے گئے ہیں، جو مردوں کے لئے حلال نہیں ہیں، بہرحال جب اللہ نے ان کی فطرت ایسی بنائی ہے اور اس فطرت کی بنا پر ان کے اندر ضعفِ رائے ہے، ضعفِ عقل ہے تو اس قسم کی عیب والی مخلوق کو جو مردوں کے مقابلے میں کسی درجے میں نقص رکھتی ہے، اس کو اللہ کی طرف منسوب کرنا کون سی عقل مندی ہے؟

نوع کے اعتبار سے عورت مَرد کے مقابلے میں ناقص ہے

تو عورت ناقص ہے اس میں کوئی شک نہیں، حدیث شریف میں بھی سرورِ کائنات ﷺ نے ان کو ''ناقصات العقل والدین'' قرار دیا ہے، کہ ان کی عقل بھی کم ہوتی ہے اور ان کا دِین بھی بمقابلہ مردوں کے کم ہوتا ہے، عورتوں نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ! ہماری عقل کا کیا نقصان ہے اور دِین کا کیا نقصان ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے تمہاری گواہی مرد

کی گواہی کے مقابلے میں نصف رکھی ہے، دو عورتیں مل کر ایک آدمی کے برابر ہوتی ہیں، یہ علامت ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ نے تمہاری تخلیق میں عقل کا ضعف رکھا ہے، جس کی بنا پر تم دو مل کر ایک مرد کے برابر ٹھہرتی ہو۔ اور دین میں نقص کی بات یہ بتائی کہ تمہارے اُوپر مہینے میں کتنے دِن گزرتے ہیں کہ تم نہ نماز پڑھتی ہو، نہ روزہ رکھتی ہو۔[1] یعنی ماہواری کے ایام، تو مجموعہ جو ہوگا اس میں تمہاری نماز مَردوں کے مقابلے میں کم ہے، تمہارے روزے وقت پر نہیں رکھے جاتے، تو اس کو آپ نے نقصانِ دین کے ساتھ تعبیر کیا، یہ اصل فطرت کے لحاظ سے ہے، باقی! اَفراد کا مقابلہ کرتے ہوئے یوں ہوسکتا ہے کہ ایک عورت کسی آدمی کے مقابلے میں زیادہ عقل والی ہو، یا کوئی عورت کسی آدمی کے مقابلے میں زیادہ دِین دار ہو، ایسا تو ہوتا رہتا ہے، افراد کا افراد سے مقابلہ کرنا مقصود نہیں، نوع کا نوع سے مقابلہ کرنا مقصود ہے، نوع کے اعتبار سے عورت مَرد کے مقابلے میں عقل کے اعتبار سے بھی کم ہے اور دین کے اعتبار سے بھی کم ہے، لیکن جب اَفراد کا مقابلہ کریں گے تو اَفراد کے اندر تو ایسا ہوسکتا ہے کہ عورت کے اَفراد مَردوں کے افراد کے مقابلے میں زیادہ دِین دار ہوں اور زیادہ عقل مند ہوں، ایک آدمی پاگل ہوسکتا ہے اور ناقص العقل ہوسکتا ہے تو ایک عورت کامل العقل بھی ہوسکتی ہے اس کے مقابلے میں، لیکن نوع کا مقابلہ کرتے ہوئے بات اسی طرح سے ہے کہ نوعِ مَرد اعلیٰ اور افضل ہے عقل اور دِین کے اعتبار سے بمقابلہ عورت کے۔ تو یہاں اللہ تعالیٰ یہی بیان فرماتے ہیں کہ جس کو تم اپنے لئے عیب سمجھتے ہو اس کی نسبت اللہ کی طرف کیوں کرتے ہو؟ تو ان کی حماقت کو یوں ظاہر کیا جارہا ہے۔ اَمِ اتَّخَذَ مِمَّا یَخْلُقُ بَنٰتٍ: بَنٰتٍ یہ اتَّخَذَ کا مفعول ہے، کیا اختیار کیا اللہ نے بیٹیوں کو اپنی مخلوق میں سے، مِمَّا یَخْلُقُ، جو چیز اللہ پیدا کرتا ہے اس میں سے کیا اللہ نے بیٹیوں کو اختیار کیا؟ وَّاَصْفٰىكُمْ بِالْبَنِیْنَ: اور تمہیں خالص کردیا بیٹوں کے ساتھ؟

''بیٹی'' کو عار سمجھنا جاہلانہ نظریہ

وَ اِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِمَا ضَرَبَ لِلرَّحْمٰنِ مَثَلًا: اور جب بشارت دیا جائے ان میں سے کوئی اس چیز کی جو وہ رحمٰن کے لئے مَثَل بیان کرتے ہیں، مثل سے یہاں اولاد ہی مراد ہے، مَثَل اصل میں شبہ کے معنی میں، نمونہ کے معنی میں ہے، اور اولاد اپنے والد کا نمونہ ہی ہوا کرتی ہے، ''جس چیز کو یہ رحمٰن کا نمونہ قرار دیتے ہیں اس چیز کے ساتھ اگر ان میں سے کسی کو خبر دے دی جائے'' یعنی یہ کہہ دیا جائے کہ تیرے بیٹی پیدا ہوگئی، ''جس چیز کو رحمٰن کی اولاد قرار دیتے ہیں، رحمٰن کا شبیہ یا رحمٰن کے لئے نمونہ قرار دیتے ہیں اس کی خبر اگر ان میں سے کسی کو دے دی جائے'' ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا: مُسْوَدًّا: سیاہ۔ اور ظَلَّ افعالِ ناقصہ میں سے ہے جس کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کا دن کے وقت واقع ہونا، جس طرح سے ''بَاتَ'' رات کے وقت کسی کام کے ہونے کو کہتے ہیں تو ''ظَلَّ'' دِن کے وقت کسی کام کے ہونے کو کہتے ہیں، تو ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا کا معنی یوں ہوجائے گا کہ سارا دِن اس کا منہ سیاہ رہتا ہے، ''ہوجاتا ہے وہ دِن کے وقت سیاہ چہرے والا'' وَّهُوَ كَظِیْمٌ: اور وہ گھٹنے والا ہوتا ہے، دل میں گھٹتا ہے، دل میں بشاشت نہیں رہتی لڑکی کی خبر سُن کے، ''ہوجاتا ہے سارا دِن اس کا چہرہ سیاہ اور وہ گھٹنے والا ہوتا ہے۔''

---

(۱) بخاری ص ۴۴ باب ترک الحائض الصوم، مشکوٰۃ ص ۱۳۔

ہروقت زیب وزینت میں مشغول ہونا ضعفِ عقل کی دلیل ہے

اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ غَیْرُ مُبِیْنٍ: مَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ: جو پرورش دی جاتی ہے زیور میں، زینت میں۔ حلیہ زینت کو کہتے ہیں، زیور، زینت۔ وَهُوَ فِی الْخِصَامِ میں هُوَ ضمیر مذکر کی لوٹ رہی ہے اور یُنَشَّؤُا یہ بھی مذکر صیغہ استعمال ہوا مَنْ کی وجہ سے، ''کیا وہ جو پرورش دیا جاتا ہے زیب وزینت میں اور وہ جھگڑے میں واضح طور پر بیان کرنے والا نہیں'' کیا اس کو اللہ نے اولاد بنایا؟ اللہ نے اولاد اسی کو اختیار کرنا تھا جس کو ہروقت اپنی بناوٹ سجاوٹ سے فرصت نہیں ملتی؟ جس وقت دیکھو زیب وزینت کے پیچھے پڑی ہوئی ہے، اچھے لباس کی فکر، اچھے زیورات کی فکر، اپنی شکل سنوارنا، یہ عورت کی فطرت ہے کہ ان چیزوں کے اندر اس کو مشغولیت بہت زیادہ ہوتی ہے، یہی علامت ہے اس کے ضعف رائے کی اور ضعف عقل کی، کہ اس میں انجام بینی نہیں، زیب وزینت جو بہت ہی ایک سطحی سی چیز ہے جس میں کوئی دین ودنیا کا فائدہ نہیں اس کا اکثر وبیشتر وقت اسی طرف ہی گزرتا ہے، توجہ اس کی ادھر ہی رہتی ہے، تو ایسی ناقص مخلوق جس میں عقل کم، فہم کم، انجام بینی کم، اور پھر بڑی بات یہ ہے کہ قوتِ بیانی کم! کہ یہ اگر کسی سے لڑ بھی پڑے، جھگڑ بھی پڑے تو اپنے مدعا کو اچھی طرح سے ثابت نہیں کرسکتی، شور اگرچہ بہت مچائے گی، دوسرے کی بات کو سمجھنا اور اس کی دلیل کو توڑنا اور اپنے مدعا کو دلیل کے ساتھ ثابت کرنا جس طرح سے مرد آپس میں بحث مباحثہ کرتے ہوئے کیا کرتے ہیں، عورتوں میں یہ طاقت نہیں ہوتی، یہ بھی نوع کے اعتبار سے گویا کہ اس کے بیان میں بھی نقص ہے، بول بھی نہیں سکتی واضح طور پر، اپنی مراد بھی واضح نہیں کرسکتی، روتی جائے گی، اور اسی طرح سے کچھ نہ کچھ بولتی بھی چلی جائے گی، لیکن اپنے مفہوم کو اچھی طرح سے واضح کردینا یہ عورتوں میں بہت کم ہوتا ہے، تو قوتِ بیانیہ بھی عورتوں کی مردوں کے مقابلے میں کم ہے، تو جس کے اندر یہ نمایاں نقص پائے جاتے ہیں، تو کیا اللہ نے اولاد اختیار کرنی تھی تو ایسی اختیار کرلی؟ اللہ کی مخلوق کے اندر اور کوئی کامل تھا ہی نہیں کہ جس کو اللہ بیٹا بنالیتا؟ یہ مشرکین کی حماقت کو واضح کیا جارہا ہے کہ تم نے اللہ کی طرف اس قسم کی ناقص مخلوق کو منسوب کیا ہے کہ اس قسم کی نسبت تمہاری نظر کے اندر بھی عیب ہے، تو اللہ تعالیٰ کے لئے کس طرح گوارا کی جاسکتی ہے؟ اَوَمَنْ یُّنَشَّؤُا فِی الْحِلْیَةِ: کیا اللہ تعالیٰ نے اولاد اختیار کیا ایسے کو جو پرورش دیا جاتا ہے زیب وزینت میں اور وہ جھگڑے میں واضح طور پر بیان کرنے والا نہیں، یہ مذکر کی ضمیر مَنْ کے لفظ کے اعتبار سے آئی ہے، اور مراد یہاں عورتیں ہیں۔

فرشتوں کو لڑکیاں کہنا کس دلیل پر مبنی ہے؟

وَجَعَلُوا الْمَلٰٓئِكَةَ الَّذِیْنَ هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا: اب اگلی بات یہ کہی جارہی ہے کہ پہلے تو فرشتوں کو تم نے جو لڑکیاں قرار دے کے اللہ تعالیٰ کی اولاد قرار دیا تو اس میں عیب والا پہلو ہے، لیکن دوسری قباحت اس میں یہ ہے کہ خود فرشتوں کو لڑکیاں کہنا کس دلیل پر مبنی ہے؟ کیا جس وقت اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کو پیدا کیا تھا یہ دیکھ رہے تھے کہ اللہ ان کو لڑکیاں بنارہا ہے؟ یا انہوں نے ان کی خلقت کا اب مشاہدہ کرلیا ہے کہ ان کو پتا چل گیا کہ یہ لڑکیاں ہیں؟ تو ان کو لڑکیاں قرار دینا یہ مستقل ایک جرم ہے، اور لڑکیاں قرار دے کر اللہ کی طرف ان کی نسبت یہ مستقل عیب ہے اور پھر فرشتوں کو لڑکیاں کہنا یہ مستقل جرم ہے۔ ''قرار دیا انہوں نے، بنایا انہوں

نے فرشتوں کو جو کہ اللہ کے بندے ہیں لڑکیاں، بنایا انہوں نے فرشتوں کو لڑکیاں جو اللہ کے بندے ہیں" هُمْ عِبٰدُ الرَّحْمٰنِ اِنَاثًا فرشتے جو کہ اللہ کے عباد ہیں اللہ کے بندے ہیں اُن کو انہوں نے لڑکیاں قرار دے دیا، اَشَهِدُوْا خَلْقَهُمْ: کیا اُن کے پیدا کرنے کے وقت یہ موجود تھے؟ یہ مشاہدہ کر رہے تھے اُن کے خلق کا؟ دیکھ رہے تھے؟ کہ اِن کو پتا چل گیا کہ یہ لڑکیاں ہیں، سَتُكْتَبُ شَهَادَتُهُمْ وَيُسْئَلُوْنَ: ان کی یہ شہادت، ان کا یہ کہنا کہ لڑکیاں ہیں، ان کی یہ شہادت لکھی جائے گی، وَيُسْئَلُوْنَ: اور ان سے یہ پوچھا جائے گا کہ تم یہ شہادت کس بنا پر دیا کرتے تھے، اور ان کو اگر لڑکیاں کہتے تھے تو تمہارے پاس کیا دلیل ہے۔

شرک کے جواز پر ایک احمقانہ شبہ اور اس کا جواب

وَقَالُوْا: اور مشرکین یہ بھی کہتے ہیں کہ لَوْ شَآءَ الرَّحْمٰنُ مَا عَبَدْنٰهُمْ: اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کی پوجا نہ کرتے، یہ بات آپ کے سامنے پہلے سورۂ انعام کے اندر تفصیل سے گزر چکی، جس میں آیا تھا کہ مشرکین یوں کہتے ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے، ہمارے آباء شرک نہ کرتے، تو یہاں بھی وہ جواباً یوں ہی کہتے تھے کہ اگر اللہ تعالیٰ کو یہ پسند نہ ہوتا تو ہمیں شرک نہ کرنے دیتا، ان کی پوجا نہ کرنے دیتا، تو مشرک کبھی کبھی ضد کے طور پر ایسی بات کہہ دیا کرتے تھے، آپ جانتے ہیں کہ یہ بات تو بالکل ہی غیر فطری ہے، کسی کام کے کرنے کی قدرت دے دینا یہ اللہ تعالیٰ کے راضی ہونے کی علامت نہیں ہے، اگر یہ راضی ہونے کی علامت ہوتی تو دنیا کے اندر کوئی جرم بھی جرم نہ قرار دیا جائے اور کسی کو بھی ناپسندیدہ نہ کہا جائے، کیونکہ چور چوری کرتا ہے تو وہاں بھی وہ کہہ سکتا ہے کہ اگر اللہ کو چوری پسند نہ ہوتی تو مجھے کیوں کرنے دیتا؟ زانی زنا کرتا ہے تو وہ بھی یہ بات کہہ سکتا ہے، قاتل قتل کرتا ہے تو وہ بھی یہ بات کہہ سکتا ہے، ڈاکو ڈاکا ڈالتا ہے، دُنیا کے اندر جتنے بھی فساد ہیں وہ سارے کے سارے اسی دلیل کے ساتھ جائز ہو جاتے ہیں اگر مشرکین کی یہ دلیل مان لی جائے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہمیں روک دیتا، روک تو اللہ نے دیا، قانون تمہیں ایسا بتا دیا جس میں اس کا جرم ہونا مذکور ہو گیا، باقی! یہ ہے کہ تمہیں پکڑتا نہیں، تمہاری ٹانگیں وقت پر نہیں توڑ دیتا، تمہیں وقت پر سزا نہیں دے دیتا، کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت نہیں ہے، اس نے انسان کو مختار کر کے چھوڑ دیا ہے، اور اپنا قانون واضح کر دیا کہ یہ کام میرے نزدیک پسندیدہ ہیں، یہ پسندیدہ نہیں، پھر تمہیں طاقت دے کے، قدرت دے کے، ارادہ دے کے، علم دے کے، تمہیں چھوڑ دیا تمہارے امتحان کے لئے، اس لئے انسان کا کسی کام پر قادر ہو جانا یہ اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ ہونے کی دلیل نہیں ہے، یہ بھی ایک جاہلانہ بات تھی جو کہا کرتے تھے، "وہ کہتے ہیں کہ اگر رحمٰن چاہتا تو ہم ان کی پوجا نہ کرتے۔"

مشرکین کے پاس نہ عقلی دلیل ہے نہ نقلی!

مَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ: اُن کو اس کے متعلق کوئی علم نہیں، یعنی یہ بے علمی کی بات ہے، یہ کوئی علمی دلیل نہیں کہ یہ چونکہ عبادت کر رہے ہیں اور ان کو زبردستی روکا نہیں جا رہا تو سمجھتے ہیں کہ اللہ کی رضا کے مطابق ہے، اور ان کا یہ دعویٰ کہ جو کام ہو اور اللہ تعالیٰ اس کو زبردستی نہ روکے تو وہ کام ٹھیک ہوتا ہے اللہ کا پسندیدہ ہوتا ہے یہ کوئی علمی بات نہیں ہے، اور نہ اپنے اس مدعا کو کسی علمی دلیل کے ساتھ یہ ثابت کر سکتے ہیں، "اُن کو اس کے متعلق کوئی علم نہیں" اِنْ هُمْ اِلَّا يَخْرُصُوْنَ: نہیں ہیں وہ مگر اٹکل چلاتے، خرص کہتے ہیں بغیر

کسی دلیل کے بے سوچے سمجھے بات کرنا، جس کو اٹکل چلانا کہتے ہیں، یہ سب ان کے اٹکل کی باتیں ہیں، اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ: کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے اس قرآن کے اُترنے سے پہلے؟ کیونکہ اللہ کے نزدیک کون سی بات پسندیدہ ہے اور کون سی بات پسندیدہ نہیں یہ بات معلوم ہوتی ہے اس کی نازل کردہ کتاب سے، اسی میں اللہ تعالیٰ نے اپنا پورا پورا قانون واضح کیا ہوا ہوتا ہے جس سے پتا چلتا ہے کہ یہ کام جائز ہے اور یہ کام جائز نہیں ہے، تو یہ جو کہتے ہیں کہ فرشتوں کی عبادت ٹھیک ہے، اور فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں، اور اللہ ان کی سفارش روکتا نہیں، تو کیا ان کے پاس اللہ کی کسی کتاب میں کوئی دلیل موجود ہے؟ نہ عقلی دلیل اس بارے میں کوئی موجود، نہ نقلی دلیل موجود، اَمْ اٰتَیْنٰهُمْ كِتٰبًا مِّنْ قَبْلِهٖ: کیا ہم نے ان کو کوئی کتاب دی ہے اس قرآنِ کریم کے اُترنے سے پہلے؟ فَهُمْ بِهٖ مُسْتَمْسِكُوْنَ: پھر وہ اس کتاب کے ساتھ استمساک کرنے والے ہوں، یعنی اس سے دلیل پکڑنے والے ہوں، اس کا سہارا لینے والے ہوں، اِستمساک کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو تھام لینا، تمسک کرنا، دلیل پکڑنا، ''اس سے یہ دلیل پکڑنے والے ہوں۔''

مشرکین کا تقلیدِ آباء کا سہارا، اور ان کو پچھلی تاریخ کی یاد دہانی

بَلْ قَالُوْۤا اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّهْتَدُوْنَ: کتاب کی کوئی دلیل ان کے پاس موجود نہیں، ان کی بڑی سے بڑی دلیل یہی ہے، ''بلکہ کہتے ہیں کہ بے شک پایا ہم نے اپنے آباء کو ایک طریقے پر اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر راہ پانے والے ہیں'' بس یہ ایک مشرکانہ دلیل ہے کہ اپنا خاندانی رواج اور اپنے آباؤ اجداد کا طریقہ بس یہی ان کی دلیل ہے، کہتے ہیں کتاب تو کوئی نہیں اُتری، نہ کتاب میں سے ہم کوئی دلیل پیش کرتے ہیں، بلکہ ہم تو اپنے آباء کو دیکھتے ہیں کہ ایک طریقے پر تھے، ہم تو انہی کے نقشِ قدم پر ہی راستہ پانے والے ہیں، وَكَذٰلِكَ مَاۤ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِیْ قَرْیَةٍ مِّنْ نَّذِیْرٍ: اور ایسے ہی، نہیں بھیجا ہم نے آپ سے پہلے کسی بستی کے اندر کوئی ڈرانے والا، اِلَّا قَالَ مُتْرَفُوْهَاۤ: مگر کہا اس بستی کے خوش حال لوگوں نے اِنَّا وَجَدْنَاۤ اٰبَآءَنَا عَلٰۤى اُمَّةٍ: بے شک پایا ہم نے اپنے آباء کو ایک طریقے پر، وَّ اِنَّا عَلٰۤى اٰثٰرِهِمْ مُّقْتَدُوْنَ: اور ہم انہی کے نقشِ قدم پر اِقتدا کرنے والے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ کی جو دلیل ہے پہلے لوگ بھی اسی قسم کی دلیلیں بیان کرتے رہے ہیں انبیاء ﷩ کے مقابلے میں، نسبت خوش حال لوگوں کی طرف کر دی جاتی ہے چونکہ قیادت انہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے، باقی غریب لوگ ان کے پیچھے لگنے والے ہوتے ہیں، نبی جب آتا ہے تو مدِّمقابل یہی لوگ آتے ہیں کیونکہ نبی کے طریقے کے ماننے کے ساتھ ان کی شہوات پر زد پڑتی ہے، ان کی خواہشات پوری نہیں ہوتیں، اور وہ ایک طریقے کے عادی بنے ہوئے ہوتے ہیں، اس لئے وہ سلامتی اسی میں سمجھتے ہیں کہ آباؤ اجداد سے جو طریقہ چلا آ رہا ہے وہی طریقہ باقی رہے، اور اس میں کوئی کسی قسم کا تغیر تبدل نہ آئے، تو جب بھی کوئی نبی آتا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت لے کر تو مدِّمقابل لوگوں میں سے خوش حال طبقہ جو ہوتا ہے وہ یہ کہتا ہے کہ بس ہم تو اپنی خاندانی روایات کو ہی باقی رکھیں گے، ہم اس میں تغیر تبدل کرنے کے لئے تیار نہیں، تو جیسے مشرکینِ مکہ یہ دلیل بیان کرتے ہیں تو پہلے لوگ بھی ایسے ہی کرتے تھے، قٰلَ اَوَلَوْ جِئْتُكُمْ بِاَهْدٰى مِمَّا وَجَدْتُّمْ عَلَیْهِ اٰبَآءَكُمْ: اس نبی نے کہا (جو نبی بھی لوگوں کے سامنے آیا) کہ کیا تم اپنے آباء کے پیچھے

چلتے رہو گے؟ اگر چہ لے آؤں میں تمہارے پاس زیادہ اچھا راستہ بمقابلہ اس کے جس کے اُوپر تم نے اپنے آباء کو پایا ہے، کیا میں تمہارے پاس اس سے اچھا راستہ لے آؤں جس کے اُوپر تم نے اپنے آباء کو پایا تو کیا پھر بھی تم ان کے پیچھے لگے رہو گے؟ قَالُوْٓا: وہ کہنے لگے کہ اِنَّا بِمَآ اُرْسِلْتُمْ بِهٖ كٰفِرُوْنَ: بے شک ہم اس چیز کا انکار کرنے والے ہیں جس کے ساتھ تم بھیجے گئے ہو، آخری فیصلہ دہ یہ سنا دیتے ہیں، کہ چاہے ہمارے آباء کا طریقہ ٹھیک تھا یا غلط تھا، جیسا بھی تھا ہمیں اس سے بحث نہیں ہے، ہم تو اپنے آباء کے طریقے پر چلیں گے، ہم تو اپنے آباء کے طریقے پر چلیں گے، ہم تمہاری لائی ہوئی شریعت اور تمہاری لائی ہوئی ہدایت کا انکار کرنے والے ہیں۔ یہ پچھلی اُمتوں کا حال سنا یا ان اہلِ مکہ کو کہ تم جو یہ دلیل دیتے ہو تو یہی دلیل پہلوں کی بھی تھی، اور جو نتیجہ ان کا نکلا پھر وہی نتیجہ تمہارا نکلے گا، فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ: پھر ہم نے ان آباء پرستوں سے جو اپنے آپ کو خاندانی روایات کا پابند بناتے ہیں اور اللہ کی شریعت کا اعتبار نہیں کرتے پھر ہم نے ان لوگوں سے انتقام لیا، فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِيْنَ: پھر تُو دیکھ، کیسا انجام ہوا جھٹلانے والوں کا۔ عاقبہ: انجام۔ مکذبین: جھٹلانے والے۔ انبیاء علیہم السلام کو جھٹلانے والوں کا انجام کیسا ہوا؟ یہ پچھلی تاریخ کی طرف توجہ دلاوی کہ ان واقعات کو دیکھو! تو تمہیں پتا چلے کہ اس قسم کے ضدی لوگوں کا نتیجہ آخر کیا نکلا کرتا ہے!

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ وَقَوْمِهٖٓ اِنَّنِيْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ ۝۲۶

قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو: بے شک میں لاتعلق ہوں ان چیزوں سے جن کی تم پُوجا کرتے ہو ۝۲۶

اِلَّا الَّذِيْ فَطَرَنِيْ فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ ۝۲۷ وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِيْ عَقِبِهٖ

مگر وہ جس نے مجھے پیدا کیا، پس بے شک وہی میری راہنمائی کرتا ہے ۝۲۷ اور بنایا ابراہیم علیہ السلام نے اِس کو باقی رہنے والی بات اپنی اولاد میں،

لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ۝۲۸ بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ ۝۲۹

تا کہ وہ لوگ لوٹیں ۝۲۸ بلکہ فائدہ پہنچایا میں نے اِن کو اور ان کے آباء کو حتّٰی کہ آ گیا ان کے پاس حق اور واضح رسول ۝۲۹

وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ ۝۳۰ وَقَالُوْا لَوْلَا

جس وقت ان کے پاس حق آ گیا تو کہنے لگے: یہ تو جادو ہے اور بے شک ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں ۝۳۰ اور کہا انہوں نے: کیوں نہیں

نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ ۝۳۱ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ ؕ

اُتارا گیا یہ قرآن دو شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر؟ ۝۳۱ کیا یہ تقسیم کرتے ہیں تیرے رَبّ کی رحمت کو؟

نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ
ہم نے تقسیم کیا ان کے درمیان ان کی معیشت کو دُنیوی زندگی میں، اور اُونچا کیا ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں،
لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا ؕ وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ ﴿۳۲﴾
تا کہ بنالے ان میں سے بعض بعض کو خدمت گار، اور تیرے رَبّ کی رحمت بہتر ہے اس مال ودولت سے جس کو یہ اکٹھا کرتے ہیں ﴿۳۲﴾
وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ
اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہوجائیں گے لوگ ایک ہی جماعت، البتہ کردیتے ہم اس شخص کے لئے جو رحمٰن کا انکار کرتا ہے،
لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا مِّنْ فِضَّةٍ وَّمَعَارِجَ عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ ﴿۳۳﴾ وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا
ان کے گھروں کے لئے چھتیں چاندی کی اور سیڑھیاں جن کے اُوپر یہ چڑھتے ہیں ﴿۳۳﴾ اور (بنادیتے ہم) ان کے گھروں کے لئے دروازے
وَّسُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ﴿۳۴﴾ وَزُخْرُفًا ؕ وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ
(چاندی کے) اور ایسے تخت جن کے اُوپر یہ لوگ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہیں ﴿۳۴﴾ اور بنادیتے ہم ان سب چیزوں کو سونا نہیں ہے یہ سب کچھ
لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ؕ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴿۳۵﴾
مگر دُنیوی زندگی کا سامان، اور آخرت تیرے رَبّ کے نزدیک متقین کے لئے ہے ﴿۳۵﴾

خلاصۂ آیات

بِسْمِ اللهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهِيْمُ لِاَبِيْهِ: قابلِ ذِکر ہے وہ وقت جب کہا ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو وَقَوْمِهٖ: اور اپنی قوم کو، اِذْ کا متعلق محذوف نکال لیں اُذْكُرْ، اِيْذْ كُرْ، یاد کیجئے اس وقت کو، چاہیے کہ ذِکر کیا جائے وہ وقت، یاد کیا جائے وہ وقت، قابلِ ذِکر ہے وہ وقت جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے باپ کو اور اپنی قوم کو کہا، اِنَّنِیْ بَرَآءٌ مِّمَّا تَعْبُدُوْنَ: بَرَآءٌ یہ مصدر ہے بریٔ کے معنی میں، بے شک میں لاتعلق ہوں ان چیزوں سے جن کی تم پُوجا کرتے ہو، اِلَّا الَّذِیْ فَطَرَنِیْ: مگر وہ جس نے مجھے پیدا کیا، فَاِنَّهٗ سَيَهْدِيْنِ: هَدٰى، يَهْدِیْ: راہنمائی کرنا، پس بے شک وہ میری رہنمائی کرتا ہے، ''سین'' تاکید کے لئے ہے، رہنمائی کرتا ہے دینی وذُنیوی مصلحتوں کی طرف، اور جب اِلَّا کو مستثنیٰ منقطع کے طور پر لیں گے تو مطلب یہ ہوجائے گا میں اس سے لاتعلق نہیں ہوں جس نے مجھے پیدا کیا اور جو میری راہنمائی کرتا ہے، اور اس کے علاوہ جتنوں کو تم پُوجتے ہو ان سے میرا کوئی تعلق نہیں، وَجَعَلَهَا كَلِمَةًۢ بَاقِيَةً فِیْ عَقِبِهٖ: اور بنایا ابراہیم علیہ السلام نے اس کو باقی رہنے والی بات اپنی اولاد میں، عَقِب: پیچھے آنے والے، اولاد کے معنی میں ہے۔ ''اپنی اولاد میں اس کلمے کو باقی قرار دیا'' یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جو توحید اختیار کی، اسی توحید کی وصیت کی اپنی اولاد کو، وَوَصّٰى بِهَآ

اِبْرٰهِیْمُ بَنِیْهِ وَیَعْقُوْبُ اس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ بقرہ (آیت: ۱۳۲) میں آیا تھا، کہ اسی ملّتِ ابراہیمی پر اور اسی عقیدۂ توحید پر ثابت رہنے کے لئے اپنی اولاد کو وصیت کی، تو اس بات کو باقی رہنے والا کر دیا اپنی اولاد میں، لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ تاکہ وہ لوگ لوٹیں، رُجوع کریں، یعنی اس توحید کی بات کو اُن کے شرک سے رُجوع کرتے رہیں توحید کی طرف، لوٹ پوٹ کے ادھر ہی آئیں، اس لئے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس بات کو اپنی اولاد میں باقی رکھا۔

تفسیر

ماقبل سے ربط، تذکرۂ ابراہیم علیہ السلام اور اس کا مقصد

پچھلا رکوع جو آپ کے سامنے آیا تھا اس میں خصوصیت کے ساتھ مشرکوں کی اس دلیل کو ذکر کیا گیا تھا کہ ہم اپنے آباء کے طریقے پر چلتے ہیں، اور اللہ کے رسول ان کو سمجھاتے رہے کہ تمہارے آباء کا طریقہ غلط ہے، عقل کے خلاف ہے، نقل کے خلاف ہے، اور میں تمہارے سامنے جو راستہ واضح کرتا ہوں یہ عقل ونقل کے مطابق ہے، تو اس راستے کے مقابلے میں تم آباء کے طریقے کو کیوں اختیار کرتے ہو؟ تو مشرکین اسی کے اوپر جمتے تھے اور کہتے تھے کہ نہیں! ہم تو صرف انہی نقوش پر چلیں گے جن پر ہم نے اپنے آباء کو پایا، اس مضمون کے ذکر کرنے کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا تذکرہ کیا، جس کا ماقبل کے ساتھ تعلق اس طرح سے واضح ہے کہ مشرکینِ مکہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد بھی قرار دیتے تھے، تو ان کو ابراہیم علیہ السلام کا ہی قصہ سنایا جارہا ہے کہ تقلیدِ آباء کا اُصول جو تم نے اختیار کر لیا یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا اُصول نہیں ہے، وہ جس گھرانے میں پیدا ہوئے تھے اس گھرانے میں بھی کچھ رسم ورواج تھے، وہ گھر بھی کچھ رُسوم کا پابند تھا، ان کے ہاں بھی ایک طریقہ جاری تھا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی صحیح فطرت کے طور پر اور اللہ تعالیٰ کی تعلیم سے اور ہدایت سے جب اس بات کو سمجھ لیا کہ یہ شرک کا طریقہ غلط ہے، تو چاہے وہ باپ کا طریقہ تھا اس کو چھوڑ دیا، چاہے ساری قوم اس طریقے پر چل رہی تھی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس طریقے کو نہیں اپنایا، تو اگر تم اپنے آپ کو ملّتِ ابراہیمی پر قرار دیتے ہو، تو تمہیں بھی یہی کرنا چاہیے کہ غلط بات کو چھوڑ دو چاہے تمہارے باپ کا ہی طریقہ کیوں نہ ہو، یوں بھی اس کو ماقبل کے ساتھ جوڑا جا سکتا ہے، اور اس طرح سے بھی کہہ سکتے ہیں کہ اگر تم نے آباء کا طریقہ ہی اپنانا ہے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی تو تمہارے آباء میں داخل ہیں، تم ان کا طریقہ کیوں نہیں اپناتے؟ دیکھو! انہوں نے کس طرح سے شرک کو چھوڑا اور غلط طریقے کو چھوڑا، چاہے ساری قوم اس کے اوپر لگی ہوئی تھی لیکن انہوں نے کسی کی پروا نہیں کی اور ہر کسی سے لاتعلقی کا اعلان کر دیا، پھر اپنی اولاد کے اندر وہ اسی توحید والی بات کو باقی چھوڑ کر گئے ہیں، تقلیدِ آباء والی بات کو باقی نہیں چھوڑ کے گئے، انہوں نے جو اُصول قائم کیا وہ یہی ہے کہ اللہ وحدہٗ لاشریک ہے، اسی کی عبادت کرو، اور غیر اللہ جتنے بھی ہیں سب سے لاتعلق ہو کر رہو، تو اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف منسوب کرتے ہو اور اس نسبت کے اوپر فخر کرتے ہو اور ان کی اولاد کہلاتے ہو، اور انہی کے بنائے ہوئے اس گھر کے مجاور ہونے کی وجہ سے تم دنیوی نعمتوں سے مالا مال ہو، تو تمہیں چاہیے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے طریقے کو اپناؤ، یہ تعلق ہو جائے گا ان آیات کا ماقبل کے مضمون کے ساتھ۔

خلاصۂ آیات

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ وَاٰبَآءَهُمْ حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ: بلکہ نفع پہنچایا میں نے، فائدہ پہنچایا میں نے اِن کو اور ان کے آباء کو حتّٰی کہ آگیا ان کے پاس حق اور واضح رسول، وَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ: جس وقت اِن کے پاس حق آگیا، قَالُوْا هٰذَا سِحْرٌ کہنے لگے یہ تو جادو ہے، وَّاِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ: اور بے شک ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں، وَقَالُوْا: اور کہا انہوں نے، لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ عَظِيْمٍ: کیوں نہیں اُتارا گیا یہ قرآن دو شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر؟ عَظِيْمٍ یہ رَجُلٍ کی صفت ہے، یہاں قریہ کا لفظ بول کر یہاں شہر مراد ہے، قریۂ عظمٰی، بڑی بستی، اور مصداق اس کا ہے مکہ اور طائف، مکہ اور طائف یہ جو دو شہر ہیں ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر یہ قرآن کیوں نہیں اُتارا گیا؟ اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ: کیا یہ تقسیم کرتے ہیں تیرے رَبّ کی رحمت کو؟ یہاں ''رحمت'' سے ''نبوّت'' مراد ہے، رحمتِ خاصہ، کیا تیرے رَبّ کی رحمت کو یہ لوگ بانٹتے ہیں؟ نَحْنُ قَسَمْنَا بَيْنَهُمْ مَّعِيْشَتَهُمْ: ہم نے تقسیم کیا ان کے درمیان ان کی معیشت کو، معیشت یہ مصدر میمی ہے، عَاشَ يَعِيْشُ: زندگی گزارنا، اور معیشت بول کر اسبابِ معیشت مراد ہوتے ہیں یعنی زندگی کے ذرائع، رزق، روزی۔ اس لئے حاصل ترجمہ اس کا روزی کے ساتھ کر دیا جاتا ہے، ''ان کی زندگی گزارنے کی چیز یعنی ان کی روزی ہم نے ان کے درمیان بانٹی ہے، ہم نے ان کے درمیان تقسیم کی دُنیوی زندگی میں'' وَرَفَعْنَا بَعْضَهُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ: اور اُونچا کیا ہم نے ان میں سے بعض کو بعض پر درجوں میں، لِّيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا: تا کہ بنالے ان میں سے بعض بعض کو خدمت گار، سُخری: خدمت گار کو کہتے ہیں، تا کہ بعض بعض کو خدمت گار بنالے یعنی بعض لوگ بعض سے کام لے لیا کریں، وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ: اور تیرے رَبّ کی رحمت بہتر ہے اس مال و دولت سے جس کو یہ لوگ اکٹھا کرتے ہیں۔ وَلَوْلَآ اَنْ يَّكُوْنَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً: اگر یہ بات نہ ہوتی کہ ہو جائیں گے لوگ ایک ہی جماعت، لَّجَعَلْنَا لِمَنْ يَّكْفُرُ بِالرَّحْمٰنِ: البتہ کر دیتے ہم اس شخص کے لئے جو رحمٰن کا انکار کرتا ہے، لِبُيُوْتِهِمْ سُقُفًا: ان کے گھروں کے لئے چھتیں، مِّنْ فِضَّةٍ: چاندی کی، وَّمَعَارِجَ: معارج مِعْرَج کی جمع، اُوپر چڑھنے کا آلہ، جس کو ہم سیڑھی کہتے ہیں، ''اور سیڑھیاں''، اس کا عطف ہے سُقُفًا پر، اور مِّنْ فِضَّةٍ کا تعلق اس کے ساتھ بھی ہے، ''ہم ان کے گھروں کے لئے چھتیں بنا دیتے چاندی کی اور سیڑھیاں چاندی کی'' عَلَيْهَا يَظْهَرُوْنَ: ایسی سیڑھیاں جن کے اُوپر یہ چڑھتے ہیں، وَلِبُيُوْتِهِمْ اَبْوَابًا: اور بنا دیتے ہم ان کے گھروں کے لئے دروازے چاندی کے، وَّسُرُرًا: سُرر، سریر کی جمع ہے، سریر تخت اور چارپائی کو کہتے ہیں جس کے اُوپر اِنسان لیٹتا اور آرام کرتا ہے، عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ: سُرُرًا عَلَيْهَا يَتَّكِـُٔوْنَ ایسے تخت جن کے اُوپر یہ لوگ ٹیک لگا کر بیٹھتے ہیں، یہ سب چیزیں ہم چاندی کی بنا دیتے، وَزُخْرُفًا: اور زُخرف کہتے ہیں سونے کو، اس کا عطف ہے مِّنْ فِضَّةٍ کے محل پر (مظہری)، تو جس کا مطلب یہ ہوگا کہ ''اور یہ سب چیزیں ہم سونا بنا دیتے'' ان کے گھروں کی چھتیں سونے کی ہوتیں، سیڑھیاں سونے کی ہوتیں، اور ان کے دروازے سونے کے ہوتے، اور ان کے تخت جن کے اُوپر یہ لیٹتے، آرام کرتے ہیں، وہ بھی سونے کے ہوتے، یعنی کسی کو سونے کے دے دیتے کسی کو چاندی کے دے دیتے، اتنی وُسعت کر دیتے ان کے لئے، زُخرف سونے کو کہتے ہیں، ''اور سونا''، ''بنا دیتے ہم ان سب چیزوں کو سونا'' وَاِنْ كُلُّ ذٰلِكَ لَمَّا مَتَاعُ الْحَيٰوةِ

الدُّنْيَا: لَمَّا: إلَّا کے معنی میں ہے، اور اِنْ نافیہ ہے، نہیں ہے یہ سب کچھ مگر دُنیوی زندگی کا سامان، وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ: اور آخرت تیرے رَبّ کے نزدیک متقین کے لئے ہے۔

مشرکین قرآن کی ناقدری کرنے والے ہیں

بَلْ مَتَّعْتُ هٰٓؤُلَآءِ یہاں سے بات شروع ہوئی مشرکینِ مکہ کی، کہ یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں اپنے آپ کو قرار دیتے ہیں، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات تو یہ تھی جو ہم نے ذِکر کردی، کہ انہوں نے توحید اختیار کی اور توحید کے متعلق ہی اپنی اولاد کو وصیت کی، لیکن یہ لوگ اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، یہ مشرکینِ مکہ اپنے آپ کو ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کرنے والے اس بات کی طرف متوجہ نہیں ہوتے، "بلکہ میں نے ان کو اور ان کے آباء کو نفع پہنچایا" دُنیا کے اندر بہت ساز و سامان دیا، جس سے انہوں نے راحت اور آرام حاصل کیا، اور اپنے طریقے کے اُوپر یہ چلے آرہے ہیں، حَتّٰى جَآءَهُمُ الْحَقُّ: حتیٰ کہ ان کے پاس سچی بات آگئی، وَرَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ: اور ایک واضح رسول آگیا، یعنی کُفر و شرک اختیار کرنے کے باوجود میں ان کو فائدہ پہنچاتا رہا، ان کے لئے کسی چیز کی کمی نہیں چھوڑی، حتیٰ کہ ان کے پاس حق آگیا، اس "حق" سے مراد قرآنِ کریم ہے، اور "رسولِ مبین" کا مصداق سرورِ کائنات ﷺ ہیں، تو جس وقت یہ حق ان کے پاس آگیا تو بجائے اس کے کہ یہ قبول کرتے اور اس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طریقہ قرار دے کر اس پر اپنی جان دیتے، اس کی اتباع کرتے، ایسا نہیں کیا، لَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ: جب ان کے پاس حق آگیا تو یہ کہنے لگے یہ تو جادو ہے، اس حق کو جادو کہہ کے ٹھکرا دیا، جیسے قرآنِ کریم کے لئے کئی جگہ لفظ انہوں نے اس قسم کے استعمال کیے، اور صاف اعلان کردیا کہ اِنَّا بِهٖ كٰفِرُوْنَ: ہم اس کا انکار کرنے والے ہیں، ہم اس کو مانیں گے نہیں، یہ تو قرآنِ کریم کے متعلق ہوئی بات۔

مشرکین کا اعتراض کہ نبوّت کسی مال دار کو کیوں نہیں ملی؟

اور پھر سرورِ کائنات نے جو اپنے آپ کو اللہ کا رسول قرار دیا اور ان کے سامنے ذکر کیا، تو پہلے تو وہ لوگ بشریت میں اور بوّت میں ویسے ہی منافات کے قائل تھے، لیکن جب دلائل کے سامنے وہ اس منافات کے دعوے کو نہ نبھا سکے تو وہ کہنے لگے کہ اچھا! اگر اللہ تعالیٰ نے انسانوں میں سے ہی کسی انسان کو رسول بنانا تھا تو پھر کسی بڑے آدمی کو بناتے (عظیم: عظمت والا، ان کے نزدیک عظمت والا وہی تھا جس کے پاس مال و دولت زیادہ ہو) شہروں کے اندر بڑے بڑے سیٹھ موجود ہیں، بڑے بڑے چوہدری موجود ہیں، بہت اعلیٰ درجے کے لوگ ہیں، جن کو سرداری حاصل ہے، سیادت قیادت ان کے ہاتھ میں ہے، مال و دولت والے ہیں، خدام والے ہیں، جائیداد والے ہیں، تو چاہیے تھا کہ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو رسول بنا دیتا، تو یہ کیا بات ہے کہ اللہ نے رسول بنانا تھا تو ایسے کو ہی بنانا تھا؟ جو یتیم ہے، جس کے پاس کوئی جائیداد نہیں، جس کے پاس کوئی مال و دولت نہیں، یعنی مشرکینِ مکہ کا ذہن یہ تھا کہ یہ منصب کسی دولت مند کو ملنا چاہیے تھا، جس طرح سے دُنیوی وجاہت ان کو حاصل ہے، خاندانوں کی قبیلوں کی قیادت وہ کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے اگر کسی بشر کو اپنا نمائندہ بنانا ہی تھا تو ان بڑوں میں سے کسی ایک کو بناتا، تو عظمت ان کے دل میں تھی تو مال و دولت کی تھی، اور وہ سمجھتے تھے کہ نبوّت والا مرتبہ بھی ایسے شخص کو ملنا چاہیے جس کو دُنیا میں ہمارے نزدیک عظمت حاصل ہے، یہ

ہے ان کے اس اِعتراض کا حاصل۔ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰی رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْیَتَیْنِ عَظِیْمٍ: رجل عظیم: عظمت والا آدمی، اور عظمت والے آدمی سے ان کی مراد تھی سیٹھ، مال دار، چوہدری، صاحبِ جائیداد، کیونکہ ان کے نزدیک عظمت انہی چیزوں کی تھی، تو یہ قرآن ان دونوں شہروں میں سے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُتارا گیا؟ اگر اللہ نے اُتارنا ہی تھا، کسی کو اپنا نمائندہ بنانا تھا تو پھر کسی بڑے آدمی کو بناتے، قریتین کا ذِکر اس لئے کیا کہ دیہاتی لوگ جو ہوتے ہیں، خاص طور پر باہر جنگل میں رہنے والے، وہ ان کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے، کیونکہ مال ودولت کے لحاظ سے بھی وہ شہریوں کے مقابلے میں کم ہوتے ہیں، اور قیادت سیادت بھی آپ جانتے ہیں کہ اہلِ شہر کو ہی حاصل ہوتی ہے، اس لئے کہتے ہیں کہ مکہ اور طائف یہ دو پاس پاس شہر ہیں، اور ان میں بڑے بڑے آدمی موجود ہیں، تو ان بڑے آدمیوں میں سے کسی بڑے آدمی پر یہ قرآن اُترنا چاہیے تھا، یہ غریب مسکین جس کے پاس کوئی دُنیوی جاہ وجلال حاصل نہیں ہے تو اس کے اُوپر یہ کیوں اُتارا گیا ہے؟ یہ ہے ان کا اِعتراض، جس کے جواب کی وضاحت اللہ تبارک وتعالیٰ نے اگلی آیتوں میں کی ہے، دوطرح سے جواب دیا ہے۔

پہلا جواب: ''منصبِ نبوّت محض خدائی عطیہ ہے''

پہلے جواب کا حاصل تو یہ ہے کہ نبوّت اللہ تعالیٰ کی ایک خاص رحمت ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی تقسیم اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، کہ کس کو نبی بنانا ہے؟ یہ نبوّت کا مرتبہ کس کو عطا کرنا ہے؟ یہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، ان لوگوں کی مرضی پر یہ موقوف نہیں، کہ اللہ تعالیٰ اس کی تقسیم ان کے ہاتھ میں دے دے کہ تم جس کو چاہو نبوّت دے دو، جس کو چاہو رسالت دے دو، جس کے اُوپر چاہو تم کتاب اُتار دو، یہ انسانوں کے اختیار کی بات نہیں، یہ براہِ راست اللہ کے اختیار کی بات ہے، نبوّت تو بہت بڑی رحمت ہے، رحمتِ خاصہ ہے، یہ دیکھتے نہیں؟ کہ دُنیوی رزق، یہ معیشت جس کے ساتھ یہ اپنی زندگی گزارتے ہیں، خود اس کی تقسیم بھی ان کے ہاتھ میں نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے زیادہ دیتا ہے، جس کو چاہتا ہے کم دیتا ہے، رزق کی تقسیم اللہ تعالیٰ نے براہِ راست اپنے ہاتھ میں رکھی ہے، تو یہ دُنیوی رزق جو بدن کی بقاء کا ذریعہ ہے، یہ کم درجے کی اور گھٹیا چیز ہے، اور نبوّت تو بہت ہی اعلیٰ چیز ہے اُس کے مقابلے میں، تو جب گھٹیا چیز کی تقسیم کا اختیار اللہ نے ان کو نہیں دیا تو بڑھیا چیز کے اُوپر یہ کنٹرول کس طرح سے حاصل کرنا چاہتے ہیں؟ یعنی متوجہ اس بات کی طرف کر دیا کہ جس طرح سے یہ ظاہری، مادّی رزق اللہ تعالیٰ کے دینے کے ساتھ ہی ملتا ہے، کسی کو کم کسی کو زیادہ، یہ معیشت ہم تقسیم کرتے ہیں، تو یہ رُوحانی رزق جو اللہ کا کلام ہے، کتاب ہے، یا نبوّت ہے، اس کی تقسیم ان کے ہاتھ میں کس طرح سے آسکتی ہے؟ کہ اپنی مرضی کے ساتھ جس کو چاہیں نبی بنالیں اور جس کو یہ چاہیں اس کو نبی بنایا جائے، یہ بات نہیں ہے، رزق کی تقسیم بھی اللہ نے اپنے ہاتھ میں رکھی، اور رحمتِ خاصہ بڑی رحمت یہ تو ہے ہی براہِ راست اللہ کے قبضے میں، تو ان کو اپنا عجز اس سے محسوس کر لینا چاہیے کہ دُنیوی رزق بھی ان کے اختیار میں نہیں ہے، کہ جس کو چاہیں کم دے دیں، جس کو چاہیں زیادہ دے دیں، جس کو چاہیں محروم کر دیں، جس کو چاہیں سرمایہ دار بنا دیں، یہ معیشت کی تقسیم بھی اللہ نے اپنے اختیار میں رکھی ہے، پہلے جواب کا حاصل تو یہ ہے۔

رزق کی تقسیم بھی اِنسان کے اختیار میں نہیں

اور یہ ایک واقعہ ہے اور حقیقت ہے کہ رزق کی تقسیم اور رزق کی کمی بیشی براہِ راست اللہ کے قبضے میں ہے، یہ اُصول انسان کو ماننا پڑتا ہے، اس کے مانے بغیر چارہ نہیں، ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ میں مال دار بن جاؤں، کوئی شخص بھی اپنی جگہ مسکین رہنا نہیں چاہتا، لیکن دِن رات صبح شام ہر طرح سے وہ ٹکریں مارتا ہے، لیکن رہتا وہیں ہے جہاں اللہ تعالیٰ اس کو رکھتے ہیں، ایسا نہیں کہ جو چاہے، جتنا چاہے حاصل کرلے، جتنا چاہے کمالے، ایسا نہیں ہوسکتا، سارے لوگ مل کر ایک شخص کے متعلق یہ جذبہ رکھیں کہ یہ مالیات میں ترقی کرجائے، یہ سرمایہ دار ہوجائے، اِس کو کارخانے مل جائیں، اس کو زمین مل جائے، جائیداد مل جائے، ایسا نہیں ہوتا، سب کوششیں ناکام ہوجاتی ہیں، اپنے لئے بھی، دوسرے کے لئے بھی، اللہ تعالیٰ نے جو مرتبہ جس کے لئے متعین کیا ہے وہ اسی پہ رہتا ہے، یہ تفاوت جو ہے رزق کی تقسیم میں، یہ ایک بہت ہی بیّن چیز ہے، اور اس میں انسان اپنے آپ کو بے بس پاتا ہے، آپ دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے دینے کے مختلف طریقے ہیں، بچہ پیدا جو ہوتا ہے تو پیدا ہونے میں بچہ مختار نہیں ہے، (ذرا بات کو سمجھ لیجئے!) موٹی سی بات ہے، بچہ پیدا ہوتا ہے تو پیدا ہونے میں وہ مختار نہیں کہ میں فلاں کے گھر پیدا ہوں اور فلاں کے گھر پیدا نہ ہوں، کیا خیال ہے؟ آپ حضرات جس وقت پیدا ہونے لگے تھے تو آپ نے کوئی اپنے طور پر تجویز کی تھی کہ میں اس گھر میں پیدا ہوں اور فلاں گھر میں پیدا نہ ہوں؟ تو جب بچہ پیدا ہوتا ہے اور اپنے اختیار کے بغیر، ایک بچہ اللہ تعالیٰ نے پیدا کردیا بادشاہ کے گھر میں، وہ بھی بلا اختیار آیا بادشاہ کے گھر، لیکن آپ جانتے ہیں کہ پیدا ہوتے ہی وہ بادشاہ ہے، پیدا ہوتے ہی اس کے لئے ہر قسم کے راحت کے سامان مہیا ہیں، اردگرد اس کے خادم کھڑے ہیں، اعلیٰ سے اعلیٰ چیز اس کو مہیا کی جاتی ہے، اس کی پرورش کے لئے عمدہ سے عمدہ چیزیں لائی جاتی ہیں، اور رہنے سہنے کے لئے بھی، یعنی پیدا ہوتے ہی وہ ایئرکنڈیشنر کمروں میں آگیا، پیدا ہوتا ہی نرم گدّوں پر آگیا، پیدا ہوتا ہی سینکڑوں خادموں کے ہاتھوں میں آگیا، کوئی اس کو اُٹھاتا ہے، کوئی سلاتا ہے، کوئی کپڑے پہناتا ہے، کس طرح سے ہاتھوں ہاتھ اس کو لیے پھرتے ہیں، اس کی غذا کے لئے اچھے سے اچھا سامان مہیا کیا جاتا ہے، اب وہ غیر اختیاری طور پر پیدا ہوا اور پیدا ہوتے ہی اس کے اردگرد یہ نعمتوں کے جال بچھے ہوئے ہیں، جس کو آج کل کے محاورے میں کہہ سکتے ہیں کہ ''یہ سونے چاندی کا چمچہ منہ میں لے کر پیدا ہوا!'' ٹھیک ہے بات؟ اب یہ رزق کی وسعت جو اس کو حاصل ہوئی تو کیا اس بچے کے اختیار سے حاصل ہوئی ہے؟...... اور ایک بچہ بغیر اختیار کے ہی ایسے شخص کے گھر میں پیدا ہوجاتا ہے کہ جس کے ماں باپ کو بھی پیٹ بھر کے روٹی میسر نہیں، اور ان کو گرمی سردی کے بچاؤ کے اسباب مہیا نہیں ہیں، ان کے تن بدن کے اُوپر اپنی ضرورت کا بھی کپڑا نہیں، بچہ وہ بھی بلا اِختیار ہی آیا، بغیر اختیار کے اس گھر میں پیدا ہوا، لیکن پیدا ہوتے ہی وہ اپنے اسبابِ رزق کے اعتبار سے ایک محتاج ہے، اس کو وقت پر دُودھ نہیں ملتا، اس کو لیٹنے کے لئے کوئی اچھا بستر مہیا نہیں ہے، اس کے رہنے کے لئے کٹیا ہے، کانوں (سرکنڈوں) اور پھونسوں کی بنی ہوئی ایک جھونپڑی ہے، کوئی اچھی چارپائی اس کے پاس نہیں ہے، باقی! اور خدمت گاری کے اسباب تو کیا ہوں گے! یہ تفاوت آپ نے دیکھ لیا کہ پیدا ہوتے ہی بچوں کے سامنے آجاتا ہے اور غیر اختیاری طور پر آجاتا ہے،

اب اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں اچھے گھر میں پیدا ہوں تاکہ پیدا ہوتے ہی میں زمین دار بن جاؤں، وراثت کے اندر مجھے مال کثرت کے ساتھ حاصل ہو جائے، اسی طرح سے عزت کا معاملہ ہے کہ ایک معزز خاندان کے اندر بچہ پیدا ہوتا ہے، کسی پیر کے گھر پیدا ہو گیا، یا کسی بڑے آدمی کے گھر پیدا ہو گیا، تو اس کو پیدا ہوتے ہی ایک عزت کا مقام حاصل ہے، اور ایک ایسے گھر میں پیدا ہو جاتا ہے کہ جن کو کوئی عزت کا مقام حاصل نہیں ہوتا، تو یہ تو ابتدا ہی ایسے طور پر ہوئی کہ جس میں انسان سمجھتا ہے کہ غیر اختیاری طور پر ہی اللہ کی طرف سے بعض چیزیں عطا ہوتی ہیں اور بعض چیزوں سے انسان محروم ہوتا ہے، ابتدا تو یہاں سے ہو جاتی ہے اور غیر اختیاری طور پر ہوتی ہے۔

حصولِ رزق کے وسائل اور صلاحیتیں بھی غیر اختیاری ہیں

پھر اس پیدا ہونے کے بعد رزق کے حاصل کرنے کے لئے جس قسم کی صلاحیتوں اور جس قسم کی استعداد کی ضرورت ہوتی ہے تو آپ جانتے ہیں یہ کسی کے اختیار میں نہیں، ایک بچہ اتنا سمجھ دار ہوتا ہے کہ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ مختلف فنون حاصل کرتا ہے، مختلف کاریگریاں سیکھتا ہے، صنعت سیکھتا ہے، اور اپنی اس عقل کے ساتھ، اپنے اس دماغ سے کام لے کر اپنے لئے ترقی کے راستے پیدا کر لیتا ہے، اور ایک آدمی بلید اور اتنا کند ذہن ہوتا ہے کہ وراثت میں اس کو سب کچھ ملا تھا، لیکن جو ملا تھا وہ اس کو بھی سنبھال نہیں سکا، اپنی بے عقلی کی بنا پر اس کو بھی ضائع کر بیٹھتا ہے، تو یہ تفاوت بھی آپ کی آنکھوں کے سامنے ہے کہ لوگ بنتے بھی رہتے ہیں بگڑتے بھی رہتے ہیں، اور اس بننے بگڑنے کے اندر ان کی فطری صلاحیتوں کا بڑا دخل ہوتا ہے، اور یہ فطری صلاحیتیں کسی کے اختیار میں نہیں، جس طرح سے اللہ تعالیٰ کسی کو خوبصورت بنا دے کسی کو بدصورت بنا دے، تو بدصورت کو خوبصورت نہیں بنایا جا سکتا، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے جس کو خوبصورت بنایا ہے وہ بھی اس کے اختیار کے بغیر بنایا ہے، باطنی استعداد بھی اسی طرح سے ہے، کسی کی عقل اچھی ہے، کسی کی عقل بُری ہے، کسی کی سوچ اچھی ہے، کسی کی سوچ بُری ہے، اور اسی طرح سے اخلاق اور ملکات میں تفاوت ہوتا ہے، کوئی اچھی عادتوں کا حامل ہو گیا، کوئی بُری عادتوں کا حامل ہوتا ہے۔

دولت میں مساوات کا نظریہ فطرت سے ٹکر ہے!

جس کے بعد خود بخود درجات کا فرق پڑتا جاتا ہے کہ ایک آدمی کو دُنیا کے اندر ایک چیز حاصل ہوتی ہے، دُوسرے آدمی کو حاصل نہیں ہوتی، تو اس میں مساوات کا نظریہ رکھنا کہ دولت سب کے پاس برابر ہونی چاہیے، یہ فطرت سے ٹکر ہے، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ مقابلہ ہے، انسان کو انسان کے ساتھ کسی حیثیت میں برابر نہیں ٹھہرایا جا سکتا، یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے، نہ بدنی قوت میں ہم سب کو برابر کر سکتے ہیں، نہ ذہنی صلاحیتوں میں سب کو برابر کر سکتے ہیں، اور نہ قوتِ عملیہ کے اندر ہم سب کو برابر ٹھہرا سکتے ہیں، نہ قوتِ علمیہ کے اعتبار سے ہم سب کو برابر ٹھہرا سکتے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت یہ درجات خود بخود متفاوت ہوتے چلے جاتے ہیں، کسی کے لئے خوش حالی، کسی کے لئے تنگی، کسی کے پاس کوئی چیز ہے، کسی کے پاس کوئی چیز نہیں ہے۔

درجات کے تفاوت میں حکمت

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میں یہ درجات میں ترقی ایک دوسرے کے مقابلے میں اس لئے دیتا ہوں، لِيَتَّخِذَ بَعْضُهُمْ بَعْضًا سُخْرِيًّا: تاکہ بعض بعض کو خدمت گار بنالیا کریں، ایک دوسرے سے کام لے لیا کریں۔ ایک دن پہلے بھی آپ کے سامنے اس مضمون کی وضاحت میں نے کی تھی، کہ انسان اگر دُنیا میں ایک دُوسرے کے کام آتا ہے تو اسی وجہ سے ہی آتا ہے کہ ایک دوسرے کی طرف احتیاج ہے، ایک چیز آپ کے پاس ہے، میرے پاس نہیں، ایک میرے پاس ہے، آپ کے پاس نہیں، ایک چیز سرمایہ دار کے پاس ہے، غریب کے پاس نہیں، ایک غریب کے پاس ہے، سرمایہ دار کے پاس نہیں، تو یہ درجات کا تفاوت انسان کو انسان کے ساتھ جوڑتا ہے اور لوگ ایک دوسرے کے کام آتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ نے ایک بہت ہی فطری دلیل کے ساتھ ظاہر کردیا کہ تقسیم ہر چیز کی اللہ کے ہاتھ میں ہے، جب یہ روزمرہ کی روزی اور روزمرّہ کی روٹی اور ضروریات یہ تم ایک درجے میں مہیا نہیں کرسکتے، اس میں تفاوت ہے، اللہ نے تقسیم تمہارے ہاتھ میں نہیں رکھی، تو نبوّت تو ایک بہت اعلیٰ چیز ہے، وہ تو ایک رحمتِ خاصہ ہے، خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ جس طرح سے کہا کہ تیرے ربّ کی رحمت تو ان سب چیزوں سے افضل اور اعلیٰ ہے جن کو یہ اکٹھا کرتے ہیں، تو وہ اِن کی مرضی کے مطابق کس طرح سے تقسیم ہوجائے؟ تو یہ بطور دلیل کے ذکر کردی کہ اللہ کی رحمت یعنی نبوّت یہ اللہ کے دینے سے ملتی ہے، اس لئے ان کا تجویز کرنا کہ یہ فلاں شخص کو ملنی چاہیے، فلاں کو نہیں ملنی چاہیے، یہ اپنے مرتبے سے ان کا تجاوز ہے اور یہ بات ان کے لئے مناسب نہیں، یہ تو اپنی معیشت پر خود کنٹرول حاصل نہیں کرسکتے، اس کی تقسیم بھی ہم نے اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔

اصل میں بات تو کہی جارہی ہے نبوت کے متعلق ان کے اس اِشکال کو دُور کرنے کے لئے کہ کسی بڑے آدمی کو کیوں نہ ملی؟ لیکن اس میں اللہ تعالیٰ نے جو نظامِ معیشت رکھا ہے، اس کی حکمت کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، اور اِنسان کے سامنے ایک صحیح راہنمائی حاصل ہوگئی، کہ یہ اللہ تعالیٰ کی تقسیم ہے، اللہ تعالیٰ جس کو چاہتا ہے اُونچا کرتا ہے، جس کو چاہتا ہے نیچا کرتا ہے، اور اس طرح سے تفاوت کا پایا جانا یہی نظامِ عالم کے لئے ضروری ہے، تاکہ لوگ ایک دوسرے سے کام لیتے رہیں، تو جیسی جیسی صلاحیتیں ہوں گی جیسے جیسے اللہ کی طرف سے اسباب مہیا ہوں گے، ویسے ویسے درجات بنتے چلے جائیں گے، کسی کے لئے اُونچا، کسی کے لئے نیچا، کسی کے لئے تنگی، کسی کے لئے خوش حالی، تو فطری نظامِ معیشت یہی ہے، اس میں یہ کوشش کرنا کہ بالکل سب برابر ہوجائیں، سب کو مساوات حاصل ہوجائے، یہ آپ تب کرسکتے ہیں کہ بچے ایک جیسے پیدا ہوں، صلاحیتیں ایک جیسی ہوں، قوت ایک جیسی ہو، علم ایک جیسا ہو، اور اسی طرح سے اسباب سب کے لئے ایک جیسے مہیا ہوں، تو آپ جانتے ہیں کہ یہ چیزیں ساری کی ساری ایسی ہیں کہ اگر آپ ان میں دخل دینے کی کوشش کریں گے تو قدرت کے ساتھ اور فطرت کے ساتھ ایک جنگ ہے، جس کے اُوپر کبھی بھی آپ قابو نہیں پاسکتے، پہلی بات تو یہ کہی گئی، وَرَحْمَتُ رَبِّكَ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ تک تو جواب کی یہ نوعیت ہے۔

دُوسرا جواب: ''رجل عظیم'' کا معیار دولت نہیں!

اور دوسرا جواب جو دیا گیا اس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے یہ سمجھ لیا کہ جس کے پاس مال و دولت ہو وہ رجل عظیم ہوتا ہے؟ عظمت مال و دولت کے ساتھ حاصل ہوتی ہے؟ ہماری نظر میں مال و دولت کوئی چیز نہیں ہے، دنیا کا مال و دولت جس کو آپ سونے چاندی کے ساتھ تعبیر کر سکتے ہیں اس کی حیثیت تو ایسی ہے کہ اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ اپنی کمزوری کی بنا پر ایک ہی طریقے پہ ہو جائیں گے، یعنی جس وقت ان کو یہ پتا چلے کہ دولت حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ کُفر اختیار کرو، تو اکثر و بیشتر لوگ اپنی کمزوری کی بنا پر کُفر کی طرف بھاگ جائیں گے، اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا تو ہم تو سونا چاندی کافروں کے اُوپر اس طرح سے نچھاور کرتے کہ ان کے گھر سونے چاندی کے ہوتے، ان کی چھتیں سونے چاندی کی ہوتیں، ان کی سیڑھیاں سونے چاندی کی ہوتیں، ان کے دروازے سونے چاندی کے ہوتے، یہ سونے چاندی کے تختوں پر لیٹتے اور بیٹھتے، ہم اتنی وسعت کر دیتے کافروں کے لئے، اور یہ سب کچھ اس لئے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اس مال و دولت کی قدر کوئی نہیں، اس مال و دولت کے ڈھیر کو دیکھ کر جو تم ان کی عظمت کا اعتراف کرتے ہو، تو یہ تمہاری اپنی ذہنی غلطی ہے، سونا چاندی کوئی چیز نہیں، بلکہ لوگوں کے اُوپر یہ اللہ تعالیٰ کی ایک رحمت ہے کہ اس نے کُفر کے ساتھ اس مال داری کو لازم نہیں کیا، آپ دیکھیں گے کہ ایک آدمی کافر بھی ہے تو بھی فاقہ مرتا ہے، اس لئے ان چیزوں کا کُفر اور ایمان کے اُوپر مدار نہیں رکھا گیا، اگر یہ بات نہ ہوتی تو اللہ تعالیٰ کافروں کے لئے سونے چاندی کے دریا بہا دیتا، اور یہ اس لئے ہے کہ اللہ کے نزدیک ان چیزوں کی قدر کوئی نہیں، تو تم اس کو ایک رجل عظیم کیسے قرار دیتے ہو؟ کہ جس کے پاس سونا زیادہ ہے یا جس کے پاس چاندی زیادہ ہے، یہ کوئی عظمت کی دلیل نہیں ہے، جیسے حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اگر اس دُنیا کی قدر و قیمت اللہ تعالیٰ کے نزدیک ایک مچھر کے پَر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو پانی کا گھونٹ نہ ملتا،(۱) لیکن اللہ تعالیٰ نے دُنیا کے اندر اس دولت کی تقسیم کا نظام ایک علیحدہ بنایا ہے، کسی کے پاس پیسے کا آ جانا اس کی عظمت کی دلیل نہیں ہے، نہ اس بات کی دلیل ہے کہ اب یہ نبوّت کے قابل بھی ہو گیا، یا اللہ تعالیٰ کا یہ مقبول ہے منظور ہے، اللہ تعالیٰ کی اس کے اوپر ایسی عنایت ہے کہ ہر قسم کی قیادت سیادت اسی کے لئے ہونی چاہیے، مال اور دولت کو تم اس درجے کی چیز نہ سمجھو، عظمت اس مال و دولت کے ذریعے سے حاصل نہیں ہوتی۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ اگر آپ دُنیا میں دیکھیں گے تو بڑے بڑے حکیم، بڑے بڑے عقل مند، بڑے بڑے سمجھ دار، اور نہایت اچھے اخلاق کے مالک وہ آپ کو فاقہ مست نظر آئیں گے، اور ایسے جاہل کہ جن کو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں، وہ آپ کو بڑے خوش حال نظر آئیں گے، احمق قسم کے لوگ جن کی عقل بھی ٹھکانے نہیں، وہ خوش حال ہوتے ہیں، تو یہ سمجھ لینا کہ رزق کی وسعت یہ کوئی اعلیٰ انسان کی علامت ہے، یا عظمت والے انسان کی علامت ہے، یہ بات غلط ہے، اس طرح سے نہیں ہوا کرتا، دُوسرے جواب کا حاصل یہ ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر اس بات کا اندیشہ نہ ہوتا کہ لوگ سارے ایک ہی جماعت ہو جائیں گے، ایک ہی جماعت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کُفر کے ساتھ اس دولت مندی کو ہم لازم کر دیتے تو اکثر و بیشتر لوگ اپنی کمزوری

(۱) لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللهِ جَنَاحَ بَعُوضَةٍ مَا سَقَى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةً (ترمذی ۲/ ۵۸، باب ما جاء فی هوان الدنیا علی الله/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۴۱، کتاب الرقاق)

کی بنا پر جب یہ دیکھتے کہ دُنیا کی خوش حالی اور دُنیا کا دولت حاصل ہونے کا ذریعہ کُفر اختیار کرنا ہے تو فوراً کُفر کی طرف دوڑ جاتے، اکثر انسان اس طرح سے کرتے، کُل نہیں، کیونکہ بعض انسان تو اس وقت بھی ایسے موجود ہیں کہ اگر ان کو یقین ہو جائے کہ اگر ہم کُفر اختیار کرلیں گے، مرتد ہو جائیں گے تو ہمیں بہت دولت حاصل ہو جائے گی، لیکن اپنے ایمان کو وہ محفوظ رکھتے ہیں اور دُنیا کی دولت کو ٹانگ مار دیتے ہیں، پروانہیں کرتے، لیکن اکثریت ایسی ہے کہ دولت کو دیکھ کے، وسعت کو دیکھ کے وہ ادھر پھسل جاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہ بھی انسانوں پر رحم کیا ہے کہ کُفر کے ساتھ اتنی خوش حالی نہیں دی، ورنہ لوگ ایمان کی طرف کم آتے اور کُفر کی طرف زیادہ سے زیادہ چلے جاتے، یعنی اکثریت قریب کُل کے ایسے ہو جاتے جو اس کُفر کو اختیار کرتے، دُنیوی راحت کو حاصل کرنے کے لئے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر یہ بات نہ ہوتی یہ اندیشہ نہ ہوتا تو ہم تو کافروں کے لئے جو رحمٰن کا انکار کرتے ان کے لئے، یعنی ان کے گھروں کے لئے چھتیں بنا دیتے چاندی کی، اور سیڑھیاں جن کے اُوپر چڑھتے اُترتے ہیں، اور ان کے گھروں کے لئے دروازے اور ان کی چارپائیاں اور تخت جن کے اُوپر یہ آرام کرتے ہیں، سب سونے چاندی کے بنا دیتے، اور یہ سب اسی لئے ہے کہ یہ دُنیوی زندگی کا سامان ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں، وَالْاٰخِرَۃُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِیْنَ: اصل حاصل کرنے کی چیز آخرت ہے اور وہ اللہ تعالیٰ متقین کو دے گا، ''آخرت تیرے رَبّ کے نزدیک متقین کے لئے ہے'' یعنی آخرت کی نعمتیں یہ ہیں باقی رہنے والی، دُنیوی نعمتیں فانی ہیں، عارضی طور پر اِستعمال کے لئے دی گئی ہیں، آخرت کی نعمتیں اللہ تعالیٰ نے متقین کے لئے رکھی ہیں، تقوے کی بنا پر ان کو حاصل کیا جائے گا، تو اس جواب کا حاصل یہ ہوا کہ مال و دولت کا حاصل ہونا یہ کوئی عظمت کی دلیل نہیں ہے، دُنیا کے اندر آپ دیکھتے ہیں کہ کنجر، مراثی اور اس قسم کے گھٹیا درجے کے لوگ جن کو تمام دُنیا میں ایک نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے، مال و دولت کے اعتبار سے بسا اوقات وہ عام آبادی کے مقابلے میں فائق ہوتے ہیں۔

تو دو جواب ہو گئے ان کے اس اِشکال کے! انہوں نے کہا تھا کہ یہ نبوت کسی بڑے آدمی کو کیوں نہیں ملی؟ یا اللہ کی کلام کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُتری؟ اور بڑے آدمی سے مراد ان کے نزدیک مال دار آدمی۔ تو دو طرح سے جواب دے دیا گیا کہ یہ تقسیم تمہارے ہاتھ میں نہیں، جس طرح سے دُنیا کی روزی کی تقسیم تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے تو یہ رُوحانی روزی کی تقسیم بھی تمہارے ہاتھ میں نہیں ہے۔ دُوسرا یہ ہے کہ مال و دولت کے حاصل ہونے کی بنا پر کسی آدمی کو عظیم قرار دینا یہ بھی تمہاری ذہنی غلطی ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک یہ دُنیوی مال و دولت کا یہ درجہ نہیں ہے کہ جس کے پاس یہ ہو، اسی کو عظمت والا قرار دیا جائے اور اسی کو اعلیٰ قرار دیا جائے، اللہ تعالیٰ نے یہ اپنی حکمت کے تحت کسی کو کم دیا، کسی کو زیادہ دیا، اس کے اصول اور ہیں جو اللہ کے علم میں ہیں، اور اللہ کی حکمت کے تحت ہیں، باقی! اس مال و دولت کا حاصل ہو جانا یہ کوئی عظمت کی دلیل نہیں، حاصل کرنے کی چیز آخرت ہے جو باقی اور دائم ہے، اور اس کے اُوپر فنا آنے والی نہیں، وہ اللہ تعالیٰ متقین کو دے گا، تقوے کی برکت سے حاصل کی جاسکتی ہے۔ تو ان دونوں جوابوں کے ساتھ وہ اِشکال دُور ہو گیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کو مسکین دیکھتے ہوئے، یتیم دیکھتے ہوئے، یا یہ سمجھتے ہوئے کہ ان کے ساتھ خادم نہیں ہیں، ان کے ساتھ کوئی ایسی بڑی چیز نہیں ہے، تو یہ نبوت کے قابل بھی نہیں، یہ نظریہ تمہارا غلط ہے!

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ ۝۳۶ وَاِنَّهُمْ

جو شخص رحمٰن کے ذکر سے اندھا بنتا ہے، ہم اس کے لئے شیطان متعین کر دیتے ہیں، پس وہ شیطان اس کا ساتھی ہوتا ہے ۝۳۶ اور بے شک وہ شیاطین

لَيَصُدُّوْنَهُمْ عَنِ السَّبِيْلِ وَيَحْسَبُوْنَ اَنَّهُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۳۷ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَنَا قَالَ

البتہ روکتے ہیں ان لوگوں کو راستے سے اور یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ وہ راہ پانے والے ہیں ۝۳۷ حتیٰ کہ یہ شخص جس وقت ہمارے پاس آئے گا تو کہے گا

يٰلَيْتَ بَيْنِيْ وَبَيْنَكَ بُعْدَ الْمَشْرِقَيْنِ فَبِئْسَ الْقَرِيْنُ ۝۳۸ وَلَنْ يَّنْفَعَكُمُ الْيَوْمَ

اے کاش! میرے اور تیرے درمیان مشرق مغرب کا فاصلہ ہوتا، پس شیطان بہت برا ساتھی ہے ۝۳۸ ہرگز نفع نہیں دے گی تمہیں آج

اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّكُمْ فِى الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ ۝۳۹ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِى

جب کہ تم نے ظلم کیا، کیونکہ تم سب کے سب عذاب میں شریک ہونے والے ہو ۝۳۹ کیا پھر تو سنا سکتا ہے بہروں کو، یا تو راستہ دکھا سکتا ہے

الْعُمْىَ وَمَنْ كَانَ فِىْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝۴۰ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ ۝۴۱

اندھوں کو اور اس شخص کو جو کہ صریح گمراہی میں ہے ۝۴۰ اگر لے جائیں ہم آپ کو پس بے شک ہم ان سے انتقام لینے والے ہیں ۝۴۱

اَوْ نُرِيَنَّكَ الَّذِىْ وَعَدْنٰهُمْ فَاِنَّا عَلَيْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ ۝۴۲ فَاسْتَمْسِكْ

یا دکھا دیں ہم آپ کو وہ چیز جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا، پس بے شک ہم ان پر قدرت پانے والے ہیں ۝۴۲ آپ مضبوطی سے تھام لیں

بِالَّذِىْٓ اُوْحِىَ اِلَيْكَ ۚ اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۴۳ وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَ

اس چیز کو جو وحی کی گئی آپ کی طرف، بے شک آپ سیدھے راستے پر ہیں ۝۴۳ بے شک یہ قرآن البتہ شرف ہے آپ کے لئے اور

لِقَوْمِكَ ۚ وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ ۝۴۴ وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ

آپ کی قوم کے لئے اور عنقریب تم سے پوچھا جائے گا ۝۴۴ پوچھ لیجئے آپ ان لوگوں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا اپنے رسولوں میں سے

اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً يُّعْبَدُوْنَ ۝۴۵

کیا ہم نے رحمٰن کے علاوہ کوئی معبود بنائے ہیں جو پوجے جاتے ہوں؟ ۝۴۵

خلاصہ آیات مع تحقیق الالفاظ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ وَمَنْ يَّعْشُ عَنْ ذِكْرِ الرَّحْمٰنِ نُقَيِّضْ لَهٗ شَيْطٰنًا فَهُوَ لَهٗ قَرِيْنٌ: عشا یعشو: بہ تکلف اندھا بننا۔

عَشِیَ یَعْشٰی کا معنی ہوتا ہے نگاہ کے اندر خرابی کا پیدا ہو جانا اور چندھا ہو جانا، یعنی بِلا اختیار، اور بابِ نصر سے ہو تو اس کا معنی ہوتا ہے باختیارِ خود، بہ تکلّف اندھا بننا، یہاں بابِ نصر استعمال ہوا ہے، "جو شخص رحمٰن کے ذِکر سے اندھا بنتا ہے" یعنی اپنے اختیار کے ساتھ رحمٰن کے ذِکر سے اِعراض کرتا ہے، نُقَیِّضْ لَہٗ شَیْطٰنًا: ہم اس کے لئے شیطان متعین کر دیتے ہیں، فَھُوَ لَہٗ قَرِیْنٌ: پس وہ شیطان اس کا ساتھی ہوتا ہے۔ قرین: اس کے ساتھ مل کے رہنے والا۔ وَاِنَّھُمْ لَیَصُدُّوْنَھُمْ عَنِ السَّبِیْلِ: اور بے شک وہ شیاطین (شیطان سے چونکہ ایک شیطان مراد نہیں ہے، بلکہ ایسے لوگوں پر متعدد شیاطین مسلط کئے جاتے ہیں) بے شک وہ شیاطین البتہ روکتے ہیں ان لوگوں کو راستے سے وَیَحْسَبُوْنَ: اور یہ لوگ سمجھتے ہیں اَنَّھُمْ مُّھْتَدُوْنَ: کہ وہ راہ پانے والے ہیں۔ حَتّٰۤی اِذَا جَآءَنَا: حتّٰی کہ یہ شخص جس وقت ہمارے پاس آئے گا، یعنی جس کو شیطان نے گمراہ کیا، جو رحمٰن کے ذِکر سے اندھا بنا، جب وہ ہمارے پاس آئے گا، قَالَ: کہے گا یٰلَیْتَ بَیْنِیْ وَبَیْنَکَ بُعْدَ الْمَشْرِقَیْنِ: یٰلَیْتَ یہ تمنّا کے اظہار کے لئے ہے، اے کاش! میرے اور تیرے درمیان (بَیْنَکَ کا خطاب شیطان کو ہے) میرے اور تیرے درمیان مشرقین کا بُعد ہوتا، مشرقین یہ مشرق کا تثنیہ ہے اور مراد یہاں مشرق اور مغرب ہیں، یعنی میرے اور تیرے درمیان اتنا فاصلہ ہوتا جتنا مشرق اور مغرب میں ہوتا ہے۔ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ: بِئْسَ الْقَرِیْنُ اَنْتَ، تُو بہت بُرا ساتھی ہے، یا: شیطان بہت بُرا ساتھی ہے۔ وَلَنْ یَّنْفَعَکُمُ الْیَوْمَ اِذْ ظَّلَمْتُمْ اَنَّکُمْ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ: ہرگز نفع نہیں دے گا تمہیں آج جبکہ تم نے ظلم کیا (اَنَّکُمْ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ یہ لَنْ یَّنْفَعَکُمْ کا فاعل ہے) بے شک تم عذاب میں مشترک ہو گے، تم سب کا آپس میں عذاب میں شریک ہونا مشترک ہونا تمہیں کوئی نفع نہیں دے گا جبکہ تم سب کے سب قصوروار ہو، سب کے سب ظالم ہو، یعنی شیاطین بھی اور شیاطین کے گمراہ کیے ہوئے انسان بھی سب عذاب میں شریک ہو گئے تو سب کا عذاب میں شریک ہو جانا کسی کے لئے نافع نہیں ہے، یا مطلب یہ ہے کہ آج کے دِن اس قسم کی تمنّا کرنا کوئی نفع نہیں دے گا تمہیں، جو آج تمنّا کرتے ہو کہ کاش! ہمارے درمیان دُوری ہوتی یہ کوئی چیز نافع نہیں، اور اَنَّکُمْ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ یہ مقامِ علت میں آجائے گا (عام تفاسیر)، لِاَنَّکُمْ فِی الْعَذَابِ مُشْتَرِکُوْنَ، کیونکہ تم سب کے سب عذاب میں شریک ہونے والے ہو۔

تفسیر

ذِکرِ رَحمٰن سے اِعراض کا نتیجہ

پچھلے رُکوع میں مشرکین کے نبوّت کے بارے میں کچھ اِشکالات ذِکر کیے گئے تھے، کہ اللہ کا نبی سرمایہ دار ہوتا، بڑا ہوتا، کوئی رجلِ عظیم ہوتا۔ اللہ تبارک وتعالیٰ نے اس کی وضاحت فرمائی، اور اتنا سمجھانے کے باوجود وہ مشرک جو نہیں سمجھتے تھے تو ان آیات میں اس کی وجہ ذِکر کی گئی ہے، کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی عادت ہے کہ جو شخص بھی بہ تکلّف اللہ کی نصیحت سے اعراض کرتا ہے، ذِکر سے اِعراض کرتا ہے، تو اس پر شیطان مسلط کر دیتا ہے، شیطان جنوں میں سے بھی ہوتے ہیں اور اِنسانوں میں سے بھی ہوتے ہیں، اللہ کی یاد اور اللہ کے ذِکر کی یہ خاصیت ہے کہ انسان شیاطین سے محفوظ رہتا ہے، حدیث شریف میں آتا ہے[1] کہ شیطان

(۱) اَلشَّیْطَانُ جَاثِمٌ عَلٰی قَلْبِ ابْنِ اٰدَمَ فَاِذَا ذَکَرَ اللہَ خَنَسَ مشکوٰۃ ۱/۱۹۹ باب ذکر اللہ، فصل ثالث۔

انسان کے قلب پر بیٹھا رہتا ہے اور اس میں وسوسے ڈالتا ہے، اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ خَنَسَ، جب اللہ کو یاد کیا جائے تو پھر یہ شیطان پیچھے کو ہٹ جاتا ہے، اس لئے شیطان کا ایک لقب ''خناس'' بھی ہے، پیچھے ہٹنے والا، بدک جانے والا، اللہ کا نام سُن کر پیچھے کو ہٹتا ہے، تو جو اللہ کی یاد کی طرف لگا ہوا ہو اور اللہ کی نصیحتوں کی طرف توجہ رکھے، تو اس پر جنوں میں جو شیاطین ہیں وہ بھی اثر انداز نہیں ہوتے، اور یہ واقعہ ہے کہ اسی طرح سے اللہ کی نصیحت پر کان دھرنے والوں پر کوئی انسانی شیطان بھی اثر نہیں ڈال سکتا، بُرے لوگ خود اس شخص سے دُور ہٹنے لگ جاتے ہیں جو شخص اللہ کی یاد میں لگا ہوا ہو، بُرے لوگ اسی کے اردگرد اکٹھے ہوا کرتے ہیں جس کے اندر خود بُرائی ہے اور بُرائی قبول کرنے کا جذبہ ہے، اور اگر کسی کے اندر خود بُرائی نہ ہو اور بُرائی قبول کرنے کا جذبہ نہ ہو تو بُرے لوگوں کو اس سے مناسبت ہی نہیں ہوتی۔

بُرے دوست آخرت میں حسرت وافسوس کا باعث

تو اللہ کے ذِکر سے غفلت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بُرے لوگ ساتھی بن جاتے ہیں، جب بُرے لوگ ساتھی بن جاتے ہیں تو پھر آپس میں مل کے بُرائی کے اندر ترقی ہو جاتی ہے، لیکن وہ سمجھتے یہی ہیں کہ ہم سیدھے راستے پہ جا رہے ہیں، شیطان ان کو بھٹکا رہا ہے، بُرے دوست ترغیب دے کے بُرائی کی طرف لے جا رہے ہیں، لیکن اللہ کے ذِکر سے غفلت کے نتیجے میں انسان کا دماغ ایسا چکرا جاتا ہے کہ وہ جا رہا ہے بربادی کی طرف، ہلاکت کی طرف، اور سمجھ یہ رہا ہے کہ میں سیدھے راستے پہ جا رہا ہوں، اور یہی میرے لئے فائدے کی چیز ہے۔ تو آج تو اس طرح سے آپس میں دوستیاں نبھاتے ہیں، شیاطین اکٹھے ہو کر، بُرے انسان آپس میں اکٹھے ہو کر دوستیاں نبھاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو طریقہ ہم نے اپنا رکھا ہے، یہ ٹھیک ہے، کامیابی کا طریقہ ہے، لیکن جس وقت ہمارے پاس آجائے گا یہ شخص جو اللہ کے ذِکر سے غافل ہوا تھا، جس کے نتیجے میں اس کو بُرے ساتھی مل گئے تھے، چاہے جنوں میں سے، چاہے انسانوں میں سے، جب ہمارے سامنے آجائیں گے پھر دیکھیں گے کہ اس کا کیا نتیجہ نکلا! تو اس وقت پھر تمنا کریں گے کہ ہائے کاش! جس کو میں دوست سمجھے ہوئے تھا میرے درمیان اور اس کے درمیان اتنی دُوری ہوتی کہ میں مشرق میں ہوتا تو یہ مغرب میں ہوتا، دونوں میں بُعد المشرقین ہوتا، اس کو خطاب کر کے کہے گا کہ تیری رفاقت کی وجہ سے میں بُرائی میں مبتلا ہوا، تُو نے مجھے سیدھے راستے سے بھٹکایا، کیا ہی اچھا ہوتا کہ ہم دونوں آپس میں قریب نہ ہوتے، بلکہ ہمارے درمیان بعد المشرقین ہوتا، اتنا فاصلہ ہوتا جتنا مشرق اور مغرب کے درمیان ہوتا ہے، یعنی دُنیا کے اندر انسان اپنے دوستوں کے متعلق جذبات ایسے رکھتا ہے جس کو آپ کہا کرتے ہیں کہ۔

''خاک ایسی زندگی پہ تم کہاں اور ہم کہاں''

چند لمحوں کی جدائی بھی برداشت نہیں ہوتی، لیکن قیامت کے دِن جب اس دوستی کے نتیجے سامنے آئیں گے، اس وقت اس قسم کی تمنا ہوگی۔ اور اس مضمون کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ فرقان کے اندر آ چکی ہے، یٰوَیْلَتٰی لَیْتَنِیْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِیْلًا (آیت:۲۸) جہاں یہ آیت آئی تھی اس کے تحت اس کی تفصیل عرض کردی گئی تھی۔ فَبِئْسَ الْقَرِیْنُ: بُرا ساتھی ہے، یعنی تُو بُرا ساتھی

ہے،بِئْسَ الْقَرِيْنُ اَنْتَ، یا بِئْسَ الْقَرِيْنُ هُوَ ،شیطان کی طرف ضمیر لوٹ جائے گی، یہ شیطان بہت بُرا ساتھی ہے جو انسان کو بربادی کی طرف لے جاتا ہے، یا، اسی وقت وہ اس کو خطاب کر کے کہے گا کہ کاش! میرے اور تیرے درمیان بعد المشرقین ہوتا، تو بہت بُرا ساتھی ہے۔تو اس میں متنبہ کرنا مقصود ہے کہ اللہ کی یاد میں لگو تو تم بُرے لوگوں سے بھی محفوظ رہ جاؤ گے،شیطان کے اثر سے بھی محفوظ رہ جاؤ گے، اور جن کے ساتھ تم نے آج دوستیاں لگا رکھی ہیں، اور تمہیں وہ اللہ کے راستے سے مزید بھٹکاتے جا رہے ہیں، قیامت کے دِن ان دوستیوں کے اُوپر تم حسرت کرو گے۔

جہنّم کے عذاب کی تکلیف ''جشن'' نہیں بنے گا

پھر جب سب مل کے جہنّم کے اندر چلے جائیں گے یار دوست، تو پھر دُنیا کے اندر یہ قاعدہ ہے ''مرگِ انبوہ جشنے دارد'' لوگ کہا کرتے ہیں کہ رل مل کے اگر کہیں مرنا بھی پڑ جائے تو ایک ''جشن'' بن جاتا ہے، اس میں تکلیف نہیں ہوا کرتی۔ ایک آدمی کو سزا ہو، دوسرے دیکھنے والے ہوں، تو اس کی سزا شدّت اختیار کر جاتی ہے، یہ احساس ہوتا ہے کہ دیکھو! مجھے سزا ہو رہی ہے، دُوسروں کو نہیں ہوئی، تو اس احساس کے ساتھ اس سزا کے اندر ایک شدّت پیدا ہو جاتی ہے، لیکن اگر بہت سارے اکٹھے ہو کر کہیں پکڑے جائیں تو ایک مشغلہ سا ہو جاتا ہے، ایک دُوسرے کی طرف دیکھ کے انسان تسلّی حاصل کر لیتا ہے کہ چلو! اگر میرے پہ یہ تکلیف آئی ہے، تو فلانے پہ بھی آئی ہے، اسی کو کہتے ہیں ''مرگِ انبوہ جشنے دارد'' کہ بہت سارے اکٹھے ہو کے اگر کسی مصیبت میں مبتلا ہو جائیں، تو ایک ''جشن'' سا بن جاتا ہے، عربی میں محاورہ اسی کے متعلق آیا کرتا ہے: ''اَلْبَلِيَّةُ اِذَا عَمَّتْ طَابَتْ'' ''مصیبت جب عام ہو جاتی ہے تو خوش گوار ہو جاتی ہے۔ لیکن اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جہنّم کے عذاب میں سب شریک ہوں گے، تو یہ سب کا شریک ہونا کوئی نفع نہیں دے گا، دُوسروں کا عذاب کے اندر مبتلا ہونا کسی کے لئے تسلّی کا باعث نہیں ہوگا، وہاں شدّت احساس کی اسی طرح سے باقی رہے گی جس طرح سے فی الواقع ہونی چاہیے، آپس میں شریک ہونا، اکٹھے ہونا، یہ کوئی ''جشن'' پیدا نہیں کرے گا، اور کوئی سزا کے اندر تخفیف کا باعث نہیں ہوگا۔

یا مطلب یہ ہے کہ جب تم ظالم ہو، قصوروار ہو، تو اَب آپس میں تمنّا کرنا دُوری کی اور ایک دُوسرے سے علیحدگی کی، اب کوئی فائدہ نہیں ہوگا، اِن تمنّاؤں سے اب کوئی فائدہ نہیں، کیونکہ تم سب کے سب عذاب میں شریک ہو گئے، عذاب میں مبتلا ہو گئے، اب تمنّا کرو، یا نہ کرو، کسی قسم کا فائدہ نہیں ہوگا، تو لَنْ يَّنْفَعَكُمُ کا فاعل اَنَّكُمْ فِي الْعَذَابِ مُشْتَرِكُوْنَ بھی ہو سکتا ہے، اور ''تمنّا کرنا'' بھی ہو سکتا ہے جو يٰلَيْتَ کے اندر پیچھے مذکور ہے۔

تسلّی رسول

اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ اَوْ تَهْدِي الْعُمْيَ وَمَنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: کیا پھر تُو سنا سکتا ہے بہروں کو، یا تُو راستہ دِکھا سکتا ہے اندھوں کو اور اس شخص کو جو کہ صریح گمراہی میں ہے؟ عُمْيٌ اَعْمٰى کی جمع ہے، صُمٌّ اَصَمُّ کی جمع ہے، فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ فَاِنَّا مِنْهُمْ مُّنْتَقِمُوْنَ: اگر ہم آپ کو لے جائیں (''اِمَّا'' یہ ''اِن مَا'' تھا، ''مَا'' زائدہ ہے)، اگر لے جائیں ہم آپ کو پس بے شک ہم ان سے انتقام لینے

والے ہیں، اَوْ نُرِیَنَّكَ الَّذِیْ وَعَدْنٰهُمْ: یا دِکھا دیں ہم آپ کو وہ چیز جس کا ہم نے ان سے وعدہ کیا، فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ: پس بے شک ہم ان پر قدرت پانے والے ہیں، قدرت رکھنے والے ہیں، فَاسْتَمْسِكْ بِالَّذِیْۤ اُوْحِیَ اِلَیْكَ: تو مضبوطی سے تھام لے اس چیز کو جو وحی کی گئی تیری طرف، اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: بے شک آپ سیدھے راستے پر ہیں۔ یہ الفاظ سرورِ کائنات ﷺ کی تسلی کے لئے ہیں، کہ یہ تو اندھے بن گئے، اور ان کے اندھے بننے کی وجہ سے ان کے اُوپر شیاطین مسلط ہوگئے، اب یہ ایک دُوسرے کو بہکاتے ہیں، غلط راستے پر چلتے ہیں، سمجھتے یہ ہیں کہ ہم صحیح راستے پر جارہے ہیں، تو آخر نتیجہ ہوگا قیامت کے دن سب اکٹھے عذاب میں مبتلا ہوجائیں گے، پھر تمنائیں کریں گے کہ ہماری آپس میں دوستی نہ ہوتی، لیکن وہ تمنا اس وقت ان کے کوئی کام نہیں آئے گی، آپ اس کے اُوپر زیادہ غم، صدمہ نہ کیجئے، یہ لوگ حق سننے سے بہرے ہوگئے، حق دیکھنے سے اندھے ہوگئے، تو جس طرح سے کسی بہرے کو بات نہیں سنائی جاسکتی، کسی اندھے کو راہ نہیں دِکھائی جاسکتی، اسی طرح سے آپ اِن کو ہزار سمجھائیں، یہ اندھے، بہرے آپ کی بات نہ سنیں گے، نہ یہ حق کو سمجھیں گے، نہ حق کو قبول کریں گے، آپ اپنا فرض ادا کرتے جائیے، ان کے قبول نہ کرنے کے اُوپر صدمہ نہ کیجئے، تو یہاں انہی مشرکین کو ''صُمّ'' کہا جارہا، اور انہی مشرکین کو ''عُمْیٌ'' کہا جارہا ہے، جس طرح سے بعض آیات کے اندر ان کو ''اموات'' قرار دیا ہے، تو یہ مُردہ ہوچکے ہیں، بہرے ہوچکے ہیں، ان میں سننے کی صلاحیت نہیں، اندھے ہوچکے ہیں، ان میں دیکھنے کی صلاحیت نہیں ہے، کیونکہ اگر انسان کے پاس آنکھ تو ہے لیکن اس سے وہ حق نہیں دیکھتا تو نہ ہونے کے برابر ہے، کان تو ہے لیکن اس کے ساتھ وہ حق بات کو سنتا نہیں اور قبول نہیں کرتا تو نہ سننے کے برابر ہے، اسی طرح سے جب اس کے اندر حق کو قبول کرنے کی صلاحیتیں ساری کی ساری ختم ہوگئیں تو اس کا زندہ ہونا اور مُردہ ہونا برابر ہوگیا، تو یہ حضور ﷺ کے لئے تسلی ہے کہ ان کے قبول نہ کرنے پر آپ زیادہ فکر نہ کیجئے، کیونکہ یہ اندھے بہرے ہیں اور آپ کے سمجھائے ہوئے سمجھ نہیں سکتے، یہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔ اور یہ سزا سے کسی صورت میں بچیں گے نہیں، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ ہم آپ کی زندگی میں ان کے اُوپر عذاب بھیج دیں، اور آپ کی آنکھوں کے سامنے ہم ان سے انتقام لے لیں ایسا بھی ہوسکتا ہے، اور ایسا بھی ممکن ہے کہ آپ کو ہم لے جائیں، لیکن آپ کے لے جانے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سزا سے بچ جائیں گے، ان کو سزا پھر بھی ہوسکتی ہے، بہر صورت! آپ کی زندگی میں بھی اور آپ کے بعد بھی یہ عذاب میں مبتلا ہوں گے، ہم ان سے انتقام لیں گے، گرفت کریں گے، لیکن یہ ضروری نہیں کہ آپ کی زندگی میں آپ کے سامنے ان کا نتیجہ آجائے، اگر آپ وفات بھی پاجائیں تو بھی ہماری ان کے اوپر قدرت قائم ہے، اور اگر ہم چاہیں تو آپ کے سامنے بھی اِن کو سزا دے سکتے ہیں۔ فَاِمَّا نَذْهَبَنَّ بِكَ: اگر لے جائیں ہم آپ کو، یعنی آپ کی وفات ہوجائے، بے شک ہم ان سے انتقام لینے والے ہیں، یعنی آپ کی وفات ہوجانے کے ساتھ یہ مسئلہ ختم نہیں ہوجائے گا، بلکہ انتقام اِن کے لئے اسی طرح سے موجود ہے اور ہم اِن سے انتقام لے سکتے ہیں، ''یا ہم دکھادیں آپ کو وہ چیز جس کا ہم اِن سے وعدہ کرتے ہیں'' یعنی جس عذاب کا ہم وعدہ کررہے ہیں آپ کے سامنے وہ نمایاں کردیں تو یہ بھی ہماری قدرت ہے، فَاِنَّا عَلَیْهِمْ مُّقْتَدِرُوْنَ: ہم اِن کے اوپر قدرت رکھنے والے ہیں، آپ کا فرض یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے جو حکم آپ کو دیا گیا آپ اس کو مضبوطی سے تھامے رکھیں، اور اس حکم

میں یہ حکم تبلیغ بھی ہے، کہ آپ اِن کو ڈراتے رہیے، اِن تک اللہ کے پیغام پہنچاتے رہیے، اِس فکر میں نہ پڑو کہ یہ مانتے کیوں نہیں، ''مضبوطی سے تھام لیجئے اس چیز کو جو آپ کی طرف وحی کی گئی'' اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ: بے شک آپ سیدھے راستے پر ہیں۔

''وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ'' کے دو مفہوم

وَاِنَّهٗ لَذِكْرٌ لَّكَ وَلِقَوْمِكَ: اِنَّهٗ کی ضمیر قرآنِ کریم کی طرف لوٹ رہی ہے، بے شک یہ قرآن کریم البتہ ذکر ہے تیرے لیے اور تیری قوم کے لئے، وَسَوْفَ تُسْئَلُوْنَ: اور عنقریب تم سے پوچھا جائے گا۔ ذِکر کے یہاں دو معنی ہیں: ۱- آپ کے لئے بھی نصیحت ہے اور آپ کی قوم کے لئے بھی نصیحت ہے، اور تم سب پوچھے جاؤ گے کہ اس نصیحت پر کتنا عمل کیا؟...... ۲- اور ذِکر کا معنی شرف اور شہرت بھی لیا گیا ہے۔ ''یہ قرآن آپ کے لئے بھی شرف ہے اور آپ کی قوم کے لئے بھی شرف ہے'' اللہ کی کلام آپ پر اُتری، اس سے آپ کو بھی شرف حاصل ہوا، اور آپ کی قوم کو اس کا مخاطب اوّل بنایا گیا، یہ اس قوم کے لئے بھی شرف کی بات ہے، کتنی بڑی عزت ہے اس قوم کے لئے کہ اللہ نے اپنی کلام اُن کی زبان میں اُتاری اور اوّل مخاطب اُن کو بنایا، تو چاہیے تو یہ تھا کہ اس شرف کی وہ رعایت رکھتے اور اللہ کی اس نصیحت کو قبول کرتے، اللہ کی اس کتاب کی قدر کرتے، لیکن انہوں نے اس کی قدر نہ کی، تو تُسْئَلُوْنَ کا مطلب یہ ہوگا کہ عنقریب تم سے پوچھا جائے گا کہ تم نے اس نعمت کی کیا قدر کی اور کیا نہیں کی؟ تو ذِکر کا معنی شرف بھی کیا گیا ہے، یہ آپ کے لئے بھی شرف کا باعث ہے، اور آپ کی قوم کے لئے بھی شرف کا باعث ہے۔

توحید کی دعوت تمام انبیاء ﷩ نے دی ہے

وَسْئَلْ مَنْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رُّسُلِنَآ: پوچھ لیجئے آپ ان لوگوں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے بھیجا اپنے رسولوں میں سے، جو رسول ہم نے آپ سے پہلے بھیجے ہیں آپ ان سے پوچھ لیجئے، کیا پوچھ لیجئے؟ اَجَعَلْنَا مِنْ دُوْنِ الرَّحْمٰنِ اٰلِهَةً یُّعْبَدُوْنَ: کیا ہم نے رحمٰن کے علاوہ کوئی معبود بنائے ہیں جو پُوجے جاتے ہوں؟ یعنی جو مسئلۂ توحید آپ پیش کرتے ہیں، جس کو یہ قوم قبول نہیں کررہی، اور قرآن کی یہ جو تعلیم ہے جو آپ کے اُوپر نازل کی گئی، یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو صرف آپ پر ہی نہیں اُتارا گیا، بلکہ آپ سے پہلے جتنے انبیاء ﷩ گزرے سب کی طرف ہم نے وحی یہی کی، جیسے سورۂ انبیاء کے اندر آیا تھا: وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا نُوْحِیْٓ اِلَیْهِ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدُوْنِ (آیت: ۲۵) جو بھی نبی آیا ہم نے اس کی طرف یہی وحی کی کہ میرے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، میری ہی عبادت کرو، یہ تمام انبیاء ﷩ کا متفق علیہ مسئلہ ہے، ''آپ ان سے پوچھ لیں جن کو ہم نے پہلے بھیجا ہے'' اس پوچھنے کا کیا مطلب؟ یا تو یہ مطلب ہے کہ اگر کہیں انبیاء ﷩ کے ساتھ ملاقات ہو جائے تو آپ ان سے پوچھ لیں، وہ سب بتائیں گے کہ مسئلہ یہی ہم نے بیان کیا جو آپ بیان کررہے ہیں، اس لیے آپ کے بیان کردہ اس مسئلے میں کوئی شک شبہ کی تو گنجائش نہیں، نہ ماننے والوں کا قصور ہے۔ یا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ ان انبیاء ﷩ کی کتابوں سے تحقیق کرلو، ان کے صحیفوں سے تحقیق کرلو، ان کے جو ملفوظات، ان کی جو باتیں مروّج چلی آرہی ہیں، ان سے معلوم کرلو، کسی کی کتاب سے کسی مسئلے کو معلوم کرنا ایسا ہوتا ہے گویا کہ اس

کے مؤلف سے پوچھ لیا، توراۃ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اُتری، وہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہے، توراۃِ موسوی، تو جو مسئلہ توراۃ میں لکھا ہوا ہوگا تو ہم یہ کہیں گے کہ موسیٰ علیہ السلام کا یہی مسئلہ ہے، اِنجیل سے کسی بات کو معلوم کرلیا جائے تو ہم کہیں گے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا یہی مسئلہ ہے، تو یہ کتابیں جو اَنبیاء علیہم السلام لے کے آئے ہیں، ان کتابوں میں تحقیق کرنا یہ ایسے ہی ہے جیسے کہ ان انبیاء علیہم السلام سے پوچھ لیا، تو جب تحقیق کریں گے تو آپ کے سامنے بات یہی آئے گی کہ آپ سے قبل جتنے رسول آئے ہیں سب یہی مسئلہ لے کر آئے تھے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا معبود نہیں، یہ مسئلہ متفق علیہ ہے، اس لیے آپ اگر اس کو بیان کرتے ہیں تو آپ کا بیان کرنا صحیح، اور یہ لوگ اگر نہیں مانتے تو ان کا نہ ماننا ان کی غلطی ہے، ''پوچھ لیجئے آپ ان لوگوں سے جو آپ سے پہلے ہم نے بھیجے'' مِنْ رُّسُلِنَا یہ مَنْ کا بیان ہے، ''جو رسول ہم نے آپ سے پہلے بھیجے ان سے پوچھ لیجئے کیا ہم نے رحمٰن کے علاوہ کوئی معبود بنائے ہیں جو پُوجے جاتے ہوں، جن کی عبادت کی جاتی ہو؟'' یعنی وہ رسول بھی یہی بتائیں گے کہ رحمٰن کے علاوہ کوئی دُوسرا اِلٰہ نہیں ہے جس کی عبادت کی جائے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ىِٕهٖ فَقَالَ اِنِّیْ رَسُوْلُ رَبِّ

البتہ تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں ربّ العالمین کا

الْعٰلَمِیْنَ ﴿٤٦﴾ فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰیٰتِنَاۤ اِذَا هُمْ مِّنْهَا یَضْحَكُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَمَا نُرِیْهِمْ

رسول ہوں ﴿٤٦﴾ جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس ہماری آیات لے کر آئے اچانک وہ فرعونی ہماری آیات سے ہنستے تھے ﴿٤٧﴾ اور نہیں دِکھاتے تھے ہم انہیں

مِّنْ اٰیَةٍ اِلَّا هِیَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا ۫ وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿٤٨﴾ وَقَالُوْا

کوئی نشانی مگر وہ بڑی ہوتی تھی اپنے جیسی دُوسری نشانی سے، اور ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا تا کہ وہ لوگ لوٹ آئیں ﴿٤٨﴾ اور وہ فرعونی کہتے

یٰۤاَیُّهَ السّٰحِرُ ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ ﴿٤٩﴾

کہ اے جادوگر! پکار ہمارے لیے اپنے رَبّ کو اس طریقے کے مطابق جو تجھے معلوم ہے، بے شک ہم البتہ راہ پانے والے ہیں ﴿٤٩﴾

فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِذَا هُمْ یَنْكُثُوْنَ ﴿٥٠﴾ وَنَادٰی فِرْعَوْنُ فِیْ قَوْمِهٖ

پس جس وقت ہم ان سے عذاب دُور ہٹا دیتے اچانک وہ (اپنے اس عہد کو) توڑ دیتے تھے ﴿٥٠﴾ فرعون نے اعلان کیا اپنی قوم میں،

قَالَ یٰقَوْمِ اَلَیْسَ لِیْ مُلْكُ مِصْرَ وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِیْ ۚ اَفَلَا

کہا: اے قوم! کیا میرے لئے مصر کی حکومت نہیں؟ اور یہ نہریں میرے نیچے سے جاری ہیں، کیا پھر

تُبْصِرُوْنَ ﴿۵۱﴾ اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ ۙ وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ ﴿۵۲﴾ فَلَوْلَآ

تم دیکھتے نہیں ہو؟ (۵۱) بلکہ میں بہتر ہوں اِس شخص سے جو کہ بے قدرا ہے اور یہ بیان کرنے کے قریب بھی نہیں جاتا (۵۲) کیوں نہیں

اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ ﴿۵۳﴾ فَاسْتَخَفَّ

ڈالے گئے اس کے اُوپر سونے کے کنگن؟ یا آتے اس کے ساتھ فرشتے قطاریں باندھ کے؟ (۵۳) پس اس نے بیوقوف بنالیا

قَوْمَهٗ فَاَطَاعُوْهُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا

اپنی قوم کو، پس ان لوگوں نے اُس فرعون کی بات مان لی، بے شک وہ بدمعاش لوگ تھے (۵۴) پھر جب انہوں نے ہمیں غصہ چڑھادیا

انْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۵۵﴾ فَجَعَلْنٰهُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِيْنَ ﴿۵۶﴾

تو ہم نے ان سے انتقام لے لیا، پھر ہم نے ان سب کو ڈبو دیا (۵۵) پھر بنادیا ہم نے ان سب کو پہلے گزرے ہوئے، اور نمونہ پچھلوں کے لئے (۵۶)

تفسیر

موسیٰ علیہ السلام اور فرعون کا واقعہ اور یہاں اس کو ذِکر کرنے کا مقصد

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ: اب اسی مضمون کی تائید کے لئے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ ذکر کیا جارہا ہے، اور مشرکینِ مکہ کے حال کے یہ مطابق ہے، کہ جس طرح سے مشرکین، سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی مسکنت کو دلیل بناتے تھے کہ یہ اللہ کا رسول نہیں ہوسکتا، اللہ کا رسول کوئی رجلِ عظیم ہونا چاہیے تھا، تو یہی ذہن فرعون کا تھا، کہ فرعون وقت کا بادشاہ تھا، بہت مال و دولت والا تھا، اُس کے مقابلے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو بھیجا گیا تو موسیٰ علیہ السلام کو ظاہری طور پر کوئی وجاہت حاصل نہیں تھی، کوئی مال و دولت والے نہیں تھے، چنانچہ فرعون نے اسی طرح سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تحقیر کی تھی جس طرح سے مشرکینِ مکہ کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالیٰ کی جب گرفت آئی تو پھر سب کے سامنے آگیا کہ موسیٰ علیہ السلام جو کچھ کہتے تھے بالکل ٹھیک تھا اور فرعون غلط تھا۔ تو آج یہ لوگ اگر اپنی دولت کے نشے میں یا اپنے جتھے کے نشے میں اور غرور میں ہیں، اور آپ کی باتیں نہیں مانتے، تو ان کو فرعون کے قصے سے عبرت حاصل کرنی چاہیے، اس نقطۂ نظر کے تحت فرعون کا قصہ آگے ذکر کیا جارہا ہے اور یہ واقعات گزر چکے ہیں، وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ: البتہ تحقیق بھیجا ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات کے ساتھ فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف، فَقَالَ اِنِّيْ رَسُوْلُ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ: موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ میں رَبّ العالمین کا رسول ہوں، فَلَمَّا جَآءَهُمْ بِاٰيٰتِنَآ: جب موسیٰ علیہ السلام ان کے پاس ہماری آیات لے کر آئے، اِذَا هُمْ مِّنْهَا يَضْحَكُوْنَ: اچانک وہ فرعونی ہماری آیات سے ہنستے تھے، موسیٰ علیہ السلام جو باتیں بیان کرتے، ان کے سامنے جو معجزات ظاہر کرتے تو فرعونی ہنستے، مذاق اُڑاتے، وَمَا نُرِيْهِمْ مِّنْ اٰيَةٍ: اور نہیں دکھاتے تھے ہم انہیں کوئی نشانی، اِلَّا هِيَ اَكْبَرُ مِنْ اُخْتِهَا: مگر وہ بڑی ہوتی تھی

اپنے جیسی دُوسری نشانی سے، اپنی بہن سے بڑی ہوتی تھی، اُخت بہن کو کہتے ہیں، لیکن یہاں مثل مراد ہے، جو نشانی ہم ان کے سامنے واضح کرتے وہ اپنے جیسی دوسری نشانی سے بڑی ہوتی تھی، اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ کوئی نشانی بھی کم نہیں تھی، ہر نشانی ایک دوسرے سے بڑھ کر تھی جو ہم نے دکھائی، اُردو محاورے میں کلام اسی طرح سے آیا کرتی ہے، ''میں نے دلائل جو بیان کیے تو ہر دلیل دوسری سے بڑھ کر ہی تھی'' مطلب یہ ہے کہ ساری دلیلیں بڑی تھیں اور سب کے اندر قوت تھی، یہاں بات اسی طرح سے ہے کہ جو نشانی بھی ہم ان کے سامنے لاتے وہ اپنے جیسی نشانی سے بڑی ہوتی تھی، یعنی ہر نشانی ایک دوسرے سے بڑھ کر تھی، وَاَخَذْنٰهُمْ بِالْعَذَابِ: اور ہم نے انہیں عذاب میں پکڑا، لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ: تاکہ وہ لوگ لوٹ آئیں، اس عذاب سے وہ چھوٹے چھوٹے عذاب مراد ہیں جو تنبیہ کے طور پر اُتارے گئے، کبھی مینڈکیں آگئیں، کبھی خون کا عذاب آ گیا، کبھی گھن کا کیڑا لگ گیا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں آئی تھی، وَقَالُوْا: اور وہ فرعونی کہتے يٰۤاَيُّهَ السّٰحِرُ: موسیٰ علیہ السلام کو ساحر کہہ کے خطاب کرتے کیونکہ اس زمانے میں علم سحر ہی تھا، وہ سمجھتے تھے کہ موسیٰ علیہ السلام بھی ان کے بڑے جادوگر ہی ہیں، ''کہتے کہ اے ساحر!'' اُدْعُ لَنَا رَبَّكَ: پکار ہمارے لئے اپنے رَبّ کو، بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ: اس طریقے کے مطابق جو تجھے معلوم ہے، یا، اس عہد کی وجہ سے جو اللہ نے تیرے پاس کیا ہوا ہے، وہ عہد یہی کہ ہم باز آجائیں گے تو عذاب ٹل جائے گا، یا جو دُعا کرنے کا طریقہ تجھے معلوم ہے کہ جس طریقے سے دُعا کی جائے تو تیرا رَبّ اس کو قبول کرتا ہے، اس طریقے کے مطابق دُعا کر، ''پکار تو اپنے رَبّ کو اس طریقے کے مطابق جو تجھے معلوم ہے، یا، اس عہد کی وجہ سے جو اللہ نے تیرے نزدیک کر رکھا ہے'' اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ: بے شک ہم البتہ راہ پانے والے ہیں، فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ: پس جس وقت ہم ان سے عذاب دُور ہٹا دیتے، اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ: اچانک وہ اپنے اس عہد کو توڑ دیتے تھے، یہ جو عہد کرتے تھے اِنَّنَا لَمُهْتَدُوْنَ کہ ہم سیدھا راستہ پا جائیں گے ہم ہدایت یافتہ ہو جائیں گے، اس عہد کو وہ توڑ دیتے تھے، نَكْث توڑنے کو کہتے ہیں۔

مال و دولت اور عہدے کو عزّت کا معیار سمجھنا فرعونی نظریہ ہے

وَنَادٰى فِرْعَوْنُ فِيْ قَوْمِهٖ: فرعون نے اپنی قوم میں اعلان کیا، نَادٰی یہ نداء سے لیا گیا ہے، ''فرعون نے اعلان کیا اپنی قوم میں'' كہا يٰقَوْمِ اَلَيْسَ لِيْ مُلْكُ مِصْرَ: اے قوم! کیا میرے لئے مصر کی حکومت نہیں؟ یعنی میں مصر کا بادشاہ ہوں تم جانتے ہو، وَهٰذِهِ الْاَنْهٰرُ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِيْ: اور یہ نہریں میرے نیچے سے جاری ہیں، یعنی میرے باغات میں، میرے محلات میں نہریں بہتی ہیں، دیکھو! مجھے کیسی شان و شوکت حاصل ہے، اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ: کیا پھر تم دیکھتے نہیں ہو؟ یعنی مجھے جو عظمت حاصل ہے، وجاہت حاصل ہے بادشاہت حاصل ہے، خوش حالی حاصل ہے، تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے، اَمْ اَنَا خَيْرٌ مِّنْ هٰذَا الَّذِيْ هُوَ مَهِيْنٌ: یہ اَمْ بلکہ کے معنی میں ہے، بلکہ میں بہتر ہوں اس شخص سے جو کہ بے قدرا ہے، مَهِين کا لفظی معنی ہوتا ہے: ذلیل، جس کو کوئی عزّت حاصل نہیں، دوسری جگہ قرآنِ کریم میں لفظ ہے مِنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ، بے قدر پانی، ذلیل پانی۔ تو اس ذلیل سے میں بہتر ہوں، تو اُس نے موسیٰ علیہ السلام کو مَهِين کہا اپنے مقابلے میں، کہ میں بادشاہ ہوں اور یہ فقیر آدمی ہے، میرے پاس محلات ہیں، باغات ہیں جن کے نیچے سے نہریں جاری

ہیں اور اِس کے پاس کچھ بھی نہیں۔ یہی ذہن تھا مشرکینِ مکہ کا، وہ بھی حضور ﷺ کو ماننے سے یہی عذر کرتے تھے کہ یہ تو ہمارے مقابلے میں کمزور ہے، اِس کے ساتھ کوئی جتھا نہیں، کوئی سلطنت نہیں اور اس کے پاس کوئی دولت نہیں، تو جیسا فرعون کا ذہن تھا ویسا مشرکین کا ہے، اور یہی بات اُن کو سنائی جا رہی ہے کہ کسی کو غریب دیکھ کے، مسکین دیکھ کے، اس کی بات کو قبول نہ کرنا، یہ فرعونی ذہنیت ہے، دیکھنا یہ چاہیے کہ بات جو کہی جا رہی ہے وہ ٹھیک ہے یا نہیں؟ کہنے والا اگر غریب ہے، مسکین ہے، اور تم مال دار ہو تو یہ کوئی وجہ نہیں ہے کہ اُس کی بات کو مانا نہ جائے ''بلکہ میں بہتر ہوں اس شخص سے جو کہ مَهِين ہے، ذلیل ہے، بے قدر ہے'' وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ: اور یہ بیان کرنے کے قریب بھی نہیں جاتا، مطلب یہ ہے کہ بات صاف بھی نہیں کر سکتا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان میں لکنت تھی، اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبوّت ملی ہے تو انہوں نے دُعا کی تھی وَاحْلُلْ عُقْدَةً مِّنْ لِّسَانِيْ کہ میری زبان سے گرہ دُور کر دے، يَفْقَهُوْا قَوْلِيْ (سورۂ طٰہٰ) کہ یہ لوگ میری بات کو سمجھ لیا کریں، تو اللہ تعالیٰ نے دُعا قبول کر لی تھی، اور اُس دُعا کے اندر انہوں نے یہ قید لگائی تھی کہ اتنی گرہ دُور کر دے کہ لوگ میری بات سمجھ جایا کریں، تو ہو سکتا ہے کہ زبان میں اتنی صفائی آ گئی تھی اور پھر نہ کچھ لکنت کا اثر باقی تھا، تو اس لیے فرعون اُس بات کی طرف توجہ دِلاتا ہے کہ دیکھو! یہ تو بات بھی نہیں کر سکتا، بات تو اسے کرنی آتی نہیں اور میرے مقابلے میں اُٹھ کر کھڑا ہو گیا، یہ واضح طور پر بات بھی نہیں کر سکتا، تو گویا کہ اس کی کی طرف متوجہ کیا اپنی قوم کو (عام تفاسیر) اور اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبان بالکل صاف ہو گئی تھی اور لکنت اس میں باقی نہیں تھی، تو پھر اس کا یہ کہنا یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے ہمارا مدمقابل کوئی بات کرتا ہے اور ہم اس کی بات کو چونکہ خلافِ عقل سمجھتے ہیں، خلافِ دلیل سمجھتے ہیں، بے موقع، بے محل سمجھتے ہیں، تو ہم کہتے ہیں کہ اس کو بات کرنے کی تمیز نہیں، بات تو کرنی نہیں آتی، اور جھگڑا ہمارے ساتھ یہ کر رہا ہے (آلوسی)، تو مدمقابل کی بات کو انسان اسی طرح سے ظاہر کیا کرتا ہے کہ اس کو تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں ہے، یہ اپنے مدعا کو ہمارے سامنے واضح نہیں کر سکتا، تو ہم اس کی بات کو کس طرح سے مان لیں؟ تو فرعون نے اسی طرح سے کہا: وَّلَا يَكَادُ يُبِيْنُ: یہ تو اپنے مدعا کو واضح کرنے کے قریب بھی نہیں جاتا، جو کچھ یہ کہتا ہے ہمیں سمجھا ہی نہیں سکتا، اپنی بات کو واضح نہیں کر سکتا، اس کے مقابلے میں میں بہتر ہوں، فَلَوْلَآ اُلْقِيَ عَلَيْهِ اَسْوِرَةٌ مِّنْ ذَهَبٍ: کیوں نہیں ڈالے گئے اس کے اُوپر سونے کے کنگن، یعنی ہم جس وقت کسی کے اوپر خوش ہوتے ہیں کسی کو اپنا سفیر بنا کر بھیجتے ہیں تو ہم اس کو سونے کے کنگن پہناتے ہیں، اگر یہ اللہ کا سفیر بن کے آیا ہے اللہ کا نمائندہ ہے تو اس کے پاس سونے کے کنگن کیوں نہیں ہیں؟ اَوْ جَآءَ مَعَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ مُقْتَرِنِيْنَ: یا آتے اس کے ساتھ فرشتے قطاریں باندھ کے، ملے جلے، صفیں باندھے ہوئے فرشتے اس کے ساتھ ہوتے، تب ہم سمجھ جاتے کہ واقعی یہ اللہ کی جانب سے آیا ہے، فَاسْتَخَفَّ قَوْمَهٗ: پس اس نے بیوقوف بنا لیا اپنی قوم کو، اپنی قوم کو خفیف العقل بنا لیا، اِسْتَخَفَّ کا معنی یہی ہے: جَعَلَهُمْ خَفِيْفَةً عُقُوْلُهُمْ، ان کو ایسے بنا دیا کہ ان کی عقلیں ہلکی ہو گئیں، یعنی وہ عقلیں صحیح سوچ نہ سکیں، اس نے نادان بنا لیا، عقل کھو دی اپنی قوم کی، فَاَطَاعُوْهُ: پس ان لوگوں نے اس فرعون کی بات مان لی۔

''ہم مزاج'' کی بات جلدی سمجھ میں آتی ہے

اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ: بے شک وہ سارے کے سارے بدمعاش لوگ تھے، فاسق لوگ تھے، فسق وفجور میں مبتلا تھے، ان کی اپنی طبیعت میں چونکہ فسق وفجور تھا اس لیے فرعون کی بات ان کی سمجھ میں آ گئی، موسیٰ علیہ السلام کی بات ان کی سمجھ میں نہ آئی، جب انسان خود بُرا ہوتا ہے تو بُروں کی بات اس کو جلدی سمجھ میں آتی ہے، جس طرح سے خود انسان اگر اچھا ہو، حق کی طلب ہو، تو پھر اس کو اچھائی جلدی سمجھ میں آیا کرتی ہے، تو یہ فرعونی چونکہ خود ہی پہلے فسق وفجور میں بتلا تھے، اس لئے فرعون کی بات اُن کی سمجھ میں جلدی آ گئی، ''بے شک وہ لوگ نافرمان تھے'' فَلَمَّآ اٰسَفُوْنَا: پھر جب انہوں نے ہمیں غصہ چڑھا دیا، انْتَقَمْنَا مِنْھُمْ: تو ہم نے ان سے انتقام لے لیا، فَاَغْرَقْنٰھُمْ اَجْمَعِیْنَ: یہ اُس انتقام کی تفصیل ہے، ہم نے انتقام کس طرح سے لیا؟ کہ پھر ہم نے ان سب کو ڈبو دیا، فَجَعَلْنٰھُمْ سَلَفًا وَّمَثَلًا لِّلْاٰخِرِیْنَ: پھر بنا دیا ہم نے ان سب کو پہلے گزرے ہوئے اور نمونہ پچھلوں کے لئے، ہم نے ان کو ایسا کر دیا کہ یہ سلف ہو گئے، آگے گزرے ہوئے ہو گئے، اور پچھلوں کے لئے ایک نمونہ بن گئے۔

وَلَمَّا ضُرِبَ ابْنُ مَرْيَمَ مَثَلًا اِذَا قَوْمُكَ مِنْهُ يَصِدُّوْنَ ﴿۵۷﴾ وَقَالُوْٓا ءَاٰلِهَتُنَا خَيْرٌ

اور جب بیان کیا گیا مریم کا بیٹا از روئے مثال کے تو اچانک تیری قوم اس سے چلّاتی ہے ﴿۵۷﴾ اور کہنے لگے: کیا ہمارے معبود اچھے ہیں

اَمْ هُوَ ۭ مَا ضَرَبُوْهُ لَكَ اِلَّا جَدَلًا ۭ بَلْ هُمْ قَوْمٌ خَصِمُوْنَ ﴿۵۸﴾ اِنْ هُوَ اِلَّا عَبْدٌ

یا وہ؟ نہیں مثال بیان کرتے اُس عیسیٰ کی تیرے لیے مگر از روئے جھگڑنے کے، بلکہ یہ جھگڑالو لوگ ہیں ﴿۵۸﴾ نہیں ہے عیسیٰ علیہ السلام مگر بندہ

اَنْعَمْنَا عَلَيْهِ وَجَعَلْنٰهُ مَثَلًا لِّبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿۵۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ لَجَعَلْنَا مِنْكُمْ مَّلٰٓئِكَةً

جس پر ہم نے اِنعام کیا، اور ہم نے ان کو نمونہ بنایا بنی اسرائیل کے لئے ﴿۵۹﴾ اگر ہم چاہتے تو البتہ کر دیتے تمہارے بدلے میں فرشتے

فِي الْاَرْضِ يَخْلُفُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنَّهٗ لَعِلْمٌ لِّلسَّاعَةِ فَلَا تَمْتَرُنَّ بِهَا وَاتَّبِعُوْنِ ۭ هٰذَا

زمین میں جو خلیفہ ہوتے ﴿۶۰﴾ بے شک وہ عیسیٰ البتہ علم ہے قیامت کے لئے، پس ہرگز شک نہ کرو تم اُس قیامت میں، اور میری اتباع کرو، یہ

صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ﴿۶۱﴾ وَلَا يَصُدَّنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ ۚ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۶۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ

سیدھا راستہ ہے ﴿۶۱﴾ اور تمہیں شیطان نہ روک دے، بے شک وہ تمہارے لئے صریح دُشمن ہے ﴿۶۲﴾ اور جب عیسیٰ علیہ السلام

عِيْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ قَالَ قَدْ جِئْتُكُمْ بِالْحِكْمَةِ وَلِاُبَيِّنَ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِيْ تَخْتَلِفُوْنَ

واضح دلائل لے کر آ گئے تو فرمایا: میں تمہارے پاس دانش مندی لے کر آیا ہوں، اور تا کہ واضح کروں تمہارے لئے بعض وہ چیز جس میں کہ تم اختلاف

فِیْهِ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِیْعُوْنِ ۝۶۳ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ رَبِّیْ وَرَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ ؕ هٰذَا

کرتے ہو، پس تم اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو ۝۶۳ بے شک اللہ ہی میرا ربّ ہے اور تمہارا ربّ ہے، پھر تم اسی کی عبادت کرو، یہ

صِرَاطٌ مُّسْتَقِیْمٌ ۝۶۴ فَاخْتَلَفَ الْاَحْزَابُ مِنْۢ بَیْنِهِمْ ۚ فَوَیْلٌ لِّلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا مِنْ

سیدھا راستہ ہے ۝۶۴ اختلاف کیا گروہوں نے آپس میں، پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا

عَذَابِ یَوْمٍ اَلِیْمٍ ۝۶۵ هَلْ یَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ

یعنی دردناک دِن کا عذاب ۝۶۵ نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر قیامت کا کہ آجائے ان کے پاس اچانک اور ان کو

لَا یَشْعُرُوْنَ ۝۶۶ اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ ۝۶۷

پتا بھی نہ ہو ۝۶۶ دوست اس دِن بعض بعض کے لئے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے ۝۶۷

تفسیر

شانِ نزول

یہ آیات جو ذکر کی گئی ہیں ان کے شانِ نزول میں مفسرین نے ذکر فرمایا کہ سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ بیان کیا کہ اللہ کے علاوہ جتنے معبود ہیں، جن کو لوگ پوجتے ہیں، لوگوں نے جو معبود قرار دے رکھے ہیں، ان میں کوئی کسی قسم کی خیر اور بھلائی نہیں۔ آپ یہ مضمون بیان فرمارہے تھے، کہ اللہ کے علاوہ جن کی پوجا کی گئی ان کے اندر کوئی خیر اور بھلائی نہیں ہے، جب یہ بات آپ بیان فرمارہے تھے تو کسی مشرک نے اُٹھ کر کہہ دیا کہ عبادت تو عیسیٰ بن مریم کی بھی کی گئی، وہ بھی ''مَا عُبِدَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ'' کا مصداق ہے، اور آپ کہتے ہیں کہ جس کی بھی اللہ کے علاوہ پوجا کی گئی اس میں کوئی خیر اور بھلائی نہیں، تو آپ بتلایئے کہ عیسیٰ بن مریم کوئی خیر اور بھلائی ہے یا نہیں؟ اُدھر آپ اس کی نبوّت کا بھی قول کرتے ہیں، رسالت کا بھی قول کرتے ہیں، اس کی تعریف بھی کرتے ہیں (قرطبی)، تو مطلب یہ ہے کہ پھر یہ آپ کی بات کیسے ٹھیک ہوئی؟ کہ اللہ کے علاوہ جس کی پوجا کی جائے اس کے اندر کوئی کسی قسم کی بھلائی نہیں ہے، عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اس نے آگے سے پیش کی۔

ایک مناظرانہ اُصول

یہ ہمیشہ قاعدہ ہے کہ جس وقت دو فریق آپس میں کسی گفتگو کے اندر لگے ہوئے ہوں، اور ایک فریق میں سے کوئی آدمی ان کے مطابق کوئی بات کرے تو باقی ساتھ شور مچایا کرتے ہیں، یہ مناظروں میں اور بحث مباحثوں میں آپ نے دیکھا ہوگا، کہ آپ کا مناظر جس وقت کوئی ایسی بات کہہ دے جس کے متعلق آپ کا خیال ہو کہ یہ بات اس نے بڑی ٹھکانے کی کہی، دوسرا اس کا جواب

نہیں دے سکے گا، تو "واہ واہ، شاباش، نعرۂ تکبیر" جس طرح سے آپ لوگ لگایا کرتے ہیں، یہ قاعدہ ہے، جب بھی دو پارٹیاں آپس میں کوئی گفتگو کریں گی تو ہر پارٹی اپنے بات کرنے والے کی بات کو اُچھالتی ہے، تو جب اُس نے عیسیٰ بن مریم کی مثال پیش کی تو سارے مشرکوں نے شور مچادیا کہ ٹھیک ہے، یہ جو کہتے ہیں کہ خیر نہیں ان کی یہ بات غلط ہے، اگر ایسی بات ہوتی تو پھر عیسیٰ میں بھی خیر نہیں ہونی چاہیے، تو جیسے ہمارے معبود ہیں ویسے عیسیٰ ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کی جگہ بہ جگہ قرآنِ کریم میں تعریف کی گئی تھی، تو اس سے وہ غلط ثابت کرنا چاہتے تھے حضور ﷺ کی اس بات کو کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جن کی عبادت کی گئی ہے ان کے اندر کوئی کسی قسم کی خیر نہیں ہے، وہ سمجھتے تھے کہ عیسیٰ کی مثال سامنے آجانے کے بعد ہمارا دعویٰ ثابت ہوگیا اور ان کی بات غلط ہوگئی، اس لیے سب نے شور مچایا۔

اور بعض روایات سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ جس وقت قرآنِ کریم کی وہ آیت اُتری تھی اِنَّكُمْ وَمَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ حَصَبُ جَهَنَّمَ (سورۂ انبیاء:۹۸) کہ تم بھی اور وہ بھی جن کی اللہ کے علاوہ تم پُوجا کرتے ہو سب جہنّم کا ایندھن ہو، یہ مضمون حضور ﷺ نے بیان فرمایا، تو اس وقت انہوں نے کہا کہ اچھا! جس کی بھی پُوجا کرتے ہیں وہ جہنّم میں جائے گا، تو پھر عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تمہارا کیا خیال ہے؟ ادھر عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق تم اچھی اچھی باتیں کہتے ہو کہ وہ اللہ کے مقبول تھے، اور ادھر کہتے ہو کہ جس کی پُوجا کی جائے وہ جہنّم میں جائے گا، تو اس اُصول کے مطابق تو نعوذ باللہ! عیسیٰ علیہ السلام کو بھی جہنّم میں جانا چاہیے، یوں مثال بیان کرتے ہوئے انہوں نے شور مچادیا، تو اس آیت کے اندر اللہ تعالیٰ نے اسی واقعے کو بیان کیا کہ یہ چیختے ہیں، ان کا مقصد محض جدال ہے، جھگڑا کرنا ہے، اور یہ قوم ہے ہی جھگڑالو، ورنہ یہ سمجھتے ہیں کہ جہنّم میں وہی جائے گا جو اپنی عبادت کی ترغیب دیتا ہو جس طرح سے شیاطین ہیں، یا کم از کم عبادت سے بیزاری ظاہر نہ کرتا ہو، ناراضگی ظاہر نہ کرتا ہو، تو اس کا مصداق یا تو پتھر کے بُت ہوں گے یا شیاطین جو لوگوں کو غلط راستے کی طرف بلاتے ہیں، اللہ کے نبی تو ہمیشہ اللہ کی عبادت کی طرف بُلاتے رہے اور اپنی بندگی کا اقرار کرتے رہے، وہ ان آیات کا مصداق کس طرح سے ہوسکتے ہیں؟ اُن کا اس میں کیا قصور ہے؟ اب، اولیاء اللہ جتنے گزر گئے سب اللہ کا نام لیتے ہوئے، اللہ کی طرف لوگوں کو بُلاتے ہوئے، دین کی تلقین کرتے ہوئے، بعد میں لوگوں نے اگر ان کی قبریں پُوجنی شروع کردیں تو اس میں اولیاء اللہ کا کیا قصور ہے؟ تو مراد تو یہاں اصل میں ہیں شیاطین جو لوگوں کو ترغیب دیتے ہیں، یا کم از کم یہ پتھر کے بُت، ان کو بھی جہنّم کے اندر ڈالا جائے گا مشرکوں کی حسرت بڑھانے کے لئے، جیسے قرآنِ کریم کی آیات میں ذکر کیا گیا۔ تو انبیاء علیہم السلام یا اولیاء اللہ اس کا مصداق نہیں ہوسکتے، یہ بات خود سمجھتے بھی ہیں، لیکن جھگڑے کے لئے اس قسم کی مثالیں دے کے خواہ مخواہ شور مچاتے ہیں۔

عیسیٰ علیہ السلام کا صحیح مقام

پھر عیسیٰ علیہ السلام کی شخصیت کو اللہ تعالیٰ نے نمایاں کردیا کہ وہ تو ہمارا ایک مقبول بندہ ہے، جس کے اُوپر ہم نے اِنعام کیا، اور بنی اسرائیل کے لئے اس کو ایک نمونہ بنایا تھا، اور بے باپ کے اُن کو پیدا کیا تھا، جس کی بنا پر بعض لوگوں نے ان کو اللہ کا بیٹا قرار

دے کر عبادت شروع کر دی، حالانکہ بے باپ پیدا کر دینا اللہ تعالیٰ کے لئے کوئی مشکل نہیں، ہم چاہیں تو ہم تمہارے گھروں میں فرشتے پیدا کر دیں جو تمہارے جانے کے بعد تمہارے خلیفہ ہو کر دُنیا میں رہیں، حالانکہ فرشتہ انسان کی نسل سے غیر ہے، آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے ماں باپ کے بغیر پیدا کر دیا، تو اگر عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے پیدا کر دیا تو یہ کون سا مشکل ہے؟ اللہ چاہے تو انسانوں کے گھروں میں فرشتے پیدا کر دے جو انسانوں کے چلے جانے کے بعد زمین کے اندر ان کے خلیفہ بن کر رہیں۔ ”عیسیٰ علیہ السلام قیامت کا علم حاصل کرنے کا ایک ذریعہ ہیں“ علم حاصل کرنے کا ذریعہ دو طرح سے، یا تو اس امکان کو ثابت کرنے کے لئے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے، تو اللہ تعالیٰ مارنے کے بعد دوبارہ بھی پیدا کر دے گا، جس طرح سے اس نے بغیر ماں باپ کے آدم کو بنایا، بغیر باپ کے عیسیٰ کو بنایا، یہ تصرفات سارے کے سارے اللہ تبارک وتعالیٰ کی قدرت کی دلیل ہیں، تو اس کو دیکھ کر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ مُردوں کو زندہ کرنا اللہ کے لئے کوئی مشکل نہیں (آلوسی)، یا وہ نشانی اور علامت اور علم اس اعتبار سے ہیں کہ جب دوبارہ اُتریں گے تو وہ وقت قربِ قیامت کا ہوگا (عام تفاسیر)، دونوں باتیں یہاں مفسرین نے کہی ہیں، کہ عیسیٰ علیہ السلام کا دوبارہ نزول یہ قیامت کے واقع ہونے کی علامت ہوگی، وہ علامت ہوگی کہ اب قیامت بہت جلدی آنے والی ہے، اس آیت کے تحت بھی نزولِ عیسیٰ کا تذکرہ مفسرین نے کیا ہے، کہ آخر زمانے میں جب وہ اُتریں گے تو اس کے ذریعے سے علم حاصل ہوگا کہ اب قیامت قریب آ گئی۔ باقی! جہاں تک ان کی تعلیم کا تعلق ہے، تعلیم یہی ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کو ہی اپنا رَبّ قرار دیا، اور بنی اسرائیل سے بھی یہی کہا تھا کہ وہی تمہارا رَبّ ہے، اسی کی عبادت کرو، اور سیدھا راستہ یہی ہے۔ اور درمیان کے اندر قیامت کا ذِکر آ گیا تھا تو اس میں تاکید آ گئی کہ اس کے بارے میں شک نہ کرو، میری اتباع کرو، صراطِ مستقیم یہی ہے کہ تم قیامت کا عقیدہ رکھو کہ قیامت آنے والی ہے، اور شیطان تمہیں اس عقیدے سے غافل کر کے کسی گمراہی میں نہ ڈال دے، وہ صریح دُشمن ہے۔ اور عیسیٰ علیہ السلام جب واضح دلائل لے کر آئے تھے تو انہوں نے آ کر یہی کہا تھا کہ میں دانش مندی کی باتیں لایا ہوں، اور بعض مختلف فیہ مسائل جو تمہارے درمیان چلے آ رہے ہیں ان کا فیصلہ کروں گا، اللہ سے ڈرو اور میرا کہنا مانو، اور اللہ ہی میرا رَبّ ہے اور تمہارا رَبّ ہے، اُسی کی عبادت کرو، یہی صراطِ مستقیم ہے۔ تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کے اندر توحید کی تعلیم دی، انہوں نے نہ شرک کو پسند کیا نہ شرک کی تعلیم دی اور نہ اپنی عبادت کی طرف بُلایا، اس لیے جہاں بھی معبودینِ غیر اللہ کی مذمت آئے گی، اس میں اس قسم کے اشخاص شامل نہیں ہیں، یوں وضاحت ہوگئی اس مضمون کی، تو ان کی پوزیشن تو اپنی جگہ واضح ہے لیکن ان کے بارے میں مختلف گروہ بن گئے، کسی نے ان کے متعلق کیسا عقیدہ بنالیا، کسی نے کیسا عقیدہ بنالیا، ان میں جو ظالم اور مشرک ہیں جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی حیثیت کو گرایا جس طرح سے یہودی ہیں، یا اتنا بڑھایا جس طرح سے عیسائی ہیں کہ اللہ کی صفات کی حدود میں اُن کو داخل کر دیا، ان سب کے لئے خرابی ہوگی دردناک دِن کے عذاب سے۔

آگے پھر یہی مشرکین کو تنبیہ ہے کہ اتنا سمجھانے کے باوجود یہ نہیں سمجھتے، هَلْ يَنظُرُونَ إِلَّا السَّاعَةَ: یہ نہیں منتظر مگر قیامت

کے اَنْ تَاْتِیَهُمْ بَغْتَةً وَّهُمْ لَا یَشْعُرُوْنَ: کہ آجائے وہ ان کے پاس اچانک اوران کو پتا بھی نہ چلے، یعنی وہ اسی کے ہی منتظر ہیں، اس کے آئے بغیر وہ مانیں گے نہیں، سمجھیں گے نہیں، ''نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر قیامت کا کہ آجائے ان کے پاس اچانک اوران کو پتا بھی نہ ہو'' اَلْاَخِلَّآءُ یَوْمَىِٕذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِیْنَ: اَلْاَخِلَّآءُ: خلیل کی جمع، دوست اس دن بعض بعض کے لئے دشمن ہوں گے سوائے متقین کے، جن لوگوں کی دوستی تقویٰ پر مبنی تھی وہ تو ایک دوسرے کے دشمن نہیں ہوں گے، وہ تو ایک دوسرے کے لئے سہارا بنیں گے، یہ دوستیاں تو مفید ہیں جن کی بنیاد تقوے پہ ہو، اوراس کے علاوہ باقی جتنے دوست ہیں چونکہ ایک دوسرے کے لئے برائی میں مبتلا ہونے کا باعث بنتے ہیں، ذریعہ بنتے ہیں، وہ سب ایک دوسرے کے دشمن بن جائیں گے، جیسے پہلے یہ مضمون ذکر ہوا۔

یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۶۸﴾ اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاٰیٰتِنَا

اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمزدہ ہوگے ﴿۶۸﴾ وہ بندے جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں

وَكَانُوْا مُسْلِمِیْنَ ﴿۶۹﴾ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ تُحْبَرُوْنَ ﴿۷۰﴾

اور فرماں بردار ہوتے ہیں ﴿۶۹﴾ (انہیں کہہ دیا جائے گا) داخل ہو جاؤ جنّت میں تم بھی اور تمہاری بیویاں بھی اس حال میں کہ تم خوش کیے جاتے ہو ﴿۷۰﴾

یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ ۚ وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ وَتَلَذُّ

گھمائی جائیں گی ان کے اُوپر پیالیاں سونے کی اور گلاس، اور جنّت میں وہ چیز ہوگی جس کو ان کے دِل چاہیں گے اور آنکھیں

الْاَعْیُنُ ۚ وَاَنْتُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۷۱﴾ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ

لذیذ سمجھیں گی، اور تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوگے ﴿۷۱﴾ یہی جنّت ہے جس کے تم وارث بنا دیئے گئے ان کاموں کی وجہ سے

تَعْمَلُوْنَ ﴿۷۲﴾ لَكُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ كَثِیْرَةٌ مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ ﴿۷۳﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ

جو تم کیا کرتے تھے ﴿۷۲﴾ تمہارے لئے اس جنّت کے اندر بہت میوے ہیں، ان میں سے تم (چُن چُن کر) کھاؤ گے ﴿۷۳﴾ بے شک مجرمین

عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ ﴿۷۴﴾ لَا یُفَتَّرُ عَنْهُمْ وَهُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ ﴿۷۵﴾

جہنّم کے عذاب میں ہمیشہ رہنے والے ہوں گے ﴿۷۴﴾ وہ عذاب ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا اور وہ اس عذاب کے اندر مایوس پڑے ہوئے ہوں گے ﴿۷۵﴾

وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِیْنَ ﴿۷۶﴾ وَنَادَوْا یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ

ہم نے ان کے اُوپر کوئی زیادتی نہیں کی لیکن وہی لوگ ظلم کرنے والے تھے ﴿۷۶﴾ آواز دیں گے اے مالک! چاہیے کہ موت طاری کر دے

عَلَيْنَا رَبُّكَ ۖ قَالَ إِنَّكُمْ مَّٰكِثُونَ ﴿٧٧﴾ لَقَدْ جِئْنَٰكُم بِالْحَقِّ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ

ہم پر تیرا رب، مالک جواب دے گا: بے شک تم ٹھہرنے والے ہو ﴿۷۷﴾ ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے لیکن تم میں سے اکثر حق سے

كَٰرِهُونَ ﴿٧٨﴾ أَمْ أَبْرَمُوٓا۟ أَمْرًا فَإِنَّا مُبْرِمُونَ ﴿٧٩﴾ أَمْ يَحْسَبُونَ أَنَّا لَا نَسْمَعُ

کراہت کرنے والے تھے ﴿۷۸﴾ کیا ان لوگوں نے کوئی امر طے کر لیا ہے پس ہم بھی طے کرنے والے ہیں ﴿۷۹﴾ یا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ

سِرَّهُمْ وَنَجْوَىٰهُم ۚ بَلَىٰ وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُونَ ﴿٨٠﴾ قُلْ إِن كَانَ لِلرَّحْمَٰنِ

باتوں کو اور ان کی سرگوشیوں کو سنتے نہیں؟ کیوں نہیں، اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے ہیں ﴿۸۰﴾ آپ کہہ دیجئے اگر رحمٰن کی کوئی

وَلَدٌ فَأَنَا۠ أَوَّلُ الْعَٰبِدِينَ ﴿٨١﴾ سُبْحَٰنَ رَبِّ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ رَبِّ الْعَرْشِ

اولاد ہوتی تو میں عبادت کرنے والوں میں سے پہلا ہوتا ﴿۸۱﴾ پاک ہے آسمانوں کا اور زمین کا رب اور عرش کا رب

عَمَّا يَصِفُونَ ﴿٨٢﴾ فَذَرْهُمْ يَخُوضُوا۟ وَيَلْعَبُوا۟ حَتَّىٰ يُلَٰقُوا۟ يَوْمَهُمُ الَّذِى

ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں ﴿۸۲﴾ چھوڑ انہیں، کہ لگے رہیں اور کھیلتے رہیں حتیٰ کہ ملاقات کریں یہ اپنے اس دن سے

يُوعَدُونَ ﴿٨٣﴾ وَهُوَ الَّذِى فِى السَّمَآءِ إِلَٰهٌ وَفِى الْأَرْضِ إِلَٰهٌ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ

جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں ﴿۸۳﴾ وہی اللہ ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے، اور وہ حکمت والا ہے

الْعَلِيمُ ﴿٨٤﴾ وَتَبَارَكَ الَّذِى لَهُۥ مُلْكُ السَّمَٰوَٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا

علم والا ہے ﴿۸۴﴾ برکت والا ہے وہ جس کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو دونوں کے درمیان میں ہیں

وَعِندَهُۥ عِلْمُ السَّاعَةِ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿٨٥﴾ وَلَا يَمْلِكُ الَّذِينَ يَدْعُونَ مِن

اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے، اور اسی کی طرف ہی تم سب لوٹائے جاؤ گے ﴿۸۵﴾ نہیں اختیار رکھتے وہ جن کو پکارتے ہیں یہ لوگ

دُونِهِ الشَّفَٰعَةَ إِلَّا مَن شَهِدَ بِالْحَقِّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٨٦﴾

اللہ کے علاوہ شفاعت کا، مگر اس کی (سفارش کریں گے) جس نے حق کی گواہی دی ہوئی ہوگی، اور ان کو خوب اچھی طرح سے پتا ہوگا ﴿۸۶﴾

وَلَئِن سَأَلْتَهُم مَّنْ خَلَقَهُمْ لَيَقُولُنَّ اللَّهُ ۖ فَأَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ﴿٨٧﴾ وَ

اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو پیدا کس نے کیا؟ تو البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے کیا! پھر یہ کدھر کو پھیرے جاتے ہیں؟ ﴿۸۷﴾ اور

قِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۸۸﴾ فَاصْفَحْ عَنْهُمْ وَقُلْ سَلٰمٌ ؕ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

(اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے) رسول کے اس قول کا علم کہ اے میرے پروردگار! بے شک یہ لوگ ایمان نہیں لاتے ﴿۸۸﴾ آپ ان سے درگزر کر جائیے اور سلام کہہ دیجئے، عنقریب ان کو پتا چل جائے گا ﴿۸۹﴾

تفسیر

نیک لوگوں کے لئے اِنعامات

یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْكُمُ الْیَوْمَ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ: متقین کا ذکر آیا تو اس کے ساتھ ان کے انجام کا بھی ذکر کر دیا گیا، ''اللہ تعالیٰ کہے گا کہ اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تم غمزدہ ہوؤ گے، نہ تم پر کوئی حزن ہوگی'' غمزدہ بھی نہیں ہوگے اور کوئی خوف بھی نہیں ہوگا۔ ''خوف'' اور ''حزن'' کے درمیان فرق آپ کے سامنے بارہا گزر گیا، ''خوف'' ہوتا ہے آنے والے حالات کا، ''حزن'' ہوا کرتا ہے گزرے ہوئے واقعات پر، اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاٰیٰتِنَا: اور بندوں سے مراد وہ بندے ہیں جو ہماری آیات پر ایمان لاتے ہیں، وَكَانُوْا مُسْلِمِیْنَ: اور فرماں بردار ہوتے ہیں، ایمان کا تعلق قلب سے ہوگیا اور اسلام کا تعلق اعضا سے ہوگیا، دل سے تسلیم کرتے ہیں عقیدہ رکھتے ہیں اور اعضا کے ساتھ فرماں برداری کرتے ہیں، انہیں کہہ دیا جائے گا اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ اَنْتُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ: داخل ہو جاؤ تم جنت میں، تم بھی اور تمہاری بیویاں بھی، تُحْبَرُوْنَ: اس حال میں کہ تم خوش کئے جاتے ہو، حبرۃ سرۃ کے معنی میں ہوتا ہے، یعنی خوش وخرم تم بھی اور تمہاری بیویاں بھی جنت میں داخل ہو جاؤ، یُطَافُ عَلَیْهِمْ بِصِحَافٍ مِّنْ ذَهَبٍ وَّاَكْوَابٍ: صحاف صحفۃ کی جمع، جس کو ہم پلیٹ کہتے ہیں، ''گھمائی جائیں گی ان کے اُوپر سونے کی پلیٹیں اور گلاس''، ''گھمائی جائیں گی'' یعنی ولدان مخلدون لے کر پھریں گے، یَطُوْفُوْنَ عَلَیْهِمْ، گھمائی جائیں گی ان کے اُوپر، یعنی ان کے خدام لے کے آئیں گے پرچیاں پیالیاں سونے کی اور گلاس، اکواب کُوب کی جمع ہے، کُوب گلاس کو کہتے ہیں، صحاف صحفۃ کی جمع، صحفۃ: پرچ یا پلیٹ، وَفِیْهَا مَا تَشْتَهِیْهِ الْاَنْفُسُ: اور جنت میں وہ چیز ہوگی جس کو ان کے دل چاہیں گے، وَتَلَذُّ الْاَعْیُنُ: اور آنکھیں لذت لیں گی، آنکھوں کے لئے لذت کی چیز، یعنی دیکھنے سے بھی طبیعت خوش ہوگی، اور کھانے، چکھنے، استعمال کرنے سے بھی طبیعت خوش ہوگی، تَلَذُّ الْاَعْیُنُ: آنکھیں لذیذ سمجھیں گی، آنکھیں لذت پائیں گی، ''وہ چیز ہوگی جس کو ان کے دل چاہیں گے اور آنکھیں لذیذ سمجھیں گی'' وَاَنْتُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ: اور تم اس میں ہمیشہ رہنے والے ہوگے، وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِیْۤ اُوْرِثْتُمُوْهَا: یہی جنت ہے جس کے تم وارث بنادیے گئے، بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: ان کاموں کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے، لَكُمْ فِیْهَا فَاكِهَةٌ كَثِیْرَةٌ: تمہارے لیے اس جنت کے اندر بہت میوے ہیں، مِّنْهَا تَاْكُلُوْنَ: اُن میووں میں سے تم چن چن کر کھاؤ گے۔

مجرمین کی بے بسی

اِنَّ الْمُجْرِمِیْنَ فِیْ عَذَابِ جَهَنَّمَ خٰلِدُوْنَ: مقابلۃً دوسرا فریق آگیا، بے شک مجرمین جہنم کے عذاب کے اندر ہمیشہ رہنے والے ہوں گے، لَا یُفَتَّرُ عَنْهُمْ: وہ عذاب ان سے ہلکا نہیں کیا جائے گا، وَهُمْ فِیْهِ مُبْلِسُوْنَ: اور وہ اس عذاب کے اندر مایوس پڑے ہوئے ہوں گے، انہیں چھوٹنے کی بھی کوئی توقع نہیں ہوگی، وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ: ہم نے ان کے اوپر کوئی زیادتی نہیں کی، وَلٰكِنْ كَانُوْا هُمُ الظّٰلِمِیْنَ: وہی لوگ ظلم کرنے والے تھے یعنی اپنے نفس پر ظلم انہوں نے کیا، وہ تو جیسا کیا تھا ہم نے ان کے سامنے پیش کر دیا۔ وَنَادَوْا یٰمٰلِكُ لِیَقْضِ عَلَیْنَا رَبُّكَ: یہ بھی جہنمیوں کی پریشانی کو ذکر کرنا مقصود ہے، جب ان کو کوئی چھوٹنے کا راستہ نظر نہیں آئے گا تو آخرکار مشورہ کر کے کہیں گے کہ یہ جہنم کا جو داروغہ ہے اسے پکارو، یہی ممکن ہے تمہاری مشکل کو حل کرنے کا ذریعہ بن جائے، مالک یہ خازنِ نار ہے جہنم کا داروغہ، ''آواز دیں گے کہ اے مالک! چاہیے کہ تیرا رب ہم پر موت ہی طاری کر دے'' یعنی مالک سے کہیں گے کہ تُو ہمارا سفارشی بن جا، اللہ سے کہہ کے ہمیں تو موت ہی دلا دے، چاہیے کہ موت طاری کر دے ہم پر تیرا رب۔ مالک جواب دے گا اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ: بے شک تم ٹھہرنے والے ہو، اب تمہیں موت بھی نہیں آئے گی، حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہنمی ایک ہزار سال تک مالک کو اس طرح سے پکارتے رہیں گے، ایک ہزار سال کے بعد مالک جواب دے گا۔[1] آپ جانتے ہیں کہ کسی سے کوئی بات پوچھی جائے اور فوراً ہی جواب مل جائے تو اس میں بھی کسی درجے میں راحت ہوتی ہے، اور اگر آپ کسی کو بلا رہے ہیں اور وہ بولتا ہی نہیں، بار بار آپ اسے آوازیں دیتے ہیں وہ توجہ ہی نہیں کرتا، تو یہ ایک مستقل تکلیف ہوتی ہے، تو ہزار سال تو پکارتے رہیں گے، اس کے بعد جواب یہی آئے گا اِنَّكُمْ مّٰكِثُوْنَ کہ کیوں چیخ رہے ہو؟ کیوں چلّا رہے ہو؟ اب چھوٹنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے، تم یہیں رہو گے، موت بھی نہیں آئے گی، مالک کی طرف سے یہ جواب ہو جائے گا۔ لَقَدْ جِئْنٰكُمْ بِالْحَقِّ: ہم تمہارے پاس حق لے کر آئے تھے، وَلٰكِنَّ اَكْثَرَكُمْ لِلْحَقِّ كٰرِهُوْنَ: لیکن تم میں سے اکثر حق کو پسند کرنے والے نہیں تھے، حق سے کراہت کرنے والے تھے۔ اَمْ اَبْرَمُوْٓا اَمْرًا فَاِنَّا مُبْرِمُوْنَ: کیا ان لوگوں نے، مشرکینِ مکہ نے کوئی اَمر طے کر لیا ہے؟ پس ہم بھی طے کرنے والے ہیں، یعنی انہوں نے کوئی سکیم بنالی ہے حق کو مغلوب کرنے کی یا نبی کو شکست دینے کی یا قتل کرنے کی؟ تو ہم نے بھی اپنے طور پر پھر طے کر لیا ہے کہ ہم انہیں ذلیل کر کے، ناکام کر کے چھوڑیں گے، اَمْ یَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰىهُمْ: یا یہ لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی پوشیدہ باتوں کو سنتے نہیں، اور ان کی سرگوشیوں کو سنتے نہیں، بَلٰى: کیوں نہیں، وَرُسُلُنَا لَدَیْهِمْ یَكْتُبُوْنَ: اور ہمارے بھیجے ہوئے ان کے پاس لکھتے ہیں، یعنی ہم سنتے بھی ہیں اور ساتھ ساتھ ہمارے بھیجے ہوئے فرشتے لکھتے بھی ہیں۔

''رحمٰن'' اولاد سے پاک ہے

قُلْ اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِیْنَ: قُلْ: کہہ دیجئے، اس کہنے کا حاصل یہ ہے کہ مشرکینِ مکہ سے آپ کہیے کہ دیکھو! ہم تمہارے سامنے جو توحید بیان کرتے ہیں تو واقعہ یہ ہے کہ ہم اسی طرح سے سمجھتے ہیں اور یہ عقیدہ صحیح ہے، ورنہ ہم کوئی ضدی

(۱) تفسیر مظہری میں حضرت ابن عباسؓ سے موقوفاً مروی ہے۔ واللہ اعلم!

نہیں کہ تمہارے ساتھ ضد کی بنا پر ہم کوئی بات بنالیں، تم اللہ تعالیٰ کے لئے اولاد کا قول کرتے ہو، ہم کہتے ہیں کہ اگر اللہ کے لئے اولاد ہوتی تو سب سے پہلے پوجنے والے ہم ہی ہوتے، یعنی ہمیں ضد نہیں ہے، لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ کے لئے اولاد ہے ہی نہیں، اِنْ كَانَ لِلرَّحْمٰنِ وَلَدٌ: اگر ہوتا رحمٰن کے لئے کوئی بیٹا، رحمٰن کی کوئی اولاد ہوتی، فَاَنَا اَوَّلُ الْعٰبِدِيْنَ: تو میں عبادت کرنے والوں میں سے پہلا ہوتا، یعنی میرے اندر تو اتنا انصاف موجود ہے کہ اگر کوئی بات ثابت ہو جائے تو میں قبول کرنے کے لئے تیار ہوں، لیکن جب واقعہ ہے کہ اولاد ہے ہی نہیں، اور ہونا ممکن ہی نہیں، تو ہم کسی کو اولاد قرار دے کے جھوٹ موٹ ایسے ہی پوجا کیوں کریں؟ اگر کوئی ہوتا تو ہم سب سے پہلے مانتے، لیکن ہے نہیں، ''اگر ہوتا رحمٰن کے لئے کوئی بیٹا تو میں اوّل العابدین ہوتا'' سُبْحٰنَ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: اب اولاد کا ذکر آیا تو آگے اللہ تعالیٰ کی تنزیہ ہوگئی، کیونکہ اولاد کی نسبت اللہ کی طرف یہ عیب ہے، ''پاک ہے آسمانوں کا اور زمین کا رَبّ اور عرش کا رَبّ ان باتوں سے جو یہ بیان کرتے ہیں۔

فَذَرْهُمْ يَخُوْضُوْا وَيَلْعَبُوْا: چھوڑ ان کو، باتوں میں لگے رہیں، اور مشغلوں میں لگے رہیں۔ لَعِب: کھیلنا۔ خوض: باتوں میں گھسنا۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی آپ پروانہ کریں، ''چھوڑ انہیں، کہ لگے رہیں اور کھیلتے رہیں'' حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ: حتیٰ کہ ملاقات کریں یہ اپنے اس دن سے جس کا یہ وعدہ دیے جاتے ہیں، وَهُوَ الَّذِيْ فِي السَّمَآءِ اِلٰهٌ وَّفِي الْاَرْضِ اِلٰهٌ: وہی اللہ ہے جو آسمان میں معبود ہے اور زمین میں معبود ہے، یعنی عبادت کے لائق آسمان میں بھی وہی اور زمین میں بھی وہی، ''اور وہ حکمت والا ہے علم والا ہے''، ''برکت والا ہے وہ جس کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی اور ان چیزوں کی جو دونوں کے درمیان میں ہیں اور اسی کے پاس قیامت کا علم ہے'' قیامت کا علم، یعنی تعیین کے ساتھ کہ قیامت کب آئے گی؟ یہ صرف اسی کے پاس ہے، ''اور اسی کی طرف ہی تم سب لوٹائے جاؤ گے۔''

کون سفارش کرے گا؟ اور کس کی؟

''نہیں اختیار رکھتے وہ جن کو پکارتے ہیں یہ لوگ اللہ کے علاوہ شفاعت کا'' شفاعت کے عقیدے کی بار بار تردید کی جارہی ہے، کیونکہ مشرکین کے اندر اِس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی، وہ غیر اللہ کو اسی لئے پوجتے تھے کہ یہ ہمارے سفارشی ہیں، دُنیوی حاجات بھی یہی پوری کرواتے ہیں، اور اگر بالفرض! آخرت ہوئی تو وہاں بھی یہ ہمارے کام آئیں گے۔ اللہ فرماتے ہیں کہ جن کو یہ پوجتے ہیں اللہ کے علاوہ، وہ شفاعت کا اختیار نہیں رکھتے، اِلَّا مَنْ شَهِدَ بِالْحَقِّ: مگر اس کی سفارش کریں گے جس نے حق کی گواہی دی ہوئی ہوگی، اور ان کو خوب اچھی طرح سے پتا ہوگا کہ واقعی یہ حق پرست ہے، جس وقت تک کوئی شخص حق کو قبول نہ کرے قیامت کے دن کسی کی سفارش کا کوئی مستحق نہیں ہوگا، ہاں! البتہ جنہوں نے حق کو قبول کیا ہے، ان کے لئے بعض سفارشی سفارش کریں گے، یعنی فی حد ذاتہٖ شفاعت کا عقیدہ حق ہے، لیکن جس تفصیل کے تحت مشرکین مانتے جانتے تھے، وہ ٹھیک نہیں ہے۔ اور یہ بات آپ کے سامنے بارہا ہو چکی، سفارش فی حد ذاتہٖ باطل نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کے دربار میں سفارش ہے، لیکن کرے گا کون؟ جو اللہ کا مقبول ہوگا، کرے گا کس کی؟ جس کی سفارش کرنے کے لئے اللہ کی طرف سے اجازت ہوگی، اور یہ وضاحت آگئی کہ کافر، مشرک کے لئے کوئی

زبان نہیں کھول سکے گا، اس کی سفارش کوئی نہیں کرے گا، ہاں! البتہ جس کا خاتمہ ایمان پہ ہوا تو اس کی سفارش نبی بھی کریں گے، فرشتے بھی کریں گے، اولیاء بھی کریں گے اور صالحین بھی کریں گے، اس طرح سے متعدد چیزوں کا ذِکر آتا ہے، تو ان کی سفارش کے ساتھ اللہ تعالیٰ عذاب سے نجات بھی دے گا، درجات بلند بھی کرے گا، جنّت میں داخلہ بھی ہوگا، یہ واقعات اپنی جگہ صحیح ہیں، لیکن غیر مقبول سفارش نہیں کر سکے گا، غیر مقبول کے لئے سفارش نہیں کر سکے گا، اس لیے مشرکین والی سفارش غلط ہے۔

وَلَئِنْ سَاَلْتَهُمْ مَّنْ خَلَقَهُمْ: اگر آپ ان سے پوچھیں کہ ان کو پیدا کس نے کیا؟ ''تو البتہ ضرور کہیں گے کہ اللہ نے کیا، پھر یہ کدھر کو پھیرے جاتے ہیں' جب خالق وہ ہے تو مالک بھی وہ ہے، عبادت بھی اسی کی کرنی چاہیے۔

وَقِيْلِهٖ: اس کا عطف مفسرین نے کیا ہے ساعۃ کے اُوپر، وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَقِيْلِهٖ، اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے قیامت کا علم، اور اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہے رسول کے اس قول کا علم کہ یٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ: اے میرے پروردگار! بے شک یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، یعنی یہ رسول جو فریاد کرتا ہے اللہ کے دربار میں کہ میرے سمجھانے کے باوجود یہ مانتے نہیں ہیں، یہ قول بھی اللہ جانتا ہے، یعنی ان کا شرک مستقل جرم، لیکن رسول کی جو نالش ہے اور دعویٰ ہے اللہ کے دربار میں یہ اس میں شدّت پیدا کردے گا، اللہ کو معلوم ہے کہ اللہ کا رسول یوں کہہ رہا ہے، یہ ہو گیا عطف اس کا ساعۃ کے اُوپر، وَعِنْدَهٗ عِلْمُ السَّاعَةِ وَقِيْلِهٖ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ (عام تفاسیر)، اور بعض مفسرین نے وَقِيْلِهٖ میں واؤ کو قسمیہ بنایا ہے، پھر معنی یہ ہو جائے گا کہ رسول کے اس قول کی قسم! میں اس کی مدد ضرور کروں گا، یہ قسم کا جواب محذوف نکل آئے گا (آلوسی)، اللہ کے رسول کے اس قول کی قسم، وہ قول یہ ہے کہ يٰرَبِّ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ لَّا يُؤْمِنُوْنَ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے، رسول کے اس کہنے کی قسم! میں رسول کی مدد ضرور کروں گا اور ان کے مخالفین کو عذاب ضرور دوں گا۔ اس طرح سے بھی مفہوم بیان کیا گیا ہے۔

فَاصْفَحْ عَنْهُمْ: آپ ان سے درگزر کر جائیے، وَقُلْ سَلٰمٌ: اور سلام کہہ دیجئے، سلام سے مراد ہے رَفعِ شر کی بات، سلامتی کی بات، جس طرح سے ہوتا ہے کہ بھئی! ہمارا تمہارا کوئی جھگڑا نہیں، ہماری طرف سے تمہیں سلام، یہ منازعت کے قطع کرنے کے لئے ایک طریقہ ہوتا ہے کہ ہماری طرف سے سلام لو، ہماری جان چھوڑو، ہم تمہیں کچھ نہیں کہتے اور تم ہمارے پیچھے نہ پڑو، فیصلہ ایک دن خود ہو جائے گا، یہ سلام ''سلامِ متارکت'' کہلاتا ہے قطع تعلق کے لئے، جس طرح سے حضرت ابراہیم نے بھی اپنے باپ کو کہا تھا: سَلٰمٌ عَلَيْكَ (سورۂ مریم: ۴۷)، اور سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ لَا نَبْتَغِي الْجٰهِلِيْنَ (سورۂ قصص: ۵۵)، اُس آیت کے اندر بھی اِسی ''سلامِ متارکت'' کا ذکر آیا تھا، ''اور آپ سلام کہہ دیجئے'' یعنی سلامتی کی بات کہہ دیجئے، رَفعِ شر کی بات کہہ دیجئے، قطع تعلق اِن سے کر لیجئے، فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ: عنقریب ان کو پتا چل جائے گا کہ ان کے کردار کا کیا نتیجہ ان کے سامنے آتا ہے!

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُورَةُ الدُّخَانِ

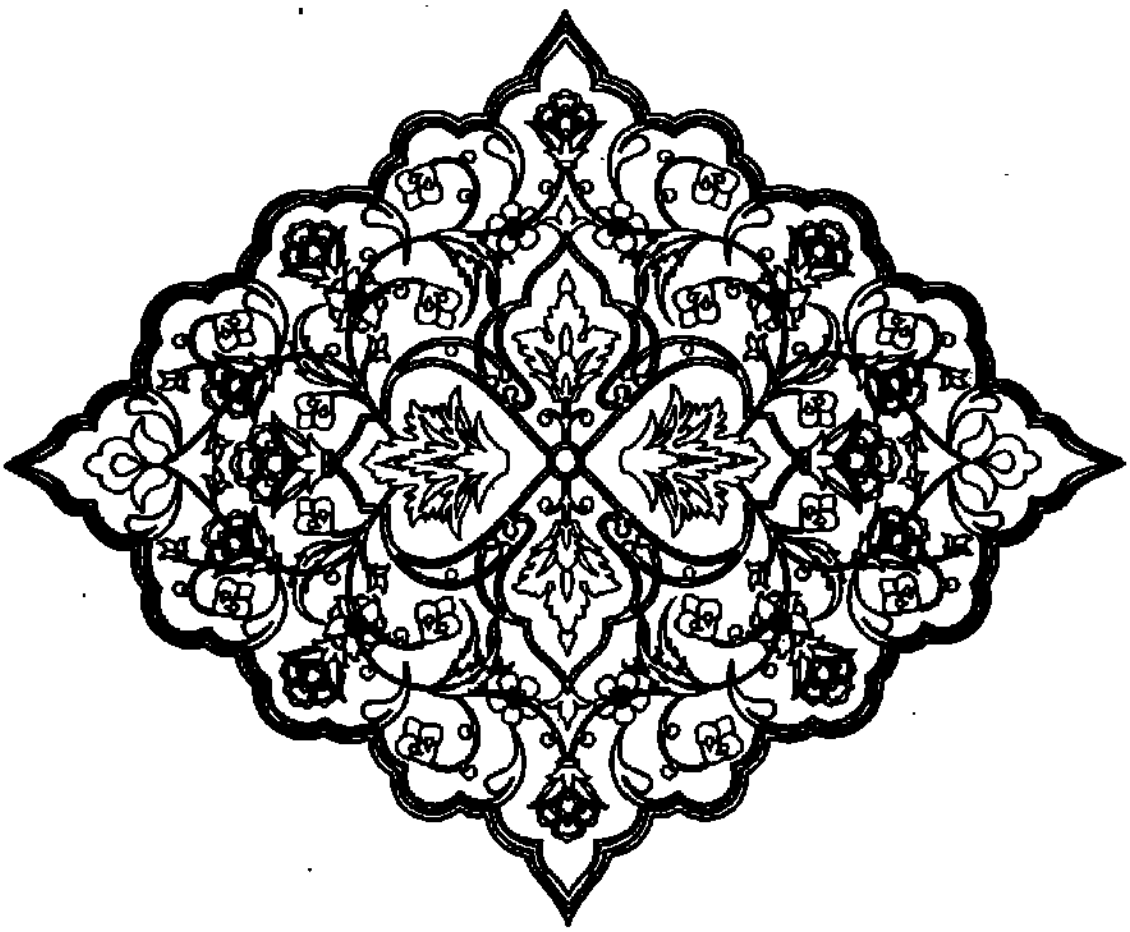

آیاتها ۵۹ ۴۴ سُوْرَةُ الدُّخَانِ مَكِّيَّةٌ ۶۴ رکوعاتها ۳

سورۂ دخان مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی انسٹھ آیتیں ہیں تین رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

حٰمٓ ۚ﴿۱﴾ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ۙ﴿۲﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ ﴿۳﴾

حٰمٓ ﴿۱﴾ واضح کتاب کی قسم! ﴿۲﴾ بے شک ہم نے اُتارا اس کو برکت والی رات میں، بے شک ہم ڈرانے والے ہیں ﴿۳﴾

فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ ۙ﴿۴﴾ اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا ؕ اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ ۚ﴿۵﴾

اُس رات میں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر حکمت والے امر کا ﴿۴﴾ ہماری طرف سے حکم صادر ہوکر، بے شک ہم بھیجنے والے ہیں ﴿۵﴾

رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۙ﴿۶﴾ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا

تیری رَبّ کی طرف سے رحمت کی وجہ سے، بے شک وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے ﴿۶﴾ جو رَبّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو

بَيْنَهُمَا ۘ اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ ﴿۷﴾ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ؕ رَبُّكُمْ

ان دونوں کے درمیان میں ہیں اگر تم یقین لانے والے ہو ﴿۷﴾ کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، وہ زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے، وہ تمہارا رَبّ ہے

وَرَبُّ اٰبَآىِٕكُمُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۸﴾ بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ ﴿۹﴾ فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَاْتِي

اور تمہارے پہلے آباء کا رَبّ ہے ﴿۸﴾ بلکہ یہ شک میں ہیں اور کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں ﴿۹﴾ پس آپ انتظار کیجئے جس دن کہ لے آئے گا

السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ ۙ﴿۱۰﴾ يَّغْشَى النَّاسَ ؕ هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۱۱﴾ رَبَّنَا اكْشِفْ

آسمان ایک واضح دُھواں ﴿۱۰﴾ جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا، یہ دردناک عذاب ہے ﴿۱۱﴾ (یہ کہیں گے) اے ہمارے رَبّ! دُور ہٹا دے

عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ

ہم سے اس عذاب کو، بے شک ہم ایمان لانے والے ہیں ﴿۱۲﴾ کیونکر ہوگی ان کے لئے نصیحت، حالانکہ آگیا ان کے پاس رسول

مُّبِيْنٌ ۙ﴿۱۳﴾ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ ۘ﴿۱۴﴾ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا

مبین ﴿۱۳﴾ پھر ان لوگوں نے اس رسول سے پیٹھ پھیری اور کہنے لگے: یہ تو سکھایا ہوا ہے، دیوانہ ہے ﴿۱۴﴾ بے شک ہم کھولنے والے ہیں عذاب کو تھوڑا سا،

اِنَّكُمْ عَآىِٕدُوْنَ ﴿۱۵﴾ یَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى ۚ اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا

بے شک تم لوٹنے والے ہو﴿۱۵﴾ جس دن کہ ہم پکڑیں گے سخت پکڑ، بے شک ہم انتقام لینے والے ہیں﴿۱۶﴾ البتہ تحقیق آزمائش میں ڈالا ہم نے

قَبْلَهُمْ قَوْمَ فِرْعَوْنَ وَجَآءَهُمْ رَسُوْلٌ كَرِیْمٌ ﴿۱۷﴾ لا اَنْ اَدُّوْۤا اِلَیَّ عِبَادَ اللّٰهِ ؕ اِنِّیْ

ان سے پہلے فرعون کی قوم کو، اور آیا ان کے پاس ایک بہت ہی باعزت رسول﴿۱۷﴾ (یہ پیغام لے کر) کہ ادا کردو میری طرف اللہ کے بندوں کو، میں

لَكُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ ﴿۱۸﴾ لا وَّ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ ۚ اِنِّیْۤ اٰتِیْكُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِیْنٍ ﴿۱۹﴾ ج وَ

تمہارے لئے امانت دار رسول ہوں﴿۱۸﴾ اور اللہ کے مقابلے میں سرکشی اختیار نہ کرو، بے شک میں تمہارے پاس واضح دلیل لے کر آیا ہوں﴿۱۹﴾ اور

اِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ وَرَبِّكُمْ اَنْ تَرْجُمُوْنِ ﴿۲۰﴾ وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ

بے شک میں پناہ پکڑتا ہوں اپنے ربّ کی اور تمہارے ربّ کی اس بات سے کہ تم مجھے رجم کرو﴿۲۰﴾ اور اگر تم مجھ پر ایمان نہیں لاتے

فَاعْتَزِلُوْنِ ﴿۲۱﴾ فَدَعَا رَبَّهٗۤ اَنَّ هٰۤؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ ﴿۲۲﴾

تو تم مجھ سے جدا ہی رہو﴿۲۱﴾ تو اس رسول نے اپنے ربّ کے سامنے دُعا کی کہ یہ سارے کے سارے لوگ جرم کرنے والے ہیں﴿۲۲﴾

فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ ﴿۲۳﴾ لا

(تو اللہ کی طرف سے اُس رسول کریم کو کہہ دیا گیا کہ) تُو میرے بندوں کو لے کے راتوں رات چل، بے شک تم پیچھا کیے جاؤ گے﴿۲۳﴾

وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا ؕ اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ ﴿۲۴﴾ كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّ

اور چھوڑ دے تُو سمندر کو ساکن، بے شک یہ لشکر ہیں ڈبوئے ہوئے﴿۲۴﴾ چھوڑ گئے وہ لوگ کتنے ہی باغات اور

عُیُوْنٍ ﴿۲۵﴾ لا وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِیْمٍ ﴿۲۶﴾ لا وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِیْهَا فٰكِهِیْنَ ﴿۲۷﴾ لا كَذٰلِكَ ۫ وَ

چشمے﴿۲۵﴾ اور کتنی ہی کھیتیاں اور عزّت کے مقام﴿۲۶﴾ اور کتنی ہی خوش حالی جس میں وہ مزے اُڑایا کرتے تھے﴿۲۷﴾ بات ایسے ہی ہے، اور

اَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ﴿۲۸﴾ فَمَا بَكَتْ عَلَیْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِیْنَ ﴿۲۹﴾ ع

ہم نے ان سب چیزوں کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا﴿۲۸﴾ نہ رویا ان کے اُوپر آسمان اور زمین، نہ وہ ڈھیل دیے گئے تھے﴿۲۹﴾

سورۂ دُخان کی فضیلت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سورۂ دُخان مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی انسٹھ آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں۔ ''دُخان'' دھویں

کو کہتے ہیں، اور اس سورت میں یہ لفظ آ رہا ہے فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ، تو اس سورت کا نام اسی سے ماخوذ ہے۔ احادیث میں جس طرح چند سورتوں کے خاص خاص فضائل آئے ہیں، اس سورت کی فضیلت بھی بعض روایات میں ذکر کی گئی ہے، جمعہ کی رات کو پڑھنے کے متعلق حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص جمعہ کی رات کو اس سورت کی تلاوت کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے گناہ معاف فرمادیتے ہیں۔[1] اور ایک روایت میں ہے کہ جو شخص رات کے وقت سورۂ دُخان پڑھتا ہے تو ستر ہزار فرشتے اس کے لئے صبح تک استغفار کرتے رہتے ہیں۔[2] اس لیے سورۂ دُخان کی تلاوت جمعہ کی رات کو کرنی چاہیے، جمعہ کی رات سے مراد ہوا کرتی ہے جمعرات اور جمعہ کی درمیانی رات، جس کے بعد جمعہ کا دِن آیا کرتا ہے، کیونکہ اسلامی نقطۂ نظر سے رات، دِن سے پہلے آیا کرتی ہے، ہفتے کی شام کو جو رات آئے گی وہ اتوار کی رات کہلائے گی، اتوار کی شام کو جو رات آئے گی وہ سوموار کی کہلائے گی، تو جمعہ کی رات وہ ہوتی ہے جو جمعہ کے دِن سے پہلے آتی ہے، تو اُس رات میں اِس سورت کے پڑھنے کی فضیلت آتی ہے۔ اس کے مضامین دوسری ''مکی'' سورتوں کی طرح ہی ہیں، چونکہ مکہ میں نازل ہوئی تو اُصول کا ذکر ہی ہے۔

خلاصۂ آیات مع تحقیق الالفاظ

حٰمٓ: یہ حروفِ مقطعات میں سے ہیں، کئی سورتیں اسی نام کے ساتھ چلی آرہی ہیں، اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمُرَادِهٖ بِذٰلِكَ۔ وَالْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ: واوٴ قسمیہ ہے، واضح کتاب کی قسم! مبین یہ اَبَان سے ہے، اور اَبَان لازم بھی ہے متعدی بھی، کتابِ مبین کا معنی واضح کتاب، جو اپنی ذات میں خود واضح ہے، اور اَبَان ظاہر کرنے کو بھی کہتے ہیں، تو مبین کا معنی ظاہر کرنے والی، ایسی کتاب جو کہ حقائق کو ظاہر کرنے والی ہے، خیر اور شر کی تفصیل بیان کرنے والی ہے، مبین کا یہ معنی بھی ہوسکتا ہے۔ کتابِ مبین کی قسم کھا کر یہ بات کہی گئی اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ: بے شک ہم نے اُتارا اِس کو برکت والی رات میں، اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ: بے شک ہم ڈرانے والے ہیں، فِيْهَا يُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِيْمٍ: اُس رات میں فیصلہ کیا جاتا ہے ہر حکمت والے امر کا، اَمْرًا مِّنْ عِنْدِنَا: ہماری طرف سے حکم صادر ہوکر، ہماری طرف سے حکم صادر ہو کر اُس رات میں ہر امرِ حکیم کا فیصلہ کیا جاتا ہے، اِنَّا كُنَّا مُرْسِلِيْنَ: بے شک ہم بھیجنے والے ہیں رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ: تیری رَبّ کی طرف سے رحمت کی وجہ سے۔ رَحْمَةً مفعول لہ ہے مُرْسِلِيْنَ کا ''تیرے رَبّ کی طرف سے رحمت کی وجہ سے ہم بھیجنے والے ہیں'' اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ: بے شک وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔ ''جو رَبّ ہے آسمانوں کا اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو ان دونوں کے درمیان میں ہیں'' اِنْ كُنْتُمْ مُّوْقِنِيْنَ: اگر تم یقین لانے والے ہو تو یہ بات یقین لانے کی ہے، تمہیں اس بات پہ یقین کرنا چاہیے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ: کوئی معبود نہیں سوائے اس کے، وہ زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے، رَبُّكُمْ وَرَبُّ اٰبَآئِكُمُ الْاَوَّلِيْنَ: وہ تمہارا رَبّ ہے اور تمہارے پہلے آباء کا رَبّ ہے، بَلْ هُمْ فِيْ شَكٍّ يَّلْعَبُوْنَ: ان باتوں کو سُن کر یہ لوگ یقین نہیں لاتے بلکہ یہ شک میں ہیں اور کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں، فَارْتَقِبْ يَوْمَ تَأْتِي السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِيْنٍ: پس آپ انتظار کیجئے جس

---

(۱) ترمذی ۲/ ۱۱۷ باب ما جاء فی فضل حم الدخان/ مشکوۃ ۱/ ۱۸۷، کتاب فضائل القرآن فصل ثانی۔ مَنْ قَرَأَ حٰمٓ الدُّخَانَ فِيْ لَيْلَةِ الْجُمُعَةِ غُفِرَ لَهٗ۔

(۲) حوالہ مذکورہ۔ ولفظ الحدیث: مَنْ قَرَأَ حٰمٓ الدُّخَانَ فِيْ لَيْلَةٍ اَصْبَحَ يَسْتَغْفِرُ لَهٗ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ

دِن کہ لے آئے گا آسمان ایک ظاہر دُھواں، ایک واضح، نمایاں دُھواں لے آئے گا، اَتٰی یَاْتِی آنے کے معنی میں، اور بِدُخَانٍ کے اوپر باء تعدیہ کی ہے، ”جس دِن کہ لے آئے آسمان ایک واضح دُھواں“ یَّغْشَی النَّاسَ: جو لوگوں کو ڈھانپ لے گا، هٰذَا عَذَابٌ اَلِيْمٌ: یہ دردناک عذاب ہے۔ رَبَّنَا اكْشِفْ عَنَّا الْعَذَابَ اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ: اس سے پہلے يَقُوْلُوْنَ، يَدْعُوْنَ اس قسم کا لفظ محذوف ہوگا، یہ لوگ دُعا کریں گے، پکاریں گے، کہیں گے، اے ہمارے ربّ! دُور ہٹادے ہم سے اِس عذاب کو، اِنَّا مُؤْمِنُوْنَ: بے شک ہم ایمان لانے والے ہیں، اَنّٰى لَهُمُ الذِّكْرٰى: کیونکر ہوگی ان کے لئے نصیحت، وَقَدْ جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مُّبِيْنٌ: حالانکہ آ گیا ان کے پاس رسول مبین، یہاں بھی مبین کے دونوں ترجمے ہیں، واضح رسول یعنی جس کی رِسالت واضح ہے، اس کے اخلاق سے، اس کے کردار سے، اس کے بیان کردہ دلائل سے، اوصاف سے، اس کا رسول ہونا بالکل واضح ہے، یا ”ایسا رسول جو کہ حقیقت کو کھول کے بیان کرنے والا ہے“ ثُمَّ تَوَلَّوْا عَنْهُ: پھر ان لوگوں نے اُس رسول سے پیٹھ پھیری، وَقَالُوْا مُعَلَّمٌ مَّجْنُوْنٌ: اور کہنے لگے کہ یہ تو سکھایا ہوا ہے، مَجْنُوْنٌ: دیوانہ ہے، اس کی عقل مستور ہے، یہ عقل مند نہیں، مُعَلَّمٌ: سکھایا ہوا ہے، کسی نے سکھا کے اس کو آگے کردیا، پاگل ہے دوسرے کی باتوں میں آ گیا، اس لیے اپنی برادری کی مخالفت کررہا ہے، اپنے آباؤاجداد کے طریقوں کو چھوڑ رہا ہے، کسی نے اِس کو کوئی پٹی پڑھادی اور خود اِس کو عقل نہیں۔ یہ انہوں نے اپنے رسول کے اُوپر تبصرہ کیا، کہ یہ معلَّم بھی ہے اور مجنون بھی ہے، معلم مجنون ہونے کا یہی معنی ہے، جس طرح سے کوئی شخص ایسی بات کرنی شروع کردے جو آپ کی سمجھ میں نہ آئے یا آپ کی منشا کے خلاف ہو تو آپ کہتے ہیں کہ اِس کو کسی اور نے پٹی پڑھائی ہے ورنہ یہ شخص تو ایسا نہیں تھا، اور یہ بے وقوف ہے جو دوسرے کی باتوں میں آکر اس طرح سے مخالفت کرنے لگ گیا اور اس نے یہ طریقہ اختیار کرلیا جس کے نتیجے میں قوم کے اندر پھوٹ پڑگئی، پتھر کھاتا ہے، عزّت کے ساتھ رہتا تھا لیکن اب گلی گلی میں بےعزّت ہوتا پھرتا ہے، یہ کوئی عقل مندی کی بات ہے؟ کسی نے پٹی پڑھا کے اس کو آگے کردیا۔ یعنی وہ رسول کی باتوں کو اس طرح سے ٹھکراتے تھے۔ اِنَّا كَاشِفُوا الْعَذَابِ قَلِيْلًا: بے شک ہم کھولنے والے ہیں عذاب کو تھوڑا سا، تھوڑا سا کا معنی تھوڑے سے وقت کے لئے، اِنَّكُمْ عَآئِدُوْنَ: بے شک تم لوٹنے والے ہو، يَوْمَ نَبْطِشُ الْبَطْشَةَ الْكُبْرٰى: جس دِن کہ ہم پکڑیں گے سخت پکڑ، بطش پکڑ کو کہتے ہیں، اِنَّا مُنْتَقِمُوْنَ: بے شک ہم انتقام لینے والے ہیں۔

تفسیر

قرآن اپنی حقّانیت کی خود دلیل ہے

سورۂ دُخان کی ابتدائی آیات جن کا ترجمہ آپ کے سامنے کیا گیا، آپ دیکھ رہے ہیں کہ سب سے پہلے تو قرآنِ کریم کا اس میں تذکرہ ہے، جیسے کہ کل سورتیں جو حٰمٓ سے شروع کی گئی ہیں ان کی ابتدا میں کتاب اللہ کا ذِکر ہی آیا ہے، اُسی ترتیب کے مطابق یہاں بھی شروع میں اللہ کی کتاب کا ذِکر ہے۔ اسی کتابِ مبین کو شاہد کے طور پر پیش کیا گیا کہ یہ ہماری اُتاری ہوئی ہے، قرآنِ کریم میں جو قسمیں کھائی جاتی ہیں آپ کے سامنے بار بار اس کی وضاحت کی گئی کہ یہ آنے والے مضمون کے لئے ایک شاہد

کے طور پر ہوتی ہیں، تو جس کا مطلب یہ ہوا کہ یہ بات جو کہی جارہی ہے کہ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ: ہم نے اِس کتاب کو اُتارا ہے، تو ہمارے اُتارنے کی دلیل خود یہ کتاب ہے، باہر سے دلیل لانے کی ضرورت ہی نہیں، آفتاب آمد دلیل آفتاب، کہ اگر آپ اس کتاب میں دیکھیں گے غور کریں گے تو جس طرح سے اس میں باتیں بیان کی گئی ہیں، جو حقائق اِس میں نمایاں کیے گئے ہیں، جو فصاحت اور بلاغت اس میں اختیار کی گئی ہے، یہ کسی انسان کے بس کی بات ہی نہیں، اور یہی ہے اس کا اعجازی پہلو جس کی بنا پر بار بار تنبیہ کی جاتی ہے اور چیلنج کیا جاتا ہے کہ اگر تم اس کو کسی انسان کی بنائی ہوئی سمجھتے ہو تو اس کے مقابلے کے لئے میدان میں آجاؤ، اور اگر پوری کی پوری کتاب اس جیسی نہیں لاسکتے تو تم ایک سورت ہی لا کے دکھا دو، اور پھر کتنے اعتماد کے ساتھ یہ کہہ دیا گیا تھا کہ تم سے ہرگز ایسا نہیں ہوگا، اور واقعہ ہے کہ نہیں ہوسکا، تو گویا کہ یہ کتابِ مبین اپنی ذاتی حیثیت سے ہی خود دلیل ہے اس بات کی کہ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ: اس کو ہم نے اُتارا ہے۔

''لیلۂ مبارکہ'' کا مصداق

پھر یہ کتاب جو اُتاری گئی تو کیسی مبارک گھڑی میں اُتاری گئی، تم تو سمجھتے ہو کہ یہ کتاب کوئی بلائے ناگہانی ہے جو ہم پہ آگئی اور اس نے آکر ہمیں مصیبت میں ڈال دیا، یہ مصیبت میں ڈالنے والی چیز نہیں ہے، یہ تو بہت ہی مبارک وقت میں تم پہ اُتاری گئی، تم اس گھڑی کو اپنے لیے بابرکت سمجھو جس میں اللہ تعالیٰ نے اس کتاب کو تم پہ اُتار دیا۔ لیلۂ مبارکہ میں اُتاری گئی، برکت والی رات، کثیر النفع رات، جس میں اللہ تعالیٰ نے بہت منافع رکھے ہیں۔ اس رات سے کون سی رات مراد ہے؟ قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ یہ ذکر کیا گیا شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْۤ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ (سورۂ بقرہ:۱۸۵) وہاں نسبت قرآنِ کریم کی رمضان المبارک کی طرف کی گئی، ''رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اُتارا گیا'' اس سے معلوم ہوگیا کہ مہینہ تو رمضان کا ہے جس میں قرآن اُترا، اور پھر دُوسری جگہ آیا اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ (پارہ ۳۰) ہم نے اس قرآنِ کریم کو لیلۃ القدر میں اُتارا، ان دونوں باتوں کو جس وقت آپ جوڑیں گے تو معلوم یوں ہوگا کہ ''لیلۃ القدر'' رمضان میں ہے جس میں اس قرآن کو اُتارا گیا۔ اور اس اُتارنے سے وہ دفعۃً اُتارنا مراد ہے، کہ مجموعہ نقل کردیا گیا لوحِ محفوظ سے آسمانِ دُنیا کی طرف، اور اس کے بعد پھر تیئس سال میں تھوڑا تھوڑا کر کے اُترتا رہا، تو ''لیلۃ القدر رمضان میں'' تو دونوں باتیں صادق آگئیں کہ ہم نے قرآن رمضان میں اُتارا، لیلۃ القدر میں اُتارا، تو لیلۃ القدر جب رمضان میں تھی تو لیلۃ القدر میں اُترنے کے ساتھ رمضان میں اُترنا بھی لازم آگیا، یہ دونوں باتیں دلیل ہیں اس بات کی کہ ''لیلۂ مبارکہ'' سے بھی وہی رات مراد ہے، جس کو دوسری جگہ ''لیلۃ القدر'' کے ساتھ ذکر کیا گیا، جو رمضان المبارک میں ہوتی ہے، اور اسی رات کے متعلق یہ ذکر کیا گیا کہ اُس رات میں ہر حکمت والے اَمر کا فیصلہ کیا جاتا ہے۔ حکیم سے حکمت والا اَمر مراد ہے، یا محکم یعنی ہر مضبوط اَمر۔ فیصلہ کیا جاتا ہے، فیصلہ کرنے کے بعد جس طرح سے احادیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کارکنانِ قضاء وقدر یعنی فرشتے جو اللہ نے متعین کر رکھے ہیں کام کاج کے لئے، سال کے دوران میں ہونے والے واقعات کا فیصلہ کر کے ان کے سپرد کر دیا جاتا ہے، کہ تم نے اتنے بچوں کی جان نکالنی ہے، اور اتنا رزق اُتارنا ہے، اور اتنی بارش اُتارنی ہے، یہ واقعہ ہوگا، وہ واقعہ

ہوگا، تو اللہ تعالیٰ سال بھر کے واقعات کا فیصلہ کر کے لوحِ محفوظ سے نقل کروا کے (چونکہ فیصلے تو اللہ تعالیٰ کے اِس مخلوق کے پیدا کرنے سے پہلے کے لکھے ہوئے ہیں) یعنی وہ سال کے واقعات فرشتوں کے سامنے نمایاں کر دیے جاتے ہیں اور ان کے سپرد کر دیے جاتے ہیں جس جس شعبے سے ان کا تعلق ہوتا ہے، جو فرشتے بچوں کی پرورش پر متعین ہیں، جو ماں کے رحم میں بچے کی پرورش کرتے ہیں، ان کو اس کی تفصیل دے دی جاتی ہے، اور جان نکالنے والے فرشتوں کو اس کی تفصیل دے دی جاتی ہے، رزق اُتارنے والوں کو اس کی تفصیل دے دی جاتی ہے، اور دُنیا میں جتنے واقعات ہوتے ہیں اس کی تفصیل اللہ تعالیٰ نقل کروا کے فرشتوں کے سپرد کر دیتے ہیں، فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ کا یہ معنی ہے، گویا کہ اس رات کے اندر یہ بھی ایک عظیم واقعہ پیش آتا ہے۔

''شبِ براءت'' والی روایات اور ان کا درجہ

روایات کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے، ''مشکوٰۃ شریف'' میں ''باب قیام شهر رمضان'' کے اندر تین چار روایتیں آتی ہیں، جن میں نصف شعبان کی رات، ''لیلة نصفِ شعبان'' یعنی پندرہ شعبان کی رات کے متعلق آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ اَرزاق اور آجال کے فیصلے، رزقوں کے اور موتوں کے فیصلے اِس رات میں کرتے ہیں، جو نصف شعبان کی رات ہے، جس کو ''لیلۃ البراءت'' کے ساتھ ذِکر کیا جاتا ہے، اس لیے بعض حضرات کا رُجحان یہ ہوا کہ ''لیلۂ مبارکہ'' سے وہ رات مراد ہے، کیونکہ فِیْهَا یُفْرَقُ كُلُّ اَمْرٍ حَكِیْمٍ روایات کے اندر اس رات کے متعلق ذِکر کیا گیا ہے، تو مابعد کی طرف اگر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ رات لیلۂ نصفِ شعبان ہے، نصف شعبان والی رات ہے، لیکن اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ یہ ماقبل کی طرف دیکھتے ہیں تو اس سے تعیین یہ ہوتی ہے کہ اس سے لیلۃ القدر ہی مراد ہے، یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے؟ اس لیے عام طور پر مفسرین نے یہاں یہی بات لکھی ہے کہ قرآنِ کریم میں چونکہ قرآنِ کریم کا اِنزال لیلۃ القدر میں صراحت کے ساتھ ذِکر کیا گیا، اور قرآنِ کریم کا اِنزال رمضان المبارک میں ذِکر کیا گیا، تو یہ ایک نصِ قطعی ہے، لہٰذا لیلۂ مبارکہ سے وہی رات مراد لینی چاہیے جو رمضان المبارک میں ہوتی ہے، جس کو دُوسری جگہ ''لیلۃ القدر'' کے عنوان سے ذِکر کیا گیا ہے، اور باقی! جو لیلۂ نصفِ شعبان کے متعلق روایات ذِکر کی گئی ہیں وہ خبرِ واحد کی درجے کی ہیں، اور وہ اس درجے کی نہیں کہ ان کے ساتھ ہم اِن نصوص کو مؤوّل کر دیں، اس لیے مدار اِس نص کے اُوپر ہی رکھنا چاہیے، تو لیلۂ نصف شعبان کی فضیلت بھی ہوگی، اس قسم کے واقعات اس میں بھی ہوتے ہوں گے اور لیلۃ القدر میں بھی ہوتے ہوں گے، لیکن یہاں چونکہ اس میں اِنزالِ قرآن کا ذِکر آیا ہوا ہے، اس لیے یہاں لیلۃ القدر ہی متعین ہے، اور وہ روایتیں ان نصوص کے مقابلے میں مرجوح ہیں، بلکہ بعض ضعیف ہیں اور بعض مرسل ہیں، اس لیے قرآن کی صراحت کے مقابلے میں ان روایات کو بطورِ حجت کے پیش نہیں کیا جاسکتا۔

آیات اور روایات میں تطبیق

اور بعض حضرات نے تطبیق بھی دے دی کہ اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت فرقِ اُمور کی اِبتدا کرتے ہیں لیلۂ نصف شعبان سے، اور اس کی تکمیل ہوجاتی ہے لیلۃ القدر پہ جا کر، اگر یہ کرلیا جائے تو ایسی صورت میں پھر وہ روایات بھی اپنی جگہ ٹھیک ہوجائیں

گی، کہ وہ فرقِ اُمور کی اِبتدا کو بیان کرنے والی ہیں، اور لیلۃ القدر کے متعلق بھی بات ٹھیک ہوجائے گی کہ اس رات میں طے ہوکر معاملہ ختم کردیا جاتا ہے، اگر یوں کرلیا جائے تو ایسے طور پر اِن آیات کی رعایت بھی رہ سکتی ہے، اور اُن روایات کی رعایت بھی رہ سکتی ہے، کہ فرقِ اُمور کی اِبتدا وہاں سے ہوتی ہے اور اِختتام اس کا لیلۃ القدر پر ہوجاتا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ قرآنِ کریم کے اُتارنے کا ذِکر جو لیلۃ القدر میں کیا گیا ہے تو وہ اسی انتہائی واقعے کے طور پر کیا گیا ہے، فیصلہ ہوگیا ہو نصف شعبان میں، اِبتدا ہوگئی، اللہ تعالیٰ کے اپنے علم میں اپنی حکمت کے مطابق جس طرح سے ہوتی ہے، اور وہ فرشتوں کے سپرد کرتے ہوئے اس معاملے کا اختتام لیلۃ القدر پہ جاکر ہوجاتا ہے، تو بعض مفسرین نے دونوں کو اس طرح سے بھی جوڑا ہے...... لیکن یہاں جو یہ بات کہی جارہی ہے، تو یہاں اس بات کے کہنے سے مقصد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو فیصلہ کن گھڑی کے اندر اُتارا ہے، اور تمہارے لیے وہ گھڑی ”لیلۂ مبارکہ“ کا درجہ رکھتی ہے، تم اس گھڑی کو اپنے لیے مبارک سمجھو، برکت والی سمجھو، جس میں تمہاری طرف اس قسم کی کتاب کے اُتارنے کا فیصلہ ہوگیا، اس کو اپنے لیے کوئی بلا اور مصیبت نہ سمجھو، ”اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم صادر ہوکر ہر اَمر کا فیصلہ کیا جاتا ہے“ اور اسی فیصلے کے تحت یہ قرآنِ کریم کے اِنزال کا فیصلہ کیا گیا، اور قرآنِ کریم اُتارنے کی وجہ یہ تھی کہ اِنَّا كُنَّا مُنْذِرِيْنَ: ہم تمہیں ڈرانے والے ہیں تمہارے انجام سے، اور کسی شخص کو اس کے بُرے انجام سے ڈرانا یہ اس کے لئے انتہائی درجے کی رحمت ہوتی ہے، جس طرح سے آگے اللہ کے رسول کو بھیجنے کی ایک وجہ رَحْمَةً مِّنْ رَّبِّكَ کے ساتھ ذِکر کی گئی، ایک آدمی ایک کردار اختیار کیے ہوئے ہے جس کا نتیجہ ابھی اس کے سامنے نہیں، اور کچھ دنوں کے بعد ایسا نتیجہ سامنے آئے گا کہ بالکل بربادی ہوجائے گی، تو اس کو وقت پر متنبہ کردینا کہ جو عادت تُو نے اِختیار کرلی اچھی نہیں ہے، جو کردار تُو نے اِختیار کرلیا تباہ کن ہے، یہ رحمت کا ایک تقاضا ہوتا ہے، تو اللہ تعالیٰ بندوں کے لئے رحیم بھی ہے کریم بھی ہے، وہ صرف رَبّ ہی نہیں کہ تمہیں کھانے کے لئے روٹی دے اور تمہارے بدنوں کی پرورش کرے، بلکہ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ تمہاری رُوحانیت کی بھی تکمیل کرے، اور ہر بُرے انجام سے تمہیں ڈرائے اور اچھے انجام کی طرف تمہاری راہنمائی کرے، اس رحمت کی صفت کی بنا پر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم رسول بنا کر بھیجنے والے ہیں، اور اسی لیے ہم نے رسول بنا کر بھیجا اور یہ کتاب اُتاری، لوگوں کو چاہیے کہ اس کتاب کو اپنے لیے رحمت کا ظہور سمجھیں اور اس سے فائدہ اُٹھائیں۔ تو قرآنِ کریم کی عظمت کے ساتھ ساتھ اس کی حیثیت بھی واضح ہوگئی کہ یہ اللہ کی رحمت کا ظہور ہے اور لوگوں کے نفع کے لئے ہی اُتاری گئی ہے، ”اور وہ سننے والا ہے جاننے والا ہے“ ہر بات کو سنتا ہے ہر بات کو جانتا ہے، جب سمع اور علم اس کو پوری طرح سے حاصل ہے تو اس کے فیصلے جو بھی ہوں گے وہ حقیقت پر مبنی ہوں گے، اور جو راہنمائی وہ کرے گا اسی راہنمائی کے اندر ہی تمام کے تمام فوائد بند ہیں، میں آپ کو ایک مشورہ دے سکتا ہوں، لیکن چونکہ میں پورے حالات جانتا نہیں، اس لیے ہوسکتا ہے کہ میرا فیصلہ نتیجے کے اعتبار سے آپ کے لئے نقصان دہ ثابت ہوجائے، لیکن جس کا علم محیط ہے وہ ہر چیز کو جانتا ہے وہ جو راہنمائی کرے گا وہی بات ٹھیک ہے اور اس کے خلاف بات کبھی ظاہر نہیں ہوسکتی، اللہ تعالیٰ کی صفات ذِکر کرنے سے یہاں یہی مقصود ہوگیا۔

اِثباتِ توحید کے لئے رُبوبیت کا تذکرہ

آگے اس کی رُبوبیت کو ذکر کیا جارہا ہے اس کی توحید کو ثابت کرنے کے لئے، آسمان زمین اور ما بینہما کا رَبّ وہی ہے، اور جب تم بھی اس کو رَبّ مانتے ہو تو تمہیں اس بات پہ یقین کرنا چاہیے کہ جب رَبّ وہ ہے تو پھر معبود بھی وہی ہے، جس نے پیدا کیا، جس نے پالا، جو ضروریات پوری کرتا ہے تو وہی اس بات کا حق دار ہے کہ اس کے سامنے سر جھکایا جائے، لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اس کی رُبوبیت کے نتیجے میں یہ توحید کو ذکر کیا جارہا ہے، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ ۝ کے اندر جس طرح سے ذکر کیا گیا، کہ رَبّ وہی ہے، بادشاہ وہی ہے، اور جب رَبّ وہی ہے، بادشاہ وہی ہے تو پھر عبادت کے لائق بھی وہی ہے، یُحْیٖ وَیُمِیْتُ: زندگی موت سب اسی کے ہاتھ میں ہے، کسی دوسرے کے ہاتھ میں موت و حیات نہیں، ''وہ تمہارا بھی رَبّ ہے اور تمہارے آبائے اَوّلین کا بھی رَبّ ہے'' اس لئے اگر تمہارے آبائے اَوّلین نے اس کو پہچاننے میں کسی قسم کی غلطی کی ہے تو تمہیں اس غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے، حقیقت یہی ہے کہ جس طرح سے تمہارا رَبّ ہے اسی طرح سے تمہارے آبائے اَوّلین کا بھی وہی رَبّ ہے، تمہارے آبائے اَوّلین کو بھی چاہیے تھا کہ اسی کو رَبّ سمجھتے اور اسی کی عبادت کرتے، لیکن اگر انہوں نے اس چیز کے پہچاننے میں غلطی کی ہے تو تمہیں اس غلطی کا اعادہ نہیں کرنا چاہیے۔

مشرکین غافل ہیں اور دُھویں کے منتظر ہیں

بَلْ: اِضراب کے لئے ہے، کہ کتنی پیاری پیاری باتیں، کتنی صاف صاف باتیں جن کو سُن کر اِن کو تسلیم کرنا چاہیے، تو یہ تسلیم نہ کرتے، بلکہ یہ شک میں ہیں اور کھیل کود میں پڑے ہوئے ہیں، ان کا تردّد نہیں زائل ہوتا، کبھی ان کے ذہن میں کوئی بات آتی ہے، کبھی کوئی بات آتی ہے، اور اصل بات یہ ہے کہ لہو ولعب کے عادی ہیں، حقیقت پہ غور کرنے کے یہ عادی نہیں رہے، اگر یہ حقیقت پہ غور کرنے کے عادی ہوتے تو ان کا یہ شک زائل ہوجاتا اور ان کے دِل کو قرار آجاتا، کہ جو رَبّ ہے، معبود بھی وہی ہے، اس بات کو سمجھنے کے لئے یہ پوری طرح غور وفکر ہی نہیں کرتے، یَلْعَبُوْنَ کا معنی کہ ہر بات کو ہنسی مذاق کھیل میں ٹال دیتے ہیں، جب کوئی بات ان کے سامنے آتی ہے تو اس کو مشغلہ بنالیتے ہیں، اگر متفکر ہوکر بیٹھتے تدبر کرتے غور کرتے اور سمجھنے کا ارادہ ہوتا تو ان کا تردّد زائل ہوجاتا، ''یہ شک میں اور کھیل کود میں لگے ہوئے ہیں'' فَارْتَقِبْ یَوْمَ تَاْتِی السَّمَآءُ بِدُخَانٍ مُّبِیْنٍ: یہ حضور ﷺ سے کہا جارہا ہے کہ ان کی کھیل ان کی مستی ان کے مشغلے اسی وقت تک ہی ہیں جب تک اللہ کی طرف سے ان کے اوپر کوئی گرفت نہیں آتی، اور جس دِن آسمان صریح دُھواں لے آئے گا، اور وہ ایک عذاب ہوگا دردناک، تو اس وقت ان کے ہوش ٹھکانے آئیں گے، پھر یہ اللہ کے سامنے چیخیں گے، کہ اے اللہ! اس عذاب کو دُور ہٹادے، ہم ایمان لے آتے ہیں، اگلی آیت کا مفہوم یہ ہے۔

''دُخانِ مبین'' کے متعلق سیّدنا ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کی رائے

اب اس میں اہم سوال یہ ہے کہ ''دُخانِ مبین'' سے کیا مراد ہے؟ اس کے متعلق روایات میں دو باتیں ذکر کی گئی ہیں،

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ تو اس بات پر مصر ہیں کہ اس "دُخَانٍ مُّبِیۡنٍ" سے مراد وہ دُھواں ہے جو حضور ﷺ کی مکی زندگی میں ظاہر ہو چکا، کہ جب مشرکینِ مکہ کسی طرح سے مانتے نہیں تھے تو رسول اللہ ﷺ نے ان کے لئے بددُعا کی تھی جس کا ذکر متعدد روایات میں ہے، کہ اے اللہ! تُو ان کے اُوپر اپنی پکڑ کو سخت کر دے، اور اس پکڑ کو یوسف علیہ السلام کے سالوں جیسے سال بنا دے، یعنی تیری پکڑ ان کے اُوپر قحط کی شکل میں آئے، جس طرح سے یوسف علیہ السلام کے زمانے میں سات سال قحط کے مصر کے اُوپر مسلط کئے گئے تھے، اپنی اس پکڑ کو ان کے اُوپر ان سات سالوں کی صورت میں ظاہر کر یعنی ان کو قحط میں مبتلا کر دے، چنانچہ حضور ﷺ کی اس دُعا کے نتیجے میں وہ قحط کے اندر مبتلا کر دیے گئے، سرورِ کائنات ﷺ کا مقصد یہ تھا کہ آج یہ رَجے ہوئے ہیں، ان کے پیٹ بھرے ہوئے ہیں، خوش حال ہیں، اس لیے ان کو بات سمجھ میں نہیں آتی، تو ذرا یہ بھوکے ہوں گے اور ان کی ضرورتیں پوری نہیں ہوں گی، تو ممکن ہے ان کی اکڑ کچھ کم ہو جائے، ان کی گردن کچھ نیچی ہو جائے اور یہ بات کو سمجھ جائیں، بات کو مان جائیں، اس لیے ان کے لئے عذاب کی دُعا کی حضور ﷺ نے، اور وہ قحط کے اندر مبتلا ہوئے، جب قحط کے اندر مبتلا ہوئے تو کئی سال تک بارش نہیں ہوئی، اور جب بارش نہ ہو تو آپ جانتے ہیں کہ ویسے ہی فضا گرد آلود سی ہو جایا کرتی ہے، گرد گھٹا اُڑتا ہے اور فضا گرد آلود ہو جاتی ہے، بارش ہو جائے تو سارا آسمان صاف ہو جاتا ہے، گرد دَب جاتی ہے، تو اس سے بھی کچھ آسمان کی طرف گرد و غبار اُڑتا ہے، اور پھر بھوکے ہونے کی وجہ سے دماغ کے اندر بھی خشکی ہوتی ہے، انسان بے چین ہوتا ہے، تو آنکھیں بھی صاف نہیں دیکھتیں، تو انسان جس وقت دیکھتا ہے تو اس کو ایسے ساری کی ساری فضا گرد آلود اور دُھویں سے بھری ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس سے وہی دُھواں مراد ہے جو قحط کے زمانے میں ان کو آسمان کی طرف نظر آتا تھا، تو یہ واقعہ پیش آ چکا، اور اس قحط کے نتیجے میں پھر ان لوگوں نے حضور ﷺ سے درخواست کی، اور اللہ کے سامنے وہ نیچے ہوئے، کہ ہم سے اس عذاب کو دُور ہٹا دیا جائے، ہم ایمان لائیں گے، ہم مان جائیں گے، تو اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یہ مانیں گے نہیں، اگر انہوں نے ماننا ہوتا تو ایک رسول ان کے سامنے واضح طور پر آیا تھا، واضح باتیں کرنے والا، اس کو تو انہوں نے کہہ دیا کہ یہ معلم ہے یہ مجنون ہے۔

"مُعَلَّمٌ مَّجۡنُوۡنٌ" کی وضاحت

یہ دو لفظوں کے اندر ان کے سارے کے سارے تبصروں کا خلاصہ نکال دیا گیا، معلم ہے، مجنون ہے جیسے میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ حاصل یہ تھا کہ پتا نہیں اس کو بیٹھے بیٹھے کیا ہو گیا؟ چالیس سال تک تو یہ ٹھیک رہا، اس نے کبھی کوئی ایسی باتیں کی نہیں تھیں، معلوم نہیں اس کو کون اُستاذ مل گیا پڑھانے والا؟ جیسے سورۂ نحل میں لفظ آیا تھا یُعَلِّمُہٗ بَشَرٌ (آیت: ۱۰۳) کہ اس کو کوئی انسان پڑھاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ اس سے تو توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ اپنے آباؤ اجداد کے متعلق ایسی باتیں کرتا ہے، یہ تو بڑا شریف نوجوان تھا، بہت بڑا سمجھ دار تھا، خاندان کے لئے یہ باعثِ فخر تھا، یہ اس نے باتیں کیسی کرنی شروع کر دیں؟ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کوئی دوسرا پٹی پڑھاتا ہے، یہ کسی کی باتوں میں آ گیا ہے، اور خود اس نے اپنی عقل سے کام لیا نہیں، دیوانہ ہے، پاگل ہے، ساری قوم کی مخالفت کرنے لگ گیا، بات کسی اور کی ہے، کہتا یہ ہے، وہ چھپا ہوا ہے، گالیاں یہ کھاتا ہے، پتھر یہ کھاتا ہے، تو یہ اچھا

آدمی ہے؟ معلم مجنون کہہ کر وہ یہ حیثیت نمایاں کرتے تھے، یہ تو انہوں نے رسول کی قدر کی۔ تو جب اس واضح رسول کی بات نہیں مانی، اس کو معلم مجنون کہہ دیا، تو اس واقعے میں تو ہزاروں تأویلیں ہو سکتی ہیں، کہ دُنیا میں ہوتا رہتا ہے، کبھی بارش نہیں ہوتی، ہوتا رہتا ہے، کبھی زمین میں پیداوار نہیں ہوتی، قحط کے واقعات ہوتے رہتے ہیں، تو اس کو یہ کب سمجھنے والے ہیں کہ اللہ کی طرف سے یہ عذاب آیا ہے، اس لیے اگر ہم ہٹا بھی دیں اس عذاب کو، تو یہ دوبارہ لوٹ کر آ جائیں گے اسی بات کی طرف، چنانچہ ایسے ہی ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے جس وقت ان کے اُوپر کشف کیا اس عذاب کا، دُور ہٹایا تو ان کی سرکشی پھر اسی طرح سے ہو گئی، اور بطشۂ کبریٰ کی جو دھمکی دی گئی کہ بطشۂ کبریٰ آئے گی، ان کے اُوپر سخت پکڑ آئے گی، تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ اس سے غزوۂ بدر مراد ہے کہ پھر ان کے اُوپر پکڑ ہوئی ہے غزوۂ بدر میں، جس کے اندر پھر ان کی خون ریزی ہوئی اور ان کے سردار مارے گئے، قومی سطح کے اُوپر ان کو ذلیل کر دیا گیا، بطشۂ کبریٰ کا مصداق حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس غزوۂ بدر کو بنایا کرتے تھے، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی تفسیر تو اس طرح سے ہے۔[1]

''دخانِ مبین'' کے متعلق جمہور مفسرین کی رائے

اور دُوسرے مفسرین بلکہ جمہور مفسرین اس دُوسری تفسیر کی طرف ہیں اور احادیثِ صحیحہ اور احادیثِ مرفوعہ کے اندر اس کا ذِکر آتا ہے، کہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قیامت کے قریب جا کے ایک دُھواں مسلط ہو گا اس دُنیا کے اُوپر، بہت واضح دُھواں ہو گا، اور وہ لوگوں کے لئے عذاب کی شکل میں نمایاں ہو گا، تو قیامت کی علامات جو ذِکر کی گئی ہیں، جس طرح سے خروجِ دابہ ذِکر کیا گیا، خروجِ دجال ذِکر کیا گیا، مختلف قسم کے زلزلوں کے آنے کی پیش گوئی کی گئی، اور عدن کے علاقے سے کسی آگ کے نکلنے کی پیش گوئی کی گئی، اسی طرح سے اس دُخان کو بھی علاماتِ قیامت میں شمار کیا گیا ہے۔[2] تو جس طرح عام طور پر مشرکین کو ڈرایا گیا کہ یہ قیامت کا انکار کرتے ہیں، جب قیامت آ جائے گی تو یہ ہو گا، وہ ہو گا، اسی طرح سے یہاں بھی ''دُخانِ مبین'' کا ذِکر علاماتِ قیامت کے طور پر کیا جا رہا ہے، کہ ایک وقت آئے گا دُھواں محیط ہو جائے گا، پھر لوگوں کو نظر آ جائے گا کہ اب سخت عذاب آنے والا ہے، پھر یہ چیخیں گے، چلائیں گے، پھر اللہ تعالیٰ کہے گا......! اللہ کی بات کا حاصل یہ ہو گا کہ اب یہ کہتے ہیں کہ عذاب دُور ہٹا دو تو ہم ایمان لے آئیں گے، اب ایمان لانے کا موقع کون سا رہا؟ اور اگر بالفرض ہم ان سے اس عذاب کو دُور کر بھی دیں تو یہ پھر اسی طرح سے لوٹ آئیں گے، لَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (سورۂ انعام: ۲۸)، کئی آیتوں کے اندر یہ ذِکر کیا گیا کہ اگر ہم ان سے عذاب کو دُور ہٹا دیں یا ان کو دوبارہ دُنیا کی طرف بھیج دیں تو پھر یہ وہی حرکتیں کریں گے جس طرح سے پہلے کرتے تھے۔ تو روایاتِ مرفوعہ کی روشنی میں اکثر مفسرین نے اس کی تفسیر اس طرح سے کی ہے، وہ کہتے ہیں کہ ''دُخانِ مبین'' ایک حقیقت ہے جس کو قرآنِ کریم نے بیان کیا، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ''دُخانِ مبین'' کی جو تعبیر کرتے ہیں تو اس سے تو ایک وہمی سی چیز معلوم

---

(۱) بخاری ۲/ ۷۱۴، کتاب التفسیر۔ سورۃ دخان۔

(۲) مسلم ۲/ ۳۹۳ باب فی الآیات التی تکون قبل الساعۃ/ مشکوۃ ۲/ ۴۷۲ باب العلامات بین یدی الساعۃ کی پہلی حدیث۔

ہوتی ہے، وہ حقیقت میں تو ''دُخانِ مبین'' نہیں ہے، حقیقت میں تو وہ گرد وغبار ہے، یا حقیقت میں اپنے دماغ کی خشکی ہے، اور یہاں معلوم ہوتا ہے کہ وہ دُھواں ہے، تو اس بِدُخَانٍ مُّبِيۡنٍ ۙ يَّغۡشَى النَّاسَ کے ساتھ تعبیر کس طرح سے کیا جاسکتا ہے جس سے ایک عموم معلوم ہوتا ہے کہ ساری مخلوق کے اوپر وہ طاری ہوجائے گا۔ اب یہ دوسری تفسیر جو ہے وہ احادیث کی طرف دیکھتے ہوئے زیادہ راجح معلوم ہوتی ہے۔

دوقولوں میں تطبیق

اور پہلی تفسیر بھی اس کا مصداق بن سکتی ہے، کیونکہ جب قرآنِ کریم میں ''دُخان'' کا ذکر آ گیا کہ اللہ تعالیٰ دُھواں ان کے اُوپر مسلط کرے گا، تو جتنے بھی دُھویں پیش آئیں گے ان سب کو اِس کا مصداق بنایا جاسکتا ہے، اور ایک محیط دُھواں قیامت کے قریب پیش آئے گا۔

دُھویں کی کیفیت کیا ہوگی؟ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے

اور جب وہ پیش آئے گا تو حقیقت اسی وقت ہی نمایاں ہوگی کہ وہ دُھواں کیسے مسلط ہوا؟ کس طرح سے محیط ہوگیا؟ اور اس کے کیا اثرات ہیں؟ اتنے پر تو ہم ایمان لاتے ہیں کہ کوئی دُخانِ مبین آئے گا، باقی! اس کی صورت کیا ہوگی؟ وہ پیش آنے سے پہلے متعین نہیں کی جاسکتی۔ نکتہ آفرینی کے طور پر جس طرح سے بعض حضرات علمی طور پر نکتے بیان کرلیتے ہیں، تو مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ ایک بہت نکتہ رس آدمی ہیں، اشاروں کے ساتھ بات کا سمجھ جانا یہ ان کا ایک کمال ہے، وہ کہتے ہیں کہ آنے والے حالات اس بات کو واضح کرتے جارہے ہیں کہ یہ دُخان کس قسم کا ہوگا جو لوگوں کے اُوپر مسلط ہوگا، کہتے ہیں کہ آج کل آلاتِ جنگ جتنے ایجاد ہوگئے ہیں جس وقت ان کو استعمال کیا جاتا ہے تو دُھواں ہی اُٹھتا ہے اپنے اپنے درجے کے اعتبار سے، اور جب بمباری ہوتی ہے پھر تو ساری کی ساری فضا جو ہے، یہ توپ کے گولے پھٹتے ہیں یا بمباری ہوتی ہے تو ساری کی ساری فضا گردآلود اور دُھواں دار ہوجاتی ہے، چاروں طرف سے آگ برستی ہے، تو ہوسکتا ہے اس سے کسی عالم گیر جنگ کی طرف اشارہ ہو، کہ دُنیا اس طرح سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب کے طور پر جنگ میں مبتلا ہوجائے گی اور جنگ اس انداز کی ہوگی کہ دُنیا دُھویں سے ہی بھر جائے گی اور فضا ساری کی ساری دُھواں دار ہوجائے گی، اور وہ ایک بہت بڑا عذاب ہوگا جو لوگوں کے اُوپر مسلط ہوگا۔ اور احتمال کے طور پر اگر اس بات کو قبول کیا جائے تو اس میں کوئی کسی قسم کا حرج نہیں، کہ اتنی تو بات ہوگئی کہ اللہ کی طرف سے دُھواں مسلط ہوگا، لیکن وہ دُھواں ظاہر کس طرح سے ہوگا؟ اور اس دُھویں کے نمایاں ہونے کی کیا صورت ہوگی؟ تو انسان اپنے ہاتھوں خود تباہ ہوگا، اپنے طور پر اس نے اتنے آلات ایجاد کرلیے ہیں کہ جس وقت وہ آپس میں استعمال ہوں گے تو اس استعمال کے وقت میں ہر طرف آگ برسے گی اور دُھواں ہی دُھواں ہوجائے گا، اور اس مخلوق کے اوپر عمومی طور پر ایک عذاب مسلط ہوجائے گا، جس میں انسانیت بلبلائے گی اور اللہ تعالیٰ کے سامنے گڑگڑائے گی کہ یہ عذاب ہم سے دُور ہوجائے، یہ کیا ہم پر عذاب مسلط ہوگیا، تو گناہ گاروں کے لئے، بدکرداروں کے لئے، خدا تعالیٰ کے منکرین کے لئے وہ ایک بہت بڑی تنبیہ ہوگی جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آئے گی، آنے

والی بات کو علی الاحتمال اس طرح سے اگر سمجھنے کی کوشش کی جائے تو اس میں حرج کوئی نہیں، اگرچہ ہم اس کو اس کی حقیقی تفسیر قرار نہیں دے سکتے، حقیقی تفسیر اللہ جانتا ہے، صرف اتنی بات پر ہم ایمان لائیں گے کہ قیامت کے قریب ایک دُھواں مسلط ہوگا، یہ ہے ایمان کی بات، باقی وہ ہوگا کس طرح سے؟ بغیر کسی ظاہری سبب کے ہی آسمان کی طرف سے دُھواں ہی دُھواں ہو جائے گا، یا دُنیا میں کوئی عام طور پر آگ لگے گی اور اس آگ کے لگنے کے ساتھ دُھواں اُٹھے گا، جس طرح سے شہر میں دو چار جگہ اگر آگ لگ جائے تو سارا شہر دُھواں دار ہو جاتا ہے، اور اسی طرح سے عالمی سطح پر کچھ اس قسم کی آگ بھڑکے گی، کہ جس کی وجہ سے عالمی سطح کے اوپر دُھواں سارے انسانوں کو گھیر لے گا، اس میں یہ سب احتمال نکالے جا سکتے ہیں، اور اس میں کسی بات کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، احتمال کے درجے میں اگر اس کی صورت یوں متعین کی جائے تو اس میں کوئی حرج نہیں، لیکن پکی بات ایمان کی یہی ہے کہ دُھواں آئے گا، اللہ بہتر جانتا ہے کہ کس طرح سے آئے گا اور اس کی کیا کیفیت ہوگی؟ احتمال کے درجے میں اگر وہ بات ذکر کی جائے سمجھنے کے لئے تو اس کو قبول کیا جا سکتا ہے، اور واقعہ ایسے ہی ہے کہ اب حالات ایسے بنتے جا رہے ہیں کہ اگر عالمی سطح کے اوپر جنگ چھڑ گئی تو دنیا کا معتد بہ حصہ اس آگ کی لپیٹ میں آئے گا، اور جب یہ گولے پھٹیں گے اور بمباری ہوگی اور آبادیوں کو آگ لگے گی تو چاروں طرف آپ دیکھیں گے کہ دُھواں ہی دُھواں نظر آئے گا، اب بھی جہاں میدانِ جنگ بن جاتا ہے وہاں اگر آپ کو کبھی جانے کا اتفاق ہو جائے، جہاں لڑائی ہوتی ہے تو لڑائی کے نتیجے میں چونکہ آبادیوں کو آگ بھی لگتی ہے، گولے پھٹتے ہیں، بمباری ہوتی ہے، تو وہاں دُھویں کے سوا اور کچھ نہیں نظر آتا۔ ''لوگوں کو ڈھانپ لے گا، اور یہ بڑا دردناک عذاب ہوگا، پھر لوگ چیخیں گے چلائیں گے، کہیں گے کہ اے اللہ! ہم سے اس عذاب کو دُور کر دے، ہم ایمان لے آئیں گے'' یہ کہاں ان کو نصیحت ہوگی، اگر یہ عذاب دُور بھی کر دیا جائے تو یہ کہاں ماننے والے ہیں، ''کیونکر ہوگا ان کے لئے نصیحت حاصل کرنا، حالانکہ ان کے پاس واضح رسول آ چکا'' مشرکینِ مکہ کے سامنے تو رسول کی ذات ہی موجود تھی، اور اب قیامت تک آنے والوں کے لئے بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ واضح رسول آیا ہوا ہے، رسول کی ہدایات آئی ہوئی ہیں، کیونکہ جب اس کی باتیں اور اس کی لائی ہوئی کتاب موجود ہے تو یوں سمجھو کہ رسولِ مبین ہی موجود ہے۔ ''اور وہ اس رسول سے پیٹھ پھیر گئے اور کہتے ہیں کہ یہ تو معلَّم مجنون ہے'' اللہ کی طرف سے اِس کو پڑھایا سکھایا ہوا نہیں سمجھتے، یوں کہتے ہیں کہ کسی اور سے سیکھ سیکھ کے آتا ہے اور بے عقلی کی باتیں کرتا ہے، ''ہم عذاب کو دُور ہٹانے والے ہیں کچھ وقت کے لئے، یہ پھر عود کریں گے اسی بات کی طرف، اور جس دِن پکڑیں گے ہم ان کو سخت پکڑ، بے شک ہم انتقام لینے والے ہیں''۔

بنی اسرائیل اور قومِ فرعون کا واقعہ

آگے نمونے کے طور پر ذکر کر دیا بنی اسرائیل کا اور فرعون کی قوم کا، ''البتہ تحقیق آزمائش میں ڈالا ہم نے ان سے پہلے فرعون کی قوم کو، اور آیا ان کے پاس ایک بہت ہی باعزّت، کریم رسول'' شرافتِ نفس لیے ہوئے تھا، کرامتِ نفس لیے ہوئے تھا، کوئی اس کے اندر ایسی اعتراض کی بات نہیں تھی، اس میں کرم ہی کرم تھا، کرامت ہی کرامت تھی، ایک باعزّت رسول ان کے پاس آیا، ''یہ پیغام لے کر کہ ادا کر دو میری طرف اللہ کے بندوں کو'' یعنی اپنی غلامی سے ان کو چھوڑ دو، میرے سپرد کر دو، میں ان کو

جہاں چاہوں لے جاؤں، یہ ساری تاریخ جو بنی اسرائیل کی تھی وہ چند آیتوں کے اندر بطور اشارے کے سمودی گئی ہے۔ اور یہ کہا اس نے کہ اِنِّیْ لَکُمْ رَسُوْلٌ اَمِیْنٌ: میں تمہارے لیے قابلِ اعتبار رسول ہوں، امانت دار، کسی بات میں خیانت نہیں کرتا، اللہ کی طرف سے جو بات کہی جارہی ہے ٹھیک ٹھیک وہی پہنچاتا ہوں، اور اس نے یہ بات بھی کہی، وہ یہ بات بھی لے کے آیا کہ اَنْ لَّا تَعْلُوْا عَلَى اللّٰهِ: اللہ کے مقابلے میں سرکشی اختیار نہ کرو، ''بے شک میں تمہارے پاس واضح دلیل لے کے آیا ہوں'' واضح دلیل سے مراد وہی معجزات ہیں جو کہ نبوّت کی دلیل بنا کرتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عصا، ید بیضا، یہ جو واضح معجزات تھے یہ اپنے رسول ہونے کی دلیل کے طور پر بیان کیے۔ اور جب انہوں نے قتل کا ارادہ کیا مارنے کا ارادہ کیا تو اس وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ دُعا کی وَاِنِّیْ عُذْتُ بِرَبِّیْ: میں پناہ پکڑتا ہوں اپنے رَبّ کی اور تمہارے رَبّ کی اس بات سے کہ تم مجھے رجم کردو، قتل کے ارادے کے متعلق آپ کے سامنے پہلے سورۂ قصص وغیرہ میں اس کی تفصیل گزر چکی ہے، ''بے شک میں پناہ پکڑتا ہوں اپنے رَبّ کی اور تمہارے رَبّ کی اس بات سے کہ تم مجھے رجم کرو''، وَاِنْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا لِیْ: اور اگر تم میرے کہنے کی وجہ سے مانتے نہیں، مجھ پہ ایمان نہیں لاتے تو فَاعْتَزِلُوْنِ: تم مجھ سے جدا ہی رہو، کم از کم مجھے تکلیف پہنچانے کی کوشش تو نہ کرو۔ یہ ساری باتیں اُس اللہ کے رسول نے کہیں، لیکن جب وہ کسی طور پر نہیں مانے فَدَعَا رَبَّهٗٓ: تو اس رسولِ کریم نے اپنے رَبّ کے سامنے دُعا کی اَنَّ هٰٓؤُلَآءِ قَوْمٌ مُّجْرِمُوْنَ: کہ یہ سارے کے سارے لوگ مجرم ہیں، جرم کرنے والے ہیں، فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ: تو اللہ کی طرف سے اس رسولِ کریم کو کہہ دیا گیا کہ تو میرے بندوں کو لے کے راتوں رات چل، فَاَسْرِ بِعِبَادِیْ لَیْلًا: لے کے چل تو میرے بندوں کو رات کے کسی حصے میں، اِنَّكُمْ مُّتَّبَعُوْنَ: بے شک تم پیچھا کیے جاؤ گے، یہ تمہارے دشمن تمہارے پیچھے آئیں گے، وَاتْرُكِ الْبَحْرَ رَهْوًا: اور تو سمندر کو ساکن چھوڑ دینا، رَهْوًا رَاهِيًا کے معنی میں، ساکن ہونا، یعنی جب تم سمندر سے گزر جاؤ تو جس طرح وہ ٹھہرا ہوا ہے اس کو ویسے رہنے دینا، دوبارہ عصا مار کے اس کو بھرنے کی کوشش نہ کرنا، تاکہ وہ پیچھے داخل ہو جائیں، داخل ہونے کے بعد وہ ڈبو دیے جائیں، اب وہ سارے واقعات تفصیل کے ساتھ جو گزرے ہیں تو یہاں اشارے کے طور پر وہ ذکر کردیے گئے، ''چھوڑ دے تو سمندر کو ساکن، تھما ہوا'' اِنَّهُمْ جُنْدٌ مُّغْرَقُوْنَ: بے شک یہ لشکر ہیں ڈبوئے ہوئے، یہ سب لوگ غرق کیے جائیں گے، كَمْ تَرَكُوْا مِنْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ۝ وَّزُرُوْعٍ وَّمَقَامٍ كَرِيْمٍ ۝ وَّنَعْمَةٍ كَانُوْا فِيْهَا فٰكِهِيْنَ: جنّٰت: باغات ہوگئے، عیون: چشمے ہوگئے، زُروع: زَرع کی جمع آگئی بمعنی کھیتی، مقام کریم: آرام دہ جگہ، مقام کریم ہوتا ہے ایسا ٹھکانا جس میں انسان کے لئے آرام ہی آرام ہو، کوئی تکلیف نہ ہو، اور نعمۃ: خوش حالی کو کہتے ہیں، فٰكِهِيْنَ کے معنی کہ وہ مزے اُڑانے والے تھے، ''کتنے ہی باغات اور چشمے، اور کتنی ہی کھیتیاں اور عزّت کے مقام، اور کتنی ہی خوش حالی جس میں وہ مزے اُڑاتے تھے، وہ لوگ چھوڑ گئے'' تَرَكُوْا کا معنی وہ چھوڑ گئے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو باغات حاصل تھے، چشمے تھے، ہر قسم کی خوش حالی حاصل تھی، باعزّت اُن کے مقام تھے، لیکن اس رسول کی مخالفت میں یہ سب کچھ چھوڑ کر گھروں سے نکلے اور جاکر سمندر میں ڈوب گئے۔ تو یہ نمونہ دکھایا جارہا ہے ان مشرکینِ مکہ کو، کہ ذرا اِدھر خیال کرلو! آج اس رسول کو تم فقیر سمجھتے ہو کہ اس کے پاس پیسے نہیں ہیں، اس کے مقابلے میں کسی رَجلِ عظیم کو نبی بنانے کی جو تم بات کہہ رہے تھے، کہ لَوْلَا نُزِّلَ هٰذَا الْقُرْاٰنُ عَلٰى رَجُلٍ مِّنَ الْقَرْيَتَيْنِ

عَظِيْم جیسے پچھلی سورت کے اندر آیا، تو یہ بھی رَجلِ فقیر کا مقابلہ مصر کے ایک بادشاہ سے تھا، تو نتیجہ دیکھ لو کہ رَجلِ فقیر کا کیا نتیجہ ہوا، اور مصر کے بادشاہ کا کیا نتیجہ ہوا؟ تو یہ سارے خوش حالی کے مقامات چھوڑ کر وہ چل دیے، یہ کَمْ کی تمیز ہے، ترجمہ صاف ہو گیا؟ ''چھوڑ گئے وہ لوگ کتنے ہی باغات اور چشمے، کتنی ہی کھیتیاں اور عزّت کے مقام، اور کتنی ہی خوش حالی جس میں وہ مزے اُڑایا کرتے تھے'' كَذٰلِكَ: بات اسی طرح ہی ہے الْاَمْرُ كَذٰلِكَ، بات ایسے ہی ہے، وَاَوْرَثْنٰهَا قَوْمًا اٰخَرِيْنَ: اور ہم نے اِن سب چیزوں کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا، اُن کو ڈُبو دیا اور اس خوش حالی اور نعمتوں کا وارث دوسرے لوگوں کو بنا دیا۔

''زمین وآسمان کے رونے'' کے دو مفہوم

فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ: نہ رویا ان کے اوپر آسمان اور زمین، وَمَا كَانُوْا مُنْظَرِيْنَ: نہ وہ ڈھیل دے گئے تھے، یعنی وہ فرعونی اور فرعون جس وقت تباہ کر دیے گئے، ناک میں پانی ڈال ڈال کے جس وقت مار دیے گئے تو نہ زمین پر رہنے والوں میں سے کسی نے ان کے اُوپر افسوس کیا، نہ آسمان پہ رہنے والوں میں سے کسی نے ان پر افسوس کیا، تو سماء سے مراد آسمان کے رہنے والے فرشتے، اُن کو بھی اِن کے ڈُبوئے جانے پہ کوئی رونا نہ آیا، کوئی افسوس نہ ہوا، کیونکہ اُن کو بھی اِن کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، اور زمین پہ بسنے والے کسی انسان نے بھی اِن کے اوپر آنسو نہ بہائے، نہ اِن کی اِس مصیبت کے اوپر رونے والے زمین میں موجود تھے نہ آسمان پر، بلکہ سب کہتے تھے کہ ''خس کم جہاں پاک!'' اچھا ہوا کہ دفع ہوئے، ان لوگوں نے اس زمین کے اندر سرکشی پھیلا رکھی تھی، اللہ کے عذاب کو اپنے کردار کے ساتھ دعوت دے رہے تھے، تو ان کے اُوپر افسوس کس نے کرنا تھا؟...... اور اگر مطلقاً آسمان اور زمین کی طرف ہی رونے کی نسبت ہو تو یہ بھی واقع کے مطابق ہے، کہ نہ ان کی موت کے اوپر زمین روئی، نہ آسمان ہی رویا، حضرت ابنِ عباسؓ وغیرہ سے مروی ہے کہ مؤمنِ صالح جس وقت اس دُنیا سے مرتا ہے تو زمین کے جس خطے کے اُوپر وہ اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا وہ زمین کے ٹکڑے اس کو روتے ہیں، اس کے مرنے کے بعد زمین کے ٹکڑے روتے ہیں جہاں وہ اللہ کی عبادت کیا کرتا تھا (درمنثور وغیرہ)، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ آسمان کا وہ دروازہ جہاں سے اس کے لئے رزق اُترتا تھا، اور وہ دروازہ جہاں سے اس کے نیک اعمال اللہ کی طرف جاتے تھے، وہ دونوں حصے اور دروازے اس رَجلِ صالح پر روتے ہیں، حضور ﷺ نے یہ بات بیان کرنے کے بعد یہی آیت تلاوت فرمائی فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ (۱) کہ فرعونیوں کے متعلق اللہ کہتا ہے کہ ان کے اُوپر زمین نہیں روئی، آسمان نہیں رویا، یہی دلیل ہے اس بات کی کہ نیک لوگوں پر آسمان بھی روتا ہے اور زمین بھی روتی ہے، کیونکہ اگر نیک لوگوں پر بھی آسمان زمین نہ روئیں تو پھر فرعونیوں کے لئے یہ وعید کیا ہے؟ کہ ان کے لئے زمین اور آسمان نہیں روئے، یہ کہا کہ ان کے لئے زمین اور آسمان نہیں روتے یہی علامت ہے کہ بعض لوگ ایسے ہیں کہ جب اس دُنیا سے جاتے

---

(۱) ترمذی ۱۶۱/۲، کتاب التفسیر۔ سورۃ الدخان/مشکوۃ ۱۵۱/۱۔ مَا مِنْ مُؤْمِنٍ اِلَّا وَلَهٗ بَابَانِ بَابٌ يَصْعَدُ مِنْهُ عَمَلُهٗ وَبَابٌ يَنْزِلُ مِنْهُ رِزْقُهٗ فَاِذَا مَاتَ بَكَيَا عَلَيْهِ الخ

ہیں تو ان کے جانے پر زمین بھی روتی ہے اور آسمان بھی روتا ہے، اور زمین والے بھی روتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کے مرنے پر افسوس کرتے ہیں، دونوں باتیں ہی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ نیک آدمی کا یہی قصہ ہوتا ہے کہ جب مرتا ہے تو زمین والے روتے ہیں، اور اسی طرح سے اس حدیث کی رُو سے زمین بھی روتی ہے، وہ فارسی کا قطعہ تو آپ نے سُنا ہی ہوگا جس میں یہی تاثر دیا گیا ہے:

یاد داری؟ کہ وقتِ زادنِ تو   ہمہ خنداں بودند و تو گریاں

شاعر کہتا ہے کہ تمہیں یاد ہے؟ کہ جس وقت تم پیدا ہوئے تھے، تو سارے لوگ تو خوشیاں منا رہے تھے کہ لڑکا پیدا ہو گیا، اور تُو رو رہا تھا، اور بچہ پیدا ہونے کے بعد رویا ہی کرتا ہے، سب سے پہلا کام جو آپ نے اس دنیا کے اندر آنے کے بعد کیا تھا وہ چیخنا چلانا ہی تھا، پیدا ہوتے ہی بچہ چیخ مارتا ہے چلاتا ہے، یہ علامت ہوتی ہے کہ یہ زندہ ہے اور اس میں زندگی ہے، پیدا ہوتے ہی یہی چیز پہلے سامنے آیا کرتی ہے، اور ویسے بھی بچپن میں رونا کثرت سے ہوتا ہے، اور لوگ خوشیاں مناتے ہیں کہ لڑکا پیدا ہو گیا۔

چناں زی کہ وقتِ مُردنِ تو   ہمہ گریاں بوند و تو خنداں

اب زندگی اس طرح گزارو کہ جس وقت تم مرو تو ساری مخلوق تو روئے اور تم ہنستے ہوئے جاؤ، اور اگر روتے ہوئے آئے تھے اور روتے ہوئے ہی جاؤ، اور جب تم پیدا ہوئے تھے تو بھی مخلوق خوشیاں منا رہی تھی، جب مرو تو بھی لوگ خوشیاں منائیں کہ اچھا ہو گیا دفع ہو گیا، تو یہ تو پھر کوئی اچھی بات نہ ہوئی۔ جب آئے تھے تو تم روتے تھے اور مخلوق خوشیاں مناتی تھی، اور جاؤ تو ایسے حال میں جاؤ کہ تم خوشیاں مناتے ہوئے جاؤ اور پیچھے مخلوق کو روتا ہوا چھوڑ جاؤ، زندگی ایسے طور پر گزارنی چاہیے۔ بہرحال اس سے دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں، کہ نہ مخلوق نے ان کے مرنے پر افسوس کیا، انسانوں میں سے کوئی ان کے اُوپر آنسو بہانے والا تھا، نہ ان کے اُوپر فرشتے آنسو بہانے والے تھے، افسوس کرنے والے تھے، نہ خود زمین اور آسمان نے ہی ان کے اُوپر کوئی کسی قسم کا افسوس کا اظہار کیا یا آنسو بہائے، دونوں طرح سے اس کی تعبیر کی جا سکتی ہے۔ اور پھر اللہ نے انہیں مہلت بھی نہ دی، جب پکڑا تو بس پھر ایک ہی دفعہ ساری کی ساری قوم کو ڈبو دیا۔

وَلَقَدۡ نَجَّيۡنَا بَنِيٓ إِسۡرَٰٓءِيلَ مِنَ ٱلۡعَذَابِ ٱلۡمُهِينِ ﴿٣٠﴾ مِن فِرۡعَوۡنَۚ إِنَّهُۥ كَانَ عَالِيٗا
ہم نے بنی اسرائیل کو نجات دی ذلیل کرنے والے عذاب سے ﴿۳۰﴾ یعنی فرعون سے، وہ فرعون بہت سر چڑھا تھا
مِّنَ ٱلۡمُسۡرِفِينَ ﴿٣١﴾ وَلَقَدِ ٱخۡتَرۡنَٰهُمۡ عَلَىٰ عِلۡمٍ عَلَى ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴿٣٢﴾ وَءَاتَيۡنَٰهُم مِّنَ
حد سے گزرنے والوں میں سے تھا ﴿۳۱﴾ اور البتہ تحقیق پسند کیا ہم نے ان اسرائیلیوں کو جانتے بوجھتے ہوئے، جہانوں پر ﴿۳۲﴾ اور ہم نے ان کو دی

الْاٰیٰتِ مَا فِیْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِیْنٌ ﴿۳۳﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَیَقُوْلُوْنَ ﴿۳۴﴾ اِنْ هِیَ اِلَّا مَوْتَتُنَا

نشانیوں میں سے وہ چیز جس میں صریح آزمائش تھی ﴿۳۳﴾ یہ لوگ البتہ کہتے ہیں: ﴿۳۴﴾ نہیں ہے یہ مگر ہماری یہی پہلی

الْاُوْلٰی وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِیْنَ ﴿۳۵﴾ فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۳۶﴾ اَهُمْ خَیْرٌ

موت، ہم اُٹھائے نہیں جائیں گے ﴿۳۵﴾ لے آؤ ہمارے آباء کو اگر تم سچے ہو ﴿۳۶﴾ کیا یہ بہتر ہیں

اَمْ قَوْمُ تُبَّعٍ ۙ وَّالَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ اَهْلَكْنٰهُمْ ۫ اِنَّهُمْ كَانُوْا مُجْرِمِیْنَ ﴿۳۷﴾ وَمَا

یا تبع کی قوم اور وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے ہیں، ہم نے ان کو ہلاک کر دیا، بے شک وہ سارے کے سارے مجرم تھے ﴿۳۷﴾ نہیں

خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَیْنَهُمَا لٰعِبِیْنَ ﴿۳۸﴾ مَا خَلَقْنٰهُمَآ اِلَّا

پیدا کیا ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کھیلتے ہوئے ﴿۳۸﴾ نہیں پیدا کیا ہم نے ان دونوں کو مگر

بِالْحَقِّ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۳۹﴾ اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ مِیْقَاتُهُمْ اَجْمَعِیْنَ ﴿۴۰﴾ یَوْمَ لَا یُغْنِیْ

مصلحت کے ساتھ لیکن ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں ﴿۳۹﴾ بے شک فیصلے کا دن ان سب کا متعین وقت ہے ﴿۴۰﴾ جس دن نہیں فائدہ دے گا

مَوْلًی عَنْ مَّوْلًی شَیْئًا وَّلَا هُمْ یُنْصَرُوْنَ ﴿۴۱﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْعَزِیْزُ الرَّحِیْمُ ﴿۴۲﴾

کوئی دوست کسی دوست کو کچھ بھی اور نہ وہ مدد دیے جائیں گے ﴿۴۱﴾ ہاں! جس پر اللہ رحم کرے، بے شک وہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے ﴿۴۲﴾

تفسیر

بنی اسرائیل پر انعاماتِ خداوندی

وَلَقَدْ نَجَّیْنَا بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ مِنَ الْعَذَابِ الْمُهِیْنِ: ہم نے بنی اسرائیل کو ذلیل کرنے والے عذاب سے نجات دی، اور اس عذابِ مہین کا مصداق خود فرعون ہے، مِنْ فِرْعَوْنَ: یعنی فرعون سے نجات دی، فرعون اس قوم کے لئے بذاتِ خود عذابِ مہین تھا، یہ عذاب بن کر مسلط ہو یا ہوا تھا جس سے ہم نے اس قوم کو نجات دے دی، تو فرعون گویا کہ مجسمۂ عذاب تھا بنی اسرائیل کے لئے، جیسے اُردو میں محاورہ مشہور ہے: ''شامتِ اعمالِ ما، صورتِ نادر گرفت'' کہ نادر شاہ جب آیا تھا، دہلی پہ مسلط ہوا تو اس نے بہت خون ریزی کی تھی، بہت لوگوں کو لوٹا تھا، دلی پر بڑی تباہی آئی تھی، تو دِلی کے لوگ اس وقت کہتے تھے کہ ''شامتِ اعمالِ ما، صورتِ نادر گرفت'' کہ ہمارے اعمال کی شامت جو تھی وہ نادر شاہ کی شکل میں آگئی، اسی طرح سے یہ فرعون مجسم عذابِ مہین تھا، اور

وہ عذابِ مہین فرعون کی شکل میں بنی اسرائیل پر مسلط تھا، اللہ نے اس سے نجات دی، اِنَّهٗ كَانَ عَالِيًا: وہ فرعون بہت سرکش تھا، سرچڑھا تھا، مِّنَ الْمُسْرِفِيْنَ: حد سے گزرنے والوں میں سے تھا۔ وَلَقَدِ اخْتَرْنٰهُمْ عَلٰى عِلْمٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: اور البتہ تحقیق پسند کیا ہم نے ان اسرائیلیوں کو جانتے بوجھتے ہوئے جہانوں پر، یعنی ہم نے اپنے علم کی بنا پر، اپنی حکمت کی بنا پر، جہانوں کے مقابلے میں ان کو پسند کیا، اس کا ذکر آپ کے سامنے کئی دفعہ ہو چکا، اس زمانے میں ساری مخلوق کے مقابلے میں بنی اسرائیل ممتاز تھے، اور اس کے بعد پھر یہ لوگ شرارِ خلق اللہ ہو گئے، اور خَيْرَ اُمَّةٍ کا مصداق حضور ﷺ کی اُمت کو قرار دے دیا گیا، تو ان کی فضیلت یا ان کا مختار ہونا اُمتِ محمدیہ کے مقابلے میں نہیں، اپنے دور میں باقی مشرکین کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ نے انہی کو مختار قرار دیا تھا، فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ جاثیہ: ۱۶) کا لفظ جس طرح سے قرآنِ کریم میں آیا ہے، فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ (سورۂ بقرہ: ۴۷) بھی ہے کہ میں نے تمہیں فضیلت دی۔ اور یا پھر یہ جزوی فضائل مراد ہیں کہ جیسا جیسا برتاؤ اللہ نے ان اسرائیلیوں کے ساتھ کیا ہے ایسا برتاؤ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں کیا، بعض جزوی فضیلتیں ان کو تمام جہان کے مقابلے میں حاصل ہیں۔ وَاٰتَيْنٰهُمْ مِّنَ الْاٰيٰتِ مَا فِيْهِ بَلٰٓؤٌا مُّبِيْنٌ: اور ہم نے ان کو دی نشانیوں میں سے وہ چیز جس میں بلاء مبین تھی، بلاء آزمائش کو بھی کہتے ہیں اور نعمت کو بھی کہتے ہیں، ہم نے ان کو ایسی ایسی نشانیاں دیں جو نشانیاں ان کے لئے صریح آزمائش کا باعث بنیں، یا وہ نشانیاں ان کے لئے صریح اِنعام تھیں اور نعمت تھیں، بلاء اِنعام کو بھی کہتے ہیں اور بلاء آزمائش کو بھی کہتے ہیں۔ چنانچہ وہ واقعات جو بنی اسرائیل کے ساتھ پیش آئے پتھر سے چشموں کا جاری ہونا، من وسلویٰ کا اُترنا، دریا کا پھٹنا، یہ سب ایسی نشانیاں ہیں جو بنی اسرائیل کے لئے ایک اِنعام اور احسان کا پہلو لیے ہوئے بھی ہیں، اور ان کے لئے آزمائش کا باعث بھی ہیں کہ یہ ان سے متاثر ہو کر اللہ کی عبادت کرتے ہیں یا نہیں کرتے، اللہ کی اطاعت میں کس طرح سے یہ مشغول ہوتے ہیں، تو ان اِنعامات کے اندر یہ آزمائش کا پہلو بھی ہوتا ہے۔

عقیدۂ آخرت کی اہمیت وحکمت اور اِثبات

آگے کلام منتقل ہو گئی آخرت کے مسئلے کو بیان کرنے کے لئے، فرعونیوں کے واقعہ کے بیان کا حاصل یہ تھا کہ یہ رسولِ مبین جو آیا ہے اس کی قدر کرنی چاہیے، ورنہ یہ طاقت، قوت، جتھابازی جو کچھ تم لیے بیٹھے ہو یہ کوئی کام نہیں آیا کرتی جب اللہ کی پکڑ آتی ہے، آگے آخرت کا عقیدہ آ گیا...... ! توحید بھی بیان ہو گئی، رسالت بھی آ گئی، آگے معاد آ گیا، اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَيَقُوْلُوْنَ: یہ موجودہ لوگ جو ہیں مشرکین مکہ البتہ کہتے ہیں اِنْ هِيَ اِلَّا مَوْتَتُنَا الْاُوْلٰى: نہیں ہے یہ مگر ہماری یہی پہلی موت، جو موت ہم مریں گے یہی موت ہے اور کچھ نہیں ہے، وَمَا نَحْنُ بِمُنْشَرِيْنَ: ہم اٹھائے نہیں جائیں گے، بس یہ موت آ جائے گی، قصہ ختم ہو جائے گا، ''ہم اُٹھائے نہیں جائیں گے'' فَاْتُوْا بِاٰبَآئِنَآ: لے آؤ ہمارے آباء کو اگر تم سچے ہو، یہ مؤمنین کو خطاب کر کے کہتے تھے کہ اگر مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا ہے تو ہمارے آباء جو پہلے مر چکے ہیں تو انہیں لے آؤ۔ اللہ تعالیٰ آگے اس بات کا جواب دو طرح سے دیتے ہیں، یہ بات تو کہنے کی نہیں کہ تمہارے آباء کو لایا جائے اور دوبارہ زندہ کر دیا جائے، کیونکہ اس کی بار بار وضاحت ہو چکی کہ زندہ کرنے کا وقت اللہ کے علم

میں ہے جب وہ زندہ کرے گا، یہ کوئی کھیل نہیں ہے کہ ہر کسی کے کہنے کے ساتھ کبھی کوئی مردہ زندہ کر کے دکھادیا، کبھی کوئی مردہ زندہ کر کے دکھادیا، ایسی بات نہیں ہے، آخرت کے عقیدے کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ساتھ اعمال کی اور عقائد کی اصلاح ہوتی ہے، اور اگر آخرت کا عقیدہ نہ ہو تو اخلاق کی بربادی آتی ہے، اور اخلاق کی بربادی آخرکار قوموں کی تباہی کا باعث بنتی ہے، اس لیے ایسی تباہ ہونے والی قوم کی طرف متوجہ کردیا گیا، کہ وہ لوگ دیکھو! آخرت کے قائل نہیں تھے، جب آخرت کے قائل نہیں تھے تو انہوں نے ایسا کردار اپنایا جس کے مقابلے میں تباہی آگئی، اور تم ان سے زیادہ خوش حال نہیں ہو، اگر آخرت کا عقیدہ اختیار نہیں کرو گے تو تم بھی اسی طرح سے بدکرداریوں میں مبتلا ہو کر آخر تباہ ہو جاؤ گے، واقعہ بھی یہی ہے کہ جب انسان کے اُوپر یہ ذمہ داری نہیں کہ میں نے کسی کے سامنے جا کر حساب دینا ہے تو اپنے اخلاق کو درست کرنے کی کیوں کوشش کرے گا، پھر تو لذات کے پیچھے لگے گا، شہوات کے پیچھے لگے گا، اور لذات اور شہوات کے پیچھے لگنا یہ انسان کو بالکل آخرکار برباد کر کے رکھ دیتا ہے، تو آخرت کا عقیدہ نہ رکھنا یہ اخلاقی تباہی کا باعث ہے قومی سطح پر بھی اور شخصی سطح پر بھی۔ اور پھر دلیل کی طرف متوجہ کیا، زمین و آسمان کا پیدا کرنا، جس کی تفصیل آپ کے سامنے بیسیوں دفعہ ہو چکی، کہ اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کو ظاہر کرنے کے لئے بتایا کرتے ہیں کہ تم یہ سمجھتے ہو کہ مار کر دوبارہ زندہ کرنا میرے لئے کوئی مشکل ہے، جس نے آسمان بنادیئے زمین بنادی اور یہ سب کچھ کردیا تو کیا اس کے لئے تمہارا پیدا کرنا مشکل ہے؟، اور اگر تم سے کوئی پرسش نہیں کی جائے گی تو یہ پیدا کرنا سب بے کار ہی ہوا، کہ ایک کھیل کے طور پر بنایا اور ختم کردیا، اس کا نتیجہ کوئی نہیں نکلے گا، آگے دلیل کی وضاحت اس انداز میں کی جائے گی۔

خلاصۂ آیات

''کیا یہ بہتر ہیں یا تُبّع کی قوم''، تُبّع: یہ کوئی یمن کا بادشاہ تھا ''اور وہ لوگ جو ان سے پہلے گزرے ہیں، ہم نے ان کو ہلاک کردیا، بے شک وہ سارے کے سارے مجرم تھے''، وہ بھی ایسی ہی باتیں کیا کرتے تھے اور آخرت کا عقیدہ نہیں رکھتے تھے، تو ان کو بھی ڈرنا چاہیے۔ ''نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو، اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں کھیلتے ہوئے، بیکار، جس کا کوئی مقصد نہیں'' ایسے نہیں پیدا کیے، ''نہیں پیدا کیا ہم نے ان دونوں کو مگر مصلحت کے ساتھ'' اور مصلحت اور حکمت اس میں یہی ہے کہ اس سے اللہ کی توحید پر بھی استدلال کیا جائے، اور ان کے ذریعے سے آخرت کے امکان کو بھی سمجھا جائے، ''لیکن ان میں سے اکثر لوگ جانتے نہیں ہیں''، ''بے شک فیصلے کا دن ان کا وقت متعین ہے سب کا'' آئے گا ضرور اگرچہ وقت بتانا مصلحت نہیں ہے، ''فیصلے کا دن ان سب کا متعین وقت ہے، جس دن نہیں فائدہ دے گا کوئی دوست کسی دوست کو کچھ بھی''، مولیٰ: تعلق رکھنے والا، کوئی تعلق رکھنے والا کسی تعلق رکھنے والے کو کچھ کام نہیں دے گا، اَغْنٰی عَنْہُ: یہ محاورہ کئی دفعہ آپ کے سامنے واضح کیا ہے، دُور ہٹانا، کام آنا، فائدہ پہنچانا، اس کا یہ مفہوم ہوتا ہے، کوئی تعلق رکھنے والا کسی دوسرے تعلق رکھنے والے سے کچھ ہٹا نہیں سکے گا، اس کے

کچھ کام نہیں آسکے گا، اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکے گا'' اور نہ وہ مدد دیئے جائیں گے، ہاں جس پر اللہ رحم کرے'' جس پہ اللہ رحم کرے وہی ان مصیبتوں سے بچے گا، اسی کی مدد ہوگی، اسی کو فائدہ پہنچے گا، اِلَّا مَنْ رَّحِمَ اللّٰهُ: مگر جس پہ اللہ رحم کرے،'' بے شک وہ زبردست ہے رحم کرنے والا ہے۔''

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ﴿۴۳﴾ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ﴿۴۴﴾ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ﴿۴۵﴾ كَغَلْيِ

بے شک زقوم کا درخت ﴿۴۳﴾ گناہ گار کا طعام ہے ﴿۴۴﴾ تیل کی تلچھٹ کی طرح ہوگا، جوش مارے گا پیٹوں میں ﴿۴۵﴾ جس طرح سے جوش

الْحَمِيْمِ ﴿۴۶﴾ خُذُوْهُ فَاعْتِلُوْهُ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ ﴿۴۷﴾ ثُمَّ صُبُّوْا فَوْقَ رَاْسِهٖ مِنْ

مارتا ہے گرم پانی ﴿۴۶﴾ (فرشتوں کو اللہ حکم دیں گے) اس کو پکڑلو اور اس کو گھسیٹ کر لے جاؤ جہنم کے وسط کی طرف ﴿۴۷﴾ پھر ڈالو اس کے سر کے اوپر

عَذَابِ الْحَمِيْمِ ﴿۴۸﴾ ذُقْ ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ ﴿۴۹﴾ اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ

گرم پانی کا عذاب ﴿۴۸﴾ (پھر اسے کہا جائے گا) مزہ چکھ، تُو بڑا باعزّت، بڑا کریم ہے ﴿۴۹﴾ یہی وہ چیز ہے جس میں تم

تَمْتَرُوْنَ ﴿۵۰﴾ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴿۵۱﴾ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴿۵۲﴾ يَّلْبَسُوْنَ مِنْ

شک کیا کرتے تھے ﴿۵۰﴾ بے شک اللہ سے ڈرنے والے امن کی جگہ میں ہوں گے ﴿۵۱﴾ باغات میں اور چشموں میں ہوں گے ﴿۵۲﴾ پہنیں گے وہ

سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ مُّتَقٰبِلِيْنَ ﴿۵۳﴾ كَذٰلِكَ ۗ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ﴿۵۴﴾

باریک ریشم اور موٹا ریشم، ایک دُوسرے کی طرف منہ کرکے بیٹھیں گے ﴿۵۳﴾ بات ایسے ہی ہوگی، جوڑ دیں گے ہم انہیں حورعین کے ساتھ ﴿۵۴﴾

يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ ﴿۵۵﴾ لَا يَذُوْقُوْنَ فِيْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰى ۚ

منگوائیں گے وہ اس جنّت میں ہر قسم کا میوہ بے خوف ہوکر ﴿۵۵﴾ نہیں مزہ چکھیں گے اُس جنّت میں موت کا سوائے پہلی موت کے،

وَوَقٰهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ﴿۵۶﴾ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ ۗ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۵۷﴾

اور اللہ تعالیٰ نے ان کو عذابِ جحیم سے بچالیا ﴿۵۶﴾ تیرے رَبّ کے فضل سے، یہ بہت بڑی کامیابی ہے ﴿۵۷﴾

فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿۵۸﴾ فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ ﴿۵۹﴾

ہم نے اس کو آسان کیا ہے آپ کی زبان میں تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں ﴿۵۸﴾ آپ بھی انتظار کریں، یہ بھی انتظار کر رہے ہیں ﴿۵۹﴾

تفسیر

اہلِ جہنّم کا حال

اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ: اس کا ذکر پہلے بھی آیا تھا، بے شک زقوم کا درخت یہ گناہ گار کا طعام ہے، گناہ گاروں کو کھانے کے لئے دیا جائے گا، ''زقوم'' یہ تھوہڑ کا درخت، اسی جیسا کوئی درخت ہوگا جو جہنّم میں پیدا ہوتا ہے، كَالْمُهْلِ: مهل تیل کی تلچھٹ کو بھی کہتے ہیں، پگھلے ہوئے تانبے کو بھی کہتے ہیں، یعنی وہ ایسا ہوگا جس طرح سے تیل کے نیچے میل کچیل بیٹھی ہوئی ہوتی ہے، يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ: پیٹ کے اندر جا کر جوش مارے گا، كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ گرم پانی کے جوش مارنے کی طرح، یعنی اپنی بھوک کی وجہ سے وہ لوگ اگر اس کو کھا ہی لیں گے کچھ نہ کچھ، تو پیٹ میں جا کر اس طرح سے کھولے گا جس طرح سے گرم پانی کھولا کرتا ہے، اور پھر ساری آنتڑیاں کاٹ کر رکھ دے گا، اس کا اثر یہ ہوگا، ''جوش مارے گا پیٹوں میں جس طرح سے جوش مارتا ہے گرم پانی'' اور کہا جائے گا خُذُوْهُ: فرشتوں کو اللہ حکم دیں گے کہ اس کو پکڑلو، فَاعْتِلُوْهُ: اور اس کو گھسیٹ کر لے جاؤ اِلٰى سَوَآءِ الْجَحِيْمِ: جہنّم کے وسط کی طرف، یعنی اس اثیم کو، گناہ گار کو، پکڑو، پکڑ کے اس کو گھسیٹ کے لے جاؤ جہنّم کے وسط کی طرف، ''پھر ڈالو اس کے سر کے اُوپر گرم پانی کا عذاب، اس کے سر کے اُوپر گرم پانی کا عذاب ڈالو'' گرم پانی بذاتِ خود عذاب ہے۔ اور پھر اسے کہا جائے گا تنبیہ کے طور پر ذُقْ: مزہ چکھ، اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْكَرِيْمُ: تو بڑا باعزّت، بڑا کریم ہے، یعنی دُنیا کے اندر تو بڑا عزیز اور کریم تھا، اب مزہ چکھ، یا اس کو سرزنش کے طور پر کہا جائے گا یہ تیری عزّت ہی ہورہی ہے، یہ تیرا اِکرام ہی ہورہا ہے، چکھ اب مزہ، جو اس وقت تو چاہتا تھا کہ میرے اعزاز اور اکرام میں فرق نہ آئے، اگر میں کلمہ پڑھ لوں گا تو پھر یہ عزّت اور اِکرام نہیں رہے گا، اپنی عزّت و اِکرام کا مزہ چکھ، یہ بھی ساتھ ساتھ کہا جائے گا، اور جب کسی کو پیٹا بھی جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اس قسم کے فقرے بھی بولے جائیں تو آپ جانتے ہیں کہ دوہرا عذاب ہوجاتا ہے، بدنی جسمانی عذاب بھی ہے، رُوحانی کوفت بھی ہے، اِنَّ هٰذَا مَا كُنْتُمْ بِهٖ تَمْتَرُوْنَ: یہی وہ چیز ہے جس میں تم شک کیا کرتے تھے۔

متقین کے لئے اِنعامات

دوسرے فریق کا ذکر! اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ: بے شک اللہ سے ڈرنے والے امن کی جگہ میں ہوں گے، امن کی جگہ میں سب کچھ آ گیا، کہ ان کو رہنے کی جگہ ایسی ملے گی جس میں کوئی خوف نہیں، کوئی خطرہ نہیں، ''باغات میں ہوں گے چشموں میں ہوں گے'' یہ تو مکان کا مسئلہ حل ہوگیا، يَلْبَسُوْنَ مِنْ سُنْدُسٍ وَّاِسْتَبْرَقٍ: پہنیں گے وہ باریک ریشم اور موٹا ریشم، یہ لباس کا مسئلہ حل ہوگیا۔ روٹی، کپڑا، مکان جو آپ کہا کرتے ہیں، روٹی کا ذکر آگے آجائے گا يَدْعُوْنَ فِيْهَا بِكُلِّ فَاكِهَةٍ اٰمِنِيْنَ بے خطر ہو کے ہر قسم کے میوے

کھانے کو ملیں گے، تو تینوں چیزیں ہی آپ کی پوری ہوگئیں جو انسان چاہتا ہے اپنی ضروریات کے لئے، امن والی جگہ ہوگی، باغات ہیں، چشمے ہیں، پہننے کے لئے ریشم ہوگا باریک اور موٹا..... مُتَقٰبِلِیْنَ: آپس میں محبت ہوگی، ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، اِعراض نہیں ہوگا کہ کوئی اِدھر کو منہ کیے ہوئے ہے کوئی اُدھر کو منہ کیے ہوئے ہے، کیونکہ جہاں اکٹھے رہنا ہو وہاں اگر لوگوں کے درمیان میں مخالفت ہو، اِعراض کریں، کوئی منہ اُدھر کو کرے کوئی اُدھر کو کرے تو سب کچھ حاصل ہونے کے باوجود یہ اختلافات انسان کے لئے اس زندگی کو جہنم بنادیتے ہیں، یہ بات تو آپ سمجھتے ہی ہیں، کہ اگر انسان کو ہر قسم کی خوش حالی حاصل ہے، ہر قسم کے اسباب حاصل ہیں، لیکن آپس میں مخالفت ہے اور کوئی ایک دوسرے کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا، کوئی ایک دوسرے کی طرف محبت سے نہیں دیکھتا، ایک دوسرے سے چڑتے ہیں، ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے ہیں، تو وہ معاشرہ ایک لعنتی معاشرہ بن جاتا ہے جو اللہ کی رحمت سے بالکل محروم ہوتا ہے اور خوش حالی ساری ختم ہوجاتی ہے، تو وہاں جنت میں سب ایک دوسرے سے محبت کریں گے، ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں گے، نفرت نہیں ہوگی، اور یہ بھی امن اور چین کا ایک باعث ہے، رُوحانی راحت کا باعث ہے، کہ دوست ملیں اور آپس میں ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھیں..... کَذٰلِكَ: بات ایسے ہی ہوگی، وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِیْنٍ: یہ عیش کی تکمیل ہوگئی، کہ گھر بھی آباد ہوں گے، بیویاں بھی مل جائیں گی، ''جوڑ دیں گے ہم انہیں حورِ عین کے ساتھ'' حُور یہ حَوْرَاءُ کی جمع ہے۔ عِیْنٍ یہ عَیْنَاءُ کی جمع ہے، گوری گوری موٹی موٹی آنکھوں والی عورتیں، ان کے ساتھ ہم ان کو جوڑ دیں گے، اور گھروں کے اندر آپ جانتے ہیں کہ جس وقت خاوند بیوی آپس میں اکٹھے ہوتے ہیں آپس میں محبت سے رہتے ہیں تو پھر انسان کی عیش کی تکمیل ہوجاتی ہے، ورنہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک مرد کے پاس سب کچھ ہے لیکن گھر سنوارنے والی، گھر کے اندر محبت کرنے والی اگر بیوی نہ ہو تو ایسی صورت میں بھی آپ جانتے ہیں کہ راحت میں کمی آجاتی ہے، اللہ تعالیٰ اس کی بھی تکمیل فرمادیں گے...... آگے کھانے پینے کا ذکر آگیا، ''منگوائیں گے وہ اُس جنت میں ہر قسم کا میوہ بے خوف ہوکر'' اٰمِنِیْنَ: امن چین کے ساتھ رہیں گے اور بے خوف ہوکے کھانے پینے کی چیزیں منگائیں گے، خادم ان کے لئے متعین ہوں گے...... پھر ان سب نعمتوں کے باوجود موت کا خطرہ یہ بھی انسان کی زندگی کو مکدّر کردیتا ہے، جب انسان یہ سوچتا ہے کہ ایک دِن مرجانا ہے یہ سب کچھ چھوٹ جائے گا، یہ ہمیشہ کے لئے ہمیں نہیں ملا، عارضی طور پر ملا ہے، اسی لیے موت کو ''هَاذِمُ اللَّذَّات'' کہا جاتا ہے،[1] اس کا تصور سب لذتوں کو ختم کردیتا ہے، تو اس تصور سے بھی اللہ انہیں پاک کردیں گے لَا یَذُوْقُوْنَ فِیْهَا الْمَوْتَ اِلَّا الْمَوْتَةَ الْاُوْلٰی: اس پہلی موت کے علاوہ کسی موت کا وہ مزہ نہیں چکھیں گے، جو موت آچکی آچکی، اس کے بعد کوئی موت نہیں ہے، ''یَا اَهْلَ الْجَنَّةِ لَا مَوْت، یَا اَهْلَ النَّارِ لَا مَوْت''[2] یعنی مریں گے تو جہنمی بھی نہیں، لیکن ان کا نہ مرنا نعمت نہیں ہے، ان کا نہ مرنا ان کے لئے عذاب ہے، اور جنتی جو نہیں مریں گے تو ان کا نہ

---

(۱) ترمذی ۲/ ۵۷، باب ما جاء فی ذکر الموت/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۴۰، باب تمنی الموت، فصل ثانی۔

(۲) بخاری ۲/ ۹۶۹، باب یدخل الجنة الخ/ مشکوٰۃ ۲/ ۴۹۳، باب الحوض۔

مرنا ان کے لئے اِنعام ہے۔ تو آپ اس عیش کی تکمیل دیکھ رہے ہیں کہ کس طرح سے ہوگئی کہ ہر خوف و خطرہ دُور ہوگیا، حتیٰ کہ موت کا خطرہ بھی ذہن سے نکال دیا گیا، اور یہ ملے گا متقین کو، جس میں اس کے حاصل کرنے کا طریقہ بتادیا گیا، کہ تقویٰ کی زندگی اختیار کروگے تو یہ سارے کے سارے مقاصد حاصل ہوجائیں گے، ''نہیں مزہ چکھیں گے اس جنت میں موت کا سوائے اسی موت کے جو پہلے آچکی'' یعنی اس پہلی موت کے علاوہ کسی موت کا مزہ نہیں چکھیں گے۔ ''اور اللہ تعالیٰ نے ان کو عذابِ جحیم سے بچالیا'' فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكَ: تیرے رَبّ کے فضل سے، یہ سب کچھ جو ہوا تیرے رَبّ کے فضل کی وجہ سے ہوا، ''اور یہ بہت بڑی کامیابی ہے'' اور اسی کامیابی کو حاصل کرنے کی کوشش کرنی چاہیے، کیونکہ کامیابی میں جو اعلیٰ سے اعلیٰ چیز آپ سوچ سکتے ہیں وہ یہی ہے جس کا جنت میں ذکر کردیا گیا۔ فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ: اب پھر آخر میں قرآنِ کریم کا ذِکر آگیا کہ ہم نے اس کو آسان کیا ہے آپ کی زبان میں، آپ اس کی تفہیم کررہے ہیں، مخاطبین کے لئے اس کا سمجھنا آسان ہے، لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ: تاکہ یہ لوگ نصیحت حاصل کریں، فَارْتَقِبْ اِنَّهُمْ مُّرْتَقِبُوْنَ: آپ بھی انتظار کریں، یہ بھی انتظار کررہے ہیں۔

***

سُورَةُ الجَاثِيَةِ

رکوعاتھا ۴ ۴۵ سُوْرَۃُ الْجَاثِیَۃِ مَکِّیَّۃٌ ۶۵ ایاتھا ۳۷

سورۂ جاثیہ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی سینتیس آیتیں ہیں، چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

حٰمٓ ﴿۱﴾ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ﴿۲﴾ اِنَّ فِی السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ

حٰمٓ ﴿۱﴾ یہ کتاب اللہ کی طرف سے اُتاری ہوئی ہے جو زبردست ہے حکمت والا ہے ﴿۲﴾ بے شک آسمانوں میں اور زمین میں

لَاٰیٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۳﴾ وَ فِیْ خَلْقِكُمْ وَ مَا یَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ

البتہ نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لئے ﴿۳﴾ اور تمہارے پیدا کرنے میں اور ان دواب کے پیدا کرنے میں جن کو اللہ نے پھیلایا

اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ یُّوْقِنُوْنَ ﴿۴﴾ وَ اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَ النَّهَارِ وَ مَاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ

نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین رکھتے ہیں ﴿۴﴾ دن اور رات کے اختلاف میں، اور جو رزق اللہ نے آسمان سے اُتارا

فَاَحْیَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَ تَصْرِیْفِ الرِّیٰحِ اٰیٰتٌ لِّقَوْمٍ

پھر آباد کیا اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے بنجر ہو جانے کے بعد، اور ہواؤں کے پھیرنے میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے

یَّعْقِلُوْنَ ﴿۵﴾ تِلْكَ اٰیٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَیْكَ بِالْحَقِّ فَبِاَیِّ حَدِیْثٍۭ بَعْدَ اللّٰهِ وَ

جو عقل سے کام لیتے ہیں ﴿۵﴾ یہ اللہ کی آیتیں ہیں، تلاوت کرتے ہیں ہم اِن کو آپ پر ٹھیک ٹھیک، یہ لوگ کس بات پر اللہ کے بعد

اٰیٰتِهٖ یُؤْمِنُوْنَ ﴿۶﴾ وَیْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ ﴿۷﴾ یَّسْمَعُ اٰیٰتِ اللّٰهِ

اور اس کی آیات کے بعد ایمان لائیں گے؟ ﴿۶﴾ ہلاکت ہے ہر اس شخص کے لئے جو جھوٹا اور بدکردار ہے ﴿۷﴾ اللہ کی آیات سنتا ہے

تُتْلٰى عَلَیْهِ ثُمَّ یُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا كَاَنْ لَّمْ یَسْمَعْهَا فَبَشِّرْهُ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ ﴿۸﴾

جو اس پر پڑھی جاتی ہیں پھر اصرار کرتا ہے تکبر کرتا ہوا گویا کہ اس نے اُن آیات کو سنا ہی نہیں، پس ایسے شخص کو خبر دے دیجئے دردناک عذاب کی ﴿۸﴾

وَ اِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْئَا اتَّخَذَهَا هُزُوًا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ ﴿۹﴾

اور جب جان لیتا ہے ہماری آیات میں سے کسی شئ کو تو بنا لیتا ہے اس کو مذاق، اِن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے ﴿۹﴾

مِنْ وَّرَآىِٕهِمْ جَهَنَّمُ ۚ وَلَا یُغْنِیْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَیْــٴًـا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ ۚ

ان کے پیچھے جہنم ہے، اور جو کچھ انہوں نے کمایا اور جن کو اللہ کے علاوہ انہوں نے دوست بنایا وہ ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے

وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ⑩ هٰذَا هُدًى ۚ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ ⑪

اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے ⑩ یہ راہنمائی ہے، اور وہ لوگ جو اپنے رَبّ کی آیات کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے سختی کا دردناک عذاب ہے ⑪

تفسیر

سورت کا تعارف اور اس کے مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ جاثیہ مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۳۷ آیتیں ہیں، ۴ رُکوع ہیں۔ اس سورت کا نام ''جاثیۃ'' ماخوذ ہے اس آیت سے وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِیَةً، اُسی آیت اِس سورت کا نام لیا گیا ہے، جاثیہ کا معنی گھٹنے ٹیکنے والی۔ سورت ''مکی'' ہے اور اس میں اسی قسم کے مضامین ہیں جیسے کہ ''مکی'' سورتوں میں ہوتے ہیں، عقائد کا اِثبات ہے، اور اس سورت میں خصوصیت کے ساتھ معاد کی تفصیل ذِکر کی گئی ہے، اور قرآنِ کریم میں عام طور پر آپ نے دیکھا کہ جس طرح سے توحید کے متعلق تفصیلات پیش کی گئی ہیں اِسی طرح سے بلکہ اِس سے بھی بڑھ کر زیادہ زور دیا گیا ہے عقیدۂ آخرت پر، وجہ اُس کی یہ ہے کہ اگر انسان کے سامنے یہ بات آجائے کہ مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ کے سامنے ہم نے پیش ہونا ہے اور اپنی زندگی کے ایک ایک قول اور ایک ایک فعل کا حساب دینا ہے تو یہ شخص سوچ سوچ کر قدم اُٹھائے گا، انسان کے اعمال اور اس کے اخلاق کے اندر توازن پیدا کرنے کے لئے عقیدۂ آخرت بہت ضروری ہے، اور اگر کوئی شخص اس بات کا قائل ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ نہیں اُٹھنا، اور زندگی یہی ہے جو ہم یہاں دُنیا میں گزار رہے ہیں، تو سوائے لذات پرستی کے اور شہوات پرستی کے اس شخص کا اور کوئی مشن نہیں ہوتا، کوئی پروگرام نہیں ہوتا، اس لیے اخلاقی بگاڑ کے اندر اس عقیدے کو بہت دخل ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کی ذمہ داری محسوس نہ کرے، اس لیے ''مکی'' سورتوں میں معاد کے اِثبات کے لئے بہت تفصیل کے ساتھ گفتگو کی گئی ہے۔ اس سورت کی اِبتدا بھی حٰمٓ کے لفظ سے ہے جس طرح سے مسلسل سورتیں آپ کے سامنے چلی آرہی ہیں، اور ان سب سورتوں میں اِبتدا کے اندر اللہ کی کتاب کا ذکر آیا ہے، اور جب اس کتاب کو منزل من اللہ مان لیا جائے تو اس کی ساری تعلیمات کو قبول کرنا آسان ہوجائے گا۔

عظمتِ قرآن

حٰمٓ: یہ حروفِ مقطعات ہیں، اللہ اعلم بمرادہ بذالک، تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ: تَنْزِیْلُ یہ مصدر ہے اور اس کی اضافت کتاب کی طرف مفعول کی طرف اضافت ہے، یعنی هٰذَا الْكِتٰبُ مُنَزَّلٌ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ یہ کتاب اللہ کی طرف سے اُتاری ہوئی ہے جو عزیز ہے حکیم ہے۔ عزیز: زبردست۔ حکیم: حکمت والا۔ جس سے معلوم ہوگیا کہ اللہ تبارک تعالیٰ کی

اُتاری ہوئی یہ کتاب پُرحکمت ہے، اس میں جتنی باتیں بتائی گئی ہیں جب حکیم کی طرف سے آئی ہیں تو اس کی ہر بات دانش مندی کے مطابق ہے، حکمت کے تقاضے کے مطابق ہے، اور زبردست ہونا اس کا ظاہر کر دیا گیا، جس سے اس کتاب کی عظمت پیدا ہوئی کہ اس کو کسی گداگر کی درخواست نہ سمجھیں، بلکہ یہ زبردست کا پیغام ہے جو تمہیں بھیجا گیا ہے، جس کے نہ قبول کرنے کی صورت میں سزا ہوگی، اور اس کی مخالفت کو اپنے لیے کوئی آسان نہ سمجھیں۔

آیاتِ توحید

آگے آیاتِ توحید شروع ہوتی ہیں، یہ مضامین بار بار گزرے ہوئے ہیں اس لیے ان کی زیادہ تفصیل کی تو ضرورت نہیں، ترجمہ دیکھتے چلیے...... اِنَّ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰيٰتٍ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: بے شک آسمانوں میں اور زمین میں البتہ نشانیاں ہیں ایمان لانے والوں کے لئے، یعنی اگر کوئی شخص ایمان لانا چاہے تو ایمان لانے کے لئے دلائل نشانیاں زمین و آسمان کے اندر بکھری ہوئی ہیں۔ ''اور تمہارے پیدا کرنے میں'' وَمَا يَبُثُّ مِنْ دَآبَّةٍ: اور ان دواب کے پیدا کرنے میں جن کو اللہ نے پھیلایا، دابہ: ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو چلتی ہے، زمین کے اُوپر رینگتی ہے، تو مِنْ دَآبَّةٍ یہ 'مَا'' کا بیان ہے،'' جو دوابّ اللہ نے پھیلائے اُن کے پیدا کرنے میں نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو یقین لاتے ہیں۔'' وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ: دِن اور رات کے اختلاف میں، دِن اور رات کا اختلاف دو طرح سے ہوا کرتا ہے، ایک یہ کہ دِن جا رہا ہے رات آ رہی ہے، اور رات جا رہی ہے دِن آ رہا ہے، اور اسی طرح سے کبھی دِن بڑے ہو جاتے ہیں، راتیں چھوٹی ہو جاتی ہیں، اور کبھی راتیں بڑی ہو جاتی ہیں، دِن چھوٹے ہو جاتے ہیں۔ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنْ رِّزْقٍ: رزق سے یہاں مادّۂ رزق مراد ہے یعنی پانی، آسمان کی طرف سے پانی اُترتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے ساتھ نباتات پیدا فرماتے ہیں، اور انسانوں کے لئے اور حیوانوں کے لئے رزق کی فراوانی ہوتی ہے، اور مِنْ رِّزْقٍ یہ مَآ اَنْزَلَ میں مَا کا بیان ہے۔ ''اور جو رزق اللہ نے آسمان سے اُتارا'' تو رزق سے مراد مادّۂ رزق یعنی بارش، فَاَحْيَا بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا: پھر آباد کیا اُس کے ذریعے سے زمین کو زمین کے ویران ہو جانے کے بعد، بنجر ہو جانے کے بعد، زمین کی موت اس کا بنجر ہو جانا ہے اور اس کا سرسبز و شاداب ہو جانا اس کی حیات ہے، اور یہ بھی فِی کے نیچے داخل ہے، یعنی اس پانی میں جس کو اُتارا اللہ نے آسمان سے، پھر آباد کیا اس کے ذریعے سے زمین کو اس کے بنجر ہو جانے کے بعد، وَتَصْرِيْفِ الرِّيٰحِ: اور ہواؤں کے پھیرنے میں، ہواؤں کا پھیرنا بھی دو طرح سے، یا تو سمت کے اعتبار سے کہ شمالاً جنوباً، شرقاً غرباً ادل بدل ہوتی رہتی ہے، اور اسی طرح سے صفات کے اعتبار سے بھی کہ کبھی گرم ہے، کبھی سرد ہے، کبھی نرم ہے، کبھی سخت ہے، تو صفات کا اختلاف بھی ہواؤں میں ہوتا ہے،'' ان سب چیزوں میں جن کا ذکر کیا گیا البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو عقل سے کام لیتے ہیں'' جو سوچتے ہیں، غور کرنے کی جن کو عادت ہے، وہ یہ دیکھیں گے کہ کس قسم کا تصرف ہے، کیسے کیسے اس میں انعامات ہیں، کیسی کیسی قدرت نمایاں ہے، تو سوچنے کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچ سکتے ہیں کہ ان سب کا خالق مالک وحدہ لاشریک لہ ہے، کوئی دوسرا اس کے ساتھ شریک نہیں، کیونکہ ان کاموں کے اندر اگر شرکت

ہوجائے تو یہ نظم قائم نہیں رہ سکتا جس قسم کا کائنات کے اندر نظر آ رہا ہے، قرآنِ کریم میں دوسری جگہ اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا لَوۡ كَانَ فِيۡهِمَاۤ اٰلِهَةٌ اِلَّا اللّٰهُ لَفَسَدَتَا (سورۂ انبیاء:۲۲) اگر زمین وآسمان میں اللہ کے علاوہ اور آلہہ بھی ہوتے تو ان میں فساد برپا ہوجاتا، یہ نظم قائم نہ رہتا جس طرح سے اِس کائنات میں قائم ہے۔ تِلۡكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتۡلُوۡهَا عَلَيۡكَ بِالۡحَقِّ: یہ اللہ کی آیتیں ہیں، تلاوت کرتے ہیں ہم اِن کو آپ پر ٹھیک ٹھیک، فَبِاَىِّ حَدِيۡثٍۢ بَعۡدَ اللّٰهِ وَاٰيٰتِهٖ يُؤۡمِنُوۡنَ: يُؤۡمِنُوۡنَ جمع غائب کا صیغہ آ گیا، یہ لوگ کس بات پر اللہ کے بعد اور اس کی آیات کے بعد ایمان لائیں گے، یعنی یہ اللہ کی بات نہیں مانتے اور اللہ کی آیات کو نہیں مانتے تو اس کے بعد وہ کون سی بات ہوگی جس پر یہ لوگ ایمان لائیں گے، یقین کرنے کے لئے اور ایمان لانے کے لئے سب سے زیادہ اہم بات اور سب سے زیادہ درست بات اللہ کی ہے۔

کُفّار کی ضد اور اس کا انجام

وَيۡلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيۡمٍ: اَفَّاك یہ لفظ اِفك سے لیا گیا ہے، اِفك کہتے ہیں بدترقسم کے جھوٹ کو، مِّنۡ اِفۡكِهِمۡ لَيَقُوۡلُوۡنَ وَلَدَ اللّٰهُ (سورۂ صافات:۱۵۲)، اِنَّ الَّذِيۡنَ جَآءُوۡ بِالۡاِفۡكِ (سورۂ نور:۱۱)، اور اَفَّاك اس سے مبالغے کا صیغہ ہوگیا، بہت جھوٹا۔ اور اثیم: اِثم سے لیا گیا ہے، اثم گناہ کو کہتے ہیں، اثیم کا معنی گناہ گار، تو اثیم کے لفظ سے بدعملی کی طرف اشارہ ہے اور اَفَّاك کہہ کر قول اعتبار سے اس کو غلط قرار دیا گیا ہے، تو "ہر وہ شخص جو کہ باتوں میں جھوٹا ہے اور عمل میں بدکردار ہے ایسے شخص کے لئے ہلاکت ہے" جو بات صحیح نہیں کہتا، اور بات چونکہ دال ہوا کرتی ہے قلبی حالات پر، تو اس کا مطلب ہے کہ عقیدوں کے بارے میں بھی وہ جھوٹا ہے، اس کے عقیدے بھی خلافِ واقع ہیں، کیونکہ زبان جو ہے یہ قلب کے اندر جو کچھ موجود ہے اس کی ترجمان ہوا کرتی ہے، جب زبان کا وہ جھوٹا ہے تو اس کے قلبی حالات بھی اپنی جگہ ٹھیک نہیں، تو ہر ایسا شخص جو کہ اَفَّاك اثیم ہو، جو زبان کے اعتبار سے جھوٹا ہے اور عمل کے اعتبار سے گناہ گار ہے، ہر اس شخص کے لئے خرابی ہے، اس کا مصداق اس وقت کے مخاطبین ہیں قرآنِ کریم کے، جو مشرکین تھے اور قرآنِ کریم کی باتیں سُن کر مانتے نہیں تھے، وہی جھوٹے تھے وہی گناہ گار تھے۔ اور حال اس کا یہ ہے يَسۡمَعُ اٰيٰتِ اللّٰهِ: اللہ کی آیات سنتا ہے تُتۡلٰى عَلَيۡهِ اس کے اوپر پڑھی جاتی ہیں ثُمَّ يُصِرُّ مُسۡتَكۡبِرًا: تو اللہ کی باتوں کو سُن کر ماننے کی بجائے اِصرار کرتا ہے تکبر کرتا ہوا، اپنے خیالات پر اپنے نظریات پر وہ مصر ہے، مُصِر: اَڑنے والا، اَڑی کرنے والا، اور استکبار کا معنی ہوتا ہے اپنے آپ کو بڑا سمجھ لینا، اور بڑا سمجھنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دوسرے کی بات کو انسان قبول نہیں کرتا، جیسے کہ حدیث شریف میں تکبر کا معنی یہی ذکر کیا گیا ہے: بَطَرُ الْحَقِّ: حق کے سامنے اکڑ جانا اور دوسرے کو حقیر جاننا، یہ ہے تکبر کی حقیقت،[1] تو اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہوا وہ اِصرار کرتا ہے، ضد کرتا ہے، كَاَنۡ لَّمۡ يَسۡمَعۡهَا: گویا کہ اس نے اُن آیات کو سنا ہی نہیں، فَبَشِّرۡهُ بِعَذَابٍ اَلِيۡمٍ: ایسے شخص کو جو اَفَّاك اثیم ہے، اللہ کی آیات سنتا ہی نہیں، سنتا ہے تو ایسا کر دیتا ہے کہ گویا کہ سنی ہی نہیں، اپنے خیالات پر وہ مصر ہے، اپنے کردار پر

(۱) مسلم ۱/۶۵ باب تحریم الکبر وبیانہ/مشکوٰۃ ۲/۴۳۳ باب الغضب والکبر فصل اول۔ ولفظ الحدیث: اَلْكِبْرُ بَطَرُ الْحَقِّ وَغَمْطُ النَّاسِ

مصر ہے، ایسے شخص کو خبر دے دیجئے دردناک عذاب کی، اور یہ دردناک عذاب یہی ویل ہے جو وَیْلٌ لِّكُلِّ اَفَّاكٍ اَثِیْمٍ کے اندر ذکر کیا گیا۔ وَاِذَا عَلِمَ مِنْ اٰیٰتِنَا شَیْـًٔا: اور جس وقت وہ ہماری آیات میں سے کسی چیز کا علم حاصل کرتا ہے، اُس کو کسی نشانی کا پتا چلتا ہے اتَّخَذَهَا هُزُوًا: تو عقل کے ساتھ اس میں غور وفکر کرنے کی بجائے اس کا مذاق اُڑاتا ہے، کوئی معجزہ اس کے سامنے آجائے یا کوئی اللہ کی بات اس کے سامنے ذکر کی جائے تو اس کا ٹھٹھا، مذاق بناتا ہے، ''جب جان لیتا ہے ہماری آیات میں سے کسی شی کو تو بنالیتا ہے اُس کو ھُزو، ٹھٹھا، مذاق'' اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِیْنٌ: اِن کے لئے ذلیل کرنے والا عذاب ہے، مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ: وراء کا لفظ یہ لغات اضداد میں سے ہے، سامنے کے معنی میں بھی آتا ہے اور پیچھے کے معنی میں بھی آتا ہے، اگر سامنے کے معنی میں لیں گے تو ترجمہ یوں ہوگا کہ ان کے سامنے جہنم ہے، یعنی یہ اندھے بہروں کی طرح ایک سڑک پر رواں دواں ہیں اور ان کو معلوم نہیں کہ ان کا انجام کیا ہونے والا ہے، تو ان کو بتایا جا رہا ہے کہ آگے جدھر جا رہے ہو جہنم موجود ہے، اگر اسی ڈگر پر چلتے رہے اور تمہارا طرز عمل یہی رہا تو آخر جہنم میں جا گرو گے، اور وراء کا معنی پیچھے بھی ہوتا ہے، ''ان کے پیچھے جہنم ہے'' یعنی یہ بے فکری کے ساتھ ہنسی مذاق میں اپنا وقت گزار رہے ہیں حالانکہ ان کے پیچھے جہنم لگی ہوئی ہے، اور آخر ایک وقت میں انہیں دبوچ لے گی، اور ان کا احاطہ کرلے گی، تو مِنْ وَّرَآئِهِمْ جَهَنَّمُ کا ترجمہ دونوں طرح سے ہوگیا، ''ان کے سامنے جہنم ہے'' وَلَا یُغْنِیْ عَنْهُمْ مَّا كَسَبُوْا شَیْـًٔا وَّلَا مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ: مَا كَسَبُوْا: جو کچھ انہوں نے کمایا۔ شَیْـًٔا یہ لَا یُغْنِیْ کا مفعول ہے۔ اور مَا اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَوْلِیَآءَ: جو انہوں نے اللہ کے علاوہ اولیاء اختیار کیے۔ ''جو کچھ انہوں نے کمایا اور جن کو اللہ کے علاوہ انہوں نے دوست بنایا ان کے لئے کچھ کام نہیں آئیں گے'' یعنی جس وقت ان کو جہنم نے دبوچ لیا اور یہ جہنم کا لقمہ بن گئے تو آج جس کمائی کے اوپر ان کو ناز ہے کہ ہم نے دولت اکٹھی کر رکھی ہے یہ بھی کچھ کام نہیں آئے گی، اور اسی طرح سے جو انہوں نے اللہ کے علاوہ اپنے لیے سہارے تلاش کر لیے ہیں وہ سہارے بھی ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔ اَوْلِیَآءَ یہ اتَّخَذُوْا کا مفعول ہے، ''جن چیزوں کو ان لوگوں نے اللہ کے علاوہ کارساز بنایا وہ بھی کچھ کام نہیں آئیں گی، اور جو کچھ انہوں نے کمایا وہ بھی ان کے کچھ کام نہیں آئے گا'' اَغْنٰی عَنْهُ کا ترجمہ آپ کے سامنے بار ہا ذکر کیا تین طرح سے ہوجایا کرتا ہے، اَغْنٰی عَنْهُ: کام آنا، اَغْنٰی عَنْهُ: فائدہ پہنچانا، اور اَغْنٰی عَنْهُ: دُور ہٹانا۔ ''ان کی کمائی اور ان کے اولیاء اللہ کے عذاب سے کچھ بھی دُور نہیں ہٹا سکیں گے، جس وقت یہ لوگ اللہ کی گرفت میں آ گئے تو ان کی کمائی اور ان کے اولیاء ان کو کچھ فائدہ نہیں دے سکیں گے، ان کے کچھ کام نہیں آئیں گے۔'' وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ: اور ان کے لئے بڑا عذاب ہے۔

هٰذَا هُدًى: یہ راہنمائی ہے، یہ کتاب جو ہم اُتار رہے ہیں یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہدایت ہے، ھُدیٰ اور ہدایت ایک ہی چیز ہے، وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ: اور وہ لوگ جو اپنے رَبّ کی آیات کا انکار کرتے ہیں، لَهُمْ عَذَابٌ مِّنْ رِّجْزٍ اَلِیْمٌ: رِجز سختی کو کہتے ہیں، تو عَذَابٌ اَلِیْمٌ مِّنْ رِّجْزٍ، ان کے لئے دردناک عذاب ہے سختی سے، سختی کا دردناک عذاب ہے، مِنْ رِّجْزٍ یہ عَذَابٌ اَلِیْمٌ کا بیان ہے، یعنی جو لوگ بھی اس راہنمائی کو قبول نہیں کریں گے اور اللہ کی باتوں کا انکار کرتے ہیں آخر سختی کا عذاب ان کے اوپر پڑے گا۔

اَللّٰهُ الَّذِىْ سَخَّرَ لَكُمُ الْبَحْرَ لِتَجْرِىَ الْفُلْكُ فِيْهِ بِاَمْرِهٖ وَلِتَبْتَغُوْا مِنْ

اللہ وہ ہے جس نے مسخر کیا تمہارے نفع کے لئے سمندر کو تا کہ اللہ کے حکم کے ساتھ اس سمندر کے اندر کشتیاں چلیں اور تا کہ تم اللہ کے فضل

فَضْلِهٖ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ وَ

کو تلاش کرو اور تا کہ تم شکر گزار ہو جاؤ ⑫ کام میں لگایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے ان چیزوں کو جو آسمان میں ہیں اور

مَا فِى الْاَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ ؕ اِنَّ فِىْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۳﴾

ان چیزوں کو جو زمین میں ہیں سب کو اپنی جانب سے، بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ غور کرتے ہیں ⑬

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ

کہہ دیجئے آپ ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں، درگزر کر جایا کریں ان لوگوں سے جو کہ نہیں اُمید رکھتے اللہ کے معاملات کی،

لِيَجْزِىَ قَوْمًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۴﴾ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا

تا کہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو بسبب ان کاموں کے جو یہ کرتے ہیں ⑭ جو کوئی شخص نیکی کرتا ہے تو اپنے

فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ۫ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ ﴿۱۵﴾

ہی فائدے کے لئے کرتا ہے، اور جو کوئی بُرا کردار کرتا ہے تو اس کا وبال اسی پہ پڑتا ہے، پھر تم اپنے رَبّ کی طرف لوٹائے جاؤ گے ⑮

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ وَ

البتہ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب دی اور علم وحکمت دی اور نبوّت دی اور ہم نے ان کو پاکیزہ رزق دیا اور

فَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۶﴾ وَاٰتَيْنٰهُمْ بَيِّنٰتٍ مِّنَ الْاَمْرِ ۚ فَمَا اخْتَلَفُوْٓا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ

ہم نے اِن کو عالمین پر فضیلت دی ⑯ اور ہم نے ان کو دِین کی واضح واضح باتیں دیں، پھر انہوں نے اختلاف نہ کیا مگر بعد اس کے

مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۙ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِىْ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيْمَا

کہ ان کے پاس علم آ گیا، آپس میں ضد کی وجہ سے، بے شک تیرا رَبّ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دِن اس بات میں

كَانُوْا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۷﴾ ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا

جس میں کہ یہ اختلاف کیا کرتے تھے ⑰ پھر ہم نے آپ کو دِین کے ایک واضح طریقے پر کر دیا، آپ اسی کی اتباع کیجئے

وَلَا تَتَّبِعۡ اَهۡوَآءَ الَّذِيۡنَ لَا يَعۡلَمُوۡنَ ۝۱۸ اِنَّهُمۡ لَنۡ يُّغۡنُوۡا عَنۡكَ مِنَ اللّٰهِ شَيۡـًٔا ؕ

ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے جو علم نہیں رکھتے ⑱ یہ ہرگز آپ کے کام نہیں آئیں گے اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی،

وَاِنَّ الظّٰلِمِيۡنَ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِيَآءُ بَعۡضٍ ۚ وَاللّٰهُ وَلِىُّ الۡمُتَّقِيۡنَ ۝۱۹ هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ

بے شک ظالم بعض بعض کے دوست ہیں اور اللہ دوست ہے متقین کا ⑲ یہ قرآن لوگوں کے لئے روشن دلائل ہیں،

وَهُدًى وَّرَحۡمَةٌ لِّقَوۡمٍ يُّوۡقِنُوۡنَ ۝۲۰ اَمۡ حَسِبَ الَّذِيۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّيِّاٰتِ اَنۡ

اور رہنمائی ہے اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ یقین لاتے ہیں ⑳ کیا سمجھ لیا ہے ان لوگوں نے جو کہ بُرے کام کرتے ہیں کہ

نَّجۡعَلَهُمۡ كَالَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۙ سَوَآءً مَّحۡيَاهُمۡ وَمَمَاتُهُمۡ ؕ سَآءَ مَا يَحۡكُمُوۡنَ ۝۲۱ ع

ہم بنادیں گے اُنہیں ان لوگوں کی طرح؟ جو کہ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، برابر ہوگی ان کی زندگی اور ان کی موت؟
بہت بُرا فیصلہ کرتے ہیں ㉑

تفسیر

آیاتِ توحید بصورتِ اِنعام

آگے یہ جو آیات نقل کی جارہی ہیں یہ بھی آیاتِ توحید ہی ہیں، ان کے اندر اِنعام کا پہلو زیادہ ہے، اَللّٰهُ الَّذِىۡ سَخَّرَ لَكُمُ الۡبَحۡرَ لِتَجۡرِىَ الۡفُلۡكُ فِيۡهِ بِاَمۡرِهٖ: سَخَّرَ: تَسۡخِيۡر: قابو کرلینا، کام میں لگادینا، تابع کرلینا، ''اللہ وہ ہے جس نے مسخر کیا تمہارے نفع کے لئے سمندر کو، کام میں لگایا تمہارے نفع کے لئے دریاؤں کو، سمندر کو'' بحر: کا لفظ سب کے اُوپر صادق آتا ہے۔ نفع تمہارا کس طرح سے ہے؟ لِتَجۡرِىَ الۡفُلۡكُ فِيۡهِ بِاَمۡرِهٖ: تاکہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ اُس سمندر کے اندر کشتیاں چلیں، فلک کا لفظ واحد اور جمع دونوں کے لئے بولا جاتا ہے، تمہارے نفع کے لئے کشتیاں چلیں، جب کشتیاں چلتی ہیں دریا میں اور سمندر میں، اللہ تعالیٰ نے پانی کا مزاج ایسا بنادیا کہ وہ چیز کو برداشت کرتا ہے اور چیز اس میں آگے چلتی ہے، اور اسی طرح سے لکڑی لوہے کا مزاج اس طرح سے بنا دیا کہ ان کے ساتھ جب ایک کشتی کی شکل بنالی جاتی ہے تو یہ پانی کے اُوپر تیرتی ہے، تو اس میں تم سفر طے کرتے ہو، ایک ملک سے دوسرے ملک کو پہنچتے ہو، ایک شہر سے دوسرے شہر کو پہنچتے ہو، بار برداری ہوتی ہے، تجارت ہوتی ہے، تو میل ملاقات کے ساتھ ساتھ رزق کے کمانے کا ذریعہ بھی ہے، جس طرح سے وَلِتَبۡتَغُوۡا مِنۡ فَضۡلِهٖ: کے اندر ذکر کردیا گیا، تاکہ تم اللہ کے فضل کو تلاش کرو، ''اللہ کے فضل'' سے رزقِ حلال مراد ہے، وَلَعَلَّكُمۡ تَشۡكُرُوۡنَ: اور تاکہ تم شکر گزار ہوجاؤ، اور شکر کا معنی ہوا کرتا ہے قدردانی، یعنی تم اللہ کے اس احسان کی قدر کرو، اور قدر کا مطلب بھی یہی ہے کہ اس کو اللہ کی جانب سے سمجھو اور اس کی اطاعت کرو، وَسَخَّرَ لَكُمۡ مَّا فِى السَّمٰوٰتِ

وَمَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا: کام میں لگایا اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے ان سب چیزوں کو جو آسمان میں ہیں اور ان سب چیزوں کو جو زمین میں ہیں، زمین میں جو کچھ ہے اور آسمان میں جو کچھ ہے سب اللہ تعالیٰ نے تمہارے نفع کے لئے کام میں لگا دیے، مسخر اپنی قدرت کے ہی کیے ہیں لیکن نفع اس میں تمہارا ہے، آسمان کی چیزوں میں بھی اور زمین کی چیزوں میں بھی، جَمِيْعًا: سارے کے سارے، مِّنْهُ یہ تسخیر اللہ کی جانب سے ہے، یا، یہ ساری نعمتیں اللہ کی جانب سے ہیں، اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّتَفَكَّرُوْنَ: بے شک اس میں البتہ نشانیاں ہیں ان لوگوں کے لئے جو کہ غور کرتے ہیں، تفکر کا معنی دھیان کرنا، غور کرنا۔

ایمان والوں کو کفار کے متعلق درگزر کرنے کی ہدایت

قُلْ لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يَغْفِرُوْا لِلَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ اَيَّامَ اللّٰهِ کہہ دیجئے آپ ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں درگزر کر جایا کریں ان لوگوں کے لئے جو اللہ کے ایام کی اُمید نہیں رکھتے، اَيَّامَ اللّٰهِ: اللہ کے ایام، اللہ کے دِن، ''اللہ کے دِنوں'' سے مراد ہوا کرتے ہیں اللہ کے معاملات، جیسے ''ایام العرب'' کا لفظ بولا جاتا ہے، اس سے وہ تاریخی واقعات مراد ہوا کرتے ہیں جو عرب کے اندر پیش آئے، جس دِن میں اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ اِنعام کا معاملہ کرے، یا جس دِن میں اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ سزا کا معاملہ کرے وہ ''ایام اللہ'' کہلاتے ہیں، ذَكِّرْهُمْ بِاَيّٰىمِ اللّٰهِ سورۂ ابراہیم کے اندر بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں یہ آیا تھا (آیت:۵)، تو اللہ کے معاملات کی اُمید نہیں رکھتے یعنی ان کو یہ اعتقاد نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نیکی کے اوپر جزا دیتا ہے اور بُرائی کے اوپر سزا دیتا ہے، وہ اللہ کی طرف سے بے فکر ہیں، اس بے فکری میں جو حرکتیں کرتے ہیں تو اِن سے درگزر کر جایا کرو، اِن کے ساتھ بات بات پر اُلجھنے کی ضرورت نہیں، ''درگزر کر جایا کریں ان لوگوں سے جو کہ نہیں اُمید رکھتے اللہ کے معاملات کی'' لِيَجْزِيَ قَوْمًا: تا کہ بدلہ دے اللہ تعالیٰ اِن لوگوں کو بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ: بسبب اُن کاموں کے جو یہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ اِن کے کسب کا اِن کو بدلہ دے گا، اور اللہ کے بدلے کا یہ اُصول ہے کہ مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ: جو کوئی شخص نیکی کرتا ہے تو اپنے ہی فائدے کے لئے کرتا ہے، لام نفع کے لئے ہے، وَمَنْ اَسَآءَ: جو کوئی بُرا کردار کرتا ہے فَعَلَيْهَا: تو اس کا وبال اُسی پہ پڑتا ہے، ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ: پھر تم اپنے ربّ کی طرف لوٹائے جاؤ گے۔

تائید کے طور پر بنی اسرائیل کا حوالہ

تائید کے طور پر حوالہ دیا جارہا ہے بنی اسرائیل کا، کہ انبیاء علیہم السلام کا سلسلہ بنی اسرائیل میں بھی ہوا، اس لیے آپ ﷺ کا ان مشرکینِ مکہ کی طرف آنا کوئی نئی بات نہیں ہے، اور دونوں قسم کے نتائج بھی سامنے آئے کہ جب انہوں نے اللہ کی ہدایات کو مانا تو ان کا حال کچھ اور ہوا، اور جب اللہ کے اَحکام سے روگردانی کی تو پھر ان کا انجام کچھ اور نکلا، وَلَقَدْ اٰتَيْنَا بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ: حکم حکمت کے معنی میں یا حکومت کے معنی میں، ''البتہ تحقیق ہم نے بنی اسرائیل کو کتاب دی'' یعنی انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے ان کے اوپر کتابیں اُتاریں، ''اور ہم نے بنی اسرائیل کو حکومت دی یا علم وحکمت دی اور نبوت دی'' انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے ان کو یہ نعمتیں حاصل ہوئیں، وَرَزَقْنٰهُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ: یہ مادی نعمت ہوگئی، ہم نے اِن کو پاکیزہ رزق دیا، وَفَضَّلْنٰهُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ: اور ہم

نے اِن کو عالمین پر فضیلت دی، عالمین پر فضیلت یہ لفظ بار بار گزرا ہے، اگر تو جزوی واقعات کے اعتبار سے فضیلت ہو پھر تو سب جہانوں پر اُن کو قیامت تک حاصل ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کے ساتھ ایسے خصوصی خصوصی معاملات فرمائے ہیں جو ان کے علاوہ کسی اور کے ساتھ نہیں کیے، اور اگر کلی فضیلت مراد ہو تو پھر عالمین میں تخصیص کرنی پڑے گی، یعنی اس زمانے میں جس زمانے میں بنی اسرائیل میں انبیاء آتے تھے اور کتابیں ان کی جانب آتی تھیں تو سب جہانوں سے افضل وہی تھے، اللہ تعالیٰ کے علم کے حامل یہی لوگ تھے، اللہ کی کتاب کے حامل تھے، لیکن جب سرور کائنات ﷺ تشریف لے آئے اور بنی اسرائیل آپ کا انکار کر کے کافر ہو گئے تو پھر ان کی یہ فضیلت باقی نہیں رہی، پھر حضور ﷺ کی جو امت تھی وہ خَیۡرَ اُمَّۃٍ کا مصداق بن گئی، وَاٰتَیۡنٰہُمۡ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ: ہم نے اِن بنی اسرائیل کو دین کی واضح واضح باتیں دیں، بینات سے واضح باتیں مراد ہیں، ''اَمر'' سے دِین مراد ہے، دِین کی واضح واضح باتیں ہم نے اِن کو دیں فَمَا اخۡتَلَفُوۡۤا اِلَّا مِنۡۢ بَعۡدِ مَا جَآءَہُمُ الۡعِلۡمُ: پھر انہوں نے اختلاف نہ کیا مگر بعد اس کے کہ اِن کے پاس علم آ گیا، علم کے آنے کے بعد انہوں نے اختلاف کیا، بَغۡیًۢا بَیۡنَہُمۡ: آپس میں ضد کی وجہ سے، اختلاف آپس میں ہوتا، اغراض کا شہوات کا، اور دِین کو بہانہ بنا لیتے، اس طرح سے ان کے مختلف ٹولے ہو گئے؛ ''آپس میں ضد کی وجہ سے انہوں نے اختلاف کیا'' اِنَّ رَبَّکَ یَقۡضِیۡ بَیۡنَہُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ: بے شک تیرا رَبّ فیصلہ کرے گا ان کے درمیان قیامت کے دِن، فِیۡمَا کَانُوۡا فِیۡہِ یَخۡتَلِفُوۡنَ: اس بات میں جس میں کہ یہ اختلاف کیا کرتے تھے، جن باتوں میں جھگڑتے تھے اختلاف کرتے تھے ان کا عملی فیصلہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دِن فرمائیں گے۔

اب اِتباع صرف شریعتِ محمدی کی ہے

ثُمَّ جَعَلۡنٰکَ عَلٰی شَرِیۡعَۃٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ: اَمر سے وہی دِین مراد ہے، شریعت سے مراد ہوتا ہے واضح راستہ؛ ''پھر ہم نے آپ کو دِین کے ایک واضح طریقہ پہ کر دیا'' اب آپ کے پاس ایک شریعت آ گئی، دِین کا ایک واضح طریقہ آ گیا، تو فَاتَّبِعۡہَا: آپ اِسی شریعت کی اتباع کیجئے، وَلَا تَتَّبِعۡ اَہۡوَآءَ الَّذِیۡنَ لَا یَعۡلَمُوۡنَ: ان لوگوں کی خواہشات کی اتباع نہ کیجئے جو کہ علم نہیں رکھتے۔ بنی اسرائیل کو بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک شریعت دی تھی جیسے کہ بَیِّنٰتٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ کے اندر بیان ہوا، اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے سرورِ کائنات ﷺ کو دِین کا ایک طریقہ بتایا، ہم اُس کو شریعت کے عنوان سے ذکر کیا کرتے ہیں، اور اس طریقے کے واضح کرنے کے بعد یہ کہہ دیا کہ آپ نے اِسی شریعت کی اتباع کرنی ہے اور اِس کے خلاف جو شخص بھی آپ کے سامنے کوئی بات کرے، چاہے وہ پہلے انبیاء علیہم السلام کے دِین کی بات ہی کیوں نہ ہو، لیکن آپ کی شریعت میں اُس کے خلاف حکم آ چکا، اب اُس کی اتباع کرنا یہ اتباعِ شہوات ہے، اتباعِ ہویٰ ہے، تو اُن لوگوں کی باتیں آپ نہ مانیے جو کہ اپنی خواہشات پہ چلتے ہیں، یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی لائی ہوئی باتیں جن کو اللہ تعالیٰ نے منسوخ کر دیا اب وہ باتیں بھی ہویٰ کا مصداق ہیں، کہ اگر کوئی شخص ان کی اتباع کرتا ہے اِس شریعتِ محمدی کے مقابلے میں تو اُس کو ہم یہ نہیں کہیں گے کہ یہ دِینِ الٰہی کا متبع ہے، بلکہ یہ کہیں گے کہ یہ شہواتِ نفس کا متبع ہے، یہ متبعِ ہویٰ ہے، تو اللہ تعالیٰ کا دِین جو اِس وقت سرورِ کائنات ﷺ پر اُترا یہی قابلِ اتباع ہے، اور اس کے مقابلے میں باقی سب

چیزیں منسوخ ہوگئیں۔ ہاں! البتہ توراۃ کی کوئی بات قرآنِ کریم نقل کردے یا سرورِ کائنات ﷺ پچھلی شریعتوں کی کوئی بات نقل کردیں اور اس کے اُوپر انکار نہ فرمائیں، تعریف کے عنوان میں نقل کریں تو وہ ہمارے لیے حجت ہیں، لیکن شریعتِ موسوی یا شریعتِ عیسوی کے اعتبار سے نہیں، قرآن میں نقل ہونے کے بعد یا سرورِ کائنات ﷺ کے بیان میں آجانے کے بعد وہ اب شریعتِ محمدی میں داخل ہوگئی، ہم ان کو مانیں گے تو اس لئے مانیں گے کہ یہ شریعتِ محمدی ہے، چنانچہ اُصولِ فقہ کے اندر جو دلائل شرعی ہیں، جن کے ساتھ حکم ثابت ہوا کرتا ہے، یہ چار جو ذکر کیے جاتے ہیں: کتابُ اللہ، سُنّتِ رسول اللہ، اجماع اور قیاس، اس کے ساتھ ہی شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا کا ذکر بھی آیا کرتا ہے، ہم سے پہلے لوگوں کے طریقے، وہ بھی ہمارے لیے حجت ہیں بشرطیکہ اللہ اور اللہ کے رسول کے بیان میں آجائیں اور اس کے خلاف کوئی حکم ثابت نہ ہو، تو جب وہ اللہ کے بیان میں آجائیں کتاب اللہ میں اس کے اوپر اِنکار نہ ہو، یا سرورِ کائنات ﷺ کے بیان میں آجائیں، اور اس کے اوپر اِنکار نہ ہوا ہو، اور اس کے خلاف ہدایات نہ دی گئی ہوں تو ہم ان شَرَائِعُ مَنْ قَبْلَنَا کو مانیں گے لیکن اس حیثیت سے مانیں گے کہ یہ ہماری شریعت ہے اور سرورِ کائنات ﷺ کا دِین ہے۔ اور یہ بات بھی اِس میں واضح ہوگئی کہ شریعت کے خلاف اگر کوئی ایسا حکم ہے جو انبیاء ﷩ کی وساطت سے پہلے لوگوں کے پاس آیا تھا، یعنی بِاَصلِہٖ وہ اللہ کا حکم تھا اللہ کی کتاب کے مطابق تھا، شریعتِ محمدی کے خلاف ہوجانے کے بعد اس کی اتباع بھی جائز نہیں، اور اس کی اتباع کرنا یہ بھی اتباع ہویٰ ہے، تو ہم لوگ جو اپنے طور پر ذہنی طور پر طریقے تجویز کرلیتے ہیں یا خاندان کے اندر جس قسم کی رُسوم اور رواج جاری ہیں اور وہ شریعت کے خلاف ہیں تو ان کی اِتباع بدرجۂ اَولیٰ اِتباعِ ہویٰ ہوگی، اگر حضور ﷺ کے تشریف لے آنے کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئیں تو ان کی بات بھی نہیں مانی جائے گی، جس طرح سے حدیث شریف میں صاف آتا ہے: ''لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا مَا وَسِعَهٗ إِلَّا اتِّبَاعِيْ''[1] اگر موسیٰ علیہ السلام بھی زندہ ہوجائیں تو اُن کے لئے بھی میری اتباع کے علاوہ کوئی گنجائش نہیں ہے، ان کو بھی میری ماننی پڑے گی، اپنی شریعت لوگوں کے سامنے وہ پیش نہیں کرسکتے، اور ایک روایت میں آتا ہے کہ اگر موسیٰ علیہ السلام تشریف لے آئیں اور تم لوگ موسیٰ کے پیچھے لگ جاؤ مجھے چھوڑ کر ''لَضَلَلْتُمْ'' تو تم گمراہ قرار پاؤ گے۔[2] یعنی جس میں یہ واضح ہوگیا کہ سرورِ کائنات ﷺ کے تشریف لے آنے کے بعد آپ ﷺ کی ہدایات کے خلاف چلنا درست نہیں ہے، تو اگر آپ ﷺ کی شریعت کے خلاف موسیٰ علیہ السلام کی اتباع ایک ضلالت ہے، اور آپ کی شریعت کے بعد اگر توراۃ اور انجیل کی اِتباع ضلالت ہے ان اَحکام میں جو کہ حضور ﷺ کی شریعت کے خلاف ہیں تو پھر یہ اَیرے غیرے کے تجویز کردہ طریقے اور تجویز کردہ رُسوم، اِن کی اتباع کس طرح سے گمراہی قرار نہیں پائے گی؟ یہ سب بے علمی کی باتیں ہیں، اور شریعت کے خلاف کسی بات کو مان لینا ایسے ہی ہے گویا کہ آپ نے علم کو جہالت کے تابع کردیا، تو اس میں حیثیت نمایاں ہوگئی شریعت کی، ''ہم نے آپ کے لئے

---

(۱) مشکوٰۃ ۳۰/۱، باب الاعتصام، فصل ثانی، عن جابر واللفظ لہ۔ مسند احمد رقم: ۱۴۶۳۱۔ ولفظ احمد: لَوْ كَانَ مُوْسٰى حَيًّا بَيْنَ أَظْهُرِكُمْ مَا حَلَّ لَهٗ إِلَّا أَنْ يَّتَّبِعَنِيْ

(۲) مسند احمد رقم: ۱۵۸۶۴۔ ۱۸۳۳۵ / سنن دارمی ۱۸۲/۱، رقم: ۴۴۹ / مشکوٰۃ ۳۲/۱ باب الاعتصام فصل ثالث، عن جابر

دین کا ایک واضح طریقہ بتادیا، آپ اسی کی اتباع کیجئے، اور ان لوگوں کی خواہشات پر نہ چلیے جو کہ بے علم ہیں'' تو دین کے خلاف بات کرنے والا لَا یَعۡلَمُوۡنَ کا مصداق ہی ہوتا ہے۔

اہلِ ہویٰ کی اِتباع کا کچھ فائدہ نہیں

اِنَّهُمۡ لَنۡ یُّغۡنُوۡا عَنۡكَ مِنَ اللّٰهِ شَیۡـًٔا: بسا اوقات انسان دِین کے خلاف دوسرے کی بات اس لیے مانتا ہے کہ اس سے کوئی نفع متعلق ہے یا اُس سے کوئی ضرر کا اندیشہ ہے، جانتے بوجھتے ہوئے کہ یہ شریعت کا حکم ہے پھر بھی دوسرے کی بات انسان اگر مانتا ہے تو بسا اوقات یہ جذبہ ہوتا ہے، کہ اُس سے نفع حاصل ہونے کی توقع ہے یا اس لیے مانتا ہے کہ اگر نہیں مانیں گے تو ضرر پہنچنے کا اندیشہ ہے، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جو اَہواء کے متبع ہیں اور دِین کے اور شریعت کے خلاف باتیں بتلاتے ہیں یہ ہرگز تیرے کام نہیں آئیں گے اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، اللہ کے مقابلے میں یہ کچھ بھی کام نہیں آئیں گے اس لیے ان لوگوں کی پروا نہیں کرنی چاہیے، اللہ کے اَحکام کی اتباع کرنی چاہیے۔ وَاِنَّ الظّٰلِمِیۡنَ بَعۡضُهُمۡ اَوۡلِیَآءُ بَعۡضٍ: بے شک ظالم بعض بعض کے دوست ہیں،'' اور اللہ دوست ہے متقین کا'' اگر آپ اللہ کی ولایت حاصل کرنا چاہتے ہیں تو اس کا طریقہ تقویٰ ہے، اور اگر تقویٰ اختیار نہیں کرو گے اللہ کی شریعت کے خلاف چلو گے تو ظالم بن گئے، پھر ظالموں کا ظالموں کے ساتھ تو جوڑ ہو سکتا ہے، اللہ کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

عظمتِ قرآن

هٰذَا بَصَآئِرُ لِلنَّاسِ: بصائر یہ بصیرۃ کی جمع ہے، بصیرت اصل کے اعتبار سے دل کی روشنی کو کہتے ہیں، اور یہ باتیں جو کہ دل کے اندر بصیرت پیدا کرنے کا ذریعہ ہیں ان کو بھی بصائر کہہ دیا جاتا ہے، حاصل ترجمہ اس کا کرلیا جاتا ہے روشن دلائل، کیونکہ روشن دلائل کے ذریعہ سے دل کے اندر بصیرت پیدا ہوتی ہے۔'' یہ قرآنِ کریم لوگوں کے لئے روشن دلائل ہیں، دلائل کا مجموعہ ہے، اور راہنمائی ہے اور رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو کہ یقین لاتے ہیں'' هُدًی اور رحمت یہ لفظ بھی بار بار آتے ہیں، هُدًی کا مطلب ہوا کہ یہ راہنمائی ہے اور جس وقت اِس سے راہنمائی حاصل کی جائے گی اور اِس کے مطابق چلیں گے تو پھر اللہ کی رحمت حاصل ہوتی ہے۔ لیکن یہ فائدہ کون لوگ اٹھاتے ہیں؟ جو یقین لے آئیں کہ واقعی یہ اللہ کی باتیں ہیں اور اِن کی اتباع میں فائدہ ہے، وہی اِس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

معاد پر عقلی دلیل

آگے ذکر آ گیا معاد کا! اَمۡ حَسِبَ الَّذِیۡنَ اجۡتَرَحُوا السَّیِّاٰتِ: کیا سمجھ لیا ہے ان لوگوں نے جو کہ بُرے کام کرتے ہیں، اِجۡتَرَحَ، مَا جَرَحۡتُمۡ بِالنَّهَارِ (سورۂ انعام: ۶۰)، جَرَحَ کَسَبَ کے معنی میں،'' جو لوگ بری بری حرکتیں کرتے ہیں کیا اُن لوگوں نے سمجھ

لیا ہے؟ کہ ہم بنادیں گے اُنہیں ان لوگوں کی طرح جو کہ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں' سَوَآءً مَّحْیَاهُمْ وَمَمَاتُهُمْ: برابر ہوگی ان کی زندگی اور ان کی موت؟ سَآءَ مَا یَحْكُمُوْنَ: بہت بُرا فیصلہ کرتے ہیں۔ یہ ایک بہت ہی سادی سی دلیل کے ساتھ آخرت کی ضرورت کو اس میں سمجھایا گیا ہے، حاصل اس کا یہ ہے کہ دنیا کے اندر آپ لوگوں کے حالات پہ غور کرتے ہیں تو بعض لوگ آپ کو اس قسم کے ملتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرتے ہیں، اپنے اوپر مختلف قسم کی ذمہ داریاں انہوں نے ڈال رکھی ہیں، حلال اور حرام میں امتیاز کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اپنی نیند چھوڑتے ہیں، گرمی سردی کی تکلیف برداشت کرتے ہیں، اپنی شہوات کے اوپر انہوں نے پابندی لگا رکھی ہے، کچھ اس قسم کے لوگ بھی آپ کو نظر آئیں گے جو صبح شام مجاہدے میں لگے ہوئے ہیں، حلال کماتے ہیں اور حلال کمانے میں اپنے خون پسینے کو ایک کرتے ہیں، محنت مزدوری سے اپنا اور اپنے بچوں کا پیٹ پالتے ہیں، شبہات تک سے بچتے ہیں، ان کی زندگی آپ کو کسی کسائی معلوم ہوتی ہے، جس طرح سے کہ قیدی کی زندگی ہوا کرتی ہے، اور ایک آدمی آپ کو اس قسم کا نظر آئے گا جو بالکل ہی ڈھوروں ڈنگروں کی طرح اپنا وقت گزار رہا ہے، اس کو پیٹ بھرنے کے لئے کوئی لذیذ چیز چاہیے، یہ فکر نہیں ہے کہ یہ حرام ہے یا حلال؟، جو کام کرنے کو جی چاہتا ہے وہ کر لیتا ہے، بالکل آزاد زندگی گزارتا ہے، محنت نہیں کرتا، مزدوری نہیں کرتا، جس وقت پیسوں کی ضرورت پیش آتی ہے کسی کی جیب کاٹ لیتا ہے، کسی جگہ ڈاکا ڈال لیتا ہے، چوری کر لیتا ہے، لوگوں کی کمائی سے وہ اپنی عیاشی کے سامان مہیا کرتا ہے، اور اپنے مقصد کو پورا کرنے کے لئے ہر غلط سے غلط طریقہ اختیار کر لیتا ہے، اپنی پیاس بجھانے کے لئے وہ دوسرے کا خون تک پی جاتا ہے، اور اپنا پیٹ بھرنے کے لئے وہ یتیموں کا قیمہ کھانے سے بھی کوئی پرہیز نہیں کرتا۔ اب یہ دو قسم کے لوگ ہیں، اگر آخرت نہ ہو، مرنے کے بعد دوبارہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر کوئی جزا اور سزا کا سلسلہ اگر نہیں ہے، تو پھر بظاہر معلوم یہ ہوگا کہ جس شخص نے دنیا کے اندر اپنی خواہشات کو پورا کر لیا اچھا کھا لیا اچھا پہن لیا اور عیش کا وقت گزار لیا تو کامیاب یہ شخص ہے، اور جس نے یہاں دنیا کے اندر پابندیاں برداشت کیں، مرنے کے بعد وہ بھی مٹی ہو جائے گا، یہ بھی مٹی ہو جائیں گے، تو انجام دونوں کا برابر ہو گیا۔ اب یہ عقل کس طرح سے گوارہ کر سکتی ہے؟ کہ خیر اور شر کا سلسلہ سرے سے مٹ جائے، خیر اور شر رہے ہی نہ، اگر آخرت کے عقیدے کو انسان اپنے پروگرام سے خارج کر دے تو دُنیا کے اندر خیر وشر کا کوئی معیار نہیں ہے، پھر خیر وہی ہے جو اپنی خواہش کے مطابق ہے اور شر وہ ہے جو اپنی خواہش کے خلاف ہے۔ تو دُنیا کے اندر خیر وشر کا سلسلہ یہ تبھی پائیدار ہے کہ جب اس کے انجام کا عقیدہ رکھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے پیش ہو کر ہم نے اپنے اعمال کی جزا سزا پانی ہے اور برداشت کرنی ہے، تب جا کر خیر اور شر کا سلسلہ مستقل ہو سکتا ہے، اور مرنے کے بعد اگر سب نے مٹی ہو جانا ہے تو پھر اس خیر وشر کے سلسلے کے باقی رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ تو اللہ تعالیٰ یہاں یہی بتاتے ہیں کہ بدکردار لوگ جو یہ سمجھتے ہیں کہ مرنے کے بعد اللہ کے سامنے پیش نہیں ہونا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد یہ مؤمن عمل صالح کرنے والے اور یہ بُرائیاں کرنے والے سب برابر ہو جائیں گے؟، ان کی زندگی موت ایک ہی جیسی ہوگی؟ مؤمن کی زندگی اور مؤمن کی موت برابر

ہو جائے کہ جس طرح سے زندگی میں یہ خواہشات سے محروم رہالذات سے محروم رہا تو مرنے کے بعد بھی محروم، اور کافر کی زندگی اور موت برابر ہو جائے کہ جس طرح سے یہاں اس کو پوچھنے والا کوئی نہیں تھا تو مرنے کے بعد بھی پوچھنے والا کوئی نہ ہو، ایسا نہیں ہوگا، مؤمن کی اور کافر کی زندگی میں بھی فرق ہے، مؤمن کی اور کافر کی موت میں بھی فرق ہے، جس نے یہاں اللہ کی مرضی کے مطابق وقت گزارا ہے مرنے کے بعد اللہ تعالیٰ اس کو اس کی مرضی کے مطابق عیش وعشرت دیں گے، اور جس نے اس زندگی کے اندر اپنی مرضی کے مطابق وقت گزارا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس شخص کے مرنے کے بعد اس کی کسی مرضی کی رعایت نہیں رکھیں گے بلکہ اپنی مرضی کے مطابق اس کو سزا دیں گے۔

عقیدۂ آخرت سے اعمال میں توازن پیدا ہوتا ہے

یہ عقیدہ ہے جو انسان کے عمل کے اندر توازن پیدا کرتا ہے، جس کے ساتھ اس دنیا کا نظم قائم رہ سکتا ہے، ورنہ اس عقیدے کو اگر اٹھا دیا جائے تو دنیا کے اندر نظم قائم نہیں رہ سکتا، کیونکہ جرم انسان کرتا ہے، بسا اوقات تو حکومت کے علم میں ہی نہیں آتا کہ یہ جرم کس نے کیا، اور اگر علم میں آجاتا ہے تو مجرم پکڑا نہیں جا سکتا، بھاگ جاتے ہیں، چھپ جاتے ہیں، ہاتھ میں نہیں آتے ہیں، اور اگر پکڑے بھی جاتے ہیں تو یہاں دنیا کے اندر ہزاروں طریقے چھوٹنے کے ہیں، سفارش اور رشوت وغیرہ کے ذریعے سے مجرم سزا سے بچ جاتا ہے، تو زندگی ایک مجرمانہ زندگی ہو جاتی ہے، معاشرہ کسی حال میں بھی درست نہیں ہو سکتا، اور آخرت کے عقیدے کے تحت انسان چھپ کر بھی جرم کرنے سے بچتا ہے، اُس کو اگر سو فیصد یقین ہو کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا تو بھی وہ جرم کرنے سے بچے گا، کیونکہ اسے پتا ہوگا کہ اگر حکومت نہیں دیکھ رہی یا حکومت کے نمائندے مجھے نہیں پکڑ سکیں گے تو اللہ تعالیٰ تو دیکھ رہا ہے، اور اس کے فرشتے میرے ساتھ لگے ہوئے ہیں، تو اللہ کی عدالت سے میں کسی صورت بھی نہیں بچ سکتا، تو یہ عقیدہ انسان کے عمل میں اور اخلاق میں توازن پیدا کرتا ہے۔ تو یہ ایک بہت سادی سی دلیل ہے جس کے ساتھ یہاں آخرت کی ضرورت کو پیش کیا گیا ہے۔

وَخَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بِالْحَقِّ وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۢ بِمَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا

اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو مصلحت کے ساتھ، اور تاکہ بدلہ دیا جائے ہر نفس اپنے کیے کا، اور وہ ظلم نہیں

يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۲﴾ اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ وَّ

کیے جائیں گے ﴿۲۲﴾ کیا پھر آپ نے ایسے شخص کو دیکھا کہ جس نے اپنا اِلٰہ اپنی خواہش کو بنالیا، اور اللہ نے اس کو بھٹکا دیا باوجود علم کے اور

خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً ؕ فَمَنْ يَّهْدِيْهِ مِنْۢ بَعْدِ اللّٰهِ ؕ

اللہ نے مُہر لگا دی اس کے کانوں پر اور اس کے دِل پر اور کر دیا اس کی آنکھ کے اُوپر پردہ، پھر کون اس کو ہدایت دے سکتا ہے اللہ کے بعد؟

أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٢٣﴾ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَ

کیا تم نصیحت نہیں حاصل کرتے؟ ﴿٢٣﴾ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ مگر ہماری دُنیوی زندگی، ہم مرتے ہیں، زندہ ہوتے ہیں،

مَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ ۚ وَمَا لَهُم بِذَٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ ۖ إِنْ هُمْ إِلَّا يَظُنُّونَ ﴿٢٤﴾ وَإِذَا

نہیں ہلاک کرتا ہمیں مگر زمانہ، اُن کو اِس بات کا کوئی علم نہیں، نہیں ہیں وہ مگر محض توہم کرتے ﴿٢٤﴾ اور جب

تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا بَيِّنَاتٍ مَّا كَانَ حُجَّتَهُمْ إِلَّا أَن قَالُوا ائْتُوا بِآبَائِنَا إِن كُنتُمْ

ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں واضح واضح تو نہیں ہوتی ان کی دلیل مگر یہی کہ کہتے ہیں کہ لے آؤ ہمارے آباء کو اگر تم

صَادِقِينَ ﴿٢٥﴾ قُلِ اللَّهُ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يَجْمَعُكُمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ

سچے ہو ﴿٢٥﴾ آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی زندگی دیتا ہے پھر وہی موت دیتا ہے پھر وہی اکٹھا کرے گا تمہیں قیامت کے دن کی طرف

لَا رَيْبَ فِيهِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٢٦﴾ ع

جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، لیکن اکثر لوگ جانتے نہیں ﴿٢٦﴾

تفسیر

وَخَلَقَ اللَّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ: اللہ تعالیٰ نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو حق کے ساتھ، مصلحت کے ساتھ، یہ باطل نہیں ہیں کہ بیکار ہوں، لِيَدُلَّ عَلٰى قُدْرَتِهٖ یہ معطوف علیہ نکلے گا، وَلِتُجْزٰى كُلُّ نَفْسٍۭ بِمَا كَسَبَتْ: تاکہ یہ اللہ کی قدرت پر دلالت کریں اور تاکہ بدلہ دیا جائے ہر نفس اپنے کیے کا، وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ: اور وہ ظلم نہیں کیے جائیں گے۔

اتباعِ خواہشات کی مذمت اور اس کا نتیجہ

اَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ: کیا پھر آپ نے ایسے شخص کو دیکھا کہ جس نے اپنا اِلٰہ اپنی خواہش کو بنالیا؟ وہ اپنی خواہش کا پجاری ہے، وَاَضَلَّهُ اللّٰهُ عَلٰى عِلْمٍ: اور اللہ نے اس کو بھٹکا دیا باوجود علم کے، کہ وہ شخص سمجھ دار ہے جانتا سب کچھ ہے لیکن اس کے باوجود وہ بھٹک گیا، بھٹکانے کی نسبت اللہ کی طرف اس لیے ہوگئی کہ خالق ہر چیز کا وہی ہے، ''اور اللہ نے مُہر لگادی اس کے کانوں پر اور اس کے دل پر، اور کردیا اس کی آنکھ کے اوپر پردہ، پھر کون اس کو ہدایت دے سکتا ہے اللہ کے بعد؟'' اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ: کیا تم یاد نہیں رکھتے؟ کیا تم اِس بات کو سمجھتے نہیں ہو؟ نصیحت نہیں حاصل کرتے؟ اِتخاذِ اِلٰہ، اِلٰہ اختیار کرلیا، اب لوگ پُوجتے ہیں اللہ کے

علاوہ کسی دوسری چیز کو، تو اس میں فرشتے بھی ہیں، جنات بھی ہیں، پتھر اور لکڑی تک کی لوگوں نے پوجا کی، پانی اور آگ تک کو لوگوں نے سجدے کیے، چاند سورج کو لوگوں نے پکارا، اور ان کو اپنا کارساز سمجھا اور ان کو اِلٰہ قرار دیا، انبیاء ﷺ نے اِن سب کی تردید کی، تو موحد بننے کے لئے یہ ضروری ہوا کہ ان سب چیزوں سے انسان دست بردار ہو جائے اور اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کو اِلٰہ نہ سمجھے، لیکن توحید کا کمال یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو بھی اللہ کے مقابلے میں مطاع نہ قرار دے، کیونکہ عبادت کا حاصل ہے اطاعتِ مطلقہ، اور اگر کوئی شخص اپنے نفس کی اطاعتِ مطلقہ کرتا ہے، کہ جو جی میں آیا اُسی کے مطابق کرے، جو خواہش پیدا ہوئی اُسی کو پورا کرے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے آپ کو اِلٰہ کے مقام پر کھڑا کر لیا، تو جس طرح سے باہر کی چیزوں کو پوجنا شرک ہے، اسی طرح سے اپنے نفس کی پوجا اور اپنی خواہشات کی پوجا یہ بھی باطنی شرک ہے، تو کامل درجے کا موحد وہی شخص ہوا کرتا ہے جو کہ اللہ کے احکام کے مقابلے میں اپنی خواہشات تک کو مٹا دیتا ہے، اور یہی چیز ہے جو کہ دِین کے اندر مجاہدے اور ریاضت کے بعد انسان کو حاصل ہوتی ہے، کہ قلب کے اندر جتنے قسم کے بُرے بُرے جذبات ہیں، ایک ایک کو سمجھا جائے، اور ایک ایک کو سمجھنے کے بعد شریعت کے مطابق ان کو بنایا جائے، اور بُرے جذبات کی اتباع نہ کی جائے، اور یہ ''اللہ اللہ'' کی کثرت اور ''لا اِلٰہ اِلَّا اللہ'' کی ضربیں یہی چیز ہیں جن کے ساتھ انسان کے قلب کے اندر خواہشات فنا ہوتی ہیں، اور ان خواہشات کے فنا ہونے کے بعد حقیقی توحید انسان کو حاصل ہوتی ہے، اسی کو ہی کسی شاعر (علامہ اقبالؒ) نے اپنے الفاظ میں ادا کیا کہ:

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے
ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں
(''بانگِ درا''، بعنوان: ''طلوعِ اسلام'')

یعنی اتباعِ ہویٰ کے ساتھ بھی مختلف قسم کے معبود قلب میں پیدا ہو جاتے ہیں، اور ابراہیمی نگاہ تاڑتی ہے کہ کون کون سی چیزیں ایسی ہیں جو اللہ کی توحید کے خلاف ہیں، اور پھر اُن کو مٹایا جاتا ہے، وہ تصویریں جو قلب کے اندر بن جاتی ہیں جب تک ان کو نہ مٹایا جائے اس وقت تک انسان کامل درجے سے موحد نہیں بن سکتا، اسی لیے تفسیر مظہری والے جس طرح سے کہتے ہیں کہ ''فَالْمُوَحِّدُوْنَ هُمُ الصُّوْفِيَّةُ''(۱) یہ بالکل ایک حقیقی بات ہے، کہ صحیح معنی میں موحد صوفی ہوتا ہے، کہ جو ظاہر میں بھی کسی کی پوجا نہیں کرتا اور باطن میں بھی اپنی شہوات کا متبع نہیں، ظاہر کی دنیا میں اور باطن میں ہر وقت وہ اللہ کی اطاعت کی طرف متوجہ رہتا ہے، تصوّر اور دھیان ہے تو اللہ کا، اطاعت ہے تو اللہ کی، تب جا کے توحید کامل ہوتی ہے، ورنہ اور نہیں تو انسان اپنے نفس کا پجاری ہو جاتا ہے۔ اور اسی مضمون کو سرورِ کائنات ﷺ نے اُس روایت کے اندر واضح فرمایا: ''لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يَكُوْنَ هَوَاهُ

(۱) تفسیر مظہری سورۂ یوسف آیت ۱۰۶ کے تحت۔

تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِهٖ "(۱) تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش اس دین کے تابع نہ ہو جائے جس کو کہ میں لے کر آیا ہوں۔ تو اِتباعِ خواہش، اِتباعِ ہوئی اور انسان کا اپنے نفس کی خواہشات کے پیچھے چلنا یہ بھی توحید کے خلاف ہے اور یہ بھی شرک کی ایک قسم ہے۔ تو بسا اوقات انسان جانتا سب کچھ ہے لیکن اپنے دل کی خواہش کے مطابق وہ سیدھے راستے کو چھوڑ دیتا ہے، اسی کی یہاں مذمت کی گئی۔ اور پھر اتباعِ ہوئی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے، خواہش پرستی انسان کو یہاں تک پہنچا دیتی ہے، کہ پھر اپنی خواہشات کے خلاف نہ کسی بات کو سننے کے لئے تیار ہوتا ہے، نہ دیکھنے کے لئے تیار ہوتا ہے، اور نہ اپنے دل میں اُس خواہش کے خلاف سوچنے کے لئے تیار ہوتا ہے، تو اتباعِ ہوئی کے نتیجے میں ساری صلاحیتیں اس کی ختم ہو جاتی ہیں، خَتَمَ عَلٰى سَمْعِهٖ وَقَلْبِهٖ وَجَعَلَ عَلٰى بَصَرِهٖ غِشٰوَةً کے اندر اسی مضمون کو ادا کیا گیا ہے، جتنا آپ خواہشات کے خلاف چلیں گے اتنی صلاحیت انسان میں بڑھتی ہے، اور جتنا خواہشات کے مطابق چلیں گے اتنی حیوانیت ترقی پاتی ہے اور انسانی صلاحیتیں ختم ہو جاتی ہیں۔

.مانے کی طرف نسبت کرنے میں اللہ کے قائل اور منکر کا فرق

وَقَالُوْا: اب یہ منکرینِ آخرت کا ذکر آ گیا، وَقَالُوْا مَا هِیَ اِلَّا حَیَاتُنَا الدُّنْیَا نَمُوْتُ وَنَحْیَا: اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ نہیں ہے یہ مگر ہماری دُنیوی زندگی، ہم مرتے ہیں زندہ ہوتے ہیں، وَمَا یُهْلِكُنَاۤ اِلَّا الدَّهْرُ: نہیں ہلاک کرتا ہمیں مگر زمانہ، وَمَا لَهُمْ بِذٰلِكَ مِنْ عِلْمٍ: اُن کو اس بات کا کوئی علم نہیں، اِنْ هُمْ اِلَّا یَظُنُّوْنَ: نہیں ہیں وہ مگر محض توہم کرتے، توہمات کے اندر مبتلا ہیں، ظن وتخمین کے ساتھ یہ باتیں کرتے ہیں، اِن کے اِس دعوے کے لئے اِن کے پاس دلیل کوئی نہیں۔ یہ مشرکین کا قول نقل کیا، جس کا حاصل یہ ہے کہ ہماری موت وحیات اللہ کی تقدیر کے تحت نہیں، بلکہ زمانے کی گردش سے ہے، جس طرح سے ایک وقت آتا ہے کہ نباتات پیدا ہوتی ہے، بڑھتی ہے، ایک وقت آتا ہے کہ سوکھ جاتی ہے، پتے جھڑ جاتے ہیں، نیست و نابود ہو جاتی ہے، تو یہی حال ہمارا ہے، دِن رات کی گردش کے ساتھ ہم پیدا ہوئے، جوان ہوئے، بوڑھے ہوئے، آخر ہماری صلاحیتیں ختم ہو گئیں، ہم مر جاتے ہیں، بس یہی چکر ہے، باقی! مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا کوئی نہیں ہے، دہر کی طرف اس کو نسبت کیا، دہر زمانے کو کہتے ہیں، اور آپ جانتے ہیں کہ یہ زمانہ، یہ دِن رات کا چکر، آخر یہ بھی اللہ کے ہاتھ میں ہی ہے، "بِیَدِیَ الْاَمْرُ اُقَلِّبُ اللَّیْلَ وَالنَّهَارَ "(۲) اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ سارا معاملہ تو میرے ہاتھ میں ہے، دِن رات کو چکر تو میں ہی دیتا ہوں، اس لیے زمانے کی طرف نسبت کر کے زمانے کو بُرا کہنا اس کی ممانعت حدیث شریف میں آئی ہے، سرورِ کائنات ﷺ فرماتے ہیں حدیث قدسی ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں "یُؤْذِیْنِیْ ابْنُ اٰدَمَ یَسُبُّ الدَّهْرَ" آدم کا بچہ مجھے تکلیف دیتا ہے جب وہ زمانے کو بُرا بھلا کہتا ہے، "اَنَا الدَّهْرُ" زمانہ تو میں ہی ہوں، "بِیَدِیَ الْاَمْرُ"

(۱) شرح السنۃ للبغوی ۲۱۳/۱، رقم: ۱۰۴/ مشکوۃ ۳۰/۱ باب الاعتصام فصل ثانی، عن عبد اللہ بن عمرو۔

(۲) بخاری ۷۱۵/۲، کتاب التفسیر، سورۃ الجاثیۃ/ مشکوۃ ص ۱۳۔

معاملہ سارا میرے ہاتھ میں ہے، ''اُقَلِّبُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ'' دن رات کو چکر میں دیتا ہوں (حوالہ مذکورہ)۔ مطلب اس کا یہ ہے کہ جب کوئی شخص زمانے کی طرف نسبت کر کے کسی واقعے کو بیان کرتا ہے تو حقیقت کے اعتبار سے متصرف کی طرف نسبت ہوتی ہے، اگرچہ وہ اپنی غلط فہمی کے ساتھ زمانے کو متصرف قرار دے رہا ہے، اور حقیقت کے اعتبار سے متصرف اللہ ہے، تو زمانے کی طرف کسی واقعے کی نسبت کر کے زمانے کو بُرا کہنا یہ اصل میں متصرف کو بُرا کہنا ہے، جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہاں ناراضگی کا اظہار فرمایا۔ لیکن جو اللہ کے قائل ہی نہیں یا اللہ کی تقدیر کے قائل نہیں ہیں وہ تو ہر بات کی زمانے کی طرف ہی نسبت کرتے ہیں کہ یہ دن رات کا چکر ہے جس کے ساتھ اس قسم کے معاملات سامنے آتے ہیں، تو ان کو ''دہریہ'' کہا جاتا ہے، تو ''دہریہ'' کہنے کی وجہ سے ہم ان کو در پردہ اللہ والے نہیں سمجھیں گے، کہ جس وقت ''دہر'' ''اللہ'' کو کہہ دیا تو جو ''دہری'' ہے وہ ''اللہ والا'' ہو گیا، ایسی بات نہیں ہے، یہ لوگ اللہ کی طرف نسبت کے قائل نہیں، دہر کی طرف نسبت کر کے اللہ مراد تو وہی شخص لے گا کہ جو اللہ تعالیٰ کو متصرف سمجھے، ان کو کہا جا رہا ہے کہ تم زمانے کی طرف نسبت کر کے کسی چیز کو بُرا نہ کہا کرو، کیونکہ تمہیں پتا تو ہے کہ سارا تغیر، تصرّف میرے ہی ہاتھ میں ہے۔ لیکن جو اللہ کے حکم کے قائل نہیں، اللہ کی تقدیر کے قائل نہیں، یہ جو ''دہری'' ہیں، تو ان کا یہ درجہ نہیں ہوا کرتا، کہ ''دہر'' کی طرف نسبت کرنا یہ اللہ کی طرف ہی نسبت کرنا ہو گیا، یہ مشرکین جو تھے یہ موت و حیات کو اسی طرح سے سمجھتے تھے کہ یہ بخت و اتفاق کا نتیجہ ہے، جس طرح سے نباتات پھوٹتی ہیں اسی طرح سے ہم ہیں، یہاں ان کی مذمت کی گئی ہے۔ اور یہ ان کا دعویٰ کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ نہیں ہونا، محض ایک وہم ہے، اس پر اُن کے پاس علمی دلیل کوئی نہیں، وہ یہ ثابت نہیں کر سکتے کہ ایک دفعہ زندگی ختم ہونے کے بعد دوبارہ زندگی نہیں آسکتی، اِس دعوے پر اُن کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے، جبکہ اللہ تعالیٰ نے دلائل دے دے کر اپنے ساری کتاب کو بھرا ہوا ہے کہ میری قدرت کے سامنے یہ کوئی چیز بعید نہیں ہے کہ ایک دفعہ زندگی دینے کے بعد میں پھر اس کو دوبارہ زندگی دے دوں، موت واقع کرنے کے بعد دوبارہ اس میں زندگی پیدا کر دی جائے اللہ تعالیٰ کی قدرت کے سامنے یہ کوئی چیز مشکل نہیں ہے، اور یہ دعویٰ کہ جب ایک دفعہ مر گئے تو دوبارہ زندہ نہیں ہو سکتے، اُن کے پاس اس دعوے کی کوئی دلیل نہیں ہے، بلکہ یہ دلیل کے خلاف ہے، یہی کہا جا رہا ہے کہ اس بات کا اُن کو کوئی علم نہیں، بے علمی کی باتیں کرتے ہیں، محض توہمات ہیں۔ ''اور جب ان پر ہماری آیات پڑھی جاتی ہیں واضح واضح'' جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا حق ہے، تو پھر اس کے جواب کے طور پر یہ صرف یہی بات کہتے ہیں، مَا كَانَ حُجَّتَهُمْ: نہیں ہوتی ان کی دلیل مگر یہی کہتے ہیں کہ لے آؤ ہمارے آباء کو اگر تم سچے ہو، اگر تمہارا یہ دعویٰ سچا ہے تو ہمارے آباء کو لے آؤ۔ ''آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی زندگی دیتا ہے پھر وہی موت دیتا ہے، اور وہی اکٹھا کرے گا تمہیں قیامت کے دن کی طرف جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں'' وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن اکثر جانتے نہیں ہیں، جس میں اس بات کو واضح کر دیا گیا کہ زندگی موت تو واقعی اللہ کے ہاتھ میں ہے، زندگی بھی وہی دیتا ہے موت بھی وہی دیتا ہے، لیکن سب کو اکٹھا کرنا اللہ تعالیٰ

نے اپنی حکمت کے تحت قیامت کے دن تک مؤخر کر رکھا ہے، قیامت آئے گی، اس کے آنے میں کوئی کسی قسم کا شبہ نہیں، پھر سب کو زندہ کر کے دکھا دیا جائے گا، دنیا کے اندر کسی کے کہنے سے مردے کو زندہ کر کے کھڑا کر دیں، یہ اللہ کی حکمت نہیں ہے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے مطالبہ ایمان بالغیب کا ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ يَوْمَىِٕذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿۲۷﴾

اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، جس دن کہ قیامت قائم ہوگی اس دن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے ﴿۲۷﴾

وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً ۣ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا ۭ اَلْيَوْمَ

اور تُو دیکھے گا ہر جماعت کو گھٹنے ٹیکے ہوئے، ہر جماعت کو بلایا جائے گا اس کے نامۂ اعمال کی طرف، آج

تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۸﴾ هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ ۭ اِنَّا كُنَّا

بدلہ دیئے جاؤ گے تم ان کاموں کا جو تم کیا کرتے تھے ﴿۲۸﴾ یہ ہماری کتاب ہے جو بولتی ہے تم پر ٹھیک، بے شک ہم

نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۲۹﴾ فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

لکھواتے رہتے تھے ان کاموں کو جو تم کرتے تھے ﴿۲۹﴾ پھر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے

فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۳۰﴾ وَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۣ

داخل کرے گا ان کو ان کا رَبّ اپنی رحمت میں، یہ بہت واضح کامیابی ہے ﴿۳۰﴾ اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا (انہیں کہا جائے گا)

اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ فَاسْتَكْبَرْتُمْ وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿۳۱﴾ وَاِذَا قِيْلَ

کیا ہماری آیات تم پر پڑھی نہیں جاتی تھیں؟ پھر تم تکبر کرتے تھے اور تم مجرم لوگ تھے ﴿۳۱﴾ اور جب کہا جاتا تھا

اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ

کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے اور قیامت بھی ٹھیک ہے، اس کے آنے میں کوئی شک نہیں، تو تم کہا کرتے تھے ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے،

اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ ﴿۳۲﴾ وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا وَ

نہیں خیال کرتے ہم مگر سرسری سا خیال کرنا اور ہمیں یقین بالکل نہیں ہے ﴿۳۲﴾ اور ظاہر ہو گئیں ان کے لئے ان کے اعمال کی برائیاں، اور

حَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝۳۳ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ كَمَا نَسِيْتُمْ

گھیر لیا ان کو اس چیز نے جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے ۝۳۳ اور کہا جائے گا کہ آج ہم تمہیں بھلاتے ہیں جس طرح سے تم نے اس

لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا وَمَاْوٰىكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝۳۴ ذٰلِكُمْ بِاَنَّكُمُ اتَّخَذْتُمْ اٰيٰتِ

دن کی ملاقات کو بھلا رکھا تھا، تمہارا ٹھکانا جہنم ہے اور تمہارے لئے کوئی مددگار نہیں ۝۳۴ یہ اس وجہ سے ہوا کہ تم نے اللہ کی آیات کا

اللّٰهِ هُزُوًا وَّغَرَّتْكُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ فَالْيَوْمَ لَا يُخْرَجُوْنَ مِنْهَا وَلَا هُمْ

مذاق اُڑایا تھا اور دُنیوی زندگی نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا، پس آج نہیں نکالے جائیں گے یہ جہنم سے، اور نہ ان سے

يُسْتَعْتَبُوْنَ ۝۳۵ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَرَبِّ الْاَرْضِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝۳۶

راضی کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا ۝۳۵ پس سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو آسمانوں کا رب ہے، زمین کا رب ہے، تمام جہانوں کا رب ہے ۝۳۶

وَلَهُ الْكِبْرِيَآءُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۪ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۳۷ ع

اسی کے لئے کبریائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور وہ زبردست حکمت والا ہے ۝۳۷

تفسیر

قیامت کے دِن مجرمین کا انجام بد اور اس کی وجہ

"اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی" وَيَوْمَ تَقُوْمُ السَّاعَةُ: جس دِن کہ قیامت قائم ہوگی، يَوْمَئِذٍ يَّخْسَرُ الْمُبْطِلُوْنَ: اس دِن باطل پرست خسارے میں پڑ جائیں گے یعنی ان کا خسارہ نمایاں ہوجائے گا، مُبطِل کا لفظ مُحِق کے مقابلے میں بولا جاتا ہے، مُحِق ہوتا ہے حق پرست، اور مُبطِل ہوتا ہے باطل پرست، یہ باطل پرست باطل باتیں کرنے والے خسارے میں پڑ جائیں گے اُس دن۔ وَتَرٰى كُلَّ اُمَّةٍ جَاثِيَةً: اور تو دیکھے گا ہر جماعت کو گھٹنے ٹیکے ہوئے، یا تو ہیبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے سامنے گھٹنوں کے بل گری پڑی ہوگی، یا ادب کے ساتھ گھٹنے ٹیک کے اللہ کا حکم سننے کے لئے بیٹھے ہوں گے، "دیکھے گا تو ہر جماعت کو گھٹنوں کے بل" جاثیہ: گھٹنوں کے بل بیٹھنے والی، گھٹنے ٹیک کے بیٹھنے والی۔ كُلُّ اُمَّةٍ تُدْعٰٓى اِلٰى كِتٰبِهَا: ہر جماعت کو بلایا جائے گا اس کے نامۂ اعمال کی طرف، اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: آج بدلہ دیے جاؤ گے تم ان کاموں کا جو تم کیا کرتے تھے، اللہ کی طرف سے

یہ اطلاع دی جائے گی کہ "یہ ہماری کتاب ہے"، کتاب سے لکھا ہوا نامہ اعمال مراد ہے، "جو تم پر حق کے ساتھ بیان کرے گا" یعنی ٹھیک ٹھیک تمہارے اعمال اقوال احوال کردار جو کچھ ہے تمہارے سامنے واضح کرے گا، اُس میں کوئی بات خلاف واقع نہیں ہوگی، اور واقعہ بھی یہ ہے کہ مجرم جس وقت اپنی کتابوں کو دیکھیں گے تو خود ہی بول پڑیں گے، مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰىهَا (سورۂ کہف: ۴۹) اس کتاب کو کیا ہوگیا کہ اس نے تو نہ کوئی چھوٹی چیز چھوڑی، نہ بڑی چیز چھوڑی، سب کو گھیر لیا، تو نامۂ اعمال جب سامنے آئے گا تو حقیقت واضح ہوجائے گی، "یہ ہماری کتاب ہے" کتاب کا لفظ چونکہ اُردو میں مؤنث استعمال ہوتا ہے اس لیے ہم ترجمہ مؤنث کے ساتھ کرتے ہیں، عربی میں لفظ کتاب مذکر ہے، هٰذَا كِتٰبُنَا يَنْطِقُ عَلَيْكُمْ بِالْحَقِّ: یہ ہماری کتاب ہے جو بولتی ہے تم پر ٹھیک ٹھیک، یعنی بیان کرتی ہے ٹھیک ٹھیک، کتاب کے بولنے سے مراد کتاب کا واضح کرنا ہے، اِنَّا كُنَّا نَسْتَنْسِخُ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: بے شک ہم لکھواتے رہتے تھے ان کاموں کو جو تم کرتے تھے، استنساخ: لکھوانا۔ نَسَخَ لکھنے کو کہتے ہیں، جو کچھ تم کرتے تھے ہم لکھواتے رہتے تھے، فَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: پھر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کیے، فَيُدْخِلُهُمْ رَبُّهُمْ فِيْ رَحْمَتِهٖ: داخل کرے گا ان کو ان کا رب اپنی رحمت میں، ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ: یہ بہت واضح کامیابی ہے، مبطل تو خسارے میں پڑیں گے، اور ایمان لانے والے اور نیک عمل کرنے والے واضح کامیابی حاصل کریں گے، "اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا انہیں کہا جائے گا کہ" اَفَلَمْ تَكُنْ اٰيٰتِيْ تُتْلٰى عَلَيْكُمْ: کیا ہماری آیات تم پر پڑھی نہیں جاتی تھیں؟ فَاسْتَكْبَرْتُمْ: یہ اُن کو سرزنش اور تنبیہ ہے، پھر تم تکبّر کرتے تھے، یعنی ہماری آیات کی پروا نہیں کرتے تھے، جس طرح سے شروع سورت میں ذکر کیا گیا يُصِرُّ مُسْتَكْبِرًا، "تم تکبّر کرتے تھے" وَكُنْتُمْ قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ: اور تم مجرم لوگ تھے۔ وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ: اور جب کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے (یہ بھی اُسی ڈانٹ کا حصہ ہے جو قیامت کے دن ان پر پڑے گی) جب انہیں کہا جاتا تھا کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، وَّالسَّاعَةُ: اور قیامت بھی ٹھیک ہے، لَا رَيْبَ فِيْهَا: اس کے آنے میں کوئی شک نہیں، "تو تم کہا کرتے تھے" اِذَا قِيْلَ قُلْتُمْ، تو قُلْتُمْ کا تعلق اِذَا قِيْلَ کے ساتھ ہے، جب یہ بات کہی جاتی تھی کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے، اور قیامت اس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں، تو تم کہا کرتے تھے مَا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ: ہم نہیں جانتے قیامت کیا ہوتی ہے، تم اُس وقت یہ کہا کرتے تھے، قیامت کے دن اللہ تعالیٰ مجرمین کو ڈانٹتے ہوئے یہ بات کہیں گے، "تم کہا کرتے تھے کہ ہم نہیں جانتے کہ قیامت کیا ہوتی ہے" اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ: نہیں خیال کرتے ہم مگر سرسری سا خیال کرنا، یعنی ایسے ہی وہم سا تو آتا ہے ہمارے دل میں، اور ہمیں یقین بالکل نہیں ہے، وَبَدَا لَهُمْ سَيِّاٰتُ مَا عَمِلُوْا: ظاہر ہوگئیں اُن کے لئے ان کے اعمال کی بُرائیاں، مَا عَمِلُوْا جو کچھ انہوں نے کیا اس کے سیئات ان کے سامنے واضح ہوگئے، وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ: اور گھیر لیا ان کو اس چیز نے جس کا وہ مذاق اُڑایا کرتے تھے، جب اللہ کے عذاب کا ذکر کیا جاتا تو ہنستے تھے مذاق اُڑاتے تھے، تو آج اسی چیز نے ان کو گھیر لیا۔ وَقِيْلَ الْيَوْمَ نَنْسٰىكُمْ: اور کہا جائے گا کہ آج ہم تمہیں

بھلاتے ہیں، کَمَا نَسِیْتُمْ لِقَآءَ یَوْمِکُمْ هٰذَا: جس طرح سے تم نے اس دن کی ملاقات کو بھلا رکھا تھا، ایک تو بھلانے کا مطلب یہ ہے کہ حافظے سے نکال دیا، یاد ہی نہ رہے، اور ایک ہے کہ اس کا خیال نہ رکھا جائے، اس کو کوئی آرام نہ پہنچایا جائے، راحت نہ دی جائے، یہ بھی بھلا دینا ہوتا ہے، اب یہ اللہ کو یاد نہ رہے یہ تو ممکن نہیں، یہاں توجہ نہ فرمانا یہ نسیان ہے، ہم تمہیں اس طرح سے جہنم میں پھینک دیں گے پھر تم پر کوئی کسی قسم کا رحم نہیں کریں گے جس طرح سے کوئی شخص کسی چیز کو بھلا ہی دیتا ہے، یہاں یہی مطلب ہے، تمہاری کوئی رعایت نہیں رکھی جائے گی، ''آج ہم تمہیں بھلا دیں گے جس طرح سے تم نے اِس دن کو بھلا رکھا تھا'' وَمَاْوٰىکُمُ النَّارُ: تمہارا ٹھکانا جہنم ہے، وَمَا لَکُمْ مِّنْ نّٰصِرِیْنَ: اور تمہارے لیے کوئی مددگار نہیں، یہ وہی ڈانٹ ہے جو قیامت کے دن ان کے سامنے دی جارہی ہے، وہ سنا رہے ہیں۔ ''اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ تم نے اللہ کی آیات کا مذاق اُڑایا تھا'' یہ دیکھو! مضمون لوٹ کر اُدھر ہی آگیا جہاں سے سورت شروع ہوئی تھی، وہاں بھی یہی ذکر کیا تھا کہ یہ اَفاک اثیم قسم کے لوگ ہیں، جب اِن کے سامنے کوئی اللہ کی آیات پڑھی جاتی ہیں تو اس پہ ہنسی اڑاتے ہیں مذاق کرتے ہیں، سنی کو اَن سنی کر دیتے ہیں، تو اب انجام کے اعتبار سے جا کے ان کے سامنے یہی ڈانٹ واضح کی جارہی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہیں یہی کہا جائے گا کہ جب اللہ کی آیات تمہارے سامنے آتی تھیں تم ہنسی اور مذاق اڑاتے تھے، تو اس وقت سب کے سامنے پھر یہ انجام آجائے گا، ''یہ اس وجہ سے ہے کہ تم نے اللہ کی آیات کو ھُزو بنایا'' یعنی ان کے ساتھ ہنسی اور مذاق کیا، ھُزُوًا یہ مَھْزُوًّا بِہَا کے معنی میں ہے، ''تم نے اللہ کی آیات کو ایسی چیز قرار دیا جس کے ساتھ ہنسی اور مذاق کیا جاتا ہے''، ''اور دنیوی زندگی نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا تھا'' وہاں تم اپنی کمائیوں پر بہت ناز کرتے تھے، اور سمجھتے تھے کہ بس ہماری یہی دنیوی زندگی ہے، مرنے کے بعد اُٹھنا نہیں، یہیں عیش کر لو جو کرنی ہے، ''دنیوی زندگی نے تمہیں دھوکے میں ڈال دیا تھا'' فَالْیَوْمَ لَا یُخْرَجُوْنَ مِنْهَا: پس آج نہیں نکالے جائیں گے یہ جہنم سے، وَلَا هُمْ یُسْتَعْتَبُوْنَ: اور نہ ان سے راضی کرنے کا مطالبہ کیا جائے گا، استعتاب یہ لفظ عتاب سے لیا گیا ہے، عتاب غصے کو کہتے ہیں، اَعْتَبَ اِعْتَاب ازالہ عتاب کے معنی میں، اور استعتاب کا معنی ہوتا ہے ازالہ اعتاب کا مطالبہ کرنا، یعنی ان سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا، اور انہیں یہ نہیں کہا جائے گا کہ آج توبہ کر کے اپنی پچھلی غلطیوں سے معافی مانگ کے اللہ کو راضی کرلو، یہ موقع اب اُن کو نہیں دیا جائے گا، اب اگر وہ توبہ کریں گے بھی، معافی مانگیں گے بھی تو اب کوئی موقع نہیں رہا، ''اُن سے راضی کرنے کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا'' یعنی ان سے توبہ کا مطالبہ نہیں کیا جائے گا کہ تم اب توبہ کر کے اپنے اللہ کو راضی کرلو، یہ موقع نہیں ہوگا، فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ: پس سب تعریفیں اللہ کے لئے ہیں جو آسمانوں کا رَبّ ہے، زمین کا رَبّ ہے، تمام جہانوں کا رَبّ ہے، رُبوبیت کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا گیا، کیونکہ رُبوبیت سے ہی آگے جا کے اُلوہیت کی طرف انسان کا ذہن منتقل ہوتا ہے، جس کو پیدا کرنے والا سمجھا جائے، جس کو تمام ضرورتیں پوری کرنے والا سمجھا جائے تو آخر وہی حقدار ہوتا ہے کہ انسان اُسی کی عظمت کا اعتراف کرے اور اسی کے سامنے جھکے اور اسی کی عبادت کرے،

اس لیے قرآنِ کریم کی آخری سورت میں بھی قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۙ مَلِكِ النَّاسِ ۙ اِلٰهِ النَّاسِ، ترتیب یہی رکھی گئی، پہلے ربوبیت کو ذکر کیا کہ ضرورتیں پوری کرنے والا وہی ہے، اور جو ضرورتیں پوری کیا کرتا ہے وہ بااختیار بھی ہوتا ہے، کیونکہ جو بااختیار نہ ہو وہ ضرورتیں پوری نہیں کرسکتا، بادشاہت اُسی کے ہاتھ میں ہوگی تبھی جاکے وہ ساری ضرورتیں پوری کرسکتا ہے، اور جو ضرورتیں پوری کرنے والا ہے، ہر قسم کے اختیارات رکھنے والا ہے تو اِلٰهِ النَّاسِ بھی وہی ہے، الٰہ بھی اُسی کو قرار دیا جائے، اسی طرح سے یہاں بھی ربوبیت کو نمایاں کیا جارہا ہے، ''سب تعریفیں اُس اللہ کے لئے ہیں جو کہ آسمانوں کا رَبّ ہے، زمین کا رَبّ ہے، تمام جہانوں کا رَبّ ہے، اسی کے لئے کبریائی ہے آسمانوں میں اور زمین میں، اور وہ زبردست حکمت والا ہے'' تو سورت کی ابتدا بھی اللہ تعالیٰ کے انہی اسماء کے ساتھ ہوئی تھی عزیز حکیم کے ساتھ، اور اسی پر ہی اختتام کیا جارہا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

***

سُورَةُ الأَحقَافِ

ایاتھا ۳۵ ۴۶ سُوْرَۃُ الْاَحْقَافِ مَکِّیَّۃٌ ۶۶ رکوعاتھا ۴

سورۂ اَحقاف مکی ہے، اور اس کی ۳۵ آیتیں ہیں، ۴ رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

حٰمٓ ۞ تَنْزِیْلُ الْكِتٰبِ مِنَ اللّٰهِ الْعَزِیْزِ الْحَكِیْمِ ۞ مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

حٰمٓ ① یہ کتاب اُتاری ہوئی ہے اللہ عزیز حکیم کی طرف سے ② نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو

وَمَا بَیْنَهُمَآ اِلَّا بِالْحَقِّ وَاَجَلٍ مُّسَمًّى ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَمَّآ اُنْذِرُوْا

اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں مگر حق کے ساتھ اور وقت معین تک، اور وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اِعراض کرنے والے ہیں اس

مُعْرِضُوْنَ ۞ قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ

چیز سے جس سے ان کو ڈرایا جاتا ہے ③ آپ انہیں کہیں بتلاؤ تم، جن چیزوں کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، مجھے دکھلاؤ، انہوں نے کیا پیدا کیا

الْاَرْضِ اَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِی السَّمٰوٰتِ ؕ اِیْتُوْنِیْ بِكِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ هٰذَآ اَوْ اَثٰرَةٍ

زمین سے؟ یا ان کے لئے کوئی ساجھا ہے آسمانوں میں؟ لے آؤ میرے پاس کتاب اس سے پہلے کی، یا کوئی علمی بات جو منقول چلی

مِّنْ عِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۞ وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا

آرہی ہو اگر تم سچے ہو ④ اور کون بڑا گمراہ ہے اس شخص سے جو پکارے اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کو جو نہیں

یَسْتَجِیْبُ لَهٗٓ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ ۞ وَاِذَا حُشِرَ

قبول کر سکتے اس کے لئے قیامت کے دِن تک اور وہ اِن کے پکارنے سے بے خبر ہیں ⑤ اور جب لوگ جمع کیے جائیں گے

النَّاسُ كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِیْنَ ۞ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَیْهِمْ اٰیٰتُنَا

تو یہ ان کے لئے دشمن ہوجائیں گے اور ان کی عبادت کا انکار کرنے والے ہوجائیں گے ⑥ اور جب ان پر ہماری واضح واضح آیتیں

بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ ۙ هٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ ۞ؕ اَمْ

پڑھی جاتی ہیں تو کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا حق کے متعلق جب وہ حق ان کے پاس آگیا، یہ صریح جادو ہے ⑦ کیا

يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِيْ

یہ لوگ کہتے ہیں کہ اس قرآن کو اس رسول نے خود گھڑ لیا ہے؟ آپ کہہ دیجئے اگر میں نے اس کو گھڑ لیا پس نہیں اختیار رکھو گے تم میرے لئے

مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا ؕ هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ كَفٰى بِهٖ شَهِيْدًاۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ؕ

اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، اللہ خوب جونتا ہے اس چیز کو جس میں تم لگے ہوئے ہو، وہی کافی گواہ ہے میرے اور تمہارے درمیان

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝۸ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ وَمَاۤ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ

وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ⑧ آپ کہہ دیجئے کہ نہیں ہوں میں رسولوں میں سے کوئی نیا، اور نہیں جانتا میں کہ کیا کیا جائے گا

بِيْ وَلَا بِكُمْ ؕ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰۤى اِلَيَّ

میرے ساتھ اور اور نہ میں جانتا ہوں کہ کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ، نہیں پیروی کرتا میں مگر اسی بات کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے

وَمَاۤ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۹ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ

اور نہیں ہوں میں مگر صریح ڈرانے والا ⑨ آپ ان سے پوچھئے کہ تم مجھے بتلاؤ، اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہوا اور تم نے اس کا انکار کیا

وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى مِثْلِهٖ فَاٰمَنَ وَاسْتَكْبَرْتُمْ ؕ

اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے گواہی دے دی اس جیسی کتاب پر، پھر وہ تو ایمان لے آیا اور تم نے تکبر کیا (پھر تم سے بڑھ

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۰ ع

کر ظالم کون ہوگا)، بے شک اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے ⑩

تفسیر

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ احقاف ''مکی'' ہے، اور اس کی ۳۵ آیتیں ہیں، ۴ رکوع ہیں۔ پچھلی سورتوں کی طرح یہ سورت بھی عقائد کی وضاحت پر مشتمل ہے، اور حٰمٓ کے سلسلے کی جو سورتیں شروع ہوئی تھیں ان میں سے یہ آخری سورت ہے۔

حٰمٓ: حروفِ مقطعات، اللہ اعلم بمرادہ بذالک، ان حروف سے اللہ تعالیٰ کی جو مراد ہے وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں۔ تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ مِنَ اللّٰہِ الْعَزِیْزِ الْحَکِیْمِ: حٰمٓ سورتوں کی ابتدا قرآنِ کریم کے تذکرے سے ہی ہے، اِس سورت میں بھی حسبِ معمول پہلے قرآنِ کریم کا ذکر ہی ہے، تَنْزِیْلُ الْکِتٰبِ: مصدر کی اضافت مفعول کی طرف، ''یہ کتاب اتاری ہوئی ہے اللہ عزیز حکیم کی طرف سے۔''

اِثباتِ توحید

آگے مضمون توحید کا شروع ہوا، مَا خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ: نہیں پیدا کیا ہم نے آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو ان کے درمیان میں ہیں مگر حق کے ساتھ، فائدے کے تحت، مصلحت کے مطابق، جس کا کوئی اچھا نتیجہ نکلنے والا ہے، باطل پیدا نہیں کیا، جو بالکل بے کار اور عبث ہو جس کا کوئی نتیجہ نکلنے والا نہیں، وَأَجَلٍ مُّسَمًّى: اور وقتِ معین تک، یعنی ان کی تخلیق بھی اگر ہوئی ہے تو اَجَلِ مُسَمّٰی کے ساتھ ہوئی، اَجل: وقت۔ مسمٰی: متعین کیا ہوا۔ یعنی یہ نہ ہمیشہ سے ہیں نہ ہمیشہ رہیں گے، جس طرح سے آپ منطق کی اِصطلاحات میں حادِث یا محدِث کا لفظ بولا کرتے ہیں، یہ وہی بات ہے، پہلے موجود نہیں تھے، ہم نے پیدا کیے، یہ موجود ہو گئے، اور پھر آخر ایک وقت پر جا کے یہ فنا کر دیے جائیں گے، ہمیشہ کے لئے یہ نہیں ہیں، ایک وقتِ معین تک کے لئے ان کو پیدا کیا ہے، اور اس ''وقتِ معین'' سے قیامت کے دِن کی طرف اشارہ ہے۔ وَالَّذِينَ كَفَرُوا عَمَّا أُنذِرُوا مُعْرِضُونَ: اب چاہیے تو یہ تھا کہ انسان اِن چیزوں میں تدبر کرتا، غور کرتا، اپنے انجام کو سوچتا، اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور اپنے خالق کی فرماں برداری اختیار کرتا، لیکن جو لوگ منکر ہیں، سرے سے اللہ اور اس کی صفات کے صحیح طور پر قائل ہی نہیں، اللہ کی باتوں کو مانتے نہیں، ان کو جتنا ڈرایا جاتا ہے وہ منہ پھیرتے ہیں، اِعراض کرتے ہیں، وَالَّذِينَ كَفَرُوا: اور وہ لوگ جنہوں نے انکار کیا، عَمَّا أُنذِرُوا مُعْرِضُونَ: اِعراض کرنے والے ہیں اس چیز سے جس کے ذریعے ان کو ڈرایا جاتا ہے۔ ''ما'' موصولہ ہو جائے گا، أُنذِرُوا بِهِ یہ ضمیر جو ''مَا'' کی طرف لوٹے گی محذوف نکال لی جائے گی، عائد محذوف ہے، ''جس چیز سے ان کو ڈرایا جاتا ہے وہ اس سے اعراض کرنے والے ہیں، منہ موڑنے والے ہیں، توجہ نہیں کرتے۔''

''اِثباتِ شرک'' پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے، نہ نقلی!

قُلْ أَرَأَيْتُم مَّا تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ أَرُونِي مَاذَا خَلَقُوا مِنَ الْأَرْضِ أَمْ لَهُمْ شِرْكٌ فِي السَّمٰوٰتِ ۖ ائْتُونِي بِكِتٰبٍ مِّن قَبْلِ هٰذَا أَوْ أَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ: یہ اِبطالِ شرک ہے، آپ پوچھیے، قُلْ: کہہ دیجئے، کہنا کبھی کبھی بطور پوچھنے کے ہوتا ہے، اس لئے یہ لفظ قُلْ سوال پر مشتمل ہے، آپ ان سے کہیں یعنی اِن سے پوچھیں کہ یہ اپنے عقیدے کی دلیل کی وضاحت کریں، ''آپ انہیں کہیں'' أَرَأَيْتُم: اس کا معنی ہوا کرتا ہے: أَخْبِرُونِي، مجھے بتاؤ، آگے أَرُونِي کا لفظ بھی اِسی کی تاکید کے طور پر ہے، ''بتلاؤ تم، جن چیزوں کو تم اللہ کے علاوہ پکارتے ہو، مجھے دکھلاؤ، انہوں نے کیا پیدا کیا زمین سے، یا ان کے لئے کوئی ساجھا ہے آسمانوں میں؟'' ائْتُونِي بِكِتٰبٍ مِّن قَبْلِ هٰذَا: لے آؤ میرے پاس کتاب اس سے پہلے کی، قرآنِ کریم سے پہلے کوئی کتاب اُتری ہو وہ کتاب لے آؤ، أَوْ أَثٰرَةٍ مِّنْ عِلْمٍ: أَثٰرَةٍ یہ مصدر ہے ماثور کے معنی میں، یا کوئی علمی بات منقول چلی آ رہی ہو وہ لے آؤ، إِن كُنتُمْ صٰدِقِينَ: اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔ دعویٰ ان کا یہ تھا کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور چیزیں بھی ہیں جن کو پکارا جا سکتا ہے، وہ کارساز ہیں، کام بنا سکتے ہیں، دعویٰ اُن کا یہ تھا، ان سے اس دعوے کے اوپر دلیل پوچھی جا رہی ہے، دلیل عقلی بھی ہوتی ہے اور نقلی بھی، عقلی دلیل کا حاصل تو یہ ہے

کہ تم بتاؤ کہ وہ کوئی خالق ہیں؟ زمین کا کچھ حصہ انہوں نے پیدا کیا؟ یا آسمان میں ان کی کسی قسم کی شرکت ہے؟ اگر وہ خالق بھی نہیں اور آسمان کے معاملات میں شریک بھی نہیں تو پھر وہ پکارنے کے قابل کیسے ہوئے؟ یا وہ الٰہ کس طرح سے ہیں؟، اور اگر تم اس قسم کی کوئی عقلی دلیل پیش نہیں کر سکتے جس سے ان کا خالق ہونا معلوم ہوتا ہو تو کوئی نقلی دلیل ہی لے آؤ، یہ کتاب جو تمہارے سامنے ہے قرآنِ کریم، اس کا تو ایک ایک لفظ شرک کی تردید کرتا ہے اور یہ بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی شریک نہیں، کوئی پکارے جانے کے لائق نہیں، کوئی عبادت کے لائق نہیں، اِس سے قبل کوئی اور کتاب تمہارے پاس ہو جو اللہ کی طرف سے اُتری ہو جس میں تمہارے اِن شرکیہ عقائد کی تائید کی گئی ہو، اور اس میں ظاہر کیا گیا ہو کہ واقعی اللہ نے کچھ اختیارات دوسروں کو دے دیے ہیں، جن کی بنا پر وہ پکاریں سنتے ہیں، اور لوگوں کے کام بناتے ہیں، تو وہ کتاب ہی لے آؤ، اور اگر کوئی کتاب لکھی لکھائی موجود نہیں تو اچھے لوگوں میں کوئی علمی بات منقول چلی آ رہی ہو، جیسے انبیاء علیہم السلام کے ملفوظات ہوتے ہیں، یا اولیاء اللہ کی باتیں ہوتی ہیں، تو کوئی ملفوظ اس قسم کا چلا آ رہا ہو، کوئی علمی بات نقل ہوتی چلی آ رہی ہو تو وہی لے آؤ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو، مطلب یہ ہے کہ نہ تو کوئی عقلی دلیل ہے کہ اللہ کے علاوہ کوئی دوسرا عبادت کے لائق ہے، دوسرا عبادت کے لائق تب ہوتا کہ زمین وآسمان میں اس کی شرکت ہوتی، اور اگر کوئی عقلی دلیل نہیں تو پہلے کوئی کتاب بھی موجود نہیں جو اللہ کی طرف سے آئی ہو جس میں یہ لکھا ہوا ہو کہ واقعی اللہ کے کچھ شرکاء ہیں یا اللہ نے کسی کو اختیار دے رکھا ہے وہ کام بنا سکتے ہیں، اور اسی طرح سے اہل علم میں کوئی بات چلی آ رہی ہو، علمی طور پر کوئی مضمون منقول ہو، ایسی بھی کوئی بات نہیں، تو پھر تم دعویٰ کس طرح سے کرتے ہو کہ اللہ کے علاوہ دوسری چیزیں اور بھی ہیں جن کو پکارا جا سکتا ہے، وہ فریادیں سنتی ہیں، اور اسی طرح سے وہ ہماری مدد کر سکتی ہیں، ہماری مشکل کشائی کر سکتی ہیں، یہ دعویٰ تم کس طرح سے کر سکتے ہو؟

معبودانِ باطلہ کی بے بسی

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنْ یَّدْعُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ لَهٗۤ اِلٰى یَوْمِ الْقِیٰمَةِ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ: تو جب یہ شرک والا نظریہ غلط ہو گیا، اس کے اوپر کوئی کسی قسم کی دلیل نہیں، بے دلیل ہے، محض خواہشات کی اتباع ہے یا تقلیدِ آباء ہے، جاہل آباء کے پیچھے لگ کے یہ نظریہ اختیار کیا گیا ہے، تو ”کون بڑا گمراہ ہے، کون زیادہ گمراہ ہے اس شخص سے جو پکارے اللہ کے علاوہ ایسی چیزوں کو جو نہیں قبول کر سکتے اس کے لئے قیامت کے دِن تک، اور وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں“ وَهُمْ عَنْ دُعَآىِٕهِمْ غٰفِلُوْنَ: اور وہ اِن کے پکارنے سے بے خبر ہیں، دُعَاء یہ مصدر ہے، مصدر کی اضافت اگر فاعل کی طرف ہو تو مطلب یہ ہے کہ یہ جو دُعا کرتے ہیں تو اس کی اُن کو کوئی خبر نہیں، اور اگر مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہو تو معنی ہو گا کہ اُن کو جو پکارا جا رہا ہے تو اس پکارے جانے کی ان کو کوئی خبر نہیں، حاصل دونوں کا ایک ہی ہے کہ قیامت کے دِن تک وہ اِن کی بات مان نہیں سکتے، اُس کے مطابق عمل نہیں کر سکتے، استجابۃ کا معنی ہوتا ہے کسی کی دُعا کو اور پکار کو قبول کر لینا، جو ایسے لوگوں کو پکاریں جو قیامت تک ان کی دُعا کو قبول نہیں کر سکتے، قبول کرنا تو اپنی جگہ رہا وہ ان کے پکارنے سے بے خبر ہیں، ایسے لوگوں کو پکارنے والے سب سے بڑے

گمراہ ہیں، ان سے بڑھ کے کون گمراہ ہوسکتا ہے؟، چونکہ یہ دعویٰ بلا دلیل ہے اور اِس قسم کی چیز کو اختیار کرلینا سراسر گمراہی ہے۔تو اِس میں یہ بات ظاہر کر دی گئی کہ جو معبود مشرکین نے بنا رکھے تھے وہ اِن کی دُعا کو قبول نہیں کر سکتے، بلکہ اِن کے دُعا کرنے کا اُن کو پتا ہی کہ وہ ہم سے کوئی دُعا کر رہے ہیں۔

مذکورہ آیت کا ''عدمِ سماعِ موتیٰ'' سے کوئی تعلق نہیں!

آج کل جس طرح سے آپ حضرات کے سامنے ''سماعِ موتیٰ'' کی بحث بعض لوگوں نے چھیڑ رکھی ہے، اور وہ کہتے ہیں کہ عدمِ سماع قطعی ہے، قطعی طور پر ثابت ہے کہ اموات سنتے نہیں ہیں۔اس میں جو وہ دلائل پیش کرتے ہیں، اُن دلائل میں سے ایک آیت یہ بھی ہے، کہ جس میں یہ کہا جا رہا ہے کہ لوگ ان کو پکارتے ہیں اور ان کو اِن کے پکارنے کا پتا ہی نہیں، جس سے معلوم ہوگیا کہ وہ سنتے نہیں ہیں۔اس مسئلے کی وضاحت تو آپ کے سامنے بار بار کی جاچکی کہ مشرکین کا جو عقیدہ تھا وہ تھا سماعِ لازم دائم، سماعِ لازم دائم کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جب پکاریں، جہاں سے پکاریں، جو کہیں، اور جو کوئی پکارنے والا ہو، وہ ہر بات کو سنتے ہیں، ہر کسی کی سنتے ہیں، یہ ہے مشرکانہ عقیدہ، اور یہی عقیدہ سماع کا یہ اُلوہیت کے لوازم میں سے ہے کہ اگر کسی کے متعلق ایسا عقیدہ رکھ لیا جائے تو وہ رکھنے والا کافر ہے، مشرک ہے اور یہ عقیدہ شرک ہے۔سماعِ لازم دائم! ضرور سنتے ہیں اور ہمیشہ سنتے ہیں، ہر کسی کی سنتے ہیں، ہر جگہ سے سنتے ہیں، مشرکین کا عقیدہ اپنے آلہہ کے متعلق یہ تھا، اور یہ عقیدہ شرک ہے، اور جس کے متعلق ایسا عقیدہ رکھا جائے وہ اللہ کا شریک ٹھہرا لیا گیا، اور یہ عقیدہ رکھنے والا مشرک ہے، اِس میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں، اور ان آیتوں کا یہی مفہوم ہے، انہیں کہا جارہا ہے کہ جس قسم کے سماع کے تم قائل ہو ایسا سماع نہیں ہے۔

مشرکین کا ''عقیدۂ سماع'' کیا تھا؟

وجہ یہ ہے کہ مشرکین نے جس قسم کے معبود بنا رکھے تھے اس میں کیا چیزیں تھیں؟ سورۂ فاطر کی اِبتدا اِبتدا میں بھی آپ کے سامنے اِس کی تفصیل عرض کی گئی تھی، مشرکین کے معبودوں میں بے جان چیزیں بھی تھیں، مشرکین کے معبودوں میں سیارے چاند سورج بھی تھے، اور ان کے معبودوں میں ملائکہ بھی تھے، ان کے معبودوں میں جنات بھی تھے، ان کے معبودوں میں گزرے ہوئے انبیاء علیہم السلام بھی تھے، اولیاء بھی تھے، ہر قسم کے معبود ان کے تھے جن کو یہ پُوجتے تھے، جو بے جان چیزیں ہیں ان کے تو سننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا، چاہے قریب سے پکاریں چاہے دُور سے پکاریں، بے جان چیزوں نے تو کیا سننا ہے، اور جاندار چیزیں جن کو وہ پکارتے تھے ان کے پکارنے کی صورت کیا تھی؟ یہ ہے اصل قابلِ غور بات، ان کے پکارنے کی صورت یہ تھی کہ انہوں نے اُن کے نام کے بُت تراش رکھے تھے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بُت تراش کے رکھا ہوا تھا بیت اللہ میں، اسماعیل علیہ السلام کا بُت تراش کے رکھا ہوا تھا، اپنے بزرگوں کا، اس طرح سے وہ بُت بنا لیتے تھے، تصویر بنا لیتے، لکڑی کی، پتھر کی، پیتل کی، کسی چیز کی، وہ بنا کے رکھ لیتے تھے، اور اسی طرح سے فرشتوں کو پکارتے تھے تو فرشتوں کے نام پر بھی وہ زنانی تصویریں بناتے تھے، چونکہ وہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں قرار دیتے تھے تو عورتوں کی شکلوں پر بُت تراش لیتے تھے، اور اُن کو وہ فرشتوں کی طرف منسوب کرتے تھے، اسی طرح سے

جنات کے لئے بھی انہوں نے کوئی مقام اور محل ایسے بنا رکھے تھے کہ جہاں وہ چڑھاوے چڑھاتے تھے، کہتے یہ فلاں جن کے لئے ہے، یہ فلاں اِس وادی کے سردار کے لئے ہے، اِس قسم کے معاملات وہ کرتے تھے، تو آپ جانتے ہیں کہ اگر کوئی شخص یہاں جبریل کا مجسمہ بنا کر رکھ لے، اور وہ ''یا جبریل! یا جبریل!'' کہہ کر اس کو پکار رہا ہے، تو کیا اس مجسمے کے سامنے بیٹھ کر ''یا جبریل!'' کہنے سے جبریل اگر سدرۃ المنتہٰی پر موجود ہے تو جبریل سُن لے گا؟ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اسی طرح سے اگر ابراہیم علیہ السلام کا مجسمہ بنا کے وہ سامنے رکھ لیں یا حضرت اسماعیل علیہ السلام کا مجسمہ بنا کے سامنے رکھ لیں، اور اس مجسمے کے سامنے بیٹھ کے ''یا ابراہیم! یا اسماعیل!'' کہنے لگ جائیں، یا کوئی جنات کے لئے وہ کچھ نشانات متعین کر لیں، ان کو وہ پکارتے رہیں، تو ہر عقل مند آدمی جانتا ہے کہ اِن پتھر کی مورتیوں کو وہ پکاریں، چاہے ''ابراہیم'' کہہ کے پکاریں اور چاہے ''اسماعیل'' کہہ کے پکاریں، چاہے ''جبریل، میکائیل'' کا نام رکھ کے پکاریں، یا کسی جن کا نام رکھ کے پکاریں، تو آپ حلفیہ کہہ سکتے ہیں، یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام، اسماعیل علیہ السلام کو کوئی پتا نہیں کہ مجھے کوئی پکار رہا ہے، مجھے کوئی بلا رہا ہے، نہ فرشتوں کو خبر ہے، مشرکین نے جو طریقہ اپنایا ہوا تھا اس کے بارے میں یہ قطعی بات ہے کہ نہ فرشتے سنتے ہیں، نہ جن سنتے ہیں، نہ انبیاء علیہم السلام سنتے ہیں، نہ زندہ سنتے ہیں، نہ مُردہ سنتے ہیں، کیونکہ اگر وہ کسی زندہ کو ہی پکارتے ہوں، مثال کے طور پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا مجسمہ بنا کر رکھ لیتے، جس طرح سے عیسائیوں نے بنا کر رکھا ہوا ہے، تو عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں یا نہیں؟ (جی) عقیدۂ قطعی ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں، اور فرشتے بھی تو زندہ ہیں، اب اگر ان زندوں کے مجسّمے بنا کے سامنے رکھ لیں تو ہم تو بھی حلف اُٹھا کر کہہ سکتے ہیں کہ یہ نہیں سنتے، کیونکہ یہ صورت تو ایسی ہے کہ جس میں زندہ مُردہ کی کوئی تفصیل ہی نہیں، کسی کی تصویر بنا کے سامنے رکھ لی جائے تو سامنے رکھنے کے بعد اگر اُس کو کوئی پکارتا ہے، چاہے صاحبِ تصویر زندہ ہے، چاہے صاحبِ تصویر مُردہ ہو گیا، ہم کہہ سکتے ہیں کہ وہ بالکل نہیں سنتے، لیکن اس کا یہ معنی نہیں کہ اگر عیسیٰ علیہ السلام زندہ ہیں اور یقیناً زندہ ہیں اور ان کے پاس جا کر کوئی بات کرے تو عیسیٰ علیہ السلام تو بھی نہیں سنتے کیونکہ قرآن میں آ گیا وَهُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ، یا فرشتے پاس موجود ہوں اور فرشتوں کے ساتھ کوئی بات کی جائے تو فرشتے نہیں سنتے کیونکہ قرآنِ کریم میں آ گیا کہ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ، تو یہ صورت ہے؟ (نہیں!!) اسی طرح سے اگر واقعہ یوں ہوتا کہ مشرکینِ مکہ بُت سامنے نہیں رکھتے تھے، تصویریں سامنے رکھ کر نہیں پکارتے تھے، بلکہ انبیاء علیہم السلام کی قبور پر جاتے، اور انبیاء علیہم السلام کی قبور پر جا کر وہاں کہتے کہ اے ابراہیم! ہمارے لئے دُعا کیجئے اللہ ہمارا کام کر دے، یا ابراہیم علیہ السلام کو پکار کے کہتے تھے کہ تُو ہمارا کام کر دے، جو بھی طریقہ ہو، اگر قبور پر جا کر اس قسم کی وہ باتیں کرتے، پھر اللہ تعالیٰ کہتا کہ هُمْ عَنْ دُعَآئِهِمْ غٰفِلُوْنَ، کہ یہ تو ان کے بلائے جانے سے اور پکارے جانے سے بالکل بے خبر ہیں، تو پھر آپ کہہ سکتے تھے کہ واقعی انبیاء علیہم السلام وفات کے بعد اپنی قبروں میں بالکل نہیں سنتے چاہے کوئی پاس جا کر ہی بات کرے، پھر یہ بات قطعی ہوتی، لیکن ایسا تو واقعہ تھا ہی نہیں! اس لیے میں نے آپ کے سامنے یہ سوال اُٹھایا تھا کہ میری نظر میں تو ایسا کوئی واقعہ نہیں گزرا کہ مکہ معظمہ کے اندر مشرکینِ مکہ نے کسی نبی کی قبر بنا رکھی ہو اور وہ وہاں جا کے میلہ لگاتے ہوں اور وہاں جا کے بیٹھ کے اُن کو پکارتے ہوں، یا ان کو سلام کہتے ہوں یا ان سے کوئی باتیں کرتے ہوں، ایسا کوئی واقعہ میرے سامنے نہیں ہے، اور نہ اُن کی تاریخ کے اندر یہ ذکر کیا گیا ہے کہ باقاعدہ مکہ معظمہ سے سفر کر کے جاتے تھے قریۂ خلیل، جہاں حضرت خلیل علیہ السلام کی قبر ہے، یہاں سے

وہاں جاتے ہوں اور وہاں جا کے سلام کہتے ہوں یا کوئی کسی قسم کی بات کرتے ہوں، اگر واقعہ ایسا ہوتا پھر یہ آیتیں اُترتیں تو پھر ہم کہہ سکتے تھے کہ واقعی یہ صورت بھی منفی ہوگئی، کہ قبر کے پاس جا کر بھی کوئی بات کرتا ہے تو یہ نہیں سنتے، لیکن جب قبر کے پاس جا کر بات کرنا تو مشرکین کا معمول ہی نہیں تھا، وہ تو جب پکارتے تھے تو اُن کی تصویریں سامنے رکھ کر پکارتے تھے، ایسے طور پر پکارتے تھے کہ ایک بُت کا نام وہی رکھ لیتے کہ یہ ''ابراہیم'' ہے، یعنی ''ابراہیم'' کی تصویر ہے، چاہے ان کے تصور میں وہ ابراہیم علیہ السلام ہوں، کہ جب ہم اِن کو پکارتے ہیں تو اُن کو پتا چل جاتا ہے، یہ صورت قطعی طور پر منفی ہے، یا کوئی چیز بھی نہ رکھتے ہوں، جس طرح سے سمندر میں سفر کرتے جا رہے ہیں اور حضرت خلیل علیہ السلام کی قبر سے ہزاروں میل کے فاصلے پہ ہیں، اسماعیل علیہ السلام کی قبر سے سینکڑوں میل کے فاصلے پہ ہیں، اور کشتی بھنور میں پھنس گئی یا کوئی اور مصیبت آ گئی تو اس وقت کہیں: ''یا ابراہیم! یا ابراہیم!'' تو ہم یقیناً کہیں گے کہ نہیں سنتے، یہ صورتیں جتنی مشرکین کے اندر معمول تھیں ان کے بارے میں تو ہم قطعی طور پر کہہ سکتے ہیں کہ مشرکین کا یہ عقیدہ غلط تھا، وہ کہتے تھے کہ فرشتے ہماری سنتے ہیں اور آگے اللہ کے سامنے پہنچا دیتے ہیں، یا اولیاء، انبیاء، جو بھی اُن کے بنائے ہوئے تھے، اس میں زندہ مُردہ کی کوئی تفصیل نہیں، اگر زندہ کے متعلق کوئی اس قسم کا عقیدہ رکھتا ہے تو بھی مشرک ہے، مُردے کے متعلق رکھتا ہے تو بھی مشرک ہے، ان آیات کا تعلق سماعِ موتی کے ساتھ نہیں ہے، مشرکین اگر زندہ آدمی کو پکارنا شروع کر دیں جیسے فرعون کو فرعونی پکارتے تھے، وہ زندہ تھا، اور وہ بیٹھا ہوا اپنے تخت پر اپنی جگہ، اور پکارنے والے اُس کو مصر کے دوسرے کنارے سے پکارتے ہوں تو بالکل ہم کہیں گے کہ وہ نہیں سنتے، جو انداز تھا ان کا غائبانہ پکارنے کا، اور تصویریں اور فوٹو سامنے رکھ کر ان کا تصور کر کے کہ یہ فلاں ہے اور اس کو پکارنے کا، یہ صورت قطعی طور پر منفی ہے، قرآنِ کریم کی ان آیات کا قطعی مصداق یہی ہے۔

اہلِ سُنّت کا عقیدۂ سماع

باقی! یہ کہ اموات کے ساتھ کوئی بات کی جائے قبور کے پاس جا کر اور یہ عقیدہ رکھا جائے کہ کوئی بات سُن سکتے ہیں، کوئی نہیں سُن سکتے، جو اللہ سُنا دے سنتے ہیں، جو اللہ نہ سُنائے تو نہیں سنتے، اللہ کی مشیت کے تحت ہے، ہمارے ہاتھ میں کوئی ایسا ضابطہ نہیں کہ ہم کہیں گے کہ یہ بات ضرور سُنا دیں گے، قریب سے، دُور سے نہیں، اور اللہ کی مشیت کے تحت کوئی بات سُن لیں، ہر کسی کے متعلق ہم قطعاً اور یقیناً نہیں کہہ سکتے، یہ مسئلہ ہے جس کے متعلق علمائے اُمّت کے اندر بحث ہے کہ یہ سماع بھی ثابت ہے یا نہیں، ورنہ قرآنِ کریم میں اتنی صاف باتیں آجانے کے بعد اور صاف آیات آجانے کے بعد اس مسئلے میں اختلاف کی گنجائش کیا رہ جاتی ہے؟ اگر مطلب یہی ہو تو پھر تو اس میں کوئی گنجائش نہیں رہنی چاہیے۔ علمائے اُمّت کے اندر جو مسئلہ مختلف فیہ ہے وہ ان آیات کا مصداق نہیں ہے، اور اِن آیات کے اندر جس کی نفی کی گئی ہے وہ علماء کے اندر مختلف فیہ نہیں ہے، نبی کو پکارو، ولی کو پکارو، فرشتے کو پکارو، جن کو پکارو، بھوت کو پکارو، زندہ کو پکارو، مُردہ کو پکارو، غائبانہ دُور سے، یا اس کی کوئی تصویر سامنے رکھ کے تو اُمّتِ مسلمہ کا اتفاق ہے کہ اِس قسم کا سماع کہ جہاں سے پکارا جائے، جو کہا جائے، جو کوئی کہے، جس وقت کہے، یہ صرف اللہ تعالیٰ کی شان ہے، کسی دوسرے کے لئے یہ بات ثابت نہیں ہے، دونوں مسئلوں میں فرق کیجئے......! جب دونوں مسئلوں کو آپس میں خلط کر لیا جاتا ہے تو

خلط کرنے کے بعد پھر معاملہ خراب ہوجاتا ہے، سمجھ گئے؟ تو یہ جو چالیس آیتیں، یا ساٹھ آیتیں، یا پچھتر آیتیں لیے پھرتے ہیں، کہ عدمِ سماع کے اُوپر دلالت کرنے والی ہیں، یہ خلطِ مبحث ہے، دونوں بحثوں کو آپس میں خلط کرلیا جاتا ہے، جس سماع کی نفی یہ آیتیں کرتی ہیں یہ سماع وہ ہے جو لوازمِ اُلوہیت میں سے ہے، اور جو سماع کا مسئلہ مسلمانوں کے درمیان مختلف فیہ ہے وہ لوازمِ اُلوہیت میں سے نہیں، اور جس قسم کے سماع کی یہاں نفی کی گئی ہے اس میں زندہ مُردہ کی کوئی تفصیل نہیں۔ اُدھر تو کہتے ہو کہ فرشتے ان کے معبود تھے اور یہ فرشتوں کو بھی پکارتے تھے، تو جب فرشتوں کو پکارنے کی ممانعت پر یہ آیتیں آئی ہیں کہ فرشتے نہیں سنتے، تو اس سے مُردوں کا عدمِ سماع کس طرح سے ثابت ہوگیا؟ فرشتے مُردہ ہیں؟ اُدھر تو کہتے ہو کہ جِن ان کے معبود تھے اور یہ جنوں کو پکارتے تھے اور قرآنِ کریم کہتا ہے کہ جب یہ جنوں کو پکارتے ہیں تو جِن نہیں سنتے، تو کیا جِن مُردہ ہیں؟ کہ آپ اِن آیات کے ذریعے سے ثابت کریں کہ مُردے نہیں سنتے، قرآن کہتا ہے کہ جِن نہیں سنتے، یہ کہتے ہیں مُردے نہیں سنتے، قرآن کہتا ہے فرشتے نہیں سنتے، یہ کہتے ہیں مُردے نہیں سنتے، اِن آیات کا حاصل تو یہ ہوا، دونوں باتوں کے درمیان کوئی جوڑ نہیں ہے، قرآنِ کریم جو کچھ کہتا ہے وہ یہی ہے کہ چاہے جنوں کو پکاریں، چاہے فرشتوں کو، پکارنے کی صورت وہ ہو جو مشرکین نے اختیار کر رکھی تھی، یا تو سامنے کچھ نہیں ہوتا تھا جیسے جنگل میں پھرتے ہوئے پکار رہے ہیں، یا وہ تصویریں رکھ کے پکارتے تھے، ایسی صورت میں کوئی نہیں سنتا، ہاں! البتہ قریب سے جا کر اگر کوئی بات کرے تو پھر سنتے ہیں یا نہیں؟ قبر کے اُوپر جا کے کوئی سلام کرے تو سنتے ہیں یا نہیں؟ اس مسئلے میں اختلاف کی گنجائش ہے جس طرح سے علمائے اُمت میں ہے، اور اس میں راجح سماع ہے، اور انبیاء ﷺ کے سماع کے بارے میں حضرت گنگوہی رحمہ اللہ کی تحریر کے مطابق اُمت میں کوئی اختلاف نہیں، عام اموات کے بارے میں اختلاف ہے جس میں بعض نے عدمِ سماع کو راجح قرار دیا ہے اور بعض نے سماع کو راجح قرار دیا ہے، اہلِ حق کا عقیدہ یہ ہے، اس لیے یہ مسئلہ کفر اور شرک کا مدار نہیں ہے، نہ سماع کا قول کرنے والا مشرک، نہ انکار کرنے والا کافر، اس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ رُوم میں یا سورۂ نمل میں اچھی طرح سے کر چکا ہوں،[1] یہ آیت چونکہ اس مسئلے سے تعلق رکھتی تھی تو میں نے مختصر سی وضاحت اس کی کر دی۔

وَاِذَا حُشِرَ النَّاسُ: اور جس وقت لوگ جمع کیے جائیں گے، كَانُوْا لَهُمْ اَعْدَآءً: تو جن کو یہ پکارتے ہیں وہ پکارنے والوں کے دشمن ہوں گے، اِن کے خلاف گواہیاں دیں گے، ان سے تبرّی اور بےزاری کا اظہار کریں گے، ''جب لوگ جمع کیے جائیں گے تو یہ اِن کے لئے دشمن ہوجائیں گے'' وَّكَانُوْا بِعِبَادَتِهِمْ كٰفِرِيْنَ: اور ان کی عبادت کا انکار کرنے والے ہوجائیں گے، وہ کہیں گے کہ یہ ہمیں پُوجتے ہی نہیں تھے مَا كَانُوْٓا اِيَّانَا يَعْبُدُوْنَ (سورۂ قصص: ۶۳)، بلکہ حقیقت کے اعتبار سے یہ پُوجا شیطان کی ہی ہے، اور شیطان بھی بیزاری کا اظہار کرے گا، کہے گا یہ اپنی خواہشات کو پُوجتے تھے، میں نے تو ذرا اشارہ ہی کیا تھا، میں نے کون سا ان کے اُوپر جبر کیا تھا۔ ''ہوجائیں گے وہ اِن کی عبادت کا انکار کرنے والے۔'' وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيٰتُنَا بَيِّنٰتٍ: اور جب اِن پر ہماری واضح

(۱) سورۂ نمل کے آخر میں یہ مسئلہ مکمل تفصیل کے ساتھ موجود ہے، ملاحظہ فرمائیں۔

واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں، وہ آیتیں جو کہ توحید کے مسئلے کی وضاحت کرتی ہیں، وہ آیتیں جو کہ اس بات کو ظاہر کرتی ہیں کہ اللہ کے علاوہ پکارنے کے لائق کوئی نہیں، ہر کسی کی ہر وقت پکار سننا اللہ کا کام ہے کوئی دوسرا نہیں سُن سکتا، اور اگر بالفرض! سُن بھی لے تو کر کچھ نہیں سکتا، دونوں باتیں ہی ہیں، مَنْ لَّا یَسْتَجِیْبُ کے اندر کر کچھ نہیں سکتا کی بات آئی تھی، سُن ہی نہیں سکتے، بالفرض! سُن بھی لیں تو کر کچھ نہیں سکتے۔

انہی باتوں کی وضاحت کے طور پر حضرت شیخ الاسلام رحمہ اللہ نے دیکھو یہ لفظ بولے ہیں ''فوائدِ عثمانی'' میں، یہ اشارہ جس سے آپ تفصیل خود سمجھ جائیں گے، وہ لکھتے ہیں: ''یعنی اس سے بڑی حماقت اور گمراہی کیا ہوگی کہ خدا کو چھوڑ کر ایک ایسی بے جان یا بے اختیار مخلوق کو اپنی حاجت برآری کے لئے پکارا جائے جو اپنے مستقل اختیار سے کسی کی پکار کو نہیں پہنچ سکتی، بلکہ یہ بھی ضروری نہیں کہ اُن کو پکارنے کی خبر بھی ہو، پتھر کی مورتیوں کا تو کہنا ہی کیا، فرشتے اور پیغمبر بھی وہی بات سُن سکتے اور وہی کام کر سکتے ہیں جس کی اجازت اور قدرت حق تعالیٰ کی طرف عطا ہو۔'' (''تفسیر عثمانی'' آیت ۵ کے تحت) جتنی تفصیل میں نے آپ کے سامنے کی اِن لفظوں کے اندر سب کا خلاصہ آ گیا، کہ پتھر کے بتوں کا تو کہنا ہی کیا کہ وہ کیا سنیں گے، باقی! فرشتے، انبیاء، پیغمبر وہی بات سُن سکتے ہیں، وہی کام کر سکتے ہیں جس کی اجازت اور قدرت حق تعالیٰ کی طرف سے عطا ہو، تو جیسا عقیدہ مشرکین نے اپنے آلہہ کے متعلق بنا رکھا تھا وہ کسی صورت میں بھی ٹھیک نہیں ہے۔ ''اور جب لوگ جمع کیے جائیں تو ان کے لئے دشمن ہوں گے، اور وہ اِن کی عبادت کا انکار کرنے والے ہوں گے''، ''اور جب اِن کے اوپر ہماری واضح آیتیں پڑھی جاتی ہیں'' جو کہ توحید کے مسئلے کی وضاحت کرتی ہیں ''تو کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا حق کے متعلق جب وہ حق ان کے پاس آ گیا'' ھٰذَا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ: یہ صریح جادو ہے۔

اِثباتِ رِسالت

اَمْ یَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ: یہاں سے مسئلہ رِسالت کا آ گیا! ''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ اِس قرآن کو اِس رسول نے خود گھڑ لیا ہے؟ قُلْ: آپ کہہ دیجئے اِنِ افْتَرَیْتُهٗ: اگر میں نے اِس کو گھڑ لیا، فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا: پس نہیں اختیار رکھو گے تم میرے لئے اللہ کے مقابلے میں کچھ بھی، کیا مطلب؟ کہ اگر میں نے گھڑ لیا تو عذاب میرے پہ آئے گا، پھر تم لوگ مجھے بچا نہیں سکو گے، فَلَا تَمْلِكُوْنَ لِیْ مِنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا یہ دال بر جزاء ہے، اصل بات یوں ہی اِنِ افْتَرَیْتُهٗ: اگر میں نے اِس کو گھڑ لیا عاجلنی بالعقوبۃ اللہ. مجھے جلدی سزا دے گا، اور جب اللہ سزا دے گا تو تم اللہ کے مقابلے میں میرے لیے کسی چیز کا اختیار نہیں رکھو گے، هُوَ اَعْلَمُ بِمَا تُفِیْضُوْنَ فِیْهِ: وہ اللہ خوب جانتا ہے ان باتوں کو جو تم اِس قرآن کے بارے میں کرتے ہو، فِیْهِ کی ضمیر ''بیان القرآن'' میں قرآنِ کریم کی طرف لوٹائی گئی ہے، اور اگر فِیْهِ کی ضمیر ''مَا'' کی طرف لوٹائی ہو تو ترجمہ یوں بھی صحیح ہے ''اللہ خوب جانتا ہے اس چیز کو جس میں تم لگے ہوئے ہو'' جس چیز میں تم لگے ہوئے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے، كَفٰى بِهٖ شَهِیْدًۢا بَیْنِیْ وَ بَیْنَكُمْ: وہی کافی گواہ ہے میرے اور تمہارے درمیان، وَ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ: وہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ قُلْ مَا كُنْتُ بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ: بِدْعًا: نئی چیز، جس کی مثال

پہلے موجود نہ ہو، لفظ بدعت اور یہ لفظ ایک ہی مادّے سے ہیں، بدیع السماوات کا لفظ اسی مادّے سے ہے آسمانوں اور زمین کو بے نمونہ بنانے والا، جس کا نمونہ پہلے موجود نہیں تھا، اور بدعت اُسی فعل کو کہا جاتا ہے کہ جس کا نمونہ پہلے موجود نہ ہو، سرورِ کائنات ﷺ کے قول و فعل میں، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے قول و فعل میں، قرآنِ کریم میں، حدیث میں، کسی اُصول کے تحت اس کو ثابت نہیں کیا جاسکتا اُصولِ صحیحہ سے، اس کو کہتے ہیں یہ ایک نئی بات نکال لی دِین میں، بدعت اُسے کہا جاتا ہے۔ تو بِدْعًا سے یہاں نئی چیز بے مثل چیز مراد ہے، ''میں کوئی نئی قسم کا رسول نہیں ہوں، میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں'' ایسا نہیں ہوں کہ میری مثال پہلے نہ گزری ہو، میرے جیسا کوئی رسول پہلے نہ آیا ہو، ایسی بات تو نہیں ہے، یعنی تمہیں تعجب ہے کہ ایک انسان کو رسول کس طرح سے بنادیا گیا، تو یہ کون سی تعجب کی بات ہے، میں کون سا نیا رسول آیا ہوں، پہلے بھی تو انسان رسول آئے ہیں، اگر تمہیں میرے اس حال کے اُوپر تعجب ہے کہ یہ رسول کھاتا پیتا کیوں ہے مَالِ هٰذَا الرَّسُوْلِ يَاْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِيْ فِي الْاَسْوَاقِ (سورۂ فرقان:۷) اِس کو کیا ہوگیا، یہ تو کھاتا بھی ہے اور بازاروں میں چلتا بھی ہے، تو قرآنِ کریم میں وضاحت آئی تھی کہ یہ کون سی بات ہے، پہلے بھی جتنے رسول آئے تھے وہ کھانا بھی کھاتے تھے بازاروں میں چلتے پھرتے بھی تھے، [1] یا مشرکین کہتے تھے یہ عجیب رسول ہے، اس کی بیوی بھی ہے، بچے بھی ہیں، اگر یہ اللہ کا رسول ہے تو اس کے بیوی بچے کیوں ہیں؟ تو سورۂ رعد میں آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو رسول ہم نے پہلے بھیجے ہیں تو جَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (آیت:۳۸) [2] ہم نے ان کے لئے بھی بیوی بچے بنائے تھے، تو یہ کوئی ایسی بات نہیں، تعجب کس بات پہ ہے؟ میں کوئی انوکھا رسول تو نہیں ہوں، بے مثل تو نہیں ہوں کہ جس کی مثال پہلے نہیں گزری، اگر آپ دیکھیں گے تو رسولوں کا سلسلہ پہلے سے جاری ہے، جیسے اللہ کے رسول پہلے تھے ویسے میں ہوں، ''آپ کہہ دیجئے کہ نہیں ہوں میں رسولوں میں سے کوئی نئی چیز'' بِدْعًا: انوکھا، نئی چیز، ''میں رسولوں میں سے کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔''

اللہ کے بتائے بغیر رسول کو بھی علم نہیں ہوسکتا

وَمَآ اَدْرِيْ مَا يُفْعَلُ بِيْ وَلَا بِكُمْ: نہ میرے کوئی دعوے انوکھے ہیں، میں یہ کہوں کہ میں سب کچھ جانتا ہوں، میں عالم الغیب ہوں، ایسی بات بھی کوئی نہیں، ''نہیں جانتا میں کہ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ، اور نہ میں جانتا ہوں کہ کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ'' یعنی مستقبل میں میری اس کوشش کا کیا نتیجہ نکلنے والا ہے؟ مجھے نہیں معلوم، کہ میرا انجام کیا ہوگا اور تمہارا انجام کیا ہوگا؟ میرا فرض تو ہے کہ جو اللہ کی طرف سے وحی آئے میں اس کی اتباع کرتا جاؤں، اس کے مطابق تبلیغ کرتا چلا جاؤں، باقی! آخر فتح مجھے ہوگی، یا دُنیا میں دِین پھیلے گا یا نہیں پھیلے گا؟ اور کیا حالات گزریں گے مستقبل کے اندر؟ اِس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم، نہ تمہارے متعلق، نہ اپنے متعلق! ''نہیں جانتا میں کہ کیا کیا جائے گا میرے ساتھ، اور نہیں جانتا میں کہ کیا کیا جائے گا تمہارے ساتھ'' وَلَا بِكُمْ

(۱) وَمَآ اَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّآ اِنَّهُمْ لَيَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَيَمْشُوْنَ فِي الْاَسْوَاقِ (سورۃ الفرقان:۲۰)

(۲) وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلًا مِّنْ قَبْلِكَ وَجَعَلْنَا لَهُمْ اَزْوَاجًا وَّذُرِّيَّةً (پارہ ۱۳ سورۃ رعد آیت ۳۸)

میں لَا اُسی کی تاکید ہے جو مَآ اَدْرِیْ کے اندر نفی آئی ہوئی ہے، اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰۤی اِلَیَّ: نہیں پیروی کرتا میں مگر اسی بات کی جو میری طرف وحی کی جاتی ہے، ''اور نہیں ہوں میں مگر صریح ڈرانے والا'' میرا فرض یہ ہے، مستقبل کے بارے میں تمام تفصیلات کا جاننا یہ میرا منصب نہیں ہے، اللہ تعالیٰ جو بتاتا ہے پتا چلتا جاتا ہے، اور جو وحی آتی ہے میں اُس کی اتباع کرتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے بے انتہا چیزیں، لامحدود چیزیں حضور ﷺ کو بتائیں مستقبل کے متعلق، دُنیا میں آنے والے بڑے بڑے واقعات حدیث شریف میں حضور ﷺ نے بیان فرمائے، قیامت کے حالات، جنت دوزخ کے واقعات، آخرت کے، سب حضور ﷺ نے بیان فرمائے، لیکن اللہ کے بتانے کے تحت، جتنا اللہ بتادے اتنا پتا ہے، جو نہ بتائے مجھے کچھ پتا نہیں کہ کیا ہوگا، کیا نہیں ہوگا؟ اِن الفاظ کی مراد سمجھ گئے؟ یعنی جو اللہ بتائے اُس کا پتا چلتا ہے، باقی! میری طرف سے یہ دعویٰ کوئی نہیں کہ میں ہر ہر چیز کو جانتا ہوں، جتنا اللہ بتادے، جو کچھ اُس نے بتادیا معلوم ہوگیا، دُنیا کے بے شمار واقعات حضور ﷺ نے پیش گوئی کے طور پر ذکر فرمائے اللہ کے بتانے کے ساتھ، اور آخرت کی باتیں بھی واضح کیں۔ ''نہیں پیروی کرتا میں مگر اُس چیز کی جو وحی کی جاتی ہے میری طرف، اور نہیں ہوں میں مگر صریح ڈرانے والا۔''

قُلْ اَرَءَیْتُمْ: آپ اِن سے پوچھیے کہ تم مجھے بتلاؤ، اِنْ كَانَ مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَكَفَرْتُمْ بِهٖ: اگر یہ قرآن اللہ کی جانب سے ہوا اور تم نے اِس کا انکار کیا، وَشَهِدَ شَاهِدٌ مِّنْۢ بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ عَلٰی مِثْلِهٖ: اور بنی اسرائیل میں سے ایک گواہ نے گواہی دے دی اس جیسی کتاب پر، فَاٰمَنَ: پھر وہ تو ایمان لے آیا، وَاسْتَكْبَرْتُمْ: اور تم نے تکبر کیا، جزاء محذوف ہے ''پھر تم سے بڑھ کے گمراہ کون ہوگا، تم سے بڑھ کے ظالم کون ہوگا''، یعنی اگر یہ اللہ کی جانب سے ہو جیسا کہ واقع ہے، اور تم نے کیا انکار، اور اُدھر بنی اسرائیل کا شاہد اس جیسی کتاب کے اوپر گواہی دیتا ہے، بنی اسرائیل کے شاہد سے موسیٰ علیہ السلام بھی مراد ہو سکتے ہیں، عام اسرائیلی بھی مراد ہو سکتے ہیں، جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب توراۃ کو قبول کیا، چونکہ توراۃ بھی اِس جیسی کتاب تھی، جیسی باتیں اِس میں ہیں ویسی اُس میں ہیں، جو حقائق قرآنِ کریم میں پیش کیے گئے ہیں اسی قسم کے حقائق توراۃ میں تھے، تو توراۃ کو صحیح سمجھ لینا یہ ایک قسم کی قرآنِ کریم جیسی چیز کے اوپر شہادت ہے، یا جب توراۃ کی تصدیق کردی گئی تو اس کے ضمن میں قرآنِ کریم کی تصدیق بھی ہوگئی، کیونکہ توراۃ کے اندر قرآنِ کریم کی پیش گوئی موجود ہے، مطلب یہ ہے کہ اہلِ علم طبقہ، بنی اسرائیل، وہ تو سارے کے سارے قرآن کو یا قرآن جیسی کتابوں کو مانے بیٹھے ہیں، کیونکہ وہ اپنی کتابوں کو پڑھتے تھے اور یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ ایک کتاب ایسی اُترنے والی ہے، یا جب توراۃ کو تسلیم کرلیا تو توحید، رسالت، معاد کے متعلق اُن تمام باتوں کو تسلیم کرلیا جو قرآنِ کریم بیان کرتا ہے، اور تم انکار کرتے رہے تو تم سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا؟ ''بے شک اللہ تعالیٰ ظالموں کو سیدھا راستہ نہیں دکھاتا'' اُن کو یہ باتیں سمجھ میں نہیں آتیں، جس وقت تک ظلم سے توبہ نہ کریں، عدل و انصاف کے ساتھ سوچنے کی کوشش نہ کریں، اس وقت تک یہ حقائق سمجھ میں نہیں آتے، اِنَّ اللّٰهَ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ: اللہ تعالیٰ ظالم لوگوں کو ہدایت نہیں دیتے۔

وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْ كَانَ خَيْرًا مَّا سَبَقُوْنَآ

کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا ان لوگوں کے متعلق جو ایمان لائے کہ اگر یہ دین خیر ہوتا تو یہ لوگ ہم سے سبقت نہ لے جاتے

اِلَيْهِ ۭ وَاِذْ لَمْ يَهْتَدُوْا بِهٖ فَسَيَقُوْلُوْنَ هٰذَآ اِفْكٌ قَدِيْمٌ ⑪ وَ

اس خیر کی طرف جب ان کافروں نے اِس قرآن کے ساتھ ہدایت حاصل نہ کی تو ضرور کہیں گے کہ یہ تو پُرانا جھوٹ ہے ⑪ اور

مِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰٓى اِمَامًا وَّرَحْمَةً ۭ وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ

اس قرآن سے پہلے موسیٰ کی کتاب ہے اس حال میں کہ وہ اِمام اور رحمت ہے اور یہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے، اس حال میں کہ

لِّسَانًا عَرَبِيًّا لِّيُنْذِرَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ڰ وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِيْنَ ⑫ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا

یہ عربی زبان میں ہے، تاکہ ڈرائے ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا اور یہ بشارت ہے نیکوکاروں کے لئے ⑫ بے شک وہ لوگ جو کہہ دیتے ہیں

رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ⑬ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ

کہ ہمارا ربّ اللہ ہے پھر اسی کے اُوپر جم جاتے ہیں، نہ انہیں کوئی خوف ہوگا نہ یہ غم زدہ ہوں گے ⑬ یہی لوگ جنّت والے ہیں،

خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ⑭ وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ

ہمیشہ رہیں گے اس میں، بدلہ دیے گئے یہ ان کاموں کا جو یہ کرتے تھے ⑭ ہم نے تاکیدی حکم دیا انسان کو

بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا ۭ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ

اس کے والدین کے متعلق اچھا برتاؤ کرنے کا، اُٹھایا اس انسان کو اس کی ماں نے اس حال میں کہ وہ مشقت والی تھی اور وضع کیا اس کو

كُرْهًا ۭ وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا ۭ حَتّٰٓي اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَ

اس حال میں کہ وہ مشقت والی تھی، اور اُس انسان کو اُٹھانا اور اس کو جدا کرنا تیس مہینے میں ہے، حتّٰی کہ جس وقت اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور

بَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۙ قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ

چالیس سال کی مدت کو پہنچ جاتا ہے پھر وہ کہتا ہے: اے میرے ربّ! مجھے مداومت دے اس بات پر کہ میں شکر ادا کروں

نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ وَاَصْلِحْ لِيْ

اس احسان کا جو تُو نے میرے پہ کیا اور میرے والدین پہ کیا، اور میں نیک عمل کروں جس کو کہ تُو پسند کرتا ہے، اور میرے لیے دُرستی کر

فِيْ ذُرِّيَّتِيْ ۚ اِنِّيْ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاِنِّيْ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ نَتَقَبَّلُ

دے میری اولاد میں، میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں، میں فرماں برداروں میں سے ہوں ﴿۱۵﴾ یہی لوگ ہیں کہ ہم قبول کرتے ہیں

عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَيِّاٰتِهِمْ فِيْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ ۭ

ان کی طرف سے ان کے بہترین اعمال کو اور ان کے بُرے اعمال سے ہم درگزر کر جاتے ہیں، اور یہ لوگ اصحابِ جنت میں ہوں گے،

وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِيْ كَانُوْا يُوْعَدُوْنَ ﴿۱۶﴾ وَالَّذِيْ قَالَ لِوَالِدَيْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ

اس سچے وعدے کی وجہ سے جو یہ کیے جاتے تھے ﴿۱۶﴾ اور وہ شخص جو کہ اپنے والدین کو کہتا ہے کہ تمہارے لئے تف ہو،

اَتَعِدٰنِنِيْٓ اَنْ اُخْرَجَ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِيْ ۚ وَهُمَا

کیا تم مجھے ڈراتے ہو اس بات سے کہ میں نکالا جاؤں گا؟ حالانکہ بہت سی جماعتیں مجھ سے پہلے گزر گئیں، اور وہ دونوں کے دونوں

يَسْتَغِيْثٰنِ اللّٰهَ وَيْلَكَ اٰمِنْ ۤ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ښ فَيَقُوْلُ مَا

اللہ کے سامنے فریاد کرتے ہیں، (اور اُسے کہتے ہیں:) تیرا ناس ہو! تُو ایمان لے آ! بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، وہ کہتا ہے: نہیں

هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۱۷﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ حَقَّ عَلَيْهِمُ الْقَوْلُ فِيْٓ اُمَمٍ

ہیں یہ مگر پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں ﴿۱۷﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان کے اُوپر بات ثابت ہوگئی اس حال میں کہ یہ شامل ہیں ان جماعتوں میں

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِيْنَ ﴿۱۸﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ

جو ان سے پہلے گزر گئیں جنوں اور انسانوں کی، بے شک یہ سارے خسارہ پانے والے ہیں ﴿۱۸﴾ جو کچھ انہوں نے کیا اس کی وجہ سے

مِّمَّا عَمِلُوْا ۚ وَلِيُوَفِّيَهُمْ اَعْمَالَهُمْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ

ہر کسی کے لئے مختلف درجات ہیں، تاکہ اللہ پورا پورا دے ان کو ان کے اعمال، اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے ﴿۱۹﴾ جس دن کہ پیش کیے جائیں گے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا ۚ فَالْيَوْمَ

کافر آگ پر، (انہیں کہا جائے گا:) لے گئے تم اپنی پاکیزہ چیزیں اپنی دُنیوی زندگی میں اور تم نے ان سے فائدہ اُٹھالیا، پس آج

تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ ﴿۲۰﴾ ع

بدلہ دیئے جاؤ گے تم ذلت کا عذاب بسبب اس کے کہ تم اکڑا کرتے تھے زمین میں ناحق، اور بسبب اس کے کہ تم نافرمانی کیا کرتے تھے ﴿۲۰﴾

تفسیر

منکرین کی ہٹ دھرمی، اور قرآن کی عظمت

وَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَوْ کَانَ خَیْرًا مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَیْهِ: کہتے ہیں وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اُن لوگوں کے متعلق جو ایمان لائے، لَوْ کَانَ خَیْرًا: اگر یہ دِین بہتر ہوتا، اگر یہ دِین خیر ہوتا، مَّا سَبَقُوْنَاۤ اِلَیْهِ: تو یہ لوگ ہم سے سبقت نہ لے جاتے اِس خیر کی طرف۔ مشرکین کہتے تھے کہ اگر واقعی یہ کوئی چیز اچھی ہوتی تو ہم اس کو آگے بڑھ کر قبول کرتے، اس کی کیا وجہ ہے کہ سمجھ دار لوگ، عقل مند لوگ تو اس کو مان نہیں رہے، اور یہ غریب فقیر جن کے پاس کچھ کھانے کو نہیں، جن کو کوئی عقل نہیں، یہ سارے کے سارے مانے بیٹھے ہیں۔ اس طرح سے وہ مسلمانوں کی تحقیر بھی کرتے تھے اور اپنے دِل کو ایک جھوٹی تسلی بھی دیتے تھے، اگر یہ دِین کوئی اچھی چیز ہوتی تو جس طرح سے باقی خیر برکت، مال دولت سب ہمارے پاس ہے تو یہ غریب آگے بڑھ کے اِس کو لے نہ سکتے، بلکہ پھر ہم ہی قبول کرتے، ''نہ سبقت لے جاتے یہ لوگ ہم سے اِس دِین کی طرف'' وَاِذْ لَمْ یَهْتَدُوْا بِهٖ: جب اِن کافروں نے اِس قرآن کے ساتھ ہدایت حاصل نہ کی فَسَیَقُوْلُوْنَ هٰذَاۤ اِفْكٌ قَدِیْمٌ: تو ضرور کہیں گے کہ یہ تو پُرانا جھوٹ ہے، چونکہ یہ چیز اِن کے لئے راہنمائی کا ذریعہ نہیں بن رہی تو کہتے ہیں یہ پُرانی باتیں ہیں، پُرانے لوگ بھی کرتے تھے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اُٹھنا ہے، اور بھی باتیں پُرانے زمانے میں ہوا کرتی تھیں کہ اللہ ایک ہی ہے، کوئی اور نہیں ہے، اسی قسم کا پُرانا جھوٹ چلا آرہا ہے، تو قرآنِ کریم کو وہ اِفكٌ قدیم کہیں گے، وَمِنْ قَبْلِهٖ كِتٰبُ مُوْسٰۤى اِمَامًا وَّرَحْمَةً: اور واقعہ یہ ہے کہ اِس قرآن سے پہلے کتاب موسیٰ موجود ہے جو کہ اِمام اور رحمت تھی، امام: رہنمائی کرنے والی، رَحْمَةً: اللہ کی رحمت حاصل ہونے کا ذریعہ، تو جیسے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب اِمام و رحمت تھی اسی طرح سے یہ بھی اِمام ورحمت ہے، ''اِس قرآن سے پہلے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے اس حال میں کہ وہ اِمام اور رحمت ہے'' وَهٰذَا كِتٰبٌ مُّصَدِّقٌ: اور یہ کتاب تصدیق کرنے والی ہے اُسی توراۃ کی، یا، اس کی پیش گوئیوں کا مصداق بننے والی ہے، لِّسَانًا عَرَبِیًّا: اس حال میں کہ یہ عربی زبان میں ہے، لِّیُنْذِرَ الَّذِیْنَ ظَلَمُوْا: تاکہ ڈرائے ان لوگوں کو جنہوں نے ظلم کیا، وَبُشْرٰى لِلْمُحْسِنِیْنَ: اور یہ بشارت ہے نیکوکاروں کے لئے، جو صفتِ احسان کو اپنالیں، ہر کام کو اچھی طرح سے کریں، اللہ کو حاضر ناظر جان کر کام کرنے والے ہوں، جس طرح سے اِحسان کا معنیٰ نقل کیا گیا ہے ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ'' احسان یہی ہے کہ تم اللہ کی عبادت ایسے کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، تم نہیں دیکھ رہے تو وہ تو دیکھ ہی رہا ہے، یہ تصور جما کر جو اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں وہ محسنین ہیں، اُن کے لئے یہ بشارت ہے۔

اہلِ اِستقامت کے لئے اِنعام

اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا: بے شک وہ لوگ جو کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے، اللہ کی رُبوبیت کا اقرار کرلیتے ہیں، اور پھر اسی کے اُوپر ڈٹ جاتے ہیں، جم جاتے ہیں، اِستقامت اختیار کرتے ہیں، اُن کا قدم پھسلتا نہیں ہے اس

عقیدے سے۔ اور یہ بارہا آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق رَبّ ہونے کا عقیدہ یہی تمام صحیح عقائد کی بنیاد ہے، یہی وجہ ہے کہ بدء فطرت میں اللہ تعالیٰ نے ''اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟'' کہہ کر یہی بات ہمارے قلوب میں ڈالی، کہ کیا میں تمہارا رَبّ نہیں ہوں؟ تو رَبّ ہونے کا اقرار کروایا۔ اور دُنیا کے اندر رہتے ہوئے بھی اسی رُبوبیت کے اُوپر جمنے کی تلقین ہے، مرنے کے بعد امتحانی پرچہ جو آئے گا تو اس میں سب سے پہلے سوال یہی ہے کہ ''مَنْ رَّبُّكَ؟'' معلوم ہوتا ہے کہ اگر رَبّ کا مفہوم صحیح طور پر سمجھ لیا جائے اور اللہ تعالیٰ کو رَبّ قرار دے دیا جائے تو توحید کی بنیاد خود بخود قائم ہوجاتی ہے، کہ جب آپ دیکھیں گے کہ پیدا کرنے والا وہی، پالنے والا وہی، حاجات اور ضروریات پوری کرنے والا وہی، جیسے کہ رَبّ کا مفہوم ہے، تو پھر آخر خود عقل فیصلہ دیتی ہے کہ پھر عبادت بھی اسی کی، اطاعت بھی اسی کی، قصہ ختم! تو اللہ کو رَبّ کہہ دینا گویا کہ تمام دِین کو صحیح طور پر قبول کرلینا ہے، اور پھر اس کے اُوپر ڈٹ جائیں، جم جائیں، ''جو لوگ کہہ دیتے ہیں کہ ہمارا رَبّ اللہ ہے پھر اس کے اُوپر جم جاتے ہیں، اِستقامت اختیار کرتے ہیں'' فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ: نہ انہیں کوئی خوف ہوگا، نہ یہ غم زدہ ہوں گے، قیامت کے دِن کامیابی انہی کے لئے ہوگی، ''یہی لوگ جنت والے ہیں، ہمیشہ رہیں گے اس میں، بدلہ دیے گئے وہ اس چیز کا جو وہ کیا کرتے تھے'' جَزَآءًۢ بِمَا ...... ''یہی جنت والے ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُس میں، بدلے کی وجہ سے اُن کاموں کا جو یہ کرتے ہیں، یا، بدلہ دیے گئے یہ ان کاموں کا جو یہ کرتے تھے۔''

والدین کے حقوق ادا کرنے کی تاکید

وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَيْهِ اِحْسٰنًا: آگے والدین کے حقوق ادا کرنے کی تاکید ہے۔ جس طرح سے اللہ تعالیٰ اپنی عبادت کی طرف متوجہ کرتا ہے تو دُنیوی طور پر والدین کی خدمت اور ان کے ساتھ احسان کی طرف متوجہ کرتا ہے، ان دونوں باتوں کے اندر جوڑ سورۂ لقمان میں آپ کے سامنے ذِکر کردیا گیا تھا، وَوَصَّيْنَا الْاِنْسَانَ: ہم نے تاکید کی انسان کو، تاکیدی حکم دیا انسان کو اس کے والدین کے متعلق اچھا برتاؤ کرنے کا۔ احسان: اچھا برتاؤ کرنا۔ حَمَلَتْهُ اُمُّهٗ كُرْهًا وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا: اُٹھایا اس انسان کو اس کی ماں نے، كُرْهٌ: مشقت کو کہتے ہیں ذَاتَ كُرْهٍ کے معنی میں ہوکر حملت کے فاعل اُمُّهٗ سے حال ہے، ''اس حال میں کہ وہ مشقت والی تھی'' وَّوَضَعَتْهُ كُرْهًا: اور وضع کیا اُس انسان کو اس کی ماں نے اس حال میں کہ وہ مشقت والی تھی، مشقت کے ساتھ پیٹ میں اُٹھایا کتنی دیر تک، اور مشقت کے ساتھ ہی اس کو جنا، یہ دونوں وقت ہی عورت کے لئے بہت تکلیف کے ہوتے ہیں، جب بچہ پیٹ میں ہوتا ہے تو اس وقت بھی عورت تکلیف اُٹھاتی ہے، اور جب بچہ جنا جاتا ہے تو اس وقت بھی تکلیف ہوتی ہے، وَحَمْلُهٗ وَفِصٰلُهٗ ثَلٰثُوْنَ شَهْرًا: اور اُس انسان کو اُٹھانا اور اس کو جدا کرنا تیس مہینے میں ہے، اس کے حمل وفصال کی مدت تیس مہینے ہے، ''تیس مہینے'' کس طرح سے؟ حمل کی کم از کم مدت فقہاء کے نزدیک چھ مہینے ہے، چھ مہینے سے پہلے بچہ پیدا ہو تو وہ بچہ کامل نہیں ہوتا اور زِندہ نہیں رہ سکتا، چھ مہینے کے بعد پیدا ہو تو زندہ رہ سکتا ہے، کم از کم مدت یہ ہے، اور زیادہ سے زیادہ مدت عام حالات میں کوئی متعین نہیں، کبھی نو مہینے میں بچہ ہوجاتا ہے، کبھی دسویں میں ہوجاتا ہے، کبھی گیارہویں میں ہوجاتا ہے، کبھی ساتویں میں ہوجاتا ہے، کبھی آٹھویں میں ہوجاتا ہے،

اور سال ڈیڑھ سال، دو سال تک بھی بچہ رہ سکتا ہے، تو آخری مدت اس طرح سے واقعے کے طور پر کوئی متعین نہیں ہے کہ اتنی دیر بچہ پیٹ میں رہے گا، البتہ چھ مہینے لازمی ہیں، اس لیے وضع حمل کی تو کم از کم مدت ذکر کر دی، اور آگے دودھ چھڑانا عام معمول میں دو سال میں ہوتا ہے، دو سال سے پہلے بھی چھڑا دیتے ہیں لیکن غایت دو سال ہے، کوئی بچہ ابتدا سے ہی ماں کا دودھ نہیں پیتا، کوئی دو چار مہینے کے بعد چھوڑ دیتا ہے یا چھڑا دیا جاتا ہے، لیکن زیادہ سے زیادہ دو سال تک پلاتے ہیں، جس طرح سے کہ جمہور کا مسلک ہے، اور حنفیوں کے نزدیک مفتی بہ یہی ہے کہ دو سال تک بچے کا دودھ چھڑا دینا چاہیے، تو رضاعت کی آخری مدت ذکر کر دی گئی اور حمل کی ابتدائی مدت ذکر کر دی گئی، چونکہ واقعے کے لحاظ سے متعین یہی ہیں، حمل کی زائد مدت کو متعین نہیں کیا جاسکتا، کہ واقعات مختلف ہیں، اسی طرح دودھ چھڑانے کی کم مدت کو متعین نہیں کیا جاسکتا، کہ واقعات مختلف ہیں، اس لیے کہہ دیا کہ اس کا پیٹ میں اُٹھانا اور دودھ چھڑانا یہ عام حالات میں "تیس مہینے" میں ہوتا ہے۔ اور اگر بچہ نو مہینے میں پیدا ہو تو بھی اکثر و بیشتر عادت ہے کہ دو سال کا ہونے سے پہلے پہلے ہی وہ دودھ چھوڑ دیتا ہے، اکیس مہینے میں یعنی پونے دو سال میں عموماً دودھ چھوڑ دیتا ہے، تو متوجہ ادھر کرنا ہے کہ ماں دیکھو! کتنی طویل مشقت اُٹھاتی ہے، کتنی مدت تک بچے کی اس طرح سے خدمت کرتی ہے، اس لیے ماں زیادہ احسان اور زیادہ اچھے برتاؤ کی مستحق ہے، ان تکلیفوں میں اگرچہ باپ بھی کسی درجے میں شریک ہے، لیکن واقع کے لحاظ سے خرچ کی ذمہ داری تو باپ پر ہوتی ہے، لیکن خدمت جس طرح سے والدہ کرتی ہے، باپ اس طرح سے خدمت نہیں کرسکتا، جس طرح سے آپ رویا کرتے تھے، بے وقت پیشاب کر دیا کرتے تھے، بے وقت پاخانہ کرتے تھے، مردوں کے بس میں پڑے ہوئے ہوتے تو وہ مار مار کے حلیہ بگاڑ دیتے، یہ ماں کا تحمل ہے کہ سب کچھ برداشت کر لیتی ہے، اس لیے اس کو خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک آدمی نے پوچھا تھا کہ یارسول اللہ! میرے اچھے برتاؤ کا مستحق کون ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: تیری ماں! پھر پوچھا کہ پھر؟ پھر فرمایا: تیری ماں! اس نے کہا: پھر؟ فرمایا: تیری ماں! اس نے کہا: پھر؟ پھر فرمایا: تیرا باپ![1] تین درجے ذکر کیے ماں کے اور چوتھے درجے میں ذکر کیا باپ کو، اور یہاں بھی دیکھو کہ تین درجے کی تکلیفیں واضح کی گئی ہیں، پہلے حمل کی تکلیف ہوگئی، پھر وضع کی تکلیف ہوگئی، پھر دودھ پلانے کی اور چھڑانے کی تکلیف ہوگئی، تو یہ مسلسل تکلیفیں عورت جو اُٹھاتی ہے اس کی بنا پر یہ بچے کی طرف سے، اولاد کی طرف سے یہ خدمت کی زیادہ حق دار ہے، اگرچہ اطاعت اور فرماں برداری باپ کی، کیونکہ جو آپ کا باپ ہے، آپ کی ماں بھی اس کی فرماں بردار ہے، وہ آپ کی ماں پر بھی حاکم ہے، اس لیے جہاں اطاعت اور فرماں برداری کی بات ہوگی وہاں ترجیح باپ کو ہے، لیکن جہاں خدمت گزاری اور اچھے سلوک کا معاملہ ہوگا وہاں ترجیح ماں کو ہے۔

فرماں بردار اولاد کا طرزِ عمل

حَتّٰٓى اِذَا بَلَغَ اَشُدَّهٗ وَبَلَغَ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً: حَتّٰى کا مطلب یہ ہے کہ بچہ پیدا ہونے کے بعد، دودھ چھوڑنے کے بعد نشوونما پاتا رہتا ہے، حتیٰ کہ جس وقت اپنی جوانی کو پہنچ جاتا ہے اور چالیس سال کی مدت کو پہنچ جاتا ہے، جس میں جا کر عقل کامل ہو جاتی ہے،

(۱) بخاری ۲/ ۸۸۳ باب من احق الناس بحسن الصحبة۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۱۸ باب البر والصلة کی پہلی حدیث۔

طبعی تقاضے کمزور ہو جاتے ہیں، قَالَ رَبِّ اَوْزِعْنِیْٓ: پھر وہ بچہ کہتا ہے......! سعادت منداولاد کا کام یہ ہے کہ والدین کے لئے پھر وہ یوں جذبات ظاہر کرتے ہیں، اَوْزِعْنِیْٓ: اے میرے رَبّ! مجھے روک کے رکھ، یعنی مجھے توفیق دے، مداومت دے اس بات پر کہ میں شکرادا کروں اس احسان کا جو تُو نے میرے پہ کیا اور میرے والدین پہ کیا، اور مجھے توفیق دے مجھے مداومت عطافرما کہ میں نیک عمل کروں جس کو کہ تُو پسند کرتا ہے، اور میرے لیے دُرستی کردے میری اولاد میں، یعنی میری اولاد کو نیک کردے، اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ: میں تیری طرف توبہ کرتا ہوں، وَاِنِّیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ: میں فرماں برداروں میں سے ہوں۔ سمجھ دار، جن کی عقل ٹھیک ہوتی ہے وہ اس قسم کے جذبات کا اظہار کرتے ہیں، اللہ کی نعمتوں کی شکرگزاری کرتے ہیں، اپنے والدین کے متعلق اچھے جذبات رکھتے ہیں، اپنی اولاد کی نیکی چاہتے ہیں، اور اپنے لیے نیک اعمال مانگتے ہیں، اپنی کوتاہیوں سے اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ کرتے ہیں، اپنی فرماں برداری کا اظہار کرتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ نَتَقَبَّلُ عَنْهُمْ اَحْسَنَ مَا عَمِلُوْا: یہی لوگ ہیں کہ ہم قبول کرتے ہیں ان کی طرف سے ان کے بہترین اعمال کو، وَنَتَجَاوَزُ عَنْ سَیِّاٰتِهِمْ: اور ان کے بُرے اعمال سے ہم درگزر کر جاتے ہیں، اور یہ لوگ اَصحابِ جنّت میں ہوں گے، کَائِنِیْنَ فِیْٓ اَصْحٰبِ الْجَنَّةِ...... وَعْدَ الصِّدْقِ الَّذِیْ كَانُوْا یُوْعَدُوْنَ: پورا کیا اللہ نے وہ سچا وعدہ جو ان سے کیا جاتا تھا، اَنْجَزَ وَعْدَ الصِدقِ...... یا، نَتَقَبَّلُ، نَتَجَاوَزُ کے ساتھ جوڑ دیں، اُس سچے وعدے کی وجہ سے جو یہ کیے جاتے تھے، تو یہ (وَعْدَ الصِّدْقِ) مفعول لہ کے طور پر بھی آسکتا ہے۔ یا ''اللہ نے وہ سچا وعدہ پورا کیا'' یا ''ہم ان کے عمل کو قبول کرتے ہیں اور ان کی بُرائیوں سے درگزر کرتے ہیں سچے وعدے کی وجہ سے جو یہ کیے جاتے تھے۔''

نافرمان اولاد کا طرزِ عمل

اب دُوسری طرف بدبخت لوگ آگئے، وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ: اور وہ شخص جو کہ اپنے والدین کو کہتا ہے کہ تمہارے لئے تف ہو، اُفٍّ لَّكُمَآ، یہ ''اُفٍّ'' جھڑک کا کلمہ ہے، ماں باپ کوئی نیکی کی نصیحت کرتے ہیں تو وہ آگے سے ''تف'' کہتا ہے، فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ (سورۂ اسراء: ۲۳) یہ لفظ پہلے آیا ہے نا؟ یہ ''اُف'' ایسے ہی ہے جس طرح سے ''تُف'' کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اپنے ماں باپ کو جھڑک دیتا ہے، ''اور وہ شخص جو اپنے والدین سے کہتا ہے کہ تمہارے لیے تُف''، تو وَالَّذِیْ قَالَ لِوَالِدَیْهِ اُفٍّ لَّكُمَآ یہ شقی اور بدبخت کا ذِکر آگیا جس طرح سے پہلے سعید اور نیک بخت کا ذِکر تھا، حاصل اس کا یہ ہے کہ والدین نیک ہیں، مؤمن ہیں، بچے کو نصیحت کرتے ہیں، خاص طور پر جب بچہ جب کافر ہو تو اسے کہتے ہیں دیکھ! تُو یہ عقیدہ رکھ کہ مَرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہونا ہے۔ تو وہ آگے سے جھڑکتا ہے، کہتا ہے: ''تم پر تف ہو! کیا تم مجھے ایسی باتوں سے ڈراتے ہو کہ مرنے کے بعد دوبارہ نکالا جاؤں گا؟ کتنے لوگ پہلے مر گئے؟ کبھی کوئی دوبارہ اُٹھتا ہوا دیکھا ہے؟'' اس طرح سے ماں باپ کو جھڑکتا ہے اور ان کی اچھی بات کو بھی قبول نہیں کرتا، ''اور وہ شخص جو کہتا ہے اپنے والدین کو کہ تمہارے لیے اُف ہے'' اَتَعِدٰنِنِیْٓ: وَعَدَ یَعِدُ: وعدہ کرنا، اور وعید مصدر ہو تو ڈرانے کے معنی میں ہوتا ہے، ''کیا تم مجھے ڈراتے ہو اس بات سے کہ میں نکالا جاؤں گا؟'' یعنی مرنے کے بعد قبروں سے دوبارہ اُٹھایا جاؤں گا، تم مجھے اس بات سے ڈراتے ہو؟ وَقَدْ خَلَتِ الْقُرُوْنُ مِنْ قَبْلِیْ: حالانکہ بہت ساری جماعتیں مجھ سے پہلے گزر گئیں، وَهُمَا

یَسْتَغِیْثٰنِ اللّٰہَ اور وہ دونوں کے دونوں اللہ کے سامنے فریاد کرتے ہیں، وَیْلَكَ اٰمِنْ: اور اسے کہتے ہیں او! تیرا ستیاناس ہوجائے، تو ایمان لے آ، وَیْلَكَ: تیری خرابی، تو ایمان لے آ، اللہ کے سامنے فریادیں کرتے ہیں کہ اللہ اسے ایمان کی توفیق دے دے، اور اِسے کہتے ہیں کہ وَیْلَكَ اٰمِنْ: تیرا ناس ہو، تو ایمان لے آ، اِنَّ وَعْدَ اللّٰہِ حَقٌّ: بے شک اللہ کا وعدہ سچا ہے، فَیَقُوْلُ: وہ کہتا ہے مَا هٰذَآ اِلَّآ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ: نہیں ہیں یہ مگر پہلے لوگوں کے قصے کہانیاں، یہ تو پہلوں سے باتیں چلی آرہی ہیں، تم نے بھی ویسے ٹن کے کرنی شروع کردیں، والدین کی بات پہ وہ کان ہی نہیں دھرتا۔

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ حَقَّ عَلَیْهِمُ الْقَوْلُ: یہی لوگ جو والدین کی باتوں کو یوں ٹھکراتے ہیں، نہ اللہ کی مانتے ہیں، نہ والدین کی مانتے ہیں، والدین اللہ کی بات ان کو سمجھاتے ہیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتی، ''یہی لوگ ہیں کہ ان کے اُوپر بات ثابت ہوگئی اس حال میں کہ یہ شامل ہیں اُن جماعتوں میں جو ان سے پہلے گزرگئیں جنوں اور انسانوں کی'' جنوں اور انسانوں کی جو کافر جماعتیں گزرگئیں ان میں یہ بھی شامل ہیں، اِنَّهُمْ كَانُوْا خٰسِرِیْنَ: بے شک یہ سارے کے سارے خسارہ پانے والے ہیں۔ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا: ہر کسی کے لئے درجے ہیں اس کے عمل کی وجہ سے، بُروں کو بُرے مل جائیں گے، اچھوں کو اچھے مل جائیں گے، مَا عَمِلُوْا: جو کچھ انہوں نے کیا اُس کی وجہ سے ہر کسی کے لئے مختلف درجات ہیں، وَلِیُوَفِّیَهُمْ اَعْمَالَهُمْ: اللہ تعالیٰ یہ کام کرے گا تاکہ پورا پورا دے ان کو ان کے اعمال، وَهُمْ لَا یُظْلَمُوْنَ: اور وہ ظلم نہیں کئے جائیں گے، وَیَوْمَ یُعْرَضُ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ: جس دِن کہ پیش کئے جائیں گے کافر آگ پر، یُقَالُ لَهُمْ انہیں کہا جائے گا اَذْهَبْتُمْ طَیِّبٰتِكُمْ فِیْ حَیَاتِكُمُ الدُّنْیَا: لے گئے تم اپنی پاکیزہ چیزیں اپنی دُنیوی زندگی میں وَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهَا: اور تم نے ان سے فائدہ اٹھالیا، فَالْیَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ: پس آج بدلہ دیئے جاؤ گے تم ذِلّت کا عذاب، بِمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ: بسبب اس کے کہ تم اکڑا کرتے تھے زمین میں ناحق وَبِمَا كُنْتُمْ تَفْسُقُوْنَ: بسبب اس کے کہ تم نافرمانی کیا کرتے تھے، یعنی کافروں کو یہ کہا جائے گا کہ تمہاری نافرمانی کی اور تمہارے تکبر کی سزا تو اب مل رہی ہے۔

''دُنیا'' کافر کے لئے جنّت اور مؤمن کے لئے جیل ہے

باقی! اگر تم نے کوئی اچھے کام کئے تھے، تو ان سے تم نے دُنیوی زندگی میں فائدہ اُٹھالیا، جس طرح سے روایات کے اندر واضح کیا گیا ہے کہ کافر کی نیکیاں چونکہ صورۃً نیکیاں ہوتی ہیں، ان نیکیوں کی بنیاد کوئی قلب میں صحیح عقیدے پہ نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ اُس کا بدلہ بھی صورۃً دیدیتے ہیں، دُنیا میں عزت دے دی، دولت دے دی، راحت دے دی، صحت دے دی، شہرت دے دی، یہ کافر کو اس کی نیکیوں کے بدلے کے طور پر دنیا میں مل جاتا ہے، اور جب آخرت میں جائے گا تو اس کے پاس کوئی نیکی نہیں ہوگی جس کا اس کو بدلہ دیا جائے۔ بالکل اس طرح سے جس طرح سے مؤمن کا جو گناہ ہے وہ ایک بہت سرسری سی چیز ہوتی ہے، کیونکہ عقیدے پر اس کی بنیاد نہیں ہوتی، عقیدہ تو صحیح ہوتا ہے، تو قلب میں اس گناہ کی بنیاد نہیں ہوتی، تو اللہ تعالیٰ بسا اوقات اس قسم کے گناہوں کو دُنیا میں سزاؤں کے ذریعے معاف کردیتے ہیں، جب آخرت میں جائیں گے تو کوئی گناہ ذمے نہیں ہوگا، نیکیاں باقی ہوں گی، مؤمن کی نیکیوں کی بنیاد صحیح ہوتی ہے، کافر کے گناہوں کی بنیاد صحیح ہوتی ہے، مؤمن کی بُرائیاں ایک سرسری ہوتی ہیں، چونکہ ان کی بنیاد کسی غلط

عقیدے پہ نہیں ہوتی، اور کافر کی نیکیاں سرسری ہوتی ہیں، چونکہ ان کی بنیاد کسی عقیدے پہ نہیں ہوتی، اس لیے سرسری نیکی کا بدلہ اللہ تعالیٰ کافر کو دُنیا میں دے دیتے ہیں، اور مؤمن کو اس کے سرسری گناہوں کی سزا دُنیا میں دے دیتے ہیں، جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ "اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ وَجَنَّۃُ الْکَافِرِ"(۱) جنت اپنی نیکیوں کے فائدہ اُٹھانے کی جگہ ہے، اس لئے دُنیا کافر کے لئے جنت ہے، اور جیل اپنے گناہوں کی سزا پانے کی جگہ ہے، اس لئے دُنیا مؤمن کے لئے جیل ہے، اس میں اس کو گناہوں کی سزا ملتی ہے۔

عیش وعشرت دیکھ کر صحابہ کی گھبراہٹ

اس لئے بھائی! صحابہ کرام ﷡، جب ان کے سامنے دُنیا میں کوئی عیش عشرت یا کوئی اچھی چیز آتی تو فوراً متنبہ ہوتے تھے کہ یا اللہ! کہیں ہماری نیکیوں کا بدلہ تو ہمیں دُنیا میں تو نہیں دیا جا رہا، ایسا نہ ہو کہ جب ہم قیامت کے دِن آئیں تو ہمیں کہہ دیا جائے کہ اپنی نیکیوں سے تو فائدہ تم نے دُنیا میں اُٹھا لیا، یہ خیال کر کے وہ رونے لگ جاتے تھے، جب ان کے سامنے کوئی اچھی چیز آتی تھی عیش وعشرت کی، اکثر و بیشتر وہ اس سے دستبردار ہو جاتے تھے کہ ہم اس دُنیا میں لذت نہیں اُٹھانا چاہتے، تعیش نہیں کرنا چاہتے، کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری نیکیوں کا حساب یہیں بے باق کر دیا جائے، اور آخرت میں جس طرح سے اللہ تعالیٰ نے کافروں کے متعلق ذکر کیا ہے تو ہمیں بھی کہہ دیا جائے کہ تم نے تو اپنی نیکیوں سے فائدہ دُنیا میں اُٹھا لیا، حضرت عمر ﷛ کے واقعات اور اس قسم کے دوسرے حضرات کے واقعات احادیث میں موجود ہیں۔ بہر حال! کافر کی نیکی آخرت میں کام نہیں آئے گی، دُنیا کے اندر اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ جس طرح سے مناسب سمجھتے ہیں دے دیتے ہیں، چاہے اس کے بدلے میں اس کو صحت دے دیں، اولاد دے دیں، مال دولت، عزت شہرت، یہ چیزیں ہیں جو اس کی نیکیوں کے بدلے میں دُنیا میں اس کو مل جاتی ہیں، آخرت میں سوائے جہنم کے ان کے پاس کچھ نہیں ہوگا!

وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ ۭ اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ
عاد کے بھائی کا ذکر کیجئے جب ڈرایا اس نے اپنی قوم کو ریت کے ٹیلوں میں، حال یہ ہے کہ ڈرانے والے گزر گئے تھے اس سے
يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖٓ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ۭ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ
پہلے بھی اور اس کے پیچھے بھی (ڈرایا اس بات کے ساتھ) کہ نہ عبادت کرو تم مگر اللہ کی، میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دِن کے
عَظِيْمٍ ۝ قَالُوْٓا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا ۚ فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ اِنْ كُنْتَ مِنَ
عذاب کا ⑳ انہوں نے کہا: کیا آیا ہے تُو ہمارے پاس تاکہ پھیر دے تُو ہمیں ہمارے معبودوں سے؟ لے آ تُو وہ چیز جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے اگر تُو

(۱) مسلم ۴۰۷/۲، کتاب الزہد کی پہلی حدیث۔ مشکوٰۃ ۴۳۹/۲، کتاب الرقاق، فصل اول۔

الصّٰدِقِيْنَ ﴿۲۲﴾ قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ ۖ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّآ اُرْسِلْتُ بِهٖ وَلٰكِنِّيْٓ

سچوں میں سے ہے ﴿۲۲﴾ ہود علیہ السلام نے کہا کہ علم اللہ کے پاس ہے، میں پہنچاتا ہوں تمہیں وہ پیغام جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں لیکن

اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ﴿۲۳﴾ فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ ۙ قَالُوْا

میں سمجھتا ہوں تمہیں جاہل لوگ ﴿۲۳﴾ جب دیکھا ان لوگوں نے اُس عذاب کو اس حال میں کہ وہ بادل تھا ان کی وادیوں کے سامنے تو کہنے لگے

هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا ۭ بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ ۭ رِيْحٌ فِيْهَا عَذَابٌ

یہ بادل آرہا ہے جو ہم پہ برسے گا، بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم جلدی طلب کرتے تھے، یہ ایک آندھی ہے اس میں دردناک

اَلِيْمٌ ﴿۲۴﴾ تُدَمِّرُ كُلَّ شَيْءٍۢ بِاَمْرِ رَبِّهَا فَاَصْبَحُوْا لَا يُرٰٓى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ ۭ كَذٰلِكَ

عذاب ہے ﴿۲۴﴾ نیست و نابود کردے گی ہر چیز کو اپنے رَبّ کے حکم کے ساتھ، پس ہو گئے وہ لوگ کہ نہیں دیکھے جاتے مگر ان کے مکانات، ہم مجرم

نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۲۵﴾ وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ

لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں ﴿۲۵﴾ البتہ تحقیق ہم نے ان کو قدرت دی تھی اس چیز میں کہ نہیں قدرت دی ہم نے تمہیں اس چیز میں

وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ڮ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ

اور ہم نے بنائے ان کے لیے کان اور آنکھیں اور دِل، ان کے کان اور ان کی آنکھیں اور ان کے دِل ان کے کچھ کام نہ آئے

مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ ۙ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ﴿۲۶﴾ ع

جبکہ وہ انکار کرتے تھے اللہ کی آیات کا، اور گھیر لیا ان کو اس چیز نے جس کا کہ وہ استہزا کیا کرتے تھے ﴿۲۶﴾

تفسیر

قومِ عاد کا واقعہ

آگے انہی مضامین کی تائید کے طور پر واقعہ ذکر کیا جارہا ہے قومِ عاد کا، اور یہ بارہا آپ کے سامنے گزر گیا، وَاذْكُرْ اَخَا عَادٍ: عاد کے بھائی کا ذکر کیجئے، عاد کے بھائی سے مراد ''ہود علیہ السلام'' ہیں، جیسے دوسری جگہ ہے: وَاِلٰى عَادٍ اَخَاهُمْ هُوْدًا (سورۂ ہود: ۵۰) ''عاد کے بھائی کا ذکر کیجئے'' اِذْ اَنْذَرَ قَوْمَهٗ بِالْاَحْقَافِ: اس واقعے سے بِدْعًا مِّنَ الرُّسُلِ کی وضاحت بھی ہوجائے گی، کہ میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں، مجھ سے پہلے بھی رسول آئے جنہوں نے اسی قسم کی تعلیمات دیں، اس واقعہ سے اُس کی وضاحت بھی ہوجائے

گی۔ اَحقاف یہ حقف کی جمع ہے، حقف کہتے ہیں ریت کے لمبے لمبے ٹیلوں کو، اُونچے اور لمبے ٹیلے، جس طرح سے آپ تھل کے علاقے میں جائیں تو آپ کو بہت لمبے لمبے پھیلے ہوئے ٹیلے معلوم ہوں گے، کبھی سیدھے، کبھی ٹیڑھے، تو اَحقاف: ریت کے مستطیل مڑے ہوئے ٹیلے، یہ ریت کی عادت ہوتی ہے کہ اس کے ٹیلے سیدھے نہیں ہوتے، کبھی یوں مڑ گئے کبھی کس طرح سے ہو گئے، اسی قسم کا ریگستانی علاقہ تھا جس کے اندر وہ قومِ عاد آباد تھی، اور وہاں حضرت ہود علیہ السلام نے ان کو ڈرایا، اور یہ آج کل بہت بڑا ریگستان ہے جہاں یہ قوم آباد تھی، نام ونشان ان کا کوئی موجود نہیں، اور نہ وہاں کوئی آبادی ہے، نقشے کے اندر ''رُبعِ خالی'' کے عنوان کے ساتھ وہ میدان دکھایا ہوا ہوتا ہے، عمان اور یمن کے درمیان میں یہ علاقہ تھا، ''جب ڈرایا اس نے اپنی قوم کو ریت کے ٹیلوں میں۔''

حضرت ہود علیہ السلام کی تبلیغ اور قومِ عاد کی بدسلوکی

وَقَدْ خَلَتِ النُّذُرُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهٖ: یہ جملہ معترضہ یا حال ہے، حال یہ ہے کہ ڈرانے والے گزر گئے تھے اس سے پہلے بھی اور اس کے پیچھے بھی، بہت سارے ڈرانے والے گزرے ہیں ہود علیہ السلام سے پہلے بھی اور ہود کے بعد بھی، اس سے ہود علیہ السلام کی اُسی مضمون کی تائید ہوتی ہے یہ جملہ معترضہ ہے، ڈرایا اس بات کے ساتھ کہ اَلَّا تَعْبُدُوْۤا اِلَّا اللّٰهَ: نہ عبادت کرو تم مگر اللہ کی، اِنِّيْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ: میں اندیشہ کرتا ہوں تم پر بڑے دن کے عذاب کا، قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَاْفِكَنَا عَنْ اٰلِهَتِنَا: انہوں نے کہا، کیا آیا ہے تُو ہمارے پاس تا کہ پھیر دے تُو ہمیں ہمارے معبودوں سے، فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ: لے آ تُو وہ چیز جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے، اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ: اگر تُو سچوں میں سے ہے، اگر سچوں میں سے ہے تو وہ عذاب لے آ جس سے تُو ہمیں ڈراتا ہے، تَعِدُنَاۤ: وَعَدَ يَعِدُ وَعِيد سے ہے، جس چیز سے ہمیں تو ڈراتا ہے وہ لے آ، قَالَ اِنَّمَا الْعِلْمُ عِنْدَ اللّٰهِ: ہود علیہ السلام نے کہا کہ علم اللہ کے پاس ہے کہ عذاب کب آئے گا؟ وَاُبَلِّغُكُمْ مَّاۤ اُرْسِلْتُ بِهٖ: میرا کام تو یہی ہے، میں پہنچاتا ہوں تمہیں وہ پیغام جس کے ساتھ میں بھیجا گیا ہوں، وَلٰكِنِّيْۤ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ: لیکن میں سمجھتا ہوں تمہیں جاہل لوگ، میں دیکھتا ہوں تمہیں کہ تم جہالتیں کرتے ہو، کیونکہ اللہ کی بات کو مانا نہ جائے اور آگے سے ڈھٹائی دکھائی جائے یہ جاہلوں کا کام ہے، ''سمجھتا ہوں میں تمہیں جاہل لوگ۔''

قومِ عاد کی ہلاکت

فَلَمَّا رَاَوْهُ عَارِضًا: رَاَوْهُ میں ''ہٗ'' کی ضمیر ''مَا تَعِدُنَا'' کی طرف لوٹ گئی، جب دیکھا ان لوگوں نے اُس عذاب کو اس حال میں کہ وہ بادل تھا مُّسْتَقْبِلَ اَوْدِيَتِهِمْ: ان کی وادیوں کے سامنے، یعنی وادیوں کے سامنے بادل اُٹھتا ہوا نظر آیا، حقیقت کے اعتبار سے تو وہ ''مَا تَعِدُنَا'' تھا، جو عذاب کی دھمکی اُن کو دی جاتی تھی، نظر اُن کو بادل کی شکل میں آیا، دیکھ کے خوش ہو گئے، جیسے ریگستانی لوگ جو ہوا کرتے ہیں آپ جانتے ہیں کہ ان کی معیشت کا مدار زیادہ تر بارش پہ ہوتا ہے، بارشیں ہوتی ہیں تو فصل ہوتی ہے، بارانی علاقے، تو یہ علاقہ بھی ایسے تھا، ویسے بہت خوش حال قوم تھی جیسے ان کا دعویٰ نقل کیا مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حم فصلت: ۱۵) ہم سے زیادہ زور آور بھی کوئی ہے؟ ارد گرد کے سب علاقوں کے اُوپر یہ قابض تھے۔ تو جب انہوں نے اس عذاب کو دیکھا بادل کی شکل میں

جوان کی وادیوں کے سامنے تھا، قَالُوْا هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا: کہنے لگے: یہ بادل آرہا ہے جو ہم پہ برسے گا، ہم پہ بارش ہوگی، بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ: اللہ کی طرف سے کہا گیا: یہ بادل بارش برسانے والا نہیں، بلکہ یہ وہ چیز ہے جس کو تم جلدی طلب کرتے تھے رِیْحٌ: یہ ایک آندھی ہے، فِیْهَا عَذَابٌ اَلِیْمٌ: اس میں دردناک عذاب ہے، تُدَمِّرُ كُلَّ شَیْءٍۭ بِاَمْرِ رَبِّهَا نیست و نابود کردے گی ہر چیز کو اپنے رَبّ کے حکم کے ساتھ، فَاَصْبَحُوْا لَا یُرٰۤى اِلَّا مَسٰكِنُهُمْ: پس ہوگئے وہ لوگ کہ نہیں دیکھے جاتے مگر ان کے مکانات، صرف ان کے مکانات باقی رہ گئے، باقی ہر چیز ختم ہوگئی، كَذٰلِكَ نَجْزِی الْقَوْمَ الْمُجْرِمِیْنَ: ہم مجرم لوگوں کو ایسا ہی بدلہ دیا کرتے ہیں۔

کافروں نے اپنی صلاحیتیں دُنیا پر لگادیں

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِیْمَاۤ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِیْهِ: البتہ تحقیق ہم نے قدرت دی تھی اُن کو ایسی چیزوں میں کہ ہم نے تمہیں اُس چیز میں قدرت نہیں دی، یعنی جیسے خوش حالی ان کو نصیب تھی تمہیں ایسے خوش حالی نصیب نہیں ہے، مَكَّنَ تَمْكِیْن: قدرت دینا، ''ہم نے اُن کو قدرت دی تھی اُس چیز میں کہ نہیں قدرت دی ہم نے تمہیں اُس چیز میں'' وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـٕدَةً: اور ہم نے ان کے لئے کان اور آنکھیں اور دِل بنائے تھے، یعنی کانوں سے آنکھوں سے اور دِلوں سے بہت ہوشیار لوگ تھے، کان بھی تھے، ان کی آنکھیں بھی تھیں، یہاں صرف کان آنکھیں ذِکر کرنی مقصود نہیں، مطلب یہ ہے کہ کان آنکھ دِل بڑے اچھے تھے جن کے ذریعے سے انہوں نے دُنیوی ترقیاں خوب کیں، ''ہم نے بنائے ان کے لئے کان اور آنکھیں اور دِل'' فَمَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَاۤ اَبْصَارُهُمْ وَلَاۤ اَفْـٕدَتُهُمْ مِّنْ شَیْءٍ: پس نہ کچھ فائدہ پہنچایا انہیں ان کے کانوں نے، نہ ان کی آنکھوں نے، نہ ان کے دِلوں نے، مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُمْ مِّنْ شَیْءٍ یہ اکٹھا محاورہ ہوگیا، ''اُن کے کان ان کی آنکھیں اور ان کے دِل اُن کے کچھ کام نہ آئے'' اِذْ كَانُوْا یَجْحَدُوْنَ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ: جب کہ وہ انکار کرتے تھے اللہ کی آیات کا، وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ یَسْتَهْزِءُوْنَ: اور گھیر لیا ان کو اس چیز نے جس کا کہ وہ اِستہزا کیا کرتے تھے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى وَصَرَّفْنَا الْاٰیٰتِ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۲۷﴾

یہ پکی بات ہے کہ ہم نے ہلاک کیا ان بستیوں کو جو تمہارے اردگرد ہیں، اور ہم نے آیات پھیر پھیر کر بیان کیں تا کہ وہ لوٹ آئیں ﴿۲۷﴾

فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِیْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً ؕ بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ ۚ

پھر کیوں نہ مدد کی اِن کی اُنہوں نے جن کو بنایا انہوں نے اللہ کے علاوہ آلہہ تقرّب حاصل کرنے کے لئے، بلکہ وہ سب اِن سے گم ہوگئے

وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ وَمَا كَانُوْا یَفْتَرُوْنَ ﴿۲۸﴾ وَاِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ

اور یہ اِن کا جھوٹ ہے اور وہ باتیں ہیں جن کو یہ تراشتے ہیں ﴿۲۸﴾ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ پھیرا ہم نے آپ کی طرف جنوں کا ایک گروہ

يَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ ۚ فَلَمَّا حَضَرُوْهُ قَالُوْٓا اَنْصِتُوْا ۚ فَلَمَّا

وہ قرآن سنتے تھے، جس وقت وہ حاضر ہوئے اُس قرآن کے پاس تو آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ چپ ہو جاؤ، جب

قُضِيَ وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِيْنَ ﴿۲۹﴾ قَالُوْا

وہ قرآن پورا کردیا گیا تو وہ جنات اپنی قوم کی طرف پیٹھ پھیر کر چلے گئے اس حال میں کہ ڈرانے والے تھے ﴿۲۹﴾ کہنے لگے کہ

يٰقَوْمَنَآ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى مُصَدِّقًا لِّمَا

اے ہماری قوم! بےشک ہم نے سنی ایک کتاب جو اُتاری گئی موسیٰ علیہ السلام کے بعد، وہ تصدیق کرنے والی ہے اس کتاب کی جو

بَيْنَ يَدَيْهِ يَهْدِيْٓ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِيْقٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۳۰﴾ يٰقَوْمَنَآ اَجِيْبُوْا دَاعِيَ

اس سے پہلے ہے، وہ کتاب رہنمائی کرتی ہے حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف ﴿۳۰﴾ کہنے لگے کہ اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی

اللّٰهِ وَاٰمِنُوْا بِهٖ يَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ وَيُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿۳۱﴾ وَمَنْ

بات مان لو اور اس پہ ایمان لے آؤ، بخش دے گا وہ تمہیں تمہارے گناہ، اور پناہ دے گا تمہیں دردناک عذاب سے ﴿۳۱﴾ اور جو

لَّا يُجِبْ دَاعِيَ اللّٰهِ فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءُ ۭ

اللہ کے داعی کی بات نہیں مانے گا وہ عاجز کرنے والا نہیں ہے زمین میں، اور اللہ کے علاوہ اس کے لئے کوئی کارساز نہیں

اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۳۲﴾ اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ

یہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں ﴿۳۲﴾ کیا یہ مشرک دیکھتے نہیں کہ بےشک وہ اللہ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو

وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ بِقٰدِرٍ عَلٰٓى اَنْ يُّحْيِۦَ الْمَوْتٰى ۭ بَلٰٓى اِنَّهٗ

اور نہیں تھکا وہ ان کے پیدا کرنے کے ساتھ، کیا یہ اُس کو قادر نہیں مانتے اس بات پر کہ وہ مُردوں کو زندہ کردے؟ کیوں نہیں! وہ

عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۳۳﴾ وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ ۭ

ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۳۳﴾ اور جس دن کہ پیش کیا جائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا آگ پر (ان سے کہا جائے گا:)

اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ۭ قَالُوْا بَلٰى وَرَبِّنَا ۭ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿۳۴﴾

کیا یہ حق نہیں ہے؟ وہ کہیں گے کیوں نہیں ہمارے رب کی قسم! اللہ تعالیٰ کہے گا کہ چکھو عذاب بسبب اس کے کہ تم کفر کرتے تھے ﴿۳۴﴾

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ؕ كَاَنَّهُمْ يَوْمَ
جس طرح سے اُولو العزم رسولوں نے صبر کیا آپ بھی اسی طرح سے صبر کیجئے، اور آپ ان کے لئے جلدی نہ کیجئے، جس دن
يَرَوْنَ مَا يُوْعَدُوْنَ ۙ لَمْ يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنْ نَّهَارٍ ؕ بَلٰغٌ ۚ فَهَلْ
یہ لوگ دیکھیں گے اس چیز کو جس کا یہ وعدہ دیئے جاتے ہیں، گویا کہ وہ نہیں ٹھہرے مگر دِن کی ایک گھڑی، یہ پہنچا دینا ہے، پھر نہیں
يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۳۵
ہلاک کئے جائیں گے مگر فاسق لوگ ۝۳۵

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ پچھلے رُکوع میں قومِ عاد کا واقعہ ذِکر کیا گیا تھا، اور اس رُکوع کی اِبتدائی آیتیں اِسی مضمون کی تکمیل کے لئے ہیں۔

گزشتہ قوموں پر عذاب کے وقت ان کے آلہہ کام نہ آئے

وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا مَا حَوْلَكُمْ مِّنَ الْقُرٰى: لَقَدْ تاکید کے لئے ہے، یہ پکی بات ہے کہ ہم نے ہلاک کیا ان بستیوں کو جو تمہارے ردگرد ہیں، مَا حَوْلَكُمْ میں جو مَا ہے مِّنَ الْقُرٰى اسی کا بیان ہے، وَصَرَّفْنَا الْاٰيٰتِ: اور ہم نے آیات بار بار بیان کیں، پھیر پھیر کر بیان کیں، مختلف انداز سے، طرح طرح سے، لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ: تاکہ وہ لوٹ آئیں، کُفر وشرک سے توحید کی طرف رُجوع کریں، ہم نے بار بار طرح طرح سے انہیں سمجھایا، اپنی نشانیاں ان کے سامنے واضح کیں، فَلَوْلَا نَصَرَهُمُ الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قُرْبَانًا اٰلِهَةً: پھر کیوں نہ مدد کی ان کی اُنہوں نے جن کو بنایا انہوں نے اللہ کے علاوہ آلہہ، قُرْبَانًا: تقرّب حاصل کرنے کے لئے، قُربان تقرّب کے معنی میں ہے، چونکہ مشرکین اپنے شرک کا یہی فلسفہ بیان کرتے تھے کہ مَا نَعْبُدُهُمْ اِلَّا لِيُقَرِّبُوْنَآ اِلَى اللّٰهِ زُلْفٰى (سورۂ زُمر: ۳) کہ ہم نے یہ جو آلہہ اختیار کر رکھے ہیں، ان کی جو ہم عبادت کرتے ہیں تو اِلٰہِ اکبر کا قربِ حاصل کرنے کے لئے کرتے ہیں، یہ آلہہ اُس اِلٰہِ اکبر کے تابع ہیں، اِن کی عبادت کے ساتھ ہم اُس کے دربار میں قُربِ حاصل کرتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ جو آلہہ اِنہوں نے قُربِ حاصل کرنے کے لئے اختیار کر رکھے تھے، جن پر اِن کو اعتماد تھا کہ ان کی سفارش سے کام چل جاتا ہے، مصیبت کے وقت میں کام آتے ہیں، جب ہمارا عذاب آیا تو اُن آلہہ نے اِن کو کیوں نہ بچا لیا؟ جس طرح سے پچھلی آیات میں ذکر کیا گیا تھا کہ ہم نے انہیں کان دیے تھے، آنکھیں دی تھیں، دِل دیے تھے، جس سے وہ دُنیوی اُمور میں بہت سمجھدار لوگ تھے، بڑے علوم انہوں نے ایجاد کر رکھے تھے، لیکن جب اللہ کا عذاب آیا تو ان کے یہ کان، ان کی آنکھیں، ان کے دِل کچھ کام نہ آئے، بدنی صلاحیتیں کام نہ آئیں یعنی اِنفرادی صلاحیتیں، اسی طرح سے انہوں نے جو ایک سلسلہ بنا رکھا تھا آلہہ کا وہ بھی کچھ کام نہ آیا،

مشرکینِ مکہ کو یہ بات سُنائی جارہی ہے،'' لَولا'' جس طرح سے ملامت کے لئے، تندیم کے لئے آیا کرتا ہے،'' کیوں نہ مدد کی اِن کی اُنہوں نے جن کو بنایا اُنہوں نے اللہ کے علاوہ آلہہ تقرّب حاصل کرنے کے لئے' بَلْ ضَلُّوْا عَنْهُمْ: بلکہ اس مصیبت کے وقت میں سب اِن سے گم ہوگئے، کوئی ان کے پاس نہ رہا، کوئی ان کی مدد کے لئے نہ آیا،'' بلکہ وہ سب ان سے گم ہوگئے' وَذٰلِكَ اِفْكُهُمْ: اور اُن کو آلہہ قرار دینا بھی اِن کا جھوٹ ہے، اللہ کے علاوہ کوئی الٰہ ہے ہی نہیں، کوئی دوسرا ایسا شخص نہیں کہ جس کی عبادت کی جائے اللہ کا تقرّب حاصل کرنے کے لئے، اِنہوں نے جو کچھ یہ ایجاد کیا ہے سب اِن کا جھوٹ ہے،'' یہ اِن کا جھوٹ ہے' وَمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ: اور وہ باتیں ہیں جن کو یہ تراشتے ہیں۔

جنّات کے قبولِ اسلام کا واقعہ اور اس کو ذِکر کرنے سے مقصود

وَاِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ: اب آگے ایک واقعہ ذِکر کیا جارہا ہے جنوں کے ایمان لانے کا، اور اس کو ذکر کرکے بھی مشرکینِ مکہ کو تنبیہ کرنا مقصود ہے کہ جن جو کہ اپنی اصل خلقت کے اعتبار سے بمقابلہ انسانوں کے زیادہ سرکش ہیں، جب انہوں نے توجہ کے ساتھ قرآنِ کریم کو سُنا تو وہ بھی متاثر ہوگئے، اور تمہارا متاثر نہ ہونا عجیب ہے۔ اس کا واقعہ کہ جن کس طرح سے متاثر ہوئے تھے؟ قرآنِ کریم سُن کے انہوں نے آپس میں کیا باتیں کی تھیں؟ مفصل طور پر سورۂ جنّ میں اُنتیسویں پارے میں ذِکر کیا جائے گا، اور یہاں اِجمالاً ذِکر کیا گیا۔ مفسرین نے اس واقعے کی تشریح کرتے ہوئے کہا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی بعثت سے پہلے جنّات آسمان کی طرف جایا کرتے تھے اور اُوپر سے کچھ باتیں سُن لایا کرتے تھے، اور لا کے کاہنوں کو پہنچاتے، کاہن آگے پیش گوئیوں کے طور پر ذِکر کرتے، کچھ اس میں جھوٹ ملاتے، تو جو بات وہ اُوپر سے سُن کے آتے تھے وہ سچی ہوتی، تو اِس طرح سے کاہنوں کی کی ہوئی باتوں میں سے کوئی بات تو سچی نکل آتی تھی جس سے ان کی دُکان چمکتی تھی، لیکن جب سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے نبی بنا کر مبعوث کردیا تو پھر جنّات کے اُوپر سختی شروع ہوگئی، جب یہ آسمان کی طرف جاتے تھے تو ان کو فرشتوں کی طرف سے مار پڑتی تھی، پھر انہوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ اب یہ کیا واقعہ رونما ہوا ہے جس کی بنا پر یہ حالات بدل گئے، اور ہمارا آسمان کی طرف آنا جانا مشکل ہوگیا، جب ہم جاتے ہیں اور کوئی بات سننے کی کوشش کرتے ہیں تو ہمیں پیٹا جاتا ہے، ہلاک کردیا جاتا ہے، شہاب ہم پر برستے ہیں، رجم کیا جاتا ہے، تو اس واقعے کی تحقیق کے لئے وہ گھومتے پھر رہے تھے کہ دیکھیں کہ دُنیا میں کیا واقعہ پیش آیا ہے۔ تو سرورِ کائنات ﷺ طائف سے واپس آتے ہوئے ''بطنِ نخلہ'' ایک جگہ ہے، وہاں ٹھہرے ہوئے تھے، اور فجر کی نماز میں قرآنِ کریم پڑھ رہے تھے (رازی وغیرہ)، وہ ان جنوں نے سُن لیا، سننے کے بعد وہ فوراً تاڑ گئے کہ یہی ایک چیز نئی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ظاہر فرمائی اور اس کی وجہ سے ہمارا کاروبار مندہ پڑ گیا، توجہ کے ساتھ انہوں نے قرآنِ کریم سُنا، اس کی عظمت کو محسوس کیا، تو حضور ﷺ سے ملاقات کیے بغیر وہ اس کتاب پر اِجمالی طور پر اِیمان لاکر واپس چلے گئے، حضور ﷺ کو پتا نہیں چلا ان جنّات کے قرآن سننے کا اور اِیمان لانے کا، بعد میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے آپ کو اطلاع دی، جس کی تفصیل سورۂ جنّ میں ہے، اور پھر ان جنوں کا آنا بار بار ہوا، متعدد بار ان کے وفود آئے ہیں، مختلف جگہوں پر حضور ﷺ سے انہوں نے ملاقات کی ہے اور آپ

نے ان کے سامنے تبلیغ کی اور ان کو وعظ کہا، یہ بہت سارے واقعات احادیث میں آتے ہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ چونکہ انسانوں کے لئے بھی نبی اور رسول تھے اور جنّات کے لئے بھی، تو جنّات کے اندر بھی ایمان کی اشاعت اس طرح سے ہوئی، یہاں اجمالاً اُس واقعے کی طرف اشارہ کیا ہوا ہے۔

جنّات کا وجود قطعی ہے

وَاِذْ صَرَفْنَاۤ اِلَیْكَ نَفَرًا مِّنَ الْجِنِّ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب ہم نے پھیر دیا آپ کی طرف جنوں کا ایک گروہ۔ ''جِنّ'' یہ مستقل مخلوق ہیں انسانوں کی طرح، اور ان کے وجود کا تسلیم کرنا ضروریاتِ دِین میں سے ہے، اس لئے اگر کوئی شخص اس بات کا منکر ہو اور کہے کہ جنّات کوئی چیز نہیں ہیں، تو وہ بھی قرآنِ کریم کی متعدّد آیات کا منکر ہے اور کافر ہے۔ جس طرح سے فرشتے ایک مستقل نوع ہے مخلوق میں سے، اسی طرح سے جن بھی مستقل نوع ہے، اور انسانوں کی طرح جن بھی مکلّف ہیں ایمان لانے کے اور اَحکامِ شرعیہ کے، تو ان کے متعلق عقیدہ رکھنا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو آگ سے پیدا کیا، اور یہ مختلف شکلیں اختیار کر لیتے ہیں، مکلّف ہیں، اور دوسرے واقعات ان کے جو آتے ہیں ان کا تسلیم کرنا ضروری ہے۔

تلاوتِ قرآن کے وقت جنّات خاموش ہو گئے

''قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب کہ پھیرا ہم نے آپ کی طرف جنوں کا ایک گروہ'' یَسْتَمِعُوْنَ الْقُرْاٰنَ: وہ قرآن سنتے تھے فَلَمَّا حَضَرُوْهُ: جس وقت وہ حاضر ہوئے اُس قرآن کے پاس یعنی جہاں قرآن پڑھا جا رہا تھا قَالُوْۤا اَنْصِتُوْا: آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ چُپ ہو جاؤ، غور کر کے سنو، جیسے کہ قرآنِ کریم کا ادب یہی ہے اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا (سورۂ اَعراف: ۲۰۴) اللہ تعالیٰ انسانوں کو بھی تلقین کرتے ہیں کہ جب قرآن پڑھا جائے تو چُپ کر جایا کرو اور توجہ کے ساتھ سُنا کرو، تو انہوں نے آپس میں ایک دوسرے کو کہا خاموش ہو جاؤ، خاموش ہو جاؤ، یہ سنو، کیا پڑھا جا رہا ہے۔

قرآن کی حقّانیت جنّات کی زبانی

فَلَمَّا قُضِیَ: جب وہ قرآن پورا کر دیا گیا یعنی جتنا حضور ﷺ نے پڑھنا تھا وہ پڑھ لیا، فارغ ہو گئے، نماز کے اندر جتنا خیال تھا قراءت کرنے کا، قُضِیَ کا یہاں یہی معنی ہے، جب وہ قرآن ختم کیا گیا یعنی اس کا پڑھنا ختم کیا گیا، حضور ﷺ نے اپنی وہ مقدار پوری کر لی جو اُس وقت پڑھنا مقصود تھی، وَلَّوْا اِلٰى قَوْمِهِمْ مُّنْذِرِیْنَ: تو وہ جنّات اپنی قوم کی طرف پیٹھ پھیر کر چلے گئے اس حال میں کہ ڈرانے والے تھے، منذِر بن کے چلے گئے، یعنی خود وہ ایمان لے آئے، قرآنِ کریم کا انہوں نے اعتقاد کر لیا، اور اپنی قوم کے پاس منذِر بن کے چلے گئے، جا کے کہنے لگے، قَالُوْا یٰقَوْمَنَاۤ اِنَّا سَمِعْنَا كِتٰبًا اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى: کہنے لگے کہ اے ہماری قوم! بے شک ہم نے سنی ایک کتاب جو اُتاری گئی موسیٰ علیہ السلام کے بعد مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ: وہ تصدیق کرنے والی ہے اس چیز کی جو اس سے پہلے ہے، ما بین یدیہ کا مصداق وہی توراۃ! توراۃ کے لئے وہ مُصَدِّق ہے جس قسم کی باتیں توراۃ میں ہیں ویسی باتیں اس

کتاب میں ہیں، اس نے آ کے تورات کی تصدیق کر دی، یا یہ ہے کہ تورات کے اندر جو پیش گوئیاں کی گئی تھیں کہ ایسی کتاب اُترنے والی ہے اور ایسا پیغمبر آنے والا ہے، وہ کتاب اس کا مصداق ہے، مصدق کا معنی یہ بھی ہے کہ اس کا مصداق بننے والی ہے، پہلی باتیں جو آئی ہوئی ہیں تورات میں جو واضح کی گئیں، ان کا وہ مصداق ہے، اور مصداق بننا یہ مصدق ہی ہے، کیونکہ کسی پیش گوئی کا مصداق واضح ہو جائے یہ اس پیش گوئی کی صداقت کی دلیل ہے، اگر ایک پیش گوئی کی گئی ہو اور اس کا مصداق سامنے نہ آئے تو پیش گوئی غلط ہے، ''مصداق بننے والی ہے وہ اُس کتاب کا جو اس سے پہلے ہے'' (مصداق اور مصدق کا مفہوم اچھی طرح سے ذہن میں آ گیا؟) ان باتوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے اُتری ہوئی ہیں، تورات میں جو توحید اور معاد اور رسالت کے متعلق باتیں کی گئیں، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کے متعلق کی گئیں، قرآنِ کریم نے ان مضامین کی تصدیق کی، اور اسی طرح سے تورات میں جو قرآنِ کریم کے متعلق پیش گوئی کی گئی کہ ایسی کتاب اُترے گی، یہ قرآن اس کا مصداق ہے، اور اس مصداق کے ظاہر ہونے کے ساتھ تورات کی وہ باتیں سچی ثابت ہو گئیں۔ تو اُن جنات نے قرآنِ کریم کو سُن کر یہ اندازہ لگالیا، ہوسکتا ہے کہ اُس وقت سرورِ کائنات ﷺ ایسی ہی آیات پڑھ رہے ہوں جن کے اندر اس قسم کے مضامین ہوں گے، یَهْدِیْۤ اِلَى الْحَقِّ وَاِلٰى طَرِیْقٍ مُّسْتَقِیْمٍ: وہ کتاب راہنمائی کرتی ہے حق کی طرف اور سیدھے راستے کی طرف، جو باتیں وہ کتاب بتاتی ہے وہ حق ہے اور وہی سیدھا راستہ ہے، حق اور صراطِ مستقیم میں اگر آپ فرق کرنا چاہیں تو حق سے مراد اُصول لے لیجئے، اُصول کے اعتبار سے وہ حق ہے، اور فروع جو بیان کر رہی ہے وہ سارے کے سارے صراطِ مستقیم کا مصداق ہیں، یا حق اور صراطِ مستقیم دونوں کا مصداق ایک ہی ہے، اُس کی دو حیثیتیں ہو گئیں، اُس کتاب کا بیان کیا ہوا طریقہ وہی صراطِ مستقیم ہے، اور وہی باتیں حق ہیں، اور حق کے مطابق ہیں، واقع کے مطابق ہیں۔

جنات نے اِنجیل کا ذِکر کیوں نہیں کیا؟

تو یہاں انہوں نے اُنْزِلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى، جنات نے یہ ذِکر کیا، حالانکہ موسیٰ علیہ السلام کے بعد عیسیٰ علیہ السلام پر اِنجیل بھی اُتری، اور نزولِ قرآن اِنجیل کے بعد ہے، انہوں نے یہاں اِنجیل کا ذِکر نہیں کیا، اس لئے بعض حضرات نے تو یوں کہا کہ ہوسکتا ہے کہ وہ جنات یہودی ہوں، حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے......! جس طرح سے انسانوں کے اندر طبقات ہیں جنات کے اندر بھی اسی طرح سے طبقات ہیں، ان میں کافر بھی ہیں، مسلمان بھی ہیں، مختلف مسلک رکھنے والے ہیں، حتیٰ کہ آئے دن جو جنات لگتے ہیں بعض لوگوں کو، عورتوں کو، یا بچوں کو، ان کے حالات سے معلوم یہ ہوتا ہے کہ بعضے بریلوی بھی ہیں اور بعض دیوبندی بھی ہیں، یعنی ایسے بھی ہیں جو کہیں چمٹ جاتے ہیں تو جب ان کو حاضر کیا جائے بات کی جائے تو وہ کہتے ہیں کہ فلانے پیر کی قبر پہ جا کے چڑھاوا چڑھاؤ تو ہم چھوڑ دیں گے، اس طرح سے وہ شرک کی طرف متوجہ کرتے ہیں اور پیروں کی طرف متوجہ کرتے ہیں، ایسے واقعات بھی بیسیوں ہیں جو ہمارے دوست احباب ذِکر کرتے ہیں جو اس قسم کے کام کرتے ہیں۔ فیصل آباد میں ایک لڑکی کو جن لگ گیا، مجھے ہمارے ایک دوست نے سنایا، کہتے ہیں جب اس کو حاضر کیا گیا تو وہ کہنے لگا: ''اس کو کھو گیارہویں سے توبہ کرلے تو میں چھوڑ

دیتا ہوں!'' وہ کوئی دیوبندی تھا، تو اُس نے گیارہویں سے توبہ کروائی، کوئی کسی قسم کا مطالبہ کرلیتا ہے، کوئی کسی قسم کا مطالبہ کرلیتا ہے، ان میں دیوبندی بھی ہیں، بریلوی بھی ہیں، شیعہ بھی ہوں گے، ان کے اندر ایسے ہی طبقات ہیں جس طرح سے انسانوں میں ہیں۔ تو ہوسکتا ہے کہ وہ جن جو یہاں سننے کے لئے آئے تھے وہ موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والے ہوں، توراۃ کو ماننے والے ہوں، اِنجیل کو نہ مانتے ہوں، کیونکہ یہودیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو تسلیم نہیں کیا، اِنجیل کو تسلیم نہیں کیا، تو اس لئے انہوں نے نسبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف اور توراۃ کی طرف کی، اور ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ اِنجیل چونکہ توراۃ کا تتمہ ہی ہے اور اس میں زیادہ تر وعظ نصیحت کی باتیں ہیں، مستقل طور پر شریعت بیان کی گئی ہے توراۃ میں ہی، اور عیسیٰ علیہ السلام کی اُمت بھی اسی توراۃ کی مکلف تھی، بعض احکام اس کے منسوخ کئے گئے، اور اِنجیل کے اندر زیادہ تر وعظ ونصیحت کا حصہ ہی ہے، تو قرآنِ کریم چونکہ ایک مستقل کتاب ہے تو مستقل کتاب ہونے کے اعتبار سے اس کو تشبیہ توراۃ کے ساتھ دی گئی، اِنجیل کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔ چنانچہ سورۂ مزمل میں بھی آپ کے سامنے آئے گا کہ سرورِ کائنات ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے تشبیہ موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دی ہے اِنَّاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلَیْكُمْ رَسُوْلًا ۙ۬ شَاهِدًا عَلَیْكُمْ كَمَاۤ اَرْسَلْنَاۤ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا، تو وہاں بھی تشبیہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ دی گئی ہے، تو یہاں مطلب یہ ہوجائے گا کہ جیسے توراۃ مستقل شریعت لے کے آئی، اسی طرح سے یہ کتاب بھی مستقل شریعت لے کر آئی ہے، جیسے توراۃ اپنی جگہ مستقل ہے کسی دوسری کتاب کا ضمیمہ یا تتمہ نہیں، اسی طرح سے قرآنِ کریم ہے۔ اِنجیل کا تذکرہ اس لئے نہیں کیا کہ اِنجیل جو عیسیٰ علیہ السلام پر اُتری ہے، اس کے اندر زیادہ اَحکام نہیں، مستقل شریعت کی وہ حامل نہیں بلکہ وہ توراۃ کا ہی تتمہ ہے۔ اس لئے یہاں تشبیہ توراۃ کے ساتھ ذِکر کردی گئی، یوں ذِکر کیا گیا کہ موسیٰ علیہ السلام پر جو کتاب اُتری ہے تو اس کے بعد یہ کتاب ہے، مستقل حیثیت کے مستقل شریعت کے حامل ہونے کے اعتبار سے توراۃ کا ذِکر کیا، اور اس کے بعد قرآنِ کریم کا ذِکر کیا، اور اِنجیل کا ذکر نہیں کیا۔ بہرحال! وہ اتنا سمجھ گئے کہ جو کچھ اس کتاب میں ذِکر کیا جارہا ہے یہ وہی باتیں ہیں جو توراۃ نے واضح کی ہیں، اور حقیقت اس میں بیان کردی گئی، اور جس راستے کی یہ کتاب راہنمائی کرتی ہے وہی راستہ مستقیم ہے، صراطِ مستقیم اور طریق مستقیم وہی ہے۔

جنّات کا اپنی قوم کو دعوت دینا

یٰقَوْمَنَاۤ اَجِیْبُوْا دَاعِیَ اللّٰهِ: یہ جو پیچھے آیا تھا کہ اپنی قوم کی طرف چلے گئے منذِر بن کر، یہ اسی کا بیان ہے، '' کہنے لگے کہ اے ہماری قوم! اللہ کے داعی کی بات مان لو'' یہ اللہ کا داعی جس بات کی طرف بُلاتا ہے اس بات کو تسلیم کرلو، وَاٰمِنُوْا بِهٖ: اور اس پہ ایمان لے آؤ، یَغْفِرْ لَكُمْ مِّنْ ذُنُوْبِكُمْ: بخش دے گا وہ تمہیں تمہارے گناہ، مِنْ اگر تبعیضیہ ہو تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے ساتھ پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں اور آئندہ کا حساب نیا شروع ہوجاتا ہے، آئندہ جو گناہ کریں گے پھر ان کا حساب علیحدہ ہوگا، پچھلے گناہ معاف ہوجاتے ہیں، یا حقوق اللہ معاف ہوجاتے ہیں، حقوق العباد معاف نہیں ہوتے، '' بخش دے گا وہ تمہارے لئے تمہارے بعض گناہ'' وَیُجِرْكُمْ مِّنْ عَذَابٍ اَلِیْمٍ: اور پناہ دے گا تمہیں دردناک عذاب سے، اس ایمان لانے کے نتیجے میں تمہارے گناہ معاف ہوں گے، اور عذاب الیم سے اللہ تعالیٰ تمہیں پناہ دے گا، اَجَارَ یُجِیْرُ: پناہ دینا، وَمَنْ لَّا یُجِبْ دَاعِیَ اللّٰهِ: یہ دوسرا پہلو

آ گیا، اور جو اللہ کے داعی کی بات نہیں مانے گا، فَلَيْسَ بِمُعْجِزٍ فِي الْاَرْضِ: تو وہ زمین میں عاجز کرنے والا نہیں ہے، پھر وہ اللہ کے عذاب سے بچ نہیں سکے گا، ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ اسے پکڑنا چاہے اور وہ پکڑا نہ جائے، اللہ اسے سزا دینا چاہے اور وہ کسی طرح سے بچ جائے، ایسا نہیں ہو سکتا، ''وہ عاجز کرنے والا نہیں ہے زمین میں'' وَلَيْسَ لَهٗ مِنْ دُوْنِهٖۤ اَوْلِيَآءُ: اور اللہ کے علاوہ اس کے لئے کوئی کارساز نہیں، اُولٰٓئِكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ: یہ صریح گمراہی میں پڑے ہوئے ہیں۔

یہ جنوں کا واقعہ نقل کر کے مشرکینِ مکہ کو متنبہ کیا ہے کہ دیکھو! قرآنِ کریم انہوں نے سنا، چونکہ ان کا مقصد ہی تھا کہ کسی حقیقت کو معلوم کریں، اور اس حقیقت کو معلوم کرنے کے بعد قبول کر لیں، چونکہ نیک نیتی کے ساتھ انہوں نے قرآنِ کریم سنا تھا، وہ فوراً متاثر ہو گئے، اور خود ایمان لے آئے اور اپنی قوم کو بھی ایمان کی طرف متوجہ کیا۔ زیادہ تفصیل اس واقعے کی سورۂ جنّ میں آئے گی۔

اِثباتِ معاد

اَوَلَمْ يَرَوْا اَنَّ اللّٰهَ الَّذِيْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ: یہ معاد کا ذِکر آ گیا، کیا یہ مشرک دیکھتے نہیں کہ بے شک اللہ جس نے کہ پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو، وَلَمْ يَعْيَ بِخَلْقِهِنَّ: اور ان کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، کیا وہ قادر نہیں ہے اس بات پر کہ زندہ کر دے مُردوں کو؟ اَوَلَمْ يَرَوْا: کیا یہ دیکھتے نہیں، بے شک وہ اللہ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور نہیں تھکا وہ ان کے پیدا کرنے سے قدرت رکھنے والا ہے اس بات پر کہ زندہ کر دے مُردوں کو'' بَلٰى: کیوں نہیں، وہ ضرور قادر ہے، کیا یہ سمجھتے نہیں کہ وہ قدرت رکھنے والا ہے، اَلَمْ يَرَوْا بِقٰدِرٍ، کیا وہ ایسے اللہ کو جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا ہے وہ قادر نہیں سمجھتے اس بات پر کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دے؟ یہ استفہام ہے جس کا جواب آگے بَلٰى کے ساتھ آ گیا، اَوَلَمْ يَرَوْا: کیا یہ دیکھتے نہیں؟ کہ بے شک وہ اللہ جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور نہیں تھکا وہ ان کے پیدا کرنے کے ساتھ۔ عَيِيَ يَعْيٰ: تھکنا، اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ سورۂ ق میں بھی آئے گا، کیا ہم پہلی دفعہ پیدا کر کے تھک گئے؟ تھکے نہیں ہیں، یہ خواہ مخواہ اشتباہ میں پڑے ہوئے ہیں دوبارہ پیدا کرنے سے، جو ابتداءً پیدا کر سکتا ہے وہ دوبارہ بھی پیدا کر سکتا ہے، ''کیا یہ اُس کو قادر نہیں مانتے اس بات پر کہ وہ مُردوں کو زندہ کر دے؟'' بَلٰى: کیوں نہیں، وہ قادر ہے، اِنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ: وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ یہ معاد کا تذکرہ ہو گیا۔

آخرت میں کُفّار کی حالت

وَيَوْمَ يُعْرَضُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا عَلَى النَّارِ: اور جس دِن کہ پیش کیا جائے گا ان لوگوں کو جنہوں نے کُفر کیا آگ پر، آگ پر پیش کیے جائیں گے، آگ کے سامنے لائے جائیں گے، ان سے کہا جائے گا اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ: کیا یہ ٹھیک نہیں؟ کیا یہ حق نہیں ہے؟ تمہیں جو کہا جاتا تھا کہ اس طرح سے جہنم آئے گی، جہنم میں تمہیں جانا پڑے گا، کیا یہ بات واقع کے مطابق نہیں؟ قَالُوْا بَلٰى: وہ کہیں گے کیوں نہیں، یہ بات تو بالکل ٹھیک ہے وَرَبِّنَا: ہمارے رَبّ کی قسم! اُس وقت قسم کھا کر تصدیق کریں گے، ''ہمارے رَبّ کی قسم! یہ بالکل ٹھیک ہے'' قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ: پھر اللہ تعالیٰ کہے گا کہ چکھو عذاب اپنے کُفر کرنے کی وجہ سے، بسبب اس کے کہ تم کُفر کرتے تھے۔

تسلّیٔ رسول

فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ: یہ سرورِ کائنات ﷺ کو خطاب ہے، کہ آپ ان کو سمجھاتے ہیں، ہر قسم کی بات دلیل کے ساتھ واضح کرتے ہیں، یہ مانتے نہیں، اُلٹا اِستہزا کرتے ہیں یا تکلیف پہنچانے کی کوشش کرتے ہیں، آپ صبر کیجئے جس طرح سے ہمت والے رسولوں نے صبر کیا، أُولُوا الْعَزْمِ: جو پختہ قصد والے تھے، پختہ عزم والے۔ تمام رسول ہی أُولوالعزم تھے، اور ان میں سے پھر خصوصیت کے ساتھ حضرت نوح علیہ السلام، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو أُولوالعزم میں سے شمار کیا جاتا ہے، اپنے اپنے درجے کے اعتبار سے سارے ہی أُولوالعزم ہیں لیکن ان میں سے یہ زیادہ ممتاز ہیں، ''جس طرح سے أُولوالعزم رسولوں نے صبر کیا آپ بھی اسی طرح سے صبر کیجئے'' یا تو سارے ہی مراد ہیں، یا خصوصیت کے ساتھ یہ جو زیادہ نمایاں ہیں، جو پختہ قصد والے تھے ہمت والے تھے، وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ: اور آپ ان کے لئے جلدی نہ کیجئے، ان کے لئے کسی چیز کو جلدی طلب نہ کیجئے کہ جو نتیجہ نکلنا ہے جلدی نکل آئے، جلدی نہ مچایئے، مستقل رہیے اپنے کام پر، برداشت کرتے چلے جایئے جس طرح سے پہلے رسولوں نے برداشت کیا اور وہ اپنے طریقے کے اوپر پختہ رہے۔

کافروں کو اپنی گزری ہوئی زندگی ایک گھڑی محسوس ہوگی

كَأَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ: يَوْمَ يَرَوْنَ مَا يُوعَدُونَ: جس دن یہ لوگ دیکھیں گے اس چیز کو جس کا یہ وعدہ دیئے جاتے ہیں، كَأَنَّهُمْ لَمْ يَلْبَثُوا إِلَّا سَاعَةً مِّن نَّهَارٍ، كَأَنَّهُمْ کا تعلق لَمْ يَلْبَثُوا کے ساتھ ہے، آج تو یہ کہہ رہے ہیں دیر کیوں ہو رہی ہے، اتنی دیر کیوں کرتے جا رہے ہو، جلدی عذاب لے آؤ، آج تو یوں کہتے ہیں، لیکن جس دن یہ عذاب کو دیکھیں گے اس دن ایسے ہوگا گویا کہ وہ نہیں ٹھہرے مگر دِن کا ایک لمحہ، پھر حال ایسا ہوگا، یوں معلوم ہوگا جیسے دِن میں ایک ہی گھڑی رہے ہیں، برسہا برس جو زندگی گزارے بیٹھے ہیں وہ ایسے ہوگا جیسا کہ ایک ہی گھڑی میں سب کچھ گزر گیا، کیونکہ یہ عیش پرستی کی زندگی، یہ غفلت کی زندگی، اِس کا طول وعرض اس وقت تک ہی ہے جس وقت تک انسان اِس زندگی میں پڑا ہوا ہے، اور جب اللہ کی طرف سے ایک تھپیڑ لگتا ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے، اور پچھلی گزری ہوئی زندگی ایسے ہی معلوم ہوتی ہے جیسے کل آئے تھے اور آج جا رہے ہیں، تو آج یہ جلدی مچا رہے ہیں، اور عذاب نہ آنے کو یہ دیر محسوس کر رہے ہیں، لیکن جس دِن یہ دیکھیں گے اس چیز کو جس کا یہ وعدہ دیئے جاتے ہیں تو گویا کہ یہ لوگ نہیں ٹھہرے مگر دِن کا ایک حصہ، ساعۃ گھڑی کو کہتے ہیں، دِن کی ایک گھڑی ٹھہرے ہیں۔

بَلٰغٌ: یہ تبلیغ کے معنی میں ہے، ہماری طرف سے یہ پہنچا دینا ہے، ہم نے یہ خبر پہنچا دی، اب سوچنا اور سوچ کے ماننا، یہ اپنے نفع ونقصان کے ذِمے دار تم خود ہو، ہماری طرف سے یہ بات پہنچا دی گئی، ہم کہہ چکے جو کچھ کہنا تھا، هٰذَا تَبْلِيغٌ یہ تبلیغ ہے، یہ بات کو پہنچا دینا ہے، قرآنِ کریم یہ بَلٰغٌ کا مصداق ہے۔ فَهَلْ يُهْلَكُ إِلَّا الْقَوْمُ الْفٰسِقُونَ: پھر نہیں ہلاک کئے جائیں گے مگر فاسق لوگ، فاسق: نافرمان، جو نافرمان ہوں گے اللہ کی پہنچی ہوئی بات کو تسلیم نہیں کریں گے ہلاکت آخر انہی پہ ہی پڑے گی۔

***

سورة محمد

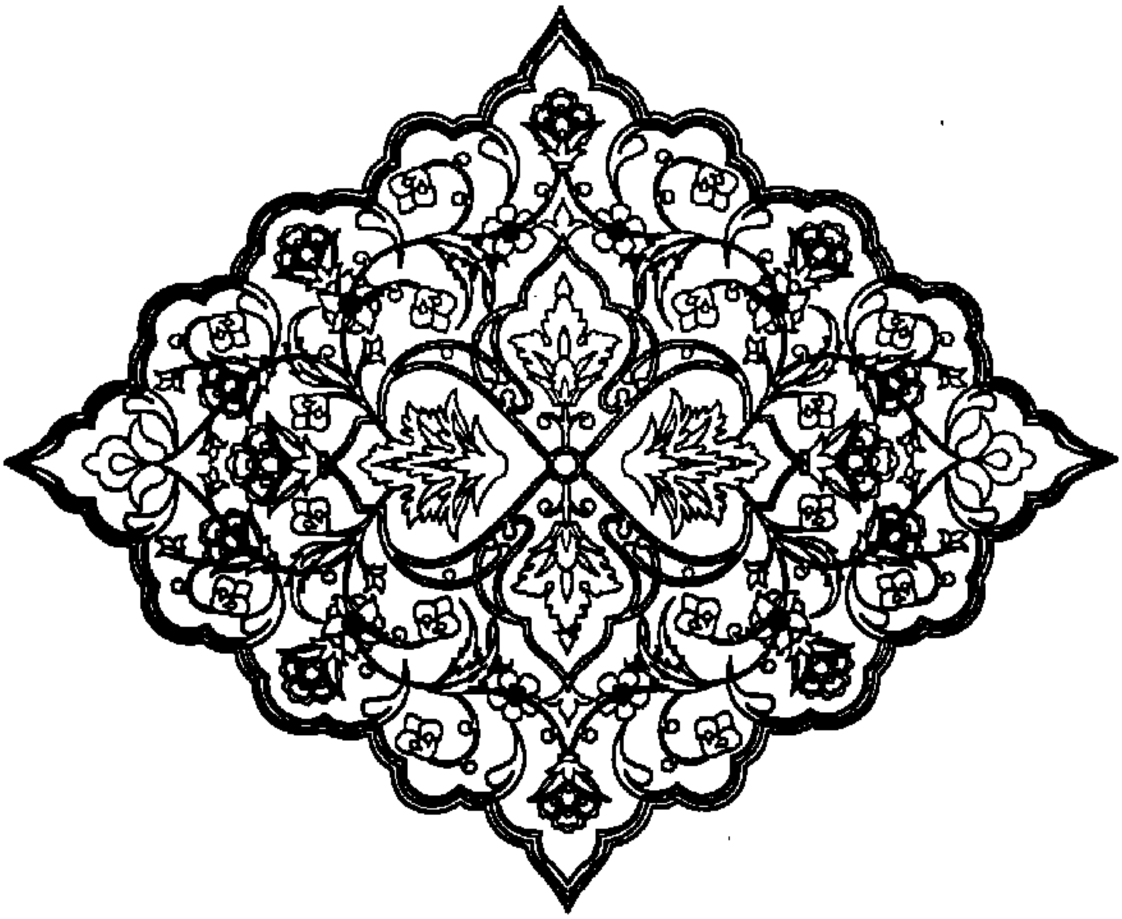

آیاتها ۳۸ — ۴۷ سُورَةُ مُحَمَّدٍ مَدَنِيَّةٌ ۹۵ — رکوعاتها ۴

سورۂ محمد مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس کی اڑتیس آیتیں ہیں، چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ ① وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ

جو لوگ کفر کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے اعمال ضائع کر دیے ① جو ایمان لاتے ہیں اور نیک

عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۙ كَفَّرَ عَنْهُمْ

عمل کرتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں وہ اس چیز پر جو محمد ﷺ پر اُتاری گئی، حالانکہ وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے، دُور ہٹائے گا اللہ تعالیٰ

سَيِّاٰتِهِمْ وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ ② ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ

ان کے گناہوں کو، اور دُرست کر دے گا ان کے حال کو ② وہ اس سبب سے ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے اتباع کی باطل کی،

وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ

اور جو لوگ ایمان لائے انہوں نے اتباع کی حق کی جو ان کے رب کی جانب سے ہے، اسی طرح سے بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے

اَمْثَالَهُمْ ③ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ ؕ حَتّٰۤى اِذَاۤ

ان کے حالات ③ جب تمہارا ٹکراؤ ہو جائے ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے کفر کیا پھر مارو گردنوں کو خوب مارنا، حتیٰ کہ جب

اَثْخَنْتُمُوْهُمْ فَشُدُّوا الْوَثَاقَ ۙ فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَاِمَّا فِدَآءً

تم ان کی خوب خون ریزی کر لو، پھر سخت کیا کرو تم باندھنے کو، پھر یا تو ان کے اُوپر احسان کرنا اس کے بعد یا ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا،

حَتّٰى تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا ۛ ذٰلِكَ ؕۛ وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا

حتیٰ کہ رکھ دے لڑائی اپنے ہتھیار، ایسے ہی کرو، اگر اللہ چاہتا تو ان سے بدلہ لے لیتا، لیکن تاکہ آزمائش کرے

بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ ؕ وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَلَنْ يُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ ④

تم میں سے بعض کی بعض کے ساتھ، جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل کر دیے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ہرگز ان کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا ④

سَيَهْدِيهِمْ وَيُصْلِحُ بَالَهُمْ ۝۵ وَيُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ
اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو منزلِ مقصود تک پہنچائے گا اور ان کا حال دُرست کردے گا۝۵ اور داخل کرے گا ان کو جنت میں،
عَرَّفَهَا لَهُمْ ۝۶ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تَنْصُرُوا اللَّهَ يَنْصُرْكُمْ وَيُثَبِّتْ
اللہ تعالیٰ پہچنوا دے گا وہ جنت اُن کے لئے۝۶ اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا اور اللہ تمہارے قدموں
أَقْدَامَكُمْ ۝۷ وَالَّذِينَ كَفَرُوا فَتَعْسًا لَهُمْ وَأَضَلَّ أَعْمَالَهُمْ ۝۸ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ
کو جمائے گا۝۷ وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا پس بربادی ہے ان کے لئے، اور اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیئے۝۸ یہ اس وجہ سے ہوا
كَرِهُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ فَأَحْبَطَ أَعْمَالَهُمْ ۝۹ أَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ
کہ انہوں نے مکروہ جانا اس چیز کو جو اللہ نے اُتاری تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے۝۹ کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں؟
فَيَنْظُرُوا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الَّذِينَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۚ دَمَّرَ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۖ وَلِلْكَافِرِينَ
پھر دیکھ لیتے، کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، اللہ نے ان کے اوپر بربادی ڈالی، اور اِن کافروں کے لئے بھی
أَمْثَالُهَا ۝۱۰ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَىٰ لَهُمْ ۝۱۱
ایسے ہی حالات ہیں۝۱۰ یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جو کہ ایمان لے آئے اور کافروں کا کوئی کارساز نہیں۝۱۱

تفسیر

سورت کا مضمون اور ماقبل سے ربط

سورۂ محمد ''مدنی'' ہے اور اس کی ۳۸ آیتیں ہیں، ۴ رُکوع ہیں۔ مدینہ منورہ میں نازل ہونے کی وجہ سے اس سورت میں کچھ جہاد کا اور منافقین کا تذکرہ آرہا ہے، اور ابتدا ہورہی ہے کافروں کی مذمت سے اور مسلمانوں کی مدح سے، جس طرح سے پچھلی سورت میں بھی دونوں گروہوں کا ذکر آیا تھا، اور سورت کا نام اسی آیت سے اخذ کیا گیا ہے: وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ۔

کافر کے نیک اعمال اللہ کے ہاں کیوں معتبر نہیں؟

اَلَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور جنہوں نے اللہ کے راستے سے روکا...... اور اَلَّذِيْنَ کے بعد اگر ماضی آجائے تو ترجمہ مضارع کے ساتھ بھی ٹھیک ہوتا ہے...... جو لوگ کُفر کرتے ہیں اور اللہ کے راستے سے روکتے ہیں، اَضَلَّ اَعْمَالَهُمْ: اللہ تعالیٰ نے اُن کے اعمال ضائع کردیئے، یعنی اگر صورۃً وہ کوئی نیکی کرتے بھی ہیں تو وہ نیکی برباد ہے، اور یہ بات

آپ کی خدمت میں کئی دفعہ ذکر کی جا چکی کہ نیکی کے قبول ہونے کے لئے ایمان شرط ہے، ایمان ہوگا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں نیکی قبول ہے اور اس کا اجر آخرت میں ملے گا، اور اگر ایمان نہیں تو کوئی نیکی قبول نہیں۔ جاہل لوگ بسا اوقات یہ شبہ کیا کرتے ہیں کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ایک ہی کام ہے جس کو ایک شخص کرتا ہے اور وہ ایمان والا ہے، حضور ﷺ پر ایمان رکھتا ہے، بعینہٖ وہی کام ایک وہ شخص کرتا ہے جس کا اللہ کے رسول پر ایمان نہیں، جس کو کافر کہا جاتا ہے، عمل تو دونوں کا ایک جیسا ہے تو اس کی کیا وجہ ہے کہ ایک کو اَجر ملے گا دُوسرے کو اَجر نہیں ملے گا اور اس کی نیکی کا کوئی اعتبار نہیں؟ جاہلوں کی یہ بات بسا اوقات سمجھ میں نہیں آتی، ہمارے ساتھ بھی کئی دفعہ اس قسم کا تذکرہ ہوا، کہتے ہیں کہ نیکی تو نیکی ہے چاہے کوئی کرے، اور اس کا اللہ تعالیٰ کے ہاں اعتبار ہونا چاہیے۔ تو شرعی دلائل تو قرآن وحدیث کے اندر اتنے ہیں جن کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ نیکی کی قبولیت کے لئے ایمان شرط ہے، کافر اگر نیکی کرے گا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ نیکی قبول نہیں، اور یہ نیکی کافر کو آخرت کے عذاب سے بچا نہیں سکتی اگر اس کے پاس ایمان نہیں ہے۔ لیکن لوگوں کو سمجھانے کے لئے ہم یہ بات کہا کرتے ہیں کہ کافر کی مثال ایک باغی کی ہے اور مؤمن کی مثال ایک فرماں بردار کی ہے جو مُلک کا اور مُلک کے آئین کا فرماں بردار ہو، اور تمام دُنیا کے اندر اس بات کے اُوپر اتفاق ہے کہ باغی کتنے ہی کمالات کیوں نہ رکھتا ہو، وہ قابلِ برداشت نہیں ہے، وہ بغاوت کی سزا میں سُولی چڑھا دیا جاتا ہے، گولی کا نشانہ بنا دیا جاتا ہے، یہ نہیں دیکھا جاتا کہ یہ بہت بڑا سائنس دان ہے، یہ بہت بڑا ڈاکٹر ہے، اور یہ بہت بڑا تعلیم یافتہ ہے، بہت مہذب ہے، اس کی گفتار اچھی ہے، اس کا کردار اچھا ہے، بڑا غریب پرَوَر ہے، لوگوں کے ساتھ بہت احسان کرتا ہے، کتنی ہی اچھی صفتوں کا مالک کیوں نہ ہو لیکن اگر وہ حکومت کا باغی ہے تو دُنیا کے تختے پر کوئی حکومت ایسی نہیں جو اس کے کمالات کو دیکھتے ہوئے اس کی بغاوت سے درگزر کرے، بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اس کی بغاوت کی طرف دیکھتے ہوئے اس کے کمالات پہ خاک ڈال دی جاتی ہے، اور اس کو یہ حق ہی نہیں دیا جاتا کہ مُلک کے اندر زندہ رہے، یا تختہ دار پہ لٹکا دیا جائے گا، یا گولی کا نشانہ بنا دیا جائے گا۔ تو معلوم ہوگیا کہ تمام انسانوں کی عقول اس بات کے اوپر متفق ہیں کہ کسی حکومت میں رہتے ہوئے بغاوت ایک ایسا جرم ہے کہ اس کے ساتھ پھر کسی دوسرے کمال کی رعایت نہیں رکھی جاتی، تمام انسانوں کی عقلوں کا یہ متفق علیہ فیصلہ ہے۔ اس کے علاوہ اگر کوئی شخص فرماں بردار ہے حکومت کا باغی نہیں ہے تو اس کو مُلک کے اندر زندہ رہنے کا حق ہے، وہ کتنا ہی گھناؤنا جرم کیوں نہ کرلے، پرلے درجے کا جاہل ہے، اس کے پاس کوئی علم نہیں، نہ وہ سائنس دان ہے، نہ انجینئر ہے، بلکہ وہ چور ہے، اُچکا ہے، اس قسم کے اس کے اندر جرائم پائے جاتے ہیں، تو حکومت اس کو پکڑے گی سزا دے گی، سزا دے کر چھوڑ بھی دے گی، اس کو مُلک کے اندر زندہ رہنے کا حق ہے باوجود اس بات کے کہ جاہل ہے اور اس کے اندر بیسیوں عیب پائے جاتے ہیں، تو اگر اللہ تعالیٰ کی عدالت بھی اس قسم کا فیصلہ کرتی ہے تو آپ کی عقول کا بھی تو یہی فیصلہ ہے، آپ اپنی چھوٹی سی حکومت کے اندر بغاوت کو برداشت نہیں کرتے اور اس بغاوت کے نتیجے میں تمام کمالات پر خاک ڈال دیتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ جو کہ اصل حاکم ہے، اور وہ کھانے کو دیتا ہے، پہننے کو دیتا ہے، تمام قسم کے احسانات اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتے ہیں، تو اُس کی بغاوت اس درجے میں کیوں نہ ہو کہ اس کے مقابلے میں کسی کمال کا کوئی اعتبار نہیں، اگر تم اپنی عارضی سی حکومت......! نہ تم انسانوں کے خالق ہو، نہ تم ان کے رازق ہو، نہ تم ان کو کچھ اور دیتے ہو، لیکن اپنی حکومت کی بغاوت برداشت

نہیں کرتے، اور اس کے کمالات کا کوئی اعتبار نہیں کرتے اس کو قتل کر دیتے ہو، اسی طرح سے اللہ تعالیٰ کی عدالت کا تو یہ زیادہ تقاضا ہے، تو یہ بات عین انصاف کے مطابق ہے کہ اللہ کی حکومت کے اندر باغی کی کوئی رعایت نہیں چاہے وہ کتنے ہی کمالات کا مالک کیوں نہ ہو، اس لئے کوئی شخص اگر کفر اختیار کرتا ہے تو جتنی بھی نیکیاں وہ کرے سب ضائع ہیں، پھر بھی اللہ کی یہ مہربانی ہے کہ اُن نیکیوں کی برکت سے دُنیا میں کچھ نہ کچھ دے دیتا ہے، جس طرح سے پچھلی سورت میں ذکر کیا گیا تھا اَذْهَبْتُمْ طَيِّبٰتِكُمْ فِيْ حَيَاتِكُمُ الدُّنْيَا، تو کافروں کی نیکی کا صلہ اللہ تعالیٰ صورۂ دُنیا میں دے دیتا ہے، رزق کی صورت میں، صحت اور شہرت اور مال و دولت یہ چیزیں عطا فرما کے اس کی نیکیوں کا حساب یہیں چکا دیتا ہے۔ اس کی تفصیل آپ کے سامنے پچھلی سورت میں ہو چکی۔

"حجیتِ حدیث" پر دلیل

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: یہ ہیں فرماں بردار لوگ، جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، نیک عمل وہی ہے جو اللہ کی ہدایات کے مطابق ہوتا ہے، ایمان اس عمل کی جان ہے، اور عملِ صالح یعنی اس کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق کرنا یہ اس کی ظاہری صورت ہے، تو عمل کی ظاہری صورت بھی ٹھیک ہے اور اس کے اندر ایمان والی اور اخلاص والی جان بھی موجود ہے، وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ: اور وہ ایمان لاتے ہیں اس پر جو کہ محمد ﷺ پر اُتارا گیا، بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ میں "مَا" عام ہے، جو کچھ سرورِ کائنات ﷺ پر اُتارا گیا، یہ اپنے عموم کے ساتھ "وحیِ جلی" کو بھی شامل ہے اور "وحیِ خفی" کو بھی شامل ہے، اس لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو دین حضور ﷺ لے کر آئے اگر وہ کتاب اللہ کی شکل میں ہے تو ماننا ضروری، اور اگر وہ احادیث کی شکل میں ہے تو ماننا ضروری، جس بات کے متعلق یہ ثابت ہو جائے تواتر کے ساتھ، ضرورت کے درجے میں، بداہت کے درجے میں کہ یہ واقعی حضور ﷺ نے بات بیان فرمائی ہے، چاہے وہ قرآن کی آیت کے طور پر پیش کی ہو، چاہے وہ اپنے قول کے طور پر پیش کی ہو، دونوں کے اُوپر ایمان لانا برابر سرابر ضروری ہے، یہ "ضروریاتِ دین" جن کو کہا جاتا ہے، یعنی دین کی ایسی باتیں جو بالکل بدیہی ہیں، جن کے متعلق یقین ہے کہ حضور ﷺ نے یہ فرمائیں، پھر چاہے وہ بات قرآن میں آئی ہوئی ہو، چاہے قرآن میں نہ آئی ہوئی ہو، اس کا تسلیم کرنا ایمان کے لئے شرط ہے! اس کے بغیر انسان مؤمن نہیں ہوتا، تو وَاٰمَنُوْا بِمَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ کے اندر تعمیم ہوگئی، مَا نُزِّلَ چاہے "وحیِ جلی" کے ساتھ ہو، چاہے "وحیِ خفی" کے ساتھ ہو، سرورِ کائنات ﷺ کی بیان کردہ باتیں سب وحی کی طرف منسوب ہیں، کوئی وحی جلی ہے، کوئی خفی ہے، "ایمان لاتے ہیں وہ اس چیز پر جو محمد ﷺ پر اُتاری گئی"، آگے اس کا جواب آئے گا كَفَّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ: اللہ ان کے گناہ دُور ہٹا دے گا، وَاَصْلَحَ بَالَهُمْ: اور ان کے حال کو دُرست کرے گا، دُنیا اور آخرت میں ان کا حال دُرست ہوگا۔ درمیان میں وَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ یہ مَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ کے لئے جملہ معترضہ یا حال کے طور پر تعریف ہے (مظہری)، "جو کچھ محمد ﷺ پہ اُتارا گیا حالانکہ وہی حق ہے ان کے رَبّ کی طرف سے" ان کے رَبّ کی طرف سے آیا ہے اور وہی حق ہے جو اس کے اُوپر اُتارا گیا، تو جو لوگ اس کو تسلیم کرتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کی بُرائیاں دُور ہٹا دے گا، جس طرح سے کافر کی نیکیاں برباد ہیں مؤمن کے گناہ معاف ہیں، اس کی غلطیوں سے درگزر کیا جاتا ہے ایمان کی برکت سے، "اور اللہ تعالیٰ دُنیا اور آخرت میں ان کے

حال کو اچھا کر دے گا"، تَوَهُوَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ یہ مَا نُزِّلَ عَلٰى مُحَمَّدٍ کی عظمت کو بیان کرنے کے لئے ہے، "یہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے"، "جو لوگ ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں اور ایمان لاتے ہیں اس بات پر جو محمد پر اُتاری گئی، حالانکہ وہی حق ہے ان کے رب کی طرف سے، دُور ہٹائے گا اللہ تعالیٰ ان سب کے گناہوں کو اور دُرست کر دے گا اُن کے حال کو۔"

کافر کی نیکیاں برباد، اور مؤمن کے گناہ معاف کیوں؟

ذٰلِكَ بِاَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوا اتَّبَعُوا الْبَاطِلَ وَاَنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّبَعُوا الْحَقَّ مِنْ رَّبِّهِمْ: اور یہ دو قسم کا برتاؤ جو کیا گیا کہ کافروں کی نیکیاں برباد اور مؤمنوں کے گناہ معاف، یہ کس وجہ سے ہوا؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ جن لوگوں نے کفر کیا انہوں نے اتباع کی باطل کی، غلط راستے کی، وہ غلط راستے پہ چلے، غلط راستے پہ چلنے کے بعد غلط نتیجہ لازماً سامنے آئے گا، "وہ اس سبب سے ہے کہ جن لوگوں نے کُفر کیا انہوں نے اتباع کی باطل کی، اور جو لوگ ایمان لائے انہوں نے اتباع کی حق کی، ایسا حق جو ان کے رب کی جانب سے ہے"۔ كَذٰلِكَ يَضْرِبُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ اَمْثَالَهُمْ: اسی طرح سے بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے لیے ان کے حالات، لوگوں کے حالات بیان کرتا ہے کہ جو لوگ باطل کی اتباع کرنے والے ہوتے ہیں ان کا انجام تباہی ہے، جو لوگ حق کی اتباع کرنے والے ہوتے ہیں ان کا انجام اچھا ہے، اَمْثَال مَثَل کی جمع ہے، حالت، "ایسے ہی بیان کرتا ہے اللہ تعالیٰ لوگوں کے لئے ان کے حالات۔"

کافروں کو قتل اور قید کرنے کا حکم

فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَضَرْبَ الرِّقَابِ: جب تمہیں یہ پتا چل گیا کہ کافر متبع باطل ہیں اور مؤمن متبع حق ہیں، تو اگر کسی میدان میں ٹکراؤ ہو جائے تو اہلِ حق کو چاہیے کہ اہلِ باطل کے پرخچے اُڑائیں، اور ان کی گردنیں خوب اچھی طرح سے ماریں، یہ جہاد کی ترغیب ہے۔ فَاِذَا لَقِيْتُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: لَقِيَ يَلْقٰى: ملاقات کرنا، ایک ملاقات دوست کی دوست کے ساتھ ہوتی ہے، ایک ملاقات دشمن کی دشمن کے ساتھ ہوتی ہے، جس کے لئے ہمارے محاورے میں "ٹکر لینا" بولا جاتا ہے، "جب تمہاری ٹکر لگ جائے ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے کُفر کیا" میدانِ جہاد میں جب تمہاری ملاقات ہو جائے میدانِ جنگ میں، یہ ملاقات ٹکرانے کی صورت میں ہے، "جب تمہارا ٹکراؤ ہو جائے ان لوگوں کے ساتھ جنہوں نے کُفر کیا" فَضَرْبَ الرِّقَابِ: یہ مصدر ہے اور مفعول مطلق ہے فعل محذوف کا، فَاضْرِبُوا الرِّقَابَ ضَرْبًا پھر مارو گردنوں کو خوب مارنا، تو مفعولِ مطلق کو مضاف کر دیا گیا مفعول بہ کی طرف، فَضَرْبَ الرِّقَابِ، تم پر ضروری ہے گردنوں کا مارنا، پھر ان کی گردنیں خوب مارا کرو، اور "گردن کا مارنا" بطور محاورے کے ہے، یعنی انہیں ہلاک کیا کرو، چاہے پیٹ پھاڑ کے ہو، چاہے ٹانگیں توڑ کے ہو، عام طور پر چونکہ انسان کو قتل کیا جاتا ہے تو گردن پر ہی مارا جاتا ہے تو اس لئے اس کو ذکر کر دیا۔ حَتّٰى اِذَا اَثْخَنْتُمُوْهُمْ: اِثْخَان: خون ریزی کرنا۔ حتّٰی کہ جب تم ان کی خوب خون ریزی کر لو، ان کی قوت اور شوکت ٹوٹ جائے، فَشُدُّوا الْوَثَاقَ: شُدُّوْا یہ اَمر کا صیغہ ہے، شَدَّ شَدًّا: باندھنا، سخت کرنا، وَثَاق اس رسّی کو کہتے ہیں جس کے ساتھ کسی چیز کو باندھا جاتا ہے، "پھر تم رسّی کو مضبوط باندھا کرو، سخت کیا کرو تم باندھنے کو" یعنی گرفتار کر لیا کرو، قیدی بنا لیا کرو، قیدی تب بنایا کرو کہ پہلے خون ریزی کر کے ان کی قوت توڑ دو۔

''کافر قیدیوں'' کے بارے میں اَحکام

فَاِمَّا مَنًّۢا بَعْدُ وَ اِمَّا فِدَآءً: ''کافیہ'' میں جس طرح سے آپ نے پڑھا: ''فَاِمَّا تَمُنُّوْنَ مَنًّا بَعْدُ وَاِمَّا تَفْدُوْنَ فِدَاءً'' پھر یا تو ان کے اُوپر احسان کرنا اس کے بعد، کہ ان کو مفت میں چھوڑ دینا، اور یا ان کو فدیہ لے کے چھوڑ دینا۔ فدیے کے اندر دو باتیں ہیں یا تو مالی معاوضہ لے لو، یا مسلمان قیدی جو کافروں کے ہاتھ میں ہیں وہ چھڑا لو۔ میدانِ جہاد میں جو کافر لوگ قابو آ جایا کرتے ہیں گرفتار ہو جایا کرتے ہیں، اِمام کو ان کے بارے میں مختلف اختیارات ہیں، ایسا بھی ہوسکتا ہے کہ احسان کرتے ہوئے اُن کو مفت میں چھوڑ دیا جائے، اِس کی بھی اجازت ہے، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اُن سے فدیہ لیا جائے، جیسے بدر کے مقام میں جو قیدی ہوئے تھے تو حضور ﷺ نے ان سے فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا تھا، تو بدلے کے اندر مالی معاوضہ بھی لیا جاسکتا ہے اور کافر قیدی چھوڑ کر مقابلے میں مسلمان قیدی بھی چھڑائے جاسکتے ہیں۔ اور ان دو باتوں کے علاوہ دو اختیار اور ہیں، مناسب سمجھیں تو اس جنگی قیدی کو قتل بھی کرسکتے ہیں اگر مصلحت اسی میں ہو، اور اگر مناسب سمجھیں تو اس کو غلام بھی بنا سکتے ہیں، غلام بنانے کا حاصل بھی ایک قسم کا قیدی رکھنا ہی ہے کہ جیل میں پڑا رہے مفت میں، اس کی صلاحیتیں برباد ہوں، تو اس سے بہتر یہ ہے کہ اس کو مسلمانوں کے قبضے میں دے دیا جائے تاکہ مسلمان اس سے کام لیں اور اس کی صلاحیتیں کام آئیں، اور یہ غلام بنالینا بھی کافروں کے لئے ایک قسم کا احسان ہی ہے، کیونکہ اس کے بہت سارے حقوق بالکل آزاد کے برابر ہوجاتے ہیں، خاص طور پر مسلمانوں کی غلامی جس میں اللہ کے رسول نے غلاموں کے حقوق متعین کیے ہیں یہ ان کافروں کے لئے رحمت ہے بمقابلہ اس کے کہ اُن کو جیل میں ڈال دیا جائے اور پڑے گلے سڑتے رہیں۔ یہ سارے کے سارے اختیارات اِمامِ وقت کو ہیں جیسے مصلحت ہو ویسے کرسکتا ہے، جمہور کا مسلک بھی یہی ہے، اور اَحناف ﷭ کے نزدیک بھی مفتیٰ بہ قول یہی ہے، اگرچہ اس کے علاوہ کچھ اور اقوال بھی ہیں کہ فدیہ لے کر یا احسان کرکے چھوڑنا دُرست نہیں، یا ان کو قتل کیا جائے یا ان کو غلام بنایا جائے، بہرحال وہ روایات مرجوح ہیں، جمہور کا مسلک یہی ہے کہ چاروں قسم کے اختیار اِمامِ وقت کو حاصل ہیں، جیسی مصلحت ہو، ویسا معاملہ کرسکتا ہے۔

''جہاد'' کب تک جاری رکھا جائے؟

حَتّٰی تَضَعَ الْحَرْبُ اَوْزَارَهَا: اوزار یہاں اسلحہ، جنگ کے معنی میں ہے۔ اوزار: ہتھیار، یہ تو آپ بولا ہی کرتے ہیں، مستریوں کے اوزار، وہ ہتھیاروں کے معنی میں ہے۔ ''حتیٰ کہ رکھ دے لڑائی اپنے ہتھیار، حتیٰ کہ لڑائی اپنے ہتھیار وضع کردے'' مطلب کیا ہے؟ کہ کفار ہتھیار ڈال دیں، لڑائی کے ہتھیار ڈالنے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ حرب ہتھیار ڈال دیں، یعنی قتل پکڑ دھکڑ یہ جاری رہنی چاہیے حتیٰ کہ کافروں کی شوکت ٹوٹ جائے، یا وہ مسلمان ہوجائیں یا پھر وہ تابع ہوجائیں، مسلمان ہوجائیں گے تو بھی انہوں نے ہتھیار ڈال دیے، اور اگر انہوں نے اطاعت قبول کرلی جیسے ذِمّی ہوجایا کرتے ہیں تو بھی ہتھیار ڈال دیے، جب تک کافر ہتھیار نہ ڈالیں اس وقت تک تمہاری طرف سے مار دھاڑ پکڑ دھکڑ جاری رہنی چاہیے، اتنا ان کے پیچھے لگو کہ یہ آخر ہتھیار ڈالنے

پر مجبور ہوجائیں، اور ہتھیار ڈالنے کی وہ دونوں صورتیں ہیں، یا تو مسلمان ہوجائیں یا ذِمّی بن جائیں عقدِ ذمہ کو قبول کرلیں۔ ذٰلِكَ: اِفْعَلُوْا ذٰلِكَ ایسے ہی کرو، یہ اسی کی تاکید ہے، یہی کام کرو جو تمہیں بتایا جارہا ہے۔

"جہاد" کی حکمت

وَلَوْ يَشَآءُ اللّٰهُ لَانْتَصَرَ مِنْهُمْ وَلٰكِنْ لِّيَبْلُوَا بَعْضَكُمْ بِبَعْضٍ: اِس میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کی ایک حکمت واضح کی ہے، یعنی اللہ تعالیٰ نے کافروں پر تمہیں مسلط کیا، اور ان کے پکڑنے اور قتل کرنے کا حکم دیا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو براہِ راست بھی ان سے بدلہ لے سکتا تھا، جس طرح سے پچھلی امتوں میں جنہوں نے انبیاء ﷩ کی مخالفت کی اور اہلِ ایمان کو تنگ کیا تو اللہ تعالیٰ نے براہِ راست ہی بدلہ لیا، عذاب بھیج دیا، ملیامیٹ کردیے، بے نام ونشان کردیے، اِن سے بھی اللہ تعالیٰ اسی طرح سے براہِ راست بدلہ لے سکتا ہے لیکن یہ اللہ کی رحمت ہے، سرورِ کائنات ﷺ کے آجانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس قسم کا عذاب انسانوں پر نہیں بھیجا جو مخالفین کو بالکل جڑ سے اکھیڑ دے، پھر ان کے ماننے کی گنجائش ہی نہ رہے، بلکہ یہاں سزا کی صورت اللہ تعالیٰ نے جہاد کے طور پر تجویز فرمائی، کہ مؤمن اور کافر میدان کے اندر ٹکرائیں جس میں دونوں گروہوں کی آزمائش بھی ہے، اور کافروں کے لئے ماننے کی گنجائش بھی باقی رہ جاتی ہے، ورنہ عذابِ مستاصل آجانے کے بعد، تباہ کن عذاب آجانے کے بعد کافروں کے لئے سنبھلنے کا کیا موقع ہے؟ لیکن یہ جہاد ایک ایسی چیز ہے کہ جس کے بعد بھی کافروں کے سنبھلنے کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے، "اگر اللہ چاہتا تو ان سے بدلہ لے لیتا لیکن اس نے اس طرح سے براہِ راست بدلہ نہیں لیا، تمہیں قتال کا حکم دیا، تاکہ آزمائش کرے تم میں سے بعض کی بعض کے ساتھ۔"

"مجاہد" ہر حال میں کامیاب ہے

اور اس آزمائش میں کافر تو بہرحال ناکام، مؤمن بہرحال کامیاب، جو اللہ کی طرف سے حکم کو مان کر میدانِ جہاد میں اُتر آئے وہ کامیاب، دونوں صورتوں میں، اگر انہوں نے کافروں کو قتل کردیا تو یہ غازی، تو بھی اللہ کے ہاں اجر پائیں گے، مجاہد بن گئے، اور اگر میدان کے اندر کافروں کے ہاتھوں سے مارے گئے تو بھی کامیاب، بتانا یہ مقصود ہے کہ ایمان کے جذبے سے اللہ کے حکم کے تحت جو میدانِ جہاد میں اتر آیا وہ کامیاب ہی کامیاب ہے، ناکام نہیں ہے۔ بظاہر یہ وسوسہ آتا ہے کہ جو شخص کافروں کے ہاتھوں قتل ہوگیا وہ تو اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوا، کامیاب اسی کو سمجھا جائے جو فتح پاجائے اور کافروں کی شوکت توڑنے کا باعث بن جائے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں نہیں! جو اللہ کے راستے میں قتل ہوجاتے ہیں ان کے اعمال بھی اللہ کے ہاں قبول ہیں، وہ بھی کامیاب ہیں، جہاد میں اُتر جانا ہی اصل کے اعتبار سے کامیابی ہے، چاہے نتیجہ اپنے قتل کی صورت میں سامنے آجائے، چاہے دُوسروں کو قتل کرنے کی صورت میں سامنے آجائے۔ اِسی کو خواجہ عزیز الحسن مجذوب جو حضرت تھانوی ﷫ کے خلفاء میں سے ہیں غالباً انہی کے اس قسم کے شعر ہیں:

بنیں ہم نہ ہندی نہ ترکی نہ قاضی	بنا لیں بس اپنے کو سچا حجازی
ہمی پھر بہرحال لے جائیں بازی	مریں تو شہید اور ماریں تو غازی

"مریں تو شہید اور ماریں تو غازی!" یہ وہی بات ہے کہ اگر میدانِ جہاد کے اندر مر گئے تو شہید، تو بھی کامیاب، اور اگر مار کے آگئے تو غازی، پھر کسی قسم کا خسارہ نہیں ہے۔ تو وَالَّذِیْنَ قُتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَلَنْ یُّضِلَّ اَعْمَالَهُمْ: جو لوگ اللہ کے راستے میں قتل کر دیئے جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ہرگز ان کے اعمال کو ضائع نہیں کرتا، ان کا بھی یہ عملِ جہاد قبول ہے، اور اللہ تعالیٰ اس کا اجر دے گا، میدان کے اندر اُتر آنا بس یہی کامیابی ہے، دوسرے کو قتل کرنا یا اپنا قتل ہو جانا یہ دونوں کامیابی کی صورتیں ہیں، سورۂ براءۃ میں بھی یہ مضمون آپ کے سامنے گزرا تھا اِنَّ اللّٰہَ اشْتَرٰی مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ۗ یُقَاتِلُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَیَقْتُلُوْنَ وَیُقْتَلُوْنَ (آیت:۱۱۱) وہاں دونوں صورتیں ذِکر کی گئیں کہ قتل کرتے ہیں اور قتل کیے جاتے ہیں، یہ دونوں صورتیں کامیابی کی ہیں۔

جنتی لوگ اپنا مقام خود پہچان لیں گے

سَیَهْدِیْهِمْ: اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو سیدھا راستہ دکھائے گا یعنی جنت کا، جیسے کہ تفصیل یُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ کے اندر ذِکر کی جا رہی ہے، "اللہ تعالیٰ اِن کو منزلِ مقصود تک پہنچائے گا" وَیُصْلِحُ بَالَهُمْ: اور ان کا حال دُرست کر دے گا، منزلِ مقصود تک پہنچائے گا اُس کی تفصیل یہی ہے وَیُدْخِلُهُمُ الْجَنَّةَ عَرَّفَهَا لَهُمْ: داخل کرے گا اللہ تعالیٰ ان کو جنت میں، اور پہچنوا دے گا وہ جنت ان کے لئے، وہ جنت ان کے لئے اجنبی نہیں ہوگی، جانی پہچانی ہوگی، جیسے کہ تفسیری روایات میں آیا ہے کہ جس طرح سے تم باہر سے اپنے شہر میں آتے ہو اور اپنے گھر کا راستہ بلاتکلف معلوم کر لیتے ہو، کہ یہ راستہ ہمارے گھر کو جا رہا ہے اور یہ ہمارا گھر ہے، تو جب اللہ تعالیٰ تمہیں جنت میں بھیجے گا اس سے بھی زیادہ اچھے طریقے کے ساتھ تم اپنے اپنے درجے کو پہچان لو گے کہ یہ ہمارا درجہ ہے اور یہاں ہم نے جا کر ٹھہرنا ہے، فطری طور پر اور طبعی طور پر اللہ تعالیٰ جنت کی پہچان کروا دیں گے، اور پھر آگے جا کر جو حور و قصور اور خدام آپ کو ملیں گے تو ان سے بھی کوئی اجنبیت نہیں ہوگی، جاتے ہی اس طرح سے مانوس ہو جائیں گے گویا ان کے ساتھ تو پُرانی واقفیت اور پُرانی معرفت ہے، اُنس ہی اُنس ہوگا اور کوئی کسی قسم کی اجنبیت نہیں ہوگی، عَرَّفَهَا لَهُمْ کے اندر یہ سب باتیں آجائیں گی، "اللہ تعالیٰ پہچنوا دے گا جنت ان مؤمنین کے لئے" معرفتِ تامہ ان کو حاصل ہو جائے گی، نہ ان کو اپنا ٹھکانا تلاش کرنے کے لئے کوئی فکر کرنا پڑے گا اور پریشانی اُٹھانی پڑے گی، اور نہ خدام اور ازواج کے ساتھ اُنس پیدا کرنے کے لئے کوئی وقت لگے گا، بلکہ سب کے ساتھ معرفتِ تامہ اللہ تعالیٰ اِبتداءً ہی دے دیں گے۔

دِین کی مدد پر اللہ کے وعدے

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰہَ یَنْصُرْكُمْ: یہ جہاد کی ترغیب ہے، اے ایمان والو! اگر تم اللہ کی مدد کرو گے اللہ تمہاری مدد کرے گا، "اللہ کی مدد" سے مراد اللہ کے دِین کی مدد، اللہ کے رسول کی مدد۔ اللہ کے کلمے کو غالب کرنے کے لئے جو جد و جہد کی جائے وہ سب "اللہ تعالیٰ کی مدد" ہی کہلاتی ہے، اس کام کی عظمت بڑھانے کے لئے اللہ نے اس عنوان کو اختیار کیا، گویا کہ دِین کی خدمت کرنا ایسے ہے جیسے کوئی شخص اللہ کی مدد کرے، اور اللہ کی طرف سے مدد تو پھر آتی ہے۔ وَیُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ: اور اللہ تمہارے قدموں کو جما کے رکھے گا، تمہارے قدموں کو جمائے گا، تمہارے قدم میدان میں اُکھڑیں گے نہیں، اگر تم صحیح طور پر دِین کے خادم بن جاؤ۔

دِین کے اَحکام کوخوشی سے قبول نہ کرنا ایمان کے منافی ہے!

وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا فَتَعْسًا لَّھُمْ: تَعِسُوْا تَعْسًا: برباد ہوجائیں وہ برباد ہونا، ''وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا پس بربادی ہے ان کے لئے'' وَاَضَلَّ اَعْمَالَھُمْ: اور اللہ نے ان کے اعمال سارے ضائع کردیے ذٰلِکَ بِاَنَّھُمْ کَرِھُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰہُ: اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ انہوں نے مکروہ جانا اس چیز کو جو اللہ نے اُتاری، فَاَحْبَطَ اَعْمَالَھُمْ: تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے، اُن کو دین پسند نہیں آیا، اللہ کی طرف سے اُتری ہوئی باتیں ان کے دِل کو نہیں لگتیں، ناگوار گزرتی ہیں، اور دین کی باتیں ناگوار گزرنا اور دِل کا اُن کے ساتھ خوش نہ ہونا یہی حبطِ اَعمال کا ذریعہ ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت اس شخص کو ہے جس کا دِل دِین کی باتوں کو خوشی کے ساتھ قبول کرلے، فَلَا وَرَبِّکَ لَا یُؤْمِنُوْنَ حَتّٰی یُحَکِّمُوْکَ فِیْمَا شَجَرَ بَیْنَھُمْ ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِھِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا (سورۂ نساء:۶۵) کہ اپنے دِل میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور خوشی کے ساتھ بات کو مان لیں، یہ ہیں کامل درجے کے مؤمن، اور اگر دین کی باتیں ناگوار گزرتی ہیں، دِل ان کو خوش ہوکر قبول نہیں کرتا، یہ کُفر ہے، ظاہری طور پر اگر کوئی شخص کلمہ پڑھتا بھی ہے، لیکن اگر دین کی بات کوئی سامنے آجائے تو دِل کو ناگوار گزرے کہ ایسا کیوں ہوگیا؟ ایسا نہیں ہونا چاہیے، میں تو اس کو ماننے کے لئے تیار نہیں، دِل میں اس قسم کے جذبے اگر آتے ہیں تو سمجھ لیں کہ اس شخص کے قلب میں ایمان نہیں ہے، یہ نفاق ہے، چاہے اس کا کسی کو پتا نہ چلے، اس لئے دِین کا حکم سامنے آجانے کے بعد اس کے سامنے سرِتسلیم خم کردینا یہی اصل مؤمن ہونے کی علامت ہے۔ تو ان کے اُوپر یہ پھٹکار اور تعس وبربادی جو آئی تو اس لئے آئی کہ انہوں نے ناگوار جانا ان باتوں کو جو اللہ نے اُتاریں، اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے۔

گزشتہ قوموں کے اَنجام سے عبرت حاصل کرو

اَفَلَمْ یَسِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ فَیَنْظُرُوْا کَیْفَ کَانَ عَاقِبَۃُ الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِھِمْ: کیا یہ زمین میں چلے پھرے نہیں؟ پھر دیکھ لیتے کیسا انجام ہوا ان لوگوں کا جو ان سے پہلے گزرے ہیں، دَمَّرَ اللّٰہُ عَلَیْھِمْ: اللہ نے ان کے اوپر بربادی ڈالی، تباہی ڈالی، دَمَّرَ تَدْمِیْرًا کا معنی ہوتا ہے نیست ونابود کردینا، اللہ تعالیٰ نے ان کے اُوپر بربادی ڈال دی، وَلِلْکٰفِرِیْنَ اَمْثَالُھَا: اور اِن کافروں کے لئے بھی ایسے ہی واقعات ہونے والے ہیں، یہ اگر سمجھیں گے نہیں تو اِن کے اوپر بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایسے ہی تدمیر ہوگی جس طرح سے پہلے کافروں کو مختلف عذابوں کا نشانہ بنایا گیا، لِلْکٰفِرِیْنَ کے اندر الف لام عہد کا ہے، ''اِن کافروں کے لئے بھی ایسے ہی حالات ہیں۔''

مؤمنین کا اللہ مولیٰ ہے، کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں!

ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ مَوْلَی الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اور یہ اس سبب سے ہے کہ اللہ کارساز ہے ان لوگوں کا جو کہ ایمان لے آئے، وَاَنَّ

الْكٰفِرِیْنَ لَا مَوْلٰى لَهُمْ: اور کافروں کا کوئی مولیٰ نہیں، کافروں کا کوئی کارساز اس طرح نہیں جس طرح سے اللہ مسلمانوں کا مددگار ہے۔
مولیٰ مالک کو بھی کہتے ہیں، اور مالک ہونے کے اعتبار سے تو اللہ کافروں کا بھی مولیٰ ہے ثُمَّ رُدُّوْۤا اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ (سورۂ انعام: ۶۲)
وہاں مولیٰ کی نسبت کافروں کی طرف بھی آئی، کہ وہ مولیٰ حقیقی کی طرف لوٹا دیئے گئے، وہاں مولیٰ مالک کے معنی میں ہے، اور یہاں
مولیٰ ناصر، مددگار، کارساز کے معنی میں ہے، اس معنی پر اللہ تعالیٰ مؤمنوں کا مولیٰ ہے، کافروں کا نہیں۔

اِنَّ اللّٰهَ یُدْخِلُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا
بے شک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں، باغات میں جن کے نیچے سے نہریں
الْاَنْهٰرُ ؕ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا یَتَمَتَّعُوْنَ وَیَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ
جاری ہیں، اور جو لوگ کفر کرتے ہیں وہ فائدہ اٹھا رہے ہیں، اور یہ کھاتے پیتے ہیں جس طرح سے جانور کھاتے پیتے ہیں اور جہنم
مَثْوًى لَّهُمْ ﴿۱۲﴾ وَكَاَیِّنْ مِّنْ قَرْیَةٍ هِیَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْیَتِكَ الَّتِیْۤ اَخْرَجَتْكَ ۚ
ان کا ٹھکانا ہے ﴿۱۲﴾ اور کتنی ہی بستیاں جو زیادہ سخت تھیں از روئے قوت کے آپ کی اس بستی سے جس نے آپ کو نکال دیا، ہم نے ان
اَهْلَكْنٰهُمْ فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ ﴿۱۳﴾ اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ
بستیوں والوں کو برباد کر دیا، پھر ان کا کوئی مددگار نہیں تھا ﴿۱۳﴾ کیا پھر وہ شخص جو واضح دلیل پہ ہے اپنے رب کی طرف سے اس شخص کی
زُیِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْۤا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ
طرح ہو سکتا ہے؟ جس کے لئے اس کا برا عمل مزین کر دیا گیا اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں ﴿۱۴﴾ حال اس جنت کا جس کا
وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ ؕ فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ ۚ وَاَنْهٰرٌ
وعدہ دیے گئے ہیں متقی لوگ، یہ ہے کہ اس میں نہریں ہیں ایسے پانی کی جو کہ گلا سڑا ہوا نہیں، اور اس جنت کے اندر نہریں ہیں
مِّنْ لَّبَنٍ لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ ۚ وَاَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ ۚ۬ وَ
دودھ کی جس کا مزہ بدلا ہوا نہیں، اور اس جنت کے اندر شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے بڑی لذیذ ہے، اور اس جنت کے
اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى ؕ وَلَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ وَمَغْفِرَةٌ
اندر نہریں ہیں شہد کی جو صاف کیا ہوا ہے، اور ان کے لئے اس جنت میں ہر قسم کے میوے ہوں گے اور ان کے رب کی طرف سے

مِّنْ رَّبِّهِمْ ؕ كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِی النَّارِ وَسُقُوْا مَآءً حَمِيْمًا

مغفرت ہوگی، (کیا یہ متقی لوگ) اُن جیسے ہوں گے جو ہمیشہ جہنم میں رہنے والے ہیں؟ اور پلائیں جائیں گے وہ گرم پانی،

فَقَطَّعَ اَمْعَآءَهُمْ ⑮ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّسْتَمِعُ اِلَيْكَ ۚ حَتّٰٓى اِذَا خَرَجُوْا

وہ پانی ان کی آنتڑیوں کو کاٹ دے گا⑮ بعض لوگ ایسے ہیں جو آپ کی طرف کان تو لگاتے ہیں، حتیٰ کہ جب آپ کی مجلس سے اُٹھ

مِنْ عِنْدِكَ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ مَاذَا قَالَ اٰنِفًا ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ طَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى

کے جاتے ہیں تو کہتے ہیں ان لوگوں کو جو علم دیئے گئے، کہ انہوں نے ابھی کیا کہا؟ یہی لوگ ہیں کہ ان کے دِلوں پر اللہ نے مُہر کردی

قُلُوْبِهِمْ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ⑯ وَالَّذِيْنَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَّ

اور یہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے⑯ اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں، زیادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو ازروئے ہدایت کے، اور

اٰتٰهُمْ تَقْوٰىهُمْ ⑰ فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ اَنْ تَاْتِيَهُمْ بَغْتَةً ۚ فَقَدْ جَآءَ

دیتا ہے اللہ ان کو ان کا تقویٰ⑰ نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر قیامت کا کہ آجائے ان کے پاس اچانک، تحقیق اس قیامت کی علامات

اَشْرَاطُهَا ۚ فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ ⑱ فَاعْلَمْ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

آچکی ہیں، کیونکر ہوگا ان کے لئے ان کا نصیحت حاصل کرنا جب وہ قیامت آجائے گی⑱ پس آپ یقین کر لیجئے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں

وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ وَلِلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ ⑲ ع

اور استغفار کیجئے آپ اپنی خطا کے لئے اور استغفار کیجئے مؤمنین کے لئے اور مومنات کے لئے، اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمہارے
چلنے پھرنے کی جگہ کو بھی اور تمہارے ٹھہرنے کی جگہ کو بھی⑲

تفسیر

اِنَّ اللّٰهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ: بے شک اللہ تعالیٰ داخل کرے گا ان لوگوں کو جو ایمان لاتے ہیں اور نیک عمل کرتے ہیں جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ: باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں۔

"کافر" جانوروں کی طرح ہیں!

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ: اور جو لوگ کُفر کرتے ہیں وہ دُنیا میں فائدہ اُٹھا رہے ہیں، تَمَتَّعَ: فائدہ اُٹھانا، وہ فائدہ اُٹھا رہے

ہیں، وَیَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ: اور دُنیا میں کھاتے پیتے ہیں جس طرح سے ڈنگر ڈور کھاتے پیتے ہیں، ان کا کھانا پینا جانوروں کی طرح ہے، اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (سورۂ اعراف:۱۷۹) ان کا دُنیا کے اندر رہنا تو جانوروں کی طرح ہے، جن کے سامنے سوائے اپنی شہوات کے پورا کرنے کے کچھ بھی نہیں، انجام کو سوچتے ہی نہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں جانور جتنے بھی ہیں، اَنعام، چوپائے جو اپنے گھروں میں رہتے ہیں، ان کو دیکھو، ان کا حاصلِ زندگی کیا ہے؟ پیٹ بھرنے کی فکر ہے، کھانے کی فکر ہے، پینے کی فکر ہے، نَر مادہ کے آپس میں تعلقات کی فکر ہے، اور اسی طرح سے بچے پیدا ہوجاتے ہیں تو بچوں کے ساتھ وہ پیار بھی کرتے ہیں، کوئی کام ایسا نہیں جو اِن میں اور ایک عام انسان میں مختلف ہو، سردی گرمی سے بچنا، اپنے لئے جو تکلیف دہ چیز ہے اس سے بچنے کی کوشش کرنا، یہ سب ان جانوروں میں بھی پایا جاتا ہے، لیکن بات اتنی ہے کہ ان کو اپنا انجام معلوم نہیں کہ ہمارے اوپر کوئی ذمہ داری بھی آتی ہے یا نہیں آتی؟ صرف اپنی شہوات کو پورا کرنا جانتے ہیں، کسی ذمہ داری کا ان کو کوئی احساس نہیں، انجام کی کوئی فکر نہیں، اسی طرح سے جو اِنسان ذمہ داری کا احساس نہیں کرتا اور اپنے انجام کو نہیں سوچتا تو اس میں اور ڈنگر میں کوئی فرق نہیں ہے، یہ بالکل جانوروں کی طرح کھاتے پیتے فائدہ اُٹھاتے ہیں، وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ: اور ایسے بےفکر اور مزے اُڑانے والوں کا انجام یہی ہے کہ جہنم ان کا ٹھکانا ہے۔ ''یہ کھاتے پیتے ہیں جس طرح سے جانور کھاتے پیتے ہیں اور جہنم اِن کا ٹھکانا ہے۔''

اہلِ مکہ سے زیادہ طاقتور قومیں ہلاک ہوگئیں

وَكَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ هِىَ اَشَدُّ قُوَّةً مِّنْ قَرْيَتِكَ الَّتِىْٓ اَخْرَجَتْكَ: اور کتنی ہی بستیاں جو زیادہ سخت تھیں از روئے قوت کے تیری اِس بستی سے جس نے تجھے نکال دیا، اِس سے مراد ہے مکہ معظمہ، تو اِس سے معلوم ہوگیا کہ یہ آیت ہجرت کے بعد اُتری، ''جس بستی نے تجھے نکال دیا اُس بستی سے زیادہ قوت اور طاقت والی کتنی ہی بستیاں تھیں اَهْلَكْنٰهُمْ: ہم نے ان بستیوں والوں کو برباد کردیا، تو یہ بھی بچیں گے نہیں، ''بستی'' بول کے ''اہلِ بستی'' مراد ہیں، فَلَا نَاصِرَ لَهُمْ: پھر ان کا کوئی مددگار نہیں تھا، بڑی قوت طاقت والی تھیں، جب ہم نے ان کو ہلاک کیا تھا تو اُن کا کوئی مددگار نہیں تھا۔

دلیل پر چلنے والا اور خواہش پر چلنے والا، برابر نہیں ہوسکتے

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ: کیا پھر وہ شخص جو کہ واضح دلیل پہ ہے اپنے رَبّ کی طرف سے، یا، واضح راستے پر ہے، یعنی اس کے رَبّ کی طرف سے ایک واضح چیز آئی ہوئی ہے وہ اس پر ثابت قدم ہے، كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ: اس شخص کی طرح ہوسکتا ہے؟ جس کے لئے اس کا بُرا عمل مزین کردیا گیا، وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ: اور وہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں جو متبع خواہشات ہیں اور بُرے اعمال ان کو اچھے لگ رہے ہیں، یہ دونوں آپس میں برابر نہیں، جب برابر نہیں تو انجام بھی برابر نہیں رہے گا، یعنی ایک آدمی کا طرزِ عمل تو یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے ایک واضح دلیل آتی ہے، اس واضح دلیل سے وہ راستہ اخذ کرتا ہے اور اس کے اوپر چلتا ہے، تو اس شخص کا کتنا صاف ستھرا طرزِ عمل ہے، اور یہ کتنا مامون اور محفوظ طرزِ عمل ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی طرف گارنٹی ہوگئی جس وقت اس کے اُوپر واضح دلیل موجود ہے تو ہم بےفکر ہیں، واضح دلیل کو اختیار کرکے ہم نے ایک عمل کرلیا، اور ایک آدمی

کے سامنے کوئی دلیل نہیں اس کے رَبّ کی طرف سے، وہ اندھیر میں پڑا ہوا ہے، اس کے سامنے صرف اپنی خواہشات ہیں، اور بُرے سے بُرا عمل بھی اس کے لئے دلچسپ بنا ہوا ہے، چونکہ کسی دلیل کی بنا پر تو اِختیار ہی نہیں کرتا، اپنی خواہش کی بنا پر اِختیار کرتا ہے...... دیکھو! ایک آدمی نشہ پینے لگ جائے تو نشہ پینا کسی واضح دلیل کی بنا پر نہیں ہے، کہ اس نے پہلے دلیل کے ساتھ اس کام کو سمجھا ہو کہ یہ کرنا ضروری ہے پھر اس نے یہ عادت اختیار کی ہو، عادت اختیار کر لینے کے بعد وہ عادت اتنی لذیذ بن جاتی ہے اس کے نزدیک، کہ اس کو چھوڑنے کے لئے وہ بالکل تیار نہیں ہوتا، یہ تو ایک مثال ہے، تمام بُری عادتوں کی یہی بات ہے، کہ جو بُری عادت انسان اختیار کیا کرتا ہے وہ ظلمت اور اندھیر میں کرتا ہے، اس کے سامنے کوئی واضح دلیل نہیں ہوتی، دُنیا کی کوئی بُری عادت ہو اس کو اِختیار کرتے وقت انسان بنیاد دلیل پر نہیں رکھتا کہ میں یہ کام اس لئے کرنے لگا ہوں کہ دلیل کا تقاضا یہ ہے کہ کرنا ضروری ہے، بدمعاشی، عیاشی کے جتنے کام ہیں سب اسی طرح سے ہیں، نفسانی ظلمت ہے، نفسانی شہوت ہے جو اِنسان کو ایک راستے کی طرف دھکا دے دیتی ہے، کوئی دلیل اور روشنی سامنے نہیں ہوتی، لیکن اس میں لگ جانے کے بعد پھر نفس جب عادی ہو جاتا ہے تو وہی انتہائی درجے کی لذیذ لگنے لگ جاتی ہے، اور جب لذیذ لگنے لگ جاتی ہے تو پھر اِنسان اس کو چھوڑتا نہیں، اب دن بدن وہ سوائے اس کے کہ اندھیرے میں ٹھوکریں کھاتا چلا جا رہا ہے، گڑھے میں گرتا چلا جا رہا ہے، اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟...... اور ایک آدمی کا طرزِ عمل یہ ہے کہ کام کرنے سے پہلے سوچتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے بارے میں کوئی دلیل آئی ہے؟ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلیل آتی ہے، روشنی مہیا ہو جاتی ہے تو سوچ سمجھ کے انسان اس کو اِختیار کرے، تو دونوں کی زندگی برابر کس طرح سے ہے؟ اور جب دونوں کی زندگی برابر نہیں تو انجام بھی برابر نہیں۔ تو کامیابی کا راستہ یہ ہے کہ عقل و ہوش کے ساتھ، سوچ کے چلو، جو کام کرنے لگو یہ دیکھو کہ کیا دلیل کے ساتھ اس کی صحت ثابت ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی دلیل قائم ہے اس بات پر؟ جو گارنٹی دیتی ہو کہ تم یہ طریقہ اختیار کرو، انجام اچھا نکلے گا۔ جس شخص کی سوچ یہ ہے وہ کامیاب ہے، اور جو صرف اتباعِ شہوت کے طور پر اندھیرے میں چھلانگ لگاتا ہے، اور اس کے سامنے کوئی دلیل نہیں ہوتی، اور پھر چھلانگ لگانے کے بعد نفسانی لذت میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اِتباعِ شہوات کی زندگی کو اَپناتا ہے، تو کس طرح سے اُمید کر سکتا ہے کہ میرا انجام بھی ویسے ہی ہوگا جیسے اس کا ہے، دونوں برابر نہیں ہو سکتے، اس لئے عقل کے ساتھ سوچ کر دلیل دیکھ کر پھر اِنسان کو قدم اُٹھانا چاہیے تب جا کے کامیابی کی راہ کھلا کرتی ہے...... یہ دو طرزِ عمل ہیں انسانوں کے، ایک محض لذت پرستی کے طور پر، جی یوں چاہتا ہے اس لیے کر لو، بس یہی ہوتی ہے سب سے بڑی بات، ان سے کہو کہ بھائی! اس کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار تم نے دیکھ لیا؟ دلیل اس کو صحیح ثابت کرتی ہے یا غلط ثابت کرتی ہے، تم نے اس بات کو سوچ لیا؟ اس راستے پہ وہ آتے ہی نہیں، جب آتے ہی نہیں تو پھر جانور ہی ہوئے، جانوروں کا کام یہی ہے کہ جو چیز ان کے دل میں آئے کر لی، ان کو یہ نہیں پتا کہ اس کا انجام اچھا نکلے گا یا بُرا نکلے گا؟ یہ دونوں آدمی برابر نہیں ہیں، تو اللہ تعالیٰ یہ بات آپ کے سامنے اس لئے واضح کر رہا ہے کہ آپ اس طریقے کو اپنائیں، کامیابی کا طریقہ یہ ہے کہ آپ جو بھی طرزِ عمل اختیار کریں، عقیدہ اختیار کرو، طرزِ عمل اختیار کرو، اس کو اختیار کرنے سے پہلے تھوڑی دیر ٹھہر کے سوچ لو کہ کیا یہ دلیل پہ مبنی ہے؟ کوئی

اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح روشنی اس کے بارے میں آئی ہے؟ اگر کرو گے تو اِن شاء اللہ العزیز! کسی درجے میں بھی جا کے آپ نقصان نہیں اُٹھا سکتے، بچی تلی بات ہوگی اور گارنٹی شدہ ہوگی، جس کے اندر کسی قسم کی کوئی شک وشبہ کی گنجائش ہی نہیں، تو ''کیا یہ اس شخص کی طرح ہو سکتے ہیں جن کے لئے بُرا عمل مزین کر دیا گیا اور وہ اپنی شہوات کے پیچھے، خواہشات کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔''

جنّت کے مشروبات وماکولات

مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ: یہ عَلٰی بَیِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ یہ معقون کا مصداق ہے، ''حالت اس جنّت کی جس کا وعدہ دیئے گئے ہیں متقی لوگ'' یہ ہے جو آگے ذکر کی گئی، مَثَلُ الْجَنَّةِ یہ مبتدا ہے اور فِیْهَاۤ اَنْهٰرٌ مِّنْ مَّآءٍ غَیْرِ اٰسِنٍ یہ خبر کی جگہ ہے۔ ''حال اس جنّت کا جس کا وعدہ دیئے گئے ہیں متقی لوگ، یہ ہے کہ اُن میں نہریں ہیں پانی کی، ایسا پانی جو کہ گلا سڑا ہوا نہیں'' غَیْرِ اٰسِنٍ: اس میں کوئی کسی قسم کی بُو نہیں، ورنہ دُنیا کے اندر جو پانی ہوتے ہیں، تالاب کی شکل میں کھڑے ہوں، نالیوں کی شکل میں بہتے ہوں، تو یہ متعفن بھی ہو جاتے ہیں، بدبُودار بھی ہو جاتے ہیں، ان کا ذائقہ بھی خراب جاتا ہے، لیکن جنّت کی نہریں صاف ستھری ہوں گی، ان کے پانی کے اندر کوئی کسی قسم کا تغیر نہیں ہوگا۔ اَسِنَ الْمَآءُ: تَغَیَّرَ رِیْحُهٗ پانی کی ہوا کا بدل جانا، بدبودار ہو جانا۔ ''پانی کی نہریں ہیں جو متغیر نہیں ہے'' مُتَغَیِّرُ الرِّیْحِ نہیں ہے۔ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ لَّبَنٍ: اور اس جنّت کے اندر نہریں ہیں دودھ کی لَّمْ یَتَغَیَّرْ طَعْمُهٗ: جس کا مزہ بدلا ہوا نہیں، دُنیا کے دُودھ ہیں، تھوڑی دیر تک پڑے رہیں تو ان کا بھی ذائقہ خراب ہو جاتا ہے، بدبُودار ہو جاتا ہے، وہاں صاف ستھرا، تازہ دُودھ ہوگا، وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ خَمْرٍ لَّذَّةٍ لِّلشّٰرِبِیْنَ: اور اس جنّت کے اندر شراب کی نہریں ہیں جو پینے والوں کے لئے بڑی لذیذ ہے، دُنیا کی شراب کی طرح کڑوی بدذائقہ نہیں، اور دُوسرے نقصانات کی نفی دوسری آیات میں آئی ہے لَا فِیْهَا غَوْلٌ وَّ لَا هُمْ عَنْهَا یُنْزَفُوْنَ (سورۂ صافات: ۴۷) کوئی پیٹ کا درد، سر کا درد اس کی وجہ سے نہیں ہوگا، نہ عقل ماری جائے گی، شراب کے جو دُنیا کے اندر نقصانات ہیں کہ بدمزہ بھی ہوتی ہے، اور پھر اس کے نتیجے میں کبھی پیٹ کا درد، کبھی سر کا درد بھی ہوتا ہے، اور عقل علیحدہ ماؤف ہو جاتی ہے، لوگ اِس کو اپنی بعض موہومہ مصلحتوں کے تحت پیتے ہیں، وہ فائدہ محسوس کرتے ہیں کہ اِس میں وقتی طور پر یہ فائدہ ہو جاتا ہے، کوئی اپنے ذہن میں تجویز کر لیتے ہیں وقتی طور پر، نشہ آ جانے کے بعد ان کو کچھ سرور محسوس ہوتا ہے، یا وہ عقل ماری جانے کی وجہ سے تفکرات ختم ہو جاتے ہیں تو وہ سمجھتے ہیں کہ راحت حاصل ہو جاتی ہے، کچھ ایسی موہومہ مصلحتیں ہیں جن کی بنا پر لوگ پیتے ہیں، ورنہ وہ نہ پیتے وقت لذیذ ہوتی ہے، نہ اس کے بعد کوئی اچھے نتائج اس کے سامنے آیا کرتے ہیں۔ تو آخرت کی شراب جو ہوگی وہ پینے میں لذیذ بھی ہے اور دیگر قسم کے نقصانات بھی اس میں نہیں ہیں۔ وَ اَنْهٰرٌ مِّنْ عَسَلٍ مُّصَفًّى: اور اس جنّت کے اندر نہریں ہیں شہد کی جو صاف کیا ہوا ہے۔ عسل مصفی: صاف ستھرا شہد۔ دُنیا کے شہد کی طرح نہیں کہ اس میں مکھیاں مری ہوئی ہوں، یا موم کی ملاوٹ ہو، یا اس کو اچھی طرح سے صاف نہ کیا گیا ہو، صاف ستھرے شہد کی نہریں ہوں گی۔ وَ لَهُمْ فِیْهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ: یہ تو آپ کے لئے مختلف قسم کے مشروبات تھے، یہ مشروبات کا ذکر آیا تھا، اور دُنیا کے اندر یہی مشروبات ہیں، ان کو مختلف شکلوں میں بدل بدل کے بہت کچھ بن سکتا ہے، مثلاً دُودھ بھی آ گیا، پانی بھی آ گیا، اور آپ جانتے ہیں کہ اسی سے آپ لسّی بھی بنا لیتے ہیں، دُودھ سے دہی بنا کر اس کو بھی کتنے

طریقوں سے استعمال کر لیتے ہیں، اور ہمارے ذوق کے مطابق اسی دودھ اور پانی کے ساتھ آگے چائے بھی تیار ہو جاتی ہے۔[1] یہ مشروبات کی قسمیں ہیں، لیکن ماخذ مشروبات کے یہی چار چیزیں ہیں، وَلَهُمْ فِيهَا مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ یہ آگے ماکولات کا ذکر آ گیا، اور ان کے لیے اس جنت میں ہر قسم کے میوے ہوں گے، اور آگے رُوحانی غذا اور رُوحانی راحت آ گئی وَمَغْفِرَةٌ مِّن رَّبِّهِمْ: ان کے رَبّ کی طرف سے معافی ہوگی، مغفرت ہوگی، درگزر کرنا ہوگا، پچھلی غلطیوں کے اوپر کوئی کسی قسم کی پکڑ نہیں ہوگی۔

جہنمیوں کا مشروب

تو کیا ایسا شخص كَمَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ: یہ ایسے متقی لوگ اُن جیسے ہوں گے جو کہ ہمیشہ جہنم میں رہنے والے ہیں؟ وہ متبع شہوات مَنْ هُوَ خَالِدٌ فِي النَّارِ کا مصداق ہے، اور یہ متقون جو بینہ پر قائم ہیں ان کا حال یہ ہے کہ ان کے لئے ایسی نہریں ہوں گی، کیا یہ اس شخص کی طرح ہے جو کہ ہمیشہ جہنم میں رہنے والا ہو؟ وَسُقُوا مَاءً حَمِيمًا: اور پلائے جائیں گے وہ گرم پانی فَقَطَّعَ أَمْعَاءَهُمْ: وہ پانی ان کی آنتڑیوں کو کاٹ دے گا، دوسری آیتوں میں ذکر کیا گیا يَشْوِي الْوُجُوهَ (سورۂ کہف: ۲۹) چہرے کو بھون دے گا، مطلب یہ ہے کہ اس کا خارجی اثر یہ ہوگا کہ جب چہرے کے قریب کریں گے تو چہرے کو بھونے گا، اور پیاس کی شدت کی بنا پر اگر اس کو حلق سے اُتاریں گے تو آنتڑیوں کو کاٹ دے گا، نہ وہ باہر باعثِ راحت ہے، نہ وہ اندر باعثِ راحت ہے۔ دونوں فریقوں کا یہ انجام ہو گیا۔

''مجلسِ نبوی'' سے منافق فائدہ کیوں نہیں اُٹھاتے؟ مؤمن فائدہ کیوں اُٹھاتے ہیں؟

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ: یہ منافقین کا ذکر آ گیا کہ بعض لوگ ایسے ہیں جو آپ کی طرف کان تو لگاتے ہیں، حَتَّىٰ إِذَا خَرَجُوا مِنْ عِندِكَ: جب آپ کی مجلس سے اٹھ کے جاتے ہیں، قَالُوا لِلَّذِينَ أُوتُوا الْعِلْمَ: کہتے ہیں ان لوگوں کو جو علم دیے گئے مَاذَا قَالَ آنِفًا: کہ انہوں نے ابھی کیا کہا؟ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ طَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ: یہی لوگ ہیں کہ ان کے دِلوں پر اللہ نے مُہر کر دی، وَاتَّبَعُوا أَهْوَاءَهُمْ: اور یہ اپنی خواہشات کے پیچھے لگ گئے۔ یہ حال منافقین کا تھا، کہ بظاہر آ کے حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھتے بھی تھے، کان لگا کے سنتے بھی تھے، لیکن جس وقت اس مجلس سے اُٹھ کر جاتے (ذرا خیال کرنا!) چونکہ حضور ﷺ کی باتوں کو وہ دل سے قبول نہیں کرتے تھے، دِل ان کا كَرِهُوا مَا أَنزَلَ اللَّهُ کا مصداق ہی تھا، اللہ کی باتیں ان کو ناگوار گزرتی تھیں، باہر نکل کے......! ''اہلِ علم'' سے مراد ہیں مخلص صحابہ جو حضور ﷺ کی خدمت میں بیٹھ کے علم حاصل کر کے آتے تھے، ان کو آ کے کہتے کہ ''انہوں نے ابھی کیا کہا تھا؟'' اس کے دو مطلب ہیں یا تو یہ ہے کہ ہماری تو سمجھ میں ان کی باتیں آتی ہی نہیں یا قابلِ توجہ نہیں ہیں، یا بسا اوقات یہ لفظ بولے جاتے ہیں بات پر اعتراض کرنے کے لئے کہ دیکھو! کیسی باتیں کر رہے تھے، جب آپ کسی مخالف کی مجلس سے اُٹھ کر آئیں تو آپ یوں کہا کرتے ہیں ''سنی ہیں؟ کیسی باتیں کر رہے تھے؟'' تو اس میں گویا کہ ان باتوں کی اُوپر اعتراض کرنا مقصود ہوتا ہے کہ یہ باتیں بھی کوئی کرنے کی تھیں؟ اور ان کا یہی علم و فضل ہے جو اس قسم کی باتیں کرتے تھے؟ تو یوں آ کے وہ اللہ تعالیٰ کی باتوں کی اور اللہ کے رسول کی باتوں کی باہر تحقیر کرتے ہیں اور ان کو ناقابلِ توجہ قرار دیتے ہیں، یہ منافقین میں بیماری تھی جس کو یہاں ذکر کیا گیا، ''اہلِ علم

(۱) حضرت حکیم العصرؒ چائے کے بہت شوقین تھے، اور خود ہی بناتے تھے۔

سے کہتے ہیں کہ انہوں نے ابھی کیا کہا؟، یہی لوگ ہیں جن کے دلوں پر اللہ نے مُہر لگادی'' کہ مجلسِ نبوی میں بیٹھ کر بھی آپ کی باتوں سے متاثر نہیں ہوتے، یوں ہے کہ ان کے دِل پتھر کے ہو گئے، اللہ تعالیٰ نے مُہر لگادی اور مُہر لگانے کی وجہ اصل میں یہی ہے کہ یہ اپنی خواہشات کے متبع ہیں، جس وقت تک کوئی شخص اپنی خواہشات کو نہیں کچلتا اور حقیقت پسندی کو اختیار نہیں کرتا کبھی اس کو ہدایت نصیب نہیں ہوا کرتی، خواہشات انسان کے دِل میں ایک ایسی ظلمت پیدا کر دیتی ہیں کہ اچھی سے اچھی بات بھی پھر انسان قبول نہیں کرتا اگر اس کی خواہش کے خلاف ہو، شہوت پرستی آخر انسان کو ہر طرح سے نا قابلِ اصلاح بنا دیتی ہے۔ وَالَّذِیْنَ اهْتَدَوْا: اور جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں زَادَهُمْ هُدًى: زیادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو از روئے ہدایت کے، وہ جتنا حضور ﷺ کی مجلس میں جائیں گے جا کر بیٹھیں گے علم میں اضافہ ہوگا، عملی قوت بڑھے گی، نورِ ایمانی میں اضافہ ہوگا، وہ سب فائدہ ہی فائدہ اُٹھا کے آتے ہیں، ''جو لوگ ہدایت یافتہ ہیں زیادہ کرتا ہے اللہ تعالیٰ ان کو از روئے ہدایت کے، اور دیتا ہے اللہ ان کو ان کا تقویٰ'' تقوے کی توفیق دیتا ہے، فَهَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا السَّاعَةَ: یہ منافق لوگ جو اس طرح سے سمجھتے نہیں تو نہیں انتظار کرتے یہ مگر قیامت کا، قیامت آئے گی تو سمجھیں گے، لیکن جب قیامت آگئی تو پھر سمجھنے کا موقع نہیں ہوگا، یعنی یہ دلیل سے نہیں سمجھتے، یہ منتظر اسی کے ہیں کہ قیامت آجائے، جب قیامت آئے گی پھر یہ سمجھیں گے لیکن پھر سمجھنے کا موقع کوئی نہیں ہوگا۔ ''نہیں انتظار کرتے یہ لوگ مگر قیامت کا کہ آجائے ان کے پاس اچانک۔''

دورِ نبوی سے ہی علاماتِ قیامت کا ظہور شروع ہو گیا تھا

فَقَدْ جَآءَ اَشْرَاطُهَا تحقیق اس قیامت کی علامات آچکی ہیں، کیونکہ حضور ﷺ کے زمانے سے ہی علاماتِ قیامت واضح ہونی شروع ہو گئیں، حضور ﷺ کا تشریف لانا اور پھر آپ کا اس دُنیا سے جانا یہ سب علاماتِ قیامت میں سے ہی ہے، کیونکہ جب تک آپ نہ آتے اس وقت تک قیامت نہ آتی، یہ بھی علامت متحقق ہو گئی، پھر حضور ﷺ کے زمانے میں چاند کا انشقاق اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ (پارہ ۲۷، سورۂ قمر) یہ معجزہ ہے، یہ بھی علاماتِ قیامت میں سے ہے، اور بھی علاماتِ قیامت میں حدیث شریف کے اندر بیسیوں چیزیں بیان کی گئیں جو درجہ بدرجہ حضور ﷺ کے تشریف لانے کے بعد پوری ہوتی جا رہی ہیں۔ تو ان کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ دُنیا اب آخر کو پہنچ گئی، جیسے حضور ﷺ نے عصر کے بعد وعظ کرتے ہوئے فرمایا تھا، سورج قریب الغروب تھا، کہا کہ جتنا یہ دِن باقی ہے تو دُنیا کی عمر بھی گزری ہوئی عمر کے لحاظ سے اتنی سی ہی باقی ہے،[1] زیادہ عمر گزر گئی، تھوڑی باقی ہے، ابھی آجائے گی قیامت، فَاَنّٰى لَهُمْ اِذَا جَآءَتْهُمْ ذِكْرٰىهُمْ: اَنّٰى لَهُمْ ذِكْرٰىهُمْ کیونکر ہوگا ان کے لئے ان کا نصیحت حاصل کرنا، ان کا نصیحت حاصل کرنا کیونکر ہوگا جس وقت وہ قیامت آجائے گی، یعنی پھر یہ نصیحت نہیں حاصل کر سکیں گے۔ اَنّٰى لَهُمْ ذِكْرٰىهُمْ کیونکر ہوگا ان کے لئے نصیحت حاصل کرنا جب وہ قیامت آجائے گی۔

(۱) ترمذی ۲/ ۴۳، باب ما اخبر النبی ﷺ اصحابہ بما هو کائن۔ مشکوۃ ۲/ ۴۳۸، باب الامر بالمعروف، فصل ثانی۔

انبیاء علیہم السلام کی لغزش پر لفظ ’’ذنب‘‘ کا اطلاق

فَاعْلَمْ: پس آپ یقین کرلیجئے، یہ خطاب حضور ﷺ کو ہے، سنانا سب کو مقصود ہے، علم سے یہاں یقین مراد ہے، ’’آپ یقین کرلیجئے کہ‘‘ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ: اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں، وَاسْتَغْفِرْ لِذَنْۢبِكَ: اور آپ سے آپ کی شان کے مطابق جو کچھ لغزش کوتاہی ہوجاتی ہے اس سے اِستغفار کرتے رہیے، گناہ ہر کسی کا اس کے درجے کے مطابق ہوا کرتا ہے بھائی! انبیاء علیہم السلام سے خلافِ اَولیٰ بات اگر ہوجاتی ہے، اِجتہادی طور پر اگر لغزش ہوجاتی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی ’’ذنب‘‘ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں، یہ عصمتِ انبیاء کے تحت آپ کے سامنے کئی دفعہ بات واضح ہوگئی۔ ’’اِستغفار کیجئے آپ اپنی خطا کے لئے اور اِستغفار کیجئے مؤمنین کے لئے اور مؤمنات کے لئے۔‘‘

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مُتَقَلَّبَكُمْ وَمَثْوٰىكُمْ: تَقَلُّب: لوٹ پوٹ ہونا، اُلٹ پلٹ ہونا جس کو کہتے ہیں، ’’تمہارے چلنے پھرنے کی جگہ کو اور تمہارے ٹھہرنے کی جگہ کو اللہ تعالیٰ جانتا ہے‘‘ تمہارا کوئی حال مخفی نہیں، تمہارا متقلب بھی معلوم ہے، مثویٰ بھی معلوم ہے، مثویٰ: ٹھہرنے کی جگہ یا ٹھہرنا، متقلب: چلنے پھرنے کی جگہ، ’’اللہ تعالیٰ جانتا ہے تمہارے چلنے پھرنے کی جگہ کو بھی اور تمہارے ٹھہرنے کی جگہ کو بھی۔‘‘

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ ۚ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ وَّذُكِرَ
کہتے ہیں وہ لوگ جو ایمان لے آئے، کیوں نہیں اُتاری جاتی کوئی سورت، پھر جس وقت کوئی محکم سورت اُتاردی جاتی ہے اور اس سورت میں
فِيْهَا الْقِتَالُ ۙ رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ
قتال کا ذکر آجاتا ہے، دیکھتا ہے تو ان لوگوں کو جن کے دِلوں میں بیماری ہے، جھانکتے ہیں تیری طرف مثل جھانکنے اس شخص کے جس کے اوپر
عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ ۭ فَاَوْلٰى لَهُمْ ۚ ⑳ طَاعَةٌ وَّقَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ ۣ فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ ۣ
موت کی غشی طاری کردی گئی ہو، ان کو ہلاک کرنے والی چیز ان کے قریب آگئی ⑳ طاعت اور معروف بات ان کے لئے بہتر ہے، جس وقت امر پختہ ہوجائے
فَلَوْ صَدَقُوا اللّٰهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۚ ㉑ فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي
پھر اگر یہ اللہ کے سامنے سچے ثابت ہوں تو یہ ان کے لئے بہتر ہے ㉑ اگر تم نے پیٹھ پھیری تو کیا تم اس بات کے قریب ہو کہ زمین میں

الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ ﴿۲۲﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ فَاَصَمَّهُمْ وَاَعْمٰۤى

فساد مچاؤ گے اور رشتہ داریاں قطع کروگے؟ ﴿۲۲﴾ یہی لوگ ہیں کہ ان کے اُوپر اللہ نے لعنت کی، اور انہیں بہرا کردیا اور ان کی آنکھیں

اَبْصَارَهُمْ ﴿۲۳﴾ اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ اَمْ عَلٰى قُلُوْبٍ اَقْفَالُهَا ﴿۲۴﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا

اندھی کردیں ﴿۲۳﴾ کیا یہ لوگ قرآنِ کریم میں غور نہیں کرتے، یا ان کے دِلوں کے اُوپر قفل پڑے ہوئے ہیں؟ ﴿۲۴﴾ بے شک وہ لوگ جو اپنی پشتوں

عَلٰۤى اَدْبَارِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى ۙ الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ ﴿۲۵﴾

پر لوٹ گئے بعد اس کے کہ ان کے لئے ہدایت واضح ہوگئی، شیطان نے ان کو چکما دیا ہے، اور ان کے لئے لمبی لمبی خواہشات واضح کی ہیں ﴿۲۵﴾

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ ۚ

یہ اس وجہ سے ہوا کہ ان منافقین نے کہا ان لوگوں کو جنہوں نے مکروہ جانا اس چیز کو جو اللہ نے اُتاری، کہ ہم اطاعت کریں گے تمہاری بعض امر میں

وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ ﴿۲۶﴾ فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ

جانتا ہے اللہ تعالیٰ ان کے بات کے چھپانے کو ﴿۲۶﴾ پھر کیا حال ہوگا ان کا جب فرشتے انہیں وفات دیں گے، ماریں گے ان کے چہروں پر

وَاَدْبَارَهُمْ ﴿۲۷﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَاۤ اَسْخَطَ اللّٰهَ وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ ﴿۲۸﴾

اور ان کی دبروں پر ﴿۲۷﴾ یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اتباع کی ایسی چیز کی جس نے اللہ کو ناراض کردیا، اور انہوں نے اللہ کی رضا کو پسند نہیں کیا، تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے ﴿۲۸﴾

تفسیر

"محکم" کے دو مفہوم

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ: کہتے ہیں وہ لوگ جو ایمان لے آئے، کیوں نہیں اُتاری جاتی کوئی سورت، فَاِذَاۤ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ: پھر جس وقت کوئی سورت محکمہ اُتار دی جاتی ہے، مُّحْكَمَةٌ یہ لفظ اِحکام سے لیا گیا ہے، اور اِحکام کا معنی پختہ کرنا، اور سورۂ محکمہ کا معنی دو طرح سے کیا جاسکتا ہے، ایسی سورت جو منسوخ ہونے والی نہیں، محکم منسوخ کے مقابلے میں بھی آتا ہے، اس کا حکم پختہ کردیا گیا، جس کے اوپر نسخ نہیں آئے گا۔ یا محکمہ کا معنی ہوتا ہے کہ جس کی مراد بالکل واضح ہو، متشابہات کے مقابلے میں محکمات کا لفظ قرآنِ کریم میں آیا ہے مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (سورۂ آل عمران: ۷) متشابہات وہ آیات ہوا کرتی ہیں کہ جن کا مفہوم اچھی طرح سے واضح نہیں ہوتا، اور محکمات وہ آیات ہوا

کرتی ہیں جن کا مفہوم بالکل واضح ہوتا ہے، توسورۂ محکمہ کا مطلب ہو گیا ایسی سورت جس کا مطلب مراد بالکل واضح ہے، جب اس قسم کی واضح المراد سورت اُتاردی جاتی ہے، اور ایسے پختہ اَحکام پر مشتمل سورت اُتاردی جاتی ہے کہ جس کے اوپر نسخ آنے کا احتمال نہیں۔

جہاد کا حکم آنے پر منافقین اور مؤمنین کی حالت میں فرق

وَّذُكِرَ فِيْهَا الْقِتَالُ: اور اُس سورت کے اندر قتال کا ذکر آجاتا ہے، قِتال مُقاتَلَة باب مفاعلہ کا مصدر یعنی قتال بالکفار، جہاد کا حکم آ گیا، جہاد کا ذکر آ گیا، رَاَيْتَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ: دیکھتا ہے تو ان لوگوں کو جن کے دلوں میں بیماری ہے، يَّنْظُرُوْنَ اِلَيْكَ نَظَرَ الْمَغْشِيِّ عَلَيْهِ مِنَ الْمَوْتِ: جھانکتے ہیں تیری طرف، تکتے ہیں تیری طرف مثل جھانکنے اس شخص کے جس کے اُوپر موت کی غشی طاری کردی گئی ہو، مغشی علیہ: جس کے اُوپر غشی طاری کردی گئی موت سے، موت کی غشی جس پہ طاری کردی گئی ہو تو جس طرح سے اس کی آنکھیں بے نُور سی ہو جاتی ہیں، پتھرا جاتی ہیں، تو یہ بھی پریشانی کے عالم میں آپ کی طرف یوں ہی جھانکتے ہیں، فَاَوْلٰى لَهُمْ: پس بربادی ہے ان کے لئے، خرابی ہے ان کے لئے، یہاں اَوْلٰى لَهُمْ یہ وَيْلٌ لَّهُمْ الویل کے مفہوم میں ہے، قَارَبَهٗ مَا يُهْلِكُهٗ، ہلاک کرنے والی چیز اس کے قریب آ رہی ہے، اس کی ہلاکت قریب ہے، اس شخص کے لئے بربادی عنقریب واقع ہونے والی ہے، اَوْلٰى لَهُمْ کا یہ مفہوم ہے۔

تو پچھلے رکوع میں منافقین کا اور مؤمنین کا ذکر آیا تھا، مؤمنین کو تو اُوْتُوا الْعِلْمَ کے ساتھ تعبیر کیا گیا تھا جو علم دیے گئے، اور منافقین حضور ﷺ کی خدمت میں آتے تھے اور بے توجہی کے ساتھ بیٹھتے تھے، اُٹھنے کے کے بعد ذکر کرتے کہ یہ کیا بات ہوئی؟ جس میں یہ ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا کہ ہم حضور ﷺ کی باتوں کو قابلِ توجہ نہیں سمجھتے، یا وہ ہمارے نزدیک اچھی باتیں نہیں ہیں، جس طرح سے ان لفظوں کا مفہوم آپ کے سامنے ذکر کر دیا گیا تھا کہ بسا اوقات کسی کی بات پر اعتراض کرنے کے لئے ناپسندیدگی ظاہر کرنے کے لئے بھی یوں کہا جاتا ہے کہ یہ کیا باتیں کر رہے تھے، اور کبھی اس بات کو ظاہر کرنے کے لئے کہ ہم نے کوئی توجہ سے نہیں سنیں، ہمارے نزدیک یہ قابلِ توجہ نہیں ہیں، یہ لفظ بولے جاتے ہیں، وہاں دونوں کا ذِکر تھا۔ تو یہ آنے والی آیات بھی دونوں کے ذکر پر ہی مشتمل ہیں کہ جہاد کا جب حکم آتا ہے تو مؤمنین کے جذبات کیا ہوتے ہیں اور منافقین کے کیا ہوتے ہیں، تو مؤمنین کو اُبھارنا مقصود ہے کہ جہاد دِل و جان سے کرنا چاہیے، اور حکم جہاد کے اوپر خوشی ہونی چاہیے نہ کہ ناگواری، ناگواری کا آنا، دِل کے اندر کراہت کا محسوس کرنا یہ منافقین کا کام ہے، مخلصین کا کام نہیں ہے، مؤمنین تو زیادتِ علم کے لئے اور زیادتِ ہدایت کے لئے ہر وقت متمنی ہوتے تھے کہ اللہ کی طرف سے کوئی سورت اُترے تا کہ ہمارے علوم میں اضافہ ہو، زیادہ سے زیادہ معرفت حاصل ہو، یہ تو ان کی خواہش ذکر کی گئی ہے لَوْلَا نُزِّلَتْ سُوْرَةٌ: کیوں نہیں اُتاری جاتی کوئی سورت، یعنی ان کے دل میں ہر وقت یہ جذبہ ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی سورت اترے، ہمارے سامنے سرورِ کائنات ﷺ پڑھ کر سنائیں تا کہ ہمارے علم میں اضافہ ہو۔ فَاِذَآ اُنْزِلَتْ سُوْرَةٌ مُّحْكَمَةٌ: جس وقت کوئی سورت اُتاردی جاتی ہے جس کی مراد بالکل واضح ہوتی ہے یا ایسے احکام پر مشتمل ہوتی ہے جو پکے احکام ہیں، جو منسوخ نہیں ہوں گے، خصوصیت کے ساتھ اس میں جہاد کا ذکر آجاتا ہے، قتال مع الکفار کا، تو مؤمن مخلص جو

ہیں وہ تو خوش ہوتے ہیں، لیکن جن کے دلوں کے اندر بزدلی کی یا نفاق کی بیماری ہے ان کے اُوپر ہیبت اور وحشت طاری ہوجاتی ہے اس قسم کے احکام سننے کے بعد، وہ یوں پریشان سے ہوجاتے کہ جس طرح سے کسی کو موت اپنے سامنے کھڑی ہوئی دکھائی دیتی ہے، سورۂ نساء کے اندر بھی اس قسم کا مضمون آیا تھا فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللَّهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً وَقَالُوا رَبَّنَا لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ لَوْلَا أَخَّرْتَنَا إِلَىٰ أَجَلٍ قَرِيبٍ (آیت ۷۷) اس قسم کے الفاظ تھے کہ ان میں سے ایک فریق اس طرح سے لوگوں سے ڈرنے لگ جاتا ہے جس طرح سے اللہ سے ڈرنا چاہیے، اور پھر ان کے دل سے یہ تمنا اُبھرتی ہے، کہتے ہیں کہ اے اللہ! تُو نے ہم پر یہ لڑنا کیوں فرض کردیا، تھوڑی دیر کے لئے تُو نے ہمیں اور عافیت کیوں نہ دے دی، تو یہ جذبات بعض لوگوں کے دِلوں میں پیدا ہوتے ہیں جن کے دِل کے اندر ایمان کی کمزوری کی بیماری ہے یا نفاق کی بیماری ہے یا بزدلی ہے، یہ علامت ہوتی ہے اس بات کی کہ ایمان قوی نہیں ہے، جب انسان کے اوپر اس قسم کا حکم سننے کے بعد وحشت سی طاری ہوجائے تو یہ علامت ہے کہ یا تو قلب میں بزدلی ہے، جبن ہے، بہادری نہیں، اور یا پھر وہی! ایمان کی کمزوری ہے، ''دیکھتا ہے تو ان لوگوں کو جن کے دِلوں میں بیماری ہے، جھانکتے ہیں تیری طرف مثل جھانکنے اس شخص کے جس کے اُوپر موت کی غشی طاری کردی گئی ہو' فَأَوْلَىٰ لَهُمْ: یہ ان کے لئے وعید ہے،''عنقریب ان کے لئے بربادی آنے والی ہے، ان کو ہلاک کرنے والی چیز ان کے قریب آگئی۔''

منافقین کو حکمِ جہاد پر عمل کی ترغیب

طَاعَةٌ وَقَوْلٌ مَّعْرُوفٌ: طاعت اور معروف بات ان کے لئے بہتر ہے، یعنی طاعت اختیار کریں اور زبان سے بھی اچھی بات کالیں یہ ان کے لئے بہتر ہے، یوں بھی اس کا مفہوم ذکر کیا گیا ہے، اور یہ بھی مفہوم ذکر کیا گیا ہے کہ ان کی طاعت اور ان کی باتیں جانی پہچانی ہوئی ہیں، یعنی ان کا حال ہم سے مخفی نہیں ہے معروف ہے، دونوں طرح سے مترجمین نے اس کا ترجمہ کیا ہے، معروف طریقے سے طاعت کرنا اور معروف طریقے سے زبان سے بات کرنا یعنی اچھی بات زبان سے نکالنا اور اچھے طریقے سے طاعت اختیار کرنا ان کے لئے بہتر ہے، یا جس قسم کی طاعت ان کو حاصل ہے اور جس قسم کی یہ باتیں کرتے ہیں تو ان کی طاعت اور ان کی باتیں سب جانی پہچانی ہوئی ہیں، کوئی نئی بات نہیں۔ فَإِذَا عَزَمَ الْأَمْرُ: جس وقت امر پختہ ہوجائے یعنی جہاد والا حکم پختہ ہوگیا، اسباب مہیا ہوگئے، موقع سامنے آگیا، فَلَوْ صَدَقُوا اللَّهَ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ: پھر اگر یہ اللہ کے سامنے سچے ثابت ہوتے تو ان کے لئے بہتر تھا، اللہ کے لئے سچ بولتے، صَدَقُوا اللَّهَ: اللہ کے سامنے سچے ثابت ہوتے، صدق یہ بھی ہوا کرتا ہے کہ بات زبان سے واقع کے مطابق نکالی جائے، خلافِ واقع بات کو''کذب'' کہتے ہیں، جو واقع کے مطابق ہوتی ہے وہ سچی ہوتی ہے اس کو''صدق'' کہتے ہیں، اور ''صدق'' کا یہ معنی بھی ہوتا ہے کہ جو بات منہ سے نکالی اس کے مطابق عمل کرکے دکھادیا، تو اپنی بات کو سچا کر دکھایا، تو یہاں لَوْ صَدَقُوا اللَّهَ کا یہی معنی ہے، اللہ کے سامنے وہ سچ بولتے، سچے ثابت ہوتے، کہ جس طرح سے بسا اوقات ڈینگیں مارتے ہیں اور مجلس میں بیٹھ کے اپنی بہادری دکھاتے ہیں، تو چاہیے تھا کہ جب حکم جہاد آجائے تو اللہ کے سامنے سچے ثابت ہوں، پھر جہاد کرکے بھی دکھادیں، پھر اس طرح سے کیوں جھانکتے ہیں گویا کہ موت آنکھوں کے سامنے آگئی، اور موت کی غشی جس طرح سے طاری ہونے

کے بعد آنکھیں پتھرا جاتی ہیں تو دل میں بزدلی کی وجہ سے وحشت طاری ہو کے ان کی آنکھیں بھی ایسے ہی پتھرا جاتی ہیں، تو حکم جہاد کے پختہ ہو جانے کے بعد اِن کو اللہ تعالیٰ کے سامنے سچے ثابت ہونا چاہیے، یہ ان کے لئے بہتر ہے، کیونکہ منافق مجلس میں بیٹھ کر اپنی بہادری جتلانے کے لئے ایسی باتیں تو کرتے تھے کہ اگر ایسا حکم آ گیا تو ہم جان قربان کر دیں گے، اگر یہ ہو گیا تو ہم مال بھی قربان کر دیں گے، لیکن جب حکم آ جاتا تو پھر اُن کی حالت اور ہوتی، فَاِذَا عَزَمَ الْاَمْرُ: ''جس وقت امر پختہ ہو جائے اگر یہ اللہ کے سامنے سچے ثابت ہوں تو یہ ان کے لئے بہتر ہے۔''

''فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ... اِلخ'' کے دو مفہوم

فَهَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ تَوَلَّيْتُمْ اَنْ تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ وَتُقَطِّعُوْۤا اَرْحَامَكُمْ: عسیٰ یہ تو افعالِ مقاربہ میں سے ہے، اور تَوَلّٰی یَتَوَلّٰی اس کے دو معنی آتے ہیں، ایک تو پیٹھ پھیرنا، اعراض کرنا، اور ایک تَوَلّٰی کا معنی ہوتا ہے متولّی بننا، والی بن جانا، حاکم بن جانا، اور اَرحام رِحم کی جمع ہے، رِحم اصل کے اعتبار سے تو عورت کا ایک جزء ہے جس میں بچے کی تخلیق ہوتی ہے جہاں بچہ بنتا ہے، اور بعد میں یہ رشتہ داری کے معنی میں آ جاتا ہے، کیونکہ آپس میں قرب اور رشتہ داری اسی رحمی رشتے سے ہوتی ہے، ''اولوالارحام'' کہا جاتا ہے قریبی رشتہ داروں کو۔ اس آیت کا ترجمہ بھی دو طرح سے کیا گیا ہے، ایک تولّی بمعنی اِعراض لے کر، اور ایک تولّی بمعنی حاکم بنا لے کر، اِعراض والا معنی تو یوں ہو جائے گا اِنْ تَوَلَّيْتُمْ: اگر تم نے پیٹھ پھیری تو کیا تم اس بات کی امید کرتے ہو، کیا تم اس بات کے قریب ہو کہ زمین میں فساد مچاؤ گے اور رشتہ داریاں قطع کرو گے؟ اور یہ اِستفہامِ تقریری ہے کہ تم سے یہی اُمید ہے، اور تمہیں اپنے متعلق بھی یہی اُمید رکھنی چاہیے، اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کافروں کے متعلق جہاد کرنے کا، اور جہاد دنیا سے ظلم وستم مٹانے اور عدل کو قائم کرنے کا ذریعہ ہے، اگر تو اس حکم پر تم پختگی کے ساتھ لگ جاؤ اور کُفر وشرک کے مقابلے میں جہاد کرو پھر تو دنیا سے ظلم مٹے گا، عدل قائم ہو گا، لوگ آپس میں ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں گے، رشتہ داروں کے بھی حقوق ادا ہوں گے، خاندان والے بھی ایک دوسرے کا لحاظ رکھیں گے، عدل وانصاف کے قائم ہو جانے کے بعد۔ اور اگر تم اس جہاد سے پیٹھ پھیر گئے تو اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ جاہلیت کے دور کی طرف لوٹ جاؤ گے، اور جب جاہلیت کے دور کی طرف لوٹ جاؤ گے تو وہی ظلم ستم، قطع رحم، اور اس قسم کے واقعات پھر شروع ہو جائیں گے، تو کیا تمہیں امید ہے؟ یعنی یہ اُمید ہونی چاہیے کہ حکمِ جہاد سے پیٹھ پھیرنے کے نتیجے میں زمین میں تم فساد برپا کرو گے اور رشتہ داریوں کو قطع کرو گے، جس طرح سے پہلے فساد فی الارض تھا اور جس طرح سے پہلے قطعِ اَرحام تھا، کہ لوگ اپنے خاندان کے لوگوں کے بھی گلے کاٹتے تھے، اپنے بچوں تک کو قتل کر دیتے تھے، اولاد کو زندہ درگور کر دیتے تھے، تو پھر وہی حالات عود کر آئیں گے، اس لئے جہاد کے اندر دنیوی بہتری بھی ہے اور اُخروی بہتری بھی ہے، جہاد کرو گے تو فساد فی الارض ختم ہو گا، اور لوگوں میں عدل وانصاف قائم ہو گا، ایک دوسرے کے حقوق ادا کریں گے، رشتہ دار رشتہ دار کا خیال کرے گا، اور اگر اس حکم سے پیٹھ پھیر جاؤ گے تو وہی جہالت کا دور دورہ آ جائے گا، اور جہالت کے دور دورے کے آ جانے کے بعد پھر تمہیں یہ اُمید رکھنی چاہیے کہ وہی فساد فی الارض ہو گا، وہی قطعِ اَرحام ہو گا، تو یہ ترکِ جہاد کے نقصان کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے اور جہاد کے فائدے کی

طرف متوجہ کیا جارہا ہے، یہ تو تَوَلّی بمعنی اعراض لے کے اِس آیت کا مفہوم ہوا...... اور بعض مترجمین نے جس طرح سے کہ حضرت شیخ الہند ﷫ نے بھی ترجمہ جو کیا ہے تو حکومت والے معنی کے ساتھ کیا ہے "اگر تم کو حکومت مل جائے"، اِنْ تَوَلَّیْتُمْ کا معنی اس طرح سے کیا ہے، تَوَلّی: والی بننا، تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ تم اللہ کے راستے میں جہاد نہیں کرتے اور اللہ کے سامنے سچے ثابت نہیں ہوتے، اگر اندریں حالات تمہیں حکومت مل جائے اور تمہیں دنیا کا والی بنادیا جائے تو تم سے کوئی توقع نہیں کہ تم نیکی کرو گے، نیکی پھیلاؤ گے، بلکہ حاکم بن جانے کے بعد بھی زمین میں فساد کرو گے اور رشتہ داریاں قطع کرو گے، نہ حقوق العباد ادا کرو گے نہ حقوق اللہ ادا کرو گے، جو اللہ تعالیٰ کے احکام سے کترانے والے ہیں اور اللہ کا حکم سُن لینے کے بعد ان کے اوپر وحشت طاری ہوجاتی ہے ایسے لوگوں کو اگر دُنیا کا حاکم بنا بھی دیا جائے تو ان سے کوئی اصلاح کی توقع نہیں ہوگی، وہ پھر اتباعِ شہوات ہی کریں گے، اور اُسی طرح سے زمین میں فساد مچائیں گے اور قطعِ ارحام کریں گے، کیا مطلب؟ کہ ان حالات میں تم اس قابل نہیں ہو کہ تمہیں حاکم بنایا جائے، اگر حاکم بنا دیا جائے تو تم سے یہی توقع ہے کہ ایسے ہی کام کرو گے، اس لئے اللہ کے اَحکام کو اپناؤ اور اللہ کے اَحکام پر عمل کرنے کی عادت ڈالو، جس وقت یہ عادت ڈالو گے پھر اللہ تعالیٰ تمہیں جو حکومت دے گا تو اس وقت پھر اصلاحِ خلق ہوگی، لوگوں کے حقوق ادا ہوں گے، پھر اس میں کوئی فساد کا شائبہ نہیں ہوگا۔ تو پہلے اللہ تعالیٰ جہاد کروانا چاہتے ہیں، تم سے مجاہدہ کروانا چاہتے ہیں تاکہ اللہ کے اَحکام کے سامنے تمہیں سب کچھ دینے اور قربان کرنے کی عادت پڑ جائے، جب اللہ کے حکم کے سامنے قربان کرنے کی عادت پڑے گی تب جاکے تم صحیح حاکم بنو گے اور حکومت آجانے کے بعد پھر حالات کی اصلاح کرو گے، ورنہ اِنہی حالات میں کہ اللہ کا حکم اگر مرضی کے خلاف آجائے تو اس سے جان چراتے ہو، تو ایسی صورت میں اگر حکومت مل بھی جائے تو اصلاح کی توقع نہیں ہے۔ پھر اس آیت کا مفہوم یہ ہوگا، "کیا تمہیں اُمید ہے، کیا تم اس بات کے قریب ہو؟ یعنی تمہیں اُمید رکھنی چاہیے تمہیں یہ احتمال ہونا چاہیے کہ اگر تم حاکم بن جاؤ تو فساد مچاؤ گے زمین میں اور قطع کرو گے رشتہ داریوں کو۔"

اللہ کی لعنت کے مستحق لوگ

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ لَعَنَهُمُ اللّٰهُ: یہی لوگ جو کہ حکومت مل جانے کے بعد فساد فی الارض کرتے ہیں یا قطعِ ارحام کرتے ہیں، رشتہ داروں کے حقوق بھی ادا نہیں کرتے، یا جو اللہ کے احکام سے اِعراض کرتے ہیں اور فساد فی الارض کا ذریعہ بنتے ہیں، یہی لوگ ہیں کہ ان کے اوپر اللہ نے لعنت کی، فَاَصَمَّهُمْ: اور اِنہیں بہرا کردیا، وَاَعْمٰۤى اَبْصَارَهُمْ: اور ان کی آنکھیں اندھی کردیں، اس تَوَلّی کے نتیجے میں اور اللہ تعالیٰ کے احکام سے جان چرانے کے نتیجے میں نہ حق سننے کی صلاحیت رہتی ہے نہ حق دیکھنے کی صلاحیت رہتی ہے، یہ بات بارہا آپ کے سامنے آگئی کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کی مخالفت کا آخر نتیجہ یہ نکلا کرتا ہے کہ انسان سے نیکی کی صلاحیت ختم ہوجاتی ہے۔ اِن پر اللہ نے لعنت کی، ان کو اللہ نے اپنی رحمت سے دور ہٹادیا، اور پھر ان کو بہرا کردیا، یعنی حق سننے کی صلاحیت ان کی ختم ہوگئی، اور ان کی آنکھوں کو بھی اندھا کردیا، کہ پھر حق دیکھنے کی صلاحیت بھی ان کے اندر ختم ہوگئی، تو زمین میں فساد مچانا، حقوق تلف کرنا، خاص طور پر قطع رحمی، اس کے نتیجے میں انسان لعنت کا مورد بنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے لعنت آتی ہے۔

''صلہ رحمی'' کا مفہوم اور اس کی اہمیت

اور حدیث شریف میں صلہ رحمی کی تاکید بہت آئی ہے اور قطع رحمی کو حرام قرار دیا گیا ہے، جس کا حاصل یہی ہے کہ جتنا انسان کا قریبی رشتہ دار ہو اتنے حقوق اس کے زیادہ ہوا کرتے ہیں، وقت پر انسان اس کے کام آئے، اس کی خوشی میں شریک ہو، اس کی غمی میں اس کے ساتھ شریک ہو، اور جہاں تک ہو سکے اس کو فائدہ پہنچائے، اس کی بھلائی سوچے، صلہ رحمی کا مفہوم کچھ اسی طرح سے ہوا کرتا ہے۔ تو رشتہ داروں کے ساتھ اچھا برتاؤ حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ رزق میں وسعت کا باعث بھی بنتا ہے اور عمر میں زیادتی کا باعث بھی بنتا ہے۔[1] بہرحال حدیث شریف میں بہت زیادہ تاکید آئی ہے رشتہ داروں کے حقوق ادا کرنے کی، اور یہاں بھی قطع رحم کے اوپر لعنت کا تذکرہ آیا ہے، اور اُسی کے نتیجے میں بہرا کرنے اور اندھا کرنے کا ذکر ہوا کہ اللہ تعالیٰ باطنی صلاحیتیں ختم کر دیتے ہیں ان لوگوں کی جو کہ اِن احکام کی رعایت نہیں رکھتے۔

منافقین قرآن میں غور و خوض کیوں نہیں کرتے؟

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ: یہ منافق لوگ جو اللہ کے احکام کی طرف متوجہ نہیں ہوتے کیا یہ قرآنِ کریم میں تدبر نہیں کرتے؟ کہ یہ حقائق اِن کو سمجھ میں آ جائیں، یا یہ کچھ سوچتے تو ہیں لیکن ان کے دِلوں پر قفل پڑے ہوئے ہوئے ہیں اور کوئی بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی، یہاں اَوْ منع خُلُو کے طور پر ہے، اور دونوں باتیں بھی ہو سکتی ہیں کہ نہ وہ تدبر کرتے ہیں نہ ان کے قلوب میں صلاحیت ہے، تو یہ منع خلو کے طور پر، دونوں سے یہ خالی نہیں، دونوں جمع ہو سکتے ہیں، ''کیا یہ لوگ قرآنِ کریم میں غور نہیں کرتے؟ یا ان کے دِلوں کے اوپر قفل پڑے ہوئے ہیں؟''

مرتدین کے لئے شیطان کی تسویل

اِنَّ الَّذِيْنَ ارْتَدُّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ: بے شک وہ لوگ جو اپنی پشتوں پر لوٹ گئے، رَدَّ یَرُدُّ: لوٹانا، اِرْتَدَّ: لوٹنا، اور مرتد اُسے کہا جاتا ہے جو اسلام سے کُفر کی طرف لوٹ جاتا ہے، اور ادبار دُبُر کی جمع ہے، ''بے شک وہ لوگ جو اپنی دُبروں پر لوٹ گئے'' یعنی جدھر سے آئے تھے اُدھر کو چلے گئے واپس، کُفر کی طرف سے اسلام کی طرف آئے تھے اور پھر اسلام سے کُفر کی طرف لوٹ گئے، مِّنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدَى: بعد اس کے کہ ان کے لیے ہدایت واضح ہو گئی، الشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۚ وَاَمْلٰى لَهُمْ: سَوَّلَ تسویل، بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا، سورۂ یوسف کے اندر بھی یہ لفظ آیا تھا، تسویل کا معنی ہوا کرتا ہے کسی کے سامنے کسی بات کو مزین کر کے پیش کرنا، اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں اس کا ترجمہ کیا ہے شیطان نے ان کو چکما دیا ہے، چکما دینے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ کسی بُری چیز کو شاندار کر کے سامنے پیش کر دیا جائے اور اس کے فوائد اس کے سامنے نمایاں کیے جائیں کہ اس میں یہ مصلحت ہے، یوں

---

(۱) مَنْ اَحَبَّ اَنْ يُبْسَطَ لَهٗ فِيْ رِزْقِهٖ وَيُنْسَاَ لَهٗ فِيْ اَثَرِهٖ فَلْيَصِلْ رَحِمَهٗ. (بخاری ۸۸۵/۲۔ مشکوۃ ۴۱۹/۲، باب البر) لَا يَزِيْدُ فِي الْعُمْرِ اِلَّا الْبِرُّ (ترمذی ۳۵/۲۔ مشکوۃ ۴۱۹/۲)

کرلوگے تو یہ فائدہ ہوگا، یوں کرلوگے تو یہ فائدہ ہوگا، وہاں جس طرح سے ترجمہ کیا تھا یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے جب جھوٹ موٹ کا عذر پیش کیا اپنے باپ کے سامنے، تو حضرت یعقوب علیہ السلام نے کہا تھا کہ بات کوئی نہیں بلکہ تمہارے دلوں نے کوئی بات بنالی ہے، تو یہاں بھی یہ مطلب ہے کہ شیطان نے ان کے لئے کوئی بات بنالی، شیطان نے ان کو چکما دیا، وَاَمْلٰى لَهُمْ: اَمْلٰى يُمْلِيْ اِمْلَاءً: ڈھیل دینا، مہلت دینا، اور یہاں مطلب یہ ہے کہ ان کے لئے لمبی لمبی خواہشات شیطان نے واضح کردی ہیں، مَدَّ لَهُمُ الْاَمَانِيَّ کا مفہوم ہے، اور حضرت (تھانوی) رحمہ اللہ نے اس کا مفہوم یوں ہی بیان کیا کہ شیطان نے ان کو دُور دُور کی سجھائی ہے، بہت دُور دُور کی تمنائیں اِن کے دل کے اندر ڈالی ہیں، اَمْلٰى لَهُمْ کا یہ مفہوم ہوجائے گا: ''شیطان نے ان کے لئے بات بنائی ہے اور ان کو دُور دُور کی سجھائی ہے'' یعنی دُور دُور کی تمنائیں ان کے دل کے اندر ڈال دیں، لمبی لمبی خواہشات ان کے قلب کے اندر ڈال دیں جس کی بنا پر وہ اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی پروا نہیں کرتے، شیطان اُن کے دل میں ڈال رہا ہے کہ یہ گناہ کرلو، یہ معصیت اختیار کرلو، اِس میں یہ فائدہ ہے، اِس میں یہ فائدہ ہے، اور فلانا نیکی کا کام اختیار کروگے تو تمہارا یہ نقصان ہوجائے گا، وہ نقصان ہوجائے گا، اس قسم کی باتیں شیطان ان کے لئے بناتا ہے۔ اَلشَّيْطٰنُ سَوَّلَ لَهُمْ ۭ وَاَمْلٰى لَهُمْ: شیطان نے ان کے لئے کوئی بات بنائی ہے، بات مزین کرکے ان کے سامنے پیش کی ہے، شیطان نے ان کو چکما دیا ہے، اور ان کے لئے لمبی لمبی خواہشات واضح کی ہیں۔

منافقین کو یہود کی صحبت برباد کرگئی

ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ: اور یہ اس وجہ سے ہوا کہ اِن منافقین نے کہا اُن لوگوں کو جنہوں نے مکروہ جانا اس چیز کو جو اللہ نے اُتاری، اَلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ کا مصداق یہودی ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے اُتارے ہوئے دِین کو پسند نہیں کرتے تھے، اور ان منافقین کے اُن کے ساتھ تعلقات تھے، اندر اندر دوستی تھی، اور خفیہ طور پر اُن کو کہتے تھے کہ ہم اللہ تعالیٰ کا حکم نہیں مانیں گے، تمہارے بعض احکام کی ہم اطاعت کریں گے، مسلمانوں کی جماعت کے خلاف یہودی جو کارروائیاں کرتے تھے ان کے ساتھ یہ منافقین موافقت کرتے تھے، اُن یہودیوں کے ساتھ دوستی اور ان کے ساتھ محبت اور ان کے ساتھ معاہدے کی وجہ سے ان کے یہ حالات خراب ہورہے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ جس وقت انسان کی صحبت اور انسان کی دوستی بُرے لوگوں کے ساتھ ہوا کرتی ہے پھر وہ اللہ کے احکام سے جان چرانے لگ ہی جایا کرتا ہے، تو منافقین کی بھی اندر سے یہی گڑبڑ تھی، کہ یہود کے ساتھ ان کے تعلقات تھے، تو یہود کے ساتھ تعلقات کی بنا پر یہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے بچنے کی کوشش کرتے تھے۔ ''یہ اس وجہ سے ہوا کہ اِنہوں نے کہا اُن لوگوں کو جنہوں نے مکروہ جانا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ کو'' سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ یہ قَالُوْا کا مقولہ ہے، اِنہوں نے اُن یہود سے کہا جو کہ اللہ کے اُتارے ہوئے دین کو پسند نہیں کرتے کہ ہم اطاعت کریں گے تمہاری بعض امر میں، وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِسْرَارَهُمْ: اللہ تعالیٰ ان کے خفیہ طور پر بات کرنے کو جانتا ہے۔ اِسرار یہ مصدر ہے، اَسَرَّ الْقَوْلَ: بات کو پوشیدہ کرنا، چپکے چپکے یہ جو بات کرتے ہیں، پوشیدہ طور پر بطور راز کے ایک دوسرے سے جو بات کرتے ہیں اللہ تعالیٰ سب جانتا ہے، ''جانتا ہے اللہ تعالیٰ اِن کے بات چھپانے کو۔''

موت کے وقت منافقین کی بدحالی

فَكَيْفَ اِذَا تَوَفَّتْهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ: پھر کیا حال ہوگا ان کا جب فرشتے انہیں وفات دیں گے، يَضْرِبُوْنَ وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ: ماریں گے ان کے چہروں پر اور ان کی ڈبروں پر، منافقوں کو جس وقت موت آتی ہے تو اس وقت اللہ کی طرف سے جو فرشتے مسلط ہوتے ہیں وہ انہیں مارتے ہیں ان کے مونہوں پر بھی مارتے ہیں، ان کی ڈبروں پر بھی مارتے ہیں، مطلقاً سزا دینا مقصود ہے، عذابِ برزخ پر جن آیات سے استدلال کیا جاتا ہے ان میں سے یہ آیت بھی ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت کے وقت بھی کافروں کو سزا ہوتی ہے، فرشتے اِن کی پٹائی کرتے ہیں، جس طرح سے صراحت کے ساتھ آ گیا کہ ان کے چہروں پر بھی مارتے ہیں اور ان کی ڈبروں پر بھی مارتے ہیں، یہی سزا ہے جس کو ہم برزخ کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، یہ موت کے ساتھ ہی ان پر شروع ہوجاتی ہے، ذٰلِكَ بِاَنَّهُمُ اتَّبَعُوْا مَآ اَسْخَطَ اللّٰهَ: یہ اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے اتباع کی ایسی چیز کی جس نے اللہ کو ناراض کردیا، وَكَرِهُوْا رِضْوَانَهٗ: اور انہوں نے اللہ کی رضا کو پسند نہیں کیا، فَاَحْبَطَ اَعْمَالَهُمْ: تو اللہ نے ان کے اعمال ضائع کردیے۔

اَمْ حَسِبَ الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ اَنْ لَّنْ يُّخْرِجَ اللّٰهُ اَضْغَانَهُمْ ﴿۲۹﴾ وَلَوْ نَشَآءُ

کیا سمجھ لیا ان لوگوں نے جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ اللہ ہرگز نہیں نکالے گا ان کے کینے؟ ﴿۲۹﴾ اگر ہم چاہتے تو آپ کو

لَاَرَيْنٰكَهُمْ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ؕ وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِيْ لَحْنِ الْقَوْلِ ؕ وَاللّٰهُ

وہ منافق دکھادیتے، پھر آپ پہچان لیتے ان کو ان کے نشان کے ساتھ، اور اور البتہ ضرور پہچان لیں گے آپ ان کو ان کے طرزِ گفتگو میں، اللہ تعالیٰ

يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۰﴾ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ ۙ وَنَبْلُوَا

تم سب کے اعمال کو جانتا ہے ﴿۳۰﴾ البتہ ضرور آزمائش میں ڈالیں گے ہم تمہیں تاکہ جان لیں ہم مجاہدین کو تم میں سے اور صابرین کو، اور تمہارے

اَخْبَارَكُمْ ﴿۳۱﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ

حالات کو خوب اچھی طرح سے آزمالیں ﴿۳۱﴾ بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، اور رسول ﷺ کی مخالفت کی

مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾

بعد اس کے کہ ان کے سامنے ہدایت واضح ہوگئی، یہ لوگ اللہ کو کچھ بھی نہیں نقصان پہنچا سکتے، عنقریب اللہ ان کے اعمال ضائع کردے گا ﴿۳۲﴾

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ﴿۳۳﴾

اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور اپنے عملوں کو باطل نہ کیا کرو ﴿۳۳﴾

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ مَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يَغْفِرَ
بے شک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا پھر وہ مر گئے اس حال میں کہ کافر ہیں، ہرگز نہیں بخشے گا
اللَّهُ لَهُمْ ﴿٣٤﴾ فَلَا تَهِنُوا وَتَدْعُوا إِلَى السَّلْمِ وَأَنتُمُ الْأَعْلَوْنَ وَاللَّهُ مَعَكُمْ وَ
اللہ تعالیٰ انہیں ﴿۳۴﴾ پس تم ہمت نہ چھوڑو اور نہ بلاؤ تم صلح کی طرف، اور تم ہی غالب آنے والے ہو، اللہ تمہارے ساتھ ہے
لَن يَتِرَكُمْ أَعْمَالَكُمْ ﴿٣٥﴾ إِنَّمَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَلَهْوٌ وَإِن تُؤْمِنُوا وَتَتَّقُوا
ہرگز کم کر کے نہیں دے گا تمہیں تمہارے اعمال ﴿۳۵﴾ سوائے اس کے نہیں کہ دنیوی زندگی تو کھیل تماشا ہے، اور اگر تم ایمان لاؤ اور تقویٰ اختیار کرو
يُؤْتِكُمْ أُجُورَكُمْ وَلَا يَسْأَلْكُمْ أَمْوَالَكُمْ ﴿٣٦﴾ إِن يَسْأَلْكُمُوهَا فَيُحْفِكُمْ
تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اجر دے گا اور تم سے تمہارے مال نہیں مانگے گا ﴿۳۶﴾ اگر تم سے ان مالوں کا سوال کرے پھر مبالغے کے ساتھ سوال کرے
تَبْخَلُوا وَيُخْرِجْ أَضْغَانَكُمْ ﴿٣٧﴾ هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ تُدْعَوْنَ لِتُنفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
تو تم بخل کرو گے اور اللہ تمہاری ناگواریوں کو ظاہر کر دے گا ﴿۳۷﴾ خبردار! تم ہی یہ لوگ ہو جو بلائے جاتے ہو تاکہ خرچ کرو تم اللہ کے راستے میں
فَمِنكُم مَّن يَبْخَلُ وَمَن يَبْخَلْ فَإِنَّمَا يَبْخَلُ عَن نَّفْسِهِ وَاللَّهُ الْغَنِيُّ
پھر تم میں سے بعض وہ ہے جو بخل کرتا ہے، اور جو بخل کرتا ہے سوائے اس کے نہیں کہ وہ بخل کرتا ہے اپنے آپ سے ہی، اللہ بے نیاز ہے،
وَأَنتُمُ الْفُقَرَاءُ وَإِن تَتَوَلَّوْا يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُونُوا أَمْثَالَكُم ﴿٣٨﴾
تم ہی محتاج ہو، اور اگر تم نے پیٹھ پھیری تو بدل لائے گا اللہ تعالیٰ اور لوگوں کو، پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے ﴿۳۸﴾

تفسیر

منافقین کا نفاق اللہ نے کھول دیا

أَمْ حَسِبَ الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ أَن لَّن يُخْرِجَ اللَّهُ أَضْغَانَهُمْ: اضغان ضغن کی جمع ہے خفیہ عداوت، کینہ۔ کیا سمجھ لیا ان لوگوں نے جن کے دلوں میں بیماری ہے کہ اللہ ہرگز نہیں نکالے گا ان کے کینے، یعنی ان کے دلوں میں جو مسلمانوں کے خلاف کینے ہیں اللہ ظاہر نہیں کرے گا، وہ یہ سمجھے بیٹھے ہیں؟ اور مرض سے یہاں نفاق والی بیماری مراد ہے، اور وہ منافق جو تھے وہی مسلمانوں کے خلاف اپنے دلوں کے اندر عداوت کو چھپائے ہوئے تھے، ''کیا سمجھ لیا ان لوگوں نے جن کے دلوں کے اندر نفاق کی بیماری

ہے کہ ہرگز نہیں نکالے گا اللہ تعالیٰ اُن کے کینے'' یعنی ان کے کینے ظاہر نہیں کرے گا؟ ظاہر کردے گا، ایسے حالات بھیجے گا جن سے معلوم ہوجائے گا کہ مسلمانوں کے حق میں یہ مخلص نہیں ہیں، وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ: اگر ہم چاہتے تو ہم دکھادیتے آپ کو یہ لوگ، آپ کے سامنے بالکل ہی نمایاں کردیتے، بتادیتے کہ یہ منافق ہے، یہ منافق ہے، یہ منافق ہے، بالتعیین آپ کو دکھادیتے، فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ: اس کا ترجمہ بھی دوطرح سے کیا گیا ہے، حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ نے تو اشارہ اس بات کی طرف کیا ہے، کہ وَلَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ یہاں فقرہ پورا ہوگیا، اگر ہم چاہتے تو ہم بالتعیین وہ لوگ آپ کو دکھادیتے، لیکن ہم نے اگرچہ آپ کو بالتعیین وہ لوگ دکھائے نہیں، لیکن آپ ان کو حلیے سے پہچانتے ہیں، ان کی شکل شباہت سے، چہرے کے آثار سے آپ کچھ تاڑ لیتے ہیں ان کو پہچان لیتے ہیں، تو فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ یہ بات علیحدہ ہوئی، پس البتہ پہچان لیا آپ نے ان کو ان کے سیما کے ساتھ، سیما علامت کو کہتے ہیں سِیْمَاهُمْ فِیْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ یہ اگلی سورت (سورۂ فتح) میں لفظ آئے گا، '' آپ اُن کو پہچانتے ہیں اُن کے نشانات کے ساتھ'' یعنی اگرچہ ہم نے بالتعیین آپ کو دکھائے نہیں لیکن نشانات کے ذریعے سے آپ ان کو پہچانتے ہیں۔ اور یہ بھی ترجمہ کیا گیا ہے کہ فَلَعَرَفْتَهُمْ بِسِیْمٰهُمْ یہ لَوْ نَشَآءُ لَاَرَیْنٰكَهُمْ کے تحت ہی ہے، '' اگر ہم چاہتے تو آپ کو وہ منافق ہم دکھادیتے پھر آپ پہچان لیتے ان کو ان کے نشان کے ساتھ، لیکن احادیث میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ منافقین کو پہچانتے تھے اور ایک خطبے میں آپ ﷺ نے نام بنام بتائے بھی، کہ فلانے شخص! تو اُٹھ کر چلا جا، تو منافق ہے، فلانے! یہاں سے نکل جا، تو منافق ہے،''[1] جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو کچھ نہ کچھ معرفت حاصل تھی، اس لیے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ (الہندؒ) کے ترجمے کو لطیف قرار دیتے ہیں کہ یہ واقعات کے مطابق ہے، ورنہ پھر یہ کہنا پڑے گا کہ جس وقت یہ آیت اُتری تھی اس وقت اگرچہ حضور ﷺ کو ان کی پہچان نہیں تھی، لیکن بعد میں کچھ آثار کے ساتھ رسول اللہ ﷺ پہچان گئے۔ '' اگر ہم چاہتے تو دکھادیتے ہم آپ کو وہ منافقین، پھر البتہ آپ پہچان لیتے اُن کو اُن کے نشان کے ساتھ'' یہ دوسرا ترجمہ ہوجائے گا۔ اور پہلا ترجمہ آپ کے سامنے کیا گیا کہ '' اگر ہم چاہتے تو ہم آپ کو دکھادیتے وہ لوگ'' یعنی بالتعیین، متعین کرکے، علیحدہ علیحدہ بتادیتے دکھادیتے کہ یہ منافق ہے، '' پھر البتہ آپ نے پہچان لیا اُن کو ان کے نشان کے ساتھ'' یعنی اگرچہ ہم نے صراحتاً تعیین ہر کسی کی نہیں کی لیکن نفاق کے اتنے نشانات ان کے اوپر نمایاں ہیں کہ آپ اپنے فہم وبصیرت کے ساتھ ان کو پہچان رہے ہیں۔

منافقین اپنے انداز سے پہچان لیے جائیں گے

وَلَتَعْرِفَنَّهُمْ فِیْ لَحْنِ الْقَوْلِ: اور آئندہ بھی آپ ان کو پہچانتے رہیں گے، پہچان لیں گے ان کے طرزِ گفتگو میں، لحن بولنے کے طریقے کو کہتے ہیں، یہ تو آپ جانتے ہی ہیں کہ زبان سے جو کچھ انسان بولتا ہے اس کے اوپر قلبی احوال بہت اثر انداز ہوتے ہیں، مخلص کے گفتگو کرنے کا طریقہ اور ہوتا ہے، اس کے بولنے میں زور ہوگا صفائی ہوگی، اور جو دِل کے اندر نفاق رکھے ہوئے ہوتا ہے وہ بھی بات اگرچہ بڑی بنانے کی کوشش کرتا ہے لیکن اس کی بات میں وہ زور نہیں ہوتا، کبھی نہ کبھی اس کی زبان سے اس قسم کے

(۱) تفسیر ابن کثیر وروح المعانی، سورۂ توبہ، آیت نمبر ۱۰۱ کے تحت۔ معجم اوسط ۱/۲۴۱، رقم الحدیث: ۷۹۲۔

الفاظ ضرور نکل جاتے ہیں جن سے معلوم ہو جاتا ہے کہ اس کے دل میں جذبہ کیا ہے؟'' البتہ ضرور پہچان لیں گے آپ اُن کو اُن کے طرزِ گفتگو میں'' وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اَعْمَالَكُمْ: اللہ تعالیٰ تم سب کے اعمال کو جانتا ہے۔

اللہ مجاہدین کو غیر مجاہدین سے جُدا کر دے گا

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ حَتّٰى نَعْلَمَ الْمُجٰهِدِيْنَ مِنْكُمْ وَالصّٰبِرِيْنَ: البتہ ضرور آزمائش میں ڈالیں گے ہم تمہیں تاکہ جان لیں ہم مجاہدین کو تم میں سے اور صابرین کو۔ عَلِمَ کا صلہ جس وقت مِن آجائے تو اس میں تمیز والا معنی ہوتا ہے، جس کا مطلب یہ ہو گیا کہ تاکہ ہم مجاہدین کو غیر مجاہدین سے جدا کر کے، صابرین کو اور غیر صابرین کو جدا کر کے معلوم کر لیں، یہ تمیز والا معنی اس میں آجائے گا، ظاہری طور پر ہم ممتاز کر دیں، یہاں علم سے علم ظاہری مراد ہے، ورنہ اللہ تعالیٰ تو جانتا ہے کہ کس کے اندر جہاد کا جذبہ ہے، اور کون جہاد سے بھاگتا ہے، اور کس کے اندر صبر کا خلق پایا جاتا ہے اور کس کے اندر صبر کا خلق نہیں پایا جاتا، لیکن اللہ تعالیٰ ظاہری طور پر ممتاز کر کے ان کو نمایاں کرنا چاہتا ہے، اس لیے تمہیں آزمائش میں ڈالے گا،'' البتہ ضرور آزمائش میں ڈالیں گے ہم تمہیں حتیٰ کہ ممتاز کر دیں ہم مجاہدین کو غیر مجاہدین سے اور صابرین کو غیر صابرین سے'' عَلِمَ کا صلہ مِن آجانے کے بعد یہ معنی پیدا ہو گیا،'' تاکہ ہم مجاہدین کو اور صابرین کو تم میں سے جان لیں'' وَنَبْلُوَا اَخْبَارَكُمْ: اور تمہارے حالات کو خوب اچھی طرح سے آزمالیں۔

اِسلام کی حفاظت کا خدائی وعدہ

اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور انہوں نے اللہ کے راستے سے روکا، وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ: اور رسول کی مخالفت کی، مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى: بعد اس کے کہ ان کے سامنے ہدایت واضح ہو گئی، لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْئًا: یہ لوگ اللہ کو کچھ بھی نقصان نہیں پہنچا سکتے، ہرگز نقصان نہیں پہنچائیں گے اللہ کو کچھ بھی، وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ: عنقریب اللہ تعالیٰ ان کے اعمال حبط کر دے گا ضائع کر دے گا، اِن اعمال سے نیک اعمال بھی مراد ہیں، اور اِن اعمال سے وہ عمل بھی مراد ہیں جو اسلام کو نقصان پہنچانے کے لئے وہ کرتے ہیں کارروائیاں، اللہ تعالیٰ اُن سب کو ضائع کر دے گا، کسی کارروائی سے مسلمانوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔

مؤمنین کو اطاعت کی ترغیب اور اِبطالِ عمل کے تین مفہوم

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ: یہ منافقین کے مقابلے میں مؤمنین کو ترغیب دی جا رہی ہے اطاعت کی، '' اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو'' وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ: اور اپنے عملوں کو باطل نہ کیا کرو، باطل کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ ساری زندگی نیکی کرتے رہے پھر کوئی کُفر کی بات کر لی جائے تو سارے کے سارے اعمال ضائع ہو جاتے ہیں، اللہ کی اطاعت کرو اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور اس کے اوپر جمے رہو، کُفر وغیرہ کر کے اپنے عملوں کو ضائع نہ کرو، یہ معنی بھی اس کا ہو سکتا ہے، اگر یہ صورت پیدا ہو جائے تو یہ متفق علیہ بات ہے کہ انسان کے نیک اعمال سارے کے سارے برباد ہو جاتے

ہیں ...... اور عمل کو باطل کرنے کا ایک یہ مطلب بھی ہوتا ہے کہ جو عمل بھی کرو پھر اس کے حقوق اور آداب کی رعایت رکھو، اور اس کے بعد بھی کوئی ایسا کام نہ کرو جس کے ساتھ پہلے عمل کا ثواب ضائع ہو جائے، کیونکہ بعض اعمال کے صحیح ہونے کے لئے یا بعض اعمال کے صحیح باقی رہنے کے لئے کچھ شرطیں ہوتی ہیں جن کو پورا کرنا ضروری ہے، اگر ان کو پورا نہ کیا جائے تو ایسی صورت میں یا تو عمل سرے سے دُرست ہی نہیں ہوتا یا ہو جانے کے بعد پھر وہ خراب ہو جاتا ہے، قرآنِ کریم میں آپ کے سامنے واضح کیا گیا تھا یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (سورۂ بقرہ: ۲۶۴) اے ایمان والو! اپنے صدقات کو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کر لیا کرو، جس کا مطلب یہ ہوا کہ صدقہ کرتے وقت نیک نیتی کے ساتھ اللہ کے راستے میں صدقہ کیا جائے تو یہ صدقہ صحیح ہو گیا، لیکن اس صدقے کے صحیح رہنے کے لئے ضروری ہے کہ جس کو آپ نے دیا ہے اس پر احسان نہ جتلاؤ اور نہ اسے تکلیف پہنچاؤ، تو یہ شرط ہو گیا اس عمل کے صحیح باقی رہنے کے لئے، اگر صدقہ خیرات کرنے کے بعد کوئی شخص اس پر احسان جتلاتا ہے یا اُسے اسی صدقہ خیرات دینے کے بعد کوئی تکلیف پہنچاتا ہے، ایسی صورت میں وہ دیا ہوا صدقہ باطل ہو جائے گا، تو یہاں یہ مطلب ہوا کہ جو بھی نیکی کا کام کرو تو اس کی صحت کے لئے اور اس کی بقاء کے لئے شریعت نے جو آداب اور شرطیں بتائی ہیں ان کی رعایت رکھو، ایسا نہ کیا کرو کہ پہلے نیکی کر لی اور اس کے بعد کوئی ایسا کام کر لیا جس سے وہ نیکی باطل ہو گئی، یہ مفہوم بھی اپنی جگہ صحیح ہے ...... اور ایک مطلب اس کا یہ بھی ہے کہ نیکی کا کام شروع کرنے کے بعد پھر اس کو درمیان میں چھوڑا نہ کرو، جس سے اَحناف نے استدلال کیا ہے کہ نفل عبادت شروع کرنے کے بعد واجب ہو جاتی ہے، کیونکہ جتنا حصہ آپ کر چکے ہیں اس کے باقی رہنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ، اگر پایۂ تکمیل تک آپ نہیں پہنچائیں گے تو جتنا کام کر چکے ہیں وہ بھی باطل ہو جائے گا، مثلاً آپ نے دو نفل کی نیت باندھ لی، اور ایک رکعت آپ نے پڑھی، یہ آپ کا ایک نیکی کا کام ہے، اب اس ایک رکعت کے باقی رکھنے کے لئے ضروری ہے کہ دوسری رکعت بھی ساتھ پڑھو، اور اگر آپ دوسری رکعت ساتھ نہیں ملاتے تو جو پہلی ایک رکعت پڑھی ہوئی ہے وہ بھی باطل ہو گئی، تو اس کے اوپر بھی ابطالِ عمل صادق آتا ہے، نفلی روزہ آپ نے رکھا، چار گھنٹے دِن کے گزرے تھے، اب یہ جتنا آپ نے روزہ رکھا ہے اس کے باقی اور صحیح رہنے کے لئے ضروری ہے کہ غروبِ شمس تک آپ اس کو پورا کریں، اگر آپ اس کو پورا نہیں کرتے تو جتنا وقت آپ روزے میں گزار چکے ہیں وہ نیکی بھی باطل ہو جائے گی، اس لیے نفل شروع نہ کرو تو تمہاری مرضی، لیکن شروع کر لینے کے بعد پھر اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچانا ضروری ہے، ورنہ کیا ہوا کام بھی باطل ہو جائے گا، اور قرآنِ کریم کہتا ہے لَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ: اپنے عملوں کو باطل نہ کیا کرو۔ تو یہ ساری صورتیں اس میں شامل ہیں، کُفر نہ کرو، کہ اِس سے بھی نیکی برباد ہو جاتی ہے، اور نیکی کے کام کرنے کے بعد اُن کو باقی رکھنے کے لئے جس قسم کے آداب اور شرائط ضروری ہیں ان کی پابندی رکھو، جیسا کہ صدقہ وغیرہ کو صحیح باقی رکھنے کے لئے مَنّ و اَذیٰ سے بچنا ضروری ہے، اور اسی طرح سے ریا اور سُمعہ سے بچنا ضروری ہے اپنے نیک عمل کو باقی رکھنے کے لئے، اگر انسان اس میں دکھاوا یا شہرت پیدا کرنی شروع کر دیتا ہے تو بھی نیکی برباد ہو جاتی ہے، اسی طرح سے اس میں یہ بھی شامل ہے کہ کسی نیک کام کو کرنے کے بعد ادھورا نہ چھوڑو، کیونکہ اگر ادھورا کرو گے تو جتنا کیا ہے وہ بھی برباد ہے اور یہ

مناسب صورت نہیں، شروع نہ کرو تو ایک علیحدہ بات ہے لیکن شروع کرنے کے بعد پھر اس کو پایۂ تکمیل تک پہنچاؤ، درمیان میں چھوڑ کے اس کو خراب نہ کرلیا کرو۔

خاتمہ کُفر پر ہوا تو بخشش نہیں ہوگی

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِیْلِ اللّٰهِ: بے شک وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا اور اللہ کے راستے سے روکا، ثُمَّ مَاتُوْا: پھر وہ مر گئے، اس حال میں کہ کافر ہیں، فَلَنْ یَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ: ہرگز نہیں بخشے گا اللہ تعالیٰ انہیں، یہ متفق علیہ مسئلہ ہے کہ کُفر پر خاتمہ ہوجانے کے بعد پھر اس کی بخشش کی کوئی توقع نہیں، اللہ تعالیٰ نے صاف جواب دے دیا ہے۔

کُفّار کے ساتھ صلح کی صورتیں اور ان کا حکم

فَلَا تَهِنُوْا وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ: تَهِنُوْا یہ لفظ وَہن سے لیا گیا ہے، سورۂ آلِ عمران کے اندر بھی یہ لفظ آیا تھا وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ (آیت:۱۳۹)، وَہن کہتے ہیں کمزوری کو، جس طرح سے لکڑی کو گھن لگ جایا کرتا ہے، تو یہ وَہن ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ فرمایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تم لوگوں کے سامنے تر نوالہ بن جاؤ گے، جس طرح سے لوگ ایک دوسرے کو دعوت دیا کرتے ہیں کہ آؤ تم بھی کھالو، تم بھی کھالو، اسی طرح سے اُمتیں ایک دوسرے کو تمہیں کھانے کی طرف بلائیں گی، تمہیں ہڑپ کرنے کے لئے، تم ایسے ہوجاؤ گے جس طرح سے کوئی کھانے کی چیز ہوتی ہے، تر نوالہ، اور لوگ ایک دوسرے کو دعوت دیں گے کہ آؤ آپ بھی حصہ لے جائیں اور آپ بھی حصہ لے جائیں، صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! کیا اس وقت ہماری تعداد کم ہوجائے گی؟ جو لوگ اس طرح سے ہم پر غالب آجائیں گے اور مختلف اُمتیں اور جماعتیں ہمیں ہڑپ کرنے کے لئے ایک دوسرے کو بلائیں گی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں، تمہاری تعداد تو اس وقت بہت زیادہ ہوگی، لیکن تمہارے اندر وَہن آجائے گا (وہاں اُس روایت میں بھی وَہن کا لفظ آیا ہوا ہے) اور تمہاری حیثیت وہ ہوجائے گی جو سیلاب کے سامنے کوڑا کرکٹ کی ہوتی ہے، کہ سیلاب آتا ہے اور تنکوں کو اور کوڑا کرکٹ کو بہا کر لے جاتا ہے، تمہاری حیثیت بھی غُثَاءٌ كَغُثَاءِ السَّيْلِ ہوجائے گی، ایسا کوڑا کرکٹ جو سیلاب کے سامنے ہوتا ہے، سیلاب آتا ہے سب کو بہا کر لے جاتا ہے، تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وَہن کیا چیز ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ”حُبُّ الدُّنْيَا وَكَرَاهِيَةُ الْمَوْتِ“[1] دُنیا کی محبت میں مبتلا ہوجاؤ گے اور موت سے نفرت کرنے لگ جاؤ گے، یہی ایک چیز ہے جو انسان میں گھن کی طرح لگ جاتی ہے، پھر مقابلے کی قوت نہیں ہوتی، جو موت سے ڈرنے لگ گیا، دُنیا سے محبت کرنے لگ گیا، پھر اس کے اندر جہاد کی قوت نہیں رہا کرتی، اور تم بھی اسی بیماری میں مبتلا ہوجاؤ گے، دُنیا سے محبت کرو گے اور موت سے ڈرو گے، اس وقت تمہارے اندر کمزوری آجائے گی، پھر کُفر کے مقابلے کی طاقت نہیں ہوگی، اور پھر لوگ تمہیں ہڑپ کرجائیں گے۔ تو یہاں لَا تَهِنُوْا کا یہ معنی ہے ”کمزور نہ ہوؤ، ہمت نہ چھوڑو“، حضرت شیخ (الہندؒ) ترجمہ کرتے ہیں ”سو تم بودے نہ ہوئے جاؤ“ بودا ہونے کا مطلب بھی یہی ہے کہ قوت اور طاقت نہ رہے، ”نہ کمزور ہوؤ تم“ وَتَدْعُوْا اِلَى السَّلْمِ: اور نہ بلاؤ تم صلح کی طرف، یعنی

(۱) ابوداؤد ۲/ ۲۳۲، کتاب الملاحم باب فی تداعی الامم علی الاسلام/ مشکوۃ ۲/ ۴۵۹ باب تغیر الناس، فصل ثانی۔

بے ہمت ہوجانے کے بعد کافروں کو خود صلح کی دعوت دو کہ آؤ ہمارے ساتھ صلح کرلو، ایسے نہ کیا کرو، کافروں کے ساتھ صلح کرنا امام کے لئے جائز ہے اِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا (سورۂ انفال:۶۱) اُس آیت کے اندر یہی مسئلہ ظاہر کیا گیا ہے کہ اگر وہ لوگ صلح کی طرف مائل ہوں تو تو بھی صلح کی طرف مائل ہوجایا کر، کافر صلح کی دعوت دیں، امام مصلحت سمجھے تو صلح کرسکتا ہے، مصلحت نہیں سمجھتا تو نہ کرے، اوراسی طرح سے پیشگی طور پر بھی صلح پیش کی جاسکتی ہے کہ ہم کافروں سے کہیں کہ آؤ ہمارے ساتھ معاہدہ کرلو اور مصالحت کرلو، یہ صورت بھی درست ہے، لیکن اس میں مسلمانوں کی مصلحت ہونی چاہیے، اپنی بزدلی اور بے ہمتی اس کی وجہ نہیں ہونی چاہیے، بے ہمتی اور بزدلی کی بنا پر دوسرے کے سامنے صلح کی پیشکش کرنا اس کی ممانعت ہے، باقی! اگر اور مصالح اس میں ہیں تو امام پیشگی طور پر بھی کافروں سے کہہ سکتا ہے کہ آؤ ہمارے ساتھ صلح کرلو، یہاں وَہن کے نتیجے میں جو دعوت الی السلم ہے اس کی ممانعت ہے، کہ خود ہمت نہیں کرتے، حوصلہ نہیں کرتے، کمزور بنے بیٹھے ہو، ایسی صورت میں اگر کافروں کو صلح کی دعوت دو گے تو تم مغلوب سمجھے جاؤ گے، کافر غالب سمجھے جائیں گے، اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکلے گا، ''کمزور نہ ہوؤ، ہمت نہ چھوڑو، اور صلح کی طرف نہ بلاؤ'' وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ: اور تم ہی غالب آؤ گے، جس طرح قرآنِ کریم میں دوسری جگہ آگے یہ آیا ہوا ہے اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ (آل عمران:۱۳۹) غلبہ آخر تمہیں ہی ہوگا اگر تم مؤمن ہوئے، کامل الایمان ہونے کی صورت میں آخر غلبہ تمہیں ہی ہوگا، اس لیے ہمت چھوڑنے کی ضرورت نہیں، وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ: تم ہی غالب آنے والے ہو، تم ہی اعلیٰ رہو گے، وَاللّٰهُ مَعَكُمْ: اللہ تمہارے ساتھ ہے، وَلَنْ يَّتِرَكُمْ اَعْمَالَكُمْ: يَتِرَ یہ وَتَرَ سے لیا گیا ہے، وَتَرَ: کم کرنا، يَتِرَ يَعِدُ کی طرح، وَعَدَ يَعِدُ، وَتَرَ يَتِرُ، ''ہرگز نہیں گھٹائے گا تمہیں تمہارے اعمال'' کم کر کے نہیں دے گا تمہیں تمہارے اعمال، بلکہ جو کچھ بھی کرو گے اللہ تعالیٰ اس کو پورا پورا تمہاری طرف ادا کرے گا، ''نہیں گھٹائے گا اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اعمال۔''

''دُنیا'' کی مذمّت

اِنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ: جہاد سے مانع دنیا کی محبت ہے، اس لیے آگے اس کی مذمت کی جارہی ہے، ''سوائے اس کے نہیں کہ دُنیوی زندگی یہ تو کھیل تماشا ہے، لعب اور لہو یہ دونوں لفظ قریب قریب ہی ہیں، لہو کا معنی ہوتا ہے ایسی چیز کی طرف مشغول ہوجانا جس میں کوئی فائدہ نہیں، اور لعب بھی کھیل کو ہی کہتے ہیں، فرق کرنے کے لئے یوں کہہ دیا جاتا ہے کہ غیر ضروری کام میں مشغول ہونا لعب، اور ضروری کام سے غافل ہوجانا لہو، ایک لفظ آجائے تو دونوں کے مفہوم کو ہی ادا کردیتا ہے، کھیل کود، کھیل تماشا، ہمارے ہاں جس طرح سے یہ دو لفظ بولے جاتے ہیں، تو ''لعب ولہو'' یہ عربی میں بھی اسی طرح سے یہ دو لفظ بولے جاتے ہیں، غیر ضروری چیزوں میں مشغول ہوجانا اور ضروری چیزوں سے غافل ہوجانا، ''دنیوی زندگی تو ایک کھیل تماشا ہے۔''

''بُخل'' کی مذمّت

وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا: اگر تم ایمان لاؤ، اور تم تقویٰ اختیار کرو، يُؤْتِكُمْ اُجُوْرَكُمْ: تو اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اجر دے گا،

وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ: اورتم سے تمہارے اموال اپنے کام کے لئے اپنے نفع کے لئے نہیں مانگے گا، اللہ تعالیٰ تم سے مالوں کا مطالبہ نہیں کرتا، یعنی اپنے نفع کے لئے، اور اگر مطالبہ کرے اللہ تعالیٰ، اور تمہارے نفع کے لئے کرے، اور سارا ہی مال خرچ کرنے کے لئے کہہ دے تم پھر بھی بخل کرو گے، یہ بھی اللہ کا کرم ہے کہ اگر خرچ کرنے کے لئے کہتا ہے، اور وہ خرچ کرنا بھی تمہارے نفع کے لئے تو بھی سارا خرچ کرنے کے لئے نہیں کہتا، ایسے موقع پر بھی جو لوگ بخل کرتے ہیں اور کچھ بھی مال اللہ کے راستے میں خیرات نہیں کرتے، اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے، جس کا نفع انہی کی طرف ہی لوٹ کے آنے والا ہے، وہ بہر صورت خسارے میں ہیں، جن کے لئے آگے دھمکی دی جارہی ہے۔ یہاں اللہ تعالیٰ متوجہ یوں کررہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ تمہیں تمہارے اُجور دے گا، اور تم سے اللہ تعالیٰ کی ذات کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا، وَلَا يَسْـَٔلْكُمْ اَمْوَالَكُمْ: اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے مال نہیں مانگے گا، یعنی اپنے نفع کے لئے، اِنْ يَّسْـَٔلْكُمُوْهَا: اگر اللہ تعالیٰ تم سے اُن مالوں کا مطالبہ کرے تمہارے نفع کے لئے ہی، فَيُحْفِكُمْ: پھر مبالغہ کرے اِس سوال کرنے میں، اَحْفٰی کا معنی ہوتا ہے کسی چیز کو اِنتہا تک پہنچا دینا، یعنی سارا ہی مال خرچ کرنے کا مطالبہ کرلے، تَبْخَلُوْا: تو تم بخیل ہو جاؤ گے، تم بخل کرو گے، وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ: اور اللہ تعالیٰ تمہاری ناگواریوں کو ظاہر کردے گا، دل میں ناگواری ہے اور جب خرچ کرنے کے لئے کہا جائے اور یہ کہہ دیا جائے کہ سارا ہی اللہ کے راستے میں خرچ کرو، تو ناگواری نمایاں ہو جاتی ہے، اگر اللہ ایسا کرے تو تمہاری ناگواریاں ظاہر ہو جائیں گی، لیکن اللہ تعالیٰ تم سے خرچ کرنے کے لئے کہتا ہے، تمہارے نفع کے لئے کہتا ہے، پھر سارا مال خرچ کرنے کے لئے نہیں کہتا، تھوڑا مال خرچ کرنے کے لئے کہتا ہے، تو اگر ایسے وقت بھی تم ناگواری محسوس کرو اور اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرو، تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں مٹا دے گا، مٹانے کے بعد کوئی اور قوم لے آئے گا، جو اللہ کے راستے میں جان بھی قربان کرے گی اور مال بھی قربان کرے گی، یہ ایک قسم کی دھمکی ہے کہ اگر جہاد سے جان چراؤ گے، اور اللہ کے راستے میں مال اور جان خرچ کرنے سے تم بچو گے تو اللہ تعالیٰ تمہیں برباد کردے گا، تمہاری جگہ اور لوگ لے آئے گا، ''اگر سوال کرے اُن مالوں کا اللہ تعالیٰ، پھر مبالغے کے ساتھ سوال کرے'' کہ سارا ہی اللہ کے راستے میں خرچ کردو، اَحْفٰی يُحْفِيْ اِحفاء: سرے تک کسی چیز کو پہنچا دینا، تَبْخَلُوْا: تو تم بخل کرو گے، وَيُخْرِجْ اَضْغَانَكُمْ: اور اللہ تمہاری ناگواریاں ظاہر کردے گا، هٰۤاَنْتُمْ هٰۤؤُلَآءِ تُدْعَوْنَ لِتُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: هٰۤاَنْتُمْ یہ تنبیہ کے لئے ہے، خبردار! تم ہی یہ لوگ ہو جو بلائے جاتے ہو تا کہ خرچ کرو تم اللہ کے راستے میں، فَمِنْكُمْ مَّنْ يَّبْخَلُ: تم میں سے بعض وہ ہے جو بخل کرتا ہے، وَمَنْ يَّبْخَلْ: اور جو کوئی بخل کرتا ہے، فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ: سوائے اس کے نہیں کہ وہ بخل کرتا ہے اپنے آپ سے ہی، اپنا نقصان کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کا کوئی نقصان نہیں، اِس بخل کا نقصان تمہیں ہی پہنچنے والا ہے ''جو بخل کرتا ہے سوائے اس کے نہیں کہ بخل کرتا ہے اپنے آپ سے ہی'' وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ: اللہ تو بے نیاز ہے، محتاج تم ہی ہو، اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے بارے میں بھی تم ہی محتاج ہو فائدہ اٹھانے کے لئے، اللہ تعالیٰ کو تمہارے مالوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے، وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ: اللہ بے نیاز ہے، اُسے کوئی ضرورت نہیں، وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ: تم ہی محتاج ہو، وَاِنْ تَتَوَلَّوْا: اور اگر تم نے پیٹھ پھیری، یعنی اللہ

کے راستے میں جان اور مال کو خرچ نہ کیا، اللہ کے احکام کی اتباع نہ کی، یَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَیْرَکُمْ: تو بدل لائے گا اللہ تعالیٰ اور لوگوں کو، بدل کے لے آئے گا اللہ تعالیٰ اور لوگوں کو، ثُمَّ لَا یَکُوْنُوْٓا اَمْثَالَکُمْ: پھر وہ تم جیسے نہیں ہوں گے، بلکہ وہ اللہ کے راستے کے اندر جان اور مال کو خیرات کرنے والے ہوں گے۔

علمائے فارس کے متعلق حدیث میں پیش گوئی

جس وقت یہ آیت اُتری ہے حدیث شریف میں آتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کون لوگ ہوں گے جن کے بارے میں یہاں کہا گیا ہے کہ ہمارے بدلے میں اللہ تعالیٰ ان کو لے آئے گا؟ اُس وقت مجلس میں بیٹھے تھے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ، فارسی اُن کو اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ فارس کے رہنے والے ہیں، یہ ایران کا علاقہ، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کی ران کے اوپر ہاتھ مارا اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اور اس کی قوم،(۱) گویا کہ اہلِ فارس کی طرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ کیا کہ اہلِ فارس میں سے کچھ لوگ ایسے ہوں گے۔ فرمایا کہ اگر ایمان ثریا پر بھی پہنچ گیا، یعنی دنیا سے ناپید ہوگیا، آسمان تک پہنچ گیا، تو اس کی قوم میں سے کچھ لوگ ایسے آئیں گے جو کہ وہاں سے بھی اس ایمان کو حاصل کرلیں گے،(۲) تو اہلِ فارس کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تعریف فرمائی، کہ سلمان کی قوم میں سے ایسے ایسے کامل الایمان لوگ آئیں گے، کہ اگر ایمان دنیا سے ثریا پر بھی چلا جائے تو وہاں سے بھی اُس کو حاصل کرلیں گے، اب ایسا واقعہ تو نہ ہوا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے تولّی کی ہو، اِس (آیت) میں تو یہ ہے کہ تولّی کرنے کی صورت میں اللہ تعالیٰ تمہارے بدلے میں ایسے لوگ لے آئے گا، لیکن اس میں اس بات کی نفی نہیں ہے کہ اگر تم متبع رہے تو اللہ تعالیٰ اہلِ فارس کو ایمان کی توفیق نہیں دے گا یا دوسرے لوگ ایمان میں داخل نہیں ہوں گے، اس کی نفی کرنی مقصود نہیں ہے، اہلِ فارس مسلمان ہوئے، ایمان لائے، اگرچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بدل کے طور پر نہیں، کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اَحکام کی پابندی کی، تو ان کے بدلے میں دوسرے لوگوں کو نہیں لایا گیا، البتہ دوسرے لوگ بغیر بدل بننے کے ایمان لائے، اور پھر اہلِ فارس میں سے اتنے کامل الایمان لوگ ہوئے، آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اکثر و بیشتر محدثین اور فقہاء وہی ہیں جو کہ اہلِ فارس سے تعلق رکھنے والے ہیں۔

"اِمام ابوحنیفہؒ" پیش گوئی کا اوّلین مصداق

خصوصیت کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ یہ بھی فارسی ہیں۔ تو یہاں مفسرین نے عام طور پر اشارہ کیا ہے کہ یہ پیش گوئی جس طرح سے دوسرے اہلِ فارس پہ صادق آتی ہے تو نہایت کامل طریقے کے ساتھ حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ پہ صادق آتی ہے۔ ابوحنیفہ

---

(۱) ترمذی ۱۶۲/۲، ابواب تفسیر سورۃ محمد۔ مشکوٰۃ ۵۸۰/۲، باب جامع المناقب، فصل ثانی کا آخر۔ نوٹ: مشکوٰۃ میں فخذ کا لفظ ہے، لیکن ترمذی میں منکب ہے۔

(۲) بخاری ۷۲۷/۲، کتاب التفسیر۔ سورۃ الجمعۃ۔ مشکوٰۃ ۵۷۶/۲، باب جامع المناقب، فصل اوّل۔ لَوْ کَانَ الْاِیْمَانُ عِنْدَ الثُّرَیَّا لَنَالَہٗ رِجَالٌ اَوْ رَجُلٌ مِنْ ھٰؤُلَاءِ۔

سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کی قوم میں سے تھے اور انہوں نے دین کو اتنا نمایاں کیا اور دین کی خدمت کی، کہ واقعی اُن کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایمان چھپا چھپایا بھی ہوتا تو وہ ضرور اُس کو نکال لاتے، تو اہلِ فارس کی منقبت کے ساتھ ساتھ ضمن میں خصوصیت کے ساتھ ابو حنیفہ رضی اللہ عنہ کی فضیلت اِس میں نمایاں ہے۔ اور حضرت شیخ الاسلامؒ نے بھی اس بارے کچھ یہاں ذکر کیا ہے، کہتے ہیں ''حدیث میں ہے صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یا رسول اللہ! وہ دوسری قوم کون ہے جس کی طرف اشارہ ہوا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ پر ہاتھ رکھ کر فرمایا ''اس کی قوم'' اور فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر ایمان ثریا پر جا پہنچے تو فارس کے لوگ وہاں سے بھی اس کو اُتار لائیں گے۔'' الحمدللہ! صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس بے نظیر ایثار اور جوشِ ایمانی کا ثبوت دیا کہ ان کی جگہ دوسری قوم کو لانے کی نوبت نہ آئی، تاہم فارس والوں نے اسلام میں داخل ہو کر علم اور ایمان کا وہ شاندار مظاہرہ کیا اور ایسی زبردست دینی خدمات انجام دیں جنہیں دیکھ کر ہر شخص کو ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ بے شک حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے موافق یہ ہی قوم تھی جو بوقتِ ضرورت عرب کی جگہ پُر کر سکتی تھی۔ ہزارہا علماء و ائمہ سے قطع نظر کر کے تنہا امامِ اعظم ابو حنیفہ رحمہ اللہ کا وجود ہی اس پیشین گوئی کے صدق پر کافی شہادت ہے، بلکہ اس بشارتِ عظمیٰ کا کامل اور اوّلین مصداق امام صاحب ہی ہیں۔ رضی اللہ عنہ وارضاھم۔'' (تفسیر عثمانی)

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

***

سُورَةُ الفَتْح

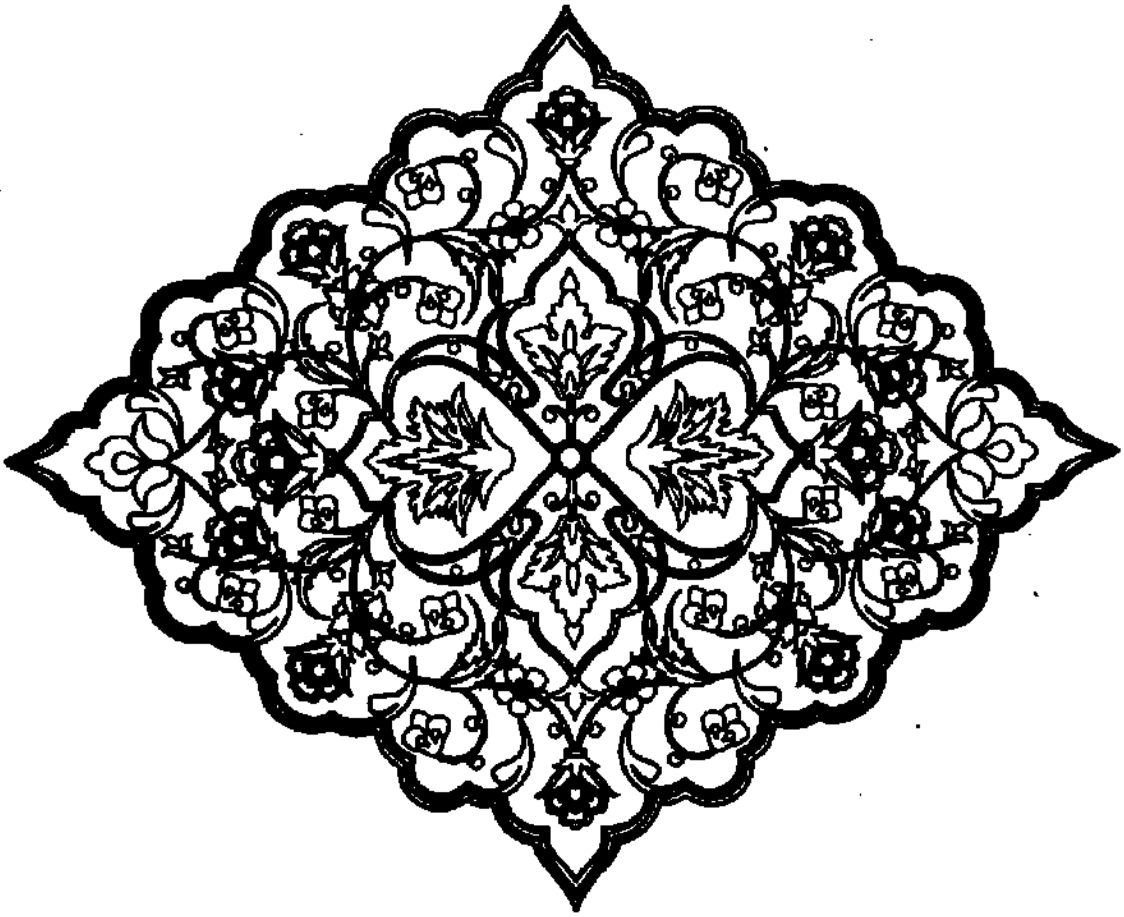

آیاتہا ۲۹ ۴۸ سُوْرَةُ الْفَتْحِ مَدَنِيَّةٌ ۱۱۱ رکوعاتہا ۴

سورۂ فتح مدینہ میں نازل ہوئی، اوراس کی انتیس آیتیں ہیں اور چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا ۝١ لِّيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ

بے شک ہم نے آپ کو نمایاں فتح دے دی① تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کردے،

وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝٢ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا ۝٣

اور تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمت کو آپ پر پوری کردے، اور تاکہ آپ کو صراط مستقیم پر چلائے② اور تاکہ آپ کو زبردست مدد دے③

هُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ فِيْ قُلُوْبِ الْمُؤْمِنِيْنَ لِيَزْدَادُوْٓا اِيْمَانًا

اللہ وہ ہے جس نے سکون اور اطمینان اُتارا مؤمنین کے قلوب میں تاکہ زیادہ ہو جائیں وہ از روئے ایمان کے

مَّعَ اِيْمَانِهِمْ ۭ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ۝٤

اپنے ایمان کے ساتھ، اللہ ہی کے لئے لشکر ہیں آسمانوں کے اور زمین کے، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے④

لِّيُدْخِلَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ

تاکہ داخل کرے اللہ تعالیٰ مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کو ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے یہ

فِيْهَا وَيُكَفِّرَ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ ۭ وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِيْمًا ۝٥ وَّيُعَذِّبَ

اس میں، اور دُور ہٹائے اللہ تعالیٰ ان سے ان کے گناہ، اور اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی ہے⑤ اور تاکہ اللہ تعالیٰ عذاب دے

الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْمُشْرِكِيْنَ وَالْمُشْرِكٰتِ الظَّاۗنِّيْنَ بِاللّٰهِ ظَنَّ السَّوْءِ ۭ

منافق مردوں کو اور منافق عورتوں کو اور مشرک مردوں کو اور عورتوں کو جو کہ اللہ کے متعلق بُرے بُرے گمان رکھنے والے ہیں،

عَلَيْهِمْ دَاۗىِٕرَةُ السَّوْءِ ۚ وَغَضِبَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَلَعَنَهُمْ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ

ان کے اُوپر بری گردش واقع ہونے والی ہے، اللہ ان کے اُوپر ناراض ہو گیا، اللہ نے ان پہ لعنت کی اور ان کے لئے جہنم تیار کی، اور وہ بہت بُرا

مَصِيْرًا ۝ وَلِلّٰهِ جُنُوْدُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝
ٹھکانا ہے⑥ اور اللہ ہی کے لئے لشکر ہیں آسمانوں کے اور زمین کے، اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے⑦
اِنَّآ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ لِّتُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَتُعَزِّرُوْهُ
بے شک ہم نے آپ کو بھیجا شاہد بنا کر، مبشر بنا کر، نذیر بنا کر⑧ تا کہ تم لوگ اللہ پہ اور اس کے رسول پہ ایمان لاؤ اور تا کہ تم اس کی مدد کرو
وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ
اور تا کہ اس کی تعظیم کرو اور تا کہ اُس کی صبح شام تسبیح بیان کرو⑨ اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت
اللّٰهَ ؕ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ فَمَنْ نَّكَثَ فَاِنَّمَا يَنْكُثُ عَلٰى نَفْسِهٖ ۚ
کرتے ہیں، اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، جو اس معاہدے کو توڑ دے گا سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ توڑے گا اپنے ہی نفس کے خلاف
وَمَنْ اَوْفٰى بِمَا عٰهَدَ عَلَيْهُ اللّٰهَ فَسَيُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝
اور جو پورا کرے گا اس چیز کو جس کے اُوپر اس نے اللہ سے معاہدہ کیا ہے تو عنقریب اللہ تعالیٰ اس کو اَجرِ عظیم دیں گے⑩

تفسیر

سورۂ فتح کا پس منظر، واقعۂ حدیبیہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ فتح مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۲۹ آیتیں ہیں، ۴ رُکوع ہیں۔ اس سورت میں کچھ واقعات بیان کیے گئے ہیں جن کا پہلے ذکر کردینا ترجمہ سمجھنے کے لئے مفید ہوگا۔ چھ ہجری میں سرورِ کائنات ﷺ نے خواب دیکھا کہ آپ مکہ معظمہ تشریف لے گئے ہیں صحابہ ﷡ کی جماعت کے ساتھ، اور بیت اللہ کا طواف کیا ہے، طواف سے فارغ ہو کر سر منڈوایا ہے، بعض نے بال کٹوائے ہیں، اس طرح سے آپ ﷺ نے عمرہ ادا کیا۔ خواب حضور ﷺ نے صحابہ کرام ﷡ کے سامنے ذکر فرمادیا، تو صحابہ کرام ﷡ کو مکہ معظمہ سے آئے ہوئے تقریباً چھ سال ہوگئے تھے، بیت اللہ کو دیکھنے کے لئے ترسے ہوئے تھے، اس خواب کے ساتھ فوراً ذہن اِدھر گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اشارہ ہوگیا ہے، ہم کامیابی کے ساتھ بیت اللہ جائیں گے اور اسی طرح سے طواف کر کے یہ مناسک ادا کریں گے، اسی شوق میں تیاری شروع کردی۔ سرورِ کائنات ﷺ نے بھی ارادہ فرمالیا، چونکہ خواب کے اندر کوئی سن یا سال تو متعین نہیں کیا گیا تھا کہ یہ واقعہ کب پیش آئے گا؟ بہر حال خیال یہی گزرا کہ عمرہ کرنے کے لئے جاتے ہیں، اور چونکہ مشرکینِ مکہ کا دستور پرانے زمانے سے یہی چلا آرہا تھا کہ عمرہ کرنے سے اور حرم میں آنے سے کسی کو وہ روکتے نہیں تھے، اس لیے آپ ﷺ نے اپنی جماعت کے ساتھ یہ ارادہ فرمالیا، یہ اندیشہ بھی تھا کہ شاید مشرکین کے ساتھ مقابلہ ہوجائے

اور وہ مزاحمت کریں، اس لیے مصلحت اسی میں سمجھی گئی کہ جماعت کثیرہ ساتھ ہو، مدینہ منورہ شہر میں بھی یہ اعلان ہوگیا اور اردگرد جو اُعراب تھے ان کو بھی اطلاع کردی گئی کہ مکہ معظمہ عمرہ ادا کرنے کے لئے جانا ہے، آپ لوگ بھی شامل ہوجاؤ، تو جن لوگوں کے دلوں میں ایمان پختہ نہیں تھا، یا اُعراب بدوی جو پوری طرح سے مہذب نہیں ہوئے تھے، انہوں نے یہ خیال کیا کہ مکہ والے بھلا کہاں اجازت دیں گے اِن کو آنے کی، اپنے شہر سے اتنی دُور جا کر اُن کے علاقے میں مقابلہ ہوگا، اور اِس مقابلے میں یہ جانے والے بچ کر نہیں آئیں گے، جس کی بنا پر انہوں نے مختلف قسم کے حیلے اور بہانے کر کے ساتھ جانے سے عذر کردیا۔

خواب کا تذکرہ تو چوتھے رُکوع کی اِبتدا میں ہے لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ، اور اُعراب کے جذبات کا ذکر دُوسرے رُکوع میں ہے، یہ دونوں واقعے اِس طرح سے اِن آیات میں ذکر کیے گئے ہیں۔

مکہ کی طرف روانگی

بہرحال تقریباً چودہ سو کا لشکر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ تیار ہوگیا مکہ معظمہ جانے کے لئے، یہ واقعہ ہے ذی قعدہ سن چھ ہجری کا، آپ مدینہ منورہ سے چلے، ذوالحلیفہ جو اُس وقت مدینہ منورہ سے تقریباً چھ میل کے فاصلے پر تھا، اب تو مدینہ منورہ کی آبادی بڑھتی ہوئی تقریباً وہاں تک پہنچ گئی، کچھ کچھ فاصلے کے ساتھ، وہاں جا کر آپ ﷺ نے اِحرام باندھا، اپنی ہدی کو قلادہ ڈالا، اِشعار کیا، اور عمرے کی نیت کر کے چل پڑے، مکہ معظمہ بھی اطلاع ہوگئی کہ اس طرح سے مسلمانوں کا لشکر آرہا ہے، انہوں نے ارادہ کرلیا کہ کسی صورت میں بھی ان کو حرم میں نہ آنے دیا جائے، مزاحمت کے لئے وہ تیار ہوگئے، اور اپنے معاونوں کو اور اپنے حلیفوں کو بھی اردگرد سے مکہ معظمہ میں جمع کرلیا۔

اُونٹنی بیٹھ گئی

سرورِ کائنات ﷺ جب چلے آرہے تھے تو ایک مقام پر آ کر آپ کی اُونٹنی بیٹھ گئی، قَصواء اُونٹنی جس کے اُوپر آپ سوار تھے وہ بیٹھ گئی، بہت اُٹھانے کی کوشش کی گئی لیکن وہ نہ اُٹھی، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کہنے لگے کہ یہ اَڑی کرنے لگ گئی، یہ ضد میں آگئی، بگڑ گئی، آپ ﷺ نے فرمایا کہ اِس نے اَڑی نہیں کی، اور نہ اَڑی کرنا اس کی عادت ہے، ''حَبَسَهَا حَابِسُ الْفِيْلِ'' اِس اُونٹنی کو اُسی نے روک لیا جس نے ہاتھیوں کو روکا تھا، اللہ تعالیٰ کی طرف سے رُکاوٹ پڑ گئی، اس لیے آپ ﷺ نے وہاں اللہ تعالیٰ کے سامنے ایک عہد کیا کہ یا اللہ! میں یہ عہد کرتا ہوں کہ مکہ والے مجھ سے جس بات کا مطالبہ کریں گے جس میں شعائر اللہ کی تعظیم ہو، میں وہ بات مان لوں گا، جب یہ عہد کیا تو اس کے بعد آواز دی گئی اُٹھانے کے لئے، تو وہ جلدی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''حدیبیہ'' میں قیام اور معجزات کا ظہور

مکہ معظمہ کو جاتے ہوئے آپ ﷺ نے معروف راستہ چھوڑ دیا، بلکہ اُس راستے سے ہٹ کر ایک میدان جس کو اُس وقت تو ''حدیبیہ'' کہتے تھے، اور اِس وقت وہ میدان ''شمیسیہ'' یا ''شُمیسیہ'' کے نام کے ساتھ مشہور ہے، جدہ سے مکہ معظمہ کو جو سڑک جاتی

ہے تو جہاں سے حرم کی حدود شروع ہوتی ہیں سڑک پر، اس حد سے ورے متصل ہی ایک بہت بڑی وسیع وادی ہے، اور آج کل وہاں مسجد بنی ہوئی ہے، اڈا ہے، جس وقت لوگ جاتے ہیں تو وہاں ٹھہرتے ہیں، مسجد میں نماز پڑھتے ہیں، اُس میدان کے مکہ معظمہ کی طرف والے کنارے سے حرم شروع ہو جاتا ہے، حرم کی اِبتدا کی برجیاں وہاں بنی ہوئی ہیں، تو اس وادی میں جا کے آپ ﷺ ٹھہر گئے، کھلی وادی ہے، میدان ہے، پانی کی وہاں قلت تھی، ایک ہی کنواں تھا جس میں پانی نہیں تھا، تو اس قسم کے معجزات سرورِ کائنات ﷺ سے وہاں ظاہر ہوئے، تھوڑا پانی بہت ہوا، اور آپ ﷺ نے اس کنویں کے اندر اپنا مستعمل پانی ڈالا، ترکش میں سے ایک تیر نکال کر دیا کہ اس میں گاڑ دیا جائے، تو وہ کنواں جو تھا چھوٹا سا، اس میں اتنا پانی آیا کہ سب کی ضرورتوں کے لئے کافی ہو گیا، اور حضور ﷺ کا تقریباً قیام اس میدان کے اندر بیس دِن ہوا، اُس وقت تک اس پانی میں کمی نہ آئی، لوگ فائدہ اُٹھاتے رہے، تو پانی کے بڑھنے کے اور پانی کے حاصل ہونے کے معجزات بھی اس میدان کے اندر حضور ﷺ سے ظاہر ہوئے ہیں۔

عثمانِ غنی پیغامبر بنے

آپ ﷺ یہاں آ کر ٹھہر گئے، ٹھہرنے کے بعد آپ نے اہلِ مکہ کو پیغام بھیجا، اور یہ پیغام لے کر گئے تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ، جس میں یہ اطلاع کرنا مقصود تھی کہ ہم کوئی لڑنے کی نیت سے نہیں آئے، بلکہ بیت اللہ کا طواف کرنے کے لئے آئے ہیں، عمرہ کرنے کے لئے آئے ہیں، عمرہ کریں گے، کر کے چلے جائیں گے، اس لیے ہمارے سامنے مزاحمت نہ کی جائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ حضور ﷺ کا یہ پیغام لے کر مکہ معظمہ گئے، جس وقت یہ مکہ معظمہ میں پہنچے ہیں تو اُس وقت مکہ معظمہ میں حالتِ جنگ تھی، تمام لوگ مسلح تھے، جوش میں تھے، ارد گرد مورچے سنبھالے ہوئے تھے، کہ کسی طرح سے بھی مسلمانوں کو آنے نہ دیا جائے، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ ایک ایک سردار کے پاس گئے، اور جا کر حضور ﷺ کا یہ پیغام پہنچایا، کہ ہمارا مقصد لڑنا نہیں ہے، ہم تو عمرہ کے لئے آئے ہیں، طواف کریں گے، طواف کر کے واپس چلے جائیں گے، اس لیے ہمارے سامنے مزاحمت نہ کی جائے، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی یہ باتیں لوگوں نے سنیں، لیکن سننے کے بعد ماننے سے انکار کر دیا۔

اِدھر تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ اس سفارتی مہم پر تھے مکہ معظمہ میں، اور اُدھر دُوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جبلِ تنعیم جو حدیبیہ سے مکہ معظمہ کی طرف منہ کر کے بائیں جانب ہے، اُس پہاڑ پر سے اَسّی (۸۰) مشرک مسلح رات کی تاریکی میں اُترے، اور ان کا مقصد تھا جس طرح سے چھاپا مارا جاتا ہے، کہ اس طرح سے چھاپا مار کر سرورِ کائنات ﷺ کو نقصان پہنچایا جائے، اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ اِمداد ہوئی کہ وہ زندہ ہی پکڑ لیے گئے، مقابلے کی نوبت نہ آئی، جو مسلمان پہرے پر تھے ان کو اِحساس ہو گیا، اور وہ سارے کے سارے گرفتار کر لیے گئے، سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے پیش کر دیئے گئے۔ مشرکینِ مکہ کو پتا چلا کہ ہمارے کچھ لوگ پکڑے گئے تو انہوں نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو محبوس کر لیا، اس طرح سے کشاکشی کے اندر اضافہ ہوا۔ ایک وفد آیا حضور ﷺ کے پاس گفتگو کرنے کے لئے حالات معلوم کرنے کے لئے، انہوں نے حضور ﷺ سے کہا کہ آپ نے ہمارے یہ جو آدمی پکڑے ہیں ان کو چھوڑ

دیں، تو رسول اللہ ﷺ نے پوری فراخ دلی کا ثبوت دیتے ہوئے وہ آدمی جتنے بھی تھے آزاد کر دیے۔ اس واقعے کا ذکر تیسرے رُکوع میں ہے وَهُوَ الَّذِي كَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَأَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ، اِن آیتوں کے اندر اِسی واقعے کا ذکر ہے۔

سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے لئے ''بیعت علی الموت'' اور ''بیعت'' کا مفہوم و اقسام

اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو جو محبوس کیا گیا تھا تو سرورِ کائنات ﷺ کو کسی نے اطلاع یہ کر دی کہ عثمان کو قتل کر دیا گیا ہے، یہ خبر اگرچہ مصدقہ نہیں تھی، لیکن کشاکشی بڑھتی جو نظر آئی تو حضور ﷺ کو کچھ احساس ہوا کہ شاید لڑائی کی نوبت آ جائے، تو پھر آپ ﷺ نے سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اکٹھا کیا، اور اکٹھا کرنے کے بعد بیعت علی الجہاد یا بیعت علی الموت لی......! ''بیعت'' کی کئی قسمیں ہیں، جس طرح سے احادیث سے معلوم ہوتی ہیں، ایک بیعت علی الاسلام ہوتی ہے، بیعت کا مطلب ہے معاہدہ، اور معاہدہ کرتے وقت پرانے زمانے سے یہ رواج تھا کہ لوگ ایک دوسرے کے ساتھ ہاتھ ملاتے تھے، ہاتھ ملا کر معاہدہ کر لیتے تھے، عہد پختہ ہو جاتا تھا، تو سرورِ کائنات ﷺ بھی جب کسی سے عہد لیتے تھے تو اس کا ہاتھ پکڑ لیتے تھے، بیعت کرنے کا طریقہ یہی تھا، تو ایک تو ''بیعت علی الاسلام'' ہوتی ہے کہ ایک کافر مسلمان ہونے کے لئے آیا، تو اس کا ہاتھ اس طرح سے پکڑ کے اس سے اسلام کا اقرار کروالیا، اور ایک ''بیعت علی الجہاد'' ہوتی ہے جو سرورِ کائنات ﷺ نے یہاں لی، اور بھی کئی مواقع پر لی، اور ایک بیعت ہوتی ہے اخلاقِ فاضلہ کی پابندی پر، یہ بھی حضور ﷺ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے لیا کرتے تھے، مختلف قسم روایات میں اس کا ذکر بھی ہے، کہ اس بات کی پابندی کی جائے گی، یہ خُلق اپنایا جائے گا، یہ کام نہیں کیا جائے گا، یہ آج کل مشائخ کے اندر جو بیعت ہے وہ ''بیعت علی الاخلاق الفاضلہ'' ہے، اچھے عمل کرنے کے لئے، بُرے عمل چھوڑنے کے لئے یہ معاہدہ ہوتا ہے بزرگوں کے ساتھ، اس لیے یہ بیعت بھی سُنّت سے ثابت ہے۔ تو یہاں سرورِ کائنات ﷺ نے جو بیعت لی تو اس میں عنوان یہ تھا کہ مقابلہ ہونے کی صورت میں، ہم مرجائیں گے میدان نہیں چھوڑیں گے، اس لیے اس کو بیعت علی الموت کے ساتھ بھی حدیث شریف میں تعبیر کیا گیا ہے۔ یہ بیعت ہے جس کا ذکر پہلے رُکوع کے آخر میں بھی ہے إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ، اور تیسرے رُکوع کی اِبتدا بھی اسی بیعت کے تذکرے سے ہے لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ، درخت کے نیچے بیٹھ کے بیعت لی تھی، اس بیعت کو ''بیعتِ رضوان'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس بیعت کے نتیجے میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت پر اپنی رضا کا اظہار فرمایا۔

بیعت کے نتیجے میں مشرکین صلح کی طرف مائل ہو گئے

بیعت جس وقت ہوئی، مشرکینِ مکہ کو پتا چلا، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے ان کے اُوپر کچھ رُعب ڈال دیا، جب رُعب ڈال دیا تو وہ کچھ نرم ہو گئے، اور صلح کی طرف ان کا کچھ میلان ہو گیا، کیونکہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے ذریعے سے حضور ﷺ نے جو پیغام پہنچایا تھا تو اس میں یہ بات بھی تھی کہ تم یہ نادانی نہ کرو، عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ مجھے اور باقی عرب کو چھوڑ دو، میں جانوں اور باقی عرب جانے، تم اطمینان کے ساتھ رہو، اگر تو باقی عرب میرے پہ غالب آ گئے اور ان کے ہاتھوں سے میرا خاتمہ ہو گیا تو تمہاری مراد بغیر

کسی مشقت کے برآ گئی اور پوری ہوگئی، اور اگر میں ان کے اُوپر غالب آ گیا تو پھر تمہیں حق ہے، چاہے مجھے قبول کرلو، چاہے پھر مقابلہ کرلینا، تو اپنے آپ کو تم مصیبت میں کیوں ڈالتے ہو، پہلے اتنی جنگیں تم لڑ چکے ہو، اور وہ جنگیں تمہیں نقصان پہنچا چکی ہیں، تو اب بھی کچھ سوچ لو اور باز آ جاؤ، میرے سامنے مزاحمت نہ کرو، تو جو پیغام حضور ﷺ نے بھیجا تھا اس کے اندر یہ چیز بھی تھی۔ جب ان کے اُوپر کچھ یہ رُعب بھی طاری ہوا تو پھر وہ آمادہ ہوگئے صلح کرنے کے لئے، صلح کرنے کے لئے وفد بھیجا، سرورِ کائنات ﷺ کے سامنے وہ لوگ آئے، آ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے انہوں نے حالات دیکھے، عجیب وغریب قسم کے حالات تھے، تمام جزئیات کی تفصیل تو نہیں کی جاسکتی اِس سفر میں جو کچھ پیش آئے، بہرحال مشرکین کا نمائندہ آ گیا اور اس نے سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ صلح کرنے کا قصد ظاہر کیا، تو آپ ﷺ نے بھی ان کے اِس قصد کو قبول کیا، اور صلح پر آپ آمادہ ہو گئے۔

بوقتِ صلح مشرکین کی ضد اور رسول اللہ ﷺ کا تحمل

صلح کی جس وقت شرطیں شروع ہوئیں تو ایک ایک بات پر مشرکین کا جو وفد تھا، یا مشرکین کا نمائندہ، وہ ضد کرتا تھا، جس ضد کا ذکر اس سورت کے تیسرے رُکوع میں آئے گا اِذْ جَعَلَ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِیَّةَ حَمِیَّةَ الْجَاهِلِیَّةِ۔ صلح نامہ لکھنے لگے تو جیسے عادت ہے کہ تحریر کی اِبتدا ہوئی ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' تو مسلمانوں کی طرف سے لکھنے والے حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے، تو جب انہوں نے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ'' لکھا تو آگے سے مشرک اِعتراض کرتا ہے کہ یہ ''رحمٰن رحیم'' ہم اس کو نہیں جانتے، ہم اِبتدا کے اندر ایسا کلمہ نہیں لکھنے دیں گے جو مختلف فیہ ہے، ہمارے نزدیک مسلّم نہیں ہے، بلکہ اسی طرح سے لکھو جس طرح سے ہمارے ہاں پہلے سے لکھنے کا رواج چلا آ رہا ہے ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کوئی بات نہیں، یہی لکھ دو ''بِاسْمِكَ اللّٰهُمَّ'' یہ بات بھی ان کی مان لی گئی...... اور آگے پھر صلح نامہ پر عنوان آیا کرتا ہے کہ ''یہ وہ عہد نامہ ہے جو محمد رسول اللہ اور اہلِ مکہ کے درمیان ہوا''، جب یہ عبارت لکھی ''هٰذَا مَا قَاضٰی عَلَیْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' جب یہ لفظ آئے تو ''رسول اللہ'' کے لفظ کے اُوپر اس نے پھر اِعتراض کر دیا، کہ یہ تو ہمارے عقیدے کے منافی ہے، یہ تو مشترکہ تحریر ہے، اس میں کوئی مختلف فیہ بات نہیں آنی چاہیے، آپ کا ''رسول اللہ'' ہونا مختلف فیہ ہے، ہم اِس کو نہیں مانتے، اِس تحریر کے اُوپر ہمارے دستخط ہونے ہیں، اگر ہم نے دستخط کر دیے تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ ہم نے آپ کو ''رسول اللہ'' مان لیا، اور اگر ہم آپ کو اللہ کا رسول مان لیں تو جھگڑا کیا رہ گیا باقی! اس لیے یہ لفظ تحریر میں نہیں آنا چاہیے، بلکہ یہاں لکھو ''هٰذَا مَا قَاضٰی عَلَیْهِ مُحَمَّدُ بْنُ عَبْدِ اللّٰهِ'' تو حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا کہ کوئی بات نہیں، میں ''محمد بن عبداللہ'' بھی ہوں اور ''محمد رسول اللہ'' بھی ہوں، اگر یہ مجھ کو ''رسول اللہ'' نہیں مانتے تو کوئی حرج نہیں، لکھ دو ''محمد بن عبداللہ''، تو حضرت علی رضی اللہ عنہ چونکہ ''رسول اللہ'' کا لفظ لکھ چکے تھے، تو انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ! میں تو یہ لفظ نہیں مٹا سکتا...... اصل بات یہ ہے کہ جس قسم کے حالات پیش آ رہے تھے ان حالات کے تحت مسلمانوں کے جذبات بڑے مشتعل ہوتے جا رہے تھے، اور اس ''صلح نامے'' میں اِبتدا سے ہی یہ تأثر ہوتا جا رہا تھا کہ گویا ہم دبتے جا رہے ہیں اور مشرکین ہمارے اُوپر چڑھتے آ رہے ہیں، جس کا اثر مسلمانوں کے جذبات پر بہت پڑ رہا تھا، تو یہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کاغذ قلم رکھ دی کہ

مجھ سے تو یہ نہیں کاٹا جاتا، تو رسول اللہ ﷺ چونکہ صلح کا ارادہ کیے ہوئے تھے اور اسی میں مصلحت معلوم ہو رہی تھی، تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ کاغذ مجھے دو، حالانکہ آپ ﷺ اُمی تھے، یہ بھی آپ کا معجزہ ہے، کہ آپ نے وہ "رسول اللہ" کا لفظ کاٹا اور روایات کے ظاہر سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نے اپنی قلم کے ساتھ وہاں محمد بن عبداللہ لکھ دیا۔ یہ بات بھی مان لی گئی۔

شرائطِ صلح

آگے تفصیل شروع ہوئی، مشرکین کے نمائندے نے شرط پیش کی کہ لکھو، اس سال آپ لوگ واپس چلے جائیں گے، عمرہ کرنے کے لئے مکہ معظمہ میں داخل نہیں ہوں گے، اور اگلے سال آپ آئیں گے اور عمرہ کریں گے۔ تو اس موقع پر واپسی اور اگلے سال آمد، اس میں بھی بظاہر ایک شکست کی صورت تھی، کہ مسلمان اِحرام باندھ کر گئے ہیں، ہدیاں ان کے ساتھ ہیں، تو اَب یہاں سے واپس چلے جائیں تو سارے کہیں گے دیکھو! یہ تو مرعوب ہو کے آ گئے، اِن میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ آگے چلے جائیں اور جا کر عمرے کو اَدا کر لیں۔ اس پر آپ ﷺ نے کچھ تھوڑا سا انکار کیا کہ نہیں، ہمیں عمرہ کرنے دیا جائے، عمرہ کرنے کے بعد ہم چلے جائیں گے۔ وہ جو مشرکین کا نمائندہ تھا وہ کہنے لگا کہ نہیں، ہم عرب کے اندر یہ بات نہیں سننا چاہتے کہ لوگ کہیں گے کہ اہلِ مکہ کی مرضی کے خلاف مسلمان مکہ معظمہ میں داخل ہو گئے، تو اِس پر بھی انہوں نے اَڑی باندھی، رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط بھی مان لی...... اگلی شرط لکھئے! اُس شرط میں یہ لکھوایا کہ اگر اہلِ مکہ میں سے کوئی شخص مدینہ منورہ چلا جائے، چاہے وہ آپ کے دِین پر ہو، وہ آپ کو واپس کرنا پڑے گا، اور اگر آپ کے ساتھیوں میں سے کوئی مکہ میں رہنا چاہے تو ہم اس کو واپس نہیں کریں گے۔ اس شرط کے اُوپر تو مسلمان شپٹا اُٹھے، کہ اگر یہ شرط مان لی گئی تو اس کا مطلب تو یہ ہے کہ آئندہ کے لئے اسلام کا دروازہ ہی بند! کون مسلمان ہو گا مکہ معظمہ میں سے، جب اُسے پتا ہو گا کہ میں اگر چلا بھی گیا تو مجھے واپس کر دیا جائے گا۔ اور یہ کتنی ناانصافی ہے، کہ صلح تو ہوا کرتی ہے مساویانہ حقوق پر، اور اِدھر اپنا تو یہ حق منوا رہے ہیں کہ ہمارا آدمی اگر مسلمان ہو کر بھی چلا گیا تو تمہیں واپس کرنا پڑے گا، اور اُدھر ہمارے متعلق یہ کہنا کہ تمہارا آدمی آ گیا تو ہم واپس نہیں کریں گے، کتنی اِس میں مشرکینِ مکہ کی ایک قسم کی فتح اور ایک قسم کی بلندی معلوم ہوتی ہے اور مسلمان آگے سے دبتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ اس کے اُوپر مسلمانوں نے اصرار کیا کہ اس کو نہ مانیے، اس کو تسلیم نہ کیجئے، حضور ﷺ کے سامنے لوگوں نے درخواست کی، تو آپ نے فرمایا کہ نہیں! یہ بھی لکھ دو، اور مسلمانوں سے کہا کہ آپ فکر نہ کریں، اگر کوئی شخص ہم سے بھاگ کر مکہ معظمہ آ جائے گا تو ہمیں اس کی ضرورت ہی نہیں، اللہ نے وہ ہم سے دُور ہٹا دیا، اور اگر کوئی شخص اہلِ مکہ میں سے مسلمان ہو جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے لئے کوئی نہ کوئی گنجائش نکال دے گا، یعنی آپ ﷺ اس رُجحان پر تھے کہ جیسے بھی ہو صلح ہو جانی چاہیے۔

دورانِ صلح سیّدنا ابوجندل رضی اللہ عنہ کی آمد

تو ابھی یہ عہد نامہ لکھا ہی جا رہا تھا، دستخط ہونے کی نوبت نہیں آئی تھی کہ مشرکین کا نمائندہ جو آیا ہوا تھا غالباً "سہیل" اس کا نام ہے تو اس کا لڑکا ابوجندل؇، وہ پہلے مسلمان ہو یا ہوا تھا، اور اس کے باپ نے اس کو باندھ رکھا تھا، مختلف قسم کی سزائیں اس کو دی

جارہی تھیں، وہ کسی طرح سے کھسکتا کھسکتا اُچھلتا حدیبیہ میں آگیا، مسلمانوں نے اس کی حالتِ زار دیکھی کہ کس طرح سے اس کے زنجیر لگے ہوئے ہیں، کیسے بیچارہ چھوٹے چھوٹے قدم اُٹھا کے یہاں پہنچا ہے، تو جس وقت وہ پہنچا، مسلمانوں نے اس کا حال دیکھا، تو مسلمانوں کے دِل میں تو اس کے اُوپر شفقت آنی ہی تھی، اُدھر وہ جو مشرکین کا نمائندہ تھا وہ کہنے لگا کہ جی! پہلے اسی شرط کے اُوپر عمل کرو جو لکھی گئی ہے، میرے بیٹے کو واپس کرو، یہ شرط لکھی جا چکی تھی، لیکن ابھی عہد نامے کے اُوپر دستخط نہیں ہوئے تھے، تو حضور ﷺ نے کہا کہ بھئی! شرطیں تو لازم تب ہوا کرتی ہیں جب عہد نامہ مکمل ہو جائے، مکمل ہونے کے بعد دونوں فریقوں کے آپس میں دستخط ہو جائیں، تو ابھی تو عہد نامہ مکمل ہی نہیں ہوا تو ابھی سے یہ لاگو کہاں ہو گیا؟ لیکن وہ کہنے لگا: نہیں! میں پھر صلح ہی نہیں کرتا، وہ پھر اَڑ کے بیٹھ گیا، تو حضور ﷺ نے پھر فرمایا کہ اچھا! اس کو واپس کر دو، اور ابو جندل سے کہا کہ تھوڑے دِن اور صبر کرو جس طرح سے پہلے کرتے رہے ہو، تو یہ سارے کے سارے حالات ایسے تھے کہ مسلمانوں کے جذبات بے قابو ہوتے جارہے تھے، آپ ﷺ نے اس کو بھی واپس کروا دیا...... غرض یہ کہ اسی طرح سے چند اور دفعات بھی ہیں جن میں یہ بھی ہے کہ دس سال تک آپس میں معاہدہ ہو گیا کہ آپس میں لڑیں گے نہیں، اور یہ حالتِ امن قائم ہو جائے گی، ایک دوسرے سے بے فکر ہو جائیں گے، کچھ اور شرطیں بھی تھیں جو اِس میں لکھی گئیں، کتابوں کے اندر وہ ساری تفصیل کے ساتھ موجود ہیں۔

بہرحال اِس ''عہد نامہ'' کے لکھنے کے بعد اِدھر سے حضور ﷺ نے دستخط کیے، حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دستخط کروائے، ابوبکر رضی اللہ عنہ سے دستخط کروائے، عمر رضی اللہ عنہ سے دستخط کروائے، عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے دستخط کروائے، اِدھر سے دستخط کرنے والے یہ سب حضرات ہیں، اور اُدھر سے بھی مشرکین کے اُس نمائندے اور اُن کے چند ساتھیوں نے اس عہد نامے کے اُوپر دستخط کیے۔

یک طرفہ شرائط سے مسلمانوں کی بے چینی اور حضور ﷺ کا مدبرانہ جواب

حضور ﷺ نے صلح کر تو لی، لیکن صحابہ رضی اللہ عنہم کے دِل پر جو کچھ گزر رہی تھی وہ اللہ ہی جانتا ہے، سب سے زیادہ بے چینی کا اظہار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کیا، باقیوں کے دِل پر بھی وہی جذبات تھے جیسے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے تھے، لیکن بولنا اور اظہار کرنا ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہوتی، حضرت عمر رضی اللہ عنہ چپ نہ رہ سکے، حضور ﷺ سے کہتے ہیں کہ یا رسول اللہ! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ یقیناً حق پہ ہیں! کیا یہ مشرکین باطل پہ نہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً باطل پہ ہیں! اگر لڑائی ہوگئی اور ہم مارے گئے تو کیا ہم جنت میں نہیں جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً جائیں گے! اور اگر یہ مارے گئے تو یہ جہنم میں نہیں جائیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: یقیناً جائیں گے! کہا کہ پھر دِین کے معاملے میں اتنی ذِلت کیوں قبول کی جارہی ہے؟ مطلب یہ تھا کہ دبنے کی کیا ضرورت ہے؟ لڑو، تلوار فیصلہ کرے گی، جب ہم حق پر ہیں مرنے کے بعد جنت میں جانا ہے تو پھر اِس میں پیچھے ہٹنے کی کیا ضرورت ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ عمر! میں اللہ کا رسول ہوں اور اللہ مجھے ضائع نہیں کرے گا۔ یہ جواب دیا، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا، حدیث شریف میں آتا ہے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس گئے، ابوبکر صدیق چپ تھے، انہوں نے کوئی بات نہیں کی، وہاں جا کر یہی سوال دوہرائے، اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے وہی جواب ملے، اور پھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہی کہا کہ پھر

یہ ذلت کیوں قبول کی جا رہی ہے؟ تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بعینہٖ انہی الفاظ کے ساتھ جواب دیا کہ عمر! یہ اللہ کے رسول ہیں، اللہ انہیں ضائع نہیں کرے گا، ان کا دامن نہ چھوڑو، جس طرح سے کرتے ہیں انہیں کرنے دو، تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی یہی جواب دیا، اُس کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی طرح سے غصے سے بھرے ہوئے ہیں لیکن چپ ہو گئے۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کا کمالِ غم اور حضرت اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کا حکیمانہ مشورہ

''عہد نامے'' پر دستخط ہو جانے کے بعد حضور ﷺ نے فرمایا کہ اُٹھو بھائی! قربانیاں یہیں کر دو، اور سر منڈا دو، واپس چلیں۔ اعلان فرمایا تو کوئی نہیں اُٹھتا قربانی کرنے کے لیے اور کوئی نہیں اُٹھتا سر منڈانے کے لئے، یعنی یہ عملاً ایک احتجاجی کیفیت تھی کہ ہم اِس صلح کے اُوپر خوش نہیں ہیں، حضور ﷺ کو اس بارے میں کچھ رنج ہوا، اور اسی رنجیدہ کیفیت میں آپ اپنے خیمے میں گئے، خیمے میں حضرت اُمّ سلمہ اُمّ المؤمنین رضی اللہ عنہا موجود تھیں، انہوں نے دیکھا کہ حضور ﷺ کے اُوپر کچھ غم کی کیفیت ہے، پوچھا: کیا بات ہے؟ تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے اب ایک فیصلہ کر لیا، اور یہ قوم تیار نہیں ہے۔ تو اُمّ سلمہ رضی اللہ عنہا کہنے لگیں کہ آپ کو کسی سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے، آپ جائیں، جا کے اپنی ہدی ذبح کر دیں اور سر منڈا دیں۔ حضور ﷺ خیمے سے نکلے، آئے اور آ کر اپنی ہدی ذبح کی اور سر منڈایا۔ جس وقت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور ﷺ کا یہ عمل دیکھا پھر سارے ہی اُٹھے اور سب نے ہدیاں ذبح کر لیں اور سر منڈا دیے۔ مقصد یہ تھا کہ اب ان کو یقین ہو گیا کہ حضور ﷺ کا یہ فیصلہ قطعی ہے، اور یہ کسی صورت منسوخ کرنے کے لئے آپ تیار نہیں ہیں، اور جس وقت تک ہدی موجود تھی، سر نہیں منڈایا تھا، اِحرام تھا، تو سمجھتے تھے کہ شاید ہماری سُن لی جائے، اور ہمارے خیال کے مطابق ہمارے جذبات کی رعایت رکھتے ہوئے حضور ﷺ کوئی راستہ نکال لیں، جس وقت دیکھ لیا کہ اب یہ قطعی فیصلہ ہو گیا ہے، تو اس قطعی فیصلے کے بعد پھر کسی نے عذر نہیں کیا، سب نے قربانی کی، قربانی کرنے کے بعد سر منڈایا اور فارغ ہو گئے۔

''صلحِ حدیبیہ'' کو ''فتحِ مبین'' کیوں کہا گیا؟

واپسی کا حکم ہو گیا، واپس جس وقت آ رہے تھے تو راستے کے اندر یہ سورت اُتری جس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابتدائی آیت میں فرما دیا: اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا: ہم نے تو آپ کو کھلی فتح دے دی، آپ تو فتح یاب ہو کے واپس جا رہے ہیں، اور فتح بھی مبین جس کے فتح ہونے میں کوئی شک شبہ ہی نہیں ہے۔ جب یہ سورت اُتری تو حضور ﷺ نے حضرت عمر کو بُلایا، بُلانے کے بعد یہ آیت پڑھ کر سنائی کہ لیجئے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے آ گیا اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا، اُس وقت تک حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے جذبات ابھی ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے، تو آگے حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس بات کو سننے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ فتح ہے جو ہم پا کر آئے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں فتح ہے۔ اور واقعہ بھی پھر ایسے ہی ہوا جیسے تفصیل آپ کے سامنے آ رہی ہے، پھر سب کی آنکھیں کھل گئیں کہ یہ بہت بڑی نمایاں فتح تھی جو اللہ تعالیٰ نے دی، اور سرورِ کائنات ﷺ کو چونکہ اللہ کی طرف سے اشارہ ہو چکا تھا آنے والے حالات کا، تو اس لیے آپ ﷺ نے اُس کو قبول کر لیا، بظاہر آپ دبے تھے، لیکن یہ دبنا جو تھا یہی اُبھرنے کا ذریعہ بن گیا، جتنا مشرکین نے دبایا، اتنی شدت کے ساتھ اُبھرے، جیسے آپ وہ شعر پڑھا کرتے ہیں:

"اتنا ہی یہ اُبھرے گا جتنا کہ دبادیں گے!"

یہاں یہی بات ہوئی کہ جتنا زور کے ساتھ دبایا گیا تھا اتنی قوت کے ساتھ اُبھرے، صورت کیا پیش آئی؟ اب اس فتحِ مبین کی کچھ تفصیل ذہن میں آجائے، صورت یہ تھی کہ سرورِ کائنات ﷺ مدینہ منورہ میں تھے، اور آپ ﷺ کے خلاف دو مرکز تھے جو جنگوں کے اندر مبتلا تھے، اور جو ہر وقت آپ کے لئے خطرہ بنے رہتے تھے، ایک مرکز تھا خیبر کے یہودیوں کا، اور دُوسرا مرکز تھا مکہ کے مشرکوں کا، دونوں مختلف سمتوں میں ہیں، مدینہ منورہ سے جو یہودی جلاوطن ہوئے تھے وہ سب خیبر میں اکٹھے ہوچکے تھے، مستقل چھاؤنی بنی ہوئی تھی مسلمانوں کے خلاف، اور اِدھر مکہ تو مرکز تھا ہی، اور اِن کی آپس میں بھی ساز باز ہوتی رہتی تھی، اور مسلمانوں کو جو لڑائیاں پیش آئی تھیں اُحد کی، خندق کی، ان سب کے اندر یہودیوں کی ہمدردیاں مشرکین کے ساتھ تھیں، اور آئے دِن یہ سازشیں چلتی رہتی تھیں، دو مرکز تھے جو حضور ﷺ کو اُلجھائے ہوئے تھے، بیک وقت دونوں کے ساتھ نبرد آزما ہونا یہ بہت مشکلات کا باعث تھا، اور آپ چاہتے یہ تھے کہ کم از کم ایک طرف سے اطمینان ہوجائے تو دوسروں کو سنبھال لیا جائے، اور جب ایک مرکز ختم ہوجائے گا تو اللہ تعالیٰ دوسری طرف بھی کوئی صورت پیدا فرمادیں گے، اب ان دونوں میں سے کس کے ساتھ معاہدہ کیا جائے؟ صلح کا، ترکِ جنگ کا۔ یہود کو تو آپ بار بار آزما چکے تھے کہ ان کے ساتھ معاہدہ ہوتا ہے لیکن معاہدہ ہونے کے بعد پھر وہ غداری کرتے ہیں، جیسے کہ غزوۂ خندق میں بنوقریظہ نے غداری کی تھی، آپ کے سامنے وہ تفصیل سورۂ اَحزاب میں آچکی، بنوقریظہ یہودی تھے اور ان کے ساتھ حضور ﷺ کی مصالحت تھی، لیکن جب مشرکین کا حملہ ہوا تو مشرکین کے حملے کی صورت میں یہ غداری کرگئے اور مسلمانوں کے لئے بے اِنتہا خطرے کا باعث بن گئے، اس لیے یہودی تو قابلِ اعتماد تھے نہیں کہ ان کے ساتھ معاہدہ کرکے ہم مشرکین سے جنگ چھیڑ دیں، اور ہم اِدھر سے مطمئن ہوکر بیٹھ جائیں کہ یہ ہمیں کچھ نہیں کہیں گے، بلکہ اِن سے غداری کا اندیشہ ہے، مشرکینِ مکہ جیسے کیسے بھی تھے لیکن ان کے اوپر عہد کی پابندی کے متعلق بدگمانی نہیں کی جاسکتی تھی جس طرح سے کہ یہود پر تھی، اُن کے متعلق یہ توقع تھی کہ اگر یہ کوئی قول اقرار صراحتاً کرلیں گے تو یہ نبھائیں گے، اس طرح سے غداری نہیں کریں گے، تو رسول اللہ ﷺ چاہتے تھے کہ اِس مرکز کے ساتھ صلح ہوجائے، ترکِ جنگ کا معاہدہ ہوجائے، تو دوسری طرف پھر یہود کو نمٹا دیا جائے، اور دوسرے بہت سارے کام جو سامنے ہیں جو اس جنگی کیفیت کی وجہ سے نہیں ہوسکتے وہ ہوجائیں گے، حضور ﷺ کے سامنے اللہ تعالیٰ نے یہ چیز منکشف کی ہوئی تھی۔

"صلح حدیبیہ" کے بعد یہود پر چڑھائی

چنانچہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ جس وقت صلح ہوگئی تو اس صلح ہونے کے ساتھ اِدھر سے حضور ﷺ کو اِطمینان ہوگیا، اس اطمینان کے بعد مسلمانوں کے وفود سارے عرب میں چلنے پھرنے لگ گئے، مشرکین کے ساتھ اختلاط شروع ہوگیا، مشرکین مسلمانوں کے اخلاق سے متاثر ہونا شروع ہوگئے، اور اُدھر یہود کے ساتھ عملاً نمٹنے کا فیصلہ کرلیا گیا، چنانچہ اِدھر سے واپس آتے ہی سرورِ کائنات ﷺ نے اعلان فرمادیا کہ اب خیبر کے اُوپر چڑھائی کرنی ہے، اِدھر سے بالکل اطمینان ہوگیا تھا کہ اب مشرکینِ مکہ

یہود کا ساتھ نہیں دیں گے، اور یہ سفر میں ہی اللہ کی طرف سے پیش گوئی ہوگئی تھی کہ یہ مغانم کثیرہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے لئے اس مکہ کے فتح ہونے سے پہلے اور عمرے سے پہلے پہلے کردی ہیں۔ تیسرے رُکوع میں ان مغانم کی تفصیل آپ کے سامنے آرہی ہے۔ مدینہ منورہ میں جس وقت پہنچے، آپ نے ارادہ ظاہر کیا، تو ذی قعد میں واپس آئے تھے اُدھر سے معاہدہ کرکے، آگے ذی الحج کا مہینہ گزرا، اور آگے محرم آیا، تو محرم میں ہی حضور ﷺ کے سفر کی اِبتدا ہوگئی ہے خیبر کی طرف۔

غزوۂ خیبر میں صرف شرکائے حدیبیہ داخل ہوں گے

اور جس وقت خیبر کی طرف جانے لگے تو وہ اَعراب اور دوسرے لوگ جن کے سامنے اب حالات یہ تھے کہ یہود مقابلہ نہیں کرسکیں گے، وہ علاقہ سرسبز شاداب یقیناً فتح ہونے والا ہے اور بہت غنیمتیں حاصل ہوں گی، پیش گوئی بھی حضور ﷺ کی طرف سے ہوگئی، اللہ کی طرف سے آیات اُتر آئیں، تو پھر ان اَعراب نے، دوسروں نے، سب نے ساتھ جانے کا ارادہ کیا، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے پہلے ممانعت آگئی تھی کہ یہ فتوحات اب صرف ان لوگوں کا حصہ ہے جو کہ حدیبیہ کے میدان میں آپ کے ہاتھ پر بیعت علی الجہاد کرچکے ہیں، کسی دوسرے کو اس میں شریک نہیں کرنا، جب انہوں نے ارادہ کیا تو حضور ﷺ نے صاف جواب دے دیا کہ میرے ساتھ تم نہیں جاسکتے، یہ تفصیل بھی آپ کے سامنے دوسرے رکوع میں آرہی ہے سَيَقُولُ الْمُخَلَّفُونَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ: کہ عنقریب یہ کہیں گے کہ تم ہم پہ حسد کرتے ہو، تم ہمیں ساتھ نہیں لے جانا چاہتے تاکہ غنیمتوں میں سے ہمیں کچھ حصہ نہ ملے، یہ اس قسم کی باتیں کریں گے لیکن اِن کو صاف جواب دے دینا کہ اب یہ ساتھ نہیں جاسکتے۔ چنانچہ وہی چودہ سو جو حضور ﷺ کے ساتھ حدیبیہ میں تھے جنہوں نے بیعت علی الجہاد کی تھی، انہی کو ساتھ لے کر حضور ﷺ نے خیبر پر حملہ کیا، اور اس صلح کے چند مہینوں کے اندر اندر ہی خیبر کو فتح کرلیا، اور یہ جو ایک مرکز پریشان کیے ہوئے تھا، حضور ﷺ اس سے فارغ ہوگئے، پوری طرح سے تسلط حاصل ہوگیا، خیبر کے باغات وہاں کی جائیدادیں سب اپنے قبضے میں آگئیں، اور مسلمانوں پر تقسیم کردی گئیں، جس کی وجہ سے ان کو مالی کشادگی بھی خوب اچھی طرح سے حاصل ہوگئی۔

مشرکینِ مکہ کی عہد شکنی اور فتحِ مکہ کی تیاری اور اَسباب

یہ سال گزرا ہے، اگلا سال آیا ہے، صلح کے معاہدے کے اندر چونکہ یہ بات بھی تھی کہ اصل فریق تو ہیں مسلمان اور مکہ والے، اور باقی قبائل جتنے بھی ہیں ان کو یہ اختیار دے دیا گیا کہ اِن دونوں میں سے جس فریق کے ساتھ شامل ہوکر کوئی اس معاہدے میں شریک ہونا چاہے ہوجائے، چنانچہ بنوخزاعہ ایک قبیلہ تھا وہ مسلمانوں کی طرف سے اس معاہدے میں شریک ہوگیا، اور بنوبکر ایک قبیلہ تھا وہ مشرکین کی طرف سے اس معاہدے میں شریک ہوگیا، اب اتفاق ایسا ہوا کہ بنوبکر اور بنوخزاعہ جاہلیت کے زمانے سے ان کی آپس میں ضد چلی آرہی تھی، کہیں چھیڑ چھاڑ ہوئی تو رات کی تاریکی میں بنوبکر نے بنوخزاعہ پر حملہ کردیا، اب یہ دونوں فریق صلح میں داخل تھے، تو یہ خیانت ہوئی بنوبکر کی طرف سے بنوخزاعہ کے خلاف، اور بنوبکر حلیف تھے مشرکینِ مکہ کے، اور اس گڑبڑ کے اندر مشرکینِ مکہ نے، عکرمہ بن ابی جہل اور اس کے بعض ساتھیوں نے در پردہ مدد کی بنوبکر کی بنوخزاعہ کے خلاف، یہ سمجھتے

ہوئے کہ حضور ﷺ تو بہت دُور بیٹھے ہیں، ان کو کیا اطلاع ہوگی، اس لیے وہ معاون بن گئے، تو گویا کہ عملاً یہ صلح مشرکین کی طرف سے ٹوٹ گئی، یہ عہد کی خلاف ورزی ہوگئی، بنوخزاعہ حضور ﷺ کے پاس پہنچے، جا کر حالات کی اطلاع دی، تو جس وقت صحیح طور پہ حالات کی تصدیق ہوگئی تو آپ ﷺ نے سمجھ لیا کہ اب اِس ''عہد نامے'' کے ہم بھی مکلف نہیں رہے، چونکہ دوسرے فریق کی طرف سے ٹوٹ گیا، تو آپ ﷺ نے ارادہ کرلیا کہ اب مکہ معظمہ کو بھی فتح کرلیا جائے، اُس مرکز (خیبر) سے فارغ ہو گئے تھے، اب یہود کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہ گیا تھا، جس طرح سے یہود کو دبانے کے لئے مشرکین کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں رہا تھا، اور اب مشرکین کو دبانے کے لئے چاروں طرف سے امن حاصل ہو گیا تھا اور کوئی کسی قسم کا خطرہ یہود کی طرف سے نہیں رہا تھا۔ آپ ﷺ نے ارادہ کیا کہ چپکے چپکے جائیں، اور جا کے یکدم ان کو دبالیں، کیونکہ اُن کی طرف سے جنگ کی اِبتدا ہو چکی ہے، اب ہماری طرف سے اعلان کی ضرورت نہیں ہے، اور خفیہ حملہ کرنے اور خفیہ طور پر ان کا محاصرہ کرنے کی اس لیے بھی سوچی گئی تا کہ حرم کے اندر زیادہ کشت وخون نہ ہو، زیادہ لڑائی کی نوبت نہ آئے۔ چنانچہ جب عمرہ کرنے کے لئے حضور ﷺ گئے تھے تو اِعلانِ عام کیا تھا، لیکن اس کے باوجود آپ ﷺ کے ساتھ صرف چودہ سو آدمی جانے کے لئے تیار ہوا تھا، دو سال کے اندر اندر ہی اسلام کی اتنی اشاعت ہوئی اور مسلمانوں کے اتنے حوصلے بڑھے کہ جب آپ ﷺ نے مکہ کو فتح کرنے کا ارادہ کیا، تو اس وقت آپ ﷺ کے ساتھ دس ہزار کا لشکر تیار ہو گیا، دو سال کے اندر اندر ایسی نوبت آ گئی۔

سیّدنا ابو بصیر رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کا واقعہ

درمیان میں ایک بات رہ گئی، چونکہ تفسیر میں کوئی آیات اس قسم کی نہیں آرہیں جن کا اُس واقعے کے ساتھ تعلق ہو، اس لیے وہ میں نے چھوڑ دیا، ویسے تتمہ کے طور پر عرض کر دوں، کہ یہ شرط تو مان لی گئی تھی جس کے اُوپر مسلمان سب سے زیادہ مشتعل ہوئے تھے کہ مکہ میں سے کوئی مدینہ آئے تو واپس کرنا پڑے گا، یہی سب سے زیادہ ناگوار شرط تھی، تو ایک ''ابو بصیر'' نامی شخص ہیں مکہ معظمہ میں وہ مسلمان ہوئے، مسلمان ہونے کے بعد وہ مدینہ منورہ آ گئے مکہ سے بھاگ کر، صلح نامہ ہو جانے کے بعد، مشرکین مکہ نے اپنے اس معاہدے کے تحت دو آدمی بھیجے ''ابو بصیر'' کو واپس لانے کے لئے، تو جب وہ حضور ﷺ کے پاس پہنچے تو آپ نے ''عہد نامے'' کا اعتراف کرتے ہوئے، احترام کرتے ہوئے ''ابو بصیر'' کو ان کے سپرد کر دیا کہ لے جاؤ، ہم اس کو رکھنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ''ابو بصیر'' ان کے ساتھ چل دیے، ذوالحلیفہ کے قریب آ کے وہ بیٹھ کے اپنا کچھ کھانے پینے لگے جو اُن کے پاس زاد تھا، کھانے میں مشغول ہوئے تو ''ابو بصیر'' ایک مشرک کو کہتا ہے کہ تیری تلوار بڑی اچھی ہے، اس کی تلوار کی تعریف کی، چونکہ اب آتو رہے تھے مصالحانہ انداز میں، تو وہ بھی کچھ پھول گیا، کہنے لگا کہ ہاں یہ میں نے وہاں سے خریدی ہے، ایسی ہے ویسی ہے، تعریف کی، تو ''ابو بصیر'' کہتا ہے: مجھے دکھاؤ تو ذرا! اس نے اس کے ہاتھ میں دے دی، تو دیکھتے ہی دیکھتے ''ابو بصیر'' نے ہاتھ جو چلایا تو ایک مشرک کی گردن اُڑا دی، اور دُوسرا خوف زدہ ہو کر وہاں سے مدینہ منورہ کی طرف بھاگا، اب آگے آگے وہ مشرک ہے پیچھے پیچھے ''ابو بصیر'' ہے، حضور ﷺ مسجد میں تشریف فرما تھے، جب اُس مشرک کو آتے ہوئے دیکھا تو آپ نے فرمایا کہ یہ تو کوئی گھبراہٹ

دیکھ کے آیا ہے، یہ تو کوئی گڑ بڑ ہو گئی، اتنے میں وہ مشرک بول پڑا، کہنے لگا کہ جی! ''قُتِلَ صَاحِبِیْ وَاِنِّیْ لَمَقْتُوْلٌ '' کہ میرے ساتھی کو توقتل کر دیا گیا، اور میں بھی عنقریب قتل کر دیا جاؤں گا، چونکہ پیچھے ''ابوبصیر'' تلوار لیے آرہا تھا۔ جب حضور ﷺ کی نظر اس پر پڑی تو آپ ﷺ نے اس کو ڈانٹا، ناراضگی کا اظہار کیا ''وَیْلُ اُمِّهٖ مِسْعَرُ حَرْبٍ لَوْ كَانَ لَهٗ اَحَدٌ '' اس قسم کے الفاظ آپ نے بیان فرمائے، کہ یہ تو لڑائی کو بھڑکانے والا ہے، یہ تو ہماری مشرکین کے ساتھ لڑائی کروا دے گا، اس کی ماں کی خرابی، اس کو وہاں کسی نے سنبھالا نہ؟ جب اس طرح سے ناراضگی کے الفاظ حضور ﷺ کی زبان سے سنے تو ''ابوبصیر'' سمجھ گئے کہ یہ مجھے رکھیں گے نہیں، یہ بہرحال واپس کر دیں گے، اب اس کو اور بھی خطرہ ہوا کہ جب میرے ہاتھ سے ایک مشرک بھی مارا گیا تو جب میں مشرکوں کی طرف واپس لوٹا دیا جاؤں گا تو وہ میرا کیا حال کریں گے، اس لیے وہ مدینہ منورہ سے نکلا، جا کر سمندر کے ساحل پر، سمندر کے کنارے پہاڑوں میں جا کر اس نے اپنا کوئی ٹھکانا بنا لیا، مکہ میں پتا چل گیا اس واقعے کا کہ ''ابوبصیر'' وہاں سے نکلا اور وہاں ٹھہر گیا، تو مکہ میں جتنے مسلمان محصور تھے وہ وہاں سے بھاگتے، بھاگ کے ''ابوبصیر'' کے پاس آجاتے، مدینہ منورہ تو آتے نہیں تھے، پتا تھا کہ ہمیں یہ رکھیں گے نہیں، جب یہاں ان کا تھوڑا سا گروہ بن گیا، اب یہ حضور ﷺ کے زیر اثر تو تھے نہیں، آپ نے تو کر دیے واپس، اِن کی ذمہ داری آپ پر نہیں آتی تھی، اور یہ جو راستہ ہے مکہ معظمہ سے شام کی طرف تجارت کا وہ اسی جگہ سے گزرتا تھا، قافلے یہیں سے جایا کرتے تھے، چنانچہ آپ کو یاد ہوگا کہ وہ قافلہ جو شام سے آرہا تھا جس کا راستہ روکنے کے لئے حضور ﷺ مدینہ منورہ سے آئے تھے، جس کے نتیجے میں جنگ بدر ہوئی تھی، وہ بھی یہیں سے جاتا تھا، تو انہوں نے ان تجارتی قافلوں کے اُوپر چھاپے مارنے شروع کر دیے، جو کوئی اِکا دُکا ملتا، تھوڑے بہت ہوتے اُن کو لوٹ لیتے اور گڑ بڑ کرتے، ان کے راستے سارے کے سارے مسدود کر دیے اِس گروہ نے جو کہ بھاگ کر یہاں اکٹھا ہو گیا تھا، مشرکوں کے لئے ایک اور مصیبت ہو گئی، اب وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتے تھے، چونکہ ان کے زیر اثر نہیں، انہوں نے تو نکال دیے، اب وہ مدینہ منورہ جانے کی بجائے انہوں نے یہاں پہاڑوں میں چھاؤنی بنا لی، مجبور ہو کر مشرکین کا وفد حضور ﷺ کی خدمت میں گیا، جا کر کہنے لگے کہ یارسول اللہ! ہم اپنی اس شرط کو واپس لیتے ہیں، اور آپ ان لوگوں کو مدینہ منورہ بلا لیجئے، خود انہوں نے اپنی اس شرط کو واپس لیا، جب یہ شرط واپس لی گئی تو حضور ﷺ نے ''ابوبصیر'' کی طرف پیغام بھیجا، اتفاق کی بات ہے اللہ تعالیٰ کو ایسا منظور تھا، جب حضور ﷺ کا پیغام گیا ہے تو اس وقت ''ابوبصیر'' کے اُوپر نزع کی کیفیت تھی، ان کا انتقال وہیں ہوا ہے، وہ تو مدینہ منورہ میں نہیں آئے، اور ان کے باقی ساتھی جتنے تھے وہ سارے کے سارے مدینہ منورہ آگئے۔ تو یہ شرط جو تھی یوں واپس ہوئی۔

دورانِ صلح اِسلام لانے والی ایک عورت کا واقعہ

اور ایک لڑکی نوجوان تھی غالباً اُمِ کلثوم بنت ابی معیط، غالباً یہی نام ہے، یہ بھی مکہ معظمہ سے مدینہ منورہ آگئی تھی، تو اس کو بھی واپس لینے کے لئے مشرکین نے آدمی بھیجے، اِس سے حضور ﷺ نے عذر کر دیا، جس کا ذکر آپ کے سامنے سورۂ ممتحنہ میں آئے گا، عذر کر دیا اور یہ کہا کہ عہد نامہ اُٹھا کر دیکھ لو، اس میں ''رجل'' کا لفظ ہے ''امرأۃ'' کا لفظ نہیں ہے، آدمیوں کو واپس کرنے کا

معاہدہ ہے، عورتوں کو واپس کرنے کا معاہدہ نہیں ہے، اور اُدھر اللہ تعالیٰ نے بھی کہہ دیا تھا کہ وہ ان کے لئے حلال نہیں، یہ اُن کے لئے حلال نہیں، اس لیے فَلَا تَرْجِعُوْهُنَّ إِلَى الْكُفَّارِ (سورۂ ممتحنہ) اگر کوئی عورت آجائے تو اُس کو کافروں کی طرف نہیں لوٹانا، اور اس میں معاہدے کی خلاف ورزی بھی نہیں تھی، چنانچہ جس وقت وہ اُٹھا کے دفعہ دیکھی گئی تو وہاں ''رجل'' کا لفظ تھا، اور ''رجل'' کا لفظ آپ جانتے ہیں کہ ''امرأة'' کو شامل نہیں، تو اُس کا آپ ﷺ نے عذر کر دیا۔

بہر حال وہ شرط جس پر اشتعال زیادہ ہوا تھا وہ اس طرح سے ختم ہوگئی۔ تو آپ ﷺ نے پھر مکہ معظمہ کو جس وقت فتح کرنے کا ارادہ کیا تو دس ہزار کا لشکر تیار کیا، اسی میں وہ واقعہ پیش آیا تھا حاطب بن ابی بلتعہ کا، کہ جس میں انہوں نے مشرکین کو خط کے ذریعے سے اطلاع دینے کی کوشش کی تھی اور حضور ﷺ کو پتا چل گیا تو آپ نے وہ خط راستے میں پکڑ والیا تھا، اور اُس کا تذکرہ آپ کے سامنے سورۂ ممتحنہ میں آئے گا سارے کا سارا باتفصیل۔

''فتحِ مکہ'' کی ایک جھلک!

بہر حال حضور ﷺ تشریف لے گئے، مکہ معظمہ کے قریب جا کر کہیں پڑاؤ ڈالا، ابوسفیان اور اس کے کچھ ساتھی رات کو گشت کرتے پھر رہے تھے، اور جب انہوں نے دیکھا کہ یہ کوئی آگ جل رہی ہے، میدان کے اندر کوئی قافلہ اُترا ہوا ہے، تو کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ یہ کون لوگ ہو سکتے ہیں؟ یہ تو ایسے ہے جس طرح سے عرفات میں آگیں جلا کرتی ہیں، تو یہ کھڑے باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں مسلمانوں کے پہریدار کہیں پہنچ گئے اور انہوں نے ان کو زندہ ہی پکڑ لیا، جن میں ابوسفیان بھی تھا، جب پکڑ کے لے آئے، ابوسفیان کو حضور ﷺ کے سامنے حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے پیش کیا سفارش کر کے، تو ابوسفیان مسلمان ہو گیا حضور ﷺ نے اسے امن دے دیا۔ مکہ معظمہ کے اندر جب مسلمانوں کا داخلہ ہوا، حضور ﷺ نے فوجیں تقسیم کی ہوئی تھیں کہ فلانا اِدھر سے جائے، اُدھر سے جائے، تو کوئی خاص مزاحمت نہیں ہوئی، ایک طرف سے تھوڑی سی مزاحمت ہوئی جدھر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ تھے اور مقابلے میں عکرمہ بن ابی جہل تھا، تو وہاں کچھ تھوڑا سا نقصان ہوا ہے، ورنہ بغیر جنگ کے، بغیر کسی کوشش کے مکہ معظمہ کے اُوپر تسلط ہو گیا۔ حضور ﷺ نے جا کر اعلان کر دیا کہ جو ابوسفیان کے گھر داخل ہو جائے گا اس کو بھی امن ہے، جو اپنا دروازہ بند کر لے اس کو بھی امن ہے، جو اپنا ہتھیار رکھ دے اس کو بھی امن ہے، اس طرح سے اعلان کرنے کے ساتھ وہ لوگ سارے کے سارے مطمئن ہو گئے، یعنی بغیر کسی مزاحمت کے بغیر زیادہ کشت وخون کرنے کے مکہ معظمہ یوں فتح ہو گیا۔

حدیبیہ کا صلح نامہ ''فتحِ مکہ'' کی بنیاد بنا

اب یہ خیبر کا فتح ہونا اور مکہ معظمہ کا فتح ہونا، اس کا مطلب یہ تھا کہ سارے عرب کے اوپر مسلمانوں کا تسلط ہو گیا، اور یہ فتح نصیب ہوئی اسی ''صلح نامے'' کے نتیجے میں جو کہ حدیبیہ کے اندر ہو گیا تھا، تو چونکہ ''صلح نامہ'' یہ بنیاد بنا اس فتح کے لئے، اس لئے اللہ تبارک وتعالیٰ نے اسی کو ہی ''فتحِ مبین'' قرار دیا، دو سال کے اندر اندر سارے کے سارے حالات کھل کے سامنے آگئے اور مسلمانوں نے دیکھ لیا کہ واقعی کامیابی کی بنیاد اور یہ ''فتحِ مبین'' یہ ساری کی ساری ''صلح حدیبیہ'' کے نتیجے میں حاصل ہوئی، تو

اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا کی تفسیر آنکھوں سے دیکھ لی اور سارے کا سارا معاملہ سامنے آگیا۔ یہ ہیں متعدد واقعات جو کہ اِس سورت کے اندر ذکر کیے گئے ہیں اور مختلف آیتوں کے اندر وہ مذکور ہیں۔

مسلمانوں پر سکون واِطمینان کا نزول

اس میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے مسلمانوں کے اُوپر ''سکینہ'' اُتارنے کا خاص طور پر ذکر کیا ہے اور تین جگہ اس کا ذکر آئے گا، ''سکینہ'' اصل کے اعتبار سے تو سکون اور اطمینان کو کہتے ہیں، تحمل اور برداشت قلب کے اندر پیدا ہو جائے، جس قسم کے حالات ہوں ان کے مقابلے کے لئے انسان تیار ہو جائے، یہ اطمینان اور سکون اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے دلوں میں اُتارا، اس کے دو اثر ظاہر ہوئے، ایک اثر تو یہ ظاہر ہوا کہ جب مرنے مارنے کی ضرورت تھی تو اس وقت وہ مرنے مارنے کے لئے تیار ہو گئے، یہ بھی تو ایک اطمینانِ قلبی کا نتیجہ ہوتا ہے کہ لڑنے کی ضرورت پیش آجائے تو لڑنے کے لئے تیار ہیں، مرنے مارنے کی ضرورت پیش آجائے تو اس کے لئے تیار ہیں، یہ بھی اُسی انزالِ سکینہ کا نتیجہ تھا، اور دوسرا اثر اس کا یہ ہوا کہ جس وقت جوش وخروش کو دبانے کی ضرورت پیش آئی تو اس وقت یہ دب بھی گئے اور برداشت بھی کر گئے، صرف اپنے جوش وخروش کے اندر آکے انہوں نے انکار نہیں کیا، کہ نہیں! ہم لڑیں گے، ہم صلح نہیں کرتے، حضور ﷺ نے صلح کی تو وہ بھی انہوں نے برداشت کر لی، یہ انتہائی درجے کے دو امتحان کے موقعے تھے، جانبازی کا موقع آیا تو اسی سکون اور اطمینان کا نتیجہ تھا کہ وہ جانبازی کے لئے تیار ہو گئے، لیکن جس وقت ان کو ٹھنڈا کرنے کی ضرورت پیش آئی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے سکون واطمینان کے نتیجے میں ان کا جوش وخروش جو تھا وہ بھی ختم ہو گیا، یہ دونوں موقعے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کمالِ طاعت کے ظاہر ہونے کے ہیں جس کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے یہاں اس کو خصوصیت کے ساتھ نمایاں کیا۔

اللہ تعالیٰ کی رضا کا مقام

اور یہ سورت ہے جس میں صحابہ رضی اللہ عنہم کے متعلق خصوصیت سے جو حدیبیہ میں شریک تھے رضامندی کا اظہار کر دیا گیا، اور اللہ کی رضا ایک ایسا مقام ہے، آپ احادیث میں دیکھیں گے، کہ جس وقت جنتی جنت میں چلے جائیں گے اور اپنے اطمینان کے ساتھ زندگی گزارنے لگ جائیں گے، تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ پھر جنتیوں سے پوچھے گا کہ کوئی اور چیز تمہیں ضرورت ہو تو بتاؤ، وہ کہیں گے: جی! کسی چیز کی ضرورت نہیں، آپ نے ہمیں اتنا خوش حال کر دیا۔ تو اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ اب میں تمہیں اپنی رضا دیتا ہوں، آئندہ میں تم پر کبھی بھی ناراض نہیں ہوں گا۔[1] رضا کا اعلان اُس وقت ہوگا تو حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس سے اہلِ جنت کے اُوپر اتنی خوشی طاری ہوگی کہ جنت کی کسی نعمت کے ساتھ اتنی خوشی ان کو نصیب نہیں ہوئی ہوگی جتنا اللہ کی رضا کا اعلان سن کے وہ خوش ہوں گے۔ تو جنت کے اعلیٰ مقامات میں سے مقام ہے ''مقامِ رضا'' کا حاصل ہو جانا، اللہ تعالیٰ نے

(۱) بخاری ۹۶۹/۲، باب صفة الجنة / مسلم ۳۷۸/۲، کتاب الجنة/ مشکوٰة ۴۹۷/۲، باب صفة الجنة، فصل اول۔ ولفظ الحدیث: فَيَقُوْلُ هَلْ رَضِيْتُمْ فَيَقُوْلُوْنَ...الخ.

اِن بیعت کرنے والوں کو دُنیا کے اندر ہی پیش گوئی دے دی کہ تم پہ اللہ راضی ہو گیا، تو یہ رضا کی نعمت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو حاصل ہوئی اس لیے اس کو ''بیعتِ رضوان'' سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

سیّدنا عثمان رضی اللہ عنہ کے فضائل

اور اس موقع پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی فضیلت باقیوں کے مقابلے میں زیادہ نمایاں ہوئی، کیونکہ جس وقت حضور علیہ السلام بیعت لے رہے تھے اُس وقت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وہاں موجود نہیں تھے، ایسے ہی ہے نا؟ جیسے واقعہ میں نے پہلے ذکر کیا، باقیوں نے بیعت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو چونکہ یہ احتمال تھا کہ عثمان زندہ ہوں، اگرچہ یہ افواہ بھی ہو گئی تھی کہ قتل کر دیے گئے، لیکن اِس فضیلت میں ان کو شریک کرنے کے لئے پھر آپ نے یوں اپنے دونوں ہاتھ نمایاں کیے، اور یہ کہا کہ یہ ہاتھ میرا ہے اور یہ عثمان کا ہے، اور یہ میں عثمان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ہاتھ کو عثمان رضی اللہ عنہ کا ہاتھ قرار دے کر بیعت کی، تو گویا کہ اس فضیلت کے اندر حضرت عثمان کو بھی شریک کر لیا گیا، بعد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کہا کرتے تھے کہ باقیوں نے تو بیعت اپنے ہاتھ کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پہ کی ہے، لیکن عثمان کی بیعت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر ہوئی ہے، اور اس کو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مناقب میں شمار کیا جاتا ہے۔ یہ ہیں وہ واقعات جو کہ اِس سورت کے اندر آ رہے ہیں۔

صلح کے نتیجے میں چار چیزوں کا خصوصیت سے ذِکر

اب اِس پہلے رُکوع کا ذرا ترجمہ دیکھ لیجئے......! اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِيْنًا: بے شک ہم نے آپ کو کھلم کھلا فتح دے دی، نمایاں فتح دے دی، لِيَغْفِرَ لَكَ اللّٰهُ مَا تَقَدَّمَ مِنْ ذَنْۢبِكَ وَمَا تَاَخَّرَ وَيُتِمَّ نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَّيَنْصُرَكَ اللّٰهُ نَصْرًا عَزِيْزًا: تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کو معاف کر دے، تاکہ بخش دے اللہ تعالیٰ آپ کو جو گناہ آپ کے پہلے گزر رہے ہیں اور جو پیچھے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ آپ کے اگلے پچھلے گناہ معاف کر دے، اور تاکہ اللہ تعالیٰ اپنی نعمت کو آپ پر پوری کر دے، اور تاکہ آپ کو صراطِ مستقیم پر چلائے، اور تاکہ آپ کو زبردست مدد دے، نَصْرًا عَزِيْزًا: غلبے والی مدد، ایسی مدد جس میں غلبہ ہی غلبہ نمایاں ہو۔ یہ چار چیزیں ذکر فرمائیں اور لام کے تحت، فتحِ مبین دی ہے جس کے نتیجے میں چار چیزیں آئیں......ایک تو اللہ نے آپ کی اگلی پچھلی سب کوتاہیاں معاف کر دیں، فتح اس لیے دی تاکہ یہ معافی ہو جائے ''کوتاہی'' کا لفظ یا ''ذنب'' کا لفظ اس کی تفصیل آپ کے سامنے کئی دفعہ آ چکی کہ انبیاء علیہم السلام سے جو لغزش ہوتی ہے یا خلافِ اَولیٰ کا اِرتکاب ہوتا ہے، اس کو قرآنِ کریم میں ''ذنب'' کے لفظ کے ساتھ اللہ تعالیٰ تعبیر فرما دیتے ہیں، وہ باتیں ان کی اپنی شان کے لائق ہوتی ہیں، کوئی کسی قسم کی لغزش، خلافِ اَولیٰ کا اِرتکاب، اللہ تعالیٰ اگلی پچھلی سب معاف کر دے، اور یہ معافی ظاہر کس طرح سے ہوئی فتح کے نتیجے میں؟ کہ جس وقت صلح ہو گئی اب اسلام پھیلے گا، جتنا اسلام پھیلے گا اتنا ہی آپ کے درجات بڑھیں گے، نیکی کی اشاعت ہونے کے ساتھ ساتھ آپ کے اعمال میں اضافہ ہو گا، اور یہی چیز اللہ تعالیٰ کی طرف سے مزید عنایات کے حاصل ہونے کا ذریعہ بنے گی، جس کے نتیجے میں یہ اعلان کر دیا جائے گا کہ آپ پر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں، اگلی پچھلی سب غلطیاں معاف اگر بالفرض ہوئی ہیں، یا جو آپ کی شان کے لائق لغزشیں ہوئیں ہم نے سب

معاف کردیں، یہ بھی ایک بہت بڑا احسان تھا جو اللہ تبارک وتعالیٰ نے حضور ﷺ کے اوپر کیا، چنانچہ محشر میں جس وقت لوگ حساب وکتاب شروع کروانے کے لئے پریشان ہوں گے، حدیثِ شفاعت بہت لمبی حدیث ہے، تو لوگ مختلف انبیاء کے پاس جائیں گے کہ ہماری سفارش کردو، تو ہر نبی اپنی کسی نہ کسی کوتاہی کو یاد کرکے اللہ تعالیٰ کے سامنے جانے سے ڈرے گا، حدیث شریف میں تفصیل جس طرح سے آتی ہے، لمبی لمبی روایتیں ہیں، حضرت آدم علیہ السلام جرأت نہیں کریں گے، نوح علیہ السلام جرأت نہیں کریں گے، حضرت ابراہیم علیہ السلام عذر کردیں گے، موسیٰ علیہ السلام عذر کردیں گے، عیسیٰ علیہ السلام عذر کردیں گے، اور آخر عیسیٰ علیہ السلام لوگوں سے یہ کہیں گے کہ انہی کے پاس جاؤ جن کے متعلق اللہ نے معافی کا اعلان کردیا ہے کہ ان کی اگلی پچھلی سب غلطیاں معاف ہیں، اس لیے ان کے لئے کوئی خوف خطرہ نہیں ہے، وہی تمہارے سفارش کریں گے، چنانچہ حضور ﷺ کے سامنے جس وقت لوگ جائیں گے تو آپ فرمائیں گے: ''اَنَا لَھَا! اَنَا لَھَا!'' ہاں میں اِس کے لائق ہوں اور میں سفارش کروں گا، تو اِس کا شرف قیامت کے میدان میں جا کے تمام انبیاء علیہم السلام کے مقابلے میں ظاہر ہوگا۔ حضور ﷺ نے اپنے لیے اس کو بھی بہت بڑی نعمت سمجھا، جو اِس روایت سے نمایاں ہے کہ آپ رات کو بہت دیر تک عبادت کیا کرتے تھے، جس کے نتیجے میں آپ کے پاؤں پر ورم بھی ہوجاتا تھا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ایک دفعہ عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ اتنی مشقت کیوں اُٹھاتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے تو آپ کی اگلی پچھلی غلطیاں سب معاف کردیں، اب آپ کو اتنی مشقت اُٹھانے کی کیا ضرورت ہے؟ تو سرورِ کائنات ﷺ نے جواب دیا تھا: ''اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا''(۱) کہ کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ ان لفظوں سے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ عبادت صرف گناہ بخشوانے کے لئے نہیں ہوا کرتی، اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی شکر گزاری کے طور پر بھی عبادت کی جاتی ہے، تو جب اللہ نے میرے اُوپر احسان اتنا بڑا کیا ہے کہ مجھے معافی کا پروانہ دے دیا، کہ آپ کی کسی غلطی کے اُوپر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی، چاہے پہلے ہوچکی، چاہے بعد میں ہو، تو مجھے شکر گزار بندہ بننے کے لئے عبادت زیادہ کرنے کی ضرورت ہے، یعنی صحابہ رضی اللہ عنہم سمجھے تھے کہ مغفرت کا اعلان ہوجانے کے بعد عبادت میں کمی آجانی چاہیے، حضور ﷺ نے یہ ظاہر کیا کہ نہیں! مغفرت کا اعلان ایک بہت بڑی نعمت ہے، جس کی شکر گزاری کے طور پر مجھے عبادت زیادہ کرنی چاہیے، تو اِس نعمت کی شکر گزاری کے طور پر فرمایا کہ میں عبادت کرتا ہوں ''اَفَلَا اَکُوْنُ عَبْدًا شَکُوْرًا؟'' کیا میں اللہ کا شکر گزار بندہ نہ بنوں؟ تو یہ مغفرت کا اعلان تو اس طرح سے ہوگیا کہ آپ کے ذریعے سے نیکی پھیلے گی، اور یہ نیکی آپ کے لئے مغفرت کا ذریعہ بن جائے گی...... اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ پر اِحسانِ تام ہوگا، اِحسانِ تام وہ بھی درجات کی بلندی اسی طرح سے اسلام کی اشاعت کے ساتھ، جو آپ کا مقصد ہے اس میں اللہ تعالیٰ آپ کو کامیابی دے گا...... صراطِ مستقیم پر آپ کو چلائے گا، اس کا بھی یہ معنی ہے کہ پہلے آپ ﷺ دین کے مطابق چلنا چاہتے تھے، آپ کے راستے میں مختلف رُکاوٹیں ہیں، لیکن یہ صلح آپ کا راستہ صاف کردے گی، اللہ تعالیٰ آپ کو صراطِ مستقیم پر نہایت آسانی کے ساتھ اور کامیابی کے ساتھ چلائے گا، کوئی مزاحمت اور کوئی رُکاوٹ نہیں ہوگی...... اور اسی صلح کے نتیجے میں آپ کو ایسا غلبہ نصیب ہوگا کہ جس میں عزت ہی عزت ہے، اللہ تعالیٰ آپ کی مدد کرے گا...... تو یہ چار چیزیں اس کے نتیجے کے طور پر ذکر کردی گئیں۔

(۱) بخاری ۱/۱۵۲ باب قیام النبی اللیل۔ مشکوٰۃ ۱/۱۰۹ باب التحریض علی قیام اللیل فصل اول۔

''صلح حدیبیہ'' اہلِ ایمان کے لئے باعثِ عزّت اور اہلِ کُفر کے لئے باعثِ ذِلّت

هُوَالَّذِیْٓ اَنْزَلَ السَّكِیْنَةَ: اب یہ دوسرا واقعہ آ گیا، اللہ وہ ہے جس نے سکون اور اطمینان اُتارا مؤمنین کے قلوب میں، ان پر بھی انعام کرنا مقصود تھا اِس اِنزالِ سکینہ کے ساتھ، لِیَزْدَادُوْٓا اِیْمَانًا مَّعَ اِیْمَانِهِمْ: تا کہ بڑھ جائیں یہ لوگ اپنے ایمان کے ساتھ اور ایمان میں، تا کہ زیادہ ہو جائیں وہ از روئے ایمان کے اپنے ایمان کے ساتھ، یعنی پہلے بھی ان کو ایمان حاصل ہے اور اس اِنزالِ سکینہ کے نتیجے میں جو ان سے طاعت نمایاں ہوگی فرماں برداری نمایاں ہوگی تو اس میں ان کے نُورِ ایمان میں اضافہ ہوگا، اللہ تعالیٰ ان کا ایمان بڑھانا چاہتا ہے، چونکہ طاعت جتنی کی جائے گی اتنا نُورِ ایمان میں اضافہ ہوتا ہے، ''اللہ ہی کے لئے لشکر ہیں آسمانوں کے اور زمین کے، اللہ تعالیٰ علم والا ہے حکمت والا ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے لشکروں کے ذریعے سے سب کچھ کر سکتا تھا، لیکن مسلمانوں کو اس قسم کے مقامِ اِبتلا میں ڈال کر اللہ تعالیٰ ان کے ایمان میں اضافہ کرنا چاہتا ہے۔ اور اس اِزدیادِ ایمان کا نتیجہ یہ ہوگا لِیُدْخِلَ الْمُؤْمِنِیْنَ: تا کہ یہ بڑھ جائیں از روئے ایمان کے، تا کہ داخل کرے اللہ تعالیٰ مؤمن مردوں کو اور مؤمن عورتوں کو ایسے باغات میں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے یہ اس میں، اور دُور ہٹائے اللہ تعالیٰ ان سے ان کے گناہ، وَكَانَ ذٰلِكَ عِنْدَ اللّٰهِ فَوْزًا عَظِیْمًا: اور اللہ کے نزدیک یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اِنزالِ سکینہ کر کے مؤمنین کو بھی فوزِ عظیم عطا کر دی، اِنزالِ سکینہ کے نتیجہ میں یہ فرماں بردار ثابت ہوئے، اور اس فرماں برداری کے نتیجے میں ان کا ایمان بڑھا، اور ایمان بڑھنے کے نتیجے میں ان کو جنّت کا داخلہ نصیب ہوگا، اور ان کے گناہ معاف ہوں گے، اور اِن درجات کا حاصل ہو جانا اللہ تعالیٰ کے نزدیک فوزِ عظیم ہے، گویا کہ یہ صلح نامہ آپ کے لئے بھی فتحِ مبین اور اِن اِنعامات کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے، اور مؤمنین کے لئے بھی یہ فتحِ مبین ہے اور ان کو بھی اس قسم کے انعامات اس صلح نامے کے نتیجے میں حاصل ہوں گے۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ منافقین اور کُفّار عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے، وہ اس سکینہ سے محروم ہیں، ان کو طاعت کی توفیق نہیں ہوئی، تو گویا کہ اِنزالِ سکینہ مؤمنین کے لئے اِس کا باعث بنا، اور مسلمانوں پہ سکینہ کا اُترنا اور کُفّار پر نہ اُترنا وہ اگلی باتوں کا ذریعہ بنا، ''اور تا کہ اللہ تعالیٰ عذاب دے منافق مَردوں اور منافق عورتوں کو، مشرک مَردوں کو اور مشرک عورتوں کو، جو کہ اللہ کے متعلق بُرے بُرے گمان رکھنے والے ہیں'' جو اللہ کے متعلق حسنِ ظن نہیں رکھتے، منافقین بھی حسنِ ظن نہیں رکھتے تھے جس طرح سے آپ کے سامنے واقعات میں آیا، کہ وہ سمجھے تھے کہ مسلمان جو جا رہے ہیں تو پٹ پٹا کے آئیں گے، پتا نہیں اِن کو واپس آنا نصیب بھی ہوگا یا نہیں، اگلے رُکوع میں سارے واقعے کی تفصیل آ رہی ہے، مشرک ہوں یا منافق جو اللہ تعالیٰ کے متعلق اچھا خیال نہیں رکھتے اِس صلح نامے کے نتیجے میں وہ دُنیا اور آخرت کے عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے، مؤمنین کے لئے یہ صلح نامہ دُنیا اور آخرت کی کامیابی کا ذریعہ ہے، اور منافق اور مشرکوں کے لئے یہی صلح نامہ دُنیا اور آخرت میں ذِلّت کا باعث بن جائے گا، ''جو اللہ تعالیٰ کے متعلق بُرے گمان رکھنے والے ہیں'' عَلَیْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ: ان کے اُوپر بُری گردش واقع ہونے والی ہے، اللہ اِن کے اُوپر ناراض ہو گیا، اللہ نے ان پہ لعنت کی، اور ان کے لئے جہنّم تیار کی، اور وہ بہت بُرا ٹھکانا ہے'' یہ فریقِ مخالف کی ذِلّت کا تذکرہ آ گیا۔ ''اور اللہ ہی کے لئے لشکر ہیں آسمانوں کے اور

زمین کے، اللہ تعالیٰ زبردست ہے حکمت والا ہے'' یعنی اللہ تعالیٰ لشکروں کے مالک ہیں، لیکن حکمت والے ہیں، غلبے والے ہیں، جب چاہیں مسلمانوں کو غلبہ دیں گے، لیکن جو حالات سامنے آرہے ہیں یہ سب اس کی حکمت کے تحت آرہے ہیں۔

حضور ﷺ کی صفاتِ عالیہ کا تذکرہ

آگے سرورِ کائنات ﷺ کی منقبت نمایاں کی جارہی ہے تاکہ مزید اطاعت کی ترغیب ہو، اِنَّاۤ اَرْسَلْنٰكَ شَاهِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا: بے شک ہم نے آپ کو بھیجا شاہد بنا کر، مبشر بنا کر، نذیر بنا کر۔ شاہد کہتے ہیں گواہ کو، اس کا یہ معنی بھی ہے کہ قیامت کے دن آپ اُمت کے لئے گواہ کے طور پر پیش ہوں گے، جیسے تفصیل آپ کے سامنے ذکر کی گئی کہ تمام انبیاء ﷺ اپنی اُمت پر شہید ہونے کے طور پر لائے جائیں گے وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰۤؤُلَآءِ شَهِيْدًا (سورۂ نساء: ۴۱) اللہ تعالیٰ آپ کو بھی اِن کے مقابلے میں گواہ بنا کر لائے گا، تو شاہد سے مراد یہ گواہ بھی ہوسکتا ہے جو قیامت کے دِن آپ کی حیثیت نمایاں ہوگی۔ اور شاہد کا معنی یوں بھی ہے جس طرح سے بعض تفسیروں میں نقل کیا گیا، خاص طور پر شاہ ولی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی طرف اس کو منسوب کیا گیا ہے، کہ آپ اللہ کی طرف سے اللہ کے اَحکام بیان کرنے کے لئے گواہ ہیں، گواہی دیتے ہیں کہ یہ کام اللہ کو پسند ہے، یہ کام اللہ کو پسند نہیں، یعنی اَحکام بتلانے والا، شاہد کا یہ مفہوم بھی ہے، آپ ﷺ اللہ کی طرف سے گواہ ہیں مخلوق کے سامنے، آپ ﷺ کی شہادت کے ساتھ ہی اچھائی اور بُرائی ثابت ہوتی ہے، جس کے متعلق آپ ﷺ یہ کہہ دیں کہ یہ بُری چیز ہے، وہ بُری ہے، جس کے متعلق آپ ﷺ کہہ دیں یہ اچھی چیز ہے، وہ اچھی ہے، تو اللہ کی طرف سے جو اَحکام ظاہر کیے جارہے ہیں اُن کے لئے آپ شاہد ہیں...... اور ماننے والوں کو بشارت سنانے والے ہیں، نہ ماننے والوں کو ڈرانے والے ہیں...... اور ہم نے آپ ﷺ کو یہ مقام دیا (آگے مؤمنین کو خطاب ہے) تاکہ تم لوگ اللہ پہ ایمان لاؤ اور اس کے رسول پہ ایمان لاؤ، وَتُعَزِّرُوْهُ: تاکہ اس کی مدد کرو، وَتُوَقِّرُوْهُ: تاکہ اس تعظیم کرو، وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا: تاکہ اس کی صبح شام تسبیح بیان کرو۔ تُسَبِّحُوْهُ میں مفعول کی ضمیر بالاتفاق اللہ کی طرف لوٹتی ہے، کیونکہ تسبیح اللہ کی ہے، کسی دوسرے کی تسبیح نہیں پڑھی جاتی، باقی تُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ کی ضمیریں کدھر لوٹ رہی ہیں اس میں مفسرین کی دونوں رائے ہیں، تعزیر کا معنی ہوتا ہے مدد کرنا، یہ بھی ہوسکتا ہے کہ'' تاکہ تم اللہ کی مدد کرو'' یعنی اللہ کے دِین کی، اللہ کے رسول کی، تُوَقِّرُوْهُ: توقیر: تعظیم کو کہتے ہیں، تاکہ تم اللہ کی تعظیم کرو، اس کی عظمت محسوس کرو، توقیر وَقار سے لیا گیا ہے، سورۂ نوح کے اندر جس طرح سے لفظ آتا ہے مَا لَكُمْ لَا تَرْجُوْنَ لِلّٰهِ وَقَارًا، تو اللہ کی توقیر یہی ہے کہ اللہ کی تعظیم کرو، اللہ کی عظمت کا عقیدہ رکھو، وہ عظیم ہے۔ اور بعضوں نے یہ ضمیر حضور ﷺ کی طرف لوٹائی ہے کہ'' تاکہ تم اس رسول کی مدد کرو، اور تاکہ تم اُس رسول کی تعظیم کرو'' تو اس میں دونوں احتمال ہیں، لیکن رَسُوْلِهٖ کی طرف ضمیر لوٹانے سے ضمائر میں انتشار آتا ہے، جو کسی درجے میں فصاحت بلاغت کے خلاف ہے، کہ رَسُوْلِهٖ کی ضمیر بھی اللہ کی طرف لوٹی، تُسَبِّحُوْهُ کی ضمیر بھی اللہ کی طرف لوٹی، اور درمیان میں تُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ یہ ضمیریں کسی اور کی طرف لوٹا دی جائیں، اس کو انتشارِ ضمائر کہا جاتا ہے، اور اگر یہ سب ضمیریں اللہ کی طرف ہی لوٹائی جائیں تو پھر یہ اتحادِ ضمائر ہے، پھر اس میں کوئی انتشار نہیں ہے،'' تاکہ تم اللہ کے رسول پہ ایمان لاؤ، تاکہ تم اللہ کی مدد کرو'' یعنی اللہ کے دِین کی مدد کرو،'' تاکہ تم

اللہ کی تعظیم کرو، تاکہ صبح شام تم اللہ کی تسبیح پڑھو۔'' اور ضمیریں دوسری طرف لوٹ جائیں تو بھی اس میں کوئی ایسا اشکال نہیں ہے، کہ ''تاکہ تم اللہ کے رسول کی مدد کرو، تاکہ تم اللہ کے رسول کی تعظیم کرو، اور اللہ کی تسبیح پڑھو صبح شام۔''

''بیعت'' کی عظمت

آگے بیعت کرنے والوں کو بیعت کی عظمت بتائی جارہی ہے، تاکہ وہ خوب اچھی طرح سے اس کی پابندی کریں۔ اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ: اس میں کوئی شک نہیں کہ جو لوگ آپ سے بیعت کرتے ہیں وہ اللہ سے بیعت کرتے ہیں، چونکہ آپ قائم مقام ہیں، اور آپ ﷺ کے ہاتھ پر بیعت کرنا حقیقت کے اعتبار سے اللہ کے ساتھ معاہدہ کرنا ہی ہے، یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ: اللہ کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے، یعنی آپ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر معاہدہ کرتے ہیں تو یوں سمجھو کہ اللہ کے ہاتھ میں ہاتھ دے کر یہ معاہدہ کررہے ہیں، چونکہ آپ ہیں اللہ کے رسول، اللہ کے بھیجے ہوئے ہیں، تو آپ کے ساتھ جو معاہدہ ہے وہ اللہ کے ساتھ بھی معاہدہ ہے، باقی ''ید'' کی نسبت اللہ کی طرف آگئی، یہ بارہا آپ کے سامنے ذکر کیا جاچکا، یہ متشابہات میں سے ہے، اس کی تفصیل یا اس کی تمثیل نہیں کی جاسکتی، جیسے اللہ کی شان کے لائق ہے، یہاں تو یہی ذکر کرنا مقصود ہے کہ آپ ﷺ کے ہاتھ پر معاہدہ کرنا یہ اللہ کے ساتھ معاہدہ ہوگیا، فَمَنْ نَّكَثَ: جو اس معاہدے کو توڑ دے گا، فَاِنَّمَا یَنْكُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ: سوائے اس کے کچھ نہیں کہ وہ توڑے گا اپنے ہی نفس کے خلاف، یعنی اس کا وبال اسی پہ پڑے گا، وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ: اور جو پورا کرے گا اس چیز کو جس کے اوپر اُس نے اللہ سے معاہدہ کیا ہے، فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا: تو عنقریب اللہ تعالیٰ اس کو اَجرِ عظیم دیں گے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

سَیَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ شَغَلَتْنَآ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا

عنقریب کہیں گے آپ سے وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے بدویوں میں سے کہ مشغول کیا ہمیں ہمارے اموال نے اور ہمارے اہل نے

فَاسْتَغْفِرْ لَنَا ۚ یَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَیْسَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ ؕ قُلْ فَمَنْ یَّمْلِكُ

پس آپ ہمارے لئے استغفار کیجئے، کہیں گے وہ اپنی زبانوں کے ساتھ ایسی بات جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، آپ کہہ دیجئے کہ کون اختیار رکھتا ہے

لَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ شَیْـًٔا اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا اَوْ اَرَادَ بِكُمْ نَفْعًا ؕ بَلْ كَانَ اللّٰهُ بِمَا

تمہارے لئے اللہ کی طرف سے کسی شیٔ کا، اگر اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق نقصان پہنچانے کا ارادہ کرلے یا تمہیں نفع پہنچانے کا ارادہ کرلے؟ بلکہ اللہ تعالیٰ

تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا ⑪ بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ یَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰٓی اَهْلِیْهِمْ

تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ⑪ بلکہ تم نے سمجھ لیا تھا کہ ہرگز نہیں لوٹ کے آئیں گے رسول اور مؤمن اپنے گھر والوں کی طرف

أَبَدًا وَّزُيِّنَ ذٰلِكَ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ ۖ وَكُنْتُمْ قَوْمًا بُوْرًا ﴿۱۲﴾ وَمَنْ

کبھی بھی اور یہ بات تمہارے دلوں میں مزین کر دی گئی، اور تم نے بُرا گمان کیا، اور تم برباد ہونے والے لوگ ہو ﴿۱۲﴾ اور جو

لَّمْ يُؤْمِنْ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَإِنَّآ أَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا ﴿۱۳﴾ وَلِلّٰهِ مُلْكُ

ایمان نہیں لائے گا اللہ پر اور اس کے رسول پر پس تیار کی ہم نے کافروں کے لئے بھڑکنے والی آگ ﴿۱۳﴾ اللہ ہی کے لئے ہے ملک

السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا

آسمانوں کا اور زمین کا، بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے، عذاب دیتا ہے جس کو چاہتا ہے، اللہ تعالیٰ بخشنے والا

رَّحِيْمًا ﴿۱۴﴾ سَيَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ إِذَا انْطَلَقْتُمْ إِلٰى مَغَانِمَ لِتَأْخُذُوْهَا

رحم کرنے والا ہے ﴿۱۴﴾ یہ پیچھے رہے ہوئے لوگ عنقریب کہیں گے جس وقت تم چلنے لگو گے غنیمتوں کی طرف تا کہ تم انہیں حاصل کرلو

ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ ۚ يُرِيْدُوْنَ أَنْ يُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ ۚ قُلْ لَّنْ تَتَّبِعُوْنَا

کہ ہمیں چھوڑو کہ ہم تمہاری اتباع کریں، یہ لوگ ارادہ کریں گے کہ اللہ کی بات کو بدل دیں، آپ انہیں کہہ دیجئے تم ہرگز ہماری اتباع نہیں کرو گے،

كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ ۚ فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا ۚ بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ إِلَّا

ایسے ہی فرما دیا اللہ تعالیٰ نے اس سے قبل، پھر وہ لوگ کہیں گے (کہ اللہ نے تو منع نہیں کیا) بلکہ تم ہم پہ حسد کرتے ہو، بلکہ نہیں سمجھتے یہ مگر

قَلِيْلًا ﴿۱۵﴾ قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْأَعْرَابِ سَتُدْعَوْنَ إِلٰى قَوْمٍ أُولِيْ بَأْسٍ شَدِيْدٍ

بہت کم ﴿۱۵﴾ کہہ دیجئے ان پیچھے رہنے والے بدویوں سے عنقریب تم بلائے جاؤ گے ایسے لوگوں کی طرف جو سخت لڑائی والے ہیں،

تُقَاتِلُوْنَهُمْ أَوْ يُسْلِمُوْنَ ۚ فَإِنْ تُطِيْعُوْا يُؤْتِكُمُ اللّٰهُ أَجْرًا حَسَنًا ۚ وَإِنْ تَتَوَلَّوْا

تم لڑتے رہو گے ان سے یا وہ فرماں بردار ہو جائیں، پھر اگر تم نے اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں اجر حسن دے گا، اور اگر تم نے پیٹھ پھیری

كَمَا تَوَلَّيْتُمْ مِّنْ قَبْلُ يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا ﴿۱۶﴾ لَيْسَ عَلَى الْأَعْمٰى حَرَجٌ وَّلَا

جیسے تم نے پیٹھ پھیری اس سے قبل تو عذاب دے گا تمہیں دردناک عذاب ﴿۱۶﴾ نہیں ہے اندھے پر کوئی حرج اور نہ

عَلَى الْأَعْرَجِ حَرَجٌ وَّلَا عَلَى الْمَرِيْضِ حَرَجٌ ۗ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ

لنگڑے پر کوئی حرج اور نہ بیمار پر کوئی حرج، اور جو کوئی اطاعت کرے اللہ اور اس کے رسول کی تو داخل کرے گا اللہ اس کو

جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ وَمَنْ يَّتَوَلَّ يُعَذِّبْهُ عَذَابًا اَلِيْمًا ۧ

ایسے باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، اور جو کوئی پیٹھ پھیرے گا تو اللہ تعالیٰ اُسے دردناک عذاب دے گا⑰

تفسیر

دیہاتیوں کی بدگمانی اور حیلہ بازی

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ واقعات کے سلسلے میں یہ بات آپ کی خدمت میں عرض کردی گئی تھی کہ مدینہ منورہ سے روانگی کے وقت حضور ﷺ نے اَعراب کو بھی پیغام بھجوایا تھا ساتھ جانے کے لئے، لیکن وہ ساتھ نہیں چلے، اُن کے دل میں خیال یہ تھا کہ یہ لوگ مکہ معظمہ جو جارہے ہیں تو یہ بچ کے نہیں آسکتے، مکہ معظمہ سے جب حضور ﷺ کی واپسی ہوئی تو راستے میں یہ سورت اُتری تھی، تو اللہ تبارک وتعالیٰ نے یہ واضح کردیا کہ اب وہ بدوی آئیں گے اور آکے آپ کے سامنے یوں جھوٹے عذر بنائیں گے، جو وہ زبان سے کہیں گے واقعہ وہ نہیں ہے، حقیقت یہ ہے کہ اُن کے دِلوں میں یہ بدگمانی تھی، سَيَقُوْلُ لَكَ الْمُخَلَّفُوْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ: عنقریب کہیں گے آپ سے وہ لوگ جو پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے بدویوں میں سے، جو بدوی پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے عنقریب وہ لوگ کہیں گے، شَغَلَتْنَاۤ اَمْوَالُنَا وَاَهْلُوْنَا: مشغول کیا ہمیں ہمارے اموال نے اور ہمارے اہل نے، یعنی ہمارے اہل وعیال نے اور ہمارے اموال نے ہمیں فرصت نہیں دی کہ ہم آپ کے ساتھ چلتے، ہم اُنہی میں مشغول رہ گئے، کام کاج سے فرصت نہیں ملی، فَاسْتَغْفِرْ لَنَا: پس آپ ہمارے لیے استغفار کیجئے اللہ تعالیٰ سے، یہ ہم سے جو کوتاہی ہوگئی کہ اپنے مال واولاد میں ہم مشغول رہ گئے اور آپ کے ساتھ نہ چل سکے اِس کوتاہی کی اللہ تعالیٰ سے آپ ہمارے لیے معافی طلب کریں، يَقُوْلُوْنَ بِاَلْسِنَتِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ: کہیں گے وہ اپنی زبانوں کے ساتھ ایسی بات جو ان کے دلوں میں نہیں ہے، یعنی وہ زبان سے کہتے ہیں کہ اہل ومال سے فرصت نہیں ملی، ان کے دل میں یہ بات نہیں، دل میں وہ بات ہے جو آگے ذکر کی جارہی ہے، قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ: آپ کہہ دیجئے کہ کون اختیار رکھتا ہے تمہارے لیے اللہ کی طرف سے کسی شی کا، اِنْ اَرَادَ بِكُمْ ضَرًّا: اگر اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق نقصان پہنچانے کا ارادہ کرلے یا تمہیں نفع پہنچانے کا ارادہ کرلے، کون اختیار رکھتا ہے؟ انہیں کہہ دینا، کہ تم یہ جو اپنی طرف سے غلط تجویزیں کررہے ہو نقصان سے بچنے کے لئے، اور اپنے خیال کے مطابق نفع حاصل کرنے کے لئے، یہ تمہاری کوششیں بے سود ہیں، وہی ہوتا ہے جو اللہ تعالیٰ کا ارادہ ہوتا ہے، اللہ تمہیں کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو تمہاری یہ تدبیریں تمہیں بچانہیں سکتیں، جس طرح سے اللہ اگر تمہیں کوئی فائدہ پہنچانا چاہے تو کوئی اُس سے روک نہیں سکتا، تو اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اعتماد کرنا چاہیے، سارا اختیار اللہ کے لئے ہے۔

بدیوں کی حیلہ بازیوں پر سزا

اور تم یہ سمجھتے ہو کہ تمہارے حال کا ہمیں پتا نہیں چلا، ہمیں پتا چل گیا ہے اللہ کے بتانے کے ساتھ، تمہارا حال مخفی نہیں بَلْ

كَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا: بلکہ اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے، بل کا یہاں معنی یہی ہے کہ تم چھپنے کی کوشش کرتے ہو، اپنے احوال کو چھپانے کی کوشش کرتے ہو، اور یہ چاہتے ہو کہ کسی کو پتا نہ چلے، تمہارا خیال بھی یہی ہے کہ تمہارا حال مخفی ہے، مخفی نہیں، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں سے باخبر ہے جو کچھ تم کرتے ہو، اور اس کے خبر دینے سے ہمیں بھی پتا چل گیا۔ بات یہ نہیں ہے جو تم کہتے ہو کہ ہمیں اپنے اہل و مال سے فرصت نہیں ملی، بَلْ ظَنَنْتُمْ اَنْ لَّنْ يَّنْقَلِبَ الرَّسُوْلُ وَالْمُؤْمِنُوْنَ اِلٰۤى اَهْلِيْهِمْ اَبَدًا: بلکہ تم نے سمجھ لیا تھا کہ ہرگز نہیں لوٹ کے آئیں گے رسول اور مؤمن اپنے گھر والوں کی طرف کبھی بھی، تمہارے دل میں یہ خیال تھا کہ اب یہ جو جا رہے ہیں مکہ معظمہ سے بچ کے نہیں آئیں گے، اور تمہیں اپنی جان عزیز تھی اس لیے تم ساتھ نہیں گئے، یہ بات نہیں کہ فرصت نہیں تھی، بَلْ ظَنَنْتُمْ: بلکہ تم نے گمان کیا، 'بل'' کا معنی یہ ہے کہ وجہ وہ نہیں جو تم نے بیان کی، کہ ہمیں کام کاج سے فرصت نہیں ملی، ''بلکہ تمہارا خیال تھا کہ ہرگز نہیں لوٹ کے آئیں گے رسول اور مؤمن اپنے گھر والوں کی طرف کبھی بھی اور یہ بات تمہارے دلوں میں مزین کردی گئی'' تمہیں یہ بات اچھی لگی، وَظَنَنْتُمْ ظَنَّ السَّوْءِ: اور تم نے بُرا گمان کیا، بُرے گمان کے اندر تم مبتلا ہو گئے، وَكُنْتُمْ قَوْمًۢا بُوْرًا: بُوْرًا بائر کی جمع، بارَ يَبُوْرُ: ہلاک ہونا، اور تم برباد ہونے والے لوگ ہو، اس قسم کی بدگمانیوں کے اندر مبتلا ہو کر تم کتنی سعادتوں سے محروم رہ گئے، تم نے اپنے آپ کو برباد کرلیا، تم برباد ہونے والے لوگ ہو۔

''اَعراب'' کو تنبیہ

وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: اس آیت کا موقع محل یہ ہوا کہ اب بھی تم اپنے ایمان کو صحیح کرلو، موقع ہے، کیونکہ جو شخص اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان نہیں لاتا، فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا: تو ایسے کافروں کے لئے ہم نے بھڑکنے والی آگ تیار کر رکھی ہے، سعیر: جوش مارنے والی آگ، ''جو ایمان نہیں لائے گا اللہ پر اور اس کے رسول پر پس تیار کی ہم نے کافروں کے لئے بھڑکنے والی آگ'' مطلب یہ ہے کہ اب بھی موقع ہے، ایمان لے آؤ، اور اگر ایمان تمہارا صحیح نہ ہوا تو جہنم کے لئے تیار رہو، ''اللہ ہی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی۔'' وَمَنْ لَّمْ يُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ سَعِيْرًا: جو کوئی شخص اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان نہ لائے پس بے شک ہم نے تیار کیا کافروں کے لئے بھڑکنے والی آگ کو، فَاِنَّاۤ اَعْتَدْنَا یہ دال ہے جزاء پر، جو شخص ایمان نہ لائے اللہ اور اس کے رسول پر وہ کافر ہے، اور ہم نے کافروں کے لئے جوش مارنے والی آگ تیار کی ہے۔ اس میں اُن اَعراب کو کہا جا رہا ہے کہ ایمان اب بھی اپنا دُرست کرلو، موقع ہے، اور اگر ایمان کو دُرست نہیں کرو گے تو پھر جہنم کے لئے تیار رہو۔ اور اللہ تعالیٰ تمہیں سزا دینا چاہے تو کوئی روک نہیں سکتا، تم اس سزا سے بچ نہیں سکتے، کہ سلطنت زمین کی اور آسمان کی اللہ ہی کے لئے ہے؛ ''اللہ ہی کے لئے ہے ملک آسمانوں کا اور زمین کا'' مُلک سے سلطنت مراد ہے۔

''مغفرت وتعذیب'' کے موقع پر ''مشیت'' کو ذِکر کرنے کا مقصد

''بخشتا ہے جس کو چاہتا ہے، عذاب دیتا ہے جس کو چاہتا ہے'' ''جس کو چاہتا ہے'' مطلب اس کا یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے سامنے کوئی رُکاوٹ نہیں پیدا کرسکتا، جو اللہ چاہے گا وہی ہوگا، اگر کسی کو اللہ سزا دینا چاہے تو اس کو کوئی روک نہیں سکتا،

اللہ تعالیٰ کسی کو بخشنا چاہے تو اس کو کوئی روک نہیں سکتا، یہ مطلب نہیں ہوتا کہ اللہ کے سزا دینے یا اللہ کے بخشنے کا کوئی ضابطہ اور قانون ہی نہیں، کہ جس کو چاہے بخش دے جس کو چاہے عذاب دے دے، بخشے گا اسی کو جس نے بخشش والے کام کیے ہوں گے، جس کے پاس ایمان ہوگا، عذاب اسی کو دے گا جس نے بُرے کام کیے ہوں گے، جو ایمان سے محروم ہوگا، قاعدہ اور ضابطہ یہی ہے جو اللہ نے اپنی حکمت کے تحت متعین کیا ہے، تو مَنْ یَّشَآءُ کا مطلب یہ ہے کہ جس کو چاہے گا ایسا کرلے گا، کوئی رُکاوٹ ڈالنے والا نہیں اللہ کی مرضی کے سامنے، تو اِس سے وہ بات نہیں معلوم ہوتی ظاہری لفظوں میں جس طرف ذہن جاتا ہے کہ اللہ کے بخشنے اور اللہ کے عذاب دینے کا قاعدہ ہی کوئی نہیں، جس کو چاہے گا جہنم میں ڈال دے، جس کو چاہے گا جنت میں ڈال دے، نہیں! جنت میں کن کو ڈالے گا؟ وہ بھی اللہ نے بتادیا، اپنا قاعدہ متعین کرکے، فیصلہ اسی کے مطابق ہوگا، جہنم میں کن کو ڈالے گا؟ وہ بھی بتادیا، تو یہ کہنا کہ ''جس کو چاہے عذاب دے، جس کو چاہے بخش دے'' اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مشیت کے سامنے کوئی رُکاوٹ نہیں ڈال سکتا، جو بھی اللہ کی مشیت ہوگی اس کے مطابق کام ہوگا، باقی! اللہ چاہے گا کس کے متعلق؟ وہ تفصیل اس نے اپنی کتاب میں ذکر کردی کہ ایسے لوگوں کو عذاب دینا چاہے گا تو کوئی بچانے والا نہیں، اور ایسے لوگوں کو بخشنا چاہے گا تو کوئی رُکاوٹ ڈالنے والا نہیں، ''اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے''، غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ذکر کرکے یہاں ترغیب دی ہے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرنے کی، اور اللہ تعالیٰ کی رحمت حاصل کرنے کی، جس کا طریقہ صحیح طور پر ایمان لانا ہے۔

''شرکائے حدیبیہ'' کے لئے ایک خاص اِنعامِ خداوندی

سَیَقُوْلُ الْمُخَلَّفُوْنَ: عنقریب کہیں گے یہ پیچھے رہے ہوئے لوگ، مخلفون: جو پیچھے رہے ہوئے ہیں، ''یہ پیچھے رہے ہوئے لوگ عنقریب کہیں گے جب تم چلو گے غنیمتوں کی طرف تا کہ تم ان کو حاصل کرلو'' جب خیبر پر حملہ کرنے کے لئے چلنے لگو گے تو یہ بدوی کہیں گے کہ ہمیں ساتھ چلنے دو، ہم تمہارے ساتھ چلتے ہیں، کیونکہ مشرکینِ مکہ کے ساتھ معاہدہ ہوجانے کے بعد ہر کسی کو یقین آگیا تھا کہ اب یہود بچ نہیں سکتے، اور یہود میں مقابلہ کرنے کی طاقت نہیں ہے، اور وہ علاقے ان کے بڑے شاداب تھے، جب اُدھر حملہ کرنے کا ارادہ کیا گیا تو ہر شخص کے دِل میں یہ خیال آیا کہ یقیناً وہ علاقہ فتح ہوگا اور بہت ساری غنیمتیں حاصل ہوں گی، اس لیے اِس جنگ میں شریک ہونا چاہیے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم کو پہلے اطلاع دے دی تھی کہ یہ اِنعام صرف انہی لوگوں کے لئے ہے جو حدیبیہ کی صلح میں شریک تھے، ''بیعتِ رضوان'' کے اندر شریک تھے، جنہوں نے اللہ کے لئے اِس پُرخطر وقت میں اپنی جان اور مال کی بازی لگائی تھی، یہ اِنعام انہی کے لئے ہے، کسی دوسرے کو اس میں شریک نہیں کرنا، اب اُسی بات کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے کہ ''عنقریب یہ کہیں گے جس وقت تم چلنے لگو گے غنیمتوں کی طرف تا کہ تم انہیں حاصل کرلو''، گویا کہ خیبر کی طرف چلنا غنیمتوں کی طرف چلنا ہے، وہ بالکل سہل اور آسان طریقے سے حاصل ہونے والی غنیمتیں تھیں۔ سَیَقُوْلُ کا مفعول یہ ہے کہ ذَرُوْنَا نَتَّبِعْكُمْ: ہمیں چھوڑو ہم تمہاری اتباع کریں، چھوڑو کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں اجازت دو، ممانعت نہ کرو، ہم بھی تمہارے ساتھ چلتے ہیں، یُرِیْدُوْنَ اَنْ یُّبَدِّلُوْا كَلٰمَ اللّٰهِ: یہ لوگ ارادہ کریں گے کہ اللہ کی بات کو بدل دیں، اللہ نے تو اپنی بات بتادی کہ اب یہ غنیمتیں

صرف انہی کے حصے کی ہیں جو اہلِ حدیبیہ ہیں، اور یہ اصرار کر کے ساتھ جو چلنا چاہتے ہیں تو کیا اللہ کی بات کو بدلنا چاہتے ہیں؟ "ارادہ کرتے ہیں کہ بدل دیں اللہ کی بات کو، آپ انہیں کہہ دیجئے" لَنْ تَتَّبِعُوْنَا: تم ہرگز ہماری اتباع نہیں کرو گے، ہمارے ساتھ نہیں چل سکو گے۔

''حجیتِ حدیث'' پر دلیل

كَذٰلِكُمْ قَالَ اللّٰهُ مِنْ قَبْلُ: اللہ نے یہ بات پہلے ہی کہہ دی، ایسے ہی فرمادیا اللہ تعالیٰ نے اِس سے قبل، یعنی تمہارے اِس سفر کرنے سے قبل اللہ نے ہمیں کہہ دیا ہے کہ تم ہمارے ساتھ نہیں چل سکو گے، اِن غنیمتوں کے اندر تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے بات کہہ دی تھی حضور ﷺ کو ''وحیِ خفی'' کے ذریعے سے، یہ آیت خود دلیل ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ حضور ﷺ کو پہنچایا جاتا ہے چاہے ''وحیِ جلی'' کے ذریعے سے ہو، چاہے ''وحیِ خفی'' کے ذریعے سے ہو، وہ ایک ہی چیز ہے، ورنہ صراحتاً قرآنِ کریم میں یہ بات نہیں آئی کہ اِن کو روک دینا، اور اِن کا اُن غنیمتوں میں حصہ نہیں ہے، اور یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ ''اللہ نے فرمادی تھی یہ بات'' تو معلوم ہوگیا کہ ''وحیِ خفی'' کے ذریعے سے فرمادی تھی، اور سرورِ کائنات ﷺ اپنے اقوال کے ساتھ جو تفسیر کیا کرتے ہیں دین کی، وہ سب من جانب اللہ ہی ہوتی ہے، یہ آیت اس بارے میں صریح دلیل ہے۔

اِنعام کے حق دار جانباز ہوا کرتے ہیں

فَسَيَقُوْلُوْنَ بَلْ تَحْسُدُوْنَنَا: پھر وہ لوگ کہیں گے کہ اللہ نے تو نہیں منع کیا، تم ہم پہ حسد کرتے ہو کہ تم ان غنیمتوں میں ہمیں شریک نہیں کرنا چاہتے، پھر اُن کے دِلوں میں یہ بدگمانی آئے گی، کہ یہ حسد کی بناء پر روکتے ہو، بَلْ كَانُوْا لَا يَفْقَهُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جارہا ہے کہ مسلمانوں کے دِلوں میں کوئی حسد نہیں، بلکہ یہی لوگ بے سمجھ ہیں، نہیں سمجھ رکھتے مگر بہت تھوڑی، نہیں سمجھتے یہ مگر بہت کم، ان کو خود خیال کرنا چاہیے کہ جنہوں نے جانبازی اس موقع پر دکھائی اور اِس خطرے میں اپنے آپ کو ڈالا، اِنعام کے مستحق وہی ہیں، جو اپنے آپ کو بچا کر بیٹھے رہے، جنہوں نے اپنی جان اور مال کو عزیز جانا، وہ اِنعام سے محروم رہیں گے، اس میں حسد کی کون سی بات ہے؟ ہر کسی کے ساتھ معاملہ اس کے حال کے مطابق کیا جارہا ہے، جانبازوں کے لئے اِنعام ہے، اور اپنی جان اور اپنے مال کو بچانے کی جو کوشش کرنے والے ہیں وہ اِنعامات سے محروم ہیں، ''بلکہ نہیں سمجھتے یہ مگر بہت کم'' بہت کم سمجھ ہے اِن کو، اکثر باتیں اِن کی سمجھ میں نہیں آتیں اور بدگمانی دُوسروں پہ کرتے ہیں۔

پیچھے رہ جانے والے آئندہ امتحان میں شرکت کے اہل ہیں

قُلْ لِّلْمُخَلَّفِيْنَ مِنَ الْاَعْرَابِ: ان پیچھے رہنے والے بدویوں سے کہہ دو، مِنَ الْاَعْرَابِ یہ وہی المخلفین کا بیان ہوگیا، کہ اب جو تم جوش دکھاتے ہو کہ ہم خیبر پر جاتے ہیں تمہارے ساتھ حملہ کرنے کے لئے، تو انہیں کہہ دو اب تو تم نہیں جاسکتے، باقی! اگر تم مدّعی ہو کہ ہمارا ایمان صحیح ہے، تو آگے مواقع آئیں گے، تمہیں بلایا جائے گا، بڑی زوردار جنگوں کی طرف بلایا جائے گا، اور اگر اُس

وقت پھر تم یہ قربانی دو گے اور جان اور مال کے ساتھ جہاد کرو گے تو اللہ کے ہاں اَجر پالو گے، اگر پھر بھی اسی طرح سے پیچھے ہٹ کر بیٹھے رہے تو پھر اللہ کی طرف سے عذاب پاؤ گے۔

''خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم'' کے برحق ہونے پر قرآنی دلیل

اب یہاں یہ جو بات کہی جارہی ہے کہ تمہیں سخت قوموں کے ساتھ لڑنے کے لئے بُلایا جائے گا، یہ موقع حضور ﷺ کی زندگی میں نہیں آیا، اللہ کی طرف سے جو پیش گوئی کے طور پر بات کہی گئی ہے یہ حضور ﷺ کی زندگی میں موقع نہیں آیا، کیونکہ خیبر کے بعد کوئی ایسی لڑائی نہیں ہوئی جس کو ہم کہہ سکیں کہ بڑی جنگجو قوم کی طرف اَعراب کو بالاہتمام دعوت دی گئی تھی مقابلے کے لئے، غزوۂ خیبر کے بعد حضور ﷺ کو فتحِ مکہ کا غزوہ پیش آیا ہے، اُس میں بھی کوئی خاص مقابلہ نہیں ہوا، اور اس کے بعد حُنین کی جنگ ہوئی تو اس میں بھی معمولی مقابلہ ہوا ہے، بالاہتمام بدویوں کو اکٹھا کر کے ان کے مقابلے میں بھی لے جانے کی کوشش نہیں کی گئی، اور غزوۂ تبوک میں سرے سے لڑائی ہوئی نہیں، تو کوئی ایسا موقع نہیں آیا۔ تو یہ موقع کہ سخت قوم کی طرف، جنگجو قوم کی طرف تمہیں بُلایا جائے گا پھر ہم دیکھیں گے کہ تم کتنا ایمان کا ثبوت دیتے ہو؟ یہ موقع آیا حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانے میں مسیلمہ کذّاب کی قوم کے ساتھ ٹکراؤ ہوا، پہلا ٹکراؤ یہ بہت سخت ٹکراؤ تھا، بڑی شدید جنگ ہوئی تھی، جس میں بہت صحابہ رضی اللہ عنہم شہید ہوئے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں تو رُوم اور فارس کے ساتھ جنگیں چھڑ گئی تھیں، اور یہی جنگیں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی جاری رہیں۔ تو قرآنِ کریم کے یہ الفاظ اس بات پہ دلالت کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے پیش گوئی یہ کی کہ آئندہ حضور ﷺ کے بعد آپ کے خلفاء کے زمانے میں تمہیں بہت بڑی بڑی فوجوں کے مقابلے میں بُلایا جائے گا جو بڑے جنگجو ہوں گے، بڑے ساز و سامان والے ہوں گے، اگر تم اُس وقت کہنا مان لو گے تو اللہ کے ہاں اَجر پاؤ گے، یہ علامت ہے اس بات کی کہ ابوبکر صدیق، حضرت عمر، حضرت عثمان رضی اللہ عنہم ان کا بُلانا وہی اِس آیت کا مصداق ہے، اور جو لوگ ان کے متبع تھے اور ان کی قیادت میں جہاد کرتے رہے وہی اَجرِ عظیم کے مستحق ہیں، اور جنہوں نے ان کی اتباع نہیں کی اور ان کی قیادت میں جہاد نہیں کیا اُن کے لئے اگلی وعید ہے، تو یہ آیت صراحتاً ان خلفاء کے حق پر ہونے کی دلیل ہے، ان کا بُلانا وہی بُلانا ہے جدھر اللہ نے کہا کہ تم بُلائے جاؤ گے پھر دیکھیں گے کہ تم کتنا کہنا مانتے ہو، کتنا کہنا نہیں مانتے؟ تو ان کا بُلانا جہاد کی طرف وہی کامیابی کا ذریعہ ہوا، تو ان خلفاء کی خلافت کے برحق ہونے کی دلیل ہے کہ ان کی اتباع کو اللہ نے اَجرِ عظیم کا ذریعہ بتایا، اور ان کی مخالفت کو اور ان کی اتباع نہ کرنے کو عذابِ الیم کا ذریعہ بتایا۔

''کہہ دیجئے ان پیچھے رہنے والے بدویوں سے'' سَتُدْعَوْنَ: عنقریب تم بُلائے جاؤ گے ایسے لوگوں کی طرف جو سخت لڑائی والے ہیں، تُقَاتِلُوْنَهُمْ اَوْ يُسْلِمُوْنَ: لڑو گے تم ان سے یا وہ مطیع ہو جائیں، یعنی دو ہی باتیں ہوں گی، یا تو تمہاری لڑائی جاری رہے گی یا وہ اسلام لے آئیں گے، اسلام کی دونوں صورتیں ہیں، مسلمان ہو جائیں یا مطیع ہو جائیں جس طرح سے ''ذمی'' بن

جاتے ہیں، دونوں صورتوں میں یہ قتال ختم ہوجاتا ہے، یعنی غایت تمہارے لڑنے کی یہی ہوگی، ''تم لڑتے رہو گے اُن سے یا وہ فرماں بردار ہوجائیں'' فَاِنْ تُطِیْعُوْا: جس وقت تمہیں بُلایا جائے گا پھر اگر تم نے اطاعت کی تو اللہ تعالیٰ تمہیں اَجرِ حسن دے گا'' اور اگر تم نے پیٹھ پھیرلی، جس طرح سے کہ اِس سے پہلے پیٹھ پھیری'' اسی حدیبیہ کے موقع پر، ''جیسے تم نے پیٹھ پھیری اس سے قبل تو عذاب دے گا تمہیں دردناک عذاب۔''

''معذورین'' کا اِستثناء

ہاں! البتہ اگر کسی کو عذر ہوگا پھر وہ جہاد میں نہ جاسکے اِس دعوت پر، تو وہ اللہ کے ہاں ماخوذ نہیں ہے، مثلاً اندھے پر کوئی تنگی نہیں، نہ لنگڑے پر کوئی تنگی ہے، اور نہ بیمار پر کوئی تنگی ہے، اِن کو ہم جہاد کی تکلیف نہیں دیں گے، اگر یہ جہاد میں شریک نہ ہوں تو ان کے لئے کوئی گناہ نہیں ہے، ''نہیں ہے اندھے پر کوئی حرج، اور نہ لنگڑے پر کوئی حرج، اور نہ بیمار پر۔ اور جو کوئی اطاعت کرے اللہ اور اس کے رسول کی تو داخل کرے گا اللہ اس کو باغات میں جن کے نیچے سے نہریں جاری ہیں، اور جو کوئی پیٹھ پھیرے گا تو عذاب دے گا اس کو دردناک عذاب، اللہ تعالیٰ اُسے دردناک عذاب دے گا۔'' تو خلفائے ثلاثہ کے حق پر ہونے کے لئے یہ آیت واضح دلیل ہے۔ آگے بیعت کرنے والوں کی فضیلت مذکور ہے۔

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِيْ
راضی ہوگیا اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے جبکہ وہ بیعت کرتے تھے آپ کی درخت کے نیچے، جان لیا اللہ نے ان جذبات کو جو
قُلُوْبِهِمْ فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ عَلَيْهِمْ وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا ﴿۱۸﴾ وَّمَغَانِمَ كَثِيْرَةً
ان کے قلوب میں تھے، پھر اُتارا اللہ نے سکون اُن پر اور ان کو بدلہ دیا ایک قریب فتح ﴿۱۸﴾ اور کثرت سے غنیمتیں
يَّاْخُذُوْنَهَا ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۹﴾ وَعَدَكُمُ اللّٰهُ مَغَانِمَ كَثِيْرَةً تَاْخُذُوْنَهَا
جن کو یہ لوگ لیں گے، اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے ﴿۱۹﴾ وعدہ کیا تم سے اللہ تعالیٰ نے بہت ساری غنیمتوں کا جن کو تم لوگے
فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ وَكَفَّ اَيْدِيَ النَّاسِ عَنْكُمْ ۚ وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ وَيَهْدِيَكُمْ
پھر جلدی دے دی اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ، اور روک دیے لوگوں کے ہاتھ تم سے، اور تاکہ یہ مؤمنین کے لئے نشانی بن جائے اور تاکہ چلائے اللہ تعالیٰ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۲۰﴾ وَّاُخْرٰى لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا قَدْ اَحَاطَ اللّٰهُ بِهَا ۭ وَكَانَ
تمہیں صراطِ مستقیم پر ﴿۲۰﴾ اور ایک اور فتح بھی ہے جس پر تم نے ابھی قدرت نہیں پائی، اللہ تعالیٰ نے اس کا احاطہ کر رکھا ہے، اور

اللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا ﴿٢١﴾ وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ ثُمَّ لَا

اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ﴿۲۱﴾ اگر لڑ پڑتے تم سے وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو پیٹھ پھیر کر بھاگ جاتے، پھر نہ

يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ﴿٢٢﴾ سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ ۖ وَلَنْ تَجِدَ

پاتے کوئی یار، نہ کوئی مددگار ﴿۲۲﴾ مثل اللہ کے طریقے کے جو گزر چکا اِس سے قبل، اور نہیں پائے گا تُو

لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا ﴿٢٣﴾ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ وَاَيْدِيَكُمْ عَنْهُمْ بِبَطْنِ مَكَّةَ

اللہ کے طریقے کے لئے کوئی تبدیلی ﴿۲۳﴾ وہی اللہ ہے جس نے روک دیے ان کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ ان سے مکہ کی وادی میں

مِنْ بَعْدِ اَنْ اَظْفَرَكُمْ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا ﴿٢٤﴾ هُمُ الَّذِيْنَ

بعد اس کے کہ تمہیں کامیاب کر دیا تھا اُن پر، اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ﴿۲۴﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے

كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوْفًا اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۗ وَلَوْلَا

کفر کیا اور تمہیں مسجدِ حرام سے روکا اور روکا ہدی کو اس حال میں کہ وہ روکی ہوئی ہے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے، اگر نہ ہوتے

رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ اَنْ تَطَئُوْهُمْ فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌۢ

کچھ مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں جو تمہیں معلوم نہیں یعنی اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم انہیں روند ڈالو گے پھر تمہیں ان کی طرف سے عیب پہنچے گا

بِغَيْرِ عِلْمٍ ۚ لِيُدْخِلَ اللّٰهُ فِيْ رَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ۚ لَوْ تَزَيَّلُوْا لَعَذَّبْنَا

بغیر علم کے، تاکہ داخل کرے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے، اگر وہ مؤمن مرد و عورتیں ایک طرف ہٹ جاتے تو ہم عذاب دیتے

الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ﴿٢٥﴾ اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ

اُن (اہلِ مکہ) میں سے کافروں کو دردناک عذاب ﴿۲۵﴾ قابلِ ذکر ہے وہ وقت جب کہ قرار دے لی کافروں نے اپنے دلوں کے اندر

الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ وَعَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ وَ

حمیت یعنی حمیتِ جاہلیہ، پھر اُتارا اللہ نے اطمینان اپنے رسول پر اور مؤمنین پر اور

اَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا ۗ وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ﴿٢٦﴾ ع

تقویٰ کی بات ان کو لازم کر دی اور یہ اس کے سب سے زیادہ حق دار تھے اور اسی کے اہل تھے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے ﴿۲۶﴾

تفسیر

''بیعتِ رضوان'' والوں کے لئے اللہ کی رضا کا اعلان اور مغانم کثیرہ کا وعدہ

لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ: راضی ہو گیا اللہ تعالیٰ، خوش ہو گیا اللہ تعالیٰ مؤمنوں سے جبکہ وہ بیعت کرتے تھے آپ کی درخت کے نیچے، ''جان لیا اللہ نے اس چیز کو جو ان کے دلوں میں ہے'' ان کے دِلوں میں جو خلوص اور جاں نثاری کا جذبہ ہے وہ سب اللہ کو معلوم ہے، قلوب کی حالت اللہ جانتے ہیں، تو اس لیے جو شہادت دے رہیں اُن کے بارے میں وہ بالکل صحیح شہادت ہے، ''جانا اللہ تعالیٰ نے ان جذبات کو، ان حالات کو جو اُن کے قلوب میں تھے'' فَاَنْزَلَ السَّكِيْنَةَ: پھر اللہ نے سکینہ اُتاری، تحمل سکون اُتارا، پھر اتارا اللہ نے سکون اُن پر، سکینہ کا معنی سکون تحمل صبر، یہ اللہ نے ان کے قلوب میں ڈالا، وَاَثَابَهُمْ فَتْحًا قَرِيْبًا: اور ان کو بدلہ دیا ایک قریب فتح، اِس قریب فتح کا مصداق فتح خیبر ہے، ماضی کے ساتھ ان کو تعبیر کیا جا رہا ہے، گویا کہ واقع ہو ہی گیا، اتنا یقینی طور پر یہ پیش گوئی کر دی گئی تھی، پیش گوئی کے طور پر یہ بات کہہ دی گئی تھی، ''بدلہ دیا ان کو اللہ تعالیٰ نے فتح قریب، وَمَغَانِمَ كَثِيْرَةً: اور کثرت سے غنیمتیں، يَّاْخُذُوْنَهَا: جس کو یہ لوگ لیں گے، ''اور اللہ تعالیٰ زبردست حکمت والا ہے''، واقعات کی تفصیل آپ کے سامنے آ چکی۔ ''وعدہ کیا تم سے اللہ تعالیٰ نے بہت ساری غنیمتوں کا جن کو تم لو گے'' فَعَجَّلَ لَكُمْ هٰذِهٖ: اور یہ اللہ نے تمہیں جلدی دے دی، یعنی خیبر کی فتح تو نقد بنقد دست بدست مل گئی، سر دست یہ تمہیں جلدی دے دی گئی، اور باقی بہت ساری غنیمتوں کے اللہ نے تم سے وعدے کیے ہیں، تو اِس کے بعد جتنی فتوحات ہوئیں جتنے ملک فتح ہوئے حضور ﷺ کے زمانے میں اور آپ کے بعد خلفاء کے زمانے میں، سب اس کا مصداق ہے، ''وعدہ کیا اللہ تعالیٰ نے تم سے بہت ساری غنیمتوں کا جن کو تم لیتے ہو، پھر جلدی دے دی اللہ نے تمہیں یہ، اور روک دیے لوگوں کے ہاتھ تم سے'' لوگوں کے ہاتھ روک دیے کہ ان میں اتنا حوصلہ نہ ہوا کہ تمہارے ساتھ لڑتے، جیسے مشرکینِ مکہ صلح کی طرف مائل ہو گئے، لڑنے کے لئے میدان میں نہیں آئے، اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ ہم نے اُن لوگوں کے ہاتھ تم سے روک دیے، اور اسی طرح سے خیبر میں یہودیوں کے ہاتھ روک دیے کہ ان کو مغلوب کر دیا، وہ تم پر غالب نہ آ سکے، وَلِتَكُوْنَ اٰيَةً لِّلْمُؤْمِنِيْنَ: اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے یہ غنیمتیں تمہیں دیں تاکہ تم دنیا میں خوش حال بھی ہو جاؤ، تمہیں وسعت بھی حاصل ہو جائے، اور تاکہ ان غنیمتوں کا حاصل ہونا مؤمنین کے لئے نشانی بن جائے اللہ کے وعدوں کے سچے ہونے کی، کہ اللہ تعالیٰ نیک لوگوں کو جاں نثاروں کو کس طرح سے نوازتا ہے، یہ نشانی بن جائے گی، ''اور تاکہ چلائے اللہ تعالیٰ تمہیں صراطِ مستقیم پر'' آئندہ کے لئے تمہیں اللہ توفیق دے اچھے عمل اختیار کرنے کی، جس میں اللہ پر اعتماد اور اللہ پر توکل نمایاں ہو، کیونکہ واقعات اس قسم کے جو پیش آیا کرتے ہیں آئندہ کے لئے انسان کی عملی زندگی کے اندر یہ معاون ہوتے ہیں، ''تاکہ چلائے اللہ تعالیٰ تمہیں سیدھے راستے پر'' یعنی تمہیں اعتماد توکل ہر طرح سے حاصل ہو جائے، قوت پیدا ہو جائے، اور پھر تم آگے اللہ کی فرماں برداری کے طور پر چلو اور اللہ

پر اعتماد کرتے ہوئے چلو، تمہارے دل میں اس قسم کے وساوس و شبہات نہ آئیں جس قسم کے منافقین کے قلوب میں آتے ہیں تو یہ نصرت اور مدد کے واقعات سامنے آتے ہیں تو آئندہ عملی زندگی میں قوت حاصل ہوتی ہے۔ وَّاُخْرٰى: اور ایک اور فتح بھی ہے لَمْ تَقْدِرُوْا عَلَيْهَا: جس کے اوپر تم نے ابھی قدرت نہیں پائی، فَتْحَةٌ اُخْرٰى بن جائے گا، ایک اور فتح بھی ہے جس پر تم نے ابھی قابو نہیں پایا، اِس سے فتحِ مکہ کی طرف اشارہ ہے، ''اللہ تعالیٰ نے اُس کا اِحاطہ کرلیا ہے'' اللہ کے اِحاطۂ قدرت میں ہے وہ بات، لیکن تم نے ابھی اُس کے اوپر قابو نہیں پایا، ''اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے'' مطلب یہ ہے کہ وہ بھی تمہیں عنقریب حاصل ہوجائے گی، مفسرین کہتے ہیں کہ اِس میں اشارہ ہے فتحِ مکہ کی طرف۔

حدیبیہ میں لڑائی ہوتی، تو بھی فتح مسلمانوں کی ہوتی

وَلَوْ قٰتَلَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: اگر کافر لوگ تم سے لڑ پڑتے، یعنی اسی حدیبیہ کے مقام میں مشرکینِ مکہ سے مقابلہ ہوجاتا، ''اگر لڑ پڑتے تم سے وہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا'' لَوَلَّوُا الْاَدْبَارَ: تو وہ تمہیں پھیر کے بھاگ جاتے، میدان میں نہ ٹھہرتے، یعنی ہم نے جو لوگوں کے ہاتھ روک کے تمہاری صلح کروادی تو اس لیے نہیں کہ اگر لڑائی ہوجاتی تو تم مغلوب ہوتے تو اللہ نے تمہیں مغلوب ہونے سے بچالیا، ایسی بات نہیں، کچھ اور مصلحت تھی جس کی بنا پر یہ لڑائی نہیں ہوئی، ورنہ اگر مقابلہ ہوجاتا تو بھی ہماری مدد تمہارے ساتھ تھی، کافر پھر بھی پیٹھ پھیر کے بھاگ جاتے، لیکن اس موقع پر اللہ کی حکمت کا تقاضا نہیں تھا کہ مشرکینِ مکہ اس طرح سے قتل ہوں اور وہاں اِس طرح سے کشت و خون ہو، بلکہ بعض مصلحتوں کی بنا پر اس بات کو مؤخر کردیا گیا اور نہایت نرمی کے ساتھ مکہ فتح کروادیا گیا، لڑائی کی نوبت ہی نہیں آئی، ''اگر لڑتے تم سے یہ لوگ جنہوں نے کُفر کیا تو یہ پیٹھ پھیر کے بھاگ جاتے'' ثُمَّ لَا يَجِدُوْنَ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا: پھر نہ پاتے کوئی یار نہ کوئی مددگار، سُنَّةَ اللّٰهِ الَّتِيْ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلُ: مثل اللہ کے طریقے کے جو کہ گزر گیا پہلے لوگوں میں، انبیاء ﷩ کے مقابلے میں جو لوگ بھی اس طرح سے آتے ہیں آخر ذلیل ہوتے ہیں، یہ اللہ کا طریقہ پہلے سے چلا آتا ہے، ''مثل اللہ کے طریقے کے جو گزر چکا اس سے قبل'' وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا: اور نہیں پائے گا تو اللہ کے طریقے کے لئے کوئی تبدیلی۔ وَهُوَ الَّذِيْ كَفَّ اَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ: وہی اللہ ہے جس نے روک دیے اُن کے ہاتھ تم سے اور تمہارے ہاتھ اُن سے، یعنی آپس میں مقابلہ نہیں ہوا، تم اُن پر دست درازی نہ کرسکے، وہ تم پر نہ کرسکے، بِبَطْنِ مَكَّةَ: مکہ کی وادی میں، ''بعد اس کے کہ تمہیں غالب کردیا تھا ان پر، تمہیں فتح دے دی تھی اُن پر، تمہیں غلبہ دے دیا اُن پر، کامیابی دے دی تھی'' اس سے اُس واقعے کی طرف اشارہ ہے جس کی تفصیل آپ کی خدمت میں عرض کی گئی تھی، کہ کچھ مشرکین جبلِ تنعیم کی طرف سے اُترے تھے چھاپہ مارنے کے لئے، اور مسلمانوں نے زندہ پکڑ لیے وہ اَسّی (۸۰) تھے، جو گرفتار ہوگئے تھے، کچھ اور مشرک بھی اس طرح سے ہاتھ آگئے تھے، اور ادھر حضرت عثمان ﷛ اور ان کے کچھ رفقاء مشرکین کے قبضے میں آگئے تھے، تو اللہ تعالیٰ نے مشرکین کو توفیق نہ دی کہ ان کو قتل کریں، اور تمہارے ہاتھ بھی روک دیے

مشرکین کے قتل کرنے سے، کیونکہ اگر تم ان کو قتل کردیتے تو مقابلۃً وہ ان کو قتل کردیتے، پھر لڑائی چھڑ جاتی، اور اس موقع پر لڑائی کروانا ہماری مصلحت نہیں تھی، اس لیے دونوں کے ہاتھ ہی روک دیے، نہ تم اُن پر ہاتھ بڑھا سکے، نہ وہ تم پر بڑھا سکے،'' وہی ہے جس نے روک دیا اُن کے ہاتھوں کو تم سے اور تمہارے ہاتھوں کو اُن سے مکہ کی وادی میں بعد اس کے کہ اللہ نے تمہیں کامیاب کردیا تھا اُن پر'' وَكَانَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرًا: اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔

کافروں نے مؤمنین کو مسجدِ حرام سے روکا

هُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ: یہی لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تمہیں مسجدِ حرام سے روکا، وَالْهَدْيَ: اور ہدی کو روکا، ھدی سے وہ جانور مراد ہیں جو قربانی کے لئے ساتھ لے کر گئے تھے،'' روکا ہدی کو اس حال میں کہ وہ اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے روکی ہوئی ہے'' مَعْكُوْفًا: روکی ہوئی ہے، اَنْ يَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ: اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے، ہدی کا ٹھکانا یہ ہوتا ہے کہ مناسک ادا کرنے کے بعد اُن کو حرم میں ذبح کیا جائے، اور یہاں حدیبیہ کے اندر انہوں نے روک لیا، اور مسلمانوں کو عمرہ ہی ادا نہیں کرنے دیا، کہ عمرہ کرکے بعد میں وہ ہدی کے جانور ذبح کرتے۔ وَالْهَدْيَ یہ صَدُّوْ کا مفعول ہے (کیونکہ اِس کا عطف صَدُّوْكُمْ کی كُمْ ضمیر پر ہے)،'' تمہیں روکا اور ہدی کو روکا اِس بات سے کہ پہنچے وہ اپنے محل پر، اِس حال میں کہ وہ معکوف ہے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے، روکی ہوئی ہے اپنے ٹھکانے پر پہنچنے سے۔''

حدیبیہ میں عدمِ قتال کی ایک مصلحت

وَلَوْلَا رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ: اگر نہ ہوتے کچھ مرد ایمان لانے والے اور کچھ عورتیں ایمان لانے والی، لَّمْ تَعْلَمُوْهُمْ: جن کو تم جانتے نہیں، اَنْ تَطَئُوْهُمْ: یہ بدلِ اشتمال ہے رِجَالٌ مُّؤْمِنُوْنَ وَنِسَآءٌ مُّؤْمِنٰتٌ سے،'' اگر نہ ہوتے کچھ مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں جو تمہیں معلوم نہیں یعنی اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم انہیں روند ڈالو گے'' فَتُصِيْبَكُمْ مِّنْهُمْ مَّعَرَّةٌ: ''پھر تمہیں اُن کی طرف سے عار اور عیب پہنچے گا بغیر علم کے، تاکہ داخل کرے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے۔ اگر وہ مؤمن مرد عورتیں ایک طرف ہٹ جاتے'' لَعَذَّبْنَا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا: البتہ عذاب دیتے ہم ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کیا دردناک عذاب، اُن میں سے جو کافر تھے ہم اُن کو دردناک عذاب دیتے۔ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے عدمِ قتال کی ایک مصلحت اس میں واضح کی ہے، جس کا حاصل یہ ہے کہ اس وقت مکہ معظمہ میں بعض لوگ ایمان لائے ہوئے تھے، یا تو انہوں نے اپنے ایمان کو مخفی کیا تھا اظہار نہیں کیا تھا، یا وہ اظہار کیے ہوئے تھے لیکن مجبور تھے، مشرکین کے ہاتھوں گرفتار تھے، پکڑے ہوئے تھے، وہ ہجرت کرکے تمہارے ساتھ شامل نہیں ہوسکے، ایسے ہی کچھ عورتیں بھی تھی جو در پردہ مؤمن تھیں یا انہوں نے ایمان کا اظہار کیا ہوا تھا لیکن مشرکین کے سامنے مغلوب تھیں، مکہ معظمہ کے اندر یہ مؤمن مرد اور یہ مؤمن عورتیں خلط ملط تھے، اور اگر اِس موقع پر لڑائی ہوجاتی

اور آپ لوگ مکہ پر تسلط حاصل کر لیتے تو جس وقت یوں جنگ ہوا کرتی ہے تو پھر امتیاز نہیں رہتا کہ کون مارا گیا ہمارے ہاتھوں سے تو بعض ایسے مؤمن بھی تمہارے ہاتھوں سے مارے جاتے، مؤمن مرد اور مؤمن عورتوں کو بھی تکلیف پہنچتی، اور پھر جب بعد میں تمہیں پتا چلتا کہ یہ لوگ تو مؤمن تھے جو ہمارے ہاتھوں سے مارے گئے یا ان کو نقصان پہنچ گیا، تو یہ تمہارے لیے باعث عار ہوتا، تمہارے لیے ایک ندامت کا باعث ہوتا، ایک عیب سمجھا جاتا، تو اللہ تعالیٰ نے اس عیب سے تمہیں بچانے کے لئے جنگ کو روکا، اور اس میں مقصد یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو اپنی رحمت میں داخل کرے، ان کو بھی بچا لے جو مکہ معظمہ میں ہیں، اور تمہارے ہاتھوں سے نقصان اُن کو نہ پہنچے، جس سے تم بھی عیب سے بچ جاؤ، یہ مصلحت تھی کہ ہم نے اس وقت تمہیں مکہ معظمہ پر مسلط نہیں کیا، اگر یہ مؤمن مرد عورتیں جو کہ وہاں ایمان لائے ہوئے تھے ایک طرف ہٹ جاتے، مکہ میں موجود نہ ہوتے، تو اللہ تعالیٰ وہیں ان کافروں کا رگڑا نکلوا دیتا۔ تو ایک مصلحت یہ ظاہر کر دی گئی کہ اس طرح سے ان مؤمن مردوں اور عورتوں کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا جو مکہ معظمہ میں تھے، اور اُن کا ایمان تمہارے سامنے نمایاں نہیں تھا، تم نہیں جانتے تھے کہ یہ بھی مؤمن ہے یہ بھی مؤمن ہے، اور اس لڑائی کے اندر انہیں بھی نقصان پہنچتا جو تمہارے لیے بھی بعد میں ندامت کا باعث ہوتا، اور اگر یہ وہاں موجود نہ ہوتے......! گویا کہ اِس وقت اہلِ مکہ اگر بچے ہیں تو اُن ضعفاء کی برکت سے بچے ہیں، ان مؤمنین کی برکت سے بچے ہیں جو مکہ معظمہ کے اندر ٹھہرے ہوئے تھے، جن کی تفصیل تم نہیں جانتے: ''اگر یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم ان کو روند ڈالو گے تو اللہ تعالیٰ اسی وقت ہی اِن کو عذاب دے دیتا'' یعنی وہ ضعفاء وہ مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں وہاں مکہ معظمہ سے ایک طرف ہٹ جاتے تو ایسی صورت میں تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ اُن کے اوپر عذاب مسلط کر دیتا، تو گویا کہ اس وقت اِن اہلِ مکہ کا بچ جانا یہ ان مؤمن مردوں اور مؤمن عورتوں کی برکت سے ہوا کہ جن کے ایمان کی تفصیل تمہیں معلوم نہیں تھی اور یہ اندیشہ تھا کہ اگر لڑائی ہو گئی تو ان میں بعض کو کچھ نقصان پہنچ جائے گا، اور تمہارے لیے یہ بات عار اور عیب کا باعث ہوتی۔ مَعَرَّۃٌ عار کو بھی کہتے ہیں عیب کو بھی کہتے ہیں۔ بات سمجھ میں آ گئی؟ ترجمہ صاف طور پر پھر دیکھیے ''اگر نہ ہوتے کچھ مؤمن مرد اور کچھ مؤمن عورتیں جن کو تم نہیں جانتے، مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں نہ ہوتیں یعنی یہ اندیشہ نہ ہوتا کہ تم اُن کو روند ڈالو گے، (یہ بدلِ اشتمال ہے پچھلے الفاظ سے) پھر پہنچے گی تمہیں اُن کی طرف سے عار'' یہ آگے جا کے بات ساتھ ملے گی، لَوْ تَزَیَّلُوْا: اگر وہ مؤمن مرد و عورتیں ایک طرف ہٹ جاتے لَعَذَّبْنَا الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِیْمًا: تو ہم عذاب دیتے اہلِ مکہ میں سے کافروں کو دردناک عذاب۔ بات وہاں جا کے پوری ہو گئی۔ اور یہ (لِیُدْخِلَ اللّٰهُ فِیْ رَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ) درمیان میں جملہ معترضہ ہے کہ اللہ نے جنگ نہیں ہونے دی جس سے اُن مؤمنوں پر بھی رحم ہو گیا اور تم پہ بھی رحم ہو گیا، ''تا کہ داخل کرے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت میں جس کو چاہے'' اس کا یہی معنی ہے کہ یہ اللہ کی رحمت کا تقاضا تھا کہ جنگ نہ ہوئی، جس میں رحمت اُن مؤمنین پر بھی ہے جو مکہ معظمہ میں ہیں اور تم پر بھی ہے، تو یہ اللہ کی رحمت کے تقاضے سے ایسا نہیں ہوا، ''اگر وہ ایک طرف ہٹ جاتے، وہاں موجود نہ ہوتے تو ہم عذاب دیتے اُن میں سے کافروں کو دردناک عذاب۔''

مشرکینِ مکہ کی جاہلانہ ضد اور اہلِ اسلام کا تحمل

اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ: قابلِ ذکر ہے وہ وقت جبکہ کافروں نے اپنے دِلوں کے اندر حمیت بنائی حمیتِ جاہلیہ، حمیتِ جاہلیہ اپنے قلوب کے اندر کافروں نے قرار دے لی، جاہلیت کی ضد، اس جاہلیت کی ضد سے وہی ضد مراد ہے جو تفصیل آپ کے سامنے آ گئی کہ ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' نہیں لکھنے دیا، ''محمد رسول اللہ'' نہیں لکھنے دیا، بات بات پہ جو ضد کر رہے تھے یہ محض جاہلیت کی ضد تھی جس کی بنا پر وہ اَڑے ہوئے تھے، ورنہ تو مسئلہ صاف تھا، مشرکینِ مکہ بھی کسی کو روکا نہیں کرتے تھے حرم میں آنے کے لئے، بیت اللہ کا طواف کرنے کے لئے، لیکن یہاں انہوں نے اپنی ناک کا سوال پیدا کر لیا، کہ اگر یہاں ہم ان اہلِ ایمان کو آنے دیں گے تو لوگ کہیں گے کہ دیکھو! وہ اِن کی مرضی کے خلاف آ گئے اور اِن کے اُوپر غالب آ گئے، اس قسم کی جاہلیت کی ضد انہوں نے اپنے دل میں قرار دے لی تھی جس کی بنا پر یہ حالات پیدا ہوئے، ''جبکہ کافروں نے اپنے دلوں کے اندر حمیت یعنی حمیتِ جاہلیہ''، ''حمیت'' عار کو کہتے ہیں، فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰى رَسُوْلِهٖ: پھر اُتارا اللہ نے اطمینان اپنے رسول پر اور مؤمنین پر، یہاں سکینہ کا معنی یہ ہے کہ حمیتِ جاہلیہ کے مقابلے میں مسلمان بے قابو نہیں ہوئے، کہ جب یہ مشرک جاہلیت والی ضد پہ آئے ہوئے ہیں تو ہم بھی ان کو اس طرح سے سزا دیں گے، مسلمان بے قابو نہیں ہوئے بلکہ اللہ نے تحمل اُتارا، سکون اُتارا، جس کی بنا پر وہ سب کچھ برداشت کرتے چلے گئے، اور جو معاملہ ہوا حکمت اور مصلحت کے مطابق ہوا، ''پھر اُتاری اللہ نے سکینہ اپنے رسول پر اور مؤمنین پر۔''

''کلمۂ تقویٰ'' اور اس کے حق دار

وَاَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوٰى: اور چمٹا دیا انہیں کلمۂ تقویٰ، تقویٰ کی بات ان کو لازم کر دی، لازم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے تقاضے پورے کرنے کی اللہ نے توفیق دی، وہ کلمہ اِن کو چمٹ گیا، یعنی اِن سے کوئی بات ایسی نہ ہوئی، کوئی فعل ایسا نہ ہوا جس کو کلمۂ تقویٰ کے خلاف کہا جا سکے، ''تقویٰ کی بات اِن مؤمنوں کے اوپر لازم کر دی'' اِن کا قول ان کا فعل سب اُس کلمۂ تقویٰ کے مطابق ہوا، ''کلمۂ تقویٰ'' سے ''لا اِلٰہ اِلّا اللہ'' مراد ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی اطاعت کا اقرار ہے، اُس کے خلاف کوئی بات نہ ہوئی اِن مؤمنین سے، اللہ نے یہ بات ان کے اُوپر لازم کر دی، کلمے کا حاصل یہی ہے اللہ اور اللہ کے رسول کی فرماں برداری۔ وَكَانُوْٓا اَحَقَّ بِهَا وَاَهْلَهَا: اور یہ صحابہ اس کلمۂ تقویٰ کے اَحق تھے، سب سے زیادہ حق دار تھے، اور اِسی کے اہل تھے، دُنیا میں یہ اِسی کے حق دار ہیں اور آخرت میں اسی کے ثواب کے اہل ہیں، دُنیا میں بھی اللہ تعالیٰ نے کلمۂ تقویٰ اِن پر لازم کر دیا

اور آخرت میں بھی ثواب اللہ تعالیٰ انہیں دے گا، وَكَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا: اللہ تعالیٰ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے، یہ بھی گویا کہ صحابہ کی مدح ہے کہ تقویٰ کے تقاضے انہوں نے ایسے وقت میں بھی پورے کیے جب کہ کافر بالکل حمیت جاہلیہ میں آئے ہوئے تھے، جاہلیت والی ضد نمایاں کر رہے تھے۔

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْيَا بِالْحَقِّ ۚ لَتَدْخُلُنَّ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ
اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا جو واقع کے مطابق ہے، البتہ ضرور داخل ہو گے تم مسجدِ حرام میں اگر اللہ چاہے گا
اٰمِنِيْنَ ۙ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ لَا تَخَافُوْنَ ۭ
اس حال میں کہ تم امن والے ہو گے، سر منڈوانے والے ہو گے، اور بال کٹوانے والے ہو گے، کسی قسم کا خوف اور اندیشہ تمہیں نہیں ہو گا،
فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِيْبًا ۝۲۷
پھر جان لیا اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو جس کو تم نہیں جانتے تھے، تو اللہ نے اس خواب کے پورا ہونے سے قبل فتح قریب قرار دے دی ۝۲۷
هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهُ بِالْهُدٰى وَدِيْنِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهِ ۭ وَ
اللہ وہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ اور دینِ حق کے ساتھ، تا کہ غالب کر دے اس دینِ حق کو تمام دینوں پر اور
كَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ۝۲۸ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ
اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے ۝۲۸ محمد ﷺ اللہ کا رسول ہے اور جو اس کے ساتھ ہیں کافروں پر بڑے سخت ہیں
رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا
اور آپس میں بڑے رحیم ہیں، اے مخاطب! تو انہیں دیکھتا ہے رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، طلب کرتے ہیں اللہ کے
مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ۡ سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ ۭ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ښ وَ
فضل کو اور اس کی رضامندی کو، ان کا نشان ان کے چہروں میں ہے سجدوں کے اثر سے، یہ حال ہے ان کا توراۃ میں اور
مَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ ښ كَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْــَٔهٗ فَاٰزَرَهٗ فَاسْتَغْلَظَ
ان کا حال ہے انجیل میں اس کھیتی کی طرح ہے جو نکالتی ہے اپنی سوئی پھر کھیتی اس سوئی کو مضبوط کرتی ہے، پھر وہ سوئی موٹی ہو جاتی ہے

فَاسْتَوٰی عَلٰی سُوْقِهٖ یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ ؕ

پھر وہ کھیتی اپنے تنے پر کھڑی ہو جاتی ہے، وہ کھیتی کاشتکاروں کو اچھی لگتی ہے تاکہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کافروں کو غصے میں ڈالے،

وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴿۲۹﴾

یہی لوگ جو مؤمن ہیں اور انہوں نے نیک عمل کیے ہیں اللہ تعالیٰ نے ان سے مغفرت کا اور اَجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے ﴿۲۹﴾

تفسیر

اللہ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا

لَقَدْ صَدَقَ اللّٰهُ رَسُوْلَهُ الرُّءْیَا بِالْحَقِّ: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کو سچا خواب دکھایا جو واقع کے مطابق ہے، اب اُس خواب کا تذکرہ آ گیا، جیسے واقعات کی تفصیل میں آپ کی خدمت میں ذکر کیا گیا تھا، لَتَدْخُلُنَّ ''البتہ ضرور داخل ہو گے تم مسجدِ حرام میں اگر اللہ چاہے گا، اس حال میں کہ تم امن والے ہو گے، سر منڈانے والے ہو گے، اور بال کٹانے والے ہو گے، اور کسی قسم کا خوف اور اندیشہ تمہیں نہیں ہو گا'' اِس خواب کا یہی حاصل تھا اور ایسا ضرور ہو گا، اللہ نے خواب سچا دکھایا، باقی! یہ ہے کہ اُس خواب میں یہ تو نہیں کہا گیا تھا کہ اِسی سال یہ واقعہ پیش آئے گا، تو اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت کچھ اور واقعات اِس سے قبل نمایاں کر دیے جس میں تمہارا ہی فائدہ ہے، باقی! یہ شک نہ کرنا کہ خواب سچا نہیں تھا، خواب سچا ہے۔ عمرۃ القضا سے پہلے ہی، جب یہ سورت اُتری اسی میں بتا دیا گیا کہ خواب بالکل ٹھیک ہے اور ایسا ضرور ہو گا، باقی اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت اس کو کچھ مؤخر کر دیا گیا'' البتہ ضرور داخل ہو گے تم (لَتَدْخُلُنَّ مستقبل کا صیغہ ہے) مسجدِ حرام میں اگر اللہ چاہے گا'' یعنی اللہ کی مشیت کے تحت جس کو روکنے والا کوئی نہیں، اٰمِنِیْنَ لَا تَخَافُوْنَ: اس حال میں کہ تم امن میں ہو گے، اور کوئی کسی قسم کا خوف اور اندیشہ تمہیں نہیں ہو گا، اور داخل ہونے کا کیا مطلب؟ کہ وہاں جا کر طواف کرو گے عمرہ کرو گے، اور عمرہ اور طواف سے فارغ ہونے کے لئے جس طرح سے سر منڈائے جاتے ہیں یا بال کٹوائے جاتے ہیں تو ایسے ہی تم بھی سر منڈاؤ گے اور بال کٹواؤ گے،'' اس حال میں کہ تم سر منڈوانے والے ہو گے یا بال کٹوانے والے ہو گے'' لَا تَخَافُوْنَ: تمہیں کوئی کسی قسم کا خوف اور خطرہ نہیں ہو گا، فَعَلِمَ مَا لَمْ تَعْلَمُوْا: پھر جان لیا اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو جو تم نہیں جانتے، کچھ مصلحتیں اللہ کے سامنے ایسی تھیں جو تمہارے سامنے نہیں ہیں،'' جان لیا اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو جس کو تم نہیں جانتے تھے'' فَجَعَلَ مِنْ دُوْنِ ذٰلِكَ فَتْحًا قَرِیْبًا: تو اللہ تعالیٰ نے اس خواب کے پورا ہونے سے قبل فتح قریب قرار دے دی، یعنی اس خواب کے پورا ہونے سے پہلے اللہ تعالیٰ نے تمہیں قریب حاصل ہونے والی فتح دے دی، اور اِس ''فتح قریب''

سے مراد وہی خیبر کی فتح، اور یہ خواب کے پورا ہونے سے پہلے اللہ نے عطا فرما دی، اور بعض مفسرین نے یہ بھی کہا ہے کہ ''فتح قریب'' سے یہاں صلح ہی مراد ہے جو کہ حدیبیہ میں ہوئی تھی، کیونکہ اُسی کو ''فتح مبین'' کہا گیا، ''اس خواب کے پورا ہونے سے پہلے اللہ نے تمہیں فتح مبین دے دی۔''

اسلام کے غلبے کی بہترین تشریح

هُوَ الَّذِيْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰى: اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو بھیجا ہدایت اور دینِ حق دے کر، ہدایت کا مصداق قرآنِ کریم، دینِ حق یہی اسلام، قرآن اور اسلام دے کر بھیجا، یا ھدیٰ سے اُصول مراد لے لیجئے اور دینِ حق سے اُصول وفروع کا مجموعہ، ''اللہ وہ ہے جس نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت کے ساتھ اور دینِ حق کے ساتھ تاکہ غالب کر دے اِس دینِ حق کو تمام دینوں پر، اور اللہ تعالیٰ گواہ کافی ہے'' یعنی اگر کوئی شخص اس کو قبول نہیں کرتا تو کوئی نقصان نہیں، اللہ کی گواہی کافی ہے۔ ''تاکہ غالب کر دے'' یعنی رسول اللہ ﷺ کا لایا ہوا دین تمام دینوں پہ غالب آ کر رہے گا، اِن کو بھیجنے کا مقصد یہی ہے کہ سب پہ غلبہ پالیں، اب یہ غلبہ دو طرح سے ہے، ایک غلبہ ہوتا ہے دلیل اور حُجّت کے ساتھ، یہ تو اسلام کو ہر زمانے میں رہا، کوئی مذہب اور کوئی دین اس کے مقابلے میں ایسا نہیں جو اِسلام کو دلیل کے ساتھ غلط ثابت کر دے، اور اس کے مقابلے میں اپنی حقانیت ثابت کر دے، ہر میدان کے اندر اللہ نے اس غلبے کو نمایاں کیا ہے، دلیل اور حُجّت کے ساتھ یہ دین ہر زمانے میں باقی دینوں پر غالب رہا اور غالب رہے گا، اور ایک یہ ہے کہ باقی اس کے مقابلے میں مٹ جائیں، ان کو دُنیا میں شان وشوکت حاصل نہ رہے، تو یہ کسی درجے میں خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں ہوا، اور کامل طریقے سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے نزول کے بعد ہوگا کہ جب سارے کے سارے دین مٹ جائیں گے اور صرف اسلام باقی رہ جائے گا، اور خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے زمانے میں، اس کے بعد بنواُمیہ کے زمانے میں، بنوعباس کے زمانے میں، ترکوں کے زمانے میں، یہ جو مسلمانوں کی ہزار، بارہ سو سال کی تاریخ ہے، اس کے مقابلے میں کسی دین کی اور کسی مذہب کی کوئی معتد بہ حکومت مسلمانوں کے مقابلے میں نہیں تھی، اور مسلمانوں کو ساری دُنیا کے اُوپر غلبہ حاصل تھا۔

کُفّار کا ''ظاہری تسلط'' ان کے حق پر ہونے کی دلیل نہیں!

آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ دُنیا کے اوپر بظاہر تسلط ہے رُوس اور امریکا کو، یہ ان کی بہت تھوڑی عمر ہے، یہ جو جنگِ عظیم ہوئی تھی، جنگِ عظیم کے بعد ہی یہ اُبھرے ہیں، ۶۶، ۶۷ سال ہوئے ہیں صرف رُوس کے اندر انقلاب آئے ہوئے، اور امریکا کا نام جو روشن ہوا ہے تو وہ بھی جنگِ عظیم کے بعد ہی، ورنہ یہ جو دو جنگیں ہوئی ہیں ان دو جنگوں سے قبل تقریباً کوئی سو سال سے برطانیہ

کو عروج تھا، اُس کی حکومت بڑی طویل عریض رہی، اور اس برطانیہ کے عروج سے پہلے تقریباً ہزار سال یہ تسلط ساری دُنیا کے اُوپر مسلمانوں کا رہا ہے، اور ان کے مقابلے میں کوئی معتد بہ حکومت نہیں تھی، تو اللہ تعالیٰ اپنی حکمت کے تحت جیسے فرمایا تِلْكَ الْاَیَّامُ نُدَاوِلُهَا بَیْنَ النَّاسِ (آل عمران: ۱۴۰) دِنوں کو اَدل بدل کرتے رہتے ہیں، آزمائش مقصود ہوتی ہے، کسی کی کسی انداز سے، کسی کی کسی انداز سے، اس طرح سے اگر کسی قوم کو عارضی طور پر عروج ہوجاتا ہے تو یہ ہمیشہ کے لئے اس کے حق ہونے کی دلیل نہیں ہوا کرتی، کبھی کوئی قوم چڑھتی ہے کبھی کوئی چڑھتی ہے، اصل حق و باطل کا فیصلہ دلیل کے ساتھ ہوتا ہے، اب ایک پتھر اگر سونے کے پیالے پہ گرے اور اس کو چُور چُور کردے تو اس پتھر کے کوئی اعلیٰ اور افضل ہونے کی یہ دلیل نہیں ہوتی۔

اَنجامِ کار فتح اہلِ اسلام کے لئے ہی ہوتی ہے!

دُنیا کے اندر غلبہ، دُنیا کے اندر فتح، دُنیا کے اندر شکست اللہ تعالیٰ کی حکمت کے تحت ہوتی رہتی ہے، لیکن انجام ہمیشہ اہلِ حق کے ساتھ ہوا کرتا ہے، اس لیے ان کے عارضی تسلط کو یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ان کے حق ہونے کی دلیل ہے، اِس سے ذرا پیچھے ہٹ کے دیکھیں گے تو بہت طویل تسلط اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دیا، اور ہم اُمید رکھتے ہیں اللہ تعالیٰ کی اور اللہ کے رسول کی پیش گوئیوں کے تحت کہ آخر ان کا پھر تسلط ٹوٹے گا، انجام کار تسلط پھر اسلام کا ہوگا، تو دیکھا تو اَنجام کو جایا کرتا ہے، عارضی طور پر اور وقتی مصلحت کے طور پر اگر کوئی غالب آجائے تو جس طرح سے اُحد میں عارضی طور پر مشرکین کو کچھ غلبہ ہوگیا تھا، تو آپ جانتے ہیں کہ بدر میں جو حق تھا اُحد میں بھی وہی حق تھا، لیکن اللہ کی حکمت اور مصلحت ہوتی ہے، کچھ حکمتوں کے تحت اللہ تعالیٰ بعض تنبیہات کے لئے، بعض غلطیوں کے اِزالے کے لئے، غلطیوں پر متنبہ کرنے کے لئے کبھی حالات بدل بھی جایا کرتے ہیں۔ تو یہ تسلط کہ دُنیا میں کوئی معتد بہ حکومت مقابلے میں نہ رہے، یہ بھی طویل عرصہ تک ایسا رہا، اور آئندہ بھی ہوگا، اور حضرت مہدی اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام جب تشریف لائیں گے تو اس وقت جیسے کہ احادیث میں ذکر کیا گیا ہے کہ مقابلے میں کوئی کُفر باقی نہیں رہے گا، اسلام ہی اسلام ہوگا، یہ قیامت سے پہلے پہلے حضور ﷺ کے لائے ہوئے دِین کا تسلط تمام دِینوں کے مقابلے میں نمایاں ہوجائے گا۔

''محمد رسول اللہ'' قرآن میں صرف ایک جگہ ہے، اور وہ کیوں؟

مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ: اب یہ اگلی آیات پھر حضور ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی منقبت اور فضیلت کے طور پر ہیں، صرف یہ سورت ہے کہ جس میں سرورِ کائنات ﷺ کا نام لے کے ''محمد رسول اللہ'' یہ اکٹھا لفظ استعمال کیا گیا، اس کی حکمت اور مصلحت یہ بتائی گئی کہ ''صلح نامے'' میں مشرکین نے ''محمد رسول اللہ'' لکھنے نہیں دیا تھا، اور اس بارے میں بھی حمیتِ جاہلیہ کا مظاہرہ کیا تھا، جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے لکھا تھا ''هٰذَا مَا قَاضٰى عَلَيْهِ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' وہ کہنے لگے کہ ہم اگر ''رسول اللہ'' مان لیں تو جھگڑا کیا باقی رہے؟

ہم نہیں لکھنے دیں گے، ''محمد بن عبداللہ'' لکھو! تو اللہ تعالیٰ نے یہاں اِس سورت کے اندر یہی لفظ اُتارے یہ ظاہر کرنے کے لئے کہ مشرکین اگر نہیں مانتے، یا نہیں لکھنے دیتے، تو کون سی بات ہے! اللہ نے اپنی کتاب کے اندر لکھا، اپنی کتاب کے اندر اُتارا، قیامت تک لوگ پڑھیں گے مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ، تو مشرکین کے انکار کرنے سے کچھ نہیں ہوتا، اِس سورت کے اندر یہ دونوں لفظ جوڑ کر اُبھار دیے گئے ''محمد اللہ کا رسول ہے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کے اِمتیازی اوصاف: ''کافروں پر سخت اور آپس میں رحم دِل''

وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ: اور جو اس کے ساتھی ہیں، اس کا اوّلین مصداق جو حدیبیہ میں ساتھ تھے، اور لفظوں کے عموم کے ساتھ تمام رُفقاء مراد ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت اختیار کی، اس لیے تمام صحابہ رضی اللہ عنہم کو یہ بات شامل ہے، لیکن اوّلین مصداق وہی ہیں جو حدیبیہ میں ساتھ تھے، ''جو اُس کے ساتھ ہیں'' اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ: کافروں پر بڑے سخت ہیں اور آپس میں بڑے رحیم ہیں، کافروں پر سخت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کافر ان پر قابو نہیں پا سکتے، نہ خوف ان کے دل میں ڈال کر ان کو مرعوب کر سکتے ہیں، اور نہ ان کو خرید سکتے ہیں، نہ ان کو قابو میں لا سکتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو کافروں کے مقابلے میں اتنا سخت بنایا ہے کہ کسی صورت میں یہ کافروں کے قابو آنے والے نہیں، جس کو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اپنے اُصولوں کی پختگی کی بنا پر اور اپنے کردار کی مضبوطی کی بنا پر کافروں کے سامنے یہ چٹان ہیں، یا اُن کے لئے یہ لوہے کے چنے ہیں جن کو چبایا نہیں جا سکتا، اور یہ اُن کے لئے کوئی موم کی ناک نہیں کہ جدھر چاہیں موڑ لیں، یا کوئی سبز چارہ نہیں ہیں جس طرح سے چاہیں چبا لیں، یہ کافروں کے بس میں آنے والے لوگ نہیں، اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ کا یہ معنی ہے، کافر ان پہ قابو نہیں پا سکتے، اُن کے مقابلے میں یہ بہت سخت ہیں، اور آپس میں بڑے رحیم کریم ہیں، ایک دوسرے کے سامنے متواضع، لیکن کافروں کے مقابلے میں سخت!

''نماز اور اِخلاص''

تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا: اے مخاطب! تُو انہیں دیکھتا ہے رُکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے، طلب کرتے ہیں اللہ کے فضل کو اور اس کی رضامندی کو۔ یہ اللہ نے ان کے خلوص کی شہادت دی، عبادت گزار ہیں، جب دیکھو رکوع میں ہیں، سجدے میں ہیں، یعنی یہ صفت ان کے اُوپر بہت نمایاں ہے۔ پہلے معاملات کا ذکر تھا کہ آپس کا معاملہ بہت رحم اور شفقت پر ہے، ایک دُوسرے کے معاون ہیں، ایک دُوسرے کے سامنے متواضع ہیں، دُکھ درد میں شریک ہونے والے ہیں، کافروں کے مقابلے میں سخت ہیں۔ اور اللہ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہے کہ اللہ کے سامنے جھکتے ہیں، سجدے کرتے ہیں، اور اللہ کے فضل اور اللہ کی رضا کے متلاشی ہیں، یہ ان کا خلوص ہے، یہ نماز کا غلبہ نمایاں کرنا مقصود ہے، جیسے ہم کہتے ہیں فلاں شخص کو جب

دیکھو وہ یہی کام کر رہا ہوتا ہے، جب دیکھو یہی کر رہا ہوتا ہے، تو صحابہ رضی اللہ عنہم کی زندگی کے اندر بھی رُکوع سجدہ بہت نمایاں تھا، جیسے کتابوں میں آتا ہے کہ دِن کو اگر وہ میدان کے اندر شاہسوار ہوتے تھے تو رات کو مصلوں کے اُوپر درویش ہوتے تھے،[1] راتیں گزارتے تھے اللہ کے سامنے روتے ہوئے، رُکوع سجدہ کرتے ہوئے، اور اسی طرح سے نماز کا شوق اور شغف، جب فرصت ملتی اللہ کے سامنے وہ جھکتے ہیں۔

''چہروں میں عبادت کا نُور''

سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ: سیما علامت کو کہتے ہیں، اُن کی علامت ان کے چہروں میں ہے سجدوں کے اثر سے، یعنی اللہ کے سامنے سجدے جو کرتے ہیں تو اس کی نُورانیت ان کے چہروں پہ نمایاں ہے، خشوع وخضوع ان کے چہروں پہ نمایاں ہے، یہاں سیما سے وہی نشان مراد ہے جو عبادت گزار لوگوں کے چہروں کے اُوپر انوارات ہوا کرتے ہیں، پیشانی کے اُوپر نشان پڑ جانا مُراد نہیں، کیونکہ یہ تو کسی کے پڑتا ہے، کسی کے نہیں پڑتا، ایک آدمی کا چمڑا کچھ ایسا ہوتا ہے کہ ساری زندگی نماز پڑھتا رہے تو پیشانی پر داغ نہیں پڑتا، اور بعضوں کے چمڑے اس قسم کے ہوا کرتے ہیں کہ وہ چاہے کبھی کبھی سجدہ دیتے ہوں تو بھی ان کی پیشانی پر داغ پڑ جاتا ہے، تو یہ مراد نہیں، یہاں نشان سے وہ خشوع خضوع کے اثرات مراد ہیں جو کہ عبادت گزار انسان کے چہرے کے اُوپر ہوا کرتے ہیں، فاسق اور فاجر کے چہرے میں اور نیک صالح آدمی کے چہرے میں بڑا فرق ہوتا ہے:

مردِ حقّانی کی پیشانی کا نُور — کب چھپا رہتا ہے پیشِ ذی شعور

اور جس طرح سے کہتے ہیں ''نُورِ حق ظاہر بُوَد اندر ولی''، اللہ کے اولیاء پر نُورِ حق ظاہر ہوتا ہے، ''نیک بیں باشی اگر اہلِ دِلی'' تھوڑا سا بھی شعور اگر آپ کو تو آپ پہچان سکتے ہیں، تو یہ آثار جو چہرے کے اُوپر نمایاں ہوتے ہیں سیما کا مصداق وہ ہیں، خصوصیت کے ساتھ تہجد گزاروں کے بارے میں آتا ہے روایات میں، کہ تہجد گزار جو ہوا کرتے ہیں ان کے چہرے پر اللہ تعالیٰ حسن نمایاں کرتا ہے، اللہ کے انوار ان کے چہروں کے اُوپر نمایاں ہوتے ہیں، تو ''ان کے آثار، ان کے اثرات چہروں میں ہیں سجدوں کے اثر سے، ان کا نشان چہروں میں ہے سجدوں کے اثر سے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کی مدح توراۃ و اِنجیل میں

ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِي التَّوْرٰىةِ ۚ وَمَثَلُهُمْ فِي الْاِنْجِيْلِ یہ مثال ہے ان کی توراۃ میں، اور مثال ہے ان کی اِنجیل میں۔ اس آیت کی ترکیب میں کئی احتمال ہیں، یا تو ذٰلِكَ کا اشارہ ماقبل کی طرف ہے ''یہ حال ہے ان کا توراۃ میں اور حال ہے ان کا اِنجیل میں'' یعنی

---

(1) تفسیر ابن کثیر۔ سورۃ الاحزاب، آیت ۲۵ کے تحت ہے: رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ لُيُوثٌ بِالنَّهَارِ۔ البدایۃ والنہایۃ ۷/ ۶۲ پر ہے: فُرْسَانٌ بِالنَّهَارِ رُهْبَانٌ بِاللَّيْلِ۔

توراۃ وانجیل میں ان کا حال یہی ذکر کیا گیا ہے کہ "اشداء علی الکفار" ہوں گے، "رحماء بینھم" ہوں گے، اللہ کے عبادت گزار ہوں گے، اور اس عبادت گزاری کے آثار ان کے چہروں پہ نمایاں ہوں گے، یہی حال ان کا توراۃ اور انجیل میں ذکر کیا گیا ہے، اور آگے مضمون مستقل ہو جائے۔ کَزَرْعٍ اَخْرَجَ شَطْئَهٗ کہ یہ صحابہ اس کھیتی کی طرح ہیں جو کہ اپنی سوئی نکالتی ہے، فَاٰزَرَهٗ: پھر اس کو مضبوط کرتی ہے، فَاسْتَغْلَظَ: پھر وہ سوئی موٹی ہو جاتی ہے، فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ، سُوق: تنا، پھر وہ اپنے تنے کے اُوپر کھڑی ہو جاتی ہے، يُعْجِبُ الزُّرَّاعَ: پھر وہ کھیتی کاشتکاروں کو اچھی لگتی ہے۔ اور یہ سارے حالات اِن کے اُوپر طاری ہو رہے ہیں لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ تاکہ ان کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کافروں کو غصّے میں ڈالے، کافر دیکھ دیکھ کے جلیں، تو یہ آگے مثال مستقل ہو جائے گی، کہ ابتدا اسلام کی اگرچہ بہت ضعف کے ساتھ ہوئی، حضور ﷺ اکیلے تھے، پھر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ساتھ ہو لیے، حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا ساتھ ہو لیں، حضرت علی رضی اللہ عنہ ساتھ ہو لیے، آہستہ، آہستہ آہستہ بڑھتے گئے، جس طرح سے ایک دانے سے ایک نباتات پھوٹتی ہے، پہلے بہت کمزور سی ہوتی ہے، پھر وہ کچھ اور مضبوط ہو جاتی ہے، پھر اس کا تنا موٹا ہو جاتا ہے، وہ اپنے تنے کے سہارے کھڑی ہو جاتی ہے، کاشتکار دیکھ دیکھ کر خوش ہوتا ہے۔ اسی طرح سے یہ فصل جو تھی اسلام کی، یونہی اُٹھی، بہت ضعف کے ساتھ اُٹھی تھی، لیکن آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ نے ایسی تقویت پہنچائی کہ وہ لہلہانے لگ گئی، کافر دیکھ دیکھ کے جلتے ہیں۔

صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبّت حُبِّ رسول کی علامت ہے!

اس لیے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے کسی حال کے اُوپر جلنے والے یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر ہیں، لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ، صحابہ کا کوئی حال سامنے آئے، ان کی کوئی منقبت اور فضیلت سامنے آئے تو دلوں کے اندر جو جلن پیدا ہوتی ہے، یہ کُفر کی علامت ہے، اور ان کے حال سُن سُن کر اور ان کی مدح اور منقبت سُن کے دلوں کے اندر بشاشت آنا، یہ ایمان کی علامت ہے۔ تو جو لوگ صحابہ کے تذکروں سے خوش ہوتے ہیں، ان کی فضیلتیں سنتے ہیں تو ان کے دِل باغ باغ ہو جاتے ہیں یہ علامت ہے کہ ان کے دلوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کی محبت ہے، اور یہ ایمان کی علامت ہے۔ اور جو ان کے حال کو سُن کر منقبض ہوتے ہیں، یہی ان کے کافر ہونے کی علامت ہے کہ ان کے دِل میں کُفر ہے، جیسے حضور ﷺ نے فرمایا کہ صحابہ کی محبت میری محبت ہے، جو شخص میرے سے محبت رکھتا ہے وہ صحابہ سے محبت رکھتا ہے، "اَللّٰهَ اللّٰهَ فِيْ اَصْحَابِيْ!" اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہ کے بارے میں! "لَا تَتَّخِذُوْهُمْ غَرَضًا مِّنْ بَعْدِيْ" "میرے بعد ان کو کہیں تنقید کا نشانہ نہ بنالینا، غرض کہتے ہیں اس نشانے کو جس پر تیر پھینکے جاتے ہیں، ان کو نشانہ نہ بنائیو میرے بعد کہ اپنی زبان کھولو اور ان کے اُوپر تنقید کرو، "مَنْ اَحَبَّهُمْ فَبِحُبِّيْ اَحَبَّهُمْ" جو ان سے محبت کرے گا، وہ میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کرے گا، مجھ سے محبت ہوگی تو میرے صحابہ سے لازماً ہوگی، "وَمَنْ اَبْغَضَهُمْ فَبِبُغْضِيْ اَبْغَضَهُمْ" اور جو ان سے بغض رکھے گا، وہ میرے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھے گا، پہلے بغض مجھ سے ہوگا تو صحابہ سے ہوگا، "وَمَنْ اٰذَاهُمْ فَقَدْ

اٰذَانِیْ ''جو اِن کو تکلیف کو پہنچائے گا وہ مجھے تکلیف پہنچائے گا،''وَمَنْ اٰذَانِیْ فَقَدْ اٰذَی اللّٰہَ'' جس نے مجھے تکلیف پہنچائی اس نے اللہ کو تکلیف پہنچائی،''وَمَنْ اٰذَی اللّٰہَ یُوْشِكُ اَنْ یَّاْخُذَہٗ'' جو اللہ کو تکلیف پہنچائے پھر دُور نہیں، اللہ اُسے پکڑ لے گا۔[1] تو کہاں جا کر سلسلہ ملا دیا! تو صحابہ کرام کی محبت حضور ﷺ کی محبت کی علامت ہے، صحابہ کرام کے ساتھ بغض رکھنا یہ حضور ﷺ کے ساتھ بغض کی علامت ہے۔ تو صحابہ کی منقبت اور فضیلت سُن کے خوش ہونا ایمان کی علامت ہے، اور اس کے اُوپر جلنا، دِل کے اندر کڑھنا، یہ کافر ہونے کی علامت ہے لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ۔ تو یہ ایک مستقل مثال ہو جائے گی، اور ذٰلِكَ کا اشارہ ماقبل کی طرف ہو گیا کہ پیچھے جو ان کی علامات ذِکر کی گئی ہیں یہی توراۃ واِنجیل میں مذکور ہیں۔

''ذٰلِكَ'' کے مشار اِلیہ میں مزید دو اِحتمال

اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ ۚۖ وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ كَزَرْعٍ اس کو بعد کے ساتھ جوڑ دیا جائے، جیسے یہ تین نقطوں کا نشان لگا ہوا ہے، میں نے پہلے بھی آپ کے سامنے اس کے متعلق کئی دفعہ ذکر کیا، کہ مابعد کے ساتھ جُڑ سکتا ہے، ماقبل کے ساتھ بھی جُڑ سکتا ہے، تو معنی یوں ہو جائے گا'' یہ مثال ہے ان کی توراۃ میں، اور مثال ہے ان کی انجیل میں کھیتی کی طرح''، توراۃ واِنجیل میں ان کی مثال کھیتی کی طرح نمایاں کی گئی ہے، چنانچہ مفسرین نے یہاں توراۃ واِنجیل کی عبارتیں نقل کی ہیں، وہ کہتے ہیں کہ باوجود تحریفات کے توراۃ واِنجیل کے اندر صحابہ کرام کی منقبت بھی موجود ہے، اور کچھ اسی سے ملتی جلتی مثالیں توراۃ واِنجیل میں آئی ہوئی ہیں۔...... تیسرا اِحتمال اس میں یہ بھی ہوسکتا ہے کہ ذٰلِكَ مَثَلُهُمْ فِی التَّوْرٰىةِ کو پیچھے لگا دو کہ صحابہ کرام ﷢ کا جو حال ذِکر کیا گیا یہ حال تو اِن کا توراۃ میں مذکور ہے، وَمَثَلُهُمْ فِی الْاِنْجِیْلِ ۚ كَزَرْعٍ: اور ان کا حال اِنجیل میں اس کھیتی کی طرح ہے۔ اور اسی تیسرے اِحتمال کو راجح قرار دیا ہے، کہ پہلا حال زیادہ نمایاں ہے توراۃ کی باتوں سے، اور دُوسرا حال زیادہ نمایاں ہے اِنجیل کی باتوں سے۔ تو پہلا فقرہ ماقبل کے ساتھ لگ گیا، کہ پیچھے جو حال صحابہ کا ذِکر کیا گیا یہی حال ان کا توراۃ میں مذکور ہے، اور اِنجیل میں ان کا حال ذِکر کیا گیا ہے كَزَرْعٍ۔

زرع کھیتی کو کہتے ہیں، ''کھیتی کی طرح جو اپنی سوئی کو نکالتی ہے'' شَطْأَهٗ کہتے ہیں اس اِبتدائی پٹھے کو جو کہ بیج سے نکلا کرتا ہے، ''جو نکالتی ہے اپنی سوئی، یا، اپنا ابتدائی پٹھا'' فَاٰزَرَهٗ: پھر کھیتی اُس سوئی کو مضبوط کرتی ہے، فَاسْتَغْلَظَ: پھر وہ سوئی جو نکلی ہے، وہ پٹھا جو نکلا ہے وہ موٹا ہو جاتا ہے، فَاسْتَوٰى عَلٰى سُوْقِهٖ: پھر وہ کھیتی اپنے تنے پر کھڑی ہو جاتی ہے، یُعْجِبُ الزُّرَّاعَ: اور یہ کھیتی کاشتکاروں کو اچھی لگتی ہے، زُرّاع زارِع کی جمع، لِیَغِیْظَ بِهِمُ الْكُفَّارَ: جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کافروں کو اللہ تعالیٰ ان کے سبب سے غیظ میں ڈالتا ہے، صحابہ کو اللہ تعالیٰ نے یہ احوال دیے تاکہ کافروں کو غیظ میں ڈالے، کافر اس سے جلتے ہیں، وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ

---

(۱) ترمذی ج ۲ ص ۲۲۵ باب فی من سب اصحاب النبی۔ مشکوٰۃ ج ۲ ص ۵۵۴ باب مناقب الصحابۃ فصل ثانی۔

مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا: مِنْهُمْ یہ بیان کے لئے ہے۔ یہی لوگ جو مؤمن ہیں اور نیک عمل انہوں نے کیے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان سے مغفرت کا اور اَجرِ عظیم کا وعدہ کیا ہے۔

عظمتِ صحابہ رضی اللہ عنہم اور عقیدۂ اہلِ سُنّت

تو آخر میں صحابہ کی منقبت ظاہر کردی گئی جنہوں نے سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ خصوصیت سے اِس میدان میں ساتھ دیا تھا، اور لفظوں کا عموم جو ہے جنہوں نے بھی حضور ﷺ کی معیت اختیار کی لفظوں کے عموم کے ساتھ یہ فضیلت سب کی نکلتی ہے، اس لیے ''صحابی'' کی تعریف جو آپ پڑھتے ہیں کہ صحابی وہ ہے کہ جس نے ایمان کی حالت میں سرورِ کائنات ﷺ کو دیکھا ہو، یا آپ کی مجلس میں بیٹھا ہو، اور ایمان پر ہی اس کا خاتمہ ہوا ہو، ''صحابی'' کی تعریف میں یہ بات ہے کہ ایمان کی حالت میں حضور ﷺ کو دیکھا، یا آپ کی مجلس میں رہا، یہ دُوسرا لفظ اس لیے بولا جاتا ہے تاکہ نابینا صحابی کو شامل ہوجائے، کہ اس نے حضور ﷺ کو دیکھا نہیں لیکن مجلس میں تو بیٹھا ہے، اور پھر ایمان پر ہی اس کا خاتمہ ہوا ہو، تو یہ جماعت جن کے اُوپر یہ تعریف صادق آتی ہے، باتفاقِ اہلِ سُنّت والجماعت عادل اور ثقہ ہیں، اور ان کے اُوپر کسی قسم کی تنقید کرنا، یا عیب جوئی کرنا، یہ اللہ تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہے، اللہ تعالیٰ نے اس جماعت کو اپنی رضا کا تمغہ دیا ہے، تو ان کے اُوپر زبان درازی نہیں کی جاسکتی، اگرچہ انبیاء علیہم السلام کی طرح وہ معصوم نہیں، لیکن اُن کے اندر خوبیاں اتنی تھیں اور جاں نثاری انہوں نے اتنی دِکھائی کہ چھوٹی موٹی کوتاہیاں ان کی اللہ کے ہاں معاف ہیں، اللہ کے یہاں مقبول ہوگئے، اللہ کی رضا کا اعلان دُنیا میں انہیں مل گیا، وہ معصوم تو نہیں البتہ محفوظ ضرور ہیں۔

***

سورة الحجرات

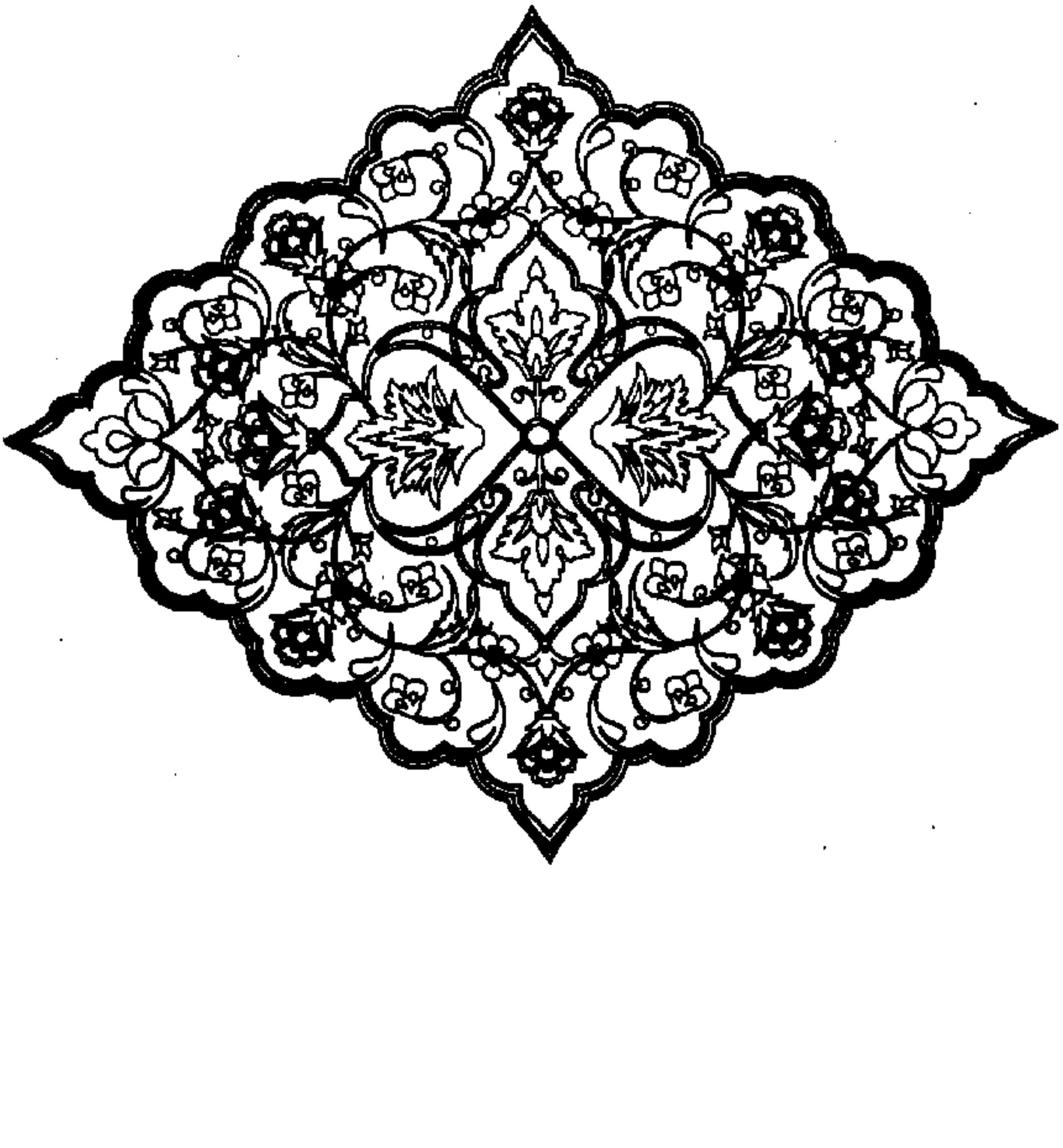

آیاتھا ۱۸ ۴۹ سُوْرَۃُ الْحُجُرٰتِ مَدَنِیَّۃٌ ۱۰۶ رکوعاتھا ۲

سورۂ حجرات مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُقَدِّمُوْا بَیْنَ یَدَیِ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَاتَّقُوا اللّٰہَ ؕ اِنَّ اللّٰہَ

اے ایمان والو! نہ آگے بڑھایا کرو کوئی اَمر اللہ اور اللہ کے رسول کے سامنے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ

سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ① یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَکُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِیِّ وَلَا تَجْھَرُوْا

سننے والا ہے جاننے والا ہے ① اے ایمان والو! اپنی آوازیں اُونچی نہ کیا کرو نبی ﷺ کی آواز سے اور جہر نہ کیا کرو

لَہٗ بِالْقَوْلِ کَجَھْرِ بَعْضِکُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُکُمْ

بات کو حضور ﷺ کے لئے جس طرح تمہارا بعض بعض کے لئے بات کو جہر کر دیتا ہے، (اس اندیشے کی بنا پر) کہ تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں

وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ② اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَھُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰہِ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ

اور تمہیں پتا بھی نہ چلے ② بے شک جو لوگ اپنی آواز پست رکھتے ہیں اللہ کے رسول کے سامنے یہی لوگ ہیں کہ

امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی ؕ لَھُمْ مَّغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ عَظِیْمٌ ③ اِنَّ الَّذِیْنَ

جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوے کے لئے خالص کر لیا، ان کے لئے مغفرت ہے اور اَجرِ عظیم ہے ③ بے شک وہ لوگ جو

یُنَادُوْنَکَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَکْثَرُھُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ ④ وَلَوْ اَنَّھُمْ صَبَرُوْا حَتّٰی

آوازیں دیتے ہیں آپ کو حجروں کے سامنے سے ان میں سے اکثر عقل نہیں رکھتے ④ اور اگر وہ صبر کرتے حتیٰ کہ

تَخْرُجَ اِلَیْھِمْ لَکَانَ خَیْرًا لَّھُمْ ؕ وَاللّٰہُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ⑤ یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا

آپ ان کی طرف نکل کے آجاتے تو ان کے لئے بہتر ہوتا، اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ⑤ اے ایمان والو!

اِنْ جَآءَکُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْٓا اَنْ تُصِیْبُوْا

اگر تمہارے پاس کوئی شریر آدمی خبر لے کر آئے تو خوب اچھی طرح سے تحقیق کر لیا کرو، اس اندیشے کی بنا پر کہ تم نادانی کے سبب

قَوْمًا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۞ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ لَوْ

سے کسی قوم کو تکلیف پہنچا دو، پھر ہو جاؤ گے تم اپنے کیے پہ پشیمان ۞ اور تم جان لو کہ اللہ کا رسول تم میں موجود ہے، اگر

يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَ

وہ اطاعت کرے تمہاری بہت سے کاموں میں تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ایمان محبوب کر دیا، اور

زَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ

اُس ایمان کو تمہارے دلوں میں مزین کر دیا، اور مکروہ ٹھہرا دیا تمہاری طرف کفر کو، فسق کو اور نافرمانی کو، یہی لوگ سیدھے راستے پر

الرّٰشِدُوْنَ ۞ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۞ وَاِنْ طَاۗىِٕفَتٰنِ مِنَ

چلنے والے ہیں ۞ اللہ کے فضل سے اور اللہ کی نعمت سے، اور اللہ علم والا حکمت والا ہے ۞ اگر دو گروہ

الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى

مؤمنین کے آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان حالات کی اصلاح کر دیا کرو، اور اگر دونوں میں سے ایک طائفہ دوسرے پر

الْاُخْرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِيْ تَبْغِيْ حَتّٰى تَفِيْۗءَ اِلٰٓى اَمْرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ

زیادتی کرے پھر تم سب مل کر لڑو اس کے ساتھ جو زیادتی کرتا ہے یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے، اور اگر وہ (اللہ کے حکم

فَاۗءَتْ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا بِالْعَدْلِ وَاَقْسِطُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِيْنَ ۞

کی طرف) لوٹ آیا تو پھر ان کے درمیان صلح کرا دو عدل کے ساتھ، اور انصاف کیا کرو، بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں ۞

اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ فَاَصْلِحُوْا بَيْنَ اَخَوَيْكُمْ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۞

ایمان والے سب آپس میں بھائی بھائی ہیں، تو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو، اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تاکہ تم پر رحم کیا جائے ۞

سورت کا تعارف اور ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ حجرات مدینہ منورہ میں نازل ہوئی، اور اس کی اٹھارہ آیتیں ہیں، دو رکوع ہیں۔ حجرات یہ حجرہ کی جمع ہے اور یہ نام لیا گیا ہے آنے والی آیت سے اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَاۗءِ الْحُجُرٰتِ۔ پچھلی سورت میں زیادہ تر اُمور جہاد کا ذکر تھا جس کا تعلق ہے اصلاحِ آفاق کے ساتھ، اور اس سورت میں زیادہ تر باتیں وہ ذکر کی گئی ہیں جن کا تعلق اپنے

اسلامی معاشرے کی اصلاح کے ساتھ ہے، اصلاحِ نفس اور اصلاحِ معاشرہ، مسلمانوں کی جماعت میں آپس میں اتفاق رہے، محبت رہے، آپس میں لڑائی نہ ہو، اور وہ کون کون سی چیزیں ہیں جو آپس میں پھوٹ ڈالتی ہیں، لڑائی کا باعث بنتی ہیں، اُن سے ممانعت کی جارہی ہے، اور ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کی تاکید کی جارہی ہے، سرورِ کائنات ﷺ کے آداب کا تذکرہ ہے، اور اسلامی بھائیوں کے حقوق کا ذکر ہے۔

تفسیر

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا: اے ایمان والو! لَا تُقَدِّمُوْا: تقدیم: آگے بڑھانا، مفعول اِس کا یہاں محذوف ہے، لَا تُقَدِّمُوْا اَمْرًا مِنَ الْقَوْلِ وَالْفِعْلِ بَیْنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: اللہ اور اللہ کے رسول کے سامنے کوئی کام آگے نہ بڑھایا کرو، کوئی امر آگے نہ بڑھایا کرو، کوئی قول فعل نہ کیا کرو، لفظی معنی تو یہی ہوا، مفہوم اس کا یہ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کی طرف سے جس معاملے میں حکم ملنے کی توقع ہو اپنی طرف سے پیش قدمی کر کے اس میں کوئی فیصلہ نہ کرلیا کرو، ''نہ آگے بڑھایا کرو کوئی امر اللہ اور اللہ کے رسول کے سامنے، اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا ہے جاننے والا ہے۔''

اِبتدائی آیات کا شانِ نزول

اِن ابتدائی آیات کے شانِ نزول میں احادیث کے اندر ایک واقعہ نقل کیا گیا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کے پاس بنی تمیم کے کچھ لوگ آئے، وہ لوگ چونکہ ادب آداب سے واقف نہیں تھے، جس وقت آئے ہیں تو سرورِ کائنات ﷺ باہر نہیں تھے بلکہ اپنے حجرات میں سے کسی حجرے میں تھے، اُن کو معلوم نہیں تھا کہ کون سے گھر ہیں، تو بیویوں کے حجروں کے سامنے کھڑے ہوکر (''حجرہ'' کہتے ہیں یہ دیوار کے اندر جو گھری ہوئی جگہ ہوتی ہے، حَجَرَ روکنے کو کہتے ہیں، گھر کا صحن جس کے اردگرد دیوار بنی ہوئی ہوتی ہے، جو دیواروں کے اندر گھرا ہوا ہوتا ہے، اس کو ''حجرہ'' کہا جاتا ہے، ہمارے عُرف میں تو عام طور پر ''حجرہ'' کمرے کے لئے بولتے ہیں، لیکن عربی میں ''حجرے'' کا معنی کمرہ نہیں ہوتا، ''محجور'' جگہ جو دیواروں کے درمیان میں گھری ہوئی ہو، اس لیے گھروں کے سامنے جو صحن ہوتے ہیں وہ بھی ''حجرہ'' کا مصداق ہیں) انہوں نے ان حجرات کے سامنے کھڑے ہوکر دیہاتیوں کی طرح آوازیں دینا شروع کردیں: ''یَا مُحَمَّدُ! اُخْرُجْ اِلَیْنَا''[1] مقصد ان کا یہ تھا کہ جس حجرے میں بھی ہوں گے، آواز سنیں گے باہر آجائیں گے، اور یہ جو معاملہ اُن کی طرف سے ہوا یہ بھی حضور ﷺ کی عظمت کے منافی ہے، اس کے متعلق بھی ہدایات آگے آرہی ہیں..... تو جب وہ حضور ﷺ کی خدمت میں آئے تو مسئلہ زیرِ بحث آیا کہ اس قبیلے پر حاکم کس کو بنا کے بھیجا جائے؟ تو سرورِ کائنات ﷺ نے ابھی کوئی رائے ظاہر نہیں فرمائی تھی کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ آپس میں ایک مشورے میں لگ گئے، ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے کسی کا نام لیا کہ فلاں شخص کو بنا دیا جائے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کسی کا لیا، دونوں کا آپس میں اختلاف رائے ہوگیا، بحث مباحثے تک

---

(۱) روح المعانی سورۃ الحجرات، آیت ۴ کے تحت۔

نوبت آ گئی، کچھ آوازیں اُونچی ہو گئیں،(۱) تو حضور ﷺ کی موجودگی میں اس طرح سے دو شخصوں کا آپس میں بحث کرنا، گفتگو میں حصہ لینا، یا آواز کا اُونچا ہو جانا، یہ بھی آپ ﷺ کی مجلس کے آداب کے خلاف ہے، تو اللہ تعالیٰ نے یہاں ہدایات ایسی دی ہیں، جس میں حضور ﷺ کی مجلس کے آداب بھی ہیں، اور آپ کے ساتھ ملنے ملانے کا کچھ طریقہ بھی واضح کیا گیا ہے۔

تو یہ پہلے جو لفظ ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول کے سامنے کوئی بات آگے نہ بڑھایا کرو، تو اس کا مطلب یہی ہے کہ اس موقع پر بھی جب اللہ کے رسول موجود تھے تو وہ اپنی رائے کو ظاہر کرتے، یا تم سے پوچھتے تو تم جواب دیتے، اپنے طور پر پیش قدمی کر کے کسی معاملے میں الجھ جانا یہ اچھا نہیں ہے، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ سے ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا جاننے والا ہے۔

اسلام کے مضبوط جماعتی نظم کے لئے اہم اُصول

حضرت مولانا شبیر احمد صاحب عثمانی رحمہ اللہ اسی معاملے میں ذکر فرماتے ہیں کہ ''جس معاملہ میں اللہ و رسول کی طرف سے حکم ملنے کی توقع ہو، اس کا فیصلہ پہلے ہی آگے بڑھ کر اپنی رائے سے نہ کر بیٹھو، بلکہ حکمِ الٰہی کا انتظار کرو، جس وقت پیغمبر علیہ السلام کچھ ارشاد فرمائیں خاموشی سے کان لگا کر سنو، ان کے بولنے سے پہلے خود بولنے کی جرأت نہ کرو، جو حکم اُدھر سے ملے اس پر بے چون وچرا اور بلا پس و پیش عامل بن جاؤ، اپنی اغراض اور اَہواء و آراء کو ان کے اَحکام پر مقدم نہ رکھو، بلکہ اپنی خواہشات و جذبات کو اَحکامِ سماوی کے تابع بناؤ۔ اس سورت میں مسلمانوں کو نبی کریم ﷺ کے آداب و حقوق اور اپنے بھائی مسلمانوں کے ساتھ برادرانہ تعلقات قائم رکھنے کے طریقے سکھلائے ہیں اور یہ کہ مسلمانوں کا جماعتی نظام کن اُصول پر کاربند ہونے سے مضبوط و مستحکم رہ سکتا ہے، اور اگر کبھی اس میں خرابی اور اختلال پیدا ہو تو اس کا علاج کیا ہے، تجربہ شاہد ہے کہ بیشتر نزاعات و مناقشات خود رائی اور غرض پرستی کے تحت وقوع پذیر ہوتے ہیں جس کا واحد علاج یہ ہے کہ مسلمان اپنی شخصی رایوں اور غرضوں کو کسی ایک بلند معیار کے تابع کر دیں، ظاہر ہے کہ اللہ و رسول ﷺ کے ارشادات سے بلند کوئی معیار نہیں ہو سکتا، ایسا کرنے میں خواہ وقتی اور عارضی طور پر کتنی ہی تکلیف اٹھانا پڑے لیکن اس کا آخری انجام یقینی طور پر دارین کی سرخروئی اور کامیابی ہے'' (تفسیر عثمانی)۔ یہ ایک اُصول واضح کر دیا گیا۔

مجلسِ نبوی میں بُلند آواز سے بولنے کی ممانعت

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْۤا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ: یہ مجلس نبوی کا ادب ہے، اے ایمان والو! اپنی آوازیں اُونچی نہ کیا کرو نبی کی آواز سے، نبی کی آواز سے اپنی آوازیں اُونچی نہ کیا کرو، یعنی مجلس میں بیٹھے ہوئے گفتگو کرتے ہو تو تمہاری آواز نبی کی آواز کے مقابلے میں پست ہونی چاہیے، ان کے مقابلے میں تمہاری آواز اُونچی نہ ہو، وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ: جہر کہتے ہیں ظاہر کرنے کو، تڑاخ تڑاخ بولنے کو جس طرح سے کہا جاتا ہے، حضور ﷺ کے لئے بات کو جہر نہ کیا کرو، جرأت کے ساتھ بلند آواز سے نہ بولا کرو، لَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ کا یہی معنی ہوگا، ''جہر نہ کیا کرو بات کو حضور ﷺ کے لئے جس طرح تمہارا بعض

(۱) بخاری ۲/۷۱۸، کتاب التفسیر، سورۃ الحجرات۔

بعض کے لئے بات کو جہر کردیتا ہے'' جس طرح سے تم ایک دوسرے کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے بلاتکلف، جرأت کے ساتھ، بلند آواز سے بات کرتے ہو، جب سرورِ کائنات ﷺ کے ساتھ بات کرنے کی نوبت آئے تو اس طرح سے کھل کے بات نہ کیا کرو۔

اِیذائے نبی حبطِ اَعمال کا ذریعہ ہے!

اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ: مَخَافَةَ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ: اس اندیشے کی بنا پر کہ تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ: اور تمہیں پتا بھی نہ چلے، تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تمہارے عمل ضائع ہوجائیں گے، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے بڑے کے ساتھ بےتکلفی کے ساتھ بلند آواز سے باتیں کرنا، جیسے دوست دوست سے بسااوقات باتیں کرنے لگ جاتا ہے، یا آپ ﷺ کی موجودگی میں اُونچی آواز کے ساتھ بولنا، یہ کبھی ایذا کا باعث ہوجاتا ہے، دل میں یہ بات آجاتی ہے کہ دیکھو! یہ میرا ادب نہیں کرتے، یہ میرے سامنے کس طرح سے گستاخی سے بول رہے ہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ جس وقت بڑے کی طبیعت میں بشاشت ہوتی ہے، وہ خود باتوں میں لگے ہوئے ہیں، تو اگر چھوٹے اس قسم کی کوئی جرأت کربھی لیں تو ناگوار نہیں بھی گزرتی، اور کبھی ناگوار گزر بھی سکتی ہے کہ یہ اس طرح سے کیوں بول رہے ہیں؟ یہ اس طرح سے باتیں کیوں کررہے ہیں؟ تو ہر فرد بلند آواز سے بولنے کا یا حضور ﷺ کے ساتھ کھل کر گفتگو کرنے کا باعثِ ایذا نہیں ہوتا، کوئی فرد باعثِ ایذا ہوتا ہے، کوئی نہیں ہوتا، تو ایسا ہوگا کہ آپ تو یہ سمجھیں گے کہ ہم اس طرح سے بےتکلفی سے بات جو کررہے ہیں حضور ﷺ کو کوئی تکلیف نہیں ہورہی، اور حقیقت میں تکلیف ہوجائے گی، آپ ﷺ کے دِل کو تکلیف پہنچے گی، اور اِیذائے نبی یہ حبطِ اَعمال کا ذریعہ ہے، جس سے حضور ﷺ کے دِل کو تکلیف پہنچ گئی اس کے پلے کیا رہ جائے گا!!! اس لیے تمہیں یہ اندیشہ ہونا چاہیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ہماری بات ناگوار گزرے اور ناگوار گزرنے کی صورت میں ہمارے اعمال خراب ہوجائیں، اور ہم یہ سمجھتے رہیں کہ ناگوار گزری نہیں، اس لیے ہمیں کوئی نقصان ہی نہیں پہنچا۔ اس طرح سے یہ مطلب واضح ہوگیا کہ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ: تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تمہارے اعمال ضائع ہوجائیں گے، ''پتا بھی نہیں چلے گا'' یعنی تم یہ سمجھو گے کہ ہماری طرف سے کوئی تکلیف نہیں پہنچی، حضور ﷺ نے ہماری اس بات کو، ہماری اس حرکت کو محسوس نہیں کیا، اور حقیقت میں تکلیف پہنچ گئی ہوگی، تو تمہیں پتا بھی نہیں چلے گا اور تمہارے اعمال خراب ہوجائیں گے، گویا کہ اِیذائے نبی حبطِ اَعمال کا ذریعہ ہے، اور مجلس کے اندر تڑاخ تڑاخ بولنا، بلند آواز سے باتیں کرنا، بسااوقات یہ اِیذا کا باعث بن جاتا ہے، اس خطرے کے پیشِ نظر تم یہ احتیاط رکھو کہ حضور ﷺ کی مجلس میں آپس میں بھی بلند آواز سے بات نہ کیا کرو، اور آپ ﷺ سے بات کرنے کی نوبت آئے تو زیادہ کھل کے بات نہ کیا کرو۔ تقویٰ حقیقت کے اعتبار سے یہی ہے کہ انسان خطرے کی بات سے بچنے کے لئے بہت ساری مباح باتوں سے بھی احتیاط کرے، تو یہاں بھی کوئی کوئی بات تو ایسی ہوسکتی ہے کہ کھل کے آپ بات کریں اور حضور ﷺ کو اِیذا نہ پہنچے، لیکن چونکہ اس کا کوئی فرد باعثِ اِیذا بھی ہوسکتا ہے تو اِحتیاط کے طور پر کلیۃً ہی ان باتوں کو چھوڑ دو، تاکہ لاشعوری میں حضور ﷺ کو کوئی اِیذا نہ پہنچ جائے اور تمہارے اعمال خراب نہ ہوجائیں۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں (ان آیات کی بہت اچھی وضاحت کی ہے انہوں نے، اس لیے میں ساتھ ساتھ ان کو پڑھ کے سنا رہا

ہوں) ''حضور ﷺ کی مجلس میں شور نہ کرو، اور جیسے آپس میں ایک دوسرے سے بے تکلف چہک کر، یا تڑخ کر بات کرتے ہو، حضور ﷺ کے ساتھ یہ طریقہ اختیار کرنا خلافِ ادب ہے، آپ سے خطاب کرو تو نرم آواز سے، تعظیم واحترام کے لہجے میں، ادب وشائستگی کے ساتھ۔ دیکھو! ایک مہذب بیٹا اپنے باپ سے، لائق شاگرد اُستاذ سے، مخلص مُرید پیرومُرشد سے، اور ایک سپاہی اپنے افسر سے کس طرح بات کرتا ہے؟، پیغمبر کا مرتبہ تو ان سب سے کہیں بڑھ کر ہے، آپ ﷺ سے گفتگو کرتے وقت پوری احتیاط رکھنی چاہیے، مبادا بے ادبی ہوجائے اور آپ کو تکدر پیش آجائے، تو حضور ﷺ کی ناخوشی کے بعد مسلمانوں کو ٹھکانا کہاں ہے؟ ایسی صورت میں تمام اعمال ضائع ہونے اور ساری محنت اَکارت جانے کا اندیشہ ہے۔ حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کی احادیث سننے اور پڑھنے کے وقت بھی یہ ہی ادب چاہیے، (یعنی جس مجلس میں حضور ﷺ کے اقوال پیش کیے جارہے ہوں، احادیث پڑھی جارہی ہوں، اس مجلس کے اندر بھی یہی ادب بحال رکھنا چاہیے کہ اس مجلس میں شور نہ ہو)، اور قبرِ شریف کے پاس حاضر ہوکر وہاں بھی ان آداب کو ملحوظ رکھے، نیز آپ کے خلفا، علمائے ربانیین اور اولوالامر کے ساتھ درجہ بدرجہ اسی ادب سے پیش آنا چاہیے، تاکہ جماعتی نظام قائم رہے، فرقِ مراتب نہ کرنے سے بہت مفاسد اور فتنوں کا دروازہ کھلتا ہے۔'' (تفسیر عثمانی)، بڑے اور چھوٹے کو اپنے مرتبے کا لحاظ رکھنا چاہیے، سرورِ کائنات ﷺ کے بعد آپ کے نائبین، آپ کے خلفاء، آپ کے ورثاء جو آپ کے علوم کے حامل ہیں یا مسلمانوں کی جماعت میں جن کا درجہ حکام کا ہے، ان کے آداب بھی درجہ بدرجہ اسی طرح سے رکھنے چاہئیں تاکہ جماعتی نظم بحال رہے۔

''نبی ﷺ'' کی طرح نبی کے اَحکام کی تعظیم بھی ضروری ہے!

اِنَّ الَّذِیْنَ یَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ: بے شک جو لوگ اپنی آواز پست رکھتے ہیں اللہ کے رسول کے سامنے
اُولٰٓىِٕكَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى: یہی لوگ ہیں کہ جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقوے کے لئے خالص کرلیا، یہ متقی ہونے کی علامت ہے جو حضور ﷺ کے سامنے دبی دبی باتیں کرتے ہیں، آہستہ آہستہ بولتے ہیں، جس طرح سے خوف زدہ آدمی بولا کرتا ہے،
لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ عَظِیْمٌ: ان کے لئے مغفرت ہے اور اجرِ عظیم ہے، (حضرت شیخ الاسلام لکھتے ہیں) ''یعنی جو لوگ نبی کی مجلس میں تواضع، ادب وتعظیم سے بولتے اور نبی کی آواز کے سامنے اپنی آوازوں کو پست کرتے ہیں، یہ وہ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے ادب کی تخم ریزی کے لئے پرکھ لیا ہے، اور مانجھ کر خالص تقویٰ وطہارت کے واسطے تیار کردیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں لکھتے ہیں کہ چار چیزیں اعظم شعائر اللہ سے ہیں، قرآن، پیغمبر، کعبہ، نماز، ان کی تعظیم وہی کرے گا جس کا دل تقویٰ سے مالا مال ہوگا وَمَنْ یُّعَظِّمْ شَعَآىِٕرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ، یہاں سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ جب حضور ﷺ کی آواز سے زیادہ آواز بلند کرنا خلافِ ادب ہے، تو آپ کے احکام وارشادات سننے کے بعد ان کے خلاف آواز اُٹھانا کس درجہ کا گناہ ہوگا'' (تفسیر عثمانی)۔ جب آپ کی آواز سے آواز اُونچی نہیں کی جاسکتی تو آپ کے اَحکام کے خلاف آواز اُٹھانا کس طرح سے قابلِ برداشت ہوسکتا ہے، جیسے کچھ عرصہ پہلے عورتیں میدان میں نکل آئیں، انہوں نے جو حکومت سے مطالبے کیے ہیں، تو اُس دن

ہم اسلام آباد ''علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی'' میں بیٹھے تھے، انگریزی میں ایک درخواست آئی تھی اور اس کا عربی میں ترجمہ کرنا تھا، تو اس میں جوان عورتوں نے مطالبے کیے ہیں ان میں ایک مطالبہ یہ بھی تھا کہ عورتوں کو مردوں کے برابر حقوق دیے جائیں، حتیٰ کہ شہادت میں بھی ان کو مرد کے برابر ٹھہرایا جائے، جیسے مرد کی گواہی ہے اسی طرح عورت کی گواہی ہو، عورت اور مرد کی گواہی کو برابر رکھا جائے، اب یہ قرآن کریم کے صریح حکم کے خلاف ہے، (پردے کے حکم کے خلاف بھی انہوں نے اسی طرح سے احتجاج کیا، اور مرد اور عورت کے اختلاط کے بارے میں بھی ان کا مطالبہ ہے کہ اس میں کوئی کسی قسم کی پابندی نہ ہو)۔ اب جن لوگوں نے یہ مطالبے کیے ہیں ان کا ایمان کس طرح سے باقی رہ گیا؟ جب صراحتاً اللہ تعالیٰ کے احکام کے خلاف وہ آواز بلند کر رہے ہیں۔ تو نبی کی آواز پر اگر آواز بلند نہیں کی جاسکتی تو اس کے احکام کے مقابلے میں آواز کس طرح سے اُٹھائی جاسکتی ہے، یہ سب کفر کی باتیں ہیں، ایمان کا تقاضا تو یہ ہے کہ حضور ﷺ کے حکم کے سامنے تو انسان نے کیا آنکھ اُٹھانی ہے، عام طور پر بات کرتے ہوئے بھی بالکل دبا دبا یا بات کرے، جس طرح سے ایک خوفزدہ آدمی یا نہایت ہی مؤدب شخص اپنے کسی بڑے کے ساتھ بات کیا کرتا ہے، آپ ﷺ کی احادیث کے تذکرے کے وقت بھی کیفیت ایسی ہی ہونی چاہیے۔

مجلسِ نبوی میں صحابہ کی کیفیت

جب یہ آیات اُتری ہیں تو اس کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا حال یہی تھا کہ حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھے ہوتے، تو کیفیت جیسے نقل کی گئی ہے ''کَاَنَّ عَلٰی رُؤُسِنَا الطَّیْرَ''[1] یوں بیٹھتے تھے گویا کہ سروں کے اُوپر پرندے بیٹھے ہیں۔ اور سر کے اُوپر پرندہ بیٹھا ہو تو انسان احتیاط کرتا ہے کہ ذرا بھی حرکت ہوگئی تو اُڑ جائے گا، یعنی پرندہ بھی آ کے آپ کے سر پہ بیٹھ سکتا ہے جب وہ فرق نہ کر سکے کہ یہ کوئی جاندار چیز ہے یا کوئی بے جان پتھر پڑا ہوا ہے، مطلب یہ ہے کہ یوں ساکن صامت ہوتے تھے کہ پرندے آ کر بھی اگر سر پر بیٹھ جائیں تو وہ محسوس نہ کریں کہ ان کے اندر کوئی جان اور حرکت ہے، ''کَاَنَّ عَلٰی رُؤُسِنَا الطَّیْرَ'' کا یہی معنی ہے کہ ہم اس طرح سے ہوتے تھے گویا کہ ہمارے سروں کے اُوپر پرندے بیٹھے ہیں۔

سیّدنا ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ کا واقعہ

ثابت بن قیس رضی اللہ عنہ ایک صحابی ہیں خزرج قبیلے میں سے، اور یہ خطیب الانصار کے لقب سے ملقب تھے، قدرتی طور پر ان کی آواز اُونچی تھی، واعظ اور مقرر جن کو بولنے کی عادت ہوتی ہے تو ان کی آواز طبعاً اُونچی ہوہی جاتی ہے، تو ان کو فکر ہوا کہ میں تو جب بھی حضور ﷺ کی مجلس میں بیٹھتا تھا اور بات کرتا تھا تو میری آواز تو اُونچی ہوہی جاتی تھی، چونکہ طبعی طور پر آواز بلند ہے، اس لیے ان کو خطرہ ہو گیا کہ میرے تو اعمال برباد ہوگئے، اسی فکر میں گھر بیٹھ کر اس نے رونا شروع کر دیا، سر اُوپر نہیں اُٹھاتے تھے، ہر وقت غم کے ساتھ سر جھکائے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ نے دیکھا کہ کئی وقت گزر گئے اور ثابت نظر نہیں آیا، پوچھا کہ کیا وہ بیمار ہے؟ کیا ہوگیا؟ ایک آدمی کہنے لگا: یارسول اللہ! میں حالات کی خبر لے کر آتا ہوں، جب گئے تو جا کر دیکھا کہ سر جھکائے ہوئے ہے اور رو رہا

---

(۱) ابن ماجہ ص۱۱۱ باب ما جاء فی الجلوس فی المقابر / مشکوٰۃ ۱/ ۱۴۹ باب دفن المیت، فصل ثانی، عن البراء۔

ہے، پوچھا تو کہنے لگے کہ بس میں تو جہنمی ہوں، میرے اعمال تو برباد ہو گئے، میں تو حضور ﷺ کی مجلس میں بات کیا کرتا تھا تو میری آواز اُونچی ہو جاتی تھی، وہ شخص آیا اور آ کر اس نے حضور ﷺ کو حال بتایا، آپ ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! وہ جہنمی نہیں، وہ تو جنتی ہے۔ (1) مطلب یہ ہے کہ اس طرح سے خوف و ہراس طاری ہو گیا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر، کہ طبعی طور پر بھی اگر کسی کی آواز اُونچی تھی تو وہ بھی محسوس کرنے لگ گیا کہ میں حضور ﷺ کی مجلس میں بولتا ہوں تو کہیں ایسا نہ ہو کہ میری آواز آپ ﷺ کی آواز سے اُونچی ہو جائے، اور آپ ﷺ کے لئے باعثِ تکلیف ہو جائے اور اس سے ہمارے اعمال ضائع ہو جائیں۔ تو آپس میں یوں باتیں کیا کرتے تھے جس طرح سرگوشی کی جاتی ہے، اور حضور ﷺ سے بھی بات کرنے کی نوبت آتی تو نہایت پست آواز کے ساتھ اور ادب کے ساتھ بات کیا کرتے تھے۔

حضور ﷺ سے ملاقات کا ادب

اِنَّ الَّذِیْنَ یُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ: یہ وہ بنی تمیم والی بات آ گئی، بے شک وہ لوگ جو آوازیں دیتے ہیں آپ کو حجروں کے سامنے سے۔ وراء: پیچھے، سامنے، یہاں حجرات سے باہر کا حصہ مراد ہے، "جو حجرات کے سامنے سے آپ کو آوازیں دیتے ہیں" اَكْثَرُهُمْ لَا یَعْقِلُوْنَ: ان میں سے اکثر کو عقل نہیں، اکثر اس لیے کہہ دیا کہ بعض اس بات کو سمجھتے تو ہوں لیکن دیکھا دیکھی انہوں نے بھی یوں کر لیا ہو، "اکثر ان میں سے عقل نہیں رکھتے" وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَیْهِمْ: اور اگر وہ صبر کرتے حتیٰ کہ آپ ان کی طرف نکل کے آ جاتے، لَكَانَ خَیْرًا لَّهُمْ: تو ان کے لئے بہتر ہوتا، وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ: اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، یعنی ان لوگوں کو چاہیے تھا کہ باہر بیٹھ کر انتظار کرتے، حضور ﷺ اپنی عادت شریفہ کے مطابق جب گھروں سے باہر آتے تو اس وقت ان سے بات کر لیتے، کیونکہ کسی کو کیا پتا کہ آپ ﷺ کس حال میں ہیں حجرے میں، آرام میں ہوں تو آپ کو بے آرام کرنا بھی ٹھیک نہیں، کسی اہم کام میں لگے ہوئے ہوں تو بھی پریشان کرنا ٹھیک نہیں، اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی اَحکام اُتر رہے ہیں، کوئی وحی کی کیفیت ہے، تو اس طرح سے شور مچانے لگ جانا یہ کون سا ادب کا تقاضا ہے، یہ کوئی عقل کا تقاضا نہیں ہے۔ اسی کی تفسیر میں (حضرت شیخ الاسلامؒ) لکھتے ہیں کہ "بنی تمیم ملنے کو آئے تو حضور ﷺ حجرہ مبارک میں تشریف رکھتے تھے، وہ لوگ باہر سے آوازیں دینے لگے: "یَا مُحَمَّدُ! اُخْرُجْ اِلَیْنَا" یہ بے عقلی اور بے تہذیبی کی بات تھی، رسول اللہ ﷺ کے مرتبے کو نہیں سمجھتے تھے، کیا معلوم ہے اس وقت آپ ﷺ پر وحی نازل ہو رہی ہو، یا کسی اور مہم کام میں مشغول ہوں، آپ ﷺ کی ذات منبع البرکات تو مسلمانوں کے تمام دینی و دُنیوی اُمور کا مرکز اور ملجا تھی، کسی معمولی ذمہ دار آدمی کے لئے بھی کام کرنا سخت مشکل ہو جائے اگر اس کا کوئی نظام الاوقات نہ ہو، اور آخر پیغمبر کا ادب واحترام بھی کوئی چیز ہے، چاہیے تھا کہ کسی کی زبانی اندر اطلاع کراتے، اور آپ ﷺ کے باہر تشریف لانے تک صبر کرتے، جب آپ ﷺ باہر تشریف لا کر ان کی طرف متوجہ ہوتے اس وقت خطاب کرنا چاہیے تھا، ایسا کیا جاتا تو اُن کے حق میں بہتر اور قابلِ ستائش ہوتا، تاہم بے عقلی اور نادانستگی سے جو بات اتفاقاً سرزد ہو جائے اللہ

(1) مسلم ۱/۷۵ باب مخافۃ المؤمن ان یحبط عملہ: بخاری ۱/۵۱۰۔ مشکوٰۃ ۲/۵۷۶ باب جامع المناقب، فصل اول۔ نیز مظہری، ابن کثیر وغیرہ۔

اس کو اپنی مہربانی سے بخشنے والا ہے، چاہیے کہ اپنی تقصیر پر نادم ہو کر آئندہ ایسا رویہ اختیار نہ کریں، حضور ﷺ کی تعظیم و محبت ہی وہ نقطہ ہے جس پر قومِ مسلم کی تمام پراگندہ قوتیں اور منتشر جذبات جمع ہوتے ہیں، اور یہی وہ ایمانی رشتہ ہے جس پر اسلامی اخوت کا نظام قائم ہے'' (تفسیر عثمانی)۔ تو یہ حضور ﷺ کے متعلق ایک ادب اِس آیت کے اندر واضح کر دیا۔

جماعتی شیرازہ بندی کے لئے اہم اُصول

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَیَّنُوْۤا اَنْ تُصِیْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِیْنَ: آدابِ نبوی کے بعد آپس میں معاملات کے کچھ آداب بتائے جا رہے ہیں، خصوصیت کے ساتھ یہاں جماعت کی شیرازہ بندی ہے، اور وہ سوراخ بند کیے جا رہے ہیں جن کی بنا پر آپس میں اختلاف اور انتشار ہوتا ہے، لڑائی جھگڑوں کی بنیاد اکثر و بیشتر غلط خبریں ہوتی ہیں، ایک آدمی بے احتیاطی کے ساتھ آ کے کسی دوسرے کے متعلق کوئی غلط سی خبر نقل کر دیتا ہے، اور دوسرے بغیر تحقیق کے اس کو قبول کر لیتے ہیں اور قبول کر کے اس کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتے ہیں، تو آپس میں لڑائی ہو جاتی ہے، اس لیے سب سے پہلے بنیادی اُصول یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر تمہارے سامنے کوئی شریر قسم کا آدمی خبر لائے، جس کے اوپر عدالت اور ثقاہت کے آثار نہیں، بلکہ کچھ بے احتیاط سا ہے، جس کو فاسق کہہ سکتے ہیں، خبرِ فاسق، فقہ کے اندر جس طرح سے یہی عنوان اختیار کیا جاتا ہے، تو اس کی بات کے اُوپر جلدی اعتبار نہ کر لیا کرو، تحقیق کیا کرو، تحقیق کرنے کے بعد کوئی قدم اُٹھایا کرو، ایسا نہ ہو کہ بلا سوچے سمجھے تم کسی قوم کے خلاف کوئی اِقدام کر بیٹھو، اور جب بعد میں پتا چلے کہ اس شرارتی نے تو بات ہی غلط کی تھی، اور خود شرارت پھیلائی ہے، پھر تم بھی شرم سار ہو جاؤ گے۔

''فاسق کی خبر'' کا حکم

اس لیے فقہاء کہتے ہیں کہ فاسق کی خبر قابلِ اعتماد نہیں جس وقت تک کہ اس کی پوری تحقیق نہ کر لی جائے...... لیکن خبر سے مراد ایسی خبر ہے کہ جس کے اندر الزام کا معنی ہو کہ جس پر عمل کرنے کی صورت میں کسی دوسرے کو نقصان پہنچے، کسی دوسرے پر کوئی ذمہ داری آتی ہو، اور ایسی باتیں جن کے اندر کوئی اس قسم کی ذمہ داری نہیں ہوتی، عام معاشرت میں جس طرح سے چلتی رہتی ہیں کہ آپ کو کسی نے بلایا ہے، یہ چیز آپ کے لئے کسی نے بھیجی ہے، یہ معمولی معمولی سی چیزیں، دعوت میں، ہدیے میں، اِذن میں، اور اس قسم کی باتیں جو ہوا کرتی ہیں جن میں کسی پر کوئی ذمہ داری نہیں آتی، اِلزام نہیں آتا، جس پر عمل کرنے کی بنا پر کسی کا کوئی نقصان نہیں ہوتا، وہاں تو فاسق کی خبر لی جا سکتی ہے۔ اور جس خبر کے اندر کوئی اِلزام کا معنی ہو، کہ کسی دوسرے پر ذمہ داری پڑ جائے گی، اور اس پر عمل کرنے کی صورت میں کسی کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے، وہاں فاسق کی خبر قبول نہیں ہے، وہاں پوری طرح سے احتیاط کرنی چاہیے، تحقیق کرنی چاہیے، جب تک کسی دوسری جگہ سے اس کے صدق کے قرائن نہ ملیں اس خبر کے اوپر عمل نہ کرو، آپ جانتے ہی ہیں کہ اکثر و بیشتر لڑائیاں اسی وجہ سے ہوا کرتی ہیں کہ کوئی شرارتی جھوٹی خبر اڑا دیتا ہے اور دوسرے سننے والے اس پر یقین کر کے

اس کے مطابق کارروائی شروع کر دیتے ہیں تو فساد ہو جاتا ہے، تو پہلے تو یہی سوراخ بند کر دیا، کہ ''اے ایمان والو! جب تمہارے پاس کوئی شریر آدمی خبر لے کر آئے'' فَتَبَيَّنُوْٓا: تو خوب اچھی طرح سے تحقیق کیا کرو، اس کی وضاحت طلب کیا کرو، اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ: مَخَافَةَ اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ، اس اندیشے کی بنا پر کہ تم جا پڑو کسی قوم کو نادانی سے، اپنی جہالت کے سبب سے، نادانی کے سبب سے تم کسی قوم کو تکلیف پہنچا دو، فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ: پھر ہو جاؤ گے تم اپنے کیے پہ پشیمان، یعنی بلا سوچے سمجھے نادانی سے کسی قوم کو کوئی نقصان پہنچا دو گے، اور پھر تمہیں نادم ہونا پڑے گا، اس لیے اس بات کی رعایت رکھا کرو کہ اگر کوئی ثقہ عادل نہیں ہے، ایک عامی سا آدمی ہے جس کے اوپر کوئی شرارت کے آثار ہیں اس کی خبر کا کبھی یقین نہ کیا کرو۔ (حضرت شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں) ''اکثر نزاعات و مناقشات کی ابتدا جھوٹی خبروں سے ہوتی ہے، اس لیے اوّل اختلاف و تفریق کے اسی سرچشمے کو بند کرنے کی تعلیم دی یعنی کسی خبر کو یوں ہی بے تحقیق قبول نہ کرو۔ فرض کیجیے! ایک بے راہرو اور تکلیف دہ آدمی نے اپنے کسی خیال اور جذبے سے بے قابو ہو کر کسی قوم کی شکایت کی، تم محض اس کے بیان پر اعتماد کر کے اس قوم پر چڑھ دوڑے، بعدہٗ ظاہر ہوا کہ اس شخص نے غلط کہا تھا، تو خیال کرو اس وقت کس قدر پچھتانا پڑے گا، اور اپنی جلد بازی پر کیا کچھ ندامت ہوگی اور اس کا نتیجہ جماعت اسلام کے حق میں کیسا خراب ہوگا'' (تفسیر عثمانی)۔

دِینی و دُنیوی اُمور میں حضور ﷺ کی اطاعت کی تاکید اور اس کی مختلف صورتیں

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ: اور تم یقین کرو، جان لو کہ اللہ کا رسول تم میں موجود ہے، لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ: اگر وہ اطاعت کرے تمہاری بہت سے کاموں میں، لَعَنِتُّمْ: تو تم مشقت میں پڑ جاؤ گے، وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ: لیکن اللہ تعالیٰ نے تمہاری طرف ایمان محبوب کر دیا، وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ: اور اُس ایمان کو تمہارے دِلوں میں مزین کر دیا، وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ: اور مکروہ ٹھہرا دیا تمہاری طرف کُفر کو، فسق کو، اور نافرمانی کو۔ فسوق کے اندر گناہِ کبیرہ آ جائے گا، اور عصیان کے اندر گناہ صغیرہ۔ یہی لوگ جو کہ ایمان سے محبت رکھنے والے ہیں، کامل ایمان کے متلاشی ہیں، ''یہی لوگ سیدھے راستے پر چلنے والے ہیں، اللہ کے فضل سے اور اللہ کی نعمت سے'' وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ: اور اللہ علم والا حکمت والا ہے۔ اس آیت میں یہ واضح کر دیا گیا کہ اپنے معاملات میں بھی حضور ﷺ کے اشاروں کی اطاعت کیا کرو، اپنی منوانے کی کوشش نہ کیا کرو، اگر اپنی منوانے کی کوشش کرو گے تو عام طور پر ہر شخص مشورہ دیتے وقت یا بات کرتے وقت اپنی اَغراض کو یا اپنے فوائد کو سامنے رکھا کرتا ہے، دوسرے کے فوائد اتنے مدنظر نہیں رہا کرتے، اگر اس طرح سے تم اپنی منوانے کی کوشش کرو گے تو کئی دفعہ تم تکلیف میں مبتلا ہو جاؤ گے، اور اللہ کا رسول جو سوچتا ہے تو وہ سب کی ہمدردی کو سامنے رکھ کے سوچتا ہے، اس لیے اللہ کا رسول جو کچھ کہے اسی کے ماننے میں تمہارا بھلا ہے دُنیوی معاملات میں بھی، یعنی شرعی احکام میں تو کسی کو رائے دینے کا حق ہی نہیں اللہ کے رسول کے سامنے، انتظامی معاملات میں بھی اور دُنیوی معاملات میں بھی اللہ کے رسول کی رائے کو فوقیت دیا کرو، اگر وہ تمہاری ماننے لگ جائیں تو کئی دفعہ ایسا ہوگا کہ تم مصیبت میں

پڑ جاؤ گے، تمہاری رائے اِس طرح سے صحیح نہیں ہوسکتی، کیونکہ ہر شخص جو سوچتا ہے تو اپنی معلومات کے تحت، اور بسا اوقات اُس کے اپنے جذبات اُس میں دخیل ہوتے ہیں، اور اللہ کے نبی کے جذبات ہر کسی کے لئے ایک جیسے ہوتے ہیں، وہ ہر کسی کی ہمدردی اور بھلائی کو سوچتے ہیں، اس لیے اُن کی بات مانا کرو، اپنی منوانے کی کوشش نہ کیا کرو۔

صحابہ کی منقبت

آگے صحابہ رضی اللہ عنہم کی ایک منقبت وفضیلت کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایمان تمہارے دلوں میں محبوب بنا دیا، اور ایمان تمہارے دلوں میں مزین ہو گیا، اور اللہ نے کُفر فسق اور عصیان کو تمہارے لیے مکروہ ٹھہرا دیا، جس کی بناء پر تم ایسے ہی ہو کہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے ہو، اور جو اس طرح سے کرتے ہیں یہی سیدھے راستے پر چلنے والے ہیں۔ تو یہ نصیحت تمہیں جو کی جارہی ہے مزید احتیاط کے لیے کی جارہی ہے ورنہ تمہارے دل ہمیشہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہی مائل ہیں، اور کامل ایمان کے متلاشی ہیں۔ یہ خبر دی گئی ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بہت بڑی منقبت ثابت ہو رہی ہے...... حضرت شیخ (الاسلامؒ) لکھتے ہیں ''یعنی اگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری کسی خبر یا رائے پر عمل نہ کریں تو بُرا نہ مانو (تم نے ایک بات کہی کہ یوں کر لیا جائے، اللہ کے رسول نے نہیں مانی، تو تم اس کو بُرا نہ مانو) حق لوگوں کی خواہشوں یا رایوں کے تابع نہیں ہوسکتا، ایسا ہو تو زمین وآسمان کا سارا کارخانہ ہی درہم برہم ہو جائے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں وَلَوِ اتَّبَعَ الْحَقُّ أَهْوَآءَهُمْ لَفَسَدَتِ السَّمٰوٰتُ وَالْأَرْضُ (سورۂ مؤمنون: ٧١) الغرض! خبروں کی تحقیق کیا کرو، اور حق کو اپنی خواہش اور رائے کے تابع نہ بناؤ، بلکہ اپنی خواہشات کو حق کے تابع رکھو، اس طرح تمام جھگڑوں کی جڑ کٹ جائے گی۔ حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں یعنی تمہارا مشورہ قبول نہ ہو تو بُرا نہ مانو، رسول عمل کرتا ہے اللہ کے حکم پر، اسی میں تمہارا بھلا ہے، اگر تمہاری بات مانا کرے تو ہر کوئی اپنے بھلے کی کہے، پھر کس کس کی بات پر چلے؟ (یعنی ہر کوئی اپنے فائدے کی بات کہے گا تو رسول کس کس کی مان سکتا ہے؟ اس لیے یہ طریقہ ہی غلط ہے کہ تم اپنی منوانے کی کوشش کرو، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو کہیں بس اسی بات کو کرتے چلے جایا کرو)، اگر تم یہ چاہتے ہو کہ پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام تمہاری ہر بات مانا کریں تو بڑی مشکل ہوگی، لیکن اللہ کا شکر کرو کہ اس نے اپنے فضل واحسان سے مؤمنین قانتین کے دِلوں میں ایمان کو محبوب بنا دیا، اور کُفر ومعصیت کی نفرت ڈال دی، جس سے وہ ایسی بیہودگی کے پاس بھی نہیں جاسکتے۔ جس مجمع میں اللہ کا رسول جلوہ افروز ہو، وہاں کسی کی رائے اور خواہش کی پیروی کہاں ہوسکتی ہے؟ آج گو حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے درمیان موجود نہیں، مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور آپ کے وارث اور نائب یقیناً موجود ہیں اور رہیں گے'' (تفسیر عثمانی)، ان سے مشورہ لے کر اللہ کے رسول کا حکم معلوم کر کے اب اسی کی اتباع کرنے میں خیر اور بھلائی ہے، یہ پوچھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اس کام کے بارے میں کیا ہیں؟ جو ہدایات سامنے آئیں انہی کو مان لینے میں مسلمانوں کی جماعت کو فائدہ ہے۔

مؤمنین کی آپس کی لڑائی کے متعلق ہدایات

وَاِنْ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ اقْتَتَلُوْا: اگر مؤمنین کے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں، لڑائی ہو جائے تو آپس میں غلط فہمیاں ہوتی ہیں، کچھ آپس میں خواہشات کا اختلاف ہونے کی بنا پر کشاکشی ہو جاتی ہے، ''اگر دو گروہ مؤمنین کے آپس میں لڑ پڑیں'' فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا: تو ان کے درمیان حالات کی اصلاح کر دیا کرو، یہ عام مؤمنین کو بھی خطاب ہو سکتا ہے، خصوصیت کے ساتھ حکام کو بھی ہو سکتا ہے۔ فَاِنْۢ بَغَتْ اِحْدٰىهُمَا عَلَى الْاُخْرٰى: اور اگر ان دونوں میں سے ایک طائفہ دوسرے کے مقابلے میں سرکشی کرے، اُن کے اُوپر زیادتی کرے، فَقَاتِلُوا الَّتِیْ تَبْغِیْ: پھر تم سب مل کر لڑو اس کے ساتھ جو زیادتی کرتا ہے حَتّٰى تَفِیْٓءَ اِلٰۤى اَمْرِ اللّٰهِ: یہاں تک کہ وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آئے۔ فَاِنْ فَآءَتْ: اور اگر وہ اللہ کے حکم کی طرف لوٹ آیا، فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا بِالْعَدْلِ: پھر ان کے درمیان حالات کی اصلاح کر دو، صلح کروا دو، عدل کے ساتھ، وَاَقْسِطُوْا: اور انصاف کیا کرو، اِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُقْسِطِیْنَ: بے شک اللہ تعالیٰ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتے ہیں۔ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ: ایمان والے سب آپس میں بھائی ہیں، فَاَصْلِحُوْا بَیْنَ اَخَوَیْكُمْ: تو اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو، اُن کے حالات ٹھیک کر دیا کرو اگر آپس میں کوئی گڑبڑ ہو جائے، وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ: اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔ (حضرت شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں) ''یعنی ان تمام پیش بندیوں کے باوجود اگر اتفاق سے مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں.....! پہلے تو یہ پیش بندیاں کی جا رہی ہیں تا کہ لڑنے کی نوبت ہی نہ آئے، لیکن اگر پھر بھی کوئی لڑائی ہو جائے، دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں تو پوری کوشش کرو کہ اختلاف رفع ہو جائے، اس میں اگر کامیابی نہ ہو اور کوئی فریق دوسرے پر چڑھا چلا جائے اور ظلم و زیادتی ہی پر کمر باندھ لے تو یکسو ہو کر نہ بیٹھ رہو، بلکہ جس کی زیادتی ہو سب مسلمان مل کر اس سے لڑائی کریں، یہاں تک کہ وہ فریق مجبور ہو کر اپنی زیادتیوں سے باز آ جائے، اور خدا کے حکم کی طرف رُجوع ہو کر صلح کے لئے اپنے آپ کو پیش کر دے، اُس وقت چاہیے کہ مسلمان دونوں فریقوں کے درمیان مساوات اور انصاف کے ساتھ صلح اور میل ملاپ کرا دیں، کسی ایک کی طرف داری میں جادۂ حق سے اِدھر اُدھر نہ جھکیں۔ آیت کا نزول صحیحین کی روایت کے موافق اَنصار کے دو گروہ اوس اور خزرج کے ایک وقتی ہنگامے کے متعلق ہوا ہے، حضور ﷺ نے ان کے درمیان اسی آیت کے ماتحت صلح کرا دی، جو لوگ خلیفہ کے مقابلے میں بغاوت کریں وہ بھی عمومِ آیت میں داخل ہیں، چنانچہ قدیم علمائے سلف بغاوت کے مسئلے میں اسی سے استدلال کرتے آئے ہیں، لیکن جیسا کہ شانِ نزول سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کی تمام جماعتی مناقشات اور مشاجرات کو شامل ہے'' (تفسیر عثمانی)۔ اور باغیوں کے متعلق بھی مفسرین نے اسی آیت کے تحت میں تفصیل کی ہے کہ اِمام کے خلاف اگر کوئی طائفہ باغی ہو جائے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ اِمام کا ساتھ دیں، اور اس طرح سے ان باغیوں کو دبا دیا جائے تا کہ مسلمانوں کے اندر مزید اِنتشار نہ پھیلے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ وَ

اے ایمان والو! کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اُڑایا کرے، ہوسکتا ہے کہ جن کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے وہ اِن مذاق اُڑانے والوں سے بہتر ہوں، اور

لَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُنَّ خَيْرًا مِّنْهُنَّ ۚ

نہ عورتیں عورتوں سے مذاق کریں، ہوسکتا ہے کہ وہ عورتیں جن کا مذاق اُڑایا جا رہا ہے وہ اِن مذاق اُڑانے والیوں سے بہتر ہوں،

وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ

اور اپنے لوگوں کو طعنے نہ دیا کرو، اور بُرے نام کے ساتھ آپس میں ایک دوسرے کو پکارا نہ کرو، بُرا نام ہے گناہگاری ایمان کے بعد،

وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ⑪ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫

اور جو کوئی توبہ نہیں کرے گا (اپنی پچھلی غلطیوں سے) یہی لوگ قصوروار ہیں ⑪ اے ایمان والو! زیادہ گمان کرنے سے بچا کرو،

اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوْا وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ

بعض گمان گناہ ہوتے ہیں، اور چھپ چھپ کے لوگوں کے عیب تلاش نہ کیا کرو، اور نہ غیبت کرے تم میں سے کوئی کسی کی،

اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا فَكَرِهْتُمُوْهُ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ

کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے کہ اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ پس تم اس سے نفرت کرتے ہو، اللہ سے ڈرتے رہو،

اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ ⑫ يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ

بے شک اللہ معاف کرنے والا مہربان ہے ⑫ اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک مذکر اور مؤنث سے، اور بنایا ہم نے تمہیں

شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ ؕ

مختلف قومیں اور قبیلے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ باعزت تم میں سے وہی ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے،

اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ⑬ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا

بے شک اللہ تعالیٰ علم رکھنے والا ہے خبر رکھنے والا ہے ⑬ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے،

وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ

بلکہ تم کہو کہ ہم فرماں بردار ہوگئے ہیں، اور نہیں داخل ہوا ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں، اگر تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے

لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ

تو اللہ نہیں کم کرے گا تمہارے عملوں میں سے کچھ بھی، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ﴿۱۴﴾ سوائے اس کے نہیں کہ کامل مؤمن

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ

وہی ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاتے ہیں پھر شک اور شبہ میں مبتلا نہیں ہوتے اور اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ

فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ

اللہ کے راستے میں جہاد کیا، یہی (دعویٰ ایمان میں) سچے ہیں ﴿۱۵﴾ آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو اپنا دین؟ حالانکہ اللہ جانتا ہے

مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۱۶﴾ يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ

جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے ﴿۱۶﴾ احسان جتلاتے ہیں آپ پر کہ

اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ

وہ مسلمان ہوگئے، آپ کہہ دیجئے کہ میرے پہ اپنے اسلام کا احسان نہ جتلاؤ بلکہ اللہ ہی نے تم پر احسان کیا کہ تمہیں ایمان کی ہدایت دے دی،

اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

اگر تم سچے ہو ﴿۱۷﴾ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے آسمانوں اور زمینوں میں چھپی ہوئی چیزوں کو، اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو ﴿۱۸﴾

تفسیر

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ: یہ باتیں جو آگے ذکر کی جارہی ہیں یہ بھی لڑائی سے بچانے کے لئے ہیں، لڑائی کی ابتدا بسا اوقات ایسی چھوٹی چھوٹی باتوں سے ہوتی ہے، کسی نہ کسی سے ہنسی کرلی، مذاق کردیا، کسی کا کوئی عیب ذکر کردیا، اور اس کو کسی برے نام سے پکار لیا، پس پشت غیبت کرلی، اور خواہ مخواہ بلا کسی دلیل کے ایک دوسرے پہ بدگمانی کرلی، یہ باتیں ہیں جن کی بنا پر آپس میں تعلقات خراب ہوا کرتے ہیں، تو اگلی آیات میں یہی ہدایات دی جارہی ہیں۔

ایک دوسرے کا مذاق اُڑانے کی ممانعت

''اے ایمان والو! کوئی قوم دوسری قوم سے ٹھٹھا نہ کیا کرے'' عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنُوْا خَيْرًا مِّنْهُمْ: ہوسکتا ہے کہ ٹھٹھا کرنے والوں سے وہ لوگ زیادہ بہتر ہوں جن سے ٹھٹھا کیا جارہا ہے، یعنی ہر شخص کو یہ سمجھنا چاہیے کہ جس کا میں مذاق اُڑا رہا ہوں ہوسکتا ہے

مجھ سے بہتر ہو، ظاہری حالت اگر ایک شخص کی کچھ خراب بھی ہو، تو باطن کا معاملہ اللہ کے ساتھ ہے، کیا معلوم کہ اس کے ایمان کی اور اس کے جذبات کی کیا کیفیت ہے، آپ کے مقابلے میں اللہ کو وہ زیادہ پسند ہو، تو کیا حق ہے تمہیں کہ کسی کے ظاہری نقص کو دیکھ کر اس کا مذاق اُڑاؤ، ''کوئی قوم کسی قوم کا مذاق نہ اُڑایا کرے، ان سے ٹھٹھا نہ کرے، ہوسکتا ہے کہ جن کا مذاق اُڑایا جارہا ہے وہ ان مذاق اُڑانے والوں سے بہتر ہوں'' وَلَا نِسَآءٌ مِّنْ نِّسَآءٍ: اور نہ عورتیں ہی عورتوں سے مذاق کریں، تمسخر کریں، استہزا کریں، عَسٰۤى اَنْ یَّكُنَّ خَیْرًا مِّنْهُنَّ: ہوسکتا ہے کہ وہ عورتیں جن کا مذاق اُڑایا جارہا ہے وہ ان مذاق اُڑانے والیوں سے بہتر ہوں، یعنی مرد، مردوں کے ساتھ ایسی ہنسی نہ کریں، عورتیں عورتوں کے ساتھ نہ کریں۔

طعنہ دینے اور بُرے القاب کے ساتھ پکارنے کی ممانعت

وَلَا تَلْمِزُوْۤا اَنْفُسَكُمْ: اپنے لوگوں کو طعنے نہ دیا کرو، یعنی کوئی عیب منہ پہ ذکر کر کے طعنہ دینا یہ بھی ٹھیک نہیں ہے، کسی کا کوئی عیب تمہیں معلوم ہے تو اُس کو اس کے منہ پر ذکر کرو اور طعنہ دو، ایسا بھی نہ کیا کرو، وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ: اور بُرے ناموں کے ساتھ آپس میں ایک دُوسرے کو پکارا نہ کرو، بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِیْمَانِ: بُرا ہے نام فسق ایمان کے بعد، یعنی ایمان لے آنے کے بعد کسی کے اُوپر گناہ کا نام آئے، کسی کے اُوپر فسق کا الزام لگے، کتنی بُری بات ہے، یعنی تم اپنے آپ کو مؤمن کہتے ہو، ایمان لائے ہو، پھر اس قسم کے کام کرو جن کی بنا پر تمہارا لقب فاسق ہوجائے یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے، ایمان کے بعد فسوق نام اچھا نہیں ہے، یعنی کسی کا نام پھر فاسق رکھ دیا جائے اس کے اوپر فسق صادق آجائے یہ کوئی اچھی بات نہیں، ایمان لانے کے بعد ان کاموں سے بچنا چاہیے، ''بُرا نام ہے گناہ گاری ایمان کے بعد'' وَمَنْ لَّمْ یَتُبْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ: اور جو کوئی توبہ نہیں کرے گا اپنی پچھلی غلطیوں سے یہی لوگ قصوروار ہیں۔

(شیخ الاسلام لکھتے ہیں) ''اوّل مسلمانوں میں نزاع واختلاف کو روکنے کی تدبیر بتلائی تھی، پھر بتلایا کہ اگر اتفاقاً اختلاف رُونما ہوجائے تو پُرزور اور مؤثر طریقے سے اس کو مٹایا جائے، لیکن جب تک نزاع کا خاتمہ نہ ہو کوشش ہونی چاہیے کہ کم از کم جذبات منافرت ومخالفت زیادہ تیز اور مشتعل نہ ہونے پائیں، عموماً دیکھا جاتا ہے کہ جہاں دو شخصوں یا دو جماعتوں میں اختلاف رُونما ہوا، بس ایک دوسرے کا تمسخر اور استہزا کرنے لگتا ہے، ذرا سی بات ہاتھ لگ گئی اور ہنسی مذاق اُڑانا شروع کر دیا، حالانکہ اسے معلوم نہیں کہ شاید جس کا مذاق اُڑایا جارہا ہے وہ اللہ کے نزدیک اس سے بہتر ہو، بلکہ بسا اوقات یہ خود بھی اختلاف سے پہلے اس کو بہتر سمجھتا ہوتا ہے، مگر ضد ونفسانیت میں دوسرے کی آنکھ کا تنکا نظر آتا ہے، اپنی آنکھ کا شہتیر نظر نہیں آتا، اس طریقہ سے نفرت وعداوت کی خلیج روز بروز وسیع ہوتی رہتی ہے اور قلوب میں اس قدر بعد ہوجاتا ہے کہ صلح وائتلاف کی کوئی اُمید باقی نہیں رہتی، آیت ہٰذا میں خداوندِ قدوس نے اسی قسم کی باتوں سے منع فرمایا ہے، یعنی ایک جماعت دُوسری جماعت کے ساتھ نہ مسخراپن

کرے، نہ ایک دُوسرے پر آوازے کسے جائیں، نہ کھوج لگا کر عیب نکالے جائیں، نہ بُرے ناموں اور بُرے القاب سے فریقِ مقابل کو یاد کیا جائے، کیونکہ ان باتوں سے دشمنی اور نفرت میں ترقّی ہوتی ہے، اور فتنہ وفساد کی آگ زیادہ تیزی سے پھیلتی ہے، سبحان اللہ! کیسی بیش بہا ہدایات ہیں، آج اگر مسلمان سمجھیں تو ان کے سب سے بڑے مرض کا مکمل علاج اسی ایک سورۂ حجرات میں موجود ہے'' (تفسیر عثمانی)۔

بدگمانی اور جاسوسی کی ممانعت

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ: اے ایمان والو! زیادہ گمان کرنے سے بچا کرو، یہاں گمان سے وہی جو بِلا دلیل دوسرے کے متعلق بدگمانیاں کرلی جاتی ہیں، ''بعض گمان گناہ ہوتے ہیں'' چونکہ خلافِ واقع ہے، جب کسی کے متعلق بُرا سوچو گے تو گناہ ہی ہوگا۔ وَلَا تَجَسَّسُوْا: اور لوگوں کے عیب تلاش نہ کیا کرو، یعنی چُھپ چُھپ کے کسی کے عیب تلاش کرنا، جاسوسی کرنا، ''جاسوسی نہ کیا کرو، چُھپ چُھپ کے لوگوں کے عیب تلاش نہ کیا کرو۔''

غیبت کی ممانعت

وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا: اور نہ بعض بعض کی غیبت کیا کرے، غیبت کا معنی ہوتا ہے پسِ پشت کسی کا بُرائی سے ذکر کرنا، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! غیبت کیا چیز ہے؟ آپ نے فرمایا: ''ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ'' تیرا اپنے بھائی کو ایسے الفاظ کے ساتھ ذکر کرنا کہ جب اس کو پتا چلے کہ اس نے میرے متعلق یہ لفظ بولے ہیں تو ناگوار گزرے[1] ''پس پشت ایسی بات ذکر نہ کیا کرو'' تو پس پشت ذکر کرنا یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی اپنے مرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے، اگر سامنے کوئی اس طرح سے طعنہ دیتا ہے تو ایسے ہے جیسے ایک بالمشافہ اس کو نوچتا ہے، تو یہ بھی تکلیف دہ بات ہے، اس سے پہلے منع کردیا، کہ سامنے بھی کسی کے عیب کو ذکر کرکے اس کو چڑانا مناسب نہیں ہے، بُرے نام سے پکارنا بھی مناسب نہیں ہے، اور پسِ پشت ذکر کرنا یہ تو پھر بہت ہی بُری بات ہے، کیونکہ وہ مدافعت پر بھی قادر نہیں ہوتا، اس لیے یہاں یہ مثال دی گئی کہ کسی کا عیب پسِ پشت ذکر کرنا جس سے اُس کو ناگواری ہو جب پتا چلے، یہ ایسے ہی ہے جیسے مُردہ بھائی کا گوشت کھایا جائے، اور تمہیں کتنی کراہت ہے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے سے، جب تم اُس سے کراہت کرتے ہو تو پھر پسِ پشت کسی کا عیب ذکر کرنے سے بھی بچا کرو۔ یہ عیب ذکر کرنا اس کو محض ذلیل اور حقیر کرنے کے لئے یہ ہے غیبت، اور اگر کسی مصلحت شرعی کے تحت ہو تو اس کی اجازت ہے، جیسے ایک آدمی فتویٰ پوچھنا چاہتا ہے اپنے فریقِ مخالف کے خلاف اور اس کا کوئی عیب ذکر کرتا ہے، حاکم کے سامنے ظالم کی شکایت کرتا ہے، یا رُوَاۃِ حدیث کے حالات ذکر کیے جاتے ہیں یہ تحقیق کرنے کے لئے کہ اس کی بات کہاں تک مانی جاسکتی ہے؟ کہاں تک نہیں مانی

(۱) ترمذی ۲/ ۱۵/ باب ماجاء فی الغیبة۔ نیز دیکھیں: مسلم ۲/ ۳۲۲/ باب تحریم الغیبة۔ مشکوٰۃ ۲/ ۴۱۲/ باب حفظ اللسان، فصل اول۔

جاسکتی؟ تو شرعی مصلحت کے تحت اگر اس قسم کی کوئی بات ہو تو قابلِ برداشت ہے، بلا وجہ زبان کا چسکا اور دُوسرے کی تحقیر اور تذلیل کے لیے کسی کے عیب ذِکر کرنا یہ غیبت ہے، جس کو حضور ﷺ نے فرمایا کہ یہ زِنا کے مقابلے میں بھی زیادہ اَشد ہے،[1] زنا تو براہِ راست حق اللہ ہے، توبہ کرلیں گے اللہ تعالیٰ قبول کرلے گا، غیبت اس وقت تک معاف نہیں ہوتی جب تک اس شخص سے معافی نہ لی جائے جس کی غیبت کی گئی ہے، اس لیے اس کو زِنا کے مقابلے میں بھی سخت ٹھہرایا گیا۔ ''نہ غیبت کرے تم میں سے کوئی کسی کی'' اَيُحِبُّ اَحَدُكُمْ: کیا تم میں سے کوئی پسند کرتا ہے اَنْ يَّاْكُلَ لَحْمَ اَخِيْهِ مَيْتًا: کہ اپنے مَرے ہوئے بھائی کا گوشت کھائے؟ فَكَرِهْتُمُوْهُ: پس تم اس سے نفرت کرتے ہو، وَاتَّقُوا اللّٰهَ: اللہ سے ڈرتے رہو، اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيْمٌ: بے شک اللہ تعالیٰ معاف کرنے والا مہربان ہے۔ (شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں) ''اختلاف وتفریقِ باہمی کے بڑھانے میں ان اُمور کو خصوصیت سے دخل ہے کہ ایک فریق دُوسرے فریق سے ایسا بدگمان ہوجاتا ہے کہ حسنِ ظن کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑتا، مخالف کی کوئی بات ہو، اس کا محمل اپنے خلاف نکال لیتا ہے، اس کی بات میں ہزار احتمال بھلائی کے ہوں، صرف ایک پہلو بُرائی کا نکلتا ہو، ہمیشہ اس کی طبیعت بُرے پہلو کی طرف چلے گی، اور اسی بُرے اور کمزور پہلو کو قطعی اور یقینی قرار دے کر فریقِ مخالف پر تہمتیں اور اِلزام لگانا شروع کردے گا، پھر نہ صرف یہی کہ ایک بات حسبِ اتفاق پہنچ گئی، بدگمانی سے اس کو غلط معنی پہنا دیے گئے، نہیں، اس جستجو میں رہتا ہے کہ دُوسری طرف کے اندرونی بھید معلوم ہوں جس پر ہم خوب حاشیے چڑھائیں اور اس کی غیبت سے اپنی مجلس گرم کریں، ان تمام خرافات سے قرآنِ کریم منع کرتا ہے، اگر مسلمان اس پر عمل کریں تو جو اِختلافات بدقسمتی سے پیش آجاتے ہیں وہ اپنی حد سے آگے نہ بڑھیں، اور ان کا ضرر بہت محدود ہوجائے، بلکہ چند روز میں نفسانی اختلافات کا نام ونشان باقی نہ رہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اِلزام لگانا اور بھید ٹٹولنا اور پیٹھ پیچھے بُرا کہنا کسی جگہ بہتر نہیں، مگر جہاں اس میں کچھ دِین کا فائدہ ہو اور نفسانیت کی غرض نہ ہو، وہاں اجازت ہے، جیسے رِجالِ حدیث کی نسبت ائمۂ جرح وتعدیل کا معمول رہا ہے کیونکہ اس کے بدون دِین کا محفوظ رکھنا محال تھا۔'' (تفسیر عثمانی) مصلحتِ شرعی کے طور پر اگر کسی کا کوئی عیب ذِکر کیا جاتا ہے تو اس کی گنجائش ہے۔ ''مسلمان بھائی کی غیبت کرنا ایسا گندہ اور گھناؤنا کام ہے جیسے کوئی اپنے مَرے ہوئے بھائی کا گوشت نوچ نوچ کر کھائے۔ کیا اس کو کوئی انسان پسند کرے گا؟ بس سمجھ لو غیبت اس سے بھی زیادہ شنیع حرکت ہے۔'' (تفسیر عثمانی)۔ ''یعنی ان نصیحتوں پر کاربند وہی ہوگا جس کے دل میں خدا کا ڈر ہو، یہ نہیں تو کچھ نہیں، چاہیے کہ ایمان واسلام کا دعویٰ رکھنے والے واقعی طور پر خداوند قہار کے غضب سے ڈریں اور ایسی ناشائستہ حرکتوں کے قریب نہ جائیں، اگر پہلے کچھ غلطیاں اور کمزوریاں سرزد ہوئی ہیں اللہ کے سامنے صدقِ دل سے توبہ کریں، وہ اپنی مہربانی سے معاف فرما دے گا'' (تفسیر عثمانی)۔

---

(۱) مشکوٰۃ ۲ر۴۱۵ باب حفظ اللسان کا تقریباً آخر۔ بحوالہ شعب الایمان للبیہقی۔

خاندانی عصبیت کی ممانعت

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ: اے لوگو!، اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى: اس آیت میں یہ ظاہر کیا جا رہا ہے کہ دوسرے پر زبان درازی، دوسرے کی عیب جوئی اور اس کے متعلق بدگوئی، اکثر و بیشتر اس کا منشا تکبر ہوتا ہے کہ انسان اپنے کو بڑھیا سمجھتا ہے، دوسرے کو گھٹیا سمجھتا ہے، تو اس میں ذکر کیا جا رہا ہے کہ انسان انسان سب برابر ہیں، اللہ کے ہاں بہتر وہی ہے جو تقوے کی صفت کے ساتھ موصوف ہو، ایک خاندان میں ہونے کی وجہ سے دوسرے خاندان کی تحقیر جائز نہیں ہے، یہ اللہ تعالیٰ نے جو قومیں بنا دیں، ذاتیں بنا دیں، یہ تو اس مصلحت کے تحت ہیں کہ تمہیں آپس میں ایک دوسرے کو پہچاننا آسان ہو جائے، رشتہ دار اور غیر رشتہ دار کا پتا چل جائے، ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے آسان ہوں، باقی! یہ مفاخرت کا ذریعہ نہیں ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کے مقابلے میں فخر کرے یا ایک خاندان والے دوسرے کی تحقیر کریں، تم سارے ہی آدم اور حواء کی اولاد ہو، اس لیے خاندانی حیثیت میں سب برابر ہیں، اس حیثیت سے کسی کی تحقیر کرنی دُرست نہیں کہ میں فلاں قوم کا ہوں اور یہ فلاں قوم کا ہے، غیر اِختیاری طور پر اللہ تعالیٰ بعض کو بعض قوموں میں پیدا کر دیتے ہیں، اگر دُنیا کے اندر وہ معزز قوم ہے تو اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے ہمیں اس قوم میں پیدا کر دیا، لیکن کسی دوسرے کی تحقیر کی اجازت نہیں ہے، اصل کے اعتبار سے سب بنی آدم ایک ہیں۔ ''اے لوگو! بے شک ہم نے تمہیں پیدا کیا ایک مذکر اور مؤنث سے'' اس سے آدم وحوا مراد ہیں، ''اور بنائے ہم نے تمہارے شعوب اور قبائل'' شعوب شِعْب کی جمع، اس کا معنی ''قومیں'' کر لیجئے، قبائل قبیلہ کی جمع، اصل میں شعب اور قبیلہ بڑے اور چھوٹے خاندان کے اعتبار سے بولا جاتا ہے، مثلاً آپ کہہ سکتے ہیں کہ ''سید'' یہ شعب ہے، اور ''حسنی'' اور ''حسینی'' یہ دو قبیلے بن گئے، اس طرح سے بڑے درجے کا خاندان شعب کہلاتا ہے، چھوٹے درجے کے قبیلے کہلا لیتے ہیں، تو ہم فرق کرنے کے لئے یوں کہہ دیں گے'' بنایا ہم نے تمہیں مختلف قومیں اور قبیلے'' لِتَعَارَفُوْا: تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ: بے شک اللہ تعالیٰ کے نزدیک زیادہ باعزت تم میں سے وہی ہے جو تم میں سے زیادہ متقی ہے، اللہ تعالیٰ کے نزدیک کرامت اور شرافت تقوے کی بنا پر حاصل ہوتی ہے، ''بے شک اللہ تعالیٰ علم رکھنے والا ہے خبر رکھنے والا ہے۔'' (شیخ الاسلامؒ لکھتے ہیں) ''اکثر غیبت، طعن وتشنیع، عیب جوئی کا منشا کبر ہوتا ہے کہ آدمی اپنے کو بڑا اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اس کو بتلاتے ہیں کہ اصل میں انسان کا بڑا چھوٹا یا معزز اور حقیر ہونا ذات پات اور خاندان ونسب سے تعلق نہیں رکھتا، بلکہ جو شخص جس قدر نیک خصلت، مؤدب اور پرہیزگار ہو، اسی قدر اللہ کے ہاں معزز اور مکرم ہے، نسب کی حقیقت تو یہ ہے کہ سارے آدمی ایک مرد اور ایک عورت یعنی آدم وحوا کی اولاد ہیں شیخ، سید، مغل، پٹھان، صدیقی، فاروقی، عثمانی، انصاری سب کا سلسلہ آدم وحوا پر منتہی ہوتا ہے، یہ ذاتیں اور خاندان اللہ تعالیٰ نے محض تعارف اور شناخت کے لیے مقرر کیے ہیں، بلاشبہ جس کو حق تعالیٰ کسی شریف اور بزرگ ومعزز گھرانے میں پیدا کر دے وہ ایک موہوب شرف ہے، جیسے کسی کو خوبصورت بنا دیا جائے، لیکن یہ چیز ناز اور فخر کرنے کے لائق نہیں کہ اسی کو معیار کمال اور فضیلت کا ٹھہرا لیا جائے اور

دوسروں کو حقیر سمجھا جائے، ہاں! شکر کرنا چاہیے کہ اس نے بلا اختیار وکسب ہم کو یہ نعمت مرحمت فرمائی، شکر میں یہ بھی داخل ہے کہ غرور وتفاخر سے باز رہے اور اس نعمت کو کمینہ اخلاق اور بری خصلتوں سے خراب نہ ہونے دے، بہر حال مجد وشرف اور فضیلت وعزت کا اصل معیار نسب نہیں، تقویٰ وطہارت ہے، اور متقی آدمی دوسروں کو حقیر کب سمجھے گا؟''...... ''یعنی تقویٰ اور ادب اصل میں دل سے ہے، اللہ ہی کو خبر ہے کہ جو شخص ظاہر میں متقی اور مؤدب نظر آتا ہے، وہ واقع میں کیسا ہے اور آئندہ کیسا رہے گا؟'' (تفسیر عثمانی)۔

اپنے ایمان کا احسان نہ جتلاؤ بلکہ اللہ کا احسان سمجھو

قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا: ان آیات میں بھی حضور ﷺ کی مجلس کا ہی ایک ادب بتایا گیا ہے، کہ بعض بدوی حضور ﷺ کے پاس آئے اور احسان جتلانے لگے کہ دیکھو! ہم مسلمان ہو گئے ہیں، ہم نے آپ سے کوئی لڑائی نہیں لڑی، فلاں لوگ لڑ کر مسلمان ہوئے تھے، حالانکہ حقیقت کے اعتبار سے ابھی وہ ظاہری طور پر مطیع ہوئے تھے اور ان کے دل میں ایمان نہیں تھا، تو اس قسم کے احسانات حضور ﷺ کے سامنے آکر جتلانا یہ بھی آدابِ نبوی کے خلاف ہے، اِن آیات میں اُن کو ہدایات دی جارہی ہیں، قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا: بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا: آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے حقیقت میں وَلٰكِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا: بلکہ تم کہو کہ ہم فرماں بردار ہو گئے ہیں، وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ: لما اور لم میں فرق آپ سمجھتے ہیں، کہ نفی میں تو دونوں شریک ہیں، لیکن لما میں آئندہ توقع ہوتی ہے، لم میں توقع نہیں ہوتی، ابھی تک تمہارے دلوں میں ایمان داخل نہیں ہوا، اگرچہ توقع ہے کہ آئندہ داخل ہو جائے گا، ''نہیں داخل ہوا ابھی تک ایمان تمہارے دلوں میں'' وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ: اگر تم اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کرو گے لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْئًا: تو اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں میں سے کسی چیز کو کم نہیں کرے گا، یہ لفظ لات یَلِیْتُ سے ہے، ''نہیں کم کرے گا تمہارے عملوں سے کچھ بھی، بے شک اللہ تعالیٰ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔ سوائے اس کے نہیں کہ کامل مؤمن وہی ہیں جو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، پھر شک اور شبہ میں مبتلا نہیں ہوتے، اور اپنے مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ اللہ کے راستے میں جہاد کرتے ہیں، یہی دعویٰ ایمان میں سچے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے کہ کیا تم اللہ کو بتلاتے ہو اپنا دین؟ حالانکہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے، اور اللہ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے۔'' يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا: احسان جتلاتے ہیں آپ پر کہ وہ مسلمان ہو گئے، آپ کہہ دیجئے کہ لَا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ: میرے پہ اپنے اسلام کا احسان نہ جتلاؤ، بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ: بلکہ اللہ ہی نے تم پر احسان کیا کہ تمہیں ایمان کی ہدایت دے دی اگر تم سچے ہو، تو اس کو اللہ کا احسان سمجھو، حضور ﷺ پر احسان جتلانے کی ضرورت نہیں، اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے آسمانوں اور زمینوں میں چھپی ہوئی چیزوں کو، ''اور اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو۔'' حضرت شیخ الاسلام لکھتے ہیں ''یہاں یہ بتلاتے ہیں کہ ایمان ویقین جب پوری طرح دل میں راسخ ہو جائے اور جڑ پکڑ لے اس وقت غیبت اور عیب جوئی وغیرہ کی خصلتیں آدمی سے دور ہو جاتی ہیں، جو شخص دوسروں کے عیب ڈھونڈنے اور آزار پہنچانے میں مبتلا ہو، سمجھو کہ

ابھی تک ایمان اس کے دِل میں پوری طرح پیوست نہیں ہوا۔ ایک حدیث میں ہے: ''یَا مَعْشَرَ مَنْ اٰمَنَ بِلِسَانِهٖ وَلَمْ یُفْضِ الْاِیْمَانُ اِلٰی قَلْبِهٖ! لَا تَغْتَابُوا الْمُسْلِمِیْنَ وَلَا تَتَّبِعُوا عَوْرَاتِهِمْ الخ'' حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں، ایک کہتا ہے کہ ہم مسلمان ہیں یعنی دِینِ مسلمانی ہم نے قبول کیا، اس کا مضائقہ نہیں، اور ایک کہتا ہے کہ ہم کو پورا یقین ہے، جب یقین پورا ہے تو اس کے آثار کہاں؟ (یعنی اس کے مطابق عمل کیوں نمایاں نہیں) جس کو واقعی پورا یقین حاصل ہو وہ تو ایسے دعوے کرنے سے ڈرتا اور شرماتا ہے۔ اس آیت سے ایمان واسلام کا فرق ظاہر ہوتا ہے اور یہ ہی بات حدیث جبریل وغیرہ سے ثابت ہوئی ہے'' (تفسیر عثمانی)۔

اِیمان اور اِسلام میں فرق

اِس (آخری بات) کا مطلب یہ ہے کہ یہاں یہ دو لفظ آئے، قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا، آپ کہہ دیجئے کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یہ کہو کہ ہم فرماں بردار ہو گئے ہیں، وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِكُمْ، اور ابھی تک ایمان تمہارے قلوب میں داخل نہیں ہوا۔ ان لفظوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ چیز ہے، کہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک شخص مسلم ہو اور مؤمن نہ ہو، جیسے کہ ان بدیوں نے کہا تھا: اٰمَنَّا، تو انہیں کہا جا رہا ہے کہ اٰمَنَّا نہ کہو، تم ایمان نہیں لائے، ابھی تمہارے دلوں میں ایمان نہیں آیا، یہ کہہ سکتے ہو کہ ہم فرماں بردار ہو گئے۔ تو ایمان اور اسلام یہاں سے دو علیحدہ علیحدہ حقیقتیں معلوم ہوتی ہیں، اور حدیثِ جبریل میں جو ''مشکوٰۃ'' کی اِبتدا میں آپ نے پڑھی، اس میں بھی یہی ہے کہ جبریل نے سوال کیا تھا ''مَا الْاِیْمَانُ؟'' تو حضور ﷺ نے اس کا جواب اور دیا، اور جبریل نے سوال کیا تھا کہ ''مَا الْاِسْلَامُ؟'' تو حضور ﷺ نے اُس کا جواب اور دیا، وہاں سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایمان اور اسلام علیحدہ علیحدہ چیزیں ہیں، تفصیل آپ کے سامنے وہیں حدیث شریف میں آتی ہے کہ ''ایمان'' سے مراد ہیں عقائد، اور ''اسلام'' سے مراد ہے ظاہری اطاعت، ظاہری اعمال جو اِنسان کرتا ہے تو یہ ''اسلام'' کا مصداق ہیں، اور دِل کے اندر عقائد ٹھیک ہو جائیں، یہ ''ایمان'' کا مصداق ہے، یہاں ان کو یہی بات کہی جا رہی ہے کہ تم جو کہتے ہو کہ ہم ایمان لے آئے کہ دِل سے ٹھیک ہو گئے، ابھی یہ بات نہیں ہے، ہاں! ظاہری طور پر تم نے مخالفت چھوڑ دی ہے اور تابع ہو گئے ہو۔ جہاں یہ دونوں لفظ آپس میں بالمقابل آ جائیں تو وہاں ظاہر اور باطن کا فرق کر دیا جاتا ہے کہ ایمان کا تعلق ہے قلبی حالات کے ساتھ، اور اسلام کا تعلق ہے ظاہری اعضا کے ساتھ، اگر ظاہری اعضا کے اعتبار سے انسان فرماں بردار ہو جائے تو لغوی طور پر وہ ''مسلم'' بن گیا، اور ''مؤمن'' تب کہلائے گا جس وقت اس کے دِل کے حالات ٹھیک ہو گئے ہوں۔ لیکن شرعی اِصطلاح میں ''مؤمن'' اور ''مسلم'' یہ دونوں آپس میں متلازم ہیں، کیونکہ ایمان وہی معتبر ہے کہ جس کا اثر ظاہر تک آ جائے، کم از کم انسان زبان سے اقرار کرے، اور اسلام وہی معتبر ہے کہ جس کا دل تک اثر چلا جائے کہ دل میں انسان کو تصدیق حاصل ہو جائے، اس لیے شرعی طور پر ''مؤمن'' وہی ہوگا جو ''مسلم'' بھی ہو، اور ''مسلم'' وہی ہوگا جو ''مؤمن'' بھی ہو، لیکن اگر ان کو بالمقابل ذکر کر دیا جائے تو فرق کرنے کے لئے کہہ دیا جاتا ہے کہ ایمان کا تعلق قلب کے ساتھ ہے، اور اسلام کا تعلق ظاہری اعضا کے ساتھ ہے۔

مثال سے وضاحت

اس کو واضح کرنے کے لئے مثال دی جایا کرتی ہے کہ ''اَلْاِیْمَانُ وَالْاِسْلَامُ كَالْفَقِیْرِ وَالْمِسْكِیْنِ اِذَا اجْتَمَعَا افْتَرَقَا وَاِذَا افْتَرَقَا اجْتَمَعَا'' کہ ''ایمان'' اور ''اسلام'' یہ دو لفظ ایسے ہی ہیں جیسے عربی کے اندر ''فقیر'' اور ''مسکین'' یہ دو لفظ آیا کرتے ہیں۔ اِذَا اجْتَمَعَا افْتَرَقَا جہاں دونوں اکٹھے آ جائیں تو مفہوم کے اعتبار سے ان میں فرق ہوگا، ''فقیر'' کا مفہوم اور بیان کریں گے، ''مسکین'' کا مفہوم اور بیان کریں گے، جیسے لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِیْنِ یہ دو لفظ اکٹھے آ گئے، تو ''فقراء'' کا مصداق اور ہوگا، ''مساکین'' کا مصداق اور ہوگا، اِذَا اجْتَمَعَا افْتَرَقَا، جب یہ اکٹھے آ جائیں تو اِن میں فرق ہوتا ہے، وَاِذَا افْتَرَقَا، اور جب یہ جدا جدا ہو جائیں تو اجْتَمَعَا، پھر ان کا مفہوم ایک ہی ہوتا ہے، ''فقیر'' کا مفہوم ایسا ہوگا جو ''مسکین'' کو بھی شامل ہے، ''مسکین'' کا مفہوم ایسا ہوگا جو ''فقیر'' کو بھی شامل ہے۔ اسی طرح سے ''ایمان'' کا لفظ اور ''اسلام'' کا لفظ، ''مؤمن'' اور ''مسلم'' کا لفظ، اگر دونوں اکٹھے ذکر کر دیے جائیں تو فرق کرنے کے لئے ہم کچھ کہیں گے، ظاہر اور باطن کا فرق کریں گے، ورنہ ''مؤمن'' کا مفہوم ایسا ہوگا جو ''مسلم'' کو بھی شامل ہے، ''مسلم'' کا مفہوم ایسا ہوگا جو ''مؤمن'' کو بھی شامل ہے۔ تو یہاں جو دونوں میں فرق کیا گیا ہے تو ظاہر اور باطن کے اعتبار سے ہے کہ تم یوں تو کہہ سکتے ہو کہ ہم نے مخالفت چھوڑ دی، ہم مطیع ہو گئے، باقی! تمہارا یہ دعویٰ کہ ہم دلی طور پر ایمان لے آئے ہیں، ایسی بات نہیں ہے، کیونکہ ابھی ایمانِ کامل کے آثار تم پر نمایاں نہیں ہوئے، ایمان کامل تو ان لوگوں کا ہوتا ہے جو اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لاتے ہیں، اور ایمان لانے کے بعد پھر کسی شک اور شبہ میں مبتلا نہیں ہوتے، دِلوں کے اندر ان کو سکون واطمینان نصیب ہوتا ہے، اللہ کے راستے کے اندر اپنے مال بھی قربان کرتے ہیں، جان بھی قربان کرتے ہیں، جو مال اور جان کی قربانی دیتے ہیں وہی دعویٔ ایمان میں سچے ہوتے ہیں، اور جو کہیں تو سہی کہ ہم ''مؤمن'' ہیں، لیکن اللہ کے لئے نہ کوئی مال خرچ کر سکتے ہیں نہ اپنی جان کو لگا سکتے ہیں، تو یہ زبان زبان سے کہہ رہے ہیں، حقیقت کے اعتبار سے ابھی اُن کے قلوب میں ایمان داخل نہیں ہوا۔

اور آگے ان کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ تم زبان سے دعویٰ کر کے جو اظہار کرتے ہو کہ ہم نے دین قبول کر لیا تو کیا اللہ کو پتا نہیں کہ تمہارے دِل کا کیا حال ہے؟ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِكُمْ: کیا تم بتلاتے ہو اللہ کو اپنا دین،'' حالانکہ اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور وہ اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ ''یَمُنُّوْنَ عَلَیْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا: مَنَّ یَمُنُّ احسان کرنے کے معنی میں بھی ہوتا ہے، اور احسان جتلانے کے معنی میں بھی، لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ (آل عمران: ١٦٤) اللہ تعالیٰ نے مؤمنین پر احسان کیا، اور لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى (سورۂ بقرہ: ٢٦٤) اپنے صدقوں کو باطل نہ کیا کرو احسان جتلا کر اور تکلیف پہنچا کر، تو مَنّ کا معنی احسان کرنا بھی ہے اور احسان جتلانا بھی ہے، اور یہاں حسان جتلانے کے معنی میں ہے، اور آگے احسان کرنے کے معنی میں ہے، دونوں معنوں کے اندر یہ لفظ یہاں استعمال ہوا ہے،'' احسان جتلاتے ہیں آپ پر کہ وہ مسلمان ہو گئے'' قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَكُمْ:

آپ کہہ دیجئے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ جتلاؤ، بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ: بلکہ اللہ نے تم پر احسان کیا، یہ ''مَنّ'' احسان کرنے کے معنی میں ہے، اللہ نے تم پر احسان کیا ہے کہ تمہیں ایمان کے لئے ہدایت دے دی، یعنی اپنے قول کے مطابق اگر تم واقعی مؤمن ہو تو بھی یہ اللہ کا احسان ہے کہ تمہیں ایمان کی توفیق دے دی، واقع میں تم مؤمن ہو یا نہیں ہو وہ اللہ جانتا ہے، لیکن جیسے تم کہتے ہو کہ ہم مؤمن ہیں، اگر اپنے قول کے مطابق تم مؤمن ہو تو اِس ایمان کو بھی اللہ کا احسان سمجھو اگر تم سچے ہو۔ اور نبی پر تو احسان جتلانے کا کوئی موقع ہی نہیں، ''یعنی اگر واقعی سچا دین اور پورا ایمان تم کو حاصل ہے تو کہے سے کیا ہوگا، جس سے معاملہ ہے وہ آپ خبردار ہے'' (تفسیر عثمانی)۔

اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: بے شک اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی باتوں کو، وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ: اللہ تعالیٰ دیکھنے والا ہے ان کاموں کو جو تم کرتے ہو۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

***

سُورَةُ قٓ

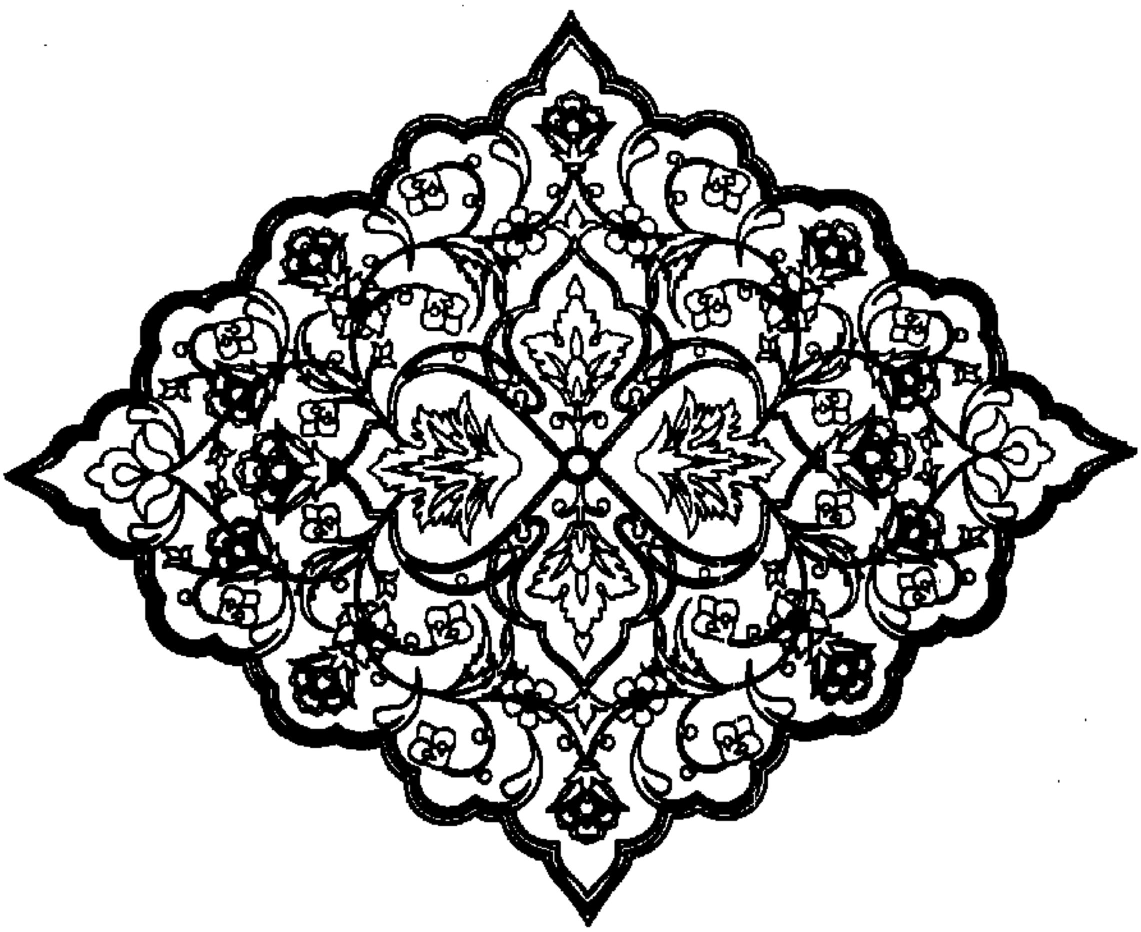

ایاتها ۴۵ ۵۰ سُوْرَۃُ قٓ مَكِّيَّةٌ ۳۴ رکوعاتها ۳

سورۂ قٓ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی پینتالیس آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

قٓ ۚ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝١ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ

قٓ۔ بزرگی والے قرآن کی قسم! ① بلکہ انہوں نے تعجب کیا اس بات سے کہ آگیا ان کے پاس ایک ڈرانے والا انہی میں سے، پھر کہا

الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝٢ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا ۚ ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ ۝٣ قَدْ

کافروں نے یہ عجیب شئے ہے ② کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے؟ یہ لوٹانا بعید از امکان ہے ③

عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ ۚ وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ ۝٤ بَلْ كَذَّبُوْا

ہم نے جان لیا اس چیز کو جس کو گھٹاتی ہے زمین ان میں سے، اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے یاد رکھنے والی ④ بلکہ جھٹلایا انہوں نے

بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْٓ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ ۝٥ اَفَلَمْ يَنْظُرُوْٓا اِلَى السَّمَآءِ

ایک حق کو جب وہ حق ان کے پاس آگیا پس وہ ایک مضطرب بات میں پڑے ہوئے ہیں ⑤ کیا یہ دیکھتے نہیں آسمان کی طرف جو

فَوْقَهُمْ كَيْفَ بَنَيْنٰهَا وَزَيَّنّٰهَا وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ ۝٦ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا

ان کے اُوپر ہے، ہم نے اس کو کس طرح سے بنایا اور اس کو مزین کیا، اس کے لئے کوئی پھٹن نہیں ⑥ اور زمین، پھیلایا ہم نے اس کو،

وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۢ بَهِيْجٍ ۝٧ ۙ تَبْصِرَةً وَّذِكْرٰى لِكُلِّ

اور ڈالے ہم نے اس کے اندر بوجھل پہاڑ اور اُگائی ہم نے اس کے اندر ہر رونق والی قسم ⑦ سمجھانے کے لئے اور یاد دلانے کے لئے ہر

عَبْدٍ مُّنِيْبٍ ۝٨ وَنَزَّلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا فَاَنْۢبَتْنَا بِهٖ جَنّٰتٍ

اس شخص کے لئے جو کہ رُجوع کرنے والا ہے ⑧ اور ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اُتارا، پھر اُگایا اس کے ذریعے سے باغات کو

وَّحَبَّ الْحَصِيْدِ ۝٩ ۙ وَالنَّخْلَ بٰسِقٰتٍ لَّهَا

اور کاٹی ہوئی کھیتی کے غلے کو ⑨ اور (اُگائے ہم نے اس پانی کے ذریعے سے) کھجوروں کے درخت لمبے لمبے، جن کے لئے تہہ بہ تہہ

طَلْعٌ نَّضِيْدٌ ﴿۱۰﴾ رِّزْقًا لِّلْعِبَادِ ۙ وَاَحْيَيْنَا بِهٖ بَلْدَةً مَّيْتًا ۭ كَذٰلِكَ

رکھے ہوئے خوشے ہیں ⑩ بندوں کو رزق دینے کے لئے، اور ہم نے اس پانی کے ذریعے بنجر علاقے کو آباد کیا اسی طرح (قبروں سے)

الْخُرُوْجُ ﴿۱۱﴾ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّاَصْحٰبُ الرَّسِّ وَثَمُوْدُ ﴿۱۲﴾ وَعَادٌ وَّفِرْعَوْنُ وَ

نکلنا ہوگا ⑪ جھٹلایا ان مشرکینِ مکہ سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے اور کنویں والوں نے اور ثمود نے ⑫ اور عاد نے اور فرعون نے اور

اِخْوَانُ لُوْطٍ ﴿۱۳﴾ وَّاَصْحٰبُ الْاَيْكَةِ وَقَوْمُ تُبَّعٍ ۭ كُلٌّ كَذَّبَ الرُّسُلَ فَحَقَّ وَعِيْدِ ﴿۱۴﴾

لُوط کے بھائیوں نے ⑬ اور بَن والوں نے، اور تبع کی قوم نے، ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کی تکذیب کی، میرا ڈرانا متحقق ہوگیا ⑭

اَفَعَيِيْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ۭ بَلْ هُمْ فِيْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِيْدٍ ﴿۱۵﴾

کیا ہم تھک گئے پہلی مرتبہ پیدا کرکے؟ بلکہ وہ خلق جدید کی طرف سے شبہ میں پڑے ہوئے ہیں ⑮

سورت کا تعارف اور مضامین

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ ق مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۴۵ آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں۔ سورت کا نام تو اس کے پہلے لفظ سے ہی ماخوذ ہے، اس سورت میں معاد کا تذکرہ زیادہ ہے، بعث بعد الموت، اس کا اِمکان، اس کا وقوع اور اس کے واقعات۔ اور یہ چیز بنیادی عقائد میں سے ہے، بلکہ مکہ معظمہ کی زندگی میں زیادہ تر زور اسی عقیدے پر ہی دیا گیا ہے کہ لوگوں کو اس چیز کا احساس دلایا جائے کہ زندگی صرف یہی نہیں، بلکہ مرنے کے بعد دوبارہ بھی اُٹھنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی اس زندگی کا حساب دینا ہے، یہ احساس پیدا ہوجانے کے بعد ہی انسان کے عمل کا رُخ سیدھا ہوتا ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ کثرت کے ساتھ اس سورت کو فجر میں اور جمعہ کے خطبے میں پڑھا کرتے تھے، روایات میں آتا ہے۔ (۱)

تفسیر

قٓ: یہ تو حروفِ مقطعات میں سے ہے، اللہ اعلم بمرادہ بذالک۔ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ: یہ واؤ قسمیہ ہے، بزرگی والے قرآن کی قسم، جوابِ قسم محذوف ہے، ''قرآنِ مجید کی قسم، آپ ڈرانے والوں میں سے ہیں، اللہ کی طرف سے آپ منذِر بنا کر بھیجے گئے ہیں''، اور قسم ایک قسم کی آنے والے مضمون کے لئے شاہد ہوتی ہے، تو اس کتاب کا آنا، اور اس کی فصاحت و بلاغت، اس کا اعجاز، یہ سب دلیل ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔

---

(۱) مسلم ۱/۲۸۶، کتاب الجمعة۔ مشکوٰۃ ۱/۱۲۳ باب الخطبة والصلاة۔ مسلم ۱/۱۸۷ باب القراءة فی الصبح مشکوٰۃ ۱/۷۹ باب القراءة فی الصلاة

کافروں کا شبہ

بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ: بَلْ یہ اضراب ہے، کافر تسلیم نہیں کرتے اس بات کو، ''بلکہ انہوں نے تعجب کیا اس بات سے کہ آ گیا ان کے پاس ایک ڈرانے والا انہی میں سے، پھر کہا کافروں نے یہ عجیب شئ ہے'' یعنی ایک آدمی کا اللہ کی طرف سے رسول اور منذر بن کے آ جانا عجیب شئ ہے، تعجب کا اظہار اس بات پر کرتے ہیں، ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا: دوسری چیز ان کو یہ عجیب معلوم ہوتی ہے، ایک تو ان میں سے کسی انسان کا منذر بن کر آنا یہ عجیب، پھر اس کا دعویٰ عجیب، اور وہ یہ ہے کہ ءَاِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا: کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے، ذٰلِكَ رَجْعٌۢ بَعِيْدٌ: اِذَا کا جواب محذوف ہے، کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے پھر ہم لوٹائے جائیں گے؟، یہ لوٹایا جانا بعید از عقل ہے، یا، بعید از مکان ہے، یعنی یہ بات عقل میں بھی نہیں آتی، یہ تو ممکن ہی نہیں، رَجْعٌ یہ مصدر ہے، رَجَعَ رُجُوْعًا ہو تو یہ لازم ہوتا ہے لوٹنے کے معنی میں، اور رَجَعَ رَجْعًا ہو تو لوٹانے کے معنی میں، یہ رَجْعٌ ہے، متعدی، ''یہ لوٹانا بعید از مکان ہے'' یہ تو ممکن ہی نہیں، بعید از عقل ہے، یہ تو سمجھ میں نہیں آتا۔

جواب کی وضاحت

قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ: بارہا آپ کی خدمت میں ذکر کیا جاچکا کہ جہاں بھی اِنکارِ معاد آتا ہے تو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے بعد اپنے علم اور قدرت کو بیان فرماتے ہیں، کیونکہ اس مسئلے کا تعلق علم اور قدرت کے ساتھ ہی ہے، اشکال اُن کو اس وجہ سے ہوتا تھا کہ مرنے کے بعد تو اِنسان مٹی میں مل جاتا ہے، ذرّے ہو جاتے ہیں، ہوا ان کو کہیں سے کہیں اُڑا کے لے جاتی ہے، وہ منتشر ہو جاتے ہیں، تو اِن سب کو اکٹھا کرنا اور دوبارہ زندہ کرنا کیسے ہوگا؟ ہڈیاں چُورا چُورا ہو جاتی ہیں، ریزہ ریزہ ہو جاتی ہیں، تو اس مسئلے کا تعلق اللہ تعالیٰ کے علم اور قدرت سے ہی ہے، وہی چیز یہاں پیش کی جارہی ہے، قَدْ عَلِمْنَا مَا تَنْقُصُ الْاَرْضُ مِنْهُمْ: ہم نے جان لیا اس چیز کو جس کو گھٹاتی ہے زمین اِن میں سے، یعنی ان کے جس حصے کو زمین کھا جاتی ہے گھٹاتی ہے وہ ہمارے علم میں ہے، ذرّات کہیں بکھرے ہوئے ہوں ہمارے علم سے باہر نہیں ہیں، وَعِنْدَنَا كِتٰبٌ حَفِيْظٌ: اور ہمارے پاس ایک کتاب ہے یاد رکھنے والی، حفاظت کرنے والی، اس سے مراد لوحِ محفوظ ہے، یعنی ہمارا علم قدیم ہے، صرف یہ نہیں کہ واقعہ پیش آنے کے بعد ہم جانتے ہیں، بلکہ اِبتدا سے ہی ہماری کتاب میں سب کچھ ضبط کیا ہوا ہے، اُس میں سب کچھ محفوظ کیا ہوا ہے، جس کو دُوسری جگہ لوحِ محفوظ کے ساتھ ذِکر کیا ہے، تو کوئی ذرہ کہیں پڑا ہو ہمارے علم سے باہر نہیں ہے، اس لیے ان کو دوبارہ لانا، اکٹھا کرنا، زندہ کرنا، کوئی مشکل نہیں۔ اور آپ کی خدمت میں کئی دفعہ یہ تفصیل عرض کی کہ اگر اِنسان اس وقت بھی دیکھے تو انسان کا اپنا وجود جو ہے یہ بھی ساری دُنیا سے مختلف ذرّات اکٹھے ہو کر ہی بنا ہے، آپ کے جسم کی ترکیب جو ہوتی ہے تو آپ کی غذا سے ہوتی ہے، کھانا پینا، چاہے آپ غذا کے طور پر کھاتے ہیں، چاہے آپ دوا کے طور پر کھاتے ہیں، تو آپ نے کبھی سوچا نہیں کہ آپ کی غذا کہاں کہاں سے اکٹھی ہو کر آرہی ہے جو آپ کے بدن کے ساتھ پیوند ہوتی جارہی ہے؟ پانی کہاں سے آتا ہے؟ دُودھ کہاں سے آتا ہے؟ اور جن جانوروں کا آپ دُودھ پیتے ہیں ان جانوروں نے کہاں کہاں چارہ کھایا اور دانہ کھایا؟ تو یہ سب ذرّات جو ہیں اکٹھے ہوتے جاتے ہیں، اور

آپ کا بدن مرکب ہوتا چلا جاتا ہے، تو اگر پہلے منتشر اَجزا کو اللہ تعالیٰ نے اکٹھا کیا، کوئی جز کہیں سے لائے، کوئی کہیں سے لائے، ادویات آتی ہیں، وہ آپ کے بدن میں پیوست ہوتی ہیں، کوئی انگلینڈ سے آرہی ہے، کوئی امریکا سے آرہی ہے، کوئی کہیں سے آرہی ہے، کوئی کہیں سے آرہی ہے، تو جب یہ ساری دُنیا میں منتشر اَجزا کو اِکٹھا کر کے اللہ نے پہلے ایک وجود بنادیا تو دوبارہ منتشر ہوجانے کے بعد ان کو اِکٹھا کرنا اس کے لئے کیا مشکل ہے؟ اس کا علم بھی محیط ہے اور اس کی قدرت بھی محیط ہے، اس لیے یہ خیال نہ کرو کہ ہم منتشر ہونے کے بعد دوبارہ کیسے اکٹھے ہوں گے اور دوبارہ زندگی کس طرح سے آجائے گی؟ ''تحقیق جان لیا ہم نے'' ہمارے علم میں ہے، حاصل یہ ہوا کہ ''ہمارے علم میں ہے وہ چیز جس کو گھٹاتی ہے زمین ان میں سے'' زمین ان میں سے جس چیز کو ناقص کرتی ہے یعنی کھا کر منتشر کردیتی ہے وہ ہمارے علم میں ہے۔ ''اور ہمارے پاس کتاب حفیظ ہے'' جس کو دوسری جگہ لوحِ محفوظ کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

مخالفینِ حق اِضطراب میں ہیں

بَلْ كَذَّبُوْا بِالْحَقِّ لَمَّا جَآءَهُمْ فَهُمْ فِيْۤ اَمْرٍ مَّرِيْجٍ: اَمْرٍ مَّرِيْجٍ: مضطرب بات، جس کو کہیں قرار نہ ہو، کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں، ''بلکہ جھٹلایا انہوں نے حق بات کو'' یعنی ان کی بات دلیل پہ مبنی نہیں ''بلکہ جھٹلایا انہوں نے ایک حق بات کو جب وہ ان کے پاس آگئی، ایک حق کو جھٹلادیا جب وہ حق ان کے پاس آگیا، پس وہ ایک مضطرب بات میں پڑے ہوئے ہیں'' ان کا معاملہ خود خلط ملط ہے، ان کو خود قرار نہیں اپنی بات پر، کبھی کچھ کہتے ہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں، اَمْرٍ مَّرِيْجٍ: مضطرب بات، مختلط، جس میں مختلف قسم کے اجزا ملے ہوئے ہوں، جس کی ترکیب مختلف اجزا کے ساتھ ہو وہ چیز فاسد ہوتی ہے، اس لئے ''اَمرِ فاسد'' بھی اس کا معنی کیا گیا ہے، ''پس یہ اُلجھی ہوئی بات میں ہیں، مضطرب بات میں ہیں'' ان کی بات کو خود قرار نہیں، کبھی کچھ کہتے ہیں کبھی کچھ کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے اِنعامات اور دلائلِ قدرت

اَفَلَمْ يَنْظُرُوْۤا اِلَى السَّمَآءِ فَوْقَهُمْ: کیا یہ دیکھتے نہیں آسمان کی طرف جو ان سے اُوپر ہے كَيْفَ بَنَيْنٰهَا: ہم نے اس کو کس طرح سے بنایا، وَزَيَّنّٰهَا: اور اس کو مزین کیا، وَمَا لَهَا مِنْ فُرُوْجٍ: فروج فَرَج کی جمع ہے، پھٹن کے معنی میں ہے، ''اس کے لئے کوئی پھٹن نہیں'' کوئی سوراخ نہیں، یہ کائنات اللہ تعالیٰ نے ایسی مضبوط بنائی ہے، ''اس کے لئے کوئی کسی قسم کا شگاف، کوئی پھٹن، کوئی دراڑ نہیں ہے'' وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا: اور زمین، پھیلایا ہم نے اس کو، وَاَلْقَيْنَا فِيْهَا رَوَاسِيَ: اور ڈالے ہم نے اس کے اندر بوجھل پہاڑ، رواسی رَاسِيَةٌ کی جمع ہے، ''جبالِ ثوابت'' کے معنی ہے، ''بوجھل پہاڑ ہم نے اِس میں ڈال دیئے'' وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيْجٍ: بھیج: ذَاتُ بَهْجَةٍ رونق والی، ''اور اُگائی ہم نے اس کے اندر ہر رونق والی قسم'' زوج قسم کے معنی میں ہے، بھیج: رونق والی، یعنی نباتات کی مختلف قسمیں جو رونق والی ہیں وہ ہم نے اس کے اندر اُگادیں، تَبْصِرَةً وَّ ذِكْرٰى لِكُلِّ عَبْدٍ مُّنِيْبٍ: یہ مفعول لہ کی جگہ ہے، ''سمجھانے کے لئے اور یاد دلانے کے لئے ہر اس شخص کے لئے جو کہ رُجوع کرنے والا ہے'' یعنی یہ آسمان کا بنانا، اس کو مزین کرنا، زمین کا پھیلانا، اس کے اندر پہاڑوں کا ڈالنا، اور اس کے اندر ہر قسم کی پُررونق نباتات کا اگانا، یہ لوگوں کے لئے دانائی اور بینائی کا

ذریعہ ہے، لیکن ان لوگوں کے لئے جو اللہ کی طرف رُجوع کرنے والے ہیں۔ تَبۡصِرَۃً: سمجھانے کے لئے، وَ ذِكۡرٰی: یاد دلانے کے لئے ہر اس شخص کے لئے جو کہ اللہ کی طرف رُجوع کرتا ہے۔ وَنَزَّلۡنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً مُّبٰرَكًا: اور ہم نے آسمان سے پانی اُتارا، مُّبٰرَكًا: برکت والا، کثیر النفع، جس میں بہت منافع رکھے ہیں، ''ہم نے آسمان سے برکت والا پانی اُتارا'' فَاَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ: پھر اُگایا اس کے ذریعے سے باغات کو، وَحَبَّ الۡحَصِيۡدِ: حَصَدَ کاٹنے کو کہتے ہیں، حصید سے مراد ہوا کرتی ہے کھیتی جس کو کاٹا جاتا ہے، اصل میں یہ نباتات جو زمین سے پیدا ہوتی ہے دو قسم کی ہے، ایک تو یہ درخت ہیں جن کے اوپر پھل لگتے ہیں جن کو جَنّٰتٍ کے ساتھ تعبیر کیا، تو یہ درخت محفوظ رہا کرتے ہیں پھل کاٹ لیا جاتا ہے، اور ایک کھیتی ہے جس کو ہم مختلف فصلوں کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں، گندم ہے، جو ہے، اللہ تعالیٰ اس کو اگاتے ہیں اور پھر اس کھیتی کو کاٹا جاتا ہے، پھر اس میں سے غلّہ نکالا جاتا ہے، تو درخت محفوظ رہ گیا پھل توڑ لیا گیا، اور کھیتی کاٹ لی گئی پھر اس میں سے غلّہ نکالا گیا، یہ دونوں قسموں کی طرف اشارہ ہے، تو حصید سے مراد کھیتی ہے جو کاٹی جاتی ہے، حَبّ کہتے ہیں دانے کو، غلے کو، ''نکالا ہم نے اس کے ذریعے سے باغات کو اور کھیتی کے غلے کو'' غلّہ جات سارے کے سارے حَبّ کا مصداق ہوگئے، حَبّ دانے کو کہتے ہیں، ''کاٹی ہوئی کھیتی کا اناج، غلّہ'' وَالنَّخۡلَ بٰسِقٰتٍ: اَنۡۢبَتۡنَا بِهٖ جَنّٰتٍ وَالنَّخۡلَ: اور اُگایا ہم نے اس پانی کے ذریعے سے کھجوروں کو بٰسِقٰتٍ: جو کہ لمبی لمبی ہیں، بٰسِقٰتٍ طِوالًا کے معنی میں ہے، کھجوروں کے درخت لمبے لمبے، لَّهَا طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ: نَضَدَ: تہہ بہ تہہ رکھنا، سورۂ واقعہ کے اندر آئے گا طَلۡحٍ مَّنۡضُوۡدٍ، تہہ بہ تہہ رکھا ہوا کیلا، اور طلع کہتے ہیں خوشے کو، طَلۡعٌ نَّضِيۡدٌ کا معنی تہہ بہ تہہ رکھے ہوئے خوشے، ایسے خوشے جن کے اندر پھل تہہ بہ تہہ رکھا ہوا ہے، آپ نے کھجور کے خوشے کو دیکھا ہوگا، کس طرح سے اللہ تعالیٰ نے اس کو جوڑ کر تہہ لگائی ہوئی ہوتی ہے، رِزۡقًا لِّلۡعِبَادِ: یہ سب کچھ ہم نے کیا بندوں کو رزق دینے کے لئے، باغات اُگائے، کھیتی کا غلّہ اُگایا، لمبے لمبے درخت کھجوروں کے اُگائے جن کے لئے تہہ بہ تہہ رکھے ہوئے خوشے ہیں، بندوں کو رزق دینے کے لئے۔

اِثباتِ معاد کے لئے اِحیائے اَرض کا ذِکر

وَاَحۡيَيۡنَا بِهٖ بَلۡدَةً مَّيۡتًا: اور ہم نے اس پانی کے ذریعے سے ویران اور بنجر علاقے کو آباد کیا، كَذٰلِكَ الۡخُـرُوۡجُ: اسی طرح قبروں سے نکلنا ہوگا۔ اور یہ بارہا کتاب کے اندر اللہ تعالیٰ بعث بعد الموت کی مثال کے طور پر اسی اِحیائے اَرض کو ذکر فرماتے ہیں، کہ جیسے زمین بنجر ویران تھی، اللہ تعالیٰ نے اس میں سے کیسی کیسی نباتات نکال لیں، اسی طرح سے اگر تم زمین میں پیوست ہوگئے تو ایسے ہی تم نکل پڑو گے، ''ایسے ہی نکلنا ہوگا'' یعنی قبروں سے۔

مکذّبین کے اَنجامِ بد پر تاریخ کی گواہی

آگے اس کی تکذیب کے انجام سے ڈراتے ہیں، كَذَّبَتۡ قَبۡلَهُمۡ قَوۡمُ نُوۡحٍ جھٹلایا ان مشرکین مکہ سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے، ''اور کنویں والوں نے'' اس کا ذکر غالباً سورۂ فرقان میں بھی آیا تھا، تفصیل اس کی روایات میں موجود نہیں کہ یہ ''کنویں والے'' کون لوگ تھے؟ بہرحال ایسے معلوم ہوتا ہے کہ کنوؤں پر کوئی آبادی تھی، انہوں نے بھی اسی طرح سے اپنے رسول کی تکذیب کی،

اورعذاب کانشانہ وہ بھی بن گئے،’’جھٹلایا اِن سے پہلے نوح کی قوم نے، کنویں والوں نے، اور ثمود نے، عاد نے اور فرعون نے اور لُوط علیہ السلام کے ساتھیوں نے‘‘ اِخْوَانُ لُوْطٍ: لُوط کے بھائی، اس سے مراد وہی قوم جس کی طرف حضرت لُوط علیہ السلام بھیجے گئے تھے، وَّاَصْحٰبُ الْاَیْکَۃِ: جنگل والوں نے، بَن والوں نے، اس سے قومِ شعیب مراد ہے، وَقَوْمُ تُبَّعٍ: اور تبع کی قوم نے، جس کا ذکر سورۂ دُخان میں بھی آیا تھا، کُلٌّ کَذَّبَ الرُّسُلَ: ان میں سے ہر ایک نے رسولوں کی تکذیب کی، فَحَقَّ وَعِیْدِ: دال کے اوپر جو کسرہ ہے وہ یائے متکلم پر دلالت کرنے والا ہے، ’’میری وعید ثابت ہوگئی، میرا ڈرانا متحقق ہوگیا‘‘ یہ انجام سے آگاہ کردیا کہ تکذیب کرنے کا نتیجہ اچھا نہیں ہے، پچھلی تاریخ پڑھ لو، تمہیں پتا چل جائے گا کہ جنہوں نے اس عقیدے کا انکار کیا اور اس عقیدے کی تلقین کرنے والوں کی تکذیب کی تو آخر کس طرح سے برباد ہوئے۔

خلقِ اوّل سے معاد پر اِستدلال

اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ: کیا ہم پہلی مرتبہ پیدا کر کے تھک گئے؟ جو تم کہتے ہو کہ دوبارہ پیدا نہیں کر سکتے، اَفَعَیِیْنَا: عَیِیَ یَعْیٰ: تھکنا۔ لَمْ یَعْیَ بِخَلْقِهِنَّ سورۂ اَحقاف کے اندر بھی یہی لفظ آیا تھا کہ اللہ نے زمین آسمان پیدا کئے اور اللہ اِن کے پیدا کرنے سے تھکا نہیں، اور آگے اِسی سورت بھی لفظ آرہا ہے وَّمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ لغوب بھی تھکاوٹ کو کہتے ہیں، ہمیں تھکاوٹ نے چھوا بھی نہیں، ’’کیا ہم تھک گئے پہلی مرتبہ پیدا کر کے؟‘‘ بَلْ هُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ: بلکہ وہ خلق جدید کی طرف سے شبہ میں پڑے ہوئے ہیں، لَبَسَ یَلْبِسُ: خلط ملط کرنا، یہ خلق جدید کی طرف سے شبہ میں پڑے ہوئے ہیں، یعنی خواہ مخواہ ان کو شبہات ہیں، شبہ میں یہ پڑے ہوئے ہیں، ورنہ ہم پہلی مرتبہ پیدا کر کے تھک نہیں گئے، قدرت ہماری ہے، اور پھر کوئی عارض بھی نہیں کہ تھک گئے ہوں اور ہم دوبارہ کام نہیں کر سکتے، جس طرح سے ایک انسان ہے اگرچہ پہلی مرتبہ کام کر لیتا ہے لیکن پہلی مرتبہ کام کر لینے کے بعد تھکاوٹ سے چکنا چور ہو جاتا ہے، تھک جاتا ہے، دوبارہ کام کرنے کی ہمت نہیں ہوتی، ہمارے متعلق تو یہ تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ ۚۖ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْهِ مِنْ

پکی بات ہے کہ ہم نے پیدا کیا انسان کو اور جانتے ہیں ہم اس چیز کو جس کے ساتھ وسوسہ ڈالتا ہے اس کا دِل، اور ہم زیادہ قریب ہیں اس کی طرف

حَبْلِ الْوَرِیْدِ ﴿۱۶﴾ اِذْ یَتَلَقَّی الْمُتَلَقِّیٰنِ عَنِ الْیَمِیْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِیْدٌ ﴿۱۷﴾ مَا

اس کی دھڑکنے والی رگ سے ﴿۱۶﴾ جب لیتے ہیں دو لینے والے، ایک دائیں طرف سے ساتھ رہنے والا ہوتا ہے، دوسرا بائیں طرف سے ﴿۱۷﴾ نہیں

یَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ بِالْحَقِّ ؕ

بولتا کوئی بات مگر اس کے پاس ایک انتظار کرنے والا تیار ہوتا ہے ﴿۱۸﴾ بالتحقیق موت کی سختی آگئی،

ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ ﴿١٩﴾ وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ ۭ ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ ﴿٢٠﴾ وَجَآءَتْ

یہی ہے جس سے تو بدکا کرتا تھا ﴿۱۹﴾ صور میں پھونک ماری جائے گی، یہی ہے ڈرانے کا دن ﴿۲۰﴾ آ گیا

كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ ﴿٢١﴾ لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا فَكَشَفْنَا

ہر نفس، اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا ﴿۲۱﴾ تو اس دن سے غفلت میں تھا، پھر کھول دیا ہم نے

عَنْكَ غِطَآءَكَ فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ ﴿٢٢﴾ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ

تجھ سے تیرا پردہ، پس تیری نگاہ آج تیز ہے ﴿۲۲﴾ اور کہے گا اس انسان کے ساتھ رہنے والا (فرشتہ) یہ وہ چیز ہے جو میرے پاس

عَتِيْدٌ ﴿٢٣﴾ اَلْقِيَا فِيْ جَهَنَّمَ كُلَّ كَفَّارٍ عَنِيْدٍ ﴿٢٤﴾ مَّنَّاعٍ لِّلْخَيْرِ مُعْتَدٍ مُّرِيْبٍ ﴿٢٥﴾

تیار ہے ﴿۲۳﴾ ڈال دو تم دونوں جہنم میں ہر ناشکرے ضدی کو ﴿۲۴﴾ جو نیکی کو روکنے والا تھا، حد سے بڑھنے والا تھا، اور لوگوں کو شبہات میں ڈالنے والا تھا ﴿۲۵﴾

الَّذِيْ جَعَلَ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ فَاَلْقِيٰهُ فِي الْعَذَابِ الشَّدِيْدِ ﴿٢٦﴾ قَالَ قَرِيْنُهٗ رَبَّنَا

جس نے اللہ کے ساتھ الٰہ آخر بنایا ہوا تھا، پس تم دونوں ڈال دو اس کو سخت عذاب میں ﴿۲۶﴾ کہے گا اس کا ساتھی (شیطان) اے ہمارے رَبّ!

مَآ اَطْغَيْتُهٗ وَلٰكِنْ كَانَ فِيْ ضَلٰلٍ بَعِيْدٍ ﴿٢٧﴾ قَالَ لَا تَخْتَصِمُوْا لَدَيَّ

میں نے اس کو سرکش نہیں کیا تھا لیکن یہ خود ہی بہت دُور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا ﴿۲۷﴾ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ میرے سامنے جھگڑا نہ کرو،

وَقَدْ قَدَّمْتُ اِلَيْكُمْ بِالْوَعِيْدِ ﴿٢٨﴾ مَا يُبَدَّلُ الْقَوْلُ لَدَيَّ وَمَآ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ﴿٢٩﴾

میں نے تو تمہاری طرف وعید پہلے بھیج دی تھی ﴿۲۸﴾ نہیں بدلی جائے گی بات میرے سامنے، اور نہ میں اپنے بندوں پر زیادتی کرنے والا ہوں ﴿۲۹﴾

تفسیر

اللہ کا علم محیط ہے

وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ: البتہ تحقیق پکی بات ہے کہ ہم نے پیدا کیا انسان کو وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُهٗ: اور جانتے ہیں ہم ان سب وساوس کو جو اس کے دل میں آتے ہیں، جانتے ہیں ہم اس چیز کو جس کے ساتھ اس کا دل بات کرتا ہے، وسوسہ صوت خفی کو کہتے ہیں، اس کا دل جو وسوسے اپنے اندر لاتا ہے جو خیالات اس کے دل میں آتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں، اور جب دل کے دھوں کو جانتے ہیں تو پھر ظاہری اعضا سے کیے ہوئے کام کو کیوں نہیں جانیں گے، وہ تو بدرجۂ اولیٰ جان جائیں گے، ''جس چیز کے

ساتھ وسوسہ ڈالتا ہے اس کا دِل' یعنی جو وسوسے اس کے دِل کے اندر آتے ہیں ہم ان کو بھی جانتے ہیں، وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيْدِ: حبل رَسّی کو کہتے ہیں، اور ورید: یہ رَگ ہے جو کہ دھڑکتی ہے، تو حَبْلِ الْوَرِيْدِ کے اضافت بیانی ہے، حبل عام ہے، ورید خاص ہے، تو عام کی اضافت خاص کی طرف ہوگئی، تو ''حبلِ ورید'' کا معنی ہے دھڑکنے والی رَگ، یہ گردن کی رَگ جو دھڑکتی ہے جس کے کٹنے کے ساتھ انسان مرجاتا ہے، یہ آپ ہاتھ یہاں (گردن پر) رکھیں گے تو آپ کو دھڑکتی ہوئی رَگ معلوم ہوگی جس کے ذریعے سے خون کی سپلائی ہوتی ہے، حَبْلِ الْوَرِيْدِ سے یہی مراد ہے، ''ہم زیادہ قریب ہیں اس کی طرف اس کی دھڑکنے والی رَگ سے، دھڑکنے والی رَگ سے زیادہ قریب ہیں'' مطلب یہ ہے کہ انسان اپنے حالات اتنے نہیں جانتا جتنا ہم انسان کے حالات جانتے ہیں، ''اس کی جان سے بھی زیادہ قریب ہیں ہم اس کی طرف۔''

''کراماً کاتبین'' اِنسان کے ساتھ مامور ہیں

اِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّيٰنِ: تَلَقّی: آگے بڑھ کے لینا۔ متلقیان سے دوفرشتے مراد ہیں جو کاتبِ اَعمال ہیں، جن کو ''کراماً کاتبین'' کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، دوفرشتے ہروقت آپ کے ساتھ رہتے ہیں، ڈیوٹیاں ان کی صبح شام بدلتی رہتی ہیں، جو آپ کے اعمال لکھنے والے ہیں، ایک دائیں طرف ہوتا ہے، ایک بائیں طرف ہوتا ہے، جو دائیں طرف ہے وہ نیکیاں لکھتا ہے، جو بائیں طرف ہے وہ آپ کے گناہ لکھتا ہے، بدیاں لکھتا ہے، دائیں طرف والا حاکم ہے بائیں طرف والے پر، اس لئے بعض روایات[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ جب انسان کوئی بُری بات زبان سے نکالتا ہے، یا کسی مجلس کے اندر کوئی بُرا کام کرلیتا ہے، تو یہ جو بائیں طرف والا ہے بُرائیاں لکھنے والا، وہ لکھنے لگتا ہے تو دائیں طرف والا اسے روک دیتا ہے کہ تھوڑی دیر ٹھہر، اگر مجلس سے اُٹھنے سے پہلے پہلے اس نے توبہ اِستغفار کرلی تو پھر نہ لکھنا، اور جب انسان اس مجلس سے چلا جاتا ہے اور توبہ اِستغفار نہیں کرتا، تو اب اس کو کہتا ہے کہ اب سب باتیں لکھ دے۔

کفّارۂ مجلس اور اس کی دُعا

اس لئے حدیث شریف میں آتا ہے کہ مجلس سے اُٹھنے سے پہلے اگر انسان یہ پڑھ لے ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ'' تو یہ کفارۃ المجلس ہے،[2] مجلس کے اندر کوئی بُری بات، کوئی بُرا قول، اور اسی طرح سے کوئی بُری حرکت انسان سے ہوجاتی ہے تو اس کے پڑھنے سے اس کا کفارہ ہوجاتا ہے، پھر کاتبِ حسنات کاتبِ سیئات کو لکھنے سے روک دیتا ہے، تو مجلس کے اِختتام پر یہ دُعا پڑھنے کی فضیلت ہے، اس کو کفارۃ المجلس قرار دیا جاتا ہے، اور سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ

---

(۱) وَاِذَا عَمِلَ سَيِّئَةً قَالَ صَاحِبُ الْيَمِيْنِ لِصَاحِبِ الشِّمَالِ: دَعْهُ سَبْعَ سَاعَاتٍ لَعَلَّهُ يُسَبِّحُ اَوْ يَسْتَغْفِرُ (بغوی، مظہری وغیرہ مرفوعًا)

(۲) ابوداؤد ۲/۳۱۱، کتاب الادب باب فی کفارۃ المجلس۔ نیز ترمذی ۲/۱۸۱، کتاب الدعوات باب ما یقول اذا قام من مجلسہ۔ مشکوٰۃ ۱/۲۱۴ باب الدعوات، فصل ثانی۔

الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۞ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۞ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۞ بعض آثار میں اس کا ذکر بھی آتا ہے،[1] اس لئے مجلس کے اختتام پر اس کو پڑھنے کی عادت بنالینی چاہیے، تو مجلس کی جو کمی کوتاہی ہوتی ہے اس کی تلافی ہوجاتی ہے، ''جب لیتے ہیں دو لینے والے'' متلقیان: دو لینے والے۔ یتلقی: آگے بڑھ کر لیتے ہیں، ''جب لیتے ہیں دو لینے والے۔''

''کراماً کاتبین'' کے ''قَعِیْدٌ'' ہونے کا مفہوم

عَنِ الْيَمِيْنِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيْدٌ: قَعِيْدٌ یہ مفرد آگیا، تو ایک قعید کو محذوف مان لیں گے قَعِيْدٌ عَنِ الْيَمِيْنِ، قَعِيْدٌ عَنِ الشِّمَالِ، ان میں سے ایک بیٹھنے والا ہوتا ہے، قعید ہوتا ہے دائیں جانب، دوسرا ہوتا ہے بائیں جانب۔ قعید وہی! قاعد، جیسے جلیس اور جالس آیا کرتا ہے، لیکن ان دونوں کے درمیان میں تھوڑا سا لغوی فرق ہے، جالس کہتے ہیں جو بالفعل بیٹھا ہوا ہو، اسی طرح سے قاعد کہتے ہیں جو بالفعل بیٹھا ہوا ہو، اور قعید کہتے ہیں ساتھ رہنے والے کو، اور جلیس بھی کہتے ہیں ساتھ رہنے والے کو، اس میں ضروری نہیں ہوتا کہ بالفعل بیٹھنے والا ہو، آپ کا ہم نشین جیسے کہہ دیا جاتا ہے، یہ میرا ہم نشین ہے، ہم نشین کا یہ معنی نہیں کہ دونوں جڑ کر صرف بیٹھتے ہی ہیں، آپس میں اکٹھے چلتے پھرتے ہیں تو بھی ان کو ہم نشین کہا جاتا ہے، اسی طرح ہم مجلس، یہ میرا ہم مجلس ہے، جیسے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ''اَنَا جَلِيْسُ مَنْ ذَكَرَنِيْ''[2] جو مجھے یاد کرتا ہے میں اس کا جلیس ہوں، تو یہ ''جلیس'' رفیق کے معنی میں ہوتا ہے، تو یہاں بھی قعید سے ساتھ رہنے والا مراد ہے، بالفعل بیٹھنے والا مراد نہیں ہے، فلانا شخص فلانے کا ہم صحبت ہے، مصاحب ہے، ہم نشین ہے، اس سے اسی بات کی طرف اشارہ ہوا کرتا ہے کہ ہمیشہ ساتھ رہتا ہے، تو قعید اور جلیس کے اندر بھی یہی مفہوم ہے، ایک دائیں طرف سے ساتھ رہنے والا ہوتا ہے دوسرا بائیں جانب سے، لفظی معنی قعید کا ہے بیٹھنے والا، لیکن قاعد اور قعید کے درمیان میں فرق ہوگیا کہ قاعد تو اسے کہتے ہیں جو بالفعل بیٹھنے والا ہے، قعید اسے کہتے ہیں جو ساتھ رہتا ہے، بیٹھنے کے وقت بیٹھتا بھی ہے، چلنے کے وقت چلتا بھی ہے۔ اور یہ جو کہا کرتے ہیں کہ ایک دائیں کندھے پہ ہوتا ہے، ایک بائیں کندھے پہ ہوتا ہے، یہ بھی محاورۃً ادا کردیا جاتا ہے، کہ جب ایک آدمی ہر وقت دوسرے کے ساتھ لگا رہے تو کہتے ہیں یہ تو میرے کندھوں پر سوار ہے کبھی اُترتا ہی نہیں، لزوم کو ان لفظوں کے ساتھ تعبیر کردیا جاتا ہے، باقی یہ کوئی ضروری نہیں کہ باقاعدہ وہ آپ کے کندھوں پر ہی بیٹھے ہوں، مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ: انسان نہیں پھینکتا کوئی بات، نہیں تلفظ کرتا کوئی بات، لفظ پھینکنے کو کہتے ہیں، اپنی زبان سے کوئی قول نہیں پھینکتا، نہیں تلفظ کرتا کوئی بات، نہیں بولتا کوئی بات، اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ: مگر اس کے پاس ایک انتظار کرنے والا تیار ہوتا ہے، رقیب کے معنی انتظار کرنے والا، عتید کے معنی تیار، یعنی جو بات منہ سے نکلتی ہے فوراً ایک (فرشتہ) تیار بیٹھا ہے اس بات کو لینے کے لئے۔

---

(۱) تفسیر ابن ابی حاتم، ودیگر تفاسیر سورۃ صافات کا آخر۔ من سرہ ان یکتال بالمکیال الاوفی من الأجر یوم القیامة فلیقل آخر مجلسه حین یرید ان یقوم: سبحان۔ الخ

(۲) ابن ابی شیبة ۱/ ۱۳۸، باب الرجل یذکر الله وهو علی الخلاء۔ عن کعب قال: قال موسی: أی رب اقریب انت فأناجیك ام بعید فأنادیك. قال: یاموسی انا جلیس من ذکرنی

موت کے وقت کی سختی کا تذکرہ

وَجَآءَتْ سَكْرَةُ الْمَوْتِ: آ گئی موت کی سختی بِالْحَقِّ: بالحق کا معنی تحقیق، تحقیق کے ساتھ، ایک ایسے امر کے ساتھ جو کہ محقق ہے، جس میں کوئی شک نہیں، بالتحقیق موت کی سختی آ گئی، یا، موت کی سختی لے آئی ایک امر حق کو، جو پہلے انسان کو معلوم نہیں، موت کی سختی جب آتی ہے تو بہت سارے حقائق منکشف ہو جاتے ہیں، باء تعدیہ کی ہو جائے گی اور جَآءَ متعدی کے معنی میں ہو جائے گا، سَكْرَةُ الْمَوْتِ: موت کی سختی، ''موت کی سختی امر حق کو لے آئی'' یعنی اس موت کی سختی نے بہت سے اُمور واضح کر دیئے جو کہ ثابت ہیں، حقیقتاً موجود ہیں، وہمی نہیں، یا ''بالتحقیق موت کی سختی آ گئی'' پکی بات ہے کہ جس میں کوئی شک وشبہ کی بات نہیں۔ آ گئی کا مطلب یہ ہے کہ آئے گی، ہر انسان کو موت آتی ہے، اور موت کے آنے کے اندر کچھ سختی بھی نمایاں ہے۔

موت کو بھلانا غفلت کا سبب

اس وقت پھر انسان کو کہا جاتا ہے کہ ذٰلِكَ مَا كُنْتَ مِنْهُ تَحِيْدُ: حَادَ يَحِيْدُ: بدکنا، ایک جانب کو ہٹ جانا، بِدکنا سمجھتے ہیں؟ اچانک کوئی چیز سامنے آ جائے تو اِنسان یوں کر کے ایک طرف کو ہٹتا ہے، ''یہی ہے جس سے تو بِدکا کرتا تھا'' یعنی جس کا تجھے کبھی دھیان نہیں آتا تھا، موت کا خیال آتا تھا تو بِدکتا تھا، یہ وہی موت ہے جو اَب آ گئی، یعنی آخرت کا انسان فکر جو نہیں کرتا تو اس میں اکثر وبیشتر اس غفلت کا اثر ہوا کرتا ہے کہ انسان کو اپنی موت یاد نہیں ہے، اگر انسان اپنی موت کی کیفیات کو یاد رکھے تو بھی انسان کے اُوپر اتنی غفلت طاری نہیں ہوتی، آخرت کے معاملے میں پھر انسان غافل نہیں ہوتا۔

کچھ مناظرِ قیامت

وَنُفِخَ فِي الصُّوْرِ: صور میں پھونک ماری جائے گی، یہاں سے نفخِ ثانی مراد ہے ذٰلِكَ يَوْمُ الْوَعِيْدِ: یہی ہے وعید کا دِن، جس دِن کہ اللہ کی وعید نمایاں ہوگی جس سے تمہیں ڈرایا جاتا تھا، ''یہی ہے ڈرانے کا دِن'' وَجَآءَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّعَهَا سَآئِقٌ وَّشَهِيْدٌ: ماضی کے صیغے کے ساتھ تعبیر کیا جا رہا ہے تحقق وقوع کے طور پر، ''آ گیا ہر نفس'' یعنی آئے گا، ''آ گیا ہر نفس اس کے ساتھ ایک ہانکنے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا'' سائق سَوق سے، چلانے والا، ''ایک چلانے والا ہے اور ایک گواہی دینے والا'' ہو سکتا ہے کہ وہی دو فرشتے جو کاتب اعمال تھے وہ انسان کے ساتھ آئیں گے میدان قیامت میں، ایک اس کو چلا رہا ہوگا اور دوسرے نے نامۂ اعمال سنبھالا ہوا ہوگا (عثانی)، جس طرح سے اگلے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے، اُس وقت اللہ تعالیٰ پھر انسان کو یاد دلائیں گے لَقَدْ كُنْتَ فِيْ غَفْلَةٍ مِّنْ هٰذَا: تو اس دِن سے غفلت میں تھا فَكَشَفْنَا عَنْكَ غِطَآءَكَ: پھر کھول دیا ہم نے تجھ سے تیرا پردہ، غطاء کہتے ہیں پردے کو، غَطّٰی تَغْطِيَةً: چھپانا، یہ دیگچی وغیرہ کے اُوپر جو آپ ڈھکنا دیتے ہیں اس کو بھی عربی میں غطاء کہتے ہیں، ''کھول دیا ہم نے تجھ سے تیرا پردہ'' فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيْدٌ: پس تیری نگاہ آج تیز ہے، آج تیری نگاہ خوب تیز ہے، اور قیامت کے واقعات تجھے نظر آ رہے ہیں، پہلے تیری آنکھوں پہ پردہ پڑا ہوا تھا، آج وہ پردہ ہم نے دور ہٹا دیا۔ وَقَالَ قَرِيْنُهٗ هٰذَا مَا لَدَيَّ عَتِيْدٌ: یہاں قرین سے وہی

فرشتہ مراد ہے، روایات سے جس طرح سے معلوم ہوتا ہے، جو کاتب اعمال ہے جس کے ہاتھ میں نامۂ اعمال ہوگا، وہ اس نامۂ اعمال کی طرف اشارہ کر کے کہے گا ھٰذَا مَا لَدَیَّ عَتِیۡدٌ: یہ وہ چیز ہے جو میرے پاس تیار ہے، یہ فہرست میرے پاس تیار ہے، لکھی ہوئی کتاب میرے پاس تیار ہے، مَا لَدَیَّ عَتِیۡدٌ سے نامۂ اعمال مراد ہے، کہے گا اُس انسان کا قرین، ساتھ رہنے والا، یہاں مراد فرشتہ ہے، ''یہ وہ چیز ہے جو میرے پاس تیار ہے'' یعنی نامۂ اعمال۔

جہنم کے مستحق لوگ

اللہ تعالیٰ کی طرف سے حکم ہوگا، اَلۡقِیَا: یہ تثنیہ کا صیغہ ہے، ''ڈال دو تم دونوں جہنم میں ہر ناشکرے ضدی کو، ہر کافر ضدی کو'' جو دُنیا میں اللہ کے احسانات کا شکر ادا نہیں کرتا تھا، اور بات مانتا نہیں تھا ضدی تھا، ''جو نیکی کو روکنے والا تھا، حد سے بڑھنے والا تھا، لوگوں کو شبہات میں ڈالنے والا تھا'' نہ خود نیکی کرتا تھا، نہ کسی کو کرنے دیتا تھا، اور حدِ انسانیت سے نکلنے والا تھا، حدِ عبدیت سے نکلنے والا تھا، دین کے معاملے میں شبہات میں ڈالنے والا تھا، جس کا یہ کردار تھا اس کو جہنم میں پھینک دو، الَّذِیۡ جَعَلَ مَعَ اللّٰہِ اِلٰـھًا اٰخَرَ: جس نے اللہ کے ساتھ اِلٰہ آخر بنایا ہوا تھا، فَاَلۡقِیٰہُ فِی الۡعَذَابِ الشَّدِیۡدِ: پس ڈال دو اس کو سخت عذاب میں، اَلۡقِیَا یہ بھی اسی طرح سے تثنیہ کا صیغہ ہے، ''تم دونوں اس کو سخت عذاب میں ڈال دو۔''

ضال اور مضل دونوں جہنم کا ایندھن

قَالَ قَرِیۡنُہٗ رَبَّنَا مَاۤ اَطۡغَیۡتُہٗ: یہاں قرین سے شیطان مراد ہے، جیسے تفصیلی آیات میں آپ کے سامنے آیا کہ جب انسان عذاب میں پڑنے لگے گا تو اِلزام شیطان پہ دھرے گا کہ مجھے اس نے گمراہ کیا، تو شیطان آگے سے کہے گا کہ میں نے گمراہ کیسے کیا؟ یہ خود ہی گمراہ ہوا، سورۂ ابراہیم کے اندر اس مضمون کی تفصیل زیادہ آئی تھی، ''کہے گا اس کا ساتھی شیطان، اے میرے رَبّ!'' مَاۤ اَطۡغَیۡتُہٗ: میں نے اس کو طاغی نہیں بنایا، میں نے اس کو سرکش نہیں کیا تھا، ''لیکن یہ خود ہی بہت دُور کی گمراہی میں پڑا ہوا تھا'' اَطۡغَیۡتُہٗ یہ طغیان سے ہے، ''میں نے اس کو طاغی نہیں بنایا، میں نے اس کو سرکش نہیں بنایا، شرارت میں اِس کو میں نے نہیں ڈالا، بلکہ یہ صریح گمراہی میں پڑا ہوا تھا۔'' اللہ تعالیٰ فرمائیں گے کہ لَا تَخۡتَصِمُوۡا لَدَیَّ: میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، وَقَدۡ قَدَّمۡتُ اِلَیۡکُمۡ بِالۡوَعِیۡدِ: میں نے تو تمہاری طرف وعید پہلے بھیج دی تھی، جس میں یہ تھا کہ خود گمراہ ہو جاؤ یا کسی کے گمراہ کرنے سے گمراہ ہو جاؤ، میرے نزدیک سب جہنمی ہیں، اب یہاں جھگڑنے کی بات نہیں کہ تم خود گمراہ ہوئے تھے یا کسی نے تمہیں گمراہ کیا تھا، کیا ہوا تھا، بس جو گمراہ ہو گیا میں تو اس کو جہنم میں ڈالوں گا، میرے سامنے جھگڑا نہ کرو، ''مت جھگڑا کرو میرے سامنے، میں نے تمہاری طرف وعید پہلے بھیج دی'' مَا یُبَدَّلُ الۡقَوۡلُ لَدَیَّ: میرے سامنے بات بدلی نہیں جائے گی، جو بات میں نے کر دی کہ کافر جہنم میں جائیں گے اور اس قسم کے لوگوں کو عذاب دیا جائے گا یہ بات اب تبدیل نہیں کی جائے گی، ''نہیں بدلی جائے گی بات میرے سامنے'' وَمَاۤ اَنَا بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِیۡدِ: اور نہ میں اپنے بندوں پر زیادتی کرنے والا ہوں، جو ان کے اعمال ہوں گے اسی کا نتیجہ سامنے آجائے گا، میری طرف سے ان کے اُوپر کوئی زیادتی نہیں ہوگی۔

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ هَلِ امْتَلَأْتِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ ۝٣٠ وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ

یاد کرنے کا دِن ہے وہ جس دِن ہم جہنّم کو کہیں گے، کیا تو بھر گئی؟ اور وہ کہے گی کیا اور بھی ہیں؟ ۝٣٠ اور جنّت قریب کردی جائے گی

لِلْمُتَّقِيْنَ غَيْرَ بَعِيْدٍ ۝٣١ هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ

متقیوں کے، دُور نہیں ہوگی ۝٣١ (کہا جائے گا کہ) یہ وہ چیز ہے جس کا تم وعدہ دیئے جاتے تھے ہر ایسے شخص کے لئے جو اللہ کی طرف لوٹنے والا

حَفِيْظٍ ۝٣٢ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبِ ۝٣٣ ادْخُلُوْهَا

اور یاد رکھنے والا ہے ۝٣٢ جو رحمٰن سے بن دیکھے ڈرتا تھا، اور لے آیا وہ رُجوع کرنے والا دِل ۝٣٣ (انہیں کہا جائے گا) داخل ہو جاؤ تم جنّت میں

بِسَلٰمٍ ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ ۝٣٤ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ ۝٣٥ وَكَمْ

سلامتی کے ساتھ، یہ ہمیشہ رہنے کا دِن ہے ۝٣٤ ان کے لئے اس جنّت میں وہ چیز ہوگی جس کو وہ چاہیں گے، اور ہمارے پاس مزید ہے ۝٣٥ کتنی ہی

اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ هُمْ اَشَدُّ مِنْهُمْ بَطْشًا فَنَقَّبُوْا فِي الْبِلَادِ هَلْ مِنْ

جماعتیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کردیں، وہ زیادہ سخت تھے ان سے از روئے پکڑ کے، پھر وہ چلے پھرے شہروں میں، کیا ہے

مَّحِيْصٍ ۝٣٦ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى لِمَنْ كَانَ لَهٗ قَلْبٌ اَوْ اَلْقَى السَّمْعَ وَهُوَ شَهِيْدٌ ۝٣٧

کوئی بچنے کی جگہ؟ ۝٣٦ اس میں البتہ نصیحت ہے ہر اس شخص کے لئے جس کا دِل ہے، یا وہ کان لگائے اس حال میں کہ حاضر ہو ۝٣٧

وَلَقَدْ خَلَقْنَا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّمَا مَسَّنَا مِنْ

پکی بات ہے ہم نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو کہ ان دونوں کے درمیان میں ہیں چھ دِن میں، اور نہیں چھوا ہمیں

لُّغُوْبٍ ۝٣٨ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَ

تھکاوٹ نے ۝٣٨ پس تُو صبر کر ان باتوں پر جو یہ کہتے ہیں، اور تسبیح بیان کر اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ، سورج کے طلوع کرنے سے قبل اور سورج کے

قَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝٣٩ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝٤٠ وَاسْتَمِعْ يَوْمَ

غروب ہونے سے قبل ۝٣٩ اور رات کے حصے میں بھی تو اس کی تسبیح بیان کر اور سجدوں کے پیچھے بھی ۝٤٠ اے مخاطب! تو جیسے سُن، جس دِن

يُنَادِ الْمُنَادِ مِنْ مَّكَانٍ قَرِيْبٍ ۝٤١ يَّوْمَ يَسْمَعُوْنَ الصَّيْحَةَ بِالْحَقِّ ذٰلِكَ

کہ آواز دینے والا آواز دے گا قریب کی جگہ سے ۝٤١ جس دن کہ سنیں گے چیخ کو ٹھیک ٹھیک، یہی

يَوْمُ الْخُرُوْجِ ﴿۴۲﴾ اِنَّا نَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَاِلَيْنَا الْمَصِيْرُ ﴿۴۳﴾ يَوْمَ تَشَقَّقُ

نکلنے کا دِن ہے ﴿۴۲﴾ بے شک ہم ہی زندگی دیتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں، اور ہماری طرف ہی لوٹنا ہے ﴿۴۳﴾ جس دِن کہ پھٹے گی

الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا ۭ ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَيْنَا يَسِيْرٌ ﴿۴۴﴾ نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا

ان سے زمین اس حال میں کہ یہ جلدی کرنے والے ہوں گے، یہ جمع کرنا ہم پر آسان ہے ﴿۴۴﴾ ہم خوب جانتے ہیں ان باتوں کو جو

يَقُوْلُوْنَ وَمَآ اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِجَبَّارٍ ۣ فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾

یہ بولتے ہیں اور آپ ان پر کوئی زور کرنے والے نہیں ہیں، نصیحت کیجئے قرآن کے ساتھ اس شخص کو جو ڈرتا ہے میرے ڈرانے سے ﴿۴۵﴾

تفسیر

جنّت اور جہنّم کی وسعت کا بیان

يَوْمَ نَقُوْلُ لِجَهَنَّمَ: یاد کرنے کا دِن ہے وہ جس دِن ہم جہنّم کو کہیں گے هَلِ امْتَلَاْتِ: کیا تو بھر گئی؟ وَتَقُوْلُ: اور وہ کہے گی کہ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ: اور بھی ہیں؟ اللہ تعالیٰ کہیں گے کہ کیا تو بھر گئی؟ یہ اس لئے کہیں گے کہ وعدہ کیا تھا: لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ میں ضرور جہنّم کو بھروں گا، اور حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جس وقت کافروں کو جہنّم کے اندر ڈالا جائے گا تو اللہ تعالیٰ پھر جہنّم سے پوچھیں گے کہ کیا تو بھر گئی؟ وہ کہے گی کہ اور بھی ہیں تو لے آؤ، اور بھی گنجائش ہے۔ اس کے ذِکر سے بھی ڈرانا ہی مقصود ہے کہ اللہ نے جہنّم اتنی وسیع بنائی ہے کہ ایسا نہیں ہوگا کہ بہت سارے اکٹھے ہوگئے تو آپ کہیں گے کہ اس میں جگہ ہی نہیں ملے گی، شاید ہم بچ ہی جائیں، جو پہلے پہلے چلے جائیں گے ان سے پُر ہوجائے گی اور باقی جو رہیں گے چھوٹ جائیں گے، ایسی بات نہیں، وہ تو جتنے آتے چلیں جائیں اس میں گنجائش ہے، تو آخر تک وہ بھرے گی نہیں، سب کافروں کو ڈالنے کے بعد بھی بھرے گی نہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے جہنّم اتنی بڑی بنائی ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر قیامت تک آنے والے انسان سارے کے سارے اس میں جانا چاہیں تو جگہ موجود ہے، اور اسی طرح سے جنّت بھی اتنی بڑی بنائی ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر آخر تک، اسی طرح سے جن، انسان، جن کو اللہ نے جنّت میں بھیجنا ہے، پوری کی پوری انسانی اور جنوں کی آبادی جنّت میں چلی جائے تو وہاں بھی جگہ موجود ہے، لیکن اب آبادی بٹ گئی دو حصوں میں، کچھ چلے گئے جنّت میں، کچھ چلے گئے جہنّم میں، اس لئے جنّت بھی کچھ خالی ہوجائے گی اور جہنّم بھی کچھ خالی ہوجائے گی۔ مثال کے طور پر دو مہمان خانے بنائے ہیں، جن میں سو آدمیوں کے رہنے کی گنجائش ہے کہ سو آدمی آرہا ہے، چاہے اس میں ٹھہر جائیں چاہے اس میں ٹھہر جائیں، اور جب وہ دو حصوں میں تقسیم ہوجائیں گے تو ادھر بھی جگہ خالی ہوگی ادھر بھی جگہ خالی ہوگی۔

جنّت اور جہنّم کو کس طرح بھرا جائے گا؟

تو جنّت کو بھرنے کے لئے تو اللہ تعالیٰ اسی وقت ایک نئی مخلوق پیدا کریں گے، اس کو جنّت میں آباد کردیں گے، جنّت کے ساتھ جو وعدہ ہے کہ میں تجھے بھی بھروں گا، یہ تو اللہ کا فضل ہے، اللہ تعالیٰ صورۃً بھی کسی بندے کو تکلیف نہیں دیتا، بغیر کسی نیکی کے اُجر دے دے تو یہ اس کا فضل ہے، اس لئے وہاں تو نئی مخلوق پیدا کر کے آباد کردی جائے گی، اور جہنّم کو بھرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نئی مخلوق پیدا نہیں کریں گے، یہ نہیں کہ ابھی ایک مخلوق پیدا کی اور اس کو عمل کا موقع دیا ہی نہیں اور ان اُٹھا کے جہنّم میں بھر دیا جائے ایسا نہیں ہوگا، بلکہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ جہنّم کے اندر اللہ تعالیٰ اپنا قدم رکھیں گے (''قدم'' متشابہات میں سے ہے، رکھنا کس طرح سے ہوگا؟ وہ اللہ جانتا ہے!) جس وقت اس میں قدم رکھیں گے تو جہنّم سکڑ جائے گی،[1] اس کے حدودِ اَربعہ تھوڑے ہوجائیں گے، اور جب حدودِ اَربعہ تھوڑے ہوجائیں گے تو پھر وہ قَطْ قَطْ کہنے لگ جائے گی، بس، بس،[2] میں بھر گئی، بھر گئی، یعنی اس کے حدودِ اَربعہ چھوٹے کردیے جائیں گے، جس وقت وہ چھوٹی ہوگئی تو جتنی آبادی ہے اسی کے ساتھ ہی یہ بھر جائے گی، اس کو ویسے ہی چھوٹا کردیا جائے گا، تو اللہ تعالیٰ صورۃً بھی کسی پہ زیادتی نہیں کرتا کہ ابھی مخلوق پیدا کر کے جہنّم میں ڈال دے اس کو بھرنے کے لئے، ایسا نہیں ہوگا، البتہ جنّت میں نئی مخلوق آباد کردی جائے گی۔

ریاضت کا مزہ تکلیف کے بعد ہوتا ہے

تو آپ لوگ یہ خیال نہ کرنا کہ وہ تو بڑے اچھے رہیں گے جو اسی وقت ہی پیدا ہوئے اور جنّت میں چلے گئے، وہ تو جنّت کو بھرنے کے لئے اللہ تعالیٰ نے ایک مخلوق بنادی، لیکن ان کو جنّت کی راحت اور جنّت کی خوشی کا کوئی احساس نہیں ہوگا، جنّت کا خوشی کا احساس ہمیں ہی ہوگا جو دُنیا سے رگڑے کھا کے جائیں گے، یہاں کی تکلیفیں جنہوں نے دیکھی ہوئی ہوں گی لذت انہیں ہی آئے گی، جنہوں نے دُنیا میں تکلیف نہیں دیکھی ان کو کیا پتا کہ راحت کیا ہے؟ راحت کا احساس اسے ہی ہوتا ہے جس نے تکلیف دیکھی ہو، اسی طرح اہل اللہ دُنیا کے اندر جس طرح سے تکلیفیں اُٹھا کر جاتے ہیں، آخرت میں سکون اطمینان ہر قسم کی راحت جو ہوگی تو اس کی لذت اور احساس انہیں ہی ہوگا، نئی مخلوق جو ہے وہ جنّت سے مزہ نہیں لے سکتی، اُن کو کیا پتا؟ تکلیفیں دیکھنے کے بعد راحت لذیذ ہوتی ہے۔

جنّت کے مستحق لوگ

وَاُزْلِفَتِ الْجَنَّةُ لِلْمُتَّقِيْنَ: اور جنّت قریب کردی جائے گی متقیوں کے غَيْرَ بَعِيْدٍ: اس حال میں کہ وہ دُور نہیں ہوگی، غَيْرَ بَعِيْدٍ یہ تاکید ہے، جیسے عَزِيْزٌ غَيْرُ ذَلِيْلٍ کہہ دیا جاتا ہے کہ فلاں عزت والا ہے ذلیل نہیں ہے، اسی طرح سے جنّت قریب کی ہوئی

---

(۱) بخاری ۲/ ۱۰۹۸، کتاب التوحید، باب قول اللہ وھو العزیز الحکیم۔ مسلم ۲/ ۳۸۲، باب جھنم۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۵، باب خلق الجنۃ والنار کی دوسری حدیث۔

(۲) بخاری ۲/ ۷۱۹، کتاب التفسیر، سورۃ ق۔ مشکوٰۃ ۲/ ۵۰۵، باب خلق الجنۃ والنار کی ابتداء: يُلْقٰى فِي النَّارِ وَتَقُوْلُ هَلْ مِنْ مَّزِيْدٍ، حَتّٰى يَضَعَ قَدَمَهٗ فَتَقُوْلُ: قَطْ قَطْ.

ہوگی دُور نہیں ہوگی، یہ لفظ بطور تاکید کے ہے،'' قریب کردی جائے گی جنت متقیوں کے، دُور نہیں ہوگی'' هٰذَا مَا تُوْعَدُوْنَ لِكُلِّ اَوَّابٍ حَفِيْظٍ: اس وقت کہا جائے گا کہ یہ وہ چیز ہے جس کا تم وعدہ دیئے جاتے تھے ہر ایسے شخص کے لئے جو اللہ کی طرف لوٹنے والا اور یاد رکھنے والا ہے، جو اللہ کے اَحکام کو یاد رکھتا ہے اور اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہوتا ہے ایسے شخص کے لئے تم وعدہ کئے جاتے تھے، اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہے، کوئی غلطی ہوجاتی ہے تو توبہ کر لیتا ہے، ہر وقت اللہ کی طرف متوجہ رہتا ہے، اللہ کی ہدایات کو اور اللہ کے اَحکام کو یاد رکھنے والا ہے۔ مَنْ خَشِيَ الرَّحْمٰنَ بِالْغَيْبِ: یہ اُسی کی تفصیل ہے، جو رحمٰن سے بن دیکھے ڈرتا تھا، یا، غیب میں ڈرتا تھا جہاں اس کو کوئی دیکھنے والا نہ ہو، چھپ چھپا کے بھی گناہ نہیں کرتا تھا، لوگوں کے سامنے تو ڈرنا آسان ہوتا ہے ناجی، تنہائی میں کوئی ڈرے اصل بات وہ ہے،'' وَرَجُلٌ ذَكَرَ اللهَ خَالِيًا فَفَاضَتْ عَيْنَاهُ'' سات قسم کے نیک بخت جن کا ذِکر حضور ﷺ نے فرمایا کہ قیامت کے دِن وہ عرش کے سائے میں ہوں گے جس دِن اس کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہیں ہوگا، تو ان میں ایک آدمی یہ بھی ہے جو تنہائی میں اللہ کو یاد کرتا ہے پھر اس کی آنکھیں پانی بہا دیتی ہیں،[1] خلوت میں اور تنہائی میں اللہ کو یاد کر کے رونے والا یہ بھی ان نیک بختوں میں داخل ہے، تو بالغیب کا یہ معنی بھی ہوتا ہے کہ چھپ کر اللہ سے ڈرے، صرف یہ نہیں کہ لوگوں کے سامنے گناہ نہیں کرتا بلکہ تنہائی میں بھی اور چھپ کر بھی گناہ نہیں کرتا۔ یا'' بن دیکھے اللہ سے ڈرتا ہے'' یعنی رحمٰن کو اس نے دیکھا نہیں، رحمٰن ایک غیب چیز ہے، اور غیب چیز پر ایمان لاتا ہوا اس سے ڈرتا ہے، یہ بھی اس کا مفہوم ہوا کرتا ہے، وَجَآءَ بِقَلْبٍ مُّنِيْبٍ: اور لے آیا وہ رُجوع کرنے والا دِل، اس کا دِل ایسا ہے جو اللہ کی طرف رُجوع کرنے والا ہے، جیسے اِلَّا مَنْ اَتَى اللهَ بِقَلْبٍ سَلِيْمٍ کا لفظ سورۂ شعراء (آیت:۸۹) میں آیا تھا کہ اللہ کے عذاب سے وہی بچے گا جو اللہ کے پاس قلبِ سلیم لے کے آئے، قلبِ سلیم بھی وہی ہے جس میں کوئی بیماری نہیں، حِقد، کینہ، بغض، حُبِّ دُنیا، یہ قلب کی جتنی بیماریاں ہیں ان سے بچا ہوا دِل لے کے آیا۔ تو یہاں قلبِ منیب سے یہی مراد ہے، ''رُجوع کرنے والا دِل لے کے آیا''

اِنسانی خواہشات پوری ہونے کی جگہ جنت ہے نہ کہ دُنیا

انہیں کہا جائے گا اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ: داخل ہوجاؤ تم جنت میں سلامتی کے ساتھ، ذٰلِكَ يَوْمُ الْخُلُوْدِ: یہ خلود کا دن ہے، ہمیشہ رہنے کا دن ہے، یعنی آج ہمیشہ رہنے کا فیصلہ کر دیا گیا، آج ہمیشگی کے فیصلے کا دِن ہے، فیصلہ کر دیا گیا کہ جنت میں تم ہمیشہ رہو گے، اس لئے اس کو یوم خلود کہہ دیا گیا، لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ فِيْهَا: ان کے لئے اس جنت کے اندر ہر وہ چیز ہوگی جس کو وہ چاہیں گے، جو چاہیں گے ملے گا، اس سے زیادہ نعمتوں کی اور کیا تفصیل ہوسکتی ہے؟ دُنیا کے اندر کوئی ہفت اقلیم کا بادشاہ بھی ہوجائے تو اپنی ہر خواہش پوری نہیں کر سکتا، دُنیا میں رہتے ہوئے انسان کی خواہشات پوری کم ہوتی ہیں اور خواہشات کے خلاف چیزیں زیادہ پیش آتی ہیں، جو چیز دِل میں آئے وہی حاصل ہوجائے، جو کرنا چاہے وہی ہوجائے، یہ چیز جنت میں جا کر اِنسان کو حاصل ہوگی، دُنیا میں رہتے ہوئے

---

(۱) پہلی حدیث دیکھیں، بخاری ۹۱/۱، باب من جلس فی المسجد ینتظر. مسلم ۳۳۲/۱، باب فضل اخفاء الصدقۃ. مشکوۃ ۶۸/۱، باب المساجد، فصل اول۔

میسر نہیں آتی، لیکن تمہاری مشیت کے مطابق تمہیں چیز تب ملے گی جب دنیا کے اندر رہتے ہوئے تم اللہ کی مشیت کی رعایت رکھو، کہ جو اللہ چاہتا ہے تم وہ کرو، دُنیا میں رہتے ہوئے جو لوگ کام کرنے کا انداز یہ اختیار کرتے ہیں کہ جو اللہ چاہتا ہے وہ کرتے ہیں، جو خود چاہتے ہیں وہ نہیں کرتے، اپنی مشیت کے تابع نہیں، وہ اللہ کی مشیت کے تابع ہیں، تو آخرت میں پھر اللہ تعالیٰ ان کی مشیت کی رعایت رکھے گا، اور جو دُنیا میں اپنی مرضی پہ چلتے ہیں تو پھر اللہ تعالیٰ آخرت میں ان کو عذاب بھی اپنی مرضی سے دے گا، پھر ہزار چیخیں چلائیں ان کی مرضی کوئی نہیں پوچھے گا کہ تم کیا چاہتے ہو" اُن کے لئے وہ چیز ہوگی جس کو چاہیں گے اُس جنّت میں" وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ: اور ہمارے پاس مزید ہے، یعنی ان کی خواہشات سے بھی زیادہ ہم دیں گے، جہاں تک ان کا فکر بھی نہیں پہنچے گا کہ یہ چیز ملنی چاہیے وہ چیز بھی ہم انہیں دیں گے۔

عبرت کے لئے گزشتہ قوموں کی ہلاکت کا ذکر

وَكَمْ اَهْلَكْنَا قَبْلَهُمْ مِّنْ قَرْنٍ: کتنی ہی جماعتیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیں، قرن کہتے ہیں ایک زمانے کے اندر موجود لوگوں کو، تو مراد ان کی جماعت ہوگی،" کتنی ہی جماعتیں ہم نے ان سے پہلے ہلاک کر دیں، وہ زیادہ سخت تھے ان سے از روئے پکڑ کے، پھر وہ چلے پھرے شہروں میں۔" نَقَّبَ تَنقِيب: اس کا اصل معنی ہوتا ہے نقب لگانا، سوراخ کرنا، پھر شہروں کے اندر تجارت کے طور پر اور اپنی ترقیوں کے لئے جو چلتے پھرتے ہیں تو تنقیب فی البلاد سے یہی مراد ہے، یعنی وہ پکڑ کے لحاظ سے بھی زیادہ سخت تھے، گرفت ان کی بہت مضبوط تھی اِس زندگی پر، اپنے حالات پر بڑا قابو پائے ہوئے تھے اپنے خیال کے مطابق، پھر شہروں میں چلنا پھرنا بھی ان کا خوب تھا، تجارت کے سفر کرتے تھے اور اس طرح سے کماتے تھے۔ هَلْ مِنْ مَّحِيْصٍ: لیکن جب ہماری پکڑ آئی تو کوئی ٹھکانا ملا؟ کیا ہے کوئی ٹھکانا؟ یعنی ان کو بھی کوئی ٹھکانا ملا بچنے کے لئے؟ جو خود طاقتور تھے، حالات پر قابو پائے ہوئے تھے، شہروں کے اندر، ان کی آمد و رفت تھی، لیکن ہمارے عذاب سے بچنے کے لئے کوئی ٹھکانا ملا؟ محیص: ہٹنے کی جگہ، بچنے کی جگہ، "کیا ہے کوئی بچنے کی جگہ؟" اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَذِكْرٰى: اس میں البتہ نصیحت ہے ہر اس شخص کے لئے جس کا دِل ہے، دِل سے مراد بیدار دِل، فہیم دِل، ورنہ دِل تو ہر انسان کا ہوتا ہے، یہ اسی محاورے کے مطابق ہے جو آپ کہا کرتے ہیں کہ فلاں شخص بڑا دِل والا ہے، اور یہ کام کرنا دِل گردے والے کا کام ہے، اس کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے،" جس کے پاس دِل ہے" یعنی بیدار دِل، زندہ دِل، فہیم دِل، " اس شخص کے لئے اِس میں نصیحت ہے، یا وہ کان لگائے اس حال میں کہ حاضر ہو" متوجہ ہو کر کان ہی لگائے، زیادہ فہیم نہ ہو تو بھی وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے، نصیحت حاصل کر سکتا ہے، کامل العقل ہو تو اس سے نصیحت حاصل کرے گا، یا اس میں دوسرے سے حاصل کرنے کا جذبہ ہو کہ کان لگائے اس حال میں کہ وہ دِل سے حاضر بھی ہے، توجہ کے ساتھ کان لگائے، اور اگر وہ کان تو لگائے ہوئے ہے لیکن توجہ نہیں تو بھی کیا نصیحت حاصل کرے گا؟" البتہ تحقیق، پکی بات ہے ہم نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو اور ان چیزوں کو جو کہ ان دونوں کے درمیان میں ہیں چھ دِن میں" اس کا ذکر بہت دفعہ ہو گیا، وَمَا مَسَّنَا مِنْ لُّغُوْبٍ: اور نہیں چھوا ہمیں تھکاوٹ نے، لغوب مشقت اور تھکاوٹ کو کہتے ہیں، "ہمیں کچھ تھکان نہیں ہوا"

خاص اوقات میں تسبیح اور تحمید کا حکم

''پس تُو صبر کران باتوں پر جو یہ کہتے ہیں، اور تسبیح بیان کر اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ'' یعنی ''سبحان اللہ. والحمد للہ'' جس طرح سے دونوں لفظ ادا کئے جاتے ہیں تو تسبیح اور تحمید ہوجاتی ہے،'' پاکی بیان کر اپنے رَبّ کی اس حال میں کہ تو متلبس ہو اس کی تعریف کے ساتھ، سورج کے طلوع کرنے سے قبل اور سورج کے غروب ہونے سے قبل، اور رات کے حصے میں بھی تو اس کی تسبیح بیان کر اور سجود کے پیچھے بھی'' سجود سے نمازیں مراد ہیں، نماز پڑھ کے اس کے بعد بھی اس کی تسبیح بیان کیا کر۔ تو کثرت کے ساتھ اللہ کا ذِکر اور اللہ کی عبادت کی طرف متوجہ رہنا اس سے انسان کو صبر کی توفیق ہوتی ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَ الصَّلٰوةِ (سورۂ بقرہ: ۱۵۳) نماز پڑھنے سے بھی انسان کو اپنے دُنیوی اُمور میں اور مخالفین کے مقابلے میں قوت حاصل ہوتی ہے، اللہ کے ذِکر سے اطمینان آتا ہے، پریشانیاں دُور ہوتی ہیں۔ اور یہ خاص اوقات ہیں جن کے اندر ذِکر کی طرف زیادہ متوجہ ہونا چاہیے، ایک سورج نکلنے سے پہلے جیسے فجر کی نماز پڑھتے ہیں، اور عام اَذکار کی بھی اِس وقت میں فضیلت ہے، اور غروب سے پہلے جیسے عصر کی نماز اس کی بھی مزید تاکید ہے، نماز پڑھنا بھی اس میں داخل ہے، دیگر اذکار بھی اس میں شامل ہیں، ان اوقات کے اندر اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ رہنے کی خاص فضیلت ہے۔ اور رات کے کچھ حصے میں، یہ تہجد کا ذِکر آ گیا، اس میں بھی اللہ کی تسبیح بیان کیا کرو، اللہ کو یاد کیا کرو۔ اور سجدوں کے پیچھے، یہ نمازوں کے پیچھے تسبیحات کا ذِکر آ گیا، جو اَذکار اَحادیث میں آئے ہوئے ہیں ان کو پڑھنا یہ نمازوں کے پیچھے اللہ کی یاد ہے۔ اور ''سبحان اللہ. الحمد للہ. لا إلٰه إلّا اللہ. اللہ اکبر'' یہ سب اَذکار آئے ہوئے ہیں نمازوں کے پیچھے، ۳۳ دفعہ ''سبحان اللہ''، ۳۳ دفعہ ''الحمد للہ''، ۳۴ دفعہ ''اللہ اکبر''، یا، ۳۳ دفعہ ''اللہ اکبر'' اور ۱۰۰ اپورا کرنے کے لئے ''لَا إِلٰهَ إِلَّا اللهُ وَحْدَهٗ لَا شَرِيكَ لَهٗ لَهُ الْمُلْكُ وَلَهُ الْحَمْدُ يُحْيِي وَيُمِيتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ''[1] اور بھی مختلف اذکار ہیں، ان کو اگر پڑھ لیا جائے تو اَدْبَارَ السُّجُوْدِ بھی متحقق ہوجائے گا، یا فرضوں کے اَدا کرنے کے بعد جو نوافل اور سنن پڑھی جاتی ہیں وہ بھی اس میں شامل ہوسکتی ہیں۔

قیامت کا تذکرہ

وَاسْتَمِعْ یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ: اے مخاطب! توجہ سے سُن اس بات کو جو آگے آرہی ہے، یَوْمَ یُنَادِ الْمُنَادِ: جس دِن کہ آواز دینے والا آواز دے گا قریب ہی جگہ سے، یعنی اس کی آواز اس طرح سے آئے گی جیسے وہ قریب کی جگہ سے بُلا رہا ہو، اس سے صورِ اسرافیلی مراد ہے، اسرافیل جس وقت صور پھونکیں گے تو ہر شخص کے کان میں آواز یوں آئے گی جیسے قریب جگہ ہی سے آواز دی جارہی ہے۔ ''جس دِن کہ سنیں گے چیخ کو ٹھیک ٹھیک'' کوئی اس میں شک وشبہ کی بات نہیں ہوگی، وہ صیحہ ان کے کان میں آئے گی، ذٰلِكَ یَوْمُ الْخُرُوْجِ: یہی نکلنے کا دِن ہے، یہ آواز جو دی جائے گی ہر ایک تک پہنچے گی، فوراً سارے نکل کر کھڑے ہوجائیں گے،

---

(۱) عمل الیوم واللیلة للنسائی، رقم: ۱۴۳/ لوٹ عام کتب حدیث میں یحیی ویمیت کے بغیر ہے، دیکھئے: مسلم ۱/۲۱۹، باب استحباب الذکر... الخ/ مشکوٰۃ ۱/۸۹، باب الذکر... الخ۔

اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَنُمِیْتُ: بے شک ہم ہی زندگی دیتے ہیں اور ہم ہی موت دیتے ہیں، وَاِلَیْنَا الْمَصِیْرُ: اور ہماری طرف ہی لوٹنا ہے، یَوْمَ تَشَقَّقُ الْاَرْضُ عَنْهُمْ سِرَاعًا: جس دن کہ پھٹے گی اِن سے زمین اس حال میں کہ یہ جلدی جلدی نکلنے والے ہوں گے، سِرَاعًا یہ سریع کی جمع ہے، سریع: جلدی کرنے والا، اور یہ عَنْهُمْ کی ھُمْ ضمیر سے حال واقع ہے، ''جس دِن پھٹے گی زمین اِن سے اس حال میں کہ جلدی جلدی آنے والے ہوں گے، جلدی کرنے والے ہوں گے'' ذٰلِكَ حَشْرٌ عَلَیْنَا یَسِیْرٌ: ذٰلِكَ عَلَیْنَا یہ جمع کرنا ہم پر آسان ہے، ہمارے لئے کوئی مشکل نہیں۔

حضور ﷺ کو تسلی اور کفّار کو تنبیہ

آگے پھر وہی! وعید بھی ہے، اور حضور ﷺ کے لئے تسلی بھی ہے، نَحْنُ اَعْلَمُ بِمَا یَقُوْلُوْنَ: جو کچھ یہ باتیں کرتے ہیں آخرت کے متعلق، شبہات ڈالتے ہیں، تکذیب کرتے ہیں، ہم خوب جانتے ہیں ان باتوں کو جو یہ بولتے ہیں، وَمَآ اَنْتَ عَلَیْهِمْ بِجَبَّارٍ: اور آپ ان پر کوئی زور کرنے والے نہیں ہیں، یعنی آپ کے ذِمّے نہیں، جس طرح سے دوسری جگہ کہا کہ لَسْتَ عَلَیْهِمْ بِمُصَیْطِرٍ (سورۂ غاشیہ) آپ اِن کے اُوپر کوئی داروغہ نہیں، منتظم نہیں، کہ آپ کے ذِمّے ہو کہ ان کو زبردستی سیدھے راستے پہ لگانا ہے، فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ: آپ کا فرض تو یہی ہے، قرآن کے ذریعے سے نصیحت کرتے رہیے ہر ایسے شخص کو جو میرے ڈرانے سے ڈرتا ہے، جو میری وعید سے خوفزدہ ہے اس کو نصیحت کیجئے، اور جو نڈر ہے، بے خوف ہے، اس کو میرے ڈرانے دھمکانے کی پروانہیں، وہ آپ کے ڈرانے سے اور آپ کے نصیحت کرنے سے کوئی متاثر نہیں ہوگا، متاثر وہی شخص ہوگا جو میری وعید سے خوف کھاتا ہے، ''نصیحت کیجئے قرآن کے ساتھ اس شخص کو جو کہ خوف کھاتا ہے میری وعید سے، جو ڈرتا ہے میرے ڈرانے سے'' میری وعید سے جو ڈرتا ہے اسے قرآنِ کریم کے ذریعے سے نصیحت کیجئے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَیْكَ

❋❋❋

سُورَةُ الذّٰرِيٰتِ

اٰياتها ٦٠ ٥١ سُوْرَةُ الذّٰرِيٰتِ مَكِّيَّةٌ ٦٧ رکوعاتها ٣

سورۂ ذاریات مکہ میں نازل ہوئی، اوراس کی ساٹھ آیتیں ہیں اور تین رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

وَالذّٰرِيٰتِ ذَرْوًا ① فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا ② فَالْجٰرِيٰتِ

قسم ہے ان ہواؤں کی جو کہ بکھیرنے والی ہیں ① پھر وہ ہوائیں جو کہ بوجھ اُٹھانے والی ہیں ② پھر ہوائیں جو کہ چلنے والی ہیں

يُسْرًا ③ فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا ④ اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ ⑤

آسان طریقے سے ③ پھر وہ ہوائیں جو کہ تقسیم کرنے والی ہیں اللہ کے حکم سے ④ بے شک وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو البتہ سچی ہے ⑤

وَّاِنَّ الدِّيْنَ لَوَاقِعٌ ⑥ وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ ⑦ اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ ⑧ يُّؤْفَكُ

اور جزاء واقع ہونے والی ہے ⑥ قسم ہے راستوں والے آسمان کی ⑦ بے شک تم البتہ مختلف باتوں میں لگے ہوئے ہو ⑧ پھیرا جاتا ہے

عَنْهُ مَنْ اُفِكَ ⑨ قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ ⑩ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ ⑪

اس سے وہی شخص جو پھیر دیا گیا ⑨ اٹکل دوڑانے والے برباد کردیے جائیں ⑩ جو غفلت میں پڑے ہوئے ہیں بھولنے والے ہیں ⑪

يَسْئَلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ ⑫ يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ ⑬ ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ ۭ هٰذَا

پوچھتے ہیں کہ جزا کا دِن کب ہوگا؟ ⑫ جس دِن وہ آگ پر تپائے جائیں گے ⑬ (اور کہا جائے گا) تم اپنی شرارت کا مزہ چکھو، یہی

الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ⑭ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ⑮ اٰخِذِيْنَ

وہ چیز ہے جس کو تم جلدی جلدی طلب کیا کرتے تھے ⑭ بے شک متقین باغات میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے ⑮ لینے والے ہوں گے

مَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۭ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ ⑯ كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ ⑰

اس چیز کو جو ان کو ان کے رَبّ نے دی، اس سے قبل وہ احسان کرنے والے تھے ⑯ وہ رات کے تھوڑے حصے میں سویا کرتے تھے ⑰

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ ⑱ وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ⑲ وَفِي

اور رات کے آخری حصوں میں وہ اِستغفار کرتے تھے ⑱ اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل کے لئے اور محروم کے لئے ⑲

الْاَرْضِ اٰیٰتٌ لِّلْمُوْقِنِیْنَ ﴿۲۰﴾ وَفِیْٓ اَنْفُسِكُمْ ۚ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَفِی السَّمَآءِ رِزْقُكُمْ

زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے ﴿۲۰﴾ اور تمہارے نفسوں میں نشانیاں ہیں، کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ ﴿۲۱﴾ آسمان میں ہے تمہارا رزق

وَمَا تُوْعَدُوْنَ ﴿۲۲﴾ فَوَرَبِّ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اِنَّهٗ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَآ اَنَّكُمْ تَنْطِقُوْنَ ﴿۲۳﴾

اور وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو ﴿۲۲﴾ آسمان اور زمین کے رَبّ کی قسم، بے شک یہ البتہ حق ہے مثل تمہارے بولنے کے ﴿۲۳﴾

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ ذاریات مکہ میں نازل ہوئی، اور اِس کی ساٹھ آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں۔ سورۂ قٓ کی طرح اِس سورت میں بھی زیادہ تر اثباتِ معاد ہے، بعث بعد الموت کا تذکرہ آرہا ہے۔

''قسم'' اور ''جوابِ قسم'' کی وضاحت

وَالذّٰرِیٰتِ ذَرْوًا: ذَرَا یَذْرُوْ: بکھیرنا، یہ لفظ پہلے بھی آیا ہے تَذْرُوْهُ الرِّیٰحُ (سورۂ کہف: ۴۵)، ''قسم ہے ان ہواؤں کی جو کہ بکھیرنے والی ہیں'' ذاریات کا موصوف ہوائیں، یہ جو گرد و غبار اُڑاتی ہیں، اِدھر اُدھر بکھیرتی ہیں، فَالْحٰمِلٰتِ وِقْرًا: وِقر کہتے ہیں بوجھ کو، حاملات کے معنی اُٹھانے والی، اس کا موصوف بھی ہوائیں نکالا گیا ہے، ''پھر وہ ہوائیں جو کہ بوجھ اُٹھانے والی ہیں'' وِقر سے مراد بادل ہو جائے گا یعنی وہ ہوائیں جو بادل اُٹھا کے لاتی ہیں، پانی سے بھری ہوئی ہوائیں۔ اور حاملات کا موصوف بعض تفاسیر کے اندر سُحُب بھی نکالا گیا ہے، بادل، ''پھر وہ بادل جو کہ پانی کا بوجھ اُٹھانے والے ہیں'' اس صورت میں وِقر سے مراد پانی ہو جائے گا جو بادلوں میں ہوتا ہے، فَالْجٰرِیٰتِ یُسْرًا: جَرٰی یَجْرِیْ: چلنا، یُسر آسانی کو کہتے ہیں، جاریات کا موصوف بھی ہوائیں نکالا گیا ہے، ''وہ ہوائیں جو کہ چلنے والی ہیں آسان طریقے سے'' نرم نرم چلنے والی ہیں۔ اور جاریات کا موصوف سُفُن بھی نکالا گیا ہے یعنی کشتیاں، ''پھر وہ کشتیاں جو کہ نرم رفتار سے چلنے والی ہیں'' دریاؤں میں، سمندروں میں، فَالْمُقَسِّمٰتِ اَمْرًا: مقسمات کا موصوف بھی ہوائیں نکالا گیا ہے، ''پھر وہ ہوائیں جو کہ تقسیم کرنے والی ہیں اللہ کے حکم سے''، یعنی اللہ کے حکم سے بارش تقسیم کرنے والی ہیں، بادلوں کو تقسیم کرنے والی ہیں، جدھر اللہ کا حکم ہوتا ہے بادلوں کو اُڑا کر لے جاتی ہیں، جتنی بارش کا اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے وہ ان ہواؤں کے ذریعے سے برستی ہے، اور مقسمات کا موصوف ملائکہ کو بھی بنایا گیا ہے، ''پھر وہ فرشتے جو کہ اللہ کے حکم کے تحت تقسیم کرنے والے ہیں'' یعنی اللہ تعالیٰ ان کو حکم دیتا ہے اور یہ اس کے مطابق رزق بارش اور دیگر اُمورِ دُنیا کے اندر تقسیم کرتے ہیں۔ تو ان کے موصوف دونوں طرح سے نکالے گئے، یا تو چاروں کا موصوف ہوائیں ہیں، حضرت شیخ (الہندؒ) کا ترجمہ اسی طرف اشارہ کر رہا ہے، پہلے ہوگئیں وہ ہوائیں جو کہ اُڑانے والی ہیں، گرد و غبار کو بکھیرنے والی ہیں، اور پھر جو بوجھ اُٹھانے والی ہیں یعنی بادلوں کو اُٹھا کر لاتی ہیں، پھر جو نرم رفتار سے چلنے والی ہیں، اور پھر وہ ہوائیں جو کہ اللہ کے حکم سے تقسیم کرنے والی ہیں۔ اور دوسری تفسیر

آپ کے سامنے آئی کہ ذاریات سے ہوائیں مراد ہیں، حاملات سے بادل مراد ہیں، جاریات سے کشتیاں مراد ہیں، مقسمات سے ملائکہ مراد ہیں۔

جوابِ قسم آگے ذکر کیا گیا اِنَّمَا تُوْعَدُوْنَ لَصَادِقٌ: بے شک وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو البتہ سچی ہے، تُوْعَدُوْنَ اگر وَعد سے لیا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا کہ جس کا تم وعدہ کئے جاتے ہو، وعدہ دیے جاتے ہو۔ اور اگر وعید سے لیا جائے تو پھر معنی ہو جائے گا ''جس سے تم ڈرائے جاتے ہو وہ بات البتہ سچی ہے۔'' صادق کا معنی ہے واقع کے مطابق، جس طرح سے اگلے الفاظ میں یہ بات ذکر کر دی گئی، وَّاِنَّ الدِّیْنَ لَوَاقِعٌ: جزاء واقع ہونے والی ہے، دین کا معنی جزاء، اعمال کی جزاء واقع ہونے والی ہے، یہ جس سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے یہ سچی بات ہے، اس میں کوئی کسی قسم کی غلطی فریب دھوکا نہیں ہے، یہ نہیں کہ خواہ مخواہ ایک بات بنا دی گئی، ایسے نہیں، واقع کے مطابق ہے، ''اور جزاء واقع ہونے والی ہے۔''

''قسم'' اور ''جوابِ قسم'' میں مناسبت

اور قرآنِ کریم میں قسمیں جو آیا کرتی ہیں یہ بارہا آپ کی خدمت میں عرض کیا گیا کہ ان میں کلام کی تاکید والا معنی بھی ہوا کرتا ہے، کہ قسم کھانے سے بات پختہ ہوتی ہے، اور یہ قسمیں مابعد کے مضمون کے لئے شاہد بھی ہوتی ہیں، اور شاہد اس طرح سے بن جائیں گی کہ قیامت کا وہ انکار جو کرتے تھے، بعث بعد الموت کا انکار جو کرتے تھے، تو ان کے انکار کی بنیاد اس بات پر تھی کہ یہ ہو کیسے سکتا ہے؟ اور اگر یہ واقع ہے تو ہمیں اس کا وقت کیوں نہیں بتایا جاتا؟ جس طرح سے آگے ان کا سوال ذکر کیا جائے گا۔ تو اللہ تعالیٰ ہمیشہ اس مضمون کو بیان فرماتے ہوئے اپنے علم اور اپنی قدرت کو ذکر فرماتے ہیں، تو یہ ہواؤں کا نظام اللہ نے جو قائم کر رکھا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی قدرت نمایاں ہے، ہوائیں بکھیرتی ہیں، بادلوں کو لاتی ہیں، بارش برستی ہے، اسی کے ساتھ یہ سارے کا سارا سلسلہ نباتات کا، زمین کے زندہ ہونے کا قائم ہے، تو اللہ تعالیٰ کی قدرت، اللہ تعالیٰ کا تصرف، اس کی طرف اگر کوئی شخص دیکھے تو اس کے بعد یہ بات ناممکن نظر نہیں آتی کہ اللہ تعالیٰ مارنے کے بعد دوبارہ زندہ کر لے۔ اور آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ بارش جو ہوتی ہے تو یہ پانی کا جو ذخیرہ موجود ہے دُنیا میں، اس کے اوپر آسمان کی طرف سے آفتاب کی حرارت واقع ہوتی ہے تو بخارات بن کے اُٹھتے ہیں، تو یہ پانی کے ذرّات ہی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اُڑا دیتے ہیں، یہ بھاپ بن کے پرواز کر جاتے ہیں، گویا کہ وہاں سے پانی کسی درجے میں ناپید ہو گیا، یا اس کے کچھ اجزاء کم ہو گئے جہاں سے اس کو اُٹھایا گیا، اُٹھانے کے بعد پھر جدھر اللہ تعالیٰ کا حکم ہوتا ہے بارشیں ہوتی ہیں، تو پھر وہی پانی دوبارہ لوٹا دیا جاتا ہے پانی کی شکل میں، ایک چیز پہلے ایک شکل میں موجود ہوتی ہے، پھر اس کو دوسری شکل میں تبدیل کر دیا جاتا ہے، اس کے بعد پھر اللہ تعالیٰ اس کو اسی شکل میں لے آتے ہیں، تو اسی طرح سے آج انسان جو آپ کو نظر آ رہا ہے تو پہلے یہ بھی اسی طرح سے بکھرے ہوئے اجزاء تھے، اکٹھے کئے گئے، اکٹھے کرنے کے بعد ان کو بکھیر دیا جائے، بکھیرنے کے بعد پھر ان کو اکٹھا کر دیا جائے، تو اللہ تعالیٰ کے ان تصرفات کی طرف دیکھتے ہوئے یہ چیز بعید معلوم نہیں ہوتی، یہ ممکن ہے، اور جس چیز کا ہونا ممکن ہو، پھر مخبرِ صادق اس کی خبر دے دے، تو اس کے وقوع کے متعلق یقین کرنا بھی ضروری ہے۔ اس طرح

سے یہ قسمیں مابعد والے مضمون کے لئے تاکید بن جائیں گی کہ جس چیز سے تمہیں ڈرایا جا رہا ہے وہ البتہ سچی بات ہے، اور جزاء واقع ہونے والی ہے۔

لفظ ''حُبُك'' کی تحقیق

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْحُبُكِ: حبك یہ حبیکہ کی جمع ہے، حبیکہ بروزن طریقہ، طریقہ کی جمع جس طرح سے طُرُق آجاتی ہے اسی طرح سے حَبِیْكَةٌ کی جمع حُبُك، لفظاً ومعناً یہ ایک ہی طرح ہیں، تو حُبُك کا معنی بھی راستے، جس طرح سے طرق کا معنی راستے ہوتا ہے، سَبْعَ طَرَآئِقَ کے اندر جس طرح سے طرائق کے ساتھ اس کو تعبیر کیا گیا (سورۂ مؤمنون: ۱۷)۔ ''قسم آسمان کی جو کہ راستوں والا ہے'' راستوں سے مراد ہوگا فرشتوں کے راستے۔ اور حبیکہ ہوا جس وقت چلتی ہے ریگستان کے اندر، تو آپ نے دیکھا ہوگا کہ ٹیلوں کے اُوپر دھاریاں سی بھی پڑ جایا کرتی ہیں، حبیکہ اس دھاری کو بھی کہتے ہیں ''دھاریوں والے آسمان کی قسم'' یوں بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور کپڑے کے اندر جس طرح سے دھاریاں پڑی ہوئی ہوتی ہیں یہ باعثِ زینت ہوتی ہیں تو اس لئے ترجمہ یوں بھی کر دیا گیا ہے ''زینت والے آسمان کی قسم!'' بہر حال یہ عالمِ بالا کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، اور اس کی قسم کے ذکر کرنے کا بھی وہی مقصد ہے جس طرح سے پہلے آپ کے سامنے ہواؤں کا تذکرہ آیا ہے، ''قسم ہے زینت والے آسمان کی! یا، قسم ہے راستوں والے آسمان کی!''

''منکرینِ قیامت'' کی دُنیا میں حالت

اِنَّكُمْ لَفِيْ قَوْلٍ مُّخْتَلِفٍ: بے شک تم البتہ مختلف باتوں میں لگے ہوئے ہو، یعنی تمہاری بات ایک نہیں ہے، جب قیامت کا ذکر آتا ہے تو کوئی کچھ کہتا ہے، کوئی کچھ بولتا ہے، سب بھانت بھانت کی بولیاں بول رہے ہیں، ''بے شک تم مختلف باتوں میں لگے ہوئے ہو'' يُّؤْفَكُ عَنْهُ مَنْ اُفِكَ: اَفَكَ: پھیرنا، پھیرا جاتا ہے اس قیامت کے اعتقاد سے وہی شخص جو پھیرا گیا، لفظی معنی اس طرح سے ہوا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو بالکل ہی چکر کھا جائے، سعادت کے راستے سے اور نیک بختی کے راستے سے جس کو بالکل ہی اُلٹ دیا جائے قیامت کے عقیدے سے وہی پھیرا جاتا ہے، جس طرح سے حدیث شریف میں سرورِ کائنات ﷺ نے لیلۃ القدر کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا کہ اس سے وہی محروم ہوتا ہے جو بالکل ہی محروم ہو، جس کی قسمت میں کوئی نیکی ہے ہی نہیں، سعادت ہے ہی نہیں، وہی اس رات کی برکات سے محروم کیا جاتا ہے۔[1] اسی طرح سے یہ ہوگیا، مَنْ اُفِكَ: جو الٹ دیا گیا، جس کے اندر سیدھا سوچنے کی قوت اور طاقت ہی نہیں رہی، جو سیدھا سوچنے کی صلاحیتیں ہی ختم کر بیٹھا، وہی اس سے چکر دیا جاتا ہے، ورنہ اگر کسی کی سوچ صحیح ہو اور اس کو غور کرنے کا کچھ نہ کچھ سلیقہ آتا ہو تو وہ سیدھا راستہ لے لے گا، قیامت کا عقیدہ وہ اختیار کر لے گا، ''پھیرا جاتا ہے اس سے وہی شخص جو پھیر دیا گیا'' قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ: اور یہ پھرے ہوئے جو لوگ تھے جن کے دماغ بگڑے ہوئے تھے، ان کے پاس اپنے مدعا کے لئے دلیل تو تھی کوئی نہیں، اور جو بغیر دلیل کے کسی قسم کی بات کیا کرتا ہے اسے خراص کہتے ہیں۔ خرص: اندازہ

(۱) ولا یحرم خیرھا الا کل محروم۔ (ابن ماجہ ص ۱۱۹ باب ما جاء فی فضل شهر رمضان/ مشکوٰۃ ۱/ ۱۷۳، کتاب الصوم فصل ثالث)

41 کرنا، تخمینے سے بات کرنا۔ تو خراص ہو جائیں گے اٹکل کے تیر چلانے والے، جو رجم بالغیب کرتے ہیں، بغیر کسی دلیل کے اس قسم
41 کی باتیں کرتے ہیں، تو خراصون ہو گئے اٹکل دوڑانے والے، تخمینے کے ساتھ باتیں کرنے والے، ایسے ہی خواہ مخواہ اپنی طرف سے، جس کی بنیاد دلیل پر نہیں ہے، ''خراصون برباد کردیئے گئے'' یعنی ان کی قسمت میں بربادی ہے، انسان بات کرے تو اس کی بنیاد کسی دلیل پر ہونی چاہیے، اور دلائل نہ ہوں تو اپنے طور پر ہی اس طرح سے بلا دلیل دعوے کرتے جانا یہ تو بربادی کی بات ہے، قُتِلَ الْخَرّٰصُوْنَ یہ دُعا کے معنی میں ہے، خراصون قتل کردیئے جائیں، برباد کردیئے جائیں، الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ غَمْرَةٍ سَاهُوْنَ: غمرة غفلت کو کہتے ہیں، ساھون سھو سے آگیا بھولنے کے معنی میں، ''جو لوگ غفلت میں بھولنے والے ہیں، غفلت میں پڑے ہوئے ہیں بھولنے والے ہیں'' يَسْـَٔلُوْنَ اَيَّانَ يَوْمُ الدِّيْنِ: پوچھتے ہیں کہ جزاء کا دِن کب ہوگا، یعنی ان کا یہ سوال ہے کہ اگر یہ واقع ہونے والا ہے تو کب آئے گا؟

''منکرینِ قیامت'' کا اُخروی اَنجام

يَوْمَ هُمْ عَلَى النَّارِ يُفْتَنُوْنَ: جس دِن کہ وہ آگ پر جلائے جائیں گے، تپائے جائیں گے، فَتَنَ کا لفظ اصل میں بولا جاتا ہے فَتَنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ، سونے چاندی کو آگ پر تپانا تاکہ اس کا کھوٹ ظاہر ہو جائے، یعنی انہیں یہ کہا جارہا ہے کہ فکر تو تمہیں انجام کی ہونی چاہیے، وقت کے پیچھے کیا لگے ہوئے ہو، کتنی باتیں دنیا کے اندر ہوتی ہیں جن کا وقت آپ کو معلوم نہیں لیکن وہ ہو کر رہتی ہیں، یہ پیچھے بارشوں کا ذکر ہی ہوا، تو بارش کا وقت معلوم نہیں لیکن ہوتی ہے، کتنی ہوگی؟ کسی کو مقدار معلوم نہیں، قبل از وقت اللہ تعالیٰ بارش کرتے ہیں، پردۂ غیب سے بہت ساری باتیں ایسی ظاہر ہوتی ہیں جن کا انسان کو پہلے پتا نہیں ہوتا، تو اسی طرح سے اگر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت اس کی تعیین کی، یعنی تمہیں نہیں بتائی، اس کا وقت ذکر نہیں کیا گیا، تو اس سے یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ یہ ہوگا ہی نہیں، یہ واقعہ ہو کر رہے گا، فکر تمہیں اپنے انجام کی ہونی چاہیے، یہ قیامت اسی دِن ہی آئے گی جس وقت تمہیں آگ میں تپایا جائے گا، تمہیں اس کا فکر ہونا چاہیے، تو يُفْتَنُوْنَ کا معنی ہو جائے گا يُحْرَقُوْنَ جس دِن کہ یہ لوگ آگ پر جلائے جائیں گے، آگ پر تپائے جائیں گے، آگ پر پیش کر کے ان کو جلایا جائے گا، ذُوْقُوْا فِتْنَتَكُمْ: اور انہیں کہا جائے گا کہ تم اپنے فتنہ کا مزہ چکھو، اگر اس ''فتنہ'' سے وہی يُفْتَنُوْنَ والا معنی لیا جائے تو پھر ہوگا کہ اپنے جلائے جانے کا مزہ چکھو، مصدر کی اضافت مفعول کی طرف ہو جائے گی، اور ''فتنہ'' کا لفظ چونکہ شرارت اور گمراہی کے لئے بھی بولا جاتا ہے، قرآنِ کریم میں اس معنی میں بھی آیا ہے، تو یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی شرارت اور گمراہی کا مزہ چکھو، ''آگ پر انہیں تپایا جائے گا اور کہا جائے گا کہ تم اپنی شرارت اور گمراہی کا مزہ چکھو، یا، اپنے اس جلائے جانے کا مزہ چکھو'' هٰذَا الَّذِيْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ: یہی وہ چیز ہے جس کو تم جلدی جلدی طلب کیا کرتے تھے۔

''متقین'' کا انجام اور ان کی صفات

اللہ تعالیٰ کی عادتِ شریفہ یہی ہے کہ جب ایک فریق کا ذکر کرتے ہیں تو مقابلے میں دوسرے فریق کا ذکر بھی آجاتا ہے، تو یہاں جو گمراہوں کا ذکر آیا تو اس کے مقابلے میں ہدایت یافتہ لوگوں کا ذکر آرہا ہے، بِضِدِّهَا تَتَبَيَّنُ الْاَشْيَاءُ، چیزیں ہمیشہ اپنی

ضد کے ذکر کے ساتھ واضح ہوا کرتی ہیں، اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ :متقین: خدا سے ڈرنے والے، پرہیزگار،''بے شک متقین باغات میں ہوں گے اور چشموں میں ہوں گے'' اٰخِذِيْنَ مَآ اٰتٰهُمْ رَبُّهُمْ : لینے والے ہوں گے اس چیز کو جو ان کو ان کے رب نے دی...... اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ : پہلے انجام کی طرف اشارہ تھا، اب ان کے اعمال کی طرف اشارہ ہے کہ یہ اچھے انجام تک کیسے پہنچے، پہلے تو تقوے کا لفظ آ گیا کہ وہ ہمیشہ بچ بچ کے چلتے تھے، اٹکل کے ساتھ باتیں نہیں کیا کرتے تھے، ہمیشہ بچ بچ کے چلتے تھے، احتیاط سے قدم اُٹھاتے تھے، احتیاط سے بات زبان سے نکالتے تھے، تقویٰ کا مفہوم یہی ہوتا ہے۔ اور پھر ان کی عادت تھی اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُحْسِنِيْنَ : وہ اس سے پہلے محسنین تھے، احسان والے تھے، ہر کام کو اچھے طریقے سے کرنے والے تھے، اللہ تعالیٰ کو حاضر ناظر سمجھ کر عبادت کرنے والے تھے، جیسے احسان کا معنی ذکر کیا تھا، حدیثِ جبریل میں آتا ہے، جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ سے پوچھا تھا: مَا الْاِحْسَانُ ؟ احسان کیا ہوتا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''اَنْ تَعْبُدَ اللهَ كَاَنَّكَ تَرَاهُ. فَاِنْ لَّمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَاِنَّهٗ يَرَاكَ '' اللہ کی عبادت ایسے طور پر کرو گویا کہ تم اللہ کو دیکھ رہے ہو، کیونکہ اگر تم نہیں دیکھ رہے تو وہ تو دیکھ ہی رہا ہے (بخاری ص ۱۲)، تو آمنا سامنا تو ہے ہی، اس استحضار کے ساتھ عبادت کرنا گویا کہ ہم اللہ کے سامنے ہیں یا اللہ کو دیکھ رہے ہیں یہی صفت احسان ہے، تو جب یہ تصور قائم ہو جائے تو آپ جانتے ہیں کہ انسان بہت اچھے طریقے سے عبادت کرتا ہے،''اس سے قبل وہ احسان کرنے والے تھے...... كَانُوْا قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ مَا يَهْجَعُوْنَ : مَا يَهْجَعُوْنَ کے اندر ''مَا'' زائدہ ہے، اور هَجَعَ هُجُوعًا: سونے کو کہتے ہیں، كَانُوْا کا تعلق يَهْجَعُوْنَ کے ساتھ ہو جائے گا، اور قَلِيْلًا یہ زَمَانًا قليلًا کے معنی میں ہے، كانوا يهجعون قليلًا مِنَ الليلِ وہ رات کے تھوڑے حصے میں سویا کرتے تھے، كَانُوْا يَهْجَعُوْنَ، سویا کرتے تھے، قَلِيْلًا مِّنَ الَّيْلِ، رات میں سے تھوڑا وقت، رات کا تھوڑا وقت سوتے تھے، زیادہ وقت اللہ کی عبادت میں گزارتے تھے۔ اور اگر ''مَا'' کو مصدریہ بنا لیا جائے تو پھر بھی بات ٹھیک ہو سکتی ہے،''ان کا سونا رات کے قلیل وقت میں ہوتا تھا'' یعنی غافلوں کی طرح نہیں کہ ساری رات ہی سو کر گزار دیں، غفلت کے ساتھ گزار دیں، بلکہ وہ رات کا اکثر حصہ اللہ کی یاد میں اور آخرت کی فکر میں گزارتے تھے۔

''وقتِ سحر'' کی فضیلت واہمیت

وَبِالْاَسْحَارِ هُمْ يَسْتَغْفِرُوْنَ: اسحار یہ سَحَرٌ کی جمع ہے۔ سحر کہتے ہیں رات کے آخری چھٹے حصے کو،''اور صبح کے وقت رات کے آخری حصوں میں وہ اِستغفار کرتے تھے، اللہ تعالیٰ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے تھے۔'' اور یہ جو کہا گیا ہے کہ رات کے کچھ حصے میں سوتے تھے، تھوڑے وقت میں سوتے تھے، تو اس کا مطلب ہے کہ کافروں کے مقابلے میں ان کا سونا کم ہوتا تھا، کہ جس طرح سے غافل لوگ سوتے ہیں اس طرح سے یہ نہیں سویا کرتے تھے، اور یہ سب نفلی عبادات ہیں جن کے اُوپر کمال جزاء ذکر کیا جارہا ہے، ورنہ مطلقاً نجات کے لئے یہ چیز شرط نہیں ہے، جو عبادات یہاں ذکر کی جارہی ہیں یہ نفل کے درجے میں ہیں، تو آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں تہجد کی فضیلت ہے کہ رات کے آخری حصے میں انسان اُٹھے، اللہ سے استغفار کرے، اللہ کو یاد کرے تو کمال کامیابی کے لئے یہ چیز ضروری ہے، مطلقاً نجات تو ایمان اور فرائض کے ادا کرنے سے بھی ہو جاتی ہے، اور جتنا نوافل کی آپ

پابندی کریں گے اتنا اللہ کے ہاں زیادہ کمال حاصل کرلیں گے، رات کے آخری حصے میں اللہ سے اُٹھ کے اللہ سے اِستغفار کرنا یہ بہت بڑی فضیلت کی بات ہے، وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ یہ لفظ پہلے سورۂ آل عمران (آیت:۱۷) میں بھی آیا تھا کہ یہ لوگ اسحار کے وقت اِستغفار کرنے والے ہوتے ہیں۔ اِستغفار کا مطلب یہ ہے کہ اگر رات کو وہ اللہ کا ذکر کرتے ہیں اور اللہ کی عبادت کرتے ہیں، تو تھوڑی سی عبادت کرنے کے بعد وہ تکبر میں نہیں آجاتے کہ اب ہم بہت نیک ہوگئے ہیں اور ہم جنت کے ضرور حق دار ہوگئے ہیں، ضرور ہمیں جنت ملے گی، نہیں! رات اللہ کی عبادت میں گزارنے کے باوجود ان کو اپنی کوتاہیوں کا احساس ہوتا ہے، وہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اِستغفار ہی کرتے ہیں۔ اور یہ وقت ایسا ہے کہ جس میں اللہ تعالیٰ دُعا بھی قبول فرماتے ہیں اور جو معافی مانگے اللہ تعالیٰ اُسے معافی بھی دیتے ہیں۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ نے فرمایا کہ رات کے آخری حصے میں اللہ تعالیٰ آسمانِ دُنیا پر تشریف لاتے ہیں (اپنی شان کے لائق، جیسے اس کی شان کے لائق ہے) طلوعِ فجر تک وہ اس طرح سے آواز دیتے رہتے ہیں: هَلْ مِنْ سَائِلٍ فَاُعْطِيَهٗ! کیا کوئی مانگنے والا ہے کہ میں اسے دُوں؟ هَلْ مِنْ دَاعٍ فَاَسْتَجِيْبَ لَهٗ! کیا کوئی دُعا کرنے والا ہے کہ میں اس کی دُعا قبول کروں؟ هَلْ مِنْ مُسْتَغْفِرٍ فَاَغْفِرَ لَهٗ! کیا کوئی معافی مانگنے والا ہے کہ میں اسے معاف کردوں؟[1] جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بُلاوا ہوتا ہے تو ایسے وقت میں اِستغفار جو کیا جائے گا، یا دُعا کی جائے گی، اللہ کے سامنے سوال کیا جائے گا تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا فرمائیں گے، یہ تو ان کی بدنی عبادت کا ذکر آگیا...... وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ: اور ان کے مالوں میں حق ہے سائل کے لئے اور محروم کے لئے، سائل تو ہوگیا مانگنے والا جو اپنی ضرورت سے مجبور ہوکر سوال کرتا ہے، محروم سے غیر سائل مراد ہے جو لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتا جس کی بنا پر اکثر و بیشتر لوگوں کی امداد سے محروم رہ جاتا ہے، مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے مالوں میں دُوسروں کا حق سمجھتے ہیں، یہ نہیں کہ جو ہم نے کمایا وہ ہمارا ہی ہے، وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے جو ہمیں دیا ہے اس میں ہمارے دُوسرے بھائیوں کا بھی حق ہے، اور اس سے صرف زکوٰۃ ہی مراد نہیں بلکہ اور صدقات خیرات بھی وہ کرتے رہتے ہیں، زکوٰۃ تو فرض کا درجہ ہے، اور یہاں جو ترغیب دی جارہی ہے وہ نفل کے درجے میں عبادت کی ہے، اور صرف زکوٰۃ ادا کرکے بےفکر ہوجانا کہ ہم نے مالی حق ادا کردیا، یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے، جس طرح سے سورۂ بقرہ میں آیا تھا وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ (آیت:۱۷۷) اللہ تعالیٰ کی محبت پر مال دیتے ہیں، یا مال کی محبت کے باوجود مال کو اللہ کے راستے میں مال خرچ کرتے ہیں، (اس کے بعد زکوٰۃ کا ذِکر الگ ہے وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ)، تو یہ بھی اپنے مالوں میں ان کا حق سمجھتے ہیں، اور حق سمجھنے کا ایک اثر یہ ہوتا ہے کہ دے کر احسان نہیں جتلاتے، کیونکہ اگر انسان یہ سمجھے کہ اس کا حق کوئی نہیں تھا، میں نے دے دیا، تو اس میں تو ہے کہ گویا میں نے احسان کیا، ان کا یہ ذہن نہیں، بلکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں دیا ہے تو دوسروں کا حق ہمارے ذمے ہے، اور اگر ہم یہ ادا نہیں کریں گے تو اُلٹے ہم گنہگار ہیں، اور اگر ہم دیتے ہیں تو ہم اپنا ایک فرض ادا کرتے ہیں، اُن کا حق ہمارے ذمے ہے جس کو ہم ادا کررہے ہیں، اس ذہن

(۱) ابن کثیر۔ آل عمران: آیت ۱۷، واللفظ لہٗ/ نیز دیکھیں: بخاری ۱/ ۱۵۲، باب الدعاء فی الصلاۃ۔ مسلم ۱/ ۲۵۸۔ مشکوۃ ۱/ ۱۰۹، باب التحریض علی قیام اللیل۔

کے ساتھ وہ لوگوں کے اُوپر اپنا مال خرچ کرتے ہیں، دُوسروں کا حق سمجھتے ہوئے اس کو اُدا کرتے ہیں، چاہے کوئی ان سے سوال کرے، چاہے سوال نہ کرے، خود خیال کرتے ہیں کہ کون ضرورت مند ہے کون ضرورت مند نہیں ہے؟ تو ایسے لوگوں کو مالی امداد دیتے ہیں، یہ متقین کی صفت ہے جو کہ جنّات اور عیون میں ہوں گے۔

زمین اور اِنسانی نفوس میں قدرت کی نشانیاں

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ: زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے، اگر کوئی یقین لانا چاہے تو زمین میں نشانیاں ہیں، بہت دفعہ ان کا تذکرہ ہوگیا مختلف انداز سے اللہ تعالیٰ نے ان آیات کی طرف متوجہ کیا ہے، ''زمین میں نشانیاں ہیں یقین لانے والوں کے لئے اور خود تمہارے نفسوں میں'' اپنے آپ میں غور کرو کہ تم کیا تھے، اللہ تعالیٰ نے تمہیں کس طرح سے پیدا کیا، کیسی صلاحیتیں دیں، بچپن کیا ہوتا ہے، جوانی کیا ہے، بڑھاپا کیا ہوگا، اس کے بعد کس طرح سے زوال آتا ہے، یہ ساری کی ساری نشانیاں ہیں، اللہ تعالیٰ نے کس قسم کی قابلیتیں، صلاحیتیں انسان میں رکھی ہیں، تو اللہ کی قدرت کی دلیل ہیں جس کے بعد یہ سمجھنا آسان ہو جاتا ہے کہ دوبارہ زندگی دینا اللہ کے لئے کوئی مشکل نہیں ہے، ''تمہارے نفسوں میں نشانیاں ہیں'' أَفَلَا تُبْصِرُونَ: کیا تم دیکھتے نہیں ہو؟ یعنی تمہاری آنکھیں نہیں کھلتیں ان نشانیوں کو دیکھ کر؟

وقت کا معلوم نہ ہونا، قیامت کے نہ ہونے کی دلیل نہیں!

وَفِي السَّمَاءِ رِزْقُكُمْ وَمَا تُوعَدُونَ: آسمان میں ہے تمہارا رزق اور وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو، یعنی اِس کا فیصلہ آسمان میں ہوتا ہے، تمہیں پتا نہیں کہ تمہیں کیا رزق ملے گا، کتنا ملے گا؟ یہ فیصلہ بھی آسمانوں میں ہے، اور جتنا ملنا ہوتا ہے مل کے رہتا ہے، تفصیلات تم نہیں جانتے، تو اسی طرح سے اگر قیامت کے بارے میں تمہیں یہ بتایا جا رہا ہے کہ یقین کرو کہ وہ آئے گی لیکن تمہیں اُس کی تفصیل معلوم نہیں، کس مہینے میں آئے گی؟ کس تاریخ میں آئے گی؟ کون سے دن آئے گی؟ کتنے سالوں کے بعد آئے گی؟ تو یہ عدم کی دلیل نہیں ہے، صبح شام، رات دن تمہیں روزی پہنچتی ہے، رزق پہنچتا ہے تو کیا تمہیں اس کی تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ تمہیں کیا ملنے والا ہے؟ کتنا ملنے والا ہے؟ تو تمہارا رزق اور جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو ان سب کی تقدیر آسمان میں ہے، اس کے فیصلے آسمان میں ہوتے ہیں، ''آسمان میں ہے تمہاری روزی اور وہ چیز جس کا تم وعدہ دیے جاتے ہو'' فَوَرَبِّ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ: قسم ہے آسمان اور زمین کے رَبّ کی! إِنَّهُ لَحَقٌّ مِّثْلَ مَا أَنَّكُمْ تَنطِقُونَ: یہ بات البتہ سچی ہے ایسے ہی جس طرح سے کہ تم بول رہے ہو، تم بات کر رہے ہو، تو تمہیں یقین ہے کہ ہم بول رہے ہیں، تو جس طرح سے یہ بات یقینی ہے اسی طرح سے یہ بات بھی یقینی ہے جس کی تمہیں خبر دی جا رہی ہے، قسم کھا کے کہا جا رہا ہے کہ یہ بات بالکل حق ہے، تمہیں اس کی فکر کرنی چاہیے، ''آسمان اور زمین کے رَبّ کی قسم! بے شک یہ البتہ حق ہے (یعنی مَا تُوعَدُونَ جس کا ذکر پہلے کیا جا رہا ہے یہ حق ہے) مثل تمہارے بولنے کے، یعنی جس طرح سے تمہیں اپنے بولتے وقت یقین ہے کہ ہم ہی بول رہے ہیں اسی طرح سے یہ بات بھی یقینی ہے۔

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ اِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ ﴿٢٤﴾ اِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا ؕ

کیا آپ کے پاس ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی بات آئی؟ ﴿۲۴﴾ جب کہ داخل ہوئے وہ ابراہیم علیہ السلام پر پھر کہا انہوں نے سلام،

قَالَ سَلٰمٌ ۚ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٢٥﴾ فَرَاغَ اِلٰٓى اَهْلِهٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ ﴿٢٦﴾ ۙ

ابراہیم علیہ السلام نے بھی سلام کہا اور (دِل میں خیال کیا) یہ کچھ اجنبی سے لوگ ہیں ﴿۲۵﴾ پھر چلے گئے اپنے گھر کی طرف، ایک موٹا سا بچھڑا لے آئے ﴿۲۶﴾

فَقَرَّبَهٗٓ اِلَيْهِمْ قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ ﴿٢٧﴾ ز فَاَوْجَسَ

ابراہیم علیہ السلام نے وہ بچھڑا ان مہمانوں کے قریب کیا، ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم کھاتے نہیں ہو؟ ﴿۲۷﴾ دِل کے اندر محسوس کیا ابراہیم علیہ السلام نے

مِنْهُمْ خِيْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ ؕ وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ ﴿٢٨﴾

ان کی طرف سے خوف، وہ کہنے لگے کہ آپ خوف نہ کیجئے، بشارت دی انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک علم والے بچّے کی ﴿۲۸﴾

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ ﴿٢٩﴾ قَالُوْا

پس متوجہ ہوئی ابراہیم علیہ السلام کی بیوی بولتی ہوئی، اور پیشانی پر ہاتھ مار کر کہنے لگی کہ میں تو بوڑھی ہوں اور بانجھ ہوں ﴿۲۹﴾ فرشتوں نے کہا

كَذٰلِكِ ۙ قَالَ رَبُّكِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ ﴿٣٠﴾

کہ ایسے ہی ہوگا، تیرے رَبّ نے یہ کہا ہے، وہ حکمت والا ہے علم والا ہے ﴿۳۰﴾

قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٣١﴾ قَالُوْٓا اِنَّآ اُرْسِلْنَآ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٣٢﴾ ۙ

ابراہیم علیہ السلام نے پوچھا: اے بھیجے ہوؤ! تمہیں کیا واقعہ درپیش ہے؟ ﴿۳۱﴾ انہوں نے بتایا کہ ہم بھیجے گئے ہیں مجرم لوگوں کی طرف ﴿۳۲﴾

لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّنْ طِيْنٍ ﴿٣٣﴾ ۙ مُّسَوَّمَةً عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣٤﴾

تاکہ ان کے اوپر ہم پتھر برسائیں مٹّی سے تیار ہونے والے ﴿۳۳﴾ جو نشان زدہ ہیں تیرے رَبّ کے پاس حد سے گزرنے والوں کے لئے ﴿۳۴﴾

فَاَخْرَجْنَا مَنْ كَانَ فِيْهَا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٣٥﴾ ۚ فَمَا وَجَدْنَا فِيْهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ

پھر جو مؤمنین اس بستی میں تھے ہم نے ان کو نکال لیا ﴿۳۵﴾ پس نہ پایا ہم نے اس بستی میں سوائے ایک گھر کے

الْمُسْلِمِيْنَ ﴿٣٦﴾ ۚ وَتَرَكْنَا فِيْهَآ اٰيَةً لِّلَّذِيْنَ يَخَافُوْنَ الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿٣٧﴾ ؕ وَفِيْ مُوْسٰٓى

مسلمانوں میں سے ﴿۳۶﴾ ہم نے چھوڑی اس بستی میں نشانی ان لوگوں کے لئے جو کہ دردناک عذاب سے ڈرتے ہیں ﴿۳۷﴾ اور موسیٰ علیہ السلام کے

إِذْ أَرْسَلْنٰهُ إِلٰى فِرْعَوْنَ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ فَتَوَلّٰى بِرُكْنِهٖ

واقعے میں (بھی نشانی ہے) جبکہ بھیجا ہم نے اس کو فرعون کی طرف واضح دلیل دے کر ﴿٣٨﴾ پس اس نے اپنی فوجوں سمیت پیٹھ پھیر لی

وَقَالَ سٰحِرٌ أَوْ مَجْنُوْنٌ ﴿٣٩﴾ فَأَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ وَهُوَ

اور کہا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے ﴿٣٩﴾ پھر پکڑ لیا ہم نے اس فرعون کو اور اس کے لشکروں کو، پھر ہم نے پھینک دیا ان کو سمندر میں، وہ فرعون

مُلِيْمٌ ﴿٤٠﴾ وَفِيْ عَادٍ إِذْ أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ ﴿٤١﴾ مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ

قابلِ ملامت کام کرنے والا تھا ﴿٤٠﴾ اور عاد کے اندر (بھی نشانی ہے) جب بھیجی ہم نے ان کے اُوپر بے برکت ہوا ﴿٤١﴾ نہیں چھوڑتی تھی وہ ہوا کسی چیز کو

أَتَتْ عَلَيْهِ إِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ ﴿٤٢﴾ وَفِيْ ثَمُوْدَ إِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ ﴿٤٣﴾

جس پر وہ آئی، مگر اس نے کر دیا اس کو بوسیدہ ہڈیوں کی طرح ﴿٤٢﴾ اور ثمود میں (بھی نشانی ہے) جب انہیں کہا گیا کہ فائدہ اُٹھاؤ تم ایک وقت تک ﴿٤٣﴾

فَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ فَأَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ﴿٤٤﴾ فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ

پھر وہ سرکش ہو گئے اپنے رَبّ کے حکم سے پھر ان کو بھی ایک کڑک نے پکڑ لیا اور وہ دیکھ رہے تھے ﴿٤٤﴾ پھر نہ طاقت رکھی انہوں نے

قِيَامٍ وَّمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ ﴿٤٥﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ۖ إِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿٤٦﴾

کھڑے ہونے کی، اور نہیں تھے وہ بدلہ لینے والے ﴿٤٥﴾ اس سے قبل ہم نے قوم نوح کو ہلاک کیا تھا، بے شک وہ بھی نافرمان لوگ تھے ﴿٤٦﴾

تفسیر

ابراہیم علیہ السلام کے لئے بیٹے کی خوشخبری

آگے کچھ واقعات بیان کئے جا رہے ہیں پچھلی اُمتوں کے، جن سے اِسی مضمون کی تائید کرنی مقصود ہے، هَلْ أَتٰىكَ حَدِيْثُ ضَيْفِ إِبْرٰهِيْمَ الْمُكْرَمِيْنَ یہ واقعہ بھی کئی دفعہ گزر گیا، کیا آپ کے پاس ابراہیم علیہ السلام کے معزز مہمانوں کی بات آئی؟ ان کا واقعہ آپ نے سنا؟ مراد اس سے فرشتے ہیں اس لیے ان کو مکرمین کہا جاتا ہے، کیونکہ فرشتوں کی صفت آئی ہے قرآنِ کریم میں عِبَادٌ مُّكْرَمُوْنَ (سورۂ انبیاء: ٢٦)، یا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے چونکہ ان مہمانوں کا اکرام کیا تھا تو ابراہیم علیہ السلام کے اکرام کے اعتبار سے وہ مکرم تھے، إِذْ دَخَلُوْا عَلَيْهِ فَقَالُوْا سَلٰمًا: جب کہ داخل ہوئے وہ ابراہیم علیہ السلام پر، پھر کہا انہوں نے سلام، نُسَلِّمُ سَلَامًا۔ اور ابراہیم علیہ السلام نے بھی جواب میں سلام کہا، اور پھر دل میں خیال کیا قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ: کہ یہ تو کچھ اوپرے سے لوگ ہیں، اجنبی سے لوگ ہیں، فَرَاغَ إِلٰى أَهْلِهٖ: چلے گئے اپنے گھر کی طرف فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِيْنٍ: عجل بچھڑے کو کہتے ہیں، سمین کا معنی موٹا، اور دوسری جگہ لفظ آیا تھا بِعِجْلٍ

حَنِيْذٍ (سورۂ ہود:۶۹) حنیذ کہتے ہیں بھنے ہوئے کو، ایک موٹا سا بچھڑا بھنا ہوا لے آئے، یعنی بچھڑے کا گوشت لے آئے، فَقَرَّبَهٗۤ اِلَيْهِمْ: ابراہیم علیہ السلام نے وہ عجل ان مہمانوں کی طرف قریب کیا، قَالَ اَلَا تَاْكُلُوْنَ: جب دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کے لئے نہیں بڑھتے تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کہا کہ کیا تم کھاتے نہیں ہو؟ فَاَوْجَسَ مِنْهُمْ خِيْفَةً: دل کے اندر محسوس کیا حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کی طرف سے خوف، کہ اگر یہ مہمان ہوتے محبت کے طور پر آئے ہوتے تو میں نے ان کے سامنے جو کھانا پیش کیا ہے تو اس کو یہ کھاتے، کہنے کے باوجود اِن کے ہاتھ نہیں بڑھتے، معلوم ہوتا ہے یہ کوئی دشمن ہیں، اُس زمانے میں یہ طریقہ تھا کہ اگر کسی شخص نے دوسرے کو کوئی نقصان پہنچانا ہو یا کوئی لڑنے بھڑنے کے خیال سے آیا ہو تو اس کے دستر خوان پہ کھاتا نہیں تھا، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہی خیال کیا کہ یہ جو کھا نہیں رہے اور ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھ رہے تو یہ کسی مکروہ ارادے کے ساتھ نہ آئے ہوں، قَالُوْا لَا تَخَفْ: فرشتوں کو احساس ہو گیا تو پھر انہوں نے بات ظاہر کر دی، وہ کہنے لگے کہ آپ خوف نہ کیجئے، وَبَشَّرُوْهُ بِغُلٰمٍ عَلِيْمٍ: بشارت دی ان فرشتوں نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک علم والے بچے کی، غلام علیم سے یہاں مراد حضرت اسحاق ہیں، جیسا کہ سورۂ ہود کے اندر تفصیل آئی تھی۔ لُوط علیہ السلام کی قوم کو تباہ کرنے کے لئے جو فرشتے آئے تھے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس آئے اور انہوں نے آ کر اسحاق علیہ السلام کی ولادت کی بشارت دے دی، فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَمِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ يَعْقُوْبَ سورۂ ہود کے اندر یہ تفصیل آئی تھی، ''بشارت دی انہوں نے ابراہیم علیہ السلام کو ایک علم والے بچے کی۔''

ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کا تعجب

فَاَقْبَلَتِ امْرَاَتُهٗ فِيْ صَرَّةٍ فَصَكَّتْ وَجْهَهَا: پس متوجہ ہوئی ابراہیم علیہ السلام کی بیوی، اس جگہ بیوی کا مصداق حضرت سارہ ہیں، فِيْ صَرَّةٍ: صَرَّ آواز نکالنے کو کہتے ہیں، صَرْصَرَ الرِّيْحُ ہوا نے آواز دی، صَرْصَرَ الْبَابُ دروازہ کھولتے وقت جس قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے اس کو بھی صَرْصَرَ سے تعبیر کرتے ہیں، تو فِيْ صَرَّةٍ کا معنی ہے حال کو بنالی صَارَّةً، یعنی بولتی ہوئی، جب انہوں نے یہ بات سنی، وَامْرَاَتُهٗ قَآئِمَةٌ ان کی بیوی بھی کھڑی تھی فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ہم نے اس کو بشارت دی جس طرح سے پیچھے آیا تھا (سورۂ ہود:۷۱)، تو جب اس نے یہ آواز سنی تو بولتی ہوئی آئی اور آ کے کہتی ہے کہ وَقَالَتْ عَجُوْزٌ عَقِيْمٌ: عجوز بوڑھی کو کہتے ہیں، عقیم کہتے ہیں بانجھ کو یعنی جو اولاد کے قابل نہ ہو، فَصَكَّتْ وَجْهَهَا: صَكٌّ مارنے کو کہتے ہیں، تعجب کے ساتھ، جس طرح سے انسان کوئی تعجب کے ساتھ بات سنتا ہے تو یوں اپنی پیشانی کو ہاتھ مارتا ہے، تو ابراہیم علیہ السلام کی بیوی سارہ بھی بولتی ہوئی متوجہ ہوئی اور پیشانی پر ہاتھ مار کے کہنے لگی کہ میں تو بوڑھی ہوں اور بانجھ ہوں، کیا میرے اولاد ہوگی؟ جس طرح سے دوسری جگہ لفظ آئے ہوئے ہیں اَتَعْجَبِيْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ (سورۂ ہود: ۷۳)، تو تعجب کے طور پر انہوں نے ہاتھ اس طرح سے پیشانی پہ مارا کہ کیا میرے اولاد ہوگی؟ میں تو بوڑھی ہوں اور عقیم ہوں، عقیم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جوانی کے وقت بھی میں اولاد کے قابل نہیں تھی، اب اولاد کس طرح سے ہوگی؟ قَالُوْا كَذٰلِكِ: فرشتوں نے کہا کہ ایسے ہی ہے، یعنی چاہے تُو بوڑھی ہے، چاہے تُو عقیم تھی، کیسی بھی تھی، اللہ تعالیٰ نے یوں فرمایا ہے قَالَ رَبُّكِ: تیرے رَبّ نے یہ کہا ہے، اِنَّهٗ هُوَ الْحَكِيْمُ الْعَلِيْمُ: وہ حکمت والا ہے علم والا ہے، اس لئے اس کے علم میں ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ

اب آپ کو اولاد دی جائے، تو بوڑھی ہونا یا عقیم ہونا اللہ کی قدرت کے لئے کوئی رُکاوٹ نہیں ہے، اللہ تعالیٰ اولاد کے قابل کردے گا اور اولاد ہو جائے گی۔

قومِ لُوط پر عذاب

یہ بات تو ختم ہوگئی، تو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ اتنے فرشتے جو آئے ہیں تو یہ صرف بشارت دینے کے لئے نہیں آئے، ان کے سامنے کوئی اور کام بھی ہے، تو پوچھا فَمَا خَطْبُكُمْ أَيُّهَا الْمُرْسَلُونَ: اے بھیجے ہوؤ! تمہیں کیا واقعہ درپیش ہے؟ خطب کہتے ہیں بڑے واقعے کو، قَالُوٓا: انہوں نے بتایا کہ إِنَّآ أُرْسِلْنَآ إِلَىٰ قَوْمٍ مُّجْرِمِينَ: ہم بھیجے گئے ہیں مجرم لوگوں کی طرف، ''مجرم لوگوں'' سے یہاں قومِ لُوط مراد ہے، لِنُرْسِلَ عَلَيْهِمْ حِجَارَةً مِّن طِينٍ: تاکہ بھیجیں ہم ان کے اُوپر پتھر، طین کہتے ہیں گارے کو، گارے سے تیار ہونے والا پتھر، اس سے کھنگر مراد ہیں، جس طرح سے دوسری جگہ سجیل کا لفظ آیا (سورۂ ہود: ۸۲) سجیل معرّب ہے سنگِ گل سے، یہ بھٹے پر جو اینٹیں پکا کرتی ہیں یہ پتھر گویا کہ مٹی سے تیار ہوتا ہے، اور بعض اس میں کھنگر کی شکل بن جاتے ہیں، ''تاکہ ان کے اُوپر ہم پتھر برسائیں مٹی سے تیار ہونے والے'' مُّسَوَّمَةً عِندَ رَبِّكَ لِلْمُسْرِفِينَ: جو نشان زدہ ہیں تیرے رَبّ کے پاس مسرفین کے لئے، حد سے گزرنے والوں کے لئے، ''حد سے گزرنے والوں'' سے وہی قومِ لُوط مراد ہوگئی، نشان زدہ کا معنی ہے کہ ان کے اُوپر خاص نشان ہے کہ وہ عذاب کے پتھر ہیں اور ان لوگوں کو ہلاک کرنے کے لئے اللہ کی طرف سے بھیجے جائیں گے، فَأَخْرَجْنَا مَن كَانَ فِيهَا مِنَ الْمُؤْمِنِينَ: پھر نکال لیا ہم نے اس بستی سے جو بھی اس میں ایمان والے تھے، جو مؤمنین اس بستی میں تھے ہم نے ان کو نکال لیا، فَمَا وَجَدْنَا فِيهَا غَيْرَ بَيْتٍ مِّنَ الْمُسْلِمِينَ: پس نہ پایا ہم نے اس بستی میں سوائے ایک گھر کے مسلمانوں میں سے، مسلمانوں کا صرف ایک ہی گھر تھا جس کو ہم نے وہاں سے نکال لیا، اس سے حضرت لُوط علیہ السلام کا گھرانہ مراد ہے، بیوی کے علاوہ، بیوی وہیں رہ گئی تھی، تو گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرماں بردار بندوں کو علیحدہ کرلیا اور دُوسروں پر پتھر برسائے۔ بہت دفعہ یہ واقعہ آپ کے سامنے گزر چکا، وَتَرَكْنَا فِيهَآ ءَايَةً لِّلَّذِينَ يَخَافُونَ الْعَذَابَ الْأَلِيمَ: ہم نے چھوڑی اس بستی میں نشانی ان لوگوں کے لئے جو کہ دردناک عذاب سے خوف کھاتے ہیں، ڈرتے ہیں، یعنی یہ واقعہ اُن لوگوں کے لئے ایک نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ جب گرفت فرماتے ہیں تو پھر گرفت کتنی سخت ہوتی ہے اور کس طرح سے پھر برباد کیا جاتا ہے۔ قومِ لُوط کی ہلاکت کا واقعہ قرآنِ کریم میں متعدد جگہ گزر گیا ہے۔

فرعون، عاد اور ثمود کی سرکشی اور ہلاکت

وَفِي مُوسَىٰٓ: اور موسیٰ علیہ السلام کے واقعے میں بھی نشانی ہے، إِذْ أَرْسَلْنَاهُ إِلَىٰ فِرْعَوْنَ بِسُلْطَانٍ مُّبِينٍ: جب کہ بھیجا ہم نے اس کو فرعون کی طرف واضح دلیل دے کر، فَتَوَلَّىٰ بِرُكْنِهِۦ: رُکن اصل کے اعتبار سے قوت کو کہتے ہیں، تو یہاں یہ معنی بھی ہوسکتا ہے کہ اپنی قوت کے سبب سے اس نے پیٹھ پھیری، اس کو اپنی قوت پہ ناز تھا، اور رُکن سے مراد اَرکانِ سلطنت بھی ہوسکتے ہیں کہ اپنی فوجوں سمیت اس نے پیٹھ پھیر لی، اپنے ارکان سمیت، یعنی نہ ارکان مانے نہ وہ مانا، یا، اپنی قوت کے بل بوتے پہ اس نے اعراض کیا، وَقَالَ سَٰحِرٌ أَوْ مَجْنُونٌ: اور اس کے انکار کا حاصل یہ تھا کہ اس نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق کہا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے، یہ أَوْ مَنعِ خُلُو کے لئے

ہے، یعنی ان دونوں باتوں میں سے ایک ضرور ہے، یا تو جادوگر ہے، اس لئے اس قسم کے کرتب دکھاتا ہے، یا یہ دیوانہ ہے جو ایسی باتیں اس نے کرنی شروع کر دیں، فَاَخَذْنٰهُ وَجُنُوْدَهٗ: پھر پکڑ لیا ہم نے اس فرعون کو اور اس کے لشکروں کو، فَنَبَذْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ: پھر ہم نے پھینک دیا ان کو سمندر میں، وَهُوَ مُلِيْمٌ: هُوَ کی ضمیر فرعون کی طرف لوٹ رہی ہے، اَلَامَ کا معنی ہوتا ہے قابلِ ملامت کام کرنا، ''وہ فرعون قابلِ ملامت کام کرنے والا تھا'' اس نے کام ہی ایسے کئے تھے کہ جس پر اس کو ملامت ہونی چاہیے تھی...... وَفِيْ عَادٍ: اور عاد کے اندر بھی نشانی ہے، یہ ہود علیہ السلام کی قوم ہوگئی، اِذْ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيْحَ الْعَقِيْمَ: ریح ہوا کو کہتے ہیں، عقیم: جس میں کوئی برکت نہ ہو، جس میں کوئی فائدہ نہ ہو، ہم نے ان کے اُوپر بے برکت ہوا بھیج دی جس میں نفع کا پہلو نہیں تھا، ایسی خشک ہوا، ایسی تیز کہ جس نے ہر چیز کو برباد کر کے رکھ دیا، اس میں کوئی نفع کا پہلو نہیں تھا، ''بھیجی ہم نے ان کے اُوپر بے برکت ہوا، خیر سے خالی ہوا'' مَا تَذَرُ مِنْ شَيْءٍ اَتَتْ عَلَيْهِ: نہیں چھوڑتی تھی وہ ہوا کسی چیز کو جس پر وہ آئی، اِلَّا جَعَلَتْهُ كَالرَّمِيْمِ: مگر اس نے کر دیا اس کو بوسیدہ ہڈیوں کی طرح، چُورا چُورا کر دیا، جس چیز پر بھی وہ ہوا آئی اس نے اس کو چُورا چُورا کر دیا...... وَفِيْ ثَمُوْدَ: اور ثمود میں بھی نشانی ہے اِذْ قِيْلَ لَهُمْ تَمَتَّعُوْا حَتّٰى حِيْنٍ: جب انہیں کہا گیا کہ فائدہ اُٹھاؤ تم بھی ایک وقت تک، یہ حضرت صالح علیہ السلام نے انہیں کہا تھا، فَعَتَوْا عَنْ اَمْرِ رَبِّهِمْ: پھر وہ سرکش ہوگئے اپنے رَبّ کے حکم سے، فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ: پھر ان کو بھی ایک کڑک نے پکڑ لیا، ان پر بھی کوئی طوفان آیا، جس میں بہت زیادہ سخت آواز تھی اور کڑک تھی، وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ: اور وہ دیکھ رہے تھے، جھانک رہے تھے، یعنی ان کے دیکھتے ہی دیکھتے ان کے اُوپر بھی اس طرح سے عذاب آ گیا، جس میں بہت سخت آواز تھی اور کڑک تھی، فَمَا اسْتَطَاعُوْا مِنْ قِيَامٍ: پھر وہ اُٹھنے کی طاقت بھی نہیں رکھتے تھے یعنی جہاں تھے وہیں ڈھیر ہوگئے، وَمَا كَانُوْا مُنْتَصِرِيْنَ: اور نہ وہ کوئی بدلہ لینے والے تھے، یعنی نہ وہ اپنا بچاؤ کر سکے نہ دفاع کر سکے، بلکہ اپنی جگہ سے اُٹھ ہی نہ سکے، جہاں تھے وہیں ڈھیر ہوگئے، ''نہ طاقت رکھی انہوں نے کھڑے ہونے کی، اور نہیں تھے وہ بدلہ لینے والے''...... وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ: اَهْلَكْنَا قَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ اس سے قبل ہم نے قوم نوح کو ہلاک کیا تھا، اِنَّهُمْ كَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِيْنَ: بے شک وہ بھی بہت بدکار لوگ تھے، فسق والے لوگ تھے، نافرمان لوگ تھے، ان کو بھی ہم نے برباد کیا۔

''عقیدۂ آخرت'' کو اہمیت نہ دینا نظامِ عالم کی بربادی کا سبب ہے!

یہ واقعات سارے کے سارے دلیل ہیں کہ جو قومیں انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کے مطابق آخرت کا عقیدہ نہیں رکھتیں، اور اپنے عمل کو اس ترازو کے اندر نہیں تولتیں، اور ان کے اندر یہ جذبہ پیدا نہیں ہوتا کہ ہم نے اللہ کے سامنے حساب دینا ہے جس کی بنا پر ہمیں اپنے اعمال دُرست کر لینے چاہئیں، آخر کار وہ برباد ہو جاتی ہیں۔ تو آخرت کا عقیدہ ایسا ہے جو قوموں کے عمل کو سیدھے رُخ پر رکھتا ہے، جس کے نتیجے میں ان کی دُنیا بھی شاداب ہوتی اور آخرت بھی۔ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ جھوٹ، بددیانتی، خیانت، ظلم، ایک دُوسرے کے حقوق کا چھیننا، یہی چیز ہے جس نے نظامِ عالم کو برباد کر رکھا ہے، اور اگر دِل کے اندر یہ احساس ہو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمارے اُوپر ذمہ داری آتی ہے اور ہم نے اللہ تعالیٰ کے سامنے حساب کتاب دینا ہے تو ادائے حقوق

کا جذبہ ہو تو دُنیا میں آبادی ہوتی ہے، اور جہاں ایک دوسرے کے حقوق تلف کیے جائیں، عیش و عشرت اور اپنی شہوات کے پیچھے لگ کے انسان یہ خیال نہیں کرتا کہ میرے ذِمّے بھی کسی کا حق ہے، تو اس کے نتیجے میں بربادی ہے۔ پریشانی جس طرح سے آئی ہوئی ہے، ایک دِن یہی شدت اختیار کرے گی، اور عالمِ انسانیت جتنا ہے وہ آپس میں ٹکرا کر ختم ہو جائے گا۔ تو آخرت کا عقیدہ انسان کے اعمال میں توازن پیدا کرتا ہے۔

وَالسَّمَآءَ بَنَيْنٰهَا بِاَيْىدٍ وَّاِنَّا لَمُوْسِعُوْنَ (۴۷) وَالْاَرْضَ فَرَشْنٰهَا فَنِعْمَ

اور آسمان، بنایا ہم نے اس کو قوت کے ساتھ، ہم البتہ وسعت رکھنے والے ہیں (۴۷) اور زمین، بچھایا ہم نے اس کو، ہم بہت ہی اچھا

الْمٰهِدُوْنَ (۴۸) وَمِنْ كُلِّ شَيْءٍ خَلَقْنَا زَوْجَيْنِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (۴۹) فَفِرُّوْٓا اِلَى اللّٰهِ ؕ اِنِّيْ

بچھانے والے ہیں (۴۸) ہر چیز سے ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا تاکہ تم نصیحت حاصل کرو (۴۹) پھر بھاگ کے آؤ تم اللہ کی طرف، میں

لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۰) وَلَا تَجْعَلُوْا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ ؕ اِنِّيْ لَكُمْ مِّنْهُ

تمہارے لئے اُس اللہ کی طرف سے صریح ڈرانے والا ہوں (۵۰) اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ قرار نہ دو، بے شک میں تمہارے لئے اس کی طرف سے

نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (۵۱) كَذٰلِكَ مَآ اَتَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا قَالُوْا سَاحِرٌ

صریح ڈرانے والا ہوں (۵۱) ایسے ہی، نہیں آیا ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے گزرے ہیں کوئی رسول مگر کہا انہوں نے کہ یہ جادوگر ہے

اَوْ مَجْنُوْنٌ (۵۲) اَتَوَاصَوْا بِهٖ ۚ بَلْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ (۵۳) فَتَوَلَّ عَنْهُمْ فَمَآ اَنْتَ

یا دیوانہ ہے (۵۲) کیا انہوں نے ایک دوسرے کو وصیت کی ہے؟ بلکہ یہ قوم ہی سرکش ہے (۵۳) آپ ان سے اِعراض کر جائیے، آپ پر کوئی

بِمَلُوْمٍ (۵۴) وَّذَكِّرْ فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ (۵۵) وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ

ملامت نہیں ہے (۵۴) نصیحت کرتے رہیے، بے شک نصیحت نفع دیتی ہے ایمان لانے والوں کو (۵۵) نہیں پیدا کیا میں نے جن اور انسان کو

اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ (۵۶) مَآ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَآ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ (۵۷) اِنَّ اللّٰهَ

مگر اس لیے تاکہ وہ میری عبادت کریں (۵۶) نہیں ارادہ کرتا میں ان سے رزق کا، اور نہیں ارادہ کرتا میں کہ یہ مجھے کھلائیں (۵۷) بے شک اللہ ہی

هُوَ الرَّزَّاقُ ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ (۵۸) فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ

رزق دینے والا ہے، قوت والا ہے، مضبوط ہے (۵۸) بے شک ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا حصہ ہے مثل ان کے ساتھیوں

اَصۡحٰبِهِمۡ فَلَا يَسۡتَعۡجِلُوۡنِ ﴿۵۹﴾ فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا مِنۡ يَّوۡمِهِمُ الَّذِىۡ يُوۡعَدُوۡنَ ﴿۶۰﴾
کے حصے کے، پس یہ مجھ سے جلدی طلب نہ کریں﴿۵۹﴾ پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کُفر کیا، ان کے اس دِن سے جس کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں﴿۶۰﴾

تفسیر

دلائلِ قدرت اور اِثباتِ توحید

وَالسَّمَآءَ بَنَيۡنٰهَا بِاَيۡٮدٍ: آگے پھر یہ دلیل توحید ہے، توحید کا تذکرہ آرہا ہے، ''آسمان، بنایا ہم نے اس کو قوت کے ساتھ'' وَّاِنَّا لَمُوۡسِعُوۡنَ: ہم البتہ وسعت رکھنے والے ہیں، وَالۡاَرۡضَ فَرَشۡنٰهَا: اور زمین، بچھایا ہم نے اس کو فَنِعۡمَ الۡمٰهِدُوۡنَ: ہم بہت ہی اچھا بچھانے والے ہیں، وَمِنۡ كُلِّ شَىۡءٍ خَلَقۡنَا زَوۡجَيۡنِ: ہر چیز سے ہم نے جوڑا جوڑا پیدا کیا لَعَلَّكُمۡ تَذَكَّرُوۡنَ: تاکہ تم نصیحت حاصل کرو، فَفِرُّوۡۤا اِلَى اللّٰهِ: پھر بھاگو تم اللہ کی طرف، یعنی اللہ کی توحید کی طرف دوڑ دوڑ کے آؤ، زمین وآسمان اور اس قسم کی چیزیں، نباتات، ان میں غور کرو، غور کرنے کے بعد اللہ کی توحید کا عقیدہ اختیار کرو، ''بھاگ کے آؤ اللہ کی طرف'' اِنِّىۡ لَـكُمۡ مِّنۡهُ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ: میں تمہارے لئے اُس اللہ کی طرف سے صریح ڈرانے والا ہوں، وَلَا تَجۡعَلُوۡا مَعَ اللّٰهِ اِلٰهًا اٰخَرَ: اللہ کے ساتھ کوئی دوسرا الٰہ نہ قرار دو، اِنِّىۡ لَـكُمۡ مِّنۡهُ نَذِيۡرٌ مُّبِيۡنٌ: بے شک میں تمہارے لیے اس کی طرف سے صریح ڈرانے والا ہوں۔

تسلیٔ رسول

آگے حضور ﷺ کے لئے ایک قسم کی تسلی ہے کہ آپ تو پوری طرح سے ان کو سمجھاتے ہیں ڈراتے ہیں، لیکن یہ نہیں مانتے، تکذیب کرتے ہیں، تو جس طرح سے یہ تکذیب کرتے ہیں ''ایسے ہی نہیں آیا ان لوگوں کے پاس جو ان سے پہلے گزرے ہیں کوئی رسول مگر کہا انہوں نے کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے'' پہلے لوگوں نے بھی ایسے ہی جواب دیا جس طرح سے یہ جواب دے رہے ہیں۔

مخالفینِ انبیاء ''صفتِ طغیان'' میں مشترک ہیں!

اَتَوَاصَوۡا بِهٖ: کیا انہوں نے ایک دوسرے کو وصیت کی ہے؟ بَلۡ هُمۡ قَوۡمٌ طَاغُوۡنَ: بلکہ یہ قوم ہی سرکش ہے۔ مطلب کیا؟ کہ انبیاء ﷺ کے مقابل جو بھی قومیں تھیں ہر ایک نے جواب ایک جیسا دیا، جب بھی کوئی نبی آیا تو لوگوں نے یہی کہا کہ یہ جادوگر ہے یا دیوانہ ہے، اور اتنی یکجہتی ہے اِن مشرکین قوموں میں کہ گویا کہ جاتے وقت ایک دوسرے کو وصیت کر کے جاتے ہیں کہ اگر اللہ کی

طرف سے کوئی ڈرانے والا آئے تو تم نے یہی جواب دینا ہے، اور بَلْ کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہیں، وصیت تو کیا کرنی تھی، کیونکہ بعض قوموں کی بعض قوموں سے ملاقات ہی سرے سے نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ صفت طغیان ان کے اندر مشترک ہے، جس وقت یہ انسان سرکش ہو جاتا ہے، اللہ تعالیٰ کے احکام قبول نہیں کرتا، تو مزاج ایک ہی جیسا ہو جاتا ہے، پھر ایک ہی جیسے کام، اور ایک ہی جیسی باتیں، تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ (سورۂ بقرہ: ۱۱۸) کے تحت جس طرح سے ذکر کیا جاتا ہے۔ نیک جذبہ رکھنے والے لوگ جس دور میں بھی ہوں اور جس جگہ بھی ہوں ان کی نیکی کا ظہور تقریباً ایک ہی انداز سے ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی عبادت ریاضت، غریبوں پر شفقت، یتیموں پہ رحم، اور مخلوقات کی خدمت، یہ جذبات نمایاں ہوتے ہیں اور ایک ہی انداز کے ساتھ وہ لوگ اپنی نیکی کا اظہار کرتے ہیں جن کی طبیعت کے اندر کوئی اچھی بات ہوتی ہے۔ اور جہاں شرارت بازی آجاتی ہے، اور دل کے اندر طغیان اور سرکشی آجاتی ہے تو جس دور میں بھی ہوں، جہاں بھی ہوں، تقریباً حرکات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ تو یہاں یہی بات کہی جارہی ہے کہ اتنی یکجہتی ہے ان میں گویا کہ ایک دوسرے کو وصیت کر کے جاتے ہیں، لیکن وصیت تو کیا کرنی تھی بلکہ یہ قوم ہی سرکش ہے، طغیان کی صفت میں مشترک ہونے کی بنا پر اس قسم کے حالات ظاہر ہوتے ہیں، انبیاء ﷩ کے حالات بھی آپس میں ملتے جلتے ہیں اور ان کے مخالفین کے حالات بھی آپس میں بالکل ملتے جلتے ہیں۔ فَتَوَلَّ عَنْهُمْ: آپ ان سے اعراض کر جائیے، اِن سے پیٹھ پھیر جائیے، فَمَآ اَنْتَ بِمَلُوْمٍ: آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے، کہ یہ نہیں مانتے تو ان کے نہ ماننے کی بنا پر آپ پر کوئی اِلزام نہیں ہے، لَامَ يَلُوْمُ سے مفعول کا صیغہ ہے ملوم، ملامت کیا ہوا، آپ پر کوئی ملامت نہیں ہے، وَّذَكِّرْ: نصیحت کرتے رہیے، فَاِنَّ الذِّكْرٰى تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِيْنَ: جن کی قسمت میں ایمان لانا ہے وہ نصیحت انہیں نفع دے گی، ''بے شک نصیحت نفع دیتی ہے ایمان لانے والوں کو۔''

جنّ واِنس کی تخلیق کا مقصد

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ: نہیں پیدا کیا میں نے جنّ اور اِنسان کو مگر اِس لیے تا کہ وہ میری عبادت کریں، یہ لام غرض وغایت کے طور پر جو آئی ہے تو یہ اللہ تعالیٰ کا ارادہ تشریعی ہے، شرعاً مطلوب اِن سے عبادت ہے، باقی جتنی مخلوق اللہ نے پیدا کی مثلاً فرشتے ہیں وہ بھی عبادت کرتے ہیں لیکن وہ عبادت پر مجبور ہیں، ان کو دوسرا طریق اختیار کرنے کا کوئی کسی قسم کا اختیار نہیں ہے، ان کی خلقت ہی اللہ نے ایسی رکھی ہے، اور ان کے علاوہ حیوانات ہیں، نباتات ہیں، ان میں سرے سے کوئی اختیار ہی نہیں، جس ڈگر پہ اللہ نے انہیں چلا دیا، وہ اَحکام کے مکلف نہیں ہیں، انسان اور جنّ اللہ نے ایسے بنائے کہ جن میں صلاحیت مکمل رکھی ہے اچھائی اور بُرائی کی، اور ان کو پیدا کرنے کے بعد ان کو مکلف کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں، یعنی میرے اَحکام کے مطابق چلیں، اپنے ارادے اور اختیار کے ساتھ عبادت کرنا یہ انسان اور جنّ کی خصوصیت ہے، کہ اگر چاہیں تو یہ غلط طریقہ بھی اختیار کر سکتے ہیں، چاہیں تو اچھا طریقہ بھی اختیار کر سکتے ہیں، تو ان کو چاہیے کہ اپنی اِس غرض وغایت کی رعایت رکھیں، اپنے اختیار کے ساتھ میرے اَحکام کی پابندی کریں۔

''عبادت'' کا مفہوم

عبادت: عبد شدن، غلام بننا، اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ دُوسرے کے اَحکام کے سامنے اس طرح سے رہو جس طرح سے آقا کے سامنے کوئی غلام ہوتا ہے کہ اپنی مرضی کو کوئی دخل نہیں دیتا، جس قسم کے اَحکام آتے جائیں، اسی قسم کے اَحکام مان لیے جائیں، اور اس کی کوئی ایک صورت متعین نہیں کہ عبادت کیا ہے، عبادت حکم ماننے کو کہتے ہیں، اور تفصیل آپ کے سامنے ہے کہ تختِ سلطنت پر بیٹھ کر بھی ایک شخص اللہ تعالیٰ کی عبادت کرتا ہے جبکہ وہ اللہ کے اَحکام کے مطابق حکومت کرتا ہے، اور اپنی زندگی کے اندر جتنے بھی شعبے ہیں ان سب کو اگر اللہ کے حکم کے مطابق انسان ادا کرے حتیٰ کہ پیشاب پاخانے کی طرف جاتا ہوا بھی اللہ کے اَحکام کا تصور رکھتا ہے تو یہ بھی ایسے ہی عبادت ہے جس طرح سے کہ مسجد کی طرف جانا عبادت ہے، حلال کمانا کھانا اور مال کو اللہ کے حکم کے تحت خرچ کرنا اور اپنے بچوں کی اور بنی آدم کی خدمت کرنا، نیکی پھیلانا، جتنی چیزیں بھی ہیں، چاہے وہ خدمتِ خلق سے تعلق رکھتی ہیں، چاہے وہ اپنے آرام کے ساتھ اور اپنے وقت گزارنے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں، جب ان میں اللہ کے اَحکام کی رعایت رکھی جائے تو یہ سب عبادت ہے۔

''اِلٰہِ حقیقی'' اور ''آلہہٴ باطلہ'' میں فرق!

مَاۤ اُرِيْدُ مِنْهُمْ مِّنْ رِّزْقٍ وَّمَاۤ اُرِيْدُ اَنْ يُّطْعِمُوْنِ: نہیں ارادہ کرتا میں ان سے رزق کا، اور نہیں ارادہ کرتا میں کہ یہ مجھے کھلائیں، مجھے ان کی طرف سے کوئی اپنا نفع مطلوب نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ رزق کما کے لے آئیں اور میری مخلوق کو رزق پہنچائیں، میری مخلوق کو رزق دینا کوئی ان کے ذِمّے نہیں، میں ان سے رزق کموانا نہیں چاہتا، نہ میں یہ کہتا ہوں کہ مجھے کھلائیں، میں کھانے سے بے نیاز ہوں، اور مخلوق کا رزق میرے ذِمّے ہے، میں اپنے فائدے کے لئے ان کو کسی کام میں نہیں لگا رہا، عبادت کے لئے اگر کہہ رہا ہوں تو اس میں بھی خود ان کا ہی فائدہ ہے۔ یا اس کا مفہوم ''بیان القرآن'' میں یوں ذِکر کیا گیا کہ میں ان سے ایسے طور پر رزق کموانے کا مطالبہ نہیں کرتا جو عبادت کے منافی ہو، اور یہ تو خیر محال ہے کہ اللہ تعالیٰ خود کہیں کہ مجھے کھلاؤ، باقی آلہہٴ باطلہ جتنے بھی ہیں یا جو لوگ بھی اللہ کے حکم کے خلاف انسانوں کو دعوت دینے والے ہیں سب کے اپنے اپنے اَغراض ہوتے ہیں، اپنے مُریدوں اور ماتحتوں کی کمائیوں سے فائدہ اُٹھاتے ہیں، اپنا پیٹ پالتے ہیں، وہ اُن کی طرف محتاج ہوتے ہیں، مجھے کوئی کسی قسم کا احتیاج نہیں، ''نہیں ارادہ کرتا میں ان سے رزق کا اور نہیں ارادہ کرتا میں کہ مجھے کھلائیں'' اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الرَّزَّاقُ: بے شک اللہ وہی رزّاق ہے، ذُو الْقُوَّةِ الْمَتِيْنُ ہے، ذُو الْقُوَّةِ: قوت والا، الْمَتِيْنُ: یہ بھی براہِ راست اللہ کی صفت ہے، ''بے شک وہی اللہ رزّاق ہے، رزق دینے والا ہے، قوت والا ہے، مضبوط ہے'' الْمَتِيْنُ کا معنی مضبوط۔

لفظ ''ذَنوب'' کی وضاحت

فَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذَنُوْبًا مِّثْلَ ذَنُوْبِ اَصْحٰبِهِمْ فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ: ذَنوب اصل کے اعتبار سے کہتے ہیں بھرے ہوئے ڈول کو،

اور کنویں پر لوگ جاتے ہیں تو اپنے اپنے حصے کا ڈول نکال لیتے ہیں، تو یہاں ذنوب سے نصیب مراد ہے حصّہ، جس طرح سے لوگ پانی تقسیم کرتے ہیں اور اپنے اپنے حصے میں لے لیتے ہیں اپنے ڈولوں کے ساتھ، تو عربی کے اندر ذنوب کا لفظ حصے کے لئے بھی بولا جاتا ہے، ''بے شک ان لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا حصّہ ہے مثل اُن لوگوں کے حصے کے جو ان سے پہلے گزرے ہیں'' ان کے اصحاب کے حصے کی طرح اِن کا بھی حصّہ ہے، اپنا اپنا حصّہ عذاب میں سے لیں گے۔ یا دُنیا کے اندر جتنا جتنا حصّہ ہے، جتنا کسی نے عمر میں اور رِزق میں حصّہ لینا ہے وہ حصّہ لیں گے، اور اس کے بعد عذاب میں مبتلا ہو جائیں گے۔ دونوں طرح سے مفہوم ذِکر کیا جاسکتا ہے، ''بے شک اُن لوگوں کے لئے جنہوں نے ظلم کیا حصّہ ہے مثل ان کے ساتھیوں کے حصے کے'' فَلَا يَسْتَعْجِلُوْنِ: پس یہ جلدی نہ مچائیں، يَسْتَعْجِلُوْنِ مجھ سے یہ جلدی طلب نہ کریں، ان کا حصّہ ان کو مل جائے گا، فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ يَّوْمِهِمُ الَّذِيْ يُوْعَدُوْنَ: پس خرابی ہے ان لوگوں کے لئے جنہوں نے کُفر کیا ان کے اس دِن سے جس کا وہ وعدہ دیے جاتے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّا إِلٰهَ إِلَّا أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

***

سُورَةُ الطُّورِ

آیاتھا ٤٩ ٥٢ سُوْرَةُ الطُّوْرِ مَكِّيَّةٌ ٧٦ رکوعاتھا ٢

سورۂ طور مکہ میں نازل ہوئی،اس کی اُنچاس آیتیں ہیں،دو رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان،نہایت رحم والا ہے

وَالطُّوْرِ ① وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ② فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ ③ وَّالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ ④ وَ

قسم ہے طور کی ① اور قسم ہے کتاب کی جو کہ لکھی ہوئی ہے ② باریک پھیلائے ہوئے چمڑے میں ③ اور قسم ہے بیت معمور کی ④ اور

السَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ ⑤ وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ ⑥ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ⑦ مَّا لَهٗ

اُونچی کی ہوئی چھت کی ⑤ اور بھرے ہوئے سمندر کی ⑥ بے شک تیرے رَبّ کا عذاب البتہ واقع ہونے والا ہے ⑦ اس کو

مِنْ دَافِعٍ ⑧ يَّوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا ⑨ وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا ⑩ فَوَيْلٌ

کوئی دُور ہٹانے والا نہیں ⑧ جس دِن کہ تھرتھرائے گا آسمان تھرتھرانا، اور چلیں گے پہاڑ چلنا ⑨ پھر خرابی ہوگی

يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ ⑪ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ ⑫ يَوْمَ يُدَعُّوْنَ اِلٰى

اس دن جھٹلانے والوں کے لیے ⑪ جو مشغلہ کرتے ہوئے باتوں میں لگے ہوئے ہیں ⑫ جس دن کہ یہ دھکیلے جائیں گے

نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا ⑬ هٰذِهِ النَّارُ الَّتِيْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ ⑭ اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ

جہنم کی آگ کی طرف سختی کے ساتھ دھکیلنا ⑬ (کہا جائے گا) یہی آگ ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے ⑭ کیا یہ جادو ہے؟ یا

اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ ⑮ اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ ۭ اِنَّمَا تُجْزَوْنَ

تم دیکھتے نہیں ہو؟ ⑮ داخل ہو جاؤ اس آگ میں، پھر تم صبر کرو یا نہ کرو، برابر ہے تم پر، اس کے سوا کچھ نہیں کہ بدلہ دیے جاتے ہو تم

مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ⑯ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ⑰ فٰكِهِيْنَ

انہی کاموں کا جو تم کیا کرتے تھے ⑯ اللہ سے ڈرنے والے باغات میں ہوں گے اور اچھی حالت میں ہوں گے ⑰ خوش ہونے والے ہوں گے

بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ ۚ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ ⑱ كُلُوْا

اس چیز کے ساتھ جو ان کے رَبّ نے ان کو دی، اور بچا لیا ان کو ان کے رَبّ نے آگ کے عذاب سے ⑱ (انہیں کہا جائے گا) کھاؤ

وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓــًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ۝١٩ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ

اور پیو مزے لے لے کر ان اعمال کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے ⑲ تکیے لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے ایسے تختوں پر

مَّصْفُوْفَةٍ ۚ وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ ۝٢٠ وَالَّذِيْنَ

جو قطاروں میں رکھے ہوئے ہوں گے، اور ہم نے ان کو جوڑ دیا گوری گوری اور موٹی موٹی آنکھوں والی عورتوں کے ساتھ ⑳ وہ لوگ

اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ

جو ایمان لائے اور ان کی پیروی کی ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ، ملادیں گے ہم ان کے ساتھ ان کی اولاد کو، اور نہیں کم کریں گے ان کو

مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ ۭ كُلُّ امْرِئٍۢ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ ۝٢١ وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ

ان کے عملوں میں سے کچھ بھی، ہر شخص اپنے کیے کے بدلے رہن رکھا ہوا ہوگا ㉑ جو میوے اور جس قسم کا گوشت وہ چاہیں گے ہم ان کو

مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ ۝٢٢ يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا لَّا لَغْوٌ فِيْهَا

روز افزوں دیں گے ㉒ چھینا جھپٹی کریں گے وہ اس جنت کے اندر جام شراب میں، اس شراب کے سبب سے نہ کوئی بیہودگی ہوگی،

وَلَا تَاْثِيْمٌ ۝٢٣ وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ ۝٢٤ وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ

اور نہ گناہ گار قرار دینا ہوگا ㉓ گھومیں گے ان پر ان کے خدام، گویا کہ وہ چھپا کے رکھے ہوئے موتی ہیں ㉔ ان جنتیوں کا بعض

عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ ۝٢٥ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ ۝٢٦

بعض پر متوجہ ہوگا آپس میں سوال کرتے ہوئے ㉕ کہیں گے کہ بے شک ہم اِس سے پہلے اپنے گھر میں ڈرنے والے ہوتے تھے ㉖

فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ ۝٢٧ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ ۭ اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ ۝٢٨

پھر اللہ نے ہم پہ احسان کیا اور ہمیں گرم ہوا کی تکلیف سے بچالیا ㉗ بے شک ہم اس سے قبل اسی کو پکارا کرتے تھے، بے شک وہ

اچھا برتاؤ کرنے والا ہے اور رحم کرنے والا ہے ㉘

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ - سورۂ طور مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۴۹ آیتیں ہیں اور ۲ رُکوع ہیں، ''مکی'' سورتوں

کی طرح اس میں بھی اُصولِ دین کا تذکرہ ہے اور زیادہ تر تذکیرِ آخرت ہے، اِثباتِ معاد، جیسا کہ پچھلی سورت میں بھی مضمون اسی انداز کا گزرا ہے۔

وَالطُّوْرِ: واؤ قسمیہ ہے، قسم ہے طور کی اطور عام پہاڑ کو بھی کہتے ہیں، لیکن یہاں سے خاص پہاڑ مراد ہے جس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ کا مکالمہ ہوا تھا، اور موسیٰ علیہ السلام کو نبی بنایا گیا تھا، اور طور پر ہی حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب سپرد کی گئی تھی جس کو ''توراۃ'' کہتے ہیں، لکھی لکھائی سپرد کی گئی، وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ: اور کتاب لکھی ہوئی، ''کتابِ مسطور'' سے یا ''نامۂ اَعمال'' مراد ہے اور یا اس سے ''توراۃ'' مراد ہے، یا قرآنِ کریم، تفسیروں میں سارے اقوال موجود ہیں، ''لکھی ہوئی کتاب'' فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ: رَق کہتے ہیں پتلے چمڑے کو، پُرانے زمانے میں کھال پتلی کر کے اس کے اُوپر لکھا کرتے تھے، باریک چمڑا، منشور کے معنی پھیلائی ہوئی، تو فِيْ رَقٍّ مَّنْشُوْرٍ یہ مَسْطُوْرٍ کے متعلق ہے،'' اور قسم کتاب کی جو کہ لکھی ہوئی ہے کھلے باریک چمڑے میں'' رَق: باریک چمڑا جو اُس وقت لکھنے کے لئے تیار کیا جاتا تھا، اور منشور کے معنی پھیلایا ہوا، وَالْبَيْتِ الْمَعْمُوْرِ: اور قسم ہے بیت معمور کی! ''بیتِ معمور'' جیسے روایات سے معلوم ہوتا ہے یہ آسمانوں میں فرشتوں کا قبلہ ہے، جو بالکل اس بیت اللہ کے محاذی ہے، کہ بالفرض اُوپر سے وہ گرے تو اسی کی چھت کے اُوپر آئے، وَالسَّقْفِ الْمَرْفُوْعِ: بلند کی ہوئی چھت، اس سے مراد آسمان، وَالْبَحْرِ الْمَسْجُوْرِ: اور بھرا ہوا سمندر، سجر بھرنے کے معنی میں ہے، بحر مسجور: بھرا ہوا سمندر، اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوَاقِعٌ ۙ مَّا لَهٗ مِنْ دَافِعٍ: یہ جوابِ قسم ہے، یہ سب قسمیں اُٹھا کے کہا جارہا ہے کہ تیرے رَبّ کا عذاب البتہ واقع ہونے والا ہے اور اس کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں، اس کا کوئی دفاع کرنے والا نہیں۔ قسمیں جو اُٹھائی جاتی ہیں کلام کی تاکید کے لئے ہوتی ہیں، اور یہ آپ کی خدمت میں کئی دفعہ عرض کیا جاچکا کہ اِن میں ایک قسم کا آنے والے مضمون کے لئے ایک شہادت کا پہلو بھی ہوتا ہے، آخرت میں عذاب جو آئے گا اس عذاب کا تعلق ہے انسان کے اعمال کے ساتھ، مجازاۃِ اعمال، اعمال کے اُوپر جزاء کا ملنا، تو پہلے جو قسمیں کھائی گئی ہیں ان کو مناسبت اس طرح سے ہے کہ لفظ طور سے اس پوری تاریخ کی طرف اشارہ ہے جس کے ساتھ بنی اسرائیل کو اَحکام کا مکلّف بھی کیا گیا تھا، اور پھر ان اَحکام کی پابندی نہ کرنے کی بنا پر ان کو مختلف سزاؤں میں بھی مبتلا کیا گیا۔

''کتابِ مسطور'' کا مصداق کیا ہے؟

اور کتابِ مسطور: لکھی ہوئی کتاب، رَق: باریک چمڑا جو اس وقت لکھنے کے کام آیا کرتا تھا، اس سے مراد یا تو ''توراۃ'' ہے، پھر تو طور کے ساتھ اس کی مناسبت نمایاں ہے، یا قرآنِ کریم ہے، یا ہر انسان کا نامۂ اَعمال، جس کے متعلق قرآنِ کریم میں لفظ آیا تھا: يَلْقٰىهُ مَنْشُوْرًا (سورۂ اسراء: ۱۳) کہ انسان اس کو کھلا ہوا پائے گا، اس کے سامنے پھیلا ہوا ہوگا، اور پھر یہ رَق آخرت کے اعتبار سے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے جو چیز بھی لکھنے کے کام آئی ہے، دنیا کے اندر چونکہ باریک چمڑا اُس وقت لکھنے کے کام آتا تھا تو اس لیے اس کے ساتھ تعبیر کردیا گیا، ورنہ نامۂ اَعمال جس چیز پر بھی لکھا گیا ہوگا وہ اُس وقت سامنے آجائے گا، اور اگر قرآنِ کریم ہو توراۃ ہو تو پھر یہ تو اُس وقت ایسے ہی لکھی جاتی تھیں مختلف چیزوں پر جن میں چمڑا بھی استعمال ہوتا تھا۔

''بیتِ معمور'' کا تعارف

اور ''بیتِ معمور'' فرشتوں کا قبلہ ہے، یہ فرشتوں کی عبادت کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح سے انسان اللہ کی عبادت کرتے ہیں، فرشتے بھی اللہ کی عبادت کرتے ہیں، اور حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ ''بیتِ معمور'' بالکل ''بیت اللہ'' کے محاذی ہے کہ اگر وہاں سے گرے تو بیت اللہ کی چھت کے اُوپر آئے،''[1] فرشتے اس کا طواف کرتے ہیں، اس میں عبادت کرتے ہیں، اور فرشتوں کی تعداد اتنی کثیر ہے کہ ہر روز اس میں ستر ہزار فرشتے داخل ہوتے ہیں عبادت کرنے کے لئے، اور جو ایک دفعہ چلے جاتے ہیں پھر قیامت تک ان کی دوبارہ باری نہیں آئے گی،[2] جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ فرشتوں کی تعداد کتنی زیادہ ہے۔

قسموں میں آسمان اور سمندر کے ذِکر کا مقصد

سقفِ مرفوع سے آسمان مراد ہے، تو آسمان اور بحرِ مسجور جس کا تعلق زمین کے ساتھ ہے ان دونوں باتوں کو ذکر کردیا، گویا کہ ہماری دُنیا کے لئے دونوں باتیں محیط ہیں، اُوپر آسمان ہے، نیچے بحر، سمندر ہے جو کہ محیط ہے، اس میں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے، اِنعام بھی نمایاں ہے، اور جزا سزا کے مضمون کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ پانی بھی انسان کے لئے سزا کا باعث بن جاتا ہے، آپ کو معلوم ہوگا کہ طوفانِ نوح پانی کی شکل میں ہی آیا تھا، اور فرعون کو جو سزا دِی گئی تو وہ پانی کی شکل میں دی گئی تھی، تو طور کا ذِکر کرکے اور توراۃ کا ذِکر کرکے، اس کے بعد سمندر کا ذِکر یہ ان سزاؤں کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ ساتھ اُن واقعات کی طرف بھی اشارہ ہوسکتا ہے۔

قیامت کا منظر

بہرحال یہ ساری کی ساری کلام جو یہاں نقل کی گئی اس سے اس بات کو مؤکد کرنا مقصود ہے کہ ''تیرے ربّ کا عذاب البتہ واقع ہونے والا ہے، اور اس کو کوئی دُور ہٹانے والا نہیں'' یعنی جس وقت وہ آئے گا پھر کسی کے ہٹانے کا نہیں ہے، يَوْمَ تَمُوْرُ السَّمَآءُ مَوْرًا: مارَ مَوْرًا: مضطرب ہونا، کانپنا، اضطرابی حرکت کو مَور کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، ''یہ عذاب اس دِن واقع ہوگا جس دِن کہ آسمان کانپے گا کانپنا'' آسمان مضطرب ہوگا، اس کے اوپر اضطرابی حرکت طاری ہوگی، ڈانواں ڈول ہوگا، اور اُس ڈانواں ڈول ہونے کے نتیجے میں جس طرح سے ایک چیز پہلے کانپتی ہے، کانپنے کے بعد وہ ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے، تو نفخۂ اُولیٰ کے وقت یہ آثار طاری ہوں گے، ''جس دِن کہ تھرتھرائے گا آسمان تھرتھرانا، ڈانواں ڈول ہوگا'' وَّتَسِيْرُ الْجِبَالُ سَيْرًا: اور

(۱) معجم کبیر طبرانی ۱۱/۴۱۷، رقم ۱۲۱۸۵۔ اَلْبَيْتُ الْمَعْمُوْرُ فِي السَّمَاءِ يُقَالُ لَهُ الضراح وَهُوَ عَلٰى مِثْلِ بَيْتِ الْحَرَامِ بِحِيَالِهِ لَوْ سَقَطَ لَسَقَطَ عَلَيْهِ. نیز عام تفاسیر۔

(۲) بخاری ۱/۴۵۶ باب ذکر الملائکہ۔ مشکوٰۃ ۲/۵۲۸ باب المعراج کی دوسری حدیث۔

چلیں گے پہاڑ چلنا، یعنی وہ اپنی جگہ سے ہلیں گے، ہلنے کے بعد ہوا کے اندر اُڑے پھریں گے، تَسِیْرُ سَیْرًا: چلنے کے معنی میں، پہاڑ بھی اپنی جگہ سے چل پڑیں گے۔

تکذیب کرنے والوں کا انجام

فَوَیْلٌ یَّوْمَىِٕذٍ لِّلْمُكَذِّبِیْنَ: پھر خرابی ہوگی اُس دن جھٹلانے والوں کے لئے، جو اللہ تعالیٰ کی باتوں کو جھٹلاتے ہیں، تکذیب کرتے ہیں ان کے لئے اس دن خرابی ہوگی۔ وَیل: ہلاکت، بربادی۔ الَّذِیْنَ هُمْ فِیْ خَوْضٍ یَّلْعَبُوْنَ: یہ مکذبین کیسے لوگ ہیں، خَاضَ یَخُوْضُ: گھسنا، خَاضَ الْمَآءَ: پانی میں گھس گیا، اور خوض فی القول: باتوں میں لگنا، باتیں بنانا، سخن سازیاں، یہ لوگ چونکہ حق کو تسلیم نہیں کرتے تھے، سرورِ کائنات ﷺ کی تکذیب کرتے تھے، تو مجلسوں میں بیٹھ کے قسم قسم کی باتیں بناتے تھے، بات سے بات نکلتی چلی جاتی، کوئی کچھ بولتا کوئی کچھ بولتا، اِسی کو ''خوض'' کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔ اور یَلْعَبُوْنَ یہ لعب سے لیا گیا ہے، لعب کھیلنے کو کہتے ہیں، باتیں بناتے ہیں کھیلتے ہوئے، مشغلے کرتے ہوئے، مکذبین یہ وہ لوگ ہیں جو کہ کھیلتے ہوئے باتوں میں لگے ہوئے ہیں، مشغلہ کرتے ہوئے باتوں میں لگے ہوئے ہیں باتوں میں گھسے ہوئے ہیں، بات سے بات نکالتے رہتے ہیں، سخن سازیاں کرتے ہیں، باتیں بناتے ہیں۔ یَوْمَ یُدَعُّوْنَ اِلٰی نَارِ جَهَنَّمَ دَعًّا: دَعَّ یَدُعُّ: دھکے دینا، سختی کے ساتھ کسی کو ہانکنا، تیسویں پارے میں بھی یہ لفظ آئے گا اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یُكَذِّبُ بِالدِّیْنِ ۞ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ یتیم کو دھکے دیتا ہے، ''جس دن کہ یہ دھکیلے جائیں گے جہنم کی آگ کی طرف سختی کے ساتھ دھکیلنا'' دَعًّا مفعول مطلق بطور تاکید کے ہے ''جس دن کہ یہ دھکیلے جائیں گے جہنم کی آگ کی طرف، سختی کے ساتھ دھکیلنا'' کہا جائے گا، یقال لھم هٰذِهِ النَّارُ الَّتِیْ كُنْتُمْ بِهَا تُكَذِّبُوْنَ: یہی آگ ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے، جس کی تم تکذیب کیا کرتے تھے، اَفَسِحْرٌ هٰذَآ اَمْ اَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ: یہ ایک قسم کی سرزنش ہے کہ جس وقت قرآنِ کریم کی آیات تمہارے سامنے پڑھی جاتی تھیں، جن کے اندر عذاب کا ذکر بھی آتا تھا، تم کہتے تھے کہ یہ تو جادو ہے، جادو کی باتیں ہیں، یعنی اس کے اثر کو باطل کرنے کے لئے وہ لوگ کہا کرتے تھے کہ یہ جادو ہے، اس لئے بے اصل ہونے کے باوجود اس کا اثر طبیعت پہ پڑتا ہے، مشرکین کتاب اللہ کو جادو کہا کرتے تھے، تو جس وقت اب اُن آیات کا مصداق سامنے آجائے گا پھر پوچھا جائے گا اَفَسِحْرٌ هٰذَآ: اب بتاؤ کہ کیا یہ جادو ہے؟ یعنی جن آیات کو تم جادو کہا کرتے تھے، جادو تو ایک بے اصل سی چیز ہوتی ہے، تم سمجھتے تھے کہ بے اصل چیزیں ہیں، لیکن ان کو ایسے طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ اس کا طبیعت پہ اثر پڑتا ہے، تو کیا یہ جادو ہے؟ یا اب بھی تمہیں نظر نہیں آتا؟ اب بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں؟ یہ ڈانٹ ڈپٹ جو ہوا کرتی ہے، کہ بدنی طور پر سزا بھی دی جائے، جس طرح سے دُنیا میں بھی معمول ہے کہ انسان مجرم کو پیٹتا بھی ہے، ساتھ ساتھ زبان سے ایسی باتیں بھی کہتا ہے جس کے ساتھ اس مجرم کو ذہنی کوفت ہوتی ہے، یہ ذہنی سزا ہوا کرتی ہے، تو اسی طرح سے یہاں ان کو عذاب کے اندر مبتلا کیا جائے گا تو ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو تنبیہات ہوں گے، فرشتے اللہ تعالیٰ کی جانب سے کریں گے، یہ ان کے لئے ذہنی کوفت کا باعث بنیں گی، یہ رُوحانی اور ذہنی تکلیف ہے، تو عذاب

میں مبتلا ہوں گے اور ساتھ یہ بھی کہا جائے گا أَفَسِحْرٌ هٰذَآ: کیا یہ جادو ہے، أَمْ أَنْتُمْ لَا تُبْصِرُوْنَ: یا تم دیکھتے نہیں ہو، اب بھی تمہاری آنکھیں نہیں کھلیں؟

آخرت کے عذاب سے کفار کا چھٹکارا ناممکن!

اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا ۚ سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ: داخل ہو جاؤ اس آگ میں، پھر تم صبر کرو یا نہ کرو، برابر ہے تم پر، یعنی نہ صبر سے فائدہ، نہ چیخنے چلانے سے۔ دُنیا کے اندر سزا سے چھوٹنے کے لئے دونوں باتیں ہی ہوتی ہیں، ایک آدمی خاموشی کے ساتھ صبر کے ساتھ سزا کو برداشت کر جاتا ہے تو بھی دوسرے آدمی کو بسا اوقات خیال آ جاتا ہے تو اس کو چھوڑ دیتا ہے، صبر کے نتیجے میں تکلیف ہلکی ہو جاتی ہے، بسا اوقات آدمی مار کھاتا ہوا چیختا چلاّتا ہے تو سننے والے کو رحم آ جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں اس کو چھوڑ دیا جاتا ہے، دونوں ہی باتیں باعث بن جایا کرتی ہیں سزا کے ہلکا ہونے کے لئے یا معافی مل جانے کے لئے، لیکن اب جہنم میں جانے کے بعد تمہارا صبر کرنا، نہ کرنا برابر ہے، اِنَّمَا تُجْزَوْنَ مَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: اس کے سوا کچھ نہیں کہ بدلہ دیا جاتے ہو تم انہی کاموں کا جو تم کیا کرتے تھے، یہ تمہاری اپنی کمائی تمہارے سامنے آ رہی ہے، اب چیخو چلاّؤ، چپ کر کے برداشت کرو، جو چاہو کرو، تمہیں کسی طرح سے بھی اس سے چھٹکارا نہیں ہوگا۔

"متقین" پر آخرت میں اللہ کے اِنعامات

فریقِ ثانی کا ذِکر......! بار بار ان چیزوں کے سامنے آ جانے کے بعد اَب یہ مجھنی آسان ہو گئیں، فریقِ ثانی کو ذِکر کیا جا رہا ہے مقابلۃً، کہ جب کسی چیز کی ضد کو واضح کر دیا جاتا ہے تو حقیقت اچھی طرح سے نمایاں ہو جایا کرتی ہے تُعْرَفُ الأشياءُ بِأَضْدَادِهَا۔ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ: یہ مکذبین کے مقابلے میں آ گئے متقین، تکذیب کرنے والے تو اللہ تعالیٰ سے نڈر تھے، بےخوف تھے، ڈرتے نہیں تھے، اس دِن کو یاد نہیں رکھتے تھے، اللہ کی مخالفت سے بچتے نہیں تھے، ان کے مقابلے میں متقین ہیں، اللہ سے ڈرنے والے، اس کی مخالفت سے بچنے والے، فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ: نعیم خوش حالی کو کہتے ہیں، باغات میں ہوں گے اور اچھی حالت میں ہوں گے، فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ: خوش ہونے والے ہوں گے اس چیز کے ساتھ جو ان کے رَبّ نے ان کو دی۔

"وَوَقٰىهُمْ" کے دو ترکیبی اِحتمالات

وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ: وَوَقٰىهُمْ کا تعلق دو طرح سے ظاہر کیا گیا ہے، وَقٰى يَقِيْ: بچانا، اور "عذابِ جحیم" آگ کا عذاب، جحیم بھڑکنے والی آگ کو کہتے ہیں، اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ عَذَابَ الْجَحِيْمِ: اس کا مطلب یہ ہوگا کہ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ یہ متعلق ہے اِسْتَقَرَّ کے، اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ اِسْتَقَرُّوْا فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ وَوَقٰىهُمْ رَبُّهُمْ: بےشک متقین قرار پکڑیں گے باغات میں اور خوش حالی میں، اور بچا لیا ان کو ان کے رَبّ نے بھڑکنے والی آگ سے، آگے تو وہی ان کا جنت کا حال ہے فٰكِهِيْنَ بِمَآ اٰتٰىهُمْ رَبُّهُمْ: جو کچھ اُن کو اُن کے رَبّ نے دیا اس کے ساتھ وہ خوش ہونے والے ہوں گے۔ اور "مدارک" نے "مَا" کو مصدریہ قرار دے کے

وَقٰهُمْ کا عطف اٰتٰهُمْ کے اُوپر بھی کیا ہے، ''اللہ کے دینے پہ خوش ہوں گے اور اللہ کے بچانے پہ خوش ہوں گے'' یہ دو باتیں ان کے لیے خوشی کا باعث ہوں گی، ایک تو اللہ نے ان کو بہت کچھ دیا اس بات پہ خوش ہیں، دُوسرے جہنم سے بچالیا اس پہ خوش ہیں، دونوں پہلو ان کے سامنے ہوں گے، اللہ نے ان کو بچالیا اس بچانے کی بنا پر خوش ہوں گے، اور جو کچھ اللہ نے ان کو دیا اس دینے کی بنا پر بھی خوش ہوں گے، تو ''مَا'' مصدر یہ ہو جائے گا اور بِاِيْتَاءِهِمْ وَوِقَايَتِهِمْ یوں تاویل ہو جائے گی اس کی، یعنی دو باتیں ان کے لیے خوشی کا باعث ہوں گی، عذاب سے بچ جانا اور نعمتوں کا حاصل ہو جانا۔

اہلِ جنّت کا کھانا

انہیں کہا جائے گا كُلُوْا وَاشْرَبُوْا هَنِيْٓـًٔا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ جیسے کُفّار کے لئے تنبیہات تھیں اِصْلَوْهَا فَاصْبِرُوْٓا اَوْ لَا تَصْبِرُوْا تو جس وقت یہ (مؤمن) جنّت میں جائیں گے تو یہ بات کہی جائے گی ''کھاؤ اور پیو مزے لے لے کر'' هَنِيْٓـًٔا یہ مصدر کی صفت ہے كُلُوْا وَاشْرَبُوْا اَكْلًا وَشُرْبًا هَنِيْٓـًٔا (نسفی) هَنِيْء کہتے ہیں جو کھانے میں لذیذ معلوم ہو، پینے میں لذیذ معلوم ہو، مزے لے لے کر جس کو انسان کھائے، یہ اکلِ هنیء ہو گیا۔ هَنِيْٓـًٔا مَّرِيْٓـًٔا یہ دو لفظ آپ کے سامنے سورۂ نساء میں بھی آئے تھے، تو هَنِيْء مَرِيْء یہ دو لفظ آتے ہیں کھانے کے ساتھ، کھانا لذیذ ہو کھاتے وقت لطف آئے (یہ هنیء ہے)، اور کھائے جانے کے بعد پھر خوش گوار ہو کہ ہضم اچھی طرح سے ہو جائے، جزوِ بدن بنے، قوت اور طاقت کا باعث ہو، کسی تکلیف کا باعث نہ ہو، اس کو ''مریء'' کہتے ہیں، تو ''مزے لے لے کر کھاؤ پیو'' بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ: ان چیزوں کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے، ان اعمال کی وجہ سے جو تم کیا کرتے تھے، مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى سُرُرٍ مَّصْفُوْفَةٍ: تکیے لگا کے بیٹھنے والے ہوں گے تختوں پر، ایسے تخت جو قطاروں میں رکھے ہوئے ہوں گے، قطار در قطار تخت پڑے ہوں گے ان کے اُوپر وہ تکیے لگا کے بیٹھیں گے۔

اہلِ جنّت کی بیویاں

وَزَوَّجْنٰهُمْ بِحُوْرٍ عِيْنٍ: اور جوڑ دیں گے ہم انہیں حور عین کے ساتھ، یہ ان کے اہل وعیال کا ذکر آ گیا، کیونکہ عیش کو تکمیل اسی سے ہوتی ہے، رہنے کے لئے اچھا مکان ہو، کھانے کے لئے اچھی اچھی چیزیں ہوں، لیکن عیش کی تکمیل نہیں ہوتی جس وقت تک کہ گھر آباد نہ ہو، تو یہاں اُسی گھر کی آبادی کا ذکر ہے۔ حُوْر یہ جمع ہے حوراء کی، عِين جمع ہے عَيْنَاء کی، جس طرح سے جنّت کی ہر چیز اعلیٰ ہو گی، تو جنتیوں کو جو ازواج ملیں گی وہ بھی بہت اعلیٰ ہوں گی، حوراء کا معنی ہوتا ہے گورے رنگ کی عورت، اور، عیناء کا معنی ہوتا ہے موٹی موٹی آنکھوں والی، گوری گوری اور موٹی موٹی آنکھوں والی عورتوں کے ساتھ ان کو جوڑ دیا جائے گا، زَوَّجْنٰهُمْ: ہم نے ان کو جوڑ دیا، ان کی زوجہ بنا دیں گوری گوری اور موٹی موٹی آنکھوں والی عورتیں۔

نسبی تعلق کی وجہ سے جنّت میں درجات کی ترقّی

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِاِيْمَانٍ اَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ: یہ بھی عیش کی ایک تکمیل ہے، اگر انسان خود خوش حال ہو اور اس

کی اولاد اُس درجے کی خوش حال نہ ہو تو اس میں بھی انسان کی عیش میں کسی درجے میں کمی آجایا کرتی ہے، اللہ تعالیٰ مؤمنین کے اوپر یہ بھی فضل فرمائے گا کہ ان کے متعلقین اگرچہ اس درجے کے نہ ہوں بشرطیکہ مؤمن ہوں، تو ان متعلقین کو ترقی دے کر ان کے درجے میں پہنچا دیا جائے گا۔ مثلاً ماں باپ اُونچے درجے میں ہو گئے، اگر تو اولاد کافر ہوئی تو ماں باپ کو ان کا خیال ہی نہ آئے گا، بلکہ اُلٹا ان کے قلوب میں نفرت پیدا ہو جائے گی، اور اگر وہ مؤمن ہوئے جنت کے دائرے میں چلے گئے ایمان کی وجہ سے، تو اللہ تعالیٰ پھر اُس کے اُوپر مزید ان کو ترقی دیں گے والدین کی نسبت سے، والدین کے عمل میں کمی کیے بغیر اولاد کو ترقی دے کر اُونچے درجے میں پہنچا دیا جائے گا۔ یہاں ذکر تو اسی طرح سے ہے کہ ذُرّیت کو پہنچایا جائے گا، اِلحاق کر دیا جائے گا ان کو ان کے بڑوں کے ساتھ، لیکن روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اسی طرح سے بڑوں کی ترقی چھوٹوں کی وساطت سے بھی ہوگی، اگر بڑا نچلے درجے میں ہوا اور اولاد زیادہ صالح ہونے کی بنا پر اُونچے درجے میں ہوئی تو بڑوں کو ترقی دے کر اُونچے درجے میں پہنچا دیا جائے گا، لیکن ایمان شرط ہے، وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ بِإِيمَانٍ: وہ لوگ جو ایمان لائے اور ان کی پیروی کی ان کی اولاد نے ایمان کے ساتھ، أَلْحَقْنَا بِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ: ملا دیں گے ہم ان کے ساتھ ان کی اولاد کو، وَمَا أَلَتْنَاهُمْ مِنْ عَمَلِهِمْ مِنْ شَيْءٍ: اور نہیں کم کریں گے ان کو ان کے عملوں سے کچھ بھی، ان کے عملوں میں ہم کسی قسم کی کمی نہیں کریں گے بلکہ اپنے فضل کے ساتھ ان کی اولاد کو ترقی دے کے وہاں تک پہنچا دیں گے۔ برابر کرنے کا ایک طریقہ یہ بھی ہوتا ہے کہ اُوپر والے کو کچھ نیچے لے آؤ، نیچے والے کو کچھ اُوپر لے آؤ، درمیانہ درجہ نکال لو، مثلاً ایک آدمی کے پاس چھ سو روپے ہیں، دوسرے کے پاس چار سو روپے ہیں، آپ ان کو برابر کرنا چاہیں، تو ایک طریقہ یہ ہے کہ چھ سو والے سے ایک سو لے لو، اس کے پاس پانچ سو رہ گیا، چار سو والے کو ایک سو دے دو، پانچ سو ہو گیا، دونوں برابر ہو گئے، ایک طریقہ یہ بھی ہے برابر کرنے کا، لیکن اس میں آپ جانتے ہیں کہ بڑوں کے لئے کمی آرہی ہے، اور ایک طریقہ یہ ہے کہ چار سو والے کو اپنے فضل سے مہربانی سے دو سو دے کر چھ سو کر دو، اس طرح سے پورے ہو جائیں، تو یہاں جو اولاد کو بڑوں کے ساتھ ملایا جائے گا تو یہ دوسری صورت ہوگی کہ چھوٹوں کے درجات اُونچے کر دیے جائیں گے اور ان کو بڑوں کے درجے تک پہنچا دیا جائے گا۔

نسب اور نسبت آخرت میں کب مفید ہوں گے اور کب نہیں؟

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نسب آخرت میں مفید ہوگا، نیکوں کے ساتھ جو نسبت ہے اس سے فائدہ پہنچے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ ایمان محفوظ ہو، اور اگر ایمان سے خالی ہوئے پھر بڑی سے بڑی نسبت بھی فائدہ نہیں پہنچا سکے گی، قرآنِ کریم میں جو واقعات آپ کے سامنے ذکر کیے گئے ہیں اس میں یہ ساری چیز واضح ہے، نوح علیہ السلام کے بیٹے کا ذکر کیا گیا، معلوم ہو گیا کہ باپ اچھا ہو، لیکن بیٹے کے پاس ایمان نہیں تو باپ بیٹے کے کام نہیں آسکتا۔ ابراہیم علیہ السلام کے باپ کا ذکر کیا گیا، تو معلوم ہو گیا کہ اگر بیٹا اچھا ہے، باپ کے پاس ایمان نہیں ہے، تو بیٹا باپ کے کام نہیں آسکتا۔ لُوط علیہ السلام اور نوح علیہ السلام کی بیویوں کا ذکر کیا گیا، جس سے معلوم ہو گیا کہ اگر بیوی کافر ہے، اس کے پاس ایمان نہیں، تو اس کا خاوند اگر نبی بھی ہو تو اس کے کام نہیں آسکتا۔ یہی تو سب سے زیادہ قریبی رشتے ہوا کرتے ہیں، باپ بیٹے والا رشتہ ہے، خاوند بیوی والا رشتہ ہے، تو قرآنِ کریم کے اندر یہ مثالیں واضح کر دی گئیں کہ یہ رشتے

کام نہیں آئیں گے، اگر ان میں سے ایک کے پاس ایمان نہ ہوا۔ ہاں! البتہ ایمان ہو تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ترقّی درجات اس نسبت اور نسب کی بنا پر ہو جائے گی۔ اور اگر وہ شخص جس کے پاس ایمان ہے، اپنے کردار کی کمزوری کی بنا پر جہنّم میں بھی چلا گیا تو اس کے ساتھ تعلق رکھنے والے اچھے لوگ جو اللہ کے مقبول ہیں، وہ سفارش کر کے جہنّم سے بھی چھڑا لیں گے، یہ واقعہ بھی ہے، لیکن اس کے لئے بھی بنیاد وہی ایمان ہے، مؤمنین جو گناہ گار ہیں ان کے لئے سفارش ہوگی، انبیاء کی ہوگی، فرشتوں کی ہوگی، اولیاء کی ہوگی، علماء کی ہوگی، شہداء کی ہوگی، حفاظ کی ہوگی، احادیث کے اندر یہ واقعات ذکر کیے گئے ہیں، لیکن اِن سب میں شرط یہ ہے کہ اس شخص کے پاس ایمان ہو، اور ایمان سے محروم ہونے کے نتیجے میں پھر کسی کی سفارش نصیب نہیں ہوگی، وَاتَّبَعَتْهُمْ ذُرِّيَّتُهُمْ: یہیں مفسرین نے اشارہ کیا ہے کہ جس طرح سے یہ نسب مفید ہے اسی طرح نسبت بھی مفید ہے، اُستاذ اور شاگرد کی نسبت، پیر اور مرید کی نسبت، یہ جو بزرگوں کے ساتھ اور صالحین کے ساتھ تعلق ہوا کرتا ہے اس تعلق کی بنا پر بھی فائدہ پہنچے گا، حتّٰی کہ یہاں تک حدیث شریف میں آتا ہے قیامت کے دِن جہنّمی قطار میں کھڑے ہوں گے، ایک صالح آدمی جو کسی کی سفارش کرنے کے لئے آیا ہوگا، وہ چلا جا رہا ہوگا، اور ایک جہنّمی اس کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس کو خطاب کرے گا کہ اے اللہ کے بندے! وہ متوجہ ہوگا تو جہنّمی پوچھے گا: آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟ وہ کہے گا کہ میں نے تو نہیں پہچانا! تو وہ یاد دلائے گا کہ آپ کو یاد ہونا چاہیے فلاں وقت میں نے آپ کو وضو کے لئے پانی دیا تھا، تو اس کو وہ واقعہ یاد آجائے گا، بس اسی تعلق کی بنا پر اس کو پکڑ کے لے جائے گا۔[1] تو اچھے لوگوں کے ساتھ اتنا سا تعلق بھی آخرت میں مفید ہوگا، لیکن تبھی جس وقت کہ جانے والے کے پلّے ایمان ہو، کافروں کا وہاں کوئی پُرسانِ حال نہیں، اس لئے ایمان کی حفاظت ضروری ہے، ایمان کے ساتھ جائیں گے تو چھوٹنے اور ترقّی پانے کے لئے اللہ کی رحمت کے ساتھ ہزاروں ذرائع میسّر آسکتے ہیں، تو سب سے بڑی فکر ایمان کی ہونی چاہیے، اس کے بغیر نہ نسب مفید ہے، نہ نسبت مفید ہے۔ وَمَآ اَلَتْنٰهُمْ مِّنْ عَمَلِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ: ہم ان کو ان کے عمل گھٹائیں گے نہیں، یعنی ان کے بڑوں کے عملوں میں کمی کر کے چھوٹوں کو ترقّی نہیں دی جائے گی، بلکہ اپنے فضل کے ساتھ ان کو ترقّی دیں گے، كُلُّ امْرِئٍۭ بِمَا كَسَبَ رَهِيْنٌ: رهین: مرہون، ہر شخص اپنے کیے کے بدلے رہن رکھا ہوا ہوگا، محبوس ہوگا ہر شخص اپنے کیے کے بدلے، ''بیان القرآن'' میں تو اس کو خاص کر دیا گیا کافروں کے ساتھ، کہ کافروں کا مؤمنین صالحین کے ساتھ اِلحاق نہیں ہوگا، بلکہ وہ تو اپنے اپنے عمل کے بدلے میں محبوس ہوں گے، ان کے چھوٹنے کی کوئی صورت نہیں ہے۔

جنّت کے میوے اور گوشت

وَاَمْدَدْنٰهُمْ بِفَاكِهَةٍ وَّلَحْمٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ: اَمَدَّ: اِمداد پہنچانا، زیادتی کرنا، زیادہ دینا، مسلسل دینا، یہ سارے کا سارا ''اَمْدَدْنَا'' کا مفہوم ہو جائے گا، ''ہم ان کو لگاتار دیں گے، روز افزوں دیں گے، اَمْدَدْنٰهُمْ کا یہ مفہوم ہو جائے گا، ہم ان کو زیادہ

(۱) مشکوٰۃ ۲/ ۴۹۴ باب الحوض والشفاعۃ فصل ثانی / شرح السنۃ ۱۵/ ۱۸۵، رقم: ۴۳۵۳۔ مرقاۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ صفیں جہنّم میں جانے سے پہلے بنیں گی۔

دیں گے، امداد پہنچائیں گے ہم انہیں فاکہہ کے ساتھ اور گوشت کے ساتھ، مِمَّا يَشْتَهُوْنَ یہ اس کا بیان ہے، جس کو وہ چاہیں گے،"جو فاکہہ اور جو میوہ وہ چاہیں گے، جس قسم کا گوشت چاہیں گے، ہم ان کو مسلسل دیں گے، لگاتار دیں گے، روز افزوں دیں گے" امداد کا یہ مفہوم ہے، یہ خوراک کا ذکر کر دیا، اور فاکہہ کے اندر ہر قسم کے میوے آ گئے، گوشت اور فاکہہ یہ دونوں انسان کی غذائی ضرورت کو پوری کر دیتے ہیں، تفکّہ اور تلذذ کے طور پر جو چیز کھائی جاتی ہے وہ فاکہہ میں آ گئی، اور ویسے جو انسان قوت حاصل کرنے کے لئے کھاتا ہے وہ لحم میں آ گیا، مقصد یہ ہے کہ ان کو کھانے پینے کے لئے بہترین سے بہترین چیز دی جائے گی جو ان کا جی چاہے گا۔

جنّت کی شراب اور اہلِ جنّت کی بے تکلفی

يَتَنَازَعُوْنَ فِيْهَا كَاْسًا: تنازع: چھینا جھپٹی کرنا،"چھینا جھپٹی کریں گے وہ اس جنت کے اندر پیالوں میں" کاس کہتے ہیں اصل میں بھرے ہوئے پیالے کو، یعنی جس وقت دوستوں کی محفل لگا کرتی ہے، تو جہاں اور خوش طبعیاں ہوا کرتی ہیں وہاں ایک خوش طبعی یہ بھی ہے کہ ایک دوسرے سے چھینتے ہیں، کبھی اس نے لے لیا، کبھی اس نے لے لیا، تو اسی طرح سے وہاں بھی خوش دلی کی محفلیں ہوں گی، جامِ شراب میں وہ تنازع کریں گے، چھینا جھپٹی کریں گے، لَا لَغْوٌ فِيْهَا: لیکن اس شراب کے سبب سے نہ کوئی بیہودگی ہوگی وَلَا تَاْثِيْمٌ: اور نہ گناہ گار قرار دینا ہوگا، اٰثَمَ تَاْثِيْمًا: کسی کی نسبت گناہ کی طرف کرنا، مطلب یہ ہے کہ کوئی ایسی حرکت نہیں ہوگی جس کو گناہ سے تعبیر کیا جا سکے، دُنیا میں جس قسم کی گناہ کی حرکتیں ہوتی ہیں اُس شراب نوشی کی محفل میں اُس دوست احباب کی محفل میں اِس قسم کی کوئی حرکت نہیں ہوگی، مطلب یہ ہے کہ شراب والا سُرور ہوگا، لیکن شراب کے ساتھ جو خرافات اور ہزلیات دُنیا کے اندر ہوتی ہیں، ان میں سے کوئی چیز نہیں پائی جائے گی، یہ سرور کا باعث ہوتی ہے اور وہ سُرور وہاں حاصل ہوگا، تو یہ دوست احباب آپس میں بیٹھ کے بے تکلفی کے ساتھ جس طرح سے چھینا جھپٹی تنازع کیا کرتے ہیں، جنتی بھی اسی طرح سے کریں گے، لیکن یہ چیز عداوت کا باعث نہیں بنے گی، دُنیا کے اندر بسا اوقات چھینا جھپٹی لڑائی تک پہنچا دیتی ہے۔ اور اسی طرح سے شراب پی کر لوگ ایک دوسرے پر تہمتیں لگاتے ہیں، بدزبانیاں کرتے ہیں، بک بک کرتے ہیں، بیہودہ بکتے ہیں، ایسی کوئی لغو بات وہاں نہیں پائی جائے گی، مطلب یہ ہے کہ سُرور اور فوائد حاصل ہوں گے، اور جو اس میں نقصانات ہیں یا جو اس میں برائیاں ہیں ان میں سے کوئی چیز نہیں ہوگی۔

اہلِ جنّت کے خدام

وَيَطُوْفُ عَلَيْهِمْ غِلْمَانٌ لَّهُمْ: یہ خدام کا ذکر آ گیا طاف یطوف: گھومنا،"طواف کریں گے اُن پر، گھومیں گے ان پر ان کے خدام" غلمان غلام کی جمع ہے، غلام نوجوان لڑکے کو کہتے ہیں، یہ نوجوان لڑکے بطور خادم کے دیے ہوں گے، ان کے اُوپر گھومیں گے، طواف کریں گے، یعنی خدمت کے طور پر کریں گے۔ اور وہ خدام بھی ایسے صاف ستھرے ہوں گے كَاَنَّهُمْ لُؤْلُؤٌ مَّكْنُوْنٌ: گویا کہ وہ چھپا کے رکھے ہوئے موتی ہیں، کیونکہ خدمت گار صاف ستھرا ہو تو یہ بھی سُرور کا ایک باعث بنتا ہے، جہاں کھانے پینے میں لذت ہے، محفل لگی ہوئی ہے، اس میں سُرور ہے، تو اسی طرح سے اگر خدام صاف ستھرے نہ ہوں تو وہ ایک کدورت کا

باعث بن جاتے ہیں، گندے ہاتھوں سے کوئی چیز لے کے کھانے کو بھی جی نہیں چاہتا، اسی طرح سے میلا کچیلا، بدحال آدمی اگر آنکھوں کے سامنے ہوتو آپ جانتے ہیں کہ ذہنی کوفت کا باعث ہوتا ہے، تو یہ خدام بھی ایسے صاف ستھرے ہوں گے گویا کہ چھپا کے رکھے ہوئے موتی ہیں۔

جنتیوں کا دُنیا کی مشقتوں کو یاد کرنا اور اللہ کا شکر اَدا کرنا

وَاَقْبَلَ بَعْضُهُمْ عَلٰى بَعْضٍ يَّتَسَآءَلُوْنَ: ان جنتیوں کا بعض بعض پہ متوجہ ہوگا آپس میں سوال کرتے ہوئے، پھر آپس میں گفتگو کریں گے سوال کریں گے، قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا قَبْلُ فِيْٓ اَهْلِنَا مُشْفِقِيْنَ: کہیں گے کہ بے شک ہم اس سے پہلے اپنے گھر والوں میں ڈرنے والے ہوتے تھے، یعنی تذکرہ کریں گے کہ دُنیا میں ہمارے اُوپر کس طرح سے خوف طاری ہوتا تھا کہ پتا نہیں انجام کیا ہوگا؟ آج دیکھو! اللہ نے ہم پہ کیسا فضل فرمادیا کہ ہمیں عذاب سے بچالیا، کیسی کیسی نعمتیں دے دیں۔ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد سفر کی مشکلات اور سفر کی تکلیفیں دوست احباب ذکر کیا کرتے ہیں، کہ راستہ کیسا کٹھن تھا اور ہم کس طرح طے کرآئے، اللہ کا فضل ہے کہ ہمیں کامیابی کے ساتھ ہماری منزلِ مقصود تک پہنچادیا، اس مجلس کے اندر بیٹھ کے یہ باتیں بھی کریں گے، ”کہیں گے کہ بے شک ہم اپنے گھر میں ڈرنے والے ہوتے تھے“ فَمَنَّ اللّٰهُ عَلَيْنَا: پھر اللہ نے ہم پہ احسان کیا، وَوَقٰىنَا عَذَابَ السَّمُوْمِ: سموم گرم ہوا کو کہتے ہیں، اور ہمیں گرم ہوا کی تکلیف سے بچالیا، یعنی آگ تو اپنی جگہ رہی، آگ کی گرم ہوا بھی ہم تک نہیں پہنچی، ”گرم ہوا کے عذاب سے اللہ نے ہمیں بچالیا“ اِنَّا كُنَّا مِنْ قَبْلُ نَدْعُوْهُ: بے شک ہم اِس سے قبل اسی کو پکارا کرتے تھے، اِنَّهٗ هُوَ الْبَرُّ الرَّحِيْمُ: بے شک وہ بَر ہے، رحیم ہے۔ بَرّ: اچھا برتاؤ کرنے والا، وفادار، اور رحیم: رحم کرنے والا ”بے شک وہ بَر ہے، اللہ محسن ہے، اچھا برتاؤ کرنے والا ہے، اور رحم کرنے والا ہے“ کہ اپنے رحم کے ساتھ ہماری غلطیاں معاف کرکے ہمیں بہت زیادہ دیا، یہ آپس میں اُن کا تذکرہ ہوگا۔ یہ دونوں فریقوں کا انجام واضح کردیا۔

فَذَكِّرْ فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ ﴿۲۹﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ
آپ نصیحت کرتے رہیں، پس آپ اپنے رَبّ کے فضل سے نہ کاہن ہیں نہ مجنوں ہیں ﴿۲۹﴾ یا یہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے
نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ ﴿۳۰﴾ قُلْ تَرَبَّصُوْا فَاِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُتَرَبِّصِيْنَ ﴿۳۱﴾
ہم انتظار کرتے ہیں اس کے متعلق موت کے حادثے کا ﴿۳۰﴾ آپ کہہ دیجئے کہ تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ﴿۳۱﴾
اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ ﴿۳۲﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ
کیا ان کو ان کی عقلیں یہی باتیں سکھاتی ہیں یا یہ لوگ ہی سرکش ہیں؟ ﴿۳۲﴾ یا یہ کہتے ہیں کہ اس کو اِس نے خود گھڑلیا، (یہ بات نہیں

بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ ﴿٣٣﴾ فَلْيَأْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖٓ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ ﴿٣٤﴾ اَمْ خُلِقُوْا مِنْ

ہے) بلکہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے ﴿٣٣﴾ تو لے آئیں اس جیسی بات اگر سچے ہیں ﴿٣٤﴾ کیا یہ پیدا کر دیے گئے

غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ ﴿٣٥﴾ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ﴿٣٦﴾

بغیر کسی شی کے؟ یا خود ہی خالق ہیں؟ ﴿٣٥﴾ یا پیدا کیا انہوں نے آسمانوں اور زمین کو؟ بلکہ یہ یقین نہیں لاتے ﴿٣٦﴾

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ﴿٣٧﴾ اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ

کیا ان کے پاس تیرے رب کے خزانے ہیں یا یہ منتظم ہیں؟ ﴿٣٧﴾ کیا ان کے لئے کوئی سیڑھی ہے جس میں چڑھ کر یہ سن لیتے ہوں؟

فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ ﴿٣٨﴾ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ ﴿٣٩﴾ اَمْ تَسْــَٔلُهُمْ

چاہیے کہ لے آئے ان کا سننے والا کوئی واضح دلیل ﴿٣٨﴾ کیا اس کے لئے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے ہیں؟ ﴿٣٩﴾ یا آپ ان سے کوئی اجر

اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ ﴿٤٠﴾ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ ﴿٤١﴾ اَمْ

طلب کرتے ہیں؟ پھر وہ تاوان کی وجہ سے بوجھ میں پڑے ہوئے ہیں ﴿٤٠﴾ یا ان کے پاس غیب ہے جس کو وہ لکھ لیتے ہیں؟ ﴿٤١﴾ یا

يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ ﴿٤٢﴾ اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ

کوئی چالبازی کا ارادہ کیے ہوئے ہیں؟ تو پھر جو لوگ کافر ہیں انہی کے خلاف چال کی گئی ہے ﴿٤٢﴾ یا ان کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی اور الٰہ ہے؟

سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿٤٣﴾ وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا

اللہ پاک ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے ﴿٤٣﴾ اگر یہ دیکھیں گے آسمان کی طرف سے کسی ٹکڑے کو گرنے والا تو کہیں گے

سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ ﴿٤٤﴾ فَذَرْهُمْ حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ ﴿٤٥﴾

یہ تو تہہ بہ تہہ بادل ہے ﴿٤٤﴾ چھوڑیے انہیں، حتیٰ کہ ملاقات کریں یہ اپنے اس دن سے جس میں یہ بے ہوش کر دیے جائیں گے ﴿٤٥﴾

يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْــًٔا وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ﴿٤٦﴾ وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا

جس دن کہ نہیں کام آئے گی ان کے ان کی تدبیر کچھ بھی، نہ یہ مدد کیے جائیں گے ﴿٤٦﴾ بے شک ان لوگوں کے لئے جو کہ ظالم ہیں

عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿٤٧﴾ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَاِنَّكَ

عذاب ہے اس سے پہلے، لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں ﴿٤٧﴾ صبر کیجئے اپنے رب کے حکم کے انتظار میں، بے شک آپ

بِاَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۟ۙ۴۸ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ۟۴۹ ع

ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، اور تسبیح بیان کیجئے اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ جس وقت آپ اُٹھتے ہیں ۴۸ اور رات کے کچھ حصے میں بھی آپ اس کی تسبیح بیان کیجئے، اور ستاروں کے پیٹھ پھیرنے کے بعد بھی ۴۹

تفسیر

کُفّار کی سخن سازیاں

اب آگے کچھ سرورِ کائنات ﷺ کے لئے کچھ تسلی کا مضمون بھی ہے اور فِيْ خَوْضٍ يَّلْعَبُوْنَ کے اندر جو ذکر کیا گیا تھا کہ یہ باتیں بناتے ہیں، سخن سازیاں کرتے ہیں، تو ان کی کچھ انہی سخن سازیوں کا تذکرہ کیا ہے، کہ کیسی بیہودہ باتیں کرتے ہیں جن کی کوئی اصلیت نہیں، فَذَكِّرْ: جب یہ دونوں فریقوں کا انجام آپ کے سامنے ہے تو آپ نصیحت کیجئے، فَمَآ اَنْتَ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ: وہ لوگ باتیں بناتے ہوئے آپ کے اُوپر جو فقرے کستے تھے تو اس میں کبھی آپ کو کاہن کہتے تھے، اور کاہن اس زمانے میں وہ ہوتے تھے جن کے جنّات کے ساتھ تعلقات تھے، جنّات کی وساطت سے وہ غیب کی کچھ خبریں معلوم کرلیتے اور جھوٹ موٹ ملا کر لوگوں کو سنایا کرتے تھے، کہانت تو اس وقت بہت تھی، تو وہ آپ کو کاہن کہتے تھے، یا کہتے تھے یہ دیوانہ ہے، اِس کی عقل ٹھکانے نہیں جو آباء واجداد کے خلاف ایسی باتیں کرنی شروع کردیں، ساری برادری کے خلاف ایک مسلک اختیار کرلیا، پھوٹ ڈال دی، شہر کا امن تباہ کردیا، یہ تو کوئی عقل مندی نہیں ہے یہ تو دیوانگی ہے، یہ فقرے کسا کرتے تھے رسول اللہ ﷺ پر۔ تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ تُو نصیحت کرتا رہ، پس تو اپنے رَبّ کے فضل سے نہ کاہن ہے نہ مجنوں ہے، فَمَآ اَنْتَ بِكَاهِنٍ وَّلَا مَجْنُوْنٍ بِنِعْمَتِ رَبِّكَ: بفضلہٖ تعالیٰ، اپنے رَبّ کے فضل وکرم سے تُو نہ کاہن ہے، نہ دیوانہ ہے، ان کی باتوں کی پروانہ کر، تُو اِن کو نصیحت کرتا رہا کر۔ اَمْ يَقُوْلُوْنَ شَاعِرٌ: یا یہ لوگ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے، یعنی شاعر کا لفظ بھی استعمال کرتے تھے، یہ پھبتی بھی کستے تھے، کہ جس طرح سے شاعر تخیل باندھتے ہیں اور مختلف قسم کی باتیں بنا کے اس قسم کی کلام لے آتے ہیں جس سے لوگ متاثر ہوتے ہیں، تو یہ بھی شاعروں جیسی خیال بندی ہے جو یہ پیش کررہے ہیں، "یا یہ کہتے ہیں کہ یہ شاعر ہے" نَّتَرَبَّصُ بِهٖ رَيْبَ الْمَنُوْنِ: منون موت کو بھی کہتے ہیں اور منون دہر کو اور زمانے کو بھی کہتے ہیں، ریب سے مراد حادثہ ہے، وہ کافر کہتے تھے کہ "یہ شاعر ہے، ہم اس کے ساتھ موت کے حادثے کے منتظر ہیں" کہ جس طرح سے بڑے بڑے شاعر آئے ہیں، جنہوں نے اپنے وقت میں بڑی بڑی محفلیں سجائیں، اور اپنی شعروشاعری کے ساتھ لوگوں کو بڑا متاثر کیا، لیکن موت آئی خاتمہ کرگئی، بعد میں کون پوچھنے والا ہے؟ اسی طرح سے یہ بھی ایک شاعر ہے، ہم منتظر ہیں، مرجائے گا، مرنے کے بعد قصہ ختم ہوجائے گا، یا "زمانے کے حادثے کا ہم انتظار کرتے ہیں" پھر بھی وہی مراد ہے کہ زمانے کے حوادثات کے ساتھ جیسے پچھلے شعراء مٹ مٹا گئے، اسی طرح سے یہ بھی بڑی پُرتاثیر کلام پیش کرتے ہیں، لیکن

حادثہ ہوگا اور ختم ہو جائیں گے، موت کا حادثہ آئے گا، زمانے کا حادثہ آئے گا تو ختم ہو جائیں گے، یہ یوں کہتے ہیں،'' یا یہ کہتے ہیں کہ شاعر ہے، ہم انتظار کرتے ہیں اِس کے متعلق زمانے کے حادثے کا، یا، موت کے حادثے کا۔''

کُفّار کی سخن سازیوں کا جواب

آپ کہہ دیجئے کہ ٹھیک ہے تم بھی انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ مل کے انتظار کرنے والا ہوں'' پتا چل جائے گا کہ میرا انجام کیا ہے اور تمہارا انجام کیا ہے؟ تم میرے مستقبل کے منتظر رہو، میں تمہارے مستقبل کا منتظر ہوں! اَمْ تَاْمُرُهُمْ اَحْلَامُهُمْ بِهٰذَآ اَمْ هُمْ قَوْمٌ طَاغُوْنَ: یہ بطورِ تعجب کے ایک بات کہی جارہی ہے کہ کیا اِن کو ان کی عقلیں یہی باتیں سکھاتی ہیں یا یہ لوگ ہی سرکش ہیں؟ اِستفہام کے طور پر ذِکر کیا جارہا ہے جس میں سے دُوسری شق واقع ہے کہ اگر یہ عقل سے کام لیتے تو ایسی باتیں نہ کرتے، انہیں پتا نہیں؟ کہ کاہنوں کے کیا حالات ہوتے ہیں؟ گندے رہتے ہیں، شرکیہ کلمات ان کی زبان پہ جاری ہوتے ہیں، جنّات کے ساتھ ان کے تعلقات ہوتے ہیں، جنوں کے ناموں پہ چڑھاوے چڑھاتے ہیں، سو میں سے ایک بات سچی نکلتی ہے، ننانوے جھوٹی نکلتی ہیں، پھر بغیر پیسے لیے کوئی بات نہیں بتاتے، تو بھلا! آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات کو کاہنوں کے حالات سے کیا نسبت؟ یہ عقل سے سوچتے نہیں؟...... اور جس قسم کے شاعر ہوا کرتے ہیں، پرلے درجے کے بدعمل! کہ باتیں تو بہت بناتے ہیں لیکن عملی زندگی صفر ہوتی ہے، سورۂ شعراء کے اندر جس طرح ذِکر کیا گیا تھا کہ شاعر قوّال ہوتے ہیں، فعّال نہیں ہوتے، جو کچھ وہ زبان سے کہا کرتے ہیں اُن کی عملی زندگی اس کے مطابق نہیں ہوتی، لیکن نبی کی زندگی میں تو ایک ایک لفظ زبان سے جو نکلتا ہے تو اس کی عملی تصویر جب چاہیں آپ دیکھ لیں، کیا مجال ہے کہ کوئی بات محض خیال بندی کے طور پر ہو اور واقعہ نہ ہو، شعروں کے بارے میں تو مشہور ہے کہ ''اَکذب اوست احسنِ اوست'' شعر کے اندر جتنی مبالغہ آرائی اور جھوٹ بولا جائے اتنا ہی شعر خوبصورت ہوتا ہے، اور اگر محض حقیقت کی ترجمانی کی جائے تو شعر پھیکا پھیکا رہ جاتا ہے، وہ تو جتنا جھوٹا ہوگا اتنا ہی اچھا ہوگا، لیکن قرآنِ کریم میں جو کچھ کہا جارہا ہے کیا اس میں سے کسی بات کو خلافِ واقع ثابت کیا جاسکتا ہے؟...... اور یہ آپ کو دیوانہ کہتے ہیں، لیکن آپ سے زیادہ فرزانہ، ہوشیار، عقل مند، صاحبِ حکمت انہوں نے دُنیا میں کبھی دیکھا بھی ہے؟ کیا آپ کی جو باتیں ہیں دیوانوں کی باتیں ایسی ہوا کرتی ہیں؟ اُن کے اقوال، افعال اسی طرح سے بچے تلے ہوتے ہیں کہ جن کے اُوپر انگلی رکھنے کی جگہ نہ ہو؟...... اگر یہ عقل سے کام لیتے تو سمجھ جاتے کہ نہ آپ کاہن ہیں، نہ مجنوں، نہ شاعر، لیکن کیا ان کو ان کی عقل اس قسم کی باتیں سکھاتی ہے یا یہ ہیں ہی سرکش طاغی، چونکہ ماننا نہیں چاہتے اس لیے جان کے انجان بنے ہوئے ہیں، تو دُوسری شق واقع ہے، کہ یہ عقل کا کام نہیں ہے، عقل ان کو ایسی باتیں نہیں سکھاتی، بلکہ سرکشی اور طغیان ان کے اندر جو آیا ہوا ہے کہ کسی دُوسرے کی اطاعت نہیں کرنا چاہتے، اپنی سرداریوں کو یہ ٹھیس نہیں پہنچنے دینا چاہتے، اس لیے اس قسم کی باتیں ایک حقیقت کو چھپانے کے لئے ایک حقیقت کو رَدّ کرنے کے لئے سخن سازیاں کرتے ہیں، دُوسری شق اس میں واقع ہے، یعنی استفہام کے درجے میں دونوں باتیں ذکر کردیں، اور جس وقت آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ عقل کا کام نہیں کہ اس قسم کی باتیں کی جائے، ایسی باتیں عقل نہیں سکھاتی، انسان کے اندر بغاوت اور شرارت جب آجاتی ہے تو پھر

انسان اس حقیقت کو نہ ماننے کے لئے ہزار سخن سازیاں کرتا ہے جس کے متعلق وہ فیصلہ کر لیتا ہے کہ اس کو نہیں ماننا، تو ان کی یہ سخن سازیاں بھی ایسے ہی ہیں۔

قرآن کے متعلق کافروں کا اِعتراض اور اس کا جواب

اَمْ يَقُوْلُوْنَ تَقَوَّلَهٗ: یا یہ کہتے ہیں کہ اس کو اس نے خود گھڑ لیا، یہ اللہ کی کلام نہیں، بَلْ لَّا يُؤْمِنُوْنَ: یہ بات نہیں ہے، دِل سے یہ بھی جانتے ہیں کہ اس کی گھڑی ہوئی نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ یہ ایمان نہیں لانا چاہتے، دِل سے یہ بھی جانتے ہیں کہ گھڑی ہوئی نہیں، کیوں؟ اس کی کیا دلیل؟ فَلْيَاْتُوْا بِحَدِيْثٍ مِّثْلِهٖۤ اِنْ كَانُوْا صٰدِقِيْنَ: اگر یہ اپنے اس دعوے میں سچے ہیں کہ یہ بات رسول نے خود بنالی تو اس جیسی بات وہ بھی بنا کے لے آئیں اگر سچے ہیں، اس میں وہی چیلنج ہے جو بار بار قرآنِ کریم میں کیا گیا کہ ایک شخص چالیس سال تک تو ایسا تھا جیسے اس نے نہ کسی مجلس میں تقریر کی، نہ اس نے نہ کوئی نظم کہی، نہ اس نے کوئی شعر بنایا، وہ کوئی تمہارا معروف خطیب نہیں ہے، اس کو بولنے کی عادت ہی نہیں، خلوت میں وقت گزارا، یا جنگل میں بکریاں چرائیں، اور تمہارے بڑے بڑے خطباء، بڑے بڑے شاعر جو ہمیشہ سے محفلیں لگاتے ہیں، بڑے مشاق ہیں، تو اگر ایک شخص اچانک بولتا ہے اور اس قسم کی کلام لے آئے کہ ساری دُنیا کو چیلنج کر رہا ہے کہ اس کے مقابلے میں لاؤ کلام، تو پھر اگر تم کہتے ہو کہ اسی کی گھڑی ہوئی ہے تو آؤ، اکٹھے ہو کر ذرا اس جیسی کلام بنا کے لے آؤ۔ کتنی واضح دلیل ہے جس کے اُوپر کچھ کہنے سننے کی ضرورت ہی نہیں، اور جب اس کا وہ جواب نہیں دے سکتے تو دِل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ اس کی بنائی ہوئی نہیں، اس میں جو تاریخی حقائق پیش کیے گئے ہیں......! یہ تو کسی مدرسے میں پڑھے نہیں، کوئی کتاب انہوں نے دیکھی نہیں، علماء کی محفل میں نہیں رہے، تو انہوں نے دُنیا کی ساری کی ساری تاریخ کہاں سے یاد کر لی؟ انبیاء علیہم السلام کے نام اور ان کے کام اور ان کے حالات اِن کے سامنے کہاں سے آ گئے؟ جب یہ کسی مکتب میں نہیں بیٹھے، کوئی کتاب نہیں دیکھی، یعنی یہ معلومات جو قرآنِ کریم میں بتائی جا رہی ہیں تو کیا ایک اَن پڑھ شخص جو کسی علمی مجلس میں بیٹھا نہ ہو، کسی مکتب میں داخل نہ ہوا ہو، اس نے کوئی کتاب نہیں پڑھی، کیا یہ عقل فیصلہ کرتی ہے کہ گھر بیٹھے بیٹھے اس نے سارے کے سارے قصے بنا لیے؟ کہ توراۃ اور اِنجیل کو بھی چیلنج کر دیا کہ ان کی معلومات بسا اوقات لوگوں نے خراب کر دیں، میں جو صحیح پیش کر رہا ہوں یہ بات ٹھیک ہے اور توراۃ، اِنجیل کے اندر لوگوں نے تحریف کر دی۔ تو پہلے کے جو اہلِ علم چلے آ رہے ہیں اُن کو بھی چیلنج کر دیا اور ان کی غلطیاں نکالنے کے لئے بھی بیٹھ گئے، تو کیا یہ کسی اُمّی اور اَن پڑھ آدمی کا کام ہے کہ چپکے چپکے بیٹھ کے ساری دُنیا کے علوم پہ حاوی ہو جائے؟ اس لیے یہ بات دِل میں تو وہ سمجھتے ہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ ماننا نہیں چاہتے اس لیے باتیں بناتے ہیں، ''تو لے آئیں اس جیسی بات اگر سچے ہیں۔''

دلائلِ توحید

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ الْخٰلِقُوْنَ: اب یہ ان کی بے فکری کے اوپر چوٹ لگائی جا رہی ہے، ''کیا یہ پیدا کر دیے گئے

بغیر کسی شیٔ کے یا خود ہی خالق ہیں، یا پیدا کیا انہوں نے آسمانوں کو اور زمین کو، بلکہ یہ یقین نہیں لاتے'' یعنی اتنا ہی سوچ لیں کہ یہ کسی کی مخلوق ہیں، اللہ نے اِن کو پیدا کیا ہے، یہ خود اپنے خالق نہیں، اور نہ یہ خالق کی صفت کے اندر شریک ہیں، تو جب یہ مخلوق ہیں تو اُس خالق کا حق اِن کے اُوپر ہے، یہ اِن کو سوچنا چاہیے، اور زمین آسمان کے بھی یہ خالق نہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے جو کچھ زمین اور آسمان کی طرف سے اِن کو دیا ہے وہ سب اللہ کی نعمتیں ہیں، پھر زمین اور آسمان جب اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں تو جب چاہے وہ ان کو معدوم بھی کرسکتا ہے، آسمان کی طرف سے آفات اِن پہ آسکتی ہیں، زمین اِن کو نگل سکتی ہے، زمین کی طرف سے حادثات اِن کے اُوپر آسکتے ہیں، ان باتوں کو یہ سوچتے نہیں ہیں؟ جو اللہ کے سامنے اس قسم کی سرکشی اور بغاوت کیے ہوئے ہیں، تو یہ توحید کی دلیل کے طور پر ذکر کیا جارہا ہے کہ تم بھی مخلوق ہو، تم خود بخود پیدا نہیں ہوگئے، اور نہ تم خود ہی اپنے خالق ہو، اور یہ زمین آسمان جس کے درمیان میں تم بستے ہو یہ بھی تمہارا بنایا ہوا نہیں، یہ بھی کسی دُوسرے کا بنایا ہوا ہے، تو اس میں تخویف کا پہلو بھی ہے اور ترغیب کا پہلو بھی ہے۔

خزائنِ رحمت کا مالک صرف اللہ

اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ: یا اِن کے پاس تیرے رَبّ کے خزانے ہیں، اَمْ هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ: یا یہ منتظم ہیں، مُصَیطِر: جو کسی چیز کے اُوپر حاکم ہوتا ہے، داروغہ، مطلب کیا ہوا؟ کہ نبوّت کے بارے میں جو یہ کہتے ہیں کہ فلانے کو کیوں نہیں ملی؟ فلانے کو کیوں مل گئی؟ فلانے کو ملنی چاہیے تھی، یا یہ اپنی خوش حالی کو دلیل بناتے ہیں کہ ہم ہمیشہ ایسے ہی رہیں گے، تو انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ نہ تو یہ اللہ کی رحمت کے خزانوں کے مالک ہیں، جس طرح سے سورۂ زُخرف میں آیا تھا اَهُمْ يَقْسِمُوْنَ رَحْمَتَ رَبِّكَ (آیت: ۳۲)، اس لیے نبوّت کی تقسیم ان کے ہاتھ میں نہیں کہ جس کو چاہیں دیں جس کو چاہیں نہ دیں، اور اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے اپنے خزانے کوئی اِن کے قبضے میں نہیں دے دیے کہ ہمیشہ یہ ایسے خوش حال ہی رہیں گے اور کبھی ان کے اُوپر بدحالی نہیں آئے گی، نہ خزانے ان کے قبضے میں ہیں نہ اِن کا حکم چلتا ہے کہ جس کو چاہیں دیں اور جس کو چاہیں نہ دیں، ''کیا ان کے پاس ان کے رَبّ کے خزانے ہیں یا یہ حاکم ہیں؟''

شرکیہ عقائد کا رَدّ

اَمْ لَهُمْ سُلَّمٌ يَّسْتَمِعُوْنَ فِيْهِ: کیا ان کے لئے کوئی سیڑھی ہے جس میں چڑھ کے یہ سُن لیتے ہوں؟ یعنی اگر یہ رسول کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تو آخر اللہ تعالیٰ کی باتیں معلوم کرنے کے لئے ان کے پاس کیا ذریعہ ہے؟ یا یہ جو اس قسم کی باتیں کرتے ہیں کہ اوّل تو آخرت آئے گی نہیں، آئے گی تو ہم پھر اس طرح سے خوش حال ہوں گے، یہ بات ان کو کہاں سے معلوم ہوگئی؟ یہ آسمان پہ چڑھ کے خود سُن کے آتے ہیں؟ اِستفہام کے طور پر چیز ذکر کی جارہی ہے اور اس کی تردید خود واضح ہے، ''کیا ان کے پاس کوئی سیڑھی ہے؟'' سُلَّم سیڑھی کو کہتے ہیں زینے کو، ''سُلَّم العلوم'' آپ کی کتاب کا نام بھی ہے، یعنی علوم کے لئے سیڑھی، کہ

جس کے پڑھنے کے بعد اِنسان کو علوم پر غلبہ حاصل ہوتا ہے،''کیا ان کے لئے کوئی سیڑھی ہے جس میں چڑھ کر وہ سنتے ہوں؟'' 43
فَلْيَأْتِ مُسْتَمِعُهُمْ بِسُلْطٰنٍ مُّبِيْنٍ: چاہیے کہ لے آئے اِن کا سننے والا کوئی واضح دلیل، اگر کوئی کہہ ہی دے کہ ہاں! ہم آسمان پہ جا کے سُن 43
کے آتے ہیں، وہاں سے ہمیں معلوم ہوا کہ آپ اللہ کے نبی نہیں ہیں، یہ کتاب اللہ نے نہیں بھیجی، تو اگر کوئی ہے ایسا تو آئے اپنی بات کو واضح کرے۔ اَمْ لَهُ الْبَنٰتُ وَلَكُمُ الْبَنُوْنَ: کیا اللہ کے لئے تو بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے ہیں؟ یہ ان کے وہی مشرکانہ خیالات......! رَدِّ شرک کے ضمن میں اس کی تردید کی جارہی ہے اِستفہام کی صورت میں، یعنی خود سوچو کہ بات کتنی ناموزوں ہے، اوّل تو اللہ کے لیے اولاد کی تجویز ہی غلط، اور پھر اگر اللہ کے لیے تم نے اولاد تجویز کی تھی تو بدبختو! ایسی تو کرتے جس کو تم بھی تعریف سمجھتے ہو، جس کو تم بھی مدح سمجھتے ہو، نسبت کی بھی تو ایسی چیز کی جس کو خود اپنے نزدیک بھی بُرا جانتے ہو،''کیا اس کے لئے بیٹیاں ہیں اور تمہارے لئے بیٹے ہیں؟'' اَمْ تَسْـَٔلُهُمْ اَجْرًا فَهُمْ مِّنْ مَّغْرَمٍ مُّثْقَلُوْنَ: یا آپ ان سے کوئی اَجر طلب کرتے ہیں پھر وہ تاوان کی وجہ سے بوجھ میں پڑے ہوئے ہیں، یعنی اس لئے نہیں مانتے کہ ان کو اندیشہ ہے کہ اگر آپ کی بات مانیں گے تو آپ کی باتوں کا معاوضہ کہاں سے دیں گے؟ آپ بڑی بڑی تنخواہ طلب کرتے ہیں، ایسی کوئی بات ہی نہیں۔ یہ ساری ان کی آپس میں خود خرافات ہے ورنہ کوئی بات نہیں جس کو ہم بنیاد بنا سکیں کہ یہ اس لیے نہیں مان رہے چونکہ یہ بات ہے، ایسے ہی ان کی اپنی خرافات ہیں اور اپنی سخن سازیاں ہیں، معقول وجہ کوئی نہیں۔ اَمْ عِنْدَهُمُ الْغَيْبُ فَهُمْ يَكْتُبُوْنَ: یا ان کے پاس غیب ہے جس کو وہ لکھ لیتے ہیں، اس لیے وہ کسی رسول کے واسطے کی ضرورت ہی نہیں محسوس کرتے، خود ہی غیب کی خبروں کا اِن کو پتا چل جاتا ہے، جس کو وہ لکھ لیتے ہیں اپنے پاس محفوظ رکھتے ہیں۔ مَغْرَم: تاوان کو کہتے ہیں۔ مُثْقَل: بوجھ میں ڈالا ہوا۔''یا آپ اِن سے کوئی اجر مانگتے ہیں، پھر وہ تاوان کی وجہ سے دبے ہوئے ہیں، یا اُن کے پاس غیب ہے جس کو وہ لکھتے ہیں۔''

کُفّار کی چال بازیوں کا وبال خود اُنہی پر

اَمْ يُرِيْدُوْنَ كَيْدًا: یا کوئی چال بازی کا ارادہ کیے ہوئے ہیں؟ کہ اس حق کے خلاف چال بازی کر کے حق کو مٹانا چاہتے ہیں، فَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا هُمُ الْمَكِيْدُوْنَ: اگر ایسی بات ہے جیسے کہ واقعہ ہے، تو پھر ان لوگوں کو سُن لینا چاہیے کہ جو لوگ کافر ہیں انہی کے خلاف چال کی گئی ہے، یعنی اپنی چال کے وبال میں وہی پھنسیں گے، چال بازیاں کر کے حق کو نہیں مٹا سکیں گے، بلکہ چال بازی کا وبال انہی پر پڑے گا، اَمْ لَهُمْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ: یا ان کے لئے کوئی اور اِلٰہ ہے؟ جو وقت پر ان کے کام آئے گا، سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ: اللہ پاک ہے ان کے شریک ٹھہرانے سے۔

''ضد'' لاعلاج مرض!

وَاِنْ يَّرَوْا كِسْفًا مِّنَ السَّمَآءِ سَاقِطًا يَّقُوْلُوْا سَحَابٌ مَّرْكُوْمٌ: اس کا تعلق بھی تسلی سے ہے، کہ ان لوگوں کو اگر آپ اِن کے کہنے

کے مطابق کوئی معجزہ دکھا بھی دیں گے، تو جب ارادہ نہ ماننے کا ہے تو پھر اس میں بھی اِسی قسم کی تاویل کرلیں گے، جیسے ان کا مطالبہ تھا اَوْ تُسْقِطَ السَّمَآءَ كَمَا زَعَمْتَ عَلَيْنَا كِسَفًا (سورۂ اسراء: ٩٢) کہ ہم پر آسمان کے ٹکڑے گرادے، تو اگر یہ آسمان کے ٹکڑے کو اپنے اُوپر گرتا ہوا دیکھیں گے بھی، اندریں حالات جس قسم کی ضد پہ یہ آئے ہوئے ہیں، باتیں بنانے پہ آئے ہوئے ہیں، ''اگر یہ دیکھیں گے آسمان کی طرف سے کسی ٹکڑے کو گرنے والا (کسفا مفرد ہے) کہیں گے یہ تو تہہ بہ تہہ بادل ہے'' یعنی اس کو دیکھ کے بھی یوں ہی کہیں گے کہ یہ تو بادل ہے تہہ بہ تہہ، اور جب عذاب کی گرفت میں آجائیں گے، فنا ہوجائیں گے، اس وقت ہی ان کی آنکھیں کھلیں گی، ورنہ یہ تاویل کرتے رہیں گے۔ ایسا ہی واقعہ آپ کے سامنے قومِ عاد کا آیا تھا کہ جب ان کے اُوپر عذاب آیا تو کہتے تھے هٰذَا عَارِضٌ مُّمْطِرُنَا (سورۂ احقاف: ٢٤) یہ تو بادل ہے جو ہم پر برسنے کے لئے آیا ہے، ہماری خوش حالی کی باعث ہوگا، تو ان کو جواب دیا گیا تھا کہ یہ بات تمہاری غلط ہے بَلْ هُوَ مَا اسْتَعْجَلْتُمْ بِهٖ، یہ تو وہی چیز ہے جس کو تم جلدی جلدی طلب کیا کرتے تھے، تو جب انسان ایک بات کے اُوپر اَڑ ہی جاتا ہے کہ نہیں ماننی، تو اس کی آنکھوں کے سامنے بھی کوئی حقیقت آتی ہے تو بھی اس میں کوئی نہ کوئی تاویل کر کے اپنے آپ کو دھوکا دے دیتا ہے۔

قیامت کے دِن کُفّار کا کوئی پُرسانِ حال نہیں ہوگا

تو جب یہ لوگ اس درجے کے ہیں تو آپ ان کو ہدایت پہ لانے کی کیا فکر میں پڑے ہوئے ہیں فَذَرْهُمْ: چھوڑیئے انہیں حَتّٰى يُلٰقُوْا يَوْمَهُمُ الَّذِيْ فِيْهِ يُصْعَقُوْنَ: حتیٰ کہ ملاقات کریں گے یہ اپنے اس دِن سے جس میں کہ ان کے ہوش اُڑ جائیں گے، جس میں یہ بے ہوش کردیے جائیں گے، اس سے قیامت کا دِن مراد ہے، نفخہ جس وقت ہوگا تو ان کے ہوش اُڑ جائیں گے، يَوْمَ لَا يُغْنِيْ عَنْهُمْ كَيْدُهُمْ شَيْئًا: جس دِن کہ نہیں کام آئے گی ان کے ان کی تدبیر کچھ بھی، دُنیا کے اندر جو یہ چال چل رہے ہیں، یہ چال ان کے کچھ بھی کام نہیں آئے گی۔ اَغْنٰى عَنْهُ کا ترجمہ کئی دفعہ آپ کے سامنے واضح کیا گیا، کام آنا، فائدہ پہنچانا، دُور ہٹانا۔ ''ان کا کید، ان کی چال ان کو کچھ بھی فائدہ نہیں پہنچائے گی'' وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ: نہ یہ مدد کیے جائیں گے، نہ یہ اپنی تدبیروں سے چھوٹ سکیں گے نہ کوئی دُوسرا ان کی مدد کے لئے آئے گا۔

دُنیا کی تکالیف کافر کے لئے عذابِ محض اور مؤمن کے لئے تجارت ہیں

وَاِنَّ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا عَذَابًا دُوْنَ ذٰلِكَ: اور اس قیامت والے عذاب سے پہلے بھی ظالموں کے لئے عذاب ہے، ''بے شک ان لوگوں کے لئے جو کہ ظالم ہیں عذاب ہے اس سے پہلے'' وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ: لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں، اس سے اشارہ ہے انہی عذابوں کی طرف جو دُنیا میں ان پر آئے، قحط میں مبتلا ہوئے، اور اس طرح سے مختلف جنگوں کے اندر مارے گئے۔ یہ سزائیں جو آیا کرتی ہیں یہ بھی دُنیا کے اندر ایک قسم کا نقد عذاب ہے، سورۂ الم تنزیل کے اندر جس طرح سے آیا تھا وَلَنُذِيْقَنَّهُمْ مِّنَ

الْعَذَابِ الْاَدْنٰى دُوْنَ الْعَذَابِ الْاَكْبَرِ، کہ ہم ان کو بڑے عذاب سے پہلے چھوٹے چھوٹے عذاب بھی چکھائیں گے، یہ چھوٹے چھوٹے عذاب یہی ہیں جو کافروں کے لئے دُنیا کے اندر مصیبتیں آتی ہیں، آفتیں آتی ہیں۔ اور یہ بات تو آپ کے سامنے واضح ہے ہی کہ یہ تکلیفیں اور آفتیں مسلمانوں کو بھی آیا کرتی ہیں، لیکن مسلمانوں کے لئے یہ عذاب نہیں، بلکہ ان کے لئے وہ نتیجۂ اللہ کی رحمت ہوتی ہیں، گناہ معاف ہوتے ہیں، اخلاق کی تہذیب حاصل ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کی اور مختلف حکمتیں ہوا کرتی ہیں، کہ ایمان والے پر دُنیا میں تکلیف آتی ہے تو آخرت میں اس کی اتنی جزا ملے گی کہ اس کے مقابلے وہ تکلیف تکلیف نہیں ہوگی، مثال آپ کے سامنے دی تھی اسی مضمون کو سمجھانے کے لئے کہ ایک کے گھر سے تو ایک من گندم چوری ہوگئی، اور ایک شخص گھر سے ایک من گندم اُٹھا کے کھیت میں بکھیر آیا، بظاہر تو دونوں کے گھر سے ایک من گندم گئی، لیکن ایک اس کو مصیبت سمجھ رہا ہے، عذاب سمجھ رہا ہے، دُوسرے کے لئے یہ نعمت ہے، وہ عذاب اس لیے سمجھ رہا ہے کہ اسے پتا ہے کہ وہ تو چلی گئی وہ واپس نہیں آئے گی اور بے کار گئی، اور جس نے جا کے کھیت میں بکھیر دی اسے پتا ہے کہ دُوسرے وقت میں یہ ایک من کے چالیس من بن کر آئے گی، تو مؤمنین کے لئے جو تکلیف دُنیا میں آیا کرتی ہے وہ تو ایک تجارت ہے، ''اضطراری تجارت'' جس کو آپ کہہ لیجئے، کہ جس طرح سے نیک اعمال کا بدلہ آخرت میں ملے گا اسی طرح سے اِن تکلیفوں کا معاوضہ بھی اللہ آخرت میں دیں گے، گناہ معاف ہوں گے، درجات بلند کریں گے، لیکن کافر کے لئے چونکہ آخرت کی نجات نہیں ہے، اس لئے دُنیا میں جو بھی تکلیف اس کو آتی ہے اس کے لئے وہ عذاب ہی عذاب ہے، ''بے شک اِن ظالموں کے لئے عذاب ہے، اس بڑے عذاب سے پہلے لیکن ان میں سے اکثر جانتے نہیں۔''

دُنیوی تکالیف کے لئے تیر بہدف نسخہ

وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ: اپنے رَبّ کے فیصلے کی انتظار میں صبر سے رہیے، صبر کیجئے، برداشت کرتے چلے جاؤ، ''صبر کیجئے اپنے رَبّ کے حکم کے انتظار میں'' فَاِنَّكَ بِاَعْيُنِنَا: بے شک آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں، آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اللہ کے حکم کا انتظار کیجئے، وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ: اور یہ ہمیشہ ایک حقیقت آپ کے سامنے واضح کی جاتی ہے کہ دِل کا غم دُور کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ کے ذِکر میں مشغولیت ایک تیر بہدف نسخہ ہے، کہ جب لوگوں کی طرف سے مخالفتیں ہوں، اس قسم کی باتیں سننے میں آئیں، دِل کو تکلیف پہنچے، صدمہ ہو، تو بس اللہ کے ذِکر کی طرف متوجہ ہوجایا کرو، اللہ کا ذِکر رُوحانی بشاشت کا باعث بھی بنتا ہے، دِل سے غم ہلکا کرنے کا باعث بھی بنتا ہے، تو ''آپ بھی اللہ کے حکم کی وجہ سے صبر کیجئے، یا: اللہ کے فیصلے کے انتظار میں صبر کیجئے، بے شک آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں، اور تسبیح بیان کیجئے اپنے رَبّ کی حمد کے ساتھ۔'' ''سبحان اللہ، والحمدللہ'' یہ اللہ کا ذِکر ہے، حِيْنَ تَقُوْمُ: جس وقت آپ اُٹھتے ہیں، یعنی جس وقت آپ سوئے ہوئے اُٹھتے ہیں تہجد کے وقت میں، یا جس وقت آپ مجلس سے اُٹھتے ہیں اس وقت اللہ کی تسبیح بیان کیجئے۔ یہاں بھی مفسرین نے اسی بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مجلس سے اُٹھتے وقت اللہ کی تسبیح تحمید کرنی چاہیے، تو اس مجلس کے اندر اگر کوئی کمی کوتاہی ہوجاتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی

تلافی فرمادیتے ہیں، وہی دونوں ذکر یہاں نقل کیے ہیں سُبْحٰنَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ ۚ وَسَلٰمٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ ۚ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ یہ پڑھا جائے، یا: ''سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ '' اس کو کفارۃ المجلس کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، اس مجلس کے اندر جو کمی کوتاہی ہو جائے اس کا کفارہ ہو جاتا ہے، ''جس وقت آپ اُٹھتے ہیں'' وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ: اور رات کے کچھ حصے میں بھی آپ اس کی تسبیح بیان کیجئے اور ستاروں کے پیٹھ پھیرنے کے بعد، جس وقت رات گزر جاتی ہے، طلوع فجر ہو جاتی ہے، ستارے غائب ہو جاتے ہیں، تو ایسے وقت میں بھی اللہ کی تسبیح بیان کیجئے، فجر کی نماز سے پہلے جو دو سنتیں پڑھی جاتی ہیں حدیث شریف میں آتا ہے کہ یہ بھی اِدبارِ نجوم کے وقت تسبیح کا مصداق ہیں،[1] اور باقی ذکر اذکار جو بھی کیا جائے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

***

(۱) ترمذی ۲/ ۱۳۳، کتاب التفسیر۔سورۃ الطور۔ مشکوۃ ۱/ ۱۰۵ باب السنن وفضائلها، فصل ثانی۔ ولفظ الحدیث: اِدْبَارَ النُّجُوْمِ الرَّكْعَتَانِ قَبْلَ الْفَجْرِ۔

سُورَةُ النَّجْمِ

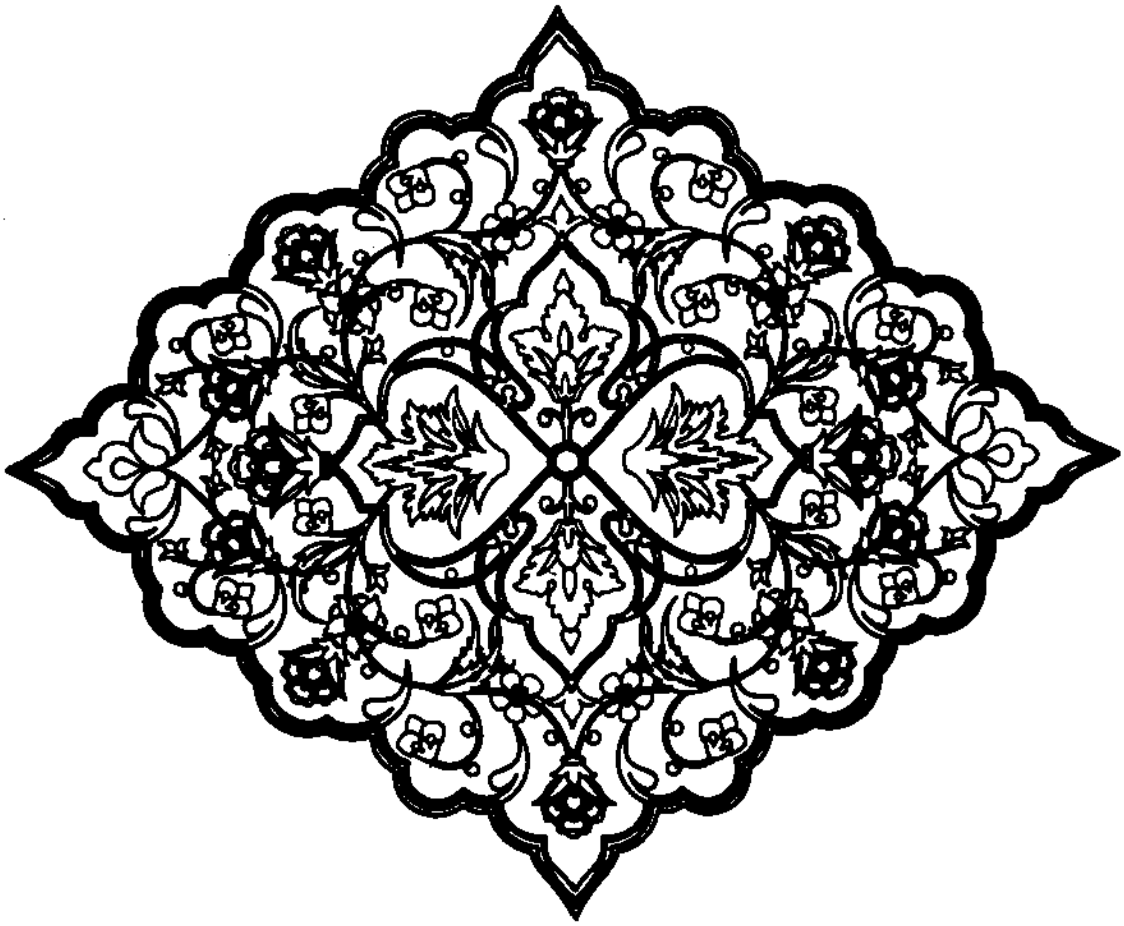

اٰيَاتُهَا ۶۲ ۵۳ سُوْرَةُ النَّجْمِ مَكِّيَّةٌ ۲۳ رُكُوْعَاتُهَا ۳

سورۂ نجم مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی باسٹھ آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى ۙ﴿۱﴾ مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى ۚ﴿۲﴾ وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۗ﴿۳﴾

قسم ہے ستارے کی جس وقت کہ وہ غائب ہو ﴿۱﴾ نہیں گمراہ ہوا تمہارا ساتھی اور نہ وہ بھٹکا ہے ﴿۲﴾ اور نہیں بولتا وہ خواہش نفس سے ﴿۳﴾

اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۙ﴿۴﴾ عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى ۙ﴿۵﴾ ذُوْ مِرَّةٍ ؕ فَاسْتَوٰى ۙ﴿۶﴾ وَهُوَ

نہیں ہے اس کا بولا ہوا مگر وحی جو کی جاتی ہے ﴿۴﴾ تعلیم دی اس کو سخت قوتوں والے نے ﴿۵﴾ جو انتہائی طاقتور ہے، پھر وہ دُرست ہوا ﴿۶﴾ اور وہ

بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى ؕ﴿۷﴾ ثُمَّ دَنَا فَتَدَلّٰى ۙ﴿۸﴾ فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى ۚ﴿۹﴾

اونچے کنارے میں تھا ﴿۷﴾ پھر قریب ہوا پھر اور قریب ہوا ﴿۸﴾ دونوں کے درمیان دُوری دو کمانوں کی مقدار تھی یا اس سے بھی قریب ﴿۹﴾

فَاَوْحٰۤى اِلٰى عَبْدِهٖ مَاۤ اَوْحٰى ؕ﴿۱۰﴾ مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى ﴿۱۱﴾ اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى

پھر وحی کی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف جو وحی کی ﴿۱۰﴾ نہیں غلطی کی دِل نے جو کچھ اس نے دیکھا ﴿۱۱﴾ کیا پھر تم اس سے جھگڑا کرتے ہو

مَا يَرٰى ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى ۙ﴿۱۳﴾ عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى ﴿۱۴﴾ عِنْدَهَا جَنَّةُ

اس چیز پر جو وہ دیکھتا ہے؟ ﴿۱۲﴾ البتہ تحقیق دیکھا اس نے اس کو دُوسری مرتبہ ﴿۱۳﴾ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس ﴿۱۴﴾ اس سدرۃ المنتہیٰ کے پاس

الْمَاْوٰى ؕ﴿۱۵﴾ اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى ۙ﴿۱۶﴾ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى ﴿۱۷﴾

رہنے کی جنت ہے ﴿۱۵﴾ جبکہ ڈھانپ لیا بیری کو جس چیز نے بھی ڈھانپا ﴿۱۶﴾ نہ نظر ٹیڑھی ہوئی اور نہ حد سے بڑھی ﴿۱۷﴾

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى ﴿۱۸﴾ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۙ﴿۱۹﴾ وَمَنٰوةَ

البتہ تحقیق دیکھا اس نے اپنے ربّ کی نشانیوں میں سے بڑی نشانیوں کو ﴿۱۸﴾ کیا پھر دیکھا تم نے لات کو اور عزّیٰ کو ﴿۱۹﴾ اور تیسرے

الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى ﴿۲۰﴾ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى ﴿۲۱﴾ تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى ﴿۲۲﴾ اِنْ

منات کو جو ان سے پیچھے ہے ﴿۲۰﴾ کیا تمہارے لئے لڑکے اور اللہ کے لئے لڑکیاں؟ ﴿۲۱﴾ تب تو یہ تقسیم بہت ہی ظالمانہ ہے ﴿۲۲﴾ نہیں ہیں

هِيَ اِلَّآ اَسْمَآءٌ سَمَّيْتُمُوْهَآ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنْ	
یہ مگر نام جو رکھ لئے تم نے اور تمہارے آباء نے، نہیں اُتاری اللہ نے ان کے متعلق کوئی دلیل، نہیں	
يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ ۚ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ	
پیروی کرتے یہ لوگ مگر بے دلیل خیال کی اور اس چیز کی جو ان کا دل چاہتا ہے، البتہ تحقیق ان کے پاس ان کے رب کی طرف سے	
الْهُدٰى ﴿۲۳﴾ اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى ﴿۲۴﴾ فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى ﴿۲۵﴾	
ہدایت آگئی ﴿۲۳﴾ کیا انسان کے لئے وہ چیز ہوتی ہے جس کی وہ خواہش کرلے؟ ﴿۲۴﴾ پس اللہ ہی کے لئے ہے آخرت اور دُنیا ﴿۲۵﴾	

تفسیر

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ نجم مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۶۲ آیتیں ہیں، ۳ رکوع ہیں۔ مضمون اس میں بھی پچھلی سورت کی طرح اُصولِ دین پر ہی مشتمل ہے، اور اِثباتِ آخرت، اِثباتِ معاد خصوصیت کے ساتھ کیا گیا ہے، اور مشرکینِ مکہ جو کہ آلہۂ باطلہ کی شفاعت پر زیادہ اِعتماد کیا کرتے تھے، تو اُس شفاعت کے عقیدے کی اِس میں تردید ہے، اور ردِّ شرک اور اِثباتِ رسالت یہ مضمون بھی اس میں آرہا ہے۔

خلاصۂ آیات

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى: قسم ہے ستارے کی جس وقت کہ وہ غائب ہو، هَوٰى يَهْوِيْ: گرنا، اور یہاں غروب ہونا مراد ہے، ''قسم ہے ستارے کی جس وقت کہ وہ گرے'' یعنی غائب ہو، مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى: نہیں گمراہ ہوا تمہارا ساتھی اور نہ وہ بھٹکا ہے، وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى: اور نہیں بولتا وہ خواہشِ نفس سے، ہوٰی سے خواہشِ نفس مراد ہے، اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى: هُوَ کی ضمیر منطوق کی طرف لوٹ رہی ہے جو مَا يَنْطِقُ سے معلوم ہورہا ہے، نہیں ہے اس کا بولا ہوا مگر وحی جو کی جاتی ہے، عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى: تعلیم دی اس کو سخت قوتوں والے نے، ذُوْ مِرَّةٍ: جو انتہائی طاقتور ہے، فَاسْتَوٰى: پھر وہ دُرست ہوا، وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى: اور وہ اُونچے کنارے میں تھا، ثُمَّ دَنَا: پھر قریب ہوا، فَتَدَلّٰى: پھر اور قریب لٹکا، تَدَلّٰى لٹکنے کو کہتے ہیں، ''پھر وہ قریب ہوا پھر اور زیادہ قریب ہوا'' تدلّی لٹکنے کو کہتے ہیں، پھر وہ اور لٹک آیا یعنی اور آگے کو جھکا، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ اَوْ اَدْنٰى: كَانَ کی ضمیر کا مرجع ہے بُعْدُ مَا بَيْنَهُمَا موقع محل سے جو بات سمجھ میں آرہی ہے، ''دونوں کے درمیان دوری دو کمانوں کی مقدار تھی یا اس سے بھی قریب'' فَاَوْحٰى اِلٰى عَبْدِهٖ مَا اَوْحٰى: پھر وحی کی اللہ تعالیٰ نے اپنے بندے کی طرف جو وحی کی، مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى: نہیں جھوٹ بولا دل نے اس چیز میں جو اس نے دیکھی، جو اس نے دیکھا اس میں اس نے غلطی نہیں کی، خلافِ واقع نہیں دیکھا جو کچھ دیکھا، ''نہیں غلطی کی دل نے جو اس نے دیکھا'' اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى: کیا پھر تم اس سے جھگڑا کرتے ہو اس چیز پر جو وہ دیکھتا ہے؟ وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى: البتہ تحقیق دیکھا اس نے

اُس کو دُوسری مرتبہ، عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى: سدرۃ منتہیٰ کے پاس، سدرہ بیری کو کہتے ہیں، منتہیٰ: انتہائی جگہ، آخری جگہ کی بیری، ''سدرۃ المنتہیٰ کے پاس دیکھا'' عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَاْوٰى: اس سدرۃ المنتہیٰ کے پاس رہنے کی جنت ہے، ماویٰ ٹھکانے کو کہتے ہیں، ٹھکانے کا باغ ہے، اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى: جبکہ ڈھانپ لیا بیری کو جس چیز نے بھی ڈھانپا، مَازَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى: زَاغَ زَيْغ: کج ہونا۔ طغیٰ: حد سے بڑھنا، ''نہ نظر ٹیڑھی ہوئی اور نہ حد سے بڑھی'' لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى: البتہ تحقیق دیکھا اس نے اپنے رب کی نشانیوں میں سے بڑی نشانیوں کو۔ الکبریٰ کا موصوف محذوف نکالیں گے، ''اپنے رب کی نشانیوں میں سے بڑی نشانیاں اس نے دیکھیں۔''

اِبتدائی آیات کا مقصد

ان اِبتدائی آیات میں سرورِ کائنات ﷺ کی رسالت کا اِثبات ہے، مشرکین آپ پر جو کہانت کا شبہ کرتے تھے اس کہانت کی یہاں تردید کی گئی ہے۔ کہانت کا مطلب یہ ہے کہ جاہلیت میں لوگ کچھ وظائف پڑھ کے جنات کے ساتھ مناسبت پیدا کر لیتے، اور پھر جنات کے ذریعے سے وہ کچھ خبریں معلوم کرتے اور لوگوں کو بتایا کرتے، جن میں سے کبھی کوئی خبر سچی بھی نکل آتی اور اکثر و بیشتر خبریں جھوٹی ہوتیں۔ تو مشرکینِ مکہ یہ کہتے تھے کہ یہ محمد ﷺ بھی کاہن ہیں، قرآنِ کریم میں کئی جگہ ان کے اس اِلزام کو ذکر کیا گیا اور اللہ تعالیٰ نے تردید کی کہ یہ بھی جنات کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں، کوئی جن ان کو تلقین کرتا ہے، اور یہ اس سے پوچھ پاچھ کے یہ باتیں آگے نقل کر دیتے ہیں، وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ۔ وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ (سورۂ حاقہ) اس قسم کے الفاظ قرآنِ کریم میں ذکر کیے گئے ہیں، شاعر ہونے کی تردید بھی کی گئی، کاہن ہونے کی تردید بھی کی گئی، تو یہاں حضور ﷺ کے علوم کے حاصل ہونے کا جو صحیح طریقہ ہے اس کو ذکر کیا جا رہا ہے اور کہانت کی تردید کی جا رہی ہے۔

''قسم'' اور ''جوابِ قسم'' میں مناسبت

وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى: پہلے یہ قسم ہے، نجم سے عام ستارہ مراد لیا جا سکتا ہے، اِذَا هَوٰى جب وہ غائب ہو، ''قسم ہے ستارے کی جس وقت کہ وہ غائب ہو، تمہارا صاحب نہ بھولا ہے نہ بھٹکا ہے۔'' قسم کی جواب قسم کے ساتھ کیا مناسبت؟ قرآنِ کریم میں ذکر کیا گیا وَبِالنَّجْمِ هُمْ يَهْتَدُوْنَ (سورۂ نحل: ۱۶) ستاروں کے ذریعے سے لوگ راستہ پاتے ہیں، تو نجوم جو اللہ تعالیٰ نے آسمان میں قائم کیے ہیں وہ لوگوں کے لئے راہنمائی کا باعث ہیں، اور یہ ستارے راہنمائی کا باعث تبھی بن سکتے ہیں کہ اگر وہ اپنی متعینہ رفتار پر رہیں اور ان کا طلوع غروب کسی ضابطے کا پابند ہو، اگر کبھی ستارہ کدھر سے طلوع ہو جائے کدھر کو غروب ہو جائے، اس کی رفتار کبھی کسی طرف کو ہو جائے کبھی کسی طرف کو ہو جائے، تو اس ستارے کو دیکھ کے کوئی شخص راہنمائی حاصل نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ نے نجوم کو اگر ہدایت کا باعث بنایا ہے تو ان کی رفتار بھی متعین کی ہے، اپنے وقت پر طلوع ہوتے ہیں، اپنے وقت پہ غروب ہوتے ہیں، اور ان کی جو حرکت ہے وہ بالکل منضبط ہے، وہ اپنے راستے سے کبھی ہٹتے نہیں، تو چونکہ وہ متعین راستے پر چلتے ہیں، متعین وقت پر طلوع ہوتے ہیں، متعین وقت پر غروب ہوتے ہیں، اس لیے ان کو دیکھ کے لوگوں نے بہت ساری راہنمائی حاصل کی کہ یہ ستارہ ادھر ہوگا تو ہمارا رُخ

اِدھر کو ہو جائے گا اور ہم وہاں پہنچ جائیں گے۔ آج بھی جو ہوائی سفر ہوتا ہے وہ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ ستارے کی وساطت سے ہی ہوتا ہے، اگرچہ مشین کے ذریعے سے انہوں نے ستارے کا رُخ متعین کر لیا، یا قطب نما کے ذریعے سے ہی سمندر میں، اور قطب نما کے ذریعے سے ہی فضا میں سفر ہوتے ہیں، وہ متعین کرتے ہیں کہ اگر قطب نما اتنے زاویے پہ ہوگا تو ہمارا رُخ اِدھر کو ہوگا اور ہم وہاں پہنچ جائیں گے، اگر قطب نما اس زاویے پہ ہوگا تو ہمارا رُخ ادھر ہوگا اور ہم فلاں جگہ پہنچ جائیں گے۔ آج بھی اهتداء جتنا بھی ہے وہ سارے کا سارا النجم کے ساتھ ہی ہے، جہاں نہ کوئی درخت ہوتا ہے نہ کوئی پہاڑ ہوتا ہے، کوئی چیز نظر ہی نہیں آتی، سمندر میں چاروں طرف پانی ہی پانی ہوتا ہے، کوئی علامت موجود نہیں، پُرانے زمانے میں لوگ باقاعدہ رات کو ستارے دیکھ کے اپنا رُخ متعین کرتے تھے، اور اسی طرح سے ریگستانوں میں سفر کرنے والے چٹیل میدانوں میں آنے جانے والے وہ بھی ستاروں کے ذریعے سے اپنے رُخ متعین کرتے تھے، آج اس ستارے کا رُخ متعین کرنے کے لئے ایک آلہ ایجاد کر لیا گیا، بہرحال اهتداء اس وقت بھی النجم کے ساتھ ہی ہے، اور یہ اهتداء تبھی ہو سکتا ہے کہ اگر ستارے کی جگہ متعین ہو، اس کا طلوع کسی ضابطے کے تحت ہو، غروب ایک ہی طریقے سے ہو، اس کی رفتار ایک ہی طریقے سے ہو، تب جا کے وہ رہنمائی کا باعث بن سکتا ہے، اگر وہ ستارہ خود بھٹکتا پھرے کہ کبھی کدھر کو ہو گیا، کبھی کدھر کو ہو گیا، تو اس کو دیکھ کے کوئی راستہ کس طرح سے معلوم کر سکتا ہے؟ اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ستارہ جس وقت غروب ہوتا ہے وہ گواہ ہے اس بات پر کہ تمہارا ساتھی نہ بھولا نہ بھٹکا، کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے اس ظاہری دُنیا کے اندر اهتداء کا باعث ستاروں کو بنایا تو ان کی رفتار منضبط ہے، وہ اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلتے ہیں، اِدھر اُدھر نہیں ہٹ سکتے، طلوع سے لے کر غروب تک ان کی حالت اس بات پہ شاہد ہے، اسی طرح سے انبیاء علیہم السلام بھی نجومِ ہدایت ہیں، جن کے ساتھ اهتداء سے رُوحانی سفر قطع ہوتا ہے، باطنی طور پر وہ ہدایت کا ذریعہ بنتے ہیں، تو اللہ نے جو بھی نبی بنایا اس کو ہدایت کا سبب بنایا، ہدایت کا ذریعہ بنایا، تو لازمی بات ہے کہ اس کی رفتار، اس کی گفتار، اس کا ہر عمل اللہ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہوگا، اگر نبی اپنے راستے سے بھٹک جائے یا راستہ بھول جائے یا غلط راستے کو صحیح راستہ سمجھ کے چلنے لگ جائے تو ایسی صورت میں باقی مخلوق کس طرح سے ہدایت حاصل کرے گی؟ جو نشانِ ہدایت ہے اگر وہی بھٹک گیا تو پھر باقی مخلوق کے لئے راستہ حاصل کرنے کا کیا طریقہ رہا؟ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ آسمان کے ستارے گواہ ہیں، طلوع سے لے کے غروب تک ان کا ایک طریقہ ہے، وہ اپنے اس حال کے ساتھ شہادت دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو بھی ہدایت کا ذریعہ بنایا کرتا ہے وہ اپنے منضبط راستے پہ چلتا ہے، اللہ کی ہدایت کے مطابق چلا کرتا ہے، وہ بھولا بھٹکا نہیں کرتا۔

''ضلالت'' اور ''غوایت'' میں فرق

اس طرح سے تمہارا ساتھی...... اصاحبکم سے محمد رسول اللہ ﷺ مراد ہیں، ان کو ''صاحب'' کے لفظ کے ساتھ اس لئے ذکر کیا کہ وہ ہر وقت ساتھ رہنے والے ہیں، ان کا کوئی حال تم سے مخفی نہیں، ماضی ان کی سامنے ہے، بچپن، جوانی تم نے دیکھی ہے......! یہ تمہارے ساتھ رہنے والا مَا ضَلَّ وَمَا غَوٰى، یہ دو لفظ بولے، ضلّ ضلالت سے ہے اور غوٰی غوایت سے ہے، دونوں کا

معنی ہی ہوتا ہے بھولنا اور بھٹکنا، دونوں کے درمیان میں فرق کرنے کے لئے یوں کہہ دیا جاتا ہے کہ ''ضل'' کا معنی تو یہ ہے کہ راستہ بھول گئے، حیران ہوئے کھڑے ہیں، معلوم نہیں راستہ کدھر ہے، اور ''غویٰ'' کا معنی ہوتا ہے کہ ایک غلط راستے کو صحیح راستہ سمجھ کے اس کے اُوپر چل پڑے، تو مطلب یہ ہوا کہ تمہارے یہ ساتھی، تمہارے ساتھ رہنے والے، نہ تو راستہ بھولے ہیں اور نہ بھٹک کے کسی غلط راستے پہ ہو گئے ہیں، بلکہ جس راستے پر یہ چل رہے ہیں یہی صراطِ مستقیم ہے، جیسے آسمان کے ستارے اپنے راستے سے نہیں ہٹتے اسی طرح سے تمہارا صاحب جو کہ تمہارے لئے نجم ہدایت بنایا گیا ہے، یہ بھی اپنے راستے سے ہٹ نہیں سکتا، وہ صراطِ مستقیم پہ قائم ہے، اِنَّكَ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (سورۂ زُخرف: ۴۳)...... اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ''ضل'' اور ''غویٰ'' میں یہ فرق بھی ہے کہ ضل ہو جائے گا کہ غلط فہمی سے انسان غلط راستہ اختیار کر لے، جیسے کوئی گناہ یا جرم کرتا ہے انسان، تو بھول چوک کے کر لیتا ہے، اور غویٰ ہو جائے گا کہ جانتا بوجھتا ہوا غلطی کرتا ہے، اور ما ضل وما غویٰ میں دونوں باتوں کی نفی کر دی کہ تمہارا صاحب تمہارے ساتھ رہنے والا نہ تو خطا اور نسیان کے طور پر کسی غلط راستے پہ چڑھ گیا، کوئی اس کا کردار یا گفتار نہ تو نسیان اور خطا کے طور پر غلط ہے، اور نہ یہ جان بوجھ کے کسی غلط راستے پہ ہوا، یعنی اس کے کردار کی گفتار کی ضمانت ہے کہ بالکل صحیح ہے، نہ غلط فہمی سے نہ جان بوجھ کر کبھی یہ غلط راستہ اختیار نہیں کرتے...... اور یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک کا تعلق عقیدے کے ساتھ ہے، ایک کا تعلق عمل کے ساتھ ہے، کہ نہ ان کے عقیدے اور نظریے میں کوئی کسی قسم کی گمراہی ہے نہ ان کے عمل کے اندر کسی قسم کی گمراہی ہے، ان کا ظاہری کردار اور ان کے باطنی احوال سب صحیح راستے پہ ہیں، نجم اس بات کے اوپر شاہد ہے کہ اللہ نے ان کو ہدایت کا ذریعہ بنایا تو ان کی رفتار کو منضبط کیا، وہ اپنے رستے سے ہٹتے نہیں، اسی طرح سے تمہارا ساتھی اللہ کا رسول ہے، جس کو دُنیا کے اندر نجمِ ہدایت بنایا گیا رُوحانی سفر طے کرنے کے لئے، ان کی بھی ہر لحاظ سے ضمانت ہے، کسی طور پر بھی یہ اپنے راستے سے ہٹنے والے نہیں، یہ جس راستے پہ چل رہے، یہی صحیح راستہ ہے، اس لئے ان کو دیکھ کر ہی صحیح سفر کیا جا سکتا ہے اور صحیح رُخ متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس طرح سے قسم کی جوابِ قسم کے ساتھ مناسبت واضح ہو جاتی ہے۔

''نبی'' کی ہر بات ''وحی'' ہونے کا مفہوم!

اب یہ ہے کہ ان کو جو علوم حاصل ہوتے ہیں ان کے علوم کے حاصل ہونے کا کیا ذریعہ ہے؟ کیا۔نعوذ باللہ۔ان کے اُوپر کوئی شیطان اُترتا ہے؟ کسی شیطان نے ان کو تلقین کی ہے؟ جس طرح سے کاہنوں پر شیطان آیا کرتے ہیں، ایسی بات نہیں ہے، ان کو تعلیم دینے والے اللہ تعالیٰ ہیں، اور جس واسطے سے ان کو تعلیم دی ہے، اس واسطے کے ساتھ ان کی ملاقات بھی ہے، اور وہ واسطہ نہایت قابلِ اعتماد ہے، اور ان کے ایک ایک لفظ کی صحت کی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضمانت ہے، جیسے کہ اگلے لفظوں میں کہا گیا کہ مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى: یہ تمہارا ساتھی کوئی بات خواہشِ نفس سے نہیں کہتا، کہ اللہ کی طرف سے اس کو رہنمائی نہ دی گئی ہو اور یہ اپنے دل کی خواہش کے مطابق کوئی بات کر دے، اس کی بات خواہشاتِ نفس سے ناشی ہو، ایسی بات نہیں، مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى: یہ

خواہشِ نفس سے نہیں بولتا، اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی: جو کچھ یہ بولتا ہے، (ھُوَ ضمیر منطوق کی طرف چلی گئی، اس کا منطوق، اس کی بولی ہوئی بات) ''نہیں ہے اس کی بولی ہوئی بات مگر وحی جو کی جاتی ہے'' اس کی ہر بولی ہوئی بات وحی ہے جو اللہ کی طرف سے اس کو پہنچائی جاتی ہے، یہ خواہشِ نفس سے نہیں بولتا، ''ہر بات وحی ہے'' ایک تو اس کا یہ مطلب ہے کہ یہ قرآنِ کریم کے عنوان سے جو کچھ بیان کرتے ہیں ایک ایک لفظ وحی شدہ ہے، اس میں اس کی خواہشِ نفس کا کوئی دخل نہیں کہ جو جی میں آیا کہہ لیا بنا لیا، ایسی بات نہیں! ایک ایک لفظ جو اس کے منہ سے نکلتا ہے، سب اللہ کی طرف سے وحی شدہ ہے، قرآنِ کریم کے بارے میں بھی یہ بات صحیح ہے۔ اور اگر اس کو عموم پہ محمول کیا جائے کہ جو کچھ یہ کہتے ہیں یعنی دِین کے انداز میں، دِینی تعلیم کے لئے، ہادی ہونے کی حیثیت میں، رسول ہونے کی حیثیت سے جو کچھ کہتے ہیں سب اللہ کی طرف سے وحی ہے، چاہے الفاظ کی بھی وحی ہو اور ''وحیٔ متلو'' ہو جو ہمارے سامنے قرآنِ کریم کی شکل میں آ گیا، چاہے معانی کی وحی ہو کہ اللہ تعالیٰ قلب کے اندر کوئی بات ڈال دیں، حضور ﷺ اس کو اپنے الفاظ کے ساتھ بیان کریں، جس کو ہم ''حدیث'' کہتے ہیں، حدیث شریف میں جو کچھ سرورِ کائنات ﷺ بیان کرتے ہیں سب اللہ کی جانب سے ہے، لیکن فرق یہ ہو گیا کہ وہ ''وحیٔ متلو'' نہیں ''وحیٔ خفی'' ہے، ''غیر متلو'' ہے، جس کی تلاوت نہیں کی جاتی، اس کے الفاظ اللہ کی جانب سے نہیں ہوتے، معانی اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ دِل میں ایک بات ڈالتے ہیں اور وہ بات حضور ﷺ اپنے الفاظ میں ادا کرتے ہیں اس کو ہم ''حدیث'' کہتے ہیں۔ اور پھر کبھی ایسا بھی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے متعین طور پر جزئی بات جو ہے وہی تفصیل سے بتا دی جاتی ہے، اس میں تو پھر نہ کوئی تاویل کی گنجائش، نہ خطا کی، نہ نسیان کی، کچھ بھی نہیں۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے ایک کلیہ وحی کر دیا گیا اور اس میں سے جزئیات مستنبط کیے جاتے ہیں، جس کو ''اجتہاد'' کہا جاتا ہے، تو ایسا بھی ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کو ایک کلیہ بتا دیا گیا اور اس کی جزئیات آپ اس سے اِجتہاد اور اِستنباط کے ساتھ نکالتے ہیں، چنانچہ جن اُمور میں آپ کو وحی کا انتظار ہوتا تھا اور وحی نہیں آتی تھی تو ایسے وقت میں آپ اِجتہاد بھی فرماتے تھے، لیکن نبی اور غیر نبی کے اِجتہاد میں یہ فرق ہے کہ نبی اِجتہاد کے ساتھ جو بات بیان کرے گا اس کی نسبت اللہ کی وحی کی طرف ہی ہو گی، اگرچہ صراحتاً وہ بات اللہ کی طرف سے بطورِ وحی کے نہیں آئی، اس لیے اس میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کبھی اس میں خطا یا لغزش ہو جائے، لیکن نبی کے لئے یہ ضمانت ہے اللہ کی طرف سے، کہ اس کو خطا پر برقرار نہیں رکھا جاتا، اس لیے کبھی آپ نے کوئی بات دِینی جذبے کے تحت کہہ دی یا کوئی کام کر لیا کسی اچھے جذبے کے تحت، لیکن اس میں ایک انسان ہونے کی حیثیت سے کسی پہلو کے مخفی رہنے کی بنا پر خلافِ مصلحت کوئی بات ہو گئی یا خلافِ مصلحت کوئی کام صادر ہو گیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فوراً متنبہ کر دیا گیا، نبی کو غلط اِجتہاد کے اُوپر برقرار نہیں رکھا جاتا، اور باقی مجتہدین بھی اللہ کی بات ہی کہتے ہیں، وہ بات بھی وحی سے اِستنباط ہوتا ہے، لیکن اس میں لغزش سے حفاظت کی ضمانت نہیں ہے، اس لیے مجتہد خطا بھی کر سکتا ہے، مجتہد کی بات دُرست بھی ہو سکتی ہے، لیکن جب اس کا اِستناد وحی کی طرف ہو گا، خواہشِ نفس کا اس میں دخل نہیں، خلوص کے ساتھ وہ جو بات قرآنِ کریم سے سمجھتے ہیں وہی آگے کہتے ہیں، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ان کی اس جد و جہد کے اُوپر ثواب یقیناً ملتا ہے، اگر وہ دُرست بات کہیں تو دوگنا ثواب، اور اگر کبھی وہ لغزش بھی کھا جائیں تو ان کی کوشش کا ثواب پھر بھی

اللہ نہیں دیتے ہیں، محروم نہیں رکھتے۔ عام مجتہد اور نبی میں فرق یہ ہوا کرتا ہے کہ مجتہد کے اِجتہاد کے صحیح ہونے کی ضمانت نہیں، اُس میں خطا کا اِحتمال ہے، اور نبی اگر اِجتہاد کرے اور بالفرض! خطا ہو بھی جائے تو اس کو اس کے اُوپر برقرار نہیں رکھا جاتا، اس غلطی اور لغزش کو فوراً نمایاں کر دیا جاتا ہے تاکہ نبی کا کردار اور نبی کی گفتار، کہی ہوئی بات، کیا ہوا عمل، سب ہر لحاظ سے صحیح ہو، اور اس میں کسی قسم کی خرابی کا اِمکان نہ ہو، تو اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى کے اندر عموم لینے کے بعد پھر یہ تقریر کرنی پڑے گی کہ جو کچھ کہتے ہیں وحی سے کہتے ہیں، چاہے الفاظ وحی ہوئے ہوئے ہوں، چاہے معانی وحی ہوں، چاہے اُصول کلیہ وحی ہوں، بہرحال اس بات کی ضمانت ہے کہ اس میں خواہشِ نفس کا کوئی دخل نہیں، کہ اپنے مطلب کے لئے یا اپنی غرض کے لئے کوئی حکم دے دیں، ایسی بات نہیں، جو ہوگا اس کی نسبت اللہ کی وحی کی طرف ہے، تو یہ گفتار کی پوری طرح سے ضمانت دے دی گئی کہ جو بولتے ہیں سب اللہ کی جانب سے سمجھو۔

گفتۂ او گفتۂ اللہ بود   گرچہ از حلقوم عبداللہ بود

اس کی کہی ہوئی بات جو بھی ہے وہ اللہ کی کہی ہوئی ہوتی ہے، اگرچہ بظاہر اللہ کے بندے کے گلے سے نکل رہی ہے۔

کلامِ اِلٰہی کو لانے والے واسطوں کی توثیق

اب آگے آ گیا کہ ان کے لئے اِن علوم کے حاصل ہونے کا ذریعہ کیا ہے؟ اللہ کی طرف سے وحی آتی ہے تو کس ذریعے سے آتی ہے، یہ اپنی بات کو جو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں تو ان کو وہ بات کس طرح سے حاصل ہوتی ہے، یہاں واسطہ ہیں درمیان کے اندر جبریل علیہ السلام، تو آپ جانتے ہیں کہ روایت کا یہ اُصول ہے کہ راوی اپنے مروی عنہ کی خبر دے کہ میں نے یہ بات کہاں سے لی ہے، جیسے محدثین بحث کیا کرتے ہیں، تو واسطہ جو درمیان میں آیا جس کو ہم "مروی عنہ" کہتے ہیں، اس کے ساتھ ملاقات، یعنی راوی اور مروی عنہ کی ملاقات ثابت ہونی چاہیے، تب جا کے اس بات پہ اِعتماد کیا جا سکتا ہے۔ محدثین جب روایت پہ بحث کیا کرتے ہیں تو اُصول یہی ہے کہ یہ شخص اپنے اُستاذ کا جو نام لیتا ہے کہ میں نے یہ روایت فلاں سے لی، تو کیا ان دونوں کی آپس میں ملاقات ہے؟ اور پھر ملاقات ہونے کے ساتھ ساتھ اَحوالِ رُواۃ پر بحث کی جاتی ہے کہ یہ جو راوی ہے اس کا اپنا حال کیسا ہے؟ اس میں صدق غالب ہے یا اس میں کذب کا اِحتمال ہے؟ اس کے حالات کیسے ہیں؟ ثقہ ہے یا نہیں؟ اگر رُواۃ کا آپس میں اِتصال بھی ثابت ہو جائے اور اِتصال ثابت ہونے کے ساتھ ساتھ اَحوالِ رُواۃ بھی قابلِ اعتماد ہوں اور وہ ثقہ بھی ثابت ہو جائیں، تو اس خبر کو کہتے ہیں کہ یہ خبر صحیح ہے۔ دُنیا کے اندر آپس میں اپنی خبروں کے صحیح اور غلط کی پہچاننے کا یہی طریقہ ہے، آپ جس کی طرف سے بات نقل کرتے ہیں کیا آپ اس سے ملے بھی ہیں؟ اور جس کی طرف سے آپ بات نقل کر رہے ہیں کیا وہ قابلِ اعتماد بھی ہے؟ یہی طریقہ ہوا کرتا ہے کسی خبر کے صدق کو جانچنے کا! تو اللہ تعالیٰ نے اپنی اس کلام کو جو حضور صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچایا، یہ کلام چلی اللہ تعالیٰ سے، تو اصل کے اعتبار سے خبر کا مدار تو اللہ پہ ہے، اور اِدھر آپ کے سامنے نقل کر رہے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اللہ کے درمیان میں واسطہ ہیں جبرئیل علیہ السلام، تو اِنسانوں کے درمیان اور اللہ کے درمیان دو واسطے ہیں، ایک حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور دُوسرے جبریل علیہ السلام، اب اِن کی آپس میں ملاقات اور ان کے آپس میں حالات کی تحقیق......! اگر ثابت ہو جائے کہ دونوں ہی اپنی جگہ سچے

ہیں اور دونوں کی آپس میں ملاقات ہے تو آپ جانتے ہیں کہ پھر دُنیوی اُصول کے اعتبار سے بھی اس خبر کے اُوپر شک شبہ کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی، تو اللہ تعالیٰ نے یہ توثیقِ رُواۃ یہاں بھی کی ہے، اور اسی طرح سے آگے آئے گی سورۃ اذا الشمس کورت اس کے اندر بھی دونوں کا ذکر کیا، جبریل علیہ السلام کا بھی اور حضور ﷺ کا بھی، اس سورۃ میں زیادہ تر جبریل علیہ السلام کا ذکر ہے اور وہاں دونوں کا ذکر ہے، دونوں کی صفات بیان کی ہیں کہ دونوں کی صفات اس قسم کی ہیں کہ جس قسم کے انسان کی بات کو کسی صورت میں بھی جھوٹا نہیں کہا جاسکتا، تو سند کی تحقیق یوں سمجھئے کہ یہاں ہوگئی، اللہ کی کلام جس انداز سے آرہی ہے، تو راویوں کی تحقیق کردی گئی کہ راوی بالکل صحیح ہیں، اللہ تعالیٰ بھیجنے والے ہیں، جن واسطوں کے ساتھ آئی ہے وہ واسطے قابلِ اعتماد ہیں، پھر تمہاری بدبختی ہے کہ تم اس بات کو قبول نہ کرو۔

جبریل علیہ السلام کی قوت اور ثقاہت

عَلَّمَهٗ شَدِيْدُ الْقُوٰى: قویٰ قوۃ کی جمع ہے، سخت قوتوں والا، مراد اس سے جبریل ہیں، ''تعلیم دی اس صَاحِبُكُمْ کو،'' ''ہٗ'' ضمیر صَاحِبُكُمْ کی طرف لوٹ رہی ہے یعنی تمہارے ساتھی کو، محمد رسول اللہ ﷺ کو،'' سکھایا اس کو سخت قوتوں والے نے'' ذُوْ مِرَّةٍ: جو انتہائی طاقتور ہے، مِرۃ بھی قوت کو کہتے ہیں، یہ دو لفظ بولے: شدید القویٰ اور ذو مرۃ، جس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا کہ اس کلام کو لانے والے اور آپ کے لئے تعلیم کا واسطہ بننے والے ظاہری طور پر بھی قوی ہیں، ان کی ظاہری قوت اور طاقت بھی ایسی ہے کہ جس کا مقابلہ نہیں کیا جاسکتا، اس لیے اس میں یہ کوئی احتمال نہیں کہ کوئی ان کو مرعوب کرکے بات تبدیل کروالے، یا کوئی مرعوب کرکے ان کو بدحواس کردے جس سے یہ بات صحیح نہ سمجھیں یا صحیح اُدا نہ کرسکیں، تو ظاہری قوت میں بھی ان کا کوئی مقابلہ نہیں ہے، اور باطنی صلاحیتیں بھی ان کی انتہائی قوی ہیں، اس لئے کوئی ان کو دھوکا نہیں دے سکتا، وہ کسی کے دھوکے میں نہیں آسکتے، کہیں وہ بہکتے نہیں، کہیں اس کو خریدا نہیں جاسکتا کہ اپنی بات کو تبدیل کرکے کچھ اور بنادے، آخر کسی انسان کے بہکنے کی اور پھسلنے کی یہی وجوہ ہوا کرتی ہیں، کمزور آدمی ہے، دوسرے نے دھمکا دیا کہ دیکھو! یوں نہیں کہنا، یوں کہنا ہے، اور وہ خوف زدہ ہوکے خلافِ حقیقت بات کہہ دے۔ اور کبھی ہوتی ہے باطنی کمزوری کہ جس کی بنیاد پر وہ لالچ میں آجاتا ہے، یا کسی کے دھوکے میں آجاتا ہے، کوئی دُوسرا آدمی سچ کو جھوٹ بناکے اس کے سامنے ثابت کردیتا ہے۔ اور اگر ظاہری طور پر بھی ایک آدمی قوت والا ہے کہ کسی سے مرعوب نہیں ہوتا، کوئی اس کے اُوپر اثر نہیں ڈال سکتا، باطنی طور پر بھی پوری صلاحیتوں والا ہے کہ وہ کسی کے دھوکے میں نہیں آتا، کوئی اس کو خرید نہیں سکتا، لالچ کے ساتھ اس کو بہکا نہیں سکتا، تو اس راوی کے ثقہ ہونے میں پھر کیا شبہ رہ گیا؟ یہاں یہ دو باتیں اس طرح سے آگئیں، گویا کہ اس تعلیم میں جو واسطہ ہیں وہ شدید القویٰ ہیں اور ذو مرۃ ہیں، ظاہری قوتیں بھی ان کی انتہائی درجے کی سخت ہیں اور باطنی طور پر بھی انتہائی طاقتور ہیں۔

جبریل علیہ السلام سے اصلی صورت میں پہلی ملاقات

فَاسْتَوٰى: پھر وہ دُرست ہوکے بیٹھا، مستوی ہوا، قرار پکڑا اس نے، وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى: اس حال میں کہ وہ اُونچے

کنارے پر تھا۔ یہ حضور ﷺ کے ساتھ ملاقات ہے جبریل کی اس کی اصلی حالت میں، اِبتدائے وحی کے اندر جس طرح سے ہوئی تھی، حدیث شریف میں آتا ہے حضور ﷺ نے ایک دفعہ جبریل علیہ السلام کو اس کی اصلی حالت میں دیکھا ہے، اِبتدا اِبتدا میں، پہلی وحی غارِ حراء میں آئی تھی اور اس کے بعد تین سال وقفہ ہوگیا تھا، اس وقفے کے دوران میں یہ ملاقات جبریل سے ہوئی، ''اُفقِ اَعلیٰ'' سے مراد ہے اُونچا کنارہ، کیونکہ بالکل آسمان کے آخری کنارے پر ہوں تو دیکھنے میں دِقت پیش آتی ہے، اُونچے کنارے پر دیکھا اور ان کو اَصلی حالت میں دیکھا، حدیث میں ہے کہ ان کا اتنا بڑا وجود تھا کہ اس کے چھ سو پر تھے اور اس نے سارے کنارے کو بھر رکھا تھا،[1] چونکہ پہلی دفعہ جبریل علیہ السلام کو اصلی حالت میں دیکھا تھا تو سرورِ کائنات ﷺ پر ہیبت طاری ہو کر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی تھی، پھر جب آپ ﷺ نے ہوش سنبھالا، ہوش آیا، تو اس کے بعد پھر وہ وحی آئی یٰۤاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۙ قُمْ فَاَنْذِرْ، سورۃ مدثر کی اِبتدائی آیات۔[2] تو مروی عنہ کے ساتھ ملاقات بھی ہوگئی، اور اصلی شکل میں ہوگئی، جس کے بعد پہچان لیا گیا، پہچان کر اس کے بعد جب بھی جبریل آئیں گے تو دِل کو اِطمینان ہوگا کہ یہ اللہ کی طرف سے بھیجا ہوا فرشتہ ہے اور اللہ کی کلام لا رہا ہے۔ تو یہ ''اُفقِ اَعلیٰ'' پر نظر آئے، فَاسْتَوٰى: اس نے قرار پکڑا اور وہ اُونچے کنارے پر تھا۔

جبریل علیہ السلام نے پوری توجہ کے ساتھ وحی پہنچائی

ثُمَّ دَنَا: پھر وہ شدید القویٰ، ذو مرۃ یعنی یہ فرشتہ، جبریل، ''پھر یہ قریب آیا'' فَتَدَلّٰى: پھر لٹکا، لٹکنے سے مراد یہ ہے کہ جس طرح سے ایک اُستاذ شاگرد کی طرف آگے بڑھتا ہے، اور اس کی طرف جھکاؤ اختیار کر کے اس کو اچھی طرح سے بات سمجھاتا ہے، یہ نہیں جس طرح سے کاہنوں کے قصے میں آیا خَطِفَ الْخَطْفَةَ (سورۂ صافات:۱۰) شیطان نے چلتے چلتے کہیں سے بات اُچک لی، اور چلتے چلتے وہ اپنے کاہن کے کان میں کہہ گیا، تو اس کو بھی سمجھنے میں غلطی لگ سکتی ہے، اور جس کو پہنچائی جا رہی ہے اس کو بھی سمجھنے میں غلطی لگ سکتی ہے، پھر وہ چونکہ کاروباری لوگ ہوتے ہیں اِنتہائی درجے کے حریص، اور دُنیا کمانے والے، جنّات کے ساتھ مناسبت پیدا کرنے کے لئے اِنتہائی درجے کے گندے، تو پھر وہ اس کو اپنا کاروبار بنانے کی بنا پر پیسے لیے بغیر کسی کو بتاتے نہیں، اور اس کے اندر کئی جھوٹ ملاتے ہیں تا کہ لوگوں کو متاثر کر سکیں، جیسے سورۂ تکویر میں ذِکر کیا جائے گا وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ: کہ یہ رسول تو ایسا ہے جو غیب کی بات بتانے میں کوئی بخیل نہیں، اور کاہن اس وقت تک بتاتا نہیں جب تک کہ فیس نہ لے لے۔ یہ حالات میں فرق کیا جا رہا ہے کہ ان کی تعلیم بہت صحیح طریقے سے ہوئی، اُستاذ اور شاگرد میں، ہم اپنی اصطلاح میں کہیں گے، ''راوی'' اور ''مروی عنہ'' میں یا ''اُستاذ'' اور ''شاگرد'' میں اِنتہائی قُرب، اور قُرب کے بعد اُستاذ کا شاگرد کی طرف جس طرح سے میلان ہوتا ہے اس قسم کا میلان، یوں صحیح طریقے کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بات جبریل علیہ السلام نے حضور ﷺ کو پہنچائی۔

(۱) ترمذی ۲/ ۱۶۳، کتاب التفسیر، سورۃ النجم۔ نوٹ: یہ حضرت ابن مسعودؓ کا قول ہے۔

(۲) أَجْنِحَتُهُ عَلٰى هَوْنِهٖ إِلَى الْأَرْضِ. (بخاری ۱/ ۴۵۹ باب ذکر الملائکۃ کا آخر۔ مشکوۃ ۲/ ۵۲۲ باب المبعث فصل اول)

حضور ﷺ اور جبریل علیہ السلام کا قُرب واِتصال

ثُمَّ دَنَا: پھر قریب ہوئے، فَتَدَلّٰى: پھر اور قریب ہوئے، لٹکے، آگے بڑھے، فَكَانَ قَابَ قَوْسَيْنِ أَوْ أَدْنٰى: کان کی ضمیر بُعْدُ مَا بَيْنَهُمَا کی طرف لوٹ جائے گی جو موقع محل سے سمجھ میں آ رہا ہے،"دونوں کے درمیان میں فاصلہ دو کمانوں کی مقدار تھا یا اس سے بھی قریب" یہ بات محاورۃً ہے، ہمارے ہاں اِس وقت مروّج ہے کہ جس وقت ہم ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو آپس میں ہاتھ ملاتے ہیں، مصافحہ کرنا اور ہاتھ ملانا یہ دونوں کے آپس میں قُرب اور اِتصال کی علامت ہوتی ہے، اور جب کوئی آپس میں وفا کا عہد کیا جاتا ہے تب بھی عُرف کے اندر ہاتھ ملانے کا رواج ہے، جب کسی کے ساتھ ہاتھ میں ملا لیا جائے تو گویا کہ اس سے دوستی لگ گئی اور اس سے ایک معاہدہ ہو گیا اور قول اِقرار ہو گیا، دونوں نے ہاتھ ملا لیا۔ عرب کے اندر رواج تھا کہ جس وقت آپس میں وہ کوئی معاہدہ کرتے تھے یا آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ قُرب اور اِتصال اِختیار کرتے تو ہر شخص اپنی اپنی کمان اپنے ہاتھ میں پکڑتا......! کمان آپ جانتے ہیں کہ یوں ٹیڑھی ہوا کرتی ہے، اور یہاں (درمیان میں) اس کے دستہ لگا ہوا کرتا ہے، یہاں (دستے) سے پکڑ لیا، اور اس کے دونوں کناروں کے درمیان میں تندی لگی ہوئی ہوتی ہے، تو دستے سے لے کے تندی تک کا فاصلہ "قاب" کہلاتا ہے، اور اِدھر سے وہ شخص، اس کے ہاتھ میں بھی کمان ہوتی، تو دونوں اپنی کمانوں کو یوں کر کے ملا دیتے تو یہ ایک دوستی کا معاہدہ ہو جاتا اور قُرب واِتصال قائم ہو جاتا، جس طرح سے ہاتھ ملانا قُرب واِتصال کا ذریعہ ہے، اسی طرح سے دونوں کمانوں کو یوں کر کے جب ملا دیتے تو یہ بھی قُرب واِتصال کی ایک علامت ہوتی تھی، تو اُس کے ہاتھ میں اپنی کمان، اِس کے ہاتھ میں اپنی کمان، تو قوسین کی مقدار درمیان کے اندر فاصلہ ہو گیا، یہ کسی کے ساتھ ملنے اور اس کے ساتھ قرب واتصال قائم کرنے کے لئے ایک طریقہ تھا اُس زمانے میں......! أَوْ أَدْنٰى: بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب، یہ باطنی مناسبت کی طرف اشارہ ہے کہ بسا اوقات ظاہری طور پر تو انسان قریب ہو جاتا ہے لیکن باطنی مناسبت نہیں ہوتی، یہاں چونکہ رسول اللہ ﷺ کو جبریل علیہ السلام کے ساتھ باطنی مناسبت تام تھی تو یوں سمجھو کہ اس ظاہری اِتصال کے اندر قوت اور شدّت جو پیدا ہوئی تو اس کو ادنیٰ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا ہے،"دونوں کے درمیان فاصلہ دو کمانوں کی مقدار تھا بلکہ اس سے بھی زیادہ قریب، (یاء کے ساتھ بھی ترجمہ کر سکتے ہیں) یا اس سے بھی زیادہ قریب" مطلب یہ کہ اس سے زیادہ دُور نہیں تھا، اتنا قریب آنے کے بعد اس نے پھر اللہ تعالیٰ کی بات اللہ کے بندے تک پہنچائی فَأَوْحٰى إِلٰى عَبْدِهٖ مَا أَوْحٰى: پھر وحی کی اللہ نے اپنے بندے کی طرف جو وحی کی، یعنی اِس فرشتے کی وساطت سے۔

حضور ﷺ کے مشاہدے کی توثیق

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَاٰى: اب یہ حضور ﷺ کے احساس اور مشاہدے کی توثیق ہے کہ اِس رسول نے جو کچھ دیکھا دل نے اس دیکھنے میں کوئی غلطی نہیں کی، یعنی یہ محض دل کی خیال آرائی اور دل کا توہم یا اس قسم کی چیز نہیں تھی، جیسے عام طور پر اِنسان دل کے اندر کوئی خیال پکا لیتا ہے اور وہی توہم کے طور پر چیز سامنے نظر آنے لگ جایا کرتی ہے، ایسی بات نہیں۔"جو کچھ اس بندے نے دیکھا اس دیکھنے میں دل نے کوئی غلطی نہیں کی، یا، دل نے جو کچھ دیکھا اس میں کوئی غلطی نہیں کی" دیکھنے کی نسبت دل کی طرف بھی

ہو سکتی ہے کیونکہ اصل اِدراک کرنے والا تو قلب ہی ہے، یعنی جو دیکھا جو سمجھا بالکل صحیح سمجھا، اور ان کا مشاہدہ اور ان کا احساس بالکل ٹھیک تھا، اور اُس میں کوئی کسی قسم کی غلطی نہیں تھی۔

دیکھنے والے پر اِعتماد کرنا دُنیا کا مسلّمہ اُصول ہے

اَفَتُمٰرُوْنَهٗ عَلٰى مَا يَرٰى: یہ مشرکین کو تنبیہ کی جارہی ہے کہ جو کچھ یہ بندہ دیکھتا ہے، جو کچھ یہ تمہارا ساتھی دیکھتا ہے، اس کا مشاہدہ ہے، اس کا اِدراک بالکل صحیح ہے، تو تم اس کے ساتھ ان باتوں میں جھگڑا کرتے ہو جو یہ آنکھوں سے دیکھتا ہے؟ یعنی اگر تمہیں کچھ نظر نہیں آتا تو جو دیکھ رہا ہے تم اس کے ساتھ جھگڑے کیوں کر رہے ہو؟ ایک چیز ہے ایک انسان کو نظر آرہی ہے، دُوسرے کو نہیں آرہی، دیکھنے والے کے جب حالات بالکل صحیح ہیں، قابلِ اعتماد ہے، تو اس کے دیکھنے پہ اِعتماد کرو، جیسے کہا کرتے ہیں کہ اگر چاند تمہیں نظر نہیں آتا اور دُوسرے آدمی کو نظر آ گیا، تو دُنیا کا طریقہ یہ ہے کہ دیکھنے والے پر اِعتماد کر کے قول کرو کہ ہاں! واقعی چاند موجود ہے، آج کتنی چیزیں ہیں جن کو ہم بن دیکھے مانتے ہیں صرف دوسرے پر اعتماد کر کے، آج ہماری زندگی میں بھی بے شمار چیزیں ایسی ہیں کہ جن کو ہم مانتے ہیں اور بغیر دیکھے مانتے ہیں، کہنے والے کے اعتماد پہ مانتے ہیں، طبیب ایک بیماری دیکھتا ہے، ڈاکٹر ایک بیماری دیکھتا ہے، کہتا ہے کہ یہ فلاں بیماری کے جراثیم ہیں، وہ آپ کا خون ٹیسٹ کرتا ہے، پیشاب ٹیسٹ کرتا ہے، اس میں شوگر بتاتا ہے، اس میں دوسرے جراثیم بتاتا ہے، کہ اس میں کینسر کے جراثیم ہیں، تپ دق کے جراثیم ہیں، تو آپ سب لوگ اعتماد کرتے ہیں، آپ سمجھتے ہیں کہ اس کا یہ فن ہے، اس کو یہ مہارت حاصل ہے، وہ دیکھ سکتا ہے، ہم نہیں دیکھتے، آپ کبھی بھی یہ خیال نہیں کرتے کہ جس وقت تک ہم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں ہم نہیں مانتے، اور سائنس دانوں کی تحقیقات آج جتنی ہیں، چاند کے بارے میں وہ اپنے مشاہدے بیان کرتے ہیں، کسی دوسری چیز کے بارے میں بیان کرتے ہیں، تو کیا دُنیا کا دستور یہی ہے کہ جب تک نہ دیکھو نہ مانو؟ نہیں! دُنیا کا تو نظام چلتا ہی اعتماد پر ہے کہ دیکھنے والا اگر قابلِ اعتماد ہے، تو اگر وہ کوئی بات کہتا ہے جو تم نہیں دیکھ رہے تو مان لو، اس میں جھگڑے کی کون سی بات ہے، اسی طرح سے یہ رسول یہ تمہارا صاحب تو سب کچھ دیکھتا ہے، اور تم اس کی دیکھی بھالی ہوئی چیزوں میں اس کے ساتھ جھگڑے کر رہے ہو؟ قابلِ غور بات تو یہ ہے کہ جو بات تمہارے سامنے آرہی ہے اس کو نقل کرنے والا قابلِ اعتماد ہے یا نہیں؟ جب قابلِ اعتماد ہے تو تمہیں نہیں نظر آتی تو بھی مانو، دُنیا کی زندگی کے اندر ہمیشہ یہی اُصول چلتا ہے، ''کیا پھر تم جھگڑا کرتے ہو اس سے اس چیز پر جو اس نے دیکھی۔''

جبریل علیہ السلام سے دُوسری ملاقات اور ''سدرۃ المنتہیٰ'' کا تعارف

وَلَقَدْ رَاٰهُ نَزْلَةً اُخْرٰى: اس رسول نے اُس جبریل کو دوسری مرتبہ بھی دیکھا، یعنی ایک دفعہ نہیں، دوسری مرتبہ بھی دیکھا، عِنْدَ سِدْرَةِ الْمُنْتَهٰى: یہ واقعہ لیلۃ المعراج میں پیش آیا، سدرۃ المنتہیٰ ...... ! حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح سے بیان فرمایا کہ یہ نیچے والا عالم جہاں ختم ہوتا ہے اور عالمِ بالا جہاں سے شروع ہوتا ہے، اس (نیچے والے جہان) کے منتہا پر ایک بیری کا درخت ہے، اس کی کیا

کیفیت ہے؟ وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں! چھٹے آسمان پر اس بیری کی جڑ اور ساتویں پر اس کا پھیلاؤ ہے،(۱) اور اسی بیری کے پاس جبریل کی رہائش ہے، جبریل کا ٹھکانا اسی بیری کے پاس ہے، فرمایا کہ اس کے پتے ایسے تھے جس طرح سے ہاتھیوں کے کان، اور اس کے بیر اتنے بڑے بڑے تھے جس طرح سے ہجر علاقے کے مٹکے، بہرحال اس میں بیروں کا ذکر بھی ہے ''نَبْقُهَا كَقِلَالِ هَجَرَ'' اور ''وَرَقُهَا كَآذَانِ الْفِيَلَةِ''(۲) یہ حدیث شریف میں لفظ آتے ہیں، اس کے پتے ہاتھی کے کان جتنے جتنے تھے اور اس کے بیر مٹکوں کے برابر تھے، بہرحال اللہ کے علم میں ہے جو اس کی کیفیت ہے۔ یہ بیری منتہا ہے اس نیچے والے عالم کا، تو نیچے سے جو اعمال جاتے ہیں، روایات میں آتا ہے، فرشتے جو کچھ لے کے جاتے ہیں اُس بیری تک فرشتوں کی رسائی ہے، آگے پھر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ ان کو اُٹھاتا ہے جیسے اس کا طریقہ ہے، اور اللہ کی طرف سے جو اَحکام آتے ہیں پہلے اسی بیری کے پاس آتے ہیں اور وہاں سے پھر آگے پھیلتے ہیں، تو یہ نقطۂ اِتصال دونوں عالموں کے لئے ہے۔(۳) حضرت تھانوی ؒ نے اس کو سمجھانے کے لئے ہمارے اس ماحول کے اعتبار سے ایک بہت بہترین مثال دی، فرمایا کہ جس طرح سے شہر میں ڈاک خانہ ہوتا ہے کہ شہر کی ڈاک جتنی باہر جانی ہوتی ہے پہلے ڈاک خانے میں اکٹھی ہوتی ہے، اور پھر وہاں سے آگے نکال دی جاتی ہے، اور باہر سے جتنی ڈاک شہر میں آنی ہوتی ہے پہلے ڈاک خانے میں آتی ہے پھر وہاں سے پھیلتی ہے، تو اسی طرح سے ''سدرۃ المنتہیٰ'' ایسا مرکز ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو کچھ بندوں کے لئے اُترتا ہے، جو بھی چیز آئے وہ پہلے سدرۃ المنتہیٰ کے پاس آتی ہے، پھر جبریل کی وساطت سے آگے اس کا پھیلاؤ ہوتا ہے، اور نیچے سے جو کچھ جاتا ہے، بندوں کے اعمال دُعائیں وغیرہ جو کچھ بھی ہے، وہ سدرۃ المنتہیٰ تک فرشتے پہنچاتے ہیں، پھر آگے اللہ تعالیٰ اس کو اپنی قدرت کے ساتھ اُٹھا لیتے ہیں۔ بہرحال وہاں بیری کا درخت ہے اور جبریل علیہ السلام کی وہاں رہائش ہے۔

جنّت اور جہنّم کا مقام

اور اسی کے قریب ہی جنّت الماویٰ ہے، یہ بھی قرآنِ کریم نے نشاندہی کی، جس سے معلوم ہوگیا کہ جنّت آسمانوں کے اُوپر ہے، اور جنّت پیدا شدہ ہے، جنّت کے بارے میں تو یہ صراحت ہے، حضور ﷺ جب معراج پہ گئے تھے، تو آپ نے جنّت کی سیر بھی کی، کوثر بھی دیکھا، اس کی نہریں بھی دیکھیں، اور بھی کئی چیزیں دیکھیں۔ جہنّم کے بارے میں بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ زمینوں کے نیچے ہے، جنّت عالمِ بالا میں ہے، جہنّم کے بارے میں بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیچے ہے، تحت الثریٰ، جس کے متعلق حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ؒ نے ''معارف القرآن'' میں بیان فرمایا کہ سائنس دانوں نے جس طرح سے اُوپر کو جانے

(۱) یہ بات دو قسم کی احادیث میں تطبیق ہے جو محدثین نے دی ہے دیکھیں: شرح مسلم نووی ص ۹۷۔

(۲) تفسیر آلوسی۔ اور بخاری ۵۴۹/۲، باب المعراج میں الفاظ یہ ہیں: ثُمَّ رُفِعْتُ إِلَى سِدْرَةِ الْمُنْتَهَى فَإِذَا نَبْقُهَا مِثْلُ قِلَالِ هَجَرَ وَإِذَا وَرَقُهَا مِثْلُ آذَانِ الْفِيَلَةِ.

(۳) مسلم ۹۷/۱ باب سدرۃ المنتہیٰ۔ مشکوٰۃ ۵۲۹/۲ باب المعراج، فصل اوّل۔ نوٹ: یہ حضرت عبداللہ بن مسعود ؓ کا فرمان ہے۔

کی کوشش کی، اسی طرح سے نیچے کو جانے کی بہتیری کوشش کی ہے، اب زمین کا محیط تو معلوم ہو گیا کہ زمین کا محیط کتنا ہے کہ اس کو ایک طرف سے ماپنا شروع کریں تو دائرہ نکال کے اس جگہ تک آئیں تو کتنی مسافت ہے، اور جب کسی دائرے کا محیط معلوم ہو جائے تو اس کا قطر بھی معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اس کے درمیان میں کتنا فاصلہ ہے، جیومیٹری میں جس طرح سے آپ پڑھتے ہیں، کسی دائرے کا اگر محیط معلوم ہو جائے کہ اس کا محیط اتنا ہے تو پھر درمیان میں اس کا قطر بھی معلوم کیا جا سکتا ہے، تو زمین کا قطر بھی انہوں نے معلوم کر لیا کہ کتنے ہزار میل ہے، اب انہوں نے یہ کوشش شروع کی کہ اگر ایک طرف سے سوراخ کیا جائے تو کیا دُوسری طرف نکل جائے گا؟ جس طرح سے اُوپر فضا کی طرف انہوں نے عروج کیا تو اسی طرح سے زمین کو چیر کر ان کا خیال تھا کہ یہیں سے کوئی راستہ دُوسری طرف نکال لیا جائے، اس طرح سے انہوں نے زمین کو برما لگایا، کہتے ہیں کہ مختلف جگہ اس کے تجربات ہوئے، بہت کوشش کی گئی کہ اس کی کھدائی کہاں تک ہو سکتی ہے، کتنی گہرائی تک ہو سکتی ہے، کہتے ہیں کہ جہاں بھی برما لگایا چھ میل سے آگے برما نہیں گیا، اس کے بعد کوئی اتنی سخت چٹان ہے جس میں ان کا سخت سے سخت برما میں سوراخ نہیں کر سکا، یا بعض سے سننے میں یوں آیا ہے کہ نیچے جا کے حرارت اتنی ہے کہ جتنا سخت سٹیل کا برما لگائیں وہاں جا کر پگھل جاتا ہے، چھ میل سے آگے ان کا برما نہیں گیا، مختلف جگہوں سے تجربہ کیا گیا تو چھ میل سے آگے نہیں بڑھتا، جس کے بعد انہوں نے کوشش ترک کر دی، معلوم ہو گیا کہ زمین کے اندر کوئی اس قسم کی ٹھوس چیز اللہ نے اندر بھری ہوئی ہے کہ جس کو یہ لوگ توڑنے میں کامیاب نہیں ہو سکے، ہو سکتا ہے کہ اسی حجری خول کے اندر اللہ تبارک وتعالیٰ نے جہنّم کو محفوظ کیا ہوا ہو، اور وہی پھٹے گی اور پھٹنے کے ساتھ وہی جہنّم نمایاں ہو جائے گی، تو اس میں کوئی ایسی بات نہیں، زمین جس طرح سے آگ اُگلتی رہتی ہے اس میں تو کوئی شک کی گنجائش ہی نہیں، جغرافیہ جاننے والے لوگ جانتے ہیں کہاں کہاں آتش فشاں پہاڑ ہیں اور کیسے کیسے وہ اندر سے لاوا اُگلتے ہیں، اور کیا کیا قیامت برپا ہوتی ہے جس وقت آتش فشاں پھٹتے ہیں۔ تو جغرافیہ کے اندر یہ چیزیں مذکور ہیں، اور آئے دِن اخبارات میں بھی آتی رہتی ہیں، فلاں جگہ آتش فشاں پھٹ گیا اور اس کے لاوے کے ساتھ شہر کا شہر تباہ ہو گیا، تو اندر آگ ہی آگ بھری ہوئی ہے، ہو سکتا ہے یہی آگ، جس وقت اس کو نمایاں کیا جائے گا یہی جہنّم کی شکل میں آ جائے گی، اللہ تعالیٰ نے کیا کچھ چھپا رکھا ہے؟ وہ اللہ ہی بہتر جانتے ہیں! انسان ہزار کوشش کر لے جو کچھ اللہ نے چھپا رکھا ہے اس کے ہزارویں حصے تک بھی انسان کی ابھی تک رسائی نہیں ہوئی خود ان کے اپنے دعوے کے مطابق، کہ جتنا ہم معلوم کر چکے ہیں اور اِس سے کروڑہا درجے زیادہ ابھی چیزیں مخفی ہیں جو اللہ تعالیٰ اپنی قدرت کے ساتھ زمین وآسمان میں پیدا فرمائی ہیں۔ بہرحال جنّت کی نسبت عالمِ بالا کی طرف ہے کہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جنّت ہے، ''دیکھا دُوسری مرتبہ سدرۃ المنتہیٰ کے پاس'' عِنْدَهَا جَنَّةُ الْمَأْوٰى: اس کے پاس ٹھکانے کا باغ ہے، یعنی جہاں نیک لوگوں کو ٹھکانہ ملے گا، رہنے کا باغ۔

''سدرۃ المنتہیٰ'' کی رونق اور حُسن

اِذْ يَغْشَى السِّدْرَةَ مَا يَغْشٰى: کب دیکھا تھا؟ جس وقت کہ ڈھانپ لیا بیری کو جس چیز نے ڈھانپ لیا، یعنی عجیب وغریب چیز اس وقت بیری کے اُوپر طاری تھی جب حضور ﷺ کی ملاقات وہاں سدرۃ المنتہیٰ کے پاس جبریل علیہ السلام سے ہوئی۔ حدیث شریف

میں آتا ہے کہ یہ پتنگے جس طرح سے ہوا کرتے ہیں، چراغوں پہ جیسے جمع ہو جاتے ہیں، تو یہ سونے کے پتنگے تھے سنہری رنگ کے، اتنی کثرت کے ساتھ آ کے وہ بیری پہ وارد ہوئے اور وہ بیری اتنی خوبصورت ہو گئی کہ کوئی شخص اس کی تعریف کرنے کی طاقت نہیں رکھتا، حدیث شریف میں یہ الفاظ آتے ہیں، ''کسی شخص میں طاقت نہیں کہ اس کے حسن کی تعریف کر سکے اتنی خوبصورت ہے''[1] اور وہ پتنگے جو سنہری رنگ کے آئے تھے، بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرشتے ہی تھے جن کو اللہ تعالیٰ نے بھیجا اور انہوں نے حضور ﷺ کی زیارت کی خواہش ظاہر کی تھی، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اس انداز سے بھیج دیا (بیان القرآن)، بہر حال اس میں جو رُموز، جو حکمتیں، جو حالات ہیں، اس کی تفصیل اللہ جانتے ہیں، یا جتنی اللہ کے رسول ﷺ کو اطلاع دی گئی وہ جانتے ہیں، بہر حال اس وقت یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ بیری کے اُوپر عجیب وغریب حالات طاری ہوئے۔ مَا يَغْشٰى یہاں مبہم طور پر ان کو ذکر کر دیا گیا جس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی تفصیل بیان کرنے کی نہیں ہے، نہ الفاظ سے بیان ہو سکتی ہے، ''جبکہ ڈھانپ لیا بیری کو جس چیز نے کہ ڈھانپ لیا'' گویا کہ جگہ بھی متعین کی جا رہی ہے جبریل علیہ السلام کے ملنے کی، اور وقت بھی متعین کیا جا رہا ہے کہ ایسے وقت میں ملاقات ہوئی تھی۔

اللہ کی طرف سے نگاہِ پیغمبر کی ضمانت

اب دیکھ تو لیا جبریل علیہ السلام کو، لیکن پھر بھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک آدمی جب کسی عجیب وغریب چیز کو دیکھنا چاہتا ہے تو اس کی نظر چکرا جاتی ہے، اور کبھی نظر بھٹک جاتی ہے کہ جس چیز کو دیکھنا تھا اس کو غور سے دیکھا نہیں، اور جس چیز کو دیکھنا نہیں تھا ادھر کو نظر اُٹھ گئی، جیسے آپ اگر کسی ایسے محل میں چلے جائیں جہاں کوئی عجیب وغریب چیزیں ہوں، وہاں آپ کو کوئی چیز دکھانی مقصود ہو، کوئی اُستاذ آپ کو ساتھ لے جائے، آپ کو جو چیز دکھانی مقصود ہے ادھر متوجہ کرتا ہے، لیکن آپ ادھر متوجہ نہیں ہوتے، غیر ضروری چیزوں کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں، یا متوجہ آپ ادھر ہی ہوتے ہیں لیکن آپ کی نظر چکرا جاتی ہے کہ آپ صحیح دیکھتے نہیں، تو تب بھی اس مشاہدے میں خلل آ سکتا ہے، تو اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی صفائی دے دی کہ مَا زَاغَ الْبَصَرُ وَمَا طَغٰى: نظر کے اندر نہ کسی قسم کی کجی پیدا ہوئی، نہ نظر حد سے بڑھی، کجی نہیں پیدا ہوئی کہ جس کو دیکھنا تھا اس کو نہ دیکھا ہو، حد سے نہیں بڑھی کہ جس کو نہیں دیکھنا تھا اس کی طرف نظر بڑھ گئی ہو، بہر حال دونوں لفظوں کے ذکر کرنے سے مقصد یہ ہے کہ جو دیکھنا تھا صحیح دیکھا، جو اللہ تعالیٰ نے دکھانا تھا وہی آپ نے دیکھا، اس لیے آپ کی نظر کے اُوپر پورا اعتماد ہے کہ اس کے دیکھنے میں بھی کوئی کسی قسم کا خلل واقع نہیں ہوا۔

لیلۃ المعراج میں رُؤیتِ باری تعالیٰ پر بحث

لَقَدْ رَاٰى مِنْ اٰيٰتِ رَبِّهِ الْكُبْرٰى: البتہ تحقیق دیکھا اس بندے نے اپنے رَبّ کی آیات میں سے بڑی بڑی نشانیوں کو۔ اِن بڑی بڑی نشانیوں سے کیا مراد ہے؟ اس کی تفصیل یہاں قرآنِ کریم میں ذکر نہیں کی گئی، لیلۃ المعراج میں جو واقعات پیش آئے حضور ﷺ نے بیان فرمائے، بڑی بڑی نشانیاں اس میں مذکور ہیں، اور اسی جگہ ہی اِن آیات کے ضمن میں عام طور پر محدثین نے رُؤیتِ باری تعالیٰ کا مسئلہ بھی اُٹھایا ہے، کیونکہ بعض حضرات کا خیال یہ ہے کہ یہ قُرب واتصال جو ذکر کیا جا رہا ہے یہ سب اللہ تعالیٰ

(۱) مسلم ۹۱/۱، مشکوٰۃ ۵۲۸/۲ باب المعراج۔ فَمَا أَحَدٌ مِنْ خَلْقِ اللهِ يَسْتَطِيعُ أَنْ يَنْعَتَهَا مِنْ حُسْنِهَا.

کے ساتھ ہے، جبریل کی بجائے اس کی تفسیر اللہ تعالیٰ کے ساتھ بھی کی گئی ہے، اور لیلۃ المعراج میں حضور ﷺ کو اللہ تعالیٰ کی زیارت اور رُؤیت بھی ہوئی، بعض مفسرین نے اِن آیات کا محمل اِس کو قرار دیا ہے، لیکن روایاتِ صحیحہ کے تحت راجح یہی ہے کہ یہ ملاقات جبریل کی ہے، باقی یہاں یہ جو اِبہام آ گیا کہ اللہ تعالیٰ نے بہت ساری اپنی نشانیاں دِکھائیں، بڑی عجیب وغریب باتیں حضور ﷺ نے دیکھیں، جو دِکھانا چاہا وہی دیکھا، ہوسکتا ہے کہ اس اِبہام کے اندر اللہ تعالیٰ کی رُؤیت بھی آ جائے، اس اِبہام میں اُس کو لپیٹا جاسکتا ہے جو آگے ذِکر کیا گیا۔ باقی اُوپر والی آیات کی صحیح بلکہ اَصح تفسیر یہی ہے روایات کی طرف دیکھتے ہوئے جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کی، کہ اس سے جبریل کی ملاقات اور اس کے ساتھ قُرب واِتصال اور اس کو دیکھنا، یہ ذِکر کیا گیا ہے۔

جنت میں رُؤیتِ باری کے ثبوت پر قرآنی دلائل

باقی رہا اللہ تعالیٰ کی رُؤیت کا مسئلہ......! اس کے بارے میں اہلِ سُنّت والجماعت کا جو عقیدہ ہے وہ سورۂ اَعراف میں آپ کے سامنے ذِکر کیا گیا تھا، کہ ایک رُؤیت تو ہے جو آخرت میں اہلِ جنّت کو ہوگی، اس میں اہلِ سُنّت والجماعت آپس میں متفق ہیں، اس میں کوئی شبہ کی گنجائش نہیں، صحیح روایات میں بیان کیا گیا کہ جنّتی اللہ تعالیٰ کو دیکھیں گے، اور اس دیکھنے میں جنّتی اتنی لذت حاصل کریں گے کہ جنّت کی کسی نعمت کے اندر وہ لطف نہیں ہوگا جو رُؤیتِ باری تعالیٰ میں ہوگا، قرآنِ کریم کی بعض آیات سے بھی اِدھر اشارہ نکالا گیا ہے، اور حدیث شریف میں ان کی تفصیل بھی رُؤیتِ باری تعالیٰ کے ساتھ کی گئی ہے، وَلَدَيْنَا مَزِيْدٌ (سورۂ ق:۳۵) اور اسی طرح سے اور بھی بعض آیتیں ہیں، اور ایک آیت آئے گی سورۂ مطففین میں اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ، ان کافروں کو اپنے رَبّ سے مجوب رکھا جائے گا، یہ اپنے رَبّ کو دیکھیں گے نہیں، اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہاں سے بھی اِستدلال کیا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ یہاں وعید بیان کی گئی ہے کافروں کے لئے ایک عیب بیان کیا گیا ہے کہ ان کو رَبّ سے مجوب رکھا جائے گا، یہ رَبّ کو دیکھیں گے نہیں، تو اگر مؤمنین بھی مجوب ہوں تو پھر یہ کافروں کے لئے کیا عیب ہے؟ یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ مؤمنین تو دیکھیں گے اور کافر نہیں دیکھیں گے، وہ حجاب میں ہوں گے، اور یہ کافروں کے لئے ایک سزا ہے، بات سمجھ گئے؟ یعنی وعدووعید کے اندر مفہومِ مخالف حجت ہوتا ہے (علمی اِصطلاح کے طور پر آپ کی خدمت میں بات عرض کردوں) جیسے سورۂ دُخان میں میں نے عرض کیا تھا، فرعونیوں کا ذِکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں فَمَا بَكَتْ عَلَيْهِمُ السَّمَآءُ وَالْاَرْضُ، ان کے اُوپر آسمان اور زمین روئے نہیں، میں نے عرض کیا کہ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب نیک آدمی مرتا ہے تو زمین وآسمان اس کے اُوپر روتے ہیں، زمین کا وہ حصہ جس کے اُوپر وہ نماز پڑھتا تھا، نیکی کرتا تھا، وہ زمین بھی اس کو یاد کر کے روتی ہے، اور آسمان کے وہ حصے جہاں سے اس کے اَعمال اُوپر جاتے تھے، اللہ کی رحمت جہاں سے اس کے اُوپر اُترتی تھی، وہ حصہ بھی روتا ہے۔ تو یہاں سے حضور ﷺ نے اِستدلال فرمایا، مؤمن کے لئے آسمان اور زمین کے رونے پر اِستدلال یہاں سے کیا کہ فرعونیوں پر آسمان اور زمین نہیں رویا، وہاں اِستدلال اسی طرح سے ہے کہ اگر مؤمنوں پر بھی نہیں روتا صالحین پر بھی زمین اور آسمان کوئی صدمہ نہیں کرتا تو پھر فرعونیوں کے لئے یہ کیا عیب ہے، فرعونیوں کے لئے عیب تو تبھی بنے گا کہ باقیوں پر زمین وآسمان روتے ہوں اور ان پر نہیں روئے، اسی طرح سے

یہاں بھی اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ یہ کافر اللہ سے پردے میں رکھے جائیں گے، اگر مؤمن بھی پردے میں ہوں اور اللہ کو نہیں دیکھیں گے تو پھر کافروں کے لئے کیا وعید ہے؟ اِمام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے یہیں سے اِستدلال کیا ہے کہ مؤمنین اپنے رَبّ کو دیکھیں گے۔[1] اور اسی طرح سے سورۂ قیامہ میں جو آیت آتی ہے اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ اس کو بھی اپنے ظاہر پر محمول کیا گیا ہے وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَةٌ ۝ اِلٰى رَبِّهَا نَاظِرَةٌ بعض وجوہ اس دِن بڑے تروتازہ ہوں گے اور اپنے رَبّ کی طرف دیکھنے والے ہوں گے۔ اس کو بھی اپنے ظاہر پر محمول کیا گیا ہے۔ اس میں اختلاف اگر کیا ہے تو صرف معتزلہ نے کیا ہے، وہ کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت آخرت میں بھی نہیں ہوسکتی، اہلِ سُنّت والجماعت اس بات کے اُوپر متفق ہیں کہ آخرت میں اللہ تعالیٰ کی رُؤیت اہلِ جنّت کو ہوگی۔

دُنیا میں رُؤیتِ باری عقلاً ممکن اور شرعاً ممتنع ہے

اور دُنیا میں اِس زندگی کے اندر اِنہی آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت نہیں ہوسکتی، یہ ممتنعِ شرعی ہے، جیسے کہ موسیٰ علیہ السلام نے خواہش ظاہر کی تھی اَرِنِیْٓ اَنْظُرْ اِلَیْكَ: اے اللہ تو مجھے اپنا آپ دکھا، میں تجھے دیکھ لوں، تو اللہ تعالیٰ نے جواب دیا تھا لَنْ تَرٰىنِیْ (سورۂ اَعراف: ۱۴۳) تُو مجھے نہیں دیکھ سکتا، اُس آیت کے تحت ذِکر کیا جاتا ہے کہ اس دُنیا کے اندر رہتے ہوئے ان آنکھوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو نہیں دیکھا جاسکتا، یہ ممتنعِ شرعی ہے، اگرچہ اس میں اِمتناعِ عقلی نہیں ہے، عقلاً ممکن ہے، اگر یہ عقلاً بھی ممکن نہ ہوتا تو پھر موسیٰ علیہ السلام ایسی محال بات کی خواہش نہ کرتے، نبی اعقل الناس ہوتا ہے، جو بات عقل کے خلاف ہو، نبی اس بات کا مطالبہ نہیں کرتا، تو اِمکانِ عقلی تو ہے کہ یہاں بھی اللہ کو دیکھ لیا جائے، لیکن اس آیت کے آنے کے بعد یہ بات ممتنعِ شرعی ہوگئی، شرعی دلیل کے ساتھ معلوم ہوگیا کہ یہاں اس دُنیا کے اندر اللہ تعالیٰ کو کوئی شخص نہیں دیکھ سکتا، یہ دو باتیں تو ہوگئیں اپنی جگہ متیقن، یقینی، اہلِ سُنّت والجماعت کے عقیدے کے تحت۔

لیلۃ المعراج میں رُؤیتِ باری کی تفصیل

باقی رہا لیلۃ المعراج کا قصہ......! وہاں سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو یہی ناسوتی تھی جو کہ دُنیا میں ہوتی ہے، لیکن عالمِ آخرت ہے، اب اگر کوئی اس دُنیا کا انسان زمانِ آخرت میں نہیں، محلِ آخرت میں چلا جائے، تو کیا اس پر آخرت کے اَحکام طاری ہوتے ہیں یا دُنیا کے؟ یہ بات زیرِ غور ہے، ذرا اس بات کو سمجھ لیجئے! حضرت عیسیٰ علیہ السلام اسی زندگی میں ہیں جو دُنیا میں ان کو حاصل ہے، لیکن وہ مکانِ آخرت میں یعنی عالمِ بالا میں پہنچا دیے گئے، اس دُنیا کی حدود سے نکل گئے، اب وہاں جانے کے بعد ان کے اُوپر وہ حالات ہیں جو آخرت میں جنّت والوں کے ہوں گے، کھانے کے وہ محتاج نہیں، پینے کے وہ محتاج نہیں، پیشاب پاخانے کے وہ محتاج نہیں، سونے جاگنے کا وہاں کوئی مسئلہ نہیں ہے، اور گھٹنے بڑھنے کا کوئی سوال نہیں، جس طرح سے حدیث میں آتا ہے کہ جنّتی جنّت میں جوان ہوکر جائیں گے تو لامحدود مدّت تک جوان ہی رہیں گے، کوئی فرق نہیں آئے گا، وہاں پہنچ جانے کے بعد چیز میں تغیر نہیں آتا، اس لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام جس عمر میں یہاں سے گئے تھے جب واپس آئیں گے وہی عمر ہوگی، چاہے ہزارہا

(۱) مشکوٰۃ ۲/۵۰۲ باب رؤیۃ اللہ، فصل ثالث۔ نیز تفسیر بغوی، قرطبی، خازن، مظہری، وغیرہ۔

سال وہ آسمانوں پہ گزار آئے، حتیٰ کہ حدیث شریف میں یہ آتا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کا جب نزول ہوگا تو ان کے بالوں سے پانی ٹپک رہا ہوگا، لمبے لمبے ان کے بال ہوں گے، اور اس طرح سے ہوگا جس طرح سے ابھی غسل خانے سے نکلے ہیں، اور ان کے اُوپر سے پانی ٹپک رہا ہوگا، جب یوں سر جھکائیں گے تو یوں پانی ٹپکے گا، اور جب سر اُوپر اٹھائیں گے تو پانی کے قطرے چاندی کے موتیوں کی طرح ان کے چہرے کے اُوپر سے بہہ رہے ہوں گے، یہ حدیث شریف میں آتا ہے،(1) تو یہ پانی جو ٹپک رہا ہوگا تو یہ کس چیز کا پانی ہے؟ کہتے ہیں کہ جس وقت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اُٹھایا گیا تھا اس وقت آپ غسل سے فارغ ہوئے تھے، تو جس طرح سے آدمی غسل سے فارغ ہو تو پانی ٹپکتا ہے تو اسی طرح سے ان کو اُٹھالیا گیا، جب واپس آئیں گے تو وہی حال ہوگا۔ تو عالم آخرت میں جا کے ہزاروں سال بھی وہ رہے تو ان کے حال میں تغیر نہیں آیا، جیسے گئے تھے ویسے ہی واپس آجائیں گے، معلوم ہوگیا کہ جس طرح سے دُنیا کے ختم ہونے کے بعد آخرت آجائے گی، عالمِ آخرت آجائے گا، زمانِ آخرت آجائے گا تو جس طرح کے حالات اس وقت ہوتے ہیں تو اگر کوئی شخص اِس زندگی کے اندر بھی اس عالم میں پہنچا دیا جائے، اس مکان میں پہنچا دیا جائے تو اس کے اُوپر وہی حالات طاری ہوجاتے ہیں جو کہ آخرت میں ہوں گے۔ اس لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم اگر عالمِ آخرت میں تشریف لے گئے، محلِ آخرت میں تشریف لے گئے جنت میں، تو وہاں جا کے اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی رُؤیت کا قول کر دیا جائے تو یہ ان دلائل کے منافی نہیں جن دلائل کے ساتھ دُنیا کے اندر عدمِ رُؤیت کو ثابت کیا جاتا ہے، بلکہ جن دلائل کے ساتھ جنت کے اندر رُؤیت کو ثابت کیا جاتا ہے اور ثابت مانا جاتا ہے، ان دلائل کے تحت اس کا اِمکان ثابت ہوجاتا ہے۔ اور بعض روایات میں آتا بھی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رَأَيْتُ رَبِّيْ'' میں نے اپنے رَبّ کو دیکھا،(2) جس کی بنا پر بعض صحابہ کا رُجحان ادھر ہی ہے، حضرت اِبنِ عباس رضی اللہ عنہما کا، کہ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو محقق ہوئی ہے، لیکن وہ عالمِ بالا میں ہوئی ہے، اِس عالمِ دُنیا میں نہیں، بہرحال اس میں دونوں رائے ہیں اور یہ کوئی قطعی عقیدے کی بات نہیں، رُؤیت ہوسکتی ہے، چونکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم عالمِ بالا میں تشریف لے گئے تھے، دُنیا میں نہیں، اور اَخبار جو موجود ہیں جن میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رُؤیت کا ذِکر کیا ہے وہ چونکہ خبرِ واحد ہیں، قابلِ تاویل ہیں، اس لیے اگر کوئی شخص اِنکار کرتا ہے کہ رُؤیتِ باری نہیں ہوئی تو اس کے بارے میں بھی گنجائش ہے، حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا انکار کرنے والوں میں سے ہیں، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ انکار کرنے والوں میں سے ہیں، اور حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور اس قسم کے دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم اِقرار کرنے والوں میں سے ہیں۔

حضرت کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کا فیصلہ

تو یہ مسئلہ ذوجہتین ہے جس کی تطبیق حضرت سیّد انور شاہ صاحب کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے یوں دی کہ دونوں باتیں ہی اپنی جگہ صحیح ہوسکتی ہیں، رُؤیت بین الرؤیتین کے ساتھ اس کی تاویل کردی، رُؤیت بین الرؤیتین کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسے طور پر دیکھنا

---

(1) إِذَا طَأْطَأَ رَأْسَهُ قَطَرَ وَإِذَا رَفَعَهُ تَحَدَّرَ مِنْهُ جُمَانٌ كَاللُّؤْلُؤِ۔ (مسلم ۲/۴۰۱ باب ذکر الدجال۔ ترمذی ۲/۴۸۔ مشکوۃ ۲/۴۷۳ باب العلامات بين يدى الساعة)

(2) مسند احمد ۱/۲۸۵، رقم ۲۵۸۰۔ ولفظه: عَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ قَالَ: قَالَ رَسُوْلُ اللهِ ﷺ: رَأَيْتُ رَبِّي تَبَارَكَ وَتَعَالَى۔

کہ جس کو یوں بھی کہہ سکیں کہ دیکھا ہے اور یوں بھی کہہ سکیں کہ نہیں دیکھا، جیسے سورج جس وقت پوری تمازت پہ ہوتا ہے گرمی پہ ہوتا ہے، تو آپ یوں نظر اُٹھاتے ہیں، نظر کو جھکا لیتے ہیں، نظر چندھیا جاتی ہے، اور آپ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ میں نے سورج کو دیکھا ہے، اس میں بھی کوئی غلط بات نہیں ہے، اور یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ بھائی! کہاں دیکھا جاتا ہے؟ اور کسی کا اُستاذ بارُعب ہو، پُرعظمت ہو، دیکھنے والے شاگرد کے دِل میں اس کی پوری عظمت ہو، تو کہتے ہیں کہ ہم نے کبھی اپنے اُستاد کو نظر بھر کے نہیں دیکھا، ان کا چہرہ ایسا تھا کہ ہم تو ان کو دیکھ نہیں سکتے تھے، ان پہ نظر نہیں ٹکتی تھی، یہ بیانات میں آتا ہے، لوگ جس وقت اپنے مشائخ کی تعریف کرتے ہیں اساتذہ کی کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان کے چہرے کی طرف دیکھا نہیں جاتا تھا، ہم ان کو نظر ٹکا کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ تو یہ رُؤیت بین روینتین ہوتی ہے جس کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دیکھا ہے، جس کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نہیں دیکھا، تو یہاں بھی کوئی ایسی ہی صورت پیش آئی، ادب کی رُؤیت، کہ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے "نُوْرٌ اَنّٰی اَرَاهُ"(۱) وہ تو ایک نُورانی چیز ہے اس کو میں کیونکر دیکھتا، تو جس طرح سے ایک نُور دیکھنے سے مانع ہوا کرتا ہے، لیکن اس کو من وجہ دیکھنا بھی کہا جاسکتا ہے، تو آثار کی طرف دیکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ حضور ﷺ کے ساتھ بھی کوئی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ اللہ تعالیٰ کی رُؤیت ہوئی لیکن ایسے طور پر جس کو باادب رُؤیت کہہ سکتے ہیں، اور ایسے طور پر کہ جس طرح سے کسی نُورانی چیز کی طرف نظر اُٹھتی ہے اور نظر جھک جاتی ہے، جس کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ دیکھا اور جس کو یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ نہیں دیکھا، بہرحال اس طرح سے کچھ تطبیق بھی دی گئی۔ ان آیات کے ضمن میں چونکہ اس مسئلے کو ذکر کیا گیا تو میں نے بھی کچھ اشارہ کردیا۔ باقی! دلائل میں جانے کی گنجائش نہیں ہے۔

خواب میں رُؤیتِ باری

اور اگر کوئی شخص کہتا ہے کہ میں نے خواب کے اندر اللہ تعالیٰ کو دیکھا، تو بلاکیف کوئی چیز سامنے آسکتی ہے جس کی کیفیت متعین نہیں کی جاسکتی، کہ جس میں انسان کا قلب کہتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ ہیں، اس قسم کے واقعات اولیاء اللہ میں اور انبیاء ﷩ کے خوابوں میں آتے ہیں، خود "مشکوٰۃ" میں ہی آپ نے "باب المساجد ومواضع الصلوۃ" کے اندر حضور ﷺ کا بیان کردہ خواب پڑھا، "رَاَیْتُ رَبِّیْ" میں نے اپنے رَبّ کو دیکھا، یہ واقعہ خواب کا ہے کہ مجھے نیند آگئی، میں نے دیکھا کہ میں اپنے رَبّ کے سامنے ہوں، جو گفتگو اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہوئی وہ "مشکوٰۃ" کی اس روایت کے اندر موجود ہے۔(۲) اور اولیاء اللہ کے واقعات کے اندر تو کثرت کے ساتھ اس چیز کو ذکر کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت ہوئی اور یہ بات پوچھی، اللہ نے یہ جواب دیا، تو خواب میں رُؤیتِ باری کا انکار نہیں کیا جاسکتا، وہ ایک خیال ہے جو اِنسان کے دماغ میں آتا ہے، تو رُوح کا کسی جگہ کوئی اِتصال ہونے کی بنا پر کوئی چیز منکشف ہوجاتی ہے، اس کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ تو خواب کے واقعات بھی ہوتے ہیں، جنت کے اندر بھی دیکھا جائے گا، وہ بالکل یقینی طور پر دیکھنا ہوگا، اور دُنیا کے اندر ان آنکھوں کے ساتھ نہیں دیکھا جاسکتا، دُنیا کا کوئی انسان آخرت میں منتقل ہوجائے

(۱) مسلم ۱/۹۹ باب قول الله ولقد راٰه نزلة اخرٰی. مشکوٰۃ ۲/۵۰۱ باب رؤية الله، فصل ثالث۔

(۲) ترمذی ۲/۱۵۹، کتاب التفسیر، سورۃ ص. مشکوٰۃ ۱/۶۹ باب المساجد ومواضع الصلوۃ، فصل ثانی۔

جس طرح سے معراج میں گئے تھے تو وہاں کوئی دلیل اس کے دیکھنے کے لئے امتناع ثابت نہیں کرتی، ممکن ہے، باقی! واقعہ ہے یا نہیں؟ اس میں روایات کا اختلاف ہے، یہ حاصل ہے اِس رُؤیتِ ربّ کا۔

جنّت میں رُؤیتِ باری کا ثبوت اَحادیث سے

حدیث شریف میں آتا ہے، صحابہ کرام ﷺ نے پوچھا تھا کہ یا رسول اللہ! کیا ہم سب اپنے اللہ کو دیکھیں گے؟ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ہاں دیکھیں گے۔ لیکن اب اس میں بھی پھر فوراً یہ خیال آتا ہے کہ اتنی مخلوق جو دیکھنے والی ہوگی تو بھیڑ لگ جائے گی، اور بھیڑ کے اندر آپ جانتے ہیں کہ ایک بزرگ آجائے اور سارے اس سے ملنے والے ہوں تو کتنی تکلیف ہوتی ہے، دھکے لگتے ہیں، کندھے ٹوٹتے ہیں اور کپڑے پھٹ جاتے ہیں، جب بہت سارا اِزدحام ہوجاتا ہے تو مشکل ہوجاتا ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ نہیں! وہاں ایسے نہیں ہوگا، دیکھو! کہ اللہ کی مخلوق میں سے ایک مخلوق ہے سورج، اور کتنے کروڑہا انسان اس کو بیک وقت دیکھتے ہیں بغیر مزاحمت کے، اور فرمایا کہ چودھویں رات کا چاند دیکھو! کہ ایک چاند ہے اور اس کو دیکھنے والے کروڑوں انسان ہوتے ہیں لیکن بغیر مزاحمت کے، تو جب اللہ کی مخلوق میں ایسی چیز موجود ہے کہ کروڑہا دیکھنے والا والے ہوں گے اور کوئی مزاحمت نہیں ہوگی، کوئی دھینگا مشتی نہیں ہوگی، کوئی کسی کو تکلیف نہیں پہنچائے گا، نقصان نہیں پہنچائے گا، اللہ تعالیٰ کی زیارت کرنے والے بھی اگرچہ کروڑوں ہوں گے لیکن اس میں کوئی مزاحمت نہیں ہوگی، کوئی کسی تکلیف نہیں ہوگی، یہ سورج اور چاند کی مثال کے ساتھ حضور ﷺ نے اِس بات کو سمجھایا۔(۱) بہرحال اِس اِجمال میں مفسرین نے اس کو لپیٹنے کی کوشش کی ہے کہ لیلۃ المعراج میں جبریل کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی، اور ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اپنی شان کے مطابق جس طرح سے چاہا اپنے حبیب کے ساتھ ملاقات کے دوران میں جیسے گفتگو نقل کی گئی ہے، نمازوں کی فرضیت، اور بار بار آنا، اور جا کر درخواست کرنا، گفتگو تو بالکل صحیح روایات کے اندر آئی ہے، اور اس گفتگو کے دوران میں اگر رُؤیت اور زیارت بھی ہوگئی ہو تو یہ کسی دلیل کے خلاف نہیں۔ یہ مسئلہ مفسرین نے انہی آیات کے ضمن میں بیان کیا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّاۤ اِلٰهَ اِلَّاۤ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

لات وعزّیٰ اور منات کی اُلوہیت پر رَدّ!

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى ۝ وَمَنٰوةَ الثَّالِثَةَ الْاُخْرٰى: کیا پھر دیکھا تم نے لات کو اور عزّیٰ کو اور تیسرے منات کو جو ان سے پیچھے ہے، اُخریٰ: اُولیٰ کے مقابلے میں، اُخریٰ کا لفظ مرتبہ ظاہر کرنے کے لئے ہے، کہ لات وعزّیٰ اُولیٰ کے درجے میں ہیں اور منات اُخریٰ کے درجے میں ہے، اور مفسرین نے لکھا ہے کہ ان بتوں میں ان کے ہاں یہی ترتیب تھی کہ منات کو وہ اِن سے پیچھے سمجھتے تھے، لات وعزّیٰ کا درجہ اُن کے نزدیک پہلے نمبر پر تھا، اور ثالثہ ہوگیا گنتی کے اعتبار سے، لات عزّیٰ منات یہ تین بت ہوگئے۔ اور اَفَرَءَيْتُمْ کا مفہوم پورا کرنے کے لئے یہاں کچھ الفاظ محذوف نکال لئے جائیں گے هَلْ لَهَا

(۱) بخاری ۶۵۹/۲، کتاب التفسیر، سورۃ النساء، باب ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ۔ مشکوٰۃ ۴۸۵/۲ باب الحساب والکتاب، فصل اول۔

شَيْءٌ يُوْجِبُ الْأُلُوْهِيَّةَ کیا پھر تم نے دیکھا، غور کیا لات عزّیٰ اور منات میں؟ کہ کیا ان کے لئے ایسی کوئی چیز ثابت ہے جو کہ اُلوہیت کو ثابت کرتی ہو؟، اُن کے لئے کوئی ایسی صفت ہے جو اُلوہیت کو ثابت کرتی ہو؟

لات، منات اور عزّیٰ کی وجہِ تسمیہ

اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى: کیا تمہارے لئے مذکر ہے اور اُس اللہ کے لئے اُنثیٰ ہے؟ اُنثیٰ سے لڑکیاں مراد ہیں، اور یہ لات، عزّیٰ، منات یہ بھی تینوں مؤنث ہیں، ''لات'' کے متعلق مفسرین لکھتے ہیں کہ ظاہر یہی ہے کہ جیسے اللہ کا لفظ ہے اسی طرح سے مؤنث کے طور پر یہ ''لات'' کا لفظ استعمال کرتے تھے، اَلْاِلٰهَةُ مؤنث بنا کر پھر اس سے تغیر کر کے اللّٰتُ بن گیا، تو یہ بھی مؤنث ہوا۔ الْعُزّٰی یہ تو مؤنث اَعَزّ کی ہے، اَعَزّ اور عزیز یہ اللہ کی صفتوں میں سے ہے، تو اس سے یہ عزّیٰ بنالیا۔ اور معات بھی مؤنث کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ تینوں بُت ہیں، ''لات'' کے متعلق لکھا ہے کہ یہ ایک منقش چٹان تھی جس کے اُوپر انہوں نے اپنا عبادت خانہ بنا رکھا تھا اور طائف کی طرف کے لوگ اس کو زیادہ مانتے تھے۔ اور عزّیٰ یہ کوئی درخت تھا یا درخت کا نچلا حصہ، مُڈھ جس طرح سے ہوا کرتا ہے، اور اس کے اُوپر بھی انہوں نے کوئی عمارت بنا رکھی تھی۔ اور ''منات'' یہ بھی کوئی منقش پتھر ہے۔ تو عزّیٰ کو زیادہ تر قریش مانتے تھے، اور منات یہ اوس اور خزرج کا بُت تھا، مکہ معظمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان مُشَلَّل قُدَيْد کوئی علاقہ ہے، وہاں یہ ہوتا تھا، یہاں سے اہلِ مدینہ حج کے لئے اِحرام باندھا کرتے تھے، تو اِحترام ان کا سارے عرب ہی کرتے تھے، لیکن بعض بعض قبائل ان کے زیادہ معتقد تھے، چنانچہ اُحد میں ابوسفیان نے یہ نعرہ بلند کیا تھا: لَنَا الْعُزّٰى وَلَا عُزّٰى لَكُمْ! ہمارے لئے عزّیٰ ہے تمہارے لئے کوئی عزیٰ نہیں! تو سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا تھا کہ یہ جواب دو: اَللّٰهُ مَوْلَانَا وَلَا مَوْلٰى لَكُمْ! اللہ ہمارا مولیٰ ہے اور تمہارے لئے کوئی مولیٰ نہیں![1] تو ابوسفیان کے اس نعرے کا جواب ان الفاظ سے دیا گیا تھا۔

لات وعزّیٰ اور منات کی مُراد میں تحقیقِ لطیف

اور یہ تینوں ہی مؤنث کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، بظاہر یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاید ان جگہوں کی یا ان نشانوں کی نسبت وہ فرشتوں کی طرف کرتے ہوں، کیونکہ قرآنِ کریم کی بہت ساری آیات اس بات کے اُوپر دلالت کرتی ہیں اور آگے بھی یہ ذکر ہو رہا ہے کہ وہ لوگ فرشتوں کو لڑکیاں قرار دیتے تھے اور اللہ کی بیٹیاں کہتے تھے، اور یہاں بھی آگے جو لفظ آگیا: اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى، اس سے بظاہر معلوم یوں ہوتا ہے کہ لات، عزّیٰ، منات ان کو وہ اللہ کی لڑکیاں قرار دیتے تھے، اور اللہ کی لڑکیاں قرار دینا آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا یہ عقیدہ فرشتوں کے متعلق تھا، تو ہوسکتا ہے کہ یہ جگہیں بھی فرشتوں کی طرف منسوب کرنے کی بنا پر وہ ان کا احترام کرتے ہوں اور ان کی پوجا کرتے ہوں، گویا کہ فرشتوں کی نشانی کے طور پر کوئی جگہ متعین کر لی، کوئی تھان متعین کر لیا، کوئی مقام متعین کر لیا، وہاں جا کے چڑھاوے چڑھانا اور اس عنوان کے ساتھ اُس کو ذکر کرنا گویا کہ یہ ملائکہ کی پوجا تھی...... ورنہ بظاہر آپ یہی کہیں گے کہ ایک پتھر جس کا نام انہوں نے ''لات'' رکھ لیا، اور ایک لکڑی کا مُڈھ جس کا نام انہوں نے ''عزّیٰ'' رکھ لیا،

---

(۱) بخاری ۵۷۹/۲ باب غزوۂ اُحد۔

اور "منات" یہ بھی ایک منقش چٹان ہے، تو وہ بے جان چیزوں کی پوجا کرتے ہوں تو اُن جاہلوں سے یہ بھی بعید نہیں ہے، ہم یہ کہیں کہ یہ تو عقل کے خلاف ہے کہ وہ پتھر کو پوجیں یا لکڑی کو پوجیں، اگر لکڑی اور پتھر کو پوجنا عقل کے خلاف ہے تو فرشتوں کو پوجنا بھی کوئی عقل کے مطابق نہیں ہے، اور انسانوں کو پوجنا یا انسانوں کی قبروں کو پوجنا یہ بھی کوئی عقل کے مطابق نہیں، جب وہ نظریاتی طور پر گمراہ ہی ٹھہرے تو گمراہی میں انسان جہاں تک بھی بڑھے بڑھ سکتا ہے، جانوروں تک کی پوجا لوگوں نے کی، بے جان چیزوں کی پوجا کی، حتیٰ کہ مذاہب عالم کے اندر اس کا ذکر آتا ہے کہ ہندوؤں میں ایک طبقہ تھا جو مرد وعورت کے آلۂ تناسل کی پوجا بھی کرتا تھا، یہاں تک بھی گمراہی میں لوگ بڑھے ہیں، وہ کہتے ہیں کہ ان کے ذریعے سے ہم پیدا ہوتے ہیں، یہ ہمارے پیدا کرنے والے ہیں، تو جب انسان گمراہ ہو جائے اور بھٹک جائے تو پھر اس کے بھٹکنے کی کوئی حد نہیں ہوتی کہ وہ کہاں تک ٹھہرے گا، اس لئے پتھر اور لکڑیوں کو ہی کسی مناسبت کی بنا پر وہ پوجتے ہوں تو یہ بھی ٹھیک ہے، بے جان چیزیں ہے...... ورنہ یہ تھان تھے اصل میں فرشتوں کے، فرشتوں کی طرف ان کی نسبت کرتے تھے، اور یہ آیت بھی اس بات پہ قرینہ ہے کہ لات، عزّیٰ اور منات کا ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہ سوال اُٹھایا ہے کہ کیا تمہارے لئے لڑکے ہیں اور اللہ کے لئے لڑکیاں ہیں؟ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان تینوں کو اللہ کی لڑکیاں قرار دیتے تھے، اور قرآنِ کریم کی آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتوں کو وہ اللہ کی لڑکیاں کہا کرتے تھے، اور آگے بھی ذکر آ رہا ہے کہ یہ آخرت کے منکر لوگ فرشتوں کو لڑکیوں کے طور پر ذکر کرتے ہیں، تَسْمِيَةَ الْأُنْثٰى جس طرح سے آگے آ رہا ہے، تو اس سے اس خیال کو قوت پہنچتی ہے کہ لات، عزّیٰ، منات یہ بھی انہوں نے کوئی فرشتوں کے نشان متعین کر رکھے تھے، اور اِن کی عبادت کرنا اُن کے نزدیک فرشتوں کو خوش کرنے کا ذریعہ تھا، اور فرشتے جس وقت خوش ہو جائیں گے وہ اللہ کے سامنے سفارش کریں گے، اور شفاعت کر کے وہ ہماری ضروریات پوری کرواتے ہیں، ہمیں مصیبتوں سے بچاتے ہیں، تو اِس رُکوع کے اندر آگے خصوصیت کے ساتھ اِس شفاعت والے نظریے کی تردید کر دی گئی ہے۔

اللہ اولاد سے پاک ہے

تو اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْأُنْثٰى: تمہارے لیے لڑکے اور اللہ کے لئے لڑکیاں؟ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طرف تو اولاد کی نسبت کرنا ویسے ہی عیب ہے، اور اگر تم نے اللہ کی طرف اولاد کی نسبت کرنی ہی تھی تو پھر کم از کم ایسی چیز کی نسبت تو کرتے جو تمہارے خیال کے اعتبار سے عزّت کا باعث ہو، لڑکی کی نسبت تو تمہارے نزدیک بھی ذلت کا باعث ہے، تو تم اللہ تعالیٰ کی طرف ایسی چیز کی نسبت کر رہے ہو؟ یہ جو تم نے آپس میں تقسیم کر لی کہ اپنے لئے لڑکوں کو پسند کر لیا اور اللہ کے لئے لڑکیوں کو؟ یہ تو بڑی ہی جائر اور بڑی ہی ٹیڑھی تقسیم ہے جو تم نے کی ہے، تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى: تب تو یہ تقسیم بہت ہی ظالمانہ ہے، بہت ہی کج ہے، ضِیْزٰی جائرہ کے معنی میں ہے، یہ تقسیم تمہاری عادلانہ تقسیم نہیں جو اپنے خیال کے مطابق تم کر کے بیٹھ گئے کہ اچھی چیز کو اپنی طرف منسوب کر لیا اور بُری چیز کو اللہ کی طرف منسوب کر دیا۔

"اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ" کی ماقبل کے ساتھ مناسبت

اور اَفَرَءَيْتُمُ اللّٰتَ وَالْعُزّٰى: یہاں سے گویا کہ رَدِّ شرک اور اِثباتِ توحید کا مضمون شروع ہوا، اور فاء کے ساتھ ماقبل پر اس کی تفریع اس طرح سے ہوجائے گی کہ پچھلی آیات میں ثابت کردیا گیا کہ سرورِ کائنات ﷺ اللہ کے رسول ہیں، اور یہ جو بات کہتے ہیں وحی کے ذریعے سے کہتے ہیں، اور ان کا ذریعۂ علم بالکل قابلِ اعتماد ہے، اس میں کوئی شک اور شبہ کی گنجائش نہیں، تو اس بات کے پختہ ہوجانے کے بعد ان کی باتوں پر ایمان لانا ضروری ہوا، اور جو باتیں یہ کہتے اور سمجھاتے ہیں اُن میں توحید سرِفہرست ہے، تو اس لئے توحید کا عقیدہ بھی ضروری ہوا، اور اس توحید کے خلاف تم نے یہ لات، عزّیٰ، منات اِختیار کررکھے ہیں، تو تم نے کبھی غور بھی کیا کہ کوئی دلیل ہے؟ یا کوئی صفت ان کے لئے ایسی ثابت ہے جس کے ساتھ ان کی اُلوہیت ثابت ہوجائے؟ اور پھر یہ کیسی بے ڈھنگی تقسیم ہے کہ ان کو لڑکیاں قرار دے کر تم نے اللہ کی طرف منسوب کردیا، اور اپنی طرف لڑکوں کو منسوب کرنا اپنے لئے باعثِ عزّت سمجھتے ہو، تو یہ تقسیم جو تم نے جاری کرلی یہ بہت ظالمانہ تقسیم ہے۔ اس طرح سے یہ مضمون ماقبل کے ساتھ متعلق ہوجائے گا۔

معبودانِ باطلہ کا بھرپور رَدّ!

اِنْ هِیَ اِلَّاۤ اَسْمَآءٌ سَمَّیْتُمُوْهَاۤ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ مَّاۤ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ: نہیں ہیں یہ مگر نام جو رکھ لئے تم نے اور تمہارے آباء نے نہیں اُتاری اللہ نے ان کے متعلق کوئی دلیل، اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ: نہیں پیروی کرتے یہ لوگ مگر توہم کی۔ ظن: مطلقاً خیال جو بے دلیل انسان کے قلب میں آجاتا ہے، یہاں ظن سے یہ مراد ہے، "بے دلیل خیال کی اتباع کرتے ہیں" وَمَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ: اور اس چیز کی اتباع کرتے ہیں جو ان کا دل چاہتا ہے، خواہشات کی اتباع کرتے ہیں اور بے دلیل بات کی اتباع کرتے ہیں، وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنْ رَّبِّهِمُ الْهُدٰى: البتہ تحقیق اِن کے پاس ان کے رَبّ کی طرف سے ہدایت آگئی، اَمْ لِلْاِنْسَانِ مَا تَمَنّٰى: کیا انسان کے لئے وہ چیز ہوتی ہے جس کی وہ خواہش کرلے؟ یعنی انسان جو چاہے اس کو وہ مل جایا کرتی ہے؟ ایسا نہیں ہے، فَلِلّٰهِ الْاٰخِرَةُ وَالْاُوْلٰى: آخرت اور اُولیٰ، دُنیا اور آخرت سب اللہ کے لئے ہے، اللہ جسے کوئی چیز دینا چاہے ملے گی، انسان اپنی خواہشات کو پورا نہیں کرسکتا، جو چاہے حاصل کرلے اور جو چاہے اس کو مل جائے ایسا نہیں ہوا کرتا، دُنیا اور آخرت پر قبضہ اللہ ہی کا ہے، دُنیا میں اور آخرت میں جو اللہ چاہے وہ ملتا ہے، خواہشات کا کوئی اعتبار نہیں۔

"یہ نام ہیں جو تم نے رکھ لئے" مطلب یہ ہے کہ ان کا مصداق کچھ نہیں، کسی کو تم نے کہہ دیا کہ یہ بارش دینے والا ہے، یہ ایک نام ہی نام ہے جو رکھ لیا، اس کے پیچھے حقیقت کچھ نہیں، کسی کو تم نے رازق سمجھ لیا، وہ نام ہی نام ہے جو تم نے رکھ لیا،، اس کے پیچھے کچھ نہیں، یہ اسم ہیں ان کا مسمّٰی موجود نہیں ہے، کسی کو مشکل کشا کہہ دو، یہ ایک نام ہی نام ہے جو تم نے رکھ لیا، حقیقت اس میں کچھ نہیں ہے، یہ مطلب ہے ان کا کہ لات، عزّیٰ، منات ان کو تم لڑکیاں کہتے ہو، ان کو تم اپنے لئے شفیع قرار دیتے ہو، یہ ایسے نام ہیں جو بے دلیل تم نے رکھ لئے اور تمہارے آباء نے رکھ لئے، اللہ تعالیٰ نے ان کے متعلق کوئی دلیل نہیں اُتاری کہ واقعی ان کے اندر یہ صفات موجود ہیں جو تم ذکر کررہے ہو، یا ان کو اِختیارات حاصل ہیں جس قسم کے اِختیارات تم نے ان کے لئے تجویز یا تفویض

کر رکھے ہیں، اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے کوئی کسی قسم کی دلیل نہیں اُتاری، یہ محض تمہارے توہمات ہیں، اور یا دِل کی خواہشات ہیں کہ تم آخرت کے عذاب سے بچنے کے لئے یا مذہبی ذمہ داریوں سے بچنے کے لئے یہ سہارے ڈھونڈے پھرتے ہو کہ یہ ہمیں بچالے گا، جب ہم نے اس کو خوش کرلیا تو ہم چھوٹ جائیں گے، یہ تمہارے اپنے دِل کی خواہشات ہیں۔ اور یاد رکھئے! کہ دِل کی خواہشات اور بے دلیل خیالات یہ حق کے مقابلے کوئی مفید نہیں ہوا کرتے، جیسے آگے لفظ آرہے ہیں، اور اس قسم کی تمنائیں تم ان کے ساتھ لگائے بیٹھے ہو کہ یہ ہمارے مشکل کشا ہیں، ہمیں مصیبتوں سے بچائیں گے، اگر بالفرض آخرت آگئی وہاں بھی ہمارے کام آئیں گے، یہ محض تمہاری تمنائیں ہیں، اور ضروری نہیں کہ انسان کی تمنا پوری ہوجائے، آخرت اور دُنیا اللہ کے قبضے میں ہے، جو اللہ دینا چاہے وہی کسی کو ملتا ہے، جو چیز اللہ تعالیٰ نہ دینا چاہیں وہ کوئی کسی کو دِلا نہیں سکتا، اس لئے محض خواہشات کا اعتبار نہیں ہوا کرتا، حقائق جو ہوتے ہیں جو دلائل سے ثابت ہوں ان کو ماننا چاہیے، حقائق کا مقابلہ خواہشات کے ساتھ نہیں کیا جاسکتا۔ تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ (سورۂ بقرہ:۱۱۱) جس طرح سے اہلِ کتاب کے متعلق ذکر کیا تھا کہ انہوں نے بھی غلط غلط عقیدے تجویز کرلئے اور یہ محض ان کی خواہشات ہیں، اور یہ خواہشات ان کے لئے کوئی مفید نہیں ہوں گی، ''نہیں پیروی کرتے یہ مگر ظن کی'' ظن سے مراد بے دلیل خیال، ''اور اس چیز کی جس کو ان کا دِل چاہتا ہے، اور ان کے پاس ان کے ربّ کی طرف سے راہنمائی آگئی'' اب ھدیٰ کے مقابلے میں ہویٰ یہ کوئی مفید نہیں، مَا تَهْوَى الْاَنْفُسُ میں جس طرح سے ہوائے نفس کا ذکر آگیا، اللہ کی طرف سے ھُدیٰ آگئی، ھدیٰ کے مقابلے میں ہویٰ کی اتباع یہ کوئی عقل مندی نہیں، ''کیا انسان کے لئے وہ چیز ہے جو یہ چاہتا ہے، جس کی یہ تمنا کرتا ہے؟ پس اللہ ہی کے لئے ہے آخرت اور اُولیٰ۔''

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ

کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں، نہیں فائدہ دے گی ان کی سفارش کچھ بھی، مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ اجازت دے دے

لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى ۝۲۶ اِنَّ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ لَيُسَمُّوْنَ

جس کے لئے اللہ چاہے، اور پسند کرلے ۝۲۶ بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے وہ نام رکھتے ہیں

الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِيَةَ الْاُنْثٰى ۝۲۷ وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ ۭ اِنْ يَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ ۚ

فرشتوں کا لڑکیوں کا نام ۝۲۷ ان کے پاس اس بات کے متعلق کوئی علم نہیں، نہیں پیروی کرتے یہ مگر بے دلیل خیالات کی

وَاِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ شَيْـًٔا ۝۲۸ فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى ۙ عَنْ ذِكْرِنَا

اور بے دلیل بات حق کے مقابلے میں کچھ مفید نہیں ہوا کرتی ۝۲۸ پس آپ اعراض کرجائیں اس شخص سے جو کہ پیٹھ پھیرتا ہے ہماری نصیحت سے

وَلَمْ يُرِدْ اِلَّا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝۲۹ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ ۭ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ

اور نہیں ارادہ کرتا وہ مگر دُنیوی زندگی کا ۝۲۹ ان کے علم کا منتہا یہی ہے، بے شک تیرا رَبّ خوب جانتا ہے اس کو جو

ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ ۙ وَهُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اهْتَدٰى ۝۳۰ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ

اس کے راستے سے بھٹک گیا، اور وہ خوب جانتا ہے اس کو جو ہدایت یافتہ ہے ۝۳۰ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے

وَمَا فِي الْاَرْضِ ۙ لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَاۗءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ

اور جو زمین میں ہے، نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے بُرا کیا ان کے عملوں کا، اور بدلہ دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے

اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى ۝۳۱ۚ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰۗىِٕرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ ۭ

اچھائی اختیار کی، اچھائی کے ساتھ ۝۳۱ یہ وہ لوگ ہیں جو بچتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے سوائے کچھ آلودگی کے،

اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَاِذْ اَنْتُمْ

بے شک تیرا رَبّ وسیع مغفرت والا ہے، وہ خوب جانتا ہے تمہیں جس وقت اس نے پیدا کیا تھا تمہیں زمین سے، اور جب کہ تم

اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ ۚ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى ۝۳۲ۧ

بچے تھے اپنی ماؤں کے پیٹوں میں، پس تم اپنے آپ کو پاکیزہ قرار نہ دیا کرو، وہ خوب جانتا ہے اس کو جو کہ تقویٰ اختیار کرے ۝۳۲

تفسیر

شفاعتِ حقہ اور باطلہ میں فرق

وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا: کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں، نہیں فائدہ دے گی ان کی سفارش کچھ بھی، اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَاۗءُ: مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ اجازت دے دے جس کے لئے اللہ چاہے، وَيَرْضٰى: اور پسند کرلے، جس کے لئے سفارش کرنے کی اجازت دے دے فرشتے اس کے لئے ہی سفارش کرسکیں گے، اور جس کے لئے اللہ کو سفارش کرنا پسند ہو، اللہ کی رضا جہاں ہو، وہیں وہ سفارش کریں گے، یعنی بسا اوقات دُنیا میں ایک انسان دباؤ میں آکر اجازت دے دیتا ہے، دِل سے راضی نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ جو کسی کو سفارش کرنے کی اجازت دیں گے تو اللہ کی رضا بھی ساتھ شامل ہوگی، ایسا نہیں ہوگا کہ کسی کے دباؤ میں آکر اللہ تعالیٰ کسی کو سفارش کرنے کی اجازت دے دے، پھر اس کی سفارش ماننے پر مجبور ہو، ایسی بات نہیں ہے، فرشتے جو اللہ کے مقرب ہیں آسمان میں جن کی تعداد اللہ ہی جانتا ہے وہ بھی بغیر اللہ کی اجازت کے کوئی بات نہیں

کر سکتے، بغیر اللہ تعالیٰ کی رضا کے کسی کی سفارش نہیں کر سکتے، ان کی سفارش پر بھی اعتماد نہیں کیا جا سکتا، چہ جائیکہ تم اپنی طرف سے کچھ چیزیں تجویز کے ان کو اپنا شفیع گردان لو، ایسی بات نہیں ہے۔ تو یہ شفاعت کا عقیدہ چونکہ توحید کے خلاف تھا جس قسم کا انہوں نے اختیار کر رکھا تھا، اور اس عقیدے کے تحت اپنے آپ کو مذہبی ذمہ داریوں سے بری کئے ہوئے تھے، یہ چھوٹے چھوٹے سہارے ڈھونڈ کے وہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے بے نیاز ہو گئے تھے، اس لئے یہاں شفاعت کے عقیدے کی تردید کی جا رہی ہے، ''کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں کہ نہیں فائدہ دے گی ان کی سفارش کچھ بھی مگر بعد اس کے کہ اللہ تعالیٰ اجازت دے دے جس کے لئے چاہے اور پسند کر لے، جس کے لئے چاہے اجازت دے دے اور پسند کر لے'' یعنی سفارش کرنا اس کو پسند ہو، جس کے لئے وہ اجازت دے اور اس کی سفارش کرنا اس کو پسند ہو، تب جا کے اس کی سفارش مفید ہو سکتی ہے، جس کا مطلب یہ ہوا کہ مطلقاً شفاعت باطل نہیں، اُس نظریے کے تحت باطل ہے جو مشرکین کہا کرتے تھے، ورنہ ہم بھی انبیاء ﷺ کو شفیع مانتے ہیں، اولیاء کو شفیع مانتے ہیں، ملائکہ کو شفیع مانتے ہیں، علماء کو شفیع مانتے ہیں، شہداء کو شفیع مانتے ہیں، لیکن یہ اللہ کی مشیت اور اللہ کی رضا کے تحت ہوگی، اور ہوگی اہل ایمان کے لئے، اپنے اختیار کے ساتھ جس کو چاہیں بچا لیں ایسا نہیں ہو سکتا، اور نہ اللہ تعالیٰ ان کی بات ماننے کے لئے مجبور ہے۔ تو ہمارے عقیدے میں اور مشرکین کے عقیدے میں یہ فرق ہے، مطلقاً شفاعت کا ہم بھی انکار نہیں کرتے۔

کافر محض توہمات کی پیروی کرتے ہیں

اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ: بے شک وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں لاتے لَیُسَمُّوْنَ الْمَلٰٓئِكَةَ تَسْمِیَةَ الْاُنْثٰی: وہ نام رکھتے ہیں فرشتوں کا لڑکیوں کا نام، یعنی وہ فرشتوں کو لڑکیوں کے عنوان سے ذکر کرتے ہیں جن کا آخرت پر ایمان نہیں، یہ منکرینِ آخرت کا کام ہے، بے فکری کے ساتھ اس قسم کی باتیں کرتے ہیں، فرشتوں کو لڑکیاں قرار دے کر ان کو اللہ کی بنات قرار دیتے ہیں، وَمَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ: ان کے پاس اس بات کے متعلق کوئی علم نہیں، مِنْ عِلْمٍ یہ نکرہ تحت النفی ہے، ان کے پاس اس کے متعلق کوئی علم نہیں، اِنْ یَّتَّبِعُوْنَ اِلَّا الظَّنَّ: نہیں پیروی کرتے یہ مگر توہمات کی، بے دلیل خیالات کی وَاِنَّ الظَّنَّ لَا یُغْنِیْ مِنَ الْحَقِّ شَیْئًا: اور بے دلیل بات حق کے مقابلے میں کچھ مفید نہیں ہوا کرتی، فَاَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰی: پس آپ اعراض کر جائیں اس شخص سے جو کہ پیٹھ پھیرتا ہے، اتنی صفائی کے ساتھ سمجھایا جا رہا ہے پھر بھی وہ نہیں سمجھتا اور پیٹھ پھیر کے جا رہا ہے تو آپ بھی اس سے اعراض کر جائیے، اس کے پیچھے پڑنے کی کیا ضرورت ہے؟ ''اعراض کر جائیں آپ اس شخص سے جو پیٹھ پھیرتا ہے ہمارے ذکر سے''، تَوَلّٰی عَنْ ذِكْرِنَا: جو ہماری نصیحت سے پیٹھ پھیرتا ہے آپ بھی اس سے اعراض کر جائیے، وَلَمْ یُرِدْ اِلَّا الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا: اعراض کرتا ہے وہ ہمارے ذکر سے اور نہیں ارادہ کرتا وہ مگر دُنیوی زندگی کا، اس کا مقصود صرف دُنیوی زندگی ہے، دُنیا کی عیش و عشرت ہی چاہتا ہے، آخرت اس کے سامنے ہی نہیں۔

مشرکین کا مبلغِ علم صرف دُنیا ہے

ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ: ان کے علم کا منتہا یہی ہے، ان کے علم نے ان کو یہاں تک ہی پہنچایا، مبلغ علم ان کا یہی ہے کہ دُنیا کو

مقصود بنائے ہوئے ہیں، دُنیا کو ہی وہ سب کچھ سمجھتے ہیں، آخرت کی طرف ان کا ذہن ہی نہیں جاتا، ایسے لوگوں کے پیچھے پڑنے کی آپ کو بھی کیا ضرورت؟ آپ نے سمجھا کر اپنا فرض ادا کر دیا۔ اب یہاں مشرکینِ مکہ کو اس عنوان کے تحت اللہ نے ذکر کیا کہ ان کا مبلغِ علم صرف دُنیا ہی ہے، یہ دُنیا کی عیش وعشرت چاہتے ہیں، دُنیا کی ہی ان کو فکر ہے، آخرت کی ان کو فکر ہی نہیں، تو ایسے لوگوں کے پیچھے زیادہ پڑنے کی ضرورت نہیں۔

آج کے مسلمان کی قابلِ افسوس حالت

اب یہی حال ہم دیکھ رہے ہیں کہ آج کل اپنے آپ کو مؤمن اور مسلم کہلانے والوں کا بھی ہے، کہ صبح شام، رات دن ان کی سوچ اگر ہے تو صرف دُنیوی زندگی کے متعلق ہی ہے، ان کے پروگرام سے آخرت سرے سے خارج ہے، چوبیس گھنٹے میں کسی وقت بھی ان کو یہ خیال نہیں آتا کہ ہمیں کوئی ایسا کام بھی کر لینا چاہیے جو آخرت میں مفید ہو، دن رات، صبح شام اگر سوچتے ہیں تو یہی سوچتے ہیں کہ یہ چیز کیسے حاصل ہو جائے گی؟ یہ عمارت کیسے بن جائے گی؟ یہ جائیداد کس طرح سے ہو جائے گی؟ کاروبار کو ترقی کس طرح سے ہوگی؟ سرمایہ کس طرح سے جمع ہوگا؟ اور اچھا لباس اچھی خوراک کس طرح سے مہیا ہو سکتی ہے؟ اپنے لئے اپنی اولاد کے لئے اپنے متعلقین کے لئے اسی ساز وسامان کی فراہمی کے اسباب وہ جمع کرتے ہیں، ہر وقت اسی فکر میں رہتے ہیں، اُن کے اُوپر بالکل لفظ بلفظ یہ بات صادق آتی ہے کہ ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ، کہ یہ بھی سوائے دُنیوی زندگی کے اور کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتے، اور ان کے علم کا منتہا یہی ہے کہ یہاں تک ہی یہ جانتے ہیں، آگے ان کو کسی چیز کا پتا ہی نہیں۔ تو یہ مشرکین کا حال ہے جس کے اندر غفلت کی بنا پر اہلِ ایمان بھی مبتلا ہو گئے، اور ایسے لوگوں سے تو حضور ﷺ کو اَعْرِضْ عَنْ مَّنْ تَوَلّٰى: اعراض کا حکم دیا جا رہا ہے کہ آپ ان سے ویسے ہی منہ موڑ لیجئے، ان کی طرف آپ توجہ ہی نہ کیجئے، جن کا مقصود صرف دُنیوی زندگی ہی ہے، اور ان کے علم کا منتہا یہی ہے کہ وہ دُنیا کو جانتے ہیں اور آخرت کو جانتے ہی نہیں، تو سرورِ کائنات ﷺ کا ایسے لوگوں سے کیا تعلق؟ حدیث شریف میں جہاں علاماتِ قیامت ذکر کی گئی ہیں ان کے اندر ایک علامت یہ بھی ذکر کی گئی ہے: "وَتُعُلِّمَ لِغَيْرِ الدِّيْنِ"(۱) جس کا لفظی معنی یہ ہے کہ قیامت کے قریب جا کر غیرِ دین کے لئے علم حاصل کیا جائے گا، اس کا ایک مطلب تو شارحین یہ ذکر کرتے ہیں کہ لوگ دین پڑھیں گے، لیکن دین مقصود نہیں ہوگا، اُس دین کے علم کو بھی دُنیا کمانے کا ذریعہ بنائیں گے، یہ بات بھی اپنی جگہ صحیح ہے، اکثر مترجمین نے اس جملے کا ترجمہ یوں ہی کیا ہے، علم حاصل کیا جائے گا غیر دین کے لئے، یعنی دین کے لئے نہیں بلکہ غیرِ دین کے لئے علم حاصل کریں گے، اور "علم" سے مراد "علمِ دین" ہے، علمِ دین حاصل کریں گے لیکن دین مقصود نہیں ہوگا، اس کو بھی دُنیا کمانے کا ذریعہ بنائیں گے، علاماتِ قیامت میں یہ چیز ذکر کی گئی ہے۔

دُنیوی علوم کا غلبہ قیامت کی علامت

لیکن اس کا ایک مفہوم یہ بھی ہے کہ لوگوں کے تمام کے تمام علوم غیرِ دین کے لئے ہوں گے، دینی علوم لوگ حاصل نہیں

(۱) ترمذی ۴۵/۲ باب ما جاء فی اشراط الساعة/مشکوٰۃ ۴۷۰/۲ باب اشراط الساعة، فصل ثانی عن ابی ہریرۃ۔

کریں گے، اب آج آپ کی یونیورسٹیاں اور آپ کے کالج اور آپ کے مراکزِ علم جتنے بھی ہیں وہ سارے کے سارے اپنے طور پر علم کی تلقین کرتے ہیں، اور علم حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں، لیکن وہ علم دُنیا کا ہے، دِین کا نہیں ہے، توجس کا مطلب یہ ہوگا کہ علومِ دینیہ مٹ جائیں گے اور علومِ دُنیوی کا عام رواج ہوجائے گا، کہ لوگ علم تو حاصل کریں گے لیکن وہ علم دِین کا نہیں ہوگا، دُنیا کا ہوگا، اور آج آپ کی تعلیم گاہیں اور دانش گاہیں جتنی بھی ہیں، وہ سب کی سب تحصیلِ علم کا ذریعہ ہیں، لیکن علم لغیر الدین، اور یہ آپ کے سامنے ہے، اب اِن کے سارے علم کا منتہا کیا ہے؟ اسی دُنیا کی زیب وزینت، اس سے آگے ان کے پروگرام میں کوئی چیز ہے ہی نہیں، کہ ہم نے اپنی قبر کی زندگی یا حشر کی زندگی کے متعلق بھی سوچنا ہے، کسی کے نصاب کے اندر یہ چیز داخل نہیں ہے، بس اس میں جو کچھ پڑھایا پڑھایا جاتا ہے، حاصل اس کا یہی ہے کہ دولت کس طرح سے کمانی ہے؟ تعمیرات کس طرح سے کرنی ہیں؟ اور دُنیا کے اندر اپنی زندگی عیش وآرام کے ساتھ کس طرح سے گزارنی ہے؟ آمدنی کے ذرائع کیا ہیں؟ اور خرچ کس طرح سے کرنا ہے؟ لذتیں اور خواہشیں کس طرح سے پوری کی جاسکتی ہیں؟ ساری کی ساری صنعت اور ساری کی ساری تجارت اور ساری کی ساری کوشش جتنی بھی ہے وہ صرف اپنی لذات اور اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے لئے اور دُنیوی زیب وزینت کے حاصل کرنے کے لئے ہے۔

تو یہ حالات قابلِ افسوس ہیں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں ان کو مشرکین کی صفت کے طور پر ذِکر کیا ہے کہ یہ سوائے دُنیوی زندگی کے اور کسی چیز کا ارادہ نہیں کرتے اور ان کے علم کی منتہا یہی ہے، سورۂ رُوم کے اندر بھی لفظ آیا تھا: یَعْلَمُوْنَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَهُمْ عَنِ الْاٰخِرَةِ هُمْ غٰفِلُوْنَ: یہ صرف دُنیوی زندگی کو جانتے ہیں، آخرت سے بالکل غافل ہیں، بےفکر ہیں، ان کو پتا ہی نہیں ہے کہ یہ عارضی سی زندگی ہے اور اس زندگی کے بعد کوئی دُوسری زندگی بھی آنے والی ہے۔ تو جب تک آخرت کا فکر نہ ہو اس وقت تک انسان کی سوچ صحیح ہوتی ہی نہیں، اور جب انسان صرف دُنیا کو ہی سوچے گا تو دُنیا کو سوچنے کے لئے تو اپنی خواہشات کے پورا کرنے کے لئے جو ٹیڑھے سے ٹیڑھا راستہ اس کو اِختیار کرنا پڑے گا، کرے گا۔

اچھے اور بُرے لوگوں کا اَنجام

اِنَّ رَبَّكَ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنْ ضَلَّ عَنْ سَبِيْلِهٖ: بےشک تیرا رَبّ خوب جانتا ہے اس کو جو اس کے راستے سے بھٹک گیا، اور وہ خوب جانتا ہے اس کو جو سیدھے راستے پر چلنے والا ہے، ہدایت یافتہ ہے، دونوں فریق اللہ کے سامنے ہیں، اللہ سے کوئی چھپا ہوا نہیں ہے، وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ: اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے، لِيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَسَآءُوْا بِمَا عَمِلُوْا وَيَجْزِيَ الَّذِيْنَ اَحْسَنُوْا بِالْحُسْنٰى: یہ لام لامِ عاقبت ہے، اللہ کی بادشاہت، اللہ کی حکومت، اس کا نتیجہ یہ نکلے گا، کیونکہ اللہ کی بادشاہت اور اس کی حکومت کا تقاضا یہ ہے کہ جو اَحکام وہ جاری کریں، اللہ کی مخلوق ان اَحکام کو مانے، حکومت کے تحت یہی بات ہوا کرتی ہے کہ حاکم وقت ہدایات دیا کرتا ہے اور رعایا کے ذِمّے ہوتا ہے اُس کا ماننا، اور پھر ان اَحکام کے دینے سے دو فریق خود بخود ہی پیدا ہوجاتے ہیں کہ بعض فرماں بردار ہوتے ہیں، بعض نافرمان ہوتے ہیں، تو پھر اس حکومت کا نتیجہ یہ ہوگا کہ فرماں برداروں کو اچھا بدلہ دیا جائے گا، نافرمانوں کو سزا دی جائے گی، تو یہاں بھی اللہ تعالیٰ کی مالکیت اور حکومت ذِکر کرنے کے بعد نتیجۃً یہی دو باتیں

ذکر کی جا رہی ہیں، نتیجہ یہ نکلے گا لِیَجْزِیَ: "اللہ کی مالکیت اور اللہ کی حکومت کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ تعالیٰ بدلہ دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے بُرا کیا ان کے عملوں کا، اور بدلہ دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے اچھائی اختیار کی اچھائی کے ساتھ، حسنیٰ کے ساتھ بدلہ دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے بھلائی کی، اور ان کے اعمال کا بدلہ دے گا ان لوگوں کو جنہوں نے بُرے کام کیے"، یعنی اللہ کی حکومت اور اللہ کی مالکیت کے نتیجے میں یہ چیز آجائے گی، جو اللہ کے فرماں بردار ہیں وہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے اور جو اللہ کے نافرمان ہیں وہ اپنے کیے کا بدلہ پائیں گے، یہ نتیجہ نکلے گا اللہ تعالیٰ کی اس حاکمیت کا، اللہ کی مالکیت کا، اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمت کے تحت اس مخلوق کو پیدا کر کے جو اَحکام جاری کئے ہیں جس طرح سے حاکم وقت کیا کرتا ہے، یہ سمجھانے کے لئے بات کہی جا رہی ہے، کہ دُنیا کے اندر بھی دستور یونہی ہے کہ جو حاکم ہوتا ہے وہ رعایا کو اَحکام دیا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں دو قسم کے لوگ پیدا ہو جاتے ہیں، پھر ایک پر عنایات ہوتی ہیں، دوسرے کے اوپر عقاب اور سزا ہوتی ہے۔

"محسنین" کا مصداق

اَلَّذِیْنَ اَحْسَنُوْا: جو نیکوکار ہیں، جنہوں نے اچھے کام کئے اللہ تعالیٰ اُن کو بھلائی کے ساتھ بدلہ دے گا۔ وہ نیکوکار کون لوگ ہیں؟ محسنین کا مصداق کون لوگ ہیں؟ اَلَّذِیْنَ یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ: یہ وہ لوگ ہیں جو کہ بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں، اِلَّا اللَّمَمَ: لمم کہتے ہیں اصل کے اعتبار سے، مجرد سے ہو یا مزید سے ہو، لَمَمٌ، اِلْمَامٌ: کسی جگہ عارضی طور پر اُتر پڑنا، اِلْمَامٌ بِالْمَكَانِ: کسی جگہ عارضی طور پر اُتر پڑنا، تو یہاں لمم کا مصداق ہے کچھ آلودگی، "مگر کچھ آلودگی کبھی کوئی ہو جائے"، یہ ان کے محسن ہونے کے خلاف نہیں ہے، مطلب یہ ہے کہ محسن بننے کے لئے یہ ضروری ہے کہ بڑے بڑے گناہوں سے اجتناب کریں، بے حیائی کے کاموں سے بچیں، لیکن دُنیا میں رہتے ہوئے انسان کو بیسیوں حالات اس قسم کے پیش آجاتے ہیں کہ کہیں نہ کہیں انسان کا پاؤں کچھ لغزش کھا جاتا ہے، کچھ آلودگی ہو جاتی ہے، کبھی انسان کسی معصیت میں مبتلا ہو جاتا ہے، لیکن اس معصیت میں ان کا جا پڑنا ایسے ہی ہوتا ہے کہ جیسے بے اختیاری کے ساتھ کہیں قدم پڑ گیا اور فوراً انسان سنبھل گیا، چاہے وہ گناہ چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو، اگر انسان کسی وقت سہو اور نسیان کے ساتھ اس میں مبتلا ہو کے فوراً سنبھل جائے وہ لَمَمٌ کا مصداق ہے، ایسے گناہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتے ہیں۔ ہاں! البتہ اگر عادت ہی ڈال لی جائے، اور وہ جرم ایک عادت بن جائے تو ایسا کرنے والا "محسن" نہیں ہے۔ تو مطلب یہ ہوا کہ جو شخص معصیت کا عادی نہیں بنتا، اللہ تعالیٰ کی نافرمانی سے اور گناہ سے وہ بچتا ہے، بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے بچتا ہے، اور اگر کچھ اس کو کبھی آلودگی ہو بھی جائے، تو کچھ آلودگی کا مطلب یہ ہے کہ چھینٹا پڑا تھا، غلاظت لگی تھی، گندگی پہ پاؤں جا پڑا تھا، لیکن فوراً سنبھل گیا اور اپنے آپ کو صاف کر لیا، ایسے لوگ "محسنین" کا مصداق ہیں، اور جو جان کر کثرت کے ساتھ بڑے بڑے گناہ کرتے ہیں، بے حیائی کے کاموں میں مبتلا ہوتے ہیں، پھر توبہ کی طرف بھی متوجہ نہیں ہوتے، متنبہ نہیں ہوتے، یہ لوگ "محسنین" نہیں ہیں۔ تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک "محسنین" ہونے کے لئے یہ شرط نہیں کہ سرے سے گناہ صادر ہی نہ ہو، ہاں! البتہ یہ شرط ہے کہ گناہ کی عادت نہ بنے، اور اگر کبھی گناہ صادر ہو بھی

جائے تو فوراً توبہ کر کے اس کی صفائی کر لی جائے، جو طریقہ بھی اس کی صفائی کا ہے اور تلافی کا ہے، کیونکہ نفسانی تقاضے سے بسا اوقات انسان ماحول کی مجبوری سے، غفلت اور نسیان سے بھی اس قسم کے حالات میں مبتلا ہو جاتا ہے جو اللہ کو پسند نہیں، لیکن تنبہ ہو جانے کے بعد فوراً اللہ تعالیٰ کے سامنے اگر توبہ کر لی جائے تو ایسے لوگ ''محسنین'' میں شامل رہتے ہیں۔ اور جو ڈھیٹ ہو جائیں، معصیت کے اُوپر دلیر ہو جائیں، اور ان کو کبھی تنبہ ہی نہ ہو، کبھی ان کو یاد دلایا بھی جائے کہ یہ بُرا کام ہے تو کبھی سوچتے ہی نہیں کہ ہم اس کو چھوڑ دیں، یہ ''محسنین'' میں داخل نہیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ اِن کے لئے یہ تعریفی جملے نہیں فرما رہا، اور اس قسم کے لوگ اللہ کے ہاں حسنیٰ حاصل نہیں کر سکیں گے، یَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ یہ ''محسنین'' ہونے کے لئے گویا کہ شرط ہے، بُرے کاموں سے بچتے ہیں، بے حیائی کے کاموں سے بچتے ہیں اور بڑے بڑے گناہوں سے بچتے ہیں...... اور اِلَّا اللَّمَمَ کا مصداق صغائر بھی بنائے گئے ہیں، صغیرہ گناہ، چھوٹے گناہ، اس کا بھی یہی مطلب ہے کہ ''سوائے صغیرہ گناہوں کے، مگر صغیرہ گناہ'' کہ اُن سے اجتناب ''محسنین'' کا مصداق بننے کے لئے ضروری نہیں، یعنی ہم یہ کہیں کہ جس سے کوئی صغیرہ گناہ بھی صادر ہو جائے تو وہ بھی ''محسن'' نہیں، ایسا نہیں ہے، کیونکہ صغائر تو اتنی کثرت کے ساتھ ہیں کہ ان سے انسان کا بچنا بسا اوقات مشکل ہوتا ہے، لیکن بات وہی ہے کہ اُن کی بھی عادت نہیں بنانی چاہیے۔

''صغیرہ'' اور'' کبیرہ'' گناہ کی پہچان

باقی ''صغیرہ'' اور'' کبیرہ'' ان دونوں کے درمیان تقسیم کس انداز سے ہے یہ سورۂ نساء کے اندر تفصیل آپ کے سامنے آئی تھی وہاں بھی کچھ ایسے ہی لفظ تھے اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا (آیت:۳۱) جو مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ میں سے بڑوں بڑوں سے بچتے ہیں، چھوٹے چھوٹے گناہ ہم اُن کے معاف کر دیں گے، تو وہاں یہ صغیرہ اور کبیرہ کی تفصیل آپ کے سامنے کی گئی تھی۔ حاصل اس کا یہ ہے کہ محدثین، شارحین کہتے ہیں کہ ''کبیرہ گناہ'' وہ ہوتا ہے جس کے اُوپر ''نار'' کے ساتھ یا ''غضب'' کے ساتھ وعید آئی ہو، یا جس کے فاعل کے اُوپر ''لعنت'' کی گئی ہو، یا اس کے اندر نقصان کا پہلو اتنا ہی ہو جو ان گناہوں کے برابر ہے جن کے اُوپر قرآن وحدیث میں ''لعنت'' یا ''غضب'' یا ''نار'' کے ساتھ وعید آئی ہے۔ ''کبیرہ گناہ'' کی تعریف اس کے ساتھ کی گئی، اور اس کے علاوہ باقی ''صغیرہ'' ہیں۔ اور حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کی تحقیق آپ کے سامنے ذکر کی گئی تھی کہ مقاصد کے درجے میں جو گناہ ہوا کرتے ہیں وہ کبیرہ ہیں، اور ان گناہوں کے حاصل کرنے کے لئے جس قسم کے وسائل انسان کو اِختیار کرنا پڑتے ہیں وہ صغیرہ ہیں، مثال کے طور پر شہوت پرستی کے سلسلے میں مقصد تو ہے جس کو آپ ''زِنا'' کہتے ہیں، ''ادخال الفرج فی الفرج'' لیکن یہاں تک پہنچنے کے لئے انسان کو کتنے جتن کرنے پڑتے ہیں، دِل میں سوچتا ہے، قدموں کے ساتھ چل کے جاتا ہے، آنکھوں کے ساتھ دیکھتا ہے، زبان کے ساتھ باتیں کرتا ہے، بہلاتا پھسلاتا ہے، ہاتھ بڑھاتا ہے، چھیڑ چھاڑ کرتا ہے، کتنے سلسلے پہلے انسان کو اِختیار کرنے پڑتے ہیں، یہ وسائل کے درجے میں ہیں، یہ ''وسائل'' جو ہیں یہ ''سیئات'' ہوتے ہیں، ''صغائر'' ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص ان ''وسائل'' کو اِختیار کرے، لیکن تنبہ کے بعد وہ بڑے گناہ سے بچ گیا جو اصل مقصد ہے، تو پھر

اللہ تعالیٰ یہ جو''وسائل'' ہیں عبادت کی برکت سے اور دُوسرے نیک کاموں کی برکت سے دُور فرمادیتے ہیں، اور اگر اِنسان مقصد تک پہنچ گیا، اُس بڑے گناہ تک پہنچ گیا تو پھر سارے کا سارا سلسلہ اوّل سے لے کر آخر تک ''کبیرہ گناہ'' بن جایا کرتا ہے، جس وقت تک وہ زِنا معاف نہیں ہوگا، اس کے مقدمات کے طور پر وہ بُرے خیالات، وہ قدم کا اُٹھانا، ہاتھ کا بڑھانا، آنکھ کا دیکھنا، زبان سے بات کرنا، یہ سارے کے سارے سلسلے پھر زِنا قرار پاجاتے ہیں، اس وقت تک یہ معاف نہیں ہوں گے جس وقت تک کہ اصل گناہ معاف نہ ہو۔ تو مقاصد اور وسائل کے اعتبار سے فرق کردیا گیا۔ جیسے چوری ہے، چوری میں اصل تو ہے کہ کسی کا مال اُٹھالیا جائے، کسی کی حق تلفی کردی گئی، ناجائز اس کا مال لے لیا، لیکن چوری کرنے کے لئے پہلے انسان کو کتنے وسائل اختیار کرنے پڑتے ہیں، تو یہ وسائل ''صغیرہ'' رہتے ہیں جس وقت تک کہ انسان اس مقصد تک نہ پہنچے، مقصد تک پہنچنے کے بعد پھر یہ سارا سلسلہ جو ہے وہ ''کبیرہ'' ہوجاتا ہے۔ تو یہ ''صغائر'' اور ''کبائر'' کی یہ تفصیل آپ کے سامنے سورۂ نساء میں کی گئی تھی، سورۂ نساء کے اُوپر حاشیہ بھی حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کا ہے، یہ جو قرآنِ کریم 'فوائدِ عثمانی' کے نام سے چھپا ہوا ہے، اس میں سورۂ بقرہ اور سورۂ نساء کا حاشیہ بھی شیخ الہند رحمہ اللہ کا ہے، ترجمہ تو سارا شیخ الہند رحمہ اللہ کا ہے، ان دوسورتوں کے اُوپر حاشیہ بھی شیخ الہندؒ کا ہے، تو حضرت شیخ الہند رحمہ اللہ کے قلم سے ہی سورۂ نساء کے اندر اس کی تفصیل موجود ہے، اِنْ تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ خطاب کے صیغے کے ساتھ ہے۔ ''جو بچتے ہیں بڑے بڑے گناہوں سے اور بے حیائی کے کاموں سے سوائے لمم کے، سوائے کچھ آلودگی کے'' یعنی اس سے بچنا ''محسن'' بننے کے لئے ضروری نہیں، شرط نہیں، اس کا مصداق دونوں باتیں آگئیں، کہ یا تو آلودگی سے مراد ہے کہ جو اِنسان سے دفعۃً کوئی گناہ ہوجاتا ہے اور پھر فوراً اس سے توبہ کرلے، پھر چاہے وہ چھوٹا ہو چاہے بڑا ہو، اس قسم کا گناہ کہ جس میں مبتلا ہوتے ہی متنبہ ہونے کے بعد اِنسان توبہ کرلے صدقِ دل سے، جو توبہ کی شرطیں ہیں، اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ يَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِيْبٍ، یہ آیت جو توبہ کے لفظ کے تحت ذِکر کی گئی تھی، یہ مضمون بھی سورۂ نساء (آیت:۱۷) کے اندر ہی آیا تھا، تو اس طرح سے توبہ کرلیں تو یہ ''محسن'' بننے کے خلاف نہیں۔ یا پھر اس سے ''صغائر'' مراد ہیں۔

گناہ پر مایوسی اور نیکی پر اِترانا دونوں ہی غلط

اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ: بے شک تیرا ربّ وسیع مغفرت والا ہے، هُوَ اَعْلَمُ بِكُمْ اِذْ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ: وہ خوب جانتا ہے تمہیں جس وقت اس نے پیدا کیا تھا تمہیں مٹی سے، زمین سے، وَاِذْ اَنْتُمْ اَجِنَّةٌ فِيْ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ: اور جبکہ تم جنین تھے، اجنّہ جنین کی جمع ہے، جنین بچے کو کہتے ہیں جو ماں کے پیٹ میں ہوتا ہے، ''اور جبکہ تم جنین تھے اپنی ماؤں کے پیٹوں میں'' فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ: پس تم اپنے آپ کو پاکیزہ قرار نہ دیا کرو، هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى: وہ خوب جانتا ہے اس کو جو کہ تقویٰ اختیار کرے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ وسیع مغفرت والا ہے اس لئے گنہگاروں کو مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں، مایوسی کی کوئی بات نہیں، توبہ کریں اللہ تعالیٰ بخش بھی دیتے ہیں، اور اگر کسی کو نیکی کی توفیق ہوگئی تو نیکی کی توفیق ہوجانے کے بعد انسان کو اِترانا اور اکڑنا نہیں چاہیے، اللہ تعالیٰ ہی

جانتے ہیں حقیقتاً کہ کس کی طبیعت میں نیکی ہے؟ کس کی طبیعت میں نیکی نہیں؟ بسا اوقات ایک آدمی ظاہری اعمال نیک کرتا ہے لیکن اس کے باطن میں کچھ ایسی خرابیاں ہوتی ہیں کہ وہ نیکی برباد ہو کر رہ جاتی ہے، تو اِنسان اپنی نیکی کے اُوپر اعتماد کر کے اپنی تعریف کیا کرے؟ اور پھر آپ جانتے ہیں کہ خاتمہ معلوم نہیں کہ کس حالت پہ ہوگا؟ مدار خاتمے پر ہے! اگر ایک آدمی زندگی بھر نیکی کرتا رہا لیکن آخر عمر میں جا کے اس نے کُفر اختیار کر لیا تو نیکی ساری برباد ہوگئی، اس لئے کسی شخص کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو پاکیزہ قرار دے، اپنے نفس کو پاکیزہ قرار دے، اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ کون ہدایت یافتہ ہے اور کون نہیں۔ تو گنہگاروں کو مایوس نہیں ہونا چاہیے کہ اِنَّ رَبَّكَ وَاسِعُ الْمَغْفِرَةِ، اور نیکی کی توفیق ہو جانے کے بعد کسی انسان کو غرور میں نہیں پڑنا چاہیے کہ حقیقتِ حال اللہ ہی جانتے ہیں، اور اتنا جانتے ہیں کہ تم بھی اپنے آپ کو نہیں جانتے، جب تمہاری اِبتدا مٹی سے ہوئی تھی اللہ اس وقت بھی جانتا تھا، اور جب تم اپنی ماں کے پیٹوں میں جنین تھے اس وقت بھی اللہ تمہیں جانتا تھا، اور آئندہ تمہارا کیا خاتمہ ہونے والا ہے؟ یہ بھی اللہ ہی جانتا ہے! تو حقیقتِ حال اللہ جانتا ہے، تم اپنے نفسوں کو پاکیزہ قرار نہ دیا کرو، نیکی کی توفیق ہو جائے تو اللہ کا شکر اَدا کرو، لیکن نیکی کر کے بھی ڈرتے رہو کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کے اندر کوئی اس قسم کی خرابی پیدا ہوگئی ہو، رِیا کا جذبہ ہو، یا کوئی اور اس قسم کی خرابی پیدا ہو جائے جس کے ساتھ نیکی برباد ہو جائے، ''اَلْاِیْمَانُ بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاءِ'' نیکی کر کے انسان کو اُمید بھی رکھنی چاہیے اللہ سے کہ اللہ اس کو قبول کر لے، اور ساتھ ساتھ ڈرتے بھی رہنا چاہیے کہ کوئی ایسی کوتاہی ہم سے نہ ہو جائے جس کی بنا پر یہ نیکی برباد ہو جائے۔ تو نیکوں کے لئے اِترانے کی اور غرور میں آنے کی کوئی بات نہیں، اور گنہگاروں کو مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔

اَفَرَءَيْتَ الَّذِيْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ

کیا پھر آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے پیٹھ پھیری؟ ﴿۳۳﴾ اور دیا اس نے تھوڑا سا اور رک گیا ﴿۳۴﴾ کیا اس کے پاس غیب کا علم ہے پھر وہ

يَرٰى ﴿۳۵﴾ اَمْ لَمْ يُنَبَّاْ بِمَا فِيْ صُحُفِ مُوْسٰى ﴿۳۶﴾ وَاِبْرٰهِيْمَ

دیکھ رہا ہو؟ ﴿۳۵﴾ کیا اس کو خبر نہیں دی گئی اس بات کی جو موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے ﴿۳۶﴾ اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے

الَّذِيْ وَفّٰى ﴿۳۷﴾ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾

ایسا ابراہیم جس نے قول و اقرار کو پورا کیا ﴿۳۷﴾ (وہ بات یہ ہے) کہ نہیں بوجھ اُٹھائے گا کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دوسرے نفس کا بوجھ ﴿۳۸﴾

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ

اور نہیں ہے انسان کے لئے مگر وہی جو اس نے کوشش کی ﴿۳۹﴾ اور اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی ﴿۴۰﴾ پھر اس کو پورا پورا بدلہ

الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾ وَاَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى ﴿۴۲﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَضْحَكَ وَاَبْكٰى ﴿۴۳﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَمَاتَ وَ

دیا جائے گا ﴿۴۱﴾ اور یہ بات کہ منتہا تیرے ربّ کی طرف ہی ہے ﴿۴۲﴾ اور یہ بات کہ وہی ہنساتا ہے اور وہی رُلاتا ہے ﴿۴۳﴾ وہی موت دیتا ہے

اَحْيَا ﴿۴۴﴾ وَاَنَّهٗ خَلَقَ الزَّوْجَيْنِ الذَّكَرَ وَالْاُنْثٰى ﴿۴۵﴾ مِنْ نُّطْفَةٍ اِذَا تُمْنٰى ﴿۴۶﴾ وَاَنَّ

وہی زندگی دیتا ہے ﴿۴۴﴾ اسی نے دونوں قسمیں پیدا کیں مذکر اور مؤنث ﴿۴۵﴾ ایک ہی نطفے سے جب کہ وہ ٹپکایا جاتا ہے ﴿۴۶﴾ اور یہ بات کہ

عَلَيْهِ النَّشْاَةَ الْاُخْرٰى ﴿۴۷﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَقْنٰى ﴿۴۸﴾ وَاَنَّهٗ هُوَ رَبُّ الشِّعْرٰى ﴿۴۹﴾

اسی کے ذِمّے ہے دوبارہ اُٹھانا ﴿۴۷﴾ اور یہ بات کہ وہی غنی بناتا ہے اور وہی (اس دولت کو) محفوظ رکھتا ہے ﴿۴۸﴾ اور یہ بات کہ شعریٰ کا ربّ وہی ہے ﴿۴۹﴾

وَاَنَّهٗۤ اَهْلَكَ عَادَا الْاُوْلٰى ﴿۵۰﴾ وَثَمُوْدَا فَمَاۤ اَبْقٰى ﴿۵۱﴾ وَقَوْمَ نُوْحٍ مِّنْ قَبْلُ ؕ اِنَّهُمْ كَانُوْا

اور یہ بات کہ اسی نے ہلاک کیا عادِ اُولیٰ کو ﴿۵۰﴾ اور ثمود کو، پھر باقی نہیں چھوڑا ﴿۵۱﴾ اور قوم نوح کو اس سے قبل، بے شک یہ لوگ

هُمْ اَظْلَمَ وَاَطْغٰى ﴿۵۲﴾ وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى ﴿۵۳﴾ فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى ﴿۵۴﴾

ظالم اور طاغی تھے ﴿۵۲﴾ اور پلٹا کھانے والی بستیوں کو بھی اسی نے گرایا ﴿۵۳﴾ پھر ڈھانپ لیا ان بستیوں کو جس چیز نے ڈھانپا تھا ﴿۵۴﴾

فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى ﴿۵۵﴾ هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى ﴿۵۶﴾ اَزِفَتِ

اے مخاطب! تو اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمت میں جھگڑا کرے گا ﴿۵۵﴾ یہ ڈرانے والا ہے پہلے ڈرانے والوں میں سے ﴿۵۶﴾ قریب آنے والی

الْاٰزِفَةُ ﴿۵۷﴾ لَيْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَةٌ ﴿۵۸﴾ اَفَمِنْ هٰذَا الْحَدِيْثِ تَعْجَبُوْنَ ﴿۵۹﴾

قریب آگئی ﴿۵۷﴾ نہیں ہے اس کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی دُور ہٹانے والا ﴿۵۸﴾ کیا پھر تم اس بات سے تعجب کرتے ہو؟ ﴿۵۹﴾

وَتَضْحَكُوْنَ وَلَا تَبْكُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاَنْتُمْ سٰمِدُوْنَ ﴿۶۱﴾ فَاسْجُدُوْا لِلّٰهِ وَاعْبُدُوْا ﴿۶۲﴾

اور ہنستے ہو اور روتے نہیں ہو ﴿۶۰﴾ اس حال میں کہ تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو ﴿۶۱﴾ پھر تمہیں چاہیے تم اللہ ہی کو سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو ﴿۶۲﴾

تفسیر

اَفَرَءَيْتَ الَّذِیْ تَوَلّٰى ﴿۳۳﴾ وَاَعْطٰى قَلِيْلًا وَّاَكْدٰى ﴿۳۴﴾ اَعِنْدَهٗ عِلْمُ الْغَيْبِ فَهُوَ يَرٰى: کیا پھر آپ نے دیکھا اس شخص کو جس نے پیٹھ پھیری، اور دیا اس نے تھوڑا سا، اور پھر وہ رُک گیا۔ اَكْدٰى: اصل میں عربی میں محاورہ آیا کرتا ہے: اَكْدَى الْحَافِرُ، کہ زمین کھودنے والا جس وقت زمین کھودے اور اس کے آگے کوئی ٹھوس چٹان آجائے جس کو وہ توڑ نہ سکے اور وہ کھودنے سے رُک جائے، اس کو کہتے

ہیں: ''اَکْدَی الْحَافِرُ'' کھودنے والا کُدیہ یعنی چٹان کے آجانے کی وجہ سے رُک گیا، یہاں مطلب یہ ہے کہ مشرکین مکہ ہوں یا دُوسرے جو بھی اس طرح کے لوگ ہیں، اللہ نے ان کو مال دیا ہے، بخل کرتے ہیں اور مال کی محبت کے اندر اللہ کی نافرمانی کرتے ہیں، اگر بھی کوئی خرچ کرنے کی ترغیب دیتا بھی ہے تو تھوڑا سا دیتے ہیں، پھر بخل کے جذبے کے ساتھ رُک جاتے ہیں، ان کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے۔

شانِ نزول

اور خاص طور پر یہاں مفسرین نے اس کے شانِ نزول میں ولید بن مغیرہ کا واقعہ نقل کیا ہے، کہ اُس کی کچھ رغبت اسلام کی طرف ہوئی لیکن کسی دُوسرے شیطان نے، اس کے دوست نے بہکایا کہ تُو اسلام نہ لا، وہ کہنے لگا کہ میں ڈرتا ہوں جس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ آخرت میں یوں عذاب ہوگا، مرنے کے بعد اُٹھنا ہے۔ وہ کہنے لگا: چھوڑ ان باتوں کو، میرے ساتھ تو معاہدہ کرلے، میں بچانے کا ذمہ دار ہوں، اگر ایسا ہوا تو تیرے گناہ میں اپنے سَر ڈال لوں گا لیکن شرط یہ ہے کہ تُو مجھے اتنی رقم دے دے، میرے ساتھ یہ معاہدہ کرلے۔ اس نے معاہدہ کرلیا، لیکن وہ بخل کی بنا پر جتنی رقم طے ہوئی تھی اتنی بھی نہ دے سکا، کچھ دیا پھر رُک گیا، پھر کنارہ کشی اس نے اختیار کی (آلوسی)۔ تو اللہ تعالیٰ اس ایک شخص کو سامنے رکھ کر جو بات بیان فرمارہے ہیں، تو جتنے اشخاص بھی ایسے ہوں گے، سب کے لئے یہ تنبیہ ہوجائے گی کہ مال کے ساتھ محبت اتنی ہے کہ یہ دینا نہیں چاہتے، تھوڑا دیتے ہیں، پھر رُک جاتے ہیں، یا اللہ کے نام پر بھی خرچ کرنے کا جذبہ ان میں نہیں ہے، تو بھی خرچ کرنے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں، تو پھر رُک جاتے ہیں، تو جتنے بھی بخیل ہیں سب اس کی زد میں آجائیں گے، رُک جاتے ہیں اس خیال سے کہ ہم اگر مال خرچ کریں گے تو مال ختم ہوجائے گا، پھر ہمیں ملے گا نہیں، تو اللہ اس قسم کے لوگوں کو سامنے رکھ کر یہ جو تفہیم کررہے ہیں، تو جو بھی ایسا ہوگا اس کے اُوپر صادق آجائے گی۔

اللہ کے راستے میں خرچ نہ کرنے والوں کے خیالات

''آپ نے دیکھا؟ ایسے شخص کو جس نے منہ پھیرا، اور دیا تھوڑا سا، اور رُک گیا، کیا اس کے پاس علمِ غیب ہے، پھر وہ دیکھ رہا ہے غیب کے حالات کو؟'' وہ سمجھتا ہے کہ پیسے دینے کے ساتھ اس طرح سے میں کوئی معاہدہ کرکے آخرت کے عذاب سے بچ جاؤں گا، کیا علمِ غیب اس کو حاصل ہوگیا؟ اس نے آخرت کے حالات کو دیکھ لیا؟ یا اگر اس کے دِل میں یہ وہم آتا ہے کہ میں خرچ کروں گا تو فقیر ہوجاؤں گا، پھر بعد میں مجھے اپنی ضروریات کے لئے کچھ نہیں ملے گا، آنے والے حالات کے متعلق اس کو کیا علم ہے؟ جو اِنفاق کی ترغیب دینے کے باوجود بھی خرچ نہیں کرتا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے بار بار اس وعدے کے باوجود خرچ نہیں کرتا کہ ''جو خرچ کروگے اللہ اُس کا بدل دیتا ہے اور خرچ کرنے کے ساتھ مال ختم نہیں ہوا کرتا'' تو کیا آنے والے حالات کا اُس کو علم حاصل ہوگیا، وہ آنے والے حالات کو دیکھ رہا ہے؟ وہ یہ سمجھتا ہے کہ میں خرچ نہیں کروں گا تو جو مال بچا رہے گا وہ میرے لیے مفید ہے، خرچ کرنے کی صورت میں میں محتاج ہوجاؤں گا، کیا آنے والے حالات کا اُس کو پتا چل گیا؟ یا اس نے غیب پر اطلاع پالی؟

جو وہ سمجھتا ہے کہ اس قسم کے معاہدوں کے ساتھ آخرت کے عذاب سے بچا جاسکتا ہے اور یہ شخص اس کو بچالے گا، "کیا اُس کے پاس غیب کا علم ہے؟ پھر وہ دیکھ رہا ہو۔"

موسیٰ علیہ السلام اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں مذکور مضامین

اَمْ لَمْ یُنَبَّاْ بِمَا فِیْ صُحُفِ مُوْسٰی: کیا اس کو خبر نہیں دی گئی اس بات کی جو موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں ہے، ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں جو بات لکھی ہوئی ہے کیا اس شخص کو اس کی خبر نہیں؟ وہ کیا بات ہے وہ آگے ذکر کی جارہی ہے، اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی صفت کے طور پر آ گیا اَلَّذِیْ وَفّٰی: ایسا ابراہیم جس نے وفا کی، اللہ کے اَحکام کو پورا پورا اَدا کیا، یہ بات ان کی صفت کے طور پر ذکر کردی گئی، وہ ابراہیم جس نے اپنے قول واقرار کو پورا کیا، اور یہ قول واقرار کو پورا کرنے کا ذکر بھی سورۂ بقرہ میں آیا تھا: اِذِ ابْتَلٰۤی اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ، اس آیت کے تحت ذِکر کیا گیا تھا کہ کیسی کیسی باتیں اللہ کی طرف سے ابراہیم علیہ السلام کو کہی گئیں، اور ابراہیم علیہ السلام نے جو اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کہہ کر اللہ کے ساتھ معاہدہ کیا کہ میں فرماں بردار ہوں تو اس قول کو کس طرح سے نبھایا، "اور ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں، ایسا ابراہیم جس نے اپنے قول واقرار کو پورا کیا۔"

"اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ" پر ایک اِشکال اور اس کا جواب

وہ بات یہ ہے، جو موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں بھی ہے اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں میں بھی ہے، اور اِس بات کی اِن سب کو خبر ہونی چاہیے، وہ بات یہ ہے کہ اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ۙ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى: نہیں بوجھ اُٹھائے گا کوئی بوجھ اُٹھانے والا کسی دُوسرے نفس کا بوجھ، وِزر گناہ کے بوجھ کو کہتے ہیں، معاملہ آخرت کا ذِکر کیا جارہا ہے، کہ جس شخص نے گناہ کیا ہے آخرت میں اس گناہ کا بوجھ اسی پہ ہی پڑے گا، کوئی دُوسرا نفس کسی دُوسرے نفس کے گناہ کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا، یعنی ایسے طور پر نہیں اُٹھائے گا کہ دُوسرا بالکل بری الذمہ ہوجائے، یہ لفظ جو بڑھائے جارہے ہیں وہ اس مقصد کے لئے بڑھائے جارہے ہیں کہ اَحادیثِ صحیحہ کے اندر یہ مضمون آتا ہے کہ "مَنْ سَنَّ سُنَّةً سَيِّئَةً فَلَهٗ وِزْرُهَا وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ" (مظہری) جو کوئی شخص بُرا طریقہ جاری کردے تو اس کو اس بُرا طریقہ جاری کرنے کا بھی گناہ ہے، یہ اس کا اپنا عمل ہے، "وَوِزْرُ مَنْ عَمِلَ بِهَا اِلٰى يَوْمِ الْقِيَامَةِ" اور قیامت تک جو لوگ اس بُرے طریقے کے اُوپر عمل کرتے رہیں گے، ان کا گناہ بھی اس پہلے شخص کو ہوگا، لیکن پہلے شخص کو جو گناہ ہوگا اس کا یہ مطلب نہیں کہ اِن دُوسرے عمل کرنے والوں کا بوجھ وہ اُٹھالے گا، اور یہ بَری الذمہ ہوجائیں گے، ایسا نہیں، بُرائی کرنے والوں کو اپنی جگہ مستقل گناہ ہے، چونکہ اس بُرائی کی اِشاعت کا وہ شخص سبب بنا تھا تو سبب بننے کی بنا پر آئندہ بُرائی کرنے والوں کے برابر گناہ اس کو بھی ہوگا، لیکن یہ گناہ جو اُس کا ہوگا، یہ اِن کے گناہ کے اندر کوئی کسی قسم کی کمی نہیں کرے گا، اس لئے مطلب اس کا یہ ہوگا کہ کوئی شخص کسی دُوسرے کے گناہ کا بوجھ ایسے طور پر نہیں اُٹھائے گا کہ وہ بَری الذمہ ہوجائے، ہاں! البتہ ایک آدمی گناہ کرتا ہے تو گناہ گار پر بھی گناہ کا بوجھ ہوگا اور جس نے اس گناہ کی ترغیب دی ہے، جو اس گناہ کے شائع ہونے کا سبب بنا ہے، وہ بھی برابر کا مجرم ہے، اور اِس کے برابر گناہ اُسے بھی ہوگا، لیکن اُس کو گناہ ملنا، اِس کے گناہ کے اندر کوئی کسی قسم کی کمی نہیں

کرے گا، اس لئے کرنے والا بھی مجرم، اور جو اس کرنے کا سبب بنا، جس نے ترغیب دی، جس نے بُرائی کا طریقہ جاری کیا، وہ بھی برابر کا مجرم۔ حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ دُنیا کے اندر جس وقت بھی ظلماً قتل ہوتا ہے، کوئی شخص کسی دُوسرے کو ظلماً قتل کرتا ہے، تو قاتل کے برابر گناہ آدم علیہ السلام کے اس بیٹے کو بھی ہوتا ہے جس نے قتل کا طریقہ جاری کیا تھا، قابیل جس نے اپنے بھائی ہابیل کو قتل کیا تھا، پہلا جرم زمین کے اُوپر قتل کا صادر ہوا ہے تو آدم کے دو بیٹوں میں، قاتل ہے قابیل، اور مقتول ہے ہابیل، تو ہابیل کو قابیل نے جو قتل کیا تھا تو اس نے قتل کی سنت جاری کی، تو جو بھی ظلماً قتل ہوگا تو قابیل گناہ کے اندر برابر کا شریک ہے۔[1] تو اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى کا مطلب یہ ہوگیا کہ فاعل پر اپنا جرم بھی ہوگا، لیکن سبب کے طور پر اس شخص کو بھی اس گناہ میں حصہ ملے گا جس نے کسی درجے میں اس کے ساتھ معاونت کی ہے، ترغیب دی ہے، یا اس گناہ کے جاری ہونے کا سبب بنا، کوئی شخص دُوسرے کا گناہ اس طرح سے نہیں اُٹھالے گا کہ اُس کو بَری الذمہ کردے۔

''اِلَّا مَا سَعٰى'' میں ''سعیِ ایمانی'' مُراد ہے

وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى: اور نہیں ہے انسان کے لئے مگر وہی جو اس نے کوشش کرلی۔ اپنی کوشش انسان کے سامنے آئے گی جو بھی وہ کوشش کرلے، اصل کے اعتبار سے یہاں مسئلہ ذِکر کیا جارہا ہے آخرت کا، کہ آخرت میں انسان اگر فائدہ اُٹھائے گا تو اپنی کوشش سے اُٹھائے گا، اور یہاں چونکہ ذِکر آرہا ہے شانِ نزول کے طور پر مشرکین کا اور مسئلہ تھا ایمان کا، اس لئے مفسرین نے اس ''سعی'' کو ''سعیِ ایمان'' کے ساتھ متعلق کیا ہے، کہ جو شخص ایمان لائے گا وہی اپنے ایمان سے فائدہ اُٹھائے گا، ایسا نہیں ہوسکتا کہ کوئی شخص ایمان لے آئے اور اس کے ایمان سے دُوسرا شخص فائدہ اُٹھالے، اگر کوئی شخص ایمان لانے والی کوشش نہیں کرے گا، ایمان نہیں لائے گا، تو کسی دُوسرے کے ایمان سے اس کو کوئی کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اور یہ معاہدہ کرنے والا یہ تو خود بھی مؤمن نہیں تھا، اس کے پاس تو اپنا بھی ایمان نہیں تھا، تو اس سے فائدہ تو کیا پہنچنا ہے! تو ''سعی'' سے ''سعیِ ایمان'' مراد لے لی جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ جو شخص کوشش کرکے ایمان دُنیا میں لے آئے وہی آخرت میں اس ایمان سے فائدہ اُٹھائے گا، ایک شخص کے ایمان سے دُوسرا شخص فائدہ نہیں اُٹھاسکتا، کہ اپنے پاس ایمان نہیں تھا اور دُوسرا شخص ایمان لایا تھا اور اُس کا ایمان اِس کو دے دیا جائے، یا اُس کے ایمان سے یہ فائدہ اُٹھالے، آخرت میں یہ نہیں ہوگا، یہ ہے اِس آیت کا صحیح مفہوم، اپنی کوشش انسان کے سامنے آئے گی، کسی دوسرے کی کوشش سے کوئی شخص فائدہ نہیں اُٹھاسکے گا یعنی باختیارِ خود۔

دو اہم مسئلے!

یہاں دو مسئلے ہیں، ایک قدیم مفسرین نے یہاں ذِکر کیا، اور ایک جدید محرفین نے ذِکر کیا۔ قدیم مفسرین نے تو یہاں مسئلہ ذِکر کیا ایصالِ ثواب کا، کہ قرآنِ کریم کے یہ الفاظ بتاتے ہیں کہ آخرت میں اپنی ہی کوشش کام آئے گی، تو پھر ہم جو ایک

---

(۱) بخاری ۱/ ۴۶۹ باب خلق آدم / مسلم ۲/ ۶۰ / مشکوٰۃ ۱/ ۳۲، کتاب العلم۔ لَا تُقْتَلُ نَفْسٌ ظُلْمًا اِلَّا كَانَ عَلَى ابْنِ آدَمَ الْاَوَّلِ كِفْلٌ مِنْ دَمِهَا لِاَنَّهُ اَوَّلُ مَنْ سَنَّ الْقَتْلَ.

دُوسرے کو ثواب پہنچاتے رہتے ہیں تو اس کا کیا مسئلہ ہوا، کہ یہ ثواب پہنچانا بھی ٹھیک ہے یا نہیں؟ یہ مسئلہ تو قدیم مفسرین نے یہاں ذکر کیا ہے، تمام تفسیروں میں مذکور ہے۔ اور جدید محرّفین نے ذکر یہ کیا کہ کمیونسٹوں والا اُصول یہاں سے نکلتا ہے کہ مزدور کی کمائی سے سرمایہ دار فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، جو کوشش کرے محنت کرے آمدنی اسی کی ہوگی، اور وہ یہی آیت پڑھتے ہیں کہ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى: انسان کے لئے وہی کچھ ہے جو وہ کوشش کرلے، کسی کی محنت سے دُوسرا فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، جو محنت کرے گا سرمایہ اسی کا ہوگا، وہ کمیونسٹوں والا اُصول یہاں قرآنِ کریم سے نکالے بیٹھے ہیں۔

پہلا مسئلہ: کمیونسٹوں کا ''اِلَّا مَا سَعٰى'' سے اِستدلال اور اس کا جواب

تو یہ دُوسری بات تو بالکل ہی باطل ہے، عقل ونقل دونوں کے خلاف ہے۔ دُنیا کے اندر تقسیمِ دولت کس طرح سے ہے؟ قرآن وحدیث کے اندر اس بات کو خوب اچھی طرح سے واضح کردیا گیا ہے، یہ کوئی مخفی چیز نہیں، کہ دُنیا میں کوئی شخص ایک کی محنت سے دُوسرا فائدہ اُٹھا سکتا ہے یا نہیں اُٹھا سکتا، قرآن اور حدیث کے اندر اس کو پوری طرح سے واضح کردیا گیا ہے، ''مضاربت'' اور ''مزارعت'' یہ دو عقد دُنیا میں ایسے ہیں جن کی اسلام نے اجازت دی ہے۔ ''مضاربت'' پر تو تمام اُمت کا اجماع ہے، اس میں کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں، ''مضاربت'' کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایک آدمی سرمایہ دے، دُوسرا آدمی تجارت کرے، نفع کے اندر دونوں شریک ہوجائیں، یہ اُمت کا متفق علیہ مسئلہ ہے، جس کے اندر کسی ایک فرد کا بھی اختلاف نہیں ہے، کہ ایک کا سرمایہ ہو، دُوسرا آدمی تجارت کرتا ہے، نفع جو ہوگا دونوں کے درمیان حصہ کے مطابق تقسیم ہوجائے گا، جو حصے آپس میں بنالئے جائیں، تو یہ ایک قطعی جزیہ ہے جس میں یہ بات واضح ہے کہ سرمایہ ایک کا، محنت ایک کی، ثمرہ دونوں کھائیں، یہ ایک اجماعی مسئلہ ہے۔ اور ''مزارعت'' بھی ائمۂ اَربعہ کی فقہ میں متفق علیہ ہے، اگرچہ کچھ اختلافی اقوال اس میں پائے جاتے ہیں، لیکن تعاملِ اُمت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس وقت تک یہی ہے کہ ''مزارعت'' پر زمین دی جاتی ہے، تو جب ''مزارعت'' پر زمین دی جاتی ہے، اُمت کے اندر یہ تعامل چلا آرہا ہے، تو وہاں بھی یہی بات ہے کہ زمین ایک کی ہے، محنت دُوسرے کی ہے، فائدہ دونوں اُٹھاتے ہیں۔ اس لئے یہ مسئلہ قرآنِ کریم میں اگر یوں ہی اتنا صاف ہو کہ ایک کی محنت سے دُوسرا آدمی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، تو پھر اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب سے قرآن اُترا ہے آج تک اس آیت کا مطلب کسی نے سمجھا ہی نہیں، اس کا مطلب اگر سمجھا ہے تو ''کارل مارکس'' نے سمجھا ہے یا اس کی ولدالحرام ذُرّیت نے! (ان کو ''ولدالحرام'' ہی کہہ سکتے ہیں، کہلاتے تو یہ ''مسلمان'' ہیں اور فیض سب کچھ وہیں سے لیتے ہیں، ''مسلمان'' کہلانے والے جس وقت سب کچھ وہیں سے لیں گے تو یہ نسبت صحیح تو نہیں ہے نا! یا تو یہاں سے نسبت کاٹ کے اُدھر ہی کرلیں اور قرآن اور حدیث کا نام ہی نہ لیں، اِستناد اگر کریں تو صرف انہی کے اقوال سے کریں، پھر قرآن وحدیث کو گھسیٹنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں؟ کہ ایک یہودی کے طرزِ فکر کے ساتھ قرآنِ کریم کو حل کرنے کی کیوں کوشش کرتے ہیں)۔

ایک کتاب میرے پاس آئی پڑی ہے، ''دلائل کے فریب'' اس کتاب کا نام ہے، اور اس کا لکھنے والا ہے احمد بن طلحہ، اور یہ اس کا مصنوعی نام ہے، اصل کے اعتبار سے اس کا نام کوئی اور ہے، اور وہ کہیں دفتر میں کلرک ہے، اس نے یہ کتاب لکھی ہے، جس

میں حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کے ایک رسالے کی اور اسی طرح سے مودودی صاحب کے ایک رسالے کی، اور ایک کسی اور عالم کا رسالہ ہے، اس کی تردید ہے، اس میں اس نے ثابت کیا ہے کہ نہ مکان کرائے پر دینا جائز ہے، نہ ''مضاربت'' جائز ہے، نہ ''مزارعت'' جائز ہے، اور یہ جتنے طریقے ہیں کہ انسان مفت میں بیٹھا کھاتا ہے، تھوڑا سا سرمایہ لگا کر، محنت دُوسروں کی ہوتی ہے، کہتا ہے یہ سب سُود ہے، سب حرام کھاتے ہیں جو بھی کھاتے ہیں، دُکان کرائے پہ دینی ٹھیک نہیں، مکان کرائے پہ دینا ٹھیک نہیں، ''مضاربت'' کے طور پر مال دینا ٹھیک نہیں، ''مزارعت'' کے طور پر زمین دینی ٹھیک نہیں، یہ ساری کی ساری چیزیں اس نے ربا کے اندر شامل کی ہیں کہ یہ سب سُود میں داخل ہیں۔

کیا قرآن کو سمجھنے کے لئے ''کارل مارکس'' جیسے یہودیوں کی ضرورت ہے؟

اُس کے متعلق مجھے اس کے ایک خاص آدمی نے بتایا، وہ یہاں میرے پاس آئے تھے، بلکہ جس جماعت کے ساتھ وہ تعلق رکھتے ہیں ''فکری محاذ''، اسی ''فکری محاذ'' کا ایک عہدے دار جو بظاہر مولوی ہے اور اپنے آپ کو ''مولوی'' کہلاتا ہے ''مولوی محمد قاسم''، یہاں وہ آئے میرے پاس بیٹھے تھے، تو یہ تذکرہ کر رہے تھے کہ بہت ہونہار نوجوان ہے جس نے یہ کتاب لکھی ہے، وہ کہتا ہے کہ جب سے میں نے ''کارل مارکس'' کو پڑھا ہے اس وقت سے مجھے قرآنِ کریم سمجھ آنا شروع ہوگیا ہے، اور ''کارل مارکس'' کو پڑھنے کے بعد ہی قرآنِ کریم حقیقتاً سمجھ میں آیا کہ یہ کتنی بڑی انقلابی کتاب ہے؟ میں نے کہا کہ آفرین ہے! قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لئے ''کارل مارکس'' کے فہم کی ضرورت ہے! جس وقت تک ان یہودیوں سے اِستفادہ نہ کرو قرآنِ کریم سمجھ میں نہیں آتا، اور حدیث شریف ذریعہ نہیں ہے قرآن سمجھنے کا، اور فقہ ذریعہ نہیں ہے قرآن سمجھنے کا، ''لینن'' اور ''مارکس'' ذریعہ بن گئے قرآن سمجھنے کے لئے! تو اس لئے میں نے ان کو ''محرِّفین'' کے عنوان کے ساتھ ذِکر کیا کہ قرآنِ کریم میں بدترین قسم کی تحریف کرتے ہیں، ورنہ یہ متفق علیہ مسئلہ جو تعاملِ اُمت کے تحت اُمت کے اندر چلا آرہا ہے، تو یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ بعض جزئیات ایسی ہیں کہ جن میں مشارکت یوں ہوجایا کرتی ہے کہ ایک آدمی کی محنت ہے اور دُوسرے آدمی کا سرمایہ ہے، اور دونوں سے کام چلتا ہے، کام چلنے کے بعد نفع میں دونوں شریک ہوجاتے ہیں، ایک آدمی ملازم رکھا جاتا ہے، ملازم رکھنے کے بعد وہ بدنی محنت کرتا ہے، محنت اس کی ہے اور اس کی محنت کے صلے میں جو چیز آتی ہے اس میں ملازم کی تنخواہ اور مالک کا نفع یہ ہوتا رہتا ہے، اوّل یوم سے آج تک یہ ساری کی ساری چیز چلی آرہی ہے، والد کماتا ہے اولاد کھاتی ہے، اور اسی طرح سے نوجوان بچے کماتے ہیں بوڑھے والدین کھاتے ہیں، فقراء، مساکین کا حق مال داروں کے مال میں ہے، چاہے کوئی محنت کرکے کماتا ہے، جس طرح سے بھی کماتا ہے، شریعت نے ان لوگوں کے حقوق رکھے ہیں جو اِس کے ساتھ محنت میں شریک نہیں ہیں، تو یہ اُصول کہاں تک آپ چلاسکتے ہیں کہ جو محنت نہ کرے وہ حق دار بھی نہیں، اور حق دار وہی ہے جو محنت کرے، یہ تو ساری کی ساری شریعت کا مزاج ہی اس چیز کے خلاف ہے۔ باقی! محنت کرنے والے کو محنت کا معاوضہ ملنا چاہیے، اجیر کو اُس کی اُجرت ملنی چاہیے، اس کی حق تلفی نہیں ہونی چاہیے، وہ سارے کے سارے

قواعد "باب الاجارہ" میں بھرے ہوئے ہیں۔ اس لئے یہ نظریہ تو بالکل غلط ہے، اور جو قرآنِ کریم کی اس آیت کو اس مضمون کے اُوپر محمول کرنے کی کوشش کرتے ہیں، یہ بالکل بدترین قسم کی تحریف ہے، اور یہ اسلام کے اندر یہودیت کا پیوند لگانے والی بات ہے۔

مسئلۂ ایصالِ ثواب کی تفصیل

ہاں! البتہ ایک مسئلہ قدیم مفسرین نے یہاں ذکر کیا ہے کہ ایصالِ ثواب کی کیا حیثیت ہے؟ کہ کام تو میں نے کیا ہے، تو کیا میرے اس کام سے دُوسرا آدمی فائدہ اُٹھا سکتا ہے؟ یہ مسئلہ یہاں ذکر کیا ہے۔ دُعا کے ساتھ کسی کو فائدہ پہنچے اور صدقۂ مالی کے ساتھ کسی کو فائدہ پہنچے، یہ بھی اُمت کے اندر متفق علیہ مسئلہ ہے، کہ آپ کسی مرنے والے کے لئے دُعا کریں کہ اللہ اس کو بلند درجے عطا فرمائے، اللہ اس کی غلطیاں، گناہ معاف کردے، صحیح روایات کے اندر آتا ہے کہ اس دُعا کے ساتھ مرنے والے کو فائدہ پہنچتا ہے۔[1] یہ بھی آپ کی کوشش ہے اور فائدہ دُوسرے کو پہنچ رہا ہے، لیکن آپ کے اختیار سے نہ کہ اُس کے اختیار سے۔ اور اسی طرح سے اگر مالی صدقہ دیا جائے تو اس کے اُوپر بھی اتفاق ہے کہ آپ اللہ کے راستے میں کوئی مال خرچ کریں اور نیت یہ کرلیں کہ اس کا ثواب میری والدہ کو پہنچ جائے، والد کو پہنچ جائے، میرے بزرگ کو پہنچے، جس کی بھی آپ نیت کریں گے ثواب اس کو پہنچ جائے گا، اس میں کسی کا اختلاف نہیں ہے، یہ بھی کوشش آپ کی ہے اور فائدہ دُوسرے کو پہنچتا ہے۔ ہاں! البتہ بدنی عبادات کے اندر حضرت امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کا اختلاف ہے کہ ہم جو بدنی عبادت کرتے ہیں اس کا ثواب بھی کسی دُوسرے کو پہنچتا ہے یا نہیں پہنچتا؟ جس طرح سے ہم تلاوت کریں، تلاوت کرنے کے بعد ہم ایصالِ ثواب کریں، حضرت ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ کے نزدیک اور کچھ دیگر فقہاء کے نزدیک پہنچتا ہے، اور حضرت امام شافعی رحمہ اللہ وغیرہ کے نزدیک بدنی عبادت کا ثواب نہیں پہنچتا، ہم لوگ مرنے والے کے لئے قرآنِ کریم پڑھ کے ایصالِ ثواب کا اہتمام زیادہ کرتے ہیں، ہمارے خیال کے مطابق ثواب پہنچتا ہے، آپ کی یہ کوشش بالکل صحیح ہے، لیکن بہرحال یہ مسئلہ مختلف فیہ ہے، مالی صدقے کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے اور دُعا کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے، کیونکہ اس کے ساتھ فائدہ پہنچنا متفق علیہ ہے، جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں۔ ایک طریقہ متفق علیہ ہو، جس پہ سارے متفق ہیں کسی کا اختلاف نہیں، وہ زیادہ قابلِ اعتماد ہوا کرتا ہے بمقابلہ اس کے کہ جو طریقہ مختلف فیہ ہے، لیکن ہمارے ہاں یہ تو زیادہ اہتمام کیا جاتا ہے کہ قرآنِ کریم پڑھ کر ایصالِ ثواب کیا جائے، اور مالی صدقہ اور دُعا کا اتنا اہتمام نہیں کیا جاتا، حالانکہ ان دونوں میں سے دُعا اور صدقے والا معاملہ زیادہ قابلِ اعتماد ہے، یعنی تلاوتِ قرآنِ کریم کا ثواب بھی ہمارے نزدیک پہنچتا ہے، شوافع کے نزدیک نہیں پہنچتا، وہ کہتے ہیں کہ بدنی عبادت کا ثواب دُوسرے کو نہیں دیا جاسکتا، مالی عبادت کا دیا جاسکتا ہے اور دُعا کے ساتھ فائدہ دیا جاسکتا ہے۔ بہرحال ایصالِ ثواب پر اُمت متفق ہوئی، چاہے اس کی بعض جزئیات کے اندر اختلاف ہوا، ایصالِ ثواب پر اتفاق ہے کہ مرنے والے کو آپ ثواب دے سکتے ہیں، پہنچا سکتے ہیں۔

(1) إِذَا مَاتَ الْإِنْسَانُ انْقَطَعَ عَنْهُ عَمَلُهُ إِلَّا مِنْ ثَلَاثَةٍ...... أَوْ وَلَدٍ صَالِحٍ يَدْعُو لَهُ. (مسلم ۴۱/۲)۔ نیز ابن ماجہ ص ۲۶۰، باب بر الوالدین/ مشکوٰۃ ۲۰۶/۱ باب الاستغفار۔

آیتِ بالا ایصالِ ثواب کے منافی نہیں: پہلی توجیہ

توجس وقت ایصالِ ثواب پر اتفاق ہے تو پھر اس آیت کا کیا مطلب ہوا کہ انسان کے سامنے اس کی اپنی کوشش ہی آئے گی؟ اس کے جواب کی طرف اشارہ کر رہا ہوں، کہ یا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ با اختیارِ خود اگر انسان فائدہ اُٹھا سکتا ہے تو اپنی ہی کوشش سے، دُوسرے کی کوشش سے یہ اپنے اختیار سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، ہاں ایک آدمی کوشش کرے اور اپنے اختیار کے ساتھ اس کا ثواب ادھر منتقل کر دے، تب اس کو فائدہ پہنچ سکتا ہے، یہ نہیں ہوگا کہ قیامت کے دن میں آپ کی نیکیاں آپ کی رضا کے بغیر چھین لوں، یا آپ دُنیا کے اندر عمل کر رہے ہوں اور میں وہاں آپ کے نامۂ اَعمال سے اپنے نامۂ اَعمال میں منتقل کروالوں، ایسا نہیں، یہ میرے اختیار میں نہیں ہے، ہاں! البتہ آپ اپنی خوشی کے ساتھ جس وقت آپ نیکیاں میری طرف منتقل کریں گے، اور اللہ تعالیٰ سے کہیں گے کہ ہمارا یہ کام اس کا فائدہ فلانے کو پہنچادو، تو یہ بات ٹھیک ہے۔ تو مَاسَعٰی کا مطلب یہ ہوگا کہ جو کوشش وہ کرے گا وہ تو اس کے سامنے آئے گی، باقی! کسی دُوسرے کی کوشش سے فائدہ اُٹھانے کا یہ مختار نہیں ہے، اور اگر کوئی دُوسرا شخص اپنے اختیار کے ساتھ اس کو فائدہ پہنچانا چاہے تو اس آیت میں اس کی نفی نہیں ہے۔

دُوسری توجیہ

یا پھر وہ پہلا جواب جو میں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ یہاں ''سعی'' سے مراد ''سعیِ ایمان'' ہے، ''بیان القرآن'' میں بھی اختیار کی گئی، وہ پھر بالیقین ہے کہ اگر کوئی شخص ایمان نہیں لایا، تو آخرت میں کسی دُوسرے کے ایمان سے فائدہ نہیں اُٹھا سکے گا، یہ پابندی پکی ہے، پھر ساری دُنیا بھی اکٹھے ہو کر اگر اپنے اختیار کے طور پر اپنا ایمان اسے دینا چاہیں تو بھی نہیں دے سکیں گے، کافر اور مشرک کی نجات کی کوئی صورت نہیں، کسی دُوسرے کے ایمان سے وہ فائدہ نہیں اُٹھا سکے گا، اور یہاں ڈرایا دھمکایا اُنہی کو ہی جا رہا ہے جو کہ مشرک ہیں، کافر ہیں اور ایمان نہیں لاتے، کہ اس طرح سے بےفکر نہ ہو جاؤ کہ ہمیں فلانا بچالے گا، فلانا بچالے گا، ایمان کے سلسلے میں اپنی کوشش کام آئے گی، کسی دُوسرے کی کوشش کام نہیں آئے گی۔

یہ مسئلہ مفسرین نے یہاں ذکر کیا ہے، یہ اپنی جگہ صحیح ہے، اور اس کی یہ تفصیل ہے جو آپ کی خدمت میں عرض کر دی۔

باقی! ''کارل مارکس'' اور ''لینن'' والا نظریہ قرآن وحدیث کے صراحتاً خلاف ہے، اور ان آیات کو کھینچا تانی کر کے اُس کے اُوپر محمول کرنے کی کوشش کرنا بدترین قسم کی تحریف ہے، اور یہ دینِ محمدی کے اندر یہودیت کا پیوند لگانے والی بات ہے، اس لئے میں نے عرض کیا کہ ایک بحث تو قدیم مفسرین کی ہے اور ایک جدید محرِّفین کی ہے، اور جدید محرِّفین کی بات میں نے آپ کے سامنے بالاجمال تھوڑی سی نقل کر دی، ورنہ ان کی تردید میں بہت کچھ کہا جا سکتا ہے۔

تو یہ بھی گویا کہ ابراہیم علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے صحیفوں میں آئی ہوئی بات ہے، جس پر انہیں تنبہ ہونا چاہیے کہ کوئی کسی کے گناہ کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا، اور کسی انسان کے لئے دوسرے کی کوشش کام نہیں آئے گی، انسان کے لئے وہی چیز ہے جو اس نے خود

کوشش کرلی۔ وَاَنَّ سَعْیَهٗ سَوْفَ یُرٰی: اور انسان کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی، اس کا پورا جائزہ لیا جائے گا، جیسی کوشش ہوگی ویسا اس کو اَجر دیا جائے گا، ثُمَّ یُجْزٰىهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى: پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا،''اُس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے پھر اس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔''

ابراہیمی اور موسوی صحیفوں کے مضامین اور قدرتِ الٰہی کا بیان

اور یہ بات اَنَّ اِلٰى رَبِّكَ الْمُنْتَهٰى: کہ منتہا تیرے رَبّ کی طرف ہی ہے، ہر کسی نے لوٹ کر وہیں جانا ہے،''اور یہ بات کہ وہی ہنساتا ہے وہی رُلاتا ہے، وہی موت دیتا ہے وہی زندگی دیتا ہے، اسی نے دونوں قسمیں پیدا کیں، مذکر اور مؤنث، ایک ہی نطفے سے جبکہ وہ ٹپکایا جاتا ہے'' یعنی نطفہ جو ٹپکایا جاتا ہے اس سے مذکر اور مؤنث پیدا کرنا یہ بھی اسی کا کام ہے، قدرت اسی کی ہے، بہت دفعہ اس کا ذِکر کردیا کہ انسان کی تخلیق جدھر متوجہ کیا جاتا ہے، یہاں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اختیارات ذِکر کیے جارہے ہیں، کہ یہ سب کام اسی کے اختیار میں ہیں، نہ لڑکا دینا کسی کے اختیار میں، نہ لڑکی دینی کسی کے اختیار میں، یہ قطرۂ بوند جو ٹپکائی جاتی ہے اس سے لڑکا بنانا بھی اسی کے اِختیار میں، لڑکی بنانا بھی اُسی کے اِختیار میں، اور اسی طرح سے کسی کو اچھے حالات دے دینا جس کی بنا پر اِنسان ہنستا ہے اور خوش ہوتا ہے یہ بھی اسی کے اختیار میں، اور کسی کو مصیبتوں میں مبتلا کردینا اور مرضی کے خلاف حالات دے دینا جس پر انسان روتا ہے وہ بھی اسی کے اختیار میں ہے، خوشی ہو یا غمی، راحت ہو یا تکلیف، جو کچھ ہے سب اس کے اختیار میں ہے، لڑکے ہوں، لڑکیاں ہوں، بنانا، پیدا کرنا سب اس کے اختیار میں ہے، کسی دوسرے کے اختیار میں کوئی بات نہیں کہ جدھر اِنسان ہاتھ پھیلائے،''اور یہ بات کہ اسی کے ذِمّے ہے دوبارہ اُٹھانا، پچھلا اُٹھانا'' دوبارہ اُٹھانا اسی کے ذِمّے ہے۔ نَشْاَۃ: اُٹھانا۔ اُخرٰی: پچھلا۔ یعنی یہ اُولیٰ دُنیا میں پیدا کرنا ہوگیا، اور نشاۃِ اُخریٰ ہوگئی موت کے بعد، وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى: اور یہ بات کہ وہی غنی بناتا ہے، کسی کو غنیٰ اور دولت وہی دیتا ہے، وَاَقْنٰى: اقنیٰ کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا گیا ہے، یہ لغاتِ اَضداد میں سے ہے، وَاَنَّهٗ هُوَ اَغْنٰى وَاَفْقَرَ فقیر وہی بناتا ہے، غنی وہی بناتا ہے، دولت وہی دیتا ہے اور دولت سے محروم وہی کرتا ہے، اور اَقنٰی کا ترجمہ یہ بھی کیا گیا ہے کہ اقنٰی قِنْيَة سے لیا گیا ہے قِنْيَة ذخیرے کو کہتے ہیں،''وہی دولت دیتا ہے اور وہی اس دولت کو محفوظ رکھتا ہے'' یعنی فقیر سے غنی بنادینا بھی اسی کے اختیار میں ہے اور غنی بنادینے کے بعد اس کی دولت کو محفوظ رکھنا بھی اسی کے اختیار میں ہے، زندگی کی یہی چیزیں ہیں جن کو یہاں ذِکر کیا جارہا ہے اور سب کچھ اللہ کے اختیار میں دے رہے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے، کسی دوسرے کا کوئی اختیار نہیں، جس کی بنا پر انسان بھاگ بھاگ کر جائے۔ یہی باتیں ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے میں سمجھائی گئی ہیں، اور یہی باتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحیفے میں ذِکر کی گئی ہیں،''اور یہ بات کہ شعریٰ کا رَبّ وہی ہے'' شعریٰ یہ ایک ستارہ ہے جو موسمِ بہار میں طلوع کرتا تھا، اور مشرکین اس کو پوجتے تھے، کہتے تھے یہ بہار کی رونق جتنی بھی ہے سب اسی کی وجہ سے ہے، اسی کی پیدا کردہ ہے، اُس کو مؤثر سمجھتے تھے، تو یہ بات بتادی گئی کہ شعریٰ کا رَبّ بھی وہی ہے، شعریٰ بھی اسی کی مخلوق ہے، اور اس کے اختیار میں بھی کچھ نہیں اور اس کی طرف کسی بات کی نسبت کرنا بھی ٹھیک نہیں۔

ہلاک شدہ قوموں کا تذکرہ اور اس کا مقصد

وَاَنَّهٗٓ اَهْلَكَ عَادَاۨ الْاُوْلٰى: اور یہ بات کہ اسی نے ہلاک کیا عادِ اُولیٰ کو، عادِ اُولیٰ سے وہی عاد مراد ہے جس کی طرف حضرت ہود علیہ السلام تشریف لائے تھے، اور عادِ اُخریٰ کا مصداق ثمود کو بناتے ہیں، کیونکہ وہ بھی اسی قبیلے سے تعلق رکھنے والے ہیں، دُوسری شاخ ہے، اس کو عادِ اُخریٰ کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، ''اسی نے ہلاک کیا عادِ اُولیٰ کو'' یہ وعید اور دھمکی آ گئی کہ اس قسم کے عذاب وہی نازل کرتا ہے نافرمانوں کے اُوپر، ''اور ثمود کو، پھر باقی نہیں چھوڑا'' یعنی ان کو بالکل برباد کیا اور کچھ باقی نہیں چھوڑا، ''اور قومِ نوح کو اس سے قبل، بے شک یہ لوگ ظالم اور طاغی تھے'' ظالم تھے، باغی طاغی تھے، ان سب کو اسی نے برباد کیا، وَالْمُؤْتَفِكَةَ اَهْوٰى: مُؤْتَفِكَة: پلٹا کھانے والی بستیاں، اس سے قومِ لُوط کی بستیاں مراد ہیں، آھویٰ کا معنی ''ان پلٹا کھانے والی بستیوں کو بھی اسی نے گرایا اور پلٹا، اسی نے دے مارا'' اَھْوٰی گرانے کو کہتے ہیں، اِن اُلٹنے والی بستیوں کو بھی اُسی نے گرایا، فَغَشّٰىهَا مَا غَشّٰى: پھر ڈھانپ لیا ان بستیوں کو جس چیز نے ڈھانپ لیا، یعنی ایسا عذاب ان کے اُوپر آیا کہ اس کو الفاظ میں کیا بیان کیا جائے، یہ اِبہام تہویل کے لئے ہوتا ہے، ''ڈھانپ لیا ان بستیوں کو جس چیز نے ڈھانپ لیا'' فَبِاَيِّ اٰلَاۗءِ رَبِّكَ تَتَمَارٰى: اٰلاء اِلٰی کی جمع ہے، نعمت کے معنی میں بھی آتا ہے، اور مطلقاً آثار، نشانات، تصرفات کے مفہوم میں بھی آتا ہے، نعمت بایں معنی کہ ظالموں کو ہلاک کر دینا یہ بھی ایک نعمت ہے باقیوں کے لئے، اور اس قسم کی باتیں بتا دینا جن کا انجام خطرناک نکلنے والا ہو یہ بھی ایک احسان ہے، ''اے مخاطب! تو اللہ تعالیٰ کی کون کون سی نعمت میں جھگڑا کرے گا، یا کون کون سے آثارِ قدرت میں تُو شک ڈالے گا'' یہ سب کے سب اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آثار ہیں جو پہلے ذکر کئے جا رہے ہیں، ''پس تُو اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمت میں جھگڑا ڈالے گا''

کُفّارِ مکہ کو تنبیہ

هٰذَا نَذِيْرٌ مِّنَ النُّذُرِ الْاُوْلٰى: یہ ڈرانے والا ہے پہلے ڈرانے والوں میں سے، یعنی جس طرح سے پہلے ڈرانے والے آتے رہے، هٰذَا کا اشارہ حضور ﷺ کی طرف، ''یہ بھی پہلے ڈرانے والوں میں سے ایک ڈرانے والا ہے'' اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ: قریب آنے والی قریب آ گئی، اس سے مراد قیامت ہے، ''اور نہیں ہے اس کے لئے اللہ کے علاوہ کوئی دُور ہٹانے والا''، آزفہ سے مراد آفت اور عذاب کی گھڑی ہے، ''آفت اور عذاب کی گھڑی قریب آ گئی'' چاہے دنیا کا عذاب ہو چاہے وہی قیامت والا عذاب ہو، ''اس آفت کی گھڑی کو، قریب آنے والی کو اللہ کے علاوہ کوئی دُور ہٹانے والا نہیں، کیا پھر تم اس بات سے تعجب کرتے ہو؟'' هٰذَا الْحَدِيْثِ سے مراد قرآنِ کریم ہو گیا جس میں یہ حالات بیان کئے جا رہے ہیں، یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ جس کے اندر یہ باتیں بیان کی جا رہی ہیں تم اس کو پڑھ کے متفکر ہوتے، سننے کے بعد اپنے انجام کی فکر کرتے اور اللہ کے عذاب کو یاد کر کے روتے، لیکن تمہارا حال یہ ہے کہ تم ان باتوں سے تعجب کرتے ہو، اور اِستہزاءً ہنستے ہو، اور اس کو پڑھ کے اس کی باتیں سُن کے فکر کر کے روتے نہیں ہو، ''ہنستے ہو تم'' یعنی اِستہزاءً، ''یہ باتیں سننے کے بعد ہنستے ہو، روتے نہیں ہو، اس حال میں کہ تم غفلت میں پڑے ہوئے ہو'' سٰمِدُوْنَ غٰفِلُوْنَ کے معنی میں ہے، ''غفلت میں پڑے ہوئے ہو۔''

سورۂ نجم کا سجدہ اور اس پر عجیب واقعہ

"پھر تمہیں چاہیے تم اللہ ہی کو سجدہ کرو اور اسی کی عبادت کرو" یہ ہے انجام کی فکر کرنے والی بات۔ تو یہ جو آیت ہے اس کے اُوپر سجدہ واجب ہے، اور حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ سب سے پہلے سرورِ کائنات ﷺ نے یہی آیت سجدہ تلاوت کی تھی جس پر سجدہ کیا، اور سورۂ نجم مکہ معظمہ کے اندر پڑھی تھی۔ روایات کے اندر آتا ہے کہ اس مجمع میں جتنے مسلمان اور جتنے کافر تھے سب سجدے میں گر گئے، یعنی کافر بھی وقتی طور پر مرعوب ہوگئے، اور مرعوب ہونے کی بنا پر وہ بھی سجدے میں گر گئے، عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ایک مشرک کو میں نے دیکھا کہ اس نے سجدہ نہیں کیا، بلکہ اس نے ایک مٹھی مٹی کی بھری، اور پیشانی پر لگا کر کہنے لگا کہ میرے لئے یہی کافی ہے، اس کے متعلق اِبنِ مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے اس کو کفر کی حالت میں مرا ہوا دیکھا، غالباً یہ اُمیہ اِبنِ خلف تھا،[1] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جو وہاں سجدے میں گرنے والے تھے ان کو اِیمان کی توفیق ہوگئی ہوگی۔ بہرحال اس آیت پر سجدۂ تلاوت واجب ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

(۱) بخاری ۱/۱۴۶، کتاب سجود القرآن/ نیز ۲/۷۲۱، کتاب التفسیر، سورۃ النجم کا آخر/ مشکوٰۃ ۱/۹۳، باب سجود القرآن، فصل ثالث۔

سُورَةُ القَمَرِ

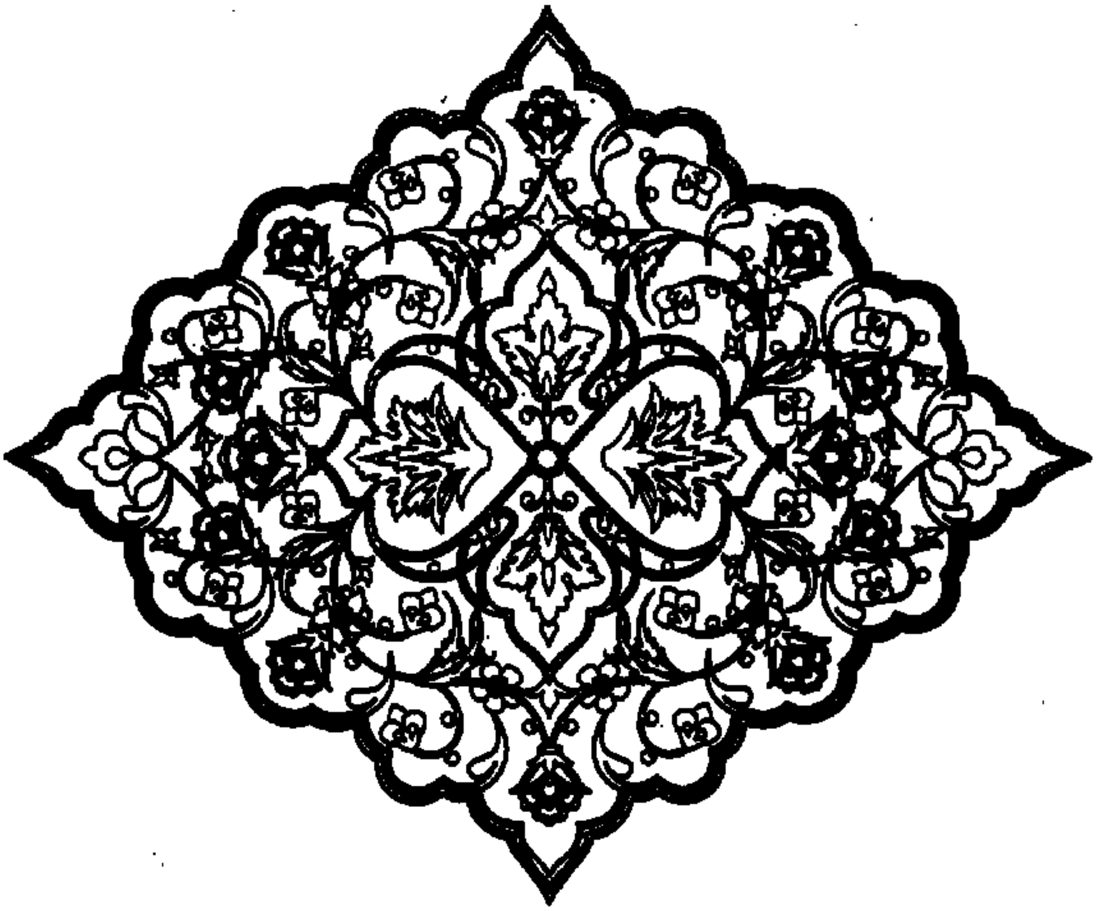

آیاتها ۵۵ ۵۴ سُوْرَةُ الْقَمَرِ مَكِّيَّةٌ ۳۷ رکوعاتها ۳

سورۂ قمر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی پچپن آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ وَانْشَقَّ الْقَمَرُ ۝۱ وَاِنْ يَّرَوْا اٰيَةً يُّعْرِضُوْا وَيَقُوْلُوْا سِحْرٌ

قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا ① اگر یہ کوئی نشانی دیکھیں گے تو اعراض کر جائیں گے اور کہیں گے یہ جادو ہے

مُّسْتَمِرٌّ ۝۲ وَكَذَّبُوْا وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ وَكُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ ۝۳ وَلَقَدْ جَآءَهُمْ

جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے ② انہوں نے تکذیب کی اور اپنی خواہشات کی پیروی کی، ہر امر قرار پکڑنے والا ہے ③ ان کے پاس وہ

مِّنَ الْاَنْۢبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ ۝۴ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ ۝۵

واقعات آگئے کہ جن کے اندر تنبیہ ہے ④ یعنی انتہا کو پہنچی ہوئی دانش مندی آگئی، پس ڈرانے والوں نے کوئی فائدہ نہ دیا ⑤

فَتَوَلَّ عَنْهُمْ ۘ يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ ۝۶ خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ

آپ اِن سے اعراض کر جائیے، جس دِن بُلائے گا اِن کو بُلانے والا ایک اوپری چیز کی طرف ⑥ اس حال میں کہ ان کی نظریں جھکنے والی ہوں گی

يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ ۝۷ مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ ۭ يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ

یہ قبروں سے نکلیں گے گویا کہ پھیلنے والی ٹڈیاں ہیں ⑦ بھاگنے والے ہوں گے داعی کی طرف، کافر کہیں گے کہ

هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ ۝۸ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا وَقَالُوْا مَجْنُوْنٌ

یہ تو بہت سخت دِن ہے ⑧ جھٹلایا ان سے پہلے نُوح کی قوم نے، پھر انہوں نے ہمارے بندے کو جھوٹا بتلایا، اور کہا انہوں نے یہ دیوانہ ہے

وَّازْدُجِرَ ۝۹ فَدَعَا رَبَّهٗٓ اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ ۝۱۰ فَفَتَحْنَآ

اور اس کو دھمکایا گیا ⑨ تو ہمارے اس بندے نے اپنے رَبّ کو پکارا کہ میں مغلوب ہو گیا ہوں، پس تو بدلہ لے ⑩ پھر کھول دیے ہم نے

اَبْوَابَ السَّمَآءِ بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ ۝۱۱ وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا فَالْتَقَى الْمَآءُ عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ

آسمان کے دروازے بہت برسنے والے پانی کے ساتھ ⑪ اور جاری کر دیا ہم نے زمین کو از روئے چشموں کے، پس پانی اکٹھا ہو گیا ایسے امر پر

قُدِرَ ﴿۱۲﴾ وَحَمَلْنٰهُ عَلٰی ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ ﴿۱۳﴾ تَجْرِیْ بِاَعْیُنِنَا جَزَآءً

جو مقدر ہو چکا تھا ⑫ اور اُٹھالیا ہم نے اس کو تختوں والی اور میخوں والی پر ⑬ وہ (کشتی) ہماری حفاظت میں چلتی تھی، (ہم نے یہ کیا) جزا کے طور پر

لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ ﴿۱۴﴾ وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَا اٰیَةً فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۵﴾ فَكَیْفَ كَانَ

اس شخص کے لئے جس کی ناقدری کی گئی تھی ⑭ البتہ تحقیق ہم نے اس واقعے کو نشانی چھوڑ دیا، کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ ⑮ پھر کیسا ہوا

عَذَابِیْ وَنُذُرِ ﴿۱۶﴾ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۱۷﴾

میرا عذاب اور میرا ڈرانا ⑯ البتہ تحقیق آسان کیا ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے، کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ ⑰

كَذَّبَتْ عَادٌ فَكَیْفَ كَانَ عَذَابِیْ وَنُذُرِ ﴿۱۸﴾ اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَیْهِمْ رِیْحًا صَرْصَرًا فِیْ یَوْمِ

تکذیب کی عاد نے، پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا ⑱ بے شک ہم نے ان کے اُوپر جھکڑ ہوا بھیجی دائمی

نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ ﴿۱۹﴾ تَنْزِعُ النَّاسَ كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ ﴿۲۰﴾ فَكَیْفَ كَانَ

نحوست کے دِن میں ⑲ اُکھیڑتی تھی وہ لوگوں کو گویا کہ وہ اُکھڑنے والی کھجوروں کے تنے ہیں ⑳ کیسا ہوا

عَذَابِیْ وَنُذُرِ ﴿۲۱﴾ وَلَقَدْ یَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۲۲﴾ ع

میرا عذاب اور میرا ڈرانا ㉑ ہم نے قرآن کو آسان بنایا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لئے۔ کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ ㉒

تعارفِ سورت اور ماقبل سے ربط

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ۔ سورۂ قمر مکہ میں نازل ہوئی اور اس کی ۵۵ آیتیں ہیں، ۳ رُکوع ہیں۔ ''مکی'' سورتوں کی طرح اس میں بھی عذاب کی وعید ذکر کر کے آخرت کے معاملے میں تفہیم کی گئی ہے، یعنی اِثباتِ آخرت پر یہ مشتمل ہے، تکذیب کرنے کے اُوپر وعید پر یہ سورت مشتمل ہے۔ پچھلی سورت کا اختتام اَزِفَتِ الْاٰزِفَةُ کے مضمون پر ہوا تھا کہ قریب آنے والی قریب آگئی، اور اُس سے بھی آخرت کی گھڑی مراد تھی، قیامت ہو یا دُنیوی عذاب کا وقت ہو، اور اِس سورت کی اِبتدا بھی اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ سے ہو رہی ہے، اور دونوں مضمون آپس میں مطابق ہیں۔

تفسیر

اِقْتَرَبَتِ السَّاعَةُ: ساعت گھڑی کے معنی میں ہے، اور عام طور پر یہ لفظ قیامت کے لئے بولا جاتا ہے، ''قیامت قریب آگئی'' وَانْشَقَّ الْقَمَرُ: اور چاند پھٹ گیا، اِنشقاقِ قمر: چاند کا پھٹ جانا، یہ سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک معجزے کا بیان ہے، اور معجزہ

نبوّت کی دلیل ہوتا ہے، اور نبی کی ہر بات سچی ہوتی ہے اور اس کے اُوپر ایمان لانا ضروری ہوتا ہے، ''اِنشقاقِ قمر'' یہ حضور ﷺ کی صداقت کی دلیل ہے، آپ ﷺ کی نبوّت کی دلیل ہے، اس لئے جو آپ ﷺ خبر دیتے ہیں وہ سچی ہے، اور نبی کی زبان سے یہ خبر مل چکی کہ قیامت آئے گی اور ضرور آئے گی، اور وہ قریب ہے اس کو دُور نہ سمجھو، اس لئے اس کے مطابق عقیدہ رکھنا ضروری ہوا۔ اور قیامت کے قریب آنے کے لئے ''اِنشقاقِ قمر'' یہ ایک علامت بھی ہے، چاند ایک بہت بڑا کرہ ہے جو آپ کو نظر آتا ہے، اس کا دو حصوں میں پھٹ جانا یہ علامت ہے اس بات کی کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت اس قسم کی شکست و ریخت کرسکتی ہے، اور ایسا واقعہ پیش آسکتا ہے کہ جس کے ساتھ یہ چیزیں ٹوٹ پھوٹ جائیں گی۔

واقعۂ شقِ قمر

باقی یہ واقعہ کیا ہے؟ اَحادیث کے اندر اس کی تفصیل آتی ہے، سرورِ کائنات ﷺ منیٰ میں تھے، اور بظاہر معلوم یوں ہوتا ہے کہ یہ وہ راتیں تھیں جن میں حاجی منیٰ میں ہوا کرتے ہیں یعنی ذُوالحجہ کا مہینہ، دسویں، گیارہویں، بارہویں رات، دس، گیارہ، بارہ یہ دِن منیٰ میں گزرا کرتے ہیں، تو حضور ﷺ ان لوگوں کو وعظ و تلقین کررہے تھے، مشرکین نے معجزے کا مطالبہ کیا، تو رسول اللہ ﷺ نے چاند کی طرف اشارہ کیا اور فرمایا کہ دیکھو، جب چاند کی طرف دیکھا گیا تو وہ دو ٹکڑے ہوچکا تھا، اور حراء پہاڑ دونوں کے درمیان میں نمایاں تھا، یعنی ایک ٹکڑا اِدھر کو، دُوسرا اُدھر کو، درمیان میں حراء پہاڑ۔(۱) درمیان میں حراء پہاڑ ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ چاند زمین پر آگیا تھا، جس طرح سے آج بھی آپ کھڑکی میں سے چاند دیکھتے ہیں، دیوار کے اُوپر سے چاند دیکھتے ہیں، تو یہ دیکھنے کے اعتبار سے ایسے تھا جیسے ایک ٹکڑا اِدھر اور ایک اُدھر اور درمیان میں حراء پہاڑ ہے، اس طرح سے وہ چاند دو ٹکڑے ہوا، اور حضور ﷺ نے فرمایا: مشاہدہ کرلو، اس کو دیکھ لو! تو یہ آپ کی نبوّت کی دلیل تھی، معجزے کے طور پر رسول اللہ ﷺ کے لئے اس چیز کو نمایاں کیا گیا، اَحادیثِ صحیحہ کے اندر یہ واقعہ آیا ہے، اور جمہور مفسرین نے ﴿وَانْشَقَّ الْقَمَرُ﴾ کا مصداق اسی واقعے کو قرار دیا ہے، کہ رسول اللہ ﷺ کے معجزے کے طور پر چاند پھٹا تھا، دو ٹکڑے ہوا تھا، دو ٹکڑے ہونے کے بعد پھر وہ آپس میں جڑ گیا۔

غلط فہمی کا اِزالہ

اب یہ واقعہ چونکہ رات کا ہے، اور آپ جانتے ہیں کہ مکہ معظمہ میں رات ہو تو دُنیا کا اکثر حصہ تو ایسا ہوگا کہ جس میں دِن ہوتا ہے، دِن نہ ہو تو رات کا بالکل اِبتدا ہوتا ہے، اور پھر رات کے وقت ضروری نہیں کہ ہر شخص آسمان کی طرف دیکھ رہا ہو، آج کل بھی ہزاروں دفعہ گہن کے واقعات پیش آتے ہیں کہ چاند کو گہن لگتا ہے، حالانکہ اخبارات میں لوگ پہلے ذِکر بھی کردیتے ہیں کہ آج گہن لگے گا، لیکن ایسے واقعات ہزاروں دفعہ پیش آجاتے ہیں کہ لاکھوں انسان اس سے ناواقف ہی رہتے ہیں، اس لئے یہ کہنا کہ ''اگر یہ واقعہ پیش آیا ہوتا تو ساری دُنیا کو پتا چل جاتا، سب دُنیا اس سے واقف ہوتی'' یہ جہالت ہے! وہاں رات ہو، دُوسری جگہ

---

(۱) بخاری ۱/۵۴۲ باب انشقاق القمر۔ نیز ۲/۵۱۳-۷۲۱/۲۔ مسلم ۲/۳۷۳ باب انشقاق القمر۔ ترمذی ۲/۱۶۳، کتاب التفسیر سورۂ قمر، وغیرہ۔

دن ہو، کسی جگہ رات کا پچھلا حصہ ہوگا، کسی جگہ دن کا آخری حصہ ہوگا، اور پھر رات کے وقت لوگ نگاہ اُٹھا اُٹھا کے چاند کی طرف دیکھتے نہیں، اور چاند اگر دو ٹکڑے بھی ہو جائے تو چاندنی میں فرق پڑتا نہیں، چاندنی تو اسی طرح سے رہے گی، اور وہ ایک لمحے کی بات تھی کہ دو ٹکڑے ہوا، مشرکین نے دیکھا، اس کے بعد وہ پھر اسی طرح سے جڑ گیا۔

”شقِ قمر“ کا مشاہدہ ایک ہندو راجہ نے بھی کیا

لیکن اس کے باوجود یہاں ہمارے ہندوستانی مفسرین نے لکھا ہے کہ ہندوستان میں ”مالیبار“ کے علاقے میں ایک راجہ تھا، اس کی نظر پڑی اور اس نے چاند کو دو ٹکڑے ہوتے ہوئے دیکھا، اور اپنے روزنامچے میں اس کو درج کیا، وہ تاریخ میں مذکور ہے، ”تاریخِ فرشتہ“ (مقالہ نمبر ۱۱) کے اندر یہ واقعہ لکھا ہوا ہے۔ اور حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے صداقتِ اسلام پر جو کتاب لکھی ہے، اس کے اندر بھی اس واقعے کو ذکر کیا ہے۔ اس (راجہ) نے اس واقعے کو دیکھا، پھر اس نے اس واقعے کی تحقیق کی، اور جب اس کو معلوم ہوا کہ مکہ معظمہ کے اندر ایک شخص ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے اور اس کے معجزے کے طور پر یہ چیز پیش آئی ہے تو وہ شخص یہاں ہندوستان میں ہوتے ہوئے مسلمان ہوا، یعنی حضور ﷺ کے زمانے میں ہی۔ تو یہاں بھی یہ دیکھا گیا۔

جدید سائنس اور ”شق القمر“ کی تصدیق

اور خبر رسانی کے ذرائع اُس وقت ایسے نہیں تھے جیسا کہ آج کل ہیں، آج کل تو دُنیا کے کسی حصے میں چھوٹا سا واقعہ پیش آتا ہے تو فوراً ریڈیو میں نشر ہو کر ساری دُنیا کو پتا چل جاتا ہے، آپ جانتے ہیں کہ اُس وقت تو یہ بات نہیں تھی، ہاں! البتہ آس پاس سے جو قافلے آ رہے تھے مشرکینِ مکہ نے ان سے بھی تحقیق کی تو روایات میں آتا ہے کہ ان قافلے والوں نے بھی تصدیق کی کہ ہم نے یہ دیکھا ہے (ابنِ کثیر)، یعنی اس محدود علاقے میں یہ چیز دیکھی گئی اور مشہور ہوئی، اور اِس معجزے کو عام طور پر مفسرین نے متواتر قرار دیا ہے (ابنِ کثیر)، اس کا اِنکار کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ اور آج کی جدید تحقیقات نے اس کی تصدیق بھی کر دی، یہ آپ کے (جامعہ باب العلوم کے) دفتر میں جو چاند کا فوٹو لگا ہوا ہے، وہ اسی سلسلے میں ہے، امریکا کے خلائی مرکز نے اس بات کی تصدیق کی ہے، جو اُوپر چاند پر جانے والے، اور وہاں سے جو تصویریں آئی ہیں، انہوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ معلوم یوں ہوتا ہے کہ جس طرح سے یہ دو ٹکڑوں میں ہو کر پھر جڑا ہوا ہے، اور جہاں جوڑ ہے اس کی ہیئت اچھی طرح سے نمایاں ہے، دیکھنا! اُنگلی کا اشارہ دیا ہوا ہے اُوپر سے بھی اور نیچے سے بھی اُس تصویر پر، تو وہ حصہ ایسا ہے کہ جہاں سے بالکل نمایاں طور پر معلوم ہوتا ہے کہ یہ کبھی ٹوٹ کر جڑا ہے، جس طرح سے آپ کا پیالہ ٹوٹ جائے یا شیشہ ٹوٹ جائے اور اس کو جوڑ لگا دیا جائے تو جوڑ نمایاں ہوا کرتا ہے، تو تصویر کے اندر وہ چیز نمایاں ہے۔ اور انہوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے کہ ظاہر یہی ہے کہ یہ کسی زمانے میں ٹوٹا تھا، ٹوٹنے کے بعد پھر جڑا ہے، گویا کہ سائنسی تحقیق کے تحت بھی اس معجزے کی تائید ہوگئی، اور آپ کے دفتر میں جو نقشہ لگا ہوا ہے اس کے نیچے جو تحریر ہے وہ اسی بارے میں ہے، یہ امریکا کے سائنس دانوں کا بیان ہے۔

''شقِ قمر'' قُربِ قیامت کی دلیل کیسے ہے؟

بہرحال یہ مضمون متیقن ہے کہ انشقّ القمر سے وہی معجزہ مراد ہے، اور یہ اقتراب ساعت کی دلیل کس طرح سے بن گیا؟ وہ دو طرح میں نے آپ کے سامنے واضح کردی: ۱- یہ حضور ﷺ کی نبوّت اور صداقت کی دلیل ہے، نبی کی ہر بات ٹھیک ہوتی ہے، اس لئے آپ کا یہ خبر دینا کہ قیامت ہوگی اور وہ عنقریب ہوگی یہ بات صحیح ہے۔ ۲- اور یا اس کا ٹوٹ پھوٹ جانا یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کی نشانی ہے، جس میں اس بات کی طرف اشارہ کردیا گیا کہ یہ ممکن ہے کہ اسی طرح سے باقی کُرّات بھی ٹوٹ جائیں، تو یہ اللہ کی قدرت کے تحت ہے، یہ ایک علامت کے طور پر چیز نمایاں کردی گئی، اس لئے قیامت کے واقعات کو ممتنع نہ سمجھا جائے، ایسا ہوسکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کائنات کو ریزہ ریزہ کردے، جس طرح سے چاند کے دو ٹکڑے کرکے اللہ نے دکھادیا۔ ''قیامت قریب آگئی اور چاند پھٹ گیا۔''

معجزات کے انکار کے لئے مشرکین کے بہانے

وَاِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً یُّعْرِضُوْا وَیَقُوْلُوْا سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ: یہ مشرکین کا عدمِ تاثر ہے، اِنْ یَّرَوْا اٰیَۃً: اگر یہ کوئی نشانی دیکھیں گے یُّعْرِضُوْا: تو اعراض کرجائیں گے، یہ ماننے والے نہیں، وَیَقُوْلُوْا: اور کہیں گے سِحْرٌ مُّسْتَمِرٌّ: سحر: جادو، مستمر کا معنی کہ ہمیشہ سے چلا آرہا ہے، ''یہ جادو ہے جو ہمیشہ سے چلا آرہا ہے'' پہلے سے بھی جادوگر اس قسم کے واقعات دکھاتے آئے ہیں، جو بھی ان کے سامنے نشانی واضح کی جائے یہ اس کو جادو کی طرف نسبت کردیتے ہیں کہ جس طرح سے پہلے جادوگر اس قسم کے واقعات دکھاتے تھے یہ بھی ایسا ہی واقعہ ہے۔ اور مستمر کا معنی گزرنے والا بھی کیا گیا ہے، کیا مطلب؟ یہ جادو ہے اس کا اثر عنقریب ختم ہوجائے گا، گزر جائے گا، فنا ہوجائے گا، یعنی یوں کہہ کر اُس نشانی کی حیثیت کو خراب کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اپنی تکذیب کے لئے یہ بہانہ بنالیتے ہیں، وَکَذَّبُوْا: انہوں نے تکذیب کی وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ: ان کی تکذیب کسی دلیل پر مبنی نہیں بلکہ انہوں نے اپنی خواہشات کی پیروی کی، اپنے دل کے خیالات کے پیچھے چلنے والے ہیں، خواہشات کے پیچھے چلتے ہیں، تکذیب کے لئے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

''کُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ'' کے دو مفہوم

وَکُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ: ہر اَمر قرار پکڑنے والا ہے، یعنی وقت گزرنے کے ساتھ ہر اَمر کی حقیقت نمایاں ہوجائے گی، جادو کے اَثرات جس قسم کے ہوا کرتے ہیں، وقت گزرنے کے ساتھ وہ باطل ہوجاتے ہیں، اصلیت نمایاں ہوجاتی ہے، اور انبیاء ؑ کے معجزات جیسے جیسے وقت گزرتا ہے ان کی صداقت نمایاں ہوتی چلی جاتی ہے۔ یا وَکُلُّ اَمْرٍ مُّسْتَقِرٌّ کا معنی یہ ہے کہ ہر اَمر قرار پکڑنے والا ہے اپنے وقت معین پر، تو قیامت کے لئے بھی اللہ تعالیٰ نے ایک وقت متعین کر رکھا ہے، اس وقت پر وہ بھی قرار پکڑے گی اور نمایاں ہوجائے گی۔ دونوں طرح سے اس جملے کا مفہوم نمایاں کیا گیا ہے۔

گزشتہ واقعات تنبیہ کے لئے کافی وافی ہیں

وَلَقَدْ جَآءَهُمْ مِّنَ الْاَنْبَآءِ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ: مُزْدَجَرٌ مصدر میمی ہے۔زَجْرٌ: جھڑکنا۔اِزدجار یہ وہی جھڑکنے کے معنی میں ہے، مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ: جس میں ڈانٹ ہے، جس میں تنبیہ ہے،''اِن کے پاس وہ چیز آگئی جس میں تنبیہ ہے یعنی اُمتوں کے واقعات'' مِّنَ الْاَنْبَآءِ یہ مَا کا بیان ہے،''ان کے پاس ایسے واقعات آگئے کہ جن کے اندر کافی تنبیہ ہے'' حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ: یعنی حکمت بالغہ ہے، حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ یہ مَا فِيْهِ مُزْدَجَرٌ سے بدل ہے۔مِّنَ الْاَنْبَآءِ یہ مَا کا بیان ہے۔یاھِیَ حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ اس طرح سے مبتدا محذوف نکال لیا جائے گا اور حِكْمَةٌۢ بَالِغَةٌ کو خبر بنالیں گے،''اِن کے پاس وہ واقعات آگئے کہ جن کے اندر تنبیہ ہے یعنی ان کے پاس حکمت بالغہ آگئی، ایسی دانش مندی آگئی جو کہ مؤثر ہے، صداقت اور دانش مندی میں اِنتہا کو پہنچی ہوئی ہے'' حکمتِ بالغہ: اِنتہا کو پہنچی ہوئی دانش مندی اِن کے پاس آگئی۔

ضدی کافر کسی طرح بھی متاثر نہیں ہوتے

فَمَا تُغْنِ النُّذُرُ: پس نُذُر نے کوئی فائدہ نہ دیا، نذر نذیر کی جمع ہے، ڈرانے والوں نے کوئی فائدہ نہ دیا، ان کے ڈرانے پہ کوئی فائدہ مرتب نہ ہوا۔اور نذر کو اِنذار کے معنی میں بھی کیا گیا ہے، آگے جہاں جہاں نذر کا لفظ آئے گا اس کو اِنذار کے معنی میں بھی کیا گیا ہے،''ڈرانے دھمکانے نے کوئی فائدہ نہ دیا'' یعنی یہ کسی طرح سے متاثر نہیں ہوتے، ان واقعات کے اندر بھی حکمت نمایاں کردی گئی اور اِنتہائی اعلیٰ قسم کی حکمت اور دانش مندی، اور اس کے اندر ان کے لئے ڈانٹ ڈپٹ بھی ہے کہ واقعات سے اگر یہ سبق لینا چاہیں تو اس کے اندر کافی تنبیہ موجود ہے لیکن یہ متاثر نہیں ہوتے، نہ ان کو ڈرانے والے کوئی فائدہ پہنچاتے ہیں، نہ ڈرانا ان کے لئے مفید ہے، فَتَوَلَّ عَنْهُمْ: تو جب یہ اس قسم کے پتھر ہیں کہ ان کے اُوپر جونک نہیں لگتی اور کسی بات سے یہ متاثر نہیں ہوتے فَتَوَلَّ عَنْهُمْ: تو آپ بھی ان سے پیٹھ پھیر جائیے۔آگے وقف ہے، وقف کا مطلب یہ ہے کہ اس سے آگے مضمون نیا شروع ہو رہا ہے، يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ یہ تَوَلَّ کا ظرف نہیں ہے، فَتَوَلَّ عَنْهُمْ پر بات ختم ہوگئی،''آپ ان سے پیٹھ پھیر جائیے، اعراض کر جائیے'' آپ بھی ان کے پیچھے زیادہ نہ پڑیں۔

قیامت کے مختلف مناظر

يَوْمَ يَدْعُ الدَّاعِ اِلٰى شَيْءٍ نُّكُرٍ: جس دِن بلائے گا ان کو بلانے والا ایک اوپری چیز کی طرف، شیء منکر کی طرف، جو چیز ان کے لئے ایک اجنبی سی ہوگی، اس سے وہی حشر مراد ہے، بعث بعد الموت، اور يَدْعُ الدَّاعِ سے اسرافیل کا بلانا اور صور پھونکنا مراد ہے،''جس دن کہ بلائے گا بلانے والا ایک عجیب شئے کی طرف، شیء منکر، اوپری چیز کی طرف'' خُشَّعًا اَبْصَارُهُمْ: اس حال میں کہ ان کی نظریں جھکنے والی ہوں گی يَخْرُجُوْنَ مِنَ الْاَجْدَاثِ: قبروں سے یہ نکلیں گے، كَاَنَّهُمْ جَرَادٌ مُّنْتَشِرٌ: گویا کہ پھیلنے والی ٹڈیاں

ہیں، جس طرح سے ٹڈی دَل کثرت کے ساتھ آتا ہے اور وہ منتشر ہوتا ہے، اسی طرح سے قبروں سے نکل کر یہ بھی ٹڈی دَل کی طرح آئیں گے۔ قرآنِ کریم میں دُوسری جگہ تشبیہ ذِکر کی گئی ہے: يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ، سورۂ قارعہ کے اندر، فراش مبثوث سے مراد ہے پھیلائے ہوئے پتنگے، برسات کے موسم میں آپ نے دیکھا ہوگا کہ جب روشنی ہوتی ہے تو کس طرح سے زمین سے پتنگے نکل نکل کر چراغوں پر جمع ہوتے ہیں، اور کس طرح سے آپس میں گڈمڈ ہوئے پھرا کرتے ہیں، تو قیامت کے میدان کی طرف جس وقت یہ آئیں گے تو اسی طرح سے ہوں گے جس طرح سے یہ پتنگے اکٹھے ہوئے ہوتے ہیں، اور یہاں جرادِ منتشر کے ساتھ تشبیہ آ گئی، بات ایک ہی ہے، قبروں سے نکل کر اتنی کثرت کے ساتھ آئیں گے جس طرح سے ٹڈی دَل آتا ہے، یا اس طرح سے ہوں گے جس طرح سے منتشر پتنگے ہوتے ہیں، یوں سارے کے سارے اُٹھ کر آ جائیں گے، اَجداث جَدَث کی جمع ہے، جدث قبر کو کہتے ہیں، سورۂ یٰسٓ کے چوتھے رُکوع میں بھی یہ لفظ آیا تھا: فَاِذَا هُمْ مِّنَ الْاَجْدَاثِ اِلٰى رَبِّهِمْ يَنْسِلُوْنَ...... ''گویا کہ یہ منتشر پھیلنے والی ٹڈیاں ہیں'' مُّهْطِعِيْنَ اِلَى الدَّاعِ: بھاگنے والے ہوں گے داعی کی طرف، جلدی جلدی آنے والے ہوں گے داعی کی طرف، يَقُوْلُ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا يَوْمٌ عَسِرٌ: کافر کہیں گے کہ یہ تو بہت سخت دِن ہے، یعنی اُس دِن کی سختی کو دیکھ کر پھر یہ حیران ہوں گے، دہشت زدہ ہوں گے، پھر کہیں گے یہ بہت سخت دِن ہے، اور آج ان کو اُس کی سختی یاد دِلائی جارہی ہے تو آج یہ سمجھتے نہیں ہیں۔

آنے والے واقعات کا ماقبل سے ربط

پیچھے جو اِشارہ آیا تھا کہ ان کے پاس ایسے واقعات آ گئے جن کے اندر ڈانٹ ڈپٹ کافی ہے، تنبیہ کافی ہے، اگر یہ سمجھنا چاہیں! تو اسی کی تفصیل کے طور پر اَب چند ایک واقعات نقل کئے جارہے ہیں، جن کے اندر یہی ڈانٹ ہے، دِکھایا جارہا ہے کہ تکذیب کا نتیجہ کیا ہوتا ہے؟ اور انبیاء ﷨ کا سلسلہ پہلے سے چلا آرہا ہے۔

قومِ نُوح کا نُوح علیہ السلام کے ساتھ سلوک

كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ: جھٹلایا ان سے پہلے نوح علیہ السلام کی قوم نے، فَكَذَّبُوْا عَبْدَنَا: پھر انہوں نے ہمارے بندے کی تکذیب کی، ہمارے بندے کو جھوٹا بتلایا، وَقَالُوْا: اور کہا انہوں نے: مَجْنُوْنٌ: یہ دیوانہ ہے، وَّازْدُجِرَ ماضی کا صیغہ ہے، اور اس کو ڈانٹا گیا، دھمکایا گیا، یعنی مجنون کہہ کر اس کی توہین کی گئی کہ اس کی باتیں دیوانے کی بڑ ہیں، یہ قابلِ توجہ نہیں ہیں، اور پھر اس کو ڈانٹ ڈپٹ بھی کی گئی لَئِنْ لَّمْ تَنْتَهِ يٰنُوْحُ لَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْمَرْجُوْمِيْنَ (سورۂ شعراء: ۱۱۶) اگر تُو باز نہیں آئے گا تو ہم تجھے پتھر مار مار کر ماردیں گے، اس قسم کی اس کو تنبیہ بھی کی گئی، ڈانٹ ڈپٹ بھی کی گئی۔

نُوح علیہ السلام کی دُعا

فَدَعَا رَبَّهٗٓ: تو ہمارے اس بندے نے اپنے رَبّ کو پکارا یہ کہتے ہوئے کہ اَنِّىْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ: کہ میں ان کے سامنے

مغلوب ہوگیا پس تُو ہی بدلہ لے، انتصار: بدلہ لینا، دفاع کرنا، اس کے دونوں مفہوم ہوا کرتے ہیں، یعنی اب میری ہمت تو ان کے مقابلے میں جواب دے رہی ہے، میرے تو یہ قابو میں آتے نہیں، اب تُو ہی انہیں سنبھال۔ اس طرح سے پھر اس بندے نے ہمارے سامنے دُعا کی جس کی تفصیل آپ کے سامنے سورۂ نُوح میں آئے گی: رَبِّ لَا تَذَرْ عَلَى الْاَرْضِ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ دَيَّارًا ۝ اِنَّكَ اِنْ تَذَرْهُمْ يُضِلُّوْا عِبَادَكَ وَلَا يَلِدُوْٓا اِلَّا فَاجِرًا كَفَّارًا، یہ ہے حضرت نُوح علیہ السلام کی دُعا، کہ اے اللہ! اب کسی کافر کو زمین پر چلتا پھرتا نہ چھوڑ، اگر یہ باقی رہیں گے تو سوائے کافر فاجر کے اِن کی اولاد میں کچھ پیدا نہیں ہونے کا، ان میں سے کوئی سمجھنے والا نہیں ہے۔ تو یہ دُعا کی: اَنِّيْ مَغْلُوْبٌ فَانْتَصِرْ: کہ میں مغلوب ہوگیا ہوں، میں ان کے سامنے ہار گیا ہوں، یہ میرے اُوپر غالب آرہے ہیں، یہ میرے قابو میں نہیں آتے، فَانْتَصِرْ: پس تُو ان سے نمٹ، تُو ان کو سنبھال لے، یا تُو دِفاع کر، تُو بدلہ لے۔

قومِ نُوح کا اَنجام

فَفَتَحْنَآ اَبْوَابَ السَّمَآءِ: تو ہماری طرف سے بدلہ لینے کا جب وقت آگیا تو پھر یہ قصہ ہوا، ''پھر کھول دیے ہم نے آسمان کے دروازے'' بِمَآءٍ مُّنْهَمِرٍ: بہت برسنے والے پانی کے ساتھ۔ آسمان کی طرف سے دروازے کھل گئے وَّفَجَّرْنَا الْاَرْضَ عُيُوْنًا: اور جاری کردیا ہم نے زمین کو چشمے، چشموں کی صورت میں ہم نے زمین کو بھی جاری کردیا، چشمے ہی چشمے پھوٹ پڑے، ''جاری کردیا ہم نے زمین کو اَز روئے چشموں کے'' فَالْتَقَى الْمَآءُ: پس پانی اکٹھا ہوگیا، آسمان کا پانی اور زمین کا پانی جُڑ گیا، مل گیا، عَلٰٓى اَمْرٍ قَدْ قُدِرَ: ایسے اَمر پر جو مقدر ہو چکا تھا، ان کو غرق کرنا جو طے ہو چکا تھا تو اس کے اُوپر زمین اور آسمان کا پانی مل گیا، وَحَمَلْنٰهُ عَلٰى ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ: اور اُٹھایا ہم نے نُوح کو کشتی پر، کشتی کو ذِکر کیا ذَاتِ اَلْوَاحٍ وَّدُسُرٍ کے ساتھ، جس میں اس کے اَجزائے ترکیب بھی آگئے، الواح لوح کی جمع ہے، لوح تختی کو کہتے ہیں، دُسر دِسار کی جمع ہے، دِسار میخ کو کہتے ہیں، ''میخوں اور تختوں سے بنی ہوئی چیز کے اُوپر ہم نے اس کو اُٹھالیا'' یہ بھی اللہ کی قدرت ہے کہ عذاب سے اُس نے یہی لکڑی اور یہی میخیں، اِن کے ذریعے سے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنی حفاظت میں رکھا اور نجات دی، اس سے مراد وہی سفینۂ نوح ہے، ''اُٹھالیا ہم نے اس کو تختوں والی اور میخوں والی پر'' یعنی ایسی چیز پر جو تختوں والی تھی اور میخوں والی تھی، میخوں سے اور تختوں سے تیار شدہ تھی، یعنی کشتی، وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِاَعْيُنِنَا (سورۂ ہود: ۳۷) سورۂ ہود کے اندر یہ واقعہ زیادہ مفصل آیا تھا۔ تَجْرِيْ بِاَعْيُنِنَا: وہ کشتی ہماری حفاظت میں چلتی تھی، ہماری آنکھوں کے سامنے، ہماری آنکھوں کے سامنے سے مراد ہے کہ ہماری حفاظت میں چلتی تھی، جَزَآءً لِّمَنْ كَانَ كُفِرَ: مَن كَانَ كُفِرَ: وہ شخص جس کی ناقدری کی گئی، جس کی ناشکری کی گئی، اس سے مراد نُوح علیہ السلام ہیں، نُوح علیہ السلام ہماری ایک نعمت تھے، اس کی ناشکری کی گئی، اس کا بدلہ لینے کے لئے ہم نے یہ سب کچھ کیا، فَعَلْنَا ذٰلِكَ جَزَآءً، کیا ہم نے یہ جزا کے طور پر اس شخص کے لئے جس کی ناقدری کی گئی تھی، یعنی اس شخص کا بدلہ ہم نے اِن لوگوں سے لیا، یہ سارے۔ کے سارے کام ہم نے بدلہ لینے کے لئے کئے، ''اس شخص کے لئے جس کی ناشکری کی گئی تھی۔''

وَلَقَدْ تَّرَكْنٰهَآ اٰيَةً: البتہ تحقیق ہم نے اس واقعے کو نشانی چھوڑ دیا، فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ: کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ یعنی لوگوں کو چاہیے کہ اس واقعے سے نصیحت حاصل کریں کہ اللہ کا جو فرستادہ بندہ ہوا کرتا ہے، اس کی تکذیب کرنے کا نتیجہ ایسے ہی ہوتا ہے۔

لفظِ ''مُّدَّكِرٍ'' کی صَرفی تحقیق

مُّدَّكِرٍ: اصل میں مُذْتَكِرٍ تھا، اِذْتَكَرَ: یہ ذَكَرَ سے بابِ افتعال ہے، پھر صَرف کے اندر آپ نے پڑھا ہے کہ بابِ افتعال میں اگر فاء کے اندر دال، ذال، زاء ان حرفوں میں سے کوئی حرف آجائے تو تائے افتعال دال سے بدل جایا کرتی ہے، تو بن گیا اِذْدَكَرَ، اور پھر ادغام کے دونوں طریقے ہی ہیں، دال کو ذال کرلو، ذال کو ذال میں اِدغام کرلو، مُذَّكِرٍ پڑھو تو بھی ٹھیک ہے، اور ذال کو دال کرلو، اور دال کو دال میں اِدغام کردو مُدَّكِرٍ پڑھو، تو بھی ٹھیک ہے، یہاں بھی قراءتیں دونوں ہی ہیں، ہماری قراءت مُدَّكِرٍ کی ہے دال کے ساتھ، ''کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟'' فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ: پھر کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا، یہ نُذُر اِنذار کے معنی میں ہے، میرا ڈرانا اور میرا عذاب پھر کیسا ہوا؟ دیکھ لیا لوگوں نے!

قرآنِ کریم نصیحت اور حفظ کے لئے آسان ہے!

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ: البتہ تحقیق آسان کیا ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے، نصیحت حاصل کرنے کے لئے قرآن سازگار ہے، اپنے مخاطبوں کی زبان میں اُترا، نہایت وضاحت کے ساتھ اس میں مضامین بیان کئے گئے، بار بار دوہرائے گئے، اس لئے اگر کوئی شخص عبرت حاصل کرنا چاہے، نصیحت حاصل کرنا چاہے تو قرآن بالکل اس کے لئے سازگار ہے، اور اسی طرح سے اگر کوئی اس کو یاد کرنا چاہے، حفظ کرنا چاہے تو اس کے لئے سازگار ہے، چنانچہ دُنیا کی کتابوں میں سے یہی ایک کتاب ہے جو یاد کرنے کے لئے انتہائی آسان ہے، کہ ایک بے سمجھ بچہ جس کو اگر آپ اُردو کی ایک نظم یاد کروانا چاہیں تو اتنی آسانی سے وہ اپنی زبان میں ایک نظم یاد نہیں کرسکتا جتنی آسانی کے ساتھ وہ قرآنِ کریم کو یاد کرلیتا ہے، متشابہات سے پُر کتاب اس طرح سے سینے میں محفوظ ہوجاتی ہے کہ زیر زبر تک کا فرق نہیں پڑتا، تو حفظ کے لئے بھی اللہ نے اس کو آسان کیا، یہ بھی اس کتاب کا معجزہ ہے، دُنیا میں دُوسری کوئی کتاب نہیں جس کو زبانی یاد کیا جاتا ہو، اور اتنی آسانی کے ساتھ وہ زبانی یاد ہوجاتی ہو، اور اتنی آسانی کے ساتھ زبانی طور پہ پڑھی جاتی ہو، یہ صرف اس کتاب کی خصوصیت ہے، نہ توراۃ کو حفظ کیا جاتا تھا، نہ انجیل کو حفظ کیا جاتا تھا، نہ دُنیا کے اندر کوئی اور اس قسم کی کتاب ہے جس کو اس اہتمام کے ساتھ اس کے ماننے والے زبانی یاد کرتے ہوں اور زبانی پڑھتے ہوں، یہ تیسیر اللہ تعالیٰ نے صرف اس کتاب کے حصے میں رکھی ہے، اور آج بھی رُوئے زمین پر یہ اس کتاب کا ایک زندہ معجزہ ہے، کوئی دُوسری کتاب اس حیثیت میں اس قرآنِ کریم کے مقابلے میں نہیں آسکتی۔

قومِ عاد کا انجام

كَذَّبَتْ عَادٌ: تکذیب کی عاد نے، عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام آئے تھے، فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ: پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا، نُذُرِ: نُذُرِیْ ہی راء کے اُوپر جو کسرہ ہے یائے متکلم پر دلالت کرنے والا ہے، اِنَّآ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِيْحًا صَرْصَرًا: بے شک ہم نے بھیجا ان کے اُوپر بادِ صرصر کو، تند ہوا، ''بادِ صرصر'' وہ ہوا کرتی ہے جو چلتی ہے تو ''ساں ساں'' کی آواز بھی آتی ہے، چلتی ہوئی شور مچاتی ہے، ''ہم نے ان کے اُوپر جھکڑ ہوا بھیجی، بادِ صرصر بھیجی'' فِيْ يَوْمِ نَحْسٍ مُّسْتَمِرٍّ: نحس: نحوست، بے برکتی، ''دائمی نحوست کے دن میں'' یعنی وہ دِن اُن کے لئے دائمی نحوست کا ذریعہ بن گیا، وہ ایسی بدبختی میں مبتلا ہوئے کہ اس بدبختی سے پھر ان کی جان نہیں چھوٹی، اور آئندہ کوئی چھوٹنے کی توقع نہ رہی، تو اس میں اِستمرار ہے، ''دائمی نحوست کے دِن میں ہم نے ان کے لئے بادِ صرصر بھیج دی'' تَنْزِعُ النَّاسَ: اُکھیڑتی تھی وہ لوگوں کو، كَاَنَّهُمْ اَعْجَازُ نَخْلٍ مُّنْقَعِرٍ: گویا کہ وہ اکھڑنے والی کھجوروں کے تنے ہیں، اَعجاز عَجُز کی جمع ہے، تنے کو کہتے ہیں، منقعر: اُکھڑنے والے، اُکھڑنے والی کھجوروں کے تنے ہیں، اس طرح سے اُٹھا اُٹھا کے ہوا نے پٹخ دیئے، دُوسری جگہ آئے گا: اَعْجَازُ نَخْلٍ خَاوِيَةٍ، سورۂ حاقہ کے اندر لفظ خاویہ کا ہے، کھوکھلے کے معنی میں ہے، وہ ایسے معلوم ہوتے تھے جیسے کھجوروں کے کھوکھلے تنے ہیں، جن کے اندر کوئی قوت اور طاقت ہی نہیں ہوتی۔ یہ وہ قوم تھی جس کا نعرہ یہ تھا کہ مَنْ اَشَدُّ مِنَّا قُوَّةً (حم فصلت:۱۵) ہم سے زیادہ طاقتور بھی کوئی ہے؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی ہوا کا مقابلہ نہ کر سکے، ہوا کا تھپیڑا لگا تو کھوکھلے تنوں کی طرح گرادیے گئے، بڑے بڑے قدآور تھے، بہت بہت قوت والے تھے، لیکن اللہ کے عذاب کے سامنے کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ یہ سب واقعات عبرت کے لئے ذکر کئے جا رہے ہیں، یہی واقعات ہیں جن کے اندر تنبیہ اور ڈانٹ کافی موجود ہے اگر کوئی عبرت حاصل کرنا چاہے، فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ: کیسا ہوا میرا عذاب اور میرا ڈرانا، وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ یہ چیز بار بار دوہرائی جا رہی ہے تاثیر پیدا کرنے کے لئے، ''ہم نے قرآن کو سازگار بنایا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لئے، کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟'' واقعات آپ کے سامنے مفصل گزر چکے ہیں۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ ﴿۲۳﴾ فَقَالُوْٓا اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّ
ثمود نے بھی ڈرانے والوں کو جھٹلایا ﴿۲۳﴾ کہنے لگے: کیا ایک انسان، ہم میں سے، ہم اس کے پیچھے لگ جائیں؟ بے شک ہم تب البتہ گمراہی میں ہوں گے
سُعُرٍ ﴿۲۴﴾ ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ ﴿۲۵﴾ سَيَعْلَمُوْنَ
اور دیوانگی میں ہوں گے ﴿۲۴﴾ کیا اِس پر نصیحت اُتار دی گئی ہمارے درمیان میں؟ بلکہ یہ جھوٹا ہے شیخی باز ہے ﴿۲۵﴾ عنقریب جان لیں گے

غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْأَشِرُ ﴿۲۶﴾ إِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ فَارْتَقِبْهُمْ

مستقبل زمانے میں کہ کون جھوٹا شیخی باز ہے (۲۶) بے شک ہم بھیجنے والے ہیں اُونٹنی کو ان کی آزمائش کے لئے پس آپ ان کا انتظار کیجئے

وَاصْطَبِرْ ﴿۲۷﴾ وَنَبِّئْهُمْ أَنَّ الْمَاءَ قِسْمَةٌ بَيْنَهُمْ ۚ كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ ﴿۲۸﴾

اور صبر کیجئے (۲۷) اور ان کو خبر دے دیجئے کہ پانی ان کے درمیان تقسیم شدہ ہے، ہر باری حاضری دی ہوئی ہے (۲۸)

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ فَتَعَاطَىٰ فَعَقَرَ ﴿۲۹﴾ فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِي وَنُذُرِ ﴿۳۰﴾ إِنَّا

ان لوگوں نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی، پس اس نے وار کیا، پھر کونچیں کاٹ دیں (۲۹) پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا (۳۰) بے شک

أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَاحِدَةً فَكَانُوا كَهَشِيمِ الْمُحْتَظِرِ ﴿۳۱﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ

ہم نے بھیجا ان کے اُوپر ایک ہی کڑک کو، پس ہو گئے وہ باڑ لگانے والے کے باڑ کے چورے کی طرح (۳۱) ہم نے قرآن کو سازگار بنایا ہے

لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿۳۲﴾ كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوطٍ بِالنُّذُرِ ﴿۳۳﴾ إِنَّا أَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ

نصیحت حاصل کرنے کے لئے، تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ (۳۲) قوم لُوط نے بھی ڈرانے والوں کو جھٹلایا (۳۳) ہم نے ان کے اُوپر ایک ہوا

حَاصِبًا إِلَّا آلَ لُوطٍ ۖ نَّجَّيْنَاهُم بِسَحَرٍ ﴿۳۴﴾ نِّعْمَةً مِّنْ عِندِنَا ۚ

بھیجی پتھر برسانے والی، سوائے آلِ لُوط کے، آلِ لُوط کو ہم نے نجات دی رات کے آخری حصے میں (۳۴) اپنی طرف سے احسان کرتے ہوئے،

كَذَٰلِكَ نَجْزِي مَن شَكَرَ ﴿۳۵﴾ وَلَقَدْ أَنذَرَهُم بَطْشَتَنَا فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ ﴿۳۶﴾

شکر گزاروں کو ہم بدلہ ایسے ہی دیا کرتے ہیں (۳۵) اور البتہ تحقیق لُوط علیہ السلام نے ڈرایا ان کو ہماری پکڑ سے، انہوں نے ہمارے ڈرانے میں جھگڑے ڈالے (۳۶)

وَلَقَدْ رَاوَدُوهُ عَن ضَيْفِهِ فَطَمَسْنَا أَعْيُنَهُمْ فَذُوقُوا عَذَابِي

البتہ تحقیق ورغلایا انہوں نے لُوط علیہ السلام کو ان کے مہمانوں سے، پھر ہم نے ان کی آنکھیں مٹا دیں، اور (کہا ہم نے کہ) چکھو میرا عذاب

وَنُذُرِ ﴿۳۷﴾ وَلَقَدْ صَبَّحَهُم بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ ﴿۳۸﴾ فَذُوقُوا عَذَابِي

اور میرا ڈرانا (۳۷) البتہ تحقیق صبح کے وقت ان پر ایسا عذاب آ گیا جو کہ قرار پکڑنے والا تھا (۳۸) پھر (کہا گیا کہ) چکھو میرے عذاب کا مزہ

وَنُذُرِ ﴿۳۹﴾ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْآنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِن مُّدَّكِرٍ ﴿۴۰﴾

اور میرے ڈرانے کا مزہ (۳۹) ہم نے سازگار بنایا قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے، تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟ (۴۰)

تفسیر

قومِ ثمود کا واقعہ

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِالنُّذُرِ: نذر نذیر کی جمع، ثمود نے رسولوں کو جھٹلایا، ڈرانے والوں کو جھٹلایا، ان کی تکذیب کی، یا جس طرح سے پہلے عرض کیا نذر انذار کے معنی میں ہے، ثمود نے انذار کی تکذیب کی، یعنی ہمارے ڈرانے کی پروا نہیں کی، ہمارے ڈراوے کو جھٹلایا، فَقَالُوْٓا: کہنے لگے: اَبَشَرًا مِّنَّا وَاحِدًا نَّتَّبِعُهٗٓ: بشرا یہ منصوب علی شریطۃ التفسیر ہے، زیدًا ضربتہ کی طرح، واحدًا یہ بشرا کی صفت ہے، ''کیا ایک انسان ہم میں سے، ہم اس کے پیچھے لگ جائیں؟'' یعنی ایک انسان کے پیچھے لگ کر ہم سارے اپنا قومی اور آباؤاجداد کا جو طریقہ ہے اس کو ترک کر دیں؟ ایک آدمی کے پیچھے لگ کے؟ اِنَّآ اِذًا لَّفِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ: بے شک ہم تب البتہ گمراہی میں ہیں اور دیوانگی میں ہیں۔ یعنی یہ تو کہتا ہے کہ میری بات نہیں مانو گے تو گمراہی ہے، اور میری بات نہیں مانو گے تو تمہاری بے عقلی اور دیوانگی ہے، لیکن ہم کہتے ہیں کہ اس کے پیچھے لگ جانا پرلے درجے کی بے عقلی اور گمراہی ہے، اور سُعُر سعیر کی جمع بھی ہوسکتی ہے، آگ کے معنی میں، بھڑکنے والی آگ، یعنی یہ تو کہتا ہے کہ اگر میری اتباع نہیں کرو گے تو تم آگوں میں جا پڑو گے، لیکن ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کی بات کو مان لینا پرلے درجے کی گمراہی ہے اور اپنے آپ کو بھاڑ میں جھونک دینا ہے، یہ شدت کے ساتھ انکار کرتے ہوئے وہ یہ بات کہتے ہیں، سُعُر کا ترجمہ دونوں طرح سے ہی ہے، دیوانگی کے معنی میں، دیوانگی اور جنون کے معنی میں بھی ہے، اور آگوں کے معنی میں بھی ہے۔ ''بے شک ہم تب البتہ گمراہی میں ہوں گے اور آگوں میں ہوں گے'' یہ اپنے آپ کو آگ میں ڈالنے والی بات ہے کہ ہم اپنے جیسے ایک انسان کے پیچھے لگ کے اپنے آباؤاجداد کے طریقے کو چھوڑ دیں۔

اِقتدار کا نشہ قبولِ حق سے رُکاوٹ

ءَاُلْقِيَ الذِّكْرُ عَلَيْهِ مِنْۢ بَيْنِنَا: پھر یہ بات بھی دیکھو، یہ کہتا ہے کہ میرے اُوپر اللہ کی طرف سے نصیحت اُترتی ہے، تو کیا اللہ تعالیٰ کو یہی ایک ملا تھا جس کے اُوپر نصیحت اُترتی ہے؟ جو خاندانی طور پر نسلاً بعد نسلٍ سرداری والے ہیں، سردار ہیں، قوم کے اعلیٰ فرد ہیں، ان کے اُوپر یہ نصیحت کیوں نہ اُتری؟ اس کو کون سے کوئی سرخاب کے پَر لگے ہوئے ہیں، یا اس پہ کون سے کوئی موتی ٹکے ہوئے ہیں جس کی بنا پر اللہ کو یہ پسند آ گیا کہ اس کے اُوپر نصیحت اُتر آئی، یہ اُن کا ذہن تھا، وہ سمجھتے تھے کہ دولت مند اور سردار آدمی جو صاحبِ اقتدار ہے اگر اللہ کی طرف سے کوئی نعمت ہے تو نعمت کے حق دار یہی ہیں، اور ایسا کہنے والے وہ خود ہی ہوتے تھے، جو قوم کے اُوپر برتری رکھے ہوئے تھے، وہ کسی دُوسرے کی برتری تسلیم نہیں کرسکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ سرمایہ دار طبقہ، سردار قسم کے لوگ انبیاء ﷺ کی مخالفت کیا کرتے ہیں، کیونکہ وہ اپنے اقتدار کے مقابلے میں کسی دُوسرے کا اِقتدار دیکھ نہیں سکتے، ساری زندگی تو

اُنہوں نے حکومت کی ہوتی ہے اپنی قوم اور قبیلے پر، لوگ اُن کے اِشاروں پر مرتے ہیں، تو اَب وہ کس طرح سے برداشت کریں کہ ہم کسی دُوسرے کے اِشاروں پہ مرنے لگ جائیں اور ساری کی ساری قوم اُن کے پیچھے لگ جائے اور ہمیں چھوڑ دے؟ اِقتدار کا نشہ ایک بہت بڑا نشہ ہے، بہت بُرا نشہ ہے، کہ جب انسان کے دل ودماغ کے اُوپر یہ نشہ طاری ہوجاتا ہے تو پھر اپنے اِقتدار کو بچانے کے لئے، یا اِقتدار کے حاصل کرنے کے لئے پھر آپ دیکھتے ہی ہیں کہ کس طرح سے لوگ کیا کرتے ہیں! الیکشن کے زمانے میں تھوڑا سا نقشہ اِس کا نظر آجایا کرتا ہے کہ اِقتدار کے لئے لوگ کس طرح سے دیوانہ ہوئے پھرتے ہیں اور کس طرح سے مارے مارے پھرتے ہیں! تو یہ بڑے لوگ یونہی کہتے ہیں کہ اِس پر کیوں اُتری، اگر اُترنا ہی تھا تو کسی سردار پہ اُترتی، کسی بڑے آدمی پہ اُترتی جو خاندانی طور پر سردار ہیں، مدّتِ مدید سے اسی طرح سے چلے آتے ہیں، ان کو مالی طور پر بھی برتری حاصل ہے، تو اللہ کی نصیحت آتی تو اُسی پر آتی، ''کیا اِس پر نصیحت اُتاردی گئی ہمارے درمیان میں؟'' بَلْ هُوَ كَذَّابٌ اَشِرٌ: بَل کا معنی ہے کہ ایسے نہیں، بلکہ یہ جھوٹا ہے اور شیخی باز ہے، کہتا ہے کہ اللہ کی طرف سے میرے پاس وحی آتی ہے، غلط کہتا ہے اور شیخی مارتا ہے خواہ مخواہ اپنی شان اُونچی دکھانے کے لئے۔ یہ کتنا سخت رویہ اِختیار کرتے تھے وہ انبیاء ﷩ کی دعوت کے مقابلے میں، اور ان کی اطاعت کے لئے کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے، ''بلکہ یہ جھوٹا ہے'' کذّاب: بہت جھوٹ بولنے والا ہے، اَشِرٌ: شیخی باز ہے، شیخیاں مارتا ہے، سَيَعْلَمُوْنَ: یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کہا جارہا ہے سَيَعْلَمُوْنَ غَدًا مَّنِ الْكَذَّابُ الْاَشِرُ: غد سے یہاں مستقبل مراد ہے، ''عنقریب مستقبل زمانے میں جان لیں گے کہ کون جھوٹا شیخی باز ہے'' ان کو پتا چل جائے گا کہ شیخیاں یہ مارتے ہیں یا اللہ کا نبی؟ اور جھوٹ یہ بولتے ہیں یا اللہ کا نبی؟ عنقریب پتا چل جائے گا آنے والے زمانے میں۔

قومِ ثمود پر آزمائش

اِنَّا مُرْسِلُوا النَّاقَةِ فِتْنَةً لَّهُمْ: بے شک ہم بھیجنے والے ہیں ایک اُونٹنی اِن کی آزمائش کے لئے، یہ تفصیل آپ کے سامنے پہلے آچکی کہ معجزے کے طور پر حضرت صالح علیہ السلام کے لئے چٹان میں سے ایک اُونٹنی پیدا کی گئی، اور اس کو آپ کی نبوّت کی دلیل بنایا گیا، چونکہ وہ عجیب الخلقت تھی، بہت بڑے قد کی تھی، اور پھر پانی بھی بہت پیتی تھی، تو قوم کے لئے وہ ایک آزمائش بن گئی، اللہ کی طرف سے ہدایت آگئی کہ یہ ہماری نشانی ہے، اس کو چھیڑنا نہیں ہے، اس کو چھوڑ دیہ اللہ کی زمین میں چلتی پھرے، اور پانی کی باری باندھ لو، ایک دِن پانی پینے کے لئے یہ آیا کرے، ایک دِن تمہارے جانور پیا کریں، اگر اس میں رُکاوٹ ڈالو گے تو خبردار! اللہ کا عذاب آجائے گا، یہ واقعات آپ کے سامنے پہلے آچکے ہیں، ''بے شک ہم بھیجنے والے ہیں اُونٹنی کو اِن کی آزمائش کے لئے'' فَارْتَقِبْهُمْ: پس آپ ان کا اِنتظار کیجئے وَاصْطَبِرْ: اور حالات کو برداشت کرتے رہیے، یہ حضرت صالح علیہ السلام کو خطاب ہے، کہ آپ اِن کا اِنتظار کیجئے، دیکھو کیا نتیجہ نکلتا ہے؟ اِس آزمائش میں یہ کیسے پورے اُترتے ہیں! اور آپ صبر کریں،

ان کی سختیاں سہتے رہیں، وَنَبِّئْهُمْ: اور انہیں اطلاع دے دو، تنبیہ کر دو، اَنَّ الْمَآءَ قِسْمَةٌۢ بَیْنَهُمْ: کہ پانی ان کے درمیان میں تقسیم شدہ ہے، یعنی جو چشمہ تھا یا جو کنواں تھا۔

اس کنویں کا تعارف جہاں سے ناقہ پانی پیا کرتی تھی

آج بھی اس کا نشان باقی ہے جہاں سے وہ اُونٹنی پانی پیا کرتی تھی، حضور ﷺ کے زمانے میں بھی نشان تھا، جس وقت آپ ﷺ غزوۂ تبوک کی طرف گئے ہیں تو اسی وادی میں سے گزرے تھے، یہ قومِ ثمود کی وادی جس کو ''حجر'' کہتے ہیں، اور اس وقت وہ ''مدائن صالح'' کے نام سے مشہور ہے، مدینہ منورہ سے جو بغداد کی طرف ریلوے لائن بنائی گئی تھی اس کے اُوپر اسٹیشن ہے ''مدائن صالح''، تو حضور ﷺ جب تشریف لے جا رہے تھے اس وادی میں سے گزرے تو لوگوں کو منع کر دیا تھا کہ یہاں دُوسرے جتنے بھی کنویں ہیں کہیں سے پانی لے کر استعمال نہیں کرنا، ہاں! البتہ اُس کنویں سے پانی لے لینا جہاں ناقہ پانی پیا کرتی تھی،(۱) اور اُس کا نشان اس وقت بھی ہے، یعنی ترکی حکومت کے زمانے وہاں ایک چوکی تھی جو اس وقت ویران ہے، اُسی کے احاطے کے اندر وہ کنواں ہے جس کے متعلق اب بھی روایت چلی آ رہی ہے کہ یہی کنواں ہے جس کے اُوپر حضرت صالح کی ناقہ پانی پیا کرتی تھی، اور پہاڑوں کے درمیان میں ایک درّہ ہے جو ''فج الناقة'' کے ساتھ اب بھی مشہور ہے، کہ اُونٹنی اس راستے سے آیا کرتی تھی، آج اس کو ''مدائن صالح'' کہتے ہیں، یہ علاقہ سعودی عرب کی حدود میں ہے، اور پہاڑوں میں جس قسم کے ان کے مکانات تھے، جیسے جیسے انہوں نے عجیب عجیب مکان بنائے ہوئے تھے پہاڑوں کو تراش کے، مولانا مودودی صاحب جب تفسیر لکھ رہے تھے تو اس علاقے میں گئے تھے، وہاں کے سب فوٹو لائے ہیں اور ''تفہیم القرآن'' کے اندر سورۂ شعراء کی تفسیر میں وہ ساری تصویریں لگائی ہیں، اور اس کنویں کا بھی انہوں نے فوٹو دیا ہے کہ یہ ہے کنواں جس کے متعلق یہ روایت ہے کہ جہاں سے یہ اُونٹنی پانی پیا کرتی تھی، سورۂ شعراء کی تفسیر میں یہ سارے فوٹو لگے ہوئے ہیں۔ ''ہم بھیجنے والے ہیں اُونٹنی کو ان کی آزمائش کے لئے، پس آپ انتظار کیجئے اور صبر کیجئے، اور ان کو خبر دے دیجئے کہ پانی ان کے درمیان تقسیم شدہ ہے'' كُلُّ شِرْبٍ مُّحْتَضَرٌ: ہر باری حاضری دی ہوئی ہے، یعنی ہر باری پر باری والا حاضر ہوگا، مُحْتَضَرٌ یہ اسم مفعول کا صیغہ ہے، ''باری حاضری دی ہوئی ہے'' یعنی ہر باری پر باری والا حاضر ہوگا، باری والے کے لئے کوئی گڑبڑ نہ کی جائے۔

ناقہ پر حملہ اور قومِ ثمود کا انجام

فَنَادَوْا صَاحِبَهُمْ: ان لوگوں نے اپنے ایک ساتھی کو آواز دی، اسے اُبھارا اس ناقہ کو ختم کرنے کے لئے، قتل کرنے کے لئے،

(۱) بخاری ۱/۴۷۸، کتاب احادیث الأنبیاء، باب قول الله: والی ثمود اخاهم صالحا۔ مسلم ۲/۴۱۱ باب النهی عن الدخول علی اهل الحجر۔

کہ یہ تو ہمارے لئے مصیبت بن گئی، یہ چارہ بھی کھا جاتی ہے اور ہمارے جانوروں کو ملتا نہیں، اور پانی کی باری پر یہ آتی ہے تو ہمارے جانور اُس دِن نہیں جا سکتے، تو انہوں نے اپنے ایک صاحب کو آواز دی یعنی اسے اُبھارا، فَتَعَاطٰی: پس اس نے وار کیا، ہاتھ بڑھایا، فَعَقَرَ: پھر کونچیں کاٹ دیں، اُس نے اس کے اُوپر وار کر کے ہاتھ بڑھا کے اس کی ٹانگیں کاٹ دیں، عَقْر کونچیں کاٹنے کو کہتے ہیں، فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِيْ وَنُذُرِ: پھر کیسا تھا میرا عذاب اور میرا ڈرانا، اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ صَيْحَةً وَّاحِدَةً: بے شک ہم نے بھیجا ان کے اُوپر ایک ہی کڑک کو، فَكَانُوْا كَهَشِيْمِ الْمُحْتَظِرِ: محتظِر کا لفظ حِظار سے لیا گیا ہے، حظر منع کرنے اور روکنے کو کہتے ہیں، اور حِظار کہتے ہیں باڑ کو جو کسی کھیت کے اِردگرد لگا دی جاتی ہے، یا بکریوں کے لئے جانوروں کے لئے باڑا جو بنایا جاتا ہے تو اس کے اردگرد وہ باڑ لگا دی جاتی ہے، اور وہ جس وقت بوسیدہ ہو جاتی ہے تو جانور اس کے اُوپر سے گزرتے ہوئے، اِنسان گزرتے ہوئے پھر وہ چورا چورا ہو جاتی ہے، تو محتظِر کہتے ہیں باڑ لگانے والے کو، حظار کہتے ہیں باڑ کو، یہاں مضاف محذوف مانیں گے، ھشیم کہتے ہیں چورے کو، ھَشَمَ توڑنے کو کہتے ہیں، ھشیم: جو چیز چورا چورا کر دی جائے، ''پس ہو گئے وہ باڑ لگانے والے کی باڑ کے چورے کی طرح'' یعنی جس طرح سے ایک آدمی باڑ لگاتا ہے، کچھ دِنوں کے بعد جانور اس کو روند روند کے چورا چورا کر دیتے ہیں، یہ بھی ایسے ہی رہ گئے، یعنی اب وہ خود ویران رہ گئے، اور ان کی آبادیاں دیکھ کر معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کوئی آبادی تھی، اور وہ سب معاملہ چورا چورا ہو گیا، نیست و نابود ہو گئے، ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے، ریزہ ریزہ ہو گئے، ''ہو گئے وہ باڑ لگانے والے کی باڑ کے چورے کی طرح''، جیسے روند روند کر جانور اُس کو چورا کر دیتے ہیں، اَصحابِ فیل کے واقعے میں جیسے لفظ استعمال کیا گیا: كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ (پ ۳۰، سورۂ فیل) اس چارے کی طرح جو جانوروں کا کھایا ہوا ہو، جانور جس چارے کو کھائیں تو بچا ہوا کوڑا کرکٹ پاؤں کے نیچے سے روندا ہوا، جس قسم کا حال اس کا ہو جایا کرتا ہے تو اَصحابِ فیل کا بھی یہی حال ہو گیا۔ تو اسی طرح سے قومِ ثمود کا یہ حال ذِکر کیا گیا کہ باڑ جس طرح سے روندے جانے کے بعد چورا چورا ہو جایا کرتی ہے یہ بھی ایسے ہی ہو گئے۔ وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ: ہم نے قرآن کو سازگار بنایا ہے نصیحت حاصل کرنے کے لئے، تو کیا کوئی نصیحت حاصل کرنے والا ہے؟

قومِ لُوط کا واقعہ

كَذَّبَتْ قَوْمُ لُوْطٍۢ بِالنُّذُرِ: قومِ لُوط علیہ السلام نے بھی ڈرانے والوں کو جھٹلایا، اِنَّاۤ اَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ حَاصِبًا: ہم نے ان کے اُوپر کنکر برسانے والی ہوا بھیجی، پتھر برسانے والی، جس طرح سے ژالہ برستا ہے، جب یہ زیادہ سخت ہو جائے، زیادہ بڑا ہو جائے تو یہی سنگ باری ہے، حدیث شریف میں جو آتا ہے کہ قیامت کے قریب جا کر واقعات پیش آئیں گے، زمین کے اندر دھنسنے کے، شکلوں کے بگڑنے کے، اور آسمان سے پتھر برسنے کے،[1] تو آسمان سے پتھر برسنا یہ ژالے جو بڑے بڑے پڑنے لگ جاتے ہیں اینٹوں

(۱) عَنِ النَّبِيِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ: بَيْنَ يَدَيِ السَّاعَةِ مَسْخٌ وَخَسْفٌ وَقَذْفٌ. (ابن ماجه ص ۲۹۵ باب الخسوف)

کی طرح یہ پتھر برسنے سے کوئی کم نہیں ہیں، اسی طرح سے ان کے اُوپر بھی اللہ نے ایک ایسی ہوا بھیجی جس کے ساتھ پتھر برسائے گئے، اور وہ پتھر سنگ۔گِل کنکر جیسے تھے، جیسے تفصیل دُوسری جگہ آپ کے سامنے گزری، ''ہم نے ان کے اُوپر ایک ہوا بھیجی پتھر برسانے والی'' اِلَّآ اٰلَ لُوْطٍ سوائے آلِ لُوط کے، آلِ لُوط کے علاوہ باقیوں پر ہم نے ہوا بھیج دی، نَجَّيْنٰهُمْ بِسَحَرٍ: آلِ لُوط کو ہم نے نجات دی رات کے آخری حصے میں، وہ رات کے آخری حصے میں سفر کر کے اس آبادی سے نکل گئے، نِّعْمَةً مِّنْ عِنْدِنَا: نجات دی ہم نے ان کو اپنی طرف سے احسان کرتے ہوئے، آلِ لُوط پر ہمارا اِحسان ہوا کہ ہم نے اُن کو نجات دے دی، كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ: شکر گزاروں کو ہم بدلہ ایسے ہی دیا کرتے ہیں، یعنی لُوط علیہ السلام اور ان کے گھر والے (سوائے ان کی بیوی کے جس طرح سے اس کا اِستثناء دُوسری جگہ موجود ہے) وہ شکر گزار تھے ہم نے ان کے اُوپر ایسے احسان کیا، وَلَقَدْ اَنْذَرَهُمْ بَطْشَتَنَا: اور البتہ تحقیق لُوط علیہ السلام نے ڈرایا اُن کو ہماری پکڑ سے، فَتَمَارَوْا بِالنُّذُرِ: انہوں نے ہمارے ڈرانے میں جھگڑے ڈالے، جھگڑا کیا انہوں نے ہمارے ڈرانے میں، یعنی ہمارے ڈرانے کی کوئی پرواہ نہ کی، وَلَقَدْ رَاوَدُوْهُ عَنْ ضَيْفِهٖ: یہ واقعہ مفصل آپ کے سامنے گزر چکا، البتہ تحقیق ورغلایا انہوں نے لُوط علیہ السلام کو ان کے مہمانوں سے، لُوط علیہ السلام کو ورغلا کر وہ مہمان لینے چاہے، مہمان سے مراد وہی فرشتے جو کہ بے ریش لڑکوں کی شکل میں آئے تھے اور ان کے چھیننے کے لئے قوم چڑھ آئی تھی، تفصیل آپ کے سامنے سورۂ ہود میں گزری ہے، فَطَمَسْنَآ اَعْيُنَهُمْ: پھر ہم نے ان کی آنکھیں مٹادیں، ان کو اندھا ہی کر دیا، فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ: اور کہا ہم نے کہ چکھو میرا عذاب اور میرا ڈرانا، میرے ڈرانے کا اور میرے عذاب کا مزہ چکھو، وَلَقَدْ صَبَّحَهُمْ بُكْرَةً عَذَابٌ مُّسْتَقِرٌّ: صَبَّحَ: صبح کے وقت عذاب کا آنا، بُكْرَةً ظرف ہے صَبَّحَ کا۔ البتہ تحقیق صبح کے وقت ان پر عذاب آگیا، ایسا عذاب جو کہ قرار پکڑنے والا تھا، یعنی وہ کوئی تنبیہ نہیں تھی کہ ایک تھپیڑ لگا اور عذاب آگے گزر گیا، تو ان کو سوچنے کا موقع دے دیا، ایسی بات نہیں، وہ تو ٹِک ہی گیا، عذاب جب آیا تو ٹھہر ہی گیا، اب قیامت تک اُس عذاب سے ان کی جان نہیں چھوٹتی اور نہ آئندہ ہی چھوٹے گی، ''ٹھہر جانے والا عذاب'' ایسی مصیبت آئی جس نے وہاں ڈیرے ہی ڈال لیے، وہ مصیبت وہاں سے ٹلنے والی نہیں تھی، واقعات دو قسم کے ہوا کرتے ہیں، ایک اللہ کی طرف سے تنبیہ آتی ہے، تنبیہ ہو کر واقعہ آگے گزر جاتا ہے، انسان کے لئے پھر سوچنے کا اور سنبھلنے کا موقع رہ جاتا ہے، دھکا لگا، پھر انسان سنبھل گیا، لیکن ایک عذاب ایسا ہوتا ہے کہ جو وہاں آکر ڈیرے ہی ڈال لے، انسان کو نیست و نابود ہی کر کے چھوڑے، کسی طرح سے جان چھوڑنے والا نہیں، تو یہ بھی عذاب مستقر تھا، قرار پکڑنے والا، ٹِک جانے والا، ایسا عذاب جس نے وہاں ڈیرے ہی ڈال لیے، فَذُوْقُوْا عَذَابِيْ وَنُذُرِ: پھر کہا گیا کہ چکھو میرے عذاب کا مزہ اور میرے ڈرانے کا مزہ۔

''يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ'' کا صحیح مفہوم

وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ: ہم نے سازگار بنایا قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لئے، تو کیا کوئی نصیحت

حاصل کرنے والا ہے؟ یہ آسانی کی نسبت جو قرآن کی طرف کی جارہی ہے کہ ہم نے اس کو آسان کیا، یہ تذکُّر کے لئے ہے، نصیحت حاصل کرنے کے لئے۔ اَحکام کا نکالنا اور اس میں سے اِجتہاداً، اِستنباطاً باتوں کو سمجھنا، یہ ہر کسی کے لئے آسان نہیں، اس کے لئے مہارت چاہیے اور انتہائی درجے کا علم اور فہم چاہیے، ہر کسی کو قرآنِ کریم میں اِجتہاد کرنے کا حق نہیں کہ اس میں سے اَحکام نکالے، اَحکام نکالنا مجتہدین اور ماہرین کا کام ہے، البتہ جہاں تک وعظ، نصیحت، عبرت حاصل کرنے کی بات ہے، وہ ہر کسی کے لئے آسان ہے، علم والے بھی حاصل کرسکتے ہیں، جاہل بھی کرسکتے ہیں، اِستنباطِ اَحکام کے لئے یہ آسان نہیں۔

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ ﴿۴۱﴾ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا كُلِّهَا فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ

آلِ فرعون کے پاس بھی ڈرانے والے آئے ﴿۴۱﴾ انہوں نے بھی ہماری سب آیات کو جھٹلایا، پھر ہم نے ان کو پکڑلیا مثل پکڑنے ایک زبردست

مُّقْتَدِرٍ ﴿۴۲﴾ اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ اَمْ لَكُمْ بَرَآءَةٌ فِي الزُّبُرِ ﴿۴۳﴾ اَمْ يَقُوْلُوْنَ

قدرت والے کے ﴿۴۲﴾ کیا تمہارے کافر اچھے ہیں ان سے؟ یا تمہارے لئے کوئی براءت لکھ دی گئی ہے کتابوں میں؟ ﴿۴۳﴾ یا یہ کہتے ہیں

نَحْنُ جَمِيْعٌ مُّنْتَصِرٌ ﴿۴۴﴾ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ ﴿۴۵﴾ بَلِ السَّاعَةُ

کہ ہم ایک جماعت ہیں بدلہ لینے والی ﴿۴۴﴾ عنقریب یہ جماعت شکست دے دی جائے گی اور یہ پیٹھ پھیر کر بھاگیں گے ﴿۴۵﴾ بلکہ قیامت

مَوْعِدُهُمْ وَالسَّاعَةُ اَدْهٰى وَاَمَرُّ ﴿۴۶﴾ اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ ﴿۴۷﴾ يَوْمَ

ان کے وعدے کا وقت ہے اور وہ قیامت بہت سخت اور بہت کڑوی ہے ﴿۴۶﴾ بے شک مجرم لوگ گمراہی میں ہیں اور بے عقلی میں ہیں ﴿۴۷﴾ جس دن

يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ ﴿۴۸﴾ اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ

کہ گھسیٹے جائیں گے یہ آگ میں چہروں کے بل، (کہا جائے گا) دوزخ کے چھونے کا مزہ چکھو ﴿۴۸﴾ بے شک ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے

بِقَدَرٍ ﴿۴۹﴾ وَمَآ اَمْرُنَآ اِلَّا وَاحِدَةٌ كَلَمْحٍۭ بِالْبَصَرِ ﴿۵۰﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَآ اَشْيَاعَكُمْ

اندازے کے ساتھ ﴿۴۹﴾ اور نہیں ہے ہمارا حکم مگر یک بارگی مثل آنکھ کے جھپکنے کے ﴿۵۰﴾ البتہ تحقیق ہلاک کیا ہم نے تم جیسے لوگوں کو،

فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ ﴿۵۱﴾ وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ ﴿۵۲﴾ وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّكَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ ﴿۵۳﴾

تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟ ﴿۵۱﴾ ہر چیز جس کو انہوں نے کیا ہے وہ اعمال ناموں میں ہے ﴿۵۲﴾ ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی گئی ہے ﴿۵۳﴾

إِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ۝۵۴ فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ ۝۵۵

بے شک پرہیزگار باغات میں ہوں گے اور نہروں میں ہوں گے ۝۵۴ بہترین ٹھکانے میں، صاحبِ اقتدار بادشاہ کے پاس ۝۵۵

تفسیر

آلِ فرعون کا انجام

وَلَقَدْ جَآءَ اٰلَ فِرْعَوْنَ النُّذُرُ: آلِ فرعون کے پاس بھی ڈرانے والے آئے، آلِ فرعون: فرعون کے متعلقین، كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا: انہوں نے بھی ہماری آیات کو جھٹلایا، كُلِّهَا: سب آیات کو جھٹلایا، فَاَخَذْنٰهُمْ اَخْذَ عَزِيْزٍ مُّقْتَدِرٍ: پھر ہم نے ان کو پکڑ لیا مثل پکڑنے ایک زبردست قدرت والے کے، ایک زبردست اِقتدار والا جس طرح سے پکڑا کرتا ہے، پھر ہم نے اُن کو ایسے پکڑا، پھر انہیں ڈھیلے ہاتھوں نہیں پکڑا، جب پکڑا تو سخت پکڑا، ایسے پکڑا جیسے کوئی زبردست قدرت والا پکڑا کرتا ہے، جس سے چھوٹنے کی پھر کوئی صورت نہیں ہوتی۔

کُفّارِ مکہ کو تنبیہ

یہاں تک یہ واقعات بیان کیے گئے بطورِ تنبیہ کے، قومِ نُوح علیہ السلام کا واقعہ آ گیا، قومِ عاد کا آ گیا، ثمود کا آ گیا، قومِ لُوط علیہ السلام کا آ گیا، اور فرعون کا آ گیا، یہ پانچ واقعات آ گئے، اب ان کو ذِکر کر کے مشرکینِ مکہ کو خطاب کر کے کہا جا رہا ہے، اَكُفَّارُكُمْ خَيْرٌ مِّنْ اُولٰٓئِكُمْ: اگر کُفر کے نتیجے میں ان کو تباہ کر دیا گیا تو کیا تمہارے کافر اِن سے اچھے ہیں؟ کہ تمہارے کُفر کے اُوپر گرفت نہیں ہوگی، ''کیا تمہارے کافر اچھے ہیں اِن سے؟ یا تمہارے لئے کوئی براءت لکھ دی گئی ہے کتابوں میں؟'' اللہ نے اپنی کتابوں میں تحریر لکھ دی کہ تمہیں کچھ نہیں کہا جائے گا، تم جس طرح سے چاہو کُفر اور تکذیب کرتے رہو؟ آپ جانتے ہیں کہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے، نہ یہ کافر اُن کافروں سے اچھے، اور نہ ان کے لئے کوئی فارغ خطی لکھ دی گئی، کہ تم ہماری طرف سے فارغ ہو، تم بَری ہو، تمہارے اُوپر کوئی کسی قسم کی گرفت نہیں ہوگی۔ یا پھر تیسری شق ہے کہ ''یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک جماعت ہیں بدلہ لینے والی، یا دِفاع کرنے والی'' کہ ہم اتنی مضبوط جماعت ہیں کہ اپنا دفاع ہم کر لیں گے، اللہ کا عذاب ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا، یا ان کا یہ خیال ہے؟ سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ: عنقریب یہ جماعت شکست دے دی جائے گی، اور یہ پیٹھ پھیر کے بھاگیں گے، ان کی جماعت بھی کوئی کام نہیں آئے گی......! یاد ہوگا، بدر میں حضور ﷺ نے جو رات گزاری تھی اور ساری رات اللہ تعالیٰ کے سامنے ہاتھ پھیلا کر دُعا کرتے رہے تھے، تو صبح کو جس وقت آپ اپنے اُس عریش سے، چھپر سے باہر آئے ہیں تو یہی آیت پڑھتے ہوئے آئے تھے

سَيُهْزَمُ الْجَمْعُ وَيُوَلُّوْنَ الدُّبُرَ، گویا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پیش گوئی کے پورے ہونے کی اطلاع کر دی گئی تھی کہ جو کہا گیا تھا کہ "یہ جماعت پیٹھ پھیر کر بھاگے گی اور ان کو شکست دے دی جائے گی" اب وہ وقت آ گیا، تو گویا کہ رات کو دُعا کر کے ہی سرورِکائنات ﷺ نے وہ جنگ جیت لی تھی، دِن کو تو صرف واقعہ ظاہر ہوا ہے، "عنقریب شکست دے دی جائے گی جماعت اور یہ پیٹھ پھیر کے بھاگیں گے۔"

قیامت کی سختی اور مجرمین کی حالت

بَلِ السَّاعَةُ مَوْعِدُهُمْ: یہ صرف دُنیا میں ہی اِن کے لئے عذاب نہیں، بلکہ قیامت ان کے وعدے کا وقت ہے، "اور وہ قیامت بہت سخت اور بہت کڑوی ہے" ان کے لئے وہ کوئی لذیذ چیز نہیں ہے، اِنَّ الْمُجْرِمِيْنَ فِيْ ضَلٰلٍ وَّسُعُرٍ: بے شک مجرم لوگ گمراہی میں ہیں اور بے عقلی میں ہیں، جنہوں نے جرم کی عادت ڈال رکھی ہے یہ گمراہی میں ہیں اور بے عقلی میں ہیں، سُعُر کا معنی وہی جنون، یا "گمراہی میں ہیں اور آگوں میں ہیں" یعنی اِس وقت گمراہی میں ہیں، نتیجۃً یہ آگوں میں واقع ہونے والے ہیں، تو یوں ہی کہہ سکتے ہیں کہ اب بھی یہ جہنم میں ہیں، يَوْمَ يُسْحَبُوْنَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ: جس دِن کہ گھسیٹے جائیں گے یہ آگ میں چہروں کے بل، کہا جائے گا: ذُوْقُوْا مَسَّ سَقَرَ: سقر بھی جہنم کو کہتے ہیں، دوزخ کے چھونے کا مزہ چکھو، اب یہ دوزخ جو تم سے مس کر رہی ہے تو اب اِس کا مزہ چکھو۔

عذاب جلدی مانگنے والوں کو تنبیہ

اِنَّا كُلَّ شَيْءٍ خَلَقْنٰهُ بِقَدَرٍ: بے شک ہم نے ہر چیز کو اندازے کے ساتھ پیدا کیا ہے، تو جو اندازہ ہمارا ہے اسی کے مطابق وہ چیز ظاہر ہوا کرتی ہے، اس لیے انہیں جلدی نہیں مچانی چاہیے کہ عذاب جلدی کیوں نہیں آتا؟ قیامت کا وقت بتاؤ، قیامت کب آئے گی؟ ہمارا ایک اندازہ ہے، اس اندازے کے مطابق ہم ہر چیز کی تخلیق کرتے ہیں، "بے شک ہم نے ہر چیز کو پیدا کیا ہے اندازے کے ساتھ"، یہ كُلَّ شَيْءٍ منصوب ہو گیا خَلَقْنٰهُ کی وجہ سے وہی منصوب عَلٰى شَرِيْطَةِ التَّفْسِيْرِ۔ "نہیں ہے ہمارا حکم مگر یک بارگی مثل آنکھ کے جھپکنے کے" یعنی جس وقت ہمارا حکم ہو جائے گا قیامت کے لئے، پھر کوئی دیر نہیں لگے گی، آنکھ جھپکتے ہی سب کچھ ہو جائے گا، یہ لمح بالبصر والی بات ہے، آنکھ جھپکتے ہی سب کچھ ہو جائے گا، "نہیں ہے ہمارا حکم مگر یک بارگی مثل آنکھ کے جھپکنے کے، البتہ تحقیق ہلاک کیا ہم نے تم جیسے لوگوں کو" اَشْيَاعَكُمْ! شیعۃٌ جماعت کو کہتے ہیں، اور اَشیاع سے مراد بھی ملتے جلتے لوگ، جو ایک نظریے کے اور ایک خیال کے ہوا کرتے ہیں ان کو اَشیاع کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، "ہم نے تم جیسے لوگوں کو ہلاک کیا، تو کیا کوئی ہے نصیحت حاصل کرنے والا؟" وَكُلُّ شَيْءٍ فَعَلُوْهُ فِي الزُّبُرِ: اس میں ان کو یہ تنبیہ ہے کہ تم یہ بھی نہ سمجھو کہ تمہارا قول فعل کوئی مخفی ہے، "ہر چیز جس کو انہوں نے کیا ہے وہ زُبر میں ہے" یعنی نامۂ اَعمال میں لکھی ہوئی ہے، زُبر زَبور کی جمع۔ زَبور: نامہ اعمال۔ زَبور

لکھی ہوئی چیز کو کہتے ہیں، ہر چیز ورقوں میں لکھی ہوئی ہے، نامۂ اعمال میں لکھی ہوئی ہے، وَكُلُّ صَغِيْرٍ وَّ كَبِيْرٍ مُّسْتَطَرٌ: یہ اُسی کی تفصیل ہے، ہر چھوٹی بڑی چیز لکھی گئی ہے، مستطر کا معنی بھی لکھی ہوئی، چھوٹی بڑی کوئی چیز باقی نہیں۔

متقین کا انجام

اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ: بے شک متقین، پرہیزگار، اللہ سے ڈرنے والے، وہ باغات میں ہوں گے اور نہروں میں ہوں گے، فِيْ مَقْعَدِ صِدْقٍ: بہترین ٹھہرنے کی جگہ میں، مقعد: بیٹھنے کی جگہ، مَقْعَدِ صِدْقٍ یہ قدمَ صدقٍ کی طرح، لسانَ صدقٍ، قدمَ صدقٍ، مُبوأ صدقٍ، قدمَ صدقٍ ان کی ترکیب ایک ہی جیسی ہے، ''بہترین بیٹھنے کی جگہ میں، بہترین ٹھکانے میں'' عِنْدَ مَلِيْكٍ مُّقْتَدِرٍ: صاحبِ اقتدار بادشاہ کے پاس، مليك مقتدر یہ اللہ تعالیٰ ہوگئے: اللہ تعالیٰ کے نزدیک، اُس کے قُرب میں، بہترین ٹھہرنے کی جگہ میں، باغات میں اور نہروں میں یہ لوگ ہوں گے متقین۔ گویا کہ ان کافروں کے لئے جو ذکر کیا گیا تھا ضلال اور سُعُر، تو اس کے مقابلے میں متقین کے انجام کی طرف اشارہ کر دیا گیا۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

***

سُورَةُ الرَّحمٰن

آیاتها ۷۸ ۵۵ سُوْرَةُ الرَّحْمٰنِ مَدَنِيَّةٌ ۹۷ رکوعاتها ۳

سورۂ رحمٰن مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی اٹھتر آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے

اَلرَّحْمٰنُ ① عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ ② خَلَقَ الْاِنْسَانَ ③ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ ④ اَلشَّمْسُ وَ

سب سے زیادہ مہربانی کرنے والا ① وہ ہے جس نے قرآن سکھایا ② پیدا کیا انسان کو ③ اور اس کو بیان سکھایا ④ سورج اور

الْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ ⑤ وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ ⑥ وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا وَوَضَعَ

چاند حساب کے ساتھ ہیں ⑤ ستارے اور درخت اللہ کو سجدہ کرتے ہیں ⑥ آسمان کو اس نے اُونچا کیا اور ترازو

الْمِيْزَانَ ⑦ اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيْزَانِ ⑧ وَاَقِيْمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ وَلَا تُخْسِرُوا

رکھی ⑦ تاکہ تم میزان میں حد سے نہ گزرو ⑧ اور سیدھا رکھا کرو وزن کو اِنصاف کے ساتھ، اور میزان کو گھٹایا

الْمِيْزَانَ ⑨ وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ⑩ فِيْهَا فَاكِهَةٌ وَّالنَّخْلُ ذَاتُ

نہ کرو ⑨ اور زمین کو اس نے رکھا مخلوق کے لئے ⑩ اس زمین کے اندر ہر قسم کا میوہ ہے اور کھجوریں

الْاَكْمَامِ ⑪ وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ ⑫ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑬

غلاف والی ⑪ اور بھوسے والا غلّہ اور خوشبو ⑫ اے جِنّ واِنسان! تم اپنے رَبّ کی کس، کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ⑬

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ كَالْفَخَّارِ ⑭ وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ ⑮

پیدا کیا اِنسان کو بجنے والی مٹی سے جو کہ ٹھیکرے کی طرح تھی ⑭ اور پیدا کیا جِنّ کو آگ کے خالص شعلے سے ⑮

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑯ رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ ⑰ فَبِاَيِّ

اے جِنّ واِنس! تم اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کرو گے؟ ⑯ وہ مشرقین کا رَبّ ہے اور مغربین کا رَبّ ہے ⑰ اے جِنّ واِنس!

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ⑱ مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ يَلْتَقِيٰنِ ⑲ بَيْنَهُمَا

تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ⑱ چلایا اس نے دو دریاؤں کو، آپس میں وہ ملتے ہیں ⑲ ان کے درمیان میں

بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ ﴿۲۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۱﴾
ایک پردہ ہے، ایک دُوسرے پر زیادتی نہیں کرتے ﴿۲۰﴾ اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کی تم تکذیب کرو گے؟ ﴿۲۱﴾
يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ ﴿۲۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۳﴾ وَلَهُ
نکلتے ہیں ان دونوں دریاؤں سے موتی اور مرجان ﴿۲۲﴾ اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمت کی تم تکذیب کرو گے؟ ﴿۲۳﴾ اسی اللہ کے لئے
الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ ﴿۲۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۵﴾
چلنے والی کشتیاں ہیں جو اُوپر اُٹھائی ہوئی ہیں سمندر میں پہاڑوں کی طرح ﴿۲۴﴾ اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمت کی تم تکذیب کرو گے؟ ﴿۲۵﴾

سورۂ رحمٰن کی فضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ رحمٰن مکہ میں نازل ہوئی، اوراس کی ۷۸ آیتیں ہیں، ۳ رُکوع ہیں۔ حدیث شریف میں سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا: "لِكُلِّ شَيْءٍ عَرُوْسٌ وَعَرُوْسُ الْقُرْاٰنِ الرَّحْمٰنُ" ہر چیز کے لئے کوئی نہ کوئی زینت ہوتی ہے، یعنی اس کا کوئی نہ کوئی حصہ ایسا ہوتا ہے جو اس کے لئے باعثِ سجاوٹ ہے، باعثِ زینت ہے، تو قرآنِ کریم کی زینت سورۂ رحمٰن ہے۔[1] چنانچہ خوش آواز قاری اگر اس کو اچھے انداز کے ساتھ پڑھے تو واقعہ یہ ہے کہ اپنی لفظی حیثیت سے یہ سورت وجد میں لانے والی ہے، عام قرآنِ کریم سے یہ ممتاز ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ سورت سنائی اور صحابہ رضی اللہ عنہم خاموش ہو کر سنتے رہے، جس وقت آپ ﷺ سنا کر فارغ ہوئے تو آپ ﷺ نے فرمایا کہ میں نے یہی سورت جنوں پر پڑھی تھی لیلۃ الجن میں، یعنی اُس رات میں جس میں جنوں کے ساتھ ملاقات ہوئی تھی میں نے یہ سورت جنوں پہ تلاوت کی، تو وہ جواب دینے کے اعتبار سے تم سے اچھے تھے، یعنی تم نے تو کوئی جواب نہیں دیا، وہ بہت اچھے انداز کے ساتھ جواب دیتے رہے، کہ جس وقت میں اس آیت پہ پہنچتا تھا: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ، تو رَبِّكُمَا میں چونکہ خطاب اِنسان اور جنّ دونوں کو ہے، اے انسان اور جنّ! تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمت جھٹلاؤ گے؟ جب میں اِس آیت کی تلاوت کرتا تو وہ جنّات آگے سے جواب دیتے تھے: "لَا بِشَيْءٍ مِّنْ نِّعَمِكَ رَبَّنَا نُكَذِّبُ فَلَكَ الْحَمْدُ" اے اللہ! ہم تو تیری نعمتوں میں سے کسی نعمت کی تکذیب نہیں کر سکتے، سب تعریفیں تیرے لئے ہی ہیں۔ جب اِس آیت پہ آتا تو جنّات یہ جواب دیتے تھے،[2] جس کی بنا پر علماء نے لکھا ہے کہ جب اس کی تلاوت سنی جائے اور یہ آیت سامنے آئے: فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ تو اسی طرح سے اپنی زبان سے کہنا مستحب ہے، یعنی جواباً یہ کہا جائے، یہ استفہام ہے اللہ کی طرف سے کہ تم کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ تو جواباً کہا جائے کہ اے اللہ! ہم تو تیری کسی نعمت کو نہیں جھٹلاتے، شکر تیرے لیے ہے!

---

(۱) شعب الایمان، رقم: ۲۲۶۵/ مشکوٰۃ ج۱ ص۱۸۹، فضائل القرآن، فصل ثالث کا تقریباً آخر۔

(۲) ترمذی ۲/ ۱۶۴، کتاب التفسیر، سورۃ الرحمٰن۔ مشکوٰۃ ۱/ ۸۱، باب القراءۃ فی الصلوٰۃ، فصل ثانی۔

ایک ہی آیت کو مکرّر لانے میں حکمت

اور یہ آیت اس میں تقریباً اکتیس دفعہ آرہی ہے، اور یہ بھی ایک انداز ہوتا ہے تقریر اور تحریر کا، شعر اور نثر کا، کہ کسی فقرے کو بار بار دہرایا جائے جس کے اندر خاص تنبیہ ہوا کرتی ہے، جیسے آپ نے نظموں میں دیکھا ہوگا کہ بسا اوقات ایک شعر بطور بند کے بار بار آیا کرتا ہے، درمیان میں کچھ تھوڑا سا مضمون آگیا پھر اُس شعر کا تکرار ہوگیا، تو یہ بھی ایک طرزِ کلام ہے، پچھلی سورت کے اندر بھی یہی اپنایا گیا تھا کہ ایک ایک واقعہ نقل کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ فرماتے تھے: فَكَيْفَ كَانَ عَذَابِىْ وَنُذُرِ، وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ، یہ آیت بار بار دہرائی گئی تھی، واقعہ بیان کیا جاتا، بیان کرنے کے بعد پھر متنبہ کیا جاتا کہ دیکھو میرا عذاب ایسے آتا ہے، تم نے نمونہ دیکھ لیا، اور قرآنِ کریم کا باعثِ نصیحت ہونا اس کی طرف تنبیہ بار بار کی گئی تھی۔ تو اسی طرح سے اس سورت میں بھی اللہ تعالیٰ مختلف قسم کی چیزیں جتلانے کے بعد اس فقرے کو بار بار دہراتے ہیں توجہ دلانے کے لئے، گویا کہ مخاطب کا ہاتھ پکڑ کر اشارہ کر کر کے ایک بات بتائی جارہی ہے کہ یہ دیکھو! تم کس طرح سے انکار کرسکتے ہو، یہ دیکھو! تم کس طرح سے انکار کرسکتے ہو، یہ دیکھو! تم کس طرح سے انکار کرسکتے ہو، تو یہ مخاطب کو سمجھانے کا ایک انداز ہوا کرتا ہے، ۳۱ دفعہ اِس آیت کو اِس سورت کے اندر دہرایا گیا ہے۔

ایک اِشکال اور جواب

اٰلَآءِ یہ لفظ جمع ہے "اِلًى" کی، یا "اَلًى" کی، جس کا معنی عام طور پر نعمت کے ساتھ کردیا جاتا ہے، اور یہاں جو اس کو ذِکر کیا گیا تو پہلے تو نعمتیں ہی مذکور ہیں، پہلے جو الفاظ ذِکر کیے گئے وہ نعمتوں پر ہی دلالت کرتے ہیں ظاہری طور پر ہی، تو ان کے بعد تو اِس آیت کا جوڑ بالکل اچھی طرح سے سمجھ میں آجاتا ہے، کہ اللہ نے ایک نعمت ذِکر فرمائی، بعد میں کہا کہ دیکھو! میرے کیسے کیسے اِنعام تم پر ہیں، تم کون کون سی نعمت کا اِنکار کروگے؟ کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ یہاں تو یہ بات بظاہر جڑتی ہوئی معلوم ہوتی ہے، لیکن بعض آیات ایسی ہیں جو کہ عذاب پر مشتمل ہیں، جہنم کے تذکرے پر مشتمل ہیں، تو اس کے بعد پھر یہی آیت آئی ہوئی ہے، تو اس میں بظاہر ایک بے جوڑ سی بات معلوم ہوتی ہے کہ عذاب، جہنم اور وعید، اس میں کون سا نعمت کا پہلو ہے؟ کہ جس کو اللہ تعالیٰ یاد دِلاتے ہیں کہ تم کون کون سی نعمت کا اِنکار کروگے؟ تو اس کے متعلق علماء نے لکھا ہے کہ کوئی چیز تو اپنے ظاہر کے اعتبار سے نعمت ہوا کرتی ہے فی الحال، اور کسی چیز کی خبر دے دینا اس میں بھی احسان اور نعمت کا پہلو ہوتا ہے، تو کسی انسان کو یہ بتادیا جائے کہ جس راستے پر تُو چلا جارہا ہے یہ تباہی کا راستہ ہے، یہ بتادینا مستقل احسان اور مستقل نعمت ہے، تو کوئی خود نعمت ہے اور کسی کی خبر دے دینا نعمت ہے، اس لئے جو عذاب کی آیتیں ہیں ان کے بعد بھی اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے اپنی نعمت کی یاد دہانی اگر کی جاتی ہے تو اس پہلو سے کہ دیکھو! کیسے کیسے خطرات تمہارے سامنے آنے والے ہیں، اور ہم تمہیں آگاہ کررہے ہیں، اور یہ آگاہ کرنا ہماری مستقل ایک نعمت ہے جس کی تمہیں قدر کرنی چاہیے، اور خبرِ عذاب کی قدر یہ ہے کہ انسان اس سے متأثر ہو اور اس بُرائی کو چھوڑے جس کے نتیجے میں وہ عذاب آنے والا ہے، تو اس طرح سے کوئی چیز فی الحال نعمت ہے اور کسی چیز کے متعلق خبر دے دینا نعمت ہے، تو

اس طرح سے وہ ساری کی ساری چیزیں نعمتوں میں داخل ہو جائیں گی چاہے بظاہر اُن کے اندر عذاب کا تذکرہ ہے...... اور بعض اہلِ لغت نے یہ بھی کہا ہے کہ الآء کا لفظ نعمت کے ساتھ ہی خاص نہیں، نعمت بھی اس کا مفہوم ہے، باقی! عجائبات قدرت، قدرت کے کرشمے، نشانیاں، واقعات جو عظمت پر دلالت کرنے والے ہوں، یہ سارے کے سارے الآء کہلاتے ہیں، اس لئے کسی جگہ اِس آیت کا مفہوم ہوگا کہ اللہ کی نعمتیں ذِکر کر کے کہا جائے گا کہ تم کون کون سی نعمت کو جھٹلاتے ہو؟ کہیں اللہ تعالیٰ کی صفات کو ذِکر کر کے کہا جائے گا کہ تم کون کون سی اللہ تعالیٰ کی شان اور صفت کا اِنکار کر سکتے ہو؟ کسی جگہ اس کے دُوسرے تصرفات ذِکر کر کے کہا جائے گا کہ تم اللہ کی کون کون سی قدرتوں کا اِنکار کرتے ہو؟ اور کبھی اسی طرح سے زمین وآسمان کے حالات پیش کرنے کے بعد کہا جائے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جس قسم کے عجائبات پیدا فرمائے ہیں، تم ان عجائبات میں سے کس کس عجیب واقعے کا انکار کرو گے؟ اس طرح سے موقع محل کے مطابق اس کے معنی میں یوں بھی تعدد پیدا کیا جا سکتا ہے۔

مضمون اس میں ''مکی'' سورتوں جیسا ہی ہے، کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں ذِکر کر کے انسان کو شکر گزاری کی طرف متوجہ کیا گیا ہے، کہ اللہ تعالیٰ کا شکر اَدا کرو، اور شکر کا مطلب یہی ہوا کرتا ہے کہ ایمان لاؤ، اللہ کی عظمت اپنے قلب میں پیدا کرو، اس کی اطاعت کرو۔ تو یہ آخرت کی یاددہانی ہے، بُروں کے انجام کی خبر بھی دی گئی ہے، اور اچھوں کے انجام کی خبر بھی دی گئی ہے۔

تفسیر

''رحمٰن'' ایک عظیم اِسمِ باری

اَلرَّحْمٰنُ: یہ اللہ کے اسماء میں سے ایک عظیم اِسم ہے، بہت زیادہ رحمت کرنے والا، جیسے ''بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ'' کے اندر اس کو ذِکر کیا جاتا ہے۔ اور مشرکین عام طور پر اس لفظ کو اللہ کے اسماء میں نہیں پہچانتے تھے، جیسا کہ سورۂ فرقان میں آپ کے سامنے ذِکر آیا تھا کہ جب ان کو رحمٰن کے لئے بلایا جاتا ہے تو کہتے ہیں: مَا الرَّحْمٰنُ، رحمٰن کیا ہوتا ہے؟ تو قریش کے اندر یہ نام زیادہ مستعمل نہیں تھا، عرب میں مشرکینِ مکہ اس نام سے واقف نہیں تھے، تو یہاں اِبتداءً اسی نام سے کی جارہی ہے۔

تعلیمِ قرآن اللہ کی رحمت کا مظہرِ عظیم ہے

''سب سے زیادہ مہربانی کرنے والا وہ ہے جس نے قرآن سکھایا'' گویا کہ تعلیمِ قرآن یہ اللہ کی رحمت کا ایک بہت بڑا عظیم مظہر ہے، تو اللہ کی رحمت سے تمہیں فائدہ اُٹھانا چاہیے، تم جو ماننے کے لئے عذاب طلب کرتے ہو تو ڈنڈے کے ساتھ سمجھانا یہ کوئی عقل مند کا کام نہیں، عقل مند وہ ہوا کرتا ہے جو سمجھایا ہوا سمجھ جائے، ڈنڈے کی کیا ضرورت ہے؟ تم بار بار عذاب جو طلب کرتے ہو، تو اس کی بجائے تم اس قرآنِ کریم کی نصیحتوں سے متاثر کیوں نہیں ہوتے، یہ بہت بڑی رحمت ہے کہ اللہ نے قرآن کا علم دیا، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ: سکھایا قرآن، یہ اللہ کی رحمت کا عظیم ظہور ہے۔

''بیان'' بھی نعمت، لیکن تعلیمِ قرآن سب سے بڑی نعمت!

خَلَقَ الْإِنْسَانَ ۝ عَلَّمَهُ الْبَيَانَ: پیدا کیا انسان کو اور اس کو بیان سکھایا، بیان: اظہار ما فی الضمیر، کہ اپنے دل کی بات سمجھا لیتا ہے، اس بیان کے اندر زبانی بیان بھی داخل ہے، تحریر تقریر بھی داخل ہے، لکھ کر اپنی بات سمجھادی جائے یہ بھی انسان کی خصوصیات میں سے ہے، جس طرح سے اچھے انداز میں انسان دوسرے کی بات کو سمجھتا اور سمجھاتا ہے باقی حیوانات جاندار چیزوں میں یہ چیز نہیں پائی جاتی، تو اِنسان کو پیدا کیا، پیدا کرنے کے بعد اس کو بیان سکھایا، اور قرآن کی تعلیم دی...... قرآن کی تعلیم کو مقدم کر دیا حالانکہ یہ بھی خلقِ انسان کے بعد ہی ہے، یہ اس کی عظمت کی وجہ سے ہے، کہ وجود کی نعمت دینے کے بعد بیان سکھا دینا یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے، لیکن قرآنِ کریم کا علم دے دینا یہ سب سے بڑھ کر نعمت ہے جس کی بنا پر اس کو مقدم کر دیا گیا۔

''سورج اور چاند'' میں اِنعام اور قدرت کے پہلو

اَلشَّمْسُ وَالْقَمَرُ بِحُسْبَانٍ: سورج اور چاند حساب کے ساتھ ہیں، یعنی ان کا چلنا حساب کے ساتھ ہے، یہ بھی انسان پر ایک احسان کا پہلو ہے، انہی کُرات کی حرکتوں کے ساتھ موسم بدلتے ہیں، سردی گرمی پیدا ہوتی ہے، روشنی اور حرارت حاصل ہوتی ہے، جو ہمارے لئے لاکھوں کروڑوں نعمتوں کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ اور اس میں اللہ کی قدرت بھی نمایاں ہے کہ جس حساب پر اللہ نے ان کو چلا دیا کروڑ ہا سال سے جو کہ اللہ کے علم میں ہے کہ کب سے یہ حساب شروع ہوا، اس وقت سے یہ ایک ہی انداز سے چلے آرہے ہیں، اور جب تک اللہ چاہے گا ایک ہی انداز سے چلتے چلے جائیں گے، ان کے حساب میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔

''نجم وشجر'' بھی اللہ تعالیٰ کو سجدہ کرتے ہیں

وَّالنَّجْمُ وَالشَّجَرُ يَسْجُدٰنِ: نجم ستارے کو بھی کہتے ہیں جیسے وَالنَّجْمِ اِذَا هَوٰى کے اندر آپ کے سامنے گزرا تھا، اور نجم سے مراد نباتات میں سے وہ نباتات بھی مراد ہوتی ہے جو تنے پر کھڑی نہیں ہوتی بلکہ زمین پر پھیلتی ہے، یہ چھوٹی چھوٹی جڑی بوٹیاں اور بیلیں، نجم کا مصداق اِن کو بھی بنایا گیا ہے، اس کے مقابلے میں شجر آگیا، شجر تنے دار نباتات کو کہتے ہیں، جو تنے پر کھڑی ہوتی ہے، تو یوں بھی اس کا ترجمہ کیا جا سکتا ہے کہ ستارے اور درخت اللہ کو سجدہ کرتے ہیں، کہ پیچھے شمس وقمر کا ذکر آیا تھا تو اس کے ساتھ ستاروں کا ذکر بھی آگیا، اور زمین کے اندر پھر اَشجار کا ذکر آگیا۔ اور یا ترجمہ یوں کیا گیا ہے کہ بے تنا اور تنادار سب نباتات اللہ کے لئے سجدہ کرتی ہے، تو دو قسمیں بن گئیں، نباتات میں سے ایک قسم وہ بن گئی جس کا تنا ہے، اور ایک قسم وہ بن گئی جس کا تنا نہیں ہے، بیل بوٹے اور درخت سب سجدہ کرتے ہیں۔ سجدہ کرنے کا معنی آپ کے سامنے کئی دفعہ ذکر کیا جا چکا، کہ وہ تکوینی اَحکام کے تبع ہیں، جس مقصد کے لئے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اُس مقصد کو ادا کرتے ہیں۔

آسمان کی رفعت کا اور میزان کا ذِکر

وَالسَّمَآءَ رَفَعَهَا: آسمان کو اس نے اُونچا کیا، وَوَضَعَ الْمِيزَانَ: اور ترازو رکھی، میزان ترازو کو کہتے ہیں، اس سے یہی ظاہری ترازو مراد ہے جس کے ساتھ چیزوں کا وزن ہوتا ہے، چاہے اسی شکل کی ہو جس کے دو پلڑے ہوتے ہیں اور اس کو پکڑ کر اُٹھایا جاتا ہے، اس کی ایک لسان اور کانٹا ہوتا ہے، جس کے اِدھر اُدھر ہونے کے ساتھ پتا چلتا ہے کہ کون سی چیز وزنی ہے اور کون سی چیز ہلکی ہے؟ اور اسی کے معنی میں ہے ہر وہ آلہ جو وزن معلوم کرنے کے لئے تیار کر لیا جائے، اس کی حیثیت، کیفیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، جیسے مختلف قسم کے کانٹے اور تکڑی ترازو بنے ہوئے ہیں وہ سب اس میں شامل ہیں۔ اور یہ بھی اللہ کا ایک بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ترازو پیدا کر دیا، کیونکہ اس ترازو کے ساتھ ہی ہم دُوسرے کے حقوق صحیح ادا کر سکتے ہیں اور اپنے حقوق صحیح وصول کر سکتے ہیں، جو بھی پیمائش کے آلے ہیں، ماپنے کے، ناپنے کے آلے ہیں، تولنے کے آلات ہیں، یہی عدل اور انصاف قائم کرنے کا ذریعہ ہیں، کہ ان کے ساتھ انسان صحیح حقوق اَدا کر سکتا ہے اور صحیح حقوق وصول کر سکتا ہے۔ تو یہ نظامِ عدل کی طرف اشارہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے آسمان وزمین کو پیدا کرنے کے بعد اس میں ایک نظامِ عدل قائم کیا، جس کے لئے ظاہری نشان بنایا ترازو کا، ''اور رکھی اللہ نے ترازو'' اَلَّا تَطْغَوْا فِي الْمِيزَانِ: اَلَّا تَطْغَوْا: لِئَلَّا تَطْغَوْا تاکہ تم میزان میں حد سے نہ گزرو، میزان میں طغیان یہی ہے کہ تولنے ماپنے میں انسان کمی بیشی کرنی شروع کر دے، ''تاکہ نہ زیادتی کرو تم میزان میں، طغیان نہ اختیار کرو، حد سے تجاوز نہ کرو'' وَاَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ: اور سیدھا رکھا کرو وزن کو انصاف کے ساتھ، وَلَا تُخْسِرُوا الْمِيزَانَ: اور میزان کو گھٹایا نہ کرو، چونکہ یہ نظامِ عدل دُنیا کا نظام قائم کرنے کے لئے بہت ہی ضروری ہے، اگر یہ حقوق کا ایفاء اور استیفاء خراب ہو جائے تو دُنیا کا نظم سارا خراب ہو جاتا ہے، اس لیے اس کی تاکید کر دی گئی، منفی انداز میں بھی کر دی گئی اور مثبت انداز میں بھی تاکید کر دی گئی، منفی انداز میں یہ کہ میزان میں طغیان اختیار نہ کیا کرو، میزان میں خسارہ نہ ڈالا کرو، اور مثبت انداز میں آ گئی اَقِيمُوا الْوَزْنَ بِالْقِسْطِ: وزن کو انصاف کے ساتھ قائم رکھا کرو۔ تو یہ عدل وانصاف ہو گیا، اس میں حقوق کی ادائیگی کی تاکید ہو گئی۔

زمین اور اس سے حاصل ہونے والی نعمتوں کا ذِکر

وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا: اور زمین کو اس نے رکھا، یعنی آسمان کو بلند کیا تو اس کے مقابلے میں زمین کو پست کر کے پھیلایا، لِلْاَنَامِ: مخلوق کے لئے، انام مخلوق کو کہتے ہیں، فِيهَا فَاكِهَةٌ: اس زمین کے اندر ہر قسم کا میوہ ہے، یہ نکرہ عموم پر دلالت کرتا ہے، وَالنَّخْلُ ذَاتُ الْاَكْمَامِ: اور کھجوریں ہیں، اَکمام یہ کِمٌّ کی جمع ہے، اور کِمٌّ کہتے ہیں لفافے کو جو کہ کھجوروں کے پیدا ہونے کے وقت ان کے اُوپر چڑھا ہوا ہوتا ہے، لفافے میں لپٹی ہوئی کھجوریں نکلتی ہیں، پہلے پہلے خوشہ جو نکلا کرتا ہے تو اس کے اُوپر وہ لفافہ چڑھا ہوا ہوتا ہے، تو ذاتُ الاکمام کا یہی معنی ہے، ''اور کھجوریں غلاف والی'' وَالْحَبُّ ذُو الْعَصْفِ وَالرَّيْحَانُ: حَبّ: غلہ، دانہ۔ جتنی قسم کے غلہ جات ہیں وہ سب حَبّ کا مصداق ہیں، ذُو الْعَصْفِ: بھوسے والے، یہ بھی ان کے پیدا ہونے کی کیفیت کی طرف اشارہ ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے غلہ جات اگر پیدا کیے ہیں تو کس طرح سے ان کو لپیٹ لپیٹ کر پیدا کیا ہے، تاکہ گرد سے غبار سے اور باہر کی غلاظتوں

سے محفوظ ہو، گندم کا ایک ایک دانہ مستقل طور پر پیک کیا ہوا ہوتا ہے، اور اسی طرح سے مکئی کا بھٹا دیکھو کہ اس کے اُوپر کتنے پردے چڑھائے ہوئے ہوتے ہیں، اور ان کو کس طرح سے محفوظ کیا ہوا ہے، کوئی چھلکی کے اندر محفوظ ہے، کسی کا ایک ایک دانہ پردے کے اندر چھپایا ہوا ہے، تو اس طرح سے اللہ تعالیٰ انسانوں کے لئے یہ چیزیں نکالتے ہیں، پھل ہوں یا غلہ جات ہوں، بہت ہی حفاظت کے ساتھ ان کی نفاست باقی رکھتے ہوئے، لطافت باقی رکھتے ہوئے اللہ تعالیٰ پیدا فرماتے ہیں، ''بھوسے والا غلہ'' یعنی ایسا غلہ جس کے ساتھ بھوسا بھی ہوتا ہے، یہ عصف کا لفظ تیسویں پارے میں سورۂ فیل کے اندر بھی آیا ہوا ہے کَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ۔ وَالرَّيْحَانُ: ریحان خوشبو کو بھی کہتے ہیں اور رزق کو بھی کہتے ہیں، تو یہاں خوشبو مراد ہے، مطلب یہ ہوا کہ انسان کی پرورش کے لئے جس طرح سے غذا ضروری ہے، اسی طرح سے اس کے تلذذ کے لئے، اس کے تفکّہ کے لئے، اس کی بشاشت کے لئے اللہ تعالیٰ نے مختلف قسم کے پھل اور خوشبوئیں بھی پیدا کردیں، اور یہ کتنا بڑا اللہ کا احسان ہے فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اے جن و انسان! تم اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمت کی تکذیب کروگے؟ کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ یعنی ایک ایک نعمت اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ تم اپنے منعم کو پہچانو، اپنے محسن کو پہچانو اور اس کا شکر اَدا کرو، کس کس نعمت کا انکار کروگے؟

اِنسان اور جِنّ کی تخلیق کا ذِکر

خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ صَلْصَالٍ: صلصال کہتے ہیں جو مٹی سوکھنے کے بعد بجنے لگ جاتی ہے، کھڑکنے لگ جاتی ہے، اور فخار ٹھیکرے کو کہتے ہیں جو پکی ہوئی ہوتی ہے، ''پیدا کیا انسان کو بجنے والی مٹی سے ٹھیکرے کی طرح، ایسی مٹی جو کہ ٹھیکرے کی طرح تھی'' انسان کی اِبتدا مٹی سے ہوئی، اس کی پیدائش کے مختلف درجات ہیں جو مختلف آیات کے اندر واضح کیے گئے، زمین سے مٹی سے اِبتدا ہوئی، مٹی اور پانی اس کا اِبتدائی عنصر ہے، فخار: ٹھیکرا، ''ٹھیکرے کی طرح بجنے والی مٹی سے انسان کو پیدا کیا'' وَخَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ: اور پیدا کیا جنّ کو آگ کے خالص شعلے سے، جس میں دُھویں کی ملاوٹ نہیں تھی، جن کے اندر یہ عنصر غالب ہے جس کی بنا پر وہ لطیف شئ ہے اور آنکھوں سے نظر نہیں آتا جب تک کہ وہ کسی دُوسری شکل میں متشکل نہ ہو، فرشتے نُور سے پیدا ہوئے ہیں، جنّ نار سے پیدا ہوئے ہیں، تو دونوں میں لطافت ہے، جس وقت تک یہ کسی شکل میں متشکل نہ ہوں، عام انسان کی نظر کی گرفت میں یہ نہیں آتے، ''خالص آگ سے پیدا کیا'' فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اے جنّ و اِنس! تم اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس کا انکار کروگے؟ یہ خلقت جو ہے یہ مستقل نعمت ہے، جس کو یہاں ذِکر کیا گیا۔

تمام جہات کا مالک اللہ ہے

رَبُّ الْمَشْرِقَيْنِ وَرَبُّ الْمَغْرِبَيْنِ: وہ مشرقین کا رَبّ ہے اور مغربین کا رَبّ ہے، مشرقین تثنیہ ہے، چونکہ گرمی اور سردی کے دو مشرق نمایاں ہوتے ہیں اور اسی طرح سے دو مغرب بھی نمایاں ہوتے ہیں، اور ''رَبّ المشارق والمغارب'' اس طرح سے بھی آیا ہے (سورۂ معارج: ۴۰) کہ ہر ہر دِن کا علیحدہ علیحدہ مشرق ہے، علیحدہ علیحدہ مغرب ہے۔ ''رَبّ المشرق والمغرب'' مفرد کے

طور پر بھی ذکر آیا ہے (سورۂ شعراء: ۲۸، سورۂ مزمل: ۹) بہر حال مطلب یہ ہے کہ تمام جہات کا مالک وہی ہے، تو فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ یہ اسی طرح سے تکرار ہو گیا، کہ اس بات کا بتلانا جو اللہ تعالیٰ کی عظمت پر دلالت کرتا ہے، جو ایمان کے لئے منشا بنتا ہے، تو یہ بھی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اور قدرت وغیرہ کے معنی میں لے لیا جائے تو بات اور بھی زیادہ صاف ہو جاتی ہے۔

میٹھے اور کھاری دریا اور ان کے فوائد

مَرَجَ الْبَحْرَيْنِ: اس نے دو دریاؤں کو چلایا، بحرین یہ بحر کا تثنیہ ہے،'' چلایا اس نے دو دریاؤں کو'' يَلْتَقِيٰنِ: آپس میں وہ ملتے ہیں، بَيْنَهُمَا بَرْزَخٌ لَّا يَبْغِيٰنِ: اور ان کے درمیان میں ایک پردہ ہے، ایک دوسرے پر زیادتی نہیں کرتے، اس کا ذکر سورۂ فاطر میں بھی آیا تھا کہ کڑوے اور میٹھے دریا دونوں زمین میں بہتے ہیں اور آپس میں خلط نہیں ہوتے، کھاری اپنی جگہ، میٹھا اپنی جگہ، سمندر میں تو مستقل لہریں ہیں جو پاس پاس بہتی ہیں، کوئی میٹھی کوئی کھاری، اور اسی طرح سے زمین کے نیچے بھی آپ دیکھتے ہیں کہ کوئی قطعہ کھاری پانی کا آجاتا ہے، کوئی میٹھے پانی کا آجاتا ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کے ساتھ ان کے درمیان میں رُکاوٹ پیدا کی ہوئی ہے کہ ایک دُوسرے میں وہ خلط نہیں ہوتے، جس کو اللہ کھاری رکھتا ہے، وہ کھاری ہی رہتا ہے، جس کو میٹھا رکھتا ہے، وہ میٹھا ہی رہتا ہے، تو آپس میں خلط ہو کے یہ ایک حیثیت اختیار نہیں کرتے، یہ بھی اللہ کی قدرت ہے، اور دونوں کے فوائد علیحدہ علیحدہ ہیں، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کی تم تکذیب کرو گے؟ يَخْرُجُ مِنْهُمَا اللُّؤْلُؤُ وَالْمَرْجَانُ: نکلتے ہیں ان دونوں دریاؤں سے موتی اور مرجان، مرجان مونگا کو کہتے ہیں، یہ زیورات جو سمندر وغیرہ سے نکلتے ہیں، میٹھے دریاؤں میں بھی ہوتے ہیں، لیکن میٹھے دریا چونکہ تیزی سے بہنے والے ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ان میں ان کی تلاش مشکل ہوتی ہے، زیادہ تر یہ کھاری پانی سے نکلتے ہیں، لؤلؤ: موتی ہو گئے، اور مرجان: مونگا ہے، یہ پنساریوں کی دُکان پہ ہوتے ہیں، کبھی لے کر دیکھیں، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اپنے رَبّ کی کون کون سی نعمت کی تم تکذیب کرو گے؟

کشتیوں میں اِنعام کے پہلو

وَلَهُ الْجَوَارِ الْمُنْشَئٰتُ فِي الْبَحْرِ كَالْاَعْلَامِ: أعلام عَلَم کی جمع ہے، علم پہاڑ کو کہتے ہیں، اَلْمُنْشَئٰتُ: اُوپر کو اُٹھائی ہوئیں، جوارِی جارِیة کی جمع ہے، جارِیة: چلنے والی کشتی، '' اسی اللہ کے لئے چلنے والیاں کشتیاں ہیں جو اُوپر اُٹھائی ہوئی ہیں سمندر میں پہاڑوں کی طرح'' جس طرح سے زمین کی سطح کے اُوپر پہاڑ ہوتے ہیں، میدان کے مقابلے میں اُونچے اُونچے نظر آتے ہیں، تو اسی طرح سے سمندر میں پانی کی سطح پر جہاز کھڑے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس میں اللہ کے احسان کے کتنے پہلو ہیں، مختلف آیات میں آپ کے سامنے آگیا کہ اللہ تعالیٰ نے پانی کو پیدا کیا، پھر اس کی طبیعت ایسی بنائی کہ اس کے اُوپر لکڑی تیرتی ہے، لکڑی کا مزاج ایسا بنایا کہ پانی میں ڈُوبتی نہیں، اور پھر ان کی ساخت اللہ نے سمجھائی جس کے ذریعے سے سفر قطع ہوتے ہیں، سامانِ تجارت ایک طرف سے دُوسری طرف منتقل ہوتا ہے، بیسیوں نعمتیں ہیں جو اللہ تعالیٰ نے اس کشتی کی صورت میں انسان کے اُوپر کی ہیں، جن کے ساتھ یہ پانی کو عبور کرتا ہے، پانی پر تیرتا ہے، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔

48/48

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ﴿۲۶﴾ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۲۷﴾

ہر وہ چیز جو زمین پر ہے فنا ہونے والی ہے ﴿۲۶﴾ اور باقی رہ جائے گی تیرے رب کی ذات جو عظمت والا ہے اور اکرام والا ہے ﴿۲۷﴾

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۲۸﴾ يَسْئَلُهٗ مَنْ فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اے جن وانس! تم اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۲۸﴾ سوال کرتے ہیں اسی سے وہ جو آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں،

كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِىْ شَاْنٍ ﴿۲۹﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۰﴾

ہر روز وہ کسی خاص حال میں ہے ﴿۲۹﴾ اے جن وانس! تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ﴿۳۰﴾

سَنَفْرُغُ لَكُمْ اَيُّهَ الثَّقَلٰنِ ﴿۳۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

اے دو بھاری جماعتو! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہو جائیں گے ﴿۳۱﴾ اے جن وانس! تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کا

تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۲﴾ يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اِنِ اسْتَطَعْتُمْ اَنْ تَنْفُذُوْا مِنْ اَقْطَارِ السَّمٰوٰتِ وَ

انکار کرو گے؟ ﴿۳۲﴾ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ نکل بھاگو آسمان اور زمین کے کناروں سے

الْاَرْضِ فَانْفُذُوْا ؕ لَا تَنْفُذُوْنَ اِلَّا بِسُلْطٰنٍ ﴿۳۳﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۴﴾

تو نکل بھاگو، اور نہیں نکل سکتے تم مگر قدرت کے ساتھ ﴿۳۳﴾ اے جن وانس! تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟ ﴿۳۴﴾

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ فَلَا تَنْتَصِرٰنِ ﴿۳۵﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

چھوڑا جائے گا تم پر شعلہ آگ کا، اور دھواں، پھر تم بدلہ نہیں لے سکو گے ﴿۳۵﴾ اے جن وانس! تم اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کا

تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۶﴾ فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ ﴿۳۷﴾ فَبِاَيِّ

انکار کرو گے؟ ﴿۳۶﴾ پس جس وقت آسمان پھٹ جائے گا اور ہو جائے گا وہ گلابی، رنگے ہوئے چمڑے کی طرح ﴿۳۷﴾ اے جن وانس! تم

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۳۸﴾ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ ﴿۳۹﴾

اپنے رب کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟ ﴿۳۸﴾ اس دن نہیں پوچھا جائے گا کوئی انسان اور نہ کوئی جن اس کے گناہ کے متعلق ﴿۳۹﴾

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۰﴾ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ فَيُؤْخَذُ

تم اپنے رب کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟ ﴿۴۰﴾ پہچان لئے جائیں گے مجرم اپنے چہرے کے نشان سے، پس پکڑ لئے جائیں گے

بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ ﴿۴۱﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۲﴾ هٰذِهٖ جَهَنَّمُ

سَر کے بالوں سے اور قدموں سے ﴿۴۱﴾ تو اے جن وانس! تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟ ﴿۴۲﴾ (کہا جائے گا) یہی جہنم ہے

الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۴۳﴾ يَطُوْفُوْنَ بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ ﴿۴۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۵﴾

کہ جس کو مجرم جھٹلایا کرتے تھے ﴿۴۳﴾ گھومیں گے یہ مجرم اسی جہنم کے درمیان اور سخت گرم پانی کے درمیان ﴿۴۴﴾ تو اے جن وانس! تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟ ﴿۴۵﴾

تفسیر

اسمائے حسنیٰ میں سے چند اِسمِ اعظم

كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ: ھا کی ضمیر زمین کی طرف لوٹ رہی ہے، ہر وہ چیز جو زمین پر ہے فنا ہونے والی ہے، وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ: اور باقی رہ جائے گی تیرے رَبّ کی ذات جو عظمت والا ہے اور اِکرام والا ہے، اِکرام والا ہے یعنی مخلوق پر اِحسان کرنے والا ہے۔ جلال والا ہے، یہ اس کی اپنی صفت ہوئی کہ عظمت والا ہے، اور اِکرام والا ہے، یعنی دُوسروں پر اِحسان کرتا ہے، یہ نہیں کہ جس طرح سے انسان کوئی ذرا باعظمت ہو جائے بڑا ہو جائے تو دُوسروں کو بھول جاتا ہے، ان کے ساتھ اچھا برتاؤ نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ عظمت اور جلال والے ہیں اور اسی طرح سے اِکرام والے ہیں کہ لوگوں کے اُوپر مہربانی کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء میں ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ یہ بھی خاص نوعیت کا حامل ہے، اسمائے حسنیٰ جو ذِکر کیے جاتے ہیں تو ان میں اِسمِ اعظم کے طور پر اس کا ذِکر بھی اکثر آتا ہے، حضور ﷺ نے فرمایا کہ دُعا کرتے ہوئے ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ اس نام کو لازم پکڑو،(1) کہ جب اللہ تعالیٰ کو اس نام سے خطاب کیا جاتا ہے اللہ تعالیٰ دُعا قبول فرماتے ہیں۔(2) ''یاحیُّ یاقیوم'' یہ لفظ بھی آتے ہیں، ''یااللہ، یاحیُّ یاقیوم، یاذا الجلال والاکرام، یارحمٰن یارحیم، یاارحم الراحمین'' اکثر و بیشتر اِسمِ اعظم کے اندر انہی اسماء کا ذِکر آتا ہے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔

حاجت رَوا صرف اللہ!

يَسْئَلُهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: جو کوئی آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں اسی سے اپنی حاجات طلب کرتے ہیں، یعنی سارے کے سارے اسی کے محتاج ہیں، ضرورت اگر پوری کرسکتا ہے تو وہی پوری کرسکتا ہے، چاہے وہ اپنا ہاتھ کسی کے سامنے پھیلائے حقیقت کے اعتبار سے یہ سوال اللہ تعالیٰ سے ہی ہے، کیونکہ حاجت کا پورا کرنا سوائے اس کے کسی دُوسرے کے اختیار میں

(1) ترمذی ج ۲ ص ۱۹۲، ابواب الدعوات، باب فی فضل التوبة سے کچھ پہلے۔ ولفظ الحدیث: اَلِظُّوا بِيَا ذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ۔
(2) ترمذی حوالہ مذکورہ۔ مشکوٰۃ ۲۱۴/۱ باب الدعوات، فصل ثانی۔ سَمِعَ رَجُلًا وَهُوَ يَقُوْلُ: يَاذَا الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ فَقَالَ: قَدِ اسْتُجِيْبَ لَكَ فَسَلْ۔

نہیں،''سوال کرتے ہیں اُسی سے وہ جو آسمان میں ہیں اور زمین میں ہیں'' كُلَّ يَوْمٍ هُوَ فِي شَأْنٍ: ہر روز وہ کسی خاص حال میں ہے، ''یوم'' سے وقت مراد ہے، اللہ تعالیٰ کی ہر وقت کوئی نہ کوئی شان نمایاں ہے، کسی کو عزت دے رہا ہے، کسی کو ذلت دے رہا ہے، کسی کو رزق دے رہا ہے، کسی کو رزق سے محروم کر رہا ہے، کسی کے لئے صحت، کسی کے لئے بیماری، دُنیا کے اندر جو بھی تصرفات ہیں، ہر وقت، ہر آن اللہ تعالیٰ کی کوئی نہ کوئی شان ظاہر ہو رہی ہے۔ فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ: اے جن وانس! تم اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کو جھٹلاؤ گے؟

جنّ وانس کے حساب کا ذِکر

سَنَفْرُغُ لَكُمْ أَيُّهَ الثَّقَلَانِ: اب یہ انجام کی طرف اشارہ ہوگیا، ثقلان: دو بوجھل چیزیں، بوجھل چیزوں سے بوجھ دار، وزن دار چیزیں مراد ہیں، ایک جماعت اِنسانوں کی اور ایک جنّات کی، یہ دونوں وزن دار ہیں، وزنی مخلوق ہیں، اللہ تعالیٰ نے اِن کو بہت وزن دار بنایا ہے، ان کی باقی مخلوق کے مقابلے میں عظمت ہے، حدیث شریف میں ''ثقلان'' کا لفظ بولا گیا ہے: ''تَرَكْتُ فِيكُمْ ثَقَلَيْنِ'' میں تمہارے اندر دو بوجھل چیزیں، وزن دار چیزیں چھوڑ رہا ہوں، تو ایک روایت میں اس کا مصداق قرآن اور سُنّت کے ساتھ آیا ہے ''كتابُ اللهِ وَسُنَّتِي''[1] اور ایک روایت کے اندر ''كتاب الله'' اور ''عترتی'' کا لفظ آیا ہے،[2] عترت سے آپ ﷺ کی آل اولاد مراد ہے، جس میں صحابہ کرام بھی شامل ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب اور میرے ساتھ تعلق رکھنے والی میری آل، ان کا دامن اگر پکڑے رہو گے تو تم کسی وقت بھی گمراہ نہیں ہو گے، اللہ کی کتاب، اور اس کو سمجھو آل اور اصحاب کی وساطت سے، یا ''كتابُ الله وَسُنَّتِي'' پھر یہ بات بالکل ہی واضح ہے، کتابُ اللہ اور میرا طریقہ، یہ دو چیزیں وزن دار ہیں جو میں تمہارے اندر چھوڑ رہا ہوں، ان کو اگر تھامے رہو گے تو کسی وقت گمراہ نہیں ہو گے۔ یہاں ثقلان کا مصداق انسانوں اور جنوں کی جماعت ہے، ''اے دو بھاری جماعتو! ہم عنقریب تمہارے لئے فارغ ہو جائیں گے'' یعنی پوری طرح سے متوجہ ہو کر تمہارا حساب کتاب لیں گے۔ اس قسم کی بات کا بتلا دینا یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک اِحسان اور نعمت ہے، اس میں بتا دیا گیا کہ تم اپنے آپ کو بالکل شترِ بے مہار نہ سمجھو، کہ تم کسی کے تابع نہیں ہو، تم سے کوئی پوچھنے والا نہیں، اس لیے جو چاہو کرتے رہو، نہیں! ایک دِن ہم پوری طرح سے متوجہ ہو کر تم سے حساب کتاب لیں گے، ایسی خبر کا دے دینا یہ ایک احسان کا پہلو رکھتا ہے، فَبِأَيِّ آلَاءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبَانِ: اے جنّ وانس! تم اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟

حکومتِ اِلٰہیہ کی وسعت

يَا مَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْإِنْسِ: اے جنوں اور انسانوں کے گروہ! إِنِ اسْتَطَعْتُمْ أَنْ تَنْفُذُوا مِنْ أَقْطَارِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ فَانْفُذُوا: اگر تم طاقت رکھتے ہو کہ نکل بھاگو آسمان اور زمین کے کناروں سے تو نکل بھاگو'' اور نہیں نکل سکتے تم مگر قدرت اور طاقت کے ساتھ''

---

(۱) تنبیہ الغافلین للسمرقندی ج۱ ص۵۵۶، رقم الحدیث:۸۹۹۔

(۲) مسند ابن الجعد، رقم:۲۷۱۱۔ فضائل الصحابہ لابن حنبل، رقم:۱۳۸۲۔ مسند احمد، رقم:۱۱۱۰۴، وغیرہ۔

اور قدرت اور طاقت تمہیں حاصل نہیں، مطلب یہ ہے کہ تم یہ سوچو! ہماری حکومت سے نکل کر کہاں جا سکتے ہو؟ کیا تم میں یہ ہمت اور طاقت ہے کہ زمین اور آسمان کے کناروں سے باہر نکل جاؤ؟ جب تم میں یہ طاقت نہیں تو تم ہر وقت ہمارے بس میں ہو، زمین اور آسمان کے اندر رہنے والی مخلوق ہر وقت اللہ کے تسلط اور قدرت میں ہے، تم کہیں نہیں جا سکتے، جب کہیں نہیں جا سکتے تو پھر تمہیں فکر ہونا چاہیے کہ ایک دِن تم نے ہمارے سامنے آنا ہے اور ہم نے تمہارا محاسبہ کرنا ہے، اگر تم میں یہ طاقت ہے کہ ہماری حکومت سے باہر نکل سکتے ہو تو نکل جاؤ، پھر ٹھیک ہے بے فکر ہو کر وقت گزار لو، تمہیں کوئی پوچھنے والا نہیں، کہ جب اللہ تعالیٰ گرفت کرنے لگیں گے ہم اس کے مُلک کی حدود سے باہر نکل جائیں گے، جس طرح سے ہمارے ہاں دُنیا میں ایسے ہوتا ہے کہ ایک آدمی کسی سلطنت کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کے خلاف بغاوت پھیلاتا ہے، جرائم کا ارتکاب کرتا ہے، لیکن جب اندیشہ ہوتا ہے کہ پکڑا جاؤں گا تو مُلک کی حدود پار کر کے بھاگ جاتا ہے، سرحد عبور کر جاتا ہے، دُوسرے مُلک میں چلا جاتا ہے، جب دُوسرے مُلک میں چلا جاتا ہے تو پھر حکومت بے بس ہو جاتی ہے، اس کو کچھ نہیں کہہ سکتی، تو تم یہ خیال نہ کرنا کہ اللہ کی حکومت سے تم کہیں باہر نکل جاؤ گے، تم نہیں نکل سکتے، تمہارے اندر طاقت ہی نہیں ہے، اگر ہے تو نکل کر دِکھادو، ''اے جنّ و انسان! اگر طاقت رکھتے ہو کہ نکل بھاگو زمین اور آسمان کے کناروں سے تو نکل جاؤ'' مطلب ہے کہ تم ایسا نہیں کر سکتے؛ ''اور نہیں نکل سکتے تم مگر قدرت کے ساتھ'' سلطان: تسلط، قدرت۔ اور وہ قدرت تمہیں حاصل نہیں ہے، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: تو ایسی باتوں کی طرف متوجہ کرنا ہی اللہ کا احسان ہے، ''اے جنّ و انس! تم اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟''

کُفّارِ اِنس و جنّ پر اللہ کا عذاب، اور ''نحاس'' کا مصداق

يُرْسَلُ عَلَيْكُمَا شُوَاظٌ مِّنْ نَّارٍ ۙ وَّنُحَاسٌ: شواظ شعلے کو کہتے ہیں جس میں دُھواں نہ ہو، اور نحاس دُھویں کو کہتے ہیں جس میں شعلہ نہ ہو، یہ مختلف قسم کے عذاب ہیں، جس طرح سے آگے سورۂ مرسلات کے اندر اس کی تفصیل آئے گی، ''چھوڑا جائے گا تم پر شعلہ آگ کا اور دُھواں'' فَلَا تَنْتَصِرٰنِ: پھر تم بدلہ نہیں لے سکو گے، اپنا دفاع نہیں کر سکو گے۔ اور نحاس عام معروف لغت کے اندر پیتل کو کہتے ہیں، پیتل تانبا، اور یہاں بعض حضرات نے کہا ہے کہ یہ شہاب ثاقب جو آسمان کی طرف سے گرتے ہیں اکثر و بیشتر تو یہ فضا میں ہی حل ہو جاتے ہیں، اور اگر کہیں سے اس کے کچھ ذرّات ملے ہیں تو سائنس دانوں نے تحقیق کی ہے تو اس کے اندر مختلف قسم کی دھاتوں کی ملاوٹ ہے، جس میں سے تانبا اور کانسی بھی ہے، تو اس لئے اگر اس نحاس کو تانبا اور پیتل پر ہی محمول کیا جائے تو اس میں بھی کوئی بات نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے جنّات پر تو دُنیا کے اندر یہ شہاب برستے ہیں، اور ان کے اندر پیتل کی ملاوٹ بھی ہے۔ ورنہ عام طور پر مفسرین نے اس کا ترجمہ یہی کیا ہے کہ قیامت کے دِن اللہ تعالیٰ کی طرف سے بعض مجرموں کے اُوپر آگ برسائی جائے گی اور اس آگ کے ساتھ ساتھ دُھواں بھی طاری ہوگا، سورۂ مرسلات کے اندر اس کی کچھ تفصیل آئے گی، دُھواں خالص جس کے اندر شعلے کی ملاوٹ نہ ہو، عام طور پر مفسرین نے اس کا ترجمہ یہی کیا ہے۔ آج کل جو گولہ باری ہوتی ہے اس میں بھی پیتل، دُھواں، آگ سب کچھ ہوتا ہے، تو اسی طرح سے اللہ کی طرف سے کوئی عذاب آئے گا تو اس میں بھی مختلف دھاتوں

کی اگر ملاوٹ ہو......! اب یہ گولے جو برستے ہیں، آپ نے دیکھیں ہوں گے، ان کے اندر یہی دھاتیں استعمال ہوتی ہیں، اور اسی طرح سے بارود اور دُوسری چیزیں استعمال ہونے کے ساتھ یہاں جو گولہ باری ہوتی ہے انسان کے ہاتھوں دوسرے انسانوں پر تو وہاں یہی کیفیت ہوتی ہے، کہ آگ بھی ہے، دُھواں بھی ہے، اور پیتل تانبا بھی ہے، تو جس طرح سے انسان انسان کے اُوپر گولہ باری کرتا ہے اور اس کے اندر اس قسم کی چیزیں ہیں، تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی براہِ راست عذاب آئے گا۔ اور یہ بھی اللہ کی طرف سے ہی ایک عذاب ہے چاہے انسان ظاہر میں ایک واسطہ بن گیا، تو یہ آگ کا برسنا، پیتل اور دُھویں اور شعلوں کا آنا یہ تو انسان انسانوں کے ہاتھوں بھی نمونے دیکھتا رہتا ہے، تو ایک وقت اللہ تعالیٰ مجرمین پر براہِ راست اس قسم کے عذاب کو بھیجیں گے، دُنیا میں اب یہ نمونے موجود ہیں کہ کس طرح سے آگ برستی ہے اور کس طرح سے اس میں پیتل تانبے کی ملاوٹ بھی ہوتی ہے اور کیسے دُھواں دار فضا ہو جاتی ہے جس وقت انسان انسان کے اُوپر گولہ باری کرتا ہے، تو یہ ایک نمونہ ہے اللہ تعالیٰ کی طرف مسلط ہونے والے عذاب کا جو آخرت میں اللہ تعالیٰ مجرمین پر مسلط کریں گے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اس طرح سے انجام سے باخبر کر دینا یہ بھی بہت بڑا احسان ہے، اس احسان کی اور اس نعمت کی قدر کرنی چاہیے اور اس کا شکر ادا کرنا چاہیے، اور اس کا شکر یہی ہے کہ ان خبروں سے متأثر ہو کر انسان اَنجام کی فکر کرے۔

قیامت کے دِن کے کچھ حالات اور مجرمین کا اَنجام

فَاِذَا انْشَقَّتِ السَّمَآءُ: پس جس وقت آسمان پھٹ جائے گا، فَكَانَتْ وَرْدَةً كَالدِّهَانِ: وَرْدَة: سُرخ۔ وَرد گلاب کے پھول کو کہتے ہیں، گلابی رنگ کا ہو جائے گا، ''ہو جائے گا وہ گلابی'' كَالدِّهَانِ: دِھان کہتے ہیں رنگے ہوئے چمڑے کو، جس طرح سے رنگی ہوئی کھال ہوتی ہے سُرخ رنگ کی، آسمان بھی اس طرح سے گلابی ہو جائے گا۔ اور اِذا کی جزاء محذوف ہوگی کہ اس وقت پھر تمہارا محاسبہ ہوگا، اللہ کے سامنے پیشی ہوگی۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُسْئَلُ عَنْ ذَنْۢبِهٖۤ اِنْسٌ وَّلَا جَآنٌّ: اس دِن نہیں پوچھا جائے گا کوئی انسان اور نہ کوئی جن اس کے گناہ کے متعلق، یہ پوچھنا تحقیق کے لئے ہے، یعنی تحقیق کی خاطر کسی انسان اور جن سے پوچھنے کی ضرورت نہیں ہوگی کہ تُو نے کیا گناہ کیا؟ کیا نہیں کیا؟ وہ ساری کی ساری چیز نامۂ اَعمال سے نمایاں ہوگی، اور ان کی ہیئت اور شکل سے نمایاں ہوگی کہ یہ مجرم ہیں پوچھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور قرآنِ کریم میں جو بار بار پوچھنے کا ذِکر ہے کہ ہم یہ پوچھیں گے، وہ پوچھیں گے وہ محض تنبیہ کے لئے ہے، تحقیق کے لئے نہیں، تحقیق کرنے کی ضرورت نہیں، ''اُس دِن نہیں پوچھے جائیں گے اپنے گناہ کے متعلق انسان اور نہ جن۔'' فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟ يُعْرَفُ الْمُجْرِمُوْنَ بِسِيْمٰهُمْ: پہچان لیے جائیں گے مجرم ان کے حلیے سے ہی۔ سیما: چہرے کے نشان، سِيْمَاهُمْ فِيْ وُجُوْهِهِمْ مِّنْ اَثَرِ السُّجُوْدِ (سورۂ فتح: ۲۹)، تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ (سورۂ بقرہ: ۲۷۳) یہ لفظ مختلف جگہ آپ کے سامنے گزر چکا ہے، ''پہچان لیے جائیں گے مجرم اپنے چہرے کے نشان سے'' فَيُؤْخَذُ بِالنَّوَاصِيْ وَالْاَقْدَامِ: پس پکڑ لیے جائیں گے سر کے بالوں سے اور قدموں سے، جیسے کسی مجرم کو

پکڑتے ہیں، اِدھر سر سے پکڑ لیا، اُدھر ٹانگ سے پکڑا، اس طرح سے اُٹھا کر اس کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ نواصی ناصیہ کی جمع ہے، ناصیہ سر کے اگلے حصے کو کہتے ہیں، جہاں بال اُگے ہوئے ہوتے ہیں، یہاں سے پکڑ لیے جائیں گے اور ٹانگوں سے پکڑ لیے جائیں گے، یعنی اس کیفیت کے ساتھ اُٹھا کر ان کو جہنم میں پھینک دیا جائے گا۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اس طرح سے انجام کی خبر دینا یہ بھی اللہ کی ایک نعمت ہے، تو اے جن وانسان! تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے؟ اس وقت کہا جائے گا جب جہنم میں پھینکے جائیں گے: هٰذِهٖ جَهَنَّمُ الَّتِيْ يُكَذِّبُ بِهَا الْمُجْرِمُوْنَ: یہی جہنم ہے کہ جس کو مجرم جھٹلایا کرتے تھے، يَطُوْفُوْنَ: گھومیں گے یہ مجرم، بَيْنَهَا وَبَيْنَ حَمِيْمٍ اٰنٍ: اِسی جہنم کے درمیان اور سخت گرم پانی کے درمیان، یعنی کبھی آگ کی طرف ان کو لے جایا جائے گا، کبھی سخت گرم پانی کی طرف لے جایا جائے گا۔ حَمِيْمٍ: گرم پانی۔ اٰنٍ یہ اس کی تاکید ہے، جو کہ حرارت میں اِنتہا کو پہنچا ہوا ہو، عَيْنٍ اٰنِيَةٍ کا ذِکر آگے سورۂ غاشیہ میں بھی آئے گا، سخت گرم پانی کا چشمہ۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ اب آگے نیکوں کا انجام مذکور ہے۔

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ﴿۴۶﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

اس شخص کے لئے جو اپنے رَبّ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے دو باغ ہوں گے ﴿۴۶﴾ تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کی

تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۷﴾ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ﴿۴۸﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۴۹﴾ فِيْهِمَا

تکذیب کرو گے؟﴿۴۷﴾ لمبی لمبی شاخوں والے ہوں گے ﴿۴۸﴾ تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟﴿۴۹﴾ ان دونوں باغوں کے اندر

عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ ﴿۵۰﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۱﴾ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ

بہنے والے دو چشمے ہوں گے ﴿۵۰﴾ اے جن وانسان! تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟﴿۵۱﴾ ان دونوں باغوں میں ہر قسم کے میووں کی

زَوْجٰنِ ﴿۵۲﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۳﴾ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍ

مختلف قسمیں ہوں گی ﴿۵۲﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟﴿۵۳﴾ تکیے لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے بستروں پر

بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ ۭ وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ ﴿۵۴﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

جن کے اندر والے کپڑے موٹے ریشم کے ہیں، دونوں باغوں کا پھل قریب ہونے والا ہوگا ﴿۵۴﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کی

تُكَذِّبٰنِ ﴿۵۵﴾ فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ ۙ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ

تکذیب کرو گے؟﴿۵۵﴾ ان کے اندر ایسی عورتیں ہوں گی جو اپنی نظر کو نیچے رکھنے والی ہیں، ان جنتیوں سے قبل نہ کسی انسان نے نہ کسی جن نے

وَلَا جَآنٌّ ﴿٥٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٧﴾ كَاَنَّهُنَّ الْيَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ ﴿٥٨﴾

ان پہ تصرف کیا ہوگا ﴿٥٦﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَب کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٥٧﴾ گویا کہ وہ یاقوت اور مرجان ہیں ﴿٥٨﴾

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٥٩﴾ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ ﴿٦٠﴾ فَبِاَيِّ

اے جن وانس! تم اپنے رَب کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٥٩﴾ نہیں ہے اِحسان کا بدلہ مگر احسان ﴿٦٠﴾ اے جن وانس!

اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦١﴾ وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ ﴿٦٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا

تم اپنے رَب کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٦١﴾ اور اِن کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے ﴿٦٢﴾ اے جن وانسان! تم اپنے رَب کی نعمتوں میں سے

تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٣﴾ مُدْهَآمَّتٰنِ ﴿٦٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٥﴾

کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٦٣﴾ گہرے سرسبز ہوں گے ﴿٦٤﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَب کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٦٥﴾

فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ ﴿٦٦﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٧﴾ فِيْهِمَا

اُن دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے جوش مارتے ہوئے ﴿٦٦﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَب کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٦٧﴾ ان میں

فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ ﴿٦٨﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٦٩﴾

پھل ہوگا، کھجوریں ہوں گی، انار ہوں گے ﴿٦٨﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَب کی ان نعمتوں میں سے کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٦٩﴾

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ ﴿٧٠﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧١﴾

ان باغات کے اندر اچھی عورتیں ہوں گی خوبصورت ﴿٧٠﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَب کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٧١﴾

حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ ﴿٧٢﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٣﴾

وہ حوریں ہوں گی جو کہ خیموں میں بند کی ہوئی ہوں گی ﴿٧٢﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَب کی کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ ﴿٧٣﴾

لَمْ يَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ ﴿٧٤﴾ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿٧٥﴾

ان جنتیوں سے پہلے نہ کسی انسان نے ان میں تصرف کیا ہوگا نہ کسی جن نے ﴿٧٤﴾ اے جن وانس! تم اپنے رَب کی کس کس نعمت کی

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ ﴿٧٦﴾ فَبِاَيِّ

تکذیب کروگے؟ ﴿٧٥﴾ تکیے لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے مزین سبز چادروں پر اور بہترین قسم کی قالینوں پر ﴿٧٦﴾ اے جن وانس! تم اپنے

فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ﴿۷۷﴾ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ ﴿۷۸﴾

رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟﴿۷۷﴾ برکت والا ہے تیرے رَبّ کا نام جو عظمت والا ہے اور اکرام والا ہے ﴿۷۸﴾

تفسیر

متقین کے لئے دو جنتیں اور ان کے خوبصورت مناظر

وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ: اس شخص کے لئے جو اپنے رَبّ کے سامنے کھڑا ہونے سے ڈرتا ہے، دو باغ ہوں گے۔ دو باغ ہوں گے، یہ تعدّد کی طرف اشارہ ہے، دو سے زیادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کا انکار کرو گے، تکذیب کرو گے؟ ذَوَاتَاۤ اَفْنَانٍ: افنان فَنَنٌ کی جمع ہے، فنن شاخ کو کہتے ہیں، ''لمبی لمبی شاخوں والے'' یہ ان کے گھنے ہونے کی طرف اشارہ ہے، اور لمبی لمبی شاخیں ہوں گی تو پھل بھی اتنا ہی زیادہ لگے گا، ''لمبی لمبی شاخوں والے ہوں گے'' فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ تَجْرِيٰنِ: ان دونوں باغوں کے اندر جاری ہونے والے دو چشمے ہوں گے، بہنے والے چشمے ہوں گے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اے جن و انسان! تم اپنے رَبّ کی کس کس نعمت کی تکذیب کرو گے؟ فِيْهِمَا مِنْ كُلِّ فَاكِهَةٍ زَوْجٰنِ: زوجان: دو قسمیں، یہاں بھی تعدّد کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، ان دونوں باغوں میں ہر قسم کے میووں سے مختلف قسمیں ہوں گی، قسم بہ قسم میوے ہوں گے، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى فُرُشٍۭ بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ: فُرُش فِراش کی جمع ہے، بستر، اور بطائن بِطَانَةٌ کی جمع ہے، بِطانۃ اندر والے کپڑے کو کہتے ہیں، جس کو ''اَستر'' کہا جاتا ہے، اُوپر والا کپڑا ذرا قیمتی ہوا کرتا ہے، اور اندر اِنسان جو کپڑا لگایا کرتا ہے، وہ ذرا کم قیمت کا ہوتا ہے، تو جس کے اندر والے کپڑے بھی ریشمی ہوں تو اُوپر والے کپڑے کی قیمت خود نمایاں ہو جائے گی، ''ٹیک لگانے والے ہوں گے بستروں پر، تکیے لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے بستروں پر جن کے اَستر ریشم کے ہیں'' استبرق موٹے ریشم کو کہتے ہیں، ''جن کے اندر والے کپڑے موٹے ریشم کے ہیں'' وَجَنَا الْجَنَّتَيْنِ دَانٍ: جَنَا پھل کو کہتے ہیں، جَنَا يَجْنِيْ: پھل چننا۔ جَنَا الْجَنَّتَيْنِ: دونوں باغوں کا پھل، دَانٍ: دَنَا يَدْنُوْ: قریب ہونا، ''قریب ہونے والا ہوگا'' پھل قریب قریب ہوگا یعنی توڑنے میں اور حاصل کرنے میں کوئی کسی قسم کی زحمت نہیں ہوگی۔ تو باغات کا ذِکر آ گیا، اس میں پھلوں کا ذِکر آ گیا، چشموں کا ذِکر آ گیا، اور پھر بیٹھنے کے لئے آرام کرنے کے لئے فُرش کا ذِکر آ گیا، جن کے قیمتی ہونے کی طرف اشارہ کر دیا گیا بَطَآئِنُهَا مِنْ اِسْتَبْرَقٍ میں، اور پھر پھل حاصل کرنے میں کوئی کسی قسم کی زحمت نہیں ہوگی، آسانی کے ساتھ توڑے جا سکیں گے، قریب قریب ہوں گے۔ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔

متقین کی جنتی بیویاں

فِيْهِنَّ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ: یہ بات، بارہا آپ کے سامنے آئی کہ عیش کی تکمیل تبھی ہوتی ہے، جب انسان کے ساتھ کوئی اس کا

دُوسرا جوڑا ہو، عورت اور مرد دونوں ملتے ہیں تو دونوں کی زندگی کی تکمیل ہوتی ہے، تو یہ ساری چیزیں دینے کے بعد پھر اللہ تعالیٰ یہ بھی بتاتے ہیں کہ انسان کی زندگی کا یہ شعبہ بھی نامکمل نہیں ہوگا، وہاں مردوں اور عورتوں کو آپس میں جوڑا جائے گا، جس طرح سے دُنیا کے اندر جب جوڑا اچھا لگتا ہے تو انسان کی عیش اور عشرت کی تکمیل ہوتی ہے، تو وہاں بھی یہی قصہ ہوگا۔ فِیْهِنَّ کی ضمیر باغات وما فیہا کی طرف لوٹ گئی، جو نعمتیں اللہ نے دی ہیں باغات اور ان کے اندر قصور، محلات، مکانات، ان کے اندر ایسی عورتیں ہوں گی جو کہ اپنی نظر کو نیچی رکھنے والی ہیں، یعنی اپنے خاوند کے علاوہ کسی دُوسرے کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھیں گی۔ عورت کے اندر یہی عفت والی صفت سب سے زیادہ کشش کا باعث ہوا کرتی ہے، پاک دامن عورتیں ہوں گی جو اپنی نظر کو نیچے رکھنے والی ہوں گی، اپنے خاوند پر نظر کو بند رکھنے والی ہوں گی، کسی دُوسرے کی طرف نظر اُٹھا کر نہیں دیکھیں گی۔ لَمْ يَطْمِثْهُنَّ إِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَلَا جَآنٌّ: اِن جنتیوں سے قبل نہ کسی انسان نے، نہ کسی جنّ نے اُن پہ تصرف کیا ہوگا، وہ کسی کے تصرف میں نہیں ہوں گی، یعنی انہی کے تصرف میں آئیں گی، اُس سے پہلے کسی کے تصرف میں نہیں ہوں گی۔ طَمْث اصل کے اعتبار سے خون کے جاری ہونے کو کہتے ہیں، اور پھر جماع الابکار کے لئے بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے، کیونکہ اس میں بھی کسی نہ کسی درجے میں جریانِ دم ہوتا ہے، تو یہاں مطلقاً مجامعت اور استعمال مراد ہے، کہ جو اِنسانوں کے لئے اللہ نے تیار کی ہیں، وہ ان سے پہلے کسی انسان کے تصرف میں نہیں ہوں گی، اور جو جنوں کے لئے پیدا کی ہیں تو اِن جنّتی جنوں سے قبل وہ کسی جنّ کے تصرف میں نہیں ہوں گی۔ فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ كَاَنَّهُنَّ الْیَاقُوْتُ وَالْمَرْجَانُ: یہ ان کی خوبصورتی کی طرف اشارہ ہے، وہ ایسی صاف ستھری ہوں گی گویا کہ وہ یاقوت اور مرجان ہیں، موتی اور مونگا، صاف ستھرے، رنگ رُوپ، صفائی ان کی ایسی ہوگی جس طرح سے موتی ہوتے ہیں، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ هَلْ جَزَآءُ الْاِحْسَانِ اِلَّا الْاِحْسَانُ: نہیں ہے بدلہ اِحسان کا مگر اِحسان۔ پہلے "اِحسان" سے مراد ہے حسنِ طاعت، اور دُوسرے "اِحسان" سے مراد ہے عنایت اور مہربانی، یعنی جب ان کی طرف سے حسنِ طاعت ہوگی تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حسنِ جزا ہے، اِن کے اچھے عمل کا بدلہ اللہ کی طرف سے اچھا برتاؤ ہے، اِس کے علاوہ اور کیا ہوسکتا ہے، "نہیں ہے اِحسان کا بدلہ مگر اِحسان" پہلا اِحسان اِنسانوں کا ہے، یعنی اچھی طرح عمل کرنا، خوبصورتی کے ساتھ عبادت کرنا، دُوسرا اِحسان اللہ تعالیٰ کی طرف سے بطورِ جزا کے ہے، اِنہوں نے جس طرح سے اچھا عمل کیا تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اچھا بدلہ ہی اس کا ہوسکتا ہے، اور کیا ہوگا، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔

"اصحاب الیمین" کی جنّت کے مناظر

وَمِنْ دُوْنِهِمَا جَنَّتٰنِ: اور اِن کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے، یہ دو گروہ ذِکر کردیے، جس طرح سے آپ کے سامنے اگلی سورت میں تفصیل آرہی ہے، ایک کو "مقربین" کے عنوان کے ساتھ ذِکر کریں گے اور ایک کو "اصحاب الیمین" کے عنوان سے، تو ان کے درجات کے درمیان فرق جو ہوگا کہ "مقربین" زیادہ اُونچے درجے میں ہوں گے، اور "اصحاب الیمین" بھی جنّت میں ہوں گے لیکن پہلوں کے مقابلے میں کم اِنعام یافتہ ہوں گے، تو اسی طرح سے دُوسرے درجے کے باغات کا ذِکر کردیا، گویا کہ پہلا ذِکر

''مقربین'' کا ہے، تو دُوسرا ذکر ''اصحاب الیمین'' کا ہے، ''ان کے علاوہ دو باغ اور ہوں گے'' فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اے جن وانسان! تم اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ مُدْهَآمَّتٰنِ: اِدْهَامٌ کا لفظی معنی ہوتا ہے سیاہ ہونا، اور یہاں مراد یہ ہے کہ ایسے شاداب ہوں گے جو زیادہ سبز ہونے کی بنا پر سیاہی مائل ہوں گے، فصل جس وقت خوب اچھی طرح سے سرسبز شاداب ہوتی ہے اور سیراب ہوتی ہے، پانی کی کمی نہیں ہوتی، تو اس کی سبزی سیاہی مائل ہوتی ہے، اور جیسے جیسے اس میں کمزوری آتی جاتی ہے پیلا پن آتا چلا جاتا ہے۔ وہ بالکل سرسبز ہوں گے، گہرے سرسبز، دیکھنے والے کو سیاہی مائل معلوم ہوں گے، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ فِيْهِمَا عَيْنٰنِ نَضَّاخَتٰنِ: اُن دونوں باغوں میں دو چشمے ہوں گے جوش مارتے ہوئے، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ فِيْهِمَا فَاكِهَةٌ وَّنَخْلٌ وَّرُمَّانٌ: ان میں پھل ہوگا، کھجوریں ہوں گی، انار ہوں گے، وہاں کلیۃً ذکر کر دیا گیا تھا کہ ہر قسم کے میوے، مختلف قسم کے ہوں گے، یہاں تفصیل آ گئی، کھجوریں بھی ہیں، انار بھی ہیں، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اے جن وانس! تم اپنے رَبّ کی اِن نعمتوں میں سے کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟

''اَصحابُ الیمین'' کی بیویاں اور عورت کی اصل حیثیت

فِيْهِنَّ خَيْرٰتٌ حِسَانٌ: یہاں بھی اُسی طرح سے پھر اَزواج کا ذِکر آ گیا، ''اُن باغات کے اندر اچھی عورتیں ہوں گی خوبصورت'' خیرات سے ان کے حسنِ سیرت کی طرف اشارہ کیا ہے، اور حِسان کے ساتھ ان کے حسنِ صورت کی طرف اشارہ کیا ہے، اچھی سیرت کی اور اچھی صورت کی، فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ۔ اُنہی کا ذِکر آ گیا حُوْرٌ مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ: وہ حوریں ہوں گی۔ حُوْر حَوْرَاءُ کی جمع، گورے رنگ کی عورت، مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ: جو کہ خیموں میں بند کی ہوئی ہوں گی، یعنی وہ آوارہ عورتوں کی طرح نہیں ہوں گی، عورت کی خوبی یہی ہے کہ اپنے گھر کے اندر وہ بند ہو، سوائے خاوند کے اس کا کسی دُوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہ ہو، جتنی عورت اس طرح سے پردے میں رہے گی، عفیف ہوگی، پاک دامن ہوگی، اتنی وہ اچھی بیوی ثابت ہوتی ہے اور گھر کے اندر آرام اور راحت کا باعث بنتی ہے، اور جتنی عورتیں باہر پھیلتی چلی جائیں، تعلقات ان کے بڑھتے چلے جائیں، آوارہ گردی میں آ جائیں، تو اُتنا گھر ویران ہو جایا کرتا ہے، گھر کی زندگی خوشگوار نہیں رہا کرتی۔

''عورت گھر کی ملکہ!''......اور اس کو ''آزادی'' کے نام پر دھوکا!

اسی لیے شریعت نے عورت کو گھر کی بادشاہ بنایا ہے، وہ گھر کی ملکہ ہے، گھر بیٹھے اور گھر کو سنوارے، بچوں کی پرورش کرے، اپنے گھر کے دُوسرے اُمور کو سنبھالے، باہر کے کام جتنے ہیں وہ سارے کے سارے مَردوں کے ذِمے ہیں، اور آج جو معاشی دور کے اندر عورتوں کو شریک کیا جا رہا ہے تو آپ دیکھ ہی رہے ہیں کہ جس طرح سے خاندانوں میں بربادی آ رہی ہے، وہ محبت، وہ پیار اور اسی طرح سے گھروں کا انتظام، گھروں کی راحت، وہ ساری کی ساری رُخصت ہوتی جا رہی ہے، اور اِن کے دماغ میں شیطانوں نے یہ عجیب وسوسہ ڈال دیا، کہ جب تم اپنی ملازمت کروگی، اپنا کاروبار کروگی، تو تم اپنے خاوند کی محتاج نہیں رہوگی۔

اب یہ آٹھ آٹھ گھنٹے جا کر دفتروں میں افسروں کے سامنے تو نیاز مندی اختیار کر سکتی ہیں، اور باندیوں کی طرح ان کے سامنے کام کرتی ہیں، ان کے رُعب سہتی ہیں، جھڑکیاں سہتی ہیں، بار بار اپنے کام کے لئے ان کے سامنے چکر لگاتی ہیں، لیکن گھر بیٹھ کر آرام کے ساتھ کھانا پینا، اِس کو یہ غلامی سمجھتی ہیں، اور اُس کو آزادی سمجھتی ہیں، یعنی آپ نے دیکھا ہے کہ ایک ملازم آدمی جس وقت دفتر میں ہوتا ہے تو اُس کو اپنے افسر کے سامنے کتنا نیاز مند بن کر رہنا پڑتا ہے، تو جب یہ عورتیں دفتر میں ملازم ہوں گی یہ بھی تو اُسی طرح سے نیاز مند ہوں گی، پھر ایک کی نہیں، اُوپر اپنے افسروں کی پوری لائن کی، ہر چھوٹے بڑے کے سامنے اِن کو نیاز مند بن کر رہنا پڑتا ہے، تو وہ نیاز مندی '' آزادی'' ہے، اور گھر میں بیٹھ کے اگر خاوند کی نیاز مندی اختیار کرتی ہیں تو ان جاہلوں نے سمجھ لیا کہ یہ '' غلامی'' ہے، خاوند کی خدمت اور اطاعت '' غلامی'' ہے، اور باہر نکل کر افسروں کی اطاعت کرنا اور ان کی ہر قسم کی ناز برداریاں کرنا '' آزادی'' ہے، تو یہ سب جہالت اور شہوت پرستی کے نتیجے میں اس قسم کی گمراہی پھیلائی جارہی ہے، ورنہ عورت کی شان اسی میں ہے کہ اپنے گھر میں بندر ہے اور گھر کے نظم کو سنبھالے، بچوں کی تربیت کرے، عورت کا دائرہ کار گھر میں ہی ہے، جب نان نفقہ شریعت نے اس کے ذِمّے نہیں ڈالا، اور اس کے لئے اتنی وسعت پیدا کر دی کہ سارا خرچ تو اس کا خاوند کے ذِمّے ہے، اور باقی! باپ کی وراثت ملے گی وہ اس کے پاس اپنی ہے، اور اولاد کے ذِمّے اس کی خدمت لگادی گئی وہ ایک علیحدہ چیز ہے، تو اس کے لئے تو آرام اور راحت کا بندوبست شریعت نے مَردوں کے مقابلے میں بھی زیادہ کیا ہے، اس کو ماں کا درجہ دیا ہے، اس میں کیا عظمت ہے، بہن کا درجہ دیا، بیٹی کا درجہ دیا، اور ایک ہی ہے اس کا درجہ بیوی والا، اس میں بھی محبوبیت ہے، محکومیت اتنی نہیں جتنی محبوبیت ہے، تو جو حقوق شریعت نے متعین کیے ہیں ماں ہونے کی حیثیت سے، بہن ہونے کی حیثیت سے، بیٹی ہونے کی حیثیت سے، بیوی ہونے کی حیثیت سے، اور نان نفقے کی جس طرح سے اس کو سہولتیں دی گئی ہیں، تو اگر دیکھا جائے تو واقعہ یہ ہے کہ شریعت نے اس کو '' گھر کی ملکہ'' بنادیا ہے، اور اس کے لئے ہر طرح سے راحت اور آرام کا سامان کیا ہے۔ اور دُوسرے نظریے میں جس طرح سے مرد دھکے کھاتے پھرتے ہیں، لوگوں کے سامنے نوکریاں اُٹھائیں، مزدوریاں کریں، ملازمتیں کریں، اور ایک لائن کی لائن افسروں کی ہوتی ہے جس کے سامنے انسان کو نیاز مند بننا پڑتا ہے، دفتروں کے چکر! آپ کو معلوم نہیں کہ جس وقت انسان جا کر کہیں ملازمت کرتا ہے تو اس کو کتنی ناز برداری کرنی پڑتی ہے اپنے اُوپر والوں کی، تو عورت کو یہ سمجھا دیا گیا کہ اُس میں '' آزادی'' ہے، تو اِس سے زیادہ ذِلت عورت کی کیا ہوگی! اور اس کے لئے اِس سے زیادہ سزا کیا ہو سکتی ہے کہ ایک خاوند سے '' آزاد'' کر کے بیسیوں کا '' غلام'' بنادیا...... ! تو یہ ساری کی ساری صفتیں جو جنتی عورتوں کی ذِکر کی جارہی ہیں اصل میں اچھی عورت کا معیار یہی ہے۔ **قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ** ہو، خیرات کا مصداق ہو، حسنِ سیرت کو لئے ہوئے ہو، اور اسی طرح سے گھر کے اندر بند ہو کے رہنے والی ہو، فرماں بردار ہو، یہ صفتیں ہیں عورت کی، اگر کسی کے اندر یہ صفتیں پائی جائیں تو یوں سمجھو کہ یہ جنت کی حور سے کم نہیں ہے، **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ**۔

لَمْ یَطْمِثْهُنَّ اِنْسٌ قَبْلَهُمْ وَ لَا جَآنٌّ: ان سے پہلے یعنی اِن جنتیوں سے پہلے نہ کسی انسان نے اُن میں تصرف کیا ہوگا، نہ کسی جن نے، **فَبِاَیِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ**۔

جنتیوں کی محفل

مُتَّكِـِٕيْنَ عَلٰى رَفْرَفٍ خُضْرٍ: تکیے لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے رَفرفِ خضر پر۔ رفرف کہتے ہیں مزین کپڑے کو، جس کے اُوپر پھول بوٹے بنے ہوئے ہوں، جس طرح سے آپ بستروں کے اُوپر چادریں بچھایا کرتے ہیں، اس لیے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ترجمہ کیا مُشَجَّر کے ساتھ، مشجر اس کپڑے کو کہتے ہیں جس پر درخت اور بیل بوٹے بنے ہوئے ہوتے ہیں، عربی کے اندر یہ لفظ آیا کرتے ہیں مِرط مُرحّل: ایسی چادر جس کے اُوپر کجاووں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، مِرط مشجر: ایسی چادر جس کے اُوپر بیل بوٹے اور درختوں کی تصویریں بنی ہوئی ہیں، تو ایسی مزین چادریں بچھی ہوئی ہوں گی جن کے اُوپر وہ ٹیک لگا کر بیٹھیں گے، رفرف یہ چادر ہوگئی، خُضر: سبز، "سبز مزین چادریں"، وَّعَبْقَرِيٍّ حِسَانٍ: عبقری یہ نسبت ہے عبقر کی طرف، جاہلیت میں مشہور تھا کہ عبقر کوئی جنوں کا شہر ہے، اس لئے جو عجیب چیز ہوتی اس کی نسبت وہ اسی کی طرف ہی کرتے تھے، کوئی انسان زیادہ کمالات کا مالک ہوتا تو اس کو کہتے یہ تو "عبقری انسان" ہے، اور اسی طرح سے کوئی عجیب وغریب چیز ہوتی تو اس کی نسبت بھی "عبقر" کی طرف کرتے تھے، تو یہاں عبقری سے اچھی سے اچھی قالینیں، بہترین سے بہترین کپڑے، نادر نادر چیزیں مراد ہیں، حِسان: خوبصورت، "ٹیک لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے مزین سبز چادروں پر اور بہترین قسم کی قالینوں پر"، موقع محل کے مطابق اس کا ترجمہ بہترین قالین کے ساتھ کیا جا سکتا ہے، ویسے عبقری ہر نادر چیز کو کہتے ہیں، فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ: اے جن وانس! تم اپنے رَبّ کی نعمتوں میں سے کس کس نعمت کی تکذیب کروگے؟ تَبٰرَكَ اسْمُ رَبِّكَ ذِي الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ: برکت والا ہے تیرے رَبّ کا نام جو عظمت والا ہے اور اِکرام والا ہے۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ أَشْهَدُ أَنْ لَّآ إِلٰهَ إِلَّآ أَنْتَ أَسْتَغْفِرُكَ وَأَتُوْبُ إِلَيْكَ

سُورَةُ الوَاقِعَةِ

آياتها ۹۶ ۵۶ سُوْرَةُ الْوَاقِعَةِ مَكِّيَّةٌ ۴۶ رکوعاتها ۳

سورۂ واقعہ مکہ میں نازل ہوئی، اوراس کی چھیانوے آیتیں ہیں، تین رُکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ ۙ﴿۱﴾ لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ ۘ﴿۲﴾ خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ ۙ﴿۳﴾

جب واقع ہونے والی واقع ہو جائے گی ﴿۱﴾ اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں ﴿۲﴾ پست کرنے والی ہے، اُونچا کرنے والی ہے ﴿۳﴾

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا ۙ﴿۴﴾ وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا ۙ﴿۵﴾ فَكَانَتْ هَبَآءً

جس وقت کہ زلزلہ دی جائے گی زمین زلزلہ دیا جانا ﴿۴﴾ اور ریزہ ریزہ کر دیے جائیں گے پہاڑ خوب اچھی طرح سے ﴿۵﴾ پھر ہو جائیں گے وہ پہاڑ

مُّنْۢبَثًّا ۙ﴿۶﴾ وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً ۭ﴿۷﴾ فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۭ﴿۸﴾

بکھرنے والا غبار ﴿۶﴾ اور ہو جاؤ گے تم تین قسمیں ﴿۷﴾ دائیں طرف والے، کیا ہی اچھے حال میں ہوں گے دائیں طرف والے ﴿۸﴾

وَاَصْحٰبُ الْمَشْــَٔمَةِ ۙ مَآ اَصْحٰبُ الْمَشْــَٔمَةِ ۭ﴿۹﴾ وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ ۙ﴿۱۰﴾

اور بائیں طرف والے، کتنے ہی بدحال ہوں گے بائیں طرف والے ﴿۹﴾ سبقت لے جانے والے تو سبقت نے جانے والے ہی ہیں ﴿۱۰﴾

اُولٰۗىِٕكَ الْمُقَرَّبُوْنَ ۚ﴿۱۱﴾ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿۱۲﴾ ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۙ﴿۱۳﴾ وَقَلِيْلٌ مِّنَ

یہی مقرب ہوں گے ﴿۱۱﴾ خوش حالی کے باغات میں ہوں گے ﴿۱۲﴾ بڑی جماعت ہے یہ اوّلین میں سے ﴿۱۳﴾ اور تھوڑے ہیں

الْاٰخِرِيْنَ ۭ﴿۱۴﴾ عَلٰي سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ ۙ﴿۱۵﴾ مُّتَّكِـــِٕيْنَ عَلَيْهَا مُتَقٰبِلِيْنَ ﴿۱۶﴾

پچھلوں میں سے ﴿۱۴﴾ جڑاؤ تختوں کے اُوپر بیٹھے ہوں گے ﴿۱۵﴾ ٹیک لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے ان پر ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے ﴿۱۶﴾

يَطُوْفُ عَلَيْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ ۙ﴿۱۷﴾ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۥ وَكَاْسٍ

گھومیں گے اُن پر لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رکھے جائیں گے ﴿۱۷﴾ وہ گھومیں گے ان کے اُوپر گلاس، لوٹے اور جاری شراب

مِّنْ مَّعِيْنٍ ۙ﴿۱۸﴾ لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ ۙ﴿۱۹﴾ وَ

کے پیالے لے کر ﴿۱۸﴾ درد سر میں مبتلا نہیں کیے جائیں گے اس شراب کی وجہ سے، اور نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا ﴿۱۹﴾ اور (گھومیں گے)

فَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُونَ ﴿٢١﴾ وَ
ایسے میووں کے ساتھ جن کو وہ جنتی پسند کریں گے ﴿٢٠﴾ اور پرندوں کے گوشت کے ساتھ جس کو وہ جنتی چاہیں گے ﴿٢١﴾ اور ان کے لیے
حُورٌ عِينٌ ﴿٢٢﴾ كَأَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُونِ ﴿٢٣﴾ جَزَاءً بِمَا كَانُوا
گوری گوری موٹی آنکھوں والی عورتیں ہوں گی ﴿٢٢﴾ چھپا کے رکھے ہوئے موتیوں کی طرح ﴿٢٣﴾ بطور بدلے کے ان کاموں کے جو وہ
يَعْمَلُونَ ﴿٢٤﴾ لَا يَسْمَعُونَ فِيهَا لَغْوًا وَلَا تَأْثِيمًا ﴿٢٥﴾ إِلَّا قِيلًا سَلَامًا سَلَامًا ﴿٢٦﴾ وَ
کیا کرتے تھے ﴿٢٤﴾ نہیں سنیں گے یہ لوگ اس جنت کے اندر کوئی بیہودہ بات اور نہ کوئی گناہ کی چیز ﴿٢٥﴾ مگر کہنا سلام سلام ﴿٢٦﴾ اور
أَصْحَابُ الْيَمِينِ مَا أَصْحَابُ الْيَمِينِ ﴿٢٧﴾ فِي سِدْرٍ مَّخْضُودٍ ﴿٢٨﴾ وَطَلْحٍ مَّنْضُودٍ ﴿٢٩﴾ وَظِلٍّ
دائیں طرف والے، کیا ہی اچھے ہوں گے دائیں طرف والے ﴿٢٧﴾ بے خار بیریوں میں ﴿٢٨﴾ اور تہہ بہ تہہ کیلے میں ﴿٢٩﴾ اور پھیلائے ہوئے
مَّمْدُودٍ ﴿٣٠﴾ وَمَاءٍ مَّسْكُوبٍ ﴿٣١﴾ وَفَاكِهَةٍ كَثِيرَةٍ ﴿٣٢﴾ لَا مَقْطُوعَةٍ وَلَا مَمْنُوعَةٍ ﴿٣٣﴾ وَ
سائے میں ﴿٣٠﴾ اور بہائے ہوئے پانی میں ﴿٣١﴾ اور بہت سارے پھل ہیں ﴿٣٢﴾ نہ وہ پھل قطع کیا ہوا ہوگا، نہ منع کیا ہوا ہوگا ﴿٣٣﴾ اور
فُرُشٍ مَّرْفُوعَةٍ ﴿٣٤﴾ إِنَّا أَنْشَأْنَاهُنَّ إِنْشَاءً ﴿٣٥﴾ فَجَعَلْنَاهُنَّ أَبْكَارًا ﴿٣٦﴾
اُونچے اُونچے بستروں میں ﴿٣٤﴾ اُٹھائیں گے ہم اُن کو اٹھانا ایک خاص طریقے سے ﴿٣٥﴾ بنائیں گے ہم اُن کو کنواریاں ﴿٣٦﴾
عُرُبًا أَتْرَابًا ﴿٣٧﴾ لِأَصْحَابِ الْيَمِينِ ﴿٣٨﴾
محبت کرنے والی، ہم عمر ﴿٣٧﴾ یہ سب کچھ اصحاب یمین کے لیے ہوگا ﴿٣٨﴾

سورۃ کا تعارف اور فضیلت

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ۔ سورۂ واقعہ مکہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۹۶ آیتیں ہیں، ۳ رُکوع ہیں۔ بعض بعض سورتوں کے جو خصوصی فضائل حدیث شریف میں آئے ہیں، اُن سورتوں میں سے ایک سورت یہ بھی ہے۔ سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ جو شخص رات کو سورۂ واقعہ پڑھتا رہے، یعنی عادت ڈال لے سورۂ واقعہ پڑھنے کی، تو "لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ"[1] اُس شخص کو فاقہ نہیں پہنچے گا۔ اور فاقہ عربی میں "اِحتیاج" کو کہتے ہیں، ہمارے ہاں اُردو میں جب "فاقہ" کا لفظ بولا جاتا ہے تو اس سے صرف "بھوک" مراد لی جاتی ہے، کہ وہ شخص بھوکا نہیں ہوگا، لیکن عربی میں "اِحتیاج" کو کہتے ہیں، وہ محتاج نہیں ہوگا، اللہ تعالیٰ اس کی ضروریات

(۱) مَنْ قَرَأَ سُوْرَةَ الْوَاقِعَةِ فِيْ كُلِّ لَيْلَةٍ لَمْ تُصِبْهُ فَاقَةٌ أَبَدًا. (شعب الایمان، رقم: ۲۲۶۸/ مشکوٰۃ ج ۱ ص ۱۸۹۔ فضائل القرآن، فصل ثالث)

پوری فرمادیں گے، توجس طرح سے رزق کی برکت کے لئے اور دُوسری ضروریات کے پورا ہونے کے لئے سورۂ یٰس کا ورد آیا ہے، اسی طرح سے سورۂ واقعہ ہے، فجر کی نماز کے بعد سورۂ یٰس کو پڑھ لیا جائے، یا طلوعِ فجر کے بعد فجر کی نماز سے پہلے یا بعد، یعنی دن کے ابتدائی حصے میں، اس کے بارے میں بھی حدیث شریف میں آتا ہے: ''مَنْ قَرَأَ يٰسٓ فِي صَدْرِ النَّهَارِ قُضِيَتْ حَوَائِجُهُ''[1] او کما قال علیہ الصلاۃ والسلام، حضور ﷺ نے فرمایا کہ جو دن کے شروع میں سورۂ یٰس پڑھ لے اُس کی ضرورتیں پوری کی جاتی ہیں۔[2] تو اسی طرح سے رات کو سورۂ واقعہ پڑھنے کی ترغیب ہے، تو مغرب کے بعد اگر اس کا اِلتزام کرلیا جائے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے انسان کے رزق میں برکت ہوتی ہے، اور دُوسری ضروریات پوری ہونے کے لئے بھی اسباب مہیا ہوجاتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنی صاحبزادیوں کو اِس سورت کے پڑھنے کی تاکید کیا کرتے تھے، اور آخر عمر میں جس وقت آپ بیمار تھے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ آپ سے ملنے کے لیے آئے، تو انہوں نے آپ کو کچھ مال دینا چاہا، تو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا کہ مجھے ضرورت نہیں، تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ لے لیجئے، آپ کی بیٹیوں کے کام آجائے گا، تو آپ نے فرمایا کہ کیا تمہیں میری بیٹیوں کے متعلق یہ اندیشہ ہے کہ محتاج ہوجائیں گی؟ ایسا نہیں ہوسکتا، میں نے انہیں تاکید کر رکھی ہے کہ رات کو سورۂ واقعہ پڑھا کرو۔ (ابنِ کثیر وغیرہ)، توجس کا مطلب یہ تھا کہ جب وہ سورۂ واقعہ پڑھتی ہیں تو مجھے یہ کوئی اندیشہ نہیں کہ کسی وقت وہ محتاج ہوجائیں گی۔ تو یہ ہلکے ہلکے سے وظیفے ہوتے ہیں جن کی برکات بہت ہیں، ان کا اِلتزام کرلیا جائے تو اِنسان کو زندگی گزارنے میں سہولت رہتی ہے......! سورۃ ''مکی'' ہے، اوراس میں بھی ذکر انہی مضامین کا ہے جیسے ''مکی'' سورتوں میں ہوا کرتے ہیں، خصوصیت کے ساتھ آخرت کے اَحوال مذکور ہیں۔

تفسیر

قیامت یقینی ہے

اِذَا وَقَعَتِ الْوَاقِعَةُ: واقعہ: واقع ہونے والی چیز، جس وقت واقع ہونے والی واقع ہوجائے گی، قیامت کو واقعہ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کیا جارہا ہے، جس سے اُس کے یقینی ہونے کی طرف اشارہ ہے، کہ یوں سمجھو کہ وہ واقع ہونے والی ہے، ''جب واقع ہونے والی واقع ہوجائے گی'' لَيْسَ لِوَقْعَتِهَا كَاذِبَةٌ: كَاذِبَةٌ یہاں مصدر ہے، خائنۃ عافیۃ کی طرح، ''اس کے واقع ہونے میں کوئی جھوٹ نہیں''، یعنی یہ خبر بالکل واقع کے مطابق ہے، اس میں کذب نہیں ہے، کوئی کسی قسم کا جھوٹ نہیں۔

قیامت کے دِن پستی وبلندی کا معیار!

خَافِضَةٌ رَّافِعَةٌ: خَافِضَةٌ: پست کرنے والی ہوگی، رَّافِعَةٌ: اُونچا کرنے والی ہوگی، یعنی اُس قیامت کے واقع ہونے سے یہ نتیجہ ظاہر ہوگا کہ کسی کو وہ پست کرے گی کسی کو بلند کرے گی، لیکن وہاں پست اور بلند کرنے کا معیار اور ہوگا، دُنیا کے اندر بلند اس کو

(۱) سنن دارمی، رقم الحدیث: ۳۴۶۱/ مشکوۃ ۱/ ۱۸۹ فضائل القرآن، فصل ثالث، عن عطاء بن ابی رباح مرسلاً۔

سمجھا جاتا ہے جس کو دولت حاصل ہو، جس کو اقتدار حاصل ہو، یا جتھے والا ہو، اور پست اُس کو سمجھا جاتا ہے جس کے پاس مال دولت نہ ہو، اسی لیے وہ رُؤسائے مشرکین، مال دار، سرمایہ دار، وہ مسلمانوں کی تحقیر کیا کرتے تھے، کہتے تھے کہ یہ گھٹیا درجے کے لوگ ہیں، هُمْ اَرَاذِلُنَا کا لفظ جس طرح سے قرآنِ کریم میں آیا تھا (سورۂ ہود: ۲۷)، ارذل: گھٹیا قسم کے لوگ۔ آخرت میں جا کر معاملہ اور طرح سے ہوجائے گا، قیامت اُونچا کرنے والی ہوگی ان لوگوں کو جنہوں نے اللہ کے اَحکام کے مطابق زندگی گزاری ہوگی، چاہے دُنیا کے اندر وہ خوش حال نہیں تھے، اور پست کرنے والی ہوگی ان کو جنہوں نے اللہ کی مخالفت میں زندگی گزاری ہوگی، چاہے دُنیا کے اندر وہ کتنے ہی بڑے سرمایہ دار اور کتنے ہی اُونچے عہدوں پہ فائز تھے۔ وہاں معاملہ برعکس ہوجائے گا، وہاں خفض و رفع کا معیار اور ہے، دُنیا والا معیار نہیں، ''پست کرنے والی ہے اُونچا کرنے والی ہے۔''

اَحوالِ قیامت

اِذَا رُجَّتِ الْاَرْضُ رَجًّا: جس وقت کہ زلزلہ دی جائے گی زمین زلزلہ دیا جانا، یہ تاکید ہے، یعنی زمین کانپ اُٹھے گی، وَّبُسَّتِ الْجِبَالُ بَسًّا: اور ریزہ ریزہ کردیے جائیں گے پہاڑ خوب اچھی طرح سے، بَسًّا مصدر ہے بطورِ تاکید کے، ''جب زمین کو خوب شدت کا زلزلہ آئے گا اور پہاڑ ریزہ ریزہ کردیے جائیں گے'' فَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْۢبَثًّا: پھر ہوجائیں گے وہ پہاڑ بکھرنے والا غبار، هَبَآءً مَّنْثُوْرًا کا لفظ جس طرح سے دُوسری جگہ آیا ہوا ہے (سورۂ فرقان: ۲۳)، بکھرنے والا، پھیلنے والا غبار، گرد کھٹے کی طرح یہ پہاڑ اُڑ جائیں گے، جس طرح سے غبار ہوتا ہے، ویسے ہوجائیں گے۔ اور اِذَا کا جواب محذوف ہے، جب یہ واقعہ پیش آئے گا تو اس وقت لوگوں کے سامنے اپنے اعمال کا بدلہ آجائے گا، تمہیں آخرت کا یقین آجائے گا، تمہیں پتا چل جائے گا کہ تم جو تکذیب کرتے تھے وہ غلط تھی، اس کے واقع ہونے میں کوئی کسی قسم کا جھوٹ نہیں، یہ چیز نمایاں ہوجائے گی، اِذَا کا جواب اس طرح سے نکال لیا جائے گا۔

قیامت کے دِن لوگوں کی تین قسمیں

وَّكُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَةً: اور تم تین قسم پہ تقسیم ہوجاؤ گے، ہوجاؤ گے تم تین قسمیں، فَاَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ ۙ مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ: یہ ایک قسم ہے، دائیں طرف والے، میمنہ یمین کے معنی میں، یعنی وہ لوگ جن کو نامۂ اَعمال دائیں ہاتھ میں دیا جائے گا، ''دائیں طرف والے'' مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَيْمَنَةِ: یہ اِستفہام اُن کے حال کے اُوپر تعجب ظاہر کرنے کے لئے ہے، کیا ہی اچھے ہوں گے وہ دائیں طرف والے، اُن کا کیا کہنا! یہ تعجب کے طور پر کہا جاتا ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کرتا ہے کہ وہ ایسے خوش حال ہوں گے کہ لفظوں میں بیان نہیں ہوسکتا، ''کیا ہی اچھے حال میں ہوں گے دائیں طرف والے!'' وَاَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ: اور بائیں طرف والے، مَاۤ اَصْحٰبُ الْمَشْئَمَةِ: کتنے ہی بُرے حال میں ہوں گے وہ بائیں طرف والے! اس اِستفہام میں قباحت والا معنی ہے، اس میں قباحت والے معنی پہ تعجب ہے، جس طرح سے پہلے اِستفہام میں اچھائی کے اُوپر تعجب ہے، ''کتنا ہی بدحال ہوں گے وہ بائیں طرف والے'' وَالسّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ: یہ آپس میں مبتدا خبر ہیں، سبقت لے جانے والے تو سبقت لے جانے والے ہی ہیں، یعنی اُن کا تو کیا کہنا، وہ تو سبقت

لے گئے، جیسے دُنیا کے اندر نیکیوں میں سبقت لے گئے تھے آخرت میں خوش حالی میں سبقت لے جائیں گے،" آگے بڑھنے والے تو آگے بڑھنے والے ہی ہیں۔" تو یہ تین قسمیں نکل آئیں گی، ایک سابقین، دُوسرے اصحاب الیمین، تیسرے اصحاب الشمال، تین حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے، اور السابقون یہ بھی اصحاب الیمین میں داخل ہیں، اِن کو بھی نامۂ اعمال دائیں ہاتھ میں ملے گا، لیکن یہ عام اصحاب الیمین میں چونکہ ممتاز گروہ ہوگا اسی لیے اس کو السّٰبِقُوْنَ کے لفظ کے ساتھ تعبیر کر دیا گیا، اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ: یہی سابقون یہی مقرب ہوں گے، اللہ کے ساتھ اِن کو قُرب حاصل ہوگا جیسے اللہ کے علم میں ہے، ہم اس کی کیا صورت متعین کر سکتے ہیں، فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ: خوش حالی کے باغات میں ہوں گے۔

اوّلین اور آخرین کے مصداق میں تین اقوال

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ۞ وَقَلِيْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ: بڑی جماعت ہے یہ اوّلین میں سے، اور تھوڑے ہیں پچھلوں میں سے، اوّلین میں سے یہ بڑی جماعت ہے مقربین کی، اور پچھلوں میں سے تھوڑے ہیں۔ تو یہاں اوّلین اور آخرین سے کون لوگ مراد ہیں؟ تین طرح سے اس کا مطلب بیان کیا گیا ہے۔ راجح یہی ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت کے ہی لوگ مراد ہیں، آپ کی اُمت کی ابتدا میں مقربون زیادہ ہیں، اور پچھلے حصے میں مقربون تھوڑے ہیں (مظہری)، لیکن اس سے اتنا یقینی طور پر معلوم ہو گیا کہ اللہ کا مقرب بننے کے لئے ضروری نہیں کہ حضور ﷺ کے متصل والے زمانے ہی میں انسان آئے، کئی دفعہ ایسا ہو سکتا ہے کہ ایک آدمی آیا تو ہے متصل والے زمانے میں، لیکن وہ نیکیاں کر کے یا اپنی محنت اور مشقت کے ساتھ، مجاہدہ اور ریاضت کے ساتھ وہ مقربین کی صف میں نہیں شامل ہو سکا، اصحاب الیمین میں رہ گیا، اور ایسا بھی ہوگا کہ ایک آدمی پیدا پیچھے ہوا ہے پچھلے زمانے میں، لیکن دین کے لئے جو اُس نے محنت کی، اللہ کی عبادت میں جو اس نے ریاضت کی، تو اس کے لحاظ سے وہ مقرب ہو جائے گا، تو ایسا ہوتا رہتا ہے جس طرح سے بعض بعض اعمال کے اُوپر حدیث شریف میں فضیلت آئی ہے، سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ اس قسم کا کام کرنے والوں کو وہی درجے ملیں گے، صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا، کہ جیسے تم لوگوں کے درجے ہیں..... اور دُوسرا مطلب اس کا یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک کا زمانہ یہ اوّلین کا زمانہ ہے، اس میں مقرب زیادہ ہیں، اور حضور ﷺ کے زمانے سے لے کر قیامت تک کا زمانہ یہ آخرین کا ہے جس میں مقرب نسبتاً تھوڑے ہیں (جلالین، نسفی)، اس کی وجہ یہ ہے کہ مقرب ہر دور میں کم ہوا کرتے ہیں، اعلیٰ قسم کے لوگ، اور حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک انبیاء علیہم السلام بھی لاکھوں کی تعداد میں گزر گئے، وہ سب بھی مقربون میں شامل ہیں، اور اُن کے پھر خصوصی اصحاب۔ تو حضور ﷺ کے بعد تو اور کوئی نبی آنے والا نہیں، اس لیے حضور ﷺ کی اُمت میں اُس معیار کے لوگ، انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھی، یہ نسبتاً کم ہوں گے، کیونکہ زمانہ دراز ہے، اور انبیاء علیہم السلام کی جماعت بہت کثیر ہے، اور سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت میں چونکہ آپ کے علاوہ کوئی دُوسرا نبی نہیں، اور زمانہ تھوڑا ہے دُوسروں کے مقابلے میں، اس لحاظ سے مقربین کا گروہ نسبتاً اِس اُمت میں کم ہے بمقابلہ پچھلوں کے۔ اور اصحاب الیمین پچھلوں میں زیادہ ہیں، ثُلَّةٌ کے لفظ کے ساتھ جس طرح سے آئے گا، اور حدیث شریف میں آتا ہے سرورِ کائنات ﷺ نے فرمایا کہ

جتنے لوگ جنت میں جائیں گے اُن میں نسبتاً میری اُمت زیادہ ہے، جس سے معلوم ہو گیا کہ مطلقاً جنت میں جانے والے تو حضور ﷺ کی اُمت کے زیادہ ہیں، لیکن ان میں مقربین کی تعداد سابقین میں زیادہ ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ جنتیوں کی ایک سو بیس صفیں ہوں گی، جن میں سے اَسّی صفیں میری اُمت کی ہیں،"[1] جس کا مطلب ہے کہ دو ثلث حضور ﷺ کی اُمت میں سے ہوں گے، ایک ثلث باقیوں میں سے ہوں گے...... اور تیسرا مطلب یہ بھی بیان کیا گیا ہے کہ ہر نبی کے دور کی بات ہے، کہ ہر نبی کے دور میں اوّلین میں سے مقربین زیادہ ہوتے ہیں، اور پچھلے لوگوں میں تھوڑے ہوتے ہیں (جمالین)۔ "بڑی جماعت ہے یہ اوّلین میں سے اور تھوڑے ہیں پچھلوں میں سے۔"

سابقین اور اَوّلین کے لئے جنت کی نعمتیں

عَلٰی سُرُرٍ مَّوْضُوْنَةٍ: سُرُر یہ سریر کی جمع ہے، تخت کو کہتے ہیں، جس طرح ہمارے ہاں چارپائی کو سریر کہا جاتا ہے، مَوْضُوْنَةٍ: وَضَن: بننا، بنی ہوئی چارپائیاں، یعنی سونے کی تاروں کے ساتھ بنی ہوئی، یا زیورات کے ساتھ جڑاؤ تخت، "جڑاؤ تختوں کے اُوپر بیٹھے ہوں گے" یعنی ایسے تخت جن کے اُوپر سونے چاندی کے ساتھ پھول بوٹے نکالے ہوئے ہیں، پُرانے زمانے میں بادشاہ اپنے لیے جو تخت بنایا کرتے تھے تو اس میں موتی جڑتے تھے، سونا چاندی لگاتے تھے، جس سے اُن کی شان و شوکت نمایاں ہوتی تھی، تو ایسے ہی جڑاؤ تختوں کے اُوپر وہ بیٹھے ہوں گے، سونے کی تاروں سے بُنے ہوئے یا ان میں موتی جڑے ہوئے ہوں گے، اسی طرح سے سونے چاندی کے زیورات لگے ہوئے ہوں گے۔ مُّتَّكِـِٕیْنَ عَلَیْهَا مُتَقٰبِلِیْنَ: ٹیک لگا کر بیٹھنے والے ہوں گے اُن پر ایک دُوسرے کی طرف منہ کر کے، اس میں یہ بات ظاہر کرنی مقصود ہے کہ جنت میں چلے جائیں گے تو ان کے دلوں میں کوئی کسی قسم کا کینہ، بغض، نفرت نہیں ہوگی، جس کے ساتھ معاشرے میں بدمزگی پیدا ہوتی ہے، ایک ہی گھر کے افراد اگر آپس میں لڑتے رہیں، ایک دوسرے سے نفرت کریں، اعراض کریں، تو آپ جانتے ہیں کہ زندگی تلخ ہو جاتی ہے چاہے کتنی ہی خوش حالی گھر میں کیوں نہ ہو، تو جنت میں جانے والے ایسے نہیں ہوں گے، جس طرح سے آیا تھا وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ (سورۂ حجر: ۴۷) کہ اگر کسی کے دل میں کچھ کینہ، بغض، کوئی کدورت ایک دُوسرے کے خلاف ہوگی بھی تو وہ سب ہم نکال دیں گے، "ایک دوسرے کی طرف منہ کر کے بیٹھے ہوئے ہوں گے۔"

اہلِ جنت کی مجلس کا نقشہ

یَطُوْفُ عَلَیْهِمْ وِلْدَانٌ مُّخَلَّدُوْنَ: یہ اُن کی مجلس کا نقشہ ہے، گھومیں گے اُن پر لڑکے جو ہمیشہ لڑکے ہی رکھے جائیں گے، وِلْدَانٌ کے لفظ سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ وہ بالکل نوعمر ہوں گے، چھوٹے چھوٹے بچے جس طرح سے ہوا کرتے ہیں، یہ اُچھلتے کودتے پھرتے ویسے بھی اچھے لگتے ہیں، اور خدمت گزاری میں چست و چالاک بھی ہوتے ہیں۔ مُخَلَّدُوْنَ کا مطلب یہ ہے

(۱) ترمذی ۲/۸۱، باب ما جاء فی کم صف اهل الجنة. مشکوٰۃ ۲/۴۹۸، باب صفة الجنة، فصل ثانی۔ اَهْلُ الْجَنَّةِ عِشْرُوْنَ وَمِائَةُ صَفٍّ ثَمَانُوْنَ مِنْ هٰذِهِ الْاُمَّةِ الخ

کہ جیسے وہ بنا کر جنّت میں چھوڑ دیئے جائیں گے اہلِ جنّت کی خدمت کے لئے، وہ ویسے ہی رہیں گے، اور اُن میں کوئی کسی قسم کا تغیّر نہیں آئے گا، تو اس میں دونوں باتیں ہوں گی کہ دیکھنے سے بھی فرحت ہوگی، اور وہ چست چالاک ہوں گے تو راحت اور آرام بھی زیادہ پہنچائیں گے۔ اور یہاں مفسرین نے لکھا کہ راجح یہی ہے کہ یہ بھی حوروں کی طرح ایک مستقل مخلوق ہے جو اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے جنّت میں جنتیوں کی خدمت کے لئے پیدا کیے جائیں گے (خازن)، اگرچہ بعض نے یہ بھی کہا ہے کہ یہ کفّار کے نابالغ بچے ہیں جو نابالغ ہونے کی حالت میں مرجاتے ہیں، وہ جنتیوں کے خادم ہوں گے، کیونکہ اُن کو جہنّم میں تو بھیجا نہیں جائے گا، جب نابالغ مرگئے مکلّف تو وہ ہوئے نہیں، جائیں گے وہ جنّت میں، لیکن اُن کی حیثیت ثانوی ہوگی کہ وہ اہلِ جنّت کے لئے خادم بنادیئے جائیں گے (مظہری وغیرہ)، یہ قول تفسیروں میں موجود ہے، اور یا یہ مستقل مخلوق ہے۔ بِاَكْوَابٍ وَّاَبَارِيْقَ ۙ وَكَاْسٍ مِّنْ مَّعِيْنٍ: اکواب کُوْب کی جمع ہے جس طرح سے ہمارے ہاں ''کپ'' کہتے ہیں، یہاں اس کا مصداق ایسے ہی ہے جیسے ہمارے ہاں ''گلاس'' ہوتا ہے، جس میں پکڑنے کا حلقہ بھی نہیں لگا ہوا ہوتا، اور اس کی ٹونٹی وغیرہ بھی نہیں ہوتی، اور اباریق ابریق کی جمع ہے، ابریق: لوٹا جس کی ٹونٹی ہو یا جس کا کوئی حلقہ ہو پکڑنے کے لیے۔ اور کاس پیالے کو کہتے ہیں، پیالہ جو بھرا ہوا ہو، ''وہ گھومیں گے اِن کے اُوپر گلاس، لوٹے اور جاری شراب کے پیالے لے کر'' یعنی ان کی خدمت میں آئیں جائیں گے، ضرورت کی چیزیں مہیا کریں گے، لَّا يُصَدَّعُوْنَ عَنْهَا وَلَا يُنْزِفُوْنَ: اب یہ معین کا ذکر جو آگیا، معین سے جاری شراب مراد ہے، جس طرح سے دُوسری جگہ بھی آیا کَاْسًا دِهَاقًا (پ ۳۰، سورۂ نبا) لبریز پیالے، جاری شراب سے لبریز پیالے لے کر وہ آئیں جائیں گے، ''دردِ سر میں مبتلا نہیں کیے جائیں گے اُس شراب کی وجہ سے اور نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا۔'' یعنی دُنیا کے اندر شراب جو لوگ پیتے ہیں، بعض منافع کو پیش نظر رکھ کے، تو اس کے ساتھ ساتھ کچھ تکلیفیں بھی برداشت کرنی پڑتی ہیں، سر چکراتا ہے، سر میں درد ہوجاتا ہے، جسے ''خمار'' کہتے ہیں، اور اسی طرح سے انسان بہکی بہکی باتیں کرنے لگ جاتا ہے، عقل ٹھکانے نہیں رہتی، تو یہ نقصانات جو ہیں شراب میں، یہ وہاں نہیں ہوں گے، ہاں! البتہ سُرور اور لذّت ہوگی، ''اُس شراب کی وجہ سے دردِ سر میں مبتلا نہیں کیے جائیں گے، نہ وہ بے عقل ہوں گے، نہ ان کی عقل میں فتور آئے گا'' وَفَاكِهَةٍ مِّمَّا يَتَخَيَّرُوْنَ: اور وہ لڑکے گھومیں گے ایسے میووں کے ساتھ جن کو وہ جنّتی پسند کریں گے، اُن کی پسند کے میوے لائیں گے، وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ: اور گھومیں گے وہ پرندوں کے گوشت کے ساتھ جس کو وہ جنّتی چاہیں گے، اُن کے چاہنے کے مطابق پرندوں کے گوشت لے کے آئیں گے، اب آپ دیکھیں! کہ ایک اچھی سے اچھی مجلس کا اور ان کی خوش حالی کا یہی نقشہ کھینچا جاسکتا ہے، کہ مزین تخت بچھے ہوئے ہوں، اور ان کے اُوپر ٹیک لگا کر بیٹھے ہوئے ہوں، آپس میں ایک دوسرے کی طرف محبت اور پیار سے دیکھ رہے ہوں، کوئی کسی سے نفرت اور اِعراض کرنے والا نہ ہو، خدام صاف ستھرے چست چالاک بھاگے پھرتے ہوں، اور اس طرح سے مشروبات پیش کر رہے ہیں، ماکولات پیش کر رہے ہیں، اس مجلس کے اندر پھل پیش کیے جارہے ہیں، اور اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کا گوشت پیش کیا جارہا ہے، تو یہ ایک اچھی سے اچھی مجلس کا نقشہ ہے جو ان الفاظ میں کھینچا گیا، تو اللہ تعالیٰ سابقون اوّلون کو اسی قسم کے حالات وہاں دیں گے، اور اس طرح سے ان کی خوش حالی نمایاں ہوگی۔

جنّت مَرد وعورت دونوں کی فطرت کی تکمیل کا مقام ہے!

اور یہ بارہا آپ کے سامنے ذِکر کیا جاچکا کہ انسان کی خوش حالی میں بیوی کا بہت زیادہ دخل ہے، اگر ہر قسم کا ساز وسامان مہیا ہو لیکن خاوند بیوی کا جوڑ نہ ہو، عورت کے لئے اس کا خاوند نہیں، یا خاوند کے لئے عورت مہیا نہیں، تو ایسی صورت میں عیش کی تکمیل نہیں ہوتی، تو جہاں بھی اہلِ جنّت کا ذِکر آتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ اُن کے لیے اَزواج کا ذِکر بھی کرتے ہیں، جس سے خود دُنیا کی عورتوں کا انجام بھی سمجھ میں آجاتا ہے، کہ اللہ تعالیٰ اِن کو بھی اس طرح سے خوش حال کریں گے، اور یوں یہ اپنے خاوند کی نظر میں محبوب ہوں گی۔ جنّت میں اصل میں اللہ تعالیٰ نے ہر اِنسان کی فطرت کی تکمیل کرنی ہے، اس کی فطری خواہش کی تکمیل کرنی ہے، مرد کی فطری خواہش اور قسم کی ہے، عورت کی فطری خواہش اور قسم کی ہے، عورت کی فطری خواہش یہی ہے کہ وہ حسین سے حسین تر ہو اور اس کا لباس بہت عمدہ ہو اور خاوند کی نظر میں محبوبہ ہو، اگر کوئی عورت ہر طرح سے خوش حال ہے، لیکن خاوند اس سے محبت نہیں کرتا تو ایسی عورت کی زندگی بھی جہنّم ہوتی ہے، باقی! عورت اگر صحیح الفطرت ہو تو وہ اپنے اندر غیر کو شریک نہیں کرنا چاہتی، عورت کی فطرت کا تقاضا یہ ہے، مرد میں تو حکومت کا جذبہ ہے، وہ تو کہتا ہے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ میرے ماتحت ہوں، اس لیے تعدّدِ اَزواج مرد کے لئے تو اوّل سے ہی ہے کہ ایک آدمی کئی شادیاں کرسکتا ہے، اُس کی اللہ تعالیٰ نے فطرت اور طبیعت ہی ایسی بنائی ہے۔

عورت کی دُرست فطرت!

لیکن عورت کا مزاج ایسا نہیں، عورت اپنے اندر شرکت کو گوارہ نہیں کرتی بشرطیکہ اُس کا مزاج صحیح ہو، یہ تو آج کل کی بگڑی ہوئی عورتیں ہیں جنہوں نے اس قسم کی باتیں کرنی شروع کردیں، جیسے پچھلے دِنوں کے اندر یہ مطالبہ آیا تھا، جب یہ بل زیرِ بحث تھا کہ ایک مَرد زیادہ شادیاں کرسکتا ہے یا نہیں؟ تو عورتوں کا مطالبہ تھا کہ اگر مَرد کو زیادہ شادیاں کرنے کی اجازت دی جائے تو پھر عورت کو بھی حق دینا چاہیے کہ وہ بھی چار چار خاوند کرلے، تو یہ مطالبہ کرنے والی تو ایسی ہیں جنہوں نے چار چار نہیں چالیس چالیس رکھے ہوئے ہوتے ہیں، وہ تو صرف اُن کے لئے قانونی جواز پیدا کرنے کے لیے ایسی باتیں کرتی تھیں، یہ پہلے ایک پر کب اکتفا کرتی ہیں جواب مطالبہ کرتی ہیں کہ چار چار ہونے چاہئیں! بات سمجھ میں آرہی ہے یا نہیں آرہی؟ یہ ہیں بگڑی ہوئی عورتیں جن کی فطرت مسخ ہوگئی، جن کا شریف معاشرے کے اندر کوئی کسی قسم کا مقام نہیں، ورنہ عورت کی خوبی یہی ہے کہ اس کی نظر ایک خاوند پہ بند ہو، دُوسرا اس کی طرف نظر اُٹھا کے بھی نہ دیکھے، جیسے کہ قٰصِرٰتُ الطَّرْفِ اور مَّقْصُوْرٰتٌ فِي الْخِيَامِ کے تحت نقل کیا گیا تھا، تو عورت کی جنّت یہی ہے کہ اُس کو حسین سے حسین تر بنادیا جائے گا، اعلیٰ سے اعلیٰ اُس کا لباس ہوگا، خاوند کی نظر میں محبوبہ ہوگی۔

عورت کے لئے جنّت کی نعمتوں کا الگ ذِکر کیوں نہیں؟

کھانے پینے میں اور رہنے سہنے میں جس قسم کی مرد کو سہولتیں حاصل ہوا کرتی ہیں، آپ جانتے ہیں کہ بیوی ساتھ ہی

شریک ہوا کرتی ہے، اس لیے ان کے لیے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں، ایک آدمی کا خوش حال ہونا یہی ضمانت ہوتی ہے کہ اُس کی بیوی بھی خوش حال ہے، اگر ایک آدمی مال دار ہے تو اس کے گھر میں اس کی محبوبہ بیوی جو ہے، وہ اسی طرح سے مال دار ہے، اگر وہ گھر میں اچھا کھاتا پیتا ہے تو اس کے ساتھ اس کی بیوی بھی ویسے ہی اچھا کھاتی پیتی ہے، اس لیے عورتوں کے لیے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت ہی نہیں، کہ اُن کے لئے باغات ہوں گے اور ان کے لئے محلات ہوں گے، جب انہوں نے ان محلات میں ہی رہنا ہے تو باغات بھی ان کے لیے ہو گئے اور محلات بھی ان کے لیے ہو گئے۔ عورت کی معاشیات مرد کی ساتھ ہی متعلق ہوا کرتی ہیں، جس قسم کی مرد کی معاشیات ہوتی ہیں ویسی عورت کی ہوتی ہیں، اس لیے ان کے لئے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کہے کہ نیک عورتوں کو میں باغات میں رکھوں گا، محلات میں رکھوں گا، ان کا تو مقام ہی محلات ہیں، وہ تو محلات میں ہوں گی، ہاں! البتہ ان کی ایک فطرت کا جو تقاضا ہے کہ وہ خوبصورت سے خوبصورت تر ہوں، زیورات وافر مقدار میں ان کے پاس موجود ہوں، اچھے سے اچھا لباس ہو، اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ خاوند کی نظر میں محبوبہ ہوں، یہ نعمتیں اُن کو حاصل ہوں گی۔ اور پھر خاوند اور بیوی کے مزاج میں یکسانیت ہوگی، کوئی کسی قسم کا اختلاف نہیں ہوگا، وہ اس سے محبت کرے گی، وہ اس سے محبت کرے گا، جس کے ساتھ زندگی عیش و عشرت میں اپنی اِنتہا کو پہنچ جائے گی۔ تو دُنیا کے اندر رہتے ہوئے اچھی سے اچھی زندگی اگر سوچی جاسکتی ہے تو اس کے خدوخال یہی ہیں، اس کے حدود قیود یہ ہیں جو آپ کے سامنے ذکر کیے جارہے ہیں، تو جنتیوں کے لیے وہی نقشہ کھینچا جاتا ہے، اس لیے آگے ان کی ازواج کا ذکر بھی آ گیا۔

جنتی عورت کا حُسن و جمال

وَحُوْرٌ عِيْنٌ: اور ان کے لئے حورعین ہوں گی، یہ لفظ کئی دفعہ گزر گیا، گوری گوری عورتیں، موٹی موٹی آنکھوں والی، عِيْنٌ عيناء کی جمع، حُوْرٌ حوراء کی جمع، كَاَمْثَالِ اللُّؤْلُؤِ الْمَكْنُوْنِ: جیسے کہ چھپا کے رکھے ہوئے موتی ہوں، یہ اُن کی صفائی اور پاکیزگی کا ذکر ہے، اور یہاں بھی تشبیہ انہی موتیوں کے ساتھ ہے جو کہ چھپا کر رکھے ہوئے ہوں، کیونکہ موتیوں کی آب و تاب تبھی باقی ہوتی ہے کہ وہ ڈبیہ میں بند رہیں، اور اگر موتیوں کو ڈبیہ سے باہر نکال دیا جائے تو باہر کا گرد وغبار اُن کی خوبصورتی میں فرق ڈال دیتا ہے، اسی طرح سے عورت کی خوبی بھی اسی میں ہے کہ اُس کو بھی موتیوں کی طرح اور جواہرات کی طرح چھپا کر ہی رکھا جائے، غیروں کی نظریں جب اُٹھنے لگ جایا کرتی ہیں تو عورت کا حُسن و جمال بوسیدہ ہو جاتا ہے، اُس کی پھر کوئی خوبی نہیں رہتی، اس لیے تشبیہ اگر دی گئی ہے تو لؤلؤ مکنون کے ساتھ ہی دی گئی ہے، ''چھپا کے رکھے ہوئے موتیوں کی طرح'' جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ: بطور بدلے کے اُن کاموں کے جو وہ کیا کرتے تھے، یعنی يُجْزَوْا جزاءً، بطور بدلے کے دی جائیں گی یہ ساری کی ساری چیزیں اُن کاموں کے جو کہ وہ کیا کرتے تھے۔

جنت میں کسی قسم کی خرافات نہیں ہوں گی

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا: نہیں سنیں گے یہ لوگ اُس جنت کے اندر کوئی بیہودہ بات وَلَا تَاْثِيْمًا: اور نہ کوئی گناہ کی چیز، تاثیم:

گناہ گار قرار دینا، یعنی ایسی بات نہیں سنیں گے جو اِنسان کو گناہ گار قرار دینے والی ہوتی ہے، نہ ایک دُوسرے کے اُوپر تہمت لگائیں گے، نہ کوئی لغو اور بے ہودہ بات، دُنیا کے اندر سُن لی جو بک بک لوگوں کی سُنی تھی، جنت میں جانے کے بعد کوئی کسی قسم کی خرافات سننے میں نہیں آئے گی، اِلَّا قِیلًا سَلٰمًا سَلٰمًا: مگر کہنا سلام سلام، ہر طرف سے ''سلام سلام'' کا قول ہی یہ سنیں گے، اللہ تعالیٰ کی طرف سے ''سلام'' کہا جائے گا، فرشتوں کی طرف سے ''سلام'' کہا جائے گا، جنتی آپس میں ایک دوسرے کو ''سلام'' کہیں گے، سلامتی کی باتیں، خیریت کی باتیں، ایسی ہی سامنے آئیں گی، کوئی لغو اور بیہودہ چیز سامنے نہیں آئے گی۔

''اَصحابِ یمین'' کے لیے جنت کی نعمتیں

وَاَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ: اور دائیں طرف والے مَآ اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ: کیا ہی اچھے ہوں گے دائیں طرف والے، فِیْ سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ: سِدر بیری کو کہتے ہیں، مخضود: جس کے کانٹا نہ ہو، بے خار بیریاں، تو بیر بھی عرب کے اندر معلوم ہوتا ہے کہ کوئی محبوب پھل ہے، ہمارے ہاں بھی بیر ہوتے ہیں لیکن چونکہ وہ بہت زیادہ اعلیٰ قسم کے نہیں ہوتے تو عام طور پر لوگ ان کو رغبت سے نہیں کھاتے، اور بیری کا ذکر یہاں بھی ہے سِدْرٍ مَّخْضُوْدٍ، اور سورۂ نجم میں بھی آپ کے سامنے گزرا تھا سِدْرَۃِ الْمُنْتَہٰی، آسمانوں کے اُوپر جہاں نچلا عالم ختم ہوتا اور عالمِ بالا شروع ہوتا ہے تو اس نقطۂ اِتصال پر بھی اللہ تعالیٰ نے بیری کا درخت ہی بنایا، اور اس کے پھلوں کا ذکر بھی ہے، معلوم ہوتا ہے کہ اس کو خاصی اہمیت حاصل ہے بیری کو۔ قرآنِ کریم میں تو مذکور نہیں، البتہ بعض تفسیری روایات میں ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے تجلی ہوئی تھی طور پر، جو موسیٰ علیہ السلام سے اللہ تعالیٰ کی کلام ہوئی تھی جس درخت پر نُوْدِیَ مِنْ شَاطِئِ الْوَادِ الْاَیْمَنِ فِی الْبُقْعَۃِ الْمُبٰرَکَۃِ مِنَ الشَّجَرَۃِ (سورۂ قصص: ۳۰)، تو بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جو شجرہ تھا وہ بھی بیری ہی تھی۔ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کلام، وہ بھی بیری کے پاس ہوئی سدرۃ المنتہیٰ پر، اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی کلام وہ بھی سدرۃ کی وساطت سے ہوئی، تو اِس کی کوئی اہمیت معلوم ہوتی ہے، تو مخضود: جس میں کانٹا نہ ہو، جتنا کانٹا بیری میں زیادہ ہوتا ہے اتنا اس کے پھل کی لطافت میں فرق ہوتا ہے، اور جتنا اس کا پھل اچھا ہوگا اتنا ہی وہ درخت بے خار ہوگا، ''ایسی بیریاں جن میں کانٹا نہیں'' وَّطَلْحٍ مَّنْضُوْدٍ: کیلا تہہ بہ تہہ رکھا ہوا، منضود: پیچھے لفظ آیا تھا سورۂ قٓ میں نَضِیْدٌ، تو نَضِیْد اور منضود ایک ہی چیز ہے، ''تہہ بہ تہہ کیلے میں'' وَّظِلٍّ مَّمْدُوْدٍ: اور پھیلائے ہوئے سائے میں، لمبے لمبے سائے ہوں گے، وَّمَآءٍ مَّسْکُوْبٍ: بہائے ہوئے پانی میں، سَکَب بہانے کو کہتے ہیں، ''مختصر المعانی'' میں آپ نے پڑھا: ''وَتَسْکُبُ عَیْنَایَ الدُّمُوْعَ لِتَجْمُدَا'' ...... وَّفَاکِھَۃٍ کَثِیْرَۃٍ: اور بہت سارے پھل میں، لَّا مَقْطُوْعَۃٍ وَّلَا مَمْنُوْعَۃٍ: نہ وہ پھل قطع کیا ہوا ہوگا نہ منع کیا ہوا ہوگا۔ قطع کیا ہوا نہیں ہوگا کا مطلب یہ ہے کہ پھل ختم نہیں ہوگا، جس طرح سے دُنیا کے پھل ایک موسم میں ہوتے ہیں، دُوسرے موسم میں نہیں ہوتے، تو وہ پھل مقطوعہ نہیں ہے بلکہ دائمی ہے، اور اسی طرح سے دُنیا کے اندر باغات میں پھل توڑنے کی ممانعت ہوتی ہے، وہاں کوئی روک ٹوک نہیں ہوگی، جس طرح سے چاہیں گے جنتی کھاتے رہیں گے، وَّفُرُشٍ مَّرْفُوْعَۃٍ: اور اُونچے اُونچے بستر، فُرُش فِراش کی جمع ہے، فراش بستر کو کہتے

ہیں، اُونچا ہونا بایں معنی کہ اُونچے اُونچے درجوں میں بچھے ہوئے ہوں گے، اُونچی اُونچی چار پائیوں پر اور تختوں پر بچھے ہوں گے، اور خود وہ بستر بھی بڑے موٹے موٹے ہوں گے جن کی بنا پر وہ اُونچے معلوم ہوں گے۔ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً: اب یہ "هُنَّ" کی ضمیر یہاں پھر انہی عورتوں کی طرف لوٹ گئی جو جنتیوں کو ملیں گی، پیچھے عورتوں کا ذکر نہیں ہے، ضمیر لوٹا دی گئی، پیچھے اَصْحٰبُ الْیَمِیْنِ میں عورتوں کا ذکر نہیں آیا، تو یہاں مفسرین کہتے ہیں کہ جب ان کے کھانے پینے، رہنے سہنے اور خوش حالی کا ذکر آیا، خاص طور فرش مرفوعہ کا، تو اس سے خود بخود ذہن بیویوں کی طرف منتقل ہو جاتا ہے، کیونکہ عربی میں فراش یہ خود کنایہ ہوتا ہے بیوی سے، اَلْوَلَدُ لِلْفِرَاش، تو جس وقت رہنے سہنے لیٹنے بستر وغیرہ کا ذکر آیا تو خود بخود ذہن منتقل ہو جاتا ہے، تو اس لیے آگے ان کا تعارف کرا دیا گیا کہ جنت میں جو عورتیں ہوں گی ہم ان کو ایک خاص طریقے سے پیدا کریں گے، اُٹھائیں گے، "اُٹھائیں گے ہم ان کو اُٹھانا ایک خاص طریقے سے" یعنی اُن کی خلقت بہت خاص طریقے سے ہوگی، فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا: یہ اسی کی تفصیل ہے، بنائیں گے ہم اُن کو اَبکار، اَبکار بِکر کی جمع، کنواری، یعنی اُن کی وہی کیفیت ہوگی جس طرح سے کنواری لڑکیوں کی ہوا کرتی ہے، عُرُبًا: یہ عَرُوب کی جمع، عروب کے مصداق میں ذکر کیا ہے کہ جو خاوند سے محبت کرنے والی ہوگی اور خود خاوند کی محبوبہ ہوگی، یہ لفظ ذوجہتین ہے، خاوند سے محبت کرے گی اور خاوند کی محبوبہ ہوگی، دونوں طرف سے محبت قائم ہوگی، اَتْرَابًا: یہ تِرب کی جمع ہے، ہم عمر کو کہتے ہیں، تو اَتْرَابًا کا معنی ہم عمر، ہم عمر کا یہ معنی بھی ہو سکتا ہے کہ جنتیوں کے ساتھ عمر کا تناسب رکھیں گی، مردوں کے ساتھ اپنے خاوندوں کے ساتھ اُن کی عمر کا تناسب ہوگا، ہم عمر ہوں گی، ہم عمر سے مراد یہ ہے کہ جیسے خاوند بیوی میں عمر کا تناسب ہوتا ہے، اور یہ بھی مراد ہو سکتا ہے کہ وہ عورتیں آپس میں ہم عمر ہوں گی، یعنی آپس میں ایک جیسی ہوں گی، ہم عمر ہوں گی، جس کی بنا پر رقابت یا مسابقت، منافست ان کے اندر نہیں پیدا ہوگی، کیونکہ ان کے درمیان میں کوئی کسی قسم کا فرق ہی نہیں ہوگا، دُنیا کے اندر ایک خاوند کو اگر چند بیویاں مل جاتی ہیں تو اُن کے درمیان میں گڑبڑ کی وجہ کچھ یہ بھی ہوتی ہے کہ کوئی زیادہ خوبصورت ہوئی، کوئی کم خوبصورت ہوئی، کسی کے حالات کیسے، کسی کے کیسے، کوئی بڑی عمر کی، کوئی چھوٹی عمر کی، جس کی بنا پر خاوند کے مزاج پر اُن کے اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں، لیکن جب جنت کی عورتیں ہوں گی ہی ساری ہم عمر، ہم جھولی، اور کوئی کسی قسم کا تفاوت نہیں ہوگا، تو اس قسم کے اثرات بھی نمایاں نہیں ہوں گے۔
لِّاَصْحٰبِ الْیَمِیْنِ: یہ سب کچھ اصحاب یمین کے لیے ہوگا۔

تو اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں چاہے وہ بوڑھی تھیں، سفید بال والی تھیں، دانت ان کے جھڑ گئے تھے، بدشکل تھیں، کسی قسم کی تھیں، لیکن وہاں جا کر ہم اُن کا اُٹھان ایک عجیب طریقے سے کریں گے جس کی بنا پر وہ ساری ایک جیسی ہو جائیں گی، تو یہ کیفیات ختم ہو جائیں گی جن کی بنا پر عورت کسی درجے میں غیر مرغوبہ ہوتی ہے، حدیث شریف میں آتا ہے کہ سرورِ کائنات ﷺ نے ایک دفعہ ایک بوڑھی سے کہا تھا، حضور ﷺ کے مزاح کے واقعات میں ہے، کہ آپ ﷺ نے ایک بوڑھی سے کہا تھا کہ بوڑھیاں جنت میں نہیں جائیں گی، وہ بیچاری رونے لگ گئی، وہ یہ سمجھی کہ شاید دُنیا میں جو بوڑھی ہو وہ آخرت میں جنت

میں نہیں جائے گی، تو جب رسول اللہ ﷺ کو معلوم ہوا تو آپ ﷺ نے اس کو کہا کہ تُو نے قرآنِ کریم نہیں پڑھا؟ اور یہی آیت آپ ﷺ نے پڑھی اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً [1] جس سے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ میرا مطلب یہ تھا کہ بوڑھی بوڑھی ہونے کی حیثیت سے جنّت میں نہیں جائے گی، اللہ تعالیٰ اس کو جوان لڑکی کی طرح بنائیں گے پھر اس کو جنّت میں بھیجیں گے۔ تو دُنیا کے اندر کوئی کیفیت ہو......! اس لیے دُنیا میں جو بیویاں ہیں، جو اپنے خاوند کے ساتھ رہنا چاہیں گی اور خاوند کے ساتھ اُن کا جوڑ ہے، تو ان کو اسی طرح سے بنا دیا جائے گا، یہی کیفیت جنّتی عورتوں کی اُن کے اُوپر طاری ہو جائے گی۔ تو اس سے عورتوں کے انجام کی طرف بھی اشارہ ہو گیا، کہ نیک بیویاں جو ہیں، نیک عورتیں، وہ جنّت میں کس حیثیت سے ہوں گی۔ تو یہ عام طور پر لوگ سوال کیا کرتے ہیں کہ مَردوں کا ذِکر تو آتا ہے کہ مَردوں کو یہ ملے گا، یہ ملے گا، مگر عورتوں کو کیا ملے گا؟ تو اس کی وضاحت یہاں ہو گئی۔

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۹﴾ وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۰﴾ وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ ۙ مَآ

(اصحاب الیمین کی) ایک جماعت اوّلین میں سے ہوگی ﴿۳۹﴾ اور ایک جماعت آخرین میں سے ہوگی ﴿۴۰﴾ اور بائیں طرف والے، کیا ہی

اَصْحٰبُ الشِّمَالِ ﴿۴۱﴾ فِيْ سَمُوْمٍ وَّحَمِيْمٍ ﴿۴۲﴾ وَّظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ ﴿۴۳﴾ لَّا

بُرے حال میں ہوں گے بائیں طرف والے ﴿۴۱﴾ لُو میں ہوں گے اور گرم پانی میں ہوں گے ﴿۴۲﴾ اور دُھوئیں کے سائے میں ہوں گے ﴿۴۳﴾ نہ

بَارِدٍ وَّلَا كَرِيْمٍ ﴿۴۴﴾ اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِيْنَ ﴿۴۵﴾ وَكَانُوْا يُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ

وہ سایہ ٹھنڈا ہوگا، نہ کسی قسم کا نفع بخش ہوگا ﴿۴۴﴾ بے شک یہ لوگ اس سے پہلے خوش حال تھے ﴿۴۵﴾ وہ ایک بہت بڑے گناہ پر اصرار کرتے

الْعَظِيْمِ ﴿۴۶﴾ وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ ۙ اَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا وَّعِظَامًا ءَاِنَّا

تھے ﴿۴۶﴾ اور کہا کرتے تھے کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی اور ہڈیاں ہوجائیں گے، تو کیا پھر ہم

لَمَبْعُوْثُوْنَ ﴿۴۷﴾ اَوَ اٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ ﴿۴۹﴾

اُٹھائے جائیں گے؟ ﴿۴۷﴾ کیا ہمارے پہلے آباء بھی؟ ﴿۴۸﴾ آپ کہہ دیجئے کہ بے شک پہلے لوگ اور پچھلے لوگ ﴿۴۹﴾

لَمَجْمُوْعُوْنَ ۙ اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ ﴿۵۰﴾ ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ

البتہ اکٹھے کئے جائیں گے ایک معلوم دن کے وقت کی طرف ﴿۵۰﴾ پھر بے شک تم اے گمراہو!

(1) شمائل ترمذی، باب ما جاء فی صفة مزاح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم / نیز مشکوٰة ۲/۴۱۶، باب المزاح، فصل ثانی۔

الْمُكَذِّبُونَ ﴿٥١﴾ لَآكِلُونَ مِن شَجَرٍ مِّن زَقُّومٍ ﴿٥٢﴾ فَمَالِئُونَ مِنْهَا الْبُطُونَ ﴿٥٣﴾

اے جھٹلانے والو!﴿۵۱﴾ زقوم کے درخت سے تم کھانے والے ہوگے﴿۵۲﴾ بھرنے والے ہوگے اس سے پیٹوں کو﴿۵۳﴾

فَشَارِبُونَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيمِ ﴿٥٤﴾ فَشَارِبُونَ شُرْبَ الْهِيمِ ﴿٥٥﴾ هَٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ

پھر پینے والے ہوگے اُس کے اُوپر گرم پانی﴿۵۴﴾ پھر پیو گے پیاسے اُونٹوں کی طرح پینا﴿۵۵﴾ یہی ہے اُن کی مہمانی قیامت

الدِّينِ ﴿٥٦﴾ نَحْنُ خَلَقْنَاكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُونَ ﴿٥٧﴾ أَفَرَأَيْتُم مَّا تُمْنُونَ ﴿٥٨﴾ أَأَنتُمْ

کے دن﴿۵۶﴾ ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تم کیوں تصدیق نہیں کرتے؟﴿۵۷﴾ کیا پھر تم نے دیکھا؟ جو کچھ تم ٹپکاتے ہو﴿۵۸﴾ کیا تم

تَخْلُقُونَهُ أَمْ نَحْنُ الْخَالِقُونَ ﴿٥٩﴾ نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوقِينَ ﴿٦٠﴾

اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟﴿۵۹﴾ ہم نے مقدر کیا تمہارے درمیان موت کو، اور ہم مسبوق نہیں ہیں﴿۶۰﴾

عَلَىٰ أَن نُّبَدِّلَ أَمْثَالَكُمْ وَنُنشِئَكُمْ فِي مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٦١﴾

(بلکہ ہم قادر ہیں) اس بات پر کہ بدل لائیں ہم تم جیسوں کو، اور بنا دیں تمہیں کسی اور حال میں جس کو تم جانتے نہیں ہو﴿۶۱﴾

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْأَةَ الْأُولَىٰ فَلَوْلَا تَذَكَّرُونَ ﴿٦٢﴾ أَفَرَأَيْتُم مَّا تَحْرُثُونَ ﴿٦٣﴾

پہلی مرتبہ پیدا کرنا تم نے جان لیا، تم اس سے نصیحت کیوں نہیں حاصل کرتے؟﴿۶۲﴾ کیا پھر دیکھا تم نے؟ جو تم کھیتی بوتے ہو﴿۶۳﴾

أَأَنتُمْ تَزْرَعُونَهُ أَمْ نَحْنُ الزَّارِعُونَ ﴿٦٤﴾ لَوْ نَشَاءُ لَجَعَلْنَاهُ حُطَامًا فَظَلْتُمْ

کیا تم اُس کو اُگاتے ہو یا ہم اس کو اُگانے والے ہیں؟﴿۶۴﴾ اگر ہم چاہتے تو کر دیتے اُس کو چورا چورا، پھر ہو جاتے تم

تَفَكَّهُونَ ﴿٦٥﴾ إِنَّا لَمُغْرَمُونَ ﴿٦٦﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُومُونَ ﴿٦٧﴾ أَفَرَأَيْتُمُ الْمَاءَ الَّذِي

باتیں بناتے﴿۶۵﴾ بے شک ہم البتہ تاوان ڈال دیئے گئے﴿۶۶﴾ بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم ہو گئے﴿۶۷﴾ کیا پھر دیکھا تم نے اس پانی کو جس کو

تَشْرَبُونَ ﴿٦٨﴾ أَأَنتُمْ أَنزَلْتُمُوهُ مِنَ الْمُزْنِ أَمْ نَحْنُ الْمُنزِلُونَ ﴿٦٩﴾ لَوْ نَشَاءُ

تم پیتے ہو؟﴿۶۸﴾ کیا تم اس کو بادل سے اتارتے ہو یا ہم اس کو اُتارنے والے ہیں؟﴿۶۹﴾ اگر ہم چاہتے تو

جَعَلْنَاهُ أُجَاجًا فَلَوْلَا تَشْكُرُونَ ﴿٧٠﴾ أَفَرَأَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُورُونَ ﴿٧١﴾ أَأَنتُمْ

اس کو کڑوا بنا دیتے، پھر تم کیوں نہیں شکر کرتے؟﴿۷۰﴾ کیا پھر دیکھا تم نے اس آگ کو جس کو تم جلاتے ہو؟﴿۷۱﴾ اس آگ کے

ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَاۤ اَمْ نَحْنُ الْمُنْشِـُٔوْنَ ۝ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً وَّ مَتَاعًا لِّلْمُقْوِیْنَ ۝

درخت کو تم نے پیدا کیا؟ یا ہم اس کو پیدا کرنے والے ہیں؟۝ ہم نے اس آگ کو تذکرہ بنایا اور مسافروں کے لئے نفع کی چیز بنایا۝

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ۝

پس پاکی بیان کر تو اپنے رب کے عظمت والے نام کی۝

تفسیر

ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ، وَثُلَّةٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ: اصحاب الیمین کی ایک جماعت اوّلین میں سے ہوگی اور ایک جماعت آخرین میں سے ہوگی، اس کا وہی مطلب ہے جو پہلے ثُلَّةٌ مِّنَ الْاَوَّلِیْنَ ۝ وَقَلِیْلٌ مِّنَ الْاٰخِرِیْنَ کے اندر ذکر کر دیا گیا۔ تو سرورِ کائنات ﷺ کی اُمت کے ہی اوّلین اور آخرین مراد ہوں، کہ اصحاب الیمین یعنی عام مؤمنین جو اللہ تعالیٰ کے ہاں مغفور ہوں گے وہ پہلے لوگوں میں بھی زیادہ ہیں اور پچھلوں میں بھی زیادہ ہیں، اور آدم علیہ السلام سے لے کر حضور ﷺ تک بھی ان کی کثیر تعداد ہے، اور حضور ﷺ سے لے کر آگے قیامت تک آپ ﷺ کی اُمت میں بھی ان کی کثیر تعداد ہے، تو پھر یہ کثرت کی طرف تو اِشارہ ہو گیا، لیکن کثرت میں تناسب کیا ہوگا؟ وہ تناسب یہی ہے کہ مجموعی طور پر حضور ﷺ کی اُمت زیادہ ہے، جیسے میں نے اِبتدا میں تفصیل عرض کر دی۔

''اَصحابِ شمال'' کی بدحالی

وَاَصْحٰبُ الشِّمَالِ: اور بائیں طرف والے مَاۤ اَصْحٰبُ الشِّمَالِ: کیا ہیں وہ بائیں طرف والے، یعنی کیا ہی بُرا حال ہوگا اُن کا! یہ اِستفہام بھی بطورِ تعجب کے ہے، اتنا بُرا حال ہوگا کہ کیا لفظوں میں ذکر کریں، کیا کہنے ان کے! ''بائیں طرف والے، کیا ہی بُرے حال میں ہوں گے بائیں طرف والے!'' فِیْ سَمُوْمٍ وَّحَمِیْمٍ: سموم گرم ہوا کو کہتے ہیں، اور حمیم گرم پانی کو کہتے ہیں، یعنی لُو میں ہوں گے اور گرم پانی میں ہوں گے، بہت گرم ہوا انہیں لگ رہی ہوگی، کسی طرف سے ٹھنڈی ہوا کا جھونکا اُن کو نہیں آئے گا۔ ''اور دُھوئیں کے سائے میں ہوں گے'' یہاں وہ خوشگوار سایہ نہ ہوگا جس سائے میں بیٹھ کر اِنسان ٹھنڈک محسوس کرتا ہے یا اس کے مزاج کے اُوپر وہ اچھے اثرات ڈالتا ہے، ایسا نہیں، ''دُھوئیں کے سائے میں ہوں، نہ وہ سایہ ٹھنڈا ہوگا نہ کسی قسم کا نفع بخش ہوگا'' سائے کے جیسے منافع ہوا کرتے ہیں اس میں کوئی کسی قسم کا نفع نہیں پایا جائے گا۔

''اَصحابِ شمال'' عذاب میں کیوں ہوں گے؟

اِنَّهُمْ كَانُوْا قَبْلَ ذٰلِكَ مُتْرَفِیْنَ: بے شک یہ لوگ اس سے پہلے خوش حال تھے، دُنیا میں خوش حال تھے تو آخرت میں جا کر بدحال ہو گئے، کیونکہ خوش حالی کا انہوں نے شکر اَدا نہیں کیا بلکہ كَانُوْا یُصِرُّوْنَ عَلَى الْحِنْثِ الْعَظِیْمِ: دُنیا کے اندر وہ ایک بہت بڑے

گناہ پر اِصرار کرتے تھے، اور اِس بڑے گناہ سے مراد شرک ہے، یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ اللہ نے ان کو خوش حال کیا تو شکر ادا کرتے ہوئے اللہ کی وحدانیت کا عقیدہ رکھتے، شکر گزار ہوتے، ایسا نہیں، وہ ایک بڑے گناہ کے اُوپر اِصرار کرتے تھے، تو یہ شرک ہو گیا، توحید کے منکر تھے، اور آگے آگیا کہ آخرت کے بھی منکر تھے، یہ ان کے جرموں کی طرف اشارہ کردیا گیا جن جُرموں کی بنا پر آخرت میں یہ معذّب ہوں گے، وَكَانُوْا يَقُوْلُوْنَ: کہا کرتے تھے أَئِذَا مِتْنَا وَكُنَّا تُرَابًا: کیا جس وقت ہم مرجائیں گے اور مٹی ہوجائیں گے وَّعِظَامًا: اور ہڈیاں ہوجائیں گے ءَاِنَّا لَمَبْعُوْثُوْنَ: تو کیا پھر ہم اُٹھائے جائیں گے؟ وہ یوں کہا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ کا دِیا ہوا کھاتے تھے اور کھا کر پھر یوں غراتے تھے کہ کیا ہم پھر بھی اُٹھائے جائیں گے؟ اَوَاٰبَآؤُنَا الْاَوَّلُوْنَ: کیا ہمارے پہلے آباء بھی؟ قُلْ اِنَّ الْاَوَّلِيْنَ وَالْاٰخِرِيْنَ: آپ کہہ دیجئے کہ بے شک پہلے لوگ اور پچھلے لوگ لَمَجْمُوْعُوْنَ: البتہ اکٹھے جائیں گے اِلٰى مِيْقَاتِ يَوْمٍ مَّعْلُوْمٍ: ایک معلوم دِن کے وقت کی طرف جمع کیے ہوئے ہیں، یعنی اوّلین آخرین سب کو اللہ تعالیٰ موت کے دروازے سے گزار گزار کر ایک وقتِ معلوم کی طرف لیے جارہا ہے، سب اکٹھے کیئے ہوئے ہیں۔

جہنّم میں جہنمیوں کی غذا

ثُمَّ اِنَّكُمْ اَيُّهَا الضَّآلُّوْنَ الْمُكَذِّبُوْنَ: پھر تم اے گمراہو! اے جھٹلانے والو! ان دونوں لفظوں کے اندر اُن کی شخصیت ظاہر کردی کہ بھٹکے ہوئے ہیں، اُن کے عقیدے صحیح نہیں، نظریات صحیح نہیں، اُن کا عمل صحیح نہیں، مُکَذِّبُوْن ہیں، اللہ کے رسولوں کی تکذیب کرنے والے تھے، اللہ کی باتوں کو جھٹلانے والے تھے، ''اے گمراہو! اور اے جھٹلانے والو! تم البتہ کھانے والے ہو درخت سے جو کہ زَقوم ہے'' زَقُّوم کے درخت سے تم کھانے والے ہوگے، تمہیں کھانے کے لئے شجرۂ زَقوم دیا جائے گا، اِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّوْمِ ۝ طَعَامُ الْاَثِيْمِ ۝ كَالْمُهْلِ ۚ يَغْلِيْ فِي الْبُطُوْنِ ۝ كَغَلْيِ الْحَمِيْمِ (سورۂ دُخان) یہ پہلے بھی اِس کا ذِکر آیا تھا، زَقوم یہ ہمارے ہاں جس طرح سے تھوہڑ کا درخت ہے، اسی قسم کا کوئی کانٹے دار، بدبودار اور بدذائقہ درخت ہے، عرب کے اندر یہ پایا جاتا ہے، اس لیے ترجمہ یہاں حضرت (شیخ الہندؒ) نے درخت سینڈھ کے ساتھ کیا ہے، ہمارے ہاں اِس کو ''تھوہڑ'' ہی کہتے ہیں، کانٹے دار، بدذائقہ، بدمزہ اور تکلیف دِہ ہوتا ہے۔ وہ درخت کھانے کے لئے دیا جائے گا، فَمَالِئُوْنَ مِنْهَا الْبُطُوْنَ: جب بھوک لگی ہوئی ہوگی اور کچھ نہ ملے گا تو اسی کے ساتھ ہی پیٹوں کو بھرنے والے ہوں گے، پھر وہ پیٹ میں جا کر سوزش جو پیدا کرے گا تو پھر پانی مانگیں گے فَشٰرِبُوْنَ عَلَيْهِ مِنَ الْحَمِيْمِ: پھر پینے والے ہوں گے اُس کے اُوپر گرم پانی، فَشٰرِبُوْنَ شُرْبَ الْهِيْمِ: ھیم یہ اَھْيَمُ کی جمع ہے اور اھیم کہتے ہیں اس اُونٹ کو جس کو ھُیام کی بیماری ہوجائے، ھُیام یہ ایسے ہی ہے جس طرح سے کہ انسانوں کو اِستسقاء ہوجاتا ہے، جیسے اِنسانوں کو اِستسقاء ہوجائے تو پیاس نہیں بجھتی، جتنا پانی چاہے اِنسان پیتا چلا جائے، تو اسی طرح سے یہ بیماری ہے ھُیام جو اُونٹوں کو ہوتی ہے تو اس کے بعد اُن کی بھی پیاس نہیں بجھتی، عام طور پر مترجمین نے یہاں ''تونسے'' کا لفظ استعمال کیا ہے ''تونسے ہوئے اُونٹ''، کہتے ہیں ''تونسہ'' اس بیماری کو کہتے ہیں جس میں پیاس نہیں بجھتی جو اُونٹوں کو لگتی ہے، یہاں حضرت (شیخ الہندؒ) نے بھی یہی

لفظ استعمال کیا ہے "جیسے پئیں اُونٹ تونسے ہوئے"، "پیو گے اس کے اُوپر پیاسے اُونٹوں کی طرح پینا" یعنی جس طرح سے پیاسا اُونٹ دھڑا دھڑ پانی پیتا ہے لیکن اس کی پیاس نہیں بجھتی، یہ بھی ایسے ہی پئیں گے، هٰذَا نُزُلُهُمْ يَوْمَ الدِّيْنِ: یہی ہے اُن کی مہمانی قیامت کے دِن، جزا کے دِن ان کی یہی مہمانی ہوگی۔

اِثباتِ توحید و معاد کے لئے تخلیقِ اِنسانی کا ذِکر

نَحْنُ خَلَقْنٰكُمْ فَلَوْلَا تُصَدِّقُوْنَ: اب دلیل کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے توحید اور معاد کے لئے، "ہم نے تمہیں پیدا کیا پھر تم کیوں تصدیق نہیں کرتے؟" یعنی ہم نے تمہیں پیدا کیا، اپنی خِلقت کو دیکھو! کس طرح سے تمہیں بنایا گیا، تو اس سے دونوں باتیں ہی سمجھ میں آسکتی ہیں، اللہ کی توحید اور اس کی رُبوبیت بھی، اور آخرت کا اِمکان بھی، تم جو کہتے ہو کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیسے کیئے جائیں گے؟ اس لیے تم قیامت کی تصدیق نہیں کرتے، تو تم اپنی خِلقت کو نہیں دیکھتے کہ ہم نے تمہیں بنایا؟ اس میں اگر غور کرو تو یہ بات تمہاری سمجھ میں آسکتی ہے، تو تُصَدِّقُوْنَ میں دونوں باتیں آجائیں گی، توحید کی اور معاد کی تم کیوں تصدیق نہیں کرتے؟ اب اس خِلقت کا کچھ تھوڑا سا نقشہ سمجھایا جا رہا ہے اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تُمْنُوْنَ: بتلاؤ تم، جو کچھ تم ٹپکاتے ہو، یعنی تمہارا زیادہ سے زیادہ ظاہری طور پر عمل اور فعل یہ ہے کہ تم پانی کا ایک قطرہ عورت کے رحم میں ٹپکا دیتے ہو، باقی! اُس کے بعد اس پہ کیا حالات طاری ہوتے ہیں، کس طرح سے اللہ تعالیٰ اسے خون بناتا ہے، گوشت بناتا ہے، پھر ہڈیاں پیدا کرتا ہے، پھر اُس میں رُوح پھونکتا ہے، اور رُوح پھونکنے کے ساتھ ساتھ اس میں سمع، بصر اور سوچنے کی قوتیں پیدا کی جاتی ہیں، کس طرح سے مشینری اندر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے ساتھ ہی چل رہی ہے، تمہیں کچھ پتا نہیں، ماں کو پتا نہیں، باپ کو پتا نہیں کہ کیا بن رہا ہے، کس طرح سے بن رہا ہے، تو جو اللہ کی قدرت اِس جگہ کام کرتی ہے، تاریکیوں میں، اندھیریوں میں، پیٹ کے اندر، جھلی میں، رحم میں، تو کیا اس کی قدرت سے یہ بعید ہے کہ دوبارہ تمہیں پیدا کردے؟ تو یہاں سے توحید اور معاد دونوں باتیں سمجھ میں آتی ہیں۔ "بتلاؤ! تم جو کچھ تم ٹپکاتے ہو" اَفَرَءَيْتُمْ کا ترجمہ دونوں طرح سے کیا گیا ہے، "کیا پھر تم نے دیکھا؟" یعنی کبھی غور کیا؟ یا اَخْبِرُوْنِيْ کے معنی میں، "کیا تم نے دیکھا جو کچھ تم ٹپکاتے ہو، کیا تم اس کو پیدا کرتے ہو یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟" یہ تو اِبتدائے خلق ہو گیا۔

موت اور فنا میں قدرت کے نمونے

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَيْنَكُمُ الْمَوْتَ: ہم نے مقدر کیا تمہارے درمیان موت کو، وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِيْنَ: اور ہم مسبوق نہیں ہیں، کہ کوئی دُوسرا ہم سے چھوٹ کر بھاگ جائے، ہمیں عاجز کردے، مطلب یہ ہے کہ پیدا کرنے کے بعد بھی تم ہمارے ہی کنٹرول میں ہو، جب چاہتے ہیں ہم تمہارے اُوپر موت طاری کردیتے ہیں، اور تم بچ بچا کر کہیں نہیں جاسکتے، تو تمہارا پیدا کرنا ہمارے اختیار میں، زندگی ہمارے قابو میں، تو پھر تم کس طرح سے انکار کرتے ہو؟ اور اللہ کی قدرت تمہیں کیوں سمجھ میں نہیں آتی؟ "ہم نے مقدر کی تمہارے درمیان موت، اور نہیں ہیں ہم مسبوق، نہیں ہیں ہم عاجز" عَلٰۤى اَنْ نُّبَدِّلَ اَمْثَالَكُمْ: مسبوق کا صلہ آگے عَلٰی آ رہا ہے، جس سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ یہاں مسبوق کے اندر قدرت والا معنی ہے، جس کا مفہوم یوں ادا کریں گے کہ "ہم مسبوق

نہیں، ہم عاجز نہیں، بلکہ قادر ہیں اس بات پر کہ بدل لائیں ہم تم جیسوں کو'' تم جیسوں کو بدل کے لے آئیں، تم جیسے اور بنالیں اس بات پر ہم قادر ہیں، اس بات سے ہم عاجز نہیں ہیں،'' اور پیدا کر دیں تمہیں، بنادیں تمہیں کسی اور حال میں جس کو تم جانتے نہیں ہو'' تم جیسے اور انسان پیدا کر کے لے آئیں اور تمہیں کسی اور حال میں پیدا کر دیں، اور حال میں لے جائیں جس کا تمہیں پتا ہی نہیں، ہر طرح سے قدرت ہمیں موجود ہے، ہم اس بات سے عاجز نہیں ہیں، وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ النَّشْاَةَ الْاُوْلٰی: پہلی مرتبہ پیدا کرنا تم نے جان لیا، فَلَوْلَا تَذَكَّرُوْنَ: تم اس سے نصیحت کیوں نہیں حاصل کرتے، نشأۃِ اُولیٰ سے تم نشأۃِ ثانیہ کی طرف کیوں نہیں منتقل ہوتے؟ تمہارا ذہن اُدھر کیوں نہیں جاتا؟

کھیتی کے نظام میں قدرت کے نمونے

اَفَرَءَيْتُمْ مَّا تَحْرُثُوْنَ: کیا پھر دیکھا تم نے؟ جو تم بیج ڈالتے ہو، کھیتی بوتے ہو۔ اب انسان کا عمل اس میں زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ جا کر زمین تیار کر کے اس میں بیج ڈال دیا، باقی! اس بیج کی کیڑوں سے حفاظت کرنا اور پھر اس میں سے سوئی نکالنا، پھر آہستہ آہستہ اس کو بڑھانا، تن آور کرنا، اور اُس کو انتہا تک پہنچانا کہ فصل پکنے کے بعد وہ پھر کسان کو مالا مال کرتی ہے، بیج ڈالنے کے بعد کوئی چیز بھی انسان کے اختیار میں نہیں، مٹی میں اُس کے دَب جانے کے بعد یہ کیا کر سکتا ہے؟ اگر اس بیج کو کیڑا کھا جائے تو اس کی کیا طاقت ہے، یا اس میں سے کوئی چیز پیدا نہ ہو، یا پیدا ہونے کے بعد وہ بڑھے پھولے نہیں، پھلنے پھولنے کے بعد اس کے اُوپر ژالہ باری ہو جائے یا کوئی اور آفت آجائے، جس کے بعد سب نیست و نابود ہو جاتی ہے،'' کیا تم اُس کو اُگاتے ہو یا ہم اس کو اُگانے والے ہیں؟'' حَرث: بیج ڈالنا، زرع: اُگانا۔'' اگر ہم چاہتے تو کر دیتے اُس کو چورا چورا، پھر ہو جاتے تم باتیں بناتے'' تم باتیں بنانے لگ جاتے، تعجب کرنے لگ جاتے، تَفَكُّه: باتیں بنانے اور تعجب کرنے کے معنی میں،'' اگر ہم چاہیں تو کر دیں اُس کو چورا چورا، پھر ہو جاؤ تم باتیں بناتے'' یعنی یوں پھر آپس میں باتیں کرو اِنَّا لَمُغْرَمُوْنَ ﴿۶۶﴾ بَلْ نَحْنُ مَحْرُوْمُوْنَ: بے شک ہم البتہ تاوان ڈال دیئے گئے، مطلب کیا؟ کہ کھیت ہم نے بوئے تھے، حاصل کچھ نہ ہوا، اُلٹا چٹی ہمیں پڑ گئی، کہ بیج بھی گیا، اور سارا کام بھی گیا، حاصل کچھ ہوا نہ، پھر بیٹھ کے یوں ہاتھ ملتے ہو، اور بیٹھے ایسے باتیں بناتے ہو،'' بلکہ ہم تو بالکل ہی محروم ہو گئے'' یعنی جو پہلا سرمایہ تھا وہ بھی خرچ کر بیٹھے، اور آئندہ حاصل بھی کچھ نہ ہوا، چٹی پڑ گئی، پھر تم یوں باتیں کرنے لگ جاؤ اگر ہم کھیتی کو چورا چورا کر دیں۔ چنانچہ جہاں ژالہ باری ہوئی، اِس سال بھی آپ نے سنا کہ فصل کے اُوپر کتنی ژالہ باری ہوئی اور گندم کی فصل تباہ ہو گئی، تیار شدہ فصل تباہ ہو گئی، تو وہاں لوگ پھر یونہی کہتے ہیں کہ خسارہ ہی ہو گیا، چٹی پڑ گئی، اپنا جو سرمایہ خرچ کیا تھا وہ بھی واپس نہ آیا، اور تو کیا ملنا تھا۔ تو پھر تم اس قسم کی باتیں کرنے لگ جاتے ہو، تو یہ سب اللہ کی قدرت ہے جو اس فصل کو اُگاتی ہے اور وہی باقی رکھتی ہے، اور کبھی کبھی تمہیں سرزنش کرنے کے لئے اللہ تعالیٰ اس کو حُطامًا بھی کر دیتے ہیں، ریزہ ریزہ بھی کر دیتے ہیں۔

پانی کے نظام میں قدرت کے نمونے

'' کیا پھر دیکھا تم نے اس پانی کو جس کو کہ تم پیتے ہو؟'' کھانے کے بعد یہ پینے کا ذکر آ گیا،'' کیا تم نے اس کو اُتارا ہے

بادل سے، یا ہم اس کو اُتارنے والے ہیں؟" یہ جو برستا ہے، خاص طور پر عرب میں تو پانی کے حاصل ہونے کا ذریعہ ہی بارش تھی، باقی از مین کا پانی وہاں کم تھا: "تو اس کو تم بادل سے اُتارتے ہو یا ہم اس کو اُتارنے والے ہیں؟ اگر ہم چاہتے تو اس کو کڑوا بنادیتے، پھر تم کیوں شکر نہیں کرتے؟" کڑوا بنادیتے جو تمہارے لیے ناقابلِ استعمال ہوجاتا، اللہ تعالیٰ نے کیسا خوشگوار بنایا، بغیر محنت کے تمہیں بادل کی طرف سے برستا ہوا مل جاتا ہے، تو تم شکر کیوں نہیں ادا کرتے؟

آگ میں قدرت کے نمونے

اَفَرَءَيْتُمُ النَّارَ الَّتِي تُوْرُوْنَ: پھر کیا دیکھا تم نے اس آگ کو جس کو کہ تم جلاتے ہو؟ آگ بھی اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، آگ ہی اگر نہ ہوتو انسان کتنی مشکلات میں مبتلا ہوجائے، پھر خاص طور پر مسافر جب سفر کرتے ہوئے چٹیل میدانوں میں جاتے تھے، کوئی آبادی آس پاس نہیں ہوتی تھی، تو وہاں آگ کا میسر آجانا ضروریات پوری ہونے کے لئے ایک بہت بڑی نعمت تھی: "کیا پھر تم نے دیکھا اس آگ کو جس کو تم جلاتے ہو؟" ءَاَنْتُمْ اَنْشَاْتُمْ شَجَرَتَهَآ: اس آگ کے درخت کو تم نے پیدا کیا یا ہم اس کو پیدا کرنے والے ہیں؟ آگ کا درخت: یعنی وہ درخت جس سے آگ جلتی ہے، یعنی ایندھن، یہ درختوں سے ہی آگ نکلتی ہے، آگ کا درخت یعنی جس درخت سے آگ جلتی ہے اس کو تم نے پیدا کیا یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟ یعنی جس سبب سے تمہیں آگ حاصل ہوتی ہے وہ یہی نباتات اور یہی ایندھن ہی تو ہے، تو اس کو تیار کرنے والے اور پیدا کرنے والے ہم ہیں یا تم ہو؟ (رازی)...... اور شجرہ سے وہ خاص شجرہ بھی مراد لیا گیا ہے جس کا ذکر سورۂ یٰسٓ میں آیا تھا، مرخ اور عفار جس کے نام ذکر کیے گئے تھے کہ یہ درخت سبز ہوتے ہوئے بھی آگ دیتا ہے، اس کی دو شاخوں کو اگر رگڑا جائے تو اس میں سے آگ نکلتی ہے (عام تفاسیر)، اس کو بھی شجرۃ العفار کہا جاتا ہے، اُس وقت یہ دیا سلائیاں تو ہوتی نہیں تھیں، اور مسافر کو آگ کی ضرورت ہوتی ہے، اب آگ کوئی ایسی چیز تو ہے نہیں کہ جس کو انسان بنڈل باندھ کے ساتھ لے جائے، تو اللہ تعالیٰ نے ایسے درخت پیدا کردیے جن سے آگ نکلتی ہے، ایسے پتھر پیدا کردیے جن سے آگ نکلتی ہے، تو یہ مسافر کے لئے کتنی بڑی نعمت اور راحت کی چیز ہے، اور آج کل تو اُس سے بھی زیادہ نعمت اکہ ڈبیا جیب میں ڈالی اور جب چاہا کسی درخت کی شاخیں اکٹھی کیں اور آگ جلالی۔ بہرحال یہ ایندھن، یہ نباتات، آگ حاصل کرنے کے اسباب جتنے ہیں، سب ہی اللہ تعالیٰ کے پیدا کیے ہوئے ہیں، اُس زمانے میں لوگ پتھروں سے آگ نکالتے تھے یا یہ خاص قسم کے درخت تھے جن کی شاخوں کو رگڑنے کے ساتھ اُن سے آگ نکلتی تھی، چاہے وہ سرسبز شاداب ہی کیوں نہ ہوں، "اُس کے درخت کو تم نے پیدا کیا یا ہم پیدا کرنے والے ہیں؟" آگ کا درخت! اس کا مطلب سمجھ گئے؟ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ درخت کی طرح کہیں سے آگ پھوٹتی ہے، آگ کے درخت سے مراد یہ ہے کہ وہ درخت جن سے تم آگ حاصل کرتے ہو، کیونکہ آگ ہمیشہ ایندھن سے حاصل ہوتی ہے، اور ایندھن وہی شجرہ ہے، یا وہ خاص درخت مراد ہوگئے جن کی شاخوں سے آگ نکلتی ہے، اُن کو دیا سلائی کے طور پر وہ استعمال کرتے تھے، چقماق کے طور پر، جیسے پتھروں کو آپس میں ٹکرانے سے وہ آگ جلاتے تھے، اسی طرح سے درخت کی شاخیں رگڑ کر بھی آگ پیدا کرتے تھے۔ نَحْنُ جَعَلْنٰهَا تَذْكِرَةً: ہم نے

اِس آگ کو تذکرہ بنایا، یاد دِلانے والی، مُذَکِّرَة، جو دوزخ کی آگ کو یاد دِلاتی ہے، یا اللہ کے احسان کو یاد دِلاتی ہے، اللہ کی قدرت کو یاد دِلاتی ہے، ''ہم نے اس کو تذکرہ بنایا'' وَّمَتَاعًا لِّلْمُقْوِيْنَ: اور مسافروں کے لئے نفع کی چیز بنایا، متاع کہتے ہیں استعمال کرنے کی، نفع اُٹھانے کی چیز، مقوین یہ لفظ قواء سے لیا گیا، قواء: چٹیل میدان، صحراء، اَقْوٰی: صحراء میں جانا، داخل ہونا، مُقوِین: مسافر، جو بڑے بڑے میدانوں میں صحراؤں میں داخل ہوتے ہیں، جن میں آبادیاں نہیں ہوتیں، وہاں اگر یہ چیزیں مہیا نہ ہوں جن سے آگ پیدا ہوتی ہے تو پھر انسان اپنا وقت کس طرح سے گزارے، آگ بھی انسان کی زندگی میں بہت بڑی دخیل ہے۔

تسبیح کا حکم

فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ: پس پاکی بیان کر تو اپنے رَبّ کے عظمت والے نام کی، یا اپنے عظمت والے رَبّ کے نام کی، عظیم کو رَبّ کی صفت بنالو، چاہے اسم کی صفت بنالو، اپنے عظمت والے رَبّ کے نام تسبیح پڑھیے، پاکی بیان کیجئے۔ اور اس کی تسبیح کا یہی معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے متعلق یہ کہو کہ اس میں کوئی کسی قسم کا عیب نہیں، نقص نہیں۔ اور اس کے ساتھ حمد کا ذکر آجاتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ ساری خوبیوں کا مالک ہے، تو اِس میں توحید کی طرف بھی اشارہ ہوگیا، اور اس کی قدرت کا اعتقاد کرتے ہوئے، عظمت کا اعتقاد کرتے ہوئے، معاد کی طرف بھی اشارہ ہوگیا۔ سبحان اللہ والحمد للہ ولا إلٰہ إلّا اللہ واللہ اکبر۔

مذکورہ آیت کی تلاوت کے وقت مستحب عمل

یہ سَبِّحْ چونکہ اَمر کا صیغہ آ گیا، تو اس میں مستحب ہے کہ جس وقت آپ اس کی تلاوت کریں تو اس کے بعد ''سبحان ربی العظیم'' اس طرح سے کہہ لیا جائے۔ جیسے سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْأَعْلَى پڑھیں تو ''سبحان ربی الاعلیٰ'' کہہ لیا جائے، روایات میں اسی طرح سے آتا ہے، یعنی اس اَمر پر ساتھ ساتھ ہی عمل ہو جانا چاہیے، سَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ''سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ'' اس طرح سے تلاوت کرتے ہوئے بھی اس کو پڑھ لینا مستحب ہے، حتّٰی کہ نفل نماز میں بھی۔

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ ﴿۷۵﴾ وَاِنَّهٗ لَقَسَمٌ لَّوْ تَعْلَمُوْنَ عَظِيْمٌ ﴿۷۶﴾ اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ

نہیں! میں قسم اُٹھاتا ہوں ستاروں کے غروب ہونے کی جگہ کی ﴿۷۵﴾ بے شک یہ قسم بہت عظیم ہے اگر تم جانو ﴿۷۶﴾ یہ بہت باعزت

كَرِيْمٌ ﴿۷۷﴾ فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ ﴿۷۸﴾ لَّا يَمَسُّهٗٓ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ ﴿۷۹﴾ تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ

قرآن ہے ﴿۷۷﴾ چھپا کے رکھی ہوئی کتاب میں ہے ﴿۷۸﴾ اُس کو نہیں چھوتے مگر پاکیزہ لوگ ﴿۷۹﴾ یہ رَبّ العالمین کی طرف سے

الْعٰلَمِيْنَ ﴿۸۰﴾ اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ ﴿۸۱﴾ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ

اُتارا ہوا ہے ﴿۸۰﴾ کیا پھر تم اس بات کے بارے میں چشم پوشی کرنے والے ہو؟ ﴿۸۱﴾ اور بناتے ہو تم اپنا رزق اس بات کو کہ تم

تُكَذِّبُوْنَ ﴿٨٢﴾ فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ ﴿٨٣﴾ وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ ﴿٨٤﴾ وَ

جھٹلاتے ہو۝ پس کیوں نہیں، جس وقت کہ جان حلق کو پہنچ جاتی ہے۝ اور تم اس وقت جھانک رہے ہوتے ہو۝ اور

نَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ ﴿٨٥﴾ فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ

ہم اس مرنے والے کی طرف زیادہ قریب ہوتے ہیں بمقابلہ تمہارے لیکن تم ہمیں دیکھتے نہیں ہو۝ پس اگر تم

غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ﴿٨٦﴾ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿٨٧﴾ فَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ

بدلہ دیئے ہوئے نہیں ہو۝ تو کیوں نہیں لوٹا دیتے تم اس رُوح کو اگر تم سچے ہو۝ اگر وہ (مرنے والا)

الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿٨٨﴾ فَرَوْحٌ وَّرَيْحَانٌ ۙ وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ ﴿٨٩﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنْ اَصْحٰبِ

مقربین میں سے ہوا۝ تو پس اس کے لئے راحت ہے اور خوشبوئیں ہیں اور خوش حالی کا باغ ہے۝ اور اگر وہ اصحابِ یمین

الْيَمِيْنِ ﴿٩٠﴾ فَسَلٰمٌ لَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ ﴿٩١﴾ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ

میں سے ہوا۝ تو (اسے کہا جائے گا) تیرے لئے سلامتی ہے کیونکہ تو اصحابِ یمین میں سے ہے۝ اور اگر وہ جھٹلانے والوں میں سے

الضَّآلِّيْنَ ﴿٩٢﴾ فَنُزُلٌ مِّنْ حَمِيْمٍ ﴿٩٣﴾ وَّتَصْلِيَةُ جَحِيْمٍ ﴿٩٤﴾ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ

گمراہوں میں سے ہوا۝ تو اس کی مہمانی گرم پانی سے ہوگی۝ اور جہنم میں داخل کرنا ہوگا۝ بے شک یہ بات البتہ

حَقُّ الْيَقِيْنِ ﴿٩٥﴾ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ ﴿٩٦﴾

یقین میں سے حقیقی ہے۝ پس آپ تسبیح بیان کیجئے اپنے عظمت والے رَبّ کے نام کی۝

تفسیر

قرآنِ کریم کی حقّانیت

فَلَآ اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ: اب آگے قرآنِ کریم کی حقّانیت کو بیان کرنا مقصود ہے جو اس قسم کی خبریں دیتا ہے، وہ جاہل لوگ حضور ﷺ کو کاہن کہتے تھے، تو قرآنِ کریم گویا کہ کہانت ہوگیا، کہانت جنوں کا قول ہوتا ہے، یا اس کو خود تراشیدہ انسان کا اور شاعر کا قول قرار دیتے تھے، تو اب اس کی تردید کرنی مقصود ہے، ''لا'' کے ساتھ اس کی تردید ہے، نہیں نہیں! اُقْسِمُ بِمَوٰقِعِ النُّجُوْمِ- یہ پچھلی بات کی گویا کہ تردید ہوگئی جو کہ موقع محل کے مطابق زیرِ بحث ہے، ''نہیں، ایسی بات نہیں جیسے تم کہتے ہو، میں قسم اُٹھاتا ہوں

ستاروں کے غروب ہونے کی جگہ کی!'' مواقع موقِع کی جمع ہے، ستاروں کے گرنے کی جگہ۔ یا تو یہ ویسے ہی قسم ہے وَالنَّجْمِ إِذَا هَوٰى کے اندر جس طرح سے آئی، تو یہاں بھی ستاروں کے غروب ہونے کی جگہوں سے وہی اشارہ کرنا مقصود ہے کہ ستارے طلوع ہوتے ہیں، غروب ہوتے ہیں، اللہ تعالیٰ نے ان کو اِهتداء کا ذریعہ بنایا ہے، اس طرح سے کتنے نظم ونسق کے تحت چلتے ہیں، اُن کی رفتار میں کوئی کسی قسم کی خرابی نہیں، تو قرآنِ کریم کی ہر ہر آیت جو ہے یہ بھی نجم ہدایت ہے، یہ بھی اوّل سے لے کر آخر تک ہدایت کا ذریعہ ہے، جس طرح سے وہ ستارے بغیر کسی دُوسرے کے تصرف کے اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پیدا کردہ ہیں اور انسانوں کے لئے اِهتداء کا ذریعہ ہیں اسی طرح سے یہ قرآن ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ کہانت کی تردید کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے، ستارے گرتے ہیں یعنی شیاطین پہ آ کے لگتے ہیں، شیطانوں نے جو مقاعد تجویز کر رکھے تھے جن کا ذکر سورۂ جنّ میں آئے گا، جن ٹھکانوں پر وہ جا کر بیٹھتے تھے، تو مواقع النجوم سے وہی ٹھکانے مراد ہیں کہ ستارے وہاں گرتے ہیں اُن کو ہلاک کرنے کے لئے، اور ان شیاطین کو موقع نہیں دیتے کہ یہ عالَمِ بالا کے اندر جا کر کوئی بات سُن سکیں، اس لیے یہ ممکن نہیں کہ یہ جنّات کلام اُوپر سے سُن آتے ہوں اور آ کر نیچے پہنچاتے ہوں، کہانت کی تردید کے طور پر اس کا مطلب یوں ہوسکتا ہے: ''میں قسم کھاتا ہوں ستاروں کے غروب ہونے کی جگہ کی! یا ستاروں کے گرنے کی جگہ کی! بے شک یہ قسم بہت عظیم ہے اگر تم جانو۔'' اِنَّهٗ لَقُرْاٰنٌ كَرِيْمٌ: اِنَّهٗ! جو کچھ یہ رسول تمہارے سامنے پیش کرتا ہے یہ بہت باعزت قرآن ہے، فِيْ كِتٰبٍ مَّكْنُوْنٍ: چھپا کے رکھی ہوئی کتاب میں ہے، ''کتابِ مکنون'' سے یہاں ''لوحِ محفوظ'' مراد ہے۔

مسِ مصحف کے لئے طہارت کا حکم

لَّا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ: اس کا مطلب دو طرح سے ذِکر کیا گیا ہے، ''اُس کتابِ مکنون کو نہیں چھوتے مگر پاکیزہ لوگ'' یہ جنّ خبیث، رذیل قسم کے یہ وہاں نہیں جاسکتے، کہ کوئی تصرف کرلیں، مطهرون سے مراد فرشتے ہیں، ''کتابِ مکنون کو نہیں چھوتے مگر پاکیزہ لوگ'' یعنی فرشتے۔ اور یا یہ قرآنِ کریم کے ساتھ ہی لگتی ہے، تو لَا يَمَسُّهٗۤ اِلَّا الْمُطَهَّرُوْنَ یہ صورۃً خبر ہے معنیً انشاء ہے، ''بے شک یہ قرآنِ کریم ہے، چھپائی ہوئی کتاب میں ہے، اس قرآن کو نہ چھوئیں مگر پاکیزہ لوگ'' پھر معنی یوں نکل آئے گا، یعنی صورۃً خبر، معنیً انشاء، ''نہ چھوئیں مگر پاکیزہ لوگ'' جس سے پھر یہ بات نکلے گی کہ قرآنِ کریم کے چھونے کے لئے طہارت ضروری ہے، جو شخص طاہر مطہر ہو وہی اس کو ہاتھ لگا سکتا ہے، فقہائے اَربعہ اس بات کے اُوپر متفق ہیں کہ بے وضو آدمی قرآنِ کریم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، بے وضو آدمی تلاوت کرسکتا ہے،[1] اور جنبی تلاوت بھی نہیں کرسکتا، جیسے فقہ کے اندر آپ اَحکام پڑھتے ہیں۔ یہ مسئلہ تو ائمۂ اَربعہ کے نزدیک متیقن ہے، لیکن سوال یہ ہے کہ قرآنِ کریم سے یہ نکلتا ہے یا صرف احادیث سے ثابت ہے، احادیث سے تو بالیقین ثابت ہے، باقی! قرآنِ کریم سے بھی یہ مسئلہ نکل سکتا ہے اگر لَا يَمَسُّهٗۤ کو قرآنِ کریم کے ساتھ لگا دیا جائے، لیکن اس میں دونوں احتمال ہیں کہ یہ کتابِ مکنون کے ساتھ لگتا ہے یا قرآنِ کریم کے ساتھ، اس لئے اس کی دلالت قطعی نہیں ہے، اور اَحادیث

(۱) الاستذکار، ۲/۴۷۰۔ کتاب القرآن کی پہلی حدیث کے تحت۔ نیز دیکھیں 'معارف القرآن' از: مفتی محمد شفیع صاحب۔

سے یہ مسئلہ یقیناً ثابت ہے، یعنی اگر اختلاف کیا جا رہا ہے تو اس بارے میں کیا جا رہا ہے کہ قرآنِ کریم سے یہ مسئلہ نکلتا ہے یا نہیں نکلتا؟ تو یہ دلالت ظنی ہوگئی، کتاب مکنون کے ساتھ لگائیں گے تو مطہرون سے فرشتے مراد ہیں، اور اس کو قرآنِ کریم کے ساتھ لگائیں گے تو پھر مطہرون سے انسان ہی مراد ہیں، "یہ قرآنِ کریم ہے، نہ چھوئیں اس کو مگر پاکیزہ لوگ"، لَا يَمَسُّهٗ یہ صورۃً خبر، معنیً انشاء ہے، پھر اس سے مسئلہ نکل آئے گا کہ قرآنِ کریم کو چھونے کے لئے طاہر ہونا ضروری ہے۔ اور "لَا يَمَسُّ الْقُرْآنَ اِلَّا طَاهِرٌ"(1) احادیث کے اندر آتا ہی ہے، جو بالکل اس آیت کے مساوی مساوی الفاظ پر مشتمل ہے۔ اور اگر اس کو کتاب مکنون کے ساتھ لگاتے ہیں تو پھر یہ کہنا مقصود ہے کہ لوحِ محفوظ کو فرشتے ہی چھوتے ہیں، کسی جن کا وہاں گزر نہیں، کہ اس میں تصرف کر کے کوئی غلط بات اس میں درج کر دے۔

منکرینِ قرآن کا معاندانہ رویّہ

تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ: یہ ربّ العالمین کی طرف سے اُتارا ہوا ہے اَفَبِهٰذَا الْحَدِيْثِ اَنْتُمْ مُّدْهِنُوْنَ: مُّدْهِنُوْنَ یہ لفظ اِدھان سے لیا گیا ہے، اِدھان یہ دُھن سے ہے، دُھن تیل کو کہتے ہیں، اَدْهَنَ کا معنی ہوتا ہے مالش کرنا، اب کسی چیز کے اُوپر تیل کی مالش کردی جائے تو وہ نرم ہو جاتی ہے، اس لیے اِدھان کا مطلب ہوا کرتا ہے نرم رویہ اختیار کرنا، چشم پوشی کر جانا، سہل انگاری، کسی چیز کو نظر انداز کر جانا، پروا نہ کرنا، اس کے لئے اِدھان کا لفظ بولا جاتا ہے۔ جیسے حدیث میں ہے "اَلْمُدْهِنُ فِيْ حُدُوْدِ اللهِ"(2) جو اللہ کی حدود میں نرمی برتنے والا ہے، کوئی اُس کے سامنے معصیت کرتا رہے ٹوکتا نہیں، اس کو کہتے ہیں مُدھن فی حدود اللہ، کہ یہ اللہ کی حدود میں مُدھن ہے، نرمی برتنے والا ہے، نظر انداز کرنے والا ہے، سُستی کرنے والا ہے، تسامح کرنے والا ہے۔ تو یہاں اس کا یہی معنی ہے کہ اس بات کے ساتھ تم سُستی کرتے ہو، اِغماض کرتے ہو، چشم پوشی کرتے ہو، اس کو نظر انداز کرتے ہو، اس بات کی تم اہمیت محسوس نہیں کرتے، کیا پھر تم اس بات کے بارے میں اِغماض کرنے والے ہو، چشم پوشی کرنے والے ہو، یا، نظر انداز کرنے والے ہو؟ وَتَجْعَلُوْنَ رِزْقَكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ: اور تم نے اپنا رزق ہی بنا لیا اس بات کو کہ تم جھٹلاتے ہی جاتے ہو، تمہاری تکذیب غذا بن گئی، "بناتے ہو تم اپنا رزق اس بات کو کہ تم جھٹلاتے ہو" یعنی جھٹلانا تمہاری غذا ہی بن گئی، جس طرح غذا کے بغیر اِنسان گزارہ نہیں کر سکتا تم بھی تکذیب کیے بغیر گزارہ نہیں کر سکتے، اس طرح سے اس کو اپنا لیا جس طرح سے انسان رزق کو اپناتا ہے، یا یہ ہے کہ تَجْعَلُوْنَ شُكْرَ رِزْقِكُمْ اَنَّكُمْ تُكَذِّبُوْنَ، رزق کا مصداق قرآنِ کریم بھی ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں یہ ایک رُوحانی رزق دیا تھا، تم نے اس کے شکر کو یہی قرار دے دیا کہ تم اس کی تکذیب کرتے ہو؟ یعنی شکر کی بجائے تم نے تکذیب کو اِختیار کر لیا، اس نعمت کا شکریہ تمہارے نزدیک یہی ہے کہ تم اس کی تکذیب کر رہے ہو؟ یہ مفہوم بھی اس کا ہو سکتا ہے۔

---

(1) موطأ امام مالك، كتاب القرآن کی پہلی حدیث/سنن دارمی، باب لا طلاق قبل نكاح، رقم: ۲۳۱۲/مشکوۃ ۵۰/۱ باب مخالطة الجنب، فصل ثانی۔
(2) بخاری ۳۶۹/۱ باب القرعة. مشکوۃ ۴۳۶/۲ باب الأمر بالمعروف کی دوسری حدیث۔

اِثباتِ معاد کے لئے بوقتِ موت اِنسان کی بے بسی کا ذِکر

فَلَوْلَآ اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ: لولا کا جواب آگے آئے گا، اِذَا بَلَغَتِ الْحُلْقُوْمَ: جس وقت کہ جان حلقوم تک آجاتی ہے، پہنچ جاتی ہے جان حلقوم تک، حلقوم: حلق، گلے میں جان آگئی، وَاَنْتُمْ حِيْنَئِذٍ تَنْظُرُوْنَ: اور تم اُس وقت بیٹھے دیکھ رہے ہوتے ہو، تمہارا کوئی عزیز مررہا ہے، بیٹا مر رہا ہے، باپ مر رہا ہے، بھائی مر رہا ہے، دوست مر رہا ہے، تم سب بیٹھے ہوتے ہو، وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْكُمْ: اور ہم اس کی طرف زیادہ قریب ہوتے ہیں بمقابلہ تمہارے وَلٰكِنْ لَّا تُبْصِرُوْنَ: لیکن تم ہمیں دیکھتے نہیں ہو، فَلَوْلَآ: یہ پہلے لولا کی تاکید ہے، اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ: اگر تم بدلہ دیے ہوئے نہیں ہو، دان یدین: بدلہ دینا، یعنی اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تم کسی کے کنٹرول میں نہیں جو تمہیں بدلہ دے گا اور مرنے کے بعد تم نے کسی کے سامنے حساب کتاب کی خاطر پیش نہیں ہونا، اگر تمہارا یہی خیال ہے تو پھر تم اس رُوح کو روک کیوں نہیں لیتے؟ اس کو نکلنے کیوں دیتے ہو؟ اور اگر تم سب بیٹھے تدبیریں کر رہے ہو، دوا دارو کر رہے ہو، ڈاکٹروں طبیبوں کو اکٹھا کیا ہوا ہے، دَم دُرود پڑھنے والوں کو بھی بٹھایا ہوا ہے، ہزار جتن کر کے باوجود تم اس رُوح کو روک نہیں سکتے تو کیا اللہ تعالیٰ اگر دوبارہ داخل کرنا چاہے گا تو تم رُکاوٹ پیدا کرلو گے؟ تو اتنی سی تو بات ہے، اپنا عجز تم اُس وقت نہیں دیکھتے؟ تم سب کے سب جھانک رہے ہوتے ہو لیکن مرنے والے کو تم بچا نہیں سکتے، تو اتنی عاجز مخلوق جس کو پیدا ہم نے کیا، اور جب چاہیں ہم اس کو موت دے دیں، قدم قدم پر تمہارا عجز نمایاں ہے، تو تم کیسے جھٹلاتے ہو؟ جیسے تمہارے اختیار کے بغیر وہ رُوح کو نکال لیتا ہے تو تمہارے اختیار کے بغیر اس کو وہ داخل بھی کر دے گا۔ اب لیجئے! سارا ترجمہ صاف کیجئے......!'' پس کیوں نہیں، جس وقت کہ جان حلق کو پہنچ جاتی ہے اور تم اُس وقت جھانک رہے ہوتے ہو، ہم اُس مرنے والے کی طرف زیادہ قریب ہوتے ہیں بمقابلہ تمہارے، لیکن تم دیکھتے نہیں ہو، پس کیوں نہیں، اگر تم بدلہ دیے ہوئے نہیں، کہ لوٹاتے ہو تم اس کو' اب لولا کا تعلق ترجعون کے ساتھ، کیوں نہیں لوٹا دیتے تم اس رُوح کو، اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ: اگر تم اس بارے میں سچے ہو کہ مرنے کے بعد تم دوبارہ نہیں لوٹائے جاؤ گے اور مرنے کے بعد زندگی نہیں، دوبارہ کوئی زندہ نہیں کرسکتا، اگر تم اس بارے میں سچے ہو تو تم اس رُوح کو کیوں نہیں روک لیتے؟ تو جب قدم قدم پر تمہارا عجز نمایاں ہے، تو تمہاری مرضی اور منشا کے خلاف اگر اللہ رُوح نکال لیتا ہے تو دوبارہ وہ داخل بھی کر دے گا۔ مدین کہتے ہیں بدلہ دیا ہوا، غیر مدین: جو بدلہ دیا ہوا نہیں، جس کے لئے لفظ ہوگا کہ یعنی اگر تم یہ سمجھتے ہو کہ تم ہمارے کنٹرول میں نہیں ہو تو پھر اس مرنے والے کو روکو، اور اگر اس کو روک نہیں سکتے تو معلوم ہو گیا کہ تمہارا اپنے آپ پر بھی کنٹرول نہیں، ہر چیز ہمارے کنٹرول میں ہے جس طرح سے چاہیں ہم کریں، جب چاہیں پیدا کر دیں، جب چاہیں مار دیں، تم ہزار کوشش کرو پیدا ہونے والے کو نہیں روک سکتے، اور ہزار جتن کرلو مرنے والے کو نہیں روک سکتے، تو پھر اس اللہ کے لئے کیا مشکل ہے کہ دوبارہ جب زندہ کرنا چاہے تو زندہ کر دے، تم اس وقت بھی کیا رُکاوٹ ڈال دو گے۔

تین گروہوں کا دوبارہ تذکرہ

اور جب مر جاؤ گے تو پھر آگے جا کے وہی تین گروہوں کا ذکر آ گیا جو ابتدائے سورۃ میں ہے، مرنے کے بعد پھر مٹی نہیں

ہو جانا، بلکہ بھر (اَمَّا تفصیل کے لئے ہے) اگر وہ مرنے والا مقربین میں سے ہوا، جس کو سابقون کے ساتھ تعبیر کیا تھا السّٰبِقُوْنَ السّٰبِقُوْنَ، اُولٰٓئِكَ الْمُقَرَّبُوْنَ، ''اگر وہ مقربین میں سے ہے'' فَرَوْحٌ: تو پس اس کے لئے راحت ہے وَّرَيْحَانٌ: ریحان: خوشبو، پھول، رزق، جس طرح سے سورۂ رحمٰن میں آپ کے سامنے آیا تھا، ''اس کے لئے خوشبوئیں ہیں'' خوشبو کا لفظ بول کر بھی اس کی راحت کی طرف اشارہ ہے، یا ریحان کا معنیٰ ''اس کے لیے غذا ہے، رزق ہے''، اس کے لئے راحت ہے، خوشبوئیں ہیں، ہر قسم کا آرام ہے، وَّجَنَّتُ نَعِيْمٍ: اور خوش حالی کا باغ ہے۔'' اور اگر وہ اَصحاب یمین میں سے ہوا، تو اسے کہا جائے گا'' سَلٰمٌ لَّكَ: تیرے لیے سلامتی ہے، مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ: لِاَنَّكَ مِنْ اَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ کیونکہ تُو اَصحاب یمین میں سے ہے، تو اَصحاب یمین میں ہونے کی وجہ سے اس کو بھی سلام کہا جائے گا۔ وَاَمَّآ اِنْ كَانَ مِنَ الْمُكَذِّبِيْنَ الضَّآلِّيْنَ: اور اگر وہ جھٹلانے والوں میں سے، گمراہوں میں سے ہوا جس کو پہلے اَصحاب شمال کے ساتھ تعبیر کیا گیا، ''تو اس کی مہمانی گرم پانی سے ہوگی، اور جہنم میں داخل کرنا ہوگا'' اِنَّ هٰذَا لَهُوَ حَقُّ الْيَقِيْنِ: بے شک یہ بات البتہ یقین میں سے حقیقی ہے، حق الیقین کے اندر اضافت ہیئی ہے ''اَلْحَقُّ الثَّابِتُ مِنَ الْيَقِيْنِ'' (آلوسی) یعنی یقینیات میں سے یہ بالکل حق اور ثابت بات ہے جو تمہیں کہی جا رہی ہے، جس کے اندر کوئی کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے، حق الیقین اسی بات کو کہا جاتا ہے جو یقینیات میں سے بالکل حق اور ثابت ہے، مزید تاکید کے طور پر حق کا لفظ بڑھا دیا جاتا ہے۔ یا ''یقین کرنے کے لائق ہے''، بے شک یہ بات البتہ حق ثابت ہے یقین سے، فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ: پس آپ تسبیح بیان کیجئے اپنے عظمت والے رَبّ کے نام کی، سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

سُورَةُ الحَدِيدِ

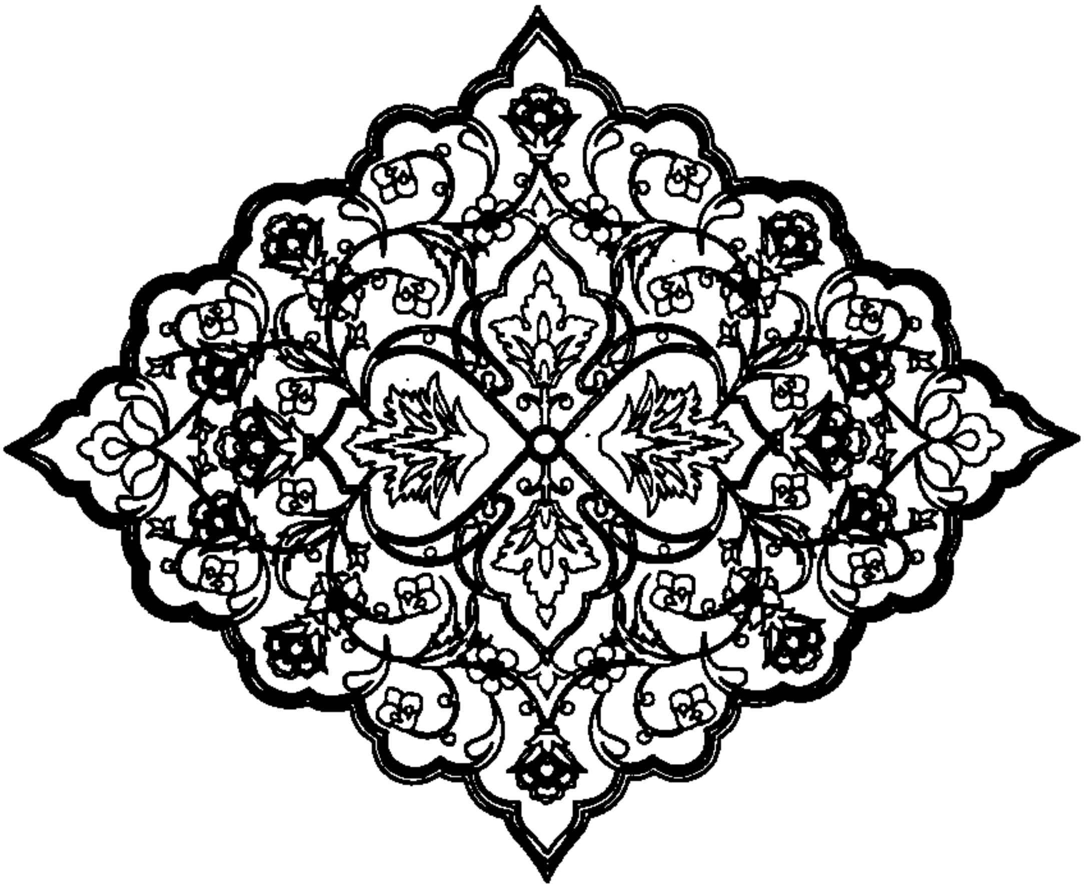

اٰيَاتُهَا ۲۹ ۵۷ سُوْرَةُ الْحَدِيْدِ مَدَنِيَّةٌ ۹۴ رُكُوْعَاتُهَا ۴

سورۂ حدید مدینہ میں نازل ہوئی اور اس کی انتیس آیتیں، چار رکوع ہیں

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

شروع اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم والا ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝۱ لَهٗ مُلْكُ

تسبیح بیان کی اللہ کی اُن چیزوں نے جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور وہ زبردست ہے حکمت والا ہے ۝ اسی کے لئے سلطنت ہے

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝۲ هُوَ الْاَوَّلُ

آسمانوں کی اور زمین کی، وہی زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے ۝ وہ اول ہے

وَالْاٰخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۳ هُوَ الَّذِيْ خَلَقَ

اور آخر ہے، ظاہر ہے اور باطن ہے، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے ۝ وہی ہے جس نے پیدا کیا

السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِيْ سِتَّةِ اَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى الْعَرْشِ ۭ يَعْلَمُ مَا يَلِجُ فِي

آسمانوں کو اور زمین کو چھ دِن میں پھر قرار پکڑا عرش پر، جانتا ہے وہ اس چیز کو جو داخل ہوتی ہے

الْاَرْضِ وَمَا يَخْرُجُ مِنْهَا وَمَا يَنْزِلُ مِنَ السَّمَآءِ وَمَا يَعْرُجُ فِيْهَا ۭ وَهُوَ مَعَكُمْ

زمین میں اور جو چیز نکلتی ہے اُس زمین سے، اور جو چیز اُترتی ہے آسمان سے اور جو چیز چڑھتی ہے اُس آسمان میں، وہ تمہارے ساتھ ہے

اَيْنَ مَا كُنْتُمْ ۭ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝۴ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ

تم جہاں بھی ہوؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے ۝ اسی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی،

وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝۵ يُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ وَيُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ ۭ وَهُوَ

اور اللہ ہی کی طرف تمام اُمور لوٹائے جاتے ہیں ۝ داخل کرتا ہے رات کو دِن میں، اور داخل کرتا ہے دِن کو رات میں، اور وہ

عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ۝۶ اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَاَنْفِقُوْا مِمَّا جَعَلَكُمْ

جاننے والا ہے دلوں کی باتوں کو ۝ اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لے آؤ، اور خرچ کرو اس چیز میں سے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں

مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ ۖ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ۞ وَمَا لَكُمْ

خلیفے بنایا، پھر وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لائیں گے اور اللہ کے راستے میں خرچ کریں گے اُن کے لئے بڑا اَجر ہے ۞ اور تمہیں کیا ہو گیا جو

لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ ۚ وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ لِتُؤْمِنُوْا بِرَبِّكُمْ وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ

تم ایمان نہیں لاتے اللہ پر، حالانکہ رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے تاکہ تم ایمان لے آؤ اپنے رب پر، اور اللہ نے تم سے تمہارا پختہ عہد بھی لیا ہے

اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞٨ هُوَ الَّذِيْ يُنَزِّلُ عَلٰى عَبْدِهٖٓ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ لِّيُخْرِجَكُمْ مِّنَ

اگر تم اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہو ۞ وہی ہے جو اُتارتا ہے اپنے بندے پر واضح واضح آیات تاکہ نکالے تمہیں تاریکیوں سے

الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۖ وَاِنَّ اللّٰهَ بِكُمْ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ۞٩ وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ

نور کی طرف، اور بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق رؤف رحیم ہے ۞ تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے؟

وَلِلّٰهِ مِيْرَاثُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۖ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ

حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے، نہیں برابر تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے خرچ کیا

مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ ۖ اُولٰٓئِكَ اَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِيْنَ اَنْفَقُوْا مِنْۢ بَعْدُ وَ

فتح مکہ سے پہلے اور لڑائی لڑی، یہ لوگ زیادہ بڑے ہیں از روئے درجے کے بمقابلہ ان لوگوں کے جنہوں نے خرچ کیا اس کے بعد اور

قٰتَلُوْا ۖ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۖ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ۞١٠ ع

لڑائی لڑی، اور ہر کسی سے اللہ نے اچھائی کا وعدہ کیا ہے، اور اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کی خبر رکھنے والا ہے ۞

تفسیر

سورت کا تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ سورۂ حدید مدینہ میں نازل ہوئی، اور اس کی ۲۹ آیتیں ہیں، ۴ رُکوع ہیں، اس سورت میں انفاق فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ پر اُبھارا گیا ہے، اور خصوصیت کے ساتھ منافقین کو اپنا نفاق چھوڑنے اور اخلاص اختیار کرنے کی تاکید ہے، ورنہ آخرت کی بدحالی جو سامنے آنے والی ہے وہ یاد دلائی گئی ہے۔

ہر چیز ہر وقت اللہ کی تسبیح میں مصروف ہے

سَبَّحَ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ: جو کچھ آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے اس نے اللہ کی پاکی بیان کی، یہاں ماضی کے طور پر ذکر کیا، بعض سورتوں کی ابتدا میں یُسَبِّحُ آیا ہے، یُسَبِّحُ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ، اور ایک سورت ایسی بھی ہے جس کے شروع میں سَبِّحْ اَمر کا صیغہ آیا ہے، تو اس کا مطلب یہ ہوگیا کہ ماضی میں، مستقبل میں، حال میں، ہر چیز اللہ کی تسبیح بیان کرتی ہے، اور انسان کو بتانا مقصود ہے کہ اُسے بھی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی تسبیح بیان کرے۔

تسبیح اور تحمید کا مفہوم

تسبیح کا حاصل آپ کے سامنے بارہا گزر چکا، اللہ کو بے عیب قرار دینا، اللہ کے متعلق یہ نظریہ رکھنا کہ کوئی نقص اور عیب کی صفت اس کے اندر موجود نہیں۔ اور اس کے ساتھ دُوسری بات ''حمد'' آیا کرتی ہے تو اس کا معنی ہوتا ہے صفاتِ کمال کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو موصوف قرار دینا، تو ''سبحان اللہ والحمد للہ'' جب کہہ دیا جائے تو منفی مثبت دونوں پہلو اس میں آجاتے ہیں، اللہ میں کوئی نقص اور عیب کی صفت موجود نہیں اور ہر خوبی موجود ہے، اور اسی میں سے توحید بھی ثابت ہوجایا کرتی ہے، کیونکہ شرک ایک بہت بڑا عیب ہے، اولاد کی نسبت اللہ کی طرف بہت بڑا عیب ہے، اور اسی طرح سے دُوسری باتیں جو اللہ تعالیٰ کی قدرت اور علم کے منافی لوگ منسوب کرتے ہیں وہ سب اِس میں منفی ہوجاتی ہیں۔ ''تسبیح بیان کی اللہ کی ان چیزوں نے جو آسمانوں میں ہیں اور زمین میں ہیں، اور وہ زبردست ہے، حکمت والا ہے۔ اسی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، وہ زندگی دیتا ہے اور موت دیتا ہے، اور وہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔''

صفاتِ باری تعالیٰ کا تذکرہ اور اس سے مقصود

''وہ اوّل ہے اور آخر ہے، ظاہر ہے اور باطن ہے، اور وہ ہر چیز کے متعلق علم رکھنے والا ہے'' اوّل، آخر، ظاہر، باطن یہ الفاظ اللہ کے ناموں کے طور پر استعمال ہوئے ہیں، ''اوّل'' کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کوئی نہیں تھا، اور ''آخر'' کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات باقی ہے، اس کے پیچھے کچھ نہیں، ایسا نہیں کہ پہلے اللہ نہ ہوتا، کوئی اور چیز ہوتی، ایسی کوئی بات نہیں ہے، اور ایسا وقت بھی نہیں آئے گا کہ اللہ نہ ہو اور کوئی دُوسری چیز موجود ہو، ایسا بھی نہیں، اللہ تعالیٰ ازلی ابدی ہے، نہ اُس کی کوئی ابتدا، نہ اس کی کوئی انتہا، ہمیشہ سے ہے ہمیشہ رہے گا، ہر چیز سے پہلے ہے اور ہر چیز کے پیچھے ہے۔ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ: اور وہ ظاہر ہے اور باطن ہے، ظاہر کا معنی نمایاں، وہ ظاہر بھی ہے کہ اس سے زیادہ ظہور کسی چیز کا نہیں، اللہ تعالیٰ کی قدرت کے آثار اتنے نمایاں ہیں کہ اس سے زیادہ کوئی چیز نمایاں ہوسکتی نہیں، اور وہ باطن یعنی چھپا ہوا بھی ہے کہ اُس کی حقیقت اتنی مخفی ہے کہ ساری عقلیں اکٹھی ہوکر بھی اللہ تعالیٰ کی حقیقت کو نہیں پاسکتیں، اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے وہ مخفی ہے، سب سے زیادہ مخفی، اس سے زیادہ مخفی کوئی چیز نہیں، اور اپنے آثارِ قدرت کے اعتبار سے اتنا نمایاں ہے کہ اُس سے زیادہ کوئی چیز نمایاں نہیں، ''وہ اوّل ہے، آخر ہے، ظاہر ہے،

باطن ہے، اور وہ ہر چیز کو جاننے والا ہے"۔ "وہی ہے جس نے پیدا کیا آسمانوں کو اور زمین کو چھ دن میں، پھر قرار پکڑا عرش پر، جانتا ہے وہ اس چیز کو جو داخل ہوتی ہے زمین میں اور جو چیز نکلتی ہے اُسی زمین سے، اور جو چیز اُترتی ہے آسمان سے اور جو چیز چڑھتی ہے اُس آسمان میں، وہ تمہارے ساتھ ہے تم جہاں بھی ہوؤ، اللہ تعالیٰ تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔" یہ علمی احاطہ بیان کیا جارہا ہے، اور یہ سب لفظ بارہا آپ کے سامنے گزر چکے ہیں، چھ دن میں اللہ نے زمین آسمان کو پیدا کیا، چھ دنوں سے یہاں آخرت کے دن مراد ہیں، دُنیا کے تو مراد ہو نہیں سکتے، کیونکہ یہ تو آسمان زمین کے پیدا ہونے کے بعد سورج چاند کے چکر سے ان دِنوں کا حساب بنا ہے، اور جب آسمان اور زمین ہی نہیں تھے، سورج اور چاند نہیں تھے، تو اس وقت یہ دُنیا کے دن کس طرح سے موجود ہو سکتے ہیں؟ ہاں! البتہ یہ ہو سکتا ہے کہ دُنیا کے چھ دِنوں کے برابر وقت مراد ہو۔ بہر حال اس میں وقت کتنا لگا؟ اور یہ کتنا وقت مراد ہے؟ یہ اللہ کے علم میں ہے!..... تو کائنات پیدا کرنے کے بعد پھر عرش پر مستوی ہو گیا، حکومت سنبھال لی، عرش اور عرش کے اُوپر اِستواء یہ اللہ کی صفت کے طور پر جب ذکر کیا جائے تو یہ بھی متشابہات میں سے ہے، بہر حال یہ معنی اس کا متعین ہے کہ حکومت اللہ نے سنبھال لی، کوئی دُوسرا اس میں حاکم نہیں، تخت نشین اِس کائنات میں وہی ہے..... پھر اس کو اپنی اِس حکومت کے چلانے کے لئے کسی اور کے سہارے کی ضرورت نہیں، جس طرح جاہل مشرک کہتے تھے کہ اتنی دُور دُور کی جگہوں کا اللہ انتظام کیسے سنبھالے، اس کو معاون چاہئیں، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ میری پیدا کی ہوئی مخلوق میں، کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ مجھ سے مخفی نہیں، کوئی چیز زمین کے اندر داخل ہوتی ہے، زمین سے نکلتی ہے، آسمان سے اُترتی ہے، آسمان کی طرف چڑھتی ہے، مجھے ہر ہر چیز کا پتا ہے، اور اللہ تمہارے ساتھ ہے جہاں بھی تم ہوؤ، تمہارا کوئی عمل اللہ سے مخفی نہیں، تمہارے عملوں کو دیکھنے والا ہے۔ "اسی کے لئے سلطنت ہے آسمانوں کی اور زمین کی، اُسی کی طرف تمام اُمور لوٹائے جاتے ہیں" یعنی ہر اَمر کے متعلق اللہ کی طرف سے حکم صادر ہوتا ہے، اسی کی ہدایات کے مطابق اَمر طے ہوتا ہے، اور جب ختم ہوتا ہے تو اسی کی طرف ہی اس اَمر کا رُجوع ہے، فرشتے اگر کوئی کام کرتے ہیں تو اللہ سے ہدایات لے کر کرتے ہیں، کام کرنے کے بعد اُس کی رپورٹ اللہ ہی کے سامنے پیش کرتے ہیں، کسی دُوسرے کا کسی اَمر میں کوئی اختیار نہیں، ہر اَمر کا مرجع مآب اللہ ہی ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ تصرفات کائنات میں جتنے بھی ہیں سب براہِ راست اللہ کے اختیار میں ہیں، کسی کے اندر کسی دوسرے کا دخل نہیں۔ صفات کے تذکرے کے ساتھ توحید ثابت ہوگئی۔ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّهَارِ: داخل کرتا ہے رات کو دن میں، اور داخل کرتا ہے دن کو رات میں، اور وہ جاننے والا ہے دِلوں کی باتوں کو، عَلِیْمٌۢ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ: علیمٌ بِأَقْوالٍ ذاتِ الصُّدُورِ دِلوں کے اندر جو باتیں موجود ہیں سب کو جاننے والا ہے۔ صدر کا ذکر کر کے مراد دِل ہوتا ہے، راز کی نسبت دونوں چیزوں کی طرف ہوا کرتی ہے، دِل کا راز، سینے کا بھید، مصداق اس کا ایک ہی ہوتا ہے۔

ایمانِ کامل اور اِنفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب

اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ: اب یہاں جو خطاب کیا جارہا ہے یہ ایمان کامل کے لئے ہے، "اللہ اور اللہ کے رسول پر ایمان لے

آؤ'' کامل طریقے سے ایمان لے آؤ جس کے ساتھ اطاعت بھی ہوتی ہے،''اور خرچ کرو اس چیز میں سے جس میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلیفے بنایا'' جَعَلَكُمْ مُّسْتَخْلَفِيْنَ فِيْهِ: جس مال میں اللہ تعالیٰ نے تمہیں خلیفے بنایا اس مال میں سے خرچ کرو، اِستخلاف سے اشارہ اس بات کی طرف کردیا کہ یہ زمین اور اِس کے خزانے پہلے سے موجود چلے آرہے ہیں، اِنہی پر قابض پہلے بھی لوگ تھے جو ختم ہوگئے تو اُن کے بعد تمہیں یہاں ٹھہرادیا گیا، اب اگر تم ان کو سنبھال سنبھال کے رکھو گے تو تمہارے پاس بھی یہ رہنے والے نہیں جیسے پہلوں کے پاس نہیں رہے، تمہیں عارضی طور پر اِس میں نائب متعین کیا گیا ہے، اگر آپ اپنی اس حیثیت کو یاد رکھیں تو پھر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے انسان میں بخل نہیں آتا، کہ اللہ کی طرف سے ہمیں اس کا خلیفہ بنایا گیا ہے، تو خلیفے کا حق یہ ہے کہ جو اصل کی طرف سے اَحکام آئیں اُن کے مطابق عمل کرتا چلا جائے، جیسے آگے میراث کا ذکر آرہا ہے تو اُس کا مطلب بھی یہی ہے کہ تم ختم ہوجاؤ گے اور یہ ساری چیز پھر اللہ کی طرف ہی لوٹ کر جانے والی ہے، تم اللہ کی زمین میں، اللہ کے ان خزانوں میں تم امین کی حیثیت رکھتے ہو، تو اگر اللہ کے حکم کے مطابق اِن کو خرچ کرو گے تو تم نے امانت ادا کی، ورنہ پھر تم خائن ہو، یہ ترغیب دی جارہی ہے اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لئے،''خرچ کرو اس چیز میں سے کہ اللہ نے تمہیں اس کے اندر خلیفے بنایا'' فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَاَنْفَقُوْا: پھر وہ لوگ جو تم میں سے ایمان لائیں گے اور اللہ کے راستے میں خرچ کریں گے لَهُمْ اَجْرٌ كَبِيْرٌ: ان کے لئے بڑا اَجر ہے۔ وَمَا لَكُمْ لَا تُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ: تمہیں کیا ہوگیا کہ تم اللہ کے ساتھ ایمان نہ لاؤ، وَالرَّسُوْلُ يَدْعُوْكُمْ: حالانکہ رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے، تو کتنا بڑا مقتضی موجود ہے ایمان لانے کے لئے،''تمہیں کیا ہوگیا کہ تم ایمان نہیں لاتے اللہ کے ساتھ، رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے، تاکہ تم ایمان لے آؤ اپنے رَبّ کے ساتھ'' وَقَدْ اَخَذَ مِيْثَاقَكُمْ: اور اللہ نے تم سے تمہارا عہد بھی لیا ہے، اس عہد کا تقاضا بھی ہے کہ تم ایمان لے آؤ، اور ایمان سے چونکہ یہاں ایمانِ کامل مراد ہے اس لیے کلمہ گو کو بھی خطاب کیا جاسکتا ہے کہ تم جنہوں نے کلمہ پڑھ لیا اور اللہ کے ساتھ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کا عہد کرلیا، جس طرح سے دُوسری جگہ قرآنِ کریم میں ہے وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖۤ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا (سورۂ مائدہ:۷) بیعت کرتے وقت، اسلام قبول کرتے وقت چونکہ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا کہا جاتا ہے، کہ ہم نے بات سُن لی اور مان لی، اس عہد کو یاد کرو، اور اللہ کے اِحسان کو یاد کرو، تو اس عہد سے وہ عہد بھی مراد ہوسکتا ہے، پھر ایمان لانے کی جو ترغیب دی جارہی ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قولاً ایمان لے آئے، تو اَب خلوص کے ساتھ تہہ دِل سے بھی ایمان لاؤ، جس میں خصوصیت کے ساتھ منافقین کے لئے تاکید نکلے گی جو زبان سے تو اِیمان لاتے تھے لیکن جب اُن سے مطالبہ کیا جاتا تھا کہ اس ایمان کے ثبوت کے طور پر اللہ کے راستے میں خرچ کرو، اللہ کے راستے میں جہاد کرو، تو وہ کتراتے تھے۔ تو عمومی عنوان رکھ کر اصل میں سمجھانا اُن کو مقصود ہے،''تمہیں کیا ہوگیا کہ تم ایمان نہیں لاتے اللہ کے ساتھ'' یعنی کامل طریقے سے،'' حالانکہ رسول تمہیں دعوت دے رہا ہے تاکہ تم ایمان لے آؤ اپنے رَبّ کے ساتھ، اور اُس اللہ نے تم سے پختہ عہد بھی لیا، اگر تم اپنے دعوئ ایمان میں سچے ہو تو تمہیں کامل طریقے سے ایمان قبول کرنا چاہیے''،''وہی ہے جو اُتارتا ہے اپنے بندے پر واضح واضح آیات'' لِيُخْرِجَكُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ: تاکہ تمہیں وہ تاریکیوں سے نُور کی طرف نکالے، تاریکیوں سے مراد دُنیا کی محبت کی تاریکیاں، شہوات نفس کی تاریکیاں، اغراض پسندی کی تاریکیاں، ان سے اللہ تعالیٰ تمہیں نکالنا چاہتا ہے، رسول جس قسم کی ہدایات دیتا ہے تم اس کو اپنے لیے

مصیبت نہ سمجھو، یہ تو نُور ہی نُور ہے، اور اس کے خلاف ظلمت ہی ظلمت ہے، تمہیں ان آیات کو اور ان اَحکام کو غنیمت سمجھنا چاہیے کہ اس سے ظلمات ختم ہوتی ہیں اور روشنی اور نُور حاصل ہوتا ہے، تو اللہ کے اَحکام جو اللہ کے رسول کی وساطت سے آتے ہیں اُن کو اپنے لیے مصیبت نہ سمجھو، یہ تو تمہارے لیے رحمت ہیں، ''وہی ہے جو اُتارتا ہے اپنے بندے پر اَحکام واضح واضح تا کہ نکالے تمہیں تاریکیوں سے نُور کی طرف۔''

رؤف ورحیم میں فرق، اوران کو ذِکر کرنے کا مقصد

''اور بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے متعلق رؤف رحیم ہے'' رؤف اور رحیم دونوں کا مفہوم قریب قریب ہی ہے، شفیق، مہربان، لیکن فرق کرنے کے لئے یوں کہہ دیا جاتا ہے کہ رأفت کے اندر دَفع مضرت کا پہلو ہے، رحیم کے اندر ایصالِ منفعت کا پہلو ہے، جب کسی کو تکلیف میں دیکھیں تو اس کی تکلیف کو دُور کرنے کے لئے جو آپ کے اندر ایک مہربانی اور شفقت اُبھرتی ہے وہ رأفت کا مصداق ہے، اور کسی کو فائدہ پہنچانے کے لئے جو قلب کے اندر جذبہ آیا کرتا ہے وہ رحمت کا مصداق ہے، تو اللہ تعالیٰ رؤف بھی ہے کہ تمہیں نقصان سے بچاتا ہے اور رحیم بھی ہے کہ تمہیں نفع پہنچاتا ہے، اس لیے اس کے اَحکام جتنے بھی ہیں وہ سب تمہارے لیے رأفت اور رحمت کا تقاضا ہیں، وہ تمہارے اُوپر کوئی زیادتی یا ظلم نہیں ہے، تو اللہ کے اَحکام کو اپنے لیے رأفت اور رحمت کا تقاضا سمجھنا چاہیے، جب انسان کے دِل میں یہ بات آجائے گی کہ ایک مہربان کی طرف سے مجھے یہ حکم دیا جارہا ہے جو مجھ سے تکلیفیں دُور ہٹاتا ہے اور مجھے نفع پہنچاتا ہے، تو پھر قلب کے اندر یہ بات آئے گی کہ واقعی اِن اَحکام کا ماننا ہی ہمارے لیے مفید ہے اور اسی کے ساتھ ہم نقصان سے بچ سکتے ہیں، اور اگر ہم اِن اَحکام کو نہیں مانیں گے تو اپنا نقصان کریں گے اور مصیبت میں پڑیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ کی ان صفات کے ذِکر کرنے کے ساتھ اللہ کے اَحکام کی نوعیت متعین ہوتی ہے کہ ایک بہت مہربان اور شفیق کی طرف سے تمہیں یہ ہدایات دی جارہی ہیں جو تمہیں نقصان سے بچاتا ہے اور تمہیں نفع پہنچاتا ہے، تو اللہ کے اَحکام کی پابندی میں تمہارے لیے نفع بھی ہے اور نقصان سے بچاؤ بھی ہے، اور تم اُلٹا یہ سمجھتے ہو کہ ان اَحکام پر عمل کریں گے اور اللہ کے راستے میں خرچ کریں گے تو ہم خسارے میں چلے جائیں گے، یہی ذہنیت ہے جس کا یہاں اِزالہ کیا جارہا ہے۔

فتحِ مکہ سے پہلے اِسلام قبول کرنے والے صحابہ کی فضیلت

وَمَا لَكُمْ اَلَّا تُنْفِقُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ: تمہیں کیا ہوگیا کہ تم اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے حالانکہ آسمانوں اور زمین کی میراث اللہ ہی کے لئے ہے، سب ختم ہوجائیں گے اور باقی سب کچھ اللہ کے لیے رہ جائے گا۔ لَا يَسْتَوِيْ مِنْكُمْ مَّنْ اَنْفَقَ مِنْ قَبْلِ الْفَتْحِ وَقٰتَلَ: نہیں برابر تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے خرچ کیا فتحِ مکہ سے پہلے اور لڑائی لڑی، دُوسری شق خود بخود نکل آئی یعنی'' اور وہ لوگ جو فتحِ مکہ کے بعد خرچ کرتے ہیں اور لڑتے ہیں۔'' اگر یہ فتحِ مکہ سے پہلے کی اُتری ہوئی آیات ہیں جیسے کہ بعض مفسرین کی رائے ہے تو پھر یہ ترغیب دینا مقصود ہے کہ مکہ فتح ہونے سے پہلے پہلے اللہ کے راستے میں خرچ کرلو اور اللہ کے راستے میں جہاد کرلو،

اس کا بڑا درجہ ہے، اور جب اللہ تعالیٰ عرب فتح کروادے گا، مکہ فتح ہو جائے گا، پھر تو اسلام ایک قوت پکڑ جائے گا، تو ایسے وقت میں جاں بازی کی وہ قدر نہیں ہوگی جو اَب ہے، تو اس لیے کوشش کرو کہ مکہ فتح ہونے سے پہلے پہلے سابقین اوّلین کا درجہ حاصل کرو، اب جتنا جہاد کرو گے اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے اس کی زیادہ قدر ہے بمقابلہ اس کے کہ فتح مکہ کے بعد جو تم جہاد کرو گے اور اللہ کے راستے میں خرچ کرو گے۔ چونکہ مکہ فتح ہونے سے پہلے پہلے مسلمان کمزور تھے اور ان کے لئے مصیبتیں زیادہ تھیں، مالیت کی تنگی تھی، مکہ فتح ہو جانے کے بعد تو عرب پر ایک مکمل حکومت حاصل ہوگئی، پھر وہ بات نہیں رہی، اور جس وقت کوئی جماعت خطرات میں گھری ہوئی ہو، اور اپنے ابتدائی دور میں ہو، اُس کی ترقی کے اسباب کم معلوم ہوتے ہوں، مصیبتیں ہی مصیبتیں سامنے ہوں، تو جو لوگ اس وقت جماعت کے ساتھ وفاداری کیا کرتے ہیں تو دُنیا کا یہ اُصول ہے کہ ان کا درجہ پچھلوں کے مقابلے میں اُونچا ہوتا ہے، اور جس وقت کامیابی حاصل ہو جائے، ہر قسم کی قوت اور طاقت جمع ہو جائے، اس کے بعد شامل ہونے کی وہ بات نہیں ہوا کرتی جو اِبتدا میں داخل ہو کے مصیبتیں اُٹھانے والوں کی ہوا کرتی ہے، ''نہیں برابر تم میں سے وہ لوگ جنہوں نے خرچ کیا فتح سے قبل اور لڑائی لڑی، یہ لوگ زیادہ بڑے ہیں از روئے درجے کے بمقابلہ اُن لوگوں کے جنہوں نے خرچ کیا اس کے بعد اور لڑائی لڑی۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کی ساری جماعت مغفور ہے

وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى: لیکن ہر کسی کے ساتھ اللہ نے حُسنیٰ کا وعدہ کیا ہے، یعنی یہ نہیں کہ پہلے خرچ کرنے والے اور پہلے لڑنے والے یہ تو زیادہ اچھے ہیں، اور پچھلوں کی کوئی قدر قیمت نہ ہو، ایسی بات نہیں ہے، حسنیٰ کا وعدہ تو ہر کسی کے ساتھ ہے لیکن درجات کا فرق ہے، مکہ فتح ہونے سے پہلے جو قربانی دیتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کو زیادہ اُونچے درجے دے گا، ''اور ہر کسی سے اللہ نے اچھائی کا وعدہ کیا۔'' تو کُلًّا کے اندر تمام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آگئے، چاہے وہ فتح مکہ سے پہلے ایمان لانے والے ہیں یا فتحِ مکہ کے بعد۔ اور دُوسری جگہ آپ کے سامنے گزرا: اِنَّ الَّذِيْنَ سَبَقَتْ لَهُمْ مِّنَّا الْحُسْنٰٓى ۙ اُولٰٓئِكَ عَنْهَا مُبْعَدُوْنَ (سورۂ انبیاء: ۱۰۱) جن کے لئے ہماری طرف سے حسنیٰ طے ہوگئی، سبقت لے گئی، وہ اس جہنم سے دُور ہٹائے جائیں گے۔ اور صحابہ کے لئے حسنیٰ کا وعدہ یہاں اِس آیت میں آگیا، جس سے معلوم ہوگیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے والے چاہے فتح مکہ سے پہلے، چاہے فتحِ مکہ کے بعد، اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُن کے لئے حُسنیٰ کا وعدہ ہے، اور جس کے لئے حسنیٰ سبقت لے گئی وہ جہنم سے دُور رکھے جائیں گے، جس سے اشارہ اس بات کی طرف نکلتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی سب جماعت مغفور ہے...... روایات میں جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کے لئے کچھ عذاب کا تذکرہ ہے وہ برزخ کے متعلق روایات ہیں، یعنی اگر کوئی غلطی کوتاہی ہوئی، اوّل تو اللہ تعالیٰ دُنیا میں معاف فرما دیتے ہیں، توبہ کی توفیق دے دیتے ہیں، کیونکہ وہ لوگ خوف اور خشیت کے حامل تھے، اور اگر کچھ کمی کوتاہی رہ بھی گئی تو اللہ تعالیٰ قبر کے اندر برزخ میں تھوڑی بہت سزا دے کر معاف کر دیں گے، آخرت میں یہ ساری کی ساری جماعت مغفور ہے۔

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا فَیُضٰعِفَهٗ لَهٗ وَ لَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ ﴿۱۱﴾ یَوْمَ

کون ہے جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض، پھر بڑھا دے اس کے لئے اللہ تعالیٰ وہ، اور اس شخص کے لئے نفع بخش اجر ہے ○ جس دن

تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَ بِاَیْمَانِهِمْ

دیکھے گا تو مؤمن مردوں کو اور مؤمن عورتوں کو کہ اُن کا نور دوڑتا ہوگا اُن کے سامنے اور ان کی دائیں طرف،

بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ جَنّٰتٌ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ

تمہارے لیے بشارت ہے آج کے دن، باغات، جاری ہیں ان کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اس میں، یہ بہت بڑی

الْعَظِیْمُ ﴿۱۲﴾ یَوْمَ یَقُوْلُ الْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ لِلَّذِیْنَ اٰمَنُوا انْظُرُوْنَا نَقْتَبِسْ

کامیابی ہے ○ جس دن کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ان لوگوں کو جو کہ ایمان لے آئے، ہمارا انتظار کرو، ہم حاصل کرلیں

مِنْ نُّوْرِكُمْ ۚ قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا ؕ فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ لَّهٗ

تمہارے نور سے، کہہ دیا جائے گا کہ پیچھے لوٹو، اور نور تلاش کرو، پھر ان کے درمیان میں دیوار قائم کردی جائے گی، اُس دیوار کے لئے

بَابٌ ؕ بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ ﴿۱۳﴾ یُنَادُوْنَهُمْ

دروازہ ہوگا، اس دیوار کے اندر کی جانب اللہ کی رحمت ہوگی اور اس دیوار کے ظاہر کی طرف عذاب ہوگا ○ وہ منافق اُن مؤمنین کو آوازیں دیں گے،

اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ؕ قَالُوْا بَلٰى وَ لٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ وَ

کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے؟ مؤمنین جواب دیں گے، ٹھیک ہے، لیکن تم نے اپنے آپ کو گمراہی میں ڈالے رکھا، اور تم (ہمارے متعلق

تَرَبَّصْتُمْ وَ ارْتَبْتُمْ وَ غَرَّتْكُمُ الْاَمَانِیُّ حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ وَ

بُرے انجام کے) منتظر رہے اور تم شبہات میں پڑے رہے، اور خواہشات نے تمہیں دھوکا دیے رکھا، یہاں تک کہ اللہ کا حکم آگیا، اور

غَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴿۱۴﴾ فَالْیَوْمَ لَا یُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْیَةٌ وَّ لَا مِنَ الَّذِیْنَ

تمہیں دھوکا باز نے اللہ کے متعلق دھوکا دیا ○ پس آج نہیں لیا جائے گا تم سے کوئی فدیہ، نہ ان لوگوں سے جنہوں نے

كَفَرُوْا ؕ مَاْوٰىكُمُ النَّارُ ؕ هِیَ مَوْلٰىكُمْ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ﴿۱۵﴾ اَلَمْ یَاْنِ لِلَّذِیْنَ

کفر کیا، تمہارا ٹھکانا جہنم ہے، وہ جہنم تمہاری دوست ہے، اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے ○ کیا وقت نہیں آیا ان لوگوں کے لیے جو

اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ	51
ایمان لائے ہیں کہ نرم ہو جائیں اُن کے قلوب اللہ کی یاد کے لئے اور اس حق کے لئے جو اُترا آیا ہے، اور یہ (ایمان والے) نہ ہوں ان لوگوں	51
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ۭ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ	
کی طرح جو کتاب دیئے گئے اس سے پہلے پھر اُن کے اُوپر مدت دراز ہوگئی، پھر اُن کے دِل سخت ہوگئے، اور ان میں سے اکثر	
فٰسِقُوْنَ ⑯ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ۭ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ	
نافرمان ہیں ⑯ یقین کرلو کہ بے شک اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کی موت کے بعد، ہم نے تمہارے لئے نشانیاں واضح کردیں	
لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ⑰ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ وَاَقْرَضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا	
تاکہ تم سوچو ⑰ بے شک صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں اور وہ لوگ جو اللہ کو قرض دیتے ہیں اچھا قرض،	
يُّضٰعَفُ لَهُمْ وَلَهُمْ اَجْرٌ كَرِيْمٌ ⑱ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖٓ	
اُن کا دیا ہوا ان کے لئے بڑھایا جاتا ہے، اور ان کے لئے باعزت اَجر ہے ⑱ اور جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں،	
اُولٰٓئِكَ هُمُ الصِّدِّيْقُوْنَ ۖ وَالشُّهَدَآءُ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ لَهُمْ اَجْرُهُمْ وَنُوْرُهُمْ ۭ وَالَّذِيْنَ	
یہی لوگ صدیقین اور شہداء کا مصداق ہیں اپنے رَبّ کے ہاں، اُن کے لیے ان کا اَجر ہے اور اُن کا نُور ہے اور وہ لوگ جو	
كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ⑲	
کُفر کرتے ہیں اور ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں یہی جہنم والے ہیں ⑲	

تفسیر

قرضِ حسن کا مفہوم

مَنْ ذَا الَّذِیْ یُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا: یہ دُوسرے انداز میں ترغیب دی جارہی ہے، قرض جب کسی سے لیا جاتا ہے تو آپ جانتے ہیں کہ قرض لینے والا اپنے آپ کو ذمہ دار ٹھہراتا ہے کہ میں اِس کو واپس کروں گا، تو اللہ تعالیٰ کے نام پر جو کچھ دیا جائے اللہ تعالیٰ اُس کو بھی قرض سے تعبیر کرتے ہیں یہ یقین دلانے کے لئے کہ جو کچھ تم میرے راستے میں دو گے لوٹ کر تمہاری طرف ہی آئے گا، اور پھر جتنا دو گے اتنا نہیں آئے گا، اس سے بھی بہت زیادہ آئے گا، لیکن شرط یہ ہے کہ قرضِ حسن ہونا چاہیے، ''قرضِ حسن''

کا مطلب یہی ہے کہ اللہ کے رستے میں خرچ کیا جائے، حلال میں سے خرچ کیا جائے، نیک نیتی کے ساتھ خرچ کیا جائے، نیت اچھی ہو، پھر خرچ کرتے وقت اگر کسی مسکین کی امداد کی گئی ہے، یتیم کی امداد کی گئی ہے، یا جماعتی حیثیت میں کہیں خرچ کیا گیا ہے تو انسان اس میں ریا اور فخر اِختیار نہ کرے، کسی کے اُوپر اِحسان نہ جتلائے، جب یہ ساری کی ساری چیزیں موجود ہوں تو پھر اس کو ''قرضِ حسن'' کہا جاتا ہے، اور اُس کے لئے مضاعفت کا وعدہ ہے کہ پھر اللہ اس کو بڑھاتا ہے، کتنا بڑھاتا ہے؟ وہ اپنے اپنے خلوص کی مقدار پر ہے، اللہ تعالیٰ کے ہاں کوئی حد متعین نہیں ہے، جتنا چاہے جس کے لئے چاہے بڑھادے، کسی کو دس گنا دے دے، کسی کو سات سو گنا دے دے، اور روایات سے جیسے معلوم ہوتا ہے کہ ایک کھجور بڑھتے بڑھتے اُحد پہاڑ کے برابر ہو جاتی ہے،[1] تو آپ اندازہ ہی نہیں کر سکتے کہ کتنے گنا بڑھ گئے، ''کون ہے جو قرض دے اللہ کو اچھا قرض، پھر بڑھائے اس کے لئے اللہ تعالیٰ وہ'' وَلَهٗۤ اَجْرٌ كَرِیْمٌ: اور اُس شخص کے لئے اجر کریم ہے، نفع بخش اجر ہے۔

''اِیمان، اِنفاق اور جہاد'' آخرت میں نُور کا ذریعہ

یَوْمَ تَرَى الْمُؤْمِنِیْنَ وَ الْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰى نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ: جس دِن دیکھے گا تو مؤمن مردوں کو اور مؤمن عورتوں کو کہ اُن کا نُور دوڑتا ہوگا ان کے سامنے اور اُن کی دائیں طرف، بُشْرٰىكُمُ الْیَوْمَ: تمہارے لیے بشارت ہے آج کے دِن، بشارت کی تفصیل یہ ہے ''باغات، جاری ہیں اُن کے نیچے سے نہریں، ہمیشہ رہنے والے ہوں گے اُس میں، یہ بہت بڑی کامیابی ہے۔'' تو گویا کہ ایمان باللہ اور اِنفاق فی سبیل اللہ کے نتیجے میں مؤمن مرد اور مؤمن عورت اس کامیابی کو حاصل کریں گے، اور آخرت میں قیامت کے دِن جہاں تاریکی ہی تاریکی ہوگی تو اِسی ایمان، اِنفاق، جہاد کی برکت سے نُور حاصل ہوگا جس کے ساتھ وہ آخرت کا سفر طے کیا جائے گا، پُل صراط پر سے عبور ہوگا، یہ نُور کے حاصل ہونے کی تدبیر ہے، اِیمان کامل لاؤ اور اس کے بعد اِنفاق فی سبیل اللہ اور قتال اختیار کرو، عورتوں کے لئے قتال نہیں، لیکن اِنفاق فی سبیل اللہ کی تو ترغیب ہے، جس طرح سے قرضِ حسن اُوپر ذِکر ہوا۔

منافقوں کا نُور سے محروم رہنا اور دِیوارِ اَعراف کا ذِکر

''اور جس دِن کہیں گے منافق مرد اور منافق عورتیں ان لوگوں کو جو کہ ایمان لے آئے'' انْظُرُوْنَا: ہمارا اِنتظار کرو، نَقْتَبِسْ مِنْ نُّوْرِكُمْ: ہم حاصل کرلیں تمہارے نُور سے، ہم بھی تمہارے نُور سے کچھ نُور حاصل کرلیں، قِیْلَ ارْجِعُوْا وَرَآءَكُمْ: کہہ دیا جائے گا کہ پیچھے لوٹو، فَالْتَمِسُوْا نُوْرًا: اور نُور تلاش کرو، فَضُرِبَ بَیْنَهُمْ بِسُوْرٍ: پھر درمیان میں دِیوار قائم کردی جائے گی، سُور کہتے ہیں بڑی دیوار کو، بَیْنَهُمْ سے مؤمنین کی جماعت اور منافقین کی جماعت مراد ہے، ان کے درمیان میں دیوار قائم کردی جائے گی، لَّهٗ بَابٌ: اُس دیوار کے لئے دروازہ ہوگا، بَاطِنُهٗ فِیْهِ الرَّحْمَةُ: اس دیوار کے اندر کی جانب اللہ کی رحمت ہوگی، وَ ظَاهِرُهٗ مِنْ قِبَلِهِ الْعَذَابُ: اور اُس

(۱) بخاری ج۱ ص۱۸۹، باب الصدقه من كسب طيب/مشكوٰة ج۱ ص۱۶۷، باب فضل الصدقة کی پہلی حدیث۔ نوٹ:- اس حدیث میں مطلقاً پہاڑ کا ذکر ہے نہ کہ اُحد کا۔

دیوار کے ظاہر کی طرف عذاب ہوگا، یہ دیوار اَعراف ہے جس کا سورۂ اَعراف میں ذکر آیا تھا، اِبتداءً جو مخلص مؤمن تھے اور منافق، یہ اکٹھے ہوں گے، لیکن انجام میں جا کر فرق آجائے گا، مؤمنین کو نُور ملے گا، منافقین اندھیرے میں رہ جائیں گے، جن کے دل میں خلوص نہیں اور جب اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کے لئے کہا جاتا ہے تو وہ ہزار حیلے بہانے کرتے ہیں وہ نُور سے محروم ہو جائیں گے، پھر وہ اُن مؤمنین کو کہیں گے کہ ہمارا اِنتظار کرو، ہمیں اپنے ساتھ شامل کرلو، تاکہ تمہاری روشنی سے ہم بھی فائدہ اُٹھائیں، لیکن اُنہیں کہا جائے گا کہ اب یہ نُور حاصل کرنے کا موقع نہیں، اب پیچھے لوٹو اگر نُور لینا ہے تو، ''پیچھے لوٹنے'' سے مراد ہے دُنیا کی طرف واپس جانا، لیکن آپ جانتے ہیں کہ پیچھے لوٹنے کا کیا موقع باقی رہ گیا؟ اس لیے وہ لوگ نُور سے محروم ہو جائیں گے۔ تو منافقین اور منافقات کو یہ تنبیہ کرنی مقصود ہے کہ پھر تم پچھتاؤ گے، چیخو گے، چلاؤ گے، آج موقع ہے اِس نُور کے لئے سامان جمع کرنے کا، آج کرلو، اپنے دِلوں میں اِخلاص پیدا کرو اور اِیمان کی صداقت کے ثبوت کے لئے اللہ کے راستے میں خرچ کرو، ''اُنہیں کہہ دیا جائے گا پیچھے لوٹو'' ، ''پیچھے لوٹنے'' سے مراد ہے دُنیا کی طرف جاؤ، نُور حاصل کرنے کا وہ موقع تھا'' پھر دیوار حائل ہو جائے گی''، اس دیوار سے اَعراف مراد ہے، اندر کی جانب، پرلی جانب جنّت ہوگی، مؤمنین اُدھر چلے جائیں گے، فَضُرِبَ بَيْنَهُمْ بِسُوْرٍ: ان کے درمیان میں دیوار قائم کردی جائے گی، سُور بڑی دیوار کو کہتے ہیں، سُور البلد جس طرح سے شہر کے اِردگرد فصیل ہوا کرتی ہے، اس کا مصداق وہی اَعراف ہے، اس میں دروازہ ہوگا، اِسی دروازے کے ساتھ جنّتی دوزخی آپس میں گفتگو کریں گے، جو طویل گفتگو آپ کے سامنے سورۂ اَعراف میں گزری، ''اُس دیوار کے اندر کی جانب اللہ کی رحمت ہوگی یعنی اُدھر جنّت ہے، اور اُس کا ظاہر یعنی اِدھر سے، مِنْ قِبَلِهِ: اُس ظاہر کی طرف سے عذاب ہوگا یعنی اِدھر جہنّم ہوگی، يُنَادُوْنَهُمْ: وہ منافق اُن مؤمنین کو آوازیں دیں گے اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ: کیا ہم تمہارے ساتھی نہیں تھے؟ یعنی آج ہمیں چھوڑے جا رہے ہو، روشنی تمہارے پاس ہے، ہمارے پاس ہے نہیں، ہمارا کچھ اِنتظار کرو، ہم دُنیا میں تمہارے ساتھ ہوتے تھے۔ دُنیا میں تو اُصول یہ ہے کہ اگر ایک آدمی کے ہاتھ میں بیٹری ہو، لالٹین ہو، تو دُوسرا اس کے ساتھ چلنے والا اگر اس کے ہاتھ میں نُور نہیں ہے، تو اُس کے نُور سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے، لیکن آخرت میں یہ ضابطہ نہیں ہوگا، آخرت میں تو یوں ہوگا کہ جس کے لئے اللہ نے نُور بنا دیا وہی اُس نُور سے فائدہ اُٹھا سکے گا، دُوسرا ایسا ہوگا جیسے چراغ بردار کے ساتھ ساتھ کوئی اندھا چل رہا ہو، اگر اُس کے پاس والے کے ہاتھ میں چراغ بھی ہو، لیکن جس طرح سے اندھا اس سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتا، تو یہ منافق اس نُور سے فائدہ نہیں اُٹھا سکیں گے، وہ بھی ایسے ہی ہیں جس طرح سے نابینے، اِس نُور سے اُنہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا۔

منافقین کی محرومی کی وجوہات

تو وہ کہیں گے کہ ہم تمہارے ساتھ ہوتے تھے اب ہمیں ساتھ لے کر چلو، قَالُوْا: مؤمنین جواب دیں گے بَلٰی: ٹھیک ہے

کہ تم ظاہری طور پر ہمارے ساتھ تو ہوتے تھے، وَلٰكِنَّكُمْ فَتَنْتُمْ اَنْفُسَكُمْ: لیکن تم نے اپنے آپ کو گمراہی میں ڈالے رکھا وَتَرَبَّصْتُمْ: اور تم ہمارے متعلق برے انجام کے منتظر رہے، تربّص انتظار کرنے کو کہتے ہیں تم اس طرح سے انتظار کرتے رہے گویا کہ ہم برباد ہونے والے ہیں، اور ہمارے متعلق برے انجام کے تم منتظر تھے، وَارْتَبْتُمْ: اور تم شبہات میں پڑے رہے، اللہ اور اللہ کے رسول کی باتوں پہ تمہیں یقین نہیں آتا تھا، تم یہ سمجھتے تھے کہ جو کہا جا رہا ہے کہ عنقریب غلبۂ اسلام ہوگا، تمہیں یقین نہیں آتا تھا، تم سمجھتے تھے شاید مشرک اور یہودی غالب آجائیں گے، پھر ان سے ہمیں ضرورت پڑے گی، تو تم اُن کے ساتھ بھی تعلقات رکھتے تھے، جنت، دوزخ یا آخرت کی جو باتیں تمہیں بتائی جاتی تھیں تمہارے دل میں تردّد رہتا تھا، تمہیں یقین نہیں آتا تھا، ''تم شبہات میں پڑے رہے'' وَغَرَّتْكُمُ الْاَمَانِيُّ: اور خواہشات نے تمہیں دھوکا دیے رکھا، دھوکے میں ڈالا تمہیں تمہاری خواہشات نے، حَتّٰى جَآءَ اَمْرُ اللّٰهِ: یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ گیا، وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ: اور تمہیں دھوکا باز نے اللہ کے متعلق دھوکا دیا، شیطان کے مغالطے میں آئے رہے، دلوں کے اندر جھوٹی خواہشات پکاتے رہے، مسلمانوں کے متعلق برے انجام کے تم منتظر رہے، اپنے آپ کو گمراہی میں تم نے ڈالے رکھا، رسول جن باتوں سے تمہیں نکالنا چاہتا تھا تم ان باتوں سے نکلتے نہیں تھے، تو اگر ظاہری طور پر تم ہمارے ساتھ بھی تھے، ہمارے ساتھ نماز روزے کرتے تھے تو کیا فائدہ؟ جب دلوں کی کیفیت یہ تھی۔ اس لیے وہ معیت کوئی کام نہیں آئے گی۔

منافق و کافر انجامِ کار یکساں

فَالْيَوْمَ لَا يُؤْخَذُ مِنْكُمْ فِدْيَةٌ: پس آج کے دن نہیں لیا جائے گا تم سے فدیہ، اور نہ اُن لوگوں سے جو صراحتاً کافر تھے، منافق ہوں یا کافر آج کوئی فدیہ دے کر اپنی جان نہیں چھڑا سکیں گے، نہ وہاں فدیہ دینے کے لیے کچھ ہوگا ہی، بالفرض ہوتو بھی لیا نہیں جائے گا، وَلَا مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا: یہ صراحت کر دی کہ منافقین بھی ایسے ہی اور کافر بھی ایسے ہی، انجام کے اعتبار سے منافق اور کافر میں کوئی فرق نہیں ہے، ''آج نہیں لیا جائے گا تم سے کوئی فدیہ، نہ اُن لوگوں سے جنہوں نے کفر کیا'' مَاْوٰىكُمُ النَّارُ: تمہارا ٹھکانا جہنم ہے، هِيَ مَوْلٰىكُمْ: وہی آگ تمہاری دوست ہے، وہی آگ تمہارا مولیٰ ہے، وہی تمہاری کارساز ہے، وہی تمہاری یار دوست ہے، آج جو کچھ تمہیں ملے گا جہنم سے ملے گا، دُوسری طرف سے اب کچھ اُمید نہ رکھو، وہ جہنم تمہاری رفیق ہے، وہ تمہاری مولیٰ ہے، وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ: اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

منافقین کو اِخلاص کی ترغیب

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ: کیا وقت نہیں آیا ان لوگوں کے لئے جو ایمان لائے ہیں، یعنی ایمان کے مدعی ہیں، زبان سے وہ ایمان لے آئے، کیا وقت نہیں آیا اُن لوگوں کے لئے جو ایمان لے آئے ہیں کہ نرم ہو جائیں ان کے قلوب اللہ کی یاد کے لئے اور اس حق کے لیے جو اُترا آیا ہے، یعنی اتنے آثار اَب نمایاں ہوتے جا رہے ہیں اسلام کی فتوحات کے اور اسلام

کی حقانیت کے، کہ کیا اب بھی وقت نہیں آیا؟ کہ اِن میں غور کر کر کے اللہ کے ذِکر کے لئے (اللہ کے ذِکر سے قرآن مراد ہے) اور جو بھی حق حضور ﷺ کی زبان سے نمایاں ہو رہا ہے اُس کے لئے اِن کے قلوب نرم ہو جائیں، وَلَا يَكُوْنُوْا: اور یہ ایمان والے نہ ہوں ان لوگوں کی طرح جو کتاب دیے گئے اِس سے قبل، فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ: پھر اُن کے اُوپر مدت دراز ہو گئی، فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ: پھر ان کے دِل سخت ہو گئے، وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ: اور ان اہلِ کتاب میں سے اکثر نافرمان ہیں، یعنی تمہارا حال اہلِ کتاب جیسا نہیں ہونا چاہیے، اہلِ کتاب کو کتاب دی گئی، لیکن مدت دراز گزر گئی، کتاب کے متعلق ان کے جذبات اچھے نہ ہوئے، آخر دِل سخت ہو گئے، پھر سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ کسی قسم کا تاثر قبول کریں۔ اب تمہیں بھی سمجھایا جا رہا ہے، بار بار سمجھایا جا رہا ہے، جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا ہے، تمہاری نافرمانی تمہارے قلوب کے اندر قساوت پیدا کر دے گی، ایسا نہیں ہونا چاہیے، اس لیے جلد از جلد اللہ تعالیٰ کی نصیحتوں سے متاثر ہو جاؤ، قرآن اور حق کو قبول کر لو، اب وقت آ گیا ہے کہ تمہارے دِل اللہ کے ذِکر کے لئے اور قرآن کے لئے نرم ہو جانے چاہئیں،'' نہ ہو جائیں ان لوگوں کی طرح جو کتاب دیے گئے اِس سے قبل، پھر ان کے اُوپر مدت دراز گزر گئی، پھر ان کے دِل سخت ہو گئے، اور اُن میں سے اکثر نافرمان ہیں۔''

قرآن مُردہ دِلوں کے لئے رُوحانی بارش

''یقین کر لو کہ بے شک اللہ زندہ کرتا ہے زمین کو اس کے بنجر ہونے کے بعد'' تو جس طرح سے زمین ویران ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو آباد کرتا ہے، تو قلوب بھی ویران تھے اسی طرح سے اللہ تعالیٰ نے آسمانی بارش کے ساتھ ان قلوب کو بھی زِندہ کیا، تو اللہ تعالیٰ کی اس بارش سے جو کہ قرآنِ کریم کی شکل میں اُتر رہی ہے فائدہ اُٹھاؤ، یہ ویران قلوب اسی کے ساتھ ہی زندہ ہوں گے، قساوتِ قلبی کے ساتھ اِحیائے ارض کو جو ذِکر کیا جا رہا ہے تو اس میں مناسبت یہی ہے، تمہارے دِل سخت ہیں، یہ بھی بنجر زمین کی طرح ہیں، اگر ان کو آباد کرنا چاہتے ہو تو اس کا طریقہ یہی ہے کہ اللہ کی نصیحت کو قبول کر لو اور اس دِین کو قبول کرو، یہ قرآن ایک رُوحانی بارش ہے، جو اس کے لئے اپنے دِل کے دروازے کھولے گا اسی کا دِل سرسبز و شاداب ہوگا'' بے شک اللہ زِندہ کرتا ہے زمین کو اس کی موت کے بعد'' قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ: ہم نے تمہارے لیے نشانیاں واضح کر دیں، لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ: تاکہ تم سوچو۔ اِنَّ الْمُصَّدِّقِيْنَ وَالْمُصَّدِّقٰتِ: بے شک وہ لوگ جو کہ صدقہ کرتے ہیں مرد ہوں یا عورتیں، بے شک صدقہ کرنے والے مرد اور صدقہ کرنے والی عورتیں، اور وہ لوگ جو اللہ کو قرض دیتے ہیں اچھا قرض، يُّضٰعَفُ لَهُمْ: اُن کے لئے بڑھایا جاتا ہے، اُن کا دیا ہوا اُن کے لئے بڑھایا جاتا ہے،'' اور اُن کے لیے باعزت اجر ہے، اور جو لوگ اللہ کے ساتھ ایمان لاتے ہیں اور اس کے رسولوں کے ساتھ ایمان لاتے ہیں یہی لوگ صدیقین اور شہداء کا مصداق ہیں'' اپنے اپنے درجے کے اعتبار سے کوئی صدیق کے مرتبے میں ہوگا، کوئی شہید کے مرتبے میں ہوگا، ''اِن کے لئے اِن کا اجر ہے اور اِن کا نُور ہے، اور وہ لوگ جو کُفر کرتے ہیں اور ہماری آیات کو جھٹلاتے ہیں یہی جہنم والے ہیں۔''

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ

یقین کرلو کہ دُنیوی زندگی تو ایک کھیل تماشا ہے، اور ایک ظاہری زینت ہے، اور آپس میں فخر کرنا ہے ایک دُوسرے کے مقابلے میں،

وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ۭ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ

اور مال اور اولاد کے اندر ایک دُوسرے کے مقابلے میں کثرت پیدا کرنا ہے، (مثال اِس کی ایسے ہی ہے) جیسے کہ بارش، اس کی نباتات کافروں

نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطَامًا ۭ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ

کو خوش کرتی ہے، پھر وہ کھیتی بھڑک اُٹھتی ہے، پھر تُو اس کو دیکھتا ہے کہ وہ زرد ہوگئی، پھر وہ ریزہ ریزہ ہوجاتی ہے، آخرت میں سخت

شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ۭ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝۲۰

عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے، اور نہیں ہے دُنیوی زندگی مگر دھوکے کا سامان ۝۲۰

سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَاۗءِ وَالْاَرْضِ ۙ

دوڑو مغفرت کی طرف اپنے رَبّ کی جانب سے، اور ایسی جنّت کی طرف جس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کی طرح ہے،

اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۭ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ

تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ پر اِیمان لاتے ہیں اور اُس کے رسولوں پر اِیمان لاتے ہیں، یہ اللہ کا فضل ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے،

وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۱ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ

اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے ۝۲۱ نہیں پہنچتی تمہیں کوئی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں

اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مِّنْ قَبْلِ اَنْ نَّبْرَاَهَا ۭ اِنَّ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرٌ ۝۲۲ۚۖ لِّكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰي مَا

مگر وہ کتاب میں ہے قبل اس کے کہ ہم اس کو پیدا کریں، اور یہ اللہ پر آسان ہے ۝۲۲ تاکہ تم غمزدہ نہ ہو اُس چیز پر جو

فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝۲۳ۙ

تم سے فوت ہوجائے، اور نہ تم اِترایا کرو اس چیز پر جو اللہ تمہیں دے دے، اللہ تعالیٰ ہر اَکڑنے والے کو، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا ۝۲۳

الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ

جن کی عادت یہ ہے کہ وہ بُخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بُخل سکھاتے ہیں، اور جو کوئی اِعراض کرتا ہے تو بے شک اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے،

الْحَمِيْدُ ﴿۲۴﴾ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ
اور صفتایا ہوا ہے ﴿۲۴﴾ ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب اور میزان بھی اُتاری
لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ
تاکہ لوگ انصاف کو قائم کریں، اور ہم نے لوہا اُتارا، اس میں سخت دبدبہ ہے اور لوگوں کے لئے منافع ہیں،
وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ ﴿۲۵﴾
(تاکہ اللہ لوگوں کو نفع پہنچائے) اور تاکہ اللہ جان لے اس شخص کو جو اس کی اور اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بن دیکھے، بے شک اللہ قوی عزیز ہے ﴿۲۵﴾

تفسیر

اِنفاق فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ سے مانع اصل کے اعتبار سے دُنیا کی محبت ہے، کہ جب انسان دُنیا کی محبت میں مبتلا ہوتا ہے تو اُس کے دِل میں خواہش ہوتی ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ جمع کروں، اچھے سے اچھا مکان ہو، اچھے سے اچھا لباس ہو، اور میرے گھر کا باقی سامان بہترین سے بہترین ہو، اِس زیب وزینت میں انسان مبتلا ہوتا ہے تو پھر اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کا داعیہ اُس کے قلب کے اندر پیدا نہیں ہوتا، اور ایسے ہی دُنیا کی محبت انسان کو جاں بازی سے بھی روکتی ہے، مال خرچ کرنے سے بھی روکتی ہے جاں بازی سے بھی روکتی ہے، اس لیے اب اگلے رُکوع کے اندر اس دُنیا کی فنائیت کو پیش کیا جارہا ہے، کہ اس دُنیا کی محبت میں مبتلا ہوکے تم اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے بخل نہ کرو۔

دُنیوی زندگی محض ایک کھیل تماشا

اِعْلَمُوْٓا: یقین کرلو، اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ: کہ دُنیوی زندگی تو ایک کھیل تماشا ہے، لعب اور لہو کا لفظ ہمیشہ اکٹھا آتا رہتا ہے، کھیل کود، کھیل تماشا، یہ تو ایک کھیل تماشا ہے جو جلدی ختم ہوجائے گا۔ وَّزِيْنَةٌ: اور یہ دُنیاوی زندگی ایک ظاہری زینت ہے، نمائش ہے، ظاہری طور پر یہ خوبصورتی ہے۔ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ: اور آپس میں فخر کرنا ہے ایک دوسرے کے مقابلے میں، وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ: مال اور اولاد کے اندر ایک دوسرے کے مقابلے میں کثرت پیدا کرنا ہے۔ یہی حاصل ہے دُنیوی زندگی کا، لہو ولعب ہے، زینت ہے، تفاخر ہے، تکاثر ہے، یہ حاصل ہے اِس زندگی کا جس کا نتیجہ کوئی اچھا نکلنے والا نہیں۔ اس کی مثال تو ایسے ہی ہے کہ جیسے بارش ہوتی ہے، نباتات پیدا ہوتی ہے، کسان لوگ اس کو دیکھ کر خوش ہوجاتے ہیں، لیکن ایک وقت آتا ہے کہ یک دَم وہ

خشک ہو جاتی ہے، چورا چورا ہو جاتی ہے، اسی طرح اس دُنیوی زندگی میں چاہے کتنی زینت ہے، کتنی خوبصورتی ہے، کتنا فخر کرلو، کتنا تکاثر پیدا کرلو، بالکل ایک دن سرسبز وشاداب فصل کی طرح یہ بھی اُجڑ جائے گی اور وہی! ریزہ ریزہ ہو جائے گی، مٹی میں تم جاملو گے، اور پلّے تمہارے کچھ نہیں ہوگا، اس لیے دُنیا کی محبت میں مبتلا ہو کے اپنی آخرت سے غفلت برتنا یہ عقل مندی نہیں ہے۔

اِنسانی زندگی کے تین اَدوار اور تین ترجیحات

لہو ولعب......! اکثر وبیشتر بچپن میں انسان اس دُنیوی زندگی میں صرف کھیل تماشے کا شوقین ہوتا ہے، جب ذرا جوانی میں آتا ہے تو پھر زیب وزینت، سجاوٹ، آرائش، نمائش اِس کے جذبات ہوتے ہیں، اور جس وقت پھر یہ بڑا ہوتا ہے، بڑھاپے کی طرف آتا ہے تو پھر اپنی جمع کی ہوئی پونجی پر ایک دُوسرے کے مقابلے میں فخر کرتے ہیں، اپنی اولاد اور مال کے متعلق ایک دُوسرے کے مقابلے میں کثرت کا دعویٰ کرتے ہیں کہ میرے پاس مال زیادہ ہے، میری اولاد زیادہ ہے، انہی درجات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے کہ دُنیوی زندگی اوّل سے لے کر آخر تک یہی چیزیں ہیں، اور ان میں سے کوئی بات بھی نہیں جو انسان کے لئے انجام کے اعتبار سے مفید ہو۔ ''مثال اس کی ایسے ہی ہے جیسے کہ بارش'' اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ: کُفّار کافر کی جمع ہے، اکثر مفسرین نے یہاں ''کُفّار'' سے ''زُرّاع'' مراد لیے ہیں، کھیتی کرنے والے، کاشت کار، کیونکہ کَفَرَ چھپانے کے معنی میں آتا ہے، تو کاشت کار بھی زمین کے اندر بیج کو چھپاتا ہے، ''اس کھیتی کو دیکھ کر کاشت کار مزارعین خوش ہوتے ہیں۔'' اور اگر ''کُفّار'' سے ''کافر'' ہی مراد لیے جائیں تو پھر یہ عنوان رکھنا مقصود ہے کہ دُنیوی زیب وزینت کو دیکھ کر خوش ہونا دراصل کافروں کا کام ہے، مؤمن کے سامنے اگر کھیتی لہراتی ہوئی آتی بھی ہے تو لہراتی ہوئی کھیتی پر نظر ڈال کے وہ اللہ کے شکر کی طرف متوجہ ہوتا ہے، عُجب میں مبتلا نہیں ہوتا، اس لیے دُنیوی زندگی پر کامل طریقے سے خوشی صرف کافر کو ہوتی ہے اس لیے ''کُفّار'' کا یہاں ذکر کر دیا، یعنی کھیتوں کو دیکھ کر خوش مؤمن بھی ہوتے ہیں، لیکن ان کی خوشی ہوتی ہے اللہ کی طرف نسبت کرتے ہوئے جس کو شکر کا جذبہ کہتے ہیں، اور حقیقتاً عُجب میں مبتلا ہو جانا اور اللہ کی طرف نسبت کیے بغیر خوشی میں مبتلا ہو جانا صرف کافروں کا کام ہے، اس لیے عنوان میں یہاں کافروں کو ذکر کیا گیا ہے، ''جیسے کہ بارش، اس کی نباتات'' یعنی اس بارش کی وجہ سے جو نباتات اُگتی ہے ''وہ کافروں کو خوش کرتی ہے''، ثُمَّ يَهِيْجُ: هَاجَ يَهِيْجُ جوش مارنے کے معنی بھی آتا ہے، ''پھر وہ کھیتی بھڑک اُٹھتی ہے'' یعنی پورے شباب کو پہنچ جاتی ہے، فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا: پھر تو اُس کو دیکھتا ہے کہ وہ زرد ہوگئی، ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا: پھر وہ ریزہ ریزہ ہو جاتی ہے۔ تو یہی دُنیوی زندگی کی مثال ہے، کھیل کود سے شروع ہوئے، جوانی شروع ہوئی تو زیب وزینت کا شوق ہوا، اپنے کو بنانے سنوارنے کا جذبہ پیدا ہوا، پھر آپس میں تفاخر اور تکاثر کی نوبت آئی، آخر موت آتی ہے سب خاتمہ کر دیتی ہے، جس طرح سے فصل کٹ جاتی ہے اسی طرح سے زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ نتیجہ کیا ہوگا؟ نتیجے میں دو باتیں آئیں گی، وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ: آخرت میں سخت عذاب ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے مغفرت اور

رضوان ہوگا، یعنی جس نے دُنیوی زندگی میں جو بویا آخرت میں کاٹے گا، اگر اس طریقے پر چلا جس کے نتیجے میں سخت عذاب ہے تو ایسا ہو جائے گا، اور اگر ایسا طریقہ اپنایا جس کے نتیجے میں اللہ کی مغفرت اور رضوان حاصل ہوتی ہے تو وہ بھی سامنے آجائے گی، یعنی دُنیوی زندگی کا انجام یہ ہے، ''آخرت میں سخت عذاب ہے اور اللہ کی طرف سے مغفرت اور رضامندی ہے، اور نہیں ہے دُنیوی زندگی مگر دھوکے کا سامان'' دھوکے کا سامان اس طرح سے ہے کہ انسان اس کی محبت میں مبتلا ہو کر اپنی ساری توجہ ادھر لگا دیتا ہے، یوں سمجھتا ہے کہ یہ میرے کام آنے والی چیز ہے، یہ میرا حاصلِ زندگی ہے، لیکن زندگی ختم ہو جاتی ہے، یہ سامان سارے کا سارا چھوٹ جاتا ہے، تو جیسے اعتماد اس کے اُوپر کیا تھا یہ کسی کام نہ آیا، اس لیے اس کو ''دھوکے کا سامان'' کہا جاتا ہے، وقت پر کام آنے والی چیز نہیں۔

مغفرت اور جنّت حاصل کرنے کی ترغیب

دُنیا کی محبت میں مبتلا نہ ہو، سَابِقُوْۤا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ: دوڑو اللہ کی مغفرت کی طرف، یعنی ایسے اعمال اور طریقے اختیار کرو جس کے نتیجے میں اللہ کی مغفرت اور رضوان حاصل ہو، ''دوڑو مغفرت کی طرف اپنے رَبّ کی جانب سے، اور ایسی جنّت کی طرف جس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کی طرح ہے'' یعنی بہت وسیع جنّت ہے، کہ زمین و آسمان کو جوڑ لیا جائے تو اس طرح سے جنّت کی چوڑائی معلوم ہوگی، ''اس کی چوڑائی زمین و آسمان کی چوڑائی کی طرح ہے'' اُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ: تیار کی گئی ہے ان لوگوں کے لئے جو اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور اس کے رسولوں پر ایمان لاتے ہیں، ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ: اور ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا حاصل ہو جانا جس کے نتیجے میں فوزِ عظیم اور جنّت ملتی ہے یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، ''اور اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والا ہے۔''

اِنسان کی غفلت کے دو بنیادی سبب اور ان کا علاج

مَاۤ اَصَابَ مِنْ مُّصِيْبَةٍ فِي الْاَرْضِ وَلَا فِيْۤ اَنْفُسِكُمْ: یہ بھی انسان کا ایک نفسیاتی علاج ہے، دُنیا کے اندر رہتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے غفلت انسان کو دو طرح سے ہوتی ہے، بسا اوقات کسی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے تو بے صبری میں واقع ہو جاتا ہے، تو بھی اللہ کے ساتھ تعلق نہیں رہتا، اور دُنیا کی کوئی زیب و زینت مال و دولت حاصل ہوتا ہے تو اکڑنے اترانے لگ جاتا ہے، تو یہ بھی اللہ سے لاتعلقی کی علامت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ دونوں باتوں کے بارے میں یہ بات سمجھ لو کہ چاہے کوئی مصیبت آئے چاہے کوئی دُکھ آئے، کوئی چیز ہو، یہ پیدا ہونے سے قبل اللہ نے لکھ دی، اس لیے اگر کوئی مصیبت تکلیف آئے تو یوں سوچ کے صبر کر لیا کرو کہ اللہ کی طرف سے مقدر تھی، تو بھی اللہ کے ساتھ اپنا تعلق کمزور نہ ہونے دو، اگر کوئی نعمت حاصل ہو جائے تو اس میں فخر نہ کیا کرو، یوں کہا کرو کہ اللہ کی طرف سے مقدر تھی اس لیے مل گئی، اس میں ہمارا کوئی کمال نہیں ہے، یوں نسبت انسان تکلیف میں اور راحت میں

اللہ کی طرف کرتا رہے تو پھر اطاعت کی توفیق ہوتی ہے، ''نہیں پہنچتی تمہیں کوئی مصیبت زمین میں'' زمین میں مصیبت پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ کھیتوں کو مصیبت پہنچ گئی، باغات کو پہنچ گئی، دوست احباب کو پہنچ گئی، اپنی ذات کے علاوہ جس چیز کے اندر بھی کوئی مصیبت نمایاں ہو وہ آپ کے لیے زمین میں مصیبت ہے۔

عقیدۂ تقدیر کی اہمیت اور اس کا مفہوم

وَلَا فِيٓ اَنْفُسِكُمْ: یہ تمہاری اپنی جانوں میں ہوگئی، ''نہیں پہنچتی تمہیں کوئی مصیبت زمین میں اور نہ تمہاری جانوں میں مگر وہ کتاب میں ہے قبل اس کے ہم اس کو پیدا کریں'' دُنیا میں پیدا کرنے سے قبل وہ کتاب میں ہے، کتاب سے مراد ''لوحِ محفوظ''، یہ اللہ کی تقدیر پہلے جاری ہے، ''اور یہ اللہ پر آسان ہے'' کہ تمام واقعات، تمام حادثات، جو کچھ ہونے والا ہے، اس کو پہلے لکھ رکھے، اللہ کے لیے مشکل کوئی نہیں! اور یہ اِن کا مقدر کرنا اور پھر تمہیں اطلاع دینا یہ اس لیے ہے (لِّكَيْلَا کا متعلق یوں نمایاں کیا جائے گا) یہ ہم نے پہلے مصیبتیں لکھ لیں اور پھر تمہیں ان کی اطلاع دے دی'' تا کہ تم غمزدہ نہ ہو اس چیز پر جو تم سے فوت ہو جائے'' جب کوئی چیز فوت ہو جائے یوں سمجھ لیا کرو کہ اللہ کی طرف سے مقدر یوں ہی تھا، وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ: اور نہ تم اَکڑا، اِترایا کرو اس چیز پر جو اللہ تمہیں دے دے، یوں ہی سوچا کرو کہ اللہ کے فضل سے ملی ہے، اس میں ہمارا کیا کمال ہے اگر اللہ کی طرف سے مقدر نہ ہوتی تو ہمیں یہ نہ پہنچتی، جب یوں تقدیر پر ایمان ہو تو پھر انسان مصیبت میں گھبراتا نہیں، اور خوشی کی حالت میں اَکڑتا اور اِتراتا نہیں، تقدیر کے متعلق یہی عقیدہ ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک شخص، ایک صحابی سے سوال کرتا ہے کہ میرے دِل میں کچھ تردّد سا ہے تقدیر کے بارے میں، مجھے کوئی بات بتاؤ جس سے میرا یہ تردّد دُور ہو جائے، تو انہوں نے اس عقیدے کی وضاحت بھی کی، وضاحت کرنے کے بعد تقدیر کا خلاصہ یہ بیان کیا، کہتے ہیں کہ ''لَوْ اَنْفَقْتَ مِثْلَ اُحُدٍ ذَهَبًا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ مَا قَبِلَهُ اللّٰهُ مِنْكَ حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ'' اگر اُحد پہاڑ کے برابر سونا بھی اللہ کے راستے میں خرچ کرو، اللہ تعالیٰ اس کو قبول نہیں کرے گا جب تک تمہارا تقدیر پر ایمان نہ ہو۔ کیونکہ تقدیر پر ایمان لانا یہ ایمانِ صحیح کے لئے رُکن ہے، اور اگر کوئی شخص تقدیر کا منکر ہے، وہ کافر ہے، کافر اُحد پہاڑ کے برابر سونا چھوڑو، زمین وآسمان کے درمیان کا بھرا ؤ سونے کا اگر خرچ کرے تو بھی اللہ کے ہاں قبول نہیں۔ تقدیر پر ایمان لانے کا کیا مفہوم ہے؟ تقدیر پر ایمان کس طرح سے لانا چاہیے؟ ''حَتّٰى تُؤْمِنَ بِالْقَدَرِ وَتَعْلَمَ اَنَّ مَا اَصَابَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَكَ وَاَنَّ مَا اَخْطَاَكَ لَمْ يَكُنْ لِيُصِيْبَكَ'' جب تک تُو تقدیر پر ایمان نہ لائے اور یہ یقین نہ رکھے کہ جو تکلیف تجھے پہنچ گئی وہ خطا کرنے والی نہیں تھی، اور جو خطا کر گئی وہ پہنچنے والی نہیں تھی۔ (۱) یہ عقیدہ یوں رکھنا ضروری ہے، جو حال بھی تجھے پہنچ گیا وہ خطا کرنے

---

(۱) ابوداؤد ۲/ ۲۹۰ باب فی القدر۔ مشکوٰۃ ۱/ ۲۳ باب الایمان بالقدر فصل ثالث۔ عن ابن الدیلمی

والا نہیں تھا، اور جو خطا کر گیا وہ پہنچنے والا نہیں تھا،"وَلَوْ مِتَّ عَلٰى غَيْرِ هٰذَا لَدَخَلْتَ النَّارَ" اگر اس عقیدے کے علاوہ کوئی اور عقیدہ رکھو گے تو سیدھے جہنم میں جاؤ گے۔ اور اس عقیدے کا نفسیاتی اثر یہ ہے کہ بڑی سے بڑی تکلیف آ جائے تو انسان جب سوچتا ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے تو انسان کے قلب کو قوت حاصل ہوتی ہے، اور بڑی سے بڑی دولت دُنیا میں حاصل ہو جائے تو انسان کبھی فخر نہیں کرتا اور اُکڑتا نہیں کہ یہ میں نے اپنے کمال سے حاصل کر لی، بلکہ یوں سوچتا ہے کہ اللہ نے مقدر کی تھی اس لیے مل گئی، اگر مقدر میں نہ ہوتی تو کیسے ملتی، میرے ذاتی کمال سے یہ بات حاصل نہیں ہوئی، تو اس طرح سے پھر انسان کے جذبات متوازن رہتے ہیں، نہ وہ بے صبری میں پڑتا ہے اور نہ وہ فخر اور اِترانے میں آتا ہے۔ اس لیے تمہیں یہ اطلاع دی جا رہی ہے۔

''متکبر'' اللہ کا مبغوض!

وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرٍ: اللہ تعالیٰ ہر اُکڑنے والے کو، فخر کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ نہ اُکڑنے والے اللہ کو پسند ہیں، نہ فخر کرنے والے پسند ہیں۔ ''جن کی عادت یہ ہے کہ وہ بخل کرتے ہیں اور لوگوں کو بھی بخل سکھلاتے ہیں'' خود بھی اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرتے اور اپنے طرزِ عمل کے ساتھ دُوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں۔ اَمر سے یہاں حکم دینا مراد ہے، ترغیب دینا، یعنی ان کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں، چاہے وہ ترغیب دیتے ہیں اپنے عمل کے ساتھ، چاہے قول کے ساتھ۔ ''اور جو کوئی اِعراض کرتا ہے، پیٹھ پھیرتا ہے، بے شک اللہ تعالیٰ تو بے نیاز ہے اور صفتایا ہوا ہے'' اللہ کسی کا محتاج نہیں، ہر صفتِ کمال اس کے لیے ثابت ہے، اس لیے اگر تم اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرو گے تو اللہ کا اِس میں کوئی نقصان نہیں ہے۔

امانت داری کا تقاضا...... اِنفاق فی سبیل اللہ

اور یہ جو اُکڑا کرتے ہیں، اِترایا کرتے ہیں، فخر کیا کرتے ہیں، اور اِس مال اور دولت کو اپنا کمایا ہوا سمجھتے ہیں، تبھی تو اُکڑنا اور فخر کرنا ہوتا ہے، یہ واقعہ ہے کہ یہ لوگ بخیل ہوتے ہیں، اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کر سکتے۔ اللہ کے راستے میں خرچ کرنا کام انہی کا ہوتا ہے جن کا یہ عقیدہ ہو کہ یہ اللہ نے دیا ہے، اس لیے اگر اللہ کے راستے میں ہم خرچ کریں گے تو یہ کوئی اللہ پر یا اللہ کے بندوں پر اِحسان نہیں، یہ مال ہمارے ہاتھ میں امانت ہے، اللہ تعالیٰ کے حکم کے تحت اس کو خرچ کرنا امین ہونے کا ایک تقاضا ہے، تو اِنفاق فی سبیل اللہ کی توفیق انہیں ہوتی ہے جو کہ مختال اور فخور نہیں ہوتے۔ جو ان نعمتوں کو اپنی محنت کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ جیسے قارون کا واقعہ آپ کے سامنے آیا تھا، کہ جب اُسے کہا گیا کہ اَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ، وہ کہتا تھا کہ اِنَّمَآ اُوْتِيْتُهٗ عَلٰى عِلْمٍ

عِنْدِي (سورۂ قصص:۷۸) یہ تو میں نے اپنی اِستعداد اور قابلیت سے کمایا ہے، تو یہ اللہ کا احسان کیسے ہے؟ اور میں یہ اللہ کے راستے میں مخلوق پر کیوں خرچ کروں؟ یہ قارونی عقیدہ آپ کے سامنے پہلے گزرا ہے، تو اسی طرح سے یہاں ذکر کیا جارہا ہے، جب نعمت کو اللہ کی طرف سے سمجھا جائے تو پھر انسان نہ اکڑتا ہے، نہ فخر کرتا ہے، ایسے شخص کے لیے اللہ کے راستے میں خرچ کرنا آسان ہوتا ہے، اور جو اس کو اپنی محنت کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو وہ فخر وغرور میں بھی مبتلا ہوتے ہیں اور وہ بخیل ہوتے ہیں، وہ اللہ کے راستے میں خرچ نہیں کرسکتے، کتوں پر تو ان کی کمائی خرچ ہوسکتی ہے، رنڈیاں اور بھڑوے تو ان کی کمائی کھاسکتے ہیں، لیکن اللہ کے راستے میں خرچ کرنے کی اُن کو توفیق نہیں ہوتی، یہ ہمیشہ دیکھ لیجے!

دولت متحرک چیز ہے

جمع کیا ہوا پیسہ کوئی ٹکنے والی چیز نہیں ہے، دولت متحرک ہے، اس کو ایک جگہ ٹکا کر نہیں رکھا جاسکتا، اگر آپ اس جمع کی ہوئی دولت کو خود نہیں ہلائیں گے تو چور اُٹھالیں گے، ڈاکٹروں کی طرف حرکت کرکے چلی جائے گی، وکیلوں کی طرف حرکت کرکے چلی جائے گی، رُسومِ بد کے اُوپر، رُسومِ قبیحہ کے اُوپر، اپنے فخر اور شان کو بڑھانے کے لئے اس کو خرچ کردوگے، تمہاری اس دولت کو رنڈیاں، بھڑوے، مراثی کھاجائیں گے، نالائق اولاد پیدا ہوگی وہ گل چھرے اُڑائے گی، یہ متحرک ہے، یہ ٹک نہیں سکتی، اس لیے اگر اس کو اللہ کے راستے میں خرچ کروگے تو نتیجہ بھی اچھا، ورنہ یہ رہنے والی چیز تو ہے نہیں، اس نے حرکت تو بہرحال کرنی ہے، ڈاکٹروں کے جائے، وکیلوں کے جائے، چوروں کے چلی جائے، پولیس کے چلی جائے، اور یہ غنڈے، مشٹنڈے، لفنگے، دوست احباب کھاجائیں، اور مراثی اور اس قسم کے دُوسرے لوٹ کرلے جائیں، رُسومِ قبیحہ کے اندر اس کو خرچ کردیا جائے، گارے مٹی کے اندر اس کو لگا کر تعمیر کرلی جائے، بہرحال یہ ٹکنے والی چیز نہیں ہے، تو اگر اس کی حرکت اللہ کے راستے کی طرف ہوجائے تو دُنیا اور آخرت دونوں میں مفید ہے، ''جو کوئی اِعراض کرے اللہ تعالیٰ غنی ہے'' اُس کو کسی کی طرف کوئی احتیاج نہیں، ''حمید ہے'' ہر صفتِ کمال اس کے لیے ثابت ہے، اُس کے اندر کوئی کسی قسم کا نقص اور عیب نہیں۔

کتاب، میزان، اور لوہے کو اُتارنے کا مقصد

لَقَدْ أَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ: ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا، ''اور ان کے ساتھ کتاب بھی اُتاری اور میزان بھی اُتاری تا کہ لوگ انصاف قائم کریں'' کتاب اَحکام کا مجموعہ ہے اور میزان یہ عمل ہے جس کے ساتھ عدل قائم ہوتا ہے، اللہ کی کتاب سے اَحکام سیکھو اور اس ترازو کے ساتھ عدل وانصاف کو قائم کرو۔ میزان سے مراد یہی ترازو جس کے ساتھ حقوق کا ایفاء اور استیفاء ہوتا ہے، جیسے سورۂ رحمٰن کی اِبتدا میں ذکر کیا گیا تھا، یا مطلقاً قانونِ عدل مراد ہے۔ ''تا کہ لوگ انصاف کو قائم کریں''

کتاب اور میزان کے ساتھ۔'' اور ہم نے لوہا اُتارا، اس میں لوگوں کے لئے سخت دبدبہ ہے اور منافع ہیں لوگوں کے لئے' وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ: '' تاکہ اللہ لوگوں کو فائدہ پہنچائے اور تاکہ جان لے، یعنی ظاہری طور پر ممتاز کر لے اس شخص کو جو اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے بن دیکھے، بے شک اللہ قوی عزیز ہے'' یہ بھی وہی جہاد کی ترغیب ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب بھی اُتاری، قانونِ عدل بھی اُتارا، تاکہ لوگ انصاف کو قائم کریں، اور پھر اللہ نے ساتھ لوہا بھی اُتارا، لڑنے کا سامان، کیونکہ نیکی پھیلانے کے لیے صرف وعظ وتلقین کافی نہیں ہوتی، کبھی کبھی ڈنڈا بھی کھڑکانا پڑتا ہے، اس لیے پانچ کتابوں کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے نعل دار جوتا بھی اُتارا ہے لوگوں کا دماغ دُرست کرنے کے لئے، جہاد کا سامان لوہے سے تیار ہوتا ہے، تاکہ اللہ آزمائے کہ کون اس کے رسولوں کی مدد کرتا ہے کون نہیں کرتا؟ اس جہاد کے سامان کے لیے اللہ نے لوہا اُتارا۔'' اُتارنے'' سے مراد ہے عالمِ غیب سے ظاہر کرنا، چونکہ ہر چیز کی تدبیر عرش کی طرف سے ہوتی ہے، اس لیے عالمِ غیب سے جو چیز ظاہر ہو اس کو اُتارنے کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، وَاَنْزَلَ لَكُمْ مِّنَ الْاَنْعَامِ ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ (سورۂ زمر: ٦) یہ حیوانات کے متعلق بھی آیا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان اَنعام کی آٹھ قسمیں تمہارے لیے نازل فرمائیں، بھیڑ، بکری، گائے، اُونٹ، اور ان کے نر اور مادہ، یہ سب اللہ نے اُتارے، وہاں بھی اَنْزَلَ کا لفظ آیا ہے، تو اللہ کا پیدا کرنا اور عالمِ غیب سے ان کا ظاہر کرنا اس کو'' اِنزال'' سے تعبیر کیا جاتا ہے، تو ایسے ہی اللہ نے لوہا نازل کیا،'' اس میں سخت دبدبہ ہے اور لوگوں کے لیے منافع ہیں تاکہ لوگوں کو اللہ نفع بھی پہنچائے اور تاکہ ظاہری طور پر دیکھ بھی لے کہ کون اللہ کے رسولوں کا معاون اور مددگار ہے بن دیکھے، بے شک اللہ قوی اور زبردست ہے۔''

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ

البتہ تحقیق بھیجا ہم نے نوح علیہ السلام کو، اور ابراہیم علیہ السلام کو، اور کیا ہم نے ان کی اولاد کے اندر نبوت کو اور کتاب کو، تو ان کی اولاد میں سے بعض لوگ

مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿٢٦﴾ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا

ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہوئے ۞ پھر ان کے نقشِ قدم پر پیچھے لگا دیا ہم نے اپنے رسولوں کو، اور پیچھے لگایا ہم نے

بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّ

عیسیٰ بن مریم علیہ السلام کو، اور اس کو ہم نے اِنجیل دی، اور ڈال دی ہم نے ان لوگوں کے دل میں جنہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کی تھی رأفت

رَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَ ۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ

اور رحمت، اور رَہبانیت، یہ انہوں نے خود گھڑ لی، یہ ہم نے اُن کے اُوپر فرض نہیں کی تھی، مگر (یہ گھڑی تھی) اللہ کی رضا چاہنے کے لئے

فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ

پس نہیں رعایت کی انہوں نے رہبانیت کی جس طرح سے رعایت کرنی چاہیے، پھر ہم نے دیا ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لے آئے اُن کا اجر

وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝۲۷ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَاٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ

اور ان میں سے اکثر نافرمان ہیں ۝۲۷ اے (عیسیٰ علیہ السلام پر) ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے (اس موجود) رسول پر ایمان لے آؤ،

يُؤْتِكُمْ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ وَيَجْعَلْ لَّكُمْ نُوْرًا تَمْشُوْنَ بِهٖ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ

دے گا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دو حصے، اور کرے گا تمہارے لیے نُور، چلو گے تم اس نُور کے ساتھ، اور تمہیں بخش دے گا، اور اللہ

غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۲۸ لِّئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰي شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ

بخشنے والا رحم کرنے والا ہے ۝۲۸ (یہ اس لیے کہا جا رہا ہے) تاکہ یقین کر لیں اہلِ کتاب کہ نہیں قادر وہ اللہ کے فضل میں سے کسی شئ پر

وَاَنَّ الْفَضْلَ بِيَدِ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۝۲۹

اور اس بات کا (یقین کر لیں) کہ فضل سارے کا سارا اللہ ہی کے قبضے میں ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والے ہیں ۝۲۹

تفسیر

بعض انبیاء اور اُن کی اولاد کا اِجمالی تذکرہ

یہ تو اِجمال تھا کہ ہم نے رسول بھیجے اور ان کے ساتھ یوں قانونِ عدل بھی اُتارا، اور آگے خصوصیت کے ساتھ بعض پیغمبروں کا ذکر کیا جا رہا ہے، "البتہ تحقیق بھیجا ہم نے نُوح علیہ السلام کو اور ابراہیم کو علیہ السلام، اور کیا ہم نے ان کی اولاد کے اندر نبوّت کو اور کتاب کو" یعنی نبی بھی آئے اور نبیوں کے پاس اللہ نے کتاب بھی بھیجی، "تو اِن کی اولاد میں سے بعض لوگ ہدایت یافتہ ہیں اور ان میں سے اکثر نافرمان ہوئے۔" نُوح علیہ السلام تو آدمِ ثانی کی طرح ہیں، کہ آنے والی اولاد ساری نُوح علیہ السلام کی نسل سے ہے۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی ابو الانبیاء ہیں، بنی اسرائیل میں ان کی حیثیت مرکزی ہے کہ جتنے انبیاء بنی اسرائیل میں آئے، اور بعد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی، سب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں، تو ان کی اولاد میں سے کچھ لوگ ہدایت یافتہ بھی ہوئے اور اکثر نافرمان رہے۔

عیسیٰ علیہ السلام کی اُمّت اور اُمّتِ محمدیہ میں ایک فرق

پھر ہم نے ان کے پیچھے اور رسول بھیجے، ثُمَّ قَفَّیْنَا عَلٰٓی اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا: اِن کے نقشِ قدم پر پیچھے لگا دیا ہم نے اپنے رسولوں کو،" اور پیچھے لگایا ہم نے عیسیٰ بن مریم کو، اور اس کو ہم نے انجیل دی، اور کی ہم نے ان لوگوں کے دل میں جنہوں عیسیٰ علیہ السلام کی اتباع کی تھی رأفت اور رحمت" عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں، آپ علیہ السلام کے زمانے میں چونکہ جہاد نہیں ہوا، جہاد کے احکام نہیں آئے تھے، اس لیے محبت، شفقت عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں میں اور انجیل کے ماننے والوں میں زیادہ تھی، جیسے حضور ﷺ کے ماننے والوں کو بھی رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کے لفظ سے ذکر کیا گیا (سورۂ فتح:۲۹)، اور خود حضور ﷺ کو بِالْمُؤْمِنِیْنَ رَءُوْفٌ رَّحِیْمٌ کے الفاظ سے ذکر کیا گیا (سورۂ توبہ:۱۲۸) کہ حضور ﷺ بھی مؤمنین کے لیے رحمت اور رأفت کو لیے ہوئے ہیں، اور مؤمنین بھی آپس میں رحماء ہیں، لیکن ہمارے ہاں چونکہ ساتھ ساتھ ڈنڈا بھی چلتا ہے اس لیے اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ بھی آیا ہوا ہے، اور عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں میں چونکہ جہاد تھا نہیں، اس لیے یہاں شدّت علی الکفّار کا ذکر نہیں کیا، آپس میں رأفت اور رحمت کا ذکر کیا ہے، اس طرح سے عیسیٰ علیہ السلام کی اُمّت میں ایک پہلو نمایاں ہے اور حضور ﷺ کی اُمّت میں دونوں پہلو نمایاں ہیں۔ عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم تو ایسی تھی جو بالکل نرمی کے ساتھ اور شفقت کے ساتھ دی جا رہی تھی، یہاں تک ہے کہ اگر کوئی مخالف تمہاری گال کے اُوپر ایک تھپڑ لگا دے تو تم دُوسری گال اس کے سامنے پیش کر دیا کرو کہ لو ایک اور لگا لو! یعنی ہاتھ اُٹھانے کی بجائے تم اس کے سامنے دُوسرا رخسارہ پیش کر دو تاکہ وہ اس پر بھی ایک مار لے، اس طرح سے عیسیٰ علیہ السلام کی اُمّت کے اندر شفقت اور نرمی ہی نرمی تھی، اس کے اندر جہاد اور شدّت نہیں آئی، حضور ﷺ کی اُمّت جامع ہے کہ جن کو رحماء بھی بنایا گیا اور اَشدّاء علی الکفّار بھی بنایا گیا ہے۔ "ان کے دِل میں ہم نے رأفت اور رحمت ڈال دی۔"

"رَہبانیت" کا مفہوم اور اس کی اِبتدا

وَرَهْبَانِيَّةَ ۨابْتَدَعُوْهَا: اور رَہبانیت، یہ انہوں نے خود گھڑ لی، مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ: یہ ہم نے ان کے اُوپر فرض نہیں کی تھی، اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ: مگر یہ گھڑی اللہ کی رضا چاہنے کے لئے، فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا: پس نہیں رعایت کی انہوں نے رَہبانیت کی جس طرح سے رعایت کرنی چاہیے، رحمت و رأفت تو آئی اللہ کی جانب سے، لیکن ایک طریقہ ان کے اندر رائج ہو گیا، حضور ﷺ کے زمانے میں بھی لوگوں کے اندر یہ موجود تھا، جس کو "رَہبانیت" کہتے ہیں۔ "رَہبانیت" یہ لفظ رَھب رَھبان سے لیا گیا ہے، الف نون زائدتان آ جائیں گے تو رَھبان بن جائے گا، اصل رَھب ہے، جس کا معنی ہوتا ہے ڈرنا، عیسیٰ علیہ السلام کے ماننے والوں میں سے جو حق پرست گروہ تھا، جس وقت اہلِ باطل کچھ اِن کے اُوپر غالب آئے تو ان حق پرستوں نے اپنی زندگی ایک اور نہج پر ڈال

دی، کہ لوگ تو عیش پرست ہوگئے، شہوات پرست ہوگئے، اقتدار کے نشے میں مست ہیں، سمجھائے ہوئے سمجھتے نہیں، تو یہ آبادیوں سے کٹ کے اور دُنیا کی لذات سے اپنے آپ کو محروم کر کے جنگلوں میں وقت گزارنے لگ گئے، چونکہ اِس کا منشا اللہ تعالیٰ کا خوف تھا اس لیے اس کو "رَہبانیت" کے ساتھ تعبیر کیا جاتا ہے، کہ خوفِ الٰہی کی ایک صورت انہوں نے یوں اختیار کر لی کہ نکاح نہ کرو، لذات میں مبتلا نہ ہوؤ، مال و دولت اکٹھا نہ کرو، کمائی نہ کرو، بچے کماؤ، آبادیوں سے کٹ کے جنگل میں رہو، تا کہ ہم عبادت میں اپنا وقت گزار دیں، اس ماحول کے اندر ہم اگر رہیں گے تو یہ تو سمجھتے نہیں، اُلٹا ہمارے اُوپر کوئی بُرائی کا اثر پڑ جائے گا، تو اللہ کی رضا طلب کرنے کے لئے اُس وقت کے اہلِ حق نے اپنے لیے یہ ایک طریقہ تجویز کیا جس کو "رَہبانیت" کہتے ہیں۔ لیکن وہ اس کی رعایت نہ رکھ سکے، یعنی ابتدا، ابتدا میں تجویز اچھے جذبے سے کیا گیا، رعایت رکھنے کا مطلب یہ تھا کہ ہمیشہ اللہ کی رضا کو وہ پیشِ نظر رکھتے، جس چیز میں اللہ راضی ہوتا وہ وہی کام کرتے، لیکن انہوں نے اس رَہبانیت کو بھی دُنیاداری کا ذریعہ بنالیا، بیٹھ گئے باہر کٹیوں میں، خانقاہیں بنا کر، گویا کہ تارک الدنیا ہیں، لیکن لوگ آنے لگ گئے، نذرانے دینے لگ گئے، یہ اُن کو تعویذ گنڈے اور غلط قسم کی باتیں بتا کے اُن کی دُنیا لوٹنے لگ گئے، تو اس ترکِ دُنیا کے پردے میں یہ انتہائی درجے کے دُنیادار بن گئے، ظاہری طور پر تو یہ اگرچہ ملنگ اور درویش نظر آتے تھے لیکن باطن میں انتہائی درجے کے نفس پرور اور عیاش، جس طرح سے حال آج کل قبروں پہ بیٹھنے والے ملنگوں کا ہے، کہ ظاہری طور پر نہ وہ اچھا کپڑا پہنیں گے، نہ وہ اپنی شکل کو سنواریں گے، معلوم یوں ہوگا جیسے دُنیا سے ان کا تعلق ہی کوئی نہیں، لیکن اگر ان کی خلوتیں دیکھیں اور ان کی راتیں دیکھیں تو انتہائی درجے کے عیاش اور بدمعاش قسم کے لوگ ہیں، یہی حال پھر ان راہبوں کا ہوگیا جیسے کہ اللہ تعالیٰ نے نشان دہی کی: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْۤا اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ الْاَحْبَارِ وَ الرُّهْبَانِ لَیَاْكُلُوْنَ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ (سورۂ توبہ: ۳۴) تو پھر انہوں نے اس رَہبانیت کے پردے میں دُنیا اکٹھی کرنی شروع کر دی، اور اس طرح سے یہ عیاشی کے اندر مبتلا ہوگئے، تو جاری یہ اچھے جذبے کے ساتھ کی گئی تھی لیکن یہ اُس کی رعایت نہیں رکھ سکے۔

اِسلام میں "رَہبانیت" نہیں ہے!

اس لیے اب یہ رَہبانیت اسلام میں ختم کر دی گئی "لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ"[1] اسلام یہ کہتا ہے کہ نکاح بھی کرو، دوست احباب سے ملو بھی، کماؤ بھی، کھاؤ بھی، لیکن اس طریقے کے مطابق جو اللہ نے بتایا، یوں ترکِ لذات کہ انسان دُنیا کو چھوڑ چھاڑ کر ایک طرف ہوجائے اور ان لذتوں کو اختیار کرنا، دُنیا کی ان چیزوں کو اختیار کرنا، انسان سمجھے کہ یہ آخرت برباد کرنے والی چیز ہے،

(۱) فتح الباری لابن رجب ۱/۱۱۰ باب من الدین الفرار الخ، بحر السمر اسیل طاؤس/ نیز مسند احمد: ۲۵۸۹۳ ولفظہ: إنَّ الرَّهْبَانِيَّةَ لَمْ تُكْتَبْ عَلَيْنَا. سنن دارمی: ۲۲۱۵، ولفظہ: إِنِّي لَمْ أُومَرْ بِالرَّهْبَانِيَّةِ۔ نوٹ:- فتح الباری لابن حجر ۹/۱۱۱ پر لکھا ہے: وَأَمَّا حَدِيثُ لَا رَهْبَانِيَّةَ فِي الْإِسْلَامِ فَلَمْ أَرَهُ بِهَذَا اللَّفْظِ لَكِنْ فِي حَدِيثِ سَعْدِ بْنِ أَبِي وَقَّاصٍ عِنْدَ الطَّبَرَانِيِّ إِنَّ اللَّهَ أَبْدَلَنَا بِالرَّهْبَانِيَّةِ الْحَنِيفِيَّةَ السَّمْحَةَ وَعَنِ ابْنِ عَبَّاسٍ رَفَعَهُ: لَا صَرُورَةَ فِي الْإِسْلَامِ. أَخْرَجَهُ أَحْمَدُ وَأَبُو دَاوُدَ وَصَحَّحَهُ الْحَاكِمُ.

اور یہ تعلقات قُربِ الٰہی کے اندر مانع ہیں، اسلام کی یہ تعلیم نہیں، اسلام کہتا ہے کماؤ بھی، اور اپنی منشا کے مطابق خوب اچھی طرح سے کھاؤ پہنو بھی، لیکن اللہ تعالیٰ کے اَحکام کی رعایت رکھو۔ نکاح کرو، اولاد کو پالو، خدمتِ خلق کرو اور یہ جہاد اور عبادات کا جتنا سلسلہ ہے، بس ہماری رَہبانیت یہی ہے کہ اللہ سے ڈرتے ہوئے ان قوانین کی پابندی کریں، اب ترکِ تعلق جس کو تَبَتُّل کہتے ہیں کہ دُنیا کو چھوڑ کر ایک طرف بیٹھ جائیں، یہ اسلام کا مزاج نہیں ہے، بس اس کی رَہبانیت اور ترکِ دُنیا یہی ہے کہ مسجد میں جا کر کچھ دیر کے لئے بیٹھ جاؤ، نماز کا انتظار کرلیا، جہاد کے لئے سفر کرلو، تو باقی ماحول سے خود بخود ہی لاتعلقی ہوگی، اس قسم کے اَحکام دے کر اُس رَہبانیت کو ختم کردیا گیا۔ رَهْبَانِيَّةً یہ منصوب ہے علیٰ شریطۃ التفسیر۔ ابْتَدَعُوْهَا: ابتداع کا معنی ہوتا ہے ایک نیا طریقہ اختیار کرلینا، اللہ نے نہیں سکھائی تھی لیکن انہوں نے اس کو اختراع کیا، نکالا، یہ ہم نے ان پر فرض نہیں کی تھی، اور نکالا کس لیے؟ اللہ کی رضا چاہنے کے لئے! اللہ کی رضامندی کی اتباع کے لئے! پھر نہیں رعایت رکھ سکے اس کی جس طرح سے کہ رعایت رکھنی چاہیے تھی، یعنی اس کی اصل رُوح جو تھی وہ تو اللہ کی رضا کا چاہنا تھا، لیکن یہ جذبہ وہ باقی نہ رکھ سکے۔

اہلِ کتاب کو اِیمان پر دُگنے اَجر کا وعدہ

فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ: پھر ہم نے دیا ان لوگوں کو جو ان میں سے ایمان لے آئے، یعنی حضور ﷺ پر، یہ عیسائی، عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والے جو حضور ﷺ پر ایمان لے آئے ہم نے ان کو ان کا اَجر دیا، وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ اور ان میں سے اکثر فاسق ہی رہے، ان میں سے اکثر نافرمان ہیں، جو اپنے ان غلط طریقوں کو چھوڑ کر حضور ﷺ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا: یہاں اٰمَنُوْا سے آمنو بعیسیٰ مراد ہیں، جس طرح سے پہلے ان کا ذکر چلا آرہا ہے، ''اے عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور اُس کے اس موجود رسول پر ایمان لے آؤ'' اٰمِنُوْا بِرَسُوْلِهٖ: لے آؤ اللہ کے رسول پر ایمان، ''دے گا اللہ تعالیٰ تمہیں دوہرا اَجر اپنی رحمت سے'' كِفْلَيْنِ: دو حصے دے گا اپنی رحمت سے۔ یہ مسئلہ آپ کے سامنے پہلے آیا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کوئی شخص ایمان لاتا ہے تو اس کو دُوسروں کے مقابلے میں دُگنا اَجر ملتا ہے، تو یہاں چونکہ كِفْلَيْنِ مِنْ رَّحْمَتِهٖ کا ذِکر ہے تو معلوم ہوگیا کہ یہ ایمان لانے کی ترغیب اہلِ کتاب کو دی جارہی ہے۔ ''اے ایمان والو! اے عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والو! اللہ سے ڈرو اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، دے گا تمہیں اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے دو حصے، اور کرے گا تمہارے لیے نُور، چلو گے تم اس نُور کے ساتھ'' جس طرح سے پیچھے مؤمنین کاملین کے لئے آخرت میں نُور کا ذِکر آیا تھا تو اللہ تمہارے لیے بھی نُور کردے گا، ''اور تمہیں بخش دے گا، اللہ بخشنے والا رحم کرنے والا ہے۔'' اور یہ اس لیے کہا جارہا ہے کہ نُور اگر حاصل کرنا ہے، مغفرت حاصل کرنی ہے، تو اس رسول پر ایمان لے آؤ، اس لیے کہا جارہا ہے ''تاکہ اہلِ کتاب کو یہ پتا چل جائے''، لِئَلَّا يَعْلَمَ اَهْلُ الْكِتٰبِ میں ''لا'' زائدہ ہے، ''تاکہ اہلِ کتاب جان لیں کہ وہ قادر نہیں کسی شئ پر اللہ کے فضل سے'' اُن کو یقین آجانا چاہیے کہ اگر اس رسول پر ایمان نہیں لائیں

گے تو اللہ کے فضل پر یہ قدرت نہیں پاسکیں گے، اللہ کا فضل اِن کو حاصل نہیں ہو سکے گا، اَلَّا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّنْ فَضْلِ اللّٰهِ: تا کہ جان لیں اہلِ کتاب کہ نہیں قدرت پاتے وہ اللہ کے فضل میں سے کسی شئ پر،'' اور اس بات کا یقین کرلیں کہ فضل اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے ''يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ: جس کو چاہتا ہے دیتا ہے، اب اللہ نے فضل کے دروازے اُنہی لوگوں پر کھولے ہیں جو اس موجود رسول کے اُوپر ایمان لاتے ہیں، اگر اِس پر ایمان نہیں لائیں گے تو اِن کو یقین کرلینا چاہیے کہ اللہ کے فضل پر یہ قدرت نہیں پاسکتے، اللہ کا فضل حاصل نہیں کرسکتے،'' تا کہ یقین کرلیں اہلِ کتاب کہ نہیں قادر وہ اللہ کے فضل میں سے کسی شئ پر، اور اس بات کا یقین کرلیں کہ فضل سارے کا سارا اللہ ہی کے قبضے میں ہے، جس کو چاہتا ہے دیتا ہے'' وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ: اللہ تعالیٰ بہت بڑے فضل والے ہیں۔

سُبْحَانَكَ اللّٰهُمَّ وَبِحَمْدِكَ اَشْهَدُ اَنْ لَّآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنْتَ اَسْتَغْفِرُكَ وَاَتُوْبُ اِلَيْكَ

***